دربارِ اکبری

شمس العلماء محمد حسین آزاد

شیخ مبارک علی بک سیلرز اندرون لوہاری دروازہ لاہور

اللہ اکبر جل جلالہ،

دربارِ اکبری

یعنی

جلال الدین اکبر بادشاہِ ہندوستان اور اُس کے دربار کے اُمرائے جلیل القدر
مثلاً بیرم خان خانخاناں۔ امیر الامرا خان زمان علی قلی خاں شیبانی
منعم خان خانخاں۔ مہیش داس راجہ بیربر۔ ابوالفیض فیضی فیاضی
شیخ عبدالقادر بدایونی۔ شیخ ابوالفضل موتمن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈرمل
راجہ مان سنگھ۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ کے دلچسپ حالات۔

مُصنّفہ

شمس العلماء مولینا مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم
سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور
کے لئے
سنہ ۱۹۴۷ء میں
دین محمدی پریس واقع سرکلر روڈ لاہور میں باہتمام ملک محمد عارف پرنٹر چھپی
چھٹا ایڈیشن ۲۰۰۰ قیمت 15/-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

حضرت قبلہ وکعبہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ایسی نہیں جس پر میرے جیسا ہیچمدان کج مج بیان کسی مقدمہ لکھنے کی جرأت کرتا۔ لیکن کتاب ہذا کا پہلا ایڈیشن جو مطبع رفاہِ عام میں چھپا تھا۔ (جس کے مالک و منیجر میر ممتاز علی صاحب ہیں) اُس کے آغاز میں منیجر صاحب موصوف نے ایک ایسا عجیب وغریب مُقدّمہ تحریر کر دیا۔ جس کی وجہ سے نہ صرف مجھے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دوسرا ایڈیشن اپنے اہتمام سے کسی دوسرے مطبع میں چھپواؤں۔ بلکہ منیجر صاحب موصوف کے تحریر کردہ مقدمہ کی اصلی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے مجھے اس امر کی جسارت کرنے پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ کہ کتاب ہذا کے ساتھ ایک مختصر مقدّمہ شامل کر دوں *

میر ممتاز علی صاحب نے پہلے ایڈیشن کے ساتھ جو مقدّمہ لکھا ہے۔ اُس میں تحریر کا انداز ایسا رکھا ہے کہ گویا دربار اکبری کا کوئی ایسا مسودہ مرقومہ حضرت قبلہ مرحوم اُن کو دستیاب نہیں ہؤا۔ جو مسودہ سمجھا جانے کے قابل ہو۔ بلکہ ایک ٹوٹا پھوٹا بے ربط۔ بے ترتیب۔ بے سروپا مجموعہ چند پرچوں اور پُرزوں اور دیگر کاغذات کا ایسی مشکلات و مصائب طے کرنے کے بعد جو ہفتخوانِ رستم کی مشکلات سے مشابہ تھیں۔ میر صاحب موصوف کے ہاتھ آیا۔ اور ایسی جستجوئیں اور تفتیشیں ان کاغذات کی بہم رسانی کے لئے اُن کو کرنی پڑیں۔ جو بہت ہی قابلِ داد ہیں۔ سب سے زیادہ افسوسناک غلط بیانی میر صاحب کے لکھے ہوئے مقدمہ میں یہ تھی کہ اُنھوں نے حضرت قبلہ مرحوم کی نسبت یہ تحریر کیا کہ "وہ یہ سُن کر کہ میں اُن کا مسودہ لینے کے درپے ہوں جوش جنوں میں مسودات کا ایک بستہ لے کر دریائے راوی پر پہنچے اور پُل پر

کھڑے ہو کر اُس کو دریا بُرد کر دیا۔ یقین کیا جاتا ہے کہ اُس میں دربار اکبری کا صاف شُدہ مسوّدہ ہوگا۔'' اِس فرضی دریا بُردگی کے قصے پر (جس کا علم سوائے میر صاحب کے کسی اور شخص کو نہیں۔ جو غالباً اُس وقت ہمراہ ہوں گے) میر صاحب موصوف نے کمال اندوہ و قلق اور درد و سوز کے ساتھ یہ بھی ارقام فرمایا ہے۔ "خدا جانے اس سخنور نے نظم و نثر کے کیا کیا موتی پروئے ہوں گے جو ہماری بد قسمتی سے دریا میں غرق ہو گئے۔" غرضکہ میر صاحب کے اس بیان کے ساتھ جب اُن کے مزید ایسے بیانات کو شامل کیا جائے جن کا ماحصل یہ ہے کہ جو مسوّدہ شاگردوں کا صاف کیا ہوا تھا وہ غلطیوں کا مجموعہ تھا۔ اور جو مسوّدہ مصنّف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ وہ بیشمار چھوٹے چھوٹے پُرزوں پر تھا جو علاوہ بہت کٹے ہوئے اور مشکوک و مشتبہ ہونے کے پڑھے جانے کے بھی قابل نہ تھے اور پنسل کی لکھی ہوئی تحریریں قریباً محو ہو چکی تھیں۔ اور انہیں وجوہات سے میر صاحب کو مسوّدہ میں جابجا تصرّفات کرنے پڑے۔ (جس میں حذف ایزاد اور تبدیلی غرضکہ ہر قسم کے تصرّفات شامل ہیں) اور اُوراق کے اُوراق جو گم تھے اُن کی گُم شدگی دیکھ کر بقول میر صاحب "بجز اس کے اور کیا چارہ ہو سکتا تھا کہ اس حصّۂ ناقص کو مَیں خود لکھ کر پورا کروں"، تو ان بیانات کے مطالعہ سے پڑھنے والے کے دل پر سوائے اس کے اور کیا اثر پیدا ہو سکتا تھا کہ بحیثیتِ مجموعی کتاب دربار اکبری دراصل قریباً میر صاحب موصوف ہی کی عرق ریزی اور محنت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ حضرت قبلہ مرحوم کے صاف کردہ مسوّدات تو دریائے راوی میں ہی غرق ہو چکے تھے۔ علاوہ بریں بقول میر صاحب موصوف ضمیمہ دربار اکبری تو تمام و کمال ہی میر صاحب موصوف کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ ایسے حالات میں دربار اکبری کی وقعت میں اسی قدر فرق آجانے کا احتمال ہے جس قدر حضرت قبلہ مرحوم اور میر صاحب کی وقعت میں تفاوت ہے۔ اس لئے اس امر کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ اصلی واقعات کا پبلک پر انکشاف ہو جائے۔

حقیقت حال یوں ہے کہ جس وقت میر ممتاز علی صاحب نے مطبع رفاہ عام کی مشینیں ولایت سے منگوائیں قدرتی طور پر ان کو چھاپنے کے لئے کتابوں کی

تلاش ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے مجھ سے کتابوں کے چھپوانے کی درخواست کی۔ مَیں نے بغیر کسی قسم کے شک کے دربارِ اکبری اور سخندانِ فارس کے حصہ اوّل کا مسوّدہ میر صاحب کو دے دیا۔ اور معاہدہ یہ ہُوا کہ دونوں کتابوں کے خرچ چھپوائی و آمدنی فروخت میں میرا اور اُن کا نصف نصف حصّہ ہوگا۔ مسودوں کے لے جانے کے قریباً چھ مہینے کے بعد میر صاحب نے مجھے ایک طویل خط لکھا۔ اُس میں بہت پیچ در پیچ شرائط دربارِ اکبری کے چھاپنے کی نسبت پیش کیں۔ جن کو مَیں نے منظور نہ کیا۔ اور صاف لکھ دیا کہ آپ دربارِ اکبری کا مسوّدہ واپس کر دیں۔ جب میر صاحب نے دیکھا کہ میں کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ تو انہوں نے پھر وہی شرطِ سابقہ نصف نصف حصّہ خرچ و آمدنی کو منظور کر کے کتاب چھاپنی شروع کی۔ مقدمہ کے صفحۂ اوّل پر جو میر صاحب نے دربارِ اکبری کے مسوّدہ حاصل کرنے کی کوشش کا ذکر کیا ہے یہ بالکل صحیح نہیں۔ وہ کبھی کتب خانۂ مصنّف مرحوم میں داخل ہو کر کسی کتاب کو چھونے کا مجاز نہیں ہو سکتے تھے۔ صفحہ ۲ پر جو میر صاحب نے مسودوں کا بستہ دریائے راوی میں ڈالنے کا ذکر کیا ہے یہ بھی درست نہیں۔ میں نے جس وقت حضرت قبلہ و کعبہ مرحوم کی طبیعت میں مجذوبیّت کا اثر دیکھا تو فوراً تمام مسوّدے جواب تک چھپوا چکا ہوں کتب خانے میں سے خود نکال لئے۔ جو مسوّدہ مَیں نے میر صاحب کو دیا تھا وہ آخری مرتبہ صاف شدہ مسوّدہ تھا۔ لیکن چونکہ حضرت مرحوم کا قاعدہ تھا کہ ہر ایک مسوّدہ میں خواہ وہ کتنی ہی دفعہ دیکھا ہُوا ہو ہمیشہ ترمیم کرتے رہتے تھے۔ اس لئے وہ جگہ جگہ سے کٹا ہُوا ضرور تھا۔

حضرت مرحوم نے تمام حالات اعیانِ دربارِ اکبری کے علیحدہ علیحدہ کاغذوں میں ترتیب دے کر رکھ چھوڑے تھے۔ اور غالباً اسی ترتیب سے اُن کو کتاب میں درج کرنا منظور تھا۔ اگرچہ مسوّدۂ مذکور کٹا ہُوا تھا اور کہیں کہیں چیپیاں بھی لگی ہوئی تھیں مگر وہ ایسی حالت میں تھا کہ ایک سمجھ دار کاتب ایسے شخص کی نگرانی میں جو مصنّف کی تحریر پڑھنے کا عادی ہو اچھی طرح سے نقل کر سکتا۔ چنانچہ سخندانِ فارس کا مسوّدہ جو مَیں نے ۱۹۰۷ء میں چھپوایا ہے بالکل ایسی ہی حالت میں تھا اور مجھے اُس کے چھپوانے میں کوئی دقّت نہیں پیش آئی۔

صفحہ ۳ کے آخر میں جو میر صاحب نے لکھا ہے کہ بعض ناقص حصوں کو میں نے خود لکھ کر پورا کیا ہے درست نہیں۔ تمام حالات بالکل مکمل تھے۔ اور مصنف مرحوم اپنے مختلف احباب سے بارہا حالتِ صحت میں ذکر کر چکے تھے کہ مسوّدہ بالکل مکمل ہے۔ صرف چھپوانے کی دیر ہے۔ مسوّدہ جوں کا توں میں نے مقفّل کر رکھا تھا۔ کوئی کاغذ بھی اس کا ضائع نہیں ہوا۔ سنین کی صحت کی نسبت جو میر صاحب نے لکھا ہے سہو کتابت ہے اور اس کا مضائقہ نہیں ہے۔ صفحہ ۴ کے تیسرے پیراگراف میں میر صاحب نے جو لکھا ہے کہ میں نے علی قلی خاں شیبانی کی جگہ علی قلی خاں سیستانی کر دیا ہے۔ یہ صحیح کو غلط کر دیا ہے۔ کیونکہ اصل میں علی قلی خاں شیبانی درست ہے علی قلی خاں شیبانی قبیلہ کا تھا۔ جہاں جہاں کتابوں کے حوالے دئے ہوئے ہیں وہاں اصل کتاب کے مضمون شاگردوں یا دوستوں کے نقل کئے ہوئے موجود ہیں۔ چنانچہ ایک خط حافظ ویران مرحوم کا اصل مسوّدہ میں رکھا ہے۔ کہ میں منتخب التواریخ میں سے فلاں حصہ نقل کروا کر بھیجتا ہوں۔ اور وہ نقل مسوّدہ میں شامل تھی۔ صفحہ ۴ کے آخری فقرہ میں جو تتمہ خود لکھنے کا ذکر میر صاحب نے کیا ہے یہ بھی صحیح نہیں۔

چونکہ الحق یعلوا ولا یعلےٰ کا ارشاد بالکل صحیح ہے۔ اس لئے تائید غیبی یہ ہوئی کہ میر صاحب موصوف نے دربار اکبری چھاپنے کے بعد کتاب مذکور کا مسوّدہ جو میں نے اُن کو دیا تھا مجھے واپس کر دیا۔ اور دیتے وقت وہ تتمہ کا مسوّدہ دستخطی حضرت مرحوم بھی نکالنا بھول گئے جس کی نسبت اُنہوں نے ایسی دلیری سے لکھ دیا تھا کہ وہ قریباً تمام وکمال ہی اُن کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ تتمہ کے اس مسودے میں مجھے خداداد خاں دکنی۔ سکندر خاں اُزبک۔ مرزا شاہرخ۔ تردی بیگ ترکستانی۔ قاضی نظام بدخشی۔ ملا عالم کابلی۔ برہان نظام شاہ۔ حسین نظام الملک۔ اسمٰعیل نظام الملک۔ ابراہیم برہان الملک چاند بی بی۔ میر عبداللطیف قزوینی۔ میر غیاث الدین علی۔ خواجہ مظفر علی تربتی۔ حکیم الملک گیلانی۔ شاہ ابوالمعانی۔ مرزا شرف الدین حسین۔ ابراہیم حسین۔ گل رخ بیگم۔ حکیم محمد مرزا۔ تورۂ چنگیزی۔ ملا شیری۔ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت محمد غوث گوالیاری رحمۃ اللہ علیہ - شیخ گدائی کنبوہ - ہیمو بقال - سادات بارہہ
سلیمہ سلطان بیگم - شمس الدین محمد اتکہ خاں - شہاب خاں - ناصر الملک ملا پیر محمد خاں -
محمد سعید بہادر خاں - حسین قلی خاں خان جہاں - اسمٰعیل قلی خاں - خواجہ امینا
خواجہ شاہ منصور - آصف خاں - عبداللہ خاں ازبک - شاہ عارف حسینی -
میاں عبداللہ نیازی سرہندی - شیخ علائی - سلیمان کرانی - سید محمد میر عدل -
رن تھنبور - نظام احمد بخشی - سید محمد جونپوری - حکیم مصری - پیر روشنائی -
خاندان سوری کے حالات مصنف کے اپنے قلم سے درست کئے ہوئے مل گئے -
جو کتاب مطبوعہ میں حرف بحرف نقل کئے گئے ہیں - اصل کتاب میں مصنف نے
جگہ جگہ تتمہ کا حوالہ دیا ہے - یہی ایک بدیہی ثبوت اس امر کا ہے کہ مصنف نے تتمہ
لکھ لیا تھا - مسودات مذکورہ بالا جس کا جی چاہے میرے پاس دیکھ سکتا ہے +

صفحہ ۵ کے دوسرے پیراگراف میں میر صاحب نے تحریر کیا ہے - کہ جو
خیالات حضرت قبلہ مرحوم سے وہ سُنا کرتے تھے اُن کو اپنے الفاظ میں لکھ کر انہوں
نے مقولۂ آزاد ظاہر کیا ہے - چنانچہ میر صاحب کے اصلی فقرات نقل کر دئے
جاتے ہیں :-

"مصنف کا قاعدہ ہے کہ وہ کسی کسی واقعہ کے بیان میں اپنے تئیں بہ لفظِ آزاد
خطاب کر کے اپنے خیالات دلی ظاہر کرتا ہے - مجھے چونکہ اپنے معزز اُستاد کے ہمراہ
تقریباً پندرہ سال تک رہنے کا اتفاق ہوا تھا - اس لئے جہاں تک مجھے اس حیثیت
سے اُن کے عادات و خیالات سے آگاہی ہو سکتی تھی اس کے لحاظ سے میں نے اُسی طرح
بعض واقعات پر ان کے دلی خیالات ظاہر کئے ہیں - اور چونکہ وہ انہیں کے خیالات ہیں
اس لئے میں نے وہاں آزاد کا لفظ ہی لکھنا مناسب جانا ہے - درحقیقت یہ کام کئی
سال کا تھا جس کو میں نے چند ماہ میں ختم کیا +"

اس کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ جس کا دل
چاہے وہ اصل مسودات دستخطی حضرت قبلہ مرحوم میرے پاس دیکھ کر میر صاحب
کے اِس بیان کی صحت کا خود اندازہ کر لے - اس موقع پر اس لطیفہ کا ذکر کر دینا
خالی از لطف نہ ہوگا - کہ صفحہ ۶۹۷ سطر ۹ میں یہ فقرات درج ہیں :- آج سے

پندرہ سولہ برس پہلے تک میں نے خود دیکھا کہ تورۂ چنگیزی کا اثر باقی چلا آتا ہے"۔ ان فقرات کو کم از کم اس تتمہ میں ضرور حذف کر دینا چاہئے تھا۔ جس کو میر صاحب تمام و کمال اپنی تحریر ظاہر کرتے ہیں۔ کیونکہ حضرت قبلہ مرحوم کا سفر بخارا کرنا تو سب کو معلوم ہے مگر جناب میر صاحب کو یقیناً خود اقبال کرنا پڑیگا کہ وہ کبھی حدودِ ہندوستان سے آج تک باہر تشریف نہیں لے گئے۔ اس سے بڑھ کر ایک اور واقعہ میری نظر سے گزرا جو قابل ذکر ہے۔ یعنی بعض بعض حاشئے جو اصلی مسوّدات دستخطی حضرت قبلہ مرحوم میں موجود ہیں۔ اُن کو میر صاحب نے کتاب مطبوعہ میں بجنسہٖ نقل کر کے اُن کے نیچے اپنا نام یعنی ممتاز علی لکھ دیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ میر صاحب کے اپنے نتائج طبع ہیں +

ان حالات کا انکشاف پبلک کی اطلاع کے لئے اشد ضروری تھا تاکہ اُن کو کتاب ہذا کی وقعت میں کوئی شبہ پیدا نہ ہو۔ ورنہ منتخب مبصرانِ زبان اور چیدہ سخندان تو حضرت قبلہ مرحوم کی زبان و کلام اور اُن کے لطف بیان کو خود پہچان سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا شبلی سے مجھے ایک دفعہ پٹیالہ میں جناب آنریبل خلیفہ صاحب مرحوم کے مکان پر نیاز حاصل ہؤا۔ تو اُنہوں نے تعجب سے دریافت فرمایا کہ جو مضمون میر ممتاز علی نے مقدمہ دربار اکبری میں لکھا ہے کہ تتمہ ان کی تحریر ہے درست ہے؟ میں نے تمام حالات عرض کر دیئے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ تتمہ کی عبارت پڑھ کر مجھے پہلے ہی خیال ہؤا تھا کہ یہ زبان مولوی صاحب کے سوا دوسرے شخص کی نہیں ہو سکتی۔ امید ہے کہ جو لوگ زبان کے نبض شناس ہیں اُنہوں نے میر صاحب کے ان بیانات کی حقیقت اور وقعت کو پہلے ہی سمجھ لیا ہوگا۔ لیکن جن صاحبان کو کوئی مغالطہ یا شکوک پیدا ہوئے ہوں اُن کو اب اس امر کا عین الیقین ہو جانا چاہیئے۔ کہ دربار اکبری میں کوئی قابل تذکرہ تحریف یا تصرف نہیں کیا گیا۔ بلکہ بحیثیت مجموعی یہ حضرت قبلہ مرحوم کی اصلی تصنیف اور اُن کے دستخطی مسوّدات کے مطابق ہے۔

خاکسار

مورخہ ۲۳ر اگست ۱۹۱۰ء — محمد ابراہیم مصنف

امرت سر

فہرست مضامین دربار اکبری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

جلال الدین اکبر شہنشاہِ ہندوستان

امیر تیمور نے ہندوستان کو زورِ شمشیر سے فتح کیا۔ مگر وہ ایک بادل آیا تھا کہ گرجا برسا اور دیکھتے دیکھتے کھُل گیا۔ بابر اس کا پوتے کا پوتا چوتھی پشت میں ہوتا تھا۔ سوا سو برس کے بعد آیا۔ اُس نے سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی کہ اسی رستے مُلکِ عدم کو روانہ ہُوا۔ ہمایوں اس کے بیٹے نے قصرِ سلطنت کی بنیاد کھودی اور کچھ اینٹیں بھی رکھیں۔ مگر شیر شاہ کے اقبال نے اُسے دم نہ لینے دیا۔ اخیر عمر میں اس کی طرف پھر ہوائے اقبال کا جھوکا آیا تو عمر نے وفا نہ کی۔ یہاں تک کہ ۹۶۳ھ ہجری میں یہ با اقبال بیٹا جانشین ہُوا۔ تیرہ برس کے لڑکے کی کیا بساط۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو۔ اُس نے سلطنت کی عمارت کو انتہائے بلندی تک پہنچایا۔ اور بنیاد کو ایسا استوار کیا کہ پشتوں تک جنبش نہ ہوئی۔ وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا۔ پھر بھی اپنی نیک نامی کے کتابے ایسے قلم سے لکھ گیا ہے کہ دن رات کی آمد و رفت اور فلک کی گردشیں انہیں گھِس گھِس کر مٹاتی ہیں مگر وہ جتنا گھستے ہیں اُتنا ہی چمکتے آتے ہیں۔ اگر جانشین بھی اُسی رستے پر چلتے تو ہندوستان کے رنگا رنگ فرقوں کو دریائے محبت پر ایک گھاٹ پانی پلا دیتے۔ بلکہ وہی آئین ملک، ملک کے لئے آئینہ ہوتے۔ اس کے حالات بلکہ بات بات کے نکتے اوّل سے آخر تک دیکھنے کے قابل ہیں +

---

[1] اکبر ولد ہمایوں ولد بابر ولد عمر شیخ مرزا ولد ابوسعید مرزا ولد سلطان محمد میرزا ولد میران شاہ ولد امیر تیمور صاحبقران

جن دنوں ہمایوں شیر شاہ کے ہاتھ سے پریشان حال تھا ایک دن ماں نے اس کی ضیافت کی۔ وہاں ایک نوجوان لڑکی نظر آئی۔ اور وہ دیکھتے ہی اس کے حسن وجمال کا عاشق و شیدا ہو گیا۔ دریافت کیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ حمیدہ بانو بیگم اس کا نام ہے۔ ایک سید بزرگوار شیخ ژندہ پیل احمد جام کی اولاد میں ہیں۔ اور آپ کے بھائی مرزا ہندال کے اُستاد ہیں یہ اُن کے خاندان کی بیٹی ہے۔ ہمایوں نے چاہا۔ کہ اُسے عقد میں لائے۔ ہندال نے کہا۔ مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے اُستاد کو ناگوار ہو۔ ہمایوں کا دل ایسا نہ آیا تھا کہ کسی کے سمجھائے سمجھ جاتا۔ آخر محل میں داخل کر لیا لیکن حضرت عشق نے شادی کی تھی اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھا تھا۔

ہمایوں کو دم بھر جدائی گوارا نہ تھی۔ دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا۔ ابھی پنجاب میں ہے ابھی سندھ میں ہے۔ ابھی بیکانیر۔ جیسلمیر کے ریگستان میں سرگرداں چلا جاتا ہے۔ پانی ڈھونڈھتا ہے تو منزلوں تک میسّر نہیں۔ جودھپور کا رُخ ہے کہ ادھر سے اُمید کی آواز آئی ہے۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اُمید نہ تھی۔ دغا آواز بدل کر بولی تھی۔ وہاں تو موت منہ کھولے بیٹھی ہے۔ ناچار پھر اُلٹے پاؤں پھر آتا ہے۔ یہ سب مصیبتیں ہیں۔ مگر پیاری بی بی دم کے ساتھ ہے۔ کئی لڑائی کے مقاموں میں اس کے سبب سے خطرناک خرابیاں اُٹھانی پڑیں۔ مگر اُسے تعویذ کی طرح گلے سے لگائے پھرا۔ جب وہ جودھپور کے سفر میں تھے تو اکبر ماں کے پیٹ میں باپ کے رنج و راحت کا شریک تھا۔ اس سفر سے پھرے اور سندھ کی طرف آئے۔ ایام ولادت بہت نزدیک تھے۔ اس لئے بیگم کو امرکوٹ میں چھوڑا۔ اور آپ آگے پرانی لڑائی کو تازہ کیا۔ اسی عالم میں ایک دن ملازم نے آکر خبر دی کہ مبارک۔ اقبال کا تارہ طلوع ہؤا۔ یہ ستارا ایسے ادبار کے وقت جھلملایا تھا۔ کہ کسی کی آنکھ ادھر نہ اُٹھی۔ مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا! آفتاب ہو کر چمکیگا۔ اور سارے ستارے اس کی روشنی میں دُھندلے ہو کر نظروں سے غائب ہو جائینگے ۔

ترکوں میں رسم ہے کہ جب کوئی ایسی خوشخبری لاتا ہے تو اُسے کچھ دیتے ہیں۔ ایک سفید پوش اشراف ہوگا تو اپنا چغہ ہی اُتار کر دے دیگا۔ امیر ہے تو اپنی دستگاہ کے بموجب خلعت اور گھوڑا۔ نقد و جنس جو جو کچھ ہو سکیگا دے گا۔ سب کی ضیافتیں کریگا

نوکروں کو انعام و اکرام سے خوش کریگا۔ ہمایوں کے پاس جب سوار یہ خبر لایا تو اُس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ دائیں بائیں دیکھا۔ کچھ نہ پایا۔ آخر یاد آیا۔ کہ کمر میں ایک مُشک نافہ ہے۔ اُسے نکال کر توڑا اور ذرا ذرا سا مشک سب کو دے دیا کہ شگون خالی نہ جائے اللہ اللہ تقدیر نے کہا ہوگا کہ دل میلا نہ کیجو۔ اس بچے کی شمیم اقبال مُشک کی طرح تمام عالم میں پھیلیگی۔ ولادت کی تاریخ ہوئی ؎ ع شب یکشنبہ و پنج رجب است ۹۴۹ھ ہجری بے سامان بچے کو جس طرح خدا نے تمام سامان ملک و دولت کے دئیے۔ اُسی طرح ولادت کے وقت ستاروں کو بھی اس نظام کے ساتھ ہر ایک برُج میں واقع کیا کہ آج تک نجومی حیران ہوتے ہیں۔ ہمایوں خود ہیئت اور نجوم کا ماہر تھا۔ وہ اس کے زائچے[۱] کو اکثر دیکھا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ کئی باتوں میں امیر تیمور سے بھی زیادہ مبارک ہے +

اکبر ابھی حمل میں تھا۔ اور میر شمس الدین محمد کی بی بی بھی حاملہ تھیں۔ بیگم نے اُن سے وعدہ کیا تھا۔ کہ میرے ہاں بچہ ہوگا تو تمہارا دُودھ اُسے دُونگی۔ اتفاق یہ کہ جب اکبر پیدا ہوا۔ تو اُن کے ہاں ابھی کچھ نہ ہُوا تھا۔ بیگم نے پہلے آپ دودھ پلایا۔ پھر اُن کے دودھ نہ رہا تو بعض بعض اور بیبیاں بھی دودھ پلاتی رہیں۔ چند روز کے بعد جب ان کے

[۱] اکبر کے طالع کے وقت میں ہند کے جوتشی اور یونان کے منجم اختلاف کرتے ہیں۔ ایک کہتے ہیں اسد ہے ایک کہتے ہیں سنبلہ ہے۔ جب میر فتح اللہ شیرازی آئے تو انہیں دونوں زائچے دکھائے۔ وہ ہیئت اور نجوم میں مہارت کُلّی رکھتے تھے دونوں کو دیکھ کر کہا کہ منجمانِ ہند بموجب تحقیق قدما کے فلک البروج کی حرکت کو نہیں مانتے۔ اہل یونان میں حکمائے متقدمین از ارسطو نے متحرک مانا ہے۔ ابرخس حکیم متحرک مانتا ہے مگر مقدار حرکت کچھ نہیں لکھتا۔ بطلیموس نے لکھا ہے کہ سو برس میں ایک درجہ حرکت کرتا ہے ۔ ۳۶ ہزار سال میں دورہ تمام کرتا ہے۔ اکثر حکما کہتے ہیں کہ ۷۰ برس میں ایک درجہ ۲۵ ہزار دو سو برس میں دَورہ پورا کرتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ۶۳ برس میں ایک درجہ یعنی ۲۲ ہزار ۶ سو ۸۰ برس میں دورہ کرتا ہے۔ ان حسابوں سے اس وقت تک ۱۷ درجے کا فرق ہوگیا کیونکہ ہندی رسد ۱۱۹۰ برس پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ ۱۱۹۰ کو ۷۰ پر تقسیم کیا تو ۱۷ نکلے پس معلوم ہوا کہ ۱۷ درجے کا فرق ہونا چاہئے غرض میر موصوف نے بھی رسد جدید کے بموجب اسد ہی طالع قرار دیا اور کہا کہ سنبلہ ۱۷ درجہ اپنی جگہ سے حرکت کر گیا ہوگا اور اسد طلوع ہوگیا ہوگا + ہمایوں کو علم ہیئت میں مہارت کامل تھی۔ بیٹے کا زائچہ سامنے رکھکر اکثر دیکھا کرتا تھا اور سوچتا تھا مصاحبان خاص کا بیان ہے بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ دیکھتے دیکھتے اُٹھ کھڑا ہوتا تھا حجرے کا دروازہ بند کر دیتا تالیاں بجا کر اُچھلتا اور مارے خوشی کے چکر پھیریاں لیا کرتا تھا اور یہ تو اکثر کہا کرتا تھا کہ اس بچے کا زائچہ کئی باتوں میں امیر تیمور صاحبقران کے زائچے پر فائق ہے +

ہاں بچہ ہُوا تو انہوں نے دودھ پلایا۔ اور زیادہ تر انہیں کا دودھ پیا۔ یہی سبب ہے کہ اکبر انہیں جیجی کہا کرتا تھا +

اکبر میں بہت سی باتیں تھیں کہ دُور بینی کی عینک اور دور اندیشی کی آنکھیں اُسے دکھاتی تھیں۔ بہت سے کارنامے تھے کہ اُس کی جرأت اور ہمت کے جوش اُنہیں سرانجام دیتے تھے۔ اکثر چغتائی مؤرخوں نے اُنہیں پیشین گوئی اور کرامات کے رنگ میں جلوہ دیا ہے۔ وہ لوگ اس کے وفاپرست نمک خوار تھے اور ایشیائی انشا پردازی اُن پر گرم مصالح آزاد سب باتوں کو تسلیم نہیں کرسکتا۔ البتہ اتنی بات ہے کہ ایسے بااقبال اور نیک نیت لوگوں میں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ عام لوگوں میں نہیں ہوتیں۔ ان میں سے چند حکایتیں نقل کرتا ہوں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ انہیں سچ سمجھو۔ جو بات واقعی ہے اور دل کو لگتی ہے۔ خود معلوم ہو جاتی ہے۔ دکھانا یہ منظور ہے کہ اُس زمانے میں ایسی ایسی باتیں بادشاہوں کی طرف منسوب کرتے اور فخر سمجھتے تھے +

جیجی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ اکبر نے کئی دن دودھ نہ پیا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ جیجی نے جادو کر دیا ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ اور کوئی دُودھ نہ پلائے۔ جیجی کو اس بات کا بڑا رنج تھا۔ ایک دن اکیلی اکبر کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اور غم سے افسردہ تھی۔ بچہ چُپکا اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ یکایک بولا کہ جیجی۔ غم نہ کھاؤ۔ دودھ تمہارا ہی پیونگا۔ اور خبردار اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ جیجی حیران ہوئی۔ اور ڈر کے مارے کسی سے نہ کہا +

جب اکبر بادشاہ ہُوا تو ایک دن شکارگاہ میں شکار کھیلتے کھیلتے تھک کر درخت کے نیچے اُتر پڑا کہ آرام لے۔ اُس وقت فقط کوکہ[1] یوسف محمد خاں پاس تھا۔ ایک بڑا اژدہا کہ جس کے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا۔ نکلا۔ اور اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ اکبر بے خطر جھپٹا اُس کی دُم پکڑ کر کھینچی۔ اور پٹخ پٹخ کر مار ڈالا۔ کوکہ حیران ہُوا۔ اور آکر یہ ماجرا ماں سے بیان کیا۔ اُس وقت جیجی نے وہ راز سربستہ بھی کھولا +

---

[1] جس بچے کی ماں کا دودھ دیتے تھے وہ بچہ شاہزادے یا امیرزادے کا کوکہ کہلاتا تھا اُسکی اور اُسکے رشتہ داروں کی بڑی خاطر ہُوا کرتی تھی۔ اور اُن کا حق سلطنت میں شریک ہوتا تھا۔ بچہ مذکور کو کوکلتاش خاں خطاب ملتا تھا اکبر نے دودھ تو آٹھ دس بیبیوں کا پیا تھا مگر بڑی حقدار ان میں ماہم بیگم اور جیجی یعنی میر شمس الدین محمد خاں کی بیوی شمار ہوتی تھیں +

جب اکبر کی ماں حاملہ تھی، تو ایک دن بیٹھی سی رہی تھی۔ یکایک کچھ خیال آیا سُوئی
سے پنڈلی کو گودا۔ اور اُس میں سُرمہ بھرنے لگی۔ ہمایوں باہر سے آگیا۔ پوچھا۔ بیگم یہ کیا
کرتی ہو؟ اُس نے کہا میرا جی چاہا کہ ایسا ہی گُل میرے بچّے کے پاؤں میں بھی ہو
خدا کی قدرت دیکھو۔ اکبر پیدا ہؤا تو اس کی پنڈلی میں بھی ویسا ہی سُرمئی نشان تھا

ہمایوں سندھ کے ملک میں مدت تک لڑتا بھڑتا رہا کہ شاید قسمت یاوری
کرے۔ اور ایسی صورت بن جائے کہ پھر ہندوستان پر فوج کشی کرنے کا سامان بہم پہنچ
جائے۔ لیکن نہ تدبیر چلی نہ شمشیر۔ اسی عرصے میں بیرم خاں آن پہنچے۔ اُنہوں نے آکر
سب حال سُنے اور صورت حال کو دیکھ کر دربار میں گفتگو اور خلوت میں صلاحیں ہوئیں۔
بیرم خاں نے کہا کہ ان بے مروتوں سے ہرگز اُمید نہیں۔ اور مروت کریں تو اس ریگستان
میں کیا خاک ہے جو کچھ ہاتھ آئے۔ ہمایوں نے کہا۔ بہتر ہے کہ اب ہندوستان کو خیرباد
کہیں اور ملک موروثی میں چل کر قسمت آزمائیں۔ بیرم خاں نے کہا کہ اُس ملک سے بادشاہ
مغفور نے کیا پایا جو حضور کو حاصل ہوگا۔ ایران کو چلیں تو قرین مصلحت ہے۔ وہ میرا
اور میرے بزرگوں کا ملک ہے۔ کیا شاہ کیا فقیر سب مہمان نواز ہیں۔ غلام وہاں کے رسم و
راہ سے واقف ہے۔ اور حضور کے خاندان عالی نے بھی وہاں سے ہمیشہ مبارک اور کامیابی
کے شگون پائے ہیں +

ہمایوں نے ملک سندھ سے ڈیرے اُٹھائے۔ ایران کا ارادہ فسخ نہ کیا
تھا مگر یہ خیال تھا کہ جیسا سفر دُور دراز کا ہے ویسے ہی کامیابی کی اُمید بھی دُور دراز
ہے۔ فی الحال بولان کی گھاٹی سے نکل کر قندھار کو دیکھنا چاہیے کہ قریب ہے۔ وہاں
سے مشہد کا رستہ بھی روشن ہے۔ بلخ و بخارا کی راہ بھی جاری ہے۔ عسکری مرزا
اس وقت قندھار میں حکومت کر رہا ہے۔ مَیں اس قدر حادثے اُٹھا کر آیا ہوں۔
عیال کا ساتھ ہے۔ آخر بھائی ہے۔ جیتا خون کب تک ٹھنڈا رہے گا۔ کچھ بھی حق نہ
سمجھا تو مہمانی ترکانہ کہیں نہیں گئی۔ چند روز رہ کر اُس کا اور نمک خوارانِ قدیم کا رنگ
دیکھوں گا بوئے وفا نہ پاؤں گا تو جدھر منہ اُٹھے گا چلا جاؤں گا کہ خلق خدا ملک خدا +

شہر یار بے شہر اور بادشاہ بے لشکر اِن خیالات میں غلطاں و پیچاں۔ غم غلط
کرتا کوہ و دشت کو دیکھتا چلا جاتا تھا۔ ایک منزل میں ڈیرے ڈالے پڑا تھا کسی

آکر خبر دی کہ فلاں شخص کامران کا وکیل سندھ جاتا ہے شاہ حسین ارغون کی بیٹی سے کامران کے بیٹے کی نسبت کا پیام لے کر چلا ہے۔ اور اس وقت قلعہ سیوی[1] میں اُترا ہوا ہے۔ ہمایوں نے ایک ملازم کے ہاتھ شُقّہ بھیج کر اُسے بُلایا۔ وہ بے وفا قلعے کا استحکام کر کے بیٹھ رہا۔ اور جواب میں کہلا بھیجا۔ کہ اہل قلعہ مجھے آنے نہیں دیتے ہمایوں کو رنج ہوا +

اسی عالم میں شال[2] کے قریب پہنچا۔ مرزا عسکری کو بھی خبر پہنچ گئی تھی بے مروّت بھائی نے خانہ برباد بھائی کی آمد سُن کر ایک سردار کو بھیج دیا تھا کہ حالات معلوم کر کے لکھتا رہے۔ اِدھر سے ہمایوں نے بھی دو ملازموں کو روانہ کیا تھا۔ وہ سردار مذکور کو رستے میں مل گئے۔ اُس نااہل نے فوراً دونوں کو گرفتار کر کے قندھار کو روانہ کیا۔ اور جو احوال معلوم ہوا وہ لکھ بھیجا۔ ان میں سے ایک وفادار نے موقع پایا۔ وہ بھاگ کر پھر ہمایوں کے پاس آیا۔ اور جو کچھ وہاں سُنا تھا۔ اور دیکھ کر قرینوں سے سمجھا تھا سب بیان کیا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ حضور کے آنے کی خبر سُن کر مرزا عسکری بہت گھبرایا ہے۔ قلعہ قندھار کی مورچہ بندی شروع کر دی ہے۔ بھائی کی بے مہری اور لوگوں کی بے حیائی اور بیوفائی دیکھ کر ہمایوں کی اُمید ٹوٹ گئی۔ اور مُشتنگ کی طرف باگیں پھیریں پھر بھی ایک محبت نامہ مفصل لکھا جس کا القاب یہ تھا:۔

برادر بے مہر بے ارادت معلوم نمایند۔ اس میں محبت اور اپنایت کے لہو کو بھی بہت گرمایا تھا۔ اور نصیحتوں اور نیک صلاحوں کے خریطے بھرے تھے۔ مگر کان کہاں جو سُنیں اور دل کہاں جو مانے؟

یہ خط دیکھ کر مرزا کے سر پر اور بھی شیطان چڑھا۔ رفیقوں کو لے کر چلا۔ کہ بے خبر پہنچ کر ہمایوں کو قید کر لے۔ موقع نہ پائے تو کہے کہ استقبال کو آیا ہوں غرض نور کا تڑکا تھا کہ سوار ہوا۔ اور پوچھا کہ اِدھر دامنِ کوہ کا رستہ کون جانتا ہے۔ جی بہادر ایک اُزبک پہلے ہمایوں کے وفاداروں کا نوکر تھا۔ تباہی کے عالم میں مرزا عسکری کے

---

[1] یہ وہی مقام ہے جو آج کل سیبی کے نام سے مشہور ہے +

[2] یہ مقام قندھار سے گیارہ کوس ورے ہے +

پاس نوکری کر لی تھی۔ اُس وقت نمک کی تاثیر چمک اُٹھی اور ہمایوں کی حالت نے اُس کے دل میں غائبانہ رحم پیدا کیا۔ اُس نے عرض کی۔ مَیں جانتا ہوں اور کئی دفعہ آیا گیا ہوں۔ مرزا نے کہا سچ کہتا ہے۔ ادھر اس کی جاگیر تھی۔ اچھا آگے آگے چل۔ اُس نے کہا میرا یابو کام نہیں دیتا۔ مرزا نے ایک نوکر سے گھوڑا دلوا دیا۔ چی بہادر نے تھوڑی دُور آگے چل کر گھوڑا اُڑایا اور سیدھا بیرم خاں کے خیمے میں آیا۔ کان میں کہا۔ کہ مرزا آن پہنچا ہے۔ اب فرصت کا وقت نہیں۔ اور مَیں قدرتی اتفاق سے اس طرح پہنچا ہوں۔ بیرم خاں نے اُسی وقت چُپ چاپ اُٹھ کر خیمے کے پیچھے سے ہمایوں کے پاس آیا اور حال بیان کیا۔ سوا اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ ایران کا ارادہ مصمم کریں۔ تردی بیگ کے پاس آدمی بھیجا۔ کہ چند گھوڑے بھیج دو۔ اس نااہل بے مروّت نے صاف جواب دیا۔ ہمایوں کو خدا یاد آیا کہ بھائیوں کا یہ حال۔ نمک خواروں اور ہمراہیوں کا یہ حال۔ جودھ پور کے رستے کی بیوفائی اور بے حیائی بھی یاد آگئی۔ چاہا کہ اُسی وقت خود جائے۔ اور اس کو حد کو پہنچائے۔ بیرم خاں نے عرض کی۔ کہ وقت تنگ ہے۔ بات کی بھی گنجائش نہیں۔ آپ ان کافر نعمتوں کو قہر الٰہی کے حوالے کریں اور جلد سوار ہوں۔ اکبر اُس وقت پورا برس دن کا بھی نہیں ہؤا تھا۔ اُسے میر غزنوی[1] اور خواجہ سرا وغیرہ اور ماہم انکہ کے سپرد کر کے یہیں چھوڑا۔ بیگم تو جان کے ساتھ تھیں۔ وفاداروں سے کہا کہ مرزا کا خدا نگہبان ہے۔ ہم آگے چلتے ہیں بیگم کو کسی طرح تم ہم تک پہنچا دو۔ آپ مخلصانِ جان نثار کے ساتھ دشتِ غربت کو روانہ ہؤا۔ پیچھے بیگم بھی آن ملیں۔ مؤرخ کہتے ہیں کہ اس شکستہ حال قافلہ میں نوکر چاکر مل کر ۷۰ آدمی سے زیادہ نہ تھے۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ رات نے آنکھوں کے آگے سیاہ پردہ تان دیا۔ — خیال یہ تھا کہ ایسا نہ ہو بے مہر بھائی تعاقب کرے۔ بیرم خاں نے کہا مرزا عسکری اگرچہ شہزادہ ہے۔ مگر پیسے کا غلام ہے۔ اس وقت خاطر جمع سے بیٹھا ہوگا۔ دو منشی اِدھر اُدھر ہوں گے اور اسباب و اجناس کی فہرست لکھوا رہا ہوگا۔ اگر ہم خدا پر توکل کر کے اس وقت جا پڑیں تو باندھ ہی لیں۔ جب مرزا بیچ میں نہ رہا تو نوکر نمک خوار ہیں سب حاضر ہو کر سلام کرینگے۔ بادشاہ نے کہا کہ صلاح تو بہت ٹھیک ہے

[1] یہی میر غزنوی جو اکبر کی بادشاہت میں خان اعظم میر شمس الدین محمد اتکہ خاں ہوئے ٭

مگر ایک ارادہ کر لیا۔ اور دور دراز عرصہ سامنے ہے چلے ہی چلو۔

اب ادھر کی سنو مرزا عسکری جب مشتنگ کے پاس پہنچے تو اپنے صدر اعظم کو بھیجا۔ ہمایوں کو جعلسازی کے پیغاموں سے باتوں میں لگائے۔ مگر مکاری کامیاب نہ ہوئی۔ ہمایوں روانہ ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی ایک گروہ کثیر پہنچا۔ پھٹے پرانے خیمے کھڑے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے نوکر چاکر پڑے تھے۔ اُنہیں آ کر گھیر لیا۔ کہ کوئی آدمی اُردو سے نکلنے نہ پائے۔ پیچھے مرزا عسکری پہنچے۔ چچی بہادر کا پہنچنا اور ہمایوں کی روانگی کا حال صدر اعظم سے مفصل سُنا۔ بے وارثے قافلے کو پڑا دیکھ کر اپنی بدنیتی پر بہت پچتایا۔ تردی بیگ سب کو لے کر سلام کو حاضر ہوئے۔ مگر سب میں یہ بھی نظر بند ہو گئے۔ میر غزنوی سے پوچھا کہ مرزا اکبر کہاں ہیں۔ عرض کی۔ گھر میں ہیں۔ چچا نے ایک اونٹ میوے کا بھتیجے کے لئے بھیجا۔ اتنے میں رات ہو گئی۔ مرزا عسکری بیٹھے اور جو بات خانخاناں نے وہاں کی تھی اُس کی تصویر کھینچ گئی۔ کہ ایک دو منشیوں کو لے کر اسباب ضبطی کی فہرست لکھوانے لگے۔ صبح کو سوار ہوئے۔ اور نقارہ بجاتے ہمایوں کے اُردو میں داخل ہو کر چھوٹے بڑے سب کو گرفتار کر لیا۔ تردی بیگ صندوق دار تھے کفایت شعاری کے انعام میں شکنجہ پر سوار کئے گئے۔ بہت آدمی ان کے ماتحت ہوئے۔ اور جو جمع کیا تھا دام دام ادا کر دیا۔ اکثر بے گناہ مارے گئے۔ بہت باندھے گئے۔ سب لوٹے گئے۔ ہمایوں کا غصہ اتنی سزا ہرگز نہ دے سکتا جو مرزا عسکری کے ہاتھوں سے مل گئی۔

بے رحم چچا ڈیوڑھی پر آیا کہ بھتیجے سے ملوں گا۔ یہاں رات قیامت کی رات گزری تھی۔ سب کے دل دھکڑ دھکڑ کرتے تھے۔ کہ ماں باپ اُس حال سے گئے ہم ان پہاڑوں میں بے سروسامان پڑے ہیں۔ بے مروت چچا ہے اور معصوم بچے کی جان ہے۔ اللہ ہی نگہبان ہے۔ میر غزنوی اور ماہم آنکہ اکبر کو کندھے سے لگائے سامنے آئی۔ منافق چچا نے گود میں لے لیا۔ اور زہر خند ہنسی سے بول چال کر چاہا کہ بچہ ہنسے بولے۔ مگر اکبر کے لبوں پر تبسم بھی نہ آیا۔ چپ کا منہ دیکھا کیا۔ کینہ ور چچا نے مکدر ہو کر کہا۔ میدانم فرزند کیست۔ با ما چگونہ شگفتہ شود۔ مرزا عسکری کے گلے میں ایک انگوٹھی سُرخ ریشم کی ڈوری میں تھی۔ لال لچھا باہر نظر آتا تھا۔ اکبر نے اس پر ہاتھ

بڑھایا۔ بارے چچا نے اپنے گلے سے اُتار کر بھتیجے کے گلے میں ڈال دی۔ دل شکستہ ہواخواہوں نے کہا۔ کیا عجب ہے خدا ایک دن اسی طرح سلطنت کی انگوٹھی اس نونہال کی انگلی میں پہنا دے +

غرض جو کچھ مرزا عسکری کے ہاتھ آیا۔ لوٹا گھسوٹا۔ اور اکبر کو بھی اپنے ساتھ قندھار لے گیا۔ قلعے کے اندر ایک بالاخانہ رہنے کو دیا۔ اور سلطان بیگم اپنی بی بی کے سپرد کیا۔ بیگم بڑی محبت و شفقت سے پیش آتی تھی خدا کی شان دیکھو۔ باپ کے جانی دشمن۔ بیٹے کے حق میں ماں باپ ہو گئے۔ ماہم اور جیجی اندر اور میر غزنوی باہر خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ یا عنبر خواجہ سرا تھا کہ اکبری اقبال کے دور میں اعتماد خاں ہو کر بڑا صاحبِ اختیار ہوا +

ترکوں میں رسم ہے کہ بچہ جب پاؤں چلنے لگتا ہے۔ تو باپ دادا چچا وغیرہ میں سے جو بزرگ موجود ہو۔ وہ اپنے سر سے عمامہ اُتار کر بچے کو چلتے ہوئے مارتا ہے۔ اس طرح کہ بچہ گر پڑے۔ اور اس کی بڑی خوشی سے شادی کرتے ہیں۔ جب اکبر سوا برس کا ہوا۔ اور پاؤں چلنے لگا۔ تو ماہم نے مرزا عسکری سے کہا۔ کہ یہاں تم ہی اس کے باپ کی جگہ ہو۔ اگر یہ رسم ادا ہو جائے تو شفقتِ بزرگانہ سے بعید نہ ہوگا۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ ماہم کا یہ کہنا اور مرزا عسکری کا عمامہ پھینکنا اور اپنا گرنا وہ ساری صورت حال مجھے اب تک یاد ہے۔ انہیں دنوں میں سر کے بال بڑھانے کو باباحسن[1] ابدال کی درگاہ میں لے گئے تھے۔ کہ قندھار میں ہے۔ وہ بھی آج تک مجھے یاد ہے +

جب ہمایوں ایران سے پھرا۔ اور افغانستان میں آمد آمد کا غل ہوا۔ تو مرزا عسکری اور کامران گھبرائے۔ آپس میں دونوں کے نامہ و پیام دوڑنے لگے۔ کامران نے لکھا کہ اکبر کو ہمارے پاس کابل میں بھیج دو۔ مرزا عسکری نے یہاں مشورت کی بعض سرداروں نے کہا بھائی اب پاس آ پہنچا ہے۔ اعزاز و اکرام سے بھتیجے کو بھیج دو۔ اور اسی کو عفو تقصیرات کا وسیلہ قرار دو۔ بعض نے کہا کہ اب صفائی کی گنجائش نہیں رہی۔ مرزا کامران ہی کا کہنا ماننا چاہیئے۔ مرزا عسکری کو بھی یہی مناسب معلوم ہوا۔ اکبر کو سب متعلقوں کے ساتھ کابل بھیج دیا +

---

[1] انہیں باباحسن ابدال کے نام سے راہ پیشاور میں ایک منزل مشہور +

مرزا کامران نے انہیں خانزادہ بیگم اپنی پھوپھی کے گھر میں اُترّوایا۔ اور ان کے کاروبار بھی انہیں کے سپرد کئے۔ دوسرے دن باغ **شہر آرا** میں دربار کیا اور اکبر کو بھی دیکھنے کو بلایا۔ اتفاقاً **شب برات** کا دن تھا۔ دربار خوب آراستہ کیا تھا۔ وہاں رسم ہے کہ بچّے اُس دن چھوٹے چھوٹے نقاروں سے کھیلتے ہیں۔ مرزا ابراہیم اُس کے بیٹے کے لئے رنگین ونگارین نقارہ آیا۔ اس نے لے لیا۔ اکبر بچّہ تھا۔ کیا سمجھتا تھا۔ کہ مَیں کس حال میں ہوں اور یہ کیا وقت ہے۔ اس نے کہا کہ یہ نقارہ مَیں لُونگا۔ مرزا کامران تو پورے حیادار تھے۔ اُنہوں نے بھتیجے کی دلداری کا ذرا خیال نہ کیا۔ کہا کہ اچھا۔ دونوں کُشتی لڑو۔ جو پچھاڑے اسی کا نقارہ۔ یہی خیال کیا ہوگا کہ میرا بیٹا اس سے بڑا ہے۔ مارے گا۔ یہ شرمندہ بھی ہوگا اور چوٹ بھی کھائیگا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ہوتے ہیں۔ وہ نونہال اقبال مند ان باتوں کو ذرا خیال میں نہ لایا۔ جھٹ لڑنے کو آگے بڑھا لپٹ کر گتھم گُتھا ہو گیا۔ اور ایسا بے لاگ اُٹھا کر مارا کہ دربار سے غل اُٹھا۔ کامران کچھ شرمندہ ہؤا۔ اور کچھ اپنے حال کو سوچ کر چُپ رہ گیا۔ کہ آثار اچھے نہیں۔ ادھر والے باغ باغ ہو گئے۔ اور اندر اندر آپس میں کہا کہ اسے کھیل نہ سمجھو۔ یہ باپ کا دمامہ دولت لیا ہے +

جب ہمایوں نے کابل فتح کیا۔ تو اکبر دو برس دو مہینے آٹھ دن کا تھا۔ بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں روشن کیں۔ اور خدا کا شکر بجالایا۔ چند روز کے بعد تجویز ہوئی۔ کہ ختنے کی رسم ادا کی جائے۔ بیگم وغیرہ حرم سرا کی بیبیاں قندھار میں تھیں وہ بھی آئیں۔ اُس وقت عجب تماشا ہؤا۔ ظاہر ہے کہ جب ہمایوں اور اُس کے ساتھ بیگم ایران کو گئے تھے۔ اس وقت اکبر کی کیا بساط تھی۔ دنوں اور مہینوں کا ہوگا۔ اتنی سی جان کیا جانے کہ ماں کون ہے۔ اب جو سواریاں آئیں تو ان سب کو لاکر محل میں بٹھایا۔ اکبر کو بھی لائے۔ اور کہا کہ جاؤ مرزا امّاں کی گود میں جابیٹھو۔ بھولے بھالے بچّے نے پہلے تو بیچ میں کھڑے ہو کر ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر خواہ دانش خداداد کہو۔ خواہ دل کی کشش کہو خواہ لہو کا جوش کہو۔ سیدھا ماں کی گود میں جا بیٹھا۔ ماں برسوں سے بچھڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ گلے سے لگایا۔ اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس عمر میں اُس کی سمجھ اور پہچان پر سب کو بڑی بڑی اُمیدیں ہوئیں +

۹۵۴ھ میں جب کامران پھر باغی ہؤا تو کابل کے اندر تھا۔ اور ہمایوں باہر گھیرے پڑا تھا۔ ایک دن دھاوے کا ارادہ تھا۔ باہر سے گولے برسانے شروع کئے اکثر اشخاص کے گھر اور گھر والے اندر تھے۔ وہ خود ہمایوں کے لشکر میں شامل تھے۔ بے درد کامران نے اُن کے گھر لوٹ لئے۔ ننگ و ناموس برباد کئے۔ ان کے بچوں کو مار مار کر فصیل پر سے پھنکوایا۔ ان کی عورتوں کی چھاتیاں باندھ باندھ کر لٹکایا غضب یہ کیا کہ جس مورچے پر گولوں کا زور تھا۔ پونے پانچ برس کے معصوم بھتیجے کو وہاں بٹھا دیا۔ ماہم نے گود میں دبکا لیا۔ اور ادھر سے پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔ کہ اگر گولہ لگے تو بلا سے۔ پہلے مَیں پیچھے بچہ۔ ہمایوں کے لشکر میں کسی کو اس حال کی خبر نہ تھی۔ یکایک توپ چلتے چلتے بند ہو گئی۔ کبھی مہتاب دکھائی تو رنجک چاٹ گئی۔ کبھی گولہ اُگل دیا۔ سنبل خاں میر آتش بڑا تیز نظر تھا۔ اُس نے غور سے دیکھا تو سامنے آدمی بیٹھا ہؤا معلوم ہؤا۔ دریافت کیا تو یہ حقیقتِ حال معلوم ہوئی۔ **آزاد**۔ یہ کچھ بڑی بات نہیں جب اقبال رفیق حال ہوتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور مجھے تو سردارِ عرب و عجم کا قول نہیں بھولتا الاجلُ حافظکَ تیری اجل ہی محافظ ہے۔ جب تک اس کا وقت نہیں آیا۔ تب تک کسی حربۂ ہلاکت کو تجھ پر اثر نہ کرنے دے گی۔ موت خود اُسے روکیگی اور کہیگی تو ابھی سے اُسے کیونکر ہلاک کرتا ہے یہ تو فلاں وقت پر میرے حصہ میں آنیوالا ہے ✦

جب ۹۶۱ھ ہجری میں ہمایوں نے ہندوستان کی طرف فتح کا نشان کھولا تو اقبال مند بیٹا ساتھ تھا اور ۱۲ برس آٹھ مہینے کی عمر تھی۔ ہمایوں نے لاہور میں مقام کیا امرا کو آگے بڑھایا۔ افغانوں نے نواح جالندھر میں بڑی شکست اُٹھائی سکندر سور نے خوانین افغان اور دلاور پٹھانوں کا اسّی ہزار انبوہ در انبوہ لشکر جمع کیا اور سرہند پر جم کر سدِ سکندر ہو گیا۔ بیرم خاں فوج لے کر آگے بڑھا۔ شہزادے کو سپہ سالار قرار دیا اور مورچے باندھ کر لڑائی ڈالی۔ اسی عرصے میں ہمایوں بھی لاہور سے جا پہنچا۔ ان میدانوں میں اکبر نے ہمت و جراُت کے خوب خوب نشان دکھائے۔ اور آخر یہ معرکہ اُسی کے نام پر فتح ہؤا۔ بیرم خاں نے کلہ مینار[1] یادگار بنایا۔ اور اس مقام کا نام سرمنزل رکھا فتحیاب

[1] شاہان ایشیا کا قدیمی دستور ہے کہ جب لڑائی کا میدان مارتے ہیں تو مقام جنگ میں ایک بلند اور نمودار مقام پر بڑا سا گڑھا کھودتے ہیں باغیوں کے سر کاٹ کر اس میں بھرتے ہیں اُس پر ایک بلند عمارت بشکل منار بناتے ہیں کہ فتح کی یادگار رہے اور دیکھنے والوں کو عبرت ہو اسکو کلہ منار کہتے ہیں

بادشاہ اور ظفریاب شہزادہ کامیابی کے نشان لہراتے دلی میں داخل ہوئے - آپ وہاں بیٹھے - امرا کو اطرافِ ممالک میں ملک گیری کے لئے روانہ کیا - سکندر سور مان کوٹ کے قلعوں کو امن کا گنبد سمجھ کر پہاڑ کے دامنوں میں دبک بیٹھا تھا - اور وقت کا منتظر تھا کہ جب ہوائے اقبال آئے - ابر کی طرح پہاڑ سے اُٹھے اور پنجاب پر چھا جائے - ہمایوں نے شاہ ابو المعالی کو صوبہ پنجاب دیا - اور چند امرائے جنگ آزمودہ کو ساتھ کیا کہ فوجیں لے کر ہمراہ ہوں - وہ جب آئے تو سکندر افواجِ شاہی کی ٹکر نہ اُٹھا سکا - اس لئے پہاڑوں میں گھس گیا - شاہ ابو المعالی لاہور میں آئے - کہ قدیم الایام سے شاہ نشین شہر ہے - یہاں شاہی فرمانروائی کی شان دکھائی - جو امراء مدد کو آئے تھے - یا پہلے سے پنجاب میں تھے اُن کے رتبے اور علاقے خاص بادشاہ کے دئے ہوئے تھے - شاہ ابو المعالی کے دماغ میں شاہی کی ہوا بھری ہوئی تھی - اُن کی جاگیروں کو پھوڑا توڑا - بلکہ پرگنات خالصہ میں تصرف کیا اور خزانے میں بھی ہاتھ ڈالا - یہ شکائتیں دربار میں پہنچ ہی رہی تھیں کہ سکندر نے بھی زور پکڑنا شروع کیا - اس وقت ہمایوں کو بندوبست مناسب کرنا واجب ہوا چنانچہ ملکِ پنجاب اکبر کے نام کر دیا اور بیرم خاں کو اُس کا اتالیق کر کے اُدھر روانہ کیا +

جب اکبر آیا تو شاہ ابو المعالی نے سلطان پور[1] کنار بیاس تک پیشوائی کی - اکبر نے بھی باپ کی آنکھ کا لحاظ کر کے بیٹھنے کی اجازت دی - مگر شاہ جب اپنے ڈیروں میں گئے تو شکایت سے لبریز ہو گئے - اور اکبر کو کہلا بھیجا - کہ جو عنایت بادشاہ مجھ پر فرماتے ہیں سب کو معلوم ہے - آپ کو بھی یاد ہو گا - کہ

[1] اب اسے سلطان پور ڈھیریاں کہتے ہیں ویران پڑا ہے اور کوسوں تک عماراتِ عالیشان کے کھنڈر چلے جاتے ہیں - کپڑے کے رنگ میں مشہور ہے یہاں کی آب و ہوا میں قدرتی تاثیر ہے - پرانی وضع کی چھینٹیں اب تک چھپتی ہیں - کوئی صاحبِ ہمت کاریگروں کی دستگیری کرنے والا ہو تو اب بھی دستکاری دکھانے کو حاضر ہیں - تاریخ فرشتہ میں بھی اُس کے مصنف نے اس شہر کا حال اور آبادی کی رونق دکھائی ہے مصنف مذکور عہد مذکور و عہد جہانگیری میں عادل شاہ کی طرف سے خود وکیل ہو کر آیا تھا جہانگیر اس وقت لاہور میں تھا اور شہر مذکور شاہراہ کے سرے پر تھا اور کثرت آبادی اور عماراتِ عالی سے گلزار ہو رہا تھا ایک زمانے میں دولت خاں لودھی کا دار الحکومت تھا +

جوئے[1] شاہی کے شکار میں مجھے ساتھ کھانے کو بٹھایا۔ اور تم کو اُلش بھیجا۔ اور ایسا اکثر ہوا ہے۔ پھر کیا بات ہے کہ آپ نے میرے بیٹھنے کو نمدِ تکیہ الگ بچھوایا۔ اور دسترخوان بھی الگ تجویز کیا۔ اکبر کی بارہ تیرہ برس کی عمر تھی۔ مگر رہا نہ گیا۔ اور کہا تعجب ہے، میر کو اب تک نسبتوں کی کیفیت کا امتیاز نہیں۔ آئین سلطنت کا اور عالم ہے۔ اور شفقت و محبت کا دستور کچھ اور ہے ✦

خانخاناں نے اکبر کو ساتھ لیا۔ اور دریائے لشکر کو پہاڑ پر چڑھا دیا۔ سکندر نے جب طوفان آتا دیکھا تو قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ لڑائی جاری تھی۔ بہادروں کی تلواریں لہو سے کارناموں کی تصویریں کھینچتی تھیں کہ برسات آگئی۔ پہاڑ میں یہ موسم بہت دق کرتا ہے۔ اکبر پیچھے ہٹ کر ہوشیار پور کے میدانوں میں اُتر آیا۔ اور اِدھر اُدھر شکار میں دل بہلانے لگا ✦

ہمایوں دلّی میں بیٹھا آرام اور مُلک کے انتظام میں مصروف تھا۔ کہ دفعتہً کتاب خانے کے کوٹھے پر سے گر پڑا۔ جاننے والے جان گئے کہ گھڑی ساعت کا مہمان ہے۔ نیم جاں کو اُٹھا کر محل میں لے گئے۔ اُسی وقت اکبر کو عرضی کی اور یہاں ظاہر کیا کہ چوٹ سخت آئی ہے۔ اور ضعف زور پر ہے۔ اس لئے باہر نہیں نکلتے۔ خاص خاص مصاحب اندر جاتے تھے۔ اور کوئی سلام کو بھی نہ جاتا تھا۔ باہر یہ صورت کہ کبھی دواخانے سے دوا جاتی ہے۔ کبھی باورچی خانے سے مرغ کا شوربہ۔ دمبدم خبر آتی ہے کہ اب طبیعت بحال ہے۔ اور اس وقت ذرا ضعف زیادہ ہے۔ اور وہ اندر ہی اندر بہشت میں پہنچ گئے ✦

حکمتِ عملی۔ دربار میں شکیبی شاعر تھا کہ قد و قامت۔ صورت شکل میں ہمایوں سے بہت مشابہ تھا۔ کئی دفعہ اسے بادشاہ کے کپڑے پہنا کر محل سرا کے

---

[1] جوئے شاہی وہی مقام ہے جو راہ پشاور و کابل میں اب جلال آباد کہلاتا ہے۔ ہمایوں نے علاقہ مذکور بچپن ہی میں اکبر کے نام کر دیا تھا۔ اہل تاریخ کہتے ہیں کہ اسی سال سے اس کی سرسبزی اور پیداوار میں ترقی ہونے لگی۔ جب اکبر بادشاہ ہوا تو اس کی آبادی اور تعمیر بڑھا کر جلال آباد نام رکھا تھا۔ کتب قدیمہ میں اس علاقہ کا نام ننگِ نہار لکھا ہوا نظر آتا تھا ✦

کوٹھے پر سے اہلِ دربار کو دکھایا۔ اور کہا کہ ابھی حضور کو باہر آنے کی طاقت نہیں۔ دیوان عام کے میدان سے مجرا کر کے رخصت ہو۔ جب اکبر تخت نشین ہوا۔ اور سب طرف فرمان جاری ہو گئے۔ تب بادشاہ کے مرنے کا حال ظاہر کیا۔ سبب یہی تھا۔ کہ اُس زمانے میں بغاوت اور بدعملی کا ہو جانا ایک بات تھی۔ خصوصاً ایسے موقع پر کہ سلطنت کے قدم بھی نہ ٹکے تھے۔ اور ہندوستان افغانوں کی کثرت سے افغانستان ہو رہا تھا۔

اِدھر جس وقت ہرکارے نے آکے خبر دی۔ اکبر کے ڈیرے اُس وقت بڈھانے کے مقام پر تھے۔ سپہ سالار نے آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ **کلانور** کو پھرا۔ جو اَب علاقہ گورداسپور میں ہے۔ ساتھ ہی نذر شیخ چولی ہمایوں کا مراسلہ لے کر پہنچا جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:۔

۷ ربیع الاوّل کو ہم مسجد کے کوٹھے سے کہ دولت خانے کے پاس ہے۔ اُترتے تھے۔ سیڑھیوں میں اذان کی آواز کان میں آئی۔ بہ مقتضائے ادب زینے میں بیٹھ گئے مؤذن اذان کو پورا کیا تو اُٹھے کہ اُتریں۔ اتفاقاً عصا کا سر اقبا کے دامن میں اٹکا۔ ایسا بے طور پاؤں پڑا کہ نیچے گر پڑے۔ پتھر کی سیڑھیاں تھیں۔ کان کے نیچے کگر کی ٹکر لگی۔ کچھ لہو کی بوندیں ٹپکیں۔ تھوڑی دیر بیہوشی رہی۔ ہوش بجا ہوئے۔ تو ہم دولت خانہ میں گئے۔ الحمدُ للہ خیر ہے۔ اصلاً وہم کو دل میں راہ نہ دینا۔ فقط۔

برابر ہی خبر پہنچی کہ ۱۵ ر کو ہمارے ہمایوں نے عالمِ قدس کو پرواز کی۔

خانخاناں نے امرا کو جمع کر کے جلسہ کیا۔ اور بموجب اتفاق رائے کے جمعہ کے دن ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ ہجری نماز کے بعد تیموری تاج نے اکبری اقبال کے رنگ میں جلوہ دکھایا۔ اُس وقت اُس کی عمر شمسی حساب سے تیرہ برس نو مہینے کی اور قمری حساب سے ۱۴ برس کئی مہینے کی تھی۔ بموجب آئینِ چنگیزی و تیموری کے تمام رسمیں جشنِ شاہانہ کی ادا ہوئیں۔ بہار نے پھول برسائے۔ آسمان نے تارے اُتارے۔ اقبال نے خبر سُنکر سر پر سایہ کیا۔ اُمرا کے منصب بڑھے۔ خلعت انعام۔ جاگیریں تقسیم ہوئیں۔ فرمان جاری کئے۔ اکبر بموجب باپ کی وصیت کے خانخاناں کی بہت عزت و عظمت کرتا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ اُس کی جاں نثاریاں جو سخت خطرناک معرکوں میں خصوصاً سفر ایران پر ظہور

میں آئی تھیں وہ ہر وقت اُس کی سفارش کرتی تھیں۔ چنانچہ اب اتالیقی و سپہ سالاری کے منصب پر وکیل مطلق کا عہدہ زیادہ کیا ❖

اس موقع پر کہ ہمایوں[1] کا ہمائے روح دفعتہً پرواز کر گیا۔ اور اکبر کے سر پر ہمائے سلطنت نے سایہ ڈالا۔ شاہ ابوالمعالی کی نیت بگڑی۔ خانخاناں جس کے دسترخوان پر ۳۰۰ ہزار شمشیری بہادر پلاؤ کی قابیں گھسیٹیں۔ اس کے نزدیک شاہ کا پکڑ لینا کیا بڑی بات تھی۔ ذرا اشارہ کرتا خیمے میں گھس کر باندھ لاتے۔ مگر تلوار ضرور چلتی۔ خون بھی بہتے۔ اور یہاں ابھی معاملہ نازک تھا۔ لشکر میں ہل چل پڑ جاتی۔ خدا جانے نزدیک و دور کیا کیا ہوائیاں اُڑتیں۔ جو چوہے گمنامی کے بِلوں میں جا بیٹھے تھے پھر شیر بن بن کر نکل آتے۔ اس لئے سوچا اور بہت مناسب سوچا کہ حکمت عملی سے اُسے قابو میں کر لینگے۔ کُشت و خون سے کیا حاصل ❖

جب دربار تخت نشینی منعقد ہُوا تھا۔ تو شاہ ابوالمعالی اس میں شامل نہ ہوئے تھے۔ اور پہلے بھی اُن کی طرف سے کھٹکا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہُوا کہ وہ اپنے خیمے میں بیٹھے فرزندی کے دعوؤں سے بلند پروازیاں کرتے ہیں۔ اور خوشامدی ہم جنس اور اُنہیں آسمان پر اُڑاتے ہیں۔ بیرم خاں نے اُمراء سے مشورت کی۔ اور تیسرے دن دربار سے پیغام بھیجا کہ بعض مہمات سلطنت میں مصلحت درپیش ہے۔ ارکانِ دولت حاضر ہیں۔ بے تمہارے صلاح ناتمام ہے تھوڑی دیر کے لئے تشریف لانا مناسب ہے۔ پھر حضرت سے رخصت ہو کر لاہور کو روانہ ہو جاؤ ❖

وہ غرور کی شراب میں بدمست تھا۔ اور خدا جانے کیا کیا خیال باندھ رہا تھا۔ کہلا بھیجا کہ صاحب مَیں شاہ غفران پناہ کے غم میں ہوں۔ مجھے ان باتوں کا ہوش نہیں۔ مَیں نے ابھی سوگ بھی نہیں اُتارا۔ اور بالفرض اگر مَیں آیا تو نئے بادشاہ مراتب اعزاز میں کس طرح پیش آئیں گے؟ نشست کہاں قرار پائی ہے۔ امرا مجھ سے کس طرح پیش آئیں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔ طول طویل تقریریں اور حیلے حوالے کہلا بھیجے۔ خیر یہاں تو یہ مطلب تھا کہ ایک دفعہ وہ دربار تک آ جائیں۔ جو جو اُنہوں نے کہا سب بے عذر منظور ہُوا۔ اور وہ

[1] ہمایوں نے پہلے دس برس۔ دوسری دفعہ ۱۰ مہینے سلطنت کی ❖

تشریف لائے اور بعض امورات سلطنت میں گفتگو ہوئی ٭

اسی عرصے میں دستر خوان بچھا۔ شاہ صاحب نے سلابچی پر ہاتھ بڑھائے۔ تولک خاں قوجیں افسر توپ خانہ اُن دنوں خوب بھسند بنا ہُوا تھا۔ بے خبر پیچھے سے آیا۔ اور شاہ کی مُشکیں کس لیں۔ شاہ تڑپ کر اپنی تلوار کی طرف پھرے جس سپاہی زادہ کے پاس تلوار رہتی تھی اُسے پہلے ہی کھسکا دیا تھا۔ غرض کہ شاہ قید ہو گئے۔ بیرم خاں کا ارادہ قتل کا تھا۔ مگر پہلا رحم اکبر کا جو ظاہر ہُوا یہی تھا کہ اُس نے کہا۔ جان کھونی کیا ضرورت قید کر دو۔ چنانچہ پہلوان گُل گز کوتوال کے حوالے کیا۔ شاہ نے بڑی کرامات دکھائی۔ سب کی آنکھوں میں خاک ڈالی اور قید سے بھاگ گئے۔ پہلوان بیچارا عزت کا مارا زہر کھا کر مر گیا ٭

سال اوّل جلوس میں کل اشیائے سوداگری پر سے محصول کا بند کھول دیا۔ کئی برس تک سلطنت کے کاروبار اپنے ہاتھ میں نہیں لئے اس لئے پُوری پُوری تعمیل نہیں ہوئی مگر اس کی نیّت نے جوہر دکھا دیا۔ جب اپنا کام آپ کرنے لگا۔ تو تجویز کو پورا کیا۔ اُس وقت بھی اہل کاروں نے سمجھایا کہ ملک ہند ہے۔ اس کی یہ رقم ایک ولایت کا خرچ ہے مگر اُس دریا دل نے ایک نہ سُنی اور کہا جب خلق خدا کی جیب کتر کر توڑے بھرے تو اس خزانے پر بھی حیف ہے ٭

اکبری لشکر سکندر کو دبائے پہاڑوں میں لئے جاتا تھا۔ برسات کا موسم آ ہی گیا تھا۔ مینہ کی فوج بادلوں کے دَل گلے۔ اور شفق کی رنگا رنگ وردیاں پہن کر موجودات دینے آئی۔ انہوں نے غنیم کو پتھروں کے حوالے کیا اور آپ جالندھر میں آ کر چھاؤنی ڈالی۔ مینہ کی بہاریں دیکھ رہے تھے اور غنیم کا رستہ روکے ہوئے تھے۔ کہ سر نکالنے نہ پائے۔ اکبر بھی شکار کھیلتے تھے۔ نیزہ بازی۔ چوگان بازی۔ تیر اندازی کرتے تھے۔ ہاتھی لڑاتے تھے۔ خان بابا سلطنت کے بندوبستوں میں تھے۔ جو یکایک خبر پہنچی کہ ہیموں بقال نے آگرہ لے کر دلّی مار لی۔ اور تردی بیگ وہاں کا حاکم بھاگا چلا آتا ہے ٭

ہیموں بقال۔ اس کی اصل و نسل اور ترقی کا مفصل حال دوسری جگہ لکھا جائیگا۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ اُس نے افغانی اقبال کی آندھیوں میں ترقی کی پرواز کی تھی جو سردار بادشاہی کے دعویدار۔ اور اُس کے بڑھانے اور دھاووں کے میدان چڑھانیوالے

تھے وہ آپس میں کٹ کٹ کر مر گئے۔ بنی بنائی فوج اور بادشاہی خزانے اُس کے قبضے میں آگئے۔ ملک دل میں خیالات کی نسل پھیلنی شروع ہوئی۔ اسی عرصے میں ہمایوں کو مرگِ ناگہانی پیش آئی۔ ہیموں کے دماغ میں جو اُمید نے انڈے بچے دئے تھے اُنھوں نے سلطنت کے پروبال نکالے۔ سمجھا کہ ۱۴ برس کا لڑکا تخت پر ہے۔ وہ بھی سکندر سور کے ساتھ پہاڑوں میں اُلجھا ہوا ہے۔ صاحب ہمت بقال نے میدانِ خیال میں اپنے حال کی موجودات لی۔ افغانوں کے انبوہِ بےحساب گرد نظر آئے۔ کئی بادشاہوں کی کمائی۔ خزانے اور سلطنت کے کارخانے ہاتھ کے نیچے معلوم ہوئے۔ تجربے نے کان میں کہا۔ کہ اب تک جدھر ہاتھ ڈالا ہے۔ پورا پڑا ہے۔ بابر کے دن یہاں رہا۔ ہمایوں کے رات یہاں رہا۔ اس لڑکے کی بنیاد کیا ہے۔ غرض جس لشکر کو لیے، قدرتی موقع کی اُمید پر تیار کر رہا تھا۔ اُسے اپنی ذاتی لیاقت سے ترتیب دے کر روانہ ہوا۔ آگرے میں اکبر کی طرف سے سکندر خاں حاکم تھا۔ اُس کے ہوش غنیم کی آمد آمد ہی میں اُڑ گئے۔ آگرے جیسا مقام۔ بداقبال سکندر کو دیکھو کہ بے جنگ قلعہ خالی کر کے بھاگا۔ اب ہیموں کب تھمتا تھا۔ دبائے چلا آیا۔ رستے میں دل شکستہ سکندر اُلٹ کر اُڑا۔ مگر کئی ہزار سپاہیوں کو قتل۔ قید اور دریا میں غرق کروایا اور پھر بھاگ نکلا۔ ہیموں کا حوصلہ اور زیادہ ہوا۔ اور طوفان کی طرح دلّی کا رُخ کیا۔ بڑے بڑے جتھے والے افغان۔ جنگی تجربہ کار اور جنگ کے بھاری سامان۔ ۵۰ ہزار فوج جرار پٹھان۔ اور راجپوت میواتی وغیرہ کی۔ ہزار ہاتھی۔ ۵۱ توپ قلعہ شکن۔ پانسو گھڑنال اور شترنال زنبورک ساتھ تھے۔ اس دریا نے جگہ سے جنبش کی۔ اور جہاں جہاں چغتائی حاکم بیٹھے تھے سب کو رولتا ہوا دلّی پر آیا۔ اور خوش آیا کہ اُس وقت وہاں تردی بیگ حاکم تھا۔ جس کی ضعف تدبیر اور بےہمتی کے کارناموں کی اُسے بھی خبر تھی +

تردی بیگ کو جب یہ خبر پہنچی۔ تو ایک عرضی اکبر کو لکھی اور امرائے بادشاہی جو نزدیک و دور تھے۔ اُنھیں خطوط روانہ کئے۔ کہ جلد حاضر اور جنگ میں شامل ہو۔ باوجود اس کے آپ کچھ بند و بست نہ کیا۔ جب غنیم کے لشکر کی شان اور ساز و سامان کی خبریں دھوم دھام سے اُڑیں۔ تو مشورے کا جلسہ کر کے گفتگو شروع کی۔ بعض کی صلاح ہوئی کہ قلعہ بند ہو کر بیٹھے رہو۔ اور لشکر بادشاہی کا انتظار کرو۔ اس عرصے میں

حسب موقع پاؤ نکل کر شب خون مارو۔ اور ترکانہ حملے بھی کرتے رہو۔ بعض کی صلاح ہوئی کہ پیچھے ہٹو اور بادشاہی لشکر کے ساتھ آکر مقابلہ کرو۔ بعض کی صلاح ہوئی کہ علی قلی خاں بھی سنبھل سے آتا ہے اُس کا انتظار کرو کہ زبردست سپہ سالار ہے۔ دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔ یہاں تک کہ غنیم لڑائی کے پلّے پر آگیا۔ اور کوئی پہلو نہ رہا۔ مگر یہ کہ نکلیں اور لڑ مریں +

چنانچہ فوجیں لے کر بڑھے۔ اور تغلق آباد[1] پر میدان جنگ قرار پایا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اکبری اقبال یہاں بھی کام کر گیا تھا۔ مگر خواہ تردی بیگ کی بے ہمتی نے۔ خواہ اُس کی قضا نے مارا ہوا میدان ہاتھ سے کھو دیا۔ خان زمان برق کے گھوڑے پر سوار آیا تھا مگر میرٹھ میں پہنچا تھا کہ یہاں کام تمام ہو گیا۔ اس لڑائی کا تماشہ دیکھنے کے قابل ہے +

جس وقت دونوں لشکر صفیں باندھ کر میدان میں جمے۔ تو آئین جنگ کے بموجب امرائے شاہی آگا پیچھا۔ دایاں۔ بایاں سنبھال کر کھڑے ہوئے تردی بیگ قلب میں قائم ہوئے۔ مُلّا پیر محمد کہ لشکر بادشاہی سے ضروری احکام لے کر آئے تھے پہلو میں جم گئے۔ ادھر ہیموں بھی لڑائی کا مشتاق ہو گیا تھا اور پرانے پرانے جنگ آزمودہ افغان اُس کے ساتھ تھے۔ اُس نے بھی اپنے گرد فوج کا قلعہ باندھا۔ اور مقابل ہوا +

لڑائی شروع ہوئی۔ پہلے توپ و تفنگ کے گولوں نے لڑائی کے پیغام پہنچائے۔ نیزوں کی زبانیں جنبش میں آئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں لشکر شاہی کا ہراول اور داہنا ہاتھ آگے بڑھا۔ اور اس زور سے ٹکر ماری کہ اپنے سامنے کے حریفوں کو اُلٹ کر پھینک دیا۔ وہ گڑگانوے کی طرف بھاگے۔ اور یہ اُنہیں ریلتے دھکیلتے پیچھے ہوئے۔ ہیموں اپنے فدائیوں کی فوج اور تین سو ہاتھی کا حلقہ لئے کھڑا تھا۔ کہ اسی کا اُسے بڑا گھمنڈ تھا۔ اور دیکھ رہا تھا کہ اب ترک کیا کرتے ہیں۔ ادھر تردی بیگ بھی منتظر تھے کہ آدھا میدان تو مار لیا ہے۔ آگے کیا کرنا چاہئے۔ اس انتظار میں کئی گھنٹے گزر گئے۔ اور جو فوج فتحیاب ہوئی تھی۔ وہ مارا مار کرتی ہوڈل پلول تک جا پہنچی۔

---

[1] تغلق آباد دہلی سے قریب سات کوس کے ہے +

آخر تردی بیگ سوچ میں رہے اور جو اُنہیں کرنا چاہئے تھا وہ اُس نے کیا۔ کہ اُن پر دھاوا کر دیا۔ اور بڑے پیچ سے کیا۔ جو فوج شاہی اس کی فوج کو مارتی ہوئی گئی تھی اس کے گرد وپیش سوار دوڑا دئے۔ اور کہا۔ کہتے چلے جاؤ کہ اور سے حاجی خاں افغان ہیموں کی مدد کو پہنچا۔ اور تردی بیگ کو بھگا دیا۔ مگر حاجی خاں بھی اسی راستے پھرا آتا ہے کیونکہ جانتا ہے۔ ترک دغاباز ہوتے ہیں۔ مبادا بھاگ کر پلٹ پڑیں +

اِدھر تو وہ چکمہ چلا۔ اِدھر تردی بیگ پر حملہ کیا جو بے وقوف باوجود کامیابی کے چپ چاپ کھڑا تھا۔ اور ہیموں اب حملہ نہ کرتا تو وہ احمق تھا۔ کہ حریف کی بے ہمتی کھُلی نظر آتی تھی۔ اور آگا اور ایک بازد اُس کا صاف میدان۔ غضب یہ ہوُا ۔ کہ تردی بیگ کے قدم اُکھڑ گئے۔ اور ہزار غضب یہ کہ رفیقوں کی ہمت نے بھی دغا کی۔ خصوصاً مُلّا پیر محمد کہ حریف کی آمد کو دیکھتے ہی ایسے بھاگ نکلے۔ گویا اسی ساعت کے منتظر تھے۔ لڑائی کا قاعدہ ہے کہ ایک کے پاؤں اُکھڑے اور سب کے اُکھڑے۔ خدا جانے اصل معاملہ کیا ہو۔ کہتے ہیں کہ خانخاناں کی تردی بیگ سے کھٹکی ہوئی تھی۔ مُلّا اِن دنوں میں خانخاناں کے رفیق خاص الخاص بنے ہوئے تھے۔ اور اُس نے اسی غرض سے انہیں بھیجا تھا۔ خان خانان! اگر ایسا کیا تو حیف ہے تمہاری اُس دانائی اور ذہن کی رسائی پر جو ایسی باریکیوں کی تلاش میں خرچ ہوئی +

فتحیاب حملہ آور جو ہودل پٹول سے سرداروں کے سر اور لوٹ کے مال باندھے پھرے تو پریشان خبریں سُنتے حیران چلے آتے تھے۔ شام کو مقام پر پہنچے تو دیکھتے ہیں جہاں تردی بیگ کو چھوڑا تھا۔ وہاں حریف کا لشکر اُترا ہوُا تھا۔ چُپ رہ گئے۔ کہ کیا ہوُا؟ فتح کی تھی۔ شکست بن گئی۔ چپ چاپ دِلّی کے برابر سے آہستہ آہستہ نکل کر پنجاب کی طرف چلے +

ادھر فتح یاب جب تغلق آباد تک پہنچ گیا تو اس سے کب رہا جاتا تھا۔ دوسرے ہی دن ہیموں دلّی میں داخل ہوئے۔ دلّی عجب مقام ہے! کون سا سر ہے کہ ہوائے حکومت رکھے اور وہاں پہنچ کر تخت پر بیٹھنے کی ہوس نہ کرے۔ اُس ہمت والے نے فقط جشن اور راجہ مہاراجہ کے خطاب پر قناعت نہ کی بلکہ بکرماجیت کے خطاب کو نام کا تاج کیا۔ اور سچ ہے۔ دلّی جیتی۔ بکرماجیت کیوں نہ ہوں +

دلّی لے کر اُس کا دل ایک سے ہزار ہو گیا تھا۔ تردی بیگ کی بے ہمتی کو آئندہ کی روئداد کا نمونہ سمجھا۔ اور سامنے میدان کُھلا نظر آیا۔ وہ جانتا تھا کہ خان خاناں نوجوان بادشاہ کو لئے سکندر کے ساتھ پہاڑوں میں پھنسا ہوا ہے۔ اس لئے دلّی میں ایک دم ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا۔ بڑھے گھمنڈ کے ساتھ پانی پت پر فوج روانہ کی اکبر جالندھر میں چھاؤنی ڈالے مینہ کے تماشے دیکھ رہا تھا۔ یکایک خبر پہنچی کہ ہیموں بقال عدلی کا سپہ سالار امرائے شاہی کو سامنے سے ہٹاتا۔ منزلوں کے ورق اُلٹتا چلا آتا ہے۔ کہ آگرے سے سکندر خاں اُزبک بھاگا۔ ساتھ ہی سُنا کہ غنیم نے تردی بیگ کو توڑ کر دلّی بھی مار لی۔ ابھی باپ کا سایہ سر پر سے اُٹھا۔ ابھی یہ شکستِ عظیم پیش آئی۔ اس پر ایسے سخت غنیم سے سامنا! افسردہ ہو گیا۔ اور لشکر میں خبریں برابر پہنچ رہی ہیں۔ کہ فلاں امیر چلا آتا ہے۔ فلاں سردار بھی بھاگا آتا ہے۔ ساتھ ہی خبر آئی کہ علی قلی خاں میدان جنگ میں نہ پہنچ سکا تھا وہ جمنا پار تھا کہ دلّی کی مہم طے ہو گئی۔ دو تخت گاہیں ہاتھ سے نکل گئیں۔ لشکر میں کھلبلی پڑ گئی۔ اور شیر شاہی معرکے یاد آ گئے۔ امرا نے آپس میں کہا کہ موقع بے ڈھب آن پڑا ہے۔ بہتر ہے۔ کہ کابل کو اُٹھ چلیں۔ سال آئندہ میں سامان کر کے آئینگے اور غنیم کو دفع کریں گے۔

خان خاناں نے جب یہ رنگ دیکھا۔ تو خلوت میں اکبر سے سارا حال عرض کیا اور کہا کہ حضور کچھ فکر نہ کریں۔ یہ بے مروّت بے ہمّت جان کو عزیز کر کے ناحق حوصلہ ہارتے ہیں۔ آپ کے اقبال سے سب سرانجام و انتظام ہو جائیگا۔ فدوی جلسۂ مشورت کر کے اُنہیں بُلاتا ہے۔ فقط حضور کا دستِ اقبال میری پشت پر چاہیئے چنانچہ امرا بلائے گئے۔ اُنہوں نے وہی تقریریں ادا کیں۔ خان خاناں نے کہا۔ ایک برس کا ذکر ہے۔ جو شاہِ جنت مکان کی رکاب میں ہم تم آئے۔ اور اس ملک کو سر سواری مار لیا۔ اِس وقت لشکر۔ خزانہ۔ سامان جس پہلو سے دیکھو پہلے سے زیادہ ہے ہاں! کمی ہے تو یہ ہے کہ وہ شاہ نہیں۔ پھر بھی خدا کا شکر کرو۔ اگرچہ ہما نظر نہیں آتا مگر اُس کا سایہ سر پر موجود ہے۔ یہ معاملہ کیا ہے! جو ہم ہمت ہاریں۔ کیا اس واسطے کہ اپنی جانیں پیاری ہیں۔ کیا اس واسطے کہ بادشاہ ہمارا نوجوان لڑکا

ہے؟ افسوس ہے ہمارے حال پر کہ جس کے بزرگوں کا ہم نے اور ہمارے باپ دادا نے نمک کھایا ہے۔ ایسے نازک وقت میں اس سے جانیں عزیز کریں۔ اور وہ ملک جس پر اس کے باپ اور دادا نے تلواریں مار کر۔ ہزار جان جوکھوں اُٹھا کر قبضہ پایا تھا۔ اُسے مفت غنیم کے حوالے کر کے چلے جائیں۔ جبکہ ہمارے پاس کچھ سامان نہ تھا اور سامنے دو پُشت کے دعویدار افغان تھے۔ وہ تو کچھ نہ کر سکے۔ یہ ۱۶ برس کا مرا ہُوا اکبر ما جیت آج کیا کرے گا۔ برائے خدا ہمّت نہ ہارو۔ اور ذرا خیال کرو۔ عزّت اور آبرو کو تو یہاں چھوڑا۔ جانیں لے کر نکل گئے تو منہ کس مُلک میں دکھائینگے۔ سب کہینگے کہ بادشاہ تو لڑکا تھا۔ تم کہنہ عمل کہن سال سپاہیوں کو کیا ہُوا تھا۔ مار نہ سکتے تھے تو مر ہی گئے ہوتے +

یہ تقریر سُن کر سب چُپ ہو گئے۔ اور اکبر نے امرائے دربار کی طرف دیکھ کر کہا کہ دشمن سر پر آ پہنچا۔ کابل بہت دُور ہے۔ اُڑ کر بھی جاؤ گے تو نہ پہنچ سکو گے اور میرے دل کی بات تو یہ ہے کہ اب ہندوستان کے ساتھ سر لگا ہُوا ہے۔ جو ہو سو یہیں ہو۔ یا تخت یا تختہ۔ دیکھو خان بابا! شاہ مغفرت پناہ نے بھی سب کاروبار کا اختیار تمہیں دیا تھا۔ مَیں تمہیں اپنے سر کی اور اُن کی روح کی قسم دے کر کہتا ہوں۔ کہ جو مناسب وقت اور مصلحتِ دولت دیکھو۔ اُسی طرح کرو۔ دشمنوں کی کچھ پرواہ نہ کرو۔ مَیں نے تمہیں اختیار دیا +

یہ سُن کر امرا چُپ ہو گئے۔ خان بابا نے فوراً تقریر کا رنگ بدلا۔ بڑی اولوالعزمی اور بلند نظری سے سب کے دل بڑھائے۔ اور دوستانہ مصلحتوں کے ساتھ نشیب و فراز دکھا کر متفق کیا۔ امرائے اطراف کو اور جو شکستہ حال دلّی سے شکست کھا کر آئے تھے۔ ان کے نام دلدہی اور دلاسے کے فرمان جاری کر کے لکھا کہ تم بہ اطمینان تھانیسر کے مقام پر آ کر ٹھیرو۔ ہم خود لشکرِ منصور کو لئے آتے ہیں۔ غرض عید قربان کی نماز جالندھر کی عیدگاہ میں پڑھی اور مبارکباد لے کر پیش خیمہ دلّی کی طرف روانہ ہُوا +

فال مبارک۔ سلاطینِ سلف میں بہت سے شغل تھے کہ شغل ہائے شاہانہ سمجھے جاتے تھے۔ اُن ہی میں مصوّری تھی۔ ہمایوں کو تصویر کا بہت شوق تھا۔

اکبر کو حکم دیا تھا کہ تم بھی سیکھا کرو۔ جب سکندر کی مہم فتح ہو چکی (ہیموں کی بغاوت کا ابھی ذکر فکر بھی نہیں تھا) اکبر ایک دن تصویر خانے میں بیٹھا تھا، مُرقع کُھلے تھے۔ مصوّر حاضر تھے۔ ہر شخص اپنی دست کاری میں مصروف تھا۔ اکبر نے ایک تصویر کھینچی۔ کہ گویا ایک شخص کا سر۔ ہاتھ۔ پاؤں الگ الگ کٹے پڑے ہیں کسی نے عرض کی۔ حضور یہ کس کی تصویر ہے؟ کہا ہیموں کی +

لیکن اسے شہزادہ مزاجی کہتے ہیں۔ کہ جب جالندھر سے چلنے لگے۔ تو میر آتش نے چاہا۔ کہ عید کی مبارک بادی میں آتش بازی کی سیر دکھائے۔ اُنہوں نے اس میں یہ بھی فرمائش کی کہ ہیموں کی مورت بناؤ اور راون کی طرح آگ دے کر اُڑاؤ۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی۔ اچھّا۔

	نہ بر رُخ زدن بلکہ شہ رُخ زدن	مبارک بود فال فرخ زدن	

جب اقبال سامنے ہوتا ہے تو وہی منہ سے نکلتا ہے جو ہونا ہوتا ہے انہیں یہ ہی کہو کہ جو مُنہ سے نکلتا ہے۔ وہی ہوتا ہے +

خان خاناں کی لیاقت اور ہمّت کی تعریف میں زبان قلم قاصر ہے۔ مشرقی ہندوستان میں تو یہ تلاطم پڑا ہوا تھا۔ اور سکندر سور جو کہ پہاڑوں میں رُکا بیٹھا تھا دانا سپہ سالار نے اس کے لئے فوج کے بندوبست سے سدِّ سکندر باندھی۔ راجہ رام چندر کانگڑے کا راجہ بھی تیار ہو رہا تھا۔ اُسے ایسا دبدبہ دکھا کر پیغام سلام کئے۔ کہ حسب دلخواہ عہد نامہ لکھ کر حضور میں حاضر ہو گیا +

غرض دلاور سپہ سالار بادشاہ اور بادشاہی لشکر کو ہوا کے گھوڑوں پر اُڑاتا۔ بجلی اور بادل کی کڑک دمک دِکھاتا دلّی کو چلا۔ سرہند کے مقام پر دیکھا۔ کہ بھاگے بھٹکے امیر بھی حاضر ہیں۔ اُن سے ملاقاتیں کر کے صلاح و مشورت کے ساتھ بندوبست شروع کئے۔ لیکن خود مختاری کی تلوار نے اس موقع پر ایسی کاٹ کھائی۔ کہ تمام امرائے بابری میں کھلبلی پڑ گئی۔ پھر بھی کوئی دم نہ مار سکا۔ بلکہ ہر شخص تھرّا کر اپنے اپنے کام پر متوجہ ہو گیا +

آزاد۔ نہ تردی بیگ حاکم دہلی کا قتل تھا۔ یہ ضرور ہے کہ دونوں امیروں کے دلوں میں عداوت کی پھانسیں کھٹک رہی تھیں۔ مگر مؤرخ یہ بھی کہتے ہیں کہ

مصلحت یہی تھی جو تجربہ کار سپہ سالار اُس وقت کر گزرا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر یہ قتل بالکل بے جا ہوتا تو بابری امیر (جن میں ایک ایک اُس کا رابر کا دعویدار تھا) اسی طرح دم بخود نہ رہ جاتے۔ فوراً بگڑ کھڑے ہوتے +

بادشاہ جواں سال تھانیسر کے مقام پر تھا جو سُنا کہ غنیم کا توپ خانہ بہزار منچلے پٹھانوں کے ساتھ پانی پت کے مقام پر آ گیا۔ خان خاناں نے بڑے استقلال کے ساتھ لشکر کے دو حصے کئے۔ ایک کو لے کر شکوہ شاہانہ کے ساتھ خود بادشاہ کی رکاب میں رہا۔ دوسرے میں چند دلاور اور جنگ آزمودہ امیر اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ رکھے۔ اُن پر علی قلی خاں شیبانی کو سپہ سالار کر کے دشمن کے مقابلے پر بطور ہراول روانہ کیا۔ اور اپنی فوج خاص بھی ساتھ کر دی۔ اُس جواں ہمت۔ اور پُرجوش افسر نے برق باد کو پیچھے چھوڑا۔ کرنال پر جا کر مقام کیا۔ اور جاتے ہی ہاتھوں ہاتھ حریفوں سے آتش خانہ چھین لیا +

جب ہیموں نے سُنا کہ آتش خانہ اس بے آبروئی کے ساتھ ہاتھ سے گیا تو دماغ رنجک کی طرح اُڑ گیا۔ دلی سے دھوآں دھار ہو کر اُٹھا۔ بڑی بے پروائی سے پانی پت کے میدان پر آیا۔ اور جتنی جنگی طاقت تھی حوصلے سے نکال کر میدان میں ڈال دی علی قلی خاں کچھ خطر خاطر میں نہ لایا۔ خان خاناں سے مدد بھی نہ مانگی۔ جو فوج اپنے پاس تھی وہی لی اور آ کر حریف سے دست و گریبان ہو گیا۔ پانی پت کے میدان میں رن پڑا۔ اور ایسا بھاری رن پڑا کہ خدا جانے کب تک کتابوں میں یادگار رہیگا۔ جس صبح کو یہ معرکہ ہوا۔ اکبری لشکر میں لڑائی کا کسی کو خیال نہ تھا۔ وہ خاطر جمع سے پچھلی رات رہے کرنال سے چلے اور کچھ دن چڑھا تھا جو ہنستے کھیلتے چند کوس زمین طے کر کے اُتر پڑے۔ رستے کی گرد چہروں سے نہ پونچھی تھی۔ اور میدانِ جنگ یہاں سے ۵ کوس آگے تھا۔ جو ایک سوار تیر کی رفتار پر پہنچا۔ اور خبر دی کہ غنیم سے مقابلہ ہو گیا۔ ۳۰ ہزار فوج اُس کی ہے۔ اکبری جاں نثار فقط ۱۰ ہزار ہیں۔ خان زمان جرأت کر کے لڑ بیٹھا ہے۔ مگر میدان کا طور بے طور ہے +

خان خاناں نے پھر لشکر کو تیاری کا حکم دیا۔ اور اکبر خود اسلحہ جنگ سجنے لگا۔ مگر چہرے سے شگفتگی اور شوقِ جنگ ٹپکتا تھا۔ فکر یا پریشانی کا اثر بھی معلوم نہ

ہوتا تھا۔ وہ مصاحبوں کے ساتھ ہنستا ہُوا سوار ہُوا۔ ہر ایک امیر اپنی اپنی فوج کو لئے کھڑا تھا۔ اور خان خاناں گھوڑا مارے ایک ایک غول کو دیکھتا پھرتا تھا۔ اور سب کے دل بڑھاتا تھا۔ نقارچی کو اشارہ ہُوا۔ اُدھر نقارے پر چوٹ پڑی۔ اکبر نے رکاب کو جنبش دی۔ اور دریائے لشکر بہاؤ میں آیا۔ تھوڑی دُور چل کر خدا جانے آدمی تھا یا فرشتہ سامنے سے گھوڑا مارے آیا۔ ایک شخص نے خبر دی کہ لڑائی فتح ہوگئی۔ کسی کو یقین نہ آیا۔ ابھی میدان جنگ کی سیاہی نمودار نہ ہوئی کہ فتح کے نور اُڑتے نظر آنے لگے۔ جو خبردار آتا تھا مبارک۔ مبارک کہتا ہُوا خاک پر گر پڑتا تھا۔ اب کون تھم سکتا تھا۔ پل کی پل میں گھوڑے اُڑا کر پہنچے +

اتنے میں ہیموں مجروح اور بدحال سامنے حاضر کیا گیا۔ وہ ایسا چُپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا کہ نوجوان بادشاہ کو ترس آیا۔ کچھ پوچھا۔ اُس نے جواب نہ دیا۔ کون کہہ سکے کہ عالم حیرت میں تھا یا ندامت تھی۔ یا ڈر چھا گیا تھا۔ اس لئے بولا نہ جاتا تھا۔ شیخ گدائی کنبوہ کہ خاندان میں مسند معرفت کے بیٹھنے والے۔ اور دربار میں صدر الصدور تھے۔ اُس وقت بولے "پہلا جہاد ہے حضور دستِ مُبارک سے تلوار ماریں کہ جہادِ اکبر ہو۔" بادشاہ نوجوان کو آفرین ہے۔ رحم کھا کر کہا کہ یہ تو آپ مرتا ہے۔ اس کو کیا ماروں! پھر کہا میں تو اُسی دن کام تمام کرچکا جس دن تصویر کھینچی تھی۔ مقامِ جنگ پر کلّہ منار عظیم الشّان بنوا دیا اور دلّی کو روانہ ہوئے ہیموں کی بی بی خزانے کے ہاتھی لے کر بھاگی۔ اکبری لشکر سے حسین خاں اور پیر محمد خاں فوج لے کر پیچھے دوڑے۔ وہ بیوہ بڑھیا کہاں بھاگتی؟ بجواڑے[1] کے جنگل پہاڑوں میں کوادہ گاؤں پر جا کر پکڑا۔ جو دولت تھی۔ بہت تو رستے کے گنواروں کے حصّے کی تھی۔ باقی غازیوں کے ہاتھ آئی۔ وہ بھی اتنی تھی کہ اشرفیاں ڈھالوں میں بھر بھر کر بٹیں۔ جس رستے سے رانی گزری تھی۔ روپے۔ اشرفیاں اور سونے کی اینٹیں گرتی چلی گئی تھیں۔ برسوں تک مسافر رستے میں پایا کرتے تھے۔ خدا کی شان

---

[1] یہ وہ بجواڑہ نہیں جو ضلع ہوشیار پور پنجاب میں ہے۔ بلکہ ایک بجواڑہ بیانہ علاقہ آگرہ میں ہے اور یہاں وہی مراد ہے +

وہی خزانے تھے جو شیر شاہ۔ سلیم شاہ۔ عدلی نے سالہا سال میں جمع کئے تھے۔ اور
خدا جانے کن کن کلیجوں ہاتھ گھنگولے تھے۔ ایسے مال اسی طرح برباد ہوتے ہیں۔

ع بباد آمد وہم بباد ے رود

خواجہ حافظ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہر چہ دل کرد فراہم ہمہ لشِ دیدہ بباخت — الله الله کہ تبہ کرد و کہ اندوختہ بود

بیرم خانی دَور کا خاتمہ اور اکبر کی خود اختیاری

تقریباً ۴ برس تک اکبر کا یہ حال تھا۔ کہ شاہ شطرنج کی طرح مسند پہ بیٹھا تھا
خان خاناں جس چال چاہتا تھا اُسی چال چلتا تھا۔ اور اُسے اس بات کی کچھ پرواہ بھی
نہ تھی۔ نیزہ بازی وچوگان بازی کرتا تھا۔ باز باشے اُڑاتا تھا۔ ہاتھی لڑاتا تھا۔ جاگیر۔
انعام معزولی۔ بحالی کل کارو بارِ سلطنت خان خاناں کے ہاتھ میں تھے۔ اس کے
رشتہ دار ملازم اور متوسّل عمدہ زرخیز اور سرسبز جاگیریں پاتے تھے۔ سامان و
لباس سے خوشحال نظر آتے تھے۔ بادشاہی نمک خوار جو باپ دادا کے عہد سے
خدمتوں کے دعوے رکھتے تھے۔ اُن کی جاگیریں ویران۔ خود پریشان اور شکستہ
حال تھے۔ بلکہ بادشاہ اپنے شوقوں کے لئے بھی خزانہ خالی پاتا تھا۔ اس لئے کبھی کبھی
تنگ ہوتا تھا۔ پندرہ سولہ برس کے لڑکے کی کیا بساط ہوتی ہے۔ علاوہ براں
بچپن سے خان خاناں کی اتالیقی کے نیچے رہا تھا۔ لوگ اُس کی شکایت کرتے تو
چُپ ہو رہتا تھا +

خان خاناں کے اختیارات اور تجویزیں کچھ نئی نہ تھیں۔ ہمایوں کے عہد سے
جاری چلی آتی تھیں۔ مگر اُس وقت عرض معروض کے رستے سے ہوتی تھیں۔ اور
بادشاہ کی زبان سے حکم کا لباس پہن کر نکلتی تھیں۔ البتہ اب وہ بلا واسطہ خان خاناں
کے احکام تھے۔ دوسرے یہ کہ اوّل اوّل سلطنت ملک گیری کی محتاج تھی۔ قدم
قدم پر مشکلوں کے دریا اور پہاڑ سامنے تھے۔ اور اُس کے سرانجام کا حوصلہ
خان خاناں کے سوا ایک کو بھی نہ تھا۔ اب میدان صاف اور دریا پایاب نظر آنے

لگے ۔ اس لئے ہر شخص کو اچھی جاگیر اور عمدہ خدمت مانگنے کا منہ ہو گیا اور اُس کا اور اُس کے متوسّلوں کا فائدہ آنکھوں میں کھٹکنے لگا ٭

خان خاناں کی مخالفت میں کئی امیر تھے ۔ مگر سب سے زیادہ ماہم انکہ اور اُس کا بیٹا آدہم خاں اور چند رشتہ دار تھے ۔ کیا دربار ۔ کیا محل ہر جگہ دخیل تھے ۔ اُن کا بڑا حق سمجھا جاتا تھا ۔ اور واقعی تھا بھی ۔ ماہم نے ماں کی جگہ بیٹھ کر اُسے پالا تھا ۔ اور جب بے درد چچانے معصوم بھتیجے کو توپ کے مہرے پر رکھا تھا تو وہی تھی جو اُسے گود میں لے کر بیٹھی تھی ۔ اُس کا بیٹا ہر وقت پاس رہتا تھا ۔ اندر وہ لگاتی بجھاتی رہتی تھی ۔ اور باہر بیٹا اور اس کے متوسّل ۔ اور حق تو یہ ہے ۔ کہ اس عورت کے تعلقے اور حوصلے نے مردوں کو مات کر دیا تھا ۔ تمام امرائے دربار حد سے زیادہ اس کی عظمت کرتے تھے ۔ اور مادر مادر کہتے منہ سوکھتا تھا ۔ وہ مہینوں اندر ہی اندر جوڑ توڑ کرتی رہی ۔ پرانے خوانین و امرا کو اپنے ساتھ شامل کیا تم خان خاناں کے حال میں دیکھنا ! اس کا جھگڑا بھی مہینوں تک رہا ۔ اس عرصے میں اور اُس کے بعد بھی جو کام خان خاناں دربار میں بیٹھ کر کیا کرتا تھا ۔ ملک داری کے معاملے امرا کے عہدے اور منصب و جاگیر ۔ موقوفی ۔ بحالی کُل کاروبار وہ اندر ہی اندر بیٹھے کرتی ٭

قدرتِ الٰہی کا تماشا دیکھو ۔ کہ سب دل کے ارمان دل ہی میں لے گئی ۔ انّا اور انّا والوں نے سمجھا تھا کہ مکھی کو نکال کر پھینک دینگے اور گھونٹ گھونٹ پی کر ہم دودھ کے مزے لینگے ۔ یعنی خان خاناں کو اُڑا کر اکبر کے پردے میں ہم ہندوستان کی بادشاہت کرینگے ۔ وہ بات نصیب نہ ہوئی ۔ اکبر پردۂ غیب سے اُن لیاقتوں کا مجموعہ بن کر نکلا تھا ۔ جو ہزاروں میں ایک بادشاہ کو نصیب نہ ہوئی ہونگی ۔ اُس نے چند روز میں ساری سلطنت کو انگوٹھی کے نگینے میں دھر لیا ۔ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے ۔ اور دیکھتا کون ؟ جو لوگ خان خاناں کی بربادی پر چھریاں تیز کئے پھرتے تھے برس دن کے اندر باہر اس طرح نابود ہو گئے ۔ گویا قضانے جھاڑو دے کر کوڑا پھینک دیا ۔ خان خاناں کا معاملہ ۹۶۷ھ میں فیصلہ ہوا)

کہنا یہ چاہئے کہ ۹۶۸ھ سے اکبر بادشاہ ہوا ۔ کیونکہ اب اُس نے خود اختیاری

کے ساتھ ملک کے کاروبار سنبھالے۔ یہ وقت اکبر کے لئے نہایت نازک موقع تھا۔ اور مشکلیں اس کی چند در چند تھیں۔ (۱) وہ ایک بے علم اور بے تجربہ نوجوان تھا جس کی عمر ۱۷ برس سے زیادہ نہ تھی۔ بچپن اُن چچاؤں کے پاس بسر ہُوا جو اس کے باپ کے نام کے دشمن تھے۔ لڑکپن کی حد میں آیا تو باز اُڑاتا رہا۔ کُتّے دوڑاتا رہا۔ پڑھنے سے دل کوسوں بھاگتا تھا (۲) لڑکپن کی حد سے نہ بڑھا تھا کہ بادشاہ ہوگیا۔ شکار کھیلتا تھا۔ شیر مارتا تھا۔ مست ہاتھیوں کو لڑاتا تھا۔ جنگلی دیوزادوں کو سدھاتا تھا۔ سلطنت کے کاروبار سب خان بابا کرتے تھے۔ یہ مفت کے بادشاہ تھے۔ (۳) ابھی سارا ہندوستان فتح بھی نہ ہُوا تھا۔ پورب کا ملک شیر شاہی سرکشوں سے افغانستان ہو رہا تھا۔ اور ایک ایک راجہ بکرماجیت اور راجہ بھوج بنا ہُوا تھا۔ سلطنت کا پہاڑ اُس کے سر پر آپڑا اور اُس نے ہاتھوں پر لیا۔ (۴) بیرم خاں ایسا منتظم اور رعب داب والا امیر تھا کہ اُسی کی لیاقت تھی جس نے ہمایوں کا بگڑا ہُوا کام بنایا اور صلاحیّت کے رستے پر لایا۔ اُس کا دفعتہً دربار سے نکل جانا کچھ آسان بات نہ تھی۔ خصوصاً وہ حالت کہ تمام ملک باغیوں سے بھڑوں کا چھتہ ہو رہا تھا۔ (۵) سب سے زیادہ یہ کہ اُن امیروں پر حکم کرنا اور اُن سے کام لینا پڑا جن کی بیوفائی نے ہمایوں کو چھوٹے بھائیوں سے برباد کروادیا۔ وہ دوغلے اور دو رُخے لوگ تھے۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر مشکل تر یہ کہ بیرم خاں کو نکال کر ہر ایک کا دماغ فرعون کا دارالخلافہ ہوگیا تھا۔ نوجوان شہزادہ کسی کی نگاہ میں جچتا نہ تھا۔ ہر شخص اپنے تئیں خود مختار سمجھتا تھا۔ مگر آفرین ہے اُس کی ہمت اور حوصلے کو کہ ایک مشکل کو مشکل نہ سمجھا۔ سخاوت کے ہاتھ سے ہر گرہ کو کھولا۔ جو نہ کھُلی۔ اُسے تیغ شجاعت سے کاٹا۔ اور نیک نیّتی نے ہر ارادے کو پورا اُتارا۔ اقبال کا یہ عالم تھا۔ کہ فتح اور ظفر حکم کی منتظر رہتی تھی۔ جہاں جہاں لشکر جاتے تھے فتح یاب ہوتے تھے۔ اکثر مہموں میں خود اس کڑاک دمک سے یلغار کر کے گیا کہ کہنہ عمل سپاہی اور پُرانے پُرانے سپہ سالار حیران تھے۔

اکبر کی پہلی یلغار

اَدہم خاں پر

مُلک مالوہ میں شیر شاہ کی طرف سے شجاعت خاں عرف شجاول خاں حکمرانی کرتا تھا۔ وہ ۱۲ برس ایک مہینے کی میعاد بسر کر کے دُنیا سے رُخصت ہوا۔ باپ کی مسند پر بازید خاں عرف باز بہادر نے جلوس کیا۔ دو برس دو مہینے عیش وعشرت کے شکار کرتا رہا کہ دفعتہً اقبال اکبری کا شہباز ہوائے مُلک گیری میں بلند پرواز ہوا۔ بیرم خاں نے اس مہم پر بہادر خاں۔ خان زمان کے بھائی کو بھیجا۔ انہیں دنوں میں اس کے اقبال نے رُخ بدلا۔ بہادر خاں مہم کو ناتمام چھوڑ کر طلب ہوا۔ بیرم خاں کی مہم کا فیصلہ کر کے اکبر نے ادھر کا قصد کیا۔ آدہم خاں اور ناصر الملک پیر محمد خاں کے لوہے تیز ہو رہے تھے۔ اُن ہی کو فوجیں دے کر روانہ کیا۔ بادشاہی لشکر فتح یاب ہوا۔ باز بہادر اس طرح اُڑ گیا جیسے آندھی کا کوا۔ اُس کے گھر میں پُرانی سلطنت تھی۔ اور دولت بے قیاس۔ دفینے۔ خزینے۔ توشہ خانے جواہر خانے تمام عجائب ونفائس سے مالامال ہو رہے تھے۔ کئی ہزار ہاتھی تھے۔ عربی وایرانی گھوڑوں سے اصطبل بھرے ہوئے وغیرہ وغیرہ وہ عیش کا بندہ تھا۔ عشرت ونشاط۔ ناچ گانا۔ رات دن رنگ رلیوں میں گزارتا تھا۔ سینکڑوں کنچنیاں۔ کلاونت گائک۔ نائک نوکر تھے۔ کئی سو گائنیں۔ ڈومنیاں۔ پاتریں حرم سرا میں داخل تھیں۔ بے قیاس نعمتیں جو ہاتھ آئیں تو اَدہم خاں مست ہو گئے۔ کچھ ہاتھی ایک عرضداشت کے ساتھ بادشاہ کو بھیج دئے۔ اور آپ وہیں بیٹھ گئے۔ مُلک میں سے علاقے بھی آپ ہی امرا کو تقسیم کر دیئے۔ پیر محمد خاں نے بھی بہت سمجھایا۔ مگر ہوش نہ آیا۔

آدہم خاں کے ماتھے پر ایک پاتر (کنچنی) نے جو کالک کا ٹیکہ دیا۔ ماں کے دودھ سے مُنہ دھوئینگے تو بھی نہ مٹے گا۔ باز بہادر پشتوں سے فرمانروائی کرتا تھا۔

مدتوں سے سلطنت جمی ہوئی تھی۔ عیش کا بندہ تھا۔ اور آرام و بے فکری میں زندگی بسر کرتا تھا۔ اُس کا دربار اور حرم سرا دن رات راجہ اندر کا اکھاڑا تھا۔ اُنہیں میں ایک پاتر ایسی پریزاد تھی۔ جس کے حسن کا باز بہادر دیوانہ بلکہ عالم میں افسانہ تھا۔ رُوپ متی اُس کا نام تھا۔ اُس حسن و جمال پر لطف یہ کہ لطیفہ گوئی۔ حاضر جوابی۔ شاعری۔ گانے بجانے میں بے نظیر نہیں بدر منیر تھی۔ ان خوبیوں اور محبوبیوں کی دھوم سُن کر ادہم خاں بھی لٹو ہو گئے۔ اور پیام بھیجا۔ اُس نے بڑے سوگ اور بروگ کے ساتھ جواب دیا۔ جاؤ خانہ بربادوں کو نہ ستاؤ۔ باز بہادر گیا۔ سب باتیں گئیں۔ اب اس کام سے جی بیزار ہو گیا۔" اِنھوں نے پھر کسی کو بھیجا۔ اُدھر بھی اس کی سہیلیوں نے سمجھایا کہ دلاور بہادر سجیلا جوان ہے۔ سردار ہے۔ سردار زادہ ہے۔ اور انّا کا بیٹا ہے تو اکبر کا ہے کسی اور کا تو نہیں۔ تمہارے حسن کا چاند چمکتا رہے۔ باز گیا تو گیا۔ اُسے چکور بناؤ۔ عورت نے اچھے اچھے مردوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ جیسی صورت کی وضع دار تھی ویسی ہی طبیعت کی بھی وضع دار تھی۔ دل نے گوارا نہ کیا۔ مگر سمجھ گئی کہ اس سے اس طرح چھٹکارا نہ ہو گا۔ قبول کیا۔ اور دو تین دن بیچ میں ڈال کر وصل کا وعدہ کیا۔ جب وہ رات آئی تو سویرے سویرے ہنسی خوشی بن سنور۔ پھول پہن۔ عطر لگا چھپر کھٹ میں گئی۔ اور پاؤں پھیلا کر لیٹ رہی۔ دوپٹہ تان لیا۔ محل والیوں نے جانا کہ رانی جی سوتی ہیں۔ ادہم خاں اُدھر گھڑیاں گن رہے تھے۔ وعدے کا وقت نہ پہنچا تھا کہ جا پہنچے۔ اُسی وقت خلوت ہو گئی۔ لونڈیاں چیریاں یہ کہہ کر سب باہر چلی آئیں۔ کہ رانی جی سُکھ کرتی ہیں۔ یہ خوشی خوشی چھپر کھٹ میں داخل ہوئے کہ اُسے جگائیں۔ جاگے کون؟ وہ تو زہر کھا کر سوئی تھی۔ اور بات کے پیچھے جان کھوئی تھی +

اکبر کو بھی خبر پہنچی۔ سمجھا کہ یہ انداز اچھے نہیں۔ چند جان نثاروں کو ساتھ لے کر گھوڑے اُٹھائے۔ رستے میں کاکرون کا قلعہ ملا کہ ادہم خاں بھی اس پر فوج کشی کر کے آیا چاہتا تھا۔ قلعہ دار ادھر اُدھر کی خبرداری میں تھا۔ یکایک دیکھا کہ اِدھر سے بجلی آن گری۔ کُنجیاں لے کر حاضر ہوا۔ اکبر قلعے میں گیا۔ جو کچھ حاضر تھا نوش فرمایا۔ اور قلعہ دار کو خلعت دے کر منصب بڑھایا +

پھر جو رکاب میں قدم رکھا تو اس سنّاٹے سے گیا کہ ماہم نے بھی قاصد دوڑائے

تھے مگر سب رستے ہی میں رہے۔ یہ دن رات مارامار گئے۔ اور صبح کا وقت تھا کہ اَدہم کے سر پر جا دھمکے اُسے خبر بھی نہ تھی فوج لے کر کاکرون پر چلا تھا۔ چند مصاحب ہنستے بولتے آگے آگے جاتے تھے۔ اُنہوں نے یکایک اکبر کو سامنے سے آتے دیکھا بے اختیار ہوکر گھوڑوں سے زمین پر گر پڑے۔ اور آداب بجالائے۔ آدہم خاں کو بادشاہ کے آنے کا شان گمان بھی نہ تھا۔ اُس نے دُور سے دیکھا حیران ہوا کہ کون آتا ہے جسے دیکھ کر میرے نوکر آداب بجالائے۔ گھوڑے کو ٹھکرا کر آپ آگے بڑھا۔ دیکھا تو آفتاب سامنے ہے۔ ہوش جاتے رہے۔ اُتر کر رکاب پر سر رکھ دیا۔ قدم چُومے۔ بادشاہ ٹھہر گئے۔ امرا اور خوانین قدیمی نمک خوار جو اَدہم کے ساتھ آتے تھے۔ سب کے سلام لئے۔ ایک ایک کو پوچھ کر سب کا دل خوش کیا۔ اگرچہ اَدہم ہی کے گھر میں جاکر اُترے۔ مگر شگفتہ ہوکر بات نہ کی۔ گرد سفر سے آلُودہ تھے۔ توشہ خانے کا صندوق پیچھے تھا۔ کپڑے نہ بدلے۔ ادہم نے لباس کے بُقچے حاضر کئے۔ منظور نہ فرمائے۔ ایک ایک امیر کے آگے روتا جھینکتا پھرا۔ خود بھی بہت ناک گھسنی کی۔ بارے دن بھر کے بعد عرض قبول اور خطا معاف ہوئی۔

حرم سرا کی پُشت پر جو مکان تھا۔ رات کو اُس کے کوٹھے پر آرام کیا۔ اکھڑ جوان (ادہم خاں) کی سرشت میں بدی داخل تھی۔ بدگمانی نے اُس کے کان میں پھونکا کہ بادشاہ جو یہاں اُترے ہیں۔ اس سے میرے ننگ و ناموس پر نظر منظور ہے۔ سرشوری نے صلاح دی کہ جس وقت موقع پائے۔ ماں کے دودھ میں نمک گھولے۔ اور حق نمک کو آگ میں ڈال کر بادشاہ کا کام تمام کر دے۔ نیک نیت بادشاہ کا ادھر خیال بھی نہ تھا۔ خیر جس کا خدا نگہبان ہو اُسے کون مار سکے۔ اُس بے ہمت کی بھی ہمت نہ پڑی۔

دوسرے ہی دن ماہم جا پہنچی۔ بیٹے کو بہت لعنت ملامت کی۔ بادشاہ کے سامنے بھی بہت باتیں بنائیں۔ تمام ضبطی کے نفائس تحائف حضور میں حاضر کئے۔ اور بگڑی ہوئی بات پھر بنالی۔

بادشاہ نے یہاں چار دن مقام کیا۔ ملک کا بندوبست کرتے رہے۔ پانچویں دن روانہ ہوئے۔ شہر سے نکل کر باہر ڈیروں میں اُترے۔ باز بہادر کی عورتوں میں سے کچھ عورتیں پسند آگئی تھیں۔ وہ ساتھ لے لی تھیں۔ ان میں سے دو پر ادہم خاں کی نیت

بگڑی ہوئی تھی۔ ماں کی لونڈیاں۔ ماما ئیں بادشاہ کی حرم سرا میں بھی خدمت کرتی تھیں۔
اُن کی معرفت دونوں پریوں کو اُڑا لیا۔ جانا تھا کہ ہر شخص کوچ کے کاروبار اور اپنے اپنے
حال میں گرفتار ہے۔ کون پوچھیگا۔ کون پیچھا کریگا۔ اکبر کو جب خبر ہوئی تو سمجھ گیا۔ دل
ہی دل میں دق ہوا۔ اسی وقت کوچ ملتوی کر دیا اور چاروں طرف آدمی دوڑائے۔
وہ بھی اِدھر اُدھر سے جستجو کر کے پکڑ ہی لائے۔ ماہم نے سُنا۔ سمجھی کہ جب دونوں عورتیں
سامنے آئیں۔ بھانڈا پھوٹ جائیگا۔ اور بیٹے کے ساتھ میرا بھی منہ کالا ہوگا۔ دونوں
بے گناہوں کو اوپر ہی اوپر مروا ڈالا۔ کٹے ہوئے گلے کیا بولتے۔ اکبر پر بھی راز کھُل گیا۔
مگر لہو کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اور آگرے کو روانہ ہوا۔ اللہ اکبر۔ پہلے ایسا حوصلہ پیدا
کرلے جب کوئی اکبر سا بادشاہ کہلائے۔ آگرے میں آئے اور چند روز کے بعد ادہم خاں
کو بُلا لیا۔ پیر محمد خاں کو علاقہ سپرد کیا۔ یہ اکبر کی پہلی یلغار تھی۔ کہ جس رستے کو شاہانِ سلف
ایک مہینے میں طے کرتے تھے۔ اس نے ہفتے بھر میں طے کیا۔

دُوسری یلغار

خان زمان پر

خان زمان علی قلی خاں نے جونپور وغیرہ اضلاع شرقی میں فتوحات عظیم
حاصل کر کے بہت سے خزانے اور سلطنت کے سامان سمیٹے تھے۔ اور حضور میں
نہ بھیجے تھے۔ شاہم بیگ کے مقدمے میں ابھی اس کی خطا معاف ہو چکی تھی۔
اولوالعزم بادشاہ ادہم خاں سے دلجمعی کر کے آگرے میں آیا۔ آتے ہی توسن ہمت
پر زین رکھا۔ اور سورج مغرب سے مشرق کو چلا

یک جا قرار ہمت عالی نمے کند	گردش ضرورت است سپہر بلند را

بڈھے بڈھے امرا کو رکاب میں لیا۔ وہ خان زمان کو جانتا تھا۔ کہ من چلا بہادر ہے
اور غیرت والا ہے۔ اہل دربار نے اُسے ناحق ناراض کر دیا ہے۔ شاید بگڑ بیٹھا تو بہتر
ہے۔ کہ تلوار درمیان نہ آئے۔ دو کہن سال نمک حلال بیچ میں آ کر باتوں میں کام نکال لینگے

چنانچہ کالپی کے رستے الہ آباد کا رُخ کیا۔ اور اس کڑک دمک سے گڑہ مانک پور جا کھڑا ہؤا۔ کہ خان زمان اور بہادر خاں دونوں ہاتھ باندھ کر پاؤں میں آن پڑے وہاں سے بھی کامیابی اور کامرانی کے ساتھ پھرے۔ بہکانے والوں نے اس کی طرف سے بہت کان بھرے تھے۔ مگر نیک نیت بادشاہ کا قول تھا کہ آدمی ایک نسخہ معجون دواخانہ الٰہی کا ہے مستی و ہوشیاری سے مرکب ہے۔ اسے بہت سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہیئے۔ یہ بھی کہا کرتا تھا۔ کہ امراہرے بھرے درخت ہیں۔ ہمارے لگائے ہوئے ہیں۔ انہیں سرسبز کرنا چاہیئے۔ نہ کاٹنا۔ انسان میں برگزیدہ صفت معافی گناہ ہے۔ جو حضور میں چلا آئے اور ناکام پھر جائے۔ تو اس پر حیف نہیں ہم پر حیف ہے۔ (دیکھو اکبر نامہ کہ اسی مقام پر شیخ ابوالفضل نے کیا لکھا ہے) +

تیر آسمانی اور غیب کی نگہبانی

اکبر کی نیت اور علو ہمت کی باتیں حد تحریر سے باہر ہیں۔ ۹۷۰ھ میں دلّی پہنچے۔ شکارگاہ سے پھرتے ہوئے سلطان نظام الدین اولیا کی زیارت کو گئے۔ وہاں سے رخصت ہوئے۔ ماہم کے مدرسے کے پاس تھے۔ جو معلوم ہؤا کہ کچھ شانے میں لگا دیکھا تو تیر! کہ پوست مال تھا۔ مگر ۱/۴ پار نکل گیا تھا۔ دریافت کیا۔ معلوم ہؤا۔ کہ کسی نے مدرسے کے کوٹھے پر سے مارا ہے۔ ابھی تیر نہ نکلا تھا۔ کہ مجرم کو پکڑ لائے۔ دیکھا کہ فولاد حبشی مرزا شرف الدین حسین کا غلام ہے۔ آقا چند روز پہلے بغاوت کر کے بھاگا تھا۔ جب شاہ ابوالمعالی سے سازش ہوئی تو تین سو آدمی جنہیں اپنی جان نثاری کا بھروسہ تھا اس کے ساتھ گئے تھے۔ آپ مکّہ کا بہانہ کر کے بھاگا پھرتا تھا۔ ان میں سے یہ شب سیاہ اس کام کا بیڑا اُٹھا کر آیا تھا۔ لوگوں نے چاہا۔ فولاد سنگ دل سے پوچھیں کہ یہ حرکت کس کے اشارے سے کی ہے؟ اکبر نے کہا نہ پوچھو۔ غلام روسیاہ خدا جانے کیا کہے۔ اور کن کن جاں نثاروں کی طرف سے شبہ ڈال دے۔ بات نہ کرنے دو اور کام تمام کردو۔ دریادل بادشاہ کے چہرے پر کچھ اضطراب نہ ہؤا۔ اسی طرح گھوڑے پر سوار چلا آیا۔ اور قلعۂ دین پناہ میں داخل

ہوا۔ چند روز میں زخم اچھا ہو گیا۔ اور اسی ہفتے میں سنگھاسن پر بیٹھ کر آگرے کو روانہ ہوئے۔

عجیب اتفاق۔ اکبر کے کتوں میں ایک زرد رنگ کا کتا تھا نہایت خوبصورت۔ اسی واسطے مہوہ اس کا نام رکھا تھا۔ وہ آگرے میں تھا۔ جس دن یہاں تیر لگا۔ اسی دن سے مہوے نے راتب کھانا چھوڑ دیا تھا۔ جب بادشاہ وہاں پہنچے۔ تو میر شکار نے حال عرض کیا۔ اکبر نے اُسے حضور میں منگایا۔ آتے ہی پاؤں میں لوٹ گیا۔ اور نہایت خوشی کی حالتیں دکھائیں۔ اپنے سامنے راتب منگا کر دیا۔ جب اس نے کھایا۔

یہ یلغاریں بابری بلکہ تیموری و چنگیزی خون کے جوش تھے کہ اکبر پر ختم ہو گئے اس کے بعد کسی بادشاہ کے دماغ میں ان باتوں کی بو بھی نہ رہی۔ بنئے تھے کہ گدی پر بیٹھے تھے۔ ان کی قسمتیں لڑتی تھیں۔ اور امرا فوجیں لے کر مرتے پھرتے تھے۔ اس کا کیا سبب سمجھنا چاہئے۔ ہندوستان کی آرام طلب خاک۔ اور باوجود گرمی کے سرد مہر ہوا اور بزدل پانی۔ روپے کی بہتات۔ سامانوں کی کثرت۔ یہاں جو ان کی اولاد ہوئی۔ ایک نئی مخلوق ہوئی۔ انہیں گویا خبر نہ تھی کہ ہمارے باپ دادا کون تھے۔ اور انہوں نے کیوں یہ قلعے۔ یہ ایوان۔ یہ تخت۔ یہ درجے تیار کئے تھے۔ جن پر ہم چڑھے بیٹھے ہیں۔ میرے دوستو! تمہارے ملک کے اہل خاندان جب اپنے تئیں شکوہ و شان کے سامانوں میں پاتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہم خدا کے گھر سے ایسے ہی آئے ہیں۔ اور ایسے ہی رہیں گے۔ جس طرح ہم آنکھ۔ ناک۔ ہاتھ۔ پاؤں لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ سب چیزیں ہمارے ساتھ پیدا ہوئی ہیں۔ ہائے غافل بدنصیبو! تمہیں خبر نہیں۔ کہ تمہارے بزرگوں نے پسینے کی جگہ خون بہا کر اس ڈھلتی پھرتی چھاؤں کو قابو کیا تھا۔ اور اگر اور کچھ نہیں کر سکتے تو جو قبضے میں ہے۔ اسے تو ہاتھ سے جانے نہ دو۔

تیسری یلغار گجرات پر

اکبر نے یلغاریں تو بہت کیں۔ مگر عجیب یلغار وہ تھی۔ جب کہ احمد آباد گجرات میں

خان اعظم اس کا کوکہ گھر گیا۔ اور وہ شتر سوار فوج کو اُڑا کر پہنچا۔ خدا جانے رفیقوں کے دلوں میں ریل کا زور بھر دیا تھا کہ تار برقی کی پھرتی۔ اس سمے کا تماشہ۔ ایک عالم ہوگا۔ دیکھنے کے قابل **آزاد** اس حالت کا فوٹو گراف الفاظ و عبارت کے رنگ و روغن سے کیونکر کھینچ کر دکھائے +

اکبر ایک دن فتح پور میں دربار کر رہا تھا۔ اور اکبری نورتن سے سلطنت کا بازو آراستہ تھا۔ دفعتہً پرچہ لگا کہ حسین مرزا چغتائی شہزادہ ملک مالوہ میں باغی ہوگیا اختیار الملک دکنی کو اپنے ساتھ شریک کیا ہے۔ ملکی باغیوں کی بے شمار جمیعت۔ اور حشری فوج جمع کی ہے۔ دُور دُور تک مُلک مار لیا ہے۔ اور مرزا عزیز کو اس طرح قلعہ بند کیا ہے کہ نہ وہ اندر سے نکل سکے۔ نہ باہر سے کوئی جا سکے۔ مرزا عزیز نے بھی گھبرا کر ادھر اکبر کو عرضیاں۔ ادھر ماں کو خط لکھنے شروع کئے۔ اکبر اسی فکر میں داخل محل سرا ہوا تھا ہاں جی جی[1] نے رونا شروع کر دیا۔ کہ جس طرح ہو میرے بچے کو صحیح سلامت دکھاؤ۔ بادشاہ نے سمجھا۔ کہ سارا لشکر بھیر و بنگاہ سمیت ایسا جلدی کیونکر جا سکیگا۔ اسی وقت محل سے باہر آیا۔ اور اقبال اپنے کام میں مصروف ہوا۔ کئی ہزار کار آزمودہ اور من چلے بہادر روانہ کئے۔ اور کہہ دیا۔ کہ ہر چند ہم تم سے پہلے پہنچیں گے مگر جہاں تک ہو سکے تم بھی اُڑے ہی جاؤ۔ ساتھ ہی رستے کے حاکموں کو لکھا۔ کہ جتنی کوتل سواریاں موجود ہوں۔ تیار کریں۔ اور اپنی اپنی انتخابی فوج سے سرراہ حاضر ہوں۔ خود تین سو جاں نثاروں سے رخانی خاں نے چار پان سو لکھا ہے، کہ تمام نامی سردار اور درباری منصب دار تھے۔ سانڈنیوں پر بیٹھ۔ کوتل گھوڑے اور گھوڑ بہلیں لگا۔ نہ دن دیکھا نہ رات۔ جنگل اور پہاڑ کاٹتا چلا +

غنیم کے تین سو سپاہی سر گنج سے پھرے ہوئے گجرات کو جاتے تھے اکبر نے راجہ سالباہن۔ قادر قلی۔ رنجیت وغیرہ وغیرہ سرداروں کو کہ بال باندھے نشانے اُڑاتے تھے۔ آواز دی کہ لینا۔ اور نہ جانے دینا۔ یہ ہوا کی طرح گئے۔ اور اس صدمے سے حملہ کیا کہ خاک کی طرح اُڑا دیا +

[1] جس کا دودھ پیتے ہیں اسے ترکوں کے بچے جی جی کہا کرتے ہیں +

شگون مبارک - اسی عالم میں شکار بھی ہوتے جاتے تھے۔ ایک جگہ ناشتے کو اُترے۔ کسی کے مُنہ سے نکلا۔ اوہو! کیا ہرن کی ڈار درختوں کی چھاؤں میں بیٹھی ہے بادشاہ نے کہا۔ آؤ شکار کھیلیں۔ ایک کالا ہرن سامنے نکلا۔ اس پر سمند رٹانگ چیتا چھوڑا۔ اور کہا اگر اس نے یہ کالا مار لیا۔ تو جانو کہ غنیم کو مار لیا۔ اقبال کا تماشا دیکھو۔ کہ مار ہی لیا۔ بس پل کے پل ٹھہرے اور روانہ +

غرض ستائیس منزلوں کو لپیٹ دغانی خاں نے لکھا ہے کہ یہ منزلیں جنہیں شاہانِ سلف نے مہینوں میں طے کیا، نویں دن گجرات کے سامنے دریائے ترپتی کے کنارے پر جا کھڑا ہؤا۔ جن امرا کو پہلے روانہ کیا تھا۔ رستے میں ملتے جاتے تھے شرمندہ ہوتے تھے۔ سلام کرتے تھے۔ اور ساتھ ہو لیتے تھے۔ پھر بھی اکثر نبھ نہ سکے۔ پیچھے پیچھے دوڑے آتے تھے +

جب گجرات سامنے آیا تو موجودات لی۔ تین ہزار نامور۔ نشان شاہی کے نیچے مرنے مارنے کو کمر بستہ تھے۔ اس وقت کسی نے تو کہا کہ جو جاں نثار پیچھے رہے ہیں۔ آیا چاہتے ہیں۔ اُن کا انتظار کرنا چاہئے۔ کسی نے کہا۔ شبخون مارنا چاہئے بادشاہ نے کہا کہ انتظار بزدلی - اور شبخون چوری ہے۔ سلاح خانے سے ہتیار بانٹ دئے۔ دائیں بائیں۔ آگے پیچھے فوج کی تقسیم کی۔ مرزا عبدالرحیم یعنی خانخاناں کا بیٹا سولہ برس کا نوجوان تھا۔ اسے سپہ سالاروں کی طرح قلب میں قرار دیا۔ خود سو سوار سے الگ رہے۔ کہ جدھر مدد کی ضرورت ہو اُدھر ہی پہنچیں +

اقبال کی مبارک فال

بادشاہ جب خود سر پر رکھنے لگے۔ تو دیکھا کہ دُبلغہ[1] نہیں۔ رستے میں دُبلغہ اُتار کر راجہ دیپ چندر کو دیا تھا۔ کہ لئے آؤ۔ وہ رستے میں اُترتے چڑھتے کہیں رکھ کر بھول گیا۔ اس وقت جو مانگا تو وہ گھبرایا اور شرمندہ ہؤا۔ فرمایا۔ اوہو۔ کیا خوب

---

[1] دبلغہ خود کے آگے کی طرف ماتھے پر جھجا لگاتے تھے کہ دھوپ اور چھدے سے ٹیمنہ صدموں سے بچا ہوا ہے

شگون ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ کہ سامنا صاف ہے بڑھو آگے +

خاصے کے گھوڑوں میں ایک بادرفتار تھا۔ سر سے پاؤں تک سفید براق جیسے نور کی تصویر۔ اکبر نے اس کا نام نور بیضا رکھا تھا۔ جس وقت اس پر سوار ہوئے گھوڑا بیٹھ گیا۔ سب ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے کہ شگون اچھا نہ ہوا۔ راجہ بھگوان داس (مان سنگھ کے باپ) نے آگے بڑھ کر کہا حضور فتح مبارک۔ اکبر نے کہا۔ سلامت باشید۔ کیوں کر! اُس نے کہا۔ اس رستے میں تین شگون برابر دیکھتا چلا آیا ہوں +

(۱) ہمارے شاستر میں لکھا ہے۔ کہ جب فوج مقابلے کو تیار ہو - اور سیناپتی کا گھوڑا سواری کے وقت بیٹھ جائے۔ تو فتح اسی کی ہوگی +

(۲) ہوا کا رُخ حضور ملاحظہ فرمائیں کہ کس طرح بدل گیا۔ بزرگوں نے لکھ دیا ہے۔ کہ جب ایسی صورت ہو۔ سمجھ لیجئے کہ مہم اپنی ہے +

(۳) رستے میں دیکھتا آیا ہوں کہ گدھ چیلیں۔ کوے برابر لشکر کے ساتھ چلے آتے ہیں۔ اسے بھی بزرگوں نے فتح کی نشانی لکھا ہے +

محبّت کے ناز و نیاز

اکبر بادشاہ قوم کا ترک - مذہب کا مسلمان تھا۔ راجہ یہاں کے ہندی وطن اور ہندو مذہب تھے - اتفاق اور اختلاف کے مقدّمے تو ہزاروں تھے - مگر مَیں اُن میں سے ایک نکتہ لکھتا ہوں - ذرا آپس کے برتاؤ دیکھو اور ان کے دلوں کے حال کا پتہ لگاؤ۔ اسی ہنگامے میں راجہ جے مل (راجہ روپسی کا بیٹا تھا) اکبر کے برابر نکلا۔ اس کا بکتر بہت بھاری تھا۔ اکبر نے سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ اس وقت یہی ہے۔ زرہ وہیں رہ گئی۔ دردخواہ بادشاہ نے اسی وقت بکتر اُتروایا اور اپنے خاصے کی زرہ پہنوا دی۔ وہ سلام کر کے خوش ہوتا ہوا اپنے رفیقوں میں گیا۔ اتنے میں راجہ کرن (مالدیو راجہ جودھپور کے پوتے) کو دیکھا۔ کہ اس کے پاس زرہ بکتر کچھ نہ تھا۔ بادشاہ نے وہی بکتر اسے دے دیا +

جے مل اپنے باپ (روپسی) کے سامنے گیا۔ اس نے پوچھا۔ بکتر کہاں ہے؟ جے مل نے سارا ماجرا سنایا۔ روپسی کی جودھپوریوں سے خاندانی عداوت چلی آتی تھی۔ اسی وقت بادشاہ کے پاس آدمی بھیجا کہ حضور میرا بکتر مرحمت ہو۔ وہ میرے بزرگوں سے چلا آتا ہے۔ اور بڑا مبارک اور فتح نصیب ہے۔ اس وقت بادشاہ کو یاد آیا کہ ان کی خاندانی کھٹک ہے۔ فرمایا۔ کہ خیر ہم نے اسی واسطے خاصے کی زرہ تمہیں دے دی ہے۔ کہ فتح کا تعویذ اور اقبال کا گنڈا ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ روپسی کے دل نے نہ مانا۔ اور تو کچھ ہو نہ سکا۔ اسلحہ جنگ اتار کر پھینک دئے۔ اور کہا۔ خیر میں میدانِ جنگ میں یونہی جاؤں گا۔ اس نازک موقع پر اکبر کو بھی اور کچھ نہ بن آیا۔ کہا۔ خیر ہمارے جاں نثار ننگے لڑیں تو ہم سے بھی نہیں ہو سکتا۔ کہ زرہ بکتر میں چھپ کر میدان میں لڑیں۔ ہم بھی برہنہ تیر و تلوار کے منہ پر جائینگے۔ راجہ بھگوان داس اسی وقت گھوڑا اُڑا کر جے مل کے پاس گئے۔ اسے سمجھایا۔ بہت لعنت ملامت کی۔ اور سمجھا بجھا کر دنیا کے رستے کا نشیب و فراز دکھایا۔ یہ بڈھا خاندان کا ستون تھا۔ اس کا سب لحاظ کرتے تھے۔ اس نے شرمندہ ہو کر پھر ہتیار سجے۔ راجہ بھگوان داس نے آکر عرض کی کہ حضور! روپسی نے بھنگ پی تھی۔ اس کی لہروں نے ترنگ دکھائی تھی۔ اور کچھ بات نہ تھی۔ اکبر سُن کر ہنسنے لگا۔ اور ایسا نازک جھگڑا لطیفہ ہو کر اُڑ گیا +

ایسے ایسے منتروں نے محبت کا طلسم باندھا تھا۔ جو ہر دل پر نقش ہو گیا تھا خاندان کی ریت رسوم۔ مبارک نامبارک بلکہ دین آئین سب برطرف۔ اب جو اکبر کہے وہی ریت رسوم۔ جو اکبر کی خوشی وہی مبارک۔ جو اکبر کہہ دے وہی دین آئین۔ اور اس سے بڑے مطلب نکلتے تھے۔ کیونکہ اگر مذہب کے دلائل سے انہیں سمجھا کر کسی بات پر لانا چاہتے تو سر کٹواتے۔ اور راجپوت کی ذات قیامت تک اپنی بات سے نہ ٹلتی۔ اکبری آئین کا نام لیتے تو جان دینے کو بھی فخر سمجھتے تھے۔ غرض حکم ہوا کہ باگیں اُٹھاؤ۔ خان اعظم کے پاس آصف خاں کو بھیجا۔ کہ ہم آپہنچے۔ تم اندر سے زور دے کر نکلو۔ اُس پر ایسا ڈر چھایا تھا۔ کہ قاصد بھی پہنچے تھے۔ ماں نے بھی خط لکھے تھے۔ اسے بادشاہ کے آنے کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ یہی کہتا تھا کہ

دشمن غالب ہے۔ کیوں کر نکلوں۔ یہ امرائے اطراف میرا دل بڑھانے اور لڑانے کو ہوائیاں اُڑاتے ہیں ؛

احمد آباد تین کوس تھا۔ حکم ہوا کہ چند قراول آگے بڑھ کر ادھر اُدھر بندوقیں سر کریں۔ ساتھ ہی نقارۂ اکبری پر چوٹ پڑی۔ اور گورکھے کی گرج سے گجرات گونج اُٹھا۔ اُس وقت تک بھی غنیم کو اس یلغار کی خبر نہ تھی۔ بندوقوں کی کڑک اور ڈنکے کی آواز سے اُس کے لشکر میں کھلبلی پڑی۔ کسی نے جانا کہ دکن سے ہماری مدد آئی ہے کسی نے کہا۔ کہ کوئی بادشاہی سردار ہوگا۔ دور نزدیک سے خان اعظم کی کمک کو پہنچا ہے حسین مرزا گھبرایا۔ خود گھوڑا مار کر نکلا اور قراولی کرتا ہوا آیا۔ کہ دیکھوں کون آتا ہے۔ دریا کے کنارے پر آکھڑا ہوا۔ ابھی تڑکا تڑکا تھا۔ سبحان قلی ترکمان (بیرم خانی جوان تھا) یہ بھی پار اُتر کر میدان دیکھتا پھرتا تھا۔ حسین مرزا نے اسے آواز دی۔ بہادر[1] دریا کے پار یہ کس کا لشکر ہے۔ اور سرلشکر کون ہے؟ اس نے کہا "لشکر بادشاہی اور شہنشاہ آپ سرلشکر" پوچھا کون شہنشاہ؟ وہ بولا اکبر شہنشاہ غازی۔ جلدی جا ان ادبار زدہ گمراہوں کو راہ بتا کہ کسی طرف کو بھاگ جائیں۔ اور جانیں بچائیں۔ مرزا نے کہا۔ بہادر! ڈراتے ہو۔ چودھواں دن ہے میرے جاسوسوں نے بادشاہ کو آگرے میں چھوڑا ہے۔ سبحان قلی نے قہقہہ مارا۔ مرزا نے کہا۔ اگر بادشاہ ہیں۔ تو وہ جنگی ہاتھیوں کا حلقہ کہاں ہے جو رکاب سے جدا نہیں ہوتا؟ اور بادشاہی لشکر کہاں ہے؟ سردار مذکور نے کہا۔ آج نواں دن ہے رکاب میں قدم رکھا ہے۔ رستے میں سانس نہیں لیا۔ ہاتھی کیا ہاتھ میں اُٹھا لاتے؟ شیر جنگ۔ فیل شکار۔ بہادر جوان جو ساتھ ہیں۔ یہ ہاتھیوں سے کچھ کم ہیں؟ کس نیند سوتے ہو۔ اُٹھو سر پر آفتاب آگیا ؛

یہ سنتے ہی مرزا موج کی طرح کنار دریا سے اُلٹا پھرا۔ اختیار الملک کو محاصرے پر چھوڑا۔ اور خود سات ہزار فوج لے کر چلا کہ طوفان کو روکے۔ ادھر بادشاہ کو انتظار تھا کہ خان اعظم اُدھر قلعے سے ہمت کر کے نکلے تو ہم ادھر سے دھاوا کریں۔ مگر جب وہ دروازے سے سر بھی نہ نکال سکا۔ تو اکبر سے رہا نہ گیا۔ کشتی کا بھی انتظار نہ کیا۔

---

[1] اہل دکن کا محاورہ تھا۔ ایک دوسرے کو بہادر کہہ کر بات کرتے تھے ؛

توکل بخدا گھوڑے دریا میں ڈال دئے۔ اقبال کی یاوری دیکھو کہ دریا پایاب تھا لشکر اس پھرتی سے پار اُتر گیا۔ کہ جاسوس خبر لائے۔ غنیم کا لشکر ابھی کمر بندی میں ہے میدان میں جا کر پرے جمائے۔ اکبر ایک بلندی پر کھڑا میدان جنگ کا انداز دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں آصف خاں مرزا کوکہ کے پاس سے پھر کر آیا اور کہا کہ اُسے حضور کے آنے کی خبر بھی نہ تھی۔ مَیں نے قسمیں کھا کھا کر کہا ہے۔ جب یقین آیا ہے۔ اب لشکر تیار کر کے کھڑا ہوا ہے۔ وہ ابھی پوری بات نہ کہہ چکا تھا۔ کہ درختوں میں سے غنیم نمودار ہوا حسین مرزا جمیعت قلیل دیکھ کر خود پندرہ سو فدائی مغلوں کو لے کر سامنے آیا۔ اور بھائی اس کا بائیں پر گرا۔ ساتھ ہی گجراتی اور حبشی فوج بازوؤں پر آئی۔ ادھر سے بھی ترکی بہ ترکی کلہ بہ کلہ جواب ہونے لگے +

اکبر الگ کھڑا تھا۔ اور قدرت الٰہی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے دیکھا۔ کہ ہراول پر زور پڑا۔ اور طور بے طور ہوا ہے۔ راجہ بھگوان داس پہلو میں تھا۔ اس سے کہا کہ اپنی فوج تھوڑی ہے اور غنیم کا ہجوم بہت ہے۔ مگر تائید الٰہی پر اس سے بہت زیادہ بھروسہ ہے۔ چلو ہم تم مل کر جا پڑیں کہ پنجہ سے مشت کا صدمہ زبردست پڑتا ہے۔ اس فوج کی طرف چلو جدھر سرخ جھنڈیاں نظر آتی ہیں حسین مرزا انہیں میں ہے۔ اُسے مار لیا تو میدان مار لیا۔ یہ کہہ کر گھوڑوں کو جگہ سے جنبش دی حسین خاں ٹکریہ نے کہا کہ ہاں "دھاوے کا وقت ہے"۔ بادشاہ نے آواز دی۔ ابھی پلّہ دُور ہے۔ تھوڑے ہو۔ جتنا پاس پہنچ کر دھاوا کرو گے۔ تازہ دم پہنچو گے۔ اور خوب زور سے حریف پر گرو گے۔ مرزا بھی اپنے لشکر سے کٹ کر ایک دستے کے ساتھ ادھر آیا۔ اور زور میں بھرا آتا تھا۔ مگر اکبر اطمینان اور دلاسے کے ساتھ فوج کو لئے جاتا تھا۔ اور گن گن کر قدم رکھتا تھا کہ پاس جا پہنچے۔ راجہ ہاپا چارن نے کہا ہاں دھاوے کا وقت ہے۔ ساتھ ہی اکبر کی زبان سے نعرہ نکلا۔ اللہ اکبر +

ان دنوں میں خواجہ معین الدین چشتی سے بہت اعتقاد تھا۔ اور یا ہادی یا معین کا وظیفہ ہر وقت زبان پر تھا۔ للکار کر آواز دی کہ ہاں دسمرن (سورن بیند ازید۔ آپ اور سب سوار یا ہادی یا معین کے نعرے مارتے جا پڑے۔ مرزا نے جب سنا کہ اکبر اسی

غول میں ہے۔ نام سُنتے ہی ہوش اُڑ گئے۔ فوج بکھر گئی اور خود بے سر و پا بھاگا رخسار پر ایک زخم بھی آیا۔ گھوڑا مارے چلا جاتا تھا۔ جو تھُور کی باڑ سامنے آئی گھوڑا جھجکا۔ اس نے چاہا کہ اڑا جائے۔ مگر نہ ہو سکا۔ اور بیچ میں پھنس گیا۔ گھوڑا ابھی ہمّت کرتا تھا۔ وہ خود بھی حوصلہ کرتا تھا۔ مگر نکل نہ سکتا تھا۔ کہ اتنے میں گدا علی ترکمان خاصے کے سواروں میں سے پہنچا۔ اور کہا۔ آؤ میں تمہیں نکالوں۔ وہ بھی عاجز ہو رہا تھا۔ جان حوالے کر دی۔ گدا علی اسے اپنے آگے سوار کر رہا تھا۔ خاں کلاں (مرزا کوکہ کے چچا) کا ایک نوکر بھی جا پہنچا۔ یہ لالچی بہادر بھی گدا علی کے ساتھ ہو لئے۔ فوج پھیلی ہوئی تھی۔ فتح یاب سپاہی بھگوڑوں کو مارتے باندھتے پھرتے تھے۔ سپہ سالار بادشاہ چند سرداروں اور جاں نثاروں کے بیچ میں کھڑا تھا۔ ہر شخص اپنی خدمتیں عرض کر رہا تھا۔ وہ سُن سُن کر خوش ہوتا تھا۔ کہ کم بخت حسین مرزا کو مشکیں بندھا سامنے حاضر کیا۔ بادشاہ کے آگے آ کر دونوں میں جھگڑا ہونے لگا۔ یہ کہتا تھا میں نے پکڑا ہے۔ وہ کہتا تھا میں نے۔ فوج لطائف کے سپہ سالار ملک تمسخر کے مہاراجہ بیربر سُور ما سپاہی بیٹھے ہوئے۔ کبھی اکبر کے آگے۔ کبھی پیچھے۔ خواہ مخواہ گھوڑا دوڑائے پھرتے تھے انہوں نے کہا یہ مرزا! تم آپ بتا دو۔ تمہیں کس نے پکڑا ہے۔ کم بخت مرزا نے کہا کہ مجھے کون پکڑ سکتا تھا حضور کے نمک نے پکڑا ہے۔ لوگوں کے دلوں سے تصدیق کے سانس نکلے۔ اکبر نے آسمان کو دیکھا۔ اور سر کو جھکا لیا۔ پھر کہا مشکیں کھول دو۔ آگے ہاتھ باندھو!

سزا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کے	تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر یار اتو کیا مارا

مرزا نے پانی پینے کو مانگا۔ ایک شخص پانی لینے کو چلا۔ فرحت خاں چیلے نے دوڑ کر مرزا بدنصیب کے سر پر ایک دوہتڑ ماری اور کہا۔ کہ ایسے نمک حرام کو پانی؟ رحمدل بادشاہ کو ترس آیا۔ اپنی چھاگل سے پانی پلوایا۔ اور فرحت خاں سے کہا۔ اب یہ کیا ضرور ہے نوجوان بادشاہ نے اس میدان میں بڑا ساکھا کیا۔ اور وہ کیا کہ پرانے سپہ سالاروں سے بھی کہیں کہیں بن پڑتا ہے۔ بے شک اس کے ساتھ کہن سال ترک اور پرانے راجپوت سائے کی طرح لگے تھے۔ مگر اس کی ہمت اور حوصلے کی تعریف نہ کرنی بے انصافی میں داخل ہے۔ وہ سفید براق گھوڑے پر سوار تھا۔ اور عام سپاہیوں

کی طرح تلواریں مارتا پھرتا تھا۔ ایک موقع پر کسی دشمن نے اس کے گھوڑے کے سر پر ایسی تلوار ماری کہ چراغ پا ہو گیا۔ اکبر بائیں ہاتھ سے اس کے بال پکڑ کر سنبھلا۔ اور حریف کو برچھا مارا۔ کہ زرہ کو توڑ کر پار ہو گیا۔ چاہتا تھا کہ کھینچ کر پھر مارے۔ مگر پھل ٹوٹ کر زخم میں رہا۔ اور بھگوڑا بھاگ گیا۔ ایک نے آکر ران پر تلوار کا وار کیا ہاتھ اوچھا پڑا تھا۔ خالی گیا اور بزدل گھوڑا بھگا کر نکل گیا۔ ایک نے آکر نیزہ مارا۔ چیتہ بڈ گوجر نے برچھا پھینک کر اس کا کام تمام کیا +

اکبر چاروں طرف لڑتا پھرتا تھا۔ سُرخ بدخشی لہو میں لال زخمی ہو کر گھبرایا ہوا قلب میں آیا۔ اور اکبر کی شمشیر زنی اور اپنے زخمی ہونے کے احوال اس اضطراب کے ساتھ بیان کئے کہ لوگوں نے جانا بادشاہ مارا گیا۔ لشکر میں تلاطم پڑ گیا۔ اکبر کو بھی خبر ہوئی۔ فوراً فوج قلب کے برابر میں آیا۔ اور للکارنا شروع کیا۔ کہ ہاں باگیں لئے ہوئے ہاں قدم اُٹھائے ہوئے۔ غنیم کے قدم اُکھڑ گئے ہیں۔ ایک حملے میں فیصلہ ہے۔ اس کی آواز سن کر سب کی جان میں جان آئی اور دل قوی ہو گئے +

ایک ایک کی جاں بازی اور جاں فشانی کے حال عرض ہو رہے تھے۔ سپاہی جو گرد و پیش حاضر تھے دو سو کے قریب ہوں گے کہ ایک پہاڑی کے نیچے سے غبار کی آندھی اُٹھی۔ کسی نے کہا۔ خان اعظم نکلا ہے۔ کسی نے کہا ادر غنیم آیا۔ ایک سوار حکم شاہی کے ساتھ دوڑا۔ اور آواز کی طرح پہاڑ سے پھرا۔ معلوم ہوا کہ محاصرے کو چھوڑ کر اختیار الملک ادھر پلٹا ہے۔ لشکر میں کھلبلی پڑی۔ بادشاہ نے پھر بہادروں کو للکارا۔ نقارچی کے ایسے اوسان گئے کہ نقارے پر چوٹ لگانے سے جی رہ گیا۔ یہاں تک کہ اکبر نے خود برچھی کی نوک سے ہشیار کیا۔ غرض سب کو سمیٹا اور پھر فوج کو لے کر دل بڑھاتا ہوا دشمن کی طرف متوجہ ہوا۔ چند سرداروں نے گھوڑے جھپٹائے۔ اور تیر اندازی شروع کی۔ اکبر نے پھر آواز دی کہ نہ گھبراؤ۔ کیوں کھنڈے جاتے ہو۔ دلاور بادشاہ شیر مست کی طرح خراماں خراماں جاتا تھا۔ اور سب کو دلاسا دیتا جاتا تھا۔ غنیم طوفان کی طرح چڑھا چلا آتا تھا۔ مگر جوں جوں پاس آتا تھا جمعیت کھنڈی جاتی تھی۔ دور سے ایسا معلوم ہوا کہ اختیار الملک چند رفیقوں کے ساتھ جمعیت سے کٹ کر جُدا ہوا ہے۔ اور جنگل کا رُخ کیا ہے۔ وہ فی الحقیقت حملہ کرنے نہیں آیا تھا

متواتر فتحوں کے سبب سے تمام ہندوستان میں دھاک بندھ گئی تھی۔ کہ اکبر نے تسخیر آفتاب کا عمل پڑھا ہے۔ اب کوئی اُس پر فتح نہ پا سکیگا۔ محمد حسین مرزا کی قید اور تباہی لشکر کی خبر سنتے ہی اختیار الملک بے اختیار محاصرہ چھوڑ کر بھاگا تھا۔ تمام لشکر اس کا جیسے چیونٹیوں کی قطار۔ برابر سے کترا کر نکل گیا۔ اس کا گھوڑا بگٹٹ چلا جاتا تھا۔ یہ کم بخت بھی تھور میں اُلجھا۔ اور خود زمین پر گرا۔ سہراب بیگ ترکمان بھی اس کے پیچھے گھوڑا اڑائے چلا جاتا تھا۔ دست و گریبان پہنچا اور تلوار کھینچ کر کودا۔ اختیار الملک نے کہا" اے جوان! تو ترکمان مے نمائی۔ وترکماناں غلام مرتضیٰ علی و دوستداران او مے باشند۔ من سید بخاریم۔ مرا بگزار"۔ سہراب بیگ نے کہا۔ " اے دیوانہ! چوں بگزارم؟ تو اختیار الملک ہستی۔ وترا شناختہ و بنیالت سرگرداں آمدہ ام" یہ کہا اور جھٹ سر کاٹ لیا۔ پھر کر دیکھے تو کوئی اپنا گھوڑا لے بھاگا۔ لہو ٹپکتے سر کو دامن میں لے کر دَوڑا۔ خوشی خوشی آیا۔ اور حضور میں نذر گزران کر انعام پایا۔ واہ آغا سہراب! اسی مُنہ سے کہو گے۔ فدایت شوم یا مولے۔ بابی انت و امی یا مولے۔ میرے دوستو ایسے وقت پر خدا اور خدا کے پیاروں کا پاس رہے۔ تو بات ہے۔ نہیں تو یہ باتیں ہی باتیں ہیں +

حسین خاں کا حال میں نے الگ لکھا ہے۔ اس بہادر جاں نثار نے اس حملے میں اپنی جان کو جان نہیں سمجھا۔ اور ایسا کچھ کیا۔ کہ بادشاہ دیکھ کر خوش ہو گیا۔ تحسین و آفرین کے طرے اُس کے سر پر لٹکائے۔ خاصے کی تلواروں میں ایک تلوار تھی۔ کہ اکبر نے اس کے گھاٹ اور کاٹ کے ساتھ میار کی اور دشمن کُشی دیکھ کر ہلاکی کا خطاب دیا تھا۔ اس وقت وہی ہاتھ میں علم تھی۔ وہی انعام فرما کر جاں نثار کا دل بڑھایا۔ تھوڑا دن باقی رہ گیا تھا۔ اور بادشاہ اختیار الملک کی طرف سے خاطر جمع کر کے آگے بڑھا چاہتے تھے۔ کہ ایک اور فوج نمودار ہوئی۔ فتح یاب سپاہ پھر سنبھلی اور قریب تھا کہ باگیں اُٹھا کر جا پڑیں۔ کہ شیخ محمد غزنوی (مرزا عزیز کوکہ کے بڑے چچا) فوج مذکور میں سے گھوڑا مار کر آگے آئے اور عرض کی کہ مرزا کوکہ حاضر ہوتا ہے۔ سب کی خاطر جمع ہوئی۔ بادشاہ خوش ہوئے۔ اتنے میں وہ بھی صحیح و سلامت آن پہنچے۔ اکبر نے گلے لگایا۔ ساتھیوں کے نام لئے۔ قلعے میں گئے۔ میدان جنگ میں کلہ منارہ بنوانے کا

حکم دیا۔ اور دو دن کے بعد دارالخلافہ کو روانہ ہوئے۔ پاس پہنچے تو جو لوگ رکاب میں تھے سب کو دکھنی وردی سے سجایا۔ وہی چھوٹی چھوٹی برچھیاں ہاتھوں میں دیں۔ اور خود بھی اسی وردی کے ساتھ ان کے کمان افسر ہو کر شہر میں داخل ہوئے۔ امرا و شرفا و بزرگان شہر نکل کر استقبال کو آئے فیضی نے غزل سنائی ؎

نسیم خوش دلی از فتح پور مے آید		کہ بادشاہ من از راہ دور مے آید	

یہ مبارک مہم اوّل سے آخر تک خوشی کے ساتھ ختم ہوئی۔ البتہ ایک غم نے اکبر کو رنج دیا۔ اور سخت رنج دیا۔ وہ یہ کہ سیف خاں اس کا جاں نثار اور وفادار کوکہ پہلے ہی حملے میں مُنہ پر دو زخم کھا کر سُرخرُو دُنیا سے گیا۔ سرنال کا میدان جہاں سے فساد اُٹھا تھا۔ اس میں وہ نہ پہنچ سکا تھا۔ اس ندامت میں اپنی موت کی دُعا مانگا کرتا تھا جب یہ دھاوا ہؤا تو اسی نشے کے جوش میں خاص حسین مرزا اور اس کے ساتھیوں پر اکیلا جا پڑا۔ اور جاں نثاری کا حق ادا کر دیا۔ وہ کہا کرتا تھا اور سچ کہتا تھا کہ مجھے حضور نے جان دی ہے۔

عجیب اتفاق۔ اس کی ماں کے ہاں کئی دفعہ برابر بیٹیاں ہی ہوئیں۔ کابل کے مقام میں پھر حاملہ ہوئی۔ باپ نے اس کی ماں کو بہت دھمکایا۔ اور کہا۔ اب کے بیٹی ہوئی تو تجھے چھوڑ دُوں گا۔ جب ولادت کے دن نزدیک ہوئے۔ تو بے بس بی بی مریم مکانی کے پاس آئی۔ حال بیان کیا۔ اور کہا کہ کیا کروں۔ اسقاط حمل کر دوں گی۔ بلا سے گھر سے بے گھر تو نہ ہوں۔ جب وہ رخصت ہو کر چلی تو اکبر رستے میں کھیلتا ہؤا مِلا۔ اگرچہ بچہ تھا۔ مگر اس نے بھی پوچھا کہ جی جی کیا ہے؟ افسردہ معلوم ہوتی ہو۔ اس بچاری کا سینہ درد سے بھرا ہؤا تھا۔ اس سے بھی کہہ دیا۔ اکبر نے کہا۔ میری خاطر عزیز ہے تو ایسا ہرگز نہ کرنا۔ اور دیکھنا! بیٹا ہی ہوگا۔ خدا کی قدرت سیف خاں پیدا ہؤا۔ اس کے بعد زین خاں پیدا ہؤا۔ مرتے وقت اجمیری اجمیری اس کی زبان سے نِکلا۔ شاید خواجہ اجمیر کا نام وردِ زبان تھا۔ یا اکبر کو پکارتا تھا۔ کہ کمال عقیدت کے سبب سے اس درگاہ کے ساتھ اُسے نسبت خاص ہو گئی تھی حسین خاں نے عرض کی کہ مَیں اس کے گرنے کی خبر سُنتے ہی گھوڑا مار کر پہنچا تھا۔ اس وقت تک حواس قائم تھے۔ مَیں نے فتح کی مبارک باد دے کر کہا کہ تم تو سرخرو چلتے ہو۔ دیکھیں ہم بھی تمہارے ساتھ

ہی آتے ہیں یا پیچھے رہنا پڑے ❖

عجیب تر یہ کہ لڑائی سے ایک دن پہلے اکبر چلتے چلتے اُتر پڑا۔ اور سب کو لے کر دستر خوان پر بیٹھا۔ ایک ہزارہ بھی اس سواری میں ساتھ تھا معلوم ہوا کہ شانہ بینی کے فن میں ماہر ہے۔ (قوم مذکور میں شانہ بینی کی فال سے حال معلوم کرنا ورثہ قدیم ہے کہ اب تک چلا آتا ہے) اکبر نے پوچھا۔ مُلاّ فتح از کیست؟ کہا قربانت شوم۔ از ماست۔ مگر امیرے ازیں لشکر بلا گردان حضور مے شود۔ پیچھے معلوم ہوا کہ سیف خاں ہی تھا۔ دیکھو توزک جہانگیری صفحہ ۲۰

لوگ کہیں گے کہ آزاد نے دربار اکبری لکھنے کا وعدہ کیا۔ اور شاہنامہ لکھنے لگا۔ لو اب ایسی باتیں لکھتا ہوں کہ جن سے شہنشاہ موصوف کے مذہب۔ اخلاق عادات اور سلطنت کے دستور و آداب۔ اور اس کے عہد کے رسم و رواج اور کاروبار کے آئین آئینہ ہوں۔ خدا کرے کہ دوستوں کو پسند آئیں ❖

اکبر کے دین واعتقاد کی ابتدا و انتہا

اس طرح کی فتوحات سے کہ جن پر کبھی سکندر کا اقبال اور کبھی رستم کی دلاوری قربان ہو۔ ہندوستان کے دل پر ملک گیری کا سکہ بٹھا دیا۔ اٹھارہ بیس برس تک اس کا یہ حال تھا کہ جس طرح سیدھے سادھے مسلمان خوش اعتقاد ہوتے ہیں اسی طرح احکام شرح کو ادب کے کانوں سے سُنتا تھا۔ اور صدق دل سے بجالاتا تھا۔ جماعت سے نماز پڑھتا تھا۔ آپ اذان کہتا تھا مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا تھا۔ علماء و فضلاء کی نہایت تعظیم کرتا تھا۔ اُن کے گھر جاتا تھا بعض کے سامنے کبھی کبھی جوتیاں سیدھی کر کے رکھ دیتا تھا۔ مقدمات سلطنت شریعت کے فتوے سے فیصلہ ہوتے تھے۔ جابجا قاضی و مفتی مقرر تھے۔ فقرا و مشائخ کے ساتھ کمال اعتقاد سے پیش آتا تھا۔ اور ان کے برکت انفاس سے اپنے کاروبار میں فیض حاصل کرتا تھا ❖

اجمیر میں جہاں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ ہے سال بہ سال جاتا تھا۔ کوئی

مہم یا مراد ہو۔ یا اتفاقاً پاس سے گزر ہو۔ تو برس کے بیچ میں بھی زیارت کرتا تھا۔ ایک منزل سے پیادہ ہوتا تھا۔ بعض منتیں ایسی بھی ہوئیں کہ فتح پور یا آگرے سے اجمیر تک پیادہ گیا۔ وہاں جاکر درگاہ میں طواف کرتا تھا۔ ہزاروں لاکھوں روپے چڑھاوے اور نذریں چڑھاتا تھا۔ پہروں صدق دل سے مراقبے میں بیٹھتا تھا۔ اور دل کی مرادیں مانگتا تھا۔ فقراء اور اہل طریقت کے حلقے میں شامل ہوتا تھا۔ ان کی وعظ و نصیحت کی تقریریں گوش یقین سے سنتا تھا۔ قال اللہ و قال الرسول میں وقت گزارتا تھا۔ معرفت کی باتیں۔ علمی تذکرے۔ حکمی اور الٰہی مسئلے اور دینی تحقیقاتیں ہوتی تھیں۔ مشائخ و علماء۔ فقراء و غرباء کو نقد۔ جنس۔ زمینیں۔ جاگیریں دیتا تھا۔ جس وقت قوال معرفت کے نغمے گاتے تھے۔ تو روپے اور اشرفیاں مینہ کی طرح برستے تھے۔ اور ایک عالم ہوتا تھا کہ در و دیوار پر حیرت چھا جاتی تھی۔ یا ہادی یا معین کے اسم وہیں سے عنایت ہوتے تھے۔ یہ وظیفہ ہر وقت زبان پر تھا۔ اور ہر شخص کو یہی ہدایت تھی۔ اُسے سمرن کہتا تھا۔ لڑائیوں میں جب دھاوا ہوتا۔ ایک نعرہ مار کر کہتا۔ ہاں سمرن بیند ازید۔ آپ بھی اور ساری فوج ہندو مسلمان با ہادی یا معین للکارتے ہوئے دوڑ پڑتے۔ ادھر باگیں اُٹھائیں۔ ادھر غنیم بھاگا۔ اور میدان صاف۔ لڑائی فتح +

علماؑ و مشائخ کا طلوعِ اقبال اور قدرتی زوال

اس ۲۰ برس کے عرصے میں جو برابر فتوحات خداداد ہوئیں۔ اور عجیب عجیب طور سے ہوئیں۔ تدبیریں تمام تقدیر کے مطابق پڑیں۔ اور جدھر ارادہ کیا اقبال استقبال کو دوڑا۔ کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ چھ برس میں دُور دُور تک کے ملک زیر قلم ہو گئے۔ جس طرح سلطنت کا دائرہ پھیلا۔ ویسا ہی اعتقاد بھی روز بروز زیادہ ہوتا گیا۔ پروردگار کی عظمت دل پر چھا گئی۔ ان نعمتوں کے شکرانے میں اور آئندہ فضل و کرم کی دعاؤں میں نیک نیت بادشاہ ہر وقت توجہ اور حضور قلب سے درگاہ الٰہی میں رجوع رکھتا تھا۔ شیخ سلیم چشتی کے سبب سے اکثر فتح پور میں رہتا تھا۔ محلوں کے

پہلو میں سب سے الگ پرانا سا حجرہ تھا۔ پاس ایک پتھر کی سل پڑی تھی۔ تاروں کی چھاؤں اکیلا وہاں جا بیٹھتا۔ نوروں کے تڑکے صبحوں کے سویرے۔ رحمت کے وقت مراقبوں میں خرچ ہوتے تھے۔ عاجزی اور نیازمندی کے ساتھ وظیفے پڑھتا اپنے خدا سے دعائیں مانگتا۔ اور نور سحر کے فیض دل پر لیتا۔ عام صحبت میں بھی اکثر خداشناسی۔ معرفت۔ شریعت اور طریقت ہی کی باتیں ہوتی تھیں۔ رات کو علماء و فضلاء کے مجمع ہوتے تھے۔ اس میں بھی یہی باتیں۔ اور حدیث تفسیر اس میں علمی مسائل کی تحقیقیں۔ اسی میں مباحثے بھی ہو جاتے تھے۔

اس ذوق شوق نے یہاں تک جوش مارا کہ سنہ ۹۸۲ھ میں شیخ سلیم چشتی کی نئی خانقاہ کے پاس ایک عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی۔ اور اس کا نام عبادت خانہ رکھا۔ یہ اصل میں وہی حجرہ تھا۔ جہاں شیخ عبداللہ[1] نیازی سرہندی کسی زمانے میں خلوت نشین تھے۔ اس کے چاروں طرف چار بڑے ایوان بنا کر بہت بڑھایا۔ ہر جمعہ کی نماز کے بعد نئی خانقاہ یعنی شیخ الاسلام (شیخ سلیم چشتی) کی خانقاہ سے آکر یہاں دربار خاص ہوتا تھا مشائخ وقت۔ علماء و فضلاء اور فقط چند مصاحب و مقرب درگاہ ہوتے۔ درباریوں میں اور کسی کو اجازت نہ تھی۔ خداشناسی اور حق پرستی کی ہدائتیں اور حکائتیں ہوتی تھیں رات کو بھی جلسے ہوتے تھے۔ دل نہایت گداز اور سرتاپا فقر کی خاک راہ ہو گیا تھا۔ مگر علماء کی جماعت ایک عجیب الخلقت فرقہ ہے۔ مباحثوں کے جھگڑے تو پیچھے ہوں گے۔ پہلے نشست ہی پر معرکے ہونے لگے۔ کہ وہ مجھ سے اوپر کیوں بیٹھے۔ اور میں اس سے نیچے کیوں بیٹھوں۔ اس لئے اس کا یہ آئین باندھا کہ امرا جانب شرقی میں۔ سادات جانب غربی میں۔ علما و حکما جنوبی میں۔ اہل طریقت شمالی میں بیٹھیں۔ دنیا کے لوگ طرفہ معجون ہیں۔ عمارت مذکور کے پاس ہی انوپ تلاؤ دولت سے لبریز تھا۔ لوگ آتے تھے اور اس طرح روپے اشرفیاں لے جاتے تھے جیسے گھاٹ سے پانی۔ ملا شیری شاعر اس پر بھی خوش نہ ہوئے۔ چنانچہ اس ہیئت مجموعی پر ایک نہایت نمکین قطعہ نظم کیا جس کا ایک شعر یاد ہے ؎

دریں ایام دیدم جمع با اموال قارونی عبادت ہائے فرعونی عمارتہائے شدادی

[1] شیخ عبداللہ نیازی بھی پہلے شیخ سلیم چشتی کے مرید تھے۔

ہر ایوان میں شب جمعہ کو بادشاہ آپ آتا تھا۔ وہاں کے اہل جلسہ سے باتیں کرتا تھا۔ اور تحقیقات مطالب سے معلومات کے ذخیرے بھرتا تھا۔ آرائش و زیبائش ان ایوانوں کو اپنے ہاتھ سے سجاتی تھی۔ گلدستے رکھتی تھی۔ عطر چھڑکتی تھی۔ پھول برساتی تھی۔ خوشبوئیاں جلاتی تھی۔ سخاوت روپوں اور اشرفیوں کی تھیلیاں لئے حاضر تھی۔ کہ دو اور حساب نہ پوچھو۔ کیونکہ انہیں لوگوں کی اوٹ میں اہل حاجت بھی آن پہنچے تھے۔ گجرات کی لُوٹ میں عمدہ عمدہ کتابیں اعتماد خاں گجراتی کے کتب خانے کی آئی تھیں۔ اور خزانہ عامرہ میں جمع تھیں۔ اُن کے نسخے بھی علماء کو بٹتے تھے۔ جمال خاں قورچی نے ایک دن عرض کی کہ فدوی آگرے میں ایک دن شیخ ضیاء الدین ولد شیخ محمد غوث گوالیاری کی خدمت میں گیا تھا۔ ایسی مفلسی غالب ہوئی ہے۔ کہ میرے لئے کئی سیر چنے بھنائے تھے۔ کچھ آپ کھائے۔ کچھ مجھے دئے۔ باقی خانقاہ میں فقرا اور مریدوں کے لئے بھیج دئے۔ یہ سُن کر بادشاہ کے دل پُردرد پر اثر ہؤا۔ انہیں بُلا بھیجا۔ اور اسی عبادت خانے میں رہنے کو جگہ دی۔ اُن کے اوصاف بھی مُلّا صاحب سے سُن لو۔ (دیکھو تتمہ)

افسوس یہ کہ مسجدوں کے بھوکوں کو جب تر نوالے ملے۔ اور حوصلے سے زیادہ عزتیں ہوئیں۔ تو گردنوں کی رگیں سخت تن گئیں۔ آپس میں جھگڑنے لگے۔ اور غُل ہو کر شور سے شر اُٹھے۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ مَیں اپنی فضیلت کے ساتھ دوسرے کی جہالت دکھاؤں۔ دغابازیاں۔ اُن کے دھوکے بازیاں اور جھگڑے بادشاہ کو ناگوار ہوئے۔ ناچار حکم دیا۔ کہ جو نامعقول بے محل بات کرے اُسے اُٹھا دو۔ مُلّا صاحب[1] سے کہا۔ آج سے جس شخص کو دیکھو کہ نامعقول بات کہتا ہے۔ ہم سے کہدو۔ ہم مجلس سے اُٹھا دیں گے۔ آصف خاں برابر حاضر تھے۔ مُلّا صاحب نے چپکے چپکے اُن سے کہا کہ اگر یہی بات ہے تو بہتوں کو اُٹھنا پڑیگا۔ پوچھا یہ کیا کہتا ہے؟ جو اُنھوں نے کہا تھا۔ اُس نے کہدیا۔ سُن کر بڑے خوش ہوئے۔ بلکہ اور مصاحبوں سے بیان کیا۔ مُلّا نے اپنی جنگ و جدل میں جو خودنمائی کی بیرقیں ہلاتے تھے ایک

[1] مُلّا عبدالقادر بدایونی مراد ہے۔

نمونہ اُس کا یہ ہے :۔

لطیفہ۔ حاجی ابراہیم سرہندی مباحثوں میں بڑے جھگڑالو اور مغالطوں میں چھلاوے کا تماشہ تھے۔ ایک دن چار ایوان کے جلسے میں مرزا مفلس سے کہا کہ موسٰے کیا صیغہ ہے۔ اور اُس کا ماخذ اشتقاق کیا؟ مرزا علوم عقلی کے سرمائے میں بہت مال دار تھے۔ مگر اس جواب میں مفلس ہی نکلے۔ شہر میں چرچا ہو گیا۔ کہ حاجی نے مرزا کو لاجواب کر دیا۔ اور حاجی ہی بڑے فاضل ہیں۔ جاننے والے جانتے تھے کہ یہ بھی تاثیر زمانہ کا ایک شعبدہ ہے۔ یہ رباعی مُلّا صاحب نے فرمائی:۔

از بہر فساد و جنگ بعضے مردم	در مدرسہ ہر علم کہ آموختہ اند
کردند بگوئے گمرہی خود را گم	فِی القَبْرِ یُضِرُّہُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ

لطیفہ۔ تحصیل فوائد پر نظر کر کے بادشاہ خوش اعتقاد دل سے چاہتا تھا کہ یہ جلسے گرم رہیں۔ چنانچہ ان ہی دنوں میں قاضی زادہ لشکر سے کہا۔ کہ تم رات کو بحث میں نہیں آتے؟ عرض کی۔ حضور آؤں تو سہی۔ لیکن حاجی وہاں مجھ سے پوچھیں۔ عیسٰے کیا صیغہ ہے۔ تو کیا جواب دوں۔ لطیفہ اُس کا بہت پسند آیا۔

غرض اختلاف رائے اور خودنمائی کی برکت سے عجب عجب مخالفتیں ظاہر ہونے لگیں۔ اور ہر عالم کا یہ عالم تھا۔ کہ جو ہیں کہوں وہی آیت و حدیث مانو۔ جو ذرا چون و چرا کرے۔ اس کے لئے کفر سے ادھر کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ دلیلیں سب کے پاس آیتوں اور روایتوں سے موجود بلکہ علمائے سلف کے جو فتوے اپنے مفید مطلب ہوں۔ وہ بھی آیت و حدیث سے کم درجے میں نہ تھے۔

۹۸۳ھ میں مرزا سلیمان والیٔ بدخشاں شاہ رخ اپنے پوتے کے ہاتھ سے بھاگ کر ادھر آئے۔ صاحب حال شخص تھے۔ مرید بھی کرتے تھے۔ اور معرفت میں خیالات بلند رکھتے تھے۔ یہ بھی عبادت خانے میں آتے تھے مشائخ و علما سے گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ اور ذکر قال اللہ و قال الرسول سے برکت حاصل کرتے تھے۔

مُلّا صاحب دو برس پہلے داخل دربار ہوئے تھے۔ اُنہوں نے وہ کتابیں ساری پڑھی تھیں۔ جنہیں لوگ پڑھ کر عالم و فاضل ہو جاتے ہیں۔ اور جو کچھ

استادوں نے بتا دیا تھا۔ وہ حرف بہ حرف یاد تھا۔ لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اجتہاد کچھ اور شے ہے۔ وہ مرتبہ نہ حاصل تھا۔ مجتہد کا یہی کام نہیں کہ آیت یا حدیث یا کسی فقہ کی کتاب کے معنے بتا دے۔ کام اُس کا یہ ہے۔ کہ جہاں صراحةً آیت یا حدیث موجود نہیں یا کسی طرح کا احتمال ہے۔ یا آئتیں یا حدیثیں بظاہر معنوں میں مختلف ہیں۔ یہ وہاں ذہن سلیم کی ہدایت سے استنباط کر کے فتوے دے۔ جہاں دشواری پیش آئے وہاں مصالح وقت کو مدّنظر رکھ کر حکم لگائے۔ آیت و حدیث عین مصالح خلق اللہ ہیں۔ اُن کے کاموں کو بند کرنے والی یا اُن کو حد سے زیادہ تکلیف میں ڈالنے والی نہیں ہیں ✦

واہ رے اکبر تیری قیافہ شناسی۔ مُلّا صاحب کو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ حاجی ابراہیم کسی کو سانس نہیں لینے دیتا۔ یہ اس کا کلّہ توڑیگا۔ چنانچہ علم کا زور۔ طبیعت بیباک۔ جوانی کی اُمنگ۔ بادشاہ خود مدد کو پشت پر۔ اور بڈھوں کا اقبال بڈھا ہو چکا تھا۔ یہ حاجی سے بڑھ کر شیخ صدر کو ٹکّریں مارنے لگے ✦

ان ہی دنوں میں شیخ ابوالفضل بھی آن پہنچے۔ اس فضیلت کی جھولی میں دلائل کی کیا کمی تھی۔ اور اس طبع خداداد کے سامنے کسی کی حقیقت کیا تھی جس دلیل کو چاہا۔ چٹکی میں اُڑا دیا۔ بڑی بات یہ تھی۔ کہ شیخ اور شیخ کے باپ نے مخدوم اور صدر وغیرہ کے ہاتھ سے برسوں تک زخم اُٹھائے تھے۔ جو عمروں میں بھرنے والے نہ تھے۔ علما میں خلاف و اختلاف کے رستے تو کھُل ہی گئے تھے۔ چند روز میں یہ نوبت ہوگئی کہ فروعی مسائل تو درکنار رہے۔ اصول عقاید میں بھی کلام ہونے لگے۔ اور ہر بات پر طرّہ یہ کہ دلیل لاؤ۔ اور اس کی وجہ کیا۔ رفتہ رفتہ غیر مذہب کے عالم بھی جلسوں میں شامل ہونے لگے۔ اور خیالات یہ ہوئے۔ کہ مذہب میں تقلید کچھ نہیں۔ ہر بات کو تحقیق کر کے اختیار کرنا چاہیئے ✦

حق یہ ہے۔ کہ نیک نیت بادشاہ سے جو کچھ ظہور میں آیا۔ مجبوری سے تھا۔ سنہ ۹۸۶ھ تک بھی مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ کہ رات کو کثر اوقات عبادت خانے میں علما و مشائخ کی صحبت میں گذرتے تھے۔ خصوصاً جمعہ کی راتیں۔ کہ رات بھر جاگتے تھے۔ اور مسائل دین کے اصول و فروع کی تحقیقیں کرتے تھے۔ اور علماء کا یہ عالم تھا۔ کہ

زبانوں کی تلواریں کھینچ کر پل پڑتے تھے کٹے مرتے تھے۔ اور آپس میں تکفیر و تذلیل کر کے ایک دوسرے کو فنا کئے ڈالتے تھے۔ (مُلّا صاحب کہتے ہیں) شیخ صدر اور مخدوم الملک کا یہ حال تھا کہ ایک کا ہاتھ اور ایک کا گریبان۔ دونوں طرف کے ردّی توڑ اور شرد سے چٹ مُلّانوں نے دو طرفہ دھڑے باندھ رکھے تھے۔ گویا فرعونی دَور تھا سبطی و قبطی دونوں گروہ حاضر تھے۔ ایک عالم ایک کام کو حلال کہتا تھا۔ دوسرا اسی کو حرام ثابت کر دیتا تھا۔ بادشاہ انہیں اپنے عہد کا امام غزالی اور امام رازی سمجھے ہوئے تھا۔ جب اُن کا یہ حال دیکھا تو حیران رہ گئے۔ ابوالفضل و فیضی بھی آ گئے تھے۔ اور اُن کے بھی طرفدار دربار میں پیدا ہو گئے تھے۔ یہ دمبدم اُکساتے تھے اور بات بات میں ان کی بے اعتباری دکھلاتے تھے۔

آخر علمائے اسلام ہی کے ہاتھوں یہ خواری ہوئی۔ کہ اسلام اور عام مذہب یکساں ہو گئے۔ اس میں علماء اور مشائخ سب سے بڑھ کر بدنام ہوئے۔ پھر بھی بادشاہ اپنے دل سے حق مطلق کا طالب تھا۔ بلکہ ہر نقطے کی تحقیق اور ہر امر کی دریافت کا شوق رکھتا تھا۔ اس لئے ہر ایک مذہب کے عالموں کو جمع کرتا تھا۔ اور حالات دریافت کرتا تھا۔ بے علم انسان تھا۔ مگر سمجھ والا تھا۔ کسی مذہب کا دعویدار اُسے اپنی طرف کھینچ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ بھی ان سب کی سنتا تھا۔ اور اپنی من سمجھوتی کر لیتا تھا۔ اس کے پاک اعتقاد اور نیک نیت میں فرق نہ آیا تھا۔ جب ۹۸۴ھ میں داؤد افغان کا سر کٹ کر بنگالہ سے فساد کی جڑ اُکھڑ گئی تو وہ شکرانے کے لئے اجمیر میں گیا۔ عین عرس کے دن پہنچا۔ بموجب اپنے معمول کے طواف کیا۔ زیارت کی۔ فاتحہ پڑھی۔ دعائیں مانگیں۔ دیر تک حضور قلب سے مراقبے میں بیٹھا رہا۔ حج کے لئے قافلہ جانے والا تھا۔ خرچ راہ میں ہزارہا آدمیوں کو روپے اور سامان سفر دیا۔ اور حکم عام دیا۔ کہ جو چاہے حج کو جائے۔ خرچ راہ خزانے سے دو۔ سلطان خواجہ خاندان خواجگان میں سے ایک خواجہ باعظمت کو میر حاج مقرر کیا۔ چھ لاکھ روپے روپے نقد۔ ۱۲ ہزار خلعت اور ہزاروں روپے کے تحفے تحائف جواہر شرفائے مکّہ کے لئے دیے۔ کہ وہاں کے مستحق لوگوں کو دینا۔ یہ بھی حکم دیا۔ کہ مکّے میں عظیم الشان مکان بنوا دینا۔ تاکہ حاجی مسافروں کو تکلیف نہ ہو

کرے۔ جس وقت میر حاج قافلے کو لے کر روانہ ہوئے۔ تو اس تمنا میں کہ میں خانہ خدا
میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ نے خود وہی وضع بنائی جو حالت حج میں ہوتی ہے۔
بال قصر کئے۔ ایک چادر آدھی کا لُنگ۔ آدھی کا جُھرمٹ۔ ننگے سر۔ ننگے پاؤں
نہایت رجوع قلب اور عجز کے ساتھ حاضر ہوا۔ کچھ دور تک پیادہ پا ساتھ چلا۔ اور
زبان سے اُسی طرح کہتا جاتا تھا۔ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ الخ
(حاضر ہوا میں حاضر ہوا اے واحدہٗ لاشریک میں حاضر ہوا) جس وقت بادشاہ نے یہ الفاظ
اس حالت کے ساتھ کہے۔ عجب عالم ہوا۔ خلق خدا کے دلوں کے آہ و نالے بلند ہوئے۔
قریب تھا کہ درختوں اور پتھروں سے بھی آواز آنے لگے۔ اس عالم میں سلطان خواجہ کا
ہاتھ پکڑ کر شرعی الفاظ کہے۔ جن کے معنے یہ تھے کہ حج اور زیارت کے لئے ہم نے اپنی
طرف سے تمہیں وکیل کیا۔ شعبان ۹۸۴ھ کو قافلہ روانہ ہوا۔ میر حاج چھ سال متواتر ان ہی
سامانوں سے جاتے رہے۔ البتہ یہ بات پھر نہ ہوئی۔ شیخ ابو الفضل لکھتے ہیں۔ کہ بعض
بھولے بھالے عالموں کے ساتھ اکثر غرض پرستوں نے سمجھا کر کے بادشاہ کو سمجھایا۔ کہ
حضور کو بذاتِ خود ثواب حج حاصل کرنا چاہیئے۔ اور حضور بھی تیار ہو گئے۔ لیکن جب حقیقت
پرست دانشمندوں نے حج کی حقیقت اور اس کا راز اصلی بیان کیا تو اس ارادے سے
باز رہے۔ اور بموجب بیان مذکورہ بالا کے میر حاج کے ساتھ قافلہ روانہ کیا۔ سلطان خواجہ
مع تحائف شاہی اور اہل حج کے جہاز الٰہی میں بیٹھے کہ اکبر شاہی جہاز تھا۔ اور بیگمات جہاز
سلیمی میں بیٹھیں کہ رومی سوداگروں کا تھا +

جلوۂ قدرت

علما و مشائخ کی بد اقبالی کے اصلی اسباب

ایسے عالی حوصلہ شہنشاہ کے لئے یہ حرکتیں علمار کی ایسی نہ تھیں۔ جن پر وہ اسقدر
بیزار ہو جاتا۔ اصل معاملہ ایک تفصیل پر منحصر ہے جسے میں مختصر بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے

لے ۲۲ شعبان ۹۸۴ھ کو یہ قافلہ روانہ ہوا قطب الدین خاں کوکلتاش اور راجہ بھگونتی داس رانا کی مہم پر گئے
ہوئے تھے انہیں حکم ہوا کہ ہمراہ ہو کر کنارہ دریائے شور تک پہنچا دو۔ دیکھو عالمگیر نامہ +

ہی آتے ہیں یا پیچھے رہنا پڑے۔

عجیب تر یہ کہ لڑائی سے ایک دن پہلے اکبر چلتے چلتے اُتر پڑا۔ اور سب کو لے کر دستر خوان پر بیٹھا۔ ایک ہزارہ بھی اس سواری میں ساتھ تھا۔ معلوم ہوا کہ شانہ بینی کے فن میں ماہر ہے۔ (قوم مذکور میں شانہ بینی کی فال سے حال معلوم کرنا ورثہ قدیم ہے کہ اب تک چلا آتا ہے) اکبر نے پوچھا۔ مُلّا فتح از کیست؟ کہا قربانت شوم۔ از ماست۔ مگر امیرے ازیں لشکر بلاگردان حضور مے شود۔ پیچھے معلوم ہوا کہ سیف خاں ہی تھا۔ دیکھو توزک جہانگیری صفحہ ۲۰

لوگ کہیں گے کہ آزاد نے دربار اکبری لکھنے کا وعدہ کیا۔ اور شاہنامہ لکھنے لگا۔ لو اب ایسی باتیں لکھتا ہوں کہ جن سے شہنشاہ موصوف کے مذہب۔ اخلاق عادات اور سلطنت کے دستور و آداب۔ اور اس کے عہد کے رسم و رواج اور کاروبار کے آئین آئینہ ہوں۔ خدا کرے کہ دوستوں کو پسند آئیں۔

اکبر کے دین و اعتقاد کی ابتدا و انتہا

اس طرح کی فتوحات سے کہ جن پر کبھی سکندر کا اقبال اور کبھی رستم کی دلاوری قربان ہو۔ ہندوستان کے دل پر ملک گیری کا سکہ بٹھا دیا۔ اٹھارہ بیس برس تک اس کا یہ حال تھا کہ جس طرح سیدھے سادھے مسلمان خوش اعتقاد ہوتے ہیں اسی طرح احکام شرح کو ادب کے کانوں سے سُنتا تھا۔ اور صدق دل سے بجالاتا تھا۔ جماعت سے نماز پڑھتا تھا۔ آپ اذان کہتا تھا۔ مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا تھا۔ علماء و فضلاء کی نہایت تعظیم کرتا تھا۔ اُن کے گھر جاتا تھا۔ بعض کے سامنے کبھی کبھی جوتیاں سیدھی کر کے رکھ دیتا تھا۔ مقدمات سلطنت شریعت کے فتوے سے فیصلہ ہوتے تھے۔ جا بجا قاضی و مفتی مقرر تھے۔ فقرا و مشائخ کے ساتھ کمال اعتقاد سے پیش آتا تھا۔ اور ان کے برکت انفاس سے اپنے کاروبار میں فیض حاصل کرتا تھا۔

اجمیر میں جہاں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ ہے سال بہ سال جاتا تھا۔ کوئی

مہم یا مراد ہو۔ یا اتفاقاً پاس سے گزر ہو۔ تو برس کے بیچ میں بھی زیارت کرتا تھا۔ ایک منزل سے پیادہ ہوتا تھا۔ بعض منتیں ایسی بھی ہوئیں کہ فتح پور یا آگرے سے اجمیر تک پیادہ گیا۔ وہاں جاکر درگاہ میں طواف کرتا تھا۔ ہزاروں لاکھوں روپے چڑھاوے اور نذریں چڑھاتا تھا۔ پہروں صدق دل سے مراقبے میں بیٹھتا تھا۔ اور دل کی مرادیں مانگتا تھا۔ فقراء اور اہل طریقت کے حلقے میں شامل ہوتا تھا۔ ان کی وعظ و نصیحت کی تقریریں گوش یقین سے سنتا تھا۔ قال اللہ و قال الرسول میں وقت گزارتا تھا۔ معرفت کی باتیں۔ علمی تذکرے۔ حکمی اور الٰہی مسئلے اور دینی تحقیقاتیں ہوتی تھیں۔ مشائخ و علماء۔ فقراء و غرباء کو نقد۔ جنس۔ زمینیں۔ جاگیریں دیتا تھا۔ جس وقت قوال معرفت کے نغمے گاتے تھے۔ تو روپے اور اشرفیاں مینہ کی طرح برستے تھے۔ اور ایک عالم ہوتا تھا کہ در و دیوار پر حیرت چھا جاتی تھی۔ یا ہادی یا معین کے اسم وہیں سے عنایت ہوتے تھے۔ یہ وظیفہ ہر وقت زبان پر تھا۔ اور ہر شخص کو یہی ہدایت تھی۔ اُسے سمرن کہتا تھا۔ لڑائیوں میں جب دھاوا ہوتا۔ ایک نعرہ مار کر کہتا۔ ہاں سمرن بیند ازید۔ آپ بھی اور ساری فوج ہندو مسلمان یا ہادی یا معین للکارتے ہوئے دوڑ پڑتے۔ ادھر باگیں اُٹھائیں۔ ادھر غنیم بھاگا۔ اور میدان صاف۔ لڑائی فتح +

علماؤ مشائخ کا طلوع اقبال اور قدرتی زوال

اس ۲۰ برس کے عرصے میں جو برابر فتوحات خداداد ہوئیں۔ اور عجیب عجیب طور سے ہوئیں۔ تدبیریں تمام تقدیر کے مطابق پڑیں۔ اور جدھر ارادہ کیا اقبال استقبال کو دوڑا۔ کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ چھ برس میں دُور دُور تک کے ملک زیر قلم ہو گئے۔ جس طرح سلطنت کا دائرہ پھیلا۔ ویسا ہی اعتقاد بھی روز بروز زیادہ ہوتا گیا۔ پروردگار کی عظمت دل پر چھا گئی۔ ان نعمتوں کے شکر انے میں اور آیندہ فضل و کرم کی دعاؤں میں نیک نیت بادشاہ ہر وقت توجہ اور حضور قلب سے درگاہ الٰہی میں رجوع رکھتا تھا۔ شیخ سلیم چشتی کے سبب سے اکثر فتح پور میں رہتا تھا۔ محلوں کے

پہلو میں سب سے الگ پرانا سا حجرہ تھا۔ پاس ایک پتھر کی سل پڑی تھی۔ تاروں کی چھاؤں اکیلا وہاں جا بیٹھتا۔ نوروں کے تڑکے صبحوں کے سویرے۔ رحمت کے وقت مراقبوں میں خرچ ہوتے تھے۔ عاجزی اور نیازمندی کے ساتھ وظیفے پڑھتا۔ اپنے خدا سے دعائیں مانگتا۔ اور نور سحر کے فیض دل پر لیتا۔ عام صحبت میں بھی اکثر خداشناسی۔ معرفت۔ شریعت اور طریقت ہی کی باتیں ہوتی تھیں۔ رات کو علمار و فضلار کے مجمع ہوتے تھے۔ اس میں بھی یہی باتیں۔ اور حدیث تفسیر اس میں علمی مسائل کی تحقیقیں۔ اسی میں مباحثے بھی ہو جاتے تھے۔

اس ذوق شوق نے یہاں تک جوش مارا کہ سنہ ۹۸۲ھ میں شیخ سلیم چشتی کی نئی خانقاہ کے پاس ایک عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی۔ اور اُس کا نام عبادت خانہ رکھا۔ یہ اصل میں وہی حجرہ تھا۔ جہاں شیخ عبداللہ[1] نیازی سرہندی کسی زمانے میں خلوت نشین تھے۔ اس کے چاروں طرف چار بڑے ایوان بنا کر بہت بڑھایا۔ ہر جمعہ کی نماز کے بعد نئی خانقاہ یعنی شیخ الاسلام (شیخ سلیم چشتی) کی خانقاہ سے آکر یہاں دربار خاص ہوتا تھا مشائخ وقت۔ علمار و فضلار اور فقط چند مصاحب و مقرب درگاہ ہوتے۔ درباریوں میں اور کسی کو اجازت نہ تھی۔ خداشناسی اور حق پرستی کی ہدائتیں اور حکائتیں ہوتی تھیں رات کو بھی جلسے ہوتے تھے۔ دل نہایت گداز اور سر تا پا فقر کی خاک راہ ہو گیا تھا۔ مگر علمار کی جماعت ایک عجیب الخلقت فرقہ ہے۔ مباحثوں کے جھگڑے تو پیچھے ہوں گے۔ پہلے نشست ہی پر معرکے ہونے لگے۔ کہ وہ مجھ سے اوپر کیوں بیٹھے۔ اور میں اس سے نیچے کیوں بیٹھوں۔ اس لئے اس کا یہ آئین باندھا کہ امرا جانب شرقی میں۔ سادات جانب غربی میں۔ علما و حکما جنوبی میں۔ اہل طریقت شمالی میں بیٹھیں۔ دنیا کے لوگ طرفہ معجون ہیں۔ عمارت مذکور کے پاس ہی انوپ تلاؤ دولت سے لبریز تھا۔ لوگ آتے تھے اور اس طرح روپے اشرفیاں لے جاتے تھے جیسے گھاٹ سے پانی۔ مُلا شیری شاعر اس پر بھی خوش نہ ہوئے۔ چنانچہ اس ہیئت مجموعی پر ایک نہایت نمکین قطعہ نظم کیا جس کا ایک شعر یاد ہے ؎

دریں ایام دیدم جمع با اموال قارونی — عبادت ہائے فرعونی عمارتہائے شدادی

[1] شیخ عبداللہ نیازی بھی پہلے شیخ سلیم چشتی کے مرید تھے۔

ہر ایوان میں شب جمعہ کو بادشاہ آپ آتا تھا۔ وہاں کے اہل جلسہ سے باتیں کرتا تھا۔ اور تحقیقات مطالب سے معلومات کے ذخیرے بھرتا تھا۔ آرائش و زیبائش ان ایوانوں کو اپنے ہاتھ سے سجاتی تھی۔ گلدستے رکھتی تھی۔ عطر چھڑکتی تھی۔ پھول برساتی تھی۔ خوشبوئیاں جلاتی تھی۔ سخاوت روپوں اور اشرفیوں کی تھیلیاں لئے حاضر تھی۔ کہ دو اور حساب نہ پوچھو۔ کیونکہ انھیں لوگوں کی اوٹ میں اہل حاجت بھی آن پہنچے تھے۔ گجرات کی لوٹ میں عمدہ عمدہ کتابیں اعتماد خاں گجراتی کے کتب خانے کی آئی تھیں۔ اور خزانہ عامرہ میں جمع تھیں۔ اُن کے نسخے بھی علماء کو بٹتے تھے۔ جمال خاں قورچی نے ایک دن عرض کی کہ فدوی آگرے میں ایک دن شیخ ضیاء الدین ولد شیخ محمد غوث گوالیاری کی خدمت میں گیا تھا۔ ایسی مفلسی غالب ہوئی ہے۔ کہ میرے لئے کئی سیر چنے بھنائے تھے۔ کچھ آپ کھائے۔ کچھ مجھے دئے۔ باقی خانقاہ میں فقرا اور مریدوں کے لئے بھیج دئے۔ یہ سُن کر بادشاہ کے دل پُر درد پر اثر ہوا۔ انھیں بُلا بھیجا۔ اور اسی عبادت خانے میں رہنے کو جگہ دی۔ اُن کے اوصاف بھی مُلّا صاحب سے سُن لو۔ (دیکھو تتمہ)

افسوس یہ کہ مسجدوں کے بھوکوں کو جب تر نوالے ملے۔ اور حوصلے سے زیادہ عزتیں ہوئیں۔ تو گردنوں کی رگیں سخت تن گئیں۔ آپس میں جھگڑنے لگے۔ اور غُل ہو کر شور سے شر اُٹھے۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ میں اپنی فضیلت کے ساتھ دوسرے کی جہالت دکھاؤں۔ دغابازیاں۔ اُن کے دھوکے بازیاں اور جھگڑے بادشاہ کو ناگوار ہوئے۔ ناچار حکم دیا۔ کہ جو نامعقول بے محل بات کرے اُسے اُٹھا دو۔ مُلّا صاحب[1] سے کہا۔ آج سے جس شخص کو دیکھو کہ نامعقول بات کہتا ہے۔ ہم سے کہدو۔ ہم مجلس سے اُٹھا دیں گے۔ آصف خاں برابر حاضر تھے۔ مُلّا صاحب نے چُپکے چُپکے اُن سے کہا کہ اگر یہی بات ہے تو بہتوں کو اُٹھنا پڑیگا۔ پوچھا یہ کیا کہتا ہے؟ جو اُنھوں نے کہا تھا۔ اُس نے کہدیا۔ سُن کر بڑے خوش ہوئے۔ بلکہ اور مصاحبوں سے بیان کیا۔ مُلّا نے اپنی جنگ و جدل میں جو خود نمائی کی بیرقیں ہلاتے تھے ایک

[1] مُلّا عبدالقادر بدایونی مراد ہے۔

نمونہ اُس کا یہ ہے:۔

لطیفہ ۔ حاجی ابراہیم سرہندی مباحثوں میں بڑے جھگڑالو اور مغالطوں میں چھلاوے کا تماشہ تھے ۔ ایک دن چار ایوان کے جلسے میں مرزا مفلس سے کہا کہ موسٰے کیا صیغہ ہے ۔ اور اُس کا ماخذ اشتقاق کیا؟ مرزا علوم عقلی کے سرمایے میں بہت مال دار تھے ۔ مگر اس جواب میں مفلس ہی نکلے ۔ شہر میں چرچا ہو گیا ۔ کہ حاجی نے مرزا کو لاجواب کر دیا ۔ اور حاجی ہی بڑے فاضل ہیں ۔ جاننے والے جانتے تھے کہ یہ بھی تاثیر زمانہ کا ایک شعبدہ ہے ۔ یہ رباعی مُلّا صاحب نے فرمائی:۔

از بہر فساد و جنگ بعضے مردم	گردند بکوئے گمرہی خود را گم
در مدرسہ ہر علم کہ آموختہ اند	فِی القَبرِ یُضِرُّھُم وَلَا یَنفَعُھُم

لطیفہ ۔ تحصیل فوائد پر نظر کر کے بادشاہ خوش اعتقاد دل سے چاہتا تھا کہ یہ جلسے گرم رہیں ۔ چنانچہ ان ہی دنوں میں قاضی زادہ لشکر سے کہا ۔ کہ تم رات کو بحث میں نہیں آتے؟ عرض کی ۔ حضور آؤں تو سہی ۔ لیکن حاجی وہاں مجھ سے پوچھیں ۔ عیسٰے کیا صیغہ ہے ۔ تو کیا جواب دوں ۔ لطیفہ اُس کا بہت پسند آیا ۔ غرض اختلاف رائے اور خود نمائی کی برکت سے عجب عجب مخالفتیں ظاہر ہونے لگیں ۔ اور ہر عالم کا یہ عالم تھا ۔ کہ جو مَیں کہوں وہی آیت و حدیث مانو ۔ جو ذرا چون و چرا کرے ۔ اس کے لئے کفر سے ادھر کوئی ٹھکانا ہی نہیں ۔ دلیلیں سب کے پاس آیتوں اور روایتوں سے موجود بلکہ علمائے سلف کے جو فتوے اپنے مفید مطلب ہوں ۔ وہ بھی آیت و حدیث سے کم درجے میں نہ تھے۔

۹۸۳ھ میں مرزا سلیمان والیِ بدخشاں شاہ رخ اپنے پوتے کے ہاتھ سے بھاگ کر ادھر آئے ۔ صاحب حال شخص تھے ۔ مرید بھی کرتے تھے ۔ اور معرفت میں خیالات بلند رکھتے تھے ۔ یہ بھی عبادت خانے میں آتے تھے مشائخ و علما سے گفتگوئیں ہوتی تھیں ۔ اور ذکر قال اللہ و قال الرسول سے برکت حاصل کرتے تھے۔

مُلّا صاحب دو برس پہلے داخل دربار ہوئے تھے ۔ اُنہوں نے وہ کتابیں ساری پڑھی تھیں ۔ جنہیں لوگ پڑھ کر عالم و فاضل ہو جاتے ہیں ۔ اور جو کچھ

استادوں نے بتادیا تھا۔ وہ حرف بہ حرف یاد تھا۔ لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اجتہاد کچھ اور شے ہے۔ وہ مرتبہ نہ حاصل تھا۔ مجتہد کا یہی کام نہیں کہ آیت یاحدیث یاکسی فقہ کی کتاب کے معنے بتادے۔ کام اُس کا یہ ہے۔ کہ جہاں صراحۃً آیت یاحدیث موجود نہیں یاکسی طرح کا احتمال ہے۔ یاآئتیں یاحدیثیں بظاہر معنوں میں مختلف ہیں۔ یہ وہاں ذہن سلیم کی ہدایت سے استنباط کر کے فتوے دے۔ جہاں دشواری پیش آئے وہاں مصالح وقت کو مدّنظر رکھ کر حکم لگائے۔ آیت و حدیث عین مصالح خلق اللہ ہیں۔ اُن کے کاموں کو بند کرنے والی یا اُن کو حد سے زیادہ تکلیف میں ڈالنے والی نہیں ہیں۔

واہ رے اکبر تیری قیافہ شناسی۔ مُلّا صاحب کو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ حاجی ابراہیم کسی کو سانس نہیں لینے دیتا۔ یہ اس کا کلہ توڑیگا۔ چنانچہ علم کا زور۔ طبیعت بیباک۔ جوانی کی اُمنگ۔ بادشاہ خود مدد کو پشت پر۔ اور بڈھوں کا اقبال بڈھا ہوچکا تھا۔ یہ حاجی سے بڑھ کر شیخ صدر کو ٹکریں مارنے لگے۔

ان ہی دنوں میں شیخ ابوالفضل بھی آن پہنچے۔ اس فضیلت کی جھولی میں دلائل کی کیا کمی تھی۔ اور اس طبع خداداد کے سامنے کسی کی حقیقت کیا تھی جس دلیل کو چاہا۔ چٹکی میں اُڑادیا۔ بڑی بات یہ تھی۔ کہ شیخ اور شیخ کے باپ نے مخدوم اور صدر وغیرہ کے ہاتھ سے برسوں تک زخم اُٹھائے تھے۔ جو عمروں میں بھرنے والے نہ تھے۔ علما میں خلاف و اختلاف کے رستے تو کُھل ہی گئے تھے۔ چند روز میں یہ نوبت ہوگئی کہ فروعی مسائل تو درکنار رہے۔ اصول عقاید میں بھی کلام ہونے لگے۔ اور ہر بات پر طرہ یہ کہ دلیل لاؤ۔ اور اس کی وجہ کیا۔ رفتہ رفتہ غیر مذہب کے عالم بھی جلسوں میں شامل ہونے لگے۔ اور خیالات یہ ہوئے۔ کہ مذہب میں تقلید کچھ نہیں۔ ہر بات کو تحقیق کرکے اختیار کرنا چاہیئے۔

حق یہ ہے۔ کہ نیک نیت بادشاہ سے جو کچھ ظہور میں آیا۔ مجبوری سے تھا۔ سنہ ۹۸۶ھ تک بھی مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ کہ رات کو کثر اوقات عبادت خانے میں علما و مشائخ کی صحبت میں گذرتے تھے۔ خصوصاً جمعہ کی راتیں۔ کہ رات بھر جاگتے تھے۔ اور مسائل دین کے اصول و فروع کی تحقیقیں کرتے تھے۔ اور علماء کا یہ عالم تھا۔ کہ

زبانوں کی تلواریں کھینچ کر پل پڑتے تھے کٹے مرتے تھے۔ اور آپس میں تکفیر و تذلیل کرکے ایک دوسرے کو فناہ کئے ڈالتے تھے۔ (مُلّا صاحب کہتے ہیں) شیخ صدر اور مخدوم الملک کا یہ حال تھا کہ ایک کا ہاتھ اور ایک کا گریبان۔ دونوں طرف کے ردی نوڑ اور شر دسے چٹ مُلّانوں نے دو طرفہ دھڑے باندھ رکھے تھے۔ گویا فرعونی دَور تھا سبطی و قبطی دونوں گروہ حاضر تھے۔ ایک عالم ایک کام کو حلال کہتا تھا۔ دوسرا اسی کو حرام ثابت کر دیتا تھا۔ بادشاہ انہیں اپنے عہد کا امام غزالی اور امام رازی سمجھے ہوئے تھا۔ جب اُن کا یہ حال دیکھا تو حیران رہ گئے۔ ابوالفضل و فیضی بھی آگئے تھے۔ اور اُن کے بھی طرفدار دربار میں پیدا ہو گئے تھے۔ یہ دم بدم اُکساتے تھے اور بات بات میں ان کی بے اعتباری دکھلاتے تھے۔

آخر علمائے اسلام ہی کے ہاتھوں یہ خواری ہوئی۔ کہ اسلام اور عام مذہب یکساں ہو گئے۔ اس میں علماء اور مشائخ سب سے بڑھ کر بدنام ہوئے۔ پھر بھی بادشاہ اپنے دل سے حق مطلق کا طالب تھا۔ بلکہ ہر نقطے کی تحقیق اور ہر امر کی دریافت کا شوق رکھتا تھا۔ اس لئے ہر ایک مذہب کے عالموں کو جمع کرتا تھا۔ اور حالات دریافت کرتا تھا۔ بے علم انسان تھا۔ مگر سمجھ والا تھا۔ کسی مذہب کا دعویدار اُسے اپنی طرف کھینچ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ بھی ان سب کی سنتا تھا۔ اور اپنی من سمجھوتی کر لیتا تھا۔ اس کے پاک اعتقاد اور نیک نیت میں فرق نہ آیا تھا۔ جب ۹۸۴ھ میں داؤد افغان کا سر کٹ کر بنگالہ سے فساد کی جڑ اکھڑ گئی تو وہ شکرانے کے لئے اجمیر میں گیا۔ عین عرس کے دن پہنچا۔ بموجب اپنے معمول کے طواف کیا۔ زیارت کی۔ فاتحہ پڑھی۔ دعائیں مانگیں۔ دیر تک حضور قلب سے مراقبے میں بیٹھا رہا۔ حج کے لئے قافلہ جانے والا تھا۔ خرچ راہ میں ہزارہا آدمیوں کو روپے اور سامان سفر دیا۔ اور حکم عام دیا۔ کہ جو چاہے حج کو جائے۔ خرچ راہ خزانے سے دو۔ سلطان خواجہ خاندان خواجگان میں سے ایک خواجہ باعظمت کو میر حاج مقرر کیا۔ چھ لاکھ روپے روپے نقد۔ ۱۲ ہزار خلعت اور ہزاروں روپے کے تحفے تحائف جواہر شرفائے مکہ کے لئے دیئے۔ کہ وہاں کے مستحق لوگوں کو دینا۔ یہ بھی حکم دیا۔ کہ مکے میں عظیم الشان مکان بنوا دینا۔ تاکہ حاجی مسافروں کو تکلیف نہ ہو۔

کرے۔ جس وقت میر حاج قافلے کو لے کر روانہ ہوئے۔ تو اس تمنا میں کہ میں خانہ خدا میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ نے خود وہی وضع بنائی جو حالت حج میں ہوتی ہے۔ بال قصر کئے۔ ایک چادر آدھی کا لُنگ۔ آدھی کا جُھرمٹ۔ ننگے سر۔ ننگے پاؤں نہایت رجوع قلب اور عجز کے ساتھ حاضر ہوا۔ کچھ دور تک پیادہ پا ساتھ چلا۔ اور زبان سے اُسی طرح کہتا جاتا تھا۔ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ الخ (حاضر ہوا میں حاضر ہوا اے واحدہٗ لاشریک میں حاضر ہوا) جس وقت بادشاہ نے یہ الفاظ اس حالت کے ساتھ کہے۔ عجب عالم ہوا۔ خلق خدا کے دلوں سے آہ و نالے بلند ہوئے۔ قریب تھا کہ درختوں اور پتھروں سے بھی آواز آنے لگے۔ اس عالم میں سلطان خواجہ کا ہاتھ پکڑ کر شرعی الفاظ کہے۔ جن کے معنے یہ تھے کہ حج اور زیارت کے لئے ہم نے اپنی طرف سے تمہیں وکیل کیا۔ شعبان ۹۸۴ھ کو قافلہ روانہ ہوا۔ میر حاج چھ سال متواتر ان ہی سامانوں سے جاتے رہے۔ البتہ یہ بات پھر نہ ہوئی۔ شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں۔ کہ بعض بھولے بھالے عالموں کے ساتھ اکثر غرض پرستوں نے سا جھا کر کے بادشاہ کو سمجھایا۔ کہ حضور کو بذاتِ خود ثواب حج حاصل کرنا چاہیئے۔ اور حضور بھی تیار ہو گئے۔ لیکن جب حقیقت پرست دانشمندوں نے حج کی حقیقت اور اس کا راز اصلی بیان کیا تو اس ارادے سے باز رہے۔ اور بموجب بیان مذکورہ بالا کے میر حاج کے ساتھ قافلہ روانہ کیا۔ سلطان خواجہ مع تحائف شاہی اور اہل حج کے جہاز الٰہی میں بیٹھے کہ اکبر شاہی جہاز تھا۔ اور بیگمات جہاز سلیمی میں بیٹھیں کہ رومی سوداگروں کا تھا +

جلوۂ قدرت

علما و مشائخ کی بداقبالی کے اصلی اسباب

ایسے عالی حوصلہ شہنشاہ کے لئے یہ حرکتیں علماء کی ایسی نہ تھیں۔ جن پر وہ اسقدر بیزار ہو جاتا۔ اصل معاملہ ایک تفصیل پر منحصر ہے جسے میں مختصر بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے

[1] ۲۴ شعبان ۹۸۴ھ کو یہ قافلہ روانہ ہوا قطب الدین خاں کو کہتاش اور راجہ بھگونتی داس رانا کی مہم پر گئے ہوئے تھے انہیں حکم ہوا کہ ہمراہ ہو کر کنارہ دریائے شور تک پہنچا دو۔ دیکھو عالمگیر نامہ +

کہ جب سلطنت کا پھیلاؤ ایک طرف افغانستان سے لے کر گجرات دکن بلکہ سمندر کے کنارے تک پھیلا۔ دوسری طرف مشرق میں بنگالے سے آگے نکل گیا۔ اُدھر بھکر اور حد قندھار تک جا پہنچا۔ اور اٹھارہ بیس برس کی ملک گیری میں اس کی دلاوری نے دلوں پر سکہ بٹھا دیا۔ آمد کے رستے بھی خرچ سے بہت زیادہ کھل گئے۔ اور خزانوں کے ٹھکانے نہ رہے۔ ایسے آئین بند بادشاہ کو اس کی قانون بندی بھی واجب تھی۔ اس لئے اُدھر متوجہ ہوا۔ سلطنت کا انتظام اب تک اس طرح تھا۔ کہ دیوانی فوجداری کل قاضیوں اور مفتیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور یہ اختیار اُنہیں شریعت اسلام نے دئے ہوئے تھے جن کی بات پر کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ امراء پر ملک تقسیم تھا۔ وہ باشی۔ بیستی سے لیکر ہزاری دَ پنجہزاری تک جو امیر منصب دار ہوتا تھا۔ اس کی فوج اور اخراجات کے لئے ملک ملتا تھا۔ باقی خالصہ بادشاہی کہلاتا تھا +

اکبر کے اقبال کو اس موقع پر دو کام درپیش تھے۔ پہلے چند بااختیاروں سے جگہ خالی کرنی۔ دوسرے کارداں صاحب ایجاد اشخاص کا پیدا کرنا۔ پہلا کام کہ ظاہر میں فقط اپنے نوکروں کا موقوف کر دینا ہے۔ آج آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اُس وقت ایک کٹھن منزل تھا۔ کیونکہ قدامت نے اُن کے قدم گاڑ دیئے تھے۔ جن کا اگلے وقتوں میں ہلانا بھی محال تھا۔ اگرچہ لیاقت اُن کے لئے بالکل سفارش نہ کرتی تھی۔ لیکن رحم اور حق شناسی جوہر وقت اکبر کے ناصح مخفی تھے۔ اُن کے ہونٹ برابر ہلے جاتے تھے۔ مضمون سفارش یہی کہ اُن کے باپ دادا تمہارے باپ دادا کی خدمت میں رہے۔ انہوں نے تمہاری خدمت کی ہے۔ یہ اب کسی کام کے نہیں رہے۔ اور اس گھر کے سوا ان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ اُس زمانے میں خاص و عام اپنے خیالات پر ایسے جمے ہوئے تھے کہ اُن کے نزدیک کسی پہلے دستور کا بدلنا اگرچہ قلم کی تراش ہی کیوں نہ ہو ایسا تھا۔ جیسے نماز روزہ کو بدل دیا۔ وہ لوگ اعتقاد کئے بیٹھے تھے۔ کہ جو کچھ بزرگوں سے چلا آتا ہے۔ عین آیت و حدیث ہے۔ اس میں یہ بھی کہنے کی حاجت نہ تھی۔ کہ جس نے یہ قاعدہ باندھا وہ کون تھا۔ یہ بھی پوچھنا ضرور نہیں کہ مذہبی طور پر ہوا تھا۔ یا عام کاروبار کے طور پر۔ اُن کے دل پر نقش تھا۔ کہ جو کچھ ہمارے بزرگوں سے چلا آتا ہے۔ اُس کی برکت ہزاروں منافع کا چشمہ اور بے شمار برائیوں کے لئے

مبارک سپر ہے جس میں ہماری عقل کام نہیں کرسکتی۔ ایسے لوگوں سے یہ کب ممکن تھا کہ وہ موجودہ باتوں پر غور کریں۔ اور آگے عقل دوڑائیں۔ کہ کیا صورت ہو۔ جو حالت موجودہ سے زیادہ فائدہ مند اور باعث آسانی ہو۔ یہ لوگ یا علما تھے۔ کہ شریعت کے سلسلے میں کارروائی کر رہے تھے۔ یا عام اہلکار اور اہل عمل تھے۔ اکبر کے اقبال نے ان دونوں مشکلوں کو آسان کر دیا۔ علما کی مشکل تو اس طرح آسان ہوئی کہ تم سُن چکے۔ یعنی خدا پرستی اور حق جوئی کے جوش نے اسے علمائے دیندار کی طرف زیادہ متوجہ کیا۔ اور یہ توجہ اس درجے کو پہنچی۔ کہ انعام و اکرام اور قدر دانی اُن کی حد سے گزر گئی۔ حسد اس فرقے کا جوہر ذاتی ہے۔ اُن میں جھگڑے اور فساد شروع ہوئے۔ لڑائی میں ان کی چلتی تلوار کیا ہے؟ تکفیر اور لعنت۔ اُس کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ آخر لڑتے لڑتے آپ ہی گر پڑے۔ آپ ہی بے اعتبار ہو گئے۔ صاحب تدبیر کو فکر و تردد کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔ آزاد۔ وقت کی حالت دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے ادبار کا موسم آگیا تھا۔ ثواب کی نظر سے ایک معاملہ پیش ہوتا ہے۔ عذاب نکل آتا ہے۔ مہم بنگالہ جو کئی برس جاری رہی تو معلوم ہوا۔ کہ اکثر علماء مشائخ کے عیال فقر و فاقے سے تباہ ہیں۔ خدا ترس بادشاہ کو رحم آیا۔ حکم دیا کہ سب جمعہ کو جمع ہو۔ بعد نماز ہم آپ روپے بانٹیں گے۔ ایک لاکھ مرد عورت کا انبوہ تھا۔ میدان چوگان بازی میں جمع ہوئے۔ فقرا کا ہجوم۔ دلوں کی بیصبری۔ احتیاج کی مجبوری۔ کارداروں کی بیدردی یا بے پروائی۔ اسی بندے خدا کے پامال ہو کر جان سے گئے۔ اور خدا جانے کتنے پس کر نیم جاں ہوئے۔ مگر کمروں سے اشرفیوں کی ہمیانیاں نکلیں۔ بادشاہ رحم کا پُتلا تھا۔ جلد نرس آجاتا تھا۔ نہایت افسوس کیا۔ مگر اشرفیوں کو کیا کرے۔ بدگمان اور بے اعتقاد بھی ہو گیا۔

شیخ صدر کی مسند بھی اُلٹ چکی تھی۔ اور بہت کچھ پردے کُھل گئے تھے کئی دن کے بعد ۹۸۷ھ میں نئے صدر[1]

[1] ملا صاحب لکھتے ہیں کہ یہ قاضی علی بغدادی۔ ملا حسین واعظ کے پوتے تھے انہیں کارگزار دیکھ کر شیخ صدر کی جگہ پر صدر نشین کیا تھا یہ بھی دربار الٰہی سے اپنے حق کو پہنچ گئے تھے ۱۰۰۰ھ میں کشمیر کے دیوان تھے وہاں لمبے چوڑے حساب اور ہزاروں دقتیں پھیلا رکھی تھیں بسپاد رعیت کا ناک میں دم تھا خنجر زمانہ نے کان کاٹے اور کٹے ہوئے کان پر قلم رکھا گدھے پر چڑھا کر تشہیر کیا کہ عدم سفر میں بھی پیادہ نہ جائیں۔ ملا صاحب نے زاد سفر عنایت کیا ؎

چونکہ قاضی علی بغدادی حسرتے یادگار باخود برد
خامۂ منشیٔ قضا بنوشت سال تاریخ او کہ موذی مُرد

کو حکم دیا۔ کہ مسجدوں کے اماموں اور شہروں کے مشائخ وغیرہ کے لئے جو صدر سابق نے جاگیریں دی تھیں۔ ہزاری سے پانصدی تک کو پڑتال کرو۔ تحقیقات میں بہت سے جاگیر خوار تخفیف میں آئے۔ اور اس قربانی میں کسی کو دیا تو گویا گائے بیں سے غدود۔ باقی ہضم۔ مسجدیں ویران۔ مدرسے کھنڈر۔ بزرگان و اکابر اور روشناس مشاہیر شہروں میں ذلیل ہو گئے۔ جلاوطن ہو گئے۔ تباہ ہو گئے۔ جو رہے۔ بدنام کرنے والے۔ آرام کے بندے۔ باپ دادا کی ہڈیاں بیچنے والے جب محتاج ہوئے۔ تو دھنیوں۔ جلاہوں سے بدتر ہو گئے۔ اور انہی میں مل گئے۔ بلکہ ہندوستان میں کسی فرقے کی اولاد ایسی ذلیل نہ تھی۔ جیسے شرفائے مشائخ کی۔ خدمتگاری و سائیسی بھی نہ ملتی تھی۔ کیونکہ وہ بھی نہ ہو سکتی تھی۔

ان لوگوں سے بداعتقادی و بیزاری کا سبب ایک نہ تھا۔ بڑے بڑے پیچ تھے۔ اُن میں سے کھلی بات بنگالے کی بغاوت تھی۔ کہ بزرگان مذکور کی برکت سے اس طرح پھیل پڑی۔ جیسے بن میں آگ لگی۔ سبب اس کا یہ ہوا۔ کہ بعض مشائخ معافی دار اور مسجدوں کے امام اپنی جاگیروں کے باب میں ناراض ہوئے ان کے دماغ پشتوں سے بلند چلے آتے تھے۔ اور اسلام کی سند سے سلطنت کو اپنی جاگیر سمجھے بیٹھے تھے۔ مشائخ عظام اور ایمۂ مساجد نے (انہیں آج تم ایسی کنگال حالت میں دیکھتے ہو۔ اُن دنوں میں یہ لوگ بادشاہ کی حقیقت کیا سمجھتے تھے) وعظ کی مجلسوں میں ہدایت شروع کر دی۔ کہ بادشاہ وقت کے ایمان میں فرق آگیا۔ اور اُس کے عقائد درست نہیں ہیں۔ اتفاق یہ کہ کئی امرائے فرمانروا دربار کے بعض احکام سے۔ اور اپنی تنخواہ لشکر۔ اور ملک کے حساب کتاب وغیرہ میں ناراض تھے۔ انہیں بہانہ ہاتھ آیا۔ دینی اور دنیاوی فرقے متفق ہو گئے۔ علماء اور قاضیوں اور مفتیوں میں سے بھی جو ہو سکا۔ اُسے بلا لیا۔ چنانچہ ملا محمد یزدی قاضی القضاۃ جونپور تھے۔ انہوں نے فتوے دیا۔ کہ بادشاہ وقت بدمذہب ہو گیا۔ اُس پر جہاد واجب ہے۔ جب یہ سندیں ہاتھ میں آئیں۔ تو کئی جلیل القدر۔ عمروں کے جاں نثار۔ صاحب لشکر امیر۔ بنگالہ اور شرق رویہ ملکوں میں باغی ہو گئے۔ اور جہاں جہاں تھے تلواریں کھینچ کر نکل پڑے۔ وفادار امیر اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس آگ کے بجھانے کو دوڑے۔ بادشاہ نے آگرے سے

خزانے اور فوجیں کمک پر بھیجیں مگر فساد روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ائمۂ مساجد اور خانقاہوں کے مشائخ کہتے تھے کہ بادشاہ نے ہماری معاش میں ہاتھ ڈالا۔ خدا نے اُس کے ملک میں ہاتھ ڈالا۔ اس پر آئتیں اور حدیثیں پڑھتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے

وہ اکبر بادشاہ تھا۔ اُسے ایک ایک بات کی خبر پہنچتی تھی۔ اور ہر بات کا تدارک کرنا واجب تھا۔ مُلّا محمد یزدی اور معز الملک کو ایک بہانے سے بلا بھیجا۔ جب وزیر آباد (آگرے سے دس کوس پہنچے تو حکم بھیجا۔ کہ ان دونوں کو الگ کرکے دریائے جمن کے رستے گوالیار پہنچا دو۔ (مجرمان سلطنت کا جیلخانہ تھا) پیچھے حکم پہنچا۔ کہ فیصلہ کردو۔ پہرے داروں نے دونوں کو ایک ٹوٹی کشتی میں ڈالا۔ اور تھوڑی دُور آگے جاکر چادر آب کا کفن دیا۔ اور گرداب کی گور میں دفن کر دیا۔ اور مشائخ ملاؤں کو بھی جن جن پر شُبہ تھا۔ ایک ایک کرکے عدم کے تہ خانے میں بھیج دیا۔ بہتیروں کو نقل مکان کے ساتھ پورب سے پچھم اور دکھن سے اُتر میں پھینک دیا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ ان کا اثر بہت تیز و تند اور سخت پُر زور ہے۔ چنانچہ اس بداعتقادی کا چرچا مکّے مدینے اور روم اور بخارا و سمرقند تک پہنچا۔ عبداللہ خاں اُزبک نے رسم کتابت بند کردی۔ مدّت کے بعد جو مراسلہ لکھا۔ تو اُس میں صاف لکھ دیا۔ کہ تم نے اسلام چھوڑا۔ ہم نے تمہیں چھوڑا۔ اور اُدھر کا اکبر کو بڑا بچاؤ رہتا تھا۔ کیونکہ اُزبک کی بلا نے دادا کو وہاں سے نکالا تھا۔ اور اب بھی اُس کا کنارہ قندھار۔ کابل اور بدخشاں سے لگا ہوا تھا۔ باوجود ان تدبیروں کے بغاوت مذکور کئی برس میں دبی۔ کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔ لاکھوں جانیں گئیں۔ ملک تباہ ہوگئے +

بہت سے قاضی مفتی۔ علماء و مشائخ عہدہ دار تھے۔ ان کی رشوت خواریوں اور فتنہ کاریوں نے تنگ کر دیا۔ یہ بھی خیال تھا کہ شاید ان میں صاحب معرفت اور اہل دل بلکہ کشف و کرامات والے لوگ ہوں۔ ملک کی مصلحت نے حکم دیا۔ کہ جو صاحب سلسلۂ مشائخ ہیں۔ سب حاضر ہوں۔ اب دل میں ان لوگوں کی وہ عظمت نہ رہی۔ جو ابتدا میں تھی۔ چنانچہ ملازمت کے وقت نئے آئینوں کے بموجب انہیں بھی تسلیم و کورنش وغیرہ بجالانی پڑیں۔ پھر بھی ہر ایک کی جاگیر و وظیفہ کو خود دیکھتا تھا۔ خلوت و جلوت میں باتیں بھی کرتا۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ شاید اس گروہ میں

کوئی سوار نکلے۔ اور اُس سے کچھ خدا کا رستہ معلوم ہو۔ مگر افسوس کہ وہ بات کے قابل بھی نہ تھے۔ اُن سے کیا معلوم ہوتا۔ خیر جو مناسب دیکھے۔ جاگیر۔ وظیفے دئے۔ جسے سنتا کہ مرید کرتا ہے۔ حال وقال کا جلسہ جماتا ہے۔ اُسے کہیں کا کہیں پھینک دیتا۔ ان لوگوں کا نام دُکان دار رکھا تھا۔ اور سچ رکھا تھا۔ ع

	بدنام کنندہ نکونامے چند	

روز انہیں کی جاگیروں کے مقدمے پیش رہتے تھے۔ کیونکہ یہی لوگ معافی دار بھی تھے انقلاب زمانہ دیکھو! جتنے بڈھے سن رسیدہ مشائخ تھے (واجب الرحم و قابل ادب نظر آتے تھے) اُنہیں پر فتنہ و فساد کا خیال زیادہ ہوتا تھا۔ کیونکہ وہی زیادہ ان صفتوں سے موصوف ہوتے تھے۔ اور انہی پر لوگ گرویدہ ہوتے تھے۔ آخر حکم ہوا۔ کہ صوفیہ و مشائخ کے فرمانوں کی پڑتال ہند و دیوان کریں۔ کہ رعایت نہ کرینگے پُرانے پُرانے خاندانی مشائخ جلاوطن کئے گئے۔ گھروں میں چھپ رہے۔ گمنام بیٹھے۔ بدحالی کے حال وقال سب بھلا دئے ؎

	کہ یاراں فراموش کردند عشق		چناں قحط سالے شد اندر دمشق	

اے خدا تیری شان۔ چوں آئیم بر سر قہر۔ نہ خویش گزارم نہ بیگانہ۔ سوکھوں کے ساتھ گیلے۔ بروں کے ساتھ اچھے سب جل گئے۔

علمائے با اختیار ہیں کہ اراکین دربار تھے۔ بعض اشخاص فی الحقیقت صاحب دل اور کریم النفس تھے۔ مثلاً میر سید محمد **میر عدل** کہ خالص اسلام کے باخبر عالم تھے اور عالم بھی باعمل تھے۔ علوم دینیہ کی سب کتابیں پڑھے تھے۔ مگر جتنے الفاظ کتاب میں لکھے تھے۔ اُن سے بال بھر سرکنا کفر سمجھتے تھے۔ خاص سے لے کر عام تک سب ان کا ادب کرتے تھے۔ اور اکبر خود بھی لحاظ کرتا تھا۔ سلطنت کی مصلحتوں پر نظر کر کے انہیں دربار سے ٹالا۔ اور بھکر کا حاکم کر کے بھیج دیا۔ بیشک وہ ایسے نیک اور نیک نیت شخص تھے کہ اُن کا دربار سے جانا برکت کا جانا تھا۔ مخدوم الملک اور شیخ صدر کے حال میں نے علیحدہ لکھے ہیں۔ تم پڑھو گے تو معلوم کرو گے۔ مخدوم نے کئی بادشاہوں کے دور اس طرح بسر کئے تھے۔ کہ شریعت کے پردے میں دربار کے ایوان۔ امیروں کے دیوان بلکہ رعایا کے گھر گھر پر دھواں دھار چھائے ہوئے

تھے - شاہانِ با اقبال اُن کا مُنہ دیکھتے رہتے تھے - اور انہیں اپنے ساتھ موافق رکھنا مصالحِ ملکی کا جزو سمجھتے تھے - ان کے آگے یہ لڑکا بادشاہ کیا مال تھا - اللہ اللہ لڑکوں کے ہاتھوں بڑھاپے کی مٹی خراب ہوئی (ابوالفضل و فیضی کون تھے - ان کے آگے کے لڑکے ہی تھے) +

شیخ صدر کے اختیار اگرچہ بادشاہ نے خود بڑھائے تھے - مگر اُن کی کُہن سالی اور جلالت خاندانی نے (کہ امام صاحب کی اولاد میں تھے) لوگوں کے دلوں میں بڑا اثر دوڑایا تھا - اور ابتدا میں انہی اوصاف کی سفارشوں نے دربارِ اکبری میں لاکر اُس رتبہ عالی تک پہنچایا تھا - کہ ہندوستان میں ان سے پہلے یا پیچھے کسی کو نصیب نہ ہوا - علمائے عصر ان کے بچے کچے تھے - کہ قاضی و مفتی بن کر ملک ملک میں امیر و غریب کی گردن پر سوار تھے - شاہ با تدبیر نے ان دونوں کو مکے بھیج کر داخلِ ثواب کیا اور بہتیرے علمار تھے - انہیں اِدھر اُدھر ٹال دیا +

جو کچھ کیا مصلحت کی مجبوری سے کیا

عہدِ قدیم میں ہر سلطنت کو شریعت کے ساتھ ذاتی پیوند رہا ہے - اوّل اوّل سلطنت شریعت کے زور سے کھڑی ہوئی - پھر شریعت اس کے سائے میں بڑھتی گئی - مگر اس دربار کا رنگ کچھ اور ہونے لگا - اوّل تو سلطنت کی جڑ مضبوط ہو کر دُور تک پہنچ گئی تھی - دوسرے بادشاہ سمجھ گیا تھا - کہ ہندوستان میں اور توران و ایران کی حالت میں مشرق مغرب کا فرق ہے - وہاں بادشاہ اور رعایا کا ایک مذہب ہے - اس لئے جو کچھ علماے دین حکم دیں - اُسی پر سب کو ایمان لانا واجب ہوتا ہے - خواہ کسی کی ذاتِ خاص یا ملکی امورات کے موافق ہو - خواہ مخالف - برخلاف اس کے ہندوستان ہندوؤں کا گھر ہے - ان کا مذہب اور رسم و رواج اور معاملات کا جُدا طور ہے - ملک گیری کے وقت جو باتیں ہو جائیں وہ ہو جائیں - جب ملک داری منظور ہو - اور اس ملک میں رہنا ہو تو چاہئے کہ جو کچھ کریں نہایت سوچ سمجھ کر اور اہلِ ملک کے مقاصد و اغراض کو مدنظر رکھ کر کریں +

تم جانتے ہو کہ صاحبِ عزم بادشاہ کے لئے جس طرح ملک گیری کی تلوار میدان صاف کرتی ہے۔ اسی طرح ملک داری کا قلم تلوار کے کھیت کو سبز کرتا ہے۔ اب وہ وقت تھا۔ کہ تلوار بہت سا کام کر چکی تھی۔ اور قلم کی عرق ریزی کا وقت آیا تھا۔ علماء نے شریعت کے اسناد سے خدائی زور پھیلا رکھے تھے۔ کہ نہ اُن کو کوئی دل برداشت کر سکتا تھا۔ نہ ملک کی مصلحت اس بنیاد پر بلند ہو سکتی تھی۔ بعض امراء بھی اکبر کی رائے سے متفق تھے۔ کیونکہ جانیں لڑا کر ملک لینا انہیں کا کام تھا۔ اور پھر ملک داری کر کے حکومت جمانا بھی انہیں کا ذمہ تھا۔ وہ اپنے کام کی مصلحتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ قاضی و مفتی ان کے سر پر حاکم شرع تھے۔ بعض مقدموں میں لالچ سے بعض جگہ حماقت سے۔ کہیں بے خبری۔ کہیں بے پروائی سے۔ کہیں اپنے فتوے کا زور دکھانے کو امراء کے ساتھ اختلاف کرتے تھے۔ اور انہیں کی پیش جاتی تھی۔ اس صورت میں امراء کو ان سے تنگ ہونا واجب تھا۔ دربار میں اب ایسے عالم بھی آگئے تھے کہ قرابا دین قدرت کے عجائب نسخے تھے۔ خوشامد اور حصول انعام کے لالچ نے انہیں ایسے ایسے مسائل بتا دیئے تھے کہ بادشاہوں کے شوق مصلحت سے بھی بہت آگے نکل گئے تھے۔ اور نئی اصلاح و انتظام کے لئے رستہ کھُلا۔

ابوالفضل و فیضی کا نام ناحق بدنام ہے۔ کر گئے داڑھی والے پکڑے گئے مونچھوں والے۔ غازی خاں بدخشی نے کہا۔ کہ بادشاہ کو سجدہ جائز ہے۔ علما نے کان کھڑے کئے۔ غل مچایا۔ گفتگو کے سلسلے پھیل کر اُلجھے۔ معترض ملانوں کے جوش نہ دم لینے تھے۔ نہ لینے دیتے تھے۔ جواز کے طرف دار بڑی ملائمت سے اُنہیں روکتے اور اپنی بنیاد جمائے جاتے تھے۔ کہتے تھے کہ عہد سلف پر نظر کرو۔ اُمت ہائے قدیمہ کو دیکھو۔ وہ عموماً اپنے بزرگوں کے سامنے تحفہ عجز و نیاز سمجھ کر ادب سے پیشانی زمین پر رکھتے تھے۔ ملائک کا سجدہ حضرت آدم کو کیسا تھا؟ ج ظاہر کہ تعظیمی۔ باپ اور بھائیوں کا سجدہ حضرت یوسف کو کیوں تھا؟ ج تحفہ ادب پیش کیا تھا۔ نہ کہ پرستش بندگی۔ بس، وہی سجدہ یہ ہے۔ پھر انکار کیوں؟ اور تکرار کیا؟

لطیفہ۔ طرہ اس پر یہ ہے کہ ملا عالم کابلی ہمیشہ افسوس کیا کرتے تھے کہ ہائے مجھے یہ نکتہ نہ سوجھا۔ حریف بازی لے گیا۔

لطیفہ۔ حاجی ابراہیم سرہندی کے زعفرانی اور لال کپڑوں پر جو دھبہ لگا۔ دیکھو میر سید محمد میر عدل کے حال میں ✦

لطیفہ۔ بادشاہ نے کہا کہ مہر کا سجع اللہ اکبر کہیں تو کیسا ہو۔ باوجود اوصاف مذکورہ کے حاجی صاحب بولے۔ اس میں شبہ پڑتا ہے۔ اس لئے ولذکر اللہ اکبر ہو تو بہتر ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ یہ شبہ نہیں وہم و وسوسہ ہے۔ بندہ ضعیف محتاج۔ عاجز۔ خدائی کا دعویٰ کیونکر کر سکتا ہے۔ ایک شاعرانہ مناسبت ہے۔ اس مطلب کو اُدھر لے جانا کیا ضرور تھا۔ سب طرف سے اس کی تائید ہوئی۔ اور یہی لکھا گیا ✦

غرض نوبت یہ ہوئی کہ شریعت کے اکثر فتوے تجویزات ملکی سے ٹکرانے لگے۔ علما، تو ہمیشہ سے زوروں پر چڑھے چلے آتے تھے۔ وہ اُڑنے لگے۔ اور بادشاہ بلکہ امرا بھی تنگ ہوئے۔ شیخ مبارک نے دربار میں کوئی منصب نہ لیا تھا۔ مگر برس میں ایک دو دفعہ کسی مبارک باد یا کچھ اور تقریب سے اکبر کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کی تعریف میں اوّل تو اتنا ہی کہنا کافی ہے۔ کہ ابوالفضل و فیضی کے باپ تھے۔ اور جو فضل و کمال بیٹوں کو بہم پہنچا۔ اُسی مبارک باپ کی کرامات تھی۔ وہ جیسا علم و فضل میں ہمہ داں عالم تھا۔ ویسا ہی عقل و دانش کا پُتلا تھا۔ اُس نے کئی سلطنتیں دیکھی تھیں۔ اور سو برس کی عمر پائی۔ مگر دربار یا اہلِ دربار سے تعلق ہی نہ پیدا کیا۔ علمائے عہد درباروں اور سرکاروں میں دوڑتے پھرتے تھے۔ وہ اپنے گھر کے گوشہ میں علم کی دُوربین لگائے بیٹھا تھا۔ اور ان شطرنج بازوں کی چالوں کو دُور سے دیکھ رہا تھا۔ کہ کہاں بڑھتے ہیں۔ اور کہاں چوکتے ہیں۔ اور بے غرض دیکھنے والا تھا۔ اس لئے چالیں اسے خوب سُوجھتی تھیں۔ اس نے ان لوگوں کے تیرِ ستم بھی اتنے کھائے تھے۔ کہ دل چھلنی ہو رہا تھا۔ شیخ مبارک کی تجویز سے یہ صلاح ٹھیری کہ چند عالموں کو شامل کر کے آیتوں اور روایتوں کی اسناد سے ایک تحریر لکھی جائے۔ خلاصہ جس کا یہ کہ امام عادل کو جائز ہے کہ اختلافی مسئلے میں اپنی رائے کے بموجب وہ جانب اختیار کرے۔ جو اس کے نزدیک مناسب وقت ہو۔ اور اُس کی تجویز کو علماء و مجتہدین کی رائے پر ترجیح ہو سکتی ہے۔ مسوّدہ شیخ مبارک نے کیا۔ قاضی جلال الدین ملتانی۔ صدر جہاں مفتی کل ممالک

ہندوستان ۔ خود شیخ موصوف ۔ غازی خاں بدخشی نے اوّل دستخط کئے ۔ پھر اگرچہ مطلب توجن سے تھا ۔ اُنہیں سے تھا ۔ مگر علماء ۔ فضلا ۔ قاضی و مفتی اور بڑے بڑے عمامہ بند ۔ جن کے فتووں کو لوگوں کے دلوں میں گہری تاثیریں تھیں ۔ سب بلائے گئے ۔ اور مہریں ہو گئیں ۔ اور ۹۸۷ھ میں علماء کی مہم عظیم فتح ہوئی +

اس محضر کے بنتے ہی علمائے دولت پرست کے گھروں میں ماتم پڑ گئے مسجدوں میں بیٹھے تھے تسبیحیں ہاتھ میں ۔ منہ سے نکلتا تھا کہ بادشاہ کافر ہو گیا ۔ اور حق بجانب تھا کہ سلطنت ہاتھ سے نکل گئی ۔ اگلے وقتوں میں ایک حکمت عملی تھی کہ جن لوگوں کا کچھ لحاظ ہوتا تھا ۔ اور ملک میں رکھنا مصلحت نہ ہوتا تھا ۔ انہیں مکّہ کو بھیج دیتے تھے ۔ چنانچہ شیخ و مخدوم کو بھی ہدایت ہوئی ۔ انہوں نے کہا کہ ہم پر حج واجب نہیں ۔ ہمارے پاس پیسہ کہاں ہے غرض ریل دھکیل کر دونوں کو روانہ کر ہی دیا ۔ دیکھو دونوں صاحبوں کے حال +

امام عادل کے لفظ پر بادشاہ کا خیال ہوا کہ خلفائے راشدین اور اکثر سلاطین بلکہ امیر تیمور اور مرزا الغ بیگ گورگان بھی برسر منبر جمعہ و جماعت میں خطبہ پڑھا کرتے تھے ۔ ہمیں بھی پڑھنا چاہیے ۔ چنانچہ مسجد فتح پور میں جو جمعہ کے دن جماعت ہوئی ۔ تو بادشاہ منبر پر گئے ۔ لیکن عجب اتفاق ہوا کہ تھر تھر کانپنے لگے ۔ اور زبان سے کچھ نہ نکلا ۔ آخر شیخ فیضی کے ۳ شعر پڑھ کر اُتر آئے ۔ سو بھی اور کوئی برابر سے بتاتا گیا :۔

خداوندے کہ مارا خسروی داد	دل دانا و بازوئے قوی داد
بعدل و داد مارا رہنموں کرد	بجز عدل از خیال ما بروں کرد
بود وصفش زحدِّ فہم برتر	تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر

دوسرا کام ۔ اہلِ عمل میں بھی دیوان اور منشی بڑے بڑے کار گزار امیر تھے ۔ ان پُرانے پاپیوں نے بادشاہی دفتر کو اختیار کے بستوں میں باندھ رکھا تھا ۔ اُن کی دفتری لیاقت ۔ پُرانی واقفیت ۔ اور حساب کتاب کی مہارت کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی ۔ اور بادشاہ سمجھتا تھا کہ مَیں بے علم ہوں ۔ اس مہم کو بھی اس کے

اقبال نے بڑے اسلوب سے سرانجام کیا۔ کوئی مر گیا۔ کسی کو گردش ایام نے پیچ میں ڈال کر مارا۔ ان کی جگہ بالیاقت۔ باکمال صاحب ایجاد لوگوں کو گھر کے گوشے سے نکال کر۔ دُور دُور کے مُلکوں سے کھینچ کر دربار میں حاضر کر دیا۔ ٹوڈرمل۔ فیضی۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام۔ میر فتح اللہ شیرازی۔ نظام الدین بخشی وغیرہ اشخاص تھے۔ ان میں ایک ایک شخص ہر فنی تھا۔ اور جس فن میں دیکھو بجائے خود ایسی دستگاہ رکھتا تھا۔ کہ گویا یک فنی تھا۔ یہ لوگ اس وقت کے ارسطو و افلاطون تھے۔ اگر اظہار فن کے موقع پاتے تو خدا جانے کیا کیا کچھ لکھ جاتے۔ مگر وقت نہ پایا۔ دفتر کی ترتیب اور حساب کتاب کا انتظام ان کے رتبۂ کمال کے لئے کمینہ کام تھا۔ دفتر مال اور اس کے حساب کتاب میں بھی ایسے تھے۔ کہ ایک ایک شخص کا نام گوشۂ کاغذ میں موتی ہو کر ملکے۔ مگر ٹوڈرمل اسی کام میں تھا۔ اس لئے پہلے اس کا نام لینا واجب ہے +

اس وقت تک دفتر شاہی کہیں ہندی میں تھا۔ کہیں فارسی میں۔ کہیں مہاجنی بہی کھاتہ۔ کہیں ایرانی ترتیب۔ اس میں بھی پُرزے پُرزے کاغذ کے بےحساب تھے۔ سررشتہ وانتظام نہ تھا۔ یہ مجسم عقلیں مل کر بیٹھیں۔ کمیٹیاں کیں۔ گفتگوئیں ہوئیں۔ مال۔ دیوانی۔ فوجداری وغیرہ وغیرہ کے الگ الگ سررشتے باندھے۔ اور ہر ایک کو اصول وضوابط کے رشتوں سے کس دیا۔ کہ کل قلمرو اکبری میں ایک آئین اکبری جاری ہو۔ ہر بات میں جزوی جزوی نکتوں پر نظر کی گئی۔ جس کا پہلا نقطہ یہ تھا۔ کہ کل دفتروں میں ایک سنہ پر حساب کی بنیاد ہو۔ اور اسی کا نام سنہ فصلی ہو۔ مُلّا صاحب نے اس بات پر بڑی داد و بے داد کی ہے۔ اور اسے بھی انہی فریادوں میں داخل کیا ہے۔ جن سے اکبر کے دل میں تنفر یا عداوت اسلام ثابت کرتے ہیں۔ لیکن معاملے کی اصلیت اُس فرمان کے مطالعے سے کھلتی ہے جو اس باب میں جاری ہوا۔ فرمان مذکور سے یہ بھی آئینہ ہوتا ہے کہ معاملاتِ سلطنت میں کیا کیا مشکلیں سدِّ راہ تھیں۔ جس کے لئے بادشاہِ ملک پرور کو یہ قانون باندھنا واجب ہوا تھا۔ مَیں بھی فضول فقروں کو چھوڑ کر ترجمہ لکھتا ہوں۔ مگر احتیاط رکھی ہے۔ کہ جو مطلب کے فقرے ہیں۔ اُن کا مضمون نہ رہ جائے۔ فرمان مذکور ابوالفضل کا لکھا ہوا تھا + (دیکھو تتمہ)

بندوبست مالگزاری

مالگزاری اور مالیات کا انتظام حقیقت میں ابھی تک تخمین پر تھا جن دیہات کا جو رقبہ تھا۔ اور جو اُس کی جمع تھی۔ وہی صدہا سال سے بندھی چلی آتی تھی بہتیری باتیں منشیانِ دفتر کی زبان پر ہی تھیں۔ سلطنتوں کے انقلابوں نے انتظام کا موقع نہ آنے دیا تھا۔ دفتر مال میں بڑی خرابی یہ تھی۔ کہ ایک امیر کو ملک دیتے تھے۔ اہل دفتر اُسے ۱۰ ہزار کا کہتے تھے۔ وہ حقیقت میں پندرہ ہزار کا ہوتا تھا۔ پھر بھی جسے دیتے تھے وہ روتا تھا۔ کہ ۵ ہزار کا بھی نہیں۔ تجویز ہوئی۔ کہ کل ممالک محروسہ کی **پیمائش** ہو جائے۔ اور جمع تحقیقی قرار دی جائے۔ **جریب** رسی کی ہوتی تھی۔ اس سے تر و خشک میں فرق ہو جاتا تھا۔ اس لئے بانس کے ٹوٹوں میں لوہے۔ کے حلقے ڈال کر جریبیں تیار ہوئیں۔ رعایا کے فائدے کو مدِنظر رکھ کر ۵۰ گز کی جگہ ۶۰ گز کا طول قرار دیا تمام اراضی خشک و تر مع اقسام زمین۔ ریت کے میدان۔ کوہستان۔ بیابان۔ جنگل۔ شہر۔ دریا۔ نہر۔ جھیل۔ تلاؤ۔ کواں وغیرہ وغیرہ سب کو ماپ ڈالا۔ اور کوئی چیز باقی نہ چھوڑی۔ ذرّہ ذرہ دفتر میں قلمبند کر لیا۔ یہ سمجھ لو کہ کاغذات مالگزاری میں جو جو تفصیلیں تم آج دیکھتے ہو۔ یہ اکبری عہد کی تحقیقیں ہیں۔ کہ اب تک اُسی طرح چلی آتی ہیں۔ البتہ بعض اصلاحیں بھی ہوئی ہیں۔ اور ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔

بعد پیمائش کے جس قدر زمین کا محصول ایک کروڑ تنگہ ہو۔ وہ ایک معتبر آدمی کو دی گئی۔ اس کا نام **کروری** ہوا۔ اس پر کارکن **فوطہ دار** مقرر ہوئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اقرار نامہ لکھا گیا۔ کہ تین برس میں نامزروعہ کو بھی مزروعہ کر دوں گا۔ اور روپیہ خزانے میں داخل کر دوں گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے جزئیات اس تحریر میں داخل تھے۔

سیکری گاؤں کو فتح پور شہر بنا کر مبارک سمجھا تھا۔ اور اس کی رونق اور آبادی و زیبائی اور اعزاز کا بڑا خیال تھا۔ بلکہ چاہا تھا کہ یہ دارالخلافہ ہو جائے۔ اسی مرکز سے چاروں طرف پیمائش شروع ہوئی۔ پہلے موضع کا نام آدم پور۔ پھر شیث پور۔

ایوب پور وغیرہ وغیرہ ہوکر یہ ٹھیری کہ تمام مواضع پیغمبروں کے نام پر ہو جائیں بنگ بہار۔ گجرات دکن۔ بدستور الگ رکھے گئے۔ اور اُس وقت تک کابل۔ قندھار، غزنین۔ کشمیر۔ ٹھٹہ۔ سواد بنیر۔ بجور۔ تیراہ۔ بنگش۔ سورٹھ۔ اڑلیسہ فتح نہ ہوئے تھے۔ باوجود اس کے ۱۸۲ عامل (کروری) مقرر ہوئے +

جس طرح چاہا تھا اُس طرح یہ کام نہ چلا۔ کیونکہ لوگ اس میں اپنا نقصان سمجھتے تھے۔ معافی دار جانتے تھے کہ ہمارے پاس زمین زیادہ ہے۔ اور اس کی آمدنی بھی زیادہ ہے۔ پیمائش کے بعد جس قدر زیادتی ہوگی کتر لیں گے۔ جاگیر دار یعنی امرا کو بھی یہی خیال تھا۔ انسان کی طبیعت کو خدا نے ایسا بنایا ہے کہ وہ کسی پابندی کے نیچے آنا گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے زمیندار بھی کچھ خوش تھے کچھ ناخوش۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی کام نہیں چل سکتا۔ جب تک کہ کل اشخاص جن جن کا قدم اس میں ہے سب خوش اور یک دل ہو کر کوشش نہ کریں۔ چہ جائیکہ نقصان سمجھ کر حارج ہوں۔ افسوس یہ ہے۔ کہ کروریوں نے آبادی پر اتنی کوشش نہ کی جتنی تحصیل پر۔ کاشتکار اُن کے ظلم سے برباد ہو گئے۔ بال بچوں کو بیچ ڈالا۔ خانہ ویران ہو گئے۔ بھاگ گئے۔ کروری بدنیت و بدعمل کہاں بچ سکتے تھے۔ ۳ برس جو کھایا سو کھایا۔ پھر جو کھایا تھا۔ راجہ ٹوڈرمل کے شکنجے میں آکر اُگلنا پڑا۔ غرض وہ فائدہ مند اور عمدہ بندوبست خلط ملط ہو کر سرمایۂ نقصان ہو گیا۔ اور جو مطلب تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ شکریے کی جگہ جابجا شکائتیں ہوئیں اور گھر گھر میں اسی کارونا پڑا عاملوں کی ہجویں۔ قواعد آئین کے مضحکے ہوئے۔ انہی میں سے جریب کے حق میں کسی مثنوی کا ایک شعر ہے ؎

در نظرِ عبرتِ مردِ لبیب	مار دو سر بہ کہ طناب جریب

ملازمت اور نوکری

شرفاء کے گزارے کے لئے اُن دنوں میں دو رستے تھے ایک مدد معاش دوسرے نوکری۔ مدد معاش جاگیر تھی کہ علما و مشائخ و ائمۂ مساجد کے لئے ہوتی تھی

اس میں خدمت معاف تھی۔ **نوکری** میں خدمت بھی ہوتی تھی۔ یہ دہ باشی سے لے کر پنجہزاری تک جو ملازم ہوتے تھے سب اہل سیف ہوتے تھے۔ دہ باشی کو ۱۰۔ بیستی کو ۲۰ وغیرہ وغیرہ سپاہی رکھنے ہوتے تھے۔ اسی طرح دو بیستی۔ پنجہ باشی۔ سہ بیستی۔ چار بیستی۔ یوز باشی وغیرہ وغیرہ پنجہزاری تک۔ تنخواہ کی صورت یہ کہ حساب کے بموجب اتنی زمین کا قطعہ یا دیہہ یا دیہات یا علاقہ یا ملک مل جاتا تھا۔ اس کے محاصل سے اپنے ذمہ واجب کی فوج رکھیں۔ اور اپنی حیثیت اور عزت امارت کو درست رکھیں۔ ایک بات اور سن لو کہ یہاں اُس زمانے میں اور ایشیائی ملکوں میں اب بھی یہی دستور ہے کہ جتنا کسی کا سامان اور خرچ وافر۔ خصوصاً دسترخوان کا پھیلاؤ اور رفیقوں اور نوکروں کی جمیعت زیادہ ہوتی ہے۔ اُتنا ہی وہ شخص بالیاقت عالی ہمت اور صاحب خانوادہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اُتنا زیادہ اور جلد اُس کا منصب بڑھاتے ہیں +

ملازمان مذکور میں سے جس کو جیسی لیاقت دیکھتے تھے۔ ویسا کام اہل قلم میں بھی دیتے تھے۔ لڑائی کا موقع آتا تو جن جن کے نام تجویز میں آتے۔ کیا اہل سیف کیا اہل قلم ان کے نام حکم پہنچتے۔ دہ باشی سے لے کر صدی دو صدی تک وغیرہ وغیرہ کل منصب دار اپنے اپنے ذمے کی فوج۔ پوشاک۔ ہتیار اور سامان سے درست کرتے اور حاضر ہوتے۔ حکم ہوتا تو آپ بھی ساتھ ہوتے۔ نہیں تو اپنے آدمی لشکر میں شامل کر دیتے +

بدنیت منصب داروں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ سپاہی تیار کر کے مہم پر جاتے۔ جب پھر کر آتے تو چند آدمی اپنی ضرورت کے بموجب رکھ لیتے۔ باقی موقوف۔ اُن کی تنخواہیں آپ ہضم۔ روپے سے بہاریں اُڑاتے۔ یا گھر بھرتے۔ جب پھر مہم پیش آتی اور یہ اس بھروسے پر بُلائے جاتے کہ آراستہ فوجیں جنگی سپاہی لے کر حاضر ہوں گے۔ وہ کچھ اپنے دسترخوانوں کے پلاؤ خور۔ کچھ کنجڑے۔ بھٹیارے۔ دھنیے۔ جلاہے۔ کچھ جنگلی مغل۔ پٹھان۔ ترک۔ کہ ہزاروں بازاروں میں پھرتے تھے اور سراؤں میں پڑے رہتے تھے۔ اُن ہی کو پکڑ لاتے تھے۔ کچھ اپنے خدمتگار۔ کچھ سائیس۔ شاگرد پیشہ وغیرہ لیتے۔ گھسیاروں کو گھوڑے

اور بھٹیاروں کو ٹٹوؤں پر بٹھاتے۔ کرائے کے ہتیار۔ مانگے تانگے کے کپڑوں سے لفافہ چڑھاتے اور حاضر ہوتے۔ لیکن توپ تلوار کے منہ پر ان لوگوں سے کیا ہوتا تھا عین لڑائی کے وقت بڑی خرابی ہوتی تھی۔

ایشیا کے فرمانرواؤں کا عہد قدیم سے یہی آئین تھا۔ کیا ہندوستان کے راجہ مہاراجہ۔ کیا ایران۔ توران کے بادشاہ۔ میں نے خود دیکھا افغانستان۔ بدخشاں سمرقند۔ بخارا وغیرہ وغیرہ ملکوں میں اب تک بھی یہی آئین چلا آتا تھا۔ اُدھر کے ملکوں میں سب سے پہلے کابل میں یہ قانون بدلا۔ اور وجہ اس کی یہ ہوئی۔ کہ جب امیر دوست محمد خاں نے احمد شاہ درانی کے خاندان کو نکال کر بے مزاحم حکم حاصل کیا تو افواج انگلشیہ شاہ شجاع کو اُس کا حق دلوانے گئیں۔ ادھر سے امیر بھی لشکر لیکر نکلا۔ تمام سردار صاحب فوج اس کے ساتھ۔ محمد شاہ خاں غلزئی۔ امین اللہ خاں لوگری۔ عبداللہ خاں اچک زئی۔ خان شیرین خاں قزلباش وغیرہ وہ خوانین تھے کہ ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر نقارہ بجائیں تو تیس تیس چالیس چالیس ہزار آدمی فوراً جمع ہو جائیں۔ امیر سب کو لے کر میدان جنگ میں آیا۔ دونوں لشکروں کے سپہ سالار منتظر کہ کدھر سے لڑائی شروع ہو۔ دفعتہً ایک افغان سردار امیر کی طرف سے گھوڑا اُڑا کر چلا۔ اس کی فوج اس کے پیچھے پیچھے۔ جیسے چیونٹیوں کی قطار۔ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ حملہ کرتا ہے۔ اُس نے آتے ہی شاہ کو سلام کیا اور قبضہ شمشیر نذر گزرانا۔ دوسرا آیا۔ تیسرا آیا۔ امیر صاحب دیکھتے ہیں تو گرد میدان صاف ہوتا جاتا ہے۔ ایک مصاحب سے پوچھا۔ فلاں سردار کجاست؟ صاحب او رفت و شاہ را سلام کرد۔ فلاں سردار کجاست؟ صاحب او رفت بہ لشکر فرنگی۔ امیر حیران۔ اتنے میں ایک وفادار گھوڑا مار کر آیا۔ اے امیر صاحب کرا مے پرسید۔ ہمہ لشکر نمک حرام شد۔ برابر سے ایک نے امیر کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر کھینچی اور کہا۔ ہاں۔ امیر صاحب چہ مے بینید ورق برگشت بیک کنار کشید خود را۔ یہ سنکر امیر صاحب نے بھی باگ پھیری۔ وہ آگے آگے۔ باقی پیچھے پیچھے۔ گھر چھوڑ کر نکل گئے جب دولت انگلشیہ نے پھر تاج بخشی کر کے انہیں ملک عنایت کیا تو سمجھایا۔ کہ اب امراء اور خوانین پر فوج کو نہ چھوڑنا۔ اب فوج نوکر رکھنا۔ آپ تنخواہ دینا اور

اپنے حکم میں فوج کو رکھنا۔ چونکہ نصیحت پا چکے تھے۔ جھٹ سمجھ گئے۔ جب کابل میں پہنچے تو بڑی حکمت عملی سے بندوبست کیا۔ اور آہستہ آہستہ تمام خوانین اور سرگروگان افغانستان کو نیست و نابود کر دیا۔ جو رہے اُن کے بازو اس طرح توڑے کہ ہلنے کے قابل نہ رہے۔ دربار میں حاضر رہو۔ تنخواہ نقد لو۔ گھروں میں بیٹھے تسبیحیں ہلایا کرو۔
ع کجا بود اشہب کجا تاختم ؂

آئین داغ

ہندوستان کے سلاطین سلف میں سب سے پہلے علاءالدین خلجی کے عہد میں داغ کا ضابطہ نکلا تھا۔ وہ اس نکتے کو سمجھ گیا تھا۔ اور کہتا تھا کہ امرا کو اس طرح رکھنے میں خود سری کا زور پیدا ہوتا ہے۔ جب ناراض ہونگے۔ مل کر بغاوت پر کھڑے ہو جائینگے۔ اور جسے چاہینگے بادشاہ بنا لینگے۔ چنانچہ فوج نوکر رکھی اور داغ کا قانون قائم کیا۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں جاگیریں ہو گئیں۔ شیر شاہ کے عہد میں پھر داغ کا آئین تازہ ہوا۔ مگر وہ مر گیا۔ داغ بھی مِٹ گیا۔ اکبر جب ۹۸۱ھ میں پٹنے کی مہم پر گیا تو امرا کی فوجوں سے بہت تنگ ہوا کہ سپاہی بدحال اور سپاہ بے سامان تھی۔ شکائتیں پہلے سے بھی ہو رہی تھیں۔ جب پھر کر آئے تو شہباز خاں کنبو نے تحریک کی اور آئین مذکور پر عمل درآمد شروع ہوا۔

شاہ با تدبیر سمجھا کہ اگر اس حکم کی تعمیل دفعتہً عام کرینگے تو تمام امرا گھبرا اُٹھینگے کیونکہ پوری فوجیں کس کے پاس ہیں۔ ان کی آزردگی سے شاید کچھ قباحت رنگ نکالے۔ اس کے علاوہ تمام ملک میں یکبارگی نگہداشت شروع ہو جائیگی۔ اس میں اور خرابی ہوگی۔ جُلاہے۔ سائیس۔ گھسیارے۔ بھٹیارے اور ان کے ٹٹو جو ہاتھ آئینگے سب سمیٹ لینگے۔ اس لئے قرار پایا کہ دہ باشی اور بیستی منصب داروں سے موجودات شروع ہو۔ اپنے اپنے سواروں کو لے کر چھاؤنی میں حاضر ہوں اور فہرست کے ساتھ پیش کریں۔ ہر ایک کا نام۔ وطن۔ عمر۔ قد و قامت۔ خط و خال۔ غرض تمام حلیہ لکھا جائے۔ موجودات کے وقت ہر نکتہ مطابق کرتے تھے۔ اور

فہرست پر نشان کرتے جاتے تھے۔ اس کو بھی داغ کہتے تھے۔ ساتھ اس کے گھوڑے
پر لوہا گرم کرکے داغ لگاتے تھے۔ اس عمل درآمد کا نام آئین داغ تھا۔ اُستاد مرحوم
نے اسی اصطلاح کا اشارہ کیا اور کیا خوب کہا ہے ؎

کہتی ہے ماہیِ بریاں کہ دبیرانِ قضا	داغ دیتے ہیں اُسے جس کو درم دیتے ہیں

جب درجہ مذکور کے ملازم جا بجا داغ ہو گئے۔ توصدی دوصدی وغیرہ کی نوبت
آئی بلکہ آدمی سے بڑھ کر منصبداروں کے اُونٹ۔ ہاتھی۔ خچر۔ گدھے۔ بیل وغیرہ جو
اُن کے کاروبار سے متعلق تھے سب داغ کے نیچے آگئے۔ یہ بھی ہو گئے تو ہزاری۔
دوہزاری۔ پنجہزاری تک نوبت پہنچی۔ کہ معراج مراتب امرا کی تھی۔ حکم تھا کہ جو امیر
داغ کی کسوٹی پر پُورا نہ اُترے اُس کا منصب گر جائے۔ اصل وہی تھی کہ کم اصل ہے۔
جب ہی کم حوصلہ ہے۔ اس قابل نہیں کہ اس کے مصارف کو اتنا خرچ اور اسے
یہ منصب دیا جائے۔ انکار داغ کی سزا میں بہت سے نامی امیر بنگالہ[1] بھیجے گئے۔ اور
منعم خاں خان خاناں کو لکھا گیا کہ ان کی جاگیریں وہیں کر دو۔ باوجود اس نرمی آہستگی
کے منصب دار بہت گھبرائے۔ مظفر خاں عتاب میں آئے۔ مرزا عزیز کوکلتاش ان کا
لاڈلا امیر اور ضدی سپہ سالار اتنا جھگڑا کہ دربار سے بند ہو گیا۔ اور حکم ہو گیا کہ
اپنے گھر میں بیٹھے نہ یہ کسی کے پاس جانے پائے نہ کوئی اس کے پاس آنے پائے۔

داغ کی صورت (ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتے ہیں) ابتدا میں گھوڑے
کی گردن پر سیدھی طرف سین کا سرا (س) لوہے سے داغ دیتے تھے۔ پھر دو الف
متقاطع بہ قائمہ ہو گئے۔ مگر چاروں سرے ذرا موٹے۔ یہ نشان سیدھی ران پر ہوتا تھا۔
پھر مدت تک چلہ اُتری کمان (ـــ) کی شکل رہی۔ پھر یہ بھی بدلا گیا۔ لوہے کے ہندسے
بن گئے۔ یہ گھوڑے کے سیدھے پٹھے پر ہوتے تھے۔ پہلی دفعہ ۱/۳ دوسری دفعہ ۲/۳
وغیرہ۔ پھر خاص طور کے ہندسے سرکار سے مل گئے۔ شہزادے۔ سلاطین سپہ سالار

[1] سلاطین چغتائیہ میں یہ آئین تھا کہ جس امیر پر خفا ہوتے تھے اُسے بنگالہ میں پھینک دیتے
تھے۔ کچھ اُس سبب سے کہ گرم ملک تھا۔ اس پر ہوا مرطوب۔ بیمار ہو جاتے تھے۔ اور کچھ اس
سبب سے کہ ولایتی لوگ اپنے ملک سے دُوری اور بعد مسافت سے بہت گھبراتے تھے اور
ناجنسی محض کے سبب سے اس ملک میں تنگ رہتے تھے۔

وغیرہ سب انہی سے نشان لگاتے تھے۔ اس میں یہ فائدہ ہوا کہ اگر کسی کا گھوڑا مر جاتا اور وہ کورا گھوڑا داغ کے وقت حاضر کرتا تو بخشی فوج کہتا تھا کہ آج کی تاریخ سے حساب میں آئیگا۔ سوار کہتا تھا۔ میں نے اسی دن خرید لیا تھا جس دن پہلا گھوڑا مرا تھا۔ کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ سوار کرایہ کا گھوڑا لاکر دکھا دیتے تھے۔ کبھی پہلے گھوڑے کو بیچ کھاتے تھے۔ داغ کے وقت اس چہرے کا گھوڑا لاکر دکھا دیتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ اس داغ سے دغا کے رستے بند ہو گئے۔ داغ مکرر میں یہی داغ دوبارہ۔ تیسری دفعہ تبارہ +

مُلّا صاحب اس مقدمے کو بھی غصّے کی وردی پہنا کر اپنی کتاب میں لائے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔ اگرچہ سب امرا ناراض ہوئے اور سزائیں بھی اُٹھائیں لیکن آخر یہی آئین سب کو ماننا پڑا۔ اور غریب سپاہی کے طبق میں پھر بھی خاک ہی پڑی۔ اُدھر امرا نے اپنا آئین یہ باندھا کہ داغ کے وقت کچھ اصلی کچھ نقلی۔ وہی لفافی کی فوج لاکر دکھادی اور منصب پورا کروالیا۔ جاگیر پر جا کر سب رخصت۔ وہ فرضی گھوڑے کیسے۔ اور کرائے کے ہتیار کہاں؟ پھر کام کا وقت ہوگا تو دیکھا جائیگا۔ مہم آن پڑی۔ تو فضیحت و رسوائی۔ جو اصلی سپاہی ہے اُسی کی تباہی ہے۔ دلاور بہادر معرکے مارنے والے مارے مارے پھرتے ہیں۔ تلواریں مارنے والے بھوکوں مرتے ہیں۔ گھوڑا اتنی اُمید پر کون باندھے۔ کہ بادشاہ کو کبھی مہم پیش آئیگی تو کسی امیر کے نوکر ہو جائینگے۔ آج رکھیں تو کھلائیں کہاں سے۔ بیچتے پھرتے ہیں۔ کوئی نہیں لیتا۔ تلوار گرو رکھتے ہیں بنیا آٹا نہیں دیتا۔ اس بربادی کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ وقت پر ڈھونڈیں تو جسے سپاہی کہتے ہیں وہ انسان پیدا نہیں۔ اسی سلسلے میں مُلّا صاحب عبارت آئندہ تمسخر کے رنگ میں لکھتے ہیں۔ مگر مجھ سے پوچھو تو وہ غصّہ بھی ناحق تھا۔ اور یہ تمسخر بھی بے جا ہے۔ حق یہ ہے کہ اکبر نے اس کام کو دلی شوق اور بڑی کوشش سے جاری کیا تھا۔ کیونکہ وہ حقیقی اور تحقیقی بادشاہ مہمات و فتوحات کا عاشق تھا۔ آپ تلوار پکڑ کر لڑتا تھا۔ اور سپاہیانہ یلغاریں کرتا تھا۔ اس لئے بہادر سپاہی اور دیدار و جوان اُسے بہت پیارا تھا۔ چنانچہ جب آئین مذکور جاری کیا۔ تو بعض وقت خود بھی دیوان خاص میں آن بیٹھتا تھا اور اس خیال سے

کہ میرا سپاہی پھر بدلا نہ جائے۔ اُس کا چہرہ لکھواتا تھا۔ پھر کپڑوں اور ہتھیاروں سمیت ترازو میں تلواتا تھا۔ حکم تھا کہ لکھ لو۔ یہ اڑھائی من سے کچھ زیادہ کا نکلا۔ وہ ساڑھے تین من سے کچھ کم ہے۔ پھر معلوم ہوتا تھا کہ ہتیار کرائے کے لئے تھے اور کپڑے مانگے کے تھے۔ ہنس کر کہہ دیتا تھا کہ ہم بھی جانتے ہیں مگر انہیں کچھ دینا چاہئے۔ سب کا گزارہ ہوتا رہے۔ سوار دو اسپہ و یک اسپہ تو عام بات تھی۔ مگر پرورش کی نظر نے نیم اسپہ کا آئین نکالا۔ مثلاً اچھا سپاہی ہے مگر گھوڑے کی طاقت نہیں رکھتا۔ حکم دیتا تھا کہ خیر دو مل کر ایک گھوڑا رکھیں۔ باری باری سے کام دیں۔ ۶ روپے مہینہ گھوڑے کا۔ اُس میں بھی دونوں شریک یہ سب کچھ صحیح مگر اسے اقبال سمجھو خواہ نیک نیتی کا پھل۔ کہ جہاں جہاں غنیم تھے خود بہ خود نیست و نابود ہو گئے۔ نہ فوج کشی کی نوبت آتی تھی۔ نہ سپاہی کی ضرورت ہوتی تھی اچھا ہوا منصب دار بھی داغ کے دُکھ سے بچ گئے۔ مُلّا صاحب اپنے جوش جذبہ میں خواہ مخواہ ہر بات کو بدی اور تعدّی کا لباس پہناتے ہیں۔ اس میں کچھ شُبہ نہیں کہ وہ نیک نیت تھا اور رعایا کو دل سے پیار کرتا تھا۔ سب کی آسائش کے لئے خالص نیت سے یہ اور صدہا ایسے ایسے آئین باندھے تھے۔ البتہ اس سے لاچار تھا کہ بدنیت اہل کار عمل درآمد میں خرابی کر کے بھلائی کو بُرائی بنا دیتے تھے۔ داغ سے بھی دغاباز نہ باز آئیں تو وہ کیا کرے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری ۱۰۰۶ھ میں ختم کی ہے۔ اُس میں لکھتے ہیں کہ سپاہ بادشاہی فرمانروایان زمیں خیز (راجگان وغیرہ) کی سپاہ مل کر ۴۴ لاکھ سے زیادہ ہے۔ بہتوں کے لئے داغ اور چہرہ نویسی نے ماتھے روشن کئے ہیں۔ اکثر بہادروں نے شرافت اطوار اور اعتبار کے جوہر سے منتخب ہو کر حضوری رکاب میں عزت پائی ہے۔ یہ لوگ پہلے یکّے کہلاتے تھے اب **احدی** کا خطاب ملا۔ (مُلّا صاحب کہتے ہیں کہ اس میں توحید الٰہی اکبر شاہی کا اشارہ بھی تھا) بعض کو داغ سے معاف بھی رکھتے ہیں +

تنخواہ ایرانی۔ تورانی کی ۲۵ روپے۔ ہندی ۲۰۔ خالصہ ۱۵۔ اس کو برآوردی کہتے تھے۔ جو منصب دار خود سوار اور گھوڑے بہم نہ پہنچا سکتے اُنہیں برآوردی سوار دیئے جاتے تھے۔ دہ ہزاری۔ ہشت ہزاری۔ ہفت ہزاری

منصب تینوں شہزادوں کے لئے خاص تھے۔ امرا میں انتہائے ترقی پنجہزاری تھی۔ اور کم سے کم دہ باشی۔ منصب داروں کی تعداد ۶۶ تھی کہ اللہ کے عدد ہیں بعض متفرقات کے طور پر تھے۔ کہ یاوری یا کمکی کہلاتے تھے۔ جو داغ دار ہوتے تھے اُن کی عزت زیادہ ہوتی۔ اکبر اس بات سے بہت خوش ہوتا تھا کہ بدرو سپاہی ہو اور خود اسپہ ہو منصبداروں کا سلسلہ اس تفصیل سے چلتا تھا۔ دہ باشی۔ بیستی۔ دوبیستی۔ پنجاہی سہ بیستی۔ چار بیستی۔ صدی وغیرہ وغیرہ انہیں حسب تفصیل ذیل سامان رکھنے ہوتے تھے

نام عہدہ	اسپ عراقی	اسپ مجنس	اسپ ترکی	یابو	تازی	جنگلہ	ہاتھیوں کے پانچ نمبر تھے ۱	۲	۳	۴	۵	بار برداری: شتر	گاڑی	خچر	ماہانہ: درجہ اول	درجہ دوم	درجہ سوم
دہ باشی	۰	۰	۲	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۰۰	۸۰	۷۵
بیستی	۰	۱	۱	۱	۲	۰	۰	۰	۰	۱	۰	یک	۰	یک	۱۳۵	۱۲۵	۱۱۵
دوبیستی	۱	۲	۲	۱	۱	۰	۰	۱	۰	۰	۰	۲	۰	۱	۲۲۳	۲۰۰	۱۸۵
پنجاہی	۱	۱	۲	۲	۱	۱	۰	۰	۱	۱	۰	۲	۰	۲	۲۵۰	۲۴۰	۲۳۰
سہ بیستی	۱	۱	۲	۲	۱	۱	۰	۰	۱	۱	۰	۲	۰	۲	۳۰۱	۲۸۵	۲۷۰
چہار بیستی	۲	۱	۲	۲	۱	۱	۰	۰	۱	۲	۰	۲	۰	۳	۴۱۰	۳۸۰	۳۵۰
یوزباشی	۲	۲	۲	۲	۲	۰	۰	۱	۱	۱	۰	۲	۰	۵	۷۰۰	۶۰۰	۵۰۰
پنجہزاری	۳۴	۳۴	۶۸	۶۸	۶۷	۶۶	۲۰	۳۰	۲۰	۲۰	۱۰	۸۰	۲۰	۱۶۰	۳۰ہزار	۲۹ہزار	۲۸ہزار

سوار اگر طاقت رکھتا ہو۔ تو ایک گھوڑے سے زیادہ بھی رکھ سکتا تھا۔ انتہا ۲۵ گھوڑے تک اور چارپائے کا نصف خرچ خزانے سے ملتا تھا۔ پھر تین گھوڑے سے زیادہ کی اجازت نہ رہی۔ یک اسپہ سے زیادہ کو ایک اونٹ یا بیل بھی باربرداری کے لئے رکھنا ہوتا تھا۔ گھوڑے کے لحاظ سے بھی سوار کی تنخواہ میں فرق ہوتا تھا۔ چنانچہ:۔

عراقی والے کو ۳۰
مجنس والے کو ۲۵

پیادے کی تنخواہ ۲۸ سے ۳ ۔ ۲ ۔ ۱ تک ہوتی تھی۔ ان میں ۱۲ ہزار بندوقچی تھے کہ

ترکی	عسہ	حاضرِ رکاب رہتے تھے۔ بیندوقچی کی تنخواہ ہعہ ۲/۱ ۱۲ - ہعہ - ۲/۱ ۱۲ تک ہوتی تھی +
یابو	ہعسہ	
تازی	ہعسہ	
جنگلہ	عسہ	

آئینِ صراف

صرّافوں اور مہاجنوں کی سیہ کاری اب بھی عالم میں روشن ہے۔ اُس وقت بھی شاہانِ سلف کے سکّوں پر جو چاہتے تھے بٹّا لگاتے تھے۔ اور غریبوں کی ہڈیاں توڑتے تھے۔ حکم ہؤا کہ پُرانے روپے جمع کر کے سب گلا ڈالو۔ ہماری قلمرو میں یک قلم ہمارا سکہ چلے۔ اور نیا پُرانا ہر سنہ کا یکساں سمجھا جائے۔ جو گھس پس کر بہت کم ہو جائے اُس کے لئے آئین و قواعد قائم ہوئے۔ شہر شہر میں فرمان جاری ہو گئے۔ قلیچ خاں کو انتظام سپرد ہؤا۔ کہ سب سے مچلکے لکھوالو۔ مگر یہ تو دلوں کے کھوٹے تھے۔ لکھ کر بھی باز نہ آئے۔ پکڑے آتے تھے باندھے جاتے تھے۔ ماریں کھاتے تھے۔ مارے بھی جاتے تھے اور اپنی کرتوتوں سے باز نہ آتے تھے +

احکامِ عام بنام کارکنانِ ممالکِ محروسہ

جوں جوں اکبری سلطنت کا سکّہ بیٹھتا گیا۔ اور سلطنت کی روشنی پھیلتی گئی انتظام و احکام بھی پھیلتے گئے۔ چنانچہ اُن میں سے ایک دستور العمل کا خلاصہ اور اکثر تاریخوں سے نکتہ نکتہ چن کر یکجا کرتا ہوں۔ کہ شہزادوں۔ امیروں۔ حاکموں۔ عاملوں کے نام فرمان کا خلعت پہن کر جاری ہوئے تھے۔ سب سے پہلے یہ کہ رعایا کے حال سے باخبر رہو۔ خلوت پسند نہ ہو۔ کہ اس میں اکثر امور کی خبر نہ ہوگی۔ جن کی تمہیں اطلاع واجب تھی۔ بزرگانِ قوم سے بہ عزت پیش آؤ۔ شب بیداری کرو۔ صبح۔ شام۔ دوپہر۔ آدھی رات کو خدا کی طرف متوجہ ہو۔ کتب اخلاق۔ نصائح تاریخ کو زیرِ نظر رکھو۔ مسکین اور گوشہ نشین لوگ جو آمد و رفت کا دروازہ بند

کر بیٹھتے ہیں۔ اُن کے ساتھ سلوک کرتے رہو کہ ضروریات سے تنگ نہ ہونے پائیں۔ اہل اللہ۔ نیک نیّت۔ صاحب دلوں کی خدمت میں حاضر ہُوا کرو۔ اور دعا کے طلب گار رہو۔ مجرموں کے گناہوں پر بڑی غور کیا کرو۔ کہ کس پر سزا واجب ہے۔ کس سے چشم پوشی۔ کیونکہ بعض اشخاص ایسے بھی ہیں۔ جن سے کبھی ایسی خطائیں ہوجاتی ہیں کہ زبان پر لانا بھی مصلحت نہیں ہوتا +

مخبروں کا بڑا خیال رکھو۔ جو کچھ کرو خود دریافت کر کے کرو۔ دادخواہوں کی عرض خود سُنو۔ ماتحت حاکموں کے بھروسے پر سب کام نہ چھوڑ دو۔ رعایا کو دلداری سے رکھو۔ زراعت کی فراوانی اور تقاوی اور دیہات کی آبادی میں بڑی کوشش رہے۔ ریزہ رعایا کے حال کی فرداً فرداً بڑی غور و پرداخت کرو۔ نذرانہ وغیرہ کچھ نہ لو۔ لوگوں کے گھروں میں سپاہی زبردستی نہ جا اُتریں۔ ملک کے کاروبار ہمیشہ مشورت سے کیا کرو۔ لوگوں کے دین و آئین سے کبھی معترض نہ ہو۔ دیکھو دُنیا چند روزہ ہے۔ اس میں انسان نقصان گوارا نہیں کرتا۔ دین کے معاملے میں کب گوارا کریگا۔ کچھ تو سمجھا ہی ہوگا۔ اگر وہ حق پر ہے۔ . . . تو تم حق سے مخالفت کرتے ہو۔ اور اگر تم حق پر ہو تو وہ بچارا بیمار نادانی ہے۔ رحم کرو۔ اور دستگیری۔ نہ کہ تعرض و انکار۔ ہر مذہب کے نکوکاروں اور خیر اندیشوں کو عزیز رکھو +

ترویج دانش اور کسب کمال میں بڑی کوشش کرو۔ اہلِ کمال کی قدردانی کرتے رہو۔ کہ استعدادیں ضائع نہ ہو جائیں۔ قدیمی خاندانوں کی پرورش کا خیال رکھو سپاہی کی ضروریات و لوازمات سے غافل نہ رہو۔ خود تیر اندازی۔ تفنگ اندازی وغیرہ سپاہیانہ ورزشیں کرتے رہو۔ ہمیشہ شکار ہی میں نہ رہو۔ ہاں تفریح مشق سپاہ گری کی رعایت سے ہو +

نیّر نور بخش عالم کے طلوع پر اور آدھی رات کو کہ حقیقت میں طلوع وہیں سے شروع ہوتا ہے نوبت بجا کرے۔ جب نیّرِ اعظم بُرج سے بُرج میں جاوے تو توپیں اور بندوقیں سر ہوں۔ کہ سب باخبر ہوں۔ اور شکرانۂ الٰہی بجالائیں۔ کوتوال نہ ہو تو اس کے کاموں کو خود دیکھو اور سرانجام کرو۔ اس خدمت کو دیکھ کر شرماؤ نہیں۔ عبادت الٰہی سمجھ کر بجالاؤ کہ اُس کے بندوں کی خدمت ہے +

کوتوال کو چاہیئے کہ ہر شہر۔ قصبہ۔ گاؤں۔ کل محلّے۔ گھر گھر والے سب لکھ لے۔ ہر شخص آپس کی ضمانت وحفاظت میں رہے۔ ہر محلہ پر میر محلّہ ہو۔ جاسوس بھی لگے رکھو کہ ہر جگہ کا حال رات دن پہنچاتے رہیں۔ شادی۔ غمی۔ نکاح۔ پیدائش ہر قسم کے واقعات کی خبر رکھو۔ کوچہ۔ بازار۔ پلوں اور گھاٹوں پر بھی آدمی رہیں۔ رستوں کا ایسا بند وبست رہے کہ کوئی بھاگے تو بے خبر نہ نکل جائے +

چور آئے آگ لگ جائے۔ کوئی مصیبت پڑے تو ہمسایہ فوراً مدد کرے میر محلّہ اور خبر دار بھی فوراً اٹھ دوڑیں۔ جان چھپا بیٹھیں تو مجرم۔ ہمسایہ۔ میر محلّہ اور خبر دار کی اطلاع بغیر کوئی سفر میں نہ جائے۔ اور کوئی آکر اترنے بھی نہ پائے۔ سوداگر۔ سپاہی۔ مسافر ہر قسم کے آدمی کو دیکھتے رہیں۔ جن کا کوئی ضامن نہ ہو اُن کو الگ سرا میں بساؤ۔ وہی با اعتبار لوگ سزا بھی تجویز کریں۔ رؤسا و شرفائے محلّہ بھی ان باتوں کے ذمہ دار ہیں۔ ہر شخص کی آمد و خرچ پر نظر رکھو جس کا خرچ آمد سے زیادہ ہے ضرور دال میں کالا ہے۔ ان باتوں کو انتظام اور بہبودی خلائق سمجھا کرو۔ روپیہ کھینچنے کی نیت سے نہ کرو +

بازاروں میں دلال مقرر کر دو۔ جو خرید و فروخت ہو۔ میر محلّہ کی و خبر دار محلّہ کی بے اطلاع نہ ہو۔ خریدنے اور بیچنے والے کا نام روزنامچہ میں درج ہو۔ جو چھپ چھپاتے لین دین کرے اُس پر جرمانہ۔ محلّہ محلّہ اور نواح شہر میں بھی رات کے لئے چوکیدار رکھو۔ اجنبی آدمی کو ہر وقت تاڑتے رہو۔ چور۔ جیب کترے۔ اُچکّے۔ اُٹھائی گیرے کا نام بھی نہ رہنے پائے۔ مجرم کو مال سمیت پیدا کرنا اُس کا ذمّہ ہے۔ جو لاوارث مر جائے یا کہیں چلا جائے۔ اس کے مال سے سرکاری قرضہ ہو تو پہلے وصول کرو۔ پھر وارثوں کو دو۔ وارث موجود نہ ہو تو امین کے سپرد کر دو۔ اور دربار میں اطلاع لکھو۔ حق دار آجائے تو وہ پائے۔ اس میں بھی نیک نیتی سے کام کرو۔ روم کا دستور یہاں نہ ہو جائے کہ جو آیا ضبط۔ مُلّا صاحب اِس پر طرّہ لگاتے ہیں کہ جب تک داروغہ بیت المال کا خط نہیں ہوتا تب تک اُس کا مردہ بھی دفن نہیں ہوتا اور قبرستان کہ شہر کے باہر بنا ہے۔ وہ بھی روبہ مشرق۔ کہ عظمت آفتاب نہ جانے پائے +

شراب کے باب میں بڑی تاکید رہے۔ بو بھی نہ آنے پائے۔ پینے والا۔ بیچنے والا۔ کھینچنے والا سب مجرم۔ ایسی سزا دو کہ سب کی آنکھیں کھُل جائیں۔ ہاں کوئی حکمت اور ہوش افزائی کے لئے کام میں لائے تو نہ بولو۔ زخوں کی ارزانی میں بڑی کوشش رکھو۔ مال دار ذخیروں سے گھر نہ بھرنے پائیں +

عیدوں کے جشنوں کا لحاظ رہے۔ سب سے بڑی عید نوروز ہے کہ نیّر نور بخش عالم برج حمل میں آتا ہے۔ یہ فروردین کی پہلی تاریخ ہے۔ دوسری عید ۱۹ اُسی مہینے کی۔ کہ شرف کا دن ہے۔ تیسری ۳ اُردی بہشت کی وغیرہ وغیرہ۔ شب نوروز اور شب شرف کو شب برات کی طرح چراغاں ہوں۔ اوّل شب نقارے بجیں معمولی عیدیں بھی بدستور ہُوا کریں۔ اور ہر شہر میں شادیانے بجا کریں +

عورت بے ضرورت گھوڑے پر نہ چڑھے۔ دریاؤں اور نہروں پر مردوں اور عورتوں کے غسل کو اور پنہاریوں کے پانی بھرنے کو الگ الگ گھاٹ تیار ہوں۔ سوداگر بے حکم ملک سے گھوڑا نہ نکال لے جائے۔ ہندوستان کا بردہ کہیں اور نہ جانے پائے۔ نرخ اشیا ربادشاہی قیمت پر رہے +

بے اطلاع کوئی شادی نہ ہُوا کرے۔ عوام الناس کی شادی ہو تو دولھا دُلھن کو کوتوالی میں دکھا دو۔ عورت ۱۲ برس مرد سے بڑی ہو تو مرد اس سے تعلق نہ کرے کہ باعث ضعف و ناتوانی ہے۔ لڑکا ۱۶ برس اور لڑکی ۱۴ برس سے پہلے نہ بیاہی جائے۔ چچا اور ماموں وغیرہ کی بیٹی سے شادی نہ ہو کہ رغبت کم ہوتی ہے۔ اولاد ضعیف ہوگی۔

---

[1] ملّا صاحب۔ اس حکم پر بڑے خفا ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔ اہلکاروں اور ملازموں کی بن آئی۔ لوگوں کے کام بند کر دیئے۔ جب تک نئی منہ بھرائی نہ لیتے شادی نہیں ہونے دیتے۔ آزاد۔ ملّا صاحب کا فرمانا سر آنکھوں پر مگر یہ بھی تو دیکھو کہ عوام میں شادی کے دعویٰ آج تک بھی کیسے اُلجھے ہوئے پیش آتے ہیں۔ باوجودیکہ ایسا چست اور درست انگریزی قانون ہے۔ پھر بھی اس ملک پنجاب میں ایک عورت کا مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ چار خاوند حاضر ہیں۔ ہر شخص کے ساتھ ایک ملّا صاحب مُنڈا ہوُا سر۔ ناف تک داڑھی۔ پاؤں تک کرتہ۔ نیلا لنگ۔ ہلاس دانی ہاتھ میں۔ بحلف شرعی فرماتے ہیں کہ میں نے بہ زبان خود نکاح پڑھا تو ہ۔ ۵ مسلمان با ایمان گواہ کہ مجلس عام میں پڑھا گیا۔ اور ماں باپ نے پڑھوایا۔ سرکار کو بھی سوا رجسٹری کے کچھ نہ بن آئی +

جو عورت بازاروں میں کھلّم کھلاّ بے برقع۔ بے گھونگھٹ پھرتی نظر آیا کرے یا ہمیشہ خاوند سے دنگہ فساد رکھے اُسے شیطان پورہ میں داخل کرو۔ ضرورت مجبور کرے تو اولاد کو گرو رکھ سکتے ہیں۔ جب روپیہ ہاتھ آئے چھڑا لیں۔ ہندو لڑکا بچپن میں جبراً مسلمان ہوگیا ہو تو بڑا ہو کر جو مذہب چاہے اختیار کرے۔ جو شخص جس دین میں چاہے چلا جائے کوئی روکنے نہ پائے۔ ہندنی عورت مسلمان کے گھر میں بیٹھ جائے تو وارثوں کے گھر پہنچادو۔ مندر۔ شوالہ۔ آتش خانہ۔ گرجا جو چاہے بنائے روک ٹوک نہ ہو +

اس کے علاوہ سینکڑوں ہزاروں احکام ملکی۔ مالی۔ داغ محلی۔ ٹکسال۔ فرد۔ فرد رعایا۔ واقعہ نویسی۔ چوکی نویسی۔ بادشاہ کی تقسیم اوقات۔ کھانا۔ پینا۔ سونا۔ جاگنا۔ اُٹھنا۔ بیٹھنا وغیرہ وغیرہ تھے۔ کہ آئین اکبری کا مجلد ضخیم اس سے آراستہ ہے۔ کوئی بات آئین و قواعد و قانون سے بچی نہ تھی۔ ملا صاحب اُن کا بھی خاکہ اُڑاتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نئے ایجاد تھے۔ جو بات نئی معلوم ہوتی ہے اُس پر لوگوں کی نظر اٹکتی ہے۔ اس وقت بھی اہل دربار مل کر بیٹھے ہونگے تو ضرور ان باتوں کے چرچے کرتے ہوں گے اور چونکہ صاحب علم و صاحب کمال تھے۔ اس لئے ایک ایک بات لطائف و ظرائف کے ساتھ نقل مجلس ہوتی ہوگی +

لطیفہ۔ ایک موقع پر حکم ہؤا۔ کہ قلعہ لاہور میں دیوانِ عام کے سامنے چبوترہ ہے۔ اس پر مختصر مسجد بنوادو کہ بعض اشخاص بہ حالتِ حضوری کارِ ضروری میں مصروف ہوتے ہیں۔ نماز کا وقت ہو تو انہیں دُور جانا نہ پڑے۔ ہمارے سامنے پڑھیں اور پھر حاضر ہو جائیں۔ حکیم مصری کے دہن ظرافت میں پانی بھر آیا اور فرمایا ؎

شاہِ ما کرد مسجدے بنیاد	ایہا المومنون مبارک باد
و ندریں نیز مصلحت دارد	تا نمازان گزار بشمارد

حکیم صاحب کی باتیں مصری کی ڈلیاں تھیں۔ جس قدر حال ان کا معلوم ہؤا علیحدہ لکھا ہے + (تتمے کو پڑھ کر منہ میٹھا کرو)

ہندوؤں کے ساتھ اپنایت

اکبر اگرچہ ترک ماوراء النہری تھا۔ مگر اُس نے ہندوستان میں آکر جس طرح

ہندوؤں اور ہندوستانیوں سے اپنائیت پیدا کی وہ ایک صنعتِ کیمیائی ہے کہ کتابوں میں لکھنے کے قابل ہے۔ اور یہ بھی ایک تمہید پر منحصر ہے۔ واضح ہو کہ جب ہمایوں ایران میں گیا اور شاہ طہماسپ سے ملاقات ہوئی۔ تو ایک دن دونو بادشاہ شکار کو نکلے۔ کسی مقام پر تھک کر اُتر پڑے۔ شاہی فراش نے اُٹھتہ غالیچہ ڈال دیا۔ شاہ بیٹھ گئے۔ ہمایوں کے ایک زانو کے نیچے فرش نہ تھا۔ اس عرصے میں کہ شاہ اُٹھیں اور غالیچہ کھول کر بچھائیں۔ ہمایوں کے ایک جاں نثار نے جھٹ اپنے تیردان کا کارچوبی غلاف چھُری سے چاک کیا اور اپنے بادشاہ کے نیچے بچھا دیا۔ شاہ طہماسپ کو یہ پھُرتی اور ہوا خواہی اُس کی پسند آئی۔ اور کہا کہ برادر ہمایوں! تمہارے ساتھ ایسے ایسے جاں نثار نمک حلال تھے۔ اور پھر مُلک ہاتھ سے اس طرح نکل گیا۔ اس کا کیا سبب ہے؟ بادشاہ نے کہا کہ بھائیوں کے حسد اور عداوت نے کام خراب کر دیا۔ نمک خوار نوکر ایک آقا کے بیٹے سمجھ کر کبھی ادھر ہو جاتے تھے کبھی اُدھر۔ شاہ نے کہا کہ ملک کے لوگوں نے رفاقت نہ کی؟ ہمایوں نے کہا کہ کل رعایا غیر قوم غیر مذہب ہیں۔ اور خود ملک کے اصلی مالک ہیں۔ ان سے رفاقت ممکن نہیں۔ شاہ نے کہا کہ ہندوستان میں دو فرقے کے لوگ بہت ہیں۔ ایک افغان۔ دوسرے راجپوت۔ خدا کی مدد شامل حال ہو۔ اب کی دفعہ وہاں پہنچو تو افغانوں کو تجارت میں ڈال دو۔ اور راجپوتوں کو دلاسا اور محبت کے ساتھ شریک حال کرو (دیکھو ماثر الامرا)۔

ہمایوں جب ہندوستان میں آیا تو اُسے اجل نے امان نہ دی۔ اور اس تدبیر کو عمل میں نہ لا سکا۔ البتہ اکبر نے کیا۔ اور خوب طور سے کیا۔ وہ اس نکتے کو سمجھ گیا تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کا گھر ہے۔ مجھے اس ملک میں خدا نے بادشاہ کر کے بھیجا ہے۔ مُلک گیری اور تسخیر کی حالت میں ممکن ہے کہ مُلک کو تلوار کے زور سے زیر کیا۔ اور اہلِ ملک کو ویران کر دیا۔ ملک والوں کو دبا لیا۔ لیکن جب کہ مَیں اسی گھر میں رہنا اختیار کر دوں تو یہ ممکن نہیں کہ ان کے ملک کے کل فوائد اور آرام، مَیں اور میرے اُمرا اُٹھائیں اور ملک والے ویران و پریشان رہیں۔ اور پھر مَیں آرام سے بھی بیٹھ سکوں۔ اور یہ اُس سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ انہیں بالکل فنا کر کے نیست و نابود کر دوں۔ وہ

یہ بھی جانتا تھا کہ میرے باپ پر چچاؤں کے ہاتھ سے کیا گزری۔ چچاؤں کی اولاد اور ان کے نمک خوار موجود ہیں۔ اور جو ہم قوم ترک اس وقت میرے ساتھ ہیں۔ یہ ہمیشہ دو دھاری تلوار ہیں۔ جدھر فائدہ دیکھا ادھر پھر گئے۔ غرض جب اُس نے مُلک کو آپ سنبھالا تو ایسا ڈھنگ ڈالا جس میں خاص و عام اہلِ ہند یہ نہ سمجھیں کہ غیر قوم ترک۔ غیر مذہب مسلمان کہیں سے آکر ہم پر حاکم ہو گیا ہے۔ اس لئے ملک کے فوائد و منافع پر کوئی بند نہ رکھا۔ اُس کی سلطنت ایک دریا تھا کہ جس کا کنارہ ہر جگہ سے گھاٹ تھا۔ آؤ۔ اور سیراب ہو جاؤ۔ دنیا میں کون ہے کہ جان رکھتا ہو اور دریا کے کنارے پر نہ آئے +

جب ملک گیری نے بہت سے معرکے طے کر دئے۔ اور رونق و زیبائی کو اس کے دربار سجانے کا موقع ملا۔ ہزاروں راجہ۔ مہاراجہ۔ ٹھاکر۔ سردار حاضر ہونے لگے۔ دربار اُن جواہر کی پتلیوں سے جگمگا اُٹھا۔ عالی ہمت بادشاہ نے اُن کے اعزاز اور مدارج کا بڑا لحاظ رکھا۔ اخلاق کا پتلا تھا۔ ملنساری اس کی طبیعت میں داخل تھی اُن سے اس طرح پیش آیا کہ سب کو آئندہ کے لئے بڑی بڑی اُمیدیں ہوئیں۔ بلکہ جو اُن کا متوسل ہو کر آیا۔ اُس سے اس طرح پیش آیا کہ ایک عالم اُدھر کو جھک پڑا۔ پنڈت کبیشر۔ گنی گنوان ہندوستان کے جو آئے۔ اس طرح خوش نکلے۔ کہ شاید اپنے راجاؤں کے دربار سے بھی اسی طرح نکلتے ہوں گے۔ ساتھ یہ بھی سب کو معلوم ہو گیا۔ کہ یہ برتاؤ اس کا ہمارے پھسلانے کے۔ لئے نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ ہم کو اپنا کرے اور ہمارا ہو رہے۔ اور اس کی سخاوتیں اور دن رات کے کاروبار اور اپنایت کے برتاؤ اس خیال کی ہر دم تصدیق کرتے تھے +

نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہم قوم اور غیر قوم کا فرق اصلا نہ رہا۔ سپہ داری اور ملک داری کے جلیل القدر عہدے ترکوں کے برابر ہندوؤں کو ملنے لگے[1]۔ دربار کی صف میں ایک ہندو ایک مسلمان۔ دو مسلمان ایک ہندو برابر نظر آنے لگے یا چپوتوں

[1] ذرا راجہ ٹوڈرمل کے حال میں دیکھو۔ کہ جب راجہ موصوف کو کل ممالک ہند کی وزارت اعظم کے اختیارات ملے تو لوگوں نے کیا شکایت کی اور نیک نیت بادشاہ نے کیا جواب دیا +

کی محبت اُن کی ہر بات کو بلکہ ریت رسوم اور لباس کو بھی اس کی آنکھوں میں خوشنما دکھانے لگی سچ ہے اور عمامہ کو اُتار کر جامہ اور کھڑکی دار پگڑی اختیار کر لی۔ داڑھی کو رخصت کر دیا۔ تخت و دیہیم کو چھوڑ کر سنگھاسن پر بیٹھنے اور ہاتھی پر چڑھنے لگا غرض فروش سواریاں اور دربار کے سامان آرائش سب ہندوانے ہونے لگے۔ ہندو اور ہندوستانی لوگ ہر وقت خدمت گزاری میں حاضر۔ جب بادشاہ کا یہ رنگ ہوا۔ تو ارکین و امراء ایرانی۔ تورانی سب کا وہی لباس۔ دربار میں پان کی گلوری[1] اس کا لازمی سنگار ہو گیا۔ ترکوں کا دربار اندرسبھا کا تماشا تھا۔

نوروز کا جشن ایران و توران کی رسم قدیم ہے۔ مگر اُس نے ہندوانی ریت رسوم کا رنگ دے کر اسے بھی ہندو بنایا۔ ہر سالگرہ پر جشن ہوتا تھا۔ شمسی بھی قمری بھی۔ اِن میں تلادان کرتے تھے۔ ۷ اناج ۷ دھات وغیرہ میں تلتے تھے۔ برہمن بیٹھ کر ہون کرتے تھے اور سب کی گٹھڑیاں باندھ اسیسیں دیتے گھر کو چلے جاتے۔ دسہرہ کو آتے۔ اشیر بادیں دیتے۔ پوجا کرواتے۔ ماتھے پر ٹیکہ لگاتے۔ جواہر و مروارید سے مرصع راکھی ہاتھ میں باندھتے۔ بادشاہ ہاتھ پر باز بٹھاتے۔ قلعے کے برجوں پر شراب رکھی جاتی۔ بادشاہ کے ساتھ اہل دربار بھی اسی رنگ میں رنگے گئے۔ اور پان کے بیڑوں نے سب کے منہ لال کر دئے۔ گائے کا گوشت۔ لسن۔ پیاز بہت سی چیزیں حرام اور بہت سی حلال ہو گئیں۔ صبح کو روز جمنا کے کنارے شرق رویہ کھڑکیوں میں بیٹھتے تھے۔ کہ پہلے آفتاب کے درشن ہوں۔ ہندوستان کے لوگ صبح کو بادشاہ کے دیدار کو بہت مبارک سمجھتے ہیں۔ جو لوگ دریا پر اشنان کو آتے تھے۔ مرد۔ عورتیں۔ بچے ہزار در ہزار سامنے آتے تھے۔ ڈنڈوتیں کرتے۔ مہابلی بادشاہ سلامت کہتے اور خوش ہوتے۔ وہ اپنے بچوں سے زیادہ اُنہیں دیکھ کر خوش ہوتا۔ اور خوشی بھی بجا تھی۔ جس کے دادا (بابر[2]) کو اپنی قوم (ترک) اس تباہی کے ساتھ اُس کے موروثی ملک سے نکالے۔ اور پانچ چھ پشت کی بندگی پر خاک ڈالے۔ یہ غیر قوم غیر جنس ہو کر اس محبت سے پیش آئیں۔ ان سے زیادہ عزیز کون ہوگا۔ اور وہ ان کے دیکھنے سے خوش نہ ہوگا تو کس سے ہوگا۔

اکبر نے سب کچھ کیا۔ مگر راجپوتوں نے بھی جاں نثاری کو حد سے گزار دیا۔

[1] دیکھو علی قلی خاں کا حال اس کا سر بریدہ کیوں کر پہچانا گیا۔ [2] دیکھو تتمہ شاہزادگانِ تیموری کا حال

سینکڑوں میں سے ایک بات ہے کہ جہانگیر نے بھی تزک میں لکھی ہے۔ اکبر نے رسوم ہند کو ابتدا میں فقط اس طرح اختیار کیا گویا غیر ملک کا تازہ میوہ ہے۔ یا نئے ملک کا نیا سنگار ہے۔ یا یہ کہ اپنے پیاروں اور پیار کرنے والوں کی ہر بات پیاری لگتی ہے۔ مگر ان باتوں نے اُسے مذہب کے عالم میں بدنام کر دیا اور بد مذہبی کا داغ اِس طرح دامن پر لگایا کہ آج تک بے خبر اور بے درد مُلا اس کی بدنامی کا سبق ویسا ہی پڑھے جاتے ہیں۔ اس مقام پر سبب اصلی کا نہ لکھنا اور دادگر بادشاہ پر ظلم کا جاری رکھنا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ میرے دوستو! تم نے کچھ سمجھ لیا اور آئندہ سمجھو گے۔ کہ ان علمائے زر پرست کی سینہ سیاہی اور بدنفسی نے کس قدر جلد اُنہیں اور اُن کے ہاتھوں اسلام کو ذلیل و خوار کر دکھایا *

ان نااہلوں کے کاروبار دیکھ کر نیک نیت بادشاہ کو ضرور خیال ہؤا ہو گا کہ حسد اور کینہ وری علمائے کتابی کا خاصہ ہے۔ اچھا۔ انہیں سلام کروں اور جو بزرگ اہل باطن اور صاحب دل کہلاتے ہیں۔ ان میں ٹٹولوں شاید اندر سے کچھ نکلے۔ چنانچہ اطرافِ ملک سے مشائخ نامدار بُلائے۔ ہر ایک سے الگ الگ خلوت رہی اور بہت باتیں اور حکایا نیں ہوئیں۔ لیکن جس کو دیکھا خاکستری جامہ کے اندر رفاک نہ تھا۔ مگر خوشامد۔ اور وہ خود دو بیگھہ مٹی کا سائل تھا۔ افسوس وہ آرزو مند اس بات کا کہ کوئی بات یا فقیرانہ کرامات یا راہِ خدا کا رستہ ان سے ملے۔ انہیں دیکھا تو خود اس سے مانگنے آتے تھے۔ معجزہ کہاں۔ کرامات کجا۔ باقی رہے اخلاق۔ توکّل۔ خوفِ الٰہی۔ دردمندی۔ سخاوت۔ ہمت۔ ظاہری باتیں۔ اس سے بھی پاک صاف پایا۔ انجام یہ ہؤا کہ بدگمانی خدا جانے کہاں کہاں دوڑ گئی *

ملّا صاحب ایک بزرگ[1] کا نام لکھ کر کہتے ہیں۔ فلاں نامی صاحب دِل اور مشہور مشائخ تشریف لائے۔ بڑی تعظیم سے عبادت خانہ میں اُتارا۔ اُنہوں نے نمازِ معکوس دکھائی اور سکھائی۔ اور بادشاہ کے ہاتھ بیچ بھی ڈالی۔ محل میں کوئی حرم حاملہ تھی۔ کہا کہ بیٹا ہو گا۔ وہاں بیٹی ہوئی۔ اور بہت سی خشک اور بے نمک اور بدمزہ

[1] خلیفہ شیخ عبدالعزیز دہلوی کے تھے۔ اور سرہند کے رہنے والے تھے *

حرکتیں کیں۔ کہ سوا افسوس کے کچھ زبانِ قلم پر نہیں آتا ہے

آں نہ صوفی گری و آزادیست دزدی و راہ زنی بہتر ازیں	بلکہ کیدی گری و قلاّبیست کفن از مردہ کنی بہتر ازیں

ایک شخص[1] حسب الطلب حاضر ہوئے۔ مگر اس طرح کہ تعمیل کی نظر سے حکم سُنتے ہی خانقاہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سواری (ڈولا) پیچھے آئی۔ خود فرمان کے ادب سے پچیس تیس منزل بادشاہی پیادوں کے ساتھ پیادہ آئے۔ فتحپور میں پہنچے تو ایک بزرگ[2] کے گھر اُترے اور کہلا بھیجا کہ حکم کی تعمیل کی ہے۔ مگر میری ملاقات کسی بادشاہ کو مبارک نہیں ہوئی۔ بادشاہ نے فوراً انعام و اکرام کے ساتھ حکم بھیجا کہ آپ کو تکلیف کرنی کیا ضرور تھی۔ بہت اشخاص دور ہی دور سے کنارہ کش ہو گئے۔ خدا جانے کچھ اندر تھا بھی یا نہیں ◆

ایک صاحب دل آئے۔ نہایت نامی اور عالی خاندان تھے۔ بادشاہ نے اُن کی کھڑے ہو کر تعظیم بھی کی۔ نہایت اعزاز و اکرام سے پیش آیا۔ مگر جو کچھ پوچھا۔ اُنھوں نے کانوں کی طرف اشارہ کیا۔ اور جواب دیا کہ اونچا سُنتا ہوں۔ علم۔ معرفت۔ طریقت۔ شریعت جس معاملہ میں پوچھتا تھا انجان اور بھولی بھالی صورت بنا کر کہتے تھے "اونچا سنتا ہوں"، غرض وہ بھی رخصت ہوئے۔ جس کو دیکھا یہی معلوم ہُوا۔ کہ خانقاہ یا مسجد میں بیٹھے ہیں۔ دوکان داری کر رہے ہیں۔ اندر لا مکان سے

کر سے کعبہ میں کیا جو سر بتخانہ سے آگہ ہے	وہاں تو کوئی صورت بھی یہاں اللہ ہی اللہ ہے

بعضے شیطان طینتوں نے کہا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ اختلاف مذاہب جو سلف سے چلا آتا ہے۔ ان کا دفع کرنے والا آئیگا۔ اور سب کو ایک کر دیگا۔ وہ اب آپ پیدا ہوئے ہیں۔ بعض نے کتب قدیم کے اشاروں سے ثابت کر دیا کہ سنہ ۹۹۰ھ میں اس کا ثبوت نکلتا ہے ◆

ایک عالم کعبتہ اللہ سے شریف مکّہ کا رسالہ لے کر تشریف لائے۔ اس میں اتنی بات کو پھیلایا تھا کہ دنیا کی ۷ ہزار برس کی عمر ہے۔ وہ ہو چکی۔ اب حضرت

[1] شیخ ستمی افغان پنجاب سے تشریف لے گئے [2] شیخ جمال بختیاری

امام مہدی کے ظہور کا وقت ہے۔ سو آپ ہیں۔ **قاضی عبد السمیع میانکالی** قاضی القضاۃ تھے۔ ان کا خاندان تمام ماوراء النہر میں عظمت اور برکت سے نامور تھا۔ مگر یہاں یہ عالم تھا۔ کہ بازی لگا کر شطرنج کھیلنا وظیفہ تھا۔ جلسۂ میخواری ایک عالم تھا۔ جس کے آفریدگار وہ تھے۔ رشوت نذرانہ تھا۔ جس کا لینا مثل ادائے نماز فرض عین تھا۔ تمسکوں میں سود پر حسب الحکم لکھتے تھے۔ اور وصول کر لیتے تھے۔ (حیلۂ شرعی بھی ضرور چاہیئے) قاسم خاں فوجی نے کچھ اشعار لکھ کر ان کے احوال و افعال کی تصویر کھینچی تھی۔ ایک شعر اس کا یاد ہے ؎

	پیرے ز قبیلۂ معزز		ریشے چو گلِ سفید یک گز

نیک نیت بے علم بادشاہ طالبِ خیر اور جویائے حق تھا۔ ایسی ایسی باتوں نے اس کے عقل و ہوش پریشان کر دیئے ؎

	پوشیدہ مرقع اندرین خامے چند		بگرفتہ بہ طامات الف لامے چند	لاالٰہ
	نارفتہ رہِ صدق و صفا گامے چند		بدنام کنندہ نکو نامے چند	الااللہ

آتش پرست پارسی نوساری علاقۂ گجرات دکن سے آئے۔ وہ دین زردشت کی کتابیں بھی لائے۔ ملکِ دل کا بادشاہ ان سے بہت خوش ہو کر ملا۔ شاہان کیانی کی رسم و رواج۔ آگ کی عظمت کے آئین۔ اور اس کی اصطلاحیں معلوم کیں۔ ملا صاحب کہتے ہیں۔ آتشکدہ محل کے پاس بنوایا۔ حکم تھا۔ ایک دم آگ بجھنے نہ پائے۔ کہ آیات عظیمۂ الٰہی اور اس کے نوروں میں سے ایک نور ہے۔ ۲۵ھ جلوس میں بے تکلف آگ کو سجدہ کیا۔ جب چراغ یا شمع روشن ہوتی۔ مصاحبان مقربین تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اہتمام اس کا شیخ ابو الفضل کے سپرد ہوا۔ آزاد۔ پارسیاں مذکور کو نوساری میں چار سو بیگھہ زمین جاگیر دی۔ اب تک ان کے قبضے میں چلی آتی ہے۔ اکبری اور جہانگیری سندیں ان کے پاس موجود ہیں۔ میں نے سیاحت بمبئی میں وہ کاغذات بچشمِ خود دیکھے ہیں ✦

اہل فرنگ کا آنا اور اُن کی خاطرداری

اکبر اگرچہ علوم و فنون کی کتابیں نہ پڑھا تھا۔ مگر اہل علم سے زیادہ علوم و فنون

اور شائستگی اور تہذیب کا عاشق تھا۔ اور ہمیشہ ایجاد و اختراع کے رستے ڈھونڈھتا تھا۔ اس کی دلی آرزو یہ تھی کہ جس طرح فتوحاتِ ملکی اور شجاعت و سخاوت میں نامور ہوں۔ اور میرا ملک قدرتی پیداوار اور زرخیزی میں باغ زر ریز ہے۔ اسی طرح علوم و فنون میں نامور ہو۔ وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ علم و کمال کے آفتاب نے یورپ میں صبح کی ہے۔ اس لئے اس ملک کے باکمالوں کی تلاش رکھتا تھا۔ یہ امر قانون قدرت میں داخل ہے۔ کہ جو ڈھونڈھیگا سو پائیگا۔ سامان اس کے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے چند اتفاق لکھتا ہوں ✦

۹۷۹ھ میں ابراہیم حسین مرزا نے بغاوت کر کے قلعہ بندر سورت پر قبضہ کر لیا۔ بادشاہی لشکر نے جا کر گھیرا۔ اور خود اکبر یلغار کر کے پہنچا۔ سوداگران فرنگ کے جہاز ان دنوں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ مرزا نے انہیں لکھا کہ اگر تم آؤ۔ اور اسوقت میں میری مدد کرو۔ تو قلعہ تمہیں دے دونگا۔ وہ لوگ آئے۔ مگر بڑی حکمت سے آئے۔ یعنی بہت سے عجائب و غرائب تحفے مختلف ممالک کے ساتھ لیتے آئے۔ جب لڑائی کے پلے پر پہنچے تو دیکھا۔ کہ سامنے کا وزن بھاری ہے۔ مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ جھٹ رنگ بدل کر ایلچی بن گئے۔ اور کہا کہ ہم تو اپنی سلطنت کی سفارت پر آئے ہیں۔ دربار میں پہنچ کر تحفے تحائف گزرانے۔ اور خلعت و انعام کے ساتھ مراسلہ کا جواب لے کر رخصت ہوئے ✦

اکبر کی ایجاد پسند طبیعت اپنے کام سے کبھی نچلی نہ رہتی تھی۔ جس طرح اب بمبئی اور کلکتہ ہے۔ اُن دنوں اکثر ممالک یورپ اور ایشیا کے جہازوں کے لئے گودا اور سورت بندرگاہ تھے۔ معرکہ مذکور کے کئی برس بعد اُس نے حاجی حبیب اللہ کاشی کو زر کثیر دے کر روانہ کیا۔ صنعتوں کے ماہر اور ہر فن کے مبصر ساتھ کئے کہ بندرگاہ گووا میں جا کر مقام کرو۔ اور وہاں سے عجائب و نفائس دیارِ فرنگ کے لاؤ۔ جو صنعت گر اور دستکار ممالک مذکورہ کے وہاں سے آسکیں انہیں بھی ساتھ لاؤ۔ وہ ۹۸۴ھ میں وہاں سے پھرے۔ تحائف و عجائب کے علاوہ جماعت کثیر اہل کمال کی ساتھ لائے۔ جس وقت شہر میں داخل ہوئے۔ تو عجائبات کی برات بن گئی۔ انبوہ کثیر جوان و پیر کا ساتھ تھا۔ بیچ میں بہت سے

اہلِ فرنگ اپنا ملکی لباس پہنے۔ اور اپنے قانون موسیقی کے بموجب فرنگی باجے بجاتے شہر میں داخل اور دربار میں حاضر ہوئے۔ انہی کے نوادر و غرائب میں اول ارغنون (آرگن)، ہندوستان میں آیا۔ وقت کے مؤرخ لکھتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس باجے کو دیکھ کر عقل حیران اور ہوش سرگرداں ہے+

دانایانِ مذکور نے دربار اکبری میں جو اعزاز پائے ہوں گے یاد بانوں نے اُڑا کر یورپ کے ملک ملک میں پہنچائے ہوں گے۔ اور جابجا امیدوں کے دریا لہرائے ہوں گے۔ کسی موج نے بندر ہگلی کے کنارے پر بھی ٹکر کھائی ہوگی۔ امرا کی کارگزاری جدھر بادشاہ کا شوق دیکھتی ہے ادھر پسینہ ٹپکاتی ہے۔ چنانچہ ۲۳ جلوس میں شیخ ابو الفضل اکبر نامہ میں ۹۸۶ھ لکھتے ہیں۔ کہ خان جہان حسین قلی خاں نے کوچ بہار کے راجہ سے اطاعت نامہ اور تحائف و نفائس اس ملک کے لے کر دربار میں بھیجے۔ تاب بارسو تاجر فرنگ بھی حاضر دربار ہوا۔ اور بارسو بارن تو بادشاہ کے حسن اخلاق اور اوصاف طبع دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور اکبر نے بھی ان پر درستی عقل اور شائستگی حال کا صاد کیا+

۳۵ جلوس میں لکھتے ہیں۔ پادری فربیتون بندر گووا سے اُتر کر حاضر دربار ہوئے۔ بہت سے عقلی اور نقلی مطالب سے آگاہ تھے۔ شہزادگان تیز ہوش کو ان کا شاگرد کیا۔ کہ یونانی کتابوں کے ترجمہ کا سامان فراہم اور ہر رنگ کی باتوں سے آگاہی حاصل ہو۔ پادری موصوف کے علاوہ ایک گروہ انبوہ فرنگی۔ ارمنی۔ حبشی وغیرہ کا تھا۔ کہ ممالک مذکورہ کی عمدہ اجناس لایا تھا۔ بادشاہ دیر تک سیر دیکھتے رہے+

۱۰۰۰ھ میں پھر ایک قافلہ بندر مذکور سے آیا۔ اشیائے عجیب و اجناس غریب لایا۔ ان میں چند دانش ور صاحب ریاضت مذہب نصاریٰ کے تھے۔ کہ پادری کہلاتے ہیں۔ نوازش بادشاہی سے کامیاب ہوئے۔ دیکھو اقبال نامہ ۱۰۰۳ھ+

ملا صاحب فرماتے ہیں کہ پاپا یعنی پادری آئے۔ ملک افرنجہ کے دانایان مرتاض کو پادھری کہتے ہیں۔ اور مجتہد کو پاپا۔ وہ مصلحت وقت کی رعایت سے احکام کو تبدیل کر سکتا ہے۔ اور بادشاہ بھی اس کے حکم سے عدول نہیں کر سکتا۔

وہ انجیل لائے اور ثالث ثلثہ پر دلائل پیش کر کے نصرانیت کا اثبات کیا۔ اور ملت عیسوی کو رواج دیا۔ ان کی بڑی خاطریں ہوئیں۔ بادشاہ اکثر دربار میں بلاتا تھا۔ اور دینی حالات اور دنیاوی معاملات میں گفتگوئیں سُنتا تھا۔ ان سے توریت انجیل کے ترجمے کرنے چاہے۔ اور کام بھی شروع ہوا۔ مگر ناتمام رہا۔ اور شاہزادہ مراد کو ان کا شاگرد بھی کیا۔ (ایک اور جگہ کہتے ہیں) جب تک یہ لوگ رہے۔ ان کے حال پر بہت توجہ رہی۔ وہ اپنی عبادت کے وقت ناقوس بجاتے تھے اور باجوں سے نغمہ سرائی کرتے تھے اور بادشاہ سُنتا تھا۔ آزاد۔ معلوم نہیں۔ کہ جو زبان شاہزادے سیکھتے تھے وہ رومی تھی یا عبرانی تھی۔ مُلّا صاحب اگرچہ سنہ نہیں لکھتے مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد کی شاگردی کا تعلق بھی پادری فریبتون سے تھا۔ شاید وہ اپنی یونانی زبان سکھاتے ہونگے جس کا ابوالفضل کے بیان سے اشارہ پایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر ہماری کتابوں سے نہیں معلوم ہوتا۔ کہ اس وقت کون کون سی کتابیں ان لوگوں کی معرفت ترجمہ ہوئیں۔ البتہ ایک کتاب میں نے خلیفہ سید محمد حسن صاحب کے کتب خانہ میں دیکھی۔ کہ زبان لاطینی (رومی) سے اسی عہد میں ترجمہ ہوئی تھی +

مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ ایک موقع پر شیخ قطب الدین جالیسری کو کہ مجذوب خراباتی تھے۔ لوگوں نے پادریوں کے مقابلے میں مباحثے کے لئے پیش کیا۔ فقیر مذکور میدان مباحثہ میں جوش خروش سے صف آرا ہوئے۔ کہا کہ ایک بڑا ڈھیر آگ کا دہکاؤ۔ جس کو دعویٰ ہو میرے ساتھ آگ میں کود پڑے۔ جو صحیح سلامت نکل آئے وہ حق پر ہے۔ آگ دہکا کر تیار کی۔ اُنھوں نے ایک پاپا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ ہاں بسم اللہ۔ پاپاؤں نے کہا کہ یہ بات خلاف عقل ہے۔ اور اکبر کو بھی یہ حرکت ناگوار گزری۔ آزاد بے شک ایسی بات کہنی گویا اقرار ہے اس بات کا کہ ہمارے پاس دلیل عقلی نہیں۔ اور مہمانوں کا دل آزردہ کرنا نہ شریعت میں درست نہ طریقت میں۔ تبت اور خطا کے لوگوں سے وہاں کے حالات سُنتا تھا۔ جین مت کے لوگوں سے بودھ دھرم کی کتابیں سُنا کرتا تھا۔ ہندوؤں میں بھی صدہا فرقے ہیں اور سینکڑوں ہی کتابیں ہیں۔ وہ سب کو سنتا تھا اور ان پر گفتگوئیں کرتا تھا +

لطیفہ۔ چند مسلمانوں بلکہ شیطانوں نے ایک فرقہ پیدا کیا کہ نماز۔ روزہ وغیرہ عبادات وطاعات سب چھوڑ دیئے۔ ناچ رنگ۔ شراب کباب کو شغل لازمی اختیار کیا۔ علماء نے بلاکر ہدایت کی۔ کہ اعمال ناشائستہ سے توبہ کرو۔ جواب دیا کہ پہلے توبہ کرلی ہے۔ جب یہ اختیار کیا ہے +

انہیں دنوں میں اکثر سلسلوں کے مشائخ بھی حکومت سے اخراج کے لئے انتخاب ہوئے تھے۔ چنانچہ ان بے سلسلہ اور اُن باسلسلہ اشخاص کو ایک قندھاری کارواں کے سلسلے میں رواں کر دیا۔ کارواں باشی کو کہا کہ انہیں وہاں چھوڑ آؤ۔ کارواں مذکور قندھار سے ولایتی گھوڑے لے آیا کہ کارآمد تھے۔ انہیں چھوڑ آیا کہ نکمّے تھے۔ بلکہ کام بگاڑنے والے۔ جب زمانہ بدلتا ہے۔ تو ایسے ہی سیاد لے کیا کرتا ہے تین سو برس بعد اُستاد مرحوم نے اس انگوٹھی پر نگینہ جڑا ہے ؎

عجب نہ تھا کہ زمانے کے انقلاب سے ہم	تیمم آب سے اور خاک سے وضو کرتے

خلاصہ مطالب مذکورۂ بالا کا یہ ہے۔ کہ مختلف اور متفرق معلومات کا ذخیرہ ایک ایسے بے تعلیم دماغ میں بھرا۔ جن پر ابتدا سے اب تک کبھی اصول و قواعد کا عکس بھی نہ پڑا تھا۔ سمجھ لو کہ اُس کے خیالات کا کیا حال ہوگا۔ اتنا ضرور ہے کہ اس کی نیت بدی اور بدخواہی پر نہ تھی۔ اُسے یہ بھی خیال تھا۔ کہ کل مذہبوں کے بانی نیک نیتی سے لوگوں کو حق پرستی اور نیک راہ پر لایا چاہتے تھے۔ اور اُنہوں نے اپنے اصولِ عقاید اور احکام و مسائل اپنے فہم اور اپنے عہد کے بموجب نیکی و اخلاق اور تہذیب و شائستگی کی بنیاد پر رکھے تھے۔ اُسے یہ بھی یقین تھا کہ ہر مذہب میں حق پرست اور صاحبِ معرفت لوگ ہوتے ہیں۔ نیک نیت بادشاہ جو سب سے اعلیٰ رُتبے کی بات سمجھتا تھا وہ یہ تھی کہ پروردگار رب العالمین ہے۔ اور قادر مطلق ہے اگر سارا حق ایک ہی مذہب کے حجرے میں بند ہوتا۔ اور وہی خدا کو پسند ہوتا۔ تو اُسی کو دنیا میں رکھتا۔ باقی سب کو نیست و نابود کر دیتا۔ لیکن جب ایسا نہ کیا تو معلوم ہوا کہ اُس کا ایک مذہب نہیں۔ سب اسی کے مذہب ہیں۔ بادشاہ سایۂ خدا ہے۔ اُسے بھی یہی سمجھنا چاہئے۔ کہ سب مذہب میرے ہیں۔ اُستاد مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہم کو کیا یاں راہ پر ہے کوئی یا گمراہ ہے — اپنی سب سے راہ ہے اور سب سے یاد اللہ ہے

اسی واسطے اُسے اس بات کا شوق نہ تھا کہ سارا جہان مسلمان ہو جائے۔ اور مسلمان کے سوا دوسرا آدمی نظر نہ آئے۔ چنانچہ اس کے دربار میں بہت سے مقدمے اس جھگڑے کے دائر ہوئے۔ بلکہ ایک مقدمے نے ایسا طول کھینچا۔ کہ شیخ صدر کی بنیاد اُکھڑ گئی۔

در حیرتم کہ دشمنیٔ کفر و دیں چراست — از یک چراغ کعبہ و بتخانہ روشن است

ہندو ہر وقت پہلو سے لگے تھے۔ ان سے ہر ایک بات پوچھنے کا موقع تھا۔ وہ بھی مدتوں سے دعائیں کر رہے تھے۔ کہ کوئی پوچھنے والا پیدا ہو۔ شوق تحقیق کو ان کی طرف جھکنے کا زیادہ موقع ملا۔ طالب تحقیق بادشاہ پر گھوتم برہمن کو (ابتدا میں سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ لکھوایا کرتا تھا) بلا کر تحقیقاتیں کرتا تھا۔ ملا صاحب فرماتے ہیں۔ ایک بالاخانہ خوابگاہ کہلاتا تھا۔ آپ اس کی کھڑکی میں بیٹھتے تھے۔ خلوت میں دیوی برہمن کو (جو مہابھارت کا ترجمہ کرواتا تھا) چارپائی پر بٹھلاتے تھے۔ اور رسیاں ڈال کر اوپر کھینچ لیتے تھے۔ وہ بیچ ہوا میں ہوتا تھا۔ کہ نہ زمین پر ہو نہ آسمان پر۔ اس سے آگ کے۔ سورج کے۔ اور ہر ایک ستارہ کے۔ اور ہر ایک دیوی۔ دیوتا۔ برمہا۔ مہادیو۔ بشن۔ کرشن۔ رام۔ مہامائی وغیرہ کی پوجا کے طریقے اور ان کے منتر سیکھتے تھے۔ اور ان کے مسائل اور افسانوں کو بڑے شوق سے سنتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی ساری کتابیں ترجمہ ہو جائیں +

ملا صاحب فرماتے ہیں۔ سنہ ۳ جلوس کے بعد زمانہ کا رنگ بالکل بدل گیا۔ کیونکہ بعض دین فروش ملا بھی شامل ہو کر اُن کے ساتھ ہمداستان ہو گئے۔ نبوت میں کلام۔ وحی میں سکوت ہونے لگے معجزے کرامت۔ جن۔ پری۔ ملائک جو آنکھ سے غائب اس کا انکار۔ قرآن کا تواتر۔ اس کا کلام الٰہی ہونا۔ سب باتوں کے لئے ثبوت طلب +

تناسخ پر رسالے لکھے گئے۔ اور قرار یہ پایا کہ اگر مرنے کے بعد ثواب یا عذاب ہے۔ تو تناسخ ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی صورت ممکن نہیں۔ ایک فقرہ کتابوں میں لکھا چلا آتا ہے۔ مامن مذہب الا و فیہ قدم راسخ للتناسخ

اتنی بات کو بڑھا کر بہت سے پھیلاوے پھیلائے۔ ارباب زمانہ اس قسم کے اشعار پڑھتے تھے اور خوش ہوتے تھے ؎

در حقیقت بدست کورے چند — مصحفے ماند و کہنہ گورے چند
گور با کس سخن نمے گوید — سر قرآں کسے نمے جوید

لطیفہ۔ خان اعظم جب کعبۃ اللہ سے پھرے تو جہان کو دیکھ کر ذرا عقل آگئی تھی۔ داڑھی بڑھائی اور درگاہ اکبری میں چڑھائی ؎

گر ابکے پھرے جیتے وہ کعبہ کے سفر سے — تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

سبحان اللہ۔ وہی خان اعظم۔ جن سے داڑھی کے طول پر کیا کیا طول کلام ہوئے۔ دیکھو خان موصوف کا حال۔ ۹۹۰ھ میں ایک مہم پر سے فتحیاب آئے۔ بادشاہ خوشی خوشی باتیں کر رہے تھے۔ اسی کے سلسلے میں فرمایا۔ کہ ہم نے تناسخ کے لئے دلائل قطعی پیدا کئے ہیں۔ شیخ ابوالفضل تمہیں سمجھائینگے۔ تم قبول کرو گے تسلیم کے سوا جواب کیا تھا۔

ایک بڑے[1] خاندانی مشائخ تھے۔ دیوی برہمن کو خوابگاہ پر جاتے ہوئے دیکھ کر انہیں بھی شوق پیدا ہوا۔ اور مکر و حیلہ کی کمند پھینک کر خوابگاہ پر پہنچنے لگے۔ بہت مقاصد **قرآن** کے اور مطالب **پُران** کے ملا کر ایک کر دیئے۔ وحدت وجود کی بنیاد رکھ کر ہمہ اوست کا منارہ بلند کیا۔ اور **فرعون** کو بھی مومن ثابت کر کے کسی کو بھی ایمان سے محروم نہ رکھا۔ بلکہ منقوش خاطر کر دیا۔ کہ مغفرت کی امید ہمیشہ خوف عذاب پر غالب ہے۔ اُنھوں نے ثابت کر دیا کہ انسان کامل جو پہلے پیغمبر تھے وہ اب خلیفۃ الزمان ہے۔ اور وہی عین واجب ہے۔ کم سے کم اس کا پرتو تو ضرور ہے۔ پس قبلۂ مرادات اور کعبۂ حاجات وہی ہے۔ سجدہ اس کے لئے جائز ہے۔ کہ فلاں فلاں پیروں کو ان کے مرید کیا کرتے تھے۔ شیخ یعقوب کشمیری نے ذکر اپنی مشہور

[1] ملا صاحب فرماتے ہیں۔ شیخ تاج الدین ولد ذکریا اجودھنی دہلوی تھے۔ (اجودھن اب پاکپٹن کہلاتا ہے۔ اور اکثر اشخاص شیخ ذکریا موصوف کو تاج العارفین کہتے ہیں۔ یہ حضرت شیخ مان پانی پتی کے شاگرد تھے شیخ مان پانی پتی وہ شخص تھے۔ کہ لوائح پر شرح لکھی تھی۔ اور نزہت الارواح پر بھی موٹی شرح تحریر فرمائی تھی۔ اور تصوف میں ایسی ایسی یادگاریں چھوڑی تھیں کہ علم توحید کے دوسرے محی الدین عربی تھے۔

تصنیفوں سے مرشد اور مقتدائے وقت مشہور تھے)۔ اس معاملہ میں بعض تمہیدیں عین القضات ہمدانی سے نقل کیں۔ اور ایسی ایسی گمراہیاں پھیلائیں +

ملا صاحب خفا ہو کر کہتے ہیں۔ بیربر نے یہ روشنی ڈالی۔ کہ آفتاب ذات الٰہی کا مظہر کامل ہے۔ سبزہ کا اُگانا۔ غلّوں کا لانا۔ پھولوں کا کھلانا۔ پھلوں کا پھلانا۔ عالم کا اُجالا۔ اہل عالم کی زندگی اس سے وابستہ ہے۔ اس لئے تعظیم اور عبادت کے لائق ہے۔ اس کے طلوع کی طرف رُخ کرنا چاہیئے نہ کہ غروب کی طرف۔ اسی طرح آگ۔ پانی۔ پتھر اور پیپل کے ساتھ سب درخت مظاہر الٰہی ہو گئے۔ یہاں تک کہ گائے اور گوبر بھی مظاہر الٰہی ہوئے۔ ساتھ اس کے تلک اور جنیؤ کو بھی جلوہ دیا۔ مزا یہ کہ علماء و فضلاء اور مصاحبان خاص نے اس کی تقویت کی۔ اور کہا کہ فی الحقیقت آفتاب نیّر اعظم۔ اور عطیہ بخش تمام عالم اور مربّی بادشاہوں کا ہے۔ اور جو باقبال بادشاہ ہوئے ہیں۔ وہ اس کی عظمت کو رواج دیتے رہے ہیں۔ اس قسم کی رسمیں ہمایوں کے عہد میں بھی جاری تھیں۔ کیونکہ چنگیزی ترکوں کا تورہ تھا۔ وہ قدیم سے نوروز کو عید مناتے تھے۔ اور خوان یغما لگا کر لوٹتے لٹاتے تھے۔ اسلام میں بھی ہر بادشاہ نے کہیں کم کہیں زیادہ اسے عید کا دن سمجھا ہے۔ اور فی الحقیقت جس دن سے اکبر تخت پر بیٹھا تھا۔ اس مبارک دن کو عالم کی عید سمجھ کر جشن کرتا تھا۔ اس کے رنگ کے موافق سارا دربار رنگین ہوتا تھا۔ ہاں اب وہ ہندوستان میں تھا۔ اس لئے ہندوستان کی ریت رسمیں بھی برت لیتا تھا +

برہمنوں سے تسخیر آفتاب کا منتر سیکھا۔ کہ نکلتے وقت اور آدھی رات کو اُسے جپا کرتا تھا۔ دیپ چند راجہ مجھولہ نے ایک جلسہ میں کہا۔ کہ حضور اگر گائے خدا کے نزدیک واجب التعظیم نہ ہوتی۔ تو قرآن میں سب سے پہلے اس کا سورہ کیوں ہوتا۔ اس کے گوشت کو حرام کر دیا۔ اور تاکید سے کہہ دیا کہ جو ماریگا۔ مارا جائیگا۔ حکماء طب کی کتابیں لے کر تائید کو حاضر ہوئے کہ اس کے گوشت سے رنگا رنگ کے مرض پیدا ہوتے ہیں۔ ردّی اور دیر ہضم ہے۔ آزاد۔ ملا صاحب اس کی باتوں کو جس طرح چاہیں بدرنگ کر کے دکھائیں۔ وہ حقیقت میں اسلام کا منکر بھی نہ تھا۔ چنانچہ میر ابوتراب امیر حاج ہو کر مکّہ کو گئے تھے۔ وہ ۹۸۷ھ میں پھر کر آئے۔ اور

ایک ایسا بھاری پتھر لائے۔ کہ ہاتھی سے بھی نہ اُٹھے۔ جب قریب پہنچے تو لکھا کہ فیروزشاہ کے عہد میں قدم شریف آیا تھا۔ حضور کے عہد مقدس میں قدوی یہ پتھر لایا ہے۔ اکبر سمجھ گیا تھا۔ کہ سید سادہ لوح نے سوداگری کی ہے۔ مگر اس لئے کہ خاص و عام میں اس بیچارے کی ہنسی نہ ہو۔ اور جو لوگ مجھے انکار نبوّت کی تہمتیں لگاتے ہیں۔ ان کے دانت ٹوٹ جائیں۔ اس لئے حکم دیا۔ کہ آداب الٰہی کے ساتھ دربار آراستہ ہو۔ سید موصوف کو فرمان پہنچا کہ چار کوس پر توقف کرو شہزادوں اور تمام امیروں کو لے کر پیشوائی کو گئے۔ دور سے پیادہ ہوئے۔ نہایت ادب اور عجز و نیاز سے خود اسے کندھا دیا۔ اور چند قدم چل کر فرمایا۔ کہ امرائے خوش اعتقاد اسی طرح دربار تک لائیں۔ اور پتھر میر ہی کے گھر پر رکھا جائے۔

مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ کہ ۹۸۷ھ میں قیامت آگئی۔ اور یہ موقع وہ تھا۔ کہ سب طرف سے خاطر جمع ہو گئی تھی۔ تجویز ہوئی کہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ **اکبر خلیفۃ اللہ** کہا کریں۔ پھر بھی لوگوں کے شور شرابے کا خیال تھا۔ اس لئے کہتے تھے۔ کہ باہر نہیں۔ محل میں کہا کرو۔ عوام کالانعام کی زبانوں پر اللہ اکبر کے سوا وظیفہ نہ تھا۔ اکثر اشخاص سلام علیک کی جگہ **اللہ اکبر** جواب میں جل جلالہٗ کہتے تھے۔ ہزاروں روپے اب تک موجود ہیں۔ جن کے دونوں طرف یہی سکہ منقوش ہے۔ گوکہ جاں نثار اور باوفا۔ بااعتبار گنے جاتے تھے۔ مگر صلاح ہوئی۔ کہ پہلے ان میں سے کوئی ابتدا کرے۔ چنانچہ **قطب الدین خاں** کو کہ مذہب تقلیدی چھوڑنے کے لئے اشارہ ہوا۔ وہ سیدھا سپاہی تھا۔ اس نے خیر اندیشی و دلسوزی کے رنگ میں ظاہر کیا۔ کہ ولایتوں کے بادشاہ یعنی سلطان روم وغیرہ سُن کر کیا کہیں گے۔ سب کا یہی دین ہے۔ خواہ تقلیدی ہے خواہ نہیں ہے۔ بادشاہ نے بگڑ کر کہا۔ ہاں! تو سلطان روم کی طرف سے غائبانہ لڑتا ہے۔ اپنے لئے جگہ پیدا کرتا ہے کہ یہاں سے جائے تو وہاں عزت پائے۔ جا وہیں چلا جا۔ شہباز خاں کمبو نے بھی تیز تند سوال جواب کئے۔ **بیربر** موقع تاک کر کچھ بولے۔ انہیں تو اس نے اس سختی سے دھمکایا کہ صحبت بدمزہ ہو گئی۔ اور امرا آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ بادشاہ نے شہباز خاں کو خصوصاً اور اوروں کو عموماً کہا کیا بکتے ہو۔ تمہارے مُنہ پر

گو مَیں جوتیاں بھر کر لگواؤں گا۔ مُلّا شیری نے اس عالم میں ایک قصیدہ کہا کہ اس کے چند اشعار ان کے حال میں لکھے ہیں +

انہی دنوں میں قرار پایا کہ جو شخص دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہو۔ چاہیئے کہ اخلاص چارگانہ رکھتا ہو۔ ترک مال۔ ترک جان۔ ترکِ ناموس۔ ترکِ دین۔ ان میں سے جو چاروں رکھتا ہے وہ پُورا ہے۔ ورنہ پون۔ آدھا۔ چوتھائی۔ جیسا ہوگا ویسا اُس کا اخلاص ہوگا۔ سب مخلص مرید درگاہ ہو گئے۔ کہ ان کا دین دین الٰہی اکبر شاہی تھا۔ ہدایت اور ترویج مذہب اور تعلیم مسائل کے لئے خلیفہ بھی تھے۔ ان میں سے خلیفہ اوّل شیخ ابوالفضل تھے۔ جو شخص دین الٰہی میں آتا تھا وہ اقرار نامہ لکھ کر دیتا تھا۔ اس کا انداز یہ تھا۔ منکہ فلاں ابن فلاں باشم۔ بطوع و رغبت و شوق قلبی از دین اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ بودم۔ ابرا و تبرا نمودم۔ و در دین الٰہی اکبر شاہی درآمدم۔ و مراتب چہارگانہ اخلاص کہ ترک مال و جان و ناموس و دین باشد قبول نمودم + اس دین میں بڑے بڑے عالیشان امیر اور صاحب ملک فرمانروا داخل ہوتے تھے۔ چنانچہ مرزا جانی حاکم ٹھٹہ بھی حلقۂ ارادت میں آیا۔ خطوط مذکورہ ابوالفضل کے سپرد ہوتے تھے کہ جس جس کا جیسا اعتقاد ہو نمبروار ترتیب دے رکھو۔ شیخ موصوف مجتہد اور خلیفہ دین الٰہی کے تھے۔ اس طریقے کا نام توحید الٰہی اکبر شاہی تھا +

امرا میں سے جو اشخاص دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہوئے۔ ان کی تفصیل کتابوں کے انتخاب سے حسب ذیل معلوم ہوتی ہے :۔

۱۔ ابوالفضل خلیفہ
۲۔ فیضی ملک الشعرائے دربار
۳۔ شیخ مبارک ناگوری
۴۔ جعفر بیگ آصف خاں مؤرخ اور شاعر
۵۔ قاسم کابلی شاعر
۶۔ عبدالصمد مصوّر دربار اور شاعر
۷۔ اعظم خاں کوکہ مکہ سے آکر
۸۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی
۹۔ صوفی احمد
۱۰۔ صدر جہاں مفتی کل ممالک ہندوستان اور
۱۱، ۱۲ } ان کے دونو صاحبزادے
۱۳۔ میر شریف املی
۱۴۔ سلطان خواجہ صدر
۱۵۔ مرزا جانی حاکم ٹھٹہ
۱۶۔ نقی شوستری شاعر و دو صدی منصبدار
۱۷۔ شیخ زادہ گوسالہ بنارسی
۱۸۔ بیربر

اسی سلسلہ میں ملّا صاحب کہتے ہیں ایک دن جلسۂ مصاحبت میں کہا۔ کہ آج کے زمانہ میں بڑا عقلمند کون ہے۔ بادشاہوں کو مستثنٰی کرو اور بتاؤ۔ حکیم ہمام نے کہا۔ مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ سب سے زیادہ مَیں عقلمند ہوں۔ ابوالفضل نے کہا۔ میرا باپ بڑا عقلمند ہے۔ اس قسم کے کلمات سے ہر شخص نے اپنی عقلمندی ظاہر کی +

اکبر کی ساری تاریخ میں یہ آئین آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ کہ باوجود ان سب باتوں کے اس سال میں اُس نے صاف حکم دے دیا کہ ہندوؤں کا جزیہ معاف کیا جائے۔ اور یہ کئی کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی تھی +

معافی جزیہ

پہلے بھی بعض بعض بادشاہ ہندوؤں سے جزیہ لیتے رہے تھے۔ سلطنت کے انقلابوں میں کبھی موقوف ہوتا تھا۔ کبھی مقرر ہو جاتا تھا۔ جب اکبر کی سلطنت نے استقلال پکڑا تو ملانوں نے پھر یاد دلایا۔ چنانچہ مُلّا صاحب سنوں کے خلط ملط میں لکھتے ہیں ”انہی دنوں میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو فرمایا کہ تحقیق کر کے ہندوؤں پر جزیہ لگاؤ۔ مگر پانی پر تحریر رہا تھا۔ جھٹ مٹ گیا۔“ پھر سنہ ۹۸۷ھ میں چوٹ کرتے ہیں ”تمغا یعنی محصول اور جزیہ کہ کئی کروڑ کی آمدنی تھی۔ اس سال میں موقوف کر دیا۔ اور تاکید کے ساتھ فرمان جاری ہوئے“ وہ اس تحریر سے لوگوں کے دلوں پر یہ پرتو ڈالتے ہیں کہ دین کی بے پروائی بلکہ اسلام کی دشمنی نے اس کے دل میں حرارتِ دینی کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اب حقیقت حال سنو کہ اوّل سنہ یکم جلوس میں اکبر کو جزیہ کا خیال آیا تھا نوجوانی کا عالم تھا۔ کچھ بے پروائی۔ کچھ بے اختیاری حکم جاری نہ ہوا۔ سنہ ۹ جلوس میں پھر اس مقدمہ پر بحث ہوئی۔ علمائے دیندار کا زور پورا پورا تھا۔ اس پر قیل و قال ہوئی اُنھوں نے کہا کہ شریعت اسلام کا حکم ہے ضرور لینا چاہئے۔ چنانچہ کہیں اس پر عمل ہوا کہیں نہ ہوا۔ سنہ ۹۸۸ھ[1] ۲۵ جلوس میں بادشاہ صلاح اندیش پھر اس عزم پر مستقل ہوا۔ اور کہا کہ عہدِ سلف میں جو یہ امر تجویز کیا گیا تھا۔ سبب یہ تھا کہ ان لوگوں نے

[1] غالباً ۹۸۳ھ ہوں +

اپنے مخالفوں کے قتل اور غارت کو مصلحت سمجھا تھا۔ چنانچہ اس نظر سے کہ ظاہری انتظام قائم رہے۔ یعنی جو ہاتھ کے نیچے ہیں وہ دبے رہیں۔ جو باہر ہیں اُن پر دباؤ پہنچے۔ اور اپنی ضروریات کے لئے سامان ہاتھ آئے کچھ روپیہ قرار دیا اور اس کا نام جزیہ رکھا۔ اب کہ ہماری خیر اندیشی اور کرم بخشی اور مرحمت عام سے غیر مذہب اشخاص یک جہتان ہمدین کی طرح کمر باندھ کر رفاقت پر جان دیتے ہیں۔ اور خیر خواہی اور جانفشانی میں جاں نثاری کی حد سے گزر گئے ہیں۔ کیونکہ ہوسکتا ہے اہل خلاف سمجھ کر انہیں بے عزت اور قتل و غارت کیا جائے۔ اور ان جاں نثاروں کو مخالف قیاس کیا جائے۔ ان لوگوں پر کہ جن کی پہلی نسلوں میں اور ہماری اصلوں میں عداوت جانی تھی۔ دبے ہوئے خون جو خدا جانے کس طرح خاک پر گرے تھے۔ مگر اب ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ انہیں دمبدم جگانا اور گرمانا کیا ضرور ہے۔ اصل بات تو یہ ہے۔ کہ بڑا سبب جزیہ لینے کے لئے یہ تھا کہ سلطنتوں کے منتظم اور معاون سامان اور اسباب دنیوی کے محتاج تھے اس ذریعے سے معاش میں وسعت پیدا کرتے تھے۔ اب ہزاراں ہزار زر نقد خزانہ میں موجود ہے۔ بلکہ آستانہ اقبال کے ایک ایک ملازم کو بے ضرورتی سے بڑھ کر فارغ البالی حاصل ہے۔ پھر منصف دانا کوڑی کوڑی چننے کے لئے کیوں نیت بگاڑے اور نہیں چاہئے کہ موہوم فائدہ کے لئے نقد نقصان پر تیار ہو بیٹھے۔ **آزاد**۔ اگرچہ دینے والوں کو پیسے۔ آنے یا کچھ روپے دینے پڑتے تھے۔ مگر فرمان جاری ہوتے ہی گھر گھر خبر پہنچ گئی۔ اور زبان زبان پر شکرانے جاری ہو گئے۔ ذرا سی بات نے دلوں اور جانوں کو مول لے لیا۔ یہ بات ہزاروں خون بہانے اور لاکھوں لونڈی یا غلام بنانے سے نہ حاصل ہوتی۔ ہاں مسجد نشین ملانے جنہوں نے مسجدوں میں بیٹھ کر پیٹ پالے اور کتابوں کے لفظ یاد کر لئے تھے۔ ان کے کان میں آواز گئی کہ آتا ہُوا روپیہ بند ہُوا جان تڑپ گئی۔ ایمان لوٹ گئے۔

لطیفہ۔ ایک جلسہ میں کوئی ملا نے صاحب بھی آ گئے۔ گفتگو یہ تھی کہ مولویوں کو (سیاق) حساب میں لیاقت کم ہوتی ہے۔ مُلا نے صاحب اُلجھ پڑے۔ ایک شخص نے کہا۔ اچھا بتاؤ۔ دو اور دو کے ملا گھبرا کے بولے چار روٹیاں۔ پناہ بخدا یہ مسجدوں کے فرمانروا۔ دن کا کھانا دوپہر ڈھلے۔ اور رات کا کھانا آدھی رات کھاتے ہیں کہ شاید

کوئی اچھی چیز آجائے۔ اور اور اچھی چیز آجائے۔ اور اس سے بھی اچھی چیز آجائے۔ اور شاید کوئی بلانے ہی آجائے۔ آدھی بجے رات کی گھڑیاں گنتے ہیں اور بیٹھے رہتے ہیں ہوا سے کنڈی ہلی اور دروازہ کو دیکھنے لگے۔ کہ کوئی کچھ لایا۔ مسجد میں بلّی کی آہٹ ہوئی۔ اور چونکتے ہوئے کہ دیکھیں کیا آیا۔ اللّٰھم احفظنا من کل بلاء الدنیا و عذاب الاخرۃ۔ ایسے لوگ مصالح سلطنت کو کیا سمجھیں۔ اُنہیں کیا خبر کہ یہ معاملہ کیا ہے اور اس کا ثمرہ کیا ہے۔ ایک ایسے ہی مقام پر ابوالفضل نے کیا خوب لکھا ہے ؎

تو خود مے نشنوی بانگِ دہل را		رموزِ سرِّ سلطاں را چہ دانی	
ترا از کافِ کفرت ہم خبر نیست		حقائقہائے ایماں را چہ دانی	

پھر مُلّا صاحب فرماتے ہیں۔ ابھی ۹۹۰ھ ہوئے تھے۔ جو لوگوں نے ذہن نشین کیا ۱۰۰۰ھ ہو چکے۔ مذہب اسلام کا دَور ہو چکا۔ اب دین نیا ہوگا۔ چنانچہ دین الٰہی اکبر شاہی کو کہ احکام حکمت پر مشتمل تھا جلوہ دینا شروع کیا۔ اسی سنہ میں حکم دیا کہ سکوں میں سنہ الف منقوش ہو۔ اور تاریخ الفی تصنیف ہوئی۔ زمین بوسی کے نام سے سجدہ قائم ہؤا کہ بادشاہوں کے لئے لازم ہے۔ شراب کا بند کھل گیا۔ مگر اس میں بھی ایک آئین تھا کہ بقدر فائدہ ہو۔ بیماری میں حکیم بتائے تو پیو۔ اتنی نہ پیو۔ کہ بدمستیاں کرتے پھرو۔ اور ایسا ہو تو سزا بھی سخت تھی۔ دربار کے پاس ہی آب کاری کی دوکان تھی۔ نرخ سرکار سے مقرر تھا۔ جسے درکار ہوئی۔ وہاں گیا۔ رجسٹر میں اپنا باپ کا دادا کا نام۔ قومیت وغیرہ وغیرہ لکھوائی۔ اور لے آیا۔ مگر یار لوگ کسی گم نام کو بھیج دیتے تھے۔ فرضی نام لکھوا کر منگاتے تھے۔ اور شیر مادر کی طرح پیتے تھے۔ خواجہ خاتون دربان اس کا داروغہ تھا۔ یہ بھڑوا بھی اصل میں کلال ہی کی نسل تھا۔ اس اختیاط پر بھی شور شرابے ہوتے تھے سر پھوٹتے تھے۔ دار القضا سے سخت سزائیں ملتی تھیں۔ مگر خاطر میں کون لاتا تھا +

لطیفہ۔ لشکر خان میر بخشی ایک دن شراب پی کر دربار میں آیا اور بدمستی کرنے لگا۔ اکبر بہت خفا ہؤا۔ گھوڑے کی دُم سے بندھوایا۔ اور لشکر خاں کو لشکر میں تشہیر کیا۔ سب نشے ہرن ہو گئے۔ ان ہی لشکر خاں کو عسکر خاں خطاب ہؤا۔ لوگوں نے

استرخاں بنادیا (واہ خچر خاں)

لطیفہ۔ مُلّا صاحب کے رونے کا مقام تو یہ ہے کہ ۹۹۸ھ کے جشن میں دربار خاص تھا۔ شراب کا دور چل رہا تھا کہ میر عبدالحیٔ صدر جہاں مفتی کل ممالک ہندوستان نے اپنے دلی شوق و ذوق سے جام طلب کرکے نوش جان فرمایا۔ اکبر نے مسکرا کر خواجہ حافظ کا شعر پڑھا ؎

درعہد بادشاہ خطابخش جُرم پوش　　قاضی پیالہ کش شد و مفتی قرابہ نوش

یہی بزرگوار حکیم ہمام کے ساتھ عبداللہ خاں ازبک کے دربار میں برسمِ سفارت بھیجے گئے تھے۔ اور مراسلت میں جو فقرے اُن کی شان میں نازل ہوئے تھے یہ ہیں۔ سیادت مآب۔ نقابت نصاب میر صدر جہاں از جملہ اعاظم سادات کبار و اجلہ اتقیائے ایں دیار۔ زمانہ کی تاثیر کو دیکھو کہ اہلِ عالم کا کیا حال کر دیا تھا اور اکبر کی اس میں کیا خطا تھی۔ سبحان اللہ کسی اُستاد نے کہا ہے۔ اور کیا خوب کہا ہے ؎

عشقت خبر ز عالم بے ہوشی آورد	اہلِ صلاح را بہ قدح نوشی آورد
یادِ تو اے نگار چہ معجونِ حکمت است	کز ہر چہ خواندہ ایم فراموشی آورد

بازاروں کے برآمدوں میں رنڈیاں اتنی نظر آنے لگیں کہ آسمان پر اتنے تارے بھی نہ ہونگے۔ خصوصاً دارالخلافہ میں۔ ان سب کو شہر کے باہر ایک جگہ آباد کیا اور **شیطان پورہ** نام رکھا۔ اس کے لئے بھی آئین تھے۔ داروغہ۔ منشی۔ چوکیدار موجود۔ جو کسی رنڈی کے پاس آکر رہتا۔ یا گھر لے جاتا نام کتاب میں لکھوا جاتا۔ بے اس کے کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ رنڈیاں نئی نوچی کو نہ بٹھا سکتی تھیں۔ ہاں کوئی امیر چاہے تو حضور میں اطلاع ہو۔ پھر لے جائے۔ پھر بھی اندر ہی اندر کام ہو جاتے تھے۔ پتہ لگ جاتا تو اُس رنڈی کو خود الگ بُلاتے اور پوچھتے کہ یہ کام کس کارگزار کا تھا۔ وہ بتا بھی دیتی تھیں معلوم ہوتا تھا تو اس امیر کو خلوت میں بُلا کر خوب لعنت ملامت کرتے۔ بلکہ بعضوں کو قید بھی کر دیا۔ آپس میں بھی بڑے شور و شر ہوتے تھے۔ سر پھوٹتے تھے۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹتے تھے۔ مگر مانتا کون تھا۔ ایک دفعہ یہاں بیربرجی کی بھی چوری پکڑی گئی۔ جاگیر پر بھاگ گئے۔

داڑھی جو مسلمانوں میں نورالٰہی کہلاتی ہے بڑی خوار ہوئی۔ سبزۂ رخسار کی جڑ پتال سے ڈھونڈھ کر نکالی۔ جہاں سے اُسے پانی پہنچتا ہے +

لطیفہ۔ علماء میں ایک مشائخ تھے۔ اور خاص حضرت شیخ مان پانی پتی کے بھتیجے تھے۔ اپنے عم بزرگوار کے کتب خانہ میں سے ایک کرم خوردہ کتاب لے کر تشریف لائے۔ اس میں سے حدیث دکھائی کہ آنحضرت کی خدمت میں ایک صحابی تشریف لائے۔ بیٹا ساتھ تھا۔ اس کی داڑھی منڈی ہوئی تھی۔ آنحضرت نے دیکھ کر فرمایا کہ اہل بہشت کی ایسی ہی صورت ہوگی۔ بعض جعلساز فقیہوں نے کتب فقہ میں سے یہ فقرہ جواز کی سند میں نکالا۔ کما یفعلہ بعض القضات + عصات کو ظالموں نے قضات پڑھ دکھایا۔ غرض تمام دربار منڈ کر صفا چٹ ہوگیا۔ اہل ایران و توران جن کی داڑھیوں کی خوبصورتی تصویر کا عالم دکھاتی تھیں۔ اُن کے رخسارے میدان لق و دق نظر آنے لگے +

ملا صاحب پھر چوٹ فرماتے ہیں۔ ہندوؤں کے مذہب کا ایک مشہور مسئلہ ہے کہ ۱۰ جانور ہیں جن کی صورت میں خدا نے ظہور کیا ہے۔ ایک ان میں سے سُؤر ہے۔ بادشاہ نے بھی اس کا خیال کیا اور زیر جھروکہ اور بعض مقامات میں جدھر یہ لوگ اشنان کو آتے تھے سُؤر بلوائے۔ کُتّے کے فضائل میں یہ دلیل پیش ہوئی۔ کہ اس میں ۱۰ خصلتیں ایسی ہیں کہ ایک بھی انسان میں ہو تو ولی ہو جائے۔ بعض مقربانِ درگاہ نے کہ خوش طبعی اور ہمہ دانی اور ملک الشعرائی سے ضرب المثل ہیں چند کُتّے پالے۔ گودوں میں بٹھاتے تھے۔ دسترخوان پر ساتھ کھلاتے تھے۔ منہ چومتے تھے۔ اور بعض مردود شاعر ہندی و عراقی فخر سے اُن کی زبانیں منہ میں لیتے تھے۔ سند کے لئے ایک صوفی شاعر کا یہ قول تھا ؎

ہر کہ آید در نظر از دور پندارم توئی	بسکہ در چشم و دلم ہر لحظہ اے یارم توئی

شیخ فیضی کے کتوں پر ملا صاحب ہمیشہ تاک باندھے بیٹھے ہیں۔ جہاں موقع پاتے ہیں ایک پتھر کھینچ ملدتے ہیں۔ دیکھو یہاں بھی مُنہ مارا لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ شکار کے ذوق شوق میں اکثر شاہان و امرا کتوں کا بھی شوق رکھتے تھے اور رکھتے ہیں ترکستان اور خراسان میں رسم عام ہے۔ اکبر نے بھی کتے رکھے تھے۔ قاعدہ ہے کہ

جس بات کا بادشاہ کو شوق ہوتا ہے۔ امرائے قربت پسند کو اس کا شوق واجب ہوتا ہے۔ اس لئے فیضی نے بھی رکھے ہوں گے۔ مُلّا صاحب چاہتے ہیں ثابت کریں کہ وہ فرض مذہبی سمجھ کر کتّے پالتا تھا +

لطیفہ ۔ مطلع مذکورۂ بالا لکھ کر مجھے یاد آیا کہ شاعر نے جب یہ مطلع جلسۂ احباب میں پڑھا۔ اور کہا۔ ع ہر کہ آید در نظر از دُور پندارم توئی ۔
تو ایک شوخ طبع شخص نے کہا۔ آنجا۔ اگر سگ بنظر آید؟ اُس نے کہا پندارم توئی +

جب زبانیں کھُل جاتی ہیں اور خیالات کے میدان وسیع ہو جاتے ہیں تو ایک عقلی بات میں ہزار بے عقلی کی باتیں نکلنے لگتی ہیں۔ چنانچہ ملا صاحب فرماتے ہیں اور بجا فرماتے ہیں۔ دربار میں تقریریں ہوتی تھیں کہ غسل جنابت کی کیا ضرورت ہے اس سے تو انسان اشرف المخلوقات کی بنیاد قائم ہوتی ہے جس سے اہل علم۔ صاحب فضل پاک خیال۔ نیک بنیاد لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے آدمی ناپاک ہو جائے؟ اس کے کیا معنی۔ بلکہ حق پوچھو تو غسل کر کے اس کی بنیاد رکھنی چاہئے۔ اور یہ کیا بات ہے کہ اتنی سی چیز کے نکلنے میں غسل واجب ہو جائے۔ اس سے دس بیس حصّہ زیادہ کثافتیں دن بھر میں کئی کئی دفعہ نکل جائیں۔ اس پر کچھ بھی نہ ہو +

کوئی کہتا تھا کہ شیر اور سُوٗر کا گوشت کھانا چاہئے کہ بہادر جانور ہیں۔ کھانیوالے کی طبیعت میں ضرور بہادری پیدا کرتا ہوگا +

کوئی کہتا تھا کہ چچا اور ماموں کی اولاد کے ساتھ قرابت نہ کرنی چاہئے کہ رغبت کم ہوتی ہے۔ اس واسطے اولاد ضعیف ہوگی۔ **آزاد** ۔ دانایانِ فرنگ نے بھی لکھا ہے۔ انسان کی طبیعت میں داخل ہے کہ جس خون سے خود پیدا ہوا ہے اُسی خون کی نسل پر وہ شوق کا جوش اور رغبت کا ولولہ نہیں ہوتا جو غیر خون پر ہوتا ہے۔ دیکھو خچر میں گھوڑی سے زیادہ زور ہوتا ہے۔ کوئی کہتا تھا جب تک بیٹا ۱۶ برس کا اور بیٹی ۱۴ برس کی نہ ہو جائے۔ تب تک نکاح جائز نہیں۔ اولاد کمزور ہوگی +

شادی

ابو الفضل آئین اکبری میں جو لکھتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے۔ کتخدائی میں

نسل انسان کی بقا اور بزم دنیا کی زیبائش، اور ڈانواں ڈول دلوں کی بہرہ داری اور گھر کی آبادی ہے۔ اور بادشاہ نیک روزگار چھوٹے بڑوں کا پاسبان۔ اس لئے شادی کے معاملے میں نسبت معنوی اور ذات کی ہمسری کو نہیں چھوڑتا۔ چھوٹی عمر دولہا دلہن اُسے پسند نہیں۔ عمدہ فائدہ نہیں۔ نقصان بڑا ہے۔ اکثر مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ گھر نہیں بستے۔ ہندوستان شرمستان ہے۔ بیاہی ہوئی عورت دوسرا خاوند کر نہیں سکتی تو کام مشکل ہوتا ہے۔ دولہا دلہن اور دونوں کے ماں باپ کی خوشی لازم سمجھتا ہے۔ قریب کے رشتہ داروں میں نامناسب سمجھتا ہے۔ اور جب دلیل میں ابتدائے عالم کا حال بیان کرتا ہے کہ دیکھو جڑواں لڑکی اس کے ساتھ کے لڑکے سے نہ بیاہی جاتی تھی تو معترض لوگوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔ مہر کی زیادتی کو پسند نہیں کرتا۔ کہ جھوٹا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ دیتا کون ہے۔ کہتا تھا کہ مہر کا بڑھانا پیوند کا توڑنا ہے۔ ایک جورو سے زیادہ پسند نہیں کرتا۔ کہ طبیعت کی پریشانی اور گھر کی ویرانی ہوتی ہے۔ بڈھے کو جوان نہ کرنی چاہئے کہ بے حیائی ہے۔ دو آدمی یادیانت کم لالچ مقرر کئے تھے۔ ایک مردوں کی تحقیقات کرتا تھا۔ دوسرا عورتوں کی۔ تو یے بیگی کہلاتے تھے۔ اور اکثر دونوں خدمتیں ایک ہی کے سپرد ہوتی تھیں۔ شکرانہ میں طرفین کو نذرانہ بھی دینا ہوتا تھا۔

پنجہزاری سے ہزاری تک	۱۰ اشرفی
ہزاری سے پانصدی تک	۴۔۴ اشرفی
پانصدی سے دوصدی تک	۲ اشرفی
دوصدی سے دہ بیستی تک	۱ اشرفی
ترکش بند سے دہ باشی تک اور اور منصب دار	} ۴ روپے
متوسط اشخاص	ایک روپیہ
عام	ایک دام

اب یہ عالم ہوگیا کہ امرائے دربار تو بالائے طاق رہے۔ وہی صدر جہاں مفتی الممالک تھے۔ جنھوں نے جشن نوروزی میں بادۂ گلرنگ کا جام لے کر پیا۔ حریر اطلس کے کپڑے پہننے لگے۔ ملّا صاحب نے ایک دن ان کا لباس دیکھ کر پوچھا کہ کوئی روایت نظر سے گزری ہوگی؟ فرمایا۔ ہاں جس شہر میں رواج ہو جائے جائز ہے میں نے کہا شاید اس روایت پر بنیاد ہوگی کہ حکم سلطان سے عدول مکروہ ہے۔ فرمایا اس کے علاوہ بھی ملّا مبارک ایک عالم تھے۔ ان کا بیٹا شیخ ابوالفضل کا شاگرد تھا۔

اُس نے بڑے تمسخر کے ساتھ ایک رسالہ لکھ کر پیش کیا کہ نماز روزہ حج وغیرہ عبادتیں سب بے حاصل۔ ذرا انصاف کرو۔ جب عالموں کا یہ حال ہو تو بے علم بادشاہ کیا کرتے۔
مریم مکانی بادشاہ کی والدہ مر گئیں۔ امرائے دربار وغیرہ ۱۵ ہزار آدمیوں نے بادشاہ کے ساتھ بھدرہ کیا۔ انّا یعنی خانِ اعظم مرزا عزیز کوکلتاش خاں کی ماں مر گئی۔ اُس کا بڑا ادب تھا۔ اور نہایت خاطر کرتے تھے۔ خود اور خانِ اعظم نے بھدرہ کیا۔ خبر پہنچی کہ لوگ بھی بھدرہ کرا رہے ہیں۔ کہلا بھیجا کہ اوروں کو کیا ضرور ہے۔ اتنی دیر میں بھی ہم سے سر اور مُنہ صفا چٹ ہو گئے۔ اصل یہ ہے کہ اگلوں کو یہ باتیں ایک کھیل تھیں۔ اور ہزاروں مسخراپن ہیں۔ یہ بھی ایک دل لگی سہی۔ اس میں دین و مذہب کا کیا علاقہ۔ مُلّا صاحب خواہ مخواہ خفا ہوتے ہیں۔ آپ نے جب بین بجانی سیکھی تھی تو نماز کی طرح واجب سمجھ کر سیکھی تھی؟ ہرگز نہیں۔ ایک دل کا بہلاوا تھا۔ ان لوگوں نے ایسی باتوں کو دربار کا مشغلہ سمجھ لیا تھا۔

اکبر کو اس بات کا لحاظ بھی ضرور تھا کہ یہ ملک ہندوستان ہے۔ ہندوؤں کو یہ خیال نہ ہو کہ ہم پر ایک متعصب مسلمان حکومت کر رہا ہے۔ اس لئے سلطنت کے آئین اور مقدمات کے احکام ہیں بلکہ روزمرّہ کاروبار میں اس مصلحت کی رعایت ضرور ہوتی ہوگی۔ اور ایسا ہی چاہئے تھا۔ خوشامدیوں سے کوئی زمانہ خالی نہیں۔ اسے بھی خوشامدیں کر کے بڑھاتے چڑھاتے ہوں گے۔ اپنی بڑائی یا دانائی کی تعریف یا اس کا لحاظ کسے بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ وہ بھی ان باتوں سے خوش ہوتا تھا اور اعتدال سے بھی بڑھ جاتا تھا۔ اور وہ تو بے علم بادشاہ تھا علما و مشائخ کے حالات سُن چکے۔

مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ تحریروں میں سنہ ہجری موقوف ہو گیا۔ سنہ الٰہی اکبر شاہی تحریر ہونے لگا۔ آفتاب کے حساب سے برس میں ۱۴ عیدیں ہونے لگیں۔ نوروز کی دھوم دھام عید رمضان و عید قربان سے بھی زیادہ ہونے لگی۔ اس کی تفصیل مکمل توضیح سُن چکے۔ مگر لطیفہ یہ ہے۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں کہ بادشاہ حروف مختصہ عربی مثلاً ث ح ع ص ض ط وغیرہ جن میں امتیاز ضرور ہوتا ہے ان سے بھی گھبراتے تھے۔ **آزاد**۔ بزرگانِ عالم نما کو اکثر دیکھا ہوگا کہ باتوں

ہیں بھی غ اور ح کو خواہ مخواہ حلق بلکہ پیٹ کے اندر سے نکالتے ہیں۔ خصوصاً جو ایک دفعہ حج بھی کر آئے ہوں۔ دربار میں ایسوں کی گفتگو پر اشارے ضرور ہوتے ہوں گے۔ ملّا صاحب اس پر خفا ہو کر فرماتے ہیں اگر عبداللہ کو ابداللہ اور احدی کو اہدی کہتے تھے تو بادشاہ خوش ہوتے تھے۔ اور منشیان دفتر الہ آباد کو بھی الہ باس لکھتے تھے۔

آغاز اسلام میں جبکہ چاروں طرف فتوحات دین کی روشنی پھیلتی چلی جاتی تھی ایران پر بھی فوج اسلام آئی ہوئی تھی۔ فارس کا ملک تسخیر ہوتا جاتا تھا۔ ہزاروں برس کی پرانی سلطنت تباہ ہو رہی تھی۔ فردوسی نے اس حالت کو نہایت خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ چنانچہ خسرو کی ماں کی زبانی جو اشعار لکھے ہیں۔ اُن میں سے دو شعر ہیں۔

ز شیرِ شتر خوردن و سوسمار	عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کند آرزو	تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

مُلّا صاحب فرماتے ہیں۔ ان شعروں کو پڑھوا کر خوش ہوتے ہیں۔ اور جو مسائل کہ اسلام میں عقاید قرار پا چکے ہیں۔ ان کی تحقیقاتیں اور اُس پر ردّ و قدح ہوتی ہے۔ عقلی دلائل سے گفتگو ہوتی ہے۔ علمی مجلس ہوتی ہے۔ اور مصاحبوں میں سے ۴۰ آدمی منتخب ہوتے ہیں۔ حکم ہے۔ کہ جو شخص چاہے سوال کرے۔ اور ہر علم میں گفتگو ہو۔ اگر کسی مسئلے پر مذہب کی رُو سے سوال ہو۔ تو کہتے کہ اسے مُلّاؤں سے پوچھو۔ ہم سے وہ پوچھو۔ جو عقل و حکمت سے متعلق ہو۔ اگر کسی بزرگ کے کلام سے سند دیں تو صاف نامقبول کہ وہ کون تھا؟ وہ تو فلاں فلاں موقع پر خود ایسا تھا۔ اس نے خود فلاں مقام پر یوں کہا۔ اور یوں کہا۔ اور ایسا کیا۔ و یسا کیا۔ انہی باتوں کے جا بجا مدرسوں اور مسجدوں میں چرچے ہیں۔

۹۹۹ھ کے جشن میں عجب عجب آئین ایجاد ہوئے۔ خود ماہ آبان میں اتوار کو پیدا ہوئے تھے۔ حکم ہوا کہ اتوار کو تمام قلمرو میں جانور ذبح نہ ہونے پائے۔ آبان کے تمام مہینے میں اور جشن نوروز کے ۱۸ دن تک ذبح بند۔ جو کرے۔ سزا پائے جرمانہ بھرے۔ گھر لُٹ جائے۔ آپ خاص خاص دنوں میں گوشت کھانا چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ کھانے کے دن برس میں ۶ مہینے بلکہ اس سے بھی کم رہ گئے اور ارادہ ہوا

کہ گوشت کھانا ہی چھوڑ دیں ؎

آفتاب کی عبادت کے وقت دن رات میں ۴ تھے۔ صبح و شام۔ دوپہر۔ آدھی رات۔ دوپہر کو اُس کی طرف منہ کرتے تھے اور نہایت رجوع قلب کے ساتھ ایک ہزار ایک نام کا وظیفہ پڑھتے تھے۔ دونوں کان پکڑ کر چک پھیری لیتے تھے۔ کانوں پر مکّے مارتے جاتے تھے۔ اور کچھ حرکتیں اور بھی ایسی ہی کرتے تھے۔ تلک بھی لگاتے تھے۔ حکم ہوا کہ طلوع اور آدھی رات کو نقارہ بجا کرے۔ چند روز بعد حکم ہوا کہ ایک عورت سے زیادہ نکاح نہ کرو۔ ہاں۔ جورو بانجھ ہو تو مضائقہ نہیں۔ جو عورت مایوس ہو جائے۔ نکاح نہ کرے۔ بیوہ نکاح چاہے تو کوئی نہ روکے۔ ہندو عورتیں لڑکپن میں بیوہ ہو جاتی ہیں۔ وہ اور جس عورت نے مرد سے کچھ کامیابی نہ پائی ہو۔ اور بیوہ ہو گئی ہو۔ وہ ستی نہ ہو۔ ہندو اس پر اٹکے۔ چنانچہ گفتگوئیں ہوئیں۔ اُن سے کہا کہ بہت خوب۔ اگر یہ ہے تو رنڈوے مرد بھی ستی ہوں۔ ضدی لوگ سوچ میں گئے۔ آخر اُن سے کہا کہ خیر اگر ایسی ہی ضد پر قائم ہو تو ستی نہ ہو۔ مگر اتنا ضرور ہو کہ رنڈوا جورو نہ کرے۔ اس کے اقرار نامے لکھ دو۔ ہندوؤں کے تہواروں کے لئے بھی حکم ہوا اور فرمان جاری ہوئے۔ شروع سال بکرماجیت میں بھی تبدیلی چاہی تھی۔ مگر نہ چلی۔ پواج و ارازل کو علم نہ پڑھائیں۔ کہ سخت خرابیاں کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے مقدمے فیصل کرنے کے لئے برہمن مقرر ہوں۔ ان کے معاملے قاضی مفتیوں کے ہاتھ میں نہ پڑیں۔ قسم کو دیکھا۔ کہ گاجر مولی کی طرح لوگ کھائے جاتے ہیں۔ اس لئے حکم دیا کہ لوہا گرم کر کے رکھو۔ کھولتے تیل میں ہاتھ ڈلواؤ۔ جل جائے تو جھوٹا۔ یا وہ غوطہ مارے دوسرا آدمی تیر پھینکے۔ اس عرصے میں سر نکال دے تو جھوٹا۔ مگر ایک دو برس بعد ستی کا آئین نہایت شدت سے جاری ہوا۔ اور حکم ہوا۔ کہ اگر عورت خود ستی نہ ہو۔ تو پکڑ کر نہ جلاویں مسلمانوں کو تاکید ہوئی کہ بارہ برس تک ختنہ نہ کرو۔ پھر لڑکے کو اختیار ہے۔ چاہے کرے۔ چاہے نہ کرے۔ جو قصائی کے ساتھ کھانا کھائے اس کا ہاتھ کاٹ ڈالو۔ اس کے گھر والوں میں کوئی کھائے تو انگلی کتر لو ؎

اس سال میں شہر کے باہر دو عالیشان محل بنوائے۔ خیر پورہ۔ دھرم پورہ۔

ایک میں فقرائے اسلام کے لئے کھانا پکتا تھا۔ ایک میں ہنود کے لئے۔ شیخ ابوالفضل کے آدمیوں کا اہتمام تھا۔ مگر جوگی غول کے غول آنے لگے۔ ان کے لئے ایک اور سرا بنی۔ اس کا نام جوگی پورہ رکھا۔ رات کو چند خدمتگاروں کے ساتھ جاتے۔ خلوت میں باتیں کرتے تھے۔ اور ان کے عقاید مذہب۔ جوگ کے اسرار و حقائق۔ اور عبادت و اشتغال کے طریقے۔ حرکات۔ سکنات۔ بیٹھنا۔ اٹھنا۔ سونا۔ جاگنا۔ کایا پلٹ وغیرہ کے کرتب ان سے حاصل کئے بلکہ کیمیا گری بھی سیکھی۔ اور سونا لوگوں کو دکھایا۔ شورا تری کی رات کو (جوگیوں کا بڑا میلہ ہوتا ہے) ان کے گرو اور مہنتوں کے ساتھ پرشاد کھائے۔ اُنہوں نے کہا۔ کہ اب آپ کی عمر معمولی عمر سے سہ چند چہار چند ہوگئی ہے۔ تماشا یہ کہ حکمتیاں دربار نے بھی اس کی تائید کی اور کہا کہ دور قمر ہو چکا۔ اس کے احکام بھی ہو چکے۔ اب دور زحل شروع ہوا۔ اس کا عمل اور اس کے احکام جاری ہوں گے۔ عمریں بھی بڑھ جائینگی۔ اتنی بات تو کتابوں سے بھی ثابت ہے کہ اگلے وقتوں میں سینکڑوں سے لے کر ہزار ہزار برس سے زیادہ جیتے تھے۔ اور ہندوؤں کی کتابوں میں تو آدمیوں کی عمر ۱۰-۱۰ ہزار برس کی لکھی ہے۔ اب بھی تبت کے پہاڑوں میں خطائیوں کے عابد لامہ ہیں۔ ان کی دو دو سو برس بلکہ اس سے بھی زیادہ عمر ہے۔ انہی کے خیال سے کھانے پینے کے باب میں اصلاحیں اور گوشت کے کھانے میں کمی کر دی۔ عورت کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ بلکہ جو کچھ ہوا اس پر بھی تاسف تھا۔ تالو پر سے بال منڈوا ڈالے۔ اِدھر اُدھر رہنے دئے۔ خیال یہ تھا کہ اہل صفا کی روح کھوپری کے رستے نکلتی ہے۔ یہی وہم و خیال کی آمد کا رستہ ہے۔ اس وقت ایسی آواز آتی ہے۔ جیسے بجلی کڑکی۔ اور یہ ہو تو جانو کہ مرنے والا بڑا نیک تھا۔ اور نیک انجام ہوا۔ اور اب اس کی روح کسی بادشاہ عالمگیر جہاں تسخیر کے قالب میں جائیگی (جسے سنسکرت میں چکرورتی راجہ کہتے ہیں) اپنے طریق کا نام توحید الٰہی رکھا۔ مریدان خاص جوگیوں کی اصطلاح کے بموجب چیلے کہلاتے تھے۔ پواج۔ اراذل۔ مکار۔ رکابی مذہب جو قلعۂ معلّٰی میں قدم رکھنے کے قابل نہ تھے۔ روز صبح کو آفتاب پرستی کے وقت زیر جھروکہ جمع ہوتے تھے۔ جب تک درشن نہ کریں مسواک۔ کھانا۔ پینا اُن پر حرام تھا۔ رات کو

ہر محتاج۔ مسکین۔ ہندو۔ مسلمان۔ رنگ رنگ کے آدمی۔ مرد عورت۔ اچھے اپاہج سب کو اجازت تھی۔ عجب ہنگامہ ہوتا تھا۔ جب سورج کے نام جپ چکتے تھے۔ پردہ سے نکل آتے تھے۔ یہ لوگ دیکھتے ہی سجدہ میں جھک جاتے تھے۔

ان میں بارہ بارہ آدمی کی ایک ایک ٹولی باندھی تھی (دیکھو اس میں بھی آئین و قانون قائم ہے) کہ جماعت جماعت مرید ہوتی تھی۔ شجرہ کی جگہ اپنی تصویر دے دیتے تھے کہ اس کا پاس رکھنا اور زیر زیارت رکھنا باعث برکت و ترقی اقبال ہے۔ ایک[1] زرین اور مرصع غلاف میں رکھتے تھے۔ اور اس سے سر کو تاجدار کرتے تھے۔ سلطان خواجہ امین میر حاج مریدان خاص الخاص میں سے تھا۔ ملا احمد ٹھٹوی نے سلطان الخوارج[۹۹۱] اس کے مرنے کی تاریخ کہی تھی۔ مگر ایک کی کسر رہی۔ خواجہ کی قبر بھی نئے ایجاد سے تصنیف ہوئی۔ چہرے کے سامنے ایک جالی رکھی تھی۔ کہ آفتاب گناہوں سے پاک کرنے والا ہے۔ روز صبح کو اس کی شعاع منہ پڑے۔ ہونٹوں کو آگ بھی دکھائی تھی۔ حکم تھا کہ قبر میں مریدوں کے سر مشرق کو پاؤں مغرب کو رہیں۔ خود بھی سونے میں اس کی پابندی کرتے تھے۔

برہمنوں نے حضور کے لئے بھی ۱۰۱ نام تراشے تھے۔ کہتے تھے کہ مایا کی لیلا ہے بشن (کشن)۔ رام چندر جی وغیرہ اوتار گزرے ہیں۔ اب اس روپ میں پرکاش کیا ہے۔ اشلوک بنا بنا کر پڑھتے تھے۔ پرانے پرانے کاغذوں پر لکھے دکھاتے تھے۔ کہ پراتم پنڈت لکھ کر رکھ گئے ہیں۔ ایک چکروتی راجہ اس دیس میں ہوگا۔ برہمنوں کا آدرمان۔ گؤ کی رکھشیا کریگا۔ دنیا کو نیاؤ سے بسائیگا۔

---

[1] ملا صاحب نے چیلوں کے آئین کو یہ لباس پہنایا ہے۔ ابوالفضل نے سنہ ۹۹۱ھ کی تجویزوں میں لکھا ہے کہ اس سنہ میں لونڈی غلاموں کی آزادی کا حکم ہوا کیونکہ خدا کے بندوں پر انسان کی بندگی کا داغ سخت بے ادبی ہے۔ ہاں بادشاہی غلام جو حضوری منظور کریں وہ چیلے کہلائیں۔ سنہ ۹۰۵ھ تک ۱۲ ہزار یکجوان تھے (باڈی گارڈ) چند روز کے بعد احدی انکا خطاب ہوا۔ پھر یہی لوگ چیلے ہو گئے۔ آزاد۔ ایسے آقا کی غلامی جان دیکر بھی ہاتھ آئے تو سستی ہے جاتا کون تھا۔ آزاد ہو کر بھی چیلے کہلاتے تھے عیش کرتے تھے اور بہاریں اڑاتے تھے۔ جانیں دیکر خدمتیں بجا لاتے تھے۔ دلی میں جو چیلوں کا کوچہ مشہور ہے وہاں کسی زمانہ میں سلاطین چغتائیہ کے اسی نسل کے خانہ زاد رہتے تھے۔

مکند برہم چاری

اکبر کے سامنے ایک پراچین پتر پیش ہؤا کہ الٰہ آباس میں مکند برہم چاری کے پاس تھا۔ جس نے اپنا سارا بدن کاٹ کاٹ کر ہون کر دیا تھا۔ وہ اپنے چیلوں کے لئے اشلوک لکھ کر رکھ گیا تھا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ ہم عنقریب ایک بادشاہ با اقبال ہو کر آئینگے۔ اُس وقت تم بھی حاضر ہونا۔ بہت سے برہمن بھی اُس پترے کے ساتھ حاضر ہوئے۔ اور عرض کی کہ جب سے آج تک مہاراج برگیان دھیان جمائے بیٹھے ہیں۔ حساب کیا تو معلوم ہؤا کہ اس کے مرنے اور اکبر کے پیدا ہونے میں صرف تین چار مہینے کا فرق تھا۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ برہمن کا ملکش مسلمان کے گھر میں جنم لینا عقل میں نہیں آتا۔ عرض کی۔ کہ کرنے والے نے تدبیر میں کوتاہی نہیں کی۔ مگر تقدیر کو کیا کرے۔ کہ اُسے خبر نہ تھی۔ ہون کی جگہ کچھ ہڈیاں اور لوہا گڑا تھا جو کچھ پیش آیا اس کا اثر ہے۔

مسلمانوں نے کہا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ ہم ہندوؤں سے پیچھے رہ جائیں۔ حاجی ابراہیم نے ایک گمنام۔ غیر مشہور۔ کرم خوردہ کتاب کبھی کی گڑی دبی نکالی۔ اس میں شیخ ابن عربی کے نام سے ایک عبارت منقول تھی جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ امام مہدی کی بہت ساری بیبیاں ہونگی۔ اور ڈاڑھی مُنڈی ہوگی۔ اور چند ایسی ایسی باتیں اور تھیں۔ مطلب یہ کہ وہ آپ ہی ہیں۔

یکہ سپاہی تھے۔ انہی کا نام احدی رکھا تھا۔ اب مریدوں کا خطاب ہؤا۔ اس اُمّت کے باب میں خیال تھا کہ یہ اصل احدی لوگ ہیں۔ کیونکہ عالم توحید میں پورا اخلاص رکھتے ہیں۔ کوئی وقت آن پڑیگا۔ تو دریائے آب اور طوفان آتش سے بھی مُنہ نہ پھیرینگے۔

مُلّا صاحب جو چاہیں سو کہیں۔ میرے نزدیک نیک نیّت بادشاہ کا کچھ قصور نہیں۔ جب اہل دین خود اپنے دین و ایمان کو لاکر سامنے نثار کریں تو فرمایئے وہ کیا کرے۔ چنانچہ مُلّا شیری پنجاب میں صدر الصدور تھے۔ وہی ملا شیری جنہوں نے

بڑے جوش ایمان خروش یقین کے ساتھ بے دینی کی شکایت میں قطعہ کہا تھا۔ اب اُنھوں نے آفتاب کی تعریف میں ایک ہزار ایک قطعہ کہہ کر ہزار شعاع نام رکھا اس سے بڑھ کر سنئے۔ **لطیفہ**۔ حضرت میر صدر جہاں کی پیاس بادہ گلرنگ سے نہ بجھی۔ چنانچہ ۱۰۱۴ھ میں معہ دو فرزند برخوردار مریدانِ خاص میں داخل ہوئے۔ ہاتھ چومے۔ قدم لئے۔ کرامات کی نعمت لی۔ اور خاتمۂ تقریر پر عرض کی۔ ریش مرا چہ حکم مے شود۔ فرمودند۔ باشد (رہے۔ ہرج کیا ہے؟) پھر بھی آفرین ہے۔ اس حق شناس بادشاہ کو کہ جب سجدۂ زمین بوس آئین میں داخل ہوا۔ تو ان بزرگوار کو اس سے مستثنیٰ کیا۔ وہ خود اپنے دل میں شرماتا ہوگا۔ کہ مفتی شریعت ہیں۔ مسندِ پیغمبر پر بیٹھے ہیں۔ اُن کی مہر سے چار دانگ ہندوستان میں فتوے جاری ہوتا ہے۔ تخت کے سامنے ان کا سر جھکوانا مناسب نہیں۔ اس پر اُن کی یہ کراماتیں۔ واہ ویلا۔ واہ مصیبتا۔ کوئی مجھے بتاؤ کہ وہ امر کیا تھا۔ جو اکبر کو کرنا چاہئے تھا۔ اور اُس نے نہ کیا۔ بے دین خود اپنے دینوں کو دنیا پر قربان کئے دیتے تھے اس بیچارے کا کیا گناہ +

ایک فاضل اجل کو حکم دیا۔ کہ شاہنامے کو نثر میں لکھو۔ اُنھوں نے لکھنا شروع کیا۔ جہاں نام آجاتا۔ آفتاب کو عز شانہٗ اور جلتہ عزمتہ لکھتے تھے۔ جیسے خدا کے لئے +

حضرت شیخ کمال بیابانی

اکبر کو اس بات کا بڑا خیال رہا کہ کوئی شخص صاحب کرامات نظر آئے۔ مگر ایک بھی نہ ملا۔ ۹۹۷ھ میں چند شیطان اسی شہر لاہور میں ایک بڈھے شیطان کو لائے کہ حضرت شیخ کمال بیابانی ہیں۔ انھیں دریائے راوی پر بٹھا دیا۔ کرامات یہ کہ کنارہ پر کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہیں۔ اور پل کی پل میں ہوا کی طرح پانی پر سے گزر کر پار جا کھڑے ہوتے ہیں۔ دیکھنے والوں نے تصدیق کی کہ ہم نے آپ دیکھ لیا ہے۔ اور سُن لیا۔ اُنھوں نے پار کھڑے ہو کر صاف آواز دی ہے۔ کہ میاں فلانے! بس اب

تم گھر جاؤ۔ بادشاہ خود اُسے لے کر دریا کے کنارے گئے۔ اور چپکے سے یہ بھی کہا۔
کہ ہم ایسی چیزوں کے طلبگار ہیں اگر کوئی کرشمہ ہمیں دکھاؤ۔ تو مال مملکت جو کچھ ہے۔
سب تمہارا بلکہ ہم بھی تمہارے۔ وہ چپ دم بخود۔ جواب کیا دے؟ کچھ ہو تو کہے
تب بادشاہ نے کہا کہ اچھا اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر قلعہ کے بُرج پر سے دریا میں
ڈال دو۔ اگر کچھ ہے تو صحیح سلامت نکل آئیگا۔ نہیں تو جائے جہنم کو۔ یہ سُن کر ڈر
گیا اور پیٹ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ کہ یہ سب اس دوزخ کے لئے ہے۔ رموز
تاریخ کے تاڑنے والے تاڑ گئے ہوں گے۔ کہ اُس وقت دریائے راوی کی لہریں
ثمن بُرج کے پاؤں میں لوٹتی تھیں جو آج قلعے سے دو میل پرے ہٹ گیا ہے۔
بات یہ تھی کہ وہ شخص لاہوری ہی تھا۔ اس کا ایک بیٹا ڈاڑھی مُنڈا بھی ساتھ
تھا۔ باپ بیٹوں کی آواز بہت ملتی تھی۔ جب سے باپ کرامات دکھانے کا وعدہ کرتا۔
بیٹا بھی نام سُن لیتا۔ اور پل یا کشتی پر چڑھ کر پار چلا جاتا۔ جب موقع وقت ہوتا تو
باپ یہاں کنارے پر گفتگو کرتا۔ اِدھر اُدھر باتیں کرتا پھرتا۔ بیٹا سامنے دیکھتا
رہتا۔ یہ لوگوں کو جُل دے کر کنارے سے نیچے اُترتا۔ کہ وضو کرکے عمل پڑھتا ہوں۔
وہیں اِدھر اُدھر کڑاڑوں میں چھپ جاتا۔ بیٹا بدذات چند لمحہ بعد اُدھر سے آواز دیتا۔
میاں خانانے جاؤ گھر کو۔ ع

آخرش گرگ زادہ گرگ شود

یہ حال معلوم ہؤا۔ تو بادشاہ بڑے خفا ہوئے۔ اور بھکر بھیج دیا۔ اُس نے وہاں
بھی جال مارا۔ کہا کہ مَیں ابدال ہوں۔ جمعہ کی رات لوگوں کو دکھا دیا۔ سر الگ۔
ہاتھ پاؤں الگ +

خان خاناں اُن دنوں مہم بھکر پر تھے۔ دولت خاں اُن کا سپہ سالار۔
(وکیل مطلق۔ اتالیق جو کہو سو بجا۔) اُس کا معتقد ہو گیا۔ بھلا وہ بھی افغان وحشی
تھا۔ خود خان خاناں نے اس دانائی و فرزانگی زیرکی و فیلسوفی کے ساتھ غوطہ کھایا۔
اس غول بیابانی نے کہا حضرت خضر سے آپ کی ملاقات کروا دیتا ہوں۔ دریائے
اٹک کے کنارے پر ڈیرے پڑے تھے۔ خان خاناں خود آکر کھڑے ہوئے۔
مصاحب اور رفقا ساتھ۔ اُس دغا باز نے غوطہ مار کر سر نکالا۔ اور کہا کہ خضر علیہ السلام

آپ کو دعا فرماتے ہیں۔ خان خاناں کے ہاتھ میں ایک سونے کی گیند تھی۔ کہا۔ کہ ذرا گیند دیکھنے کو مانگتے ہیں۔ اُنھوں نے دے دی۔ اُس نے وہ گیند پانی میں ڈال کر ایک اور غوطہ مارا۔ غرض اُدل بدل کر کے پیتل کی گیند ہاتھ میں دے دی۔ باتوں باتوں اور ہاتھوں ہاتھوں میں سونے کی گیند اُڑا لے گیا۔

اکبر پر حالت طاری ہو

بادشاہ نیک نیت کو ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ پاک پٹن سے زیارت کرتا ہوا نندنہ کے علاقہ میں پہنچا اور دامن کوہ کے جانور گھیر کر شکار کھیلنے لگا۔ چار دن کے عرصہ میں بے حساب شکار مار کر گرا دیئے۔ حلقہ سمٹتے سمٹتے ملا چاہتا تھا۔ دفعتہً بادشاہ کا دل ایسا جوش و خروش میں آیا۔ کہ بیان میں نہیں آسکتا۔ عجیب جذبے کا عالم ہوا۔ کسی کو معلوم نہ ہوا۔ کہ کیا دکھائی دیا تھا۔ اُسی وقت شکار بند کیا جس درخت کے نیچے یہ حالت ہوئی تھی۔ وہاں زر کثیر فقیروں اور مسکینوں کو دیا۔ اس جلوہ غیبی کی یادگار میں ایک عمارت، عالیشان بنوانے کا اور باغ لگانے کا حکم دیا۔ وہیں بیٹھ کر سر کے بال منڈوائے اور جو مصاحب بہت مقرب تھے خوشامد کے اُسترے سے خود بخود منڈ گئے۔ اس حالت نے عجیب و غریب رنگ سے شہروں میں شہرت پھیلائی۔ بلکہ زندگی کے باب میں رنگ برنگ کی ہوائیاں اُڑیں۔ بعضے مقاموں میں بدعملی بھی ہو گئی۔ خیال مذکور کا اعتقاد ایسا دل پر چھایا کہ اُس دن سے شکار کھیلنا ہی چھوڑ دیا۔

جہاز رانی کا شوق

ایشیائی بادشاہوں کو دریائی ملک گیری کا خیال بالکل نہیں ہوا۔ اور راجگان ہند کا تو ذکر ہی نہ کرو۔ کہ پنڈتوں نے سفر دریا کو خلاف مذہب لکھ دیا تھا۔ اکبر کی طبیعت کو دیکھو۔ کہ باپ دادا کے ملک کو کبھی دریا سے تعلق نہ ہوا۔

خود ہندوستان ہی میں آکر آنکھیں کھولی تھیں۔ اور خشکی کے فساد دم نہ لینے دیتے تھے باوجود اس کے دریا پر نظر لڑی ہوئی تھی۔ یہ شوق اسے دو سبب سے پیدا ہوا تھا۔ اول یہ کہ جو قافلے سوداگروں یا حاجیوں کے جاتے اور آتے تھے۔ ان پر ڈچ اور پرتگالی جہاز دریا میں آن گرتے تھے۔ لوٹتے تھے مارتے تھے۔ آدمیوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے۔ بالکل صلاحیت سے پیش آتے تو یہ تھا کہ اندازہ سے بہت زیادہ محصول وصول کرتے اور تکلیف بھی دیتے تھے۔ بادشاہی لشکر کا ہاتھ وہاں بالکل نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے اکبر دق ہوتا تھا +

فیضی جب دکن کی سفارت پر گیا ہے اور وہاں سے رپوٹیں کر رہا ہے۔ ان میں روم اور ایران کی خبریں جہازی مسافروں کی زبانی اس خوبصورتی سے لکھتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر انہیں بڑے شوق سے سن رہا ہے۔ ان تحریروں میں بعض جگہ راہ دریائی کی بے انتظامی کا بھی اثر پایا جاتا ہے۔ اس خیال سے وہ بندرگاہوں پر بڑے شوق سے قبضہ کرتا تھا +

اُس وقت ادھر کراچی کی جگہ ٹھٹہ اور دکن کی جانب میں بندر گووہ۔ کمبایت اور سورت کا نام بہت کتابوں میں آتا ہے۔ دریائے راوی بڑے زور شور سے بہہ رہا تھا۔ اکبر نے چاہا تھا کہ جہاز یہاں سے چھوڑے۔ اور ملتان کے نیچے سے نکال کر سکر سے ٹھٹے میں پہنچا دے۔ چنانچہ اسی لاہور کے باہر ایک جہاز کا بچہ تیار ہوا۔ جس نے مستول کے رنگ میں ۳۶ گز کا قد نکالا۔ جب بادبانوں کے کپڑے پہنا کر روانہ کیا۔ تو بعض مقاموں پر پانی کی کمی سے رُک رُک گیا۔ جب سنہ ۱۰۲ھ میں ایلچی ایران کو رخصت کر کے خود ایلچی روانہ کیا۔ تو حکم دیا۔ کہ لاہور سے براہِ دریا لاہری بندر میں جا اُترو۔ اور وہاں سے سوار ہو کر سرحد ایران میں داخل ہو +

وہ زمانہ اور تھا۔ ہوا اور تھی۔ پانی اور تھا۔ اس پر آئے دن لڑائیاں اور فساد اور سب امیروں کے سینہ میں اکبر کا دل بھی نہ تھا جو اپنے شوق سے اس کام کو پورا کرتے۔ اور دریا کو ایسا بڑھاتے۔ کہ جہاز رانی کے قابل ہو جاتا۔ اس لئے کام آگے نہ چلا +

مُلک موروثی کی یاد نہ بھولتی تھی

اکبر کے درخت سلطنت نے ہندوستان میں جڑ پکڑی تھی۔ لیکن ملک موروثی یعنی سمرقند و بخارا کی ہوائیں ہمیشہ یاد آتی تھیں۔ اور اس کے دل کو سبزۂ تر کی طرح لہراتی تھیں۔ یہ داغ اس کے بلکہ اس سے لے کر عالمگیر تک کے دل پر ہر وقت تازہ تھا۔ کہ بابر ہمارے دادا کو اُزبک نے پانچ پشت کی سلطنت سے محروم کر کے نکالا۔ اور ہمارا گھر دشمن کے قبضہ میں ہے۔ لیکن عبداللہ خاں اُزبک بھی بڑا بہادر۔ صاحب عزم۔ با اقبال بادشاہ تھا۔ ہٹانا تو در کنار اس کے حملہ سے کابل اور بدخشاں کے لالے پڑے رہتے تھے۔ والیٔ کاشغر کے نام ایک مراسلہ اکبر کا دفتر ابوالفضل میں ہے۔ اُسے تم پڑھو گے تو کہو گے کہ فی الحقیقت اکبر بادشاہ سلطنت کی شطرنج کا پورا شاطر تھا۔ ملک مذکور پر بھی اُس کا خاندانی دعوےٰ تھا۔ مگر کجا کاشغر اور کجا ہندوستان۔ پھر بھی جب کشمیر پر تسلّط کر لیا تو بزرگوں کا وطن یاد آیا۔ تم جانتے ہو کہ شطرنج باز جب حریف کے کسی مہرہ کو مارنا چاہتا ہے۔ یا حریف کے ایک مہرے کو اپنے کسی مہرے پر آتا دیکھتا ہے تو اُسی مُہرے سے سینہ بسینہ لڑ کر نہیں مار سکتا۔ اُسے واجب ہے کہ دائیں بائیں۔ دُور نزدیک تک کہیں کہیں کے مہروں سے اپنے مہرے کو زور اور حریف پر ضرب پہنچائے۔ اکبر دیکھتا تھا کہ میں اُزبک پر کابل کے سوا اور کہیں سے چوٹ نہیں کر سکتا۔ کشمیر کی طرف سے ایک رستہ بدخشاں کا نکلا ہے۔ اور اس کا ملک ترکستان و تاتار کی طرف دُور دُور تک پھیل گیا ہے۔ اور پھیلا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھا شمشیر اُزبک کی چمک پر کاشغر۔ خطا۔ ختن سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا۔ اور اُزبک اسی فکر میں ہے کہ کب موقع پائے اور اُسے بھی نگل جائے۔

اکبر نے اسی بنیاد پر والیٔ کاشغر سے قرابت قدیمی کا رشتہ ملا کر رستہ نکالا۔ خط مذکور میں اگرچہ کھول کر نہیں لکھا۔ مگر پوچھتا ہے کہ حکومت خطا کا حال مدت سے معلوم نہیں۔ تم لکھو کہ وہاں کا حاکم کون ہے۔ اُس کی کس سے مخالفت ہے کس سے موافقت ہے۔ صاحب علم و فضل اور اہل دانش کون کون اشخاص ہیں مسندِ

ہدایت پر کون کون لوگ مشہور ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہندوستان کے عجائب و نفائس سے جو کچھ تمہیں مرغوب ہو۔ بے تکلف لکھو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہم اپنا معتبر فلاں شخص روانہ کرتے ہیں۔ اسے آگے کو چلتا کر دو۔ وغیرہ وغیرہ +

مصالح مملکت

جو قافلہ سال بسال حج کو جاتا تھا۔ اور اکبر اپنی طرف سے میر حاج مقرر کر کے ساتھ کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ ہزاروں روپے مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ اور مختلف روضوں اور درگاہوں کے مجاوروں کو بھیجتا تھا۔ کہ ہر جگہ تقسیم ہو جائیں۔ اور اُن میں بھی خاص خاص اشخاص کے لئے روپے اور تحفے الگ ہوتے تھے۔ کہ خفیہ دئے جاتے تھے۔ شرفائے مکہ میں سے خاص خاص لوگوں کو جو خفیہ روپے پہنچتے تھے۔ آخر کس غرض سے؟ یہ سلطان روم کے گھر میں سرنگ لگتی تھی۔ افسوس اُس وقت کے مؤرخوں نے خوشامد کے انبار باندھے۔ مگر ان باتوں کی پرواہ بھی نہ کی۔ نہ اُس وقت کے دفتر رہے۔ جن سے یہ نکتے کھُلتے۔ نقد و جنس نو لاکھوں روپے جاتے تھے۔ ایک رقم جس کا شیخ عبدالنبی صدر سے یہاں آ کر مطالبہ ہوا۔ ۷۰ ہزار کی تھی۔ اور کھُلم کھُلا جو کچھ جاتا تھا اُس کا کیا ٹھکانا ہے +

اکبر نے اولادِ سعادتمند نہ پائی

با اقبال بادشاہ کی اولاد پر نظر کرتا ہوں۔ تو افسوس آتا ہے۔ کہ بڑھاپے میں ان سے دُکھ بھی پائے۔ اور داغ بھی اُٹھائے۔ بلکہ اخیر عمر میں ایک بیٹا رہا۔ اس کی طرف سے بھی دل آزردہ اور ناکام گیا۔ خدا نے اسے تین بیٹے دئے تھے۔ اگر صاحب توفیق ہوتے تو دست و بازو و دولت و اقبال کے ہوتے۔ اُس کی تمنا تھی کہ یہ نونہال میری ہی ہمت اور میرے ہی خیالات کی ہوا میں سرسبز و سرفراز ہوں کوئی ملک مقبوضہ کو سنبھالے اور مفتوحہ کو بڑھائے۔ کوئی دکن کو صاف کرے۔

کوئی افغانستان کو پاک کر کے آگے بڑھے۔ اور اُزبک کے ہاتھ سے باپ دادا کا ملک چھڑائے۔ مگر وہ شرابی کبابی ایسی ہوس لائی اور عیش پرستی کے بندے ہوئے کہ کچھ بھی نہ ہوئے۔ وہ ہونہار باغ جوانی کے نونہال لہلہاتے گئے۔ تیسرا جہانگیر رہا۔ سلطنت کے مؤرخ دولت کے نمک خوار تھے۔ ہر طرح باتیں بنائیں مگر بات یہی ہے۔ کہ اکبر جیسا باپ اس سے ناراض اور اس کے افعال سے بیزار گیا۔

جہانگیر سب سے پہلے ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ کو پیدا ہوا۔ اور یہ راجہ بہارا مل کچھواہہ کا نواسہ تھا۔ یعنی راجہ بھگوان داس کا بھانجہ۔ مان سنگھ کی پھوپھی کا بیٹا۔

مراد ۹۷۸ھ میں ۱۰ محرم کو فتحپور کے پہاڑوں میں پیدا ہوا تھا۔ اور اسی واسطے اکبر پیار سے اسے پہاڑی راجہ کہا کرتا تھا۔ مہم دکن پر سپہ سالار ہو کر گیا۔ شراب مدت سے گھلا رہی تھی۔ اور ایسی مُنہ لگی تھی کہ چھُٹ نہ سکتی تھی۔ وہاں جا کر اور بڑھ گئی۔ اور بیماری بھی حد سے زیادہ گزر گئی۔ آخر ۱۰۰۸ھ میں ۳۰ برس کی عمر میں مرا۔ اور نامراد و ناشاد جواں مرگ دنیا سے گیا۔ تاریخ ہوئی۔ ع

از گلشن اقبال نہالے گم شد

جہانگیر اپنی توزک میں لکھتا ہے۔ سبزہ رنگ، باریک اندام، خوش قد، بلند بالا تھا۔ تمکین و وقار چہرہ سے نمودار تھا۔ اور سخاوت و مردانگی اطوار سے آشکار۔ باپ نے اس کے شکرانہ ولادت میں بھی اجمیر کی درگاہ کے گرد طواف کیا شہر کے گرد فصیل بنوائی۔ عمارات عالی اور شاہانہ محل بلند کر کے قلعہ مرتب کیا۔ اور امرا کو بھی حکم دیا کہ اپنے اپنے حسب مراتب عمارتیں بنوائیں۔ تین برس میں طلسمات کا شہر ہو گیا۔

دانیال اُسی سال اجمیر میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں جب حاملہ تھی۔ تو برکت کے لئے اجمیر میں ایک نیک مرد صالح مجاور درگاہ کے گھر میں اُسے جگہ دی تھی۔ مجاور مذکور کا نام شیخ دانیال تھا۔ پیدا ہوا۔ تو اس کی مناسبت سے اس کا بھی نام دانیال رکھا۔ یہ وہی ہونہار تھا جس سے خان خاناں کی بیٹی بیاہی تھی۔

مراد کے بعد اسے مہم دکن پر بھیجا۔ خان خاناں کو بھی ساتھ کیا۔ پیچھے پیچھے آپ فوج لے کر گیا۔ کچھ ملک اُس نے لیا۔ کچھ آپ فتح کیا۔ سب اُس کو دیا۔ خاندیس کا نام دان دیس رکھا۔ کہ دانیال کا دیس ہے۔ اور دار الخلافہ کو پھر آیا۔ وہ جان ہار بھی شراب میں غرق ہوا۔ بدنصیب باپ کو خبریں پہنچیں۔ خان خاناں پر فرمان دوڑنے شروع ہوئے۔ وہ کیا کرے سمجھایا۔ تاکید کی۔ نوکروں کو تنبیہ کی۔ کہ شراب کی بوند اندر نہ جانے پائے۔ اُسے لت لگ گئی تھی۔ نوکروں کی منت خوشامد کی۔ کہ خدا کے واسطے جس طرح ہو کہیں سے لاؤ۔ اور کسی طرح پلاؤ ؎

اے ذوق اتنا دخترِ رز کو نہ منہ لگا		چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

جانثار جوان کو بندوق کے شکار کا بھی بہت شوق تھا۔ ایک بندوق بہت عمدہ اور نہایت بیخطا تھی۔ اسے ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ اس کا نام رکھا تھا یکہ وجنازہ۔ یہ بیت آپ کہہ کر اس پر لکھوائی تھی ؎

از شوقِ شکارِ تو شود جاں تر و تازہ		بر ہر کہ خورد تیرِ تو یکہ و جنازہ

جن نوکروں و مصاحبوں سے بے تکلف تھا۔ انہیں کمال منت و زاری سے کہا۔ ایک نادان خیر خواہ لالچ کا مارا اُسی بندوق کی نالی میں شراب بھر کر لے گیا۔ اُس میں میل اور دھواں جما ہوا تھا۔ کچھ تو وہ چھٹا۔ کچھ شراب نے لوہے کو کاٹا۔ خلاصہ یہ کہ پیتے ہی لوٹ پوٹ ہو کر موت کا شکار ہو گیا۔ یہ بھی خوبصورت اور سجیلا جوان تھا۔ اچھے ہاتھی اور اچھے گھوڑے کا عاشق تھا۔ ممکن نہ تھا کہ کسی امیر کے پاس سنے اور لے نہ لے۔ گانے کا شوقین تھا۔ کبھی کبھی آپ بھی ہندی دوہرے کہتا تھا۔ اور اچھے کہتا تھا۔ اس جوانمرگ نے ۳۳ برس کی عمر ۱۰۱۳ھ میں باپ کے جگر پر داغ دیا۔ اور سلیم کی جہانگیری کے لئے پاک صاف میدان چھوڑا۔ دیکھو تزک جہانگیری

جہانگیر نے بھی شراب خوری میں کسر نہیں کی۔ اپنی سینہ صافی سے آپ تزک کے سنہ میں لکھتے ہیں۔ خورم (شاہجہان) کی ۲۴ برس کی عمر ہوئی۔ کئی شادیاں ہوئیں۔ اب تک شراب سے لب آلودہ نہیں کئے تھے۔ میں نے کہا کہ بابا۔ شراب تو وہ شے ہے کہ بادشاہوں اور شاہزادوں نے پی ہے۔ تو بچوں والا ہو گیا۔ اور اب تک شراب نہیں پی۔ آج تیرا تلا کا جشن ہے۔ ہم تمہیں شراب پلاتے ہیں۔ اور اجازت دیتے

ہیں کہ روز ہائے جشن اور ایام نوروز اور بڑی بڑی مجلسوں میں شراب پیا کرو۔ لیکن اعتدال کی رعایت رکھو۔ کیونکہ اس قدر پینی کہ جس میں عقل جاتی رہے داناؤں نے ناروا سمجھی ہے۔ چاہیئے کہ اس کے پینے سے فائدہ مدنظر ہو۔ نہ کہ نقصان۔ **بوعلی** جیسے تمام فلاسفہ و اطبا میں بزرگ دنیا سمجھتے ہیں۔ رباعی کہہ گیا ہے۔ رباعی

مے دشمن مست و دوست ہشیار است	اندک تریاق و بیش زہر مار است
از بسیارش مضرتے اندک نیست	در اندک او منفعتے بسیار است

غرض بڑی تاکید سے پلائی ۔

اپنا حال لکھتا ہے۔ میں نے ۱۵ برس کی عمر تک شراب نہیں پی تھی۔ بچپن میں والدہ اور اناؤں نے بچوں کی دوا کی طرح کبھی والد بزرگوار سے عرق منگالیا وہ بھی تولہ بھر گلاب یا پانی ملایا۔ کھانسی کی دوا کہہ کر مجھے پلادیا۔ ایک دفعہ والد بزرگوار کا لشکر اٹک کے کنارے پر پڑا ہوا تھا۔ میں شکار کو سوار ہوا۔ بہت پھرتا رہا شام کو آیا تو تھکن معلوم ہوئی۔ استاد شاہ قلی توپچی اپنے فن میں بڑا صاحب کمال تھا۔ میرے عم بزرگوار مرزا حکیم کے نوکروں میں سے تھا۔ اس نے کہا۔ ایک پیالی نوش جاں فرمائیں تو ساری ماندگی جاتی رہے۔ جوانی دِوانی تھی۔ ایسی باتوں پہ دل مائل تھا محمود آبدار سے کہا۔ حکیم علی کے پاس جا۔ سرور کا شربت لے آ۔ حکیم نے ڈیڑھ پیالہ بھیج دیا۔ زرد بسنتی شیریں۔ سفید شیشہ میں۔ میں نے پیا عجب کیفیت معلوم ہوئی۔ اس دن سے شراب شروع کی۔ اور روز بروز بڑھاتا رہا۔ یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ شراب انگوری کچھ معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ عرق شروع کیا۔ ۹ برس میں یہ عالم ہوا۔ کہ عرق دو آتشہ کے ۱۴ پیالے دن کو، ۶ رات کو پیتا تھا۔ کل ۶ سیر اکبری ہوئی اُن دنوں ایک مرغ کے کباب روٹی کے ساتھ اور مُولیاں خوراک تھی۔ کوئی منع نہ کر سکتا تھا۔ نوبت یہ ہوئی۔ کہ حالت خمار میں رعشہ کے مارے پیالہ ہاتھ میں نہ لے سکتا تھا۔ اور لوگ پلاتے تھے۔ **حکیم ہمام** حکیم ابو الفتح کا بھائی والد کے مقربان خاص میں تھا۔ اُسے بلا کر حال کہا۔ اُس نے کمال اخلاص اور نہایت دلسوزی سے بے حجابانہ کہا۔ صاحب عالم! جس طرح آپ عرق نوش جاں فرماتے ہیں۔ نعوذ باللہ چھ مہینے میں یہ حال ہو جائیگا۔ کہ علاج پذیر نہ رہیگا۔ اُس نے چونکہ خیر اندیشی سے

عرض کیا تھا۔ اور جان بھی عزیز ہے۔ میں نے فلونیا کی عادت ڈالی۔ شراب گھٹاتا تھا فلونیا بڑھاتا جاتا تھا۔ حکم دیا۔ کہ عرق شراب انگوری میں ملا کر دیا کرو چنانچہ دو حصے شراب انگوری۔ ایک حصہ عرق دینے لگے۔ گھٹاتے گھٹاتے، ۷ برس میں ۶ پیالے پر آگیا۔ اب ۱۵ برس سے اسی طرح ہوں۔ نہ کم ہوتی ہے نہ زیادہ۔ رات کو پیا کرتا ہوں۔ مگر جمعرات کا دن مبارک ہے کہ میرا روز جلوس ہے۔ اور شب جمعہ متبرک رات ہے۔ اور اُس کے آگے بھی متبرک دن آتا ہے۔ اس لئے نہیں پیتا۔ جمعہ کا دن آخر ہوتا ہے۔ تو پیتا ہوں۔ جی نہیں چاہتا کہ وہ رات غفلت میں گزرے۔ اور منعم حقیقی کے شکر سے محروم رہوں۔ جمعرات، اور اتوار کو گوشت نہیں کھاتا۔ اتوار والد بزرگوار کی پیدائش کا دن ہے۔ وہ بھی اس دن کا بڑا ادب کرتے تھے۔ چند روز سے فلونیا کی جگہ افیون کر دی ہے۔ اب عمر ۴۶ برس ۴ مہینے شمسی پر پہنچی۔ ۴۷ برس ۹ مہینے قمری ہوئے۔ ۸ رتی ۵ گھڑی دن چڑھے۔ ۶ رتی پہر رات گئے کھاتا ہوں۔ آزاد۔ دیکھتے ہو سادہ لوح مسلمان آج حکومت اسلام اور عمل اسلام کہہ کر فدا ہوئے جاتے ہیں عقل حیران ہے کہ وہ کیا اسلام تھے۔ اور کیا آئین اسلام تھے جس کو دیکھو۔ شیر مادر کی طرح شراب پئے جاتا ہے۔ ناموں کی فہرست لکھ کر اب کیوں اُنہیں بدنام کروں۔ اور ایک شراب کو کیا رویئے۔ سُن چکے اور سُن لوگے کہ کیا کیا کچھ ہوتا تھا۔ ع۔ عرض میں کیا کہوں۔ دنیا عجب تماشا ہے ✦

اب شہزادوں کی سعادت مندی کے کارنامے سُنو۔ کہ اکبر کو ملک دکن کی تسخیر کا شوق تھا۔ اُدھر کے حکاّم و امرا کو پرچاتا تھا۔ جو آتے تھے۔ اُنہیں دلداری و خاطرداری سے رکھتا تھا۔ خود سفارتیں بھیجتا تھا۔ ۱۰۰۳ھ میں معلوم ہوا۔ کہ برہان الملک کے مرنے، اور اُس کے نااہل بیٹوں کی کشاکشی سے گھر بے چراغ اور ملک میں اندھیر پڑ گیا۔ امرائے دکن کی عرضیاں بھی دربار اکبری میں پہنچیں۔ کہ حضور اس طرف کا قصد فرمائیں۔ تو عقیدت مند خدمت کو حاضر ہیں۔ اکبر نے جلسہ مشورت قائم کر کے اُدھر کا عزم مصمم کیا۔ ملک کو امرا پر تقسیم کیا۔ ان کے عہدے بڑھائے۔ اس وقت تک دربار میں پنجہزاری منصب معراج مدارج تھا۔ اب

شہزادوں کو وہ منصب عطا کئے۔ جو آج تک نہ سُنے تھے +

بڑے شہزادے یعنی سلیم (جو بادشاہ ہو کر جہانگیر ہوا) کو کہ ولیعہد دولت تھا۔ دوازدہ ہزاری (۲)، مراد کو دہ ہزاری (۳)، دانیال کو ہفت ہزاری +

مراد کو سلطان روم کی چوٹ پر **سلطان مراد** بنا کر مہم دکن پر روانہ کیا ناتجربہ کار شہزادہ اوّل سب کو بلند نظر نوجوان نظر آیا۔ مگر حقیقت میں پست ہمت اور کوتاہ عقل تھا۔ خان خاناں جیسے شخص کو عالی دماغی سے ایسا تنگ کیا۔ کہ وہ اپنی التجا کے ساتھ دربار میں واپس طلب ہوا۔ اور مراد دُنیا سے ناشاد گیا +

اکبر نے ایک ہاتھ جگر کے داغ پر رکھا۔ دوسرے ہاتھ سے سلطنت کو سنبھال رہا تھا۔ جو ۱۰۰۵ھ میں خبر آئی کہ عبداللہ خاں اُزبک والیٔ ترکستان نے بیٹے کے ہاتھ سے قضا کا جام پیا۔ اور ملک میں چھری کٹاری کا بازار گرم ہے۔ اُس نے فوراً انتظام کا نقشہ بدلا۔ امرا کو لے کر بیٹھا۔ اور مشورت کی انجمن جمائی۔ صلاح یہی ٹھہری کہ پہلے دکن کا فیصلہ کر لینا واجب ہے۔ گھر کے اندر کا معاملہ ہے۔ اور کام بھی قریب الاختتام ہے۔ ادھر سے خاطر جمع کر کے اُدھر چلنا چاہئے۔ چنانچہ دانیال کے نام مہم نامزد کی۔ اور مرزا عبدالرّحیم خان خاناں کو ساتھ کر کے خاندیس روانہ کیا +

سلیم کو شہنشاہی خطاب اور بادشاہی لوازمات و اسباب دے کر ولیعہد قرار دیا۔ اجمیر کا صوبہ متبرک سمجھ کر اس کی جاگیر میں دیا۔ اور میواڑ (ادیپور) کی مہم پہ نامزد کیا۔ راجہ مان سنگھ وغیرہ نامی امرا کو ساتھ کیا۔ تمن۔ تورغ۔ علم۔ نقارہ۔ فراش خانہ وغیرہ تمام سامان سلطانی عنایت فرمائے۔ لاکھ اشرفی نقد دی۔ عماری دار ہاتھی سواری کو دیا۔ مان سنگھ کو بنگالہ کا صوبہ پھر عنایت فرمایا۔ اور حکم دیا کہ شہزادہ کی رکاب میں جاؤ۔ جگت سنگھ اپنے بڑے بیٹے کو۔ یا جسے مناسب سمجھو نیابت بنگالہ پر بھیج دو +

دانیال کی شادی خان خاناں کی بیٹی سے کر دی۔ ابوالفضل بھی مہم دکن پر گئے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اور خان خاناں نے اکبر کو لکھا کہ حضور خود تشریف لائیں تو یہ مشکل مہم ابھی آسان ہو جائے۔ اکبر کا اسپ ہمت قمچی کا محتاج نہ تھا۔

ایک اشارہ میں برہان پور پر جا پہنچا۔ اور آسیر کا محاصرہ کر لیا۔ خان خاناں دانیال کو لئے احمد نگر کو گھیرے پڑا تھا۔ کہ اکبر نے آسیر کا قلعہ بڑے زور و شور سے فتح کیا۔ ادھر احمد نگر خانخاناں نے توڑا۔

۱۶۰۱ء ۱۰۰۹ھ ۔ اب ملک کے دروازے خود بخود کھلنے لگے۔ ابراہیم عادل شاہ کا ایلچی بیجاپور سے تحائف گراں بہا لے کر حاضر ہوا۔ تحریر و تقریر میں اشارہ تھا۔ کہ بیگم سلطان اس کی بیٹی کو حضور شہزادہ دانیال کی ہمنشینی کے لئے قبول فرمائیں۔ اکبر یہ عالم دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ میر جمال الدین انجو کو اس کے لینے کے لئے بھیجا۔ بڈھے بادشاہ کا جوان اقبال ادائے خدمت میں طلسمات کا تماشا دکھا رہا تھا۔ جو خبر پہنچی کہ شاہزادہ ولیعہد رانا کی مہم کو چھوڑ کر بنگالہ کو چلا گیا۔

بات یہ تھی کہ اوّل تو وہ نوجوان عیش کا بندہ تھا۔ آپ اجمیر کے علاقہ میں شکار کھیل رہا تھا۔ امرا کو رانا پر روانہ کیا تھا۔ دوسرے وہ کوہستان ویران۔ گرم ملک غنیم جان سے ہاتھ دھوئے ہوئے کبھی ادھر سے آن گرا کبھی اُدھر سے شبخون مارا۔ بادشاہی فوج بڑے حوصلہ سے حملے کرتی تھی۔ اور روکتی تھی۔ رانا جب دبتا تھا۔ پہاڑوں میں بھاگ جاتا تھا۔ شہزادہ کے پاس بدنیت اور بداعمال مصاحب صحبت میں تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ بادشاہ اس وقت مہم دکن میں ہیں۔ اور منصوبہ عظیم پیش نظر ہے۔ مدتوں کی منزلیں اور مسافت درمیان ہے۔ آپ راجہ مان سنگھ کو اس کے علاقہ پر رخصت کر دیں۔ اور آگرہ کی طرف نشان دولت بڑھا کر کوئی سیر حاصل اور سرسبز علاقہ زیر قلم کر لیں۔ یہ امر کچھ معیوب نہیں۔ جوہر ہمت اور غیرت سلطنت کی بات ہے۔

مورکھ شہزادہ ان کی باتوں میں آ گیا۔ اور ارادہ کیا۔ کہ پنجاب میں جا کر باغی بن بیٹھے۔ اتنے میں خبر آئی۔ کہ بنگالہ میں بغاوت ہو گئی۔ اور راجہ کی فوج نے شکست کھائی۔ اس کی مراد بر آئی۔ راجہ کو اُدھر رخصت کیا۔ اور آپ مہم چھوڑ آگرہ کو روانہ ہوا[1]۔ یہاں آ کر باہر ڈیرے ڈال دیئے۔ قلعہ میں مریم مکانی (والدہ اکبر) بھی موجود تھیں۔ قلیچ خاں پرانا خدمت گزار اور نامی سپہ سالار قلعدار اور

[1] ابوالفضل کی دور اندیشی نے اکبر کو یہ سمجھایا کہ جو کچھ ہوا مان سنگھ کے اغوا سے ہوا۔

تحویلدار تھا۔ اور کارسازی و منصوبہ بازی میں یکتا مشہور تھا۔ اس نے نکل کر بڑی خوشی اور شگفتہ روئی سے مبارکباد دی۔ پیشکش اور نذرانہ شاہانہ گذران کر ایسی خیر خواہی کے ساتھ باتیں بنائیں اور تدبیریں بتائیں۔ کہ شاہزادہ کے دل پر اپنی ہواخواہی پتھر کی لکیر کر دی۔ ہر چند نئے مصاحبوں نے کان میں کہا۔ کہ پرانا پاپی بڑا متفنی ہے۔ اس کا قید کر لینا مصلحت ہے۔ یہ آخر شہزادہ تھا۔ نہ مانا۔ بلکہ رخصت کے وقت اُسے کہہ دیا کہ ہر طرف سے ہشیار رہنا۔ اور قلعہ کی خبرداری اور ملک کا بندوبست رکھنا۔

جہانگیر جمنا اُتر کر شکار کھیلنے لگا۔ مریم مکانی پر یہ راز کھل گیا تھا۔ اور وہ بیٹے سے زیادہ اسے چاہتی تھیں۔ اُنہوں نے بلا بھیجا۔ نہ آیا۔ ناچار خود سوار ہوئیں۔ یہ آنے کی خبر سُن کر شکار کی طرح بھاگے۔ اور جھٹ کشتی پر بیٹھ کر الہ آباد کو روانہ ہوئے۔ دادی کہن سال افسردہ حال اپنا سا مُنہ لے کر چلی آئی۔ اُس نے الہ آباد پہنچ کر سب کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ الہ آباد آصف خاں میر جعفر کے سپرد تھا۔ اُس سے لے کر اپنی سرکار میں داخل کر لیا۔ بہار اودھ وغیرہ آس پاس کے صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ ہر جگہ اپنے حاکم مقرر کئے۔ وہ اکبری ملازم پرانے قدیم الخدمت ٹھوکریں کھاتے ادھر آئے۔ بہار کا خزانہ ۳۰ لاکھ سے زیادہ تھا۔ اُس پر قبضہ کیا۔ صوبہ مذکور شیخ جیون اپنے کوکہ کو عنایت کیا۔ اور قطب الدین خاں خطاب دیا۔ تمام مصاحبوں کو منصب اور خانی و سلطانی کے خطاب دئے۔ جاگیریں دیں۔ اور آپ بادشاہ بن گیا۔ سنہ ۱۶۰۰ء ۱۰۰۹ھ

اکبر دکن کے کنارہ پر بیٹھا پورب پچھم کے خیال باندھ رہا تھا۔ یہ خبر پہنچی تو بہت گھبرایا۔ میر جمال الدین حسین کے آنے کا انتظار بھی نہ کیا۔ مہم کو امرا پر چھوڑا اور آپ حسرت و افسوس کے ساتھ آگرہ کو روانہ ہوا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر یہ ٹہلا چند روز اور نہ اُٹھتا۔ تو دکن کے بہت سے قلعدار خود کنجیاں لے لے کر حاضر ہو جاتے۔ اور دشوار مہمیں آسان طور سے طے ہو جاتیں۔ پھر ملک موروثی یعنی ترکستان پر خاطر جمع سے دھاوے مارتے۔ مگر مقدر مقدم ہے۔

نا اہل و ناخلف بیٹے نے جو حرکتیں وہاں کیں۔ باپ کو حرف حرف خبر

پہنچی۔ اب اسے محبت پدری کہو خواہ مصلحت ملکی سمجھو۔ باوجود ایسی بے اعتدالیوں کے باپ نے ایسی بات نہ کی جس سے بیٹا بھی باپ کی طرف سے نا اُمید ہو کر کھلم کھلا باغی ہو جاتا۔ بلکہ کمال محبت سے فرمان لکھا۔ اُس نے جواب میں ایسے زمین آسمان افسانے سُنائے۔ گویا اُس کی کچھ خطا ہی نہیں۔ بُلا بھیجا۔ ٹوٹال گیا۔ اور ہرگز نہ آیا۔ اکبر آخر باپ تھا۔ اور آخری وقت تھا۔ دانیال بھی دنیا سے جانے والا تھا۔ یہی ایک نظر آتا تھا اور اسے بڑی منتوں مرادوں سے پایا تھا۔ ایک اور فرمان لکھ کر محمد شریف ولد خواجہ عبد الصمد شیریں قلم کے ہاتھ روانہ کیا۔ کہ وہ ان کا ہم سبق تھا۔ اور بچپن سے ساتھ کھیلا تھا۔ زبانی بھی بہت کچھ کہلا بھیجا۔ اور بڑی محبت اور اشتیاق دیدار کے پیام بھیجے۔ بہت بہلایا پھسلایا۔ خدا جانے وہ منایا نہ منا۔ باپ بچارا آپ ہی کہہ سُن کر خوش ہو گیا۔ اور حکم بھیجا۔ کہ ملک بنگال اور اوڑیسہ تمہاری جاگیر ہے۔ اس کا انتظام کرو۔ مگر اُس نے حکم کی تعمیل نہ کی اور آلے بالے بتاتا رہا +

۱۰۱۰ھ میں پھر وہی روز سیاہ پیش آیا۔ الٰہ آباد میں بگڑ بیٹھے۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ ٹکسال میں سکّہ لگوایا۔ روپے اشرفیاں مہاجنوں کے لین دین میں آگرہ اور دلی پہنچائیں۔ کہ باپ دیکھے اور جلے۔ اس کے پرانے وفاداروں اور قدیمی جاں نثاروں کو اپنا بدخواہ اور نمک حرام ٹھیرایا۔ کسی کو سخت قید۔ کوئی قتل۔ یہاں تک کہ شیخ ابو الفضل کے خون ناحق سے فارغ ہوئے۔ اب یا تو اکبر بُلاتا تھا۔ یہ آتے نہ تھے۔ یا مصاحبوں سے صلاح مشورہ کر کے تیس چالیس ہزار لشکر جرّار کے ساتھ آگرہ کو چلے۔ رستے میں بہت سے امیروں کی جاگیریں لُوٹتے آئے۔ اٹاوہ میں آصف خاں کی جاگیر تھی۔ وہاں پہنچ کر مقام کیا۔ آصف خاں دربار میں تھا۔ اس کے وکیل نے آقا کی طرف سے لعل گراں بہا نذر گزرانا۔ اور عرضی پیش کی (اکبر کے اشارے سے لکھی گئی تھی) اس پر بھی زر خطیر اُس کی جاگیر سے وصول کیا۔ جن امراء کی جاگیریں صوبہ بہار میں تھیں۔ سب نالاں تھے۔ آصف بہت کہتے رہتے تھے۔ مگر سلیمان صلاح اندیش ایسے جواب دیتا تھا۔ جسے سُن کر محبت کے سینے سے دودھ بہنے لگتا تھا۔ امرا چپ تھے۔ مگر آپس میں کہتے تھے۔ کہ بادشاہ کی سمجھ میں نہیں آتا دیکھئے

اس بیحد شفقت کا انجام کیا ہوتا ہے +

جب نوبت حد سے گزر گئی۔ اور وہ اٹاوہ سے بھی کوچ کر کے آگے بڑھا تو انتظام سلطنت میں خلل عظیم نظر آیا۔ اب اکبر کا بھی یہ حال ہوا۔ کہ یا تو بیٹے کے ملنے کی آرزو اور ذوق شوق کے خیالات سُنا سُنا کر خوش ہوتا تھا۔ یا اپنے اور اس کے معاملے کے انجام کو سوچنے لگا۔ فرمان لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے۔ **خلاصۂ فرمان**

اگرچہ اشتیاق دیدار فرزند کامگار کا حد سے زیادہ ہے۔ بوڑھا باپ دیدار کا پیاسا ہے۔ لیکن پیارے بیٹے کا ملنے کو آنا۔ اور اس جاہ و جلال سے آنا دل محبت منزل پر شاق اور ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اگر تجمل اور خوشنمائی لشکر کی اور موجودات سپاہ کی منظور نظر ہے تو مجرا قبول ہو گیا۔ سب کو جاگیروں پر رخصت کر دو۔ اور معمول کے بموجب چھڑے چلے آؤ۔ باپ کی دُکھتی آنکھوں کو روشن اور محروم دل کو خوش کرو۔ اگر لوگوں کی یاوہ گوئی سے کچھ وہم و وسواس تمہارے دل میں ہے جس کا ہمیں شان گمان بھی نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ الہ آباد کی طرف مراجعت کرو۔ اور کسی قسم کے وسوسے کو دل میں راہ نہ دو۔ جب وہم کا نقش تمہارے دل سے دھویا جائیگا۔ اُس وقت ملازمت میں حاضر ہونا +

اس فرمان کو دیکھ کر جہانگیر بھی بہت شرمایا۔ کیونکہ کوئی بیٹا باپ کے سلام کو اس کرّ و فر سے نہیں گیا۔ اور ایسے اختیارات نہیں دکھائے۔ اور کسی بادشاہ نے بیٹے کی بے اعتدالیوں کا اس قدر تحمّل بھی نہیں کیا۔ چنانچہ وہیں ٹھہر گیا۔ اور عرضی لکھی۔ کہ غلام خانہ زاد کو سوا آرزوئے ملازمت کے اور کچھ خیال نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب حکم حضور کا اس طرح پہنچا ہے اطاعت فرمان واجب جان کر چند روز اپنے خداوند و مرشد و قبلہ کی درگاہ سے جدا رہنا ضرور ہوا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ لکھا اور الہ آباد کو پھر گیا۔ اکبر کے حوصلے کو آفرین ہے کہ کل بنگالہ بیٹے کی جاگیر کر دیا۔ اور لکھ بھیجا کہ اپنے ہی آدمی تعینات کر دو۔ سفید و سیاہ کا تمہیں اختیار ہے۔ اور ہماری ناخوشی کا وسوسہ اور دغدغہ دل سے نکال ڈالو۔ بیٹے نے شکریہ کی عرضداشت لکھی۔ اور خود اختیاری کے ساتھ اپنے ہاتھوں کے احکام جاری کر دیئے +

صحبت میں مصاحب اچھے نہ تھے۔ بے اعتدالیاں بڑھنے لگیں۔ اکبر

پریشان رہتا تھا۔ امرائے دربار میں نہ کسی کی عقل پر اعتماد تھا۔ نہ دیانت کا اعتبار تھا۔ ناچار شیخ ابوالفضل کو دکن سے بلایا۔ وہ اس طرح مارے گئے خیال کرنا چاہیے کہ دل پر کیا صدمہ گزرا ہوگا۔ واہ رے اکبر زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ جب کچھ بن نہ آئی۔ تو خدیجۃ الزمانی سلیمہ سلطان بیگم کو کہ دانائی کاردانی اور سخن سنجی و حسن تقریر میں سحر آفرین تھیں۔ بیٹے کی تسلی اور دلاسے کے لئے روانہ کیا۔ خاصہ کے ہاتھی دل میں سے فتح لشکر ہاتھی۔ خلعت اور تحفے گراں بہا بھیجے۔ لطیف میوے من بھاتے کھانے۔ مٹھائیاں۔ پوشاک و لباس کی اکثر چیزیں برابر چلی جاتی تھیں۔ کہ کسی طرح بات بنی رہے۔ اور ضدی لڑکا ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ وہ اکبر بادشاہ تھا سمجھتا تھا کہ میں چراغِ سحری ہوں۔ اس وقت یہ ٹکرا بڑھی۔ تو سلطنت کا عالم تہ و بالا ہو جائیگا +

کارداں بیگم وہاں پہنچی۔ اپنی کاردانی سے وہ منتر پھونکے کہ مرغ وحشی دام میں آگیا۔ اور ایسا کچھ سمجھایا کہ ہٹیلا لڑکا ساتھ چلا آیا۔ رستے میں سے پھر عرضی آئی کہ مریم مکانی مجھے لینے آئیں۔ اکبر نے جواب میں لکھا کہ مجھے تو اب اُن سے کہنے کا منہ نہیں۔ تم آپ ہی لکھو۔ خیر ایک منزل آگرہ رہا تو مریم مکانی بھی گئیں۔ اپنے ہی گھر میں لاکر اُتارا۔ دیدار کا بھوکا باپ [illegible] اں چلا گیا۔ بارے ایک ہاتھ مریم مکانی نے پکڑا۔ ایک سلیمہ سلطان بیگم نے۔ [illegible]منے لائے باپ کے قدموں پر ان کا سر رکھا۔ باپ کو اس سے زیادہ اور دنیا میں تھا کیا؟ اُٹھا کر دیر تک سر چھاتی سے لگائے رہے۔ اور روئے۔ اپنے سر سے دستار اُتار کر بیٹے کے سر پر رکھ دی۔ ولی عہدی کا خطاب تازہ کیا۔ اور حکم دیا کہ شادیانے بجیں۔ مبارکبادیں ہوئیں۔ رانا کی مہم پر پھر نامزد کیا۔ اور امرا فوجیں دے کر ساتھ کئے +

یہ یہاں سے روانہ ہوئے۔ اور فتح پور میں جا کر مقام کیا۔ بعض سامانوں اور خزانوں کے پہنچنے میں دیر ہوئی۔ نازک مزاج پھر بگڑ گیا۔ اور لکھا کہ کفایت اندیش حضور کے سامان بھیجنے میں تأمل کرتے ہیں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اوقات ضائع ہوتی ہے۔ اس مہم کے لئے لشکر وافر چاہیئے۔ رانا پہاڑوں میں گھس گیا ہے۔ وہاں سے نکلتا نہیں۔ اس لئے چاروں طرف سے فوج روانہ کرنی چاہیئے۔ اور ہر جگہ

اتنی فوج ہو کہ جہاں مقابلہ ہو پڑے اس کا جواب دے سکے۔ اُمیدوار ہوں کہ فی الحال مجھے اجازت ہو کہ جاگیر پر جاؤں۔ وہاں حسب دلخواہ خود کافی و وافی سامان سرانجام کر کے حکم کی تعمیل کر دوں گا۔ اکبر نے دیکھا کہ لڑکا پھر مچلا۔ سوچ سمجھ کر اپنی بہن کو بھیجا۔ پھوپھی نے بھی جا کر بہتیرا سمجھایا۔ وہ کیا سمجھتا تھا۔ آخر باپ کو اجازت دیتے ہی بن آئی۔ یہ کوچ بہ کوچ شانِ شاہانہ سے الہ آباد کو روانہ ہوئے۔ کوتہ اندیش امیروں نے اکبر کو اشارہ کیا۔ کہ موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہئے ذفیدا اُس نے ٹال دیا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ دوسرے ہی دن ایک پوستین سمور سفید کا بھیجا۔ کہ ہمیں اس وقت بہت پسند آیا۔ جی چاہا کہ نورچشم اسے پہنے اور کچھ تحفے کشمیر کابل کے اور بھی ساتھ بھیجے۔ مطلب یہی تھا۔ کہ اس کے دل میں شبہ نہ آئے۔ اس نے الہ آباد میں پہنچ کر پھر وہی اُکھاڑ پچھاڑ شروع کر دی۔ جن امرا کو باپ نے پچاس برس کی محنت میں جانباز اور جاں نثار دلاور فتحیاب تیار کیا تھا۔ اور اس کے بھی محرم راز تھے۔ انہی کو برباد کرنے لگا۔ وہ اُٹھ اُٹھ کر دربار میں آنے لگے۔

خسرو اس کا بیٹا راجہ مان سنگھ کا بھانجا تھا۔ مگر بے عقل اور بدنیت تھا۔ وہ اپنے حال پر اکبر کی شفقت دیکھ کر سمجھتا تھا کہ دادا مجھے ولیعہد کر دیگا۔ باپ کے ساتھ بے ادبی و بے باکی سے پیش آتا تھا۔ اور کبھی کبھی اکبر کی زبان سے بھی نکل گیا تھا۔ کہ اس باپ سے تو یہ لڑکا ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ ایسی ایسی باتوں پر نظر کر کے وہ کوتہ اندیش لڑکا اور بھی لگاتا بجھاتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی ماں کو یہ حالات دیکھ کر تاب نہ رہی۔ کچھ تو جنون اس کا موروثی مرض تھا۔ کچھ ان باتوں کا غم و غصہ۔ بیٹے کو سمجھایا۔ وہ باز نہ آیا۔ آخر راجپوت رانی تھی۔ افیم کھا کر مر گئی۔ کہ اس کی ان حرکتوں سے میرے دودھ پر حرف آئیگا۔

انہی دنوں میں بادشاہی واقعہ نویس ایک لڑکے کو لے کر بھاگ گیا۔ کہ نہایت صاحبِ جمال تھا۔ اور جہانگیر بھی اسے دربار میں دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ حکم دیا کہ پکڑ لاؤ۔ وہ کئی منزل سے پکڑے آئے۔ اپنے سامنے دونوں

کی زندہ کھال اُتروا ڈالی۔ اکبر کو بھی دم دم کی خبر پہنچتی تھی۔ سُن کر تڑپ گیا۔ اور کہا۔ اللہ اللہ شیخوجی ہم تو بکری کی کھال بھی اُترتے نہیں سکتے۔ تم نے یہ سنگدلی کہاں سے سیکھی۔ شراب اس قدر پیتا تھا کہ نوکر چاکر ڈر کے مارے کونوں میں چھپ جاتے تھے۔ پاس جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ جو حضوری سے مجبور تھے وہ نقش دیوار کھڑے رہتے تھے۔ وہ ایسی حرکتیں کرتا تھا جن کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہوں ؛

ایسی ایسی باتیں سُنکر عاشق باپ سے رہا نہ گیا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ زیادہ تر شراب کی خانہ خرابی ہے۔ چاہا کہ خود جاؤں اور آپ سمجھا کر لے آؤں کشتی پر سوار ہؤا۔ ایک دن کشتی ریتے میں رُکی رہی۔ دوسرے دن اور کشتی آئی۔ دو دن مینہ کا تار لگا رہا۔ اتنے میں خبر پہنچی کہ مریم مکانی کا بُرا حال ہے۔ مختصر یہ کہ پھر آئے۔ اور ایسے وقت پہنچے کہ لبوں پر دم تھا۔ ماں نے بیٹے کا آخری دیدار دیکھ کر سنہ ۱۰۱۲ھ میں دنیا سے سفر کیا۔ اکبر کو بڑا رنج ہؤا۔ بھدرا کیا۔ کہ چنگیز خانی تورہ اور ہندوستانی ریت کا حکم تھا۔ ہم اسو نمک حلالوں نے ساتھ دیا۔ تھوڑی دور سعادت مند بیٹے نے ماں کا تابوت سر پر اُٹھایا۔ تمام امرا کندھول پر لے گئے۔ اکبر تھوڑی دُور تک جاکر نہایت آزردہ ہؤا۔ پھر آیا اور تابوت کو دِلّی روانہ کیا۔ کہ شوہر کے پہلو میں دفن ہو۔ الہ آباد میں خبر پہنچی تو یہ بھی کچھ سمجھے۔ اور روتے بسورتے باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عاشق باپ نے گلے سے لگایا۔ بہت سمجھایا۔ معلوم ہؤا کہ کثرتِ شراب سے دماغ میں خلل آگیا ہے۔ نوبت یہ ہوگئی تھی کہ فقط شراب کا نشہ بس نہ تھا۔ اس میں افیون گھول کر پیتے تھے۔ جب ذرا سرور معلوم ہوتا تھا۔ اکبر نے حکم دیا۔ کہ محل سے نکلنے نہ پائیں۔ مگر پھر کب تک۔ ناچار تفریحوں اور ترکیبوں سے طبیعت کی اصلاح کرتا تھا۔ اور حکمت عملی کے علاجوں سے دیوانہ کو قابو میں لاتا تھا۔ غائبانہ حاضرانہ شفقتیں کر کے پھسلاتا تھا۔ کہ ہٹیلے لڑکے کی ضدوں میں بڑوں کا نام نہ مٹ جائے۔ اور فی الحقیقت وہ ملک و تدبیر کا بادشاہ سچ سمجھا تھا ؛

ابھی مراد کے آنسوؤں سے پلکیں نہ سوکھی تھیں کہ اکبر کو پھر جوان بیٹے کے غم میں رونا پڑا۔ یعنی ۱۰۱۳ھ میں دانیال نے بھی اسی شراب کے پیچھے اپنی جان عزیز کو ضائع کیا۔ اور سلیم کے لئے میدان خالی چھوڑ گیا۔ باپ کو اب سوا سلیم کے دین و دنیا میں کوئی نہ تھا۔ بیٹا اور اکلوتا بیٹا ع داغ فرزندے کند فرزند دیگر را عزیز

اسی عرصہ میں ایک دن بعض سلاطین[1] اور شہزادوں کی فرمائش سے صلاح ٹھہری کہ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھیں۔ اکبر کا بھی قدیمی شوق تھا۔ پھر جوانی کی اُمنگ آگئی۔ ولیعہد دولت کے پاس ایک بڑا بلند اور تنادر ہاتھی تھا۔ اسی لئے اس کا نام گرانبار رکھا تھا۔ وہ ہزاروں ہاتھیوں میں نمودار نظر آتا تھا۔ اور لڑائی میں ایسا بلونت تھا کہ ایک ہاتھی اس کی ٹکر نہ اُٹھا سکتا تھا۔ خسرو (شاہزادہ ولیعہد کے بیٹے) کے پاس ایسا ہی نامور اور دھین دھونکڑ ہاتھی تھا۔ اُس کا نام آپ روپ تھا۔ دونوں کی لڑائی ٹھہری۔ خاصہ بادشاہی میں بھی ایک ایسا ہی جنگی ہاتھی تھا۔ اس کا نام رن تھمن تھا۔ تجویز ٹھہری کہ جو ان دونوں میں سے دب جائے۔ اُس کی مدد پر رن تھمن آئے۔ بادشاہ اور اکثر شہزادے جھروکوں میں بیٹھے۔ جہانگیر اور خسرو اجازت لے کر گھوڑے اُڑاتے میدان میں آئے۔ ہاتھی آمنے سامنے ہوئے۔ اور پہاڑ ٹکرانے لگے۔ اتفاقاً بیٹے (خسرو) کا ہاتھی بھاگا اور باپ کا (جہانگیر) ہاتھی اُس کے پیچھے چلا۔ خاصہ کے فیلبان نے بموجب قرار داد کے رن تھمن کو آپ روپ کی مدد پر پہنچایا۔ جہانگیر نمک خواروں کو خیال ہوُا کہ ایسا نہ ہو۔ ہماری جیت ہار ہو جائے۔ اس لئے رن تھمن کو مدد سے روکا۔ چونکہ پہلے سے یہ بات ٹھہری ہوئی تھی۔ فیلبان نہ رُکا۔ جہانگیری نوکروں نے غل مچایا۔ برچھوں کے کوچے اور پتھر مار نے شروع کئے۔ یہاں تک کہ فیلبان شاہی کی پیشانی پر پتھر لگا۔ اور کچھ لہو بھی منہ پر بہا۔

خسرو ہمیشہ دادا کو باپ کی طرف سے اُکسایا کرتا تھا۔ اپنے ہاتھی کے

[1] خاندان چغتائیہ کی اصطلاح میں بادشاہ اور ولیعہد کے سوا جو خاندان کے بھائی بند ہوں۔ سلاطین کہلاتے ہیں۔ بلکہ مجازاً ایک بھی سلاطین کہہ دیتے ہیں۔ اگرچہ لفظاً جمع کا صیغہ ہے۔

بھاگنے سے کھسیانا ہوگیا۔ اور جب مدد بھی نہ پہنچ سکی۔ تو دادا کے پاس آیا بسورتی صورت بناکر باپ کے نوکروں کی زیادتی اور فیلبانِ خاصہ کی مجروحی کا حال بُرے رنگ سے دکھایا۔ جہانگیر کے نوکروں کا شور شرابا اور اپنے فیلبان کے منہ پر لہو بہتا ہوا سامنے سے اکبر نے بھی دیکھا تھا۔ بہت برہم ہوا۔ خورمؔ (شاہجہان) کی ۱۴ برس کی عمر تھی۔ اور دادا کی خدمت سے ایک دم جُدا نہ ہوتا تھا۔ اس وقت بھی حاضر تھا۔ اکبر نے کہا۔ تم جاؤ اپنے شاہ بھائی (جہانگیر) سے کہو کہ شاہ بابا (اکبر) کہتے ہیں۔ دونوں ہاتھی تمہارے۔ دونوں فیلبان تمہارے۔ جانور کی طرفداری میں ہمارے ادب کا بھول جانا یہ کیا بات ہے۔

خورم اس عمر میں بھی دانشمند اور نیک طبع تھا۔ ہمیشہ ایسی باتیں کیا کرتا تھا۔ جس میں باپ اور دادا میں صفائی رہے۔ وہ گیا اور خوشی خوشی پھر آیا۔ عرض کی شاہ بھائی کہتے ہیں۔ حضور کے سر مبارک کی قسم ہے کہ فدوی کو اس بیہودہ حرکت کی ہرگز خبر نہیں اور غلام کبھی ایسی گستاخی گوارا نہیں کرسکتا۔ غرض باپ کی طرف سے اس طرح تقریر کی کہ دادا خوش ہوگیا۔ اکبر اگرچہ جہانگیر کی حرکات ناشائستہ سے ناراض تھا۔ اور اس عالم میں کبھی خسرو کی تعریف بھی کر دیا کرتا تھا۔ مگر سمجھتا تھا کہ یہ اس سے بھی نالائق ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ خسرو ایک دفعہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر نہ رہیگا۔ کیونکہ اس کا پچھا بھاری ہے۔ یعنی مان سنگھ کا بھانجا ہے تمام سردارانِ کچھواہہ ساتھ دیں گے۔ خان اعظم کی بیٹی اس سے بیاہی ہے۔ وہ بھی سلطنت کا رکنِ اعظم ہے۔ ان دونوں کا ارادہ تھا۔ کہ جہانگیر کو باغی قرار دے کر اندھا کر دیں اور قید رکھیں۔ خسرو کے سر پر تاج اکبری رکھ دیں۔ مگر دانا بادشاہ برسوں کی مدت اور کوسوں کی مسافت کو سامنے دیکھتا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا۔ کہ جب اس طرح بگڑے گی تو گھر ہی بگڑ جائیگا۔ اس لئے مصلحت یہی نظر آئی کہ سب کاروبار بدستور رہے اور جہانگیر ہی تخت نشین ہو۔ ان دنوں میں جو

[1] خورم۔ سلیم یعنی جہانگیر کا بیٹا تھا۔ یہ راجہ اُدے سنگھ کی بیٹی۔ راجہ مالدیو زبانزد کی جودھپور کی پوتی کے شکم سے ۱۰۰۰ھ اسی شہر لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اکبر نے اسے خود بیٹا کر لیا تھا۔ بہت پیار کرتا تھا۔ اور ہر وقت دادا کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔

بڑے بڑے امیر تھے وہ اضلاع دور دست میں بھیجے ہوئے تھے۔ اس لئے[1]
جہانگیر بہت ہراساں تھا۔ چنانچہ جب اکبر کی حالت غیر ہوئی تو اس کے اشارہ
سے قلعہ سے نکل کر ایک مکان محفوظ میں جا بیٹھا۔ وہاں شیخ فرید بخشی وغیرہ پہنچے
اور شیخ کو اپنے مکان میں لے گئے۔

جب بیٹے کو کئی دن نہ دیکھا تو اکبر بھی سمجھ گیا اور اُسی عالم میں بُلایا گلے سے
لگا کر بہت پیار کیا اور کہا کہ امرائے دربار کو یہیں بُلا لو۔ پھر بیٹے سے کہا۔ اے
فرزند! جی نہیں قبول کرتا کہ تجھ میں اور میرے ان دولتخواہوں میں بگاڑ ہو۔
جنہوں نے برسوں میرے ساتھ یلغاروں اور شکاروں میں محنتیں اُٹھائیں۔
اور تیغ و تفنگ کے منہ پر جان جوکھوں میں رہے۔ اور میرے جاہ و جلال اور
ملک و دولت کی ترقی میں جانفشانی کرتے رہے۔ اتنے میں امرا بھی حاضر ہو گئے۔
سب کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ کہ اے میرے وفادارو۔ اے میرے عزیزو
اگر بھولے سے بھی کوئی خطا تمہاری مَیں نے کی ہو تو معاف کرو۔ جہانگیر نے جب
یہ بات سنی تو باپ کے قدموں پر گرا اور زار زار رونے لگا۔ باپ نے سر اُٹھا کر
سینہ سے لگایا اور تلوار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اسے کمر سے باندھو۔ اور
میرے سامنے بادشاہ بنو۔ اور پھر کہا کہ خاندان کی عورتوں اور حرم سرا کی
بیبیوں کی غور و پرداخت سے غافل نہ رہنا۔ اور قدیمی نمک خواروں اور
میرے پرانے ہوا خواہوں اور رفیقوں کو نہ بھولنا۔ سب کو رخصت کر دیا۔ اور
مرض کو آرام ہؤا۔ مگر وہ طبیعت نے سنبھالا لیا تھا۔ غرض جہانگیر پھر شیخ فرید
کے گھر میں جا بیٹھا۔

اکبر کی بیماری میں خورم اس کی خدمت میں حاضر تھا۔ اسے محبت دلی اور
سعادت مندی کہو یا باپ کی اور اپنی مصلحت وقت سمجھو۔ اہل تاریخ یہ بھی لکھتے

[1] اس نے اکثر معرکوں میں دلاوری کے کارنامے دکھا کر جہانگیر سے مرتضیٰ خاں خطاب حاصل
کیا۔ سید صحیح النسب تھا۔ کہتا تھا کہ میں رضوی سید ہوں مگر حقیقت میں نقوی سید تھا یعنی
حضرت جعفر توّاب کی اولاد تھا۔ جنہیں اکثر مصنّف جعفر کذّاب لکھتے ہیں۔ اکبر کے عہد
میں بھی بڑی جانفشانی اور نمک حلالی سے خدمتیں بجا لاتا رہا تھا یہاں تک کہ بخشی گری کے منصب تک پہنچا تھا

ہیں کہ باپ (جہانگیر) محبّتِ پدری کے سبب سے بُلا بُلا بھیجتا اور کہتا تھا کہ چلے آؤ۔ دشمنوں کے زغے میں رہنا کیا ضرور ہے۔ وہ نہ آتا تھا اور کہلا بھیجتا تھا کہ شاہ بابا کا یہ حال ہے۔ اس عالم میں انہیں چھوڑ کر کس طرح چلا جاؤں۔ جب تک جان میں جان ہے۔ شاہ بابا کی خدمت سے ہاتھ نہ اُٹھاؤں گا۔ یہاں تک کہ ماں بیقرار ہو کر آپ اُس کے لینے کو دوڑی گئی۔ اور بہت سمجھایا۔ مگر وہ ہرگز اپنے ارادے سے نہ ٹلا۔ دادا کے پاس رہا۔ اور باپ کو بھی دم دم کی خبریں پہنچاتا رہا +

اُس وقت اُس کا وہاں رہنا اور باہر نہ آنا ہی مصلحت ہُوا۔ خان اعظم اور مان سنگھ کے آدمی ہتیار بند چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اگر وہ نکلتا۔ تو فوراً پکڑا جاتا۔ جہانگیر ہاتھ آجاتا تو وہ بھی گرفتار ہو جاتا۔ جہانگیر نے ان حالات کو خود بھی توزک میں لکھا ہے۔ اُسے بڑا خطرہ اس واقعہ کے سبب سے تھا۔ جو شاہ طہماسپ کے بعد ایران میں گزرا تھا۔ جب شاہ کا اِنتقال ہُوا تو سلطان حیدر اپنے امرا و رفقا کی حمایت سے تخت نشین ہو گیا۔ بری جان خانم شاہ طہماسپ کی بہن پہلے سے سلطنت کے کاروبار اور انتظام مہمات میں دخل رکھتی تھی وہ اس کی تخت نشینی دل سے نہ چاہتی تھی۔ اس نے شفقت کے پیام بھیج کر بھتیجے کو قلعہ میں بُلایا۔ بھتیجا نفاق سے بے خبر۔ وہ بیخبر پھوپھی کے پاس گیا۔ اور جاتے ہی قید ہو گیا۔ قلعہ کے دروازے بند ہو گئے۔ اس کے رفقا نے جب سنا تو اپنی اپنی فوجیں لے کر آئے اور قلعہ کو گھیر لیا۔ اندر والوں نے سلطان حیدر کو مار ڈالا اور اُس سر کاٹ کر فصیل پر سے دکھایا۔ اور کہا کہ جس کے لئے تم لڑتے ہو اس کا تو یہ حال ہے۔ اب کس بھروسے پر مرتے ہو۔ اور سر کو باہر پھینک دیا۔ جب اُن لوگوں کو یہ حال معلوم ہُوا تو دل شکستہ ہو کر پریشان ہو گئے۔ اور شاہ اسمٰعیل ثانی تخت نشین ہو گیا۔ غرض مرتضیٰ خاں (شیخ فرید بخشی) جہانگیر کا بھی خیر خواہ تھا۔ اُس نے آ کر بند و بست کیا۔ وہ بخشی بادشاہی تھا۔ اور امرا اور افواج کی طبیعت پر اثر عظیم رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کے سبب سے خان اعظم کے نوکروں میں بھی تفرقہ پڑ گیا۔ خسرو کا یہ عالم تھا کہ کئی برس سے ہزار روپیہ روز (۳ لاکھ ۶۰ ہزار سالانہ) ان لوگوں کو دے رہا تھا

کہ وقت پر کام آتا۔ اخیر وقت میں بعض خیرخواہان سلطنت نے مشورہ کر کے یہی مناسب دیکھا کہ مان سنگھ کو بنگالہ کے صوبہ پر ٹالنا چاہیئے۔ چنانچہ اُسی دن اکبر سے اجازت لی اور فوراً خلعت دے کر روانہ کر دیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اندر اندر مدت سے کھچڑی پک رہی تھی مصلحت اندیش بادشاہ نے اپنے علو حوصلہ سے گھر کا راز کھلنے نہ دیا۔ اخیر میں جا کر یہ باتیں کھلیں۔ ملا صاحب تیرہ چودہ برس پہلے لکھتے ہیں۔ (اُس وقت دانیال اور مراد بھی زندہ تھے) ایک دن بادشاہ کے پیٹ میں درد ہوا اور شدت اُس کی اس قدر ہوئی کہ بیقراری ضبط کی طاقت سے گزر گئی۔ اس وقت عالم اضطراب میں ایسی باتیں کرتے تھے جس سے بڑے شہزادے پر بدگمانی ہوتی تھی۔ کہ شاید اسی نے زہر دیا ہے۔ بار بار کہتے تھے۔ بابا شیخو جی! ساری سلطنت تمہاری تھی۔ ہماری جان کیوں لی۔ بلکہ حکیم ہمام جیسے معتمد پر بھی سازش کا شبہ ہوا۔ پیچھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت جہانگیر نے شاہزادہ مراد پر خفیہ پہرے بٹھا دیئے تھے۔ مگر جلد ہی صحت ہو گئی۔ پھر شاہزادہ مراد اور بیگمات نے بادشاہ سے سب حال عرض کیا۔

اواخر عمر میں اکبر کو فقرا اور اہل کمال کی تلاش تھی۔ اور غرض اس سے یہ تھی کہ کوئی ترکیب ایسی ہو جس سے اپنی عمر زیادہ ہو جائے۔ اس نے سنا۔ ملک خطا میں فقرا ہوتے ہیں کہ لامہ کہلاتے ہیں۔ چنانچہ کاشغر اور خطا کو سفیر روانہ کئے۔ اسے یہ بھی خیال ہوا کہ صاحب ریاضت ہندوؤں میں بہت ہوتے ہیں۔ اور ان کے مختلف فرقوں میں سے جوگی لوگ حبس دم۔ کایا پلٹ اور اس قسم کے شغل و عمل بہت رکھتے ہیں۔ اس لئے اس فرقہ کے فقیروں کو بہت جمع کرتا تھا۔ اور اُن کے ساتھ صحبت رکھتا تھا۔ لیکن افسوس یہی ہے کہ موت کا علاج کچھ نہیں ایک دن یہاں سے جانا ہے۔ دنیا کی ہر بات میں کلام کو جگہ ہے۔ لاکلام بات ہے تو یہی ہے کہ ایک دن جانا ہے۔ غرض ۱۱ر جمادی الاوّل کو طبیعت علیل ہوئی۔ حکیم علی اپنے جملہ اوصاف کے ساتھ فن طبابت میں ایسا صاحب کمال تھا۔ کہ اُسی کو علاج کے لئے کہا۔ اس نے ۸ دن تک دفع مرض کو مزاج پر چھوڑا۔ کہ شاید اپنے وقت پر طبیعت آپ

دفع کرے۔ لیکن بیماری بڑھتی ہی گئی۔ نویں دن علاج پر ہاتھ ڈالا۔ دس دن تک دوا کی۔ کچھ اثر نہ ہُوا۔ بیماری بڑھتی جاتی تھی اور طاقت گھٹتی جاتی تھی ؎

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

باوجود اس کے اُس ہمّت والے نے ہمّت نہ ہاری۔ دربار میں آبیٹھتا تھا۔ حکیم نے اُنیسویں دن پھر علاج چھوڑ دیا۔ اس وقت تک جہانگیر پاس موجود تھا۔ مگر جب طور بے طور دیکھا تو چپکے[1] سے نکل کر شیخ فرید بخاری کے گھر میں چلا گیا۔ کہ اُسے باپ کے نمک حلالوں میں اپنا بھی جاں نثار سمجھتا تھا۔ یہاں وقت کا منتظر بیٹھا تھا۔ اور دولت خواہ دم بدم خبر پہنچا رہے تھے۔ کہ حضور! اب فضلِ الٰہی ہوتا ہے۔ اور اب اقبال کا ستارہ طلوع ہوتا ہے (یعنی باپ مرتا ہے۔ اور تم تخت نشین ہوتے ہو)۔ افسوس افسوس۔ ع

دنیا ہیچ است و کارِ دنیا ہمہ ہیچ

اے غافل! کس دن کے لئے؟ اور کس اُمید پر؟ اور اس بات کا ذرا خیال نہیں کہ ۲۲ برس کے بعد مجھے بھی یہی دن آنے والا ہے۔ اور ذرا بھی شک نہیں کہ آنے والا ہے۔ آخر بدھ کے دن ۱۲ جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ کو آگرے میں اکبر نے دنیا سے انتقال کیا۔ ۶۴ برس کی عمر پائی۔

آزاد۔ ذرا اس دنیا کے رنگ دیکھو! وہ کیا مبارک دن ہوگا! اور دلوں کی شگفتگی کا کیا عالم ہوگا۔ جس میں کہنے والوں نے ولادت کی تاریخیں کہی تھیں۔ انہی میں سے ایک تاریخ ہے۔ ع

شبِ یکشنبہ و پنج رجب است

تاریخ کیا ہے! لطیفۂ غیبی ہے۔ سنہ۔ مہینہ۔ دن۔ تاریخ۔ وقت سب موجود۔ ایسے بادشاہ کی تاریخ بھی ایسی ہی چاہیئے تھی۔ اور اُس دن کی خوشی کا

[1] ایشیائی سلطنتوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ کے مرتے ہی بغاوت ہوجاتی ہے۔ سلطنت کے دعویدار مختلف امرا اور ارکانِ سلطنت کو ملا لیتے ہیں۔ ہزاروں واقعہ طلب لالچی ان کے ساتھ ہوجاتے ہیں۔ دعویدار سلطنت کے کبھی کشت و خون سے کبھی سازش سے ایک دوسرے کو مروا ڈالتے ہیں۔

کیا کہتا کہ جمعہ ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ کو تخت پر بیٹھا کسی نے نصرتِ اکبر کسی نے کام بخش۔ خدا جانے کیا کیا تاریخیں کہی ہونگی۔ اللہ اللہ وہ گجرات کی یلغاریں۔ وہ خان زماں کی لڑائیاں۔ وہ جشنوں کی بہاریں۔ اقبال کے نشان۔ خدائی کی شان ؎

گیا حسنِ خوباں دلخواہ کا	ہمیشہ رہے نام اللہ کا

کہاں وہ عالم! کہاں آج کا عالم! ذرا آنکھیں بند کر کے خیال کرو۔ اُس کا مُردہ ایک الگ مکان میں سفید چادر اوڑھے پڑا ہے۔ ایک مُلّا صاحب تسبیح ہلا رہے ہیں۔ چند حافظ قرآن شریف پڑھے جاتے ہیں۔ کچھ خدمت گزار بیٹھے ہیں۔ نہلائیں گے۔ کفنائینگے۔ نناویں دروازے سے چپ چپاتے لیکر چلے جائینگے۔ دفنا کر چلے آئینگے ؎

لائی حیات آئے۔ قضا لے چلی۔ چلے	اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

وہی ارکان دولت جو اُس کی بدولت سونے روپے کے بادل اُڑاتے تھے۔ موتی رولتے تھے۔ جھولیاں بھر بھر لے جاتے تھے۔ اور گھروں پر لُٹاتے تھے۔ زرق برق پڑے پھرتے ہیں۔ نیا دربار سجاتے ہیں۔ نئے سنگار۔ نئے نقشے تراشتے ہیں۔ نئے بادشاہ کو نئی خدمتیں دکھائینگے۔ بڑی بڑی ترقیاں پائینگے جس کی جان گئی اُس کی پروا بھی نہیں۔ آصف خاں کو آفرین ہے۔ اُسی عالم میں ایک تاریخ تو کہہ دی ؎

فوت اکبر شد از قضائے اِلٰہ	گشت تاریخ فوت اکبر شاہ

اِس میں ایک زیادہ ہے۔ کسی نے تخرجہ خوب کیا ہے۔ ع

الف کشیدہ ملائک زفوت اکبر شاہ

یعنی ملائک نے اس کے غم میں فقیری و قلندری اختیار کی۔ اس لئے ماتھے پر الف اللہ کا کھینچا۔ وہاں آسمان پر انھوں نے وہ الف کھینچا۔ یہاں اعداد میں سے الف کا ایک شاعر نے کھینچ لیا۔ ۱۰۱۴ پورے رہ گئے +

آزاد۔ الف کشیدن بمعنی قلندری اختیار کردن کے لئے فارسی میں کسی اُستاد کے کلام سے سند چاہئے +

اور سکندرہ کے باغ میں کہ اکبر آباد سے کوس بھر ہے دفن کیا +

ایجاد ہائے اکبری

اگرچہ علوم نے اُس کی آنکھوں پر عینک نہ لگائی تھی۔ اور فنون نے دماغ پر دستکاری بھی خرچ نہ کی تھی۔ لیکن وہ ایجاد کا عاشق تھا۔ اور یہی فکر تھا کہ ہر بات میں نئی بات پیدا کیجئے۔ اہلِ علم اور اہلِ کمال گھر بیٹھے تنخواہیں اور جاگیریں کھا رہے تھے۔ بادشاہ کے شوق ان کے آئینہ ایجاد کو اُجالتے تھے۔ وہ نئی سے نئی بات نکالتے تھے۔ نام بادشاہ کا ہوتا تھا۔

شیر شکار اکبر ہاتھیوں کا شوقین تھا۔ ابتدا میں فیل شکاری کا شوق ہوا۔ اور کہا کہ ہم خود ہاتھی پکڑیں گے۔ اس میں بھی نئے نئے ایجاد نکالیں گے۔ چنانچہ ۹۷۱ھ میں مالوہ پر فوج کشی کی تھی۔ گوالیار سے ہوتے ہوئے نرور کے جنگلوں میں گھس گئے۔ لشکر کو کئی فوجوں میں تقسیم کیا۔ ایک ایک فوج پر ایک ایک امیر کو فوجدار کیا اور اپنے اپنے رُخ کو چلے۔ بہت سرگردانی کے بعد پہلے ایک ہتنی نظر آئی۔ اس کی طرف ہاتھی لگایا۔ وہ بھاگی یہ پیچھے پیچھے دوڑے۔ اور اتنا دوڑے گئے۔ کہ وہ تھک کر ڈھیلی ہوگئی۔ داہنے بائیں جو دو ہاتھی لگے ہوئے تھے۔ ایک نے رسّا پھینکا۔ دوسرے نے لپک لیا۔ اور دونوں طرف سے اتنا ڈھیلا چھوڑا کہ ہتنی کی سونڈ کے نیچے ہوگیا۔ پھر جو تانا تو گلے سے جا لگا۔ ایک فیلبان نے اپنا سرا دوسرے کی طرف پھینک دیا۔ اس نے لپک کر دونوں سروں میں گرہ دی یا بل دیا۔ اور اپنے ہاتھی کے گلے میں باندھ لیا۔ پھر جو ہاتھی کو دوڑایا تو ایسا دبائے چلا گیا۔ کہ ہتنی ہانپ کر بے دم ہوگئی۔ ایک فیلبان اپنا ہاتھی برابر لے گیا۔ اور جھٹ اس کی پشت پر جا بیٹھا۔ آہستہ آہستہ رستے پر لگایا۔ ہری ہری گھانس سامنے ڈالی۔ کچھ چاٹ دی۔ کچھ کھلایا۔ وہ بھوکی پیاسی تھی۔ جو کچھ ملا غنیمت معلوم ہوا۔ پھر جہاں لانا تھا لے آئے۔ مُلّا آئے کتابدار کا بیٹا بھی ساتھ ہو گیا تھا۔ اس کھینچا تانی میں ہاتھیوں کی رو ندن میں آگیا تھا۔ غنیمت ہوا کہ جان بچ گئی۔ گرتا پڑتا بھاگا۔

چلتے چلتے ایک کھلی بن میں جا نکلے۔ ایسا گھن کا بن تھا۔ کہ دن بھی شام ہی نظر آتا تھا۔ اقبال اکبری خدا جانے کہاں سے گھیر لایا تھا کہ وہاں ۷۰ ہاتھی کا گلہ چرتا نظر آیا۔ بادشاہ نہایت خوش ہوا۔ اُسی وقت آدمی دوڑائے۔ تمام فوجوں کے ہاتھی جمع کر لئے۔ اور لشکر سے شکاری رسّے منگائے۔ اپنے ہاتھی پھیلا کر رستے روک لئے۔ اور بہت سے ہاتھیوں کو ان میں ملا دیا۔ پھر گھیر کر آہستہ آہستہ ایک کھلے جنگل میں لائے۔ چرکٹوں اور فیلبانوں کو ہزار آفرین کہ جنگلیوں کے پاؤں میں رسّے ڈال کر درختوں سے باندھ دیا۔ بادشاہ اور ہمراہی وہیں اُتر پڑے۔ جس جنگل میں کبھی آدمی کا قدم نہ پڑا ہوگا قدرت کا گلزار نظر آنے لگا۔ رات وہیں کاٹی۔ دوسرے دن عید تھی۔ وہیں جشن منائے۔ گلے مل مل کر آپس میں مبارک بادیں دیں۔ اور سوار ہوئے۔ ایک ایک جنگلی کو دو دو اکبری ہاتھیوں کے بیچ میں رسّوں سے جکڑ کر رواں کیا۔ حکمت عملی سے آہستہ آہستہ لے کر چلے۔ کئی دن کے بعد جہاں لشکر کو چھوڑ کر گئے تھے آن شامل ہوئے۔ افسوس یہ ہے۔ کہ جاتے ہوئے جبکہ ہاتھیوں کا حلقہ دریائے چنبل سے اُترتا تھا۔ لکھنہ ہاتھی ڈوب گیا۔

۹۷۱ھ میں اکبر مالوہ سے خاندیس کی سرحد پہ دورہ کرکے آگرہ کی طرف پھرا۔ رستے میں قصبہ سیری پر ڈیرے ہوئے اور ہاتھیوں کا شکار ہونے لگا۔ ایک دن بڑا گلہ ہاتھیوں کا جنگل میں ملا۔ حکم دیا کہ بہادر سوار جنگل میں پھیل جائیں۔ گلہ پر گھیرا ڈال کر ایک طرف کا رستہ کھلا رکھیں۔ اور بیچ میں لے کر نقارے بجانے شروع کریں۔ چند فیلبانوں کو حکم دیا کہ اپنے سدھے سدھائے ہاتھیوں پہ سوار ہو جاؤ۔ اور سیاہ شالیں اوڑھ کر ان کے پیٹ سے اس طرح وصل ہو جاؤ کہ جنگلی ہاتھیوں کو ذرا نظر نہ آؤ۔ اور اُن کے آگے آگے ہو کر قلعہ سیری کی طرف لگائے چلو۔ سواروں کو سمجھا دیا کہ گرد گھیرے نقارے بجاتے چلے آؤ۔ منصوبہ درست بیٹھا۔ اور سارے ہاتھی قلعہ مذکور میں فیل بند ہو گئے۔ فیلبان کوٹھوں اور دیواروں پر چڑھ گئے۔ بڑے بڑے رسّوں کی کمندیں اور پھاندیں ڈال کر سب کو باندھ لیا۔ ایک ہاتھی بڑا بلونت اور مستی میں بپھرا ہوا تھا کسی طرح قابو میں نہ آیا۔ حکم دیا کہ ہمارے کھانڈے رائے ہاتھی کو لے کر اس سے لڑا دو۔ وہ بڑا تناور اور جنگی ہاتھی تھا۔ آتے

ہی ریل دھکیل ہونے لگی۔ ایک پہر دونوں پہاڑ ٹکرائے۔ آخر جنگلی کے نشے ڈھیلے ہوگئے۔ قریب تھا کہ کھانڈے رائے اُسے دبا لے۔ حکم ہوا کہ منہ پر مشعلیں جلا جلا کر مار دو تاکہ اُس کا پیچھا چھوڑے۔ بڑی مشکلوں سے دونوں جُدا ہوئے۔ مگر جنگلی دیوزاد جب ادھر سے چھُٹا تو بھاگا اور قلعے کی دیوار ٹکریں اور ٹھوکروں سے توڑ کر جنگل کو نکل گیا۔ یوسف خاں کوکلتاش (مرزا عزیز کوکہ کے بڑے بھائی) کو کئی ہاتھی اور ہاتھی بان دے کر اُس کے پیچھے بھیجا اور کہا کہ رن بھیروں ہاتھی کو (کہ حلقۂ خاصہ کا ہاتھی اور بدمستی اور زبردستی میں بدنام عالم تھا) جا کر اُلجھا دو۔ تھکا ہُوا ہے۔ ہاتھ آجائیگا اس نے جاکر پھر لڑائی ڈالی۔ فیل بانوں نے رسوں میں پھانس کر ایک درخت سے جکڑ دیا۔ اور دو تین دن میں چارہ پر لگا کر لے آئے۔ چند روز تعلیم پاکر فیل ہائے خاصہ میں داخل ہوگیا۔ اور گج پتی خطاب پایا +

گوئے آتشین

چوگان بازی کا بہت شوق تھا۔ اکثر ہوتا تھا کہ کھیلتے کھیلتے شام ہوگئی۔ بازی ابھی تمام نہ ہوئی۔ اندھیرا ہوگیا گیند نہیں دکھائی دیتی۔ ناچار کھیل بند کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے ۹۷۴ھ میں گوئے آتشین نکالی کہ اندھیرے میں شعلے کی طرح جاتی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک قسم کی لکڑی کی تراشی تھی۔ اوپر کچھ دوائیں مل دیتے تھے (فاسفورس ہوگا) جب ایک دفعہ اُسے آگ دیتے تھے تو چوگان کی چوٹ اور زمین پر چھٹنے یا لُڑھکنے سے بجھتی نہ تھی۔ واہ۔ رات کی بہار دن سے بھی زیادہ ہوگئی +

چار ایوان یا عبادت خانہ

۹۸۳ھ میں دولت خانۂ فتح پور میں تیار ہوا۔ یہ گویا ایک کونسل (انجمن) عقلا۔ علماء کی تھی۔ کہ مسائل مذہبی۔ مہمات سلطنت۔ مقدمات ملکی اس میں پیش ہوتے تھے۔ اور جو کتابی یا عقلی اختلاف ان میں ہوتے تھے وہ کھُل جاتے تھے۔ جس وقت اسے قرار دیا تھا۔ تو خالص نیک نیتی کے ساتھ یہی غرض رکھی تھی دوسرا ایجاد قدرتی پیدا ہوگیا۔ کہ آپس کے رشک اور اختلاف باہمی کے سبب سے ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور اس سے شریعت جو سلطنت کو دبائے ہوئے تھی۔ اس کا زور ٹوٹ گیا +

تقسیم اوقات

۹۸۶ھ میں تقسیم اوقات کی ہدایت فرمائی۔ جب سو کے

اُٹھیں تو سب کاموں سے ہاتھ روک کر باطن ہی کی طرح ظاہر کو بھی نیاز طلب کریں (عبادت میں مصروف ہوں) اور دل کو جان آفرین کی یاد سے روشنی دیں۔ اس ضروری وقت میں یہ بھی چاہئے کہ نئی زندگی پائے۔ شروع وقت کو کسی اچھے کام سے سجائیں کہ سارا دن اچھی طرح گزرے۔ اس کام میں ۵ گھڑی سے کم خرچ نہ ہو (دو گھنٹے ہوئے) اور اسے ابواب مقاصد کی کنجی سمجھے +

بدن کا بھی تھوڑا سا خیال چاہئے۔ اس کی خبر گیری اور لباس پر توجہ کرنی چاہئے۔ مگر اس میں ۳ گھڑی سے زیادہ نہ لگے +

پھر دربار عام میں عدل کے دروازے کھول کر ستم رسیدوں کی خبر گیری کریں۔ گواہ اور قسم حیلہ گروں کی دست آویز ہے۔ اس پر اعتماد نہ کرنا چاہئے۔ تقریروں کے اختلاف اور قیافوں کے انداز سے اور نئی جستجوؤں سے اور بڑی بڑی حکمتوں سے مطلب کا کھوج لگانا چاہئے۔ یہ کام ڈیڑھ پہر سے کم نہ ہوگا + دنیا عالم تعلق ہے۔ تھوڑا کھانے پینے میں بھی مصروف ہونا ضرور ہے کہ کام اچھی طرح ہو سکے۔ اس میں دو گھڑی سے زیادہ نہ لگائینگے +

پھر عدالت کی بارگاہ کو بلندی بخشینگے۔ جن بے زبانوں کے دل کا حال کوئی کہنے والا نہیں۔ ان کی خبر لیں۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ اُونٹ۔ خچر وغیرہ کو ملاحظہ کریں۔ اس بے تکلف مخلوق کے کھانے کھلانے کی بھی خبر لینی واجب ہے ۴ گھڑی اس کے لئے جدا کرنی چاہئے +

پھر محلوں میں جایا کریں۔ اور جو پاکدامن بیبیاں وہاں حاضر ہوں۔ ان کی عرض معروض سُنیں۔ کہ مرد۔ عورت برابر اور انصاف سب پر شامل رہے +

بدن ہڈیوں کی عمارت ہے۔ نیند پر اس کی بنیاد رکھی ہے۔ اس نیّت سے کہ طاقت اور شکرانہ مل کر کارگزاری کریں۔ اڑھائی پہر نیند کو دینے چاہئیں۔ ان ہاتیوں سے اہل شرف نے سعادت کا سرمایہ سمیٹا۔ اور سخت بیداری کا آئین ہاتھ آیا +

معافی جزیہ ومحصول

تمام احکام اکبری میں جو حکم سنہری حرفوں سے لکھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ ۹۷۰ھ کے پس وپیش میں

جزیہ اور چنگی کا محصول معاف کر دیا جس کا محاصل کئی کروڑ روپیہ ہوتا تھا +

گنگ محل

گفتگو ہوئی کہ انسان کی طبعی اور مادری زبان کیا ہے؟ خدا کے ہاں سے کیا مذہب لے کر آتے ہیں؟ اور پہلے پہل کیا کلمہ ان کی زبان سے نکلتا ہے۔ ۹۸۸ھ میں اس کی تحقیق کے لئے شہر سے الگ ایک وسیع عمارت بنوائی۔ تقریباً ۲۰ بچے پیدا ہوتے ہی ماؤں سے لے لئے۔ اور وہاں لے جا کر رکھا۔ انائیں۔ پالنے والی۔ خدمت گزار۔ کیا عورتیں کیا مرد سب گونگے ہی رکھے کہ گفتگوئے انسانی کی آواز تک کان میں نہ جائے۔ آرام و آسائش کے سامان کمال فارغ البالی کے ساتھ موجود تھے۔ مقام کا نام **گنگ محل** تھا۔ چند سال کے بعد آپ وہاں گئے۔ خدمتگاروں نے بچوں کو لا کر آگے چھوڑا۔ چھوٹے چھوٹے تھے۔ چلتے۔ پھرتے۔ کھیلتے۔ کودتے۔ بولتے بھی تھے۔ مگر بات کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ جانوروں کی طرح غائیں بائیں کرتے تھے۔ گنگ محل میں پلے تھے۔ گونگے نہ ہوتے تو کیا ہوتے۔ **الاسماء تنزل من السماء** +

التزام دوازدہ سالہ

اکبر کے کاروبار کے عمل درآمد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعض ایجاد اس کے رفع قباحت یا باعث آسائش۔ یا فائدہ کی نظر سے ہوتے تھے۔ بعض فقط مضامین شاعرانہ تھے بعض اس خیال سے تھے کہ مختلف بادشاہوں سے خاص خاص باتیں یادگار ہیں۔ یہ بات ہماری بھی یادگار رہے۔ چنانچہ ۹۸۸ھ میں خیال آیا کہ ہمارے بزرگوں نے ۱۲-۱۲ سال کا ایک ایک مجموعہ کر کے ہر سال کا ایک ایک نام رکھا ہے۔ آئین باندھنا چاہئے۔ کہ ہم اور ہمارے جاں نثار ہر سال میں اس کے مناسب حال ایک خاص کام کا التزام رکھیں:۔

سچقائیل	چوہے کو نہ ستائیں (سچقان = موش)
اودئیل	گائے بیل کو پرورش اور کسانوں کو دان پُن کر کے مدد کریں (اود = گاؤ)
پارس ئیل	نہ چیتے کو شکار کریں۔ نہ چیتے سے شکار کریں۔ (پارس = پلنگ)
توشقائیل	نہ خرگوش کھائیں نہ اُس کا شکار کریں (توشقان = خرگوش)
لوئی ئیل	مچھلی سے وہی معاملہ رہے (لوئی = مگرمچھ)

ییلانیل	سانپ کو نہ آزار دیں (ییلان = مار)
آیت ئیل	نہ گھوڑوں کو ذبح کریں نہ کھائیں۔ خیرات میں دیں (آت = گھوڑا)
قوی ئیل	بکری سے یہی سلوک رہے (قوی = بکری)
پیچی ئیل	بندر کا شکار نہ کریں۔ جسکے پاس ہو جنگل میں چھوڑ دے (پچی = بندر)
تخاقوئیل	مرغا نہ ماریں۔ نہ لڑائیں (تخاقو = مرغا)
ایت ئیل	کتے کے شکار سے دل نہ بہلائیں۔ اس وفادار کو آرام دیں خصوصاً بازاری کو (ایت = کتا)
تنگوزئیل	سؤر کو نہ ستائیں (تنگز = سؤر)

چاند کے مہینوں میں امورات مفصلہ ذیل کا لحاظ رکھیں

محرم	جاندار کو نہ ستاؤ		اپنے ہم سال کیلئے دستگیری کرو۔
صفر	بندی آزاد کر دو	شعبان	کسی پر سختی نہ کرو
ربیع الاوّل	۳۰ نیک محتاج شخصوں کو بخشش کرو	رمضان	اپاہج کو کھلاؤ۔ پہناؤ
ربیع الثانی	غسل کر کے خوشحال ہو۔	شوال	ہزار دفعہ نام الٰہی ورد کرو
جمادی الاوّل	لباس فاخرہ اور ابریشمیں کپڑے پہنو	ذیقعدہ	اوّل شب جاگتے رہو اور چند غیر مذہب
جمادی الثانی	چمڑا کام میں نہ لاؤ		آدمیوں کو سلوک کرنے کے لئے خوش کرتے رہو
رجب	۴ برس کی دستگاہ کے بموجب	ذالحجہ	آسائش خلق کے لئے عمارت بناؤ

مردم شماری — سنہ ۹۸۹ھ میں حکم ہؤا کہ تمام جاگیردار عامل۔ شقدار وغیرہ وغیرہ سب مل کر مردم شماری۔ نام بنام بہ قید پیشہ و حرفہ وغیرہ مرتب کریں +

خیر پورہ۔ دھرم پورہ — شہروں اور منزلوں میں جابجا دو دو مقام مقرر ہوئے۔ کہ ہندو مسلمان وہاں کھانا کھائیں۔ اور سامان آسائش سے آرام پائیں۔ مسلمانوں کے لئے خیر پورہ۔ ہندوؤں کے لئے دھرم پورہ +

شیطان پورہ — سنہ ۹۹۰ھ میں آباد ہؤا۔ اُس کی سیر دیکھنی ہے تو دیکھو صفحہ ۷۷

زنانہ بازار جشن سالانہ کے درباروں کا انداز تم نے دیکھ لیا ہے۔ اُس کے بازاروں کا تماشا محلوں کی بیگمات کو بھی دکھایا۔ ۹۹۱ھ میں یہ آئین قرار پایا دیکھو صہ ۱۵۳

ترقی اجناس مختلف اشیاء جو مہمات سلطنت میں اجزائے ضروری بلکہ ہمیشہ کاروبار کے لازمی اوزار ہوتے ہیں وقت پر تیار نہیں ملتیں۔ اس لئے ۹۹۰ھ میں حکم دیا کہ ایک ایک کی حفاظت اور ترقی اور عمدہ اقسام کا بہم پہنچانا ایک ایک امیر کے ذمہ ہو۔ اس سپردگی میں مناسبتِ حال بلکہ ظرافت کا گرم مصالح بھی چھڑکا۔ نمونہ کے طور پر چند نام اور نام داروں کے کام لکھتا ہوں:۔

عبدالرحیم خانخاناں — گھوڑے کی نگہداشت

راجہ ٹوڈرمل — ہاتھی اور غلہ

مرزا یوسف خاں — خان اعظم کے بڑے بھائی کو اونٹ کی نگہداشت سپرد کی۔ شاید اس میں یہ اشارہ ہو کہ اس گھرانے کا ہر شخص عقل کا اونٹ ہے +

شریف خاں — بھیڑ۔ بکری۔ اعظم خاں کے چچا تھے۔ بھیڑ بکری کیا بلکہ دنیا کے جانور اس خاندان کی اُمت تھے +

شیخ ابوالفضل — پشمینہ

نقیب خاں — کتابت

قاسم خاں میر بحر و میر بر — پھول۔ پتی۔ جڑی۔ بوٹی وغیرہ نباتات ان کے سپرد ہوئی۔ مطلب یہ کہ جنگل اور دریا کے سامان خوب بہم پہنچینگے۔ دونوں میں انہی کی بادشاہی ہے +

حکیم ابوالفتح — مسکرات۔ مطلب یہ کہ حکیم ہیں، اس میں بھی حکمتیں نکالیں

راجہ بیربر — گائے بھینس۔ اس میں اشارہ تھا کہ گائے بھینس کی رکھیا تمہارا دھرم ہے۔ اور بھینس اس کی بہن ہے لطف یہ ہے۔ کہ صورت دیکھو تو خود ایک جاموش اکبری ہے +

کشمیر میں کشتیوں کی عمدہ تراشیں

۹۹۷ھ میں لشکر اور امرائے لشکر اور بیگمات سمیت گلگشت کشمیر کو گئے۔ دریا اور تالابوں میں ۳۰ ہزار کشتی سے زیادہ چلی جاتی تھی۔ مگر بادشاہی نشست کے لائق ایک بھی نہ تھی۔ بنگالے کی کشتیاں اور ان کے نشیمن اور مکانات اور بالاخانے اور کھڑکیوں کی عمدہ تراشیں دیکھی تھیں۔ ان کے نمونے پر ہزار کشتی چند روز میں تیار ہو گئی۔ اور امرا نے بھی اس طرح پانی پر گھر بنائے۔ دریا پر ایک آباد شہر چلنے لگا۔

جہاز

۱۰۰۲ھ میں دریائے راوی کے کنارے پر جہاز تیار ہوا۔ ۳۵ گز الٰہی کا مستول تھا۔ ۲۹۳۶ بڑے بڑے شہتیر سال اور ناجود کے ۔۸۰۰ ۴۶۸ من دو سیر لوہا خرچ ہوا۔ ۴۰۰ ۲ بڑھئی اور لوہار وغیرہ اس میں کام کرتے تھے۔ جب تیار ہوا تو جہاز سلطنت کا ناخدا کنارے آکر کھڑا ہوا۔ جر ثقیل کے عجیب و غریب اوزار لگائے۔ ہزار آدمی نے ہاتھ پاؤں کا زور لگایا۔ ۱۰ دن میں بڑی مشکل سے پانی میں ڈال کر لاہری بندر کو روانہ کیا۔ جہاز کے بوجھ اور دریا کی کم آبی کے سبب سے جا بجا رُک رُک گیا۔ اور بڑی مشکل سے بندر مقصود تک پہنچا۔ اس زمانہ میں ایسے روشن دماغ اور یہ سامان کہاں تھے۔ جو دریا کا زور بڑھا کر گزرگاہ کو جہاز رانی کے قابل کر لیتے۔ اس لئے آمد و رفت جاری نہ ہوئی۔ اگر امرائے عہد اور اس کے جانشین بھی ویسے ہی ہوتے تو کام چل نکلتا۔

۱۰۰۴ھ میں ایک اور جہاز تیار ہوا۔ اس میں پانی کی کمی کا لحاظ رکھ کر جہاز کے بوجھ کی رعایت کی گئی۔ پھر بھی ۱۵ ہزار من سے زیادہ بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ یہ لاہور سے لاہری تک آسان جا پہنچا۔ اس کا مستول ۳۷ گز کا تھا

۱۶۳۳۸ روپے کی لاگت میں تیار ہوا تھا (دیکھو اکبرنامہ)

اکبر کی تحصیل علمی۔ اور شوق علمی

سلاطین و امراء کے بچوں کے لئے ایشیائی ملکوں میں پڑھنے لکھنے کی عمر

چھ سات برس سے زیادہ نہیں۔ جہاں گھوڑے پر چڑھنے لگے۔ چوگان بازی شروع ہوئی۔ پھر شکار ہونے لگے۔ شکار کھیلتے ہی کھُل کھیلے۔ اب پڑھنا کجا چند روز میں ملک و دولت کے شکار پر گھوڑے دوڑنے لگے۔

اکبر جب ۴ برس ۴ مہینے ۴ دن کا ہوا تو ہمایوں نے بیٹے کی بسم اللہ کی۔ ملا عصام الدین ابراہیم کو آخوندی کا اعزاز ملا۔ چند روز کے بعد سبق سُنا تو معلوم ہوا کہ اللہ اللہ۔ ہمایوں نے جانا کہ اس ملا نے توجہ نہیں دی۔ لوگوں نے کہا کہ مُلا کو کبوتر بازی کا بہت شوق ہے۔ شاگرد کا دل بھی کبوتروں میں ہوائی ہو گیا۔ ناچار مُلا بایزید کو مقرر کیا۔ مگر نتیجہ کچھ نہ حاصل ہوا۔ ان دونوں کے ساتھ مولانا عبد القادر کا نام شامل کر کے قرعہ ڈالا۔ اس میں مولانا کا نام نکلا۔ چند روز وہ پڑھاتے رہے۔ غرض جب تک کابل میں رہا اپنے دلی شوق سے شہسواری شتر دوانی۔ سگ تازی۔ کبوتر بازی میں اُلجھا رہا۔ ہندوستان میں آکر بھی وہی شوق رہے۔ ملا پیر محمد۔ بیرم خاں خانخاناں کے وکیل تھے۔ جس وقت حضور کی طبیعت حاضر ہوتی اور خیال آتا۔ تو برائے نام ان کے سامنے بھی کتاب لے بیٹھتے ۹۶۳ھ میں میر عبد اللطیف قزوینی سے دیوان حافظ وغیرہ پڑھنا شروع کیا۔ ۹۸۷ھ میں علماء کے جھگڑے سُن سُن کر زبان عربی کی بھی ہوس ہوئی۔ اور صرف ہوائی شروع کی۔ شیخ مبارک اُستاد ہوئے۔ مگر اب بچپن کا مغز کہاں سے آئے۔ خیر یہ بھی ایک ہوا تھی۔ چند روز میں بدل گئی۔ ایک لطیفہ اکثر اشخاص کی زبانی سُنا۔ مگر کتاب میں نہیں دیکھا۔ چونکہ مشہور ہے۔ آمدِ سخن کے طور پر لکھا جاتا ہے۔ ایک دن خلوت کا دربار ہوا۔ اراکینِ خاص موجود۔ ایلچی توران مراسلت گذرانتا ہے۔ اُس نے ایک کاغذ پیش کر کے اکبر کی طرف بڑھایا کہ قبلۂ عالم ملاحظہ فرمایند۔ فیضی نے اُس کے ہاتھ سے لے لیا کہ پڑھے۔ وہ ایک انداز سے مُسکرایا۔ اور نگاہوں سے طنز بے علمی کے اشارے ٹپکتے تھے۔ فیضی فوراً بولے۔ در حضرتِ ماسخن مگوئید۔ مگر نشنیدید کہ پیغمبرِ ما صلوٰۃ اللہ علیہ ہم اُمّی بودہ۔

ہندوستان کے مؤرخ کہ تمام دولت چغتائی کے نمک خوار تھے۔ عجیب عبارتوں سے اس کی بے علمی کو جلوے دیتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں۔ حقیقت معنوی

پر عالم صورت کے علوم کا پردہ نہ ڈالا تھا۔ کبھی کہتے ہیں پروردگار کو ثابت کرنا تھا۔ کہ یہ برگزیدہ الٰہی بے تحصیل علوم ظاہری کے ہمارے فیوضات نامتناہی کا منبع ہے۔ کبھی کہتے ہیں۔ اس میں حکمت الٰہی یہ تھی کہ اہلِ علم پر روشن ہو جائے کہ اکبر بادشاہ خدا آگاہ کی عقل و دانش خداداد ہے۔ بندہ سے حاصل کی ہوئی نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب کچھ تھا مگر علم کا مذاق بلکہ علوم و فنون کا شوق اور قدردانی کا جوش جو اس کو تھا۔ کوئی عالم بادشاہ بھی ہو تو شاید اتنا ہو۔ ذرا **عبادت خانہ چار ایوان** کے جلسے یاد کرو۔ راتوں کو ہمیشہ کتابیں پڑھواتا تھا۔ اور سُنتا تھا۔ علمی تحقیقیں تھیں۔ علمی باتیں تھیں۔ اور علمی چرچے تھے۔ کتب خانہ کئی جگہ تقسیم تھا۔ کچھ حرم سرا میں۔ کچھ باہر۔ اس میں دو تقسیمیں تھیں۔ علوم و فنون۔ نثر۔ نظم۔ ہندی۔ فارسی۔ کشمیری۔ عربی الگ الگ تھیں۔ اسی انتظام سے سال بسال موجودات لی جاتی تھی۔ عربی کا نمبر سب سے اخیر تھا۔ اہلِ دانش وقت معمولی پر کتابیں سُناتے تھے۔ اور وہ بھی جس کتاب کو سنتا تھا۔ ایک صفحہ بھی نہ چھوڑتا تھا۔ پڑھتے پڑھتے جہاں پر ملتوی کرتے تھے۔ وہاں اپنے ہاتھ سے نشان کر دیتا تھا۔ اور جب کتاب ختم ہوئی تو پڑھنے والے کو بحساب صفحات جیب خاص سے انعام ملتا تھا۔

مشہور کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو گی۔ جو اس کے سامنے نہ پڑھی گئی۔ کوئی تاریخی سرگذشت۔ اکثر فقہی مسائل۔ علوم کے عمدہ مباحثے۔ فلسفہ و حکمت کے نکتے ایسے نہ تھے جن میں وہ خود بحث اور گفتگو نہ کر سکتا ہو۔ کتاب کے دوبارہ سننے سے اُکتاتا نہ تھا۔ بلکہ اور بھی دل لگا کر سُنتا تھا۔ اور اس کے مطالب پر گفتگو کرتا تھا۔ اخلاق ناصری۔ کیمیائے سعادت سینکڑوں مسئلے فقہ کے اور اس میں اختلاف علمائے کی زبانی یاد تھے۔ تاریخی معلومات میں ایک جامع الاخبار کتاب بلکہ کتب خانہ تھا۔ ملّا صاحب منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں **حکایت** سلطان شمس الدین التمش کے باب میں مشہور ہے کہ وہ ہیز تھا۔ اور اصل اس کی یہ ہے کہ اس نے ایک دفعہ کسی خوبصورت صاحبِ جمال لونڈی سے صحبت کرنی چاہی کچھ نہ ہو سکا۔ اور چند دفعہ ایسا ہی ارادہ کیا۔ مگر خالی گیا۔ ایک دن وہی لونڈی اس

کے سر میں تیل مل رہی تھی۔ معلوم ہؤا کہ کئی بوندیں سر پر ٹپکی ہیں۔ بادشاہ نے سر اُٹھا کر دیکھا اور رونے کا سبب پوچھا۔ بڑے اصرار سے بتایا کہ مجھے یاد ہے بچپن میں میرا ایک بھائی تھا اور آپ کی طرح اس کے بھی سر کے بال اُڑے ہوئے تھے۔ اُسے یاد کر کے میرے آنسو نکل پڑے۔ جب تحقیق کیا کہ یہ تباہی زدہ کیونکر آئی تھی اور کہاں سے آئی تھی تو معلوم ہؤا کہ بادشاہ کی حقیقی بہن تھی۔ خدا نے اس نیک نیت بادشاہ کو اس طرح گناہ سے بچایا۔ بعد اس کے ملا صاحب لکھتے ہیں کہ راقم اوراق کو خلیفۂ آفاق اکبر بادشاہ اکثر خلوت گاہ میں رات کو بلا لیتے تھے۔ اور گفتگوئے زبانی سے اعزاز بڑھایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ فتح پور میں اور ایک دفعہ لاہور میں فرمایا کہ یہ نقل سلطان غیاث الدین بلبن کی ہے اور کچھ زیادہ نکتے بھی بیان فرمائے۔ قابوس نامہ۔ ملفوظات شیخ شرف الدین منیری حدیقہ حکیم سنائی مثنوی معنوی۔ جام جم۔ شاہنامہ۔ خمسۂ نظامی۔ کلیات امیر خسرو۔ کلیات جامی۔ دیوان خاقانی انوری وغیرہ وغیرہ اور ہر قوم کی تاریخیں اس کے سامنے بلاناغہ پڑھی جاتی تھیں۔ اور گلستاں بوستاں سب سے زیادہ +

ترجمہ کا سر رشتہ خاص تھا۔ مختلف زباں داں نوکر تھے۔ سنسکرت یونانی۔ عربی کی کتابیں۔ فارسی اور بھاشا میں ترجمہ کرتے تھے۔ جہاں یہ صاحب زباں بیٹھتے تھے اس مقام کا نام مکتب خانہ تھا۔ زیچ جدید مرزا الغ بیگ کا ترجمہ میر فتح اللہ شیرازی کے اہتمام سے ہؤا۔ کشن جوتشی۔ گنگا دھر۔ مہیش مہانند بھی اس میں شامل تھے کہ سنسکرت سے مدد کرتے تھے +

تفصیل کتابوں کی جو اکبر کی فرمائش سے یا اسکے عہد میں لکھی گئیں

کتابیں جو اس کی فرمائش سے تصنیف ہوئیں۔ اب تک اہل نظر اُن میں سے مطالب کے پھول اور فواید کے میوے چن چن کر دامن بھرتے ہیں۔ اُستاد مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

روز اس گلشن رخسار سے لے جاتے ہیں	اپنے دامن نظر مردم بینا بھر کر

سنگھاسن بتیسی۔ کی پتلیوں کو بادشاہ کی فرمائش سے ۹۸۲ھ میں ملا عبد القادر بدایونی نے فارس کے کپڑے پہنائے اور نامۂ خرد افزا اس کا تاریخی نام ہوا +

حیوۃ الحیوان عربی میں تھی۔ اکبر پڑھوا کر اس کے معنی سُنا کرتا تھا۔ ۹۸۳ھ میں ابو الفضل سے فرمایا کہ اس کا فارسی میں ترجمہ ہو۔ چنانچہ شیخ مبارک نے لکھ دیا دیکھو اس کا حال +

اتھر بن بید۔ ۹۸۳ھ میں شیخ بھاون ایک برہمن دکن سے آکر اپنی خوشی سے مسلمان ہوا۔ اور خواصوں میں داخل ہوا۔ اُسے حکم ہوا کہ اس کا ترجمہ کرواؤ۔ یہ چوتھا بید ہے۔ فاضل بدایونی کو لکھنے کی خدمت سپرد ہوئی۔ اکثر عبارتیں ایسی مشکل تھیں کہ معنی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے عرض کی۔ اوّل شیخ فیضی کو پھر حاجی ابراہیم کو یہ خدمت سپرد ہوئی۔ مگر وہ بھی نہ لکھ سکے۔ آخر ملتوی رہا۔ بلوکمین صاحب آئین اکبری کے ترجمے میں لکھتے ہیں ترجمہ ہوگیا تھا +

کتاب الاحادیث۔ ملا صاحب نے ثواب جہاد اور ثواب تیر اندازی میں لکھی اور نام بھی تاریخی رکھا۔ ۹۸۶ھ میں اکبر کو نذر گزرانی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۹۷۶ھ میں ملازمت سے پہلے اپنے شوق سے لکھی تھی۔ ان کا قلم بھی نچلا نہ رہتا تھا۔ آزاد کی طرح کچھ نہ کچھ کئے جاتے تھے۔ لکھتے تھے۔ ڈال رکھتے تھے +

تاریخ الفی۔ ۹۹۰ھ میں فرمایا کہ ہزار سال پورے ہو گئے۔ کاغذوں میں سنہ الف لکھے جاتے ہیں۔ وقائع عالم کا ہزار سالہ حال لکھ کر اس کا نام تاریخ الفی رکھنا چاہیئے تفصیل دیکھو عبد القادر کا حال۔ شیخ ابو الفضل لکھتے ہیں کہ دیباچہ میں نے لکھا +

رامائن۔ ۹۹۳ھ میں ملا عبد القادر بدایونی کو حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کرو۔ چند پنڈت ساتھ کئے۔ ۹۹۷ھ میں ختم ہوئی ضخامت ۱۲۰ جز ہوئی۔ کل کتاب کے ۲۵ ہزار اشلوک ہیں۔ فی اشلوک ۶۵ حرف۔ مہابھارت کو بھی انہی پنڈتوں نے ترجمہ کروایا تھا +

جامع رشیدی۔ ۹۹۳ھ میں ملا عبد القادر کو حکم ہوا کہ شیخ ابو الفضل کی صلاح سے اس کا خلاصہ کرو۔ وہ ایک مجلد ضخیم ہے +

توزک بابری - کہ عقل عملی کا قانون ہے۔ ۹۹۷ھ میں عبد الرحیم خان خاناں نے حسب الحکم ترکی سے فارسی میں ترجمہ کر کے نذر گزرانی اور بہت پسند آئی۔

تاریخ کشمیر - راج ترنگنی کا ذکر آیا۔ وہ کشمیر کے عہدِ قدیم کی تاریخ زبان سنسکرت میں ہے۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی[1] ایک فاضل جامع معقول و منقول تھے۔ انہیں حکم دیا تھا کہ اس کا ترجمہ لے کر کشمیر کی تاریخ لکھو۔ تیار ہوئی تو عبارت پسند نہ آئی۔ ۹۹۹ھ میں ملا صاحب کو حکم دیا کہ سلیس اور برجستہ عبارت میں لکھو انہوں نے دو مہینے میں لکھ دی۔

معجم البلدان - ۹۹۹ھ میں حکیم ہمام نے کتاب مذکور کی بہت تعریف کی اور کہا کہ فوائد عجیب اور حکایات غریب پر مشتمل ہے ترجمہ ہو جائے تو خوب ہے۔ دو سو جز کی کتاب تھی۔ دس بارہ شخص ایرانی و ہندوستانی جمع کئے۔ اور کتاب کے ٹکڑے کر کے بانٹ دی۔ چند روز میں تیار ہو گئی۔

نجات الرشید - ۹۹۶ھ میں خواجہ نظام الدین بخشی کی فرمائش سے ملا عبد القادر نے لکھی نام تاریخی ہے۔

مہابھارت - سنہ الف میں ترجمہ شروع ہوا۔ بہت سے مصنف اور مترجم مصروف رہے تیار ہو کر با تصویر لکھی گئی۔ اور مکرر لکھی گئی۔ رزم نامہ نام پایا۔ شیخ ابو الفضل نے اس پر دیباچہ لکھا۔ تقریباً ۲ جز ہونگے۔

طبقات اکبر شاہی - سنہ الف تک لکھی گئی آگے نہ چلی۔

سواطع الالہام - ۱۰۰۲ھ میں شیخ فیضی نے ایک تفسیر بے نقط لکھی ۷۵ جز ہیں۔ دیکھو فیضی کا حال۔

موارد الکلم - یہ بھی فیضی نے لکھی۔ بے نقط ہے۔

نلدمن - ۱۰۰۳ھ میں اکبر نے شیخ فیضی کو حکم دیا کہ پنج گنج نظامی پر پنج گنج لکھو۔ اُنہوں نے ۴ مہینے میں اول نل دمن کہہ کر گزرانی۔ دیکھو فیضی کا حال۔

لیلاوتی - ایک حساب کی کتاب ہے فیضی نے سنسکرت سے فارسی کے قالب میں ڈھالی۔ دیکھو فیضی کا حال۔

[1] یہ شاہ آباد علاقہ کشمیر میں ہے۔ سرینگر دار الحکومت سے ۳ منزل ادھر۔

بحر الاسماء - ۹۸۰ھ میں ایک ہندی افسانے کو ملا عبد القادر بدایونی سے درست کروایا۔ جس نے بحر الاسماء نام پایا۔ اصل ترجمہ سلطان زین العابدین بادشاہ کشمیر کے حکم سے ہوا تھا۔ بڑی فربہ اور ضخیم کتاب ہے۔ اب نہیں ملتی +

مرکز ادوار - خمسۂ مذکور میں سے یہ کتاب بھی فیضی نے لکھی تھی۔ مرنے کے بعد ایک بیاض میں متفرق اشعار مسودہ کے طور پر نکلے۔ ابو الفضل نے اُنہیں ترتیب دے کر صاف کیا۔ دیکھو فیضی کا حال +

اکبر نامہ - ۴۰ برس کا حال اکبر کا ہے۔ اور آئین اکبری اس کا حصہ دوم کل ابو الفضل نے لکھا۔ دیکھو ابو الفضل کا حال +

عیار دانش - قصۂ کلیلہ و دمنہ ابو الفضل نے لکھا۔ دیکھو ابو الفضل کا حال +

کشکول - شیخ ابو الفضل نے سیاحت نظر کے عالم میں جو جو کتابوں میں دیکھا اور پسند آیا۔ انتخاب کے طور پر لکھا۔ اسی مجموعہ کا نام کشکول ہے۔ اکثر علمائے صاحب نظر کا قاعدہ ہے کہ جب مختلف کتابوں کی سیر کرتے ہیں۔ تو ان میں سے یادداشتیں لکھتے جاتے ہیں۔ چنانچہ شیخ حرّ عاملی۔ شیخ بہاؤ الدین۔ سید نعمت اللہ جزائری۔ شیخ یوسف بحرانی وغیرہ اکثر علما کے کشکول ہیں۔ اور ایران میں چھپ گئے ہیں +

تاجک - علم ہیئت میں ایک کتاب تھی۔ مکمل خاں گجراتی نے حسب الحکم اس کا فارسی میں ترجمہ کیا +

ہری بنس - اس میں سری کرشن جی کا حال ہے۔ ملا شیری نے حسب الحکم فارسی میں ترجمہ کیا +

جو تنش - خان خاناں نے جوتنش میں ایک مثنوی لکھی۔ ہر بیت میں ایک مصرع فارسی ایک سنسکرت +

ثمرۃ الفلاسفہ - عبد الستار ابن قاسم کی تصنیف ہے۔ اکبری تاریخ میں شہرت کی سرخی اس کے نام پر نہیں نظر آتی۔ مصنف خود دیباچہ میں لکھتا ہے کہ میں نے چھ مہینے کے عرصے میں زبان مذکور پادری جرونمو شو پر سے حاصل کر لی۔ بول نہیں سکتا۔ مگر مطلب خاصہ نکال لیتا ہوں۔ چنانچہ اُدھر بادشاہ نے

اس کتاب کے ترجمے کا حکم دیا۔ ادھر کتاب تیار ہوگئی۔ مصنف مذکور اور اس کی کتاب ابوالفضل کے اُس فقرے کی تصدیق کرتے ہیں جو اُس نے پادری فرنبتون وغیرہ اہلِ فرنگ کے آنے کے ذکر میں لکھا ہے "یونانی کتابوں کے ترجمے کا سامان بہم پہنچا" کتاب مذکور میں اوّل روما کی تاریخ قدیم کا مختصر بیان ہے۔ پھر مشاہیر اہل کمال کے حالات ہیں۔ انداز عبارت ایسا ہے کہ اگر دیباچہ نہ پڑھو تو تم جانو کہ ابوالفضل یا اُس کے شاگرد کا مسودہ ہے۔ نظرثانی کی نوبت نہ پہنچی ہوگی۔ ۴۸؁ جلوس اکبری میں لکھی گئی۔ ۱۰۱۱؁ھ ہوئے۔ یہ کتاب خلیفہ سید محمد حسن صاحب وزیر پٹیالہ کے کتب خانہ میں میری نظر سے گزری +

خیر البیان - ایک کتاب پیر تاریکی نے لکھی۔ یہ وہی پیر ہے جس نے اپنا نام پیر روشنائی رکھا تھا۔ کوہستان پشاور میں جو وہابی پھیلے ہوتے ہیں وہ اُسی کی اُمت چلے آتے ہیں۔ جو ادھر اُدھر نئے پیدا ہوتے ہیں۔ اُنھیں میں جا ملتے ہیں +

عماراتِ عہدِ اکبر شاہی

۹۶۱؁ھ میں جب ہمایوں ہندوستان پر آیا تو لاہور میں پہنچ کر آپ یہاں ٹھہرا۔ اور اکبر کو باتالیقیِ خان خاناں آگے بڑھایا۔ سرہند کے مقام پر سکندر سور پٹھانوں کا ٹڈی دل لئے پڑا تھا۔ خاں خاناں نے جا کر میدان میں صف آرائی کی۔ اور ہمایوں کو عرضی لکھی۔ وہ بھی جا پہنچا۔ لڑائی بڑے معرکے سے شروع ہوئی۔ اور کئی دن تک جاری رہی۔ جو پہلو اکبر اور بیرم خاں کے سپرد تھا۔ اُدھر سے خوب خوب کارنامے ہوئے۔ اور جس دن شاہزادے کے دھاوے کا دن تھا اُسی دن معرکہ فتح ہوا۔ چنانچہ اس فتح کے تہنیت نامے اُس کے نام سے لکھے گئے۔ خان خاناں نے مقام مذکور کا نام سرمنزل رکھا۔ کہ شاہزادہ کے نام کی پہلی فتح تھی۔ اور ایک کلہ منار یادگار تعمیر کیا +

۹۶۹؁ھ میں خان اعظم شمس الدین محمد خاں اتکہ آگرہ میں شہید ہوئے ان کا

جنازہ دلّی میں بھجوایا۔ اور اس پر مقبرہ بنوایا۔ اُسی تاریخ ادہم خاں اُن کے جرم قتل میں قتل ہُوا۔ اُسے بھی اسی رستے روانہ کیا۔ اس کے چالیسویں کے دن ماہم بیگم اس کی ماں کہ اکبر کی انا تھی بیٹے کے غم میں دُنیا سے کوچ کر گئی۔ اس کا جنازہ بھی وہیں بھیجا کہ ماں بیٹے ساتھ رہیں۔ اور اُن کی قبر پر مقبرۂ عالیشان بنوایا۔ قطب صاحب کے پاس اب تک بھول بھلیاں مشہور ہے +

۹۶۳ھ سال اوّل جلوس میں ہیموں کی مہم فتح ہوئی۔ پانی پت کے میدان میں جہاں لڑائی ہوئی تھی کلہ منار بنایا۔ دیکھو صفحہ ۹ +

نگر چین۔ شہر آگرہ سے ۳ کوس کے فاصلے پر کرائی ایک گاؤں تھا۔ اس دلکشا مقام کی سرسبزی اور سیرابی اکبر کو بہت پسند آئی۔ اکثر سیر و شکار کو وہیں آجاتے تھے۔ اور دل کو شگفتہ کرتے تھے۔ **۹۷۱ھ** میں خیال آیا کہ یہاں شہر آباد ہو۔ چند روز میں پھلے پھولے باغ۔ عالیشان عمارتیں۔ شاہانہ محل۔ پائین باغ۔ دلچسپ مکانات۔ چوپڑ کے بازار۔ اُونچی اُونچی دکانیں۔ بلند بالا خانے تیار ہو گئے۔ امرائے دربار اور اراکین سلطنت نے بھی اپنی اپنی دسترس کے بموجب مکاں۔ حرم سرائیں خانہ باغ تعمیر کئے۔ بادشاہ نے یہیں ایک میدان ہموار مرتب کیا تھا۔ کہ اُس میں چوگان کھیلا کرتے تھے۔ وہ **میدان چوگان بازی** کہلاتا تھا۔ شہر مذکور اپنی بینظیر لطافتوں اور عجیب و غریب ایجادوں کے ساتھ اس قدر جلد تیار ہُوا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ (مُلّا صاحب کہتے ہیں) اور مِٹا بھی ایسا جلد کہ دیکھتے دیکھتے نشان تک نہ رہا۔ مَیں نے خود آگرہ جا کر دیکھا اور لوگوں سے دریافت کیا۔ مقام مذکور اب شہر سے پانچ کوس سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت کی کتابوں میں جو شہر سے تین کوس فاصلہ لکھا ہے۔ اس سے اور وہاں کے خرابوں سے دریافت کر سکتے ہیں۔ کہ جب شہر آگرہ کہاں تک آباد تھا۔ اور اب کتنا رہ گیا ہے +

مسجد و خانقاہ شیخ سلیم چشتی۔ اکبر کی ۲۷-۲۸ برس کی عمر ہو گئی تھی۔ اور اولاد نہ تھی۔ ہوئی تو مر گئی۔ شیخ سلیم چشتی نے خبر دی کہ وارثِ تاج و تخت پیدا ہونے والا ہے۔ اتفاق یہ کہ انہی دنوں محل میں حمل کے آثار معلوم ہوئے۔ اس خیال سے کہ برکات انفاس قریب تر ہو جائے حرم مذکور کو شیخ کے گھر میں بھیج دیا۔ اور

خود بھی وعدہ کے انتظار میں وہیں رہنے لگے۔ اس عالم میں کہ سنہ ۹۷۶ھ تھے شیخ کی پہلی خانقاہ اور حویلی کے پاس کوہ سیکری پر ایک شاہانہ عمارت اور نئی خانقاہ اور نہایت عالیشان مسجد کی تعمیر شروع کی۔ کہ کل سنگین ہے۔ اور ایک پہاڑ ہے کہ پہاڑ پر دھرا ہے۔ مسافران عالم کہتے ہیں کہ ایسی عمارتیں عالم میں کم ہیں۔ تخمیناً ۵ برس میں تیار ہوئی۔ اس کا بلند دروازہ کسی بنئے نے بنوایا تھا +

فتح پور سیکری۔ سنہ ۹۷۹ھ میں حکم ہوا کہ دیوان دولت اور شبستانِ حشمت کے لئے قصر ہائے عالی تعمیر ہوں۔ اور تمام امرا درجۂ اعلیٰ سے لے کر ادنےٰ تک سنگین اور گچکاری کی عمارتوں سے محل اور مکان آراستہ کریں۔ سنگین اور چوڑے چوپڑ کے بازار۔ اوپر ہوادار بالاخانے۔ نیچے مدرسے خانقاہیں اور حمام گرم ہوں۔ شہر میں خانہ باغ۔ باہر باغ لگیں۔ شرفا و غربا ہر پیشہ کے لوگ آباد ہو کر دلچسپ مکانوں اور دلکش دکانوں سے شہر کی آبادی بڑھائیں۔ گرد شہر کے پتھر اور چونے کی فصیل کا دائرہ کھینچیں۔ ۱۲ کوس کے فاصلے پر مریم مکانی کے محل اور باغ دلکشا تھا۔ بابر نے بھی رانا پر یہیں فتح پائی تھی۔ اکبر نے مبارک شگون سمجھ کر فتح آباد نام رکھا تھا پھر فتح پور مشہور ہو گیا۔ اور بادشاہ کو بھی یہی منظور ہو گیا۔ الاسماء تنزل من السماء۔ چاہتا تھا کہ یہی دارالخلافہ ہو جائے۔ خدا نے نہ چاہا۔ سنہ ۹۸۵ھ میں حکم دیا کہ ٹکسال بھی یہیں جاری ہو چنانچہ ۵ گوشہ روپے پہلے وہیں سے نکلے +

بنگالی محل۔ اور ایک اور محل اسی سنہ میں آگرہ میں تیار ہوا۔ قاسم ارسلان نے دونوں کی تاریخ کہی ہے

تمام شد دو عمارت لبسانِ خلدِ بریں — بدورِ دولتِ صاحبقراں ہفت اقلیم
یکے بہ بلدۂ دارالخلافۂ آگرہ — دگر بہ خطۂ سیکری مقام شیخ سلیم
سپہر از پئے تاریخ ایں دو عالی قصر — رقم زدہ دو بہشت بریں بکلکِ قدیم

قلعہ اکبر آباد۔ آگرہ کو زیادہ تر سکندر لودی نے آباد کیا اور ایسا بڑھایا چڑھایا کہ اینٹ پتھر چونے سے قلعہ تیار کر کے دارالسلطنت بنا دیا۔ اس وقت دونوں طرف شہر آباد تھا۔ بیچ میں جمنا بہتی تھی۔ قلعہ شہر کے مشرق پر تھا۔ سنہ ۹۷۳ھ میں اکبر نے حکم دیا کہ قلعہ کو سنگین بنائیں۔ اور سنگِ سرخ کی سلیں تراش تراش کر لگائیں۔ دو طرفہ

گچ اور پتھر سے مستحکم عمارتیں بنیں۔ مُلّا صاحب فرماتے ہیں ۳ سیر غلّہ سر جریب تمام ولایت پر لگادیا محصّل پہنچے اور امرائے جاگیر دار کی معرفت وصول کر لائے ۵ برس میں تیار ہوگیا۔ عرض دیوار ۳۰ گز۔ ارتفاع ۶۰ گز۔ ۴ دروازے۔ خندق عمیق۔ پانی تک کہ ۱۰ گز تک نکل آیا تھا۔ تین چار ہزار آدمی کی مدد روز لگتی تھی۔ اب بھی طول میں جمنا کے کنارے تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں۔ کہ یہ قلعہ بھی اپنا نظیر نہیں رکھتا[1]۔ **شیخ فیضی** نے دروازے کی تاریخ کہی: بنائے در بہشت

پھر ملّا صاحب کہتے ہیں قریب ۳ کروڑ کے لاگت ہے اور ہندوستان بھر کے روپے کو چھاتی پر لئے بیٹھا ہے۔ کاریگر معمار۔ سنگتراش نزاکت کار۔ مصوّر جادو نگار۔ کُمہار مزدور وغیرہ وغیرہ ۴ ہزار آدمی کی مدد روز جاری تھی دولتخانہ خاص میں سنگتراشوں کی منبّت اور پچی کاری اور مصوّروں کی سحر نگاری نے آیندہ ایجاد کے لئے جگہ نہیں چھوڑی۔ اس لئے تاریخ ہوئی۔ بنائے قلعہ شد بہر زر۔ اس کے عالیشان دروازے کے دونوں طرف دو ہاتھی پتھر کے تراش کر کھڑے کئے تھے۔ کہ آمنے سامنے سونڈیں ملا کر محراب بناتے تھے اور سب اُس کے نیچے سے آتے جاتے تھے۔ اس کا نام **ہتیا پول** تھا۔ (پول بمعنی دروازہ) اسی پر نقارہ خانۂ دربار تھا۔ ملّا شیری نے تاریخ کہی ہے

کلک شیری پئے تاریخ نوشت		بے مثال آمدہ دروازۂ فیل	

اب نقارہ نہ رہا۔ صاحبِ نقّارہ نہ رہے۔ نقار خانہ بے فائدہ چیز تھی۔ سرکار نے اُسے گرا کر پتھر بیچ ڈالے۔ دروازہ باقی ہے۔ ہاتھی بھی نہ رہے ہتیا پول کا نام باقی ہے۔ اور جامع مسجد اُس کے محاذی واقع ہوئی ہے۔ فتح پور سیکری کے ہتیا پول میں ہاتھی موجود ہیں۔ سونڈیں ٹوٹ گئیں۔ افسوس محراب کا لطف

[1] بدایونی میں مدّت تعمیر ۵ برس اور اکبر نامہ میں ۸ برس لکھتے ہیں اور مقدار عرض اور ارتفاع میں بھی فرق ہے۔ خافی خاں لکھتے ہیں ۹۷۳ھ میں شروع اور ۹۸۰ھ میں تمام ہوا۔ ۳۰ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ انہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ عوام میں یہ خیال ہے کہ اکبر کے عہد سے اسکا نام اکبر آباد ہوا۔ مگر مرزا امینا شاہجہان نامہ میں لکھتا ہے کہ شاہجہان نے دادا کی محبت سے اکبر آباد نام رکھا۔ اس سے پہلے آگرہ ہی مشہور تھا۔

نہ رہا +

ہمایوں کا مقبرہ۔ ۹۷۰ھ میں شہر دہلی میں دریائے جمن کے کنارے پر میرک مرزا غیاث کے اہتمام سے آٹھ نو برس کی محنت سے تیار ہوا۔ تمام سنگین۔ اس کی گلتراشی اور منبت کاری کے لئے پہاڑوں نے اپنے جگر کے ٹکڑے بھیجے۔ اور معماروں نے صنعت کاری کی جگہ جادوگری خرچ کی۔ اب تک دیکھنے والوں کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ مگر حیرت کی نگاہیں نہیں تھکتیں +

عمارات اجمیر۔ ۹۷۷ھ میں پہلے سلیم پیدا ہوا۔ پھر مراد پیدا ہوا۔ بادشاہ شکرانے اور منت بڑھانے کو اجمیر گئے۔ شہر کے گرد قلعہ باندھا۔ امراء کو حکم ہوا کہ تم بھی عالیشان عمارتیں بناؤ۔ سب تعمیل کر کے شکوہ اقبال کی شہ نشینوں میں بیٹھے اور آخرین بادشاہی طرۂ دستار ہوئی۔ شرقی جانب میں بادشاہی دولت خانے تھے تین برس میں سب عمارتیں تیار ہو گئیں +

کوکر تلاؤ کہ خسرو شیریں کار کی توجہ سے **شکر تلاؤ** ہو گیا۔ اس کا افسانہ سننے کے قابل ہے۔ جب ۹۷۸ھ میں شاہزادۂ مراد کی ولادت کے شکرانے ادا کر کے اجمیر سے پھرے تو ناگور کے رستے آئے اور اسی مقام پر ڈیرے ہوئے رعایائے شہر نے حاضر ہو کر عرض کی کہ خشک مُلک ہے اور خلق خدا کی گزران دو تالابوں پر ہے گیلانی تلاؤ شمش تلاؤ کہ کوکر تلاؤ کہلاتا ہے۔ اور بند پڑا ہے۔ بادشاہ نے اُس کی پیمائش کروا کر صفائی امرا پر تقسیم کی۔ اور وہیں مقام کر دیا۔ چند روز میں صاف ہو کر کٹورے کی طرح چھلکنے لگا۔ اور شکر تلاؤ نام پایا۔ کوکر تلاؤ اس لئے کہتے تھے کہ کسی سوداگر کے پاس ایک وفادار کتا تھا۔ اُسے بہت عزیز رکھتا تھا مگر کچھ ضرورت ایسی پڑی کہ ایک شخص کے پاس گرو رکھ دیا۔ چند روز کے بعد اس پر خدا نے کرم کیا کہ دولت و مال سے آسودہ ہو گیا۔ اور اپنی وفا کی گٹھڑی لینے چلا۔ اتفاقاً کُتا بھی اپنی وفا کے جوش میں اس کی طرف چلا تھا۔ مقام مذکور پر ملاقات ہوئی۔ کُتے نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور دُم ہلا کر اس کے پاؤں میں لوٹ گیا۔ اور یہاں تک خوش ہوا کہ دم نکل گیا۔ سوداگر جتنا محبت والا تھا اُس سے زیادہ ہمت والا تھا۔ یہاں پکا تلاؤ بنایا۔ کہ آج تک اس کی ہمت اور کتے کی محبت پر گواہی دیتا ہے +

چاہ و منارہ۔ اکبر نے عہد کیا تھا کہ ہر سال ایک دفعہ اجمیر میں زیارت کو حاضر ہؤا کرونگا۔ ۹۸۱ھ آگرہ سے وہاں تک ہر میل پر ایک کوآں اور ایک منارہ تعمیر کیا۔ اُس وقت تک جتنے ہرن شکار کئے تھے۔ ان کے سینگ جمع تھے۔ ہر منارہ پر لگا کر سراپا شاخ در شاخ کر دیا۔ کہ یہ بھی یادگار رہے۔ مُلّا صاحب اس کی تاریخ **میل شاخ** کہہ کر فرماتے ہیں۔ کاش کہ ان کی جگہ باغ یا سرا بنواتے کہ فائدہ بھی ہوتا۔ **آزاد** کہتا ہے۔ کاش ملّا صاحب کو دے دیتے یونیورسٹی پنجاب ہوتی تو ڈپوٹیشن لے کر پہنچتی کہ ہمیں دے دو۔ ع

عزازیل گوید نصیبے برم +

عبادت خانہ چار ایوان۔ ۹۸۱ھ میں بمقام فتح پور سیکری تعمیر ہؤا۔ دیکھو صفحہ ۱۰۸+

الہ آباد۔ پراگ پر گنگا جمنا دونوں بہنیں گلے ملتی ہیں۔ اُس پانی کے زور کا کیا کہنا جہاں دو محبّت کے دریا ٹکر کھائیں۔ یہ ہندوؤں کے تیرتھ کا مقام ہے۔ ہمیشہ سے یہاں منّتیں مانتے ہیں۔ اور تناسخ کے خیالات میں جانیں دیتے ہیں۔ ۹۸۱ھ میں اکبر پٹنے کی مہم پر جاتا تھا۔ مقام مذکور پر حکم دیا کہ ایک حصار عظیم الشان قلعۂ آگرہ کے نقشے پر تعمیر ہو۔ اور یہ ایجاد زیادہ ہو کہ چار قلعوں میں تقسیم ہو۔ ہر قلعے میں محل۔ مکانات۔ بالاخانے خوشنما طرزوں کے ساتھ مرتب ہوں۔ پہلا قلعہ وہاں ہو جہاں ٹھیک دونوں دریاؤں کی ٹکر ہے۔ اس میں ۱۲ خانہ باغ ہوں۔ ہر باغ میں کئی کئی مکانات دلکشا۔ یہ خاص دولت خانۂ بادشاہی (۲) میں بیگمات اور شاہزادے (۳) اقربائے سلطانی۔ ملازم اور اہل خدمت۔ خاص و عام مہندسانِ تیز ہوش نے اُس کے نقشوں کی تراشیں پیدا کرنے میں ذہن لڑا کر کارنامے دکھلائے اور ساتھ ہی ایک کوس طولانی۔ ۴۰ گز عریض۔ ۴۰ گز بلند بند مستحکم باندھ کر عمارتیں تیار کھڑی کردیں۔ ۲۸ھ جلوس میں عمارت کا کام ختم ہؤا تھا۔ پھر وہ الہ آباد سے الہ باس ہو گیا۔ ارادہ ہؤا کہ اس میں دار الخلافہ قائم کریں امرا نے بھی عمارات عالی تعمیر کیں۔ شہر کی آبادانی اور فراوانی زیادہ ہوئی۔ ٹکسال کا سکّہ بیٹھا۔ شریف سرمدی کا شعر مقبول ہو کر منقوش ہؤا۔ ؎

به شرق و غرب جہاں سکّہ الہ آباد	ہمیشہ چوں زرِ خورشید و ماہ روشن باد

اسی عہد میں چوکی نویسی کا آئین مقرر ہوا تھا۔ چند معتبر منصبدار تھے۔ کہ باری باری سے حاضر ہوتے تھے۔ روزمرہ ساعت بساعت کے احکام لکھتے رہتے تھے۔ وہ چوکی نویس کہلاتے تھے۔ امیر منصبدار۔ احدی جو خدمت پر حاضر ہوتے تھے اُن کی یہ حاضری لکھتے تھے۔ جو سندیں اور چٹھیاں ان کی تنخواہوں کی خزانہ پر ہوتی تھیں اُنہی کی تصدیق سے ہوتی تھیں۔ **محمد شریف** مذکور اور **محمد نفیس** بھی انہی میں تھے۔ ان کی لیاقت بھی بہت خوب تھی۔ اور اکبر کی بھی نظر عنایت تھی۔ اس واسطے حاضر بھی زیادہ رہتے تھے۔ محمد شریف شیخ ابوالفضل کے جلسے کے بھی یار تھے۔ انشائے ابوالفضل کے دفتر دوم میں کئی خط ان کے نام ہیں۔ اور مان سنگھ وغیرہ امرا کے خطوط میں ان کی سفارش بھی کی ہے۔ پھر تو ملّا صاحب کو اُن پر خفا ہونا واجب ہوا۔ چنانچہ سلسلہ تاریخ میں اس مقام پر فرماتے ہیں۔ ان کے باب میں کسی نے شعر بھی کہا ہے ؎

یکے نانفیس و دگر نا شریف	دو چوکی نویس اند ہر دو کثیف

قلعہ تاراگڑھ۔ اسی سال میں زیارت اجمیر کو گئے۔ اور حضرت سید حسین خنگ سوار کی عمارات مزار اور فصیل کی تعمیر کی ٭

منوہر پور۔ شہر انبر[1] پر لشکر اُترا۔ معلوم ہوا کہ قریب ترِ یہاں سے **ملتھان** نام ایک شہر قدیم کے ویرانے پڑے ہیں۔ اور خاک کے ٹیلے اس کی تاریخ سنا رہے ہیں۔ اکبر نے جا کر دیکھا۔ حکم دیا کہ فصیل دروازے باغ وغیرہ تیار ہوں۔ کام امرا کو تقسیم ہو گئے۔ اور تعمیر میں بڑی تاکید کی۔ انتہا ہے کہ ۸ دن میں کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اور رعایا آباد ہو گئی۔ **رائے منوہر** ولد **رائے لون کرن** حاکم سانبھر کے نام پر **منوہر پور** اس کا نام رکھا۔ ملا صاحب کہتے ہیں کنور مذکور پر بڑی نظر عنایت تھی۔ سلیم کے ساتھ کھیل کر بڑا ہوا تھا۔ شعر بھی خوب کہتا تھا۔ اور اس میں توسنی تخلّص

[1] شیخ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں اسے عنبر سر اور ملا صاحب نے عنبر لکھا ہے۔ فرماتے ہیں انبر کے پاس موضع ملتان پہنچے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ شہر قدیم ہے۔ خدا جانے کب سے ویران پڑا ہے اس کی آبادی کا سرانجام کر کے وہاں سے اُٹھے ٭

کرتا تھا۔ جوان قابل اور ہر معاملہ میں مُنصف مزاج تھا۔ رائے مرزا منوہر کہلاتا تھا۔

قلعۂ اٹک۔ جب محمد حکیم مرزا کی اخیر مہم فتح کرکے کابل سے پھرے۔ تو اٹک کے گھاٹ پر مقام ہوُا۔ جاتے ہوئے تجویز ہو گئی تھی کہ یہاں جنگی قلعہ تعمیر ہو۔ سنہ ۹۹۰ھ ۱۴ خورداد دوپہر پر دو گھڑی بجے اپنے مبارک ہاتھ سے بنیاد کی اینٹ رکھی بنگالہ میں کٹک بنارس ہے۔ اس کا نام اٹک بنارس رکھا۔ **خواجہ شمس الدین خانی** اُنھی دنوں میں بنگالہ سے آئے تھے۔ اُن کے اہتمام سے تعمیر ہوُا۔ کنار اٹک پر جو دو پتھر جلالا۔ کمالا کہتے ہیں۔ اسی صاحب تاثیر بادشاہ نے خطاب دیا ہے۔ عجب برکت والے لوگ تھے۔ جو موج دل میں آئی۔ عالم کی زبان پر جاری ہوگئی۔

حوض حکیم علی۔ سنہ ۱۰۰۲ھ میں حکیم علی نے لاہور میں ایک حوض بنایا کہ پانی سے لبریز تھا۔ عرض و طول ۲۰×۲۰۔ گہرا ۳ گز۔ بیچ میں حجرۂ سنگین۔ اُس کی چھت پر بلند منارہ۔ حجرہ کے چاروں طرف ۴ پُل۔ لطف یہ تھا کہ حجرہ کے دروازے کھُلتے تھے۔ اور پانی اندر نہ جاتا تھا۔ ۷ برس پہلے فتحپور میں ایک حکیم نے اسی کمال کا دعویٰ کیا۔ یہی سب سامان بنوایا مگر بن نہ آیا۔ آخر کہیں غوطہ مار گیا۔ اس باکمال نے کہا اور کر دکھایا۔ میر حیدر علی معمائی نے تاریخ کہی۔ **حوض حکیم علی**۔ بادشاہ بھی سیر کو آئے۔ سُنا کہ جو اندر جاتا ہے۔ رستہ ڈھونڈتا ہے۔ نہیں ملتا۔ دم گھُٹ کر گھبراتا ہے اور نکل آتا ہے۔ خود کپڑے اُتار کر غوطہ مارا۔ اور اندر جاکر سارا حال معلوم کیا۔ ہواخواہ بہت گھبرائے۔ جب نکلے تو سب کے دم میں دم آئے۔ جہانگیر نے سنہ ۱۰۱۶ھ میں لکھا ہے۔ آج آگرہ میں حکیم علی کے گھر اُس حوض کا تماشا دیکھنے گیا۔ جیسا والد کے وقت میں لاہور میں بنایا تھا۔ چند مصاحبوں کو ساتھ لے گیا۔ کہ اُنھوں نے نہیں دیکھا تھا۔ ۶×۶ ہے۔ پہلو میں ایک حجرہ ہے نہایت روشن۔ رستہ اسی حوض میں سے ہے۔ مگر پانی اس راہ سے اندر نہیں آتا۔ ۱۰-۱۲ آدمی اس میں جلسہ جما کر بیٹھ سکتے ہیں۔

انوپ تلاؤ۔ سنہ ۹۸۶ھ میں فتحپور سے بھیرہ کی طرف شکار کو چلے۔ حکم دیا کہ ناتمام حوض کو صاف کرکے ہر قسم کے سِکّوں سے لبریز کردو کہ ہم اعلیٰ سے ادنیٰ تک خلق اللہ کو اس کا فیض پہنچائیں گے۔ (مُلّا صاحب کہتے ہیں پیسوں سے بھروایا تھا)

طول عرض ۲۰×۲۰ ۔ عمق دو قد آدم ۔ سنگِ سُرخ کی عمارت تھی ۔ چند روز کے بعد رستے میں راجہ ٹوڈرمل نے عرض کی کہ ۱۷ کروڑ بھر چکے ہیں مگر بھرا نہیں ہے ۔ فرمایا کہ جب تک ہم پہنچیں لبالب کر دو ۔ جس دن تیار ہُوا ۔ آپ کنارے پر آئے ۔ شکر الٰہی بجالائے ۔ پہلے ایک اشرفی ایک روپیہ ۔ ایک پیسا آپ اُٹھایا ۔ اسی طرح امرائے دربار کو عنایت فرمایا ۔ شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ راقم شکرفنامہ نے بھی کرم عام سے فیض خاص پایا ۔ پھر مٹھیاں بھر بھر کر دیں ۔ اور دامن بھر بھر کر لوگ لے گئے ۔ اور ہر شخص نے برکت کا تعویذ بنا کر رکھا جس گھر میں رہا ۔ اُس میں کبھی روپے کا توڑا نہ ہُوا ۔

ملا صاحب فرماتے ہیں ۔ شیخ منجھو قوال صوفیانہ وضع رکھتا تھا ۔ شیخ ادہن جونپوری کے مریدوں میں سے تھا ۔ انہی دنوں میں حوض مذکور کے کنارے پر اُسے بلایا ۔ اُس کا گانا سُن کر بہت خوش ہوئے ۔ تان سین اور اچھے اچھے گویوں کو بُلا کر سنوایا ۔ اور فرمایا کہ اس کیفیت کو تم میں سے ایک نہیں پہنچتا ۔ پھر اس سے کہا منجھو ۔ جا سب نقدی تو ہی اُٹھا لے جا ۔ اُس سے کیا اُٹھ سکتی تھی ! عرض کی ۔ حضور ! یہ حکم دیں کہ جتنی غلام اُٹھا سکے اُتنی لے جائے ۔ منظور فرمایا ۔ غریب ہزار روپے کے قریب ٹکے باندھ لے گیا ۔ ۳ برس میں اسی طرح لٹا کر حوض خالی کر دیا ۔ ملا صاحب کو بہت افسوس ہُوا ۔ آزاد ۔ میں نے ایک پرانی تصویر دیکھی ۔ اکبر اس تلاؤ کے کنارے پر بیٹھے ہیں ۔ بیربل وغیرہ چند امرا حاضر ہیں ۔ کچھ مرد ۔ کچھ عورتیں ۔ کچھ لڑکیاں پنہیاریوں کی طرح اس میں سے گھڑے بھر بھر کر لئے جاتے ہیں ۔ اللہ اللہ جو سخاوت کی بہار دیکھنے والے ہیں ۔ انہیں یہ بھی ایک تماشا ہے ۔ جہانگیر نے توزک میں لکھا ہے ۔ کہ ۳۶×۳۶ طول عرض ۴½ گز عمق تھا ۔ ۳۴ کروڑ ۴۸ لاکھ ۴۶ ہزار دام = ۱۶ لاکھ ۷۹ ہزار ۴ سو روپے کی نقدی اس میں آئی تھی ۔ روپے اور پیسے ملے ہوئے تھے ۔ ضرورت اور احتیاج کے پیاسے مدتوں تک آتے اور دلوں کی پیاس بجھاتے رہے ۔ تعجب یہ ہے کہ اُس میں کپور تلاؤ نام لکھا ہے ۔

اکبر کی شاعری اور طبع موزوں

وہ دربار قدرت سے اپنے ساتھ بہت سی نعمتیں لایا تھا۔ ان میں طبیعت بھی موزوں لایا تھا۔ اسی واسطے کبھی کبھی اشعار زبان سے نکل جاتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اشعار جو اس کے نام پر کتابوں میں لکھے ہیں اُسی کے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ ملک شاعری میں شہرت چاہتا تو شاعر ہزاروں تھے۔ جلدیں کی جلدیں تیار کر دیتے لیکن جب یہی چند شعر اس کے نام پر لکھے ہیں تو اپنی ہی طبیعت کی اُمنگ ہے جو کبھی کبھی موقع پر ٹپک پڑی ہے۔ شاید لفظ یا لفظوں میں کسی نے اصلاح بھی کر دی ہو۔ خیر طبیعت کا انداز دیکھ لو۔

مطلع

گریہ کردم زغمت موجب خوشحالی نشد ــ ریختم خوں دل از دیدہ دلم خالی شد

رُباعی

مے ناز کہ دل خوں شدہ؟ از دوری او ــ من یارِ غمم ز دست مہجوریِ او
در آئینۂ چرخ نہ قوسِ قزح است ــ عکس است نمایاں شدہ از چوری او

قطعہ

دوشینہ بکوئے مے فروشاں ــ پیمانۂ مے بزر خریدم
اکنوں زخمار سر گرانم ــ زر دادم و دردِ سر خریدم

مطلع

من بنگ نمے خورم مے آرید (میارید) ــ من چنگ نمے زنم نیا رید (نے آرید)

سنہ ۹۹۷ھ میں بہار کشمیر کی گلگشت کے لئے مع لشکر و امرائے لشکر تشریف لے گئے۔ اور بیگمات کو بھی ساتھ لیا کہ باغ قدرت کا تماشا دیکھ کر سب خوش ہوں۔ آپ امرائے خاص اور مصاحبوں کو لیکر آگے بڑھ گئے تھے۔ شہر سرینگر میں پہنچکر خیال آیا کہ مریم مکانی کے دولت خیز قدم بھی ساتھ ہوں تو نہایت مبارک بات ہے۔ شیخ کو حکم ہوا کہ عرضداشت لکھو۔ وہ تحریر میں مصروف تھے۔ خود فرمایا۔ اور یہ بھی عرضداشت میں درج ہوے

حاجی بسوے کعبہ رود از برائے حج
یارب بود کہ کعبہ بیاید بسوئے ما

عہد اکبر کے عجیب واقعات

مقام بکسر میں راوت ٹیکا نام موضع مذکور کا مقدم تھا۔ کسی دشمن نے قابو پاکر اُسے مار ڈالا۔ مقتول نے دو زخم کھائے تھے۔ ایک پیٹھ پر۔ دوسرا کان کے نیچے۔ چند روز کے بعد اُس کے رشتہ دار کے گھر بچہ پیدا ہؤا کہ یہی دو زخم اُس کے موجود تھے۔ لوگوں میں چرچا ہؤا۔ اور جب وہ بڑا ہؤا تو اُس نے بھی یہی کہا۔ بلکہ اکثر اُس کی باتیں ایسے ایسے نشان و مقام کے پتے سے بتائیں کہ سب حیران ہوئے۔ معاملہ اکبر تک پہنچا۔ یہ ایسی تحقیقات کے عاشق تھے۔ اُسے بُلاکر حالات پوچھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اکبر نے بھی اُس کا دوبارہ جنم لینا تسلیم کیا۔ مگر اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے کہا۔ اگر زخم لگے تھے تو راوت کے جسم پر لگے تھے۔ جان پر نہ تھے۔ اس جسم میں آئی ہے تو جان آئی ہے۔ پھر زخموں کا اس بدن پر ظاہر ہونا چہ معنی دارد۔ اس پر اپنی والدہ کا حال بیان کیا۔ دیکھو صفحہ ۴

ایک اندھے کو لائے کہ جو کچھ بات اُس سے کہتے تھے۔ وہ بغل میں ہاتھ دے کر جواب دیتا تھا۔ اور بغل سے شعر پڑھتا تھا۔ مشق اور ورزش سے یہ بات بہم پہنچائی تھی +

نواح اکبر آباد میں ایک بغاوت کے دبانے کو فوج بادشاہی گئی۔ وہاں لڑائی ہوئی۔ لشکر بادشاہی میں دو بھائی تھے۔ قوم کھتری۔ اکبر آباد کے رہنے والے کہ جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ اور باہم بالکل مشابہ تھے۔ ایک اُن میں سے کام آیا۔ اور چونکہ لڑائی جاری تھی۔ دوسرا وہاں موجود رہا مقتول کی لاش گھر آئی۔ دونوں بھائیوں کی بیبیاں اُس کے ساتھ ستی ہونے کو تیار ہوئیں۔ یہ کہتی میرا شوہر ہے۔ وہ کہتی تھی میرا ہے۔ مقدمہ کوتوال کے پاس اور وہاں سے دربار میں پہنچا۔ بڑے بھائی کی بی بی کہ جس کا خاوند چند ساعت پہلے پیدا ہؤا تھا آگے بڑھی۔ اور عرض کی حضور میرے والی کا ۱۰ برس کا بیٹا مر گیا تھا۔ اور اُسے فرزند کے مرنے کا بڑا غم ہؤا تھا۔ اس لاش کا سینہ چیر کر دیکھئے۔ اگر اُس کے جگر میں داغ یا سوراخ ہو جائے کہ وہی ہے نہیں ہے

تو وہ نہیں ہے۔ اُسی وقت جراح حاضر ہوئے۔ چھاتی چاک کر کے دیکھا تو زخم تیر کی طرح سوراخ موجود تھا۔ سب دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اکبر نے کہا کہ بوا تم سچی ہو۔ اور جلنے اور نہ جلنے کا تمہیں اختیار ہے +

ایک شخص کو لوگ لائے کہ اُس میں مرد عورت کی دونوں علامتیں موجود تھیں ملا صاحب لکھتے ہیں کہ اُسے مکتب خانہ کے پاس لا کر بٹھایا تھا۔ یہیں ہم کتب علمی ترجمہ کیا کرتے تھے۔ جس وقت چرچا ہوا تو میں بھی گیا۔ وہ ایک حلال خور تھا چادر اوڑھے گھونگھٹ نکالے شرمندہ صورت کچھ منہ سے نہ بولتا تھا حضرت بن دیکھے قدرت الٰہی کے قائل ہو کر چلے آئے +

سنہ ۹۹۰ھ میں ایک آدمی کو لائے کہ نہ اُس کے کان تھے۔ نہ کانوں کے چھید تھے رخسار سے اور تمام کنپٹیاں صفاً صفا۔ مگر ہر بات برابر سُنتا تھا +

ایک شیر خوار بچے کا سر اعتدال بدن سے زیادہ بڑھنے لگا۔ اکبر کو اطلاع ہوئی اُس نے بلا کر دیکھا اور کہا کہ چمڑے کی چست ٹوپی بناؤ اور اسے پہناؤ۔ رات دن ایک لمحہ سر سے نہ اُتارو۔ ایسا ہی کیا۔ چند روز میں بڑھاؤ تھم گیا +

سنہ ۱۰۰۸ھ میں جب اکبر آسیر کی مہم پر خود لشکر لے کر چلا۔ فوج نربدا سے عبور کر رہی تھی۔ ہاتھیوں کا حلقہ کہ سواری کا جزو اعظم تھا۔ دریا اُترا۔ فیلبانوں نے دیکھا کہ خاصہ کے ہاتھی کی زنجیر سونے کی ہو گئی۔ داروغۂ فیلخانہ کو خبر کی۔ اُس نے خود جا کر دیکھا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی۔ زنجیر منگا کر ملاحظہ کی۔ چاشنی لی۔ ہر طرح درست گفتگو کے بعد یہ مضمون نکلا کہ دریا میں کسی مقام پر سنگِ پارس ہو گا۔ اس خیال سے ہاتھیوں کو پھر اُسی گھاٹ اور اسی رستے پر کئی بار وار اور پار لے گئے کچھ بھی نہ ہوا +

ملا صاحب سنہ ۹۶۳ھ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ بادشاہ نے خان زمان کی اخیر مہم کے لئے نشان فتح بلند کئے۔ میں حسین خاں کے ساتھ ہمسفر تھا۔ وہ ہراول ہو کر تعمیل فرمان کے لئے روانہ ہوا۔ میں شمس آباد میں رہ گیا۔ عجائبات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہمارے پہنچنے سے کئی دن پہلے رات کے وقت ایک دھوبی کا ننھا بچہ چبوترہ پر سو رہا تھا۔ غفلت میں کروٹ لی۔ پانی میں جا پڑا۔ دریا کا بہاؤ اُسے دس کوس تک صحیح سلامت لے گیا۔ اور کچھ جیور جا کر کنارے سے لگا دیا۔

وہاں کسی دھوبی نے دیکھ کر نکالا۔ وہ انہی کا بھائی یند تھا۔ اس نے پہچانا۔ صبح کو ماں باپ کے پاس پہنچادیا +

خصائل وعادات اور تقسیم اوقات

اس کی طبیعت کا رنگ ہر عہد میں بدلتا رہا۔ بچپن کی عمر کہ پڑھنے کا وقت تھا۔ کبوتروں میں اُڑایا۔ ذرا ہوش آیا تو کتے دوڑانے لگے۔ اور بڑے ہوئے۔ گھوڑے بھگانے اور باز اُڑانے لگے۔ نوجوانی تاج شاہانی لے کر آئی۔ بیرم خاں وزیر صاحب تدبیر بل گیا تھا۔ یہ سیر و شکار اور شراب و کباب کے مزے لینے لگے۔ لیکن ہر حال میں مذہبی اعتقاد سے دل نورانی تھا۔ بزرگانِ دین سے اعتقاد رکھتا تھا۔ نیک نیتی اور خدا ترسی بچپن سے مصاحب تھی۔ طلوعِ جوانی میں آکر کچھ عرصہ تک ایسے پرہیزگار نماز گذار ہوئے کہ کبھی کبھی خود مسجد میں جھاڑو دیتے تھے اور نماز کے لئے آپ اذان کہتے تھے۔ علم سے بے بہرہ رہے مگر مطالب علمی کی تحقیقات اور اہل علم کی صحبت کا شوق اتنا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ باوجودیکہ ہمیشہ فوج کشی اور مہموں میں گرفتار تھا۔ اور انتظامی کاروبار کا ہجوم تھا۔ سواری شکار بھی برابر جاری تھی۔ مگر وہ علم کا عاشق علم و حکمت کے مباحثوں اور کتابوں کے سننے کو وقت نکال ہی لیتا تھا۔ یہ شوق کسی خاص مذہب یا خاص فن میں مخصوص نہ تھا۔ کل علوم اور کل فنون اس کے لئے یکساں تھے۔ ۲۰ برس تک دیوانی فوجداری بلکہ سلطنت کے مقدمات بھی علمائے شریعت کے ہاتھ میں رہے۔ جب دیکھا کہ ان کی بے لیاقتی اور جاہلانہ سینہ زوری ترقی سلطنت میں خلل انداز ہے تو آپ کام کو سنبھالا۔ اس عالم میں جو کچھ کرتا تھا امرائے تجربہ کار اور معاملہ فہم عالموں کی صلاح سے کرتا تھا۔ جب کوئی مہم پیش آتی یا اثنائے مہم میں کوئی نئی صورت واقع ہوتی یا کوئی انتظامی امر آئین سلطنت میں جاری یا ترمیم ہونا تو پہلے امرائے دولت کو جمع کرتا۔ ہر شخص کی رائے کو بے روک سنتا اور سناتا اور اتفاقی رائے اور صلاح اور اصلاح کے ساتھ عمل درآمد کرتا۔ اور اس کا نام مجلسِ کنگاش تھا۔

شام کو تھوڑی دیر آرام لے کر علماء و حکما کے جلسہ میں آتا تھا۔ یہاں مذہب کی خصوصیت نہ تھی۔ ہر طریق اور ہر قوم کے صاحب علم جمع ہوتے تھے۔ ان کے مباحثے سُن کر معلومات کے خزانے کو آباد کرتا تھا۔ اس کے عہد میں عمدہ اور مفید اور عالی رُتبے کی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جو عرضیاں حکام و عمال نے بھیجی تھیں اُنہیں سُنتا تھا۔ اور ہر نکتے پر خود حکم مناسب لکھواتا تھا۔ آدھی رات کو یادِ الٰہی میں مصروف ہوتا۔ بعد اس کے شبستان راحت میں غروب ہوتا تھا کہ جسم و جان کو خواب کی خوراک دے۔ لیکن بہت کم سوتا تھا۔ بلکہ اکثر رات بھر جاگتا تھا۔ اُس کی نیند عموماً ۳ گھنٹے سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ صبح سے پہلے اس کا دل روشن ہوتا تھا۔ ضروریات سے فارغ ہوتا۔ نہا دھو کر بیٹھتا۔ دو گھنٹے یادِ خدا کرتا اور انوار سحر سے دل کو روشنی دیتا۔ آفتاب کے ساتھ دربار میں طلوع ہوتا تھا۔ اہالی موالی بھی اندھیرے منہ حاضر ہوتے تھے۔ اُن کی عرض معروض سُنتا تھا۔ بے زبان نمکخوار نہ دُکھ کی شکایت کر سکتے نہ کسی آرام کی درخواست۔ اس لئے خود اُٹھ کر جاتا اور اُن کی عرضیاں صُورتِ حال سے پڑھتا۔ اصطبل اور فیل خانہ شتر خانہ۔ آہو خانہ وغیرہ وغیرہ جانوروں کو اوّل۔ بعد اُن کے اور کارخانوں کو دیکھتا تھا اقسام صنعت گری کی کارگاہوں کا ملاحظہ کرتا تھا۔ ہر باب میں عمدہ ایجاد کرتا تھا۔ اور دلپذیر اصلاحیں دیتا تھا۔ اہلِ کمال کے ایجادوں کی قدر مقدار سے زیادہ کرتا تھا۔ اور ہر فن میں اس توجہ سے شوق دکھاتا تھا۔ کہ گویا اسی فن کا فریفتہ ہے۔ توپ بندوق وغیرہ آلاتِ جنگ کی صنعت اور فنونِ دستکاری میں دستگاہ رکھتا تھا۔

گھوڑے اور ہاتھی کا عاشق تھا۔ جہاں سُنتا تھا لے لیتا تھا۔ شیر۔ چیتے گینڈے۔ نیل گائیں۔ بارہ سنگے۔ ہرن وغیرہ وغیرہ ہزاروں جانور بڑی محنت سے پالے اور سدھائے تھے۔ جانوروں کے لڑانے کا بڑا شوق تھا۔ مست ہاتھی۔ شیر اور ہاتھی۔ ارنے بھینسے۔ گینڈے۔ ہرن لڑاتا تھا۔ چیتوں سے ہرن شکار کرتا تھا۔ باز۔ بہری۔ جُرّے۔ باشے اُڑاتا تھا۔ اور یہ دل کے بہلاوے ہر سفر میں ساتھ رہتے تھے۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ چیتے وغیرہ جانوروں میں بعضے بہت پیارے تھے۔ اُن کے پیارے پیارے نام رکھے تھے۔ جن سے اس کی طبیعت کی موزونی

اور ذہن کی مناسبت جھلکتی تھی۔ شکار کا دیوانہ تھا۔ شیر کو شمشیر سے مارتا تھا ہاتھی کو دور سے زیر کرتا تھا۔ خود صاحبِ قوت تھا اور سخت محنت برداشت کر سکتا تھا۔ جتنی جفاکشی کرتا تھا اُتنا ہی خوش ہوتا تھا۔ شکار کھیلتا ہُوا بیس تیس کوس پیدل نکل جاتا تھا۔ آگرہ اور فتح پور سیکری سے اجمیر تک کہ ۷ منزل ہے۔ اور ہر منزل ۱۲ کوس کی۔ کئی دفعہ پیادہ زیارت کو گیا۔ شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ ایک بار جرأت وجوانی کے جوش میں متھرا سے پیادہ پا شکار کھیلتا ہُوا چلا۔ آگرہ اٹھارہ کوس ہے۔ تیسرے پہر جا پہنچا۔ اس دن دو تین آدمیوں کے سوا کوئی ساتھ نہیں نبھ سکا۔ گجرات کے دھاوے کا تماشہ دیکھ ہی چکے ہو۔ دریا میں کبھی گھوڑا ڈال کر کبھی ہاتھی پر کبھی آپ پیر کر پار اُتر جاتا تھا۔ ہاتھیوں کی سواری اور اُن کے لڑانے میں عجیب وغریب کرتب دکھاتا تھا۔ دیکھو صفحہ ۱۰۶ و ۱۳۸۔ غرض مصیبت کا اُٹھانا اور جان جوکھوں میں پڑنا اُسے مزا دیتا تھا۔ خطر کی حالت میں اُس پر کبھی اضطراب نہ معلوم ہوتا تھا۔ باوجود اس جوانمردی و دلیری کے غصّے کا نام نہ تھا۔ اور ہمیشہ شگفتہ اور شاد نظر آتا تھا۔

باوجود اس دولت وحشمت اور خدائی جاہ وجلال کے نمائش کا خیال نہ تھا اکثر تخت کے آگے فرش پر ہو بیٹھتا۔ سیدھا سادہ مزاج رکھتا۔ سب سے بے تکلف باتیں کرتا تھا۔ رعیّت کی دادخواہی کو سُنتا تھا اور فریاد رسی کرتا تھا۔ ان سے خلق ومحبت کے ساتھ بولتا تھا۔ اور نہایت دردخواہی سے حال پوچھتا اور جواب دیتا تھا۔ غریبوں کی خاطرداری بہت کرتا تھا۔ جہاں تک ہو سکتا ان کی دل شکنی گوارا نہ کر سکتا تھا۔ ان کے غریبانہ نذرانوں کو امیروں کے پیشکشوں سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس کی باتیں سُن کر یہ معلوم ہوتا تھا۔ گویا اپنے تئیں کم ترین مخلوقات شمار کرتا ہے۔ اس کی ہر بات سے خدا پر توکّل معلوم ہوتا تھا۔ اس کی رعایا اُس کے ساتھ دل سے محبت رکھتی تھی۔ ساتھ ہی اس کے دلوں پر اس کی ہیبت اور دہشت چھائی ہوئی تھی۔

دشمنوں کے دلوں میں اس کے دلیرانہ دھاووں اور فتوحات کے کارناموں نے بڑا رعب ڈالا تھا۔ باوجود اس کے خواہ مخواہ لڑائی کا شوق نہ تھا۔ لڑائی کے معرکوں

اور جنگ کے میدانوں میں دل اور جان تک کھپا دیتا تھا مگر ہمیشہ فہم و فراست سے کام لیتا تھا۔ دل میں ہمیشہ صلح مدّنظر رکھتا تھا۔ جب حریف اطاعت کے رستے پر آتا فوراً عذر قبول اور ملک بحال۔ جب مہم ختم ہوتی دارالسلطنت پھر کر آتا اور آبادانی و فراوانی کے شغلوں میں مصروف ہوتا۔ بنیادِ سلطنت اس پر رکھی تھی کہ جہاں تک ہو سکے ملک کی خوشحالی اور لوگوں کی فارغ البالی میں خلل نہ آئے۔ سب آسودہ حال رہیں۔ فتیح صاحب اُس عہد میں ملک الزبتھ کے دربار سے سفیر ہو کر آئے تھے۔ اُنھوں نے جو حالات مشاہدہ کر کے لکھے ہیں ان مطالب کا آئینہ ہیں:۔

خدا ترسی اور رحم و شفقت اس کے خمیر میں رچی ہوئی تھی۔ کسی کا دُکھ دیکھ نہ سکتا تھا۔ گوشت بہت کم کھاتا تھا۔ جس تاریخ پیدا ہوا تھا۔ اس دن اور اس سے چند روز پہلے اور پیچھے بالکل نہ کھاتا تھا اور حکم تھا کہ ان دنوں کل ممالک محروسہ میں ذبح نہ ہو۔ جہاں ہوتا تھا چوری چھپے سے ہوتا تھا۔ پھر اس مہینے میں اور اس سے پہلے اور پیچھے ترک کر دیا۔ پھر جتنے برس عمر کے تھے اُتنے دن پہلے اور پیچھے چھوڑ دیا۔

علی مرتضےٰ شیرِ خدا کا قول ہے کہ سینے کو حیوانات کا گورستان نہ بناؤ۔ یہ خزانہ اسرار الٰہی کا ہے۔ یہی مضمون ادا کرتا تھا اور کہتا تھا۔ گوشت آخر درخت میں نہیں لگتا۔ زمین سے نہیں اُگتا۔ جاندار کے بدن سے کٹ کر جدا ہوتا ہے۔ اُسے کیسا دُکھ ہوتا ہوگا۔ اگر انسان ہیں تو ہمیں بھی درد آنا چاہئے۔ ہزاروں نعمتیں خدا نے دی ہیں۔ کھاؤ۔ پیو اور مزے لو۔ ذرا سے چٹخارے کے لئے کہ پل بھر سے زیادہ نہیں رہتا جان کا ضائع کرنا بڑی عقلی و بیرحمی ہے۔

کہتا تھا کہ شکار نکمّوں کا کام ہے۔ اور جلادی کی مشق ہے۔ ناخدا ترسوں نے خدا کی جانوں کا مارنا تماشا ٹھیرایا ہے۔ بے گناہ بے زبانوں کی جان لیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ یہ پیاری صورتیں اور موہنی مورتیں خاص اس کی صنعت گری ہے۔ اس کا مٹانا سخت سنگدلی اور شقاوت ہے۔ ع

چہ خوش گفت فردوسیِ پاک زاد	کہ رحمت براں تربتِ پاک باد
میازار مورے کہ دانہ کش است	کہ جاں دارد و جاں شیریں خوش است

خاص دن اور بھی تھے کہ ان میں گوشت مطلق نہ کھاتا تھا۔ وسط عمر میں حساب کیا

گیا تھا۔ تو ان دونوں کا مجموعہ ۳ مہینے ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ برس میں چھ مہینے ہو گئے
آخر عمر میں یہاں تک کہتا تھا کہ جی چاہتا ہے کہ گوشت کھانا ہی چھوڑ دیجئے۔
وہ کم خوراک تھا۔ اکثر ایک وقت کھانا کھاتا تھا۔ اور جتنا کم کھاتا تھا اُس سے بہت
زیادہ محنت اُٹھاتا تھا۔ عورت سے بھی کنارہ کش ہو گیا تھا۔ بلکہ جو کچھ ہؤا اُس کے
ضائع ہونے کا افسوس کرتا تھا۔

آدابِ کورنش

شاہانِ دانش آرا نے اپنی اپنی رسائی کے بموجب ادائے آداب کے آئین
رکھے تھے۔ کسی ملک میں سر جھکاتے تھے۔ کہیں سینہ پر ہاتھ بھی رکھتے تھے۔
کہیں دو زانوں بیٹھ کر جھکتے تھے۔ (ترکوں کا آئین آداب تھا) اور اُٹھ کھڑے
ہوتے تھے۔ اکبر نے یہ آئین قرار دیا کہ ادب پرست دولتخواہ سامنے آکر آہستگی
سے بیٹھے۔ سیدھے ہاتھ کو مُٹھی کر کے پشت دست کو زمین پر ٹیکے اور آہستگی سے
سیدھا اُٹھے۔ دستِ راست سے تالو کو پکڑ کر اتنا جُھکے کہ دُہرا ہو جائے اور ایک
خوشنما انداز سے داہنی طرف کو جھوک دیتا ہؤا اُٹھے۔ اسی کو کورنش کہتے تھے۔
اس کے معنے یہ تھے کہ محسوس اور معقول زندگی اسی پر منحصر ہے۔ اسے دستِ
نیاز پر رکھ کر نذر کرتا ہے۔ خود فرمان پذیری پر آمادہ ہوتا ہے۔ اور جان و تن سپردِ
حضور کرتا ہے۔ اس کو تسلیم بھی کہتے تھے۔

اکبر نے خود بیان کیا کہ وہ عالم طفولیت میں ایک دن ہمایوں کے پاس
آکر بیٹھا۔ مہر پدری نے اپنے سر سے تاج اُتار کر نورِ چشم کے سر پر رکھ دیا۔
تاج دولت فراخ تھا۔ پیشانی پر درست کر کے اور گُدی کی طرف بڑھا کے رکھ دیا
عقل و آداب اتالیق ساتھ آئے تھے۔ اُن کے اشارے سے اُٹھا کہ آداب بجالائے
دستِ راست کی مُٹھی کو پشت کی طرف سے زمین پر ٹیکا اور سینہ و گردن کو سیدھا
کر کے آہستگی سے اُٹھا کہ مبارک تاج آنکھوں پہ پردہ نہ ہو جائے۔ یا کان پہ نہ
ڈھلک جائے۔ کھڑے ہو کر پہ تھما اور کلغی کو بچا کر تالو پر ہاتھ رکھا کہ شگون سعادت

گر نہ پڑے اور جتنا جُھک سکتا تھا جُھک کر آداب بجا لایا۔ بچپن کے عالم میں یہ جُھک کر اُٹھنا بھی ایک خوشنما انداز ہوا۔ باپ کو پیارے فرزند کا ادائے آداب بہت اچھا معلوم ہوا۔ حکم دیا کہ کورنش و تسلیم اسی طرز پر ادا ہوا کرے ✦

اکبر کے وقت میں ملازمت۔ رخصت۔ عطائے جاگیر۔ عنایتِ منصب انعام۔ خلعت۔ ہاتھی اور گھوڑا مرحمت ہوتا تھا تو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین تسلیمیں ادا کرتے ہوئے پاس آ کر نذر دیتے تھے۔ اور عنایتوں پر ایک بندگانِ باارادت جنھیں خلوت میں بھی بار ملتے تھے۔ جب بیٹھنے کی اجازت پاتے تھے تو سجدۂ نیاز کرتے تھے۔ حکم تھا کہ دل میں سجدۂ الٰہی کی نیت رہے۔ کج فہم۔ ظاہر بین اسے مردم پرستی سمجھتے تھے۔ اس واسطے ایسی سعادت کے لئے عام اجازت نہ تھی دربارِ عام میں بندگانِ خاص کو بھی حکم نہ تھا۔ کوئی باارادت اس طرح چہرہ نورانی کرنا چاہتا تو بادشاہ خفا ہوتا ✦

جہانگیر کے وقت میں کسی بات کی پروا نہ تھی۔ یہی رسم عموماً جاری رہی۔ شاہجہان کے عہد میں پہلا حکم یہی جاری ہوا کہ سجدہ موقوف ہو۔ ذاتِ الٰہی کے سوا دوسرے کے لئے روا نہیں۔ مہابت خاں سپہ سالار نے کہا کہ بادشاہ کے سلام میں اور عام اہلِ دولت کے سلام میں کچھ امتیاز واجب ہے سجدہ کی جگہ زمین بوس ہو تو مناسب ہے۔ کہ خادم و مخدوم اور بادشاہ و رعیت کا سررشتہ باقاعدہ رہے۔ قرار پایا کہ اہلِ آداب دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر اپنے پشتِ دست کو بوسہ دیا کریں۔ اہلِ احتیاط نے کہا کہ اس میں بھی سجدہ کی صورت نکلتی ہے۔ سالِ دہم جلوس میں یہ بھی موقوف ہوا۔ اس کی جگہ چوتھی تسلیم اور بڑھا دی۔ سادات۔ علماء۔ مشائخ ملازمت کے وقت سلام شرعی ادا کرتے تھے۔ اور رخصت کے وقت فاتحہ پڑھ کر دعا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ قدیمی دستور ترکستان کا ہے۔ کیونکہ وہاں بھی یہی رسم ہے بلکہ عموماً ہر صحبت اور ہر ملاقات میں یہی عمل درآمد عام تام ہے ✦

لطائف اقبال

دُنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ جب دولت و اقبال کسی کی طرف جھک جاتے ہیں تو عالمِ طلسمات کو مات کر دیتے ہیں۔ جو چاہے وہی ہو۔ جو منہ سے نکل جائے وہی ہو۔ اکبر کی فرمانروائی میں ایسی باتوں کا ظہور بہت نظر آتا ہے مہمات سلطنت اور فتوحات ملکی کے علاوہ اس کے تہوّر اور ہمت و جرأت کے معاملے کل تائیدِ اقبال کا ثمرہ تھے۔ اکثر معاملات میں جو کچھ اُس نے ابتدا میں کہہ دیا اُسی انتہا پر خاتمہ ہوا۔ اگر اس کی فہرست لکھوں تو بہت طولانی ہو۔ چند باتیں بطور تمثیل لکھتا ہوں +

ستتہ جلوس میں اکبر نے قاضی نور اللہ شستری کو محالات کشمیر کی جمع بندی کے لئے بھیجا۔ یہ باوجود کمال علم و فضل کے نہایت دقیقہ رس اور دیانتدار شخص تھے۔ عاملانِ کشمیری کو ڈر ہوا کہ ہمارے پیچ کھل جائینگے۔ اُنھوں نے باہم مشورت کی۔ بادشاہ بھی لاہور سے اسی طرف جانے والے تھے۔ مرزا یوسف خاں صوبہ دار کشمیر استقبال کو ادھر آیا۔ مرزا یادگار اس کا رشتہ دار نائب رہا کشمیریوں نے سازش کر کے اُسے بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ اور کہا کہ رستے دشوار۔ ملک ٹھنڈا۔ سامان جنگ بہت کچھ موجود ہے کشمیر ایسی جگہ نہیں کہ ہندوستان کا لشکر آئے اور سر سواری اسے مار لے۔ وہ بھی ان کی باتوں میں آگیا۔ اور خود سر ہو کر تاج شاہی سر پر رکھا +

دربار میں ان باتوں کا سان گمان بھی نہیں تھا۔ اکبر نے لاہور سے کوچ کیا۔ اور دریائے راوی سے اُترتے ہوئے کسی مصاحب سے پوچھا کہ یہ بیت شاعر نے کون سے گنجے کے حق میں کہی تھی ؎

کلاہِ خسروی و تاجِ شاہی　　بہر کل کے رسد حاشا و کلا

تماشا یہ ہوا کہ مرزا یادگار سر سے گنجہ نکلا +

لشکر دریائے چناب کے کنارے پہنچا تھا کہ اس فساد کی خبر پہنچی اکبر

کی زبان سے نکلا ؎

ولد الزنا ست حاسد۔ منم آنکہ طالع من	ولد الزنا کُش آمد چو ستارۂ یمانی

لطف یہ ہے کہ یادگار نقرہ تام ایک کنچنی کے پیٹ سے تھا۔ جس کے نطفے کی بھی تحقیق نہ تھی۔ اکبر نے یہ بھی کہا کہ ایں لولی بچہ مجرد برآمدن سہیل کشتہ خواہد شد۔ شیخ ابوالفضل نے دیوان حافظ میں فال دیکھی۔ یہ شعر نکلا ؎

آں خوش خبر کجاست کزیں فتح مژدہ داد	تا جاں فشانمش چو زر و سیم در قدم

عجیب بات یہ ہے کہ جب یادگار کا خطبہ پڑھا گیا تو اسے ایسی تھرتھری چڑھی جیسے بخار چڑھا۔ اور جب مہرکن سکّے کی مہر کھودنے لگا۔ فولاد کی کنی اس کی آنکھ میں جا پڑی۔ آنکھ بیکار ہوگئی۔ اکبر نے یہ بھی کہا کہ دیکھنا جو لوگ اس کی بغاوت میں شامل ہیں انہی میں سے کوئی شخص ہوگا کہ اُس کا گنجہ سر کاٹ لائیگا۔ خدا کی قدرت کہ انجام کار اسی طرح وقوع عمل میں آیا +

دنیا میں کوئی شغل اور کوئی شوق ایسا نہ تھا جس کے یہ عاشق نہ ہوں۔ اس عشقبازی سے کبوتر چھُٹ جاتے تو سخت دشواری تھی۔ انواع و اقسام کے کبوتر شہر شہر بلکہ ولایتوں سے منگائے تھے۔ عبداللہ خاں اُزبک کو لکھا۔ اُس نے کبوتران گرہ باز اور اُن کے کبوتر باز ملکِ توران سے بھیجے۔ یہاں ان کی بڑی قدر ہوئی۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں کو انہی دنوں میں فرمان لکھا ہے۔ اس میں بھی مضامین رنگین کے بہت کبوتر اُڑائے ہیں۔ اور ایک ایک کبوتر کا نام بنام حال لکھا ہے آئین اکبری میں جہاں اور کارخانوں کے آئین و ضوابط لکھے ہیں اس کے بھی لکھے ہیں۔ اور ایک اور ایک کبوتر نامہ بھی لکھا گیا۔ شیخ ابوالفضل اکبر نامہ میں لکھتے ہیں۔ ایک دن کبوتر اُڑ رہے تھے۔ وہ بازیاں کرتے تھے۔ آپ تماشا دیکھتے تھے کہ ایک خاصہ کے کبوتر پر بحری گری۔ انہوں نے للکار کر آواز دی خبردار۔ بحری جھپٹا مارتے مارتے رُک کر ہٹ گئی۔ اس کا قاعدہ ہے کہ اگر کبوتر کنوٹ کر کے نکل جاتا ہے تو چکر مارتی ہے اور پھر آتی ہے۔ بار بار جھپٹے مارتی ہے۔ اور آخر لے جاتی ہے۔ مگر وہ پھر نہ آئی +

اکبر کی شجاعتِ ذاتی اور بے حد دلاوری

یہ بات راجگانِ ہند کے اصولِ سلطنت میں داخل تھی۔ کہ راج کا فرمانروا اکثر خطرناک اور جان جوکھوں کے کام کر کے خاص و عام کے دلوں میں ایک تاثیر پھیلائے جس سے وہ سمجھیں کہ بے شک تائید غیبی اس کے ساتھ ہے اور اقبال اس طرح مددگار ہے کہ ہم میں سے یہ بات کسی کو نصیب نہیں۔ اور اسی واسطے اسکی عظمت خدا کی عظمت اور اس کی اطاعت اطاعت الٰہی کی پہلی سیڑھی ہے۔ اور یہی بات ہے کہ ہندو راجہ کو بھگوان کا اوتار اور مسلمان ظل اللہ (سایہ خدا) کہتے ہیں۔ اکبر اس بات کو خوب سمجھ گیا تھا۔ تیموری و چنگیزی لہو کی گرمی سے ہمت۔ جرأت۔ جذبہ و جوش اور شوقِ ملک گیری جو اس کے لہو میں باقی تھا۔ وہ خیالات کو اور بھی گرماتا رہتا تھا۔ بلکہ یہ جوش یا بابر کی طبیعت میں تھا یا اس میں کہ جب دریا کے کنارے پر پہنچتا تھا۔ خواہ مخواہ گھوڑا پانی میں ڈال دیتا تھا۔ جب وہ اس طرح دریا اُترے۔ تو نمک حلالوں میں کون ہے۔ کہ جاں نثاری کا دعوٰی رکھے۔ اور اس سے آگے نہ ہو جائے۔ ہمایوں راحت پسند تھا۔ کہیں ایسا ہی بوجھ پڑا ہے۔ جب وہ اس طرح جان پر کھیلا ہے۔ یلغاریں کر کے مہمیں کرنی۔ ہمت کے گھوڑے پر چڑھ کر آپ تلوار مارنی۔ قلعوں کے محاصرے کرنے۔ سرنگیں لگانی۔ ادنیٰ سپاہیوں کی طرح مورچے مورچے پر آپ پھرنا اکبر ہی کا کام تھا۔ اس کے بعد جو ہوئے عیش و آرام کے بندے تھے۔ بندگانِ خدا سے عبادت وصول کرنے والے دربار بادشاہی کے رکھوالے اور پیٹ کے ماروں کے سر کٹوانے والے بنیئے مہاجن تھے کہ باپ دادا کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ یا پیرزادے کہ بزرگوں کی ہڈیاں بیچتے ہیں۔ اور آرام سے زندگی کرتے ہیں۔ اکبر جب تک کابل میں تھا تو اونٹ سے بڑا کوئی جانور نظر نہ آتا تھا۔ اس لئے اسی پر چڑھتا تھا۔ دوڑاتا تھا لڑاتا تھا۔ کبھی کتوں سے کبھی تیر و کمان سے شکار کھیلتا تھا۔ اور نشانے لگاتا تھا۔ باز یا شے اُڑاتا تھا۔

جب ہمایوں ایران سے ہندوستان کو پھرا۔ اور کابل میں آرام سے بیٹھا تو اکبر کی عمر پانچ برس سے کچھ زیادہ ہو گی۔ یہ بھی چچا کی قید سے چھٹا۔ اور سیر و شکار جو شاہزادوں کے شغل ہیں۔ اُن میں دل خوش کرنے لگا۔ ایک دن کتے لے کر شکار کو گیا۔ کوہستان کا ملک ہے۔ ایک پہاڑ میں ہرن، خرگوش وغیرہ شکار کے جانور بہت تھے۔ چاروں طرف نوکروں کو جما دیا کہ رستہ روکے کھڑے رہو کوئی جانور نکلنے نہ پائے۔ اسے لڑکا سمجھ کر نوکروں نے بے پروائی کی۔ ایک طرف سے جانور نکل گئے۔ اکبر بہت خفا ہوا۔ اُلٹا پھرا اور جن نوکروں نے غفلت کی تھی اُنہیں رسوائی کے ساتھ تمام اُردو میں تشہیر کیا (پھرایا) ہمایوں سُن کر خوش ہوا۔ اور کہا شکر خدا کہ ابھی سے اس نونہال کی طبیعت میں سیاستِ شاہانہ اور ایجاد آئین کے اصول ہیں۔

سنہ ۹۶۲ھ میں ہمایوں نے اکبر کو صوبہ پنجاب کا انتظام سپرد کر کے دلّی سے روانہ کیا۔ تو سرہند کے مقام میں حصار فیروزہ کی فوج آ کر شامل ہوئی۔ اُن میں اُستاد عزیز سیستانی بھی تھا۔ اُسے توپ اور بندوق کے کام میں کمال تھا۔ اور بادشاہ سے رومی خاں[1] کا خطاب حاصل کیا تھا۔ وہ بھی اکبر کے سلام کو آیا۔ اپنی نشانہ بازی اور تفنگ اندازی کے کمال اس خوبی سے دکھائے کہ اکبر کو بھی شوق ہو گیا۔ شکار کا عشق تو پہلے ہی تھا۔ یہ اس کا جزو اعظم ہوا۔ چند روز میں اسے اشتیاق ہو گیا کہ بڑے بڑے گُل چلے اُستاد کان پکڑنے لگے۔

چیتوں کا شوق

جس طرح ہندوستان میں چیتوں سے شکار کھیلتے ہیں۔ ایران و ترکستان میں اس کا رواج نہیں۔ جب ہمایوں دوبارہ ہندوستان پر آیا۔ اکبر ساتھ تھا۔

[1] اس عہد میں اکثر توپ انداز روم سے آتے تھے۔ اسی واسطے بادشاہوں کے دربار سے رومی خاں خطاب پایا کرتے۔ توپ و تفنگ کے کاروبار ممالک یورپ سے اوّل دکن میں آئے۔ پھر ہندوستان میں پھیلے۔

بارہ برس کی عمر تھی۔ سرہند کے مقام پر سکندر خاں افغان انبوہ در انبوہ افغانوں کی فوج کو لئے پڑا تھا۔ جنگِ عظیم ہوئی۔ اور ہزاروں کا کھیت پڑا۔ افغان بھاگے۔ خزانے ہزار در ہزار اور اموال بے شمار فوج بادشاہی کے ہاتھ آئے۔ قلی بیگ ذوالقدر (بیرم خاں کا بہنوئی حسین قلی خاں خان جہاں کا باپ) سکندر کے چیتا خانے میں سے ایک چیتا لایا۔ اس کا نام فتح باز تھا۔ دوندو اس کا چیتابان تھا۔ دوندو نے اپنے کرتب اور چیتے کے ہنر اس خوبی سے دکھائے کہ اکبر عاشق ہو گیا۔ اور اسی دن سے چیتوں کا شوق ہوا۔ سیکڑوں چیتے جمع کئے ایسے سدھے ہوئے تھے کہ اشاروں پر کام دیتے تھے۔ اور دیکھنے والے حیران رہتے تھے۔ کمخواب و مخمل کی جھولیں اوڑھے۔ گلے میں سونے کی زنجیریں آنکھوں پر زردوزی چشمے چڑھے۔ بہلوں میں سوار چلتے تھے۔ بہلوں کا سنگار بھی اُن سے کچھ کم نہ تھا۔ سُنہری۔ روپہلی سنگوٹیاں چڑھی۔ زردوزی تاج سر پر زریں و زرتار جھولیں جھم جھم کرتی۔ غرض کہ عجیب بہار کا عالم تھا۔

ایک دفعہ سفر پنجاب میں چلے جاتے تھے کہ ایک ہرن نمودار ہوا۔ حکم ہوا کہ اس پر چیتا چھوڑو۔ چھوڑا۔ ہرن بھاگا۔ ایک گڑھا بیچ میں آگیا۔ ہرن نے چاروں پتلیاں جھاڑ کر جست کی اور صاف اُڑ گیا۔ چیتا بھی ساتھ ہی اُڑا۔ اور ہوا میں جا دبوچا۔ جیسے کبوتر اور شہباز۔ عجب طرح سے اوپر تلے گتھم گتھا ہوتے ہوئے گرے۔ سواری کا انبوہ تھا۔ دلوں سے واہ واہ کا ولولہ نکلا۔ عمدہ عمدہ چیتے آتے تھے۔ اُن میں سے انتخاب ہوتے تھے۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ خاصہ میں داخل ہوتے تھے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ ان کی تعداد کبھی ہزار تک نہ پہنچی۔ جب ایک دو کی کسر رہتی کچھ نہ کچھ عارضہ ایسا ہوتا تھا کہ چند چیتے مر جاتے تھے۔ سب حیران تھے۔ اور اکبر بھی ہمیشہ متعجب رہتا تھا۔

ہاتھی

ہاتھی کا بڑا شوق تھا۔ اور یہ شوق فقط شاہوں اور شہزادوں کا شوق نہ تھا

ہاتھیوں کے سبب سے اکثر مہمیں قائم ہوگئیں۔ جن میں لاکھوں کروڑوں روپے صرف ہوئے۔ اور ہزاروں سر کٹ گئے۔ خود ہاتھی پر بہت خوب بیٹھتا تھا۔ سرشور۔ مست۔ آدم کش ہاتھی کہ بڑے بڑے مہاوت اُن کے پاس جاتے ہوئے ڈریں۔ وہ بے لاگ جاتا۔ برابر گیا۔ کبھی دانت۔ کبھی کان پکڑا۔ اور گردن پر نظر آیا۔ ہاتھی سے ہاتھی پر اُچھل جاتا تھا۔ اور اس کی گردن پر بیٹھ کر بے تکلف ہنستا کھیلتا لڑاتا۔ بھگاتا۔ گدی۔ جھول کچھ نہیں۔ فقط کلاوہ میں پاؤں ہے۔ اور گردن پر جما ہوا ہے۔ کبھی درخت پر بیٹھ جاتا۔ جب ہاتھی برابر آیا۔ جھٹ اُچھلا اور گردن یا پشت پر۔ پھر وہ بہتیری جھرجھریاں لیتا ہے۔ سر دُھنتا ہے کان پھٹ پھٹاتا ہے۔ یہ کب ہلتے ہیں ؀

ایک دفعہ اس کا پیارا ہاتھی مستی کے عالم میں چھٹا اور فیل خانہ سے نکل کر بازاروں میں ہتیباری کرنے لگا۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ اکبر سنتے ہی قلعہ سے نکلا اور پتہ لیتا ہوا چلا کہ کدھر ہے۔ ایک بازار میں پہنچ کر غل سُنا کہ وہ سامنے سے آتا ہے۔ اور خلقت خدا کی بھاگی چلی آتی ہے۔ یہ ادھر اُدھر دیکھ کر ایک کوٹھے پر چڑھ گیا۔ اور اس کے چھجے پر آکر کھڑا ہوا۔ جونہی ہاتھی برابر آیا۔ جھٹ لپک کر اس کی گردن پر۔ دیکھنے والے بے اختیار چلائے۔ آہا ہا۔ پھر کیا تھا دیو قابو میں آگیا۔ یہ باتیں چودہ پندرہ برس کی عمر کی ہیں ؀

لکنہ ہاتھی بدمستی و بدخوئی میں بدنام عالم تھا۔ ایک دن (دہلی میں) اس پر سوار ہوا۔ اور ایک جنگجو خونریز اسی کے جوڑ کا ہاتھی منگا کر میدان میں لڑانے لگا۔ لکنہ نے بھگا دیا۔ اور بھاگتے کے پیچھے دوڑا۔ ایک تو مست۔ دوسرے فتحیابی کا جوش۔ لکنہ اپنے حریف کے پیچھے دوڑا جاتا تھا۔ ایک تنگ اور گہرے گڑھے میں پاؤں جا پڑا۔ پاؤں بھی ایک ستون کا ستون تھا۔ مستی کی جھونجھل میں بپھر بپھر کر جو حملے کئے تو ٹہنیہ بھی پٹھے پر سے گر پڑا۔ اکبر اوّل سنبھلا۔ اخیر کو اُس کے آسن بھی گردن سے اُکھڑے۔ مگر پاؤں کلاوہ میں اٹکا رہ گیا۔ جاں نثار مضمحلال گھبرا گئے۔ اور عجب غلغلہ پڑ گیا۔ یہ اُس پر سے اُترے۔ اور جب ہاتھی نے اپنا پاؤں باہر نکال لیا تو پھر اُسی پر سوار ہو کر ہنستے کھیلتے چلے گئے۔ وہ زمانہ ہی اور تھا۔

خان خاناں زندہ تھے۔ اُنھوں نے صدقے اُتارے۔ روپے اشرفیاں نثار کیں۔ اور خدا جانے کیا کیا کچھ کیا۔

خاصہ کے ہاتھیوں میں ایک ہاتھی کا ہوائی نام تھا کہ بدہوائی اور شرارت میں باروت کا ڈھیر تھا۔ ایک موقع پر کہ وہ مست ہو رہا تھا۔ میدان چوگان بازی میں اُسے منگایا۔ آپ سوار ہوئے۔ اِدھر اُدھر دوڑاتے پھرے۔ بٹھایا۔ اُٹھایا۔ سلام کروایا۔ رن باگھ ایک اور ہاتھی تھا۔ اُس کی بدمستی اور سرشوری کا بھی بڑا غل تھا۔ اُسے بھی وہاں طلب فرمایا۔ اور آپ ہوائی کو لے کر سامنے ہوئے۔ ہواخواہوں کے دل بیقرار ہو گئے۔ جب دونوں دیو ٹکر مارتے تھے پہاڑ ٹکراتے تھے۔ اور دریا جھکولے کھاتے تھے۔ آپ شیر کی طرح اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ کبھی سر پر تھے اور کبھی پشت پر۔ جاں نثاروں میں کوئی بول نہ سکتا تھا۔ آخر اتکہ خاں کو بلا کر لائے۔ کہ سب کا بزرگ تھا۔ بڈھا بچارا ہانپتا کانپتا دوڑا آیا۔ حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دادخواہوں کی طرح سر ننگا کر لیا۔ پاس گیا اور مظلوم فریادیوں کی طرح دونوں ہاتھ اُٹھا کر چیخیں مارنے لگا۔ شاہم! برائے خدا ببخشید بہ للہ بر حال مردم رحم آرید۔ بادشاہم! جانِ بندگان مے رود۔ چاروں طرف خلقت کا ہجوم تھا۔ اکبر کی نظر اتکہ خاں پر پڑی۔ اسی عالم میں آواز دی۔ چرا بیقراری مے کنید۔ اگر شما آرام نمے نشینید ماخود را از پشت فیل مے اندازیم۔ وہ محبت کا مارا ہٹ گیا۔ آخر رن باگھ بھاگا۔ اور ہوائی آگ بگولا ہو کر پیچھے پڑا۔ دو ہاتھی آگا دیکھتے تھے نہ پیچھا۔ گڑھا نہ ٹیلا۔ جو سامنے آتا لانگھتے پھلانگتے چلے جاتے تھے۔ جمنا کا پل سامنے آیا۔ اس کی بھی پرواہ نہ کی۔ دو پہاڑوں کا بوجھ کشتیاں دبتی تھیں اور اُچھلتی تھیں۔ خلقت کناروں پر جمع تھی اور دلوں کا عجب عالم تھا۔ جاں نثار دریا میں کود پڑے۔ پُل کے دونوں طرف تیرتے چلے جاتے تھے۔ خدا خدا کر کے ہاتھی پار ہوئے۔ بارے رن باگھ ذرا تھما۔ ہوائی کے زور شور بھی ڈھیلے پڑے۔ اس وقت سب کے دل ٹھکانے ہوئے۔ جہانگیر نے اس سرگذشت کو اپنی توزک میں درج کر کے اتنا زیادہ لکھا ہے۔ "میرے والد نے مجھ سے خود فرمایا کہ ایک دن ہوائی پر سوار ہو کر میں نے ایسی حالت بنائی۔ گویا نشے میں ہوں۔ پھر یہی سارا ماجرا تحریر کیا۔

اور اکبر کی زبانی یہ بھی لکھا ہے۔ کہ "اگر میں چاہتا تو ہوائی کو ذرا سے اشارے میں روک لیتا۔ مگر اوّل سرخوشی کا عالم ظاہر کر چکا تھا۔ اس لئے پُل پر آکر سنبھلنا مناسب نہ سمجھا کہ لوگ کہینگے بناوٹ تھی۔ یا یہ سمجھینگے کہ سرخوشی تو تھی) مگر پُل اور دریا دیکھ کر نشے ہرن ہو گئے۔ اور ایسی باتیں بادشاہوں کے باب میں نازیبا ہیں۔"

اکثر شیر ببر شکارگاہوں یا عالم سفر میں اس کے سامنے آئے۔ اور اُس نے تنہا مارے۔ کبھی تیر۔ کبھی تفنگ۔ کبھی تلوار سے۔ بلکہ اکثر آواز دی ہے کہ خبردار کوئی اور آگے نہ بڑھے۔

ایک دن فوج کی موجودات لے رہا تھا۔ دو راجپوت نوکری کے لئے سامنے آئے۔ اکبر کی زبان سے نکلا۔ کچھ بہادری دکھاؤگے؟ اُن میں سے ایک نے اپنی برچھی کی بوڑی اُتار کر پھینک دی۔ اور دوسرے کی برچھی کی پھال اُس پر چڑھائی۔ تلواریں سونت لیں۔ برچھی کی انیاں سینوں پر لیں اور گھوڑوں کو ایڑیاں لگائیں۔ بےخبر گھوڑے جھک کر آگے بڑھے۔ دونوں بہادر چھد کر بیچ میں آن ملے۔ اس نے اُس کے تلوار کا ہاتھ مارا۔ اُس نے اُس کے۔ دونوں وہیں لٹ کر ڈھیر ہو گئے۔ اور دیکھنے والے حیران رہ گئے۔

اکبر کو بھی جوش آیا مگر کسی کو اپنے سامنے رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ حکم دیا کہ تلوار کا قبضہ دیوار میں خوب مضبوط گاڑو۔ پھل باہر نکلا رہے۔ پھر تلوار کی نوک پر سینہ رکھ کر چاہتا تھا کہ آگے کو حملہ کرے۔ مان سنگھ دوڑ کر لپٹ گیا۔ اکبر بڑے جھنجھلائے۔ اُسے اُٹھا کر زمین پر دے مارا۔ کہ جوش خداداد کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ انگوٹھے کی گھائی میں زخم بھی آ گیا تھا۔ مظفر سلطان نے زخمی ہاتھ مروڑ کر مان سنگھ کو چھڑایا۔ اس کشتم کشتا میں زخم زیادہ ہو گیا تھا۔ مگر علاج سے جلد اچھا ہو گیا۔

ان ہی دنوں میں ایک دفعہ کسی خلاف طبع بات پر غصے ہو کر سواری کو گھوڑا مانگا۔ اور حکم دیا کہ سائیس خدمتگار کوئی ساتھ نہ رہے۔ خاصہ کے گھوڑوں میں ایک سُرنگ گھوڑا تھا ایرانی۔ کہ خضر خواجہ خاں نے پیش کیا تھا۔ (خالو تھے)۔ گھوڑا نہایت خوبصورت اور خوش ادا تھا۔ مگر جیسا ان اوصاف میں بےنظیر تھا۔

ویسا ہی سرکش سرشور اور شریر تھا۔ چھُٹ جاتا تھا تو کسی کو پاس نہ آنے دیتا تھا۔ کوئی چابکسوار اس پر سواری کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ بادشاہ خود ہی اس پر سوار ہوتے تھے۔ اس دن غصے میں بھرے ہوئے تھے۔ اُسی پر سوار ہو کر نکل گئے۔ رستے میں خدا جانے کیا خیال آیا کہ اُتر پڑے اور درگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے۔ گھوڑا اپنی عادت کے بموجب بھاگا۔ اور خدا جانے کہاں سے کہاں نکل گیا۔ یہ اپنے عالم میں غرق۔ اُس کا خیال بھی نہیں۔ جب حالت سے ہوش میں آئے تو دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کہاں! نہ کوئی اہل خدمت پاس، نہ اور گھوڑا ساتھ۔ کھڑے سوچ رہے تھے۔ اتنے میں دیکھتے ہیں۔ وہی وفادار گھوڑا سامنے سے وہ چلا آتا ہے۔ پاس آیا اور سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے کوئی کہتا ہے کہ خانہ زاد حاضر ہے۔ سوار ہو جلیئے۔ اکبر بھی حیران رہ گیا۔ اور سوار ہو کر لشکر میں آیا +

اگرچہ بادشاہوں کو ہر ملک میں اور ہر وقت میں جان کا ڈر لگا رہتا ہے۔ مگر ایشیائی ملکوں میں جہاں شخصی سلطنت کا سکہ چلتا ہے وہاں زیادہ پُرخطر ہوتا ہے۔ خصوصاً اگلے وقتوں میں۔ کہ نہ سلطنت کا کوئی اصول یا قانون تھا۔ نہ لوگوں کے خیالات کا کوئی قاعدہ تھا۔ باوجود اس کے اکبر کسی بات کی پروا نہ کرتا تھا۔ اُسے ملک کے حال سے باخبر رہنے اور لوگوں کو آرام و آسائش سے رکھنے کا بڑا خیال تھا۔ ہمیشہ اسی فکر میں لگا رہتا تھا +

ابوالفضل سے خود ایک دن بیان کیا کہ ایک رات آگرہ کے باہر چھڑیوں کا میلہ تھا۔ میں بھیس بدل کر وہاں گیا۔ کہ دیکھوں لوگ کس حال میں ہیں۔ اور کیا کرتے ہیں۔ ایک بازاری سا آدمی تھا۔ اُس نے مجھے پہچان کر اپنے ساتھیوں سے کہا دیکھنا بادشاہ جاتا ہے۔ وہ بول رہی تھا۔ میں نے بھی سُن لیا۔ جھٹ آنکھ کو بھینگا کر کے منہ ٹیڑھا کر لیا۔ اور اسی طرح بے پروائی سے چلا گیا۔ ان میں سے بڑھ کر دیکھا اور غور کر کے کہا۔ وہ نہیں۔ بھلا اکبر بادشاہ کہاں! اس کی وہ صورت کہاں! یہ تو کوئی ٹڑھوا ہے۔ اور بھینگا بھی ہے۔ میں آہستہ آہستہ اُس بھیڑ سے نکلا۔ اور اپنے تکلف کو برطرف کر کے قلعہ کی راہ لی +

اژدہا مارنے کا حال آگے آئیگا +

اکبر نے اپنے غنیموں پر بڑے زور شور کی یلغاریں اور جان جوکھوں کے ساتھ دھاوے کیے۔ اور تھوڑی جمعیت سے ہزاروں کے لشکر گرد باد کر دیئے۔ لیکن ایک دھاوا اُس نے ایسے موقع پر کیا جس کا اس سلسلہ میں لکھنا بھی نامو زوں نہیں ہے۔ موٹہ راجہ کی بیٹی راجہ جیمل سے بیاہی تھی۔ وہ جاں نثار اکبر کا مزاج شناس تھا۔ ۹۹۱ھ میں کسی کار ضروری کے لئے اُسے بنگالہ بھیجا تھا۔ حکم کا بندہ گھوڑے کی ڈاک پر بیٹھ کر دوڑا۔ تقدیر کی بات کہ جوسا کے گھاٹ پر تھکن نے بٹھایا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں لٹا کر بستر مرگ پر سُلا دیا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی۔ سن کر بہت افسوس ہؤا۔ محل میں آئے تو معلوم ہؤا کہ اُس کا بیٹا اور چند اور جاہل راجپوت اپنی جہالت کے زور سے رانی کو زبردستی ستی کرتے ہیں۔ خدا ترس بادشاہ کو ترس آیا اور تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہؤا۔ سمجھا کہ ممکن ہے کسی اور امیر کو بھیج دُوں۔ مگر اُس کے سینے میں اپنا دل اور دل میں یہ درد کیوں کر ڈال دوں۔ فوراً گھوڑے پر بیٹھا اور ہوا کے پر لگا کر اُڑا۔ اکبر بادشاہ کا دفعتہً تختگاہ سے غائب ہو جانا آسان بات نہ تھی۔ شہر میں شور اور عالم میں شورش مچ گئی۔ جابجا ہتیار بندی ہونے لگی۔ اس دوڑا دوڑ میں امرا اور اہل خدمت میں سے کون ساتھ نبھ سکے؟ چند جاں نثار اور کئی خدمتگار رکاب میں رہے۔ اور دفعتہً محل واردات پر جا کر کھڑے ہوئے۔ اکبر کو شہر کے قریب کسی جگہ ٹھیرایا۔ راجہ جگناتھ اور راجہ رائسال گھوڑے مار کر آگے بڑھ گئے تھے۔ اُنہوں نے جا کر خبر دی کہ مہابلی آ گئے۔ ضدی جاہلوں کو روکا اور حضور میں لا کر حاضر کر دیا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ اپنے کئے پر پشیمان ہیں۔ اس لئے جان بخشی کی۔ لیکن حکم دیا کہ چند روز ادب خانۂ زندان میں رہیں۔ رانی کی جان کے ساتھ اُن کی بھی جان بچ گئی۔ اُسی دن وہاں سے پھرا۔ جب فتح پور میں پہنچا تو سب کے دم میں دم آیا۔

۹۷۴ھ میں تیغ آفتاب مشرق پر چمک رہی تھی۔ اکبر خان زماں کی مہم میں مصروف تھا۔ محمد حکیم مرزا کو بد صلاح مصاحبوں نے صلاح بتائی کہ آپ بھی آخر ہمایوں بادشاہ کے بیٹے ہیں اور ملک کے وارث ہیں۔ پنجاب تک ملک آپ کا رہے۔ وہ بھولا بھالا سادہ شہزادہ اُن کے کہنے میں آ کر لاہور میں آ گیا۔ اکبر نے ادھر کی حرارت کو عفو تقصیر کے شربت اور نذرانہ جرمانہ کی سکنجبین سے فرو کیا۔

امرا کو فوجیں دے کر ادھر بھیجا اور فوراً سمند ہمت پر سوار ہوا۔ محمد حکیم آمد آمد کی ہوا میں اُڑ کر کابل پہنچے۔ اکبر نے لاہور میں آکر مقام کیا۔ اور شکار قمرغہ کا حکم دیا۔ سردار منصبدار قراول اور شکاری دوڑے اور جلد حکم کی تعمیل کی ✦

قمرغہ۔ یہ ایران و توران کے بادشاہوں کا قدیمی شوق تھا۔ ایک فراخ جنگل کے گرد بڑے بڑے لکڑوں کی دیوار سے احاطہ باندھتے تھے۔ کہیں ٹیلوں کی قدرتی قطاروں سے۔ کہیں بنائی ہوئی دیواروں سے مدد لیتے تھے۔ تیس تیس چالیس چالیس کوس سے جانوروں کو گھیر کر لاتے تھے۔ رنگ برنگ کے جانور درندے چرندے۔ پرندے اُن میں آجاتے تھے۔ اور نکاس کے رستے بالکل بند کر دیتے تھے۔ بیچ میں کئی بلند مقام بادشاہ اور شہزادوں کے بیٹھنے کے لئے بنتے تھے۔ پہلے بادشاہ سوار ہو کر خود شکار مارتا تھا۔ پھر شہزادے۔ پھر اجازت ہو جاتی تھی خاص خاص امیر بھی شامل ہو جاتے تھے۔ روز بروز دائرے کو سکیڑتے اور جانوروں کو سمیٹتے لاتے تھے۔ آخیر دن جبکہ تھوڑی جگہ میں جانوروں کی بہتات ہو جاتی تھی تو اُن کی دھکا پیل اور ریل دھکیل۔ گھبراہٹ اور اضطراب۔ سے اولانا اور دوڑنا چلانا۔ بھاگنا۔ کودنا۔ تراسے پھرنا۔ اُچھلنا اور گر پڑنا۔ شکار بازوں کو طرفہ تماشا اور اہل درد کے دلوں کا عجیب عالم ہوتا تھا۔ اسی کو شکار قمرغہ اور شکار جرگہ بھی کہتے تھے۔ اس موقع پر ۴۰ کوس کے دورے سے جانور گھیر کر لائے۔ اور لاہور سے ۵ کوس پر شکار مذکور کا گھیرا ڈالا۔ خوب شکار ہوئے۔ اور نیک شگون نظر آئے۔ یہاں کی صید افگنی سے دل خوش کر کے کابل کے شکار پر گھوڑے اُٹھائے۔ راوی کے کنارے پہ آکر اپنے لباس اور ترکیوں تازیوں کے منہ سے نگامیں اُتار ڈالیں۔ خود امرا اور مصاحبوں سمیت دریا سے پیر کر پار ہو گئے۔ اقبال اکبری کی دستگیری سے سب صحیح سلامت اُتر گئے۔ ملا خوشخبر خاں کہ جس طرح خوشخبری کے لانے میں پیش قدم تھا۔ یہاں پیش روی کر کے کنارۂ عدم پر جا نکلا۔ اس عجیب شکارگاہ کی ایک پرانی تصویر ہاتھ آئی۔ ناظرین کے معائنہ کے لئے آئینہ دکھاتا ہوں ✦

سواری کی سیر

سلطنت کی شکوہ اور دولت و حشمت کے انبوہ۔ جشن سالگرہ اور جشن جلوس پر بہار دکھاتے تھے۔ بارگاہ جلال آراستہ۔ تخت مرصع زرّین و سیمین چبوترے پر جلوہ گر۔ تاج اقبال میں ہما کا پر۔ چتر جواہر نگار سر پر۔ زر بغت کا شامیانہ موتیوں۔ کے جھالر۔ سونے روپے کے استادوں پر تنا۔ ابریشمیں قالینوں کے فرش۔ در و دیوار پر شالہائے کشمیری۔ مخملہائے رومی۔ اطلسہائے چینی لہراتے۔ امرا دست بستہ دو طرفہ حاضر۔ چوبدار۔ خاص بردار اہتمام کرتے پھرتے ہیں۔ ان کے زرق برق لباس۔ سونے روپے کے نیزوں اور عصاؤں پر باناتی اور سقرلاطی غلاف۔ طلسمات کی پتلیاں تھیں خدمت کرتی پھرتی تھیں۔ شادی مبارکبادی کی چہل پہل اور عیش و عشرت کی ریل پیل ہوتی ہے۔

بارگاہ کے دونوں طرف شہزادوں اور امیروں کے خیمے۔ باہر دونوں طرف سواروں اور پیادوں کی قطار۔ بادشاہ دو منزلی راوٹی (جھروکے) میں آبیٹھتے۔ اس کا زر دوزی خیمہ۔ سایۂ اقبال کا شامیانہ۔ شہزادے۔ امرا۔ سلاطین آتے۔ انہیں خلعت و انعام ملتے۔ منصب بڑھتے۔ روپے۔ اشرفیاں۔ سونے چاندی کے پھول اولوں کی طرح برستے۔ یکا یک حکم ہوتا کہ ہاں لوٹ لو۔ بڑے فرّاشوں اور خواصوں نے منتوں بادلا اور مقیش کتر کر جھولیوں میں بھر لیا ہے۔ اور صندلیوں پر چڑھ کر اڑا رہے ہیں۔ نقار خانے میں نوبت جھڑ رہی ہے۔ ہندوستانی۔ عربی۔ ایرانی۔ تورانی۔ فرنگی باجے بجتے ہیں۔ غرض گہما گہمی تھی۔ اور ناز و نعمت کے لئے صلائے عام تھا۔

اب دولہا کے سامنے سے عروس دولت کی برات گزرتی ہے۔ نشان کا ہاتھی آگے۔ اس کے بعد اور ہاتھیوں کی قطار۔ پھر ماہی مراتب اور اور نشانوں کے ہاتھی۔ جنگی ہاتھیوں پر فولادی پاکھریں۔ پیشانیوں پر ڈھالیں۔ بعض کی مستکوں پر دیو زادی نقش و نگار۔ بعض کے چہروں پر گینڈوں۔ ارنے بھینسوں اور

شیروں کی کھالیں کلّوں سمیت چڑھی ہوئی۔ ہیبت ناک صورت ڈراؤنی مورت سونڈوں میں گرز۔ برچھیاں تلواریں لئے۔ سانڈنیوں کا سلسلہ جن کے سو سو کوس کے دم۔ گردن کھچی۔ سینے تنے۔ جیسے لقا کبوتر۔ پھر گھوڑوں کی قطاریں۔ عربی۔ ایرانی۔ ترکی۔ ہندوستانی آراستہ پیراستہ ساز و یراق میں غرق۔ چالاکی میں برق اُچھلتے۔ مچلتے۔ کھیلتے۔ کودتے۔ شوخیاں کرتے چلے جاتے تھے۔ پھر شیر و پلنگ چیتے۔ گینڈے بہتیرے جنگل کے جانور سدھے سدھائے شائستہ چیتوں کے چھکڑوں پر نقش ونگار۔ گل گلزار۔ آنکھوں پر زردوزی غلاف وہ اور ان کے بیل۔ کشمیری شالیں۔ مخمل و زربفت کی جھولیں اوڑھے۔ بیلوں کے سروں پر کلغیاں اور تاج۔ سینگ مصوروں کی قلمکاری سے قلمدان کشمیر۔ پاؤں میں جھانجن۔ گلے میں گھنگرو۔ چھم چھم کرتے چلے جاتے تھے۔ شکاری کتے کہ شیر سے منہ نہ پھرائیں۔ شکار کی بو پر پتال سے پتا نکال لائیں۔

پھر خاصے کے ہاتھی آتے۔ ان کی زرق برق کا عالم اللہ اللہ۔ آنکھوں کو چکا چوندی آتی تھی۔ یہ خاص الخاص چاہیتے تھے۔ اُن کی جھلابور جھولیں۔ موتی اور جواہر ٹنکے۔ زیوروں میں لدے پھندے۔ قوی ہیکل سینوں پر سونے کی ہیکلیں لٹکتی۔ سونے چاندی کی زنجیریں۔ سونڈوں میں ہلاتے۔ جھومتے جھامتے خوش مستیاں کرتے چلے جاتے تھے۔

سواروں کے دستے۔ پیادوں کے قشوں (پلٹنیں)، سپاہ ترک کے ترکی و تاتاری لباس۔ وہی جنگ کے سلاح۔ ہندوستانی فوجوں کا اپنا اپنا بانا — کیسری دگلے۔ سورما راجپوت ہتھیاروں میں ادپچی بنے۔ دکھنیوں کے دکھنی سامان۔ توپ خانے۔ آتش خانے اُن کی فرنگی و رومی وردیاں سب اپنے اپنے باجے بجاتے۔ راجپوت شہنائیوں میں کڑکے گاتے۔ اپنے نشان لہراتے چلے تھے۔ امراء و سردار اپنی اپنی سپاہ کو انتظام سے لئے جاتے تھے۔ جب سامنے پہنچتے۔ سلامی بجالاتے۔ دمامے پر ڈنکا پڑتا۔ سینوں میں دل ہل جاتے۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ فوج اور لوازمات فوج اور ہر شے کی موجودات ہو جائے۔ کوتاہی ہو تو پوری ہو جائے قباحت ہو تو اصلاح میں آئے۔ ایجاد مناسب اپنی جگہ پائے۔

اکبر کی تصویر

اکبر کی تصویریں جا بجا موجود ہیں۔ مگر چونکہ سب میں اختلاف ہے اس لئے کسی پر اعتبار نہیں۔ میں نے بڑی کوشش سے چند تصویریں مہاراجہ جے پور کے پوتھی خانہ سے حاصل کیں۔ اُن میں جو اکبر کی تصویر ملی۔ وہ سب سے زیادہ معتبر سمجھتا ہوں۔ اور اُسی کی نقل سے اس مرقع کا تاج سر کرتا ہوں۔ لیکن یہاں اُس کی تصویر کو جلوہ دیتا ہوں جو کہ جہانگیر نے اپنی توزک میں عبادت و الفاظ سے کھینچی ہے۔ حلیہ مبارک اُن کا یہ تھا کہ بلند بالا میانہ قد۔ گندمی رنگ۔ آنکھیں اور بھویں سیاہ۔ گورہ پن نے صورت کو خنک نہیں کیا تھا نمکینی زیادہ تھی شیر اندام سینہ کشادہ۔ چھاتا اُبھرا ہوا۔ دست و بازو لمبے۔ بائیں نتھنے پر ایک مسا آدھے چنے کے برابر۔ جو لوگ علم قیافہ میں مہارت رکھتے تھے اسے بڑی دولت و اقبال کا نشان سمجھتے تھے۔ آواز بلند تھی۔ گفتگو میں لذت اور قدرتی نمکینی تھی۔ اور سج دھج میں عام لوگوں کو ان سے کچھ مناسبت نہ تھی۔ شکوہ خداداد اُن کے صورت حال سے نمودار تھی +

سفر میں بارگاہ کا کیا نقشہ تھا

جب دورہ کا سفر یا شکار کا لطف منظور نظر ہوتا تھا تو مختصر لشکر اور ضروری شکوہِ سلطنت کے اسباب ساتھ لئے جاتے تھے۔ لیکن چار دانگ ہندوستان کا شہنشاہ ۴۴ لاکھ سپاہ کا سپہ سالار اس کا اختصار بھی ایک عالم کا پھیلاؤ تھا۔ آئین اکبری میں جو کچھ لکھا ہے آج کے لوگوں کو مبالغہ نظر آتا ہے۔ مگر یورپ کے سیاح جو اُس وقت یہاں آئے۔ ان کے بیان سے بھی حالات مذکورہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ بارگاہ کی شان و شکوہ کاغذی سجاوٹ میں کب آ سکتی ہے۔ شکار میں اور پاس کے سفر میں جو انتظام ہوتا تھا۔ اس کا نقشہ کھینچتا ہوں:-

گلال بار - یہ چوبی سراپردہ خرگاہ کی وضع کا ہوتا تھا۔ تسموں سے مضبوطی کی جاتی تھی۔ سُرخ ململ - بانات - قالینوں سے سجاتے تھے۔ گرد عمدہ احاطہ ایک قلعہ تھا۔ اس میں مضبوط دروازہ۔ قفل۔ کنجی سے کھلتا تھا۔ سوگز سے سوگز یا زیادہ۔ حضور کا ایجاد ہے +

اس کے شرقی کنارے پر **بارگاہ** - بیچ کے استادوں پر دو کڑیاں - ۵۴ کمروں میں تقسیم - ہر ایک کا ۲۴ گز طول - ۱۴ گز عرض - ۱۰ ہزار آدمی پر سایہ ڈالتی تھی ہزار پھرتیلے فراش ایک ہفتے میں سجاتے تھے - چرخیاں پہیئے وغیرہ جرثقیل کے اوزار زور لگاتے تھے - لوہے کی چادریں اسے مضبوط کرتی تھیں - فقط سادی بارگاہ جس میں مخمل زربفت - کمخواب - زربفت کچھ نہ لگائیں - ۱۰ ہزار کی لاگت میں کھڑی ہوتی تھی - اور کبھی اس سے بھی زیادہ بوجھ دیتی تھی +

بیچ میں **چوبیں راوٹی** ۱۰ استونوں پر کھڑی ہوتی تھی - ستون تھوڑے تھوڑے زمین میں گڑے ہوئے - سب باہم برابر مگر دو اُونچے - ان پر ایک کڑی - اوپر اور نیچے بواسہ مضبوطی کرتا تھا - اس پر کئی کڑیاں - ان پر لوہے کی چادریں کہ نر مادگی انہیں وصل کرتی تھی - دیواریں اور چھتیں نرسلوں اور بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئیں دروازے دو یا ایک - نیچے کے واسہ کے برابر چبوترہ - اندر زربفت و مخمل سجاتے تھے - باہر بانات سلطانی - ابریشمیں نواڑیں اُس کی کمر مضبوط کرتی تھیں - اور سراپردے +

اس سے ملا ہوا ایک چوبیں محل دو منزلہ ۱۸ ستون اسے سر پر لئے کھڑے رہتے تھے - چھ چھ گز بلند - چھت تختہ پوش - اُس پر چوگزے ستون نرمادگیوں سے وصل ہوکر بالاخانہ سجاتے تھے - اندر باہر اُسی طرح سے سنگار کرتے تھے - لڑائیوں میں اس کا پہلو شبستانِ اقبال سے ملا رہتا تھا - اسی میں عبادت الٰہی کرتے تھے - یہ پاک مکان ایک صاحبدل تھا - ادھر کا رُخ خلوت خانۂ وحدت پر ادھر کا نگارخانہ کثرت پر - آفتاب کی عظمت بھی اسی پر بیٹھ کر ہوتی تھی - پھر اوّل حرم سرا کی بیبیاں دولتِ دیدار حاصل کرتی تھیں - پھر باہر والے حاضر ہوکر سعادت کے ذخیرے سمیٹتے تھے - دوروں کے سفر میں ملازمت بھی یہیں ہوتی تھی - اس کا نام **دو آشیانہ منزل** تھا اور اسی کو جھروکہ بھی کہتے تھے +

۔۔ زمیں دوز۔ طرح طرح کے انداز پر ہوتے تھے۔ ایک کڑی بیچ میں یا دو بیچ میں پردے ڈال کر الگ الگ گھر کر دیتے تھے +

عجائبی ۹ شامیانے چار چار ستونوں پر ملا کر کھڑے کرتے تھے ۔ ۵ چوگوشے۔ بہم مخروطی۔ اور یکلخت بھی ہوتے تھے۔ ایک ایک کڑی بیچ میں +

منڈل ۵ شامیانے ملے ہوئے چار چار ستونوں پر تلتے تھے۔ کبھی گرد کے چار کو لٹکا دیتے تھے تو خلوت خانہ ہو جاتا تھا۔ کبھی ایک طرف کبھی چاروں طرفیں کھول کر جی خوش کرتے تھے +

اٹھ کھنبہ ۱۷ شامیانے جدا اور ملے ہوئے سجاتے تھے ۔ آٹھ آٹھ ستونوں پر +

خرگاہ۔ شیخ ابوالفضل کہتے ہیں۔ مختلف وضع کی ہوتی ہیں۔ یک دری اور دو دری۔ بندہ آزاد کہتا ہے۔ اب تک بھی تمام ترکستان میں صحرانشینوں کے گھر یہی ہیں۔ بید وغیرہ لچکدار درختوں کی موٹی اور پتلی پتلی ٹہنیاں سکھاتے ہیں۔ اور چھوٹی بڑی موقع موقع سے کاٹ کر ایک مدور ٹٹی کھڑی کرتے ہیں۔ بلند قدِ آدم۔ اس پر ویسی ہی موزوں اور متناسب لکڑیوں سے بنگلہ چھاتے ہیں۔ اوپر اور موٹے موٹے صاف۔ عمدہ اور خوشرنگ نمدے منڈھتے ہیں۔ اندر بھی دیواروں پر گلکاری کے نمدے اور قالین سجاتے ہیں۔ اور اُن کی پٹیوں سے حاشیے چڑھاتے ہیں۔ یہ سب انہی کی دستکاری ہوتی ہے۔ چوٹی پر گز بھر مدور دُھوئدان کھلا رکھتے ہیں۔ اس پر ایک نمدہ ڈال دیتے ہیں۔ برف پڑنے لگی تو یہ نمدہ پھیلا رہا۔ ورنہ کھلا رکھتے ہیں۔ جب چاہا لکڑی سے کونہ اُلٹ دیا۔ لطف یہ ہے کہ اس میں لوہا بالکل نہیں لگاتے۔ لکڑیاں آپس میں پھنس جاتی ہیں ۔ جب چاہا کھول ڈالا۔ گٹھے باندھے۔ اونٹ۔ گھوڑوں۔ گدھوں پر لادا اور چل کھڑے ہوئے +

حرم سرا۔ بارگاہ کے باہر موزوں مناسب ۲۴ چوبیں راوٹیاں ۱۰ گز طول ۶ گز عرض۔ بیچ میں قناتوں کی دیواریں۔ اس میں بیگمات اُترتی تھیں۔ کئی خیمے اور خرگاہ اور کھڑے ہوتے تھے۔ اس میں خواصیں اُترتی تھیں۔

آگے سائبان زردوزی - زربفتی مخملی بہار دیتے تھے ✦

اس سے ملا ہوا سرا پردہ گلیمی کھڑا کرتے تھے - یہ ایسا دل بادل تھا کہ اس کے اندر کئی خیمے اور لگاتے تھے - اُردو بیگنیاں اور اور عورتیں ان میں رہتی تھیں

اس کے باہر دولتخانہ خاص تک سو گز عرض کا ایک صحن سجاتے تھے - کہ مہتابی کہلاتا تھا - اس کے دونوں طرف بھی پہلی طرح سراچہ سماں باندھتا تھا - دو دو گز پر چھ گزی چوب کھڑی گز بھر زمین میں گڑی - سروں پر برنجی قبّے - اسے اندر باہر ۲ طنابیں تانے رہتی تھیں - چوکیدار برابر برابر پہرے پر حاضر - اس خوشی خانہ کے بیچ میں ایک صفہ (چبوترہ) اُس پر چار چوبہ شامیانہ - اس پر رات کو جلوس فرماتے تھے - خاصانِ درگاہ کے سوا کسی کو اجازت نہ تھی ✦

گلال بار سے ملا ہوا ۳۰ گز قطر کا دائرہ کھینچتے تھے - ۱۲ حصّوں میں تقسیم کرتے تھے - گلال بار کا دروازہ ادھر نکالتے تھے - ۱۲ شامیانے ۱۲ گزے اس پر سائبانی کرتے تھے - اور قناتیں انہیں خوشنما تراش سے تقسیم کرتی تھیں - اس خلوت خانہ کی ایچکی خانہ کہتے تھے ✦

مناسب اندازے سے ہر مقام پر ایک صحت خانہ ہوتا تھا - یہ پائخانہ کو خطاب ہوا تھا ✦

اس سے ملا ہوا ایک گلیمی پردہ سرا - ۱۵۰ گز مربع - اس کی چوبیں بھی اسی طرح قبّوں سے تاجدار بیچ میں بارگاہ وسیع - ہر افراش اسے سجاتے تھے - ۷۲ کمروں میں تقسیم اوپر ۱۵ گز کا شہتیر ✦ اس کے اوپر قلندری کھڑی کرتے تھے - خیمے کی وضع ہوتی تھی - اوپر مومجامہ وغیرہ اس کے ۵۰ شامیانے ۱۲ گزے دامن پھیلائے کھڑے تھے - یہ دولت خانہ خاص تھا - اس کا دروازہ بھی زنجیر قفل کنجی سے محفوظ ہوتا تھا - بڑے بڑے امیر سپہ سالار بخشی بے اجازت نہ جا سکتے تھے - ہر مہینے اس بارگاہ کو نیا سنگار ملتا تھا - اندر باہر رنگین نقشی بوقلموں فرش اور پردے چمن کھلا دیتے تھے - اس کے گرد ۳۵۰ گز کے فاصلے پر طنابیں کھنچتی تھیں - تین تین گز پر ایک ایک چوب کھڑی ہوئی - جا بجا پاسبان ہشیار - یہ دیوانخانہ عام کہلاتا تھا - ہر جگہ پہرہ دار - خیمیں جا کر ۱۲ طناب کے فاصلے پر ایک طناب ۶۰ گز

کی نقار خانہ +
اس میدان کے بیچ میں اکاس دیا روشن ہوتا تھا۔ اکاس دیئے کئی ہوتے تھے۔ ایک یہاں اور ایک سراپردہ کے آگے کھڑا کرتے تھے۔ ۴۰ گز کا طولانی ستون ہوتا تھا۔ اُسے ۱۵ طنابیں تانے کھڑی رہتی تھیں۔ دور تک روشنی دکھاتا تھا۔ اور بھولے بھٹکے وفاداروں کو اندھیرے میں در دولت کا رستہ بتاتا تھا۔ اور اس کے دائیں بائیں کا حساب لگا کر اور امراء کے خیموں کے پتے لگا لیتے تھے +
۱۰۰ ہاتھی ۵۰۰ اونٹ ۴۰۰ چھکڑے ۱۰۰ کہار ۵۰۰ منصبدار اور احدی۔ ہزار فراش ایرانی و تورانی و ہندوستانی ۵۰۰ بیلدار۔ ۱۰۰ سقّے۔ ۵۰ نجار۔ بہت سے خیمہ دوز مشعلچی۔ ۳۰ چرم دوز۔ ۱۵۰ حلال خور (خاکروب کو خطاب ہؤا تھا) اس آباد شہر کے ساتھ چلتے تھے۔ پیادے کا مہینہ ۲۰ روپے سے ۳ روپے تک تھا ۱۵۰۰ کے ہموار خوشنما قطعہ زمین پر بارگاہ خاص کا سامان پھیلتا تھا۔ ۳۰۰ گز گول فاصلہ دے کر دائیں بائیں پیچھے پہرہ دار کھڑے ہوتے تھے۔ پشت پر بیچوں بیچ میں سوگز کے فاصلے پر مریم مکانی۔ گلبدن بیگم اور اور بیگمات اور شاہزادہ دانیال۔ دائیں پر شاہزادہ سلطان سلیم (جہانگیر) بائیں پر شاہ مراد۔ پھر ذرا بڑھ کر توشہ خانہ۔ آبدار خانہ۔ خوشبو خانہ وغیرہ تمام کارخانے ہر گوشے پر خوشنما چوک۔ پھر اپنے اپنے رُتبے سے اُمرا دونوں طرف۔ غرض لشکر اقبال اور بارگاہ جلال ایک چلتا ہؤا شہر تھا۔ جہاں جا کر اُترتا تھا عیش و عشرت کا میلہ ہوتا تھا۔ جنگل میں منگل ہو جاتا تھا۔ چار چار پانچ پانچ میل تک دو طرفہ بازار لگ جاتے تھے۔ سارا لاؤ لشکر اور سامان مذکور ایک طلسمات کا شہر آباد ہو جاتا تھا اور گلال بار بیچ میں قلعہ نظر آتا تھا +

شکوہ سلطنت

جب دربار آراستہ ہوتا تھا۔ بادشاہ با اقبال اورنگ سلطنت پر جلوہ گر ہوتا تھا۔ اورنگ ہشت پہلو موزوں اور خوشنما تخت تھا۔ گنگا جمنی

یعنی سونے چاندی کے عنصروں سے ڈھلا ہوا۔ دریا نے دل۔ پہاڑ نے جگر نکال کر پیشکش کیا۔ لوگ سمجھے کہ الماس۔ لعل۔ یاقوت اور موتیوں سے مرصع ہے ؎	
ناژم فروتنی کہ جواہر قرار یافت	بانشستے انجم از پے ترصیع تاج و تخت

سر پر چتر زرکار و زرتار جواہر نگار۔ جھالروں میں مروارید و جواہرات جھلمل جھلمل کرتے۔ سواری کے وقت، چتر سے کم نہ ہوتے تھے۔ کوتل ہاتھیوں پر چلتے تھے +

سایہ بان ۔ بیضوی تراش۔ گز بھر بلند۔ دستہ چتر کے برابر۔ اور اسی طرح زربفت اور مخمل زرباف سے سنگارتے تھے۔ جواہرات اور مروارید ٹکے ہوئے چالاک خاص بردار رکاب کے برابر لئے چلتے تھے۔ دھوپ ہو تو سایہ کر لیتے تھے اور اسے **آفتاب گیر** بھی کہتے تھے +

کوکبہ ۔ چند سونے کے گولے صیقل اور جلا سے مبارک ستاروں کی طرح دغدغاتے پیشگاہ دربار میں آویزاں ہوتے تھے۔ اور یہ چاروں بادشاہ کے سوا کوئی شہزادہ یا امیر نہ رکھ سکتا تھا +

علم ۔ سواری کے وقت لشکر کے ساتھ کم سے کم ۵ علم ہوتے تھے ان پر بانات کے غلاف رہتے تھے۔ میدانِ جنگ میں کھل کر ہوا میں لہراتے تھے۔

چتر توغ ۔ ایک قسم کا علم تھا مگر علم سے چھوٹا۔ کئی **قطاس** کے گچھے اس پر طرہ (قطاس سرا گائے یعنی پہاڑی گائے کی دُم) +

تمن توغ ۔ اسے بھی چتر توغ ہی سمجھو۔ اُس سے ذرا اونچا ہوتا تھا۔ یہ دونوں رتبے میں اُونچے تھے اور شہزادوں کے لئے خاص تھے +

جھنڈا ۔ وہی علم۔ پلٹن پلٹن اور رسالے رسالے کا الگ ہوتا تھا بڑا معرکہ ہو تو تعداد بڑھا دیتے تھے۔ نقارے کے ساتھ الگ ہوتا تھا +

کورگہ ۔ عربی میں دمامہ کہتے ہیں۔ ایک نقارخانہ میں کم و بیش ۱۸ جوڑیاں ہوتی تھیں +

نقارہ ۔ کم و بیش ۲۰ جوڑیاں +

دہل ۔ کئی ہوتے تھے۔ کم سے کم ۴ بجتے تھے +

کرنا۔ سونے چاندی اور پیتل وغیرہ سے ڈھالتے تھے۔ چار سے کم نہ بجتی تھیں +

سرنا۔ ایرانی و ہندوستانی کم سے کم ۹ نغمہ سرائی کرتی تھیں نفیر ایرانی و ہندوستانی۔ فرنگی ہر قسم کی کئی نفیریاں نغمہ ریزی کرتی تھیں سینگ گائے کے سینگ کی وضع پر تانبے کا سینگ ڈھال لیتے تھے۔ اور دو بجتے تھے۔ سنج (جھانج) تین جوڑیاں بجتی تھیں +

پہلے ۴ گھڑی رات رہے۔ اور ۴ گھڑی دن رہے نوبت بجا کرتی تھی۔ اکبری عہد میں ایک آدھی ڈھلے بجنے لگی۔ کہ آفتاب چڑھاؤ کے درجہ میں قدم رکھتا ہے۔ دُوسری طلوع کے وقت +

جشنِ نوروزی

نوروز۔ ایک عالم افروز دن ہے کہ ایشیا کے ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ اسے عید مانتے ہیں۔ اور بالفرض کوئی بھی نہ مانے تو بھی موسم بہار ایک قدرتی جوش ہے۔ کہ اپنے وقت پر خود بخود ہر دل میں ذوق شوق پیدا کرتا ہے۔ یہ امر کچھ انسان یا حیوان پر منحصر نہیں بلکہ اُس کا اثر ہر شے میں جان ڈال دیتا ہے۔ انتہا ہے کہ مٹی میں سرسبزی اور سبزی میں گلکاری کرتا ہے۔ بس اسی کا نام عید ہے۔ ترکِ چنگیزی کہ کچھ مذہب نہ رکھتے تھے۔ اور جاہل محض تھے۔ باوجود اس کے ادنیٰ صاحب مقدور سے لے کر امراؤ بادشاہ تک۔ اس دن گھروں کو سجاتے تھے۔ خوان لیغما لگاتے تھے۔ سب مل کر لوٹتے لٹاتے تھے۔ اور اسے سال بھر کے لئے مبارک شگون سمجھتے تھے۔ ایرانی پہلے بھی مانتے تھے۔ زرتشت نے آکر اُس پر مذہبی سکہ لگایا۔ کیونکہ اس کے خیالات کے بموجب آفتاب سب سے روشن دلیل خداشناسی اور حق جوئی کی ہے۔ ہندو بھی اس خیال میں اُن سے متفق ہیں۔ خصوصاً اس جہت سے کہ ان کے بعض مہاراجگان جلیل القدر کے جلوس اور اکثر بڑی بڑی کامیابیاں اسی دن ہوئی ہیں +

اکبر کو انہیں فرقوں سے تعلق تھا۔ اس لئے وہ بھی نوروز کے دن جشن شاہانہ
کے سامان میں فصل بہار کی شان دکھاتا تھا۔ اور سلطنت کا نوروز مناتا تھا چونکہ
وہ ہندوستان میں تھا۔ اور ہندوؤں میں اسے رہنا سہنا اور گزارہ کرنا تھا۔
اس لئے ان کی ریت رسوم کی بھی بہت باتیں داخل کرلی تھیں۔ تمہیں یاد ہے؟
اس بے علم بادشاہ کو علمائے زر پرست نے ذہن نشین کر دیا تھا کہ سنہ ہزار
میں ملک وملت بدل جائیگا اور اس کے صاحب فرمان آپ ہی ہوں گے۔ وہ
اس خوشی میں ایسا بیقرار ہوا کہ جو باتیں سنہ الف پر کرنی تھیں۔ پہلے ہی کر
گزرا۔ یہاں تک کہ سنہ ۹۹۰ھ میں ہی سنہ الف کا سکہ لگا دیا۔ اور جشن نوروزی
کی شان وشکوہ میں بھی عمدہ عمدہ ترقیاں اور فائدہ مند اصلاحوں سے جاہ وجلال
کو جلوہ دیا۔ جشن کے قواعد وآئین نے سال بسال کی ترقیوں سے پرورش پائی مگر
آزاد سب کو ایک جگہ سجاتا ہے کہ دلچسپ تماشا ہے +

دیوان عام وخاص کے گرد ۱۲۰ ایوان عالیشان تھے۔ جن کی عمارت کو خوشنما
اور بیش بہا پتھروں نے سنگین اور رنگین کیا تھا۔ ایک ایک ایوان ایک ایک امیر
باتدبیر کو عنایت ہوا۔ کہ ہر عالی حوصلہ اسے آراستہ کر کے اپنی قابلیت اور
علو ہمت کا نمونہ دکھائے۔ ایک طرف دولت خانۂ خاص تھا۔ وہ خدمت گاران
خاص کے سپرد ہوا کہ آئین بندی کریں۔ **سبھا منڈل** کہ جلوہ گاہِ خاص تھا
سجایا گیا۔ اور تمام مکانات کے در و دیوار کو پرتگالی بانات رومی وکاشانی مخمل۔
بنارسی زربفت وکمخواب۔ سیلے دوپٹے۔ تاش تمامی۔ گوٹے ٹھپے۔ پیک مقیش
کے خلعت پہنائے۔ کشمیر کی شالیں اُڑھائیں۔ ایران وترکستان کی قالین پانداز
میں بچھا دئے۔ ملک فرنگ اور چین اور ماچین کے زنگارنگ پردے۔ نادر
تصویریں۔ عجیب وغریب آئینے سجائے۔ شیشہ اور بلور کے کنول۔ مردنگ۔
قندیلیں۔ جھاڑ۔ فانوسیں۔ قمقمے لٹکائے۔ شامیانے تانے۔ آسمانی خیمے بلند
کئے۔ مکانات کے صحنوں میں بہار نے آکر گلکاری کی اور کشمیر کے گلزاروں کو
تراش کر فتحپور اور آگرہ میں رکھ دیا۔ اسے مبالغہ نہ سمجھنا۔ جو اُس وقت ہوا۔
اس سے بہت کم ہے۔ یہ جو کہ آج آزاد لکھتا ہے۔ جب عالم ہی اور تھا۔ وہ اصل

حال تھا۔ آج خواب و خیال ہے۔ وہ وہ سامان جمع تھے کہ عقل دیکھتی تھی۔ اور حیران تھی +

اگلے وقتوں کے امرا کو بھی ہر قسم کی عجیب غریب اور عزیز الوجود چیزوں کا شوق ہوتا تھا۔ اور جس قدر یہ سامان زیادہ ہوتا تھا۔ اُس سے اُن کے سلیقہ اور ہمت و حوصلے کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ اوصاف عموماً امیری کے لازمے تھے۔ مگر قاعدہ ہے کہ ہر شخص کو بمقتضائے طبیعت خاص خاص قسم کی چیزوں کا یا مختلف صنائع و بدائع میں سے ایک دو کا دلی شوق ہوتا ہے۔ بلکہ بعضوں کے عہدے اور منصب اشیائے خاص کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں چنانچہ **خانخاناں** اور **خان اعظم** کے ایوان ملک ملک کے صنائع و بدائع سے ایک کامل نمائش گاہ بنے ہوئے تھے۔ جن کے در و دیوار۔ فصل بہار کی چادر کو ہاتھوں پر پھیلائے کھڑے تھے۔ اور ہر ستون ایک باغ کو بغل میں دبائے تھا۔ اکثر امرا نے اسلحہ حرب کے عمدہ نمونے دکھلائے تھے کہ ہندوستان سے جمع کئے تھے۔ اور اور ملکوں سے منگائے تھے۔ **شاہ فتح اللہ** نے اپنے ایوان میں علوم و فنون کا طلسم باندھ کر ہر بات میں نکتہ اور نکتہ میں باریکی پیدا کی تھی۔ گھڑیاں اور گھنٹے چل رہے تھے۔ علم ہیئت کے آلات۔ کُرے۔ رُبع مجیب اسطرلاب نظام فلکی کے نقشے۔ اور ان کی مجسم مورتوں میں سیارے اور افلاک چکّر مار رہے تھے۔ جرِّ اثقال کی کلیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ علم کیمیا اور علم نیرنجات کے شعبدے ساعت بساعت رنگ بدل رہے تھے دانایانِ فرنگ موجود تھے۔ **بیلان** (بیلون) کا خیمہ کھڑا تھا۔ **ارغنول**[۱] (آرگن) کا صندوق رنگارنگ کی آوازیں سناتا تھا۔ ممالک روم و فرنگ کی عمدہ

[۱] ملا صاحب ۹۸۸ھ میں لکھتے ہیں ارغنون باجا آیا۔ کہ عجائب مخلوقات سے ہے حاجی حبیب اللہ فرنگستان سے لایا تھا بادشاہ محظوظ ہوئے۔ اہل دربار کو بھی دکھایا۔ ایک بڑا صندوق تھا قدِ آدم۔ ایک فرنگی اندر بیٹھ کر تار بجاتا تھا۔ دو باہر بیٹھتے تھے۔ صندوق میں مور کے پر لگے تھے اُن کی جڑوں پر انگلیاں مارتے تھے۔ کیا کیا آوازیں نکلتی تھیں لکہ روح پر اثر ہوتا تھا۔ فرنگی دم بدم کبھی سرخ کبھی زرد۔ بوقلموں ہو ہو کر نکلتے تھے۔ اور ساعت بساعت رنگ بدلتے تھے۔ عجب عالم تھا۔ اہل مجلس حیران تھے۔ کیفیت اُس کی ٹھیک ٹھیک ادا نہیں ہو سکتی +

صنعتیں اور انوکھی دستکاریاں جادو کا کام اور اچنبھے کا تماشا تھیں۔ انہوں نے تھیٹر کا ہی سماں باندھا تھا۔ جس وقت بادشاہ آکر بیٹھے۔ موسیقیٔ فرنگ نے مبارک باد کی نغمہ سرائی شروع کی۔ باجے بج رہے تھے۔ فرنگی ساعت بساعت رنگ برنگ کے برن بدل کر آتے تھے۔ اور غائب ہو جاتے تھے۔ پرستان کا عالم نظر آتا تھا +

ف۔ اکبر بادشاہ فقط ملک کا بادشاہ نہ تھا۔ ہر فن اور ہر کام کا بادشاہ تھا۔ ہمیشہ علوم و فنون کی پرورش اور ترقی کی فکر میں رہتا تھا۔ اس کی قدردانی نے دانایانِ فرنگ کو بندر گووہ۔ سورت۔ اور ہگلی سے بُلاکر اس طرح رخصت کیا۔ کہ یورپ کے ممالک مختلفہ سے لوگ اُٹھ اُٹھ کر دَوڑے۔ اپنے اور ملک ملک کے صنائع و بدائع لاکر پیشکش کئے۔ اس موقع پر اُن سب کے نمونے سجائے گئے۔ اور ہندوستان کے صنعت گروں نے بھی اپنی دستکاریاں دکھا کر شاباش و آفرین کے پھول سمیٹے +

نوروز سے لے کر ۱۸ دن تک ہر ایک امیر نے اپنے اپنے ایوان میں ضیافت کی۔ حضور رونق افروز ہوئے اور بے تکلّف اور دوستانہ ملاقات سے محبت و اتحاد کی بنیاد دلوں میں استوار کی۔ امرا نے اپنے رتبے کے بموجب پیشکش گزرانی۔ ارباب طرب اور اہل نشاط کے طوائف۔ کشمیری۔ ایرانی۔ تورانی۔ ہندوستانی گویّے۔ ڈوم۔ ڈھاڑی۔ میراثی۔ کلاونت۔ گائک۔ ناٹک۔ سپروائی۔ ڈومنیاں۔ پاترکنچنیاں ہزار در ہزار جمع ہوئیں۔ دیوان خاص اور دیوان عام سے لیکر بازوؤں کے نقارخانوں تک جا بجا مقامات تقسیم ہو گئے تھے۔ جدھر دیکھو راجہ اندر کا اکھاڑا تھا +

جشن کی ریت رسوم کی بھی سیر دیکھو۔ روز جشن سے ایک دن پہلے مبارک ساعت سمہ لگن میں ایک سہاگن بی بی اپنے ہاتھ سے وال دلتی۔ اسے گنگا جل میں بھگوتی بیٹھی پیس کر رکھتی۔ جشن کی ساعت قریب آئی۔ بادشاہ اشنان کو گئے۔ رنگین جوڑا۔ ساعت اور ستاروں کے موافق حاضر۔ جامہ پہنا۔ کھڑکی دار پگڑی راجپوتی انداز سے باندھی۔ مکٹ سر پر رکھا کچھ اپنا خاندانی کچھ ہندوانی گہنا پہنا۔ جوتشی اور نجومی اسطرلاب لگائے بیٹھے ہیں۔ جشن کی

ساعت آئی۔ برہمن نے ماتھے پر ٹیکا لگایا۔ جواہر نگار کنگن ہاتھ میں باندھا۔ کوٹلے دہک رہے ہیں۔ خوشبوئیاں تیار ہیں۔ اُدھر ہون ہونے لگا۔ چوکے میں کڑھائی چڑھی ہے۔ یہاں اس میں برا پڑا وہاں بادشاہ نے تخت پر قدم رکھا۔ نقارۂ دولت پر چوٹ پڑی۔ نوبت خانہ میں نوبت بجنے لگی کہ گنبدِ گردوں گونج اُٹھا +

خوانوں اور کشتیوں پر زرنگار طورہ پوش پڑے۔ موتیوں کے جھالر لٹکتے۔ امرا لئے کھڑے ہیں۔ سونے روپے کے بادام۔ پستے وغیرہ میوہ جات۔ روپے اشرفیاں۔ جواہر اس طرح نچھاور ہوئے جیسے اولے برستے ہیں۔ دربار ایک مرقع قدرتِ الٰہی کا تھا۔ راجوں کے راجہ مہاراجہ اور بڑے بڑے ٹھاکر کہ فلک سے سر نہ جھکائیں۔ ایرانی۔ تورانی سردار کہ رستم و اسفندیار کو خاطر میں نہ لائیں۔ خود۔ زرہ۔ بکتر۔ چار آئینہ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق۔ تصویر کا عالم کھڑے ہیں۔ خاص شہزادوں کے سوا کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ اوّل شہزادوں نے پھر امرائے نے درجہ بدرجہ نذریں دیں۔ سلام گاہ پر گئے۔ وہاں سے تخت گاہ تک تین جگہ آداب و کورنش بجالائے۔ جب چوتھا سجدہ کہ آداب زمین بوس کہلاتا تھا ادا کیا تو نقیب نے آواز دی کہ آداب بجالاؤ۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت۔ ظلِ الٰہی بادشاہ سلامت۔ ملک الشعرا نے سامنے آکر قصیدہ مبارکباد کا پڑھا۔ خلعت و انعام سے سربلند ہوا +

برس میں دو دفعہ تلادان ہوتا تھا (۱) نوروز۔ سونے کی ترازو کھڑی ہوتی۔ بادشاہ ۱۲ چیزوں میں تُلتا تھا۔ سونا۔ چاندی۔ ابریشم۔ خوشبوئیاں۔ لوہا۔ تانبا۔ جست۔ توتیا۔ گھی۔ دودھ۔ چاول۔ ست نجا۔ (۲) جشن ولادت۔ قمری حساب سے ۵ رجب کو ہوتا تھا۔ اس میں چاندی۔ قلعی۔ کپڑا۔ ۱۲ میوے شیرینی۔ تلوں کا تیل۔ سبزی سب کچھ برہمنوں اور عام فقیروں غریبوں کو بٹ جاتا تھا۔ اسی حساب سے شمسی تاریخ کو +

مینا بازار۔ زنانہ بازار

ترکستان میں دستور ہے کہ ہفتے میں دو دفعہ یا ایک دفعہ ہر شہر میں اور اکثر دیہات میں بازار

لگتے ہیں۔ اُس آبادی کے اور اکثر پانچ پانچ چھ چھ کوس سے آس پاس کے لوگ پچھلی رات سے گھروں سے نکلتے ہیں۔ دن نکلے مقام پر آکر جمع ہوتے ہیں عورتیں برقع سروں پر نقابیں منہ پر۔ ابریشم۔ سُوت۔ ٹوپیاں۔ رومال پھلکاری اپنی دستکاری یا ضرورت کی ماری جو کچھ ہو بیچنے کو لاتی ہیں۔ مرد ہر قسم کے پیشہ در اپنی اپنی جنس سے بازار کو گرم کرتے ہیں۔ مرغی اور انڈے سے لے کر گراں بہا گھوڑوں تک، اور گزی گاڑھے سے لے کر قیمتی قالین تک۔ میوہ جات سے لے کر اقسام غلہ بُھس اور گھانس تک۔ تیل گھی۔ مسگری۔ نجّاری۔ لُہاری کے کام یہاں تک کہ مٹی کے باسن تک سب موجود ہوتے۔ اور دو پہر میں سب بک جاتے ہیں۔ اکثر لین۔ دین مبادلے میں ہوتے ہیں۔ بادشاہ نیک آئین نے اسے اصلاح و تہذیب کیسا تھ رونق دی۔ آئین اکبری میں لکھا ہے کہ ہر مہینے معمولی بازار کے تیسرے دن قلعہ میں زنانہ بازار لگتا تھا۔ غالباً یہ امر آئین میں داخل ہوگا۔ عمل اس پر کبھی کبھی ہوتا ہوگا جب جشن کے آداب و آئین شان و شکوہ میں اپنے خزانے خالی کر لیتے۔ اور آرائش اور زیبائش کی بھی ساری دستکاری خرچ ہو چکتی۔ تو اُن ایوانوں میں جو درحقیقت ایجاد اور عقل و شعور کے بازار تھے۔ زنانہ ہو جاتا۔ وہاں محل کی بیگمات آتی تھیں۔ کہ ذرا ان کی آنکھیں کھلیں اور سلیقے کی آنکھوں میں سگھڑاپے کا سرمہ لگائیں۔ امراء و شرفاء کی بیبیوں کو بھی اجازت تھی جو چاہے آئے۔ اور تماشا دیکھے۔ دکانوں پر تمام عورتیں بیٹھ جاتی تھیں۔ سوداگری اور سودا زیادہ زنانہ رکھا جاتا تھا۔ خواجہ سرا۔ قلماقنیاں۔ اُردہ بیگنیاں اسلحہ جنگ سجے انتظام کے گھوڑے دوڑاتی پھرتی تھیں۔ عورتیں ہی پہروں پر ہوتی تھیں۔ مالیوں کی جگہ مالنیں چمن آرائی کرتی تھیں اس کا نام **خوش روز تھا**۔

نیک نیت بادشاہ آپ بھی آتا تھا۔ اور اپنی رعیت کی بہو بیٹیوں کو دیکھ کر ایسا خوش ہوتا تھا کہ ماں باپ بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہوں گے۔ جہاں مناسب جگہ دیکھتے تھے بیٹھ جاتے تھے۔ بادشاہ بیگم بہنیں۔ بیٹیاں پاس بیٹھتی تھیں۔ امراء کی بیبیاں آکر سلام کرتیں۔ نذریں دیتیں۔ بچوں کو سامنے حاضر کرتیں۔ ان کی نسبتیں حضور میں قرار پاتی تھیں۔ اور حقیقت میں یہ بھی

آئینِ سلطنت کا ایک جزو تھا۔ کیونکہ یہی لوگ اجزائے سلطنت تھے۔ شطرنج کے مہروں کی طرح باہم تعلّق رکھتے تھے۔ اور آپس میں ایک ایک کا زور ایک ایک کو پہنچ رہا تھا۔ ان کے باہمی محبت و عداوت۔ اتفاق و اختلاف اور ذاتی نفع و نقصان کے اثر بادشاہ کے کاروبار تک پہنچتے[1] تھے۔ ان کی نسبتوں کے معاملے خواہ اس جشن پر خواہ کسی اور موقع پر ایک مبارک تماشا دکھاتے تھے۔ کبھی دو امیروں میں ایسا بگاڑ ہوتا تھا کہ دونوں یا ایک ان میں سے راضی نہ ہوتا تھا اور بادشاہ چاہتے تھے کہ ان میں بگاڑ نہ رہے بلکہ اتحاد ہو جائے۔ اس کا یہی علاج تھا کہ دونوں گھر ایک ہو جائیں۔ جب وہ کسی طرح نہ مانتے تو بادشاہ کہتے تھے کہ اچھا یہ لڑکا یا لڑکی ہماری تمہیں اس سے کچھ کام نہیں۔ وہ یا اس کی بی بی نازخانہ زادی سے کہتے۔ حضور! لونڈی بھی اس بچّے سے دستبردار۔ آخر حضور ہی کے لئے پالا تھا۔ محنت بھر پائی۔ باپ کہتا۔ کرامات! بہت مبارک۔ مگر خانہ زاد کو اب اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ غلام حق سے ادا ہوا۔ بادشاہ کہتے۔ بہت خوب ہم نے بھی وصول پایا۔ کبھی بیگم بیاہ کا ذمّہ لے لیتیں۔ کبھی بادشاہ لے لیتے اور شادی کا سرانجام اس طرح ہوتا۔ کہ ماں باپ سے بھی نہ ہو سکتا۔

دنیا کے معاملات سخت نازک ہیں۔ کوئی بات ایسی نہیں جس کے فوائد کے

---

[1] عبدالرحیم خان خاناں کو دیکھا کہ بن باپ کا لڑکا ہے اور بیرم خاں کا بیٹا ہے بعض امراء تک دربار میں ہیں جن کے دلوں میں کانٹا سا کھٹک رہا ہے۔ چنانچہ شمس الدین محمد خاں آتکہ کی بیٹی یعنی خانِ اعظم مرزا عزیز کوکہ کی بہن سے اُس کی شادی کر دی۔ اب بھلا مرزا عزیز کوکہ کب چاہیگا کہ عبدالرحیم کو کچھ صدمہ پہنچے اور بہن کا گھر برباد ہو۔ اور عبدالرحیم جس کے گھر میں آتکہ کی بیٹی خانِ اعظم کی بہن ہے۔ اس کے دل میں وہ خیال کب باقی رہ سکتا ہے۔ کہ اُس کا باپ میرے باپ پر تلوار کھینچ کر سامنے ہوا تھا۔ اور لشکر خونریز کے ساتھ مقابلہ کیا تھا۔ خان خاناں کی بیٹی سے دانیال نے اپنے بیٹے کی شادی کر دی۔ قلیچ خاں کہ سپہ سالار تھا اور ۴ ہزاری منصب رکھتا تھا۔ اُس کی بیٹی سے مراد کی شادی کر دی سلیم (جہانگیر) سے مان سنگھ کی بہن بیاہی تھی۔ اور اس کے بیٹے خسرو سے خانِ اعظم کی بیٹی کی شادی کی تھی وغیرہ وغیرہ مصلحت اس میں یہی تھی کہ ہر شاہزادہ اور امیر کو اس طرح آپس میں مسلسل اور وابستہ کر دیں۔ کہ ایک کا زور دوسرے کو نقصان نہ پہنچا سکے۔

ساتھ نقصان کا کھٹکا نہ لگا ہو۔ اسی آمد و رفت میں سلیم (جہانگیر) کا دل زین خاں کوکہ کی بیٹی پر آیا۔ اور ایسا آیا کہ قابو ہی میں نہ رہا۔ غنیمت ہوا کہ اس کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ اکبر نے خود شادی کر دی۔ لیکن قابلِ عبرت وہ معاملہ ہے جو کم سن سال بزرگوں سے سُنا ہے یعنی یہی مینا بازار لگا ہوا تھا۔ بیگمات پڑی پھرتی تھیں۔ جیسے باغ میں قمریاں یا ہر یاول میں ہرنیاں جہانگیر ان دنوں نوجوان لڑکا تھا۔ بازار میں پھرتا ہوا چمن میں آ نکلا۔ ہاتھ میں کبوتر کا جوڑا تھا۔ سامنے کوئی پھول کھلا ہوا نظر آیا کہ عالم سرور میں بہت بھایا۔ چاہا کہ توڑے۔ دونوں ہاتھ رُکے ہوئے تھے۔ وہیں ٹھیر گیا۔ سامنے سے ایک لڑکی آئی۔ شہزادہ نے کہا کہ بوا ذرا ہمارے کبوتر تم لے لو ہم وہ پھول توڑ لیں۔ لڑکی نے دونوں کبوتر لے لئے۔ شہزادہ نے کیاری میں جا کر چند پھول توڑے۔ پھر کر آیا تو دیکھا کہ لڑکی کے ہاتھ میں ایک کبوتر ہے۔ پوچھا دوسرا کبوتر کیا ہوا؟ عرض کی۔ صاحب عالم! وہ تو اُڑ گیا۔ پوچھا۔ ہیں! کیونکر اُڑ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسری مُٹھی بھی کھول دی کہ حضور یُوں اُڑ گیا۔ اگرچہ دوسرا کبوتر بھی ہاتھ سے گر گیا مگر شہزادے کا دل اس انداز پر لوٹ گیا۔ پوچھا تمہارا کیا نام ہے؟ عرض کی مہرنسا خانم۔ پوچھا تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟ عرض کی مرزا غیاث۔ حضور کا ناظمِ بیوتات ہے۔ کہا اور امرا کی لڑکیاں محل میں آیا کرتی ہیں۔ تم ہمارے ہاں نہیں آتیں؟ عرض کی میری اماں جان تو آتی ہیں۔ مجھے نہیں لاتیں۔ ہمارے ہاں لڑکیاں گھر سے باہر نہیں نکلا کرتیں۔ آج بھی بڑی منتوں سے یہاں لائی ہیں۔ کہا تم ضرور آیا کرو۔ ہمارے ہاں بڑی احتیاط سے پردہ رہتا ہے۔ کوئی غیر نہیں آتا۔

وہ سلام کر کے رخصت ہوئی۔ جہانگیر باہر آ گیا۔ مگر دونوں کو خیال رہا تقدیر کی بات ہے کہ پھر جو مرزا غیاث کی بی بی بیگم کے سلام کو محل میں جانے لگی تو بیٹی کے کہنے سے اُسے بھی ساتھ لے لیا۔ بیگم نے دیکھا بچپن کی عمر۔ اس میں ادب قاعدے کا لحاظ۔ سلیقہ اور تمیز اُس کی بہت بھلی معلوم ہوئی۔ باتیں چیتیں پیاری لگیں۔ بیگم نے بھی کہا اسے تم ضرور لایا کرو۔ آہستہ آہستہ آمد و رفت زیادہ ہوئی۔ شہزادے کا یہ عالم کہ جب وہ ماں کے پاس آئے تو وہاں موجود۔ وہ دادی کے سلام کو جائے تو یہ وہاں حاضر۔ کسی نہ کسی بہانے سے خواہ مخواہ اُس سے بولتا۔ بات چیت کرتا تو اُس کا طور ہی

کچھ اور۔ نگاہوں کو دیکھو تو انداز ہی کچھ اور۔ بیگم تاڑ گئی اور خلوت میں بادشاہ سے عرض کی۔ اکبر نے کہا۔ مرزا غیاث کی بی بی کو سمجھا دو۔ چند روز لڑکی کو یہاں نہ لائے۔ اور مرزا غیاث سے کہا کہ لڑکی کی شادی کر دو۔

جب خان خاناں بھکر کی مہم پر تھا تو طہماسپ قلی بیگ ایک بہادر نوجوان شریف زادہ ایران سے آیا تھا اور مہم مذکور میں کارنمایاں کر کے اُس کے مصاحبوں میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ شریف نواز شرافت پرست اُسے ساتھ لایا تھا۔ اور حضور میں اُس کی خدمتیں عرض کر کے دربار میں داخل کیا تھا۔ اُس نے شجاعت اور دلاوری کے دربار سے شیر افگن خاں خطاب حاصل کیا تھا بادشاہ نے اُس کے ساتھ نسبت ٹھیرا دی۔ اور جلد ہی شادی کر دی۔ یہی شادی اُس جوان نامراد کی بربادی تھی۔ تدبیر میں کوتاہی نہیں ہوئی۔ تقدیر سے کس کا زور چل سکتا ہے؟ انجام اُس کا یہ ہوا کہ جو ہونا تھا سو ہوا۔ شیر افگن خاں موت کا شکار ہو کر جوانمرگ دُنیا سے گیا۔ مہرنسا بیوہ ہوئی۔ چند روز کے بعد جہانگیری محلوں میں آ کر نور جہاں بیگم ہو گئی۔ افسوس نہ جہانگیر رہے نہ نور جہاں رہیں ناموں پر دھبہ رہ گیا۔

بیرم خاں۔ خان خاناں

جس وقت شہنشاہ اکبر خود اختیار صاحب دربار ہوا۔ اُس وقت یہ امیر ملک گیر دربار میں نہ رہا تھا۔ لیکن اس میں کسی کو انکار نہیں کہ اکبر بلکہ ہمایوں کی بنیادِ سلطنت بھی اس نے دوبارہ ہندوستان میں قائم کی۔ پھر بھی میں سوچتا تھا کہ اسے دربار اکبری میں لاؤں یا نہ لاؤں۔ یکایک اُس کی جانفشاں خدمتیں اور بے خطا تدبیریں سفارش کو آئیں۔ ساتھ ہی شیرانہ حملے اور رُستمانہ کارنامے مدد کو آ پہنچے۔ وہ شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ اُسے لائے۔ دربار اکبری درجۂ اوّل پر جگہ دی اور نعرۂ شیرانہ کی آواز میں کہا۔ یہ وہی سپہ سالار ہے جو ایک ہاتھ پر نشان شاہی لئے تھا۔ کہ خوش نصیبی اس کی جس کے پہلو میں چاہے سایہ کر کے

قائم ہو جائے۔ دوسرے ہاتھ میں تدابیر وزارت کا ذخیرہ تھا کہ جس کی طرف چاہے نظامِ سلطنت کا رُخ پھیر دے۔ نیک نیتی کے ساتھ نیکوکاری اسکی مصاحب تھی اور اقبال خداداد مددگار تھا۔ کہ وہ فیروزمند جس کام پر ہاتھ ڈالتا تھا پورا پڑتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ تمام مؤرخوں کی زبانیں اس کی تعریفوں میں خشک ہوتی ہیں۔ اور کسی نے برائی کے ساتھ ذکر نہیں کیا۔ ملا صاحب نے تاریخی حالات کے ذیل میں بہت جگہ اس کے ذکر کئے ہیں۔ آخر کتاب میں شعرا کے ساتھ بھی شامل کیا ہے وہاں ایک سنجیدہ اور مختصر عبارت میں اس کا برگزیدہ حال لکھا ہے جس سے بہتر کوئی کیفیت خان خاناں کے خصائل و اطوار کی۔ اور سند اُس کے اوصاف کمالات کی نہیں ہو سکتی۔ بعینہٖ اُس کا ترجمہ لکھتا ہوں۔ دیکھنے والے دیکھینگے کہ یہ اجمالی الفاظ اس کے تفصیلی حالات سے کیسی مطابقت کھاتے ہیں ۔ اور سمجھیں گے کہ ملا صاحب بھی حقیقت شناسی میں کس مرتبہ کے شخص تھے ۔ عبارت مذکور کا ترجمہ یہ ہے :۔

وہ مرزا جہاں شاہ کی اولاد میں تھا۔ رموزِ دانش۔ سخاوت ۔ راستی حسنِ خلق۔ نیاز و خاکساری میں سب سے سبقت لے گیا تھا۔ ابتدائے حال میں بابر بادشاہ کی خدمت میں۔ بیچ میں ہمایوں بادشاہ کے حضور میں رہ کر بڑھا چڑھا اور خان خاناں کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ پھر اکبر نے وقت بوقت القاب میں ترقیاں دیں۔ نہایت فقیر دوست ۔ صاحبِ حال اور نیک اندیش تھا ۔ ہندوستان دوبارہ فتح بھی ہوا اور آباد بھی ہوا۔ یہ اسی کی کوشش اور بہادری اور حسنِ تدبیر کی برکت سے ہوا۔ دنیا کے فاضل اطراف و جوانب سے اس کی درگاہ کی طرف رُخ کرتے تھے ۔ اور دریا مثال ہاتھ سے شاداب ہو کر جاتے تھے اُس کی بارگاہِ آسمان جاہ اربابِ فضل و کمال کے لئے قبلہ تھی۔ اور زمانہ اس کے وجود شریف سے فخر کرتا تھا۔ اخیر عمر میں بسبب اہلِ نفاق کی عداوت کے بادشاہ کا دل اُس سے پھر گیا۔ اور وہاں تک نوبت پہنچی جس کا ذکر حالات ۹۶۸ھ میں لکھا گیا۔

شیخ داؤد جہنی وال کے ذکر میں لکھتے ہیں :۔ در عہد بیرم خاں کہ بہترین عہدہا بود و ہند حکم عروس داشت جامع اوراق در آگرہ طالب علمی میکرد +

محمد قاسم فرشتہ نے نسب نامہ کو زیادہ تفصیل دی ہے۔ اور ہفت اقلیم میں اُس سے بھی زیادہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایران کے قراقوئیلو ترکمانوں میں بہارلو قبیلہ سے علی شکر بیگ ترکمان ایک سردار نامی گرامی خاندان تیموری سے وابستہ تھا۔ ولایت ہمدان۔ دینور۔ کردستان۔ اور اس کے متعلقات وغیرہ کا حاکم تھا۔ کتاب ہفت اقلیم اکبر کے عہد میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اب تک وہ علاقہ قلمرو علی شکر مشہور ہے۔ علی شکر کی اولاد میں شیر علی بیگ ایک سردار تھا۔ جب سلطان حسین بایقرا کے بعد سلطنت برباد ہوئی تو شیر علی بیگ کابل کی طرف آیا۔ اور سیستان وغیرہ سے جمعیت پیدا کر کے شیراز پر چڑھ گیا۔ وہاں سے شکست کھا کر پھرا۔ پھر بھی ہمت نہ ہارا۔ ادھر اُدھر سے سامان سمیٹنے لگا۔ آخر بادشاہی لشکر آیا اور انجام کو شیر علی میدان میں قضا کا شکار ہو گیا۔ اُس کا بیٹا اور پوتا یار علی بیگ اور سیف علی بیگ پھر افغانستان میں آئے۔ یار علی بیگ بابر کی یاوری میں پہنچ کر غزنی کا حاکم ہو گیا۔ مگر چند روز بعد مر گیا۔ سیف علی بیگ باپ کا قائم مقام ہوا۔ مگر عمر نے وفا نہ کی۔ اُس کا بیٹا خرد سال با اقبال تھا جو بیرم خاں کے نام سے نامی ہوا۔ سیف علی بیگ کی موت نے عیال کے ایسے دل توڑ دئے کہ کچھ نہ کر سکے۔ چھوٹے سے بچے کو لے کر بلخ میں چلے آئے۔ یہاں اس کے خاندان کے کچھ لوگ رہتے تھے۔ چند روز ان میں رہا۔ کچھ پڑھا لکھا۔ اور ذرا ہوش سنبھالا +

جب بیرم خاں نوکری کے قابل ہوا۔ ہمایوں ان دنوں میں شہزادہ تھا۔ خدمت میں آ کر نوکر ہوا۔ علوم معمولی سے تھوڑا تھوڑا بہرہ حاصل تھا۔ ملنساری حسن اخلاق۔ آداب محفل۔ طبع کی موزونی اور موسیقی میں بھی اچھی آگاہی رکھتا تھا۔ خلوت میں خود بھی گاتا بجاتا تھا۔ اس لئے ہم عمر آقا کے مصاحبوں میں داخل ہو گیا۔

ایک لڑائی میں اس سے ایسا کارنمایاں بن پڑا کہ دفعتہً شہرہ ہو گیا۔ اُس وقت ۱۶ برس کی عمر تھی۔ بابر بادشاہ نے بُلایا خود باتیں کر کے حال پوچھا۔ اور چھوٹے سے بہادر کا بہت سا دل بڑھایا۔ وضع ہونہار۔ پیشانی پر اقبال کے آثار دیکھ کر قدردانی کی اور کہا کہ شہزادہ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا کرو۔ پھر اپنی

خدمت میں لے لیا۔ سعادت مند لڑکا کارگزاری اور جاں نثاری کے بموجب ترقّی پانے لگا۔ ہمایوں بادشاہ ہوا تو پھر اُس کی حضوری میں رہنے لگا۔

اس شفیق آقا اور وفادار نوکر کے حالات و معاملات دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں فقط محبّت نہ تھی بلکہ ایک قدرتی اتحاد تھا۔ جس کی کیفیّت بیان میں نہیں آسکتی۔ ہمایوں دکن کی مہم میں جانپانیر کے قلعہ کو گھیرے پڑا تھا۔ یہ قلعہ ایسی کڈھب جگہ پر تھا کہ ہاتھ آنا بہت مشکل تھا۔ بنانے والوں نے ایسے ہی وقت کے لئے عمودی پہاڑوں کی چوٹی پر بنایا تھا۔ اور گرد اُس کے جنگل اور درختوں کا بن رکھا تھا۔ اُس وقت دشمن بہت سا کھانا دانہ بھر کر خاطر جمع سے اندر بیٹھ رہے تھے۔ ہمایوں قلعہ کو گھیرے باہر پڑا تھا۔ عرصہ کے بعد پتہ لگا کہ ایک طرف سے جنگل کے لوگ رسد کی ضروری چیزیں لے کر آتے ہیں۔ قلعہ والے اُوپر سے رسّے ڈال کر کھینچ لیتے ہیں۔ ہمایوں نے بہت سی فولادی اور چوبی میخیں بنوائیں۔ ایک رات اُسی چور رستہ کی طرف گیا۔ پہاڑ میں اور قلعہ کی دیوار میں گڑوا کر رسّے ڈلوائے۔ سیڑھیاں لگوائیں۔ اُدر اُور طرف سے لڑائی شروع کی۔ قلعہ والے تو اُدھر جھکے۔ اِدھر سے پہلے ۳۹ بہادر جانوں پر کھیل کر رسّوں اور سیڑھیوں پر چڑھے۔ جن میں چالیسواں دلاور خود بیرم خاں تھا۔ لطیفہ۔ اُس نے کمند کے پیچ میں عجیب لطیفہ سر کیا۔ ایک رسّی کی گرہ پر ہمایوں نے قدم رکھا کہ اوپر چڑھے۔ بیرم خاں نے کہا ٹھیریئے ذرا میں اس پر زور دے کر دیکھ لُوں رسی مضبوط ہے ہمایوں پیچھے ہٹا۔ اس نے جھٹ حلقہ میں پاؤں رکھا اور چار قدم مار کر دیوار قلعہ پر نظر آیا۔ غرض صبح ہوتے ہوتے تین سو جانباز اوپر پہنچ گئے۔ اور خود بادشاہ بھی جا پہنچا۔ صبح کا دروازہ ابھی بند تھا جو قلعہ فتح ہو کر کُھل گیا۔

سنہ ۹۴۶ھ میں جوسہ کے مقام پر شیر شاہ کی پہلی لڑائی میں بیرم خاں نے سب سے پہلے ہمّت دکھائی اپنی فوج لے کر بڑھ گیا دشمن پر جا پڑا۔ حملہ ہائے مردانہ اور چپقلشہائے ترکانہ سے غنیم کی صف کو تہ و بالا کر دیا۔ اور اُس کے لشکر کو اُلٹ کر پھینک دیا۔ مگر امرائے ہمراہی کوتاہی کر گئے۔ اس لئے کامیاب نہ ہوا۔ اور لڑائی نے طول کھینچا۔ انجام یہ ہوا کہ غنیم نے فتح پائی اور ہمایوں شکست

کھا کر آگرہ بھاگ آیا۔ یہ وفادار کبھی تلوار بن کر آقا کے آگے ہوا کبھی سپر بن کر پشت پر رہا۔ دوسری لڑائی نواحِ قنوّج میں ہوئی۔ ہمایوں کی قسمت نے یہاں بھی وفا نہ کی۔ بدحالی سے شکست کھائی۔ امرا اور فوج اس طرح پریشان ہوئی کہ ایک کو ایک کا ہوش نہ رہا۔ مارے گئے باندھے گئے۔ ڈوب گئے۔ بھاگ گئے۔ اور بیاباں مرگ ہوئے ؎

بیاباں مرگ ہے مجنوں خاک آلودہ تن کیسکا ہے
سئے ہے سوزنِ خارِ مغیلاں تو کفن کیسکا؟

اِنہی میں وہ جاں نثار بھی بھاگا اور سنبھل کی طرف جا نکلا۔ میاں عبدالوہاب رئیس سنبھل سے اس کا پہلے سے اتحاد تھا انہوں نے اپنے گھر میں رکھا۔ مگر ایسا نامی آدمی چھپے کہاں۔ اس لئے متر سین لکھنؤ کے راجہ کے پاس بھیج دیا کہ علاقہ جنگل میں ہی چند روز تم رکھو۔ مدّت تک وہاں رہا۔ نصیر خاں حاکم سنبھل کو خبر ہوگئی۔ اُس نے متر سین کے پاس آدمی بھیجا۔ متر سین کی کیا تاب تھی کہ شیر شاہی امیر کے آدمیوں کو ٹال دے۔ ناچار بھیج دیا۔ نصیر خاں نے قتل کرنا چاہا۔ یہاں مسندِ عالی عیسیٰ خاں کہ کہن سال امیر زادہ افغانوں کا تھا۔ شیر شاہ کا بھیجا ہوا آیا تھا۔ اُس کی اور میاں عبدالوہاب کی سکندر لودی کے وقت سے دوستی تھی۔ میاں نے عیسیٰ خاں سے کہا کہ نصیر خاں ظالم ایسے نامور اور عالی ہمت سردار کو قتل کرنا چاہتا ہے ہو سکے تو کچھ مدد کرو۔ میاں کا اور اُن کے خاندان کی بزرگی کا سب لحاظ کرتے تھے۔ عیسیٰ خاں گئے اور قید سے چھڑا کر اپنے گھر لے آئے ۔

شیر شاہ نے عیسیٰ خاں کو ایک مہم پر بُلا بھیجا۔ یہ مالوہ کے رستہ میں جا کر ملے۔ بیرم خاں کو ساتھ لے گئے تھے۔ اُس کا بھی ذکر کیا۔ اُس نے منہ بنا کر پوچھا اب تک کہاں تھا۔ مسندِ عالی نے کہا شیخ ملہن قتال کے ہاں پناہ لی تھی۔ شیر شاہ نے کہا بخشیدم۔ عیسیٰ خاں نے کہا خون تو ان کی خاطر سے بخشا اسپ و خلعت بیری سفارش سے دیجئے۔ اور ابوالقاسم گوالیار سے آیا ہے حکم دیجئے کہ اُس کے پاس اُترے شیر شاہ نے کہا قبول ۔

شیر شاہ وقت پر لگاوٹ بھی ایسی کرتے تھے۔ کہ بلّی کو مات کر دیتے تھے۔

؎ دیکھو تاریخ شیر شاہی جو اکبر کے حکم سے لکھی گئی تھی ۔

بیرم خاں کی سرداری کی اب بھی ہوا بندھی ہوئی تھی۔ شیر شاہ بھی جانتے تھے ۔ کہ صاحب جوہر ہے ۔ اور کام کا آدمی ہے ۔ ایسے آدمیوں کے یہ خود تابعدار ہو جاتے تھے ۔ اور کام لیتے تھے ۔ چنانچہ جس وقت وہ سامنے آیا تو شیر شاہ کھڑے ہو کر گلے ملا اور دیر تک باتیں کیں ۔ وفا اور اخلاص کے باب میں گفتگو تھی ۔ شیر شاہ دیر تک دلجوئی کی غرض سے باتیں کرتا رہا ۔ اسی سلسلہ میں اس کی زبان سے یہ فقرہ نکلا "ہر کہ اخلاص دارد خطا نمے کند"، خیر وہ جلسہ برخاست ہوا ۔ شیر شاہ نے اُس منزل سے کوچ کیا ۔ یہ اور ابوالقاسم بھاگے ۔ رستہ میں شیر شاہ کا ایلچی ملا وہ گجرات سے آتا تھا ۔ اور اُن کے بھاگنے کی خبر سُن چکا تھا مگر کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی ۔ دیکھ کر شُبہ ہوا ۔ ابوالقاسم قد و قامت میں بلند بالا اور خوش اندام تھا ۔ جانا کہ یہی بیرم خاں ہے اسے پکڑ لیا ۔ بیرم خاں کی نیک ذاتی و جوانمردی اور نیک نیتی پر ہزار آفرین ہے کہ خود آگے بڑھا اور کہا کہ اسے کیوں پکڑا ہے بیرم خاں تو میں ہوں ۔ ابوالقاسم کو دس ہزار آفرین ۔ کہا کہ یہ میرا غلام ہے مگر وفادار ہے ۔ اپنی جان کو حق نمک پر فدا کرنا چاہتا ہے اسے چھوڑ دو ۔ خیر ۔ بے قضا نہ کوئی مر سکے نہ بچ سکے ۔ وہ بے چارہ شیر شاہ کے سامنے آکر مارا گیا ۔ اور بیرم خاں سورت کا مُنہ چڑا کر صاف نکل گئے ۔ شیر شاہ کو بھی خبر ہوئی ۔ اس ماجرے کو سُنکر افسوس کیا ۔ اور کہا ۔ جب اُس نے ہمارے جواب میں کہا تھا کہ چنیں راست ہر کہ جوہرِ اخلاص دارد خطا نمے کند ۔ ہمیں اسی وقت کھٹکا ہوا کہ یہ اٹکنے والا نہیں ۔ جب خدا نے پھر اپنی خدائی کی شان دکھائی ۔ اکبر کا زمانہ تھا اور وہ ہندوستان کے سفید و سیاہ کا مالک تھا ۔ تو ایک دن کسی مصاحب نے پوچھا کہ مسند عالی عیسےٰ خاں اُس وقت آپ سے کس طرح پیش آئے تھے ۔ خان خاناں نے کہا جان اُنہوں نے بچائی تھی ۔ وہ ادھر آئے نہیں اور تو کیا کروں اگر آئیں تو کم سے کم چندیری کا علاقہ نذر کروں ۔ بیرم خاں وہاں سے گجرات پہنچا سلطان محمود سے ملا ۔ وہ بھی بہت چاہتا تھا ۔ کہ میرے پاس رہے ۔ اس سے حج کے بہانے رخصت لے کر بندر سورت میں آیا ۔ اور وہاں سے آقا پیارے کا پتا لیتا ہوا سندھ کی سرحد میں جا پہنچا ۔ ہمایوں کا حال سُن ہی چکے ہو ۔ کہ قنوج کے میدان سے بھاگ کر آگرہ میں آیا ۔ قسمت برگشتہ ۔

بھائیوں کے دل میں دغا۔ امراء بے وفا۔ سب نے یہی کہا کہ اب یہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔ لاہور میں بیٹھ کر صلاح ہو گی۔ یہاں آ کر کیا ہونا تھا۔ کچھ نہ ہوا۔ یہ ہوا کہ غنیم شیر ہو کر دبائے چلا آیا۔ ناکام بادشاہ نے جب دیکھا کہ دغا باز بھائی وقت ٹال رہے ہیں۔ اور پھنسانے کی نیت ہے۔ اور غنیم ہندوستان پر چھاتا ہوا سلطان پور کنار بیاس تک آ پہنچا ہے۔ ناچار ہند کو خدا حافظ کہہ کر سندھ کا رُخ کیا اور ۳ برس تک وہاں قسمت آزماتا رہا۔ جب بیرم خاں وہاں پہنچا ہمایوں مقام جون کنارۂ دریائے سندھ پر ارغونیوں سے لڑتا تھا۔ روز معرکے ہو رہے تھے۔ اگرچہ شکست دیتا تھا مگر رفیق مارے جاتے تھے جو تھے اُن سے وفا کی اُمید نہ تھی۔ خان خاناں جس دن پہنچا، محرم ۹۵۰ھ تھی۔ لڑائی ہو رہی تھی۔ اس نے آتے ہی دور سے یہ لطیفہ نذر کیا کہ ملازمت بھی نہ کی سیدھا میدان جنگ میں پہنچا۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے نوکروں اور خدمتگاروں کو ترتیب دیا۔ اور ایک طرف سے موقع دیکھ کر حملہ ہائے مردانہ اور نعرہ ہائے شیرانہ شروع کر دیئے۔ لوگ حیران ہوئے کہ یہ غیبی فرشتہ کون اور کہاں سے آیا۔ دیکھیں تو بیرم خاں۔ ساری فوج خوشی کے مارے غُل مچانے لگی۔ ہمایوں اس وقت ایک بلندی سے دیکھ رہا تھا۔ حیران ہوا کہ معاملہ کیا ہے۔ چند نوکر پاس حاضر تھے۔ ایک آدمی دوڑ کر آگے بڑھا اور خبر لایا کہ خانخاناں آ پہنچا۔

یہ وہ وقت تھا کہ ہمایوں ہندوستان کی کامیابی سے مایوس ہو کر چلنے کو تیار تھا۔ کملایا ہوا دل شگفتہ ہو گیا۔ اور ایسے جاں نثار با اقبال کے آنے کو سب مبارک شگون سمجھے۔ جب حاضر ہوا تو ہمایوں نے اُٹھ کر گلے لگا لیا۔ دونوں مل کر بیٹھے۔ مدتوں کی مصیبتیں تھیں، اپنی اپنی کہانیاں سُنائیں۔ بیرم خاں نے کہا کہ یہ جگہ اُمید کا مقام نہیں۔ ہمایوں نے کہا چلو جس خاک سے باپ دادا اُٹھے تھے اُسی پر چل کر بیٹھیں۔ بیرم خاں نے کہا کہ جس زمین سے حضور کے والد نے پھل نہ پایا حضور کیا لیں گے۔ ایران کو چلیئے وہ لوگ مہمان پرور اور مسافر نواز ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے کہ امیر تیمور جدِ اعلیٰ حضور کے تھے۔ ان کے ساتھ شاہ صفی نے کیا کچھ کیا۔ ان کی اولاد نے دو دفعہ آپ کے والد کو مدد دی۔ ماوراءالنہر پر قبضہ دلایا۔ تھمنا

نہ تھمنا خدا کے اختیار ہے۔ رہا یا نہ رہا۔ اور ایران فدوی اور فدوی کے بزرگوں کا وطن ہے۔ وہاں کے کاروبار سے غلام خوب واقف ہے۔ ہمایوں کی بھی سمجھ میں آگیا اور ایران کا رُخ کیا +

اس وقت بادشاہ اور امرائے ہمراہی کی حالت ایک لُٹے قافلے کی تصویر تھی۔ یا کاروان دفا کی فہرست جس میں سب نوکر چاکر مل کر ۷۰ آدمی سے زیادہ نہ تھے۔ لیکن جس کتاب میں دیکھا اوّل نمبر پر بیرم خاں کا نام نظر آتا ہے۔ اور حق پوچھو تو اس کے نام سے فہرست کی پیشانی کو چمکانا چاہیئے تھا۔ وہ رزم کا بہادر اور بزم کا مصاحب سایہ کی طرح پیارے آقا کے ساتھ تھا۔ جب کوئی شہر پاس آتا۔ تو آگے جاتا اور اس خوبصورتی سے مطالب ادا کرتا کہ جا بجا شاہانہ شان سے استقبال اور نہایت دھوم دھام سے ضیافتیں ہوتی گئیں۔ قزوین کے مقام سے شاہ کی خدمت میں نامہ لے کر پہنچا اور اس خوبی سے وکالت کا حق ادا کیا۔ کہ شاہ مہمان نواز آبدیدہ ہوا۔ بیرم خاں کی بھی بہت خاطر کی۔ اور بڑی عزت سے مہمان داری کی۔ جو مراسلہ جواب میں لکھا اس میں عزت واحترام کے ساتھ کمال شوق ظاہر کیا۔ اور یہ شعر بھی لکھا ؎

	اگر ترا گذرے بر مقامِ ما اُفتد		ہمائے اوج سعادت بدامِ ما اُفتد	

جب تک ایران میں رہے وہ ہما کا سایہ ہمایوں کے ساتھ تھا۔ ہر ایک کام اور پیغام اسی کے ذریعے سے طے ہوتا تھا بلکہ شاہ اکثر خود بُلا بھیجتا تھا۔ کیونکہ عقل و دانش کے ساتھ اس کی مزہ مزہ کی باتیں اور حکایتیں اور شعر و سخن۔ لطائف و ظرائف سُن کر وہ بھی بہت خوش ہوتا تھا۔ شاہ یہ بھی سمجھ گیا کہ یہ خاندانی سردار نمک حلالی اور وفاداری کا جوہر رکھتا ہے۔ اسی واسطے طبل و علم کے ساتھ خانی کا خطاب عطا کیا تھا۔ اور شکار جرگہ میں بھی جو رتبہ بھائی بند شہزادوں کا ہوتا ہے وہ بیرم خاں کا تھا +

جب ہمایوں ایران سے پھر ادھر آیا تو قندھار کو گھیرے پڑا تھا۔ بیرم خاں کو ایلچی کر کے کامران مرزا اپنے بھائی کے پاس کابل بھیجا کہ اُسے سمجھا کر راہ پر لائے۔ اور یہ نازک کام حقیقت میں اسی کے قابل تھا۔ رستہ میں ہزارے

کی قوم نے روکا اور سخت لڑائی ہوئی۔ بہادر نے ہزاروں کو مارا اور سینکڑوں کو باندھا اور بھگایا۔ میدان صاف کرکے کابل پہنچا۔ وہاں کامران سے مِلا۔ اور راس انداز سے مطلب ادا کئے کہ اس وقت اس کا پتھر دل بھی نرم ہوا۔ کامران سے کچھ کام نہ نکلا۔ البتہ اتنا فائدہ ہوا کہ بعض شہزادے اور اکثر سردار کچھ اس کی رفاقت میں اور کچھ اس کی قید میں تھے۔ سب سے جُدا جُدا مِلا۔ ہمایوں کی طرف سے بعض کو تحفے دیئے بعض کو مراسلوں کے ساتھ بہت سے محبت کے پیام پہنچائے اور سب کے دلوں کو پرچا یا۔ کامران نے اتنا پر دھکیا۔ کہ ڈیڑھ مہینے کے بعد خانزاد بیگم بڑی پھوپھی کو بیرم خاں کے ساتھ مرزا عسکری کی طرف روانہ کیا کہ اسے سمجھائے اور ہمایوں کو عذر معذرت کے ساتھ صلح کا پیغام بھیجا۔

جب ہمایوں نے قندھار فتح کیا۔ تو جس طرح شاہ سے اقرار کر آیا تھا۔ وہ علاقہ ایرانی سپہ سالار کے حوالے کر دیا۔ اور آپ کابل کو چلا۔ جسے کامران بھائی دبائے بیٹھا تھا۔ امرا نے کہا جاڑے کا موسم سر پہ ہے۔ رستہ گڈھب ہے عیال اور اسباب کا ساتھ لے چلنا مشکل ہے۔ بہتر ہے کہ قندھار سے بداغ خاں کو رخصت کیا جائے۔ حرم بادشاہی بھی یہاں آرام پائینگے۔ اور خانزادوں کے عیال بھی اُن کے سایہ میں رہینگے۔ ہمایوں کو بھی یہ صلاح پسند آئی۔ اور بداغ خاں کو پیغام بھیجا۔ ایرانی فوج نے کہا۔ کہ جب تک ہمارے شاہ کا حکم نہ آئے۔ ہم یہاں سے نہ جائینگے۔ ہمایوں لشکر سمیت باہر پڑا تھا۔ ملک برفانی اُس پر بے سامانی غرض سخت تکلیف میں تھے۔

امرا نے سپاہیانہ منصوبہ کھیلا۔ پہلے کئی دن ولایتی اور ہندی سپاہی بھیس بدل کر شہر میں جاتے رہے۔ گھاس اور لکڑیوں کی گٹھڑیوں میں ہتھیار پہنچاتے رہے۔ ایک دن صبح نور کے تڑکے گھاس کے اونٹ لدے ہوئے شہر کو جاتے تھے۔ کئی سردار اپنے اپنے بہادر سپاہیوں کو ساتھ لئے اُنہیں کی آڑ میں دبکے دبکے شہر کے دروازہ پر جا پہنچے۔ یہ جانباز مختلف دروازوں سے گئے تھے۔ چنانچہ گنہگان دروازہ سے بیرم خاں نے بھی حملہ کیا تھا۔ پہرے والوں کو کاٹ کر ڈال دیا۔ اور دم کے دم میں اس طرح پھیل گیا۔ کہ ایرانی حیرانی میں آگئے۔

ہمایوں مع لشکر شہر میں داخل ہؤا۔ اور جاڑا آرام سے بسر کیا۔

لطیفہ یہ ہے کہ شاہ کو بھی خالی نہ چھوڑا۔ ہمایوں نے مراسلہ لکھا کہ بداغ خاں نے تعمیل احکام میں کوتاہی کی اور ہمراہی سے انکار کیا۔ اس لئے مناسب معلوم ہؤا کہ اس سے ملک قندھار لیا جلئے۔ اور بیرم خاں کے سپرد کیا جائے۔ کہ بیرم خاں دامنِ دولت سے وابستہ ہے۔ اور خاک ایران کا پتلا ہے۔ یقین ہے کہ اب بھی ملک مذکور کو آپ دربار ایران سے متعلق سمجھیں گے۔ خاص اس معرکہ میں بیرم خاں کی ہمت یا حسن تدبیر پر اہلِ نظر بہت سوچ کر رائے لگائیں کہ قابل تعریف ہے یا محل اعتراض۔ کیونکہ سے جس زور سے اپنے آقا کی خدمت کے لئے جانفشانی کرنی واجب تھی۔ اُسی طرح آقا کو یہ بھی سمجھانا واجب تھا کہ برف کا موسم گزر جائیگا مگر بات رہ جائیگی۔ اور دربار ایران بلکہ ملک ایران اس معاملہ کو سُن کر کیا کہیگا جس لشکر اور سر کی بدولت ہم کو یہ دن نصیب ہوئے اُسی کو ہم تلوار سے کاٹیں اور اس برف و باران میں تلوار کی آنچ دکھا کر گھروں سے نکالیں کب مناسب ہے افسوس باوفا بیرم یہ اُس شاہ کی فوج اور سردار فوج ہے جس سے خلوت و جلوت میں تم کیا کیا باتیں کرتے تھے۔ اور اب اگر کوئی موقع آن پڑے وہاں جانے کا منہ ہے یا نہیں۔ بیرم خاں کے طرفدار ضرور کہینگے کہ وہ نوکر تھا۔ اور اس اکیلے آدمی کی رائے جلسۂ مشورت کو کیوں کر دبا سکتی تھی۔ اسے یہ بھی خطر ہوگا کہ امرائے ماوراءالنہری آقا کے دل میں میری طرف سے یہ شک نہ ڈالیں کہ بیرم خاں ایرانی ہے۔ ایرانیوں کی طرفداری کرتا ہے۔

دوسرے برس ہمایوں نے پھر کابل پر فوج کشی کی اور فتح پائی۔ بیرم خاں کو قندھار کا حاکم کر کے چھوڑ آیا تھا۔ کابل کا فتحنامہ جو ہمایوں نے لکھا تو یہ شعر خود کہے اور اپنے ہاتھ سے اُن پر لکھے اور فتحنامے کو محبت نامہ بنا کر بیرم خاں کو بھیجا۔

مثنوی

شکر للہ کہ باز شادانیم	بر رخ یار دوست خندانیم	دشمناں را بکام دل دیدیم	میوۂ باغ فتح را چیدیم
روز نوروز بیرم است امروز	دل احباب بے غم است امروز	شاد باد اہمیشہ خاطر یار	غم نگزرد بگرد یار و دیار
ہمہ اسباب عیش آمادہ است	دل بفکر وصالت افتادہ است	کہ جمال حبیب کے بینیم	گل ز باغ وصال کے چینیم

گوش خرم شود ز گفتارت	دیدہ روشن شود ز دیدارت	در حریم حضور شاد بہم	بنشینیم خرم و بے غم
بعد ازاں فکر کار ہند کنیم	عزم تسخیر ملک سند کنیم	ہر درے بستہ کشادہ شود	ہر چہ خواہیم ازاں زیادہ شود
آنچہ خواہیم از زمان و زمین	گوید آمین جبرئیلِ امین	یا الٰہی میسرم گرداں	دو جہاں را مسخرم گرداں

اور خط کے حاشیہ پر یہ رباعی لکھی۔ رباعی

اے آنکہ انیس خاطر محزونی	چوں طبع لطیف خویش موزونی	بے یاد تو ام نیست زمانے ہرگز	آیا تو بیادِ من محزوں چونی

بیرم خاں نے اس کے جواب میں اس طرح عقیدت ظاہر کی۔ رباعی

اے آنکہ بذات سایہ بیچونی	از ہر چہ ترا وصف کنم افزونی	چوں میدانی کہ بے تو چوں میگزرد	چوں مے پرسی کہ در فراقم چونی

بیرم خاں قندھار میں تھا وہاں کے انتظام کرتا تھا۔ اور جو جو حکم پہنچتے تھے نہایت گرمجوشی اور عرقریزی سے تعمیل کرتا تھا۔ باغیوں اور نمک حراموں کو کبھی مار کر بھگاتا تھا کبھی تابع کر کے دربار کو روانہ کرتا تھا +

تاریخ کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وطن کے امرا و شرفا نے بابر سے کیسی بیوفائی اور نمک حرامی کی تھی۔ مگر اس کی مروت نے بے وفاؤں سے کبھی آنکھ نہ چرائی تھی اُسی باپ کی آنکھ سے ہمایوں نے سرمۂ مروت کا نسخہ لیا تھا۔ اس لئے بخارا و سمرقند اور فرغانہ کے بہت لوگ آن موجود ہوئے تھے۔ اوّل تو قدیم الایام سے توران کی خاک ایران کی دشمن ہے۔ اس کے علاوہ تورانیوں کا مذہب بھی سنت و جماعت ہے۔ ایرانی تمام شیعہ۔ غرض سنہ ۹۶۱ھ میں ہمایوں کو شبہ ڈالا کہ بیرم خاں قندھار میں خودسری کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور شاہ ایران سے سازش رکھتا ہے۔ صورت احوال کے سامان ایسے تھے کہ ہمایوں کی نظر میں اس شبہ کا سایہ یقین کا پتلا بن گیا۔
ع چوں مضامین جمع گردد شاعری دشوار نیست + کابل کے جھگڑے۔ ہزاروں اور افغانوں کی سرشوریاں۔ سب اُسی طرح چھوڑیں اور چند سواروں کے ساتھ گھوڑے مار کر خود قندھار پر جا کھڑا ہؤا۔ بیرم خاں بڑا رمز شناس اور معاملہ فہم تھا۔ اُس نے بدگویوں کی بدی اور ہمایوں کی بدگمانی پر ذرا دل میلا نہ کیا۔ اور اس عقیدت اور عجز و نیاز سے خدمت بجالایا۔ کہ خود بخود چغل خوروں کے منہ کالے ہوگئے۔ دو مہینے ہمایوں وہاں ٹھیرا۔ ہندوستان کی مہم سامنے تھی خاطر جمع سے کابل کو پھرا۔ بیرم خاں کو بھی حال معلوم ہوگیا تھا۔ چلتے ہوئے عرض کی۔ غلام کو

حضور اپنی خدمت میں لے چلیں۔ منعم خاں یا جس جاں نثار کو مناسب سمجھیں یہاں چھوڑیں۔ ہمایوں بھی اُس کے جوہروں کو پرکھ چکا تھا۔ اُس کے علاوہ قندھار ایک ایسے نازک موقع پر واقع ہؤا تھا۔ کہ اِدھر ایران کا پہلو تھا۔ اُدھر ترکانِ اُزبک کا۔ اِدھر سرکش افغانوں کا۔ اس لئے وہاں سے اس کا سرکانہ مصلحت نہ سمجھا۔ بیرم خاں نے عرض کی کہ اگر یہی مرضی ہے تو ایک اور سردار میری اعانت کو مرحمت ہو۔ چنانچہ بہادر خاں علی قلی خاں شیبانی کے بھائی کو زمین داور کا حاکم کر کے چھوڑا +

ایک دفعہ کسی ضرورت کے سبب سے بیرم خاں کابل میں حاضر ہؤا۔ اتفاقاً عید رمضان کی دوسری تاریخ تھی۔ ہمایوں بہت خوش ہؤا۔ اور بیرم خاں کی خاطر سے باسی عید کو تازہ کر کے دوبارہ جشن شاہانہ کے ساتھ دربار کیا۔ دوبارہ نذریں گذریں اور سب کو خلعت اور انعام و اکرام دیئے۔ قبق اندازی اور چوگان بازی کے ہنگامے گرم ہوئے۔ بیرم خاں اکبر کو لے کر میدان میں آیا۔ اسی ۱۰ برس کے لڑکے نے جاتے ہی کدو پر تیر مارا اور ایسا صاف اُڑایا کہ غُل مچ گیا بیرم خاں نے مبارک باد میں قصیدہ کہا۔ مطلع

عقدِ قبق۔ بود خدنگ تو از گجگ		کردِ از ہلال صورتِ پرویں شہا بحک

اکبر کے عہد میں بھی کئی سال قندھار اِس کے نام پر رہا شاہ محمد قندھاری اس کی طرف سے نائب تھا وہی انتظام کرتا تھا +

ہمایوں نے آ کر کابل کا انتظام کیا اور لشکر لے کر ہندوستان کو روانہ ہؤا۔ بیرم خاں سے کب بیٹھا جاتا تھا۔ قندھار سے برابر عرضیاں شروع کر دیں کہ اس مہم میں غلام خدمت سے محروم نہ رہے۔ ہمایوں نے فرمان طلب بھیجا۔ وہ اپنے پُرانے پُرانے کار آزمودہ دلاوروں کو لے کر دوڑا اور پشاور کے ڈیروں لشکر میں شامل ہؤا۔ سپہ سالاری کا خطاب ملا۔ اور صوبہ قندھار جاگیر میں عنایت ہو کر ہندوستان کو روانہ ہوئے۔ یہاں بھی امرا کی فہرست میں سب سے پہلے بیرم خاں کا نام نظر آتا ہے۔ جس وقت پنجاب میں داخل ہوئے۔ اِدھر اُدھر کے ضلعوں میں بڑے بڑے لشکر افغانوں کے پھیلے ہوئے تھے۔ مگر اوبار آ چکا تھا کہ انہوں نے

کچھ بھی ہمت نہ کی۔ لاہور تک بے جنگ ہمایوں کے ہاتھ آیا۔ ہمایوں لاہور میں ٹھیرا اور امرا کو آگے روانہ کیا۔ افغان کہیں کہیں تھے۔ مگر جہاں تھے گھبرائے ہوئے تھے۔ اور آگے کو بھاگے جاتے تھے۔ جالندھر پر لشکر شاہی کا مقام تھا خبر آئی کہ تھوڑی دُور آگے افغانوں کا انبوہ کثیر جمع ہوگیا ہے۔ خزانہ و مال بھی سب ساتھ ہے۔ اور آگے کو جایا چاہتا ہے۔ تردی بیگ مال کے عاشق تھے۔ اُنہوں نے چاہا کہ بڑھ کر ہاتھ ماریں۔ خان خاناں سپہ سالار نے کہلا بھیجا کہ مصلحت نہیں۔ بادشاہی جمیعت تھوڑی ہے غنیم کا انبوہ ہے اور خزانہ و مال اس کے پاس ہے۔ مبادا کہ پلٹ پڑے اور مال کے لئے جان پر کھیل جائے۔ اکثر امرا کی رائے خانخاناں کے ساتھ تھی۔ یہ اس نے نہ مانا اور چاہا کہ اپنی جمیعت کے ساتھ دشمن پر جا پڑے۔ دوستوں میں تلوار چل گئی۔ طرفین سے بادشاہ کو عرضیاں گئیں۔ وہاں سے ایک امیر فرمان لیکر آیا۔ اپنوں کو آپس میں ملایا اور لشکر آگے روانہ ہوا۔

ستلج پر آکر پھر اختلاف ہوا خبر لگی کہ ماچھی واڑہ کے مقام پر ۳۰ ہزار افغان ستلج پار پڑے ہیں۔ خانخاناں اسی وقت اپنی فوج لے کر روانہ ہوا کسی کو خبر نہ کی اور ملا مار ندیا پار اُتر گیا۔ شام قریب تھی کہ دشمن کے قریب جا پہنچا۔ جاڑے کا موسم تھا خبر دار نے خبر دی کہ افغان ایک آبادی کے پاس پڑے ہیں۔ اور خیموں کے آگے لکڑیاں اور گھاس جلا جلا کر سینک رہے ہیں تاکہ جاگتے رہیں۔ اور روشنی میں رات کی بھی حفاظت رہے۔ اس نے اور بھی غنیمت سمجھا۔ دشمن کی کثرت کا ذرا خیال نہ کیا ایک ہزار سوار سے کہ خاص جاں نثار تھے۔ گھوڑے اُٹھائے اور فوج دشمن کے پہلو پر جا کھڑا ہوا۔ وہ بجواڑہ کے مقام میں پانی کے کنارے پر پڑے تھے سر اُٹھایا تو موت چھاتی پر نظر آئی۔ گھبرا گئے۔ احمقوں نے جتنی لکڑیاں اور گھاس کے ڈھیر تھے سب میں بلکہ اُن کے ساتھ آبادی کے چھپروں میں بھی آگ لگادی۔ کہ خوب روشنی ہوجائیگی تو دشمن کو اچھی طرح دیکھیں گے۔ ترکوں کو اور بھی موقع ہاتھ آیا۔ خوب تاک تاک کر نشانے مارنے لگے۔ افغانوں کے لشکر میں کھلبلی پڑ گئی۔ علی قلی خاں شیبانی کہ خاں خاناں دستگیری سے ہمیشہ قوی بازو تھا۔ سنتے ہی دوڑا اور اور سرداروں کو خبر ہوئی وہ بھی اپنی اپنی فوجیں لے کر دوڑا دوڑ آن پہنچے۔

افغان بدحواس ہو گئے۔ لڑائی کا بہانہ کر کے سوار ہوئے۔ خیمے ڈیرے اسباب اسی طرح چھوڑا اور سیدھے دلّی کو بھاگ گئے۔ بیرم خاں نے فوراً خزانوں کا بندوبست کر لیا۔ جو عجائب و نفائس گھوڑے ہاتھی ہاتھ آئے عرضی کے ساتھ لاہور کو روانہ کئے۔ ہمایوں نے عہد کیا تھا کہ جب تک جئے گا۔ ہندوستان میں کسی بندے کو بردہ نہ سمجھیگا چنانچہ جو عورت لڑکا لڑکی گرفتار ہوئے تھے سب کو چھوڑ دیا۔ اور ترقی اقبال کی دعائیں لیں۔ اُس وقت ماچھی واڑے میں بڑی آبادی تھی۔ بیرم خاں آپ وہاں رہا۔ اور سرداروں کو جابجا افغانوں کے پیچھے روانہ کیا۔ دربار میں جب عرضی پیش ہوئی۔ اور اجناس و اموال نظر سے گزرے سب خدمتیں مقبول ہوئیں۔ اور القاب میں خانخاناں کے خطاب پر یار وفادار اور ہمدم غمگسار کے الفاظ بڑھا ئے۔ اُس کے نوکروں کے لئے کیا اشراف۔ کیا پاجی۔ کیا ترک۔ کیا تاجیک۔ سقہ۔ فراش۔ باورچی۔ ساربان تک سب کے نام بادشاہی دفتر میں داخل ہو گئے اور خانی و سلطانی کے خطابوں سے زمانہ میں نامدار ہوئے۔ اور سنبھل کی سرکار اس کی جاگیر لکھی گئی +

سکندر سور ۸۰ ہزار افغان کا لشکر جرار لئے سرہند پر پڑا تھا۔ اکبر بیرم خاں کے سایۂ اتالیقی میں اس پر فوج لے کر گیا۔ مہم مذکور بھی خوش اسلوبی سے طے ہوئی۔ اس کے فتحنامے اکبر کے نام سے جاری ہوئے۔ بارہ تیرہ برس کے لڑکے کو گھوڑا کدانے کے سوا اور کیا آتا ہے۔ مگر وہی بات ع اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست +

جب ہمایوں نے دلّی پر قبضہ کر لیا تو جشن شاہانہ ہوئے۔ امرا کو علاقے خلعت انعام و اکرام ملے۔ سب انتظام خانخاناں کی تجویز اور اہتمام سے تھے۔ سرہند کا صوبہ اس کے نام پر ہوا کہ ابھی وہاں فتح عظیم حاصل کی تھی۔ سنبھل علی قلی خاں شیبانی کو ملا۔ پٹھان پنجاب کے پہاڑوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ۹۶۳ھ میں اُن کی جڑ اُکھاڑنے کے لئے اکبر کو فوج دے کر بھیجا۔ اُس مہم کے بھی کل کاروبار خانخاناں کے ہاتھ میں دیئے۔ اتالیقی و سپہ سالاری کا عہدہ تھا۔ اور اکبر اُسے خان بابا کہتا تھا۔ ہونہار شہزادہ پہاڑوں میں دشمن شکاری کی مشق کرتا پھرتا تھا کہ دفعتہً ہمایوں کے مرنے کی خبر پہنچی۔ خانخاناں نے اُس خبر کو بڑی احتیاط سے چھپا رکھا۔ لشکر کے امرا کو نزدیک دُور سے جمع کر لیا۔ وہ سلطنت کے آئین و آداب سے خوب واقف تھا۔

شاہانہ دربار کیا۔ اور تاج شاہی اکبر کے سر پر رکھا۔ اکبر باپ کے عہد سے اس کی خدمتیں اور عظمتیں دیکھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ برابر تین پشت کا خدمتگزار ہے۔ چنانچہ اتالیقی و سپہ سالاری پر وکیل مطلق کا منصب زیادہ کیا۔ عنایات و اختیارات کے علاوہ خطاب خان بابا القاب میں داخل کیا۔ اور خود زبان سے کہا کہ خان بابا! حکومت و امارت کے بند و بست۔ موقوفی و بحالی کے اختیار۔ سلطنت کے بدخواہوں اور خیرخواہوں کا باندھنا۔ مارنا۔ بخشنا سب تمہیں اختیار ہے کسی طرح کے وسواس کو دل میں راہ نہ دو۔ اور اسے اپنا ذمہ سمجھو۔ یہ سب اس کے معمولی کام تھے فرمان جاری کر دیئے۔ اور سب کاروبار بدستور کرتا رہا۔ بعض سرداروں پر خودسری کا خیال تھا۔ ان میں سے ابوالمعالی تھے انہیں فوراً باندھ لیا۔ اس نازک کام کو اس خوبصورتی سے طے کر دینا خان خاناں ہی کا کام تھا۔

اکبر دربار و لشکر سمیت جالندھر میں تھا۔ جو خبر پہنچی کہ ہیموں ڈھوسر نے آگرہ لے کر دلی مار لی۔ تردی بیگ حاکم وہاں کا بھاگا چلا آتا ہے۔ سب حیران رہ گئے۔ اور اکبر بھی بچپن کے سبب سے گھبرایا۔ وہ اسی امر میں جان گیا تھا کہ ہر ایک سردار کتنے کتنے پانی میں ہے۔ بیرم خاں سے کہا کہ خان بابا تمام ملکی و مالی کاروبار تمہیں اختیار ہے۔ جس طرح مناسب دیکھو کرو۔ میری اجازت پر نہ رکھو۔ تم عموے مہربان ہو۔ تمہیں والد بزرگوار کی روح مبارک کی اور میرے سر کی قسم ہے کہ جو مناسب دیکھنا سو کرنا۔ دشمنوں کی کچھ پرواہ نہ کرنا۔ خاں خاناں نے اُسی وقت اُمرا کو بلا کر مشورت کی۔ ہیموں کا لشکر لاکھ سے زیادہ سُنا گیا تھا۔ اور بادشاہی فوج ۲۰ ہزار تھی۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ دشمن کی طاقت اور اپنی حالت ظاہر ہے ملک بیگانہ ہے اپنے تئیں ہاتھیوں سے کچلوانا اور چیل کوؤں کو گوشت کھلانا کونسی بہادری ہے؟ اس وقت مقابلہ مناسب نہیں کابل کو چلنا چاہیئے۔ وہاں سے فوج لے کر آئیں گے اور سال آئندہ میں افغانوں کا بخوبی علاج کرینگے۔

خان خاناں نے کہا کہ جس ملک کو دو دفعہ لاکھوں جانیں دے کر لیا۔ اس کو بے تلوار ہلائے چھوڑ جانا۔ ڈوب مرنے کی جگہ ہے۔ بادشاہ تو ابھی بچہ ہے اسے کوئی الزام نہ دیگا۔ اس کے باپ نے عزتیں بڑھا کر ایران توران تک ہمارا نام روشن

کیا۔ وہاں کے سلاطین دامرا کیا کہینگے اور سفید ڈاڑھیوں پر یہ روسیاہی کا دھبہ کیسا زیب دیگا۔ اس وقت اکبر تلوار ٹیک کر بیٹھ گیا اور کہا خان بابا درست کہتے ہیں۔ اب کہاں جانا اور کہاں آنا بن مرے مارے ہندوستان نہیں چھوڑا جا سکتا تخت یا تختہ۔ بچہ کی اس تقریر سے بڈھوں کی خشک رگوں میں جرأت کا خون سرسرایا۔ اور کوچ کا حکم ہوگیا۔ دلّی کی طرف فتح کے نشان کھول دیئے۔ رستہ میں بھاگے بھٹکے سردار اور سپاہی بھی آکر ملنے شروع ہوئے۔ خان خاناں غرزانگی سخاوت رشجاعت کے لحاظ سے یکتا تھے۔ مگر جوہری زمانہ کی دُکان میں ایک عجیب رقم تھے۔ کسی کو بھائی کسی کو بھتیجا بنا لیتے تھے۔ تردی بیگ کو بھی تقان تردی کہا کرتے تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ دلوں سے دونوں امیر آپس میں کھٹکے ہوئے تھے اور صورتیں درباروں کی معمولی امر اتفاقی ہیں۔ دونوں ایک آقا کے نوکر تھے۔ خان خاناں کو اپنے بہت سے حقوق و اوصاف کے دعوے تھے۔ اسے جو کچھ تھا قدامت کا دعوےٰ تھا۔ منصوبوں کے رشک اور خدمتوں کی رقابت سے دونوں کے دل بھرے ہوئے تھے۔ اب ایسا موقع آیا کہ خان خاناں کا تیر تدبیر نشانے پر بیٹھا چنانچہ اس کی بے ہمتی اور نمک حرامی کے حالات کیا نئے کیا پُرانے حضور میں عرض کر دیئے تھے۔ جس سے کچھ قتل کی بھی اجازت پائی جاتی تھی۔ اب جو وہ شکست کھا کر شکستہ حال شرمندہ صورت لشکر میں پہنچا تو اُنہوں نے موقع غنیمت سمجھا۔ ان دنوں باہم شکر رنجی بھی تھی۔ چنانچہ پہلے ملّا پیر محمد نے جا کر وکالت کی کرامات دکھائی کہ ان دنوں خان خاناں کے خیر خواہ خاص تھے۔ پھر شام کو خان خاناں سیر کرتے ہوئے نکلے۔ پہلے آپ اس کے خیمہ میں گئے۔ پھر وہ ان کے خیمہ میں آیا بڑی گرمجوشی سے ملے۔ تو خان بھائی کو بڑی تعظیم اور محبت سے بٹھایا۔ خود ضرورت کے بہانے دوسرے خیمہ میں گئے۔ نوکروں کو اشارہ کر دیا تھا اُنہوں نے بیچارے کا کام تمام کر دیا۔ اور کئی سرداروں کو قید کر لیا۔ اکبر تیرہ چودہ برس کا تھا۔ شکرے کا شکار کھیلنے گیا ہؤا تھا۔ جب آیا تو خلوت میں ملّا پیر محمد کو بھیجا۔ اُنہوں نے جا کر پھر اُس سردار مردار کی طرف سے اگلی پچھلی نمک حرامیوں کے نقش بٹھائے۔ اور یہ بھی عرض کی کہ فدوی خود تغلق آباد کے میدان میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی بے ہمتی سے فتح

کی ہوئی لڑائی شکست ہوگئی۔ خان خاناں نے عرض کی ہے کہ حضور دریائے کرم ہیں فدوی کو خیال ہؤا کہ اگر آپ نے آکر اس کی خطا معاف کردی تو پھر تدارک نہ ہوسکیگا مصلحت وقت پر نظر کرکے غلام نے اُسے مارا تو سخت گستاخی ہے۔ اور موقع نہایت نازک ہے۔ اگر اس وقت چشم پوشی کی تو سب کام بگڑ جائیگا۔ اور حضور کے بڑے بڑے ارادے ہیں۔ نمک خوار ایسا کرینگے تو مہمات کا سرانجام کیونکر ہوگا۔ اس لئے یہی مصلحت سمجھی ساگرچہ گستاخانہ جرأت ہے۔ مگر اس وقت حضور معاف فرمائیں۔

اکبر نے ملّا کی بھی خاطر جمع کی اور جب خان خاناں نے حضوری کے وقت عرض کی تو اس وقت بھی اسے گلے لگایا اور اس تجویز پر آفرین و تحسین کرکے فرمایا کہ میں تو مکرر کہہ چکا ہوں کہ اختیار تمہارا ہے کسی کی پروا اور کسی کا لحاظ نہ کرو۔ اور حاسدوں اور خود مطلبوں کی ایک بات نہ سنو جو مناسب دیکھو وہ کرو۔ ساتھ یہ مصرع پڑھا ؏ دوست گر دوست شود ہر دو جہاں دشمن گیر۔ باوجود اس کے اکثر مؤرّخ یہی لکھتے ہیں کہ اُس وقت اگر ایسا نہ ہوتا تو چغتائی امیر ہرگز قابو میں نہ آتے۔ اور وہی شیر شاہی شکست کا معاملہ پھر ہو جاتا۔ یہ انتظام دیکھ کر ایک ایک مغل سردار کہ اپنے تئیں کیکاؤس اور کیقباد سمجھے ہوئے تھا ہوشیار ہوگیا۔ اور خود سری اور نفاق کا خیال بھلا کر سب ادائے خدمت پر متوجہ ہوگئے یہ سب کچھ ہؤا۔ اور اس وقت سب حریف دبک بھی گئے۔ مگر دلوں میں زہر کے گھونٹ پی پی کر رہ گئے۔ غرض پانی پت کے میدان میں ہیموں سے مقابلہ ہؤا۔ اور ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ اکبری سکّہ کا نقش فتوحات کے تمغوں پر بیٹھ گیا۔ مگر اس معرکہ میں جتنی بیرم خاں کی ہمّت اور تدبیر تھی اُس سے زیادہ علی قلی خاں کی شمشیر تھی۔ غرض ہیموں زخمی شکستہ لبستہ اکبر کے سامنے لاکر کھڑا کیا گیا۔ شیخ گدائی کنبوہ نے اکبر کو کہا کہ جہادِ اکبر کیجئے۔ ہمّتِ اکبر نے گوارا نہ کیا آخر بیرم خاں نے بادشاہ کی مرضی دیکھ کر یہ شعر پڑھا ؎

چہ حاجت تیغ شاہی را بخون ہر کس آلودن	تو بنشیں و اشارت کن بچشمے یا بابروئے

اور بیٹھے بیٹھے ایک ہاتھ جھاڑا۔ پھر حضرت شیخ نے خود ایک ہاتھ کھینچا۔ مرے کو

مارین شاہ مدار۔ اہل اللہ لوگ حال و قال کی مجلسوں کو رونق دینے والے تھے اُنہیں یہ ثواب کی نعمت کہاں ملتی۔ ع اچھا ہؤا کہ دل کا یہ ارمان نکل گیا۔ **آزاد** دیکھنا قسمت والے ایسے ہوتے ہیں۔ جہاد اکبر کا ثواب کیسا سستا ہاتھ آیا ہے یہ سب تو درست۔ مگر خان خاناں! تمہارے لوہے کو زمانے نے مانا۔ کون تھا جو تمہاری بہادری تسلیم نہ کرتا۔ میدانِ جنگ میں مقابلہ ہو جاتا تو بھی تمہارے لئے بنئے بچارے کا مار لینا فخر نہ تھا۔ چہ جائیکہ اس حالت میں نیم جاں مُردے کو مار کر اپنی دلاوری اور عالی ہمتی کے دامن پر کیوں داغ لگایا ؎

کسی بیکس کو لے بیداد گر مارا تو کیا مارا	جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا	نہنگ و اژدھا و شیر نر مارا تو کیا مارا

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ خانخاناں نے اُسے زندہ کیوں نہ رکھا۔ منتظم آدمی تھا۔ رہتا تو بڑے بڑے کام کرتا۔ **آزاد** سب کہنے کی باتیں ہیں جب معرکہ کا وقت ہوتا ہے عقل چرخ میں آجاتی ہے۔ موقع نکل جاتا ہے تو صلاحیں بتاتے ہیں۔ انصاف شرط ہے۔ اس وقت کو تو دیکھو کہ کیا عالم تھا۔ شیر شاہ کا سایہ ابھی آنکھوں کے سامنے سے نہ ہٹا تھا۔ بلکہ افغانوں کے شور سے تمام کشورِ ہندوستان طوفانِ آتش ہو رہا تھا۔ ایسے زبردست اور فتحیاب غنیم پر فتح پائی۔ گردابِ فنا سے کشتی نکل آئی۔ اور وہ بندھ کر سامنے حاضر ہؤا ہے۔ دل کا جوش اس وقت کس کے قابو میں رہتا ہے۔ اور کسے سوجھتا ہے کہ یہ رہیگا تو اس سے فلاں کارخانہ کا انتظام خوب ہوگا۔ غرض فیروزی کے ساتھ دلی پہنچے۔ اور ادھر اُدھر فوجیں بھیجکر انتظام شروع کر دیئے۔ اکبر کی بادشاہی تھی اور بیرم خاں کی سربراہی۔ دوسرے کا دخل نہ تھا۔ شکار کو جانا۔ شکارگاہوں میں رہنا۔ محل میں کم جانا۔ اور جو کچھ ہو باجازت خان خاناں +

اگرچہ امرائے دربار اور بابری سردار اُس کے بالیاقت اختیاروں کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ مگر کام ایسے پیچیدہ پیش آتے تھے کہ اُس کے سوا کوئی ہاتھ نہ ڈال سکتا تھا۔ سب کو اُس کے پیچھے پیچھے چلنا ہی پڑتا تھا۔ اسی عرصہ میں کچھ جُزوی جُزوی باتوں پر بادشاہ اور وزیر میں اختلاف پڑا۔ اس پر یاروں کا چمکانا

غضب - خدا جانے نازک مزاج وزیر کئی دن تک سوار نہ ہؤا - یا قدرتی بات ہوئی۔ کہ کچھ بیمار ہؤا - اس لئے کئی دن حضور میں نہ گیا - موقع وہ کہ سنہ دوم جلوس میں سکندر کوہستانِ جالندھر میں محصور ہؤا ہے - اکبری لشکر قلعہ مانکوٹ کو گھیرے ہوئے تھے - خانخاناں کے دُنبل نکلا تھا کہ سوار بھی نہ ہو سکتا تھا - اکبر نے فتوحا اور لکھنہ ہاتھی سامنے منگائے - اور لڑائی کا تماشا دیکھنے لگا - یہ بڑے دھاوے کے ہاتھی تھے - دیر تک آپس میں ریلتے دھکیلتے رہے اور لڑتے لڑتے بیرم خاں کے خیموں میں آن پڑے - تماشائیوں کا ہجوم - عوام کا شور و غوغا - بازار کی دُکانیں پامال ہو گئیں - اور ایسا غل مچا کہ بیرم خاں گھبرا کر باہر نکل آیا +

خانخاناں کو شمس الدین محمد خاں اتگہ کی طرف خیال ہؤا کہ اُس نے کچھ بادشاہ کے کان بھرے ہوں گے - اور ہاتھی بھی بادشاہ کے اشارے سے اُدھر ہو لے گئے ہیں ماہم آنکہ لیاقت کی پتلی اور بڑی حوصلے والی بی بی تھی - خان خاناں نے اُس کی زبانی کہلا بھیجا کہ اپنی دانست میں کوئی خطا خیال میں نہیں آتی کہ خانہ زاد سے ظہور میں آئی ہو - پھر اس قدر بے اعتنائی کا سبب کیا ہے - اگر اس خیر اندیش کی طرف سے کوئی بات خلاف واقع حضور تک پہنچی ہے تو ارشاد ہو کہ فدوی اس کا عذر کرے - یہاں تک نوبت پہنچی کہ فدوی کے خیمہ پر ہاتھی ہول دئے - اسی عرض و معروض کے ساتھ ایک بی بی محل میں مریم مکانی کی خدمت میں پہنچی - ماہم نے جو حال تھا وہ خود ہی بیان کر دیا اور کہا کہ ہاتھی اتفاقاً اِدھر آن پڑے بلکہ قسمیہ کہا نہ کسی نے تمہاری طرف سے کہا ہے نہ حضور کو کچھ خیال ہے - لاہور میں پہنچے تو اتگہ خاں اپنے بیٹوں کو لے کر خان خاناں کے پاس آئے اور قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ میں نے خلوت یا جلوت میں ہرگز تمہارے باب میں حضور سے کچھ نہیں کہا - اور یہ کہوں گا مؤرخ یہی کہتے ہیں کہ خان خاناں کی خاطر جمع اب بھی نہ ہوئی +

اکبر کی دانائی کا نمونہ اس عمر میں اتنی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمہ سلطان بیگم ہمایوں کی پھوپھی کی بیٹی بہن تھی - اور اپنے مرنے سے چند روز پہلے اس کی نسبت بیرم خاں سے ٹھیرا دی تھی - اس موقع پر کہ ۹۶۴ھ اور سنہ ۲ جلوسی تھے اور لاہور سے آگرہ کو جاتے تھے - جالندھر یا دلّی کے مقام میں اکبر نے اس کا عقد

کر دیا۔ کہ اتحاد کا رشتہ اور مضبوط ہو گیا۔ بڑی دھوم دھام ہوئی۔ خان خاناں نے بھی جشن شاہانہ کے سامان کئے۔ اکبر بموجب اس کی تمنا کے مع امرا کے خود اُس کے گھر گیا۔ خان خاناں نے بادشاہی نثاروں اور لوگوں کے انعام واکرام میں وہ دریا بہائے کہ جو سخاوت کی شہرتیں زبانوں پر تھیں دامنوں میں آن پڑیں۔ اِس شادی میں بیگمات نے بڑی تاکید سے صلاح دی۔ مگر بخاری و ماوراء النہری ترک کہ اپنے تئیں امرا کہہ کر فخر کرتے تھے۔ اس قرابت سے سخت ناراض ہوئے۔ اور کہا کہ ایرانی ترکمان اور وہ بھی نوکر۔ اُس کے گھر میں ہماری شہزادی جائے۔ یہ ہمیں زنہار گوارا نہیں۔ تعجب یہ ہے کہ پیر محمد خاں نے اس آگ پر اور بھی تیل ٹپکایا۔ **آزاد** ۔ ایرانی۔ تورانی کا بہانہ تھا۔ اور شیعہ سُنّی کا افسانہ۔ رشک وہی منصب اور اُس کے اختیارات کا تھا۔ آلِ تیمور اور آلِ بابر کی انہیں کیا پرواہ تھی۔ خود نمک حرامیاں کر کے بابر کا چھ پشت کا ملک برباد کیا۔ ہندوستان میں آکر پوتے کے ایسے خیر خواہ بن گئے۔ اور بیرم خاں بھی کچھ نیا امیر نہ تھا۔ پشتوں کا امیرزادہ تھا۔ اس کے علاوہ اُس کی ننھیال کا خاندان تیموری سے رشتہ بھی تھا۔

خواجہ عطار

خواجہ حسن المشہور بہ خواجہ زادہ چغانیاں

مرزا علاءالدین	ان کی بی بی شاہ بیگم دختر محمود مرزا۔ ابن سلطان ابوسعید مرزا تھی
مرزا انورالدین	دختر مذکور چوتھی پشت میں علی شکر بیگ کی نواسی تھی۔ کیونکہ

علی شکر بیگ کی بیٹی شاہ بیگم شاہزادہ محمود مرزا سے منسوب تھی اس سابقہ رشتے کے خیال سے بابر نے اپنی بیٹی گلرنگ بیگم کو مرزا انورالدین سے منسوب کیا۔ علی شکر کون؟ خان خاناں کے جد سوئمی اِس سلسلے سے خدا جانے خانخاناں کا خاندان تیموری کیا رشتہ ہوا۔ مگر ضرور کچھ نہ کچھ ہوا (دیکھو اکبر نامہ جلد دوم صفحہ ۸ اور مآثر الامرا میں بیرم خاں کا حال)۔

گکھر کی قوم کو قدیم سے دعوےٰ ہے کہ ہم نوشیرواں کی اولاد ہیں۔ جہلم پار سے

اٹک تک کی پہاڑیوں میں یہ لوگ پھیلے ہوئے تھے۔ ہمیشہ کے سرشور تھے۔ اور حکومت کے دعوے رکھتے تھے۔ اس وقت بھی ایسے ایسے ہمّت والے سردار اُن میں موجود تھے۔ کہ شیر شاہ اُن کے ہاتھوں سے تھک گیا تھا۔ بابر اور ہمایوں کے معاملات میں بھی اُن کے اثر پہنچتے رہتے تھے۔ ان دنوں میں سلطان آدم گکھڑ اور اس کے بھائی بڑے دعوے کے سردار تھے۔ اور ہمیشہ لڑتے بھڑتے رہتے تھے۔ خان خاناں نے سلطان آدم کو حکمت عملی سے بلایا۔ وہ مخدوم الملک ملّا عبداللہ سلطان پوری کی معرفت آیا۔ دربار میں پیش کیا اور خان خاناں نے اُسے رسم ہندوستان کے بموجب دستار بدل بھائی بنایا۔ ذرا اس کے مُلک داری کے انداز تو دیکھو +

خواجہ کلاں بیگ ایک پُرانا سردار بابر کے عہد کا تھا۔ اُس کا بیٹا مصاحب بیگ کہ شرارت اور فتنہ انگیزی میں بے اختیار تھا۔ خانخاناں نے ایک مفسدانہ جُرم پر اُسے مروا ڈالا۔ اس میں بھی قتل کے بانی مُلّا پیر محمد تھے۔ مگر دشمنوں کو تو بہانہ چاہیئے تھا۔ بدنامی کا شیشہ خان خاناں کے سینے پر توڑا۔ اور تمام امرائے شاہی میں غل مچ گیا۔ بلکہ بادشاہ کو بھی اس کے مرنے کا افسوس ہوا +

ہمایوں اسے مصاحبِ منافق کہا کرتا تھا۔ اور اس کی بداعمالیوں سے نہایت تنگ تھا۔ جب کابل میں کامران سے لڑائیاں ہو رہی تھیں تو یہ نمک حرام ایک موقع پر ہمایوں کے پاس تھا۔ اور کامران کی خیر خواہی کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ اندر اندر اُسے پرچے بھی دوڑا رہا تھا۔ یہاں تک کہ میدانِ جنگ میں ہمایوں کو زخمی کروا دیا۔ فوج نے شکست کھائی۔ انجام یہ ہوا کہ کابل ہاتھ سے نِکل گیا۔ اکبر خورد سال۔ پھر بے رحم چچا کے پنجے میں پھنس گیا۔ اس کا قاعدہ تھا کہ کبھی اِدھر ہوتا تھا کبھی اُدھر چلا جاتا تھا۔ اور یہ اس کا ادنیٰ کمال تھا۔ ہمایوں ایک دفعہ نواح کابل میں کامران سے لڑ رہا تھا۔ اس موقع پر یہ اور اس کا بھائی مبارز بیگ ہمایوں کے ساتھ تھے۔ ایک دن میدان جنگ میں کسی نے آکر خبر دی کہ مبارز بیگ مارا گیا۔ ہمایوں نے بہت افسوس کیا۔ اور کہا اس کی جگہ مصاحب مارا جاتا۔ ہمایوں کے بعد اکبری دَور ہوا تو شاہ ابو المعالی جا بجا فساد کرتا پھرتا تھا۔ یہ اُس کے مصاحب

بن گئے۔ اور مدت تک اُس کے ساتھ خاک اُڑاتے پھرے۔ خان زمان باغی ہو گیا۔ تو اُس کے پاس جا موجود ہوئے۔ بیٹے کو مہردار کروا دیا۔ آپ عہدہ دار بن گئے۔ چند در چند بندوبستوں کے بعد دلّی میں آئے۔ خان خاناں نے اس کے باب میں اصلاح مزاج کی تدبیریں کی تھیں مگر ایک کارگر نہ ہوئی اور وہ راہ پر نہ آیا۔ ان دنوں دارالخلافہ میں فساد کی تخم ریزی کرنے لگا۔ بیرم خاں نے قید کر لیا۔ اور تجویز کی کہ مکّہ کو روانہ کر دے۔ مُلّا پیر محمد اس وقت خانخاناں کے مصاحب تھے۔ اور یہ خون کے عاشق تھے۔ اُنھوں نے کہا قتل۔ پھر بھی قیل و قال کے بعد یہ ٹھہری کہ ایک پُرزہ پر قتل اور ایک پر نجات لکھ کر نمد تکیہ کے نیچے رکھ دو۔ پھر ایک پرچہ نکالو۔ وہی حکم غیب ہے۔ تقدیر الٰہی یہ کہ پیر کی کرامات سچی نکلی۔ اور مصاحب دلّی میں قتل ہوا۔ امرائے بادشاہی میں غل مچ گیا۔ کہ قدیم الخدمتوں کی اولاد اور خاص خانہ زاد مارے جاتے ہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ تیموری خاندان کا آئین ہے کہ خاندانی نوکروں کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ بادشاہ کو بھی اس امر کا خیال ہوا +

مصاحب بیگ کی آگ ابھی ٹھنڈی ہی نہ ہوئی تھی کہ ایک شعلہ اور اُٹھا۔ مُلّا پیر محمد اب بڑھتے بڑھتے امیر الامرا کے درجہ کو پہنچ کر وکیلِ مطلق ہو گئے تھے۔ سنہ ۳ جلوس میں بادشاہ مع لشکر دلّی سے آگرہ کو چلے۔ خانخاناں اور پیر محمد خاں ایک دن صبح کے وقت شکار کھیلتے چلے جاتے تھے۔ خانخاناں نے اپنے کابداروں سے پوچھا کہ بھوک لگی ہے۔ ناشتے کے لئے رکاب خانہ میں کچھ موجود ہے؟ پیر محمد خاں بول اُٹھے کہ اگر ذرا ٹھہر جایئے تو جو کچھ حاضر ہے وہ حاضر ہو۔ خان خاناں نوکروں سمیت ایک درخت کے نیچے اُتر پڑا۔ دسترخوان بچھ گیا۔ ۳ سو پیالی شربت کی اور ۷ سو غوریاں کھانے کی موجود تھیں۔ خان خاناں کو تعجب ہوا۔ مُنہ سے کچھ نہ کہا پر دل میں خیال رہا ؎ مگر تو بیخبری کاندریں مقام ترا + چہ دشمنان حسود اند دوستانِ غیور

اس کے علاوہ چونکہ مُلّا اب وکیلِ مطلق تھا ہر وقت حضور میں حاضر رہتا تھا سب کی عرضیاں اس کے ہاتھ پڑتی تھیں۔ تمام اُمرا اور اہل دربار بھی اسی کے پاس حاضر ہوتے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ کم حوصلہ۔ مغرور۔ بیرحم اور کمینہ مزاج تھا۔ اہالی و اشراف وہاں جاتے تھے اور ذلّت اُٹھاتے تھے۔ اس پر بھی بہتوں کو بات نصیب

نہ ہوتی تھی +

آگرہ پہنچ کر مُلّا کچھ بیمار ہوئے۔ خان خاناں خبر کو گئے۔ کوئی اُزبک غلام دروازہ پر تھا اُسے کیا خبر تھی کہ ملّا اصل میں کیا ہے۔ اور خان خاناں کا رتبہ کیا ہے اور دونوں میں قدیمی علاقہ کیا ہے۔ وہ دن بھر میں بہت سے بڑے بڑوں کو روک دیا کرتا تھا۔ اپنی عادت کے بموجب اُنہیں بھی روکا اور کہا کہ جب تک دُعا پہنچے آپ ٹھیریں۔ جب بلائیں گے تب جائیے گا۔ مُلّا آخر خان خاناں کا چالیس برس کا نوکر تھا۔ تعجب پر تعجب ہُوا۔ جز بز ہو کر رہ گیا اور زبان سے نِکلا ع بلے خود کردہ را درماں نہ باشد۔ لیکن یہ آنا بھی آخر خانخاناں کا آنا تھا یا قیامت کا آنا تھا۔ مُلّا سُنتے ہی خود دوڑے آئے اور کہتے جاتے تھے معذور فرمائیے دربان آپ کو پہچانتا نہ تھا یہ بولے کہ بلکہ تم بھی! اِس پر بھی یہ ہُوا کہ خانخاناں تو اندر گئے خانی ملازموں میں سے کوئی اندر نہ جا سکا۔ فقط طاہر محمد سلطان ۔ میر فراغت نے بڑی دھکا پیل سے اپنے تئیں اندر پہنچایا۔ خان خاناں دم بھر بیٹھے اور گھر چلے آئے +

دو تین دن کے بعد خواجہ امینا (جو اخیر میں خواجہ جہاں ہو گئے) اور میر عبداللہ بخشی کو مُلّا کے پاس بھیجا اور کہا کہ تمہیں یاد ہو گا کتاب بغل مارے طالب العلمی اور نامرادی کی وضع سے تم قندھار میں آئے تھے۔ ہم نے تم میں قابلیت دیکھی اور اخلاص کی صفتیں بھی پائیں۔ اور کوئی کوئی خدمت بھی تم سے اچھی بن آئی۔ چنانچہ بدترین درجہ فقر طالب علمی سے عرش المراتب خانی و سلطانی اور درجہ امیر الامرائی تک پہنچایا۔ مگر تمہارا حوصلہ دولت و جاہ کی گنجائش نہیں رکھتا۔ خطر ہے کہ کچھ ایسا فساد نہ اُٹھاؤ جس کا تدارک مشکل ہو جائے۔ ان مصلحتوں پر نظر کر کے چند روز یہ غرور کا اسباب تم سے الگ کر لیتے ہیں۔ تاکہ بگڑا ہُوا مزاج اور مغرور دماغ ٹھیک ہو جائے۔ مناسب ہے کہ علم و نقارہ اور اسباب و حشمت سب سپرد کر دو۔ ملّا کی کیا مجال تھی جو دم مار سکے۔ وہ غرور کا مواد جس نے بہت سی اِنسان صورتوں کو بے عقل اور خبطی کر رکھا ہے۔ بلکہ انسانیت اور آدمیت کے رستے سے گرایا اور گراتا ہے۔ جنگل کے بھُوتوں میں ملایا اور ملاتا ہے۔ اسی وقت سب حوالہ کر دیا۔

اور وہی ملّا پیر محمدؒ رہ گئے جو کہ تھے۔ پہلے قلعہ بیانہ کے قیدخانہ میں بھیج دیا۔ ملّا نے ایک رسالہ خان خاناں کے نام پر تصنیف کیا۔ اُس میں فقط برہانِ تمانع کو طول و تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ اور یہ ایک مشہور مباحثہ علما میں ہے گویا تفسیر ہے اس آیت کی لوکان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا۔ اس میں ایک لطیف اشارہ تھا۔ اِس بات کا کہ میری غلط فہمی تھی جو آپ کی بارگاہِ اختیار کے سامنے اپنا خیمہ لگاتا تھا۔ اور اب مَیں آپ پر ایمان لاکر توبہ کرتا ہوں۔ یہ رسالہ بھی بھیجا اور بہت سے عذر و معذرت کے خط لکھے۔ عجز و انکسار نے پہنچ کر شفاعت کی مگر قبول نہ ہوئی کہ بے وقت تھی۔ چند روز کے بعد براہِ گجرات مکّہ کو روانہ کر دیا۔ اس کی جگہ حاجی محمد سیستانی کو بادشاہ کا اُستاد اور وکیل مطلق کر دیا۔ کہ وہ بھی اپناہی دامن گرفتہ تھا جب بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوا۔ کچھ نہ کہا مگر رنج ہوا۔

شیخ گدائی[۲] کنبوہ شیخ جمالی کے بیٹے تھے۔ اور مشائخوں میں داخل ہو گئے تھے جس وقت ہمایوں کی سلطنت بگڑی اور خان خاناں پر وقت پڑا تو اُنھوں نے گجرات

---

[۱] ملّا پیر محمد یہاں سے چلے۔ گجرات کے پاس رادھن پور میں پہنچکر مقام کیا۔ وہاں فتح خاں بلوچ نے بہت خاطرداری کی۔ یہاں سے ادہم وغیرہ اُمرا کے خط پہنچے کہ جہاں جاؤ وہیں ٹھیر جاؤ۔ اور انتظار کرو کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ بیرم خاں کو خبر ہوئی کہ مُلّا وہاں بیٹھے ہیں۔ اُنھوں نے کئی سرداروں کو فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ ملّا ایک پہاڑ کی گھاٹی میں گھس کر اڑے اور دن بھر لڑے رات کو نکل گئے۔ مال اسباب اُن کا سب بیرم خانی سپاہ کے ہاتھ آیا۔ اہلکار دیکھتے تھے مگر پیش کس کی جائے بادشاہ دیکھتے تھے اور شربت کے گھونٹ پیتے جاتے تھے۔ آزاد۔ تماشہ دیکھنے والے ان باتوں کو سُنکر جو چاہیں باتیں بنائیں۔ لیکن تم غور کرو۔ ایک شخص پر کل سلطنت کا بوجھ ہے۔ درستی و خرابی کا ذمہ دار وہ ہے جب ارکان سلطنت ایسے گردن کش اور خودسر ہوں اور سینہ زور ہوں تو وہ اُن سے سلطنت کا کام کیونکر چلا سکتا ہے۔ حقیقت میں یہ لوگ اُس کے ہاتھ پاؤں ہیں جب ہاتھ پاؤں بجائے کام کرنے کے کام بگاڑنے والے ہوں تو اُسے واجب ہے کہ اور ہاتھ پاؤں پیدا کرے یا کام سے دست بردار ہو جائے۔

[۲] مجھے اب تک نہیں کھلا کہ شیخ گدائی کی ذات یا صفات میں کیا داغ تھا ہر صاحبِ تاریخ اُن کے باب میں گول گول باتیں کرتا ہے۔ مگر کھول کر نہیں کہتا۔ جو کچھ حال اُن کا اور اُن کے خاندان کا مختلف مقاموں سے معلوم ہوا ہے۔ خان خاناں نے جو اُنھیں صدارت کا منصب دیا۔ بادشاہی فرمان میں

باقی ص

میں کچھ رفاقت کی تھی۔ اب انہیں صدارت کا منصب دے کر کل اکابر و مشائخ ہند سے اونچا بٹھایا۔ خود اُن کے گھر جاتے تھے۔ بلکہ بادشاہ بھی کئی دفعہ گئے تھے اور اس پر لوگوں نے بہت چرچا کیا تھا اور کہتے تھے ع سگ نشیند بہ جائے گیپائی +

اب وہ وقت آیا کہ یا تو خان خاناں کی ہر تجویز عین تدبیر تھی۔ یا ہر بات نظروں میں کھٹکنے لگی، اور حکموں پر ناراضیاں بلکہ شور و غل ہونے لگے۔ خیر وہ برائے نام وزیر تھا مگر عقل و تدبیر کا بادشاہ تھا۔ جب لوگوں کے چرچے سُنے اور بادشاہ کو بھی کھٹکتے دیکھا تو گوالیار کا علاقہ مدت سے خود سر تھا۔ بادشاہی فوج بھی گئی تھی۔ کچھ بند و بست نہ ہو سکا تھا۔ اب اُس نے بادشاہ سے کچھ مدد نہ لی۔ خاص اپنی ذاتی فوج سے گیا۔ اور اپنے جیب خرچ سے لشکر کشی کی۔ آپ جا کر قلعہ کے نیچے ڈیرے ڈال دیئے۔ مورچے باندھے۔ اور حملہ ہائے شیرانہ اور شمشیر دلیرانہ سے قلعہ توڑا۔ اور مُلک فتح کر دیا۔ بادشاہ بھی خوش ہو گئے اور لوگوں کی زبانیں بھی قلم ہو گئیں +

مُلک مشرقی میں افغانوں نے ایسا سکّہ بٹھایا تھا کہ کوئی امیر اُدھر جانے کا حوصلہ نہ کرتا تھا۔ خان زمان کہ بیرم خان کا داہنا ہاتھ تھا۔ اور اس پر بھی دشمنوں کا دانت تھا۔ اُس نے اُدھر کی مہم کا ذمّہ لیا۔ اور ایسے ایسے کارنامے کئے کہ رستم کے نام کو

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۱ جہاں اور اعتراض کیا ہے خان خاناں نے ضرور کہا ہو گا کہ شیخ نے میرے ساتھ جو رفاقت کی تھی شاہ جنّت مکان کا ملازم سمجھ کر کی تھی۔ اور بادشاہی امید پر کی تھی۔ اب جو کچھ اُس کے ساتھ کیا گیا خدمتِ بادشاہی کا صلہ ہے کوئی اپنا حقِ قرابت نہیں ہے۔ جو لوگ باپ دادا کا نام لیکر آج حاضرِ خدمت ہیں اُس وقت کہاں گئے تھے؟ حریفوں کے ساتھ تھے یا جان بچا گئے تھے۔ جنہوں نے رفاقت کی اُن کا حق بہرصورت مقدم ہے اور حضور حق شناسی سے قطع نظر کر کے دیکھیں۔ آئینِ مملکت کیا فتویٰ دیتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جو لوگ بُرے وقت میں رفاقت کرتے ہیں اگر بھلے وقت میں اُن سے سلوک نہ کیا جائے تو آئندہ کسی کو کیا امید ہو گی۔ اور کس بھروسے پر کوئی رفاقت کریگا۔ مسجد نشین مُلّا نے یا خود غرض لوگ جو چاہیں سو کہیں یہ مسجد و مدرسہ کا وظیفہ نہیں، کہ حضرت پیر صاحب کی اولاد ہیں یا مولوی صاحب کے بیٹے ہیں انہیں کو دیدو۔ یہ مہمات سلطنت ہیں ذراسی اونچ نیچ میں بات بگڑ جاتی ہے اور اُس سے ایسا طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ ملک و مملکت تہ و بالا ہو جاتے ہیں اور ذرا ہی سی بات میں بن بھی جاتے ہیں پھر کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا۔ آزاد جن مشائخ اور اماموں سے اونچا بٹھایا تھا غور تو کرو۔ وہ کون تھے؟ وہی بزرگوار جنکا حال چند سال کے بعد کھل گیا اگر ایسے لوگوں سے اونچا بٹھا دیا تو کیا کفر ہو گیا؟

پھر زندہ کر دیا۔

چندیری اور کالپی کا بھی وہی حال تھا۔ خان خاناں نے اِس پر بھی ہمت کی۔ مگر امیروں نے بجائے مدد کے بدمدد کی۔ بنانے کے عوض کام خراب کیا۔ غنیموں سے سازشیں کریں۔ اس لئے کامیاب نہ ہوا۔ فوج ضائع ہوئی۔ روپیہ برباد ہوا۔ اور ناکام چلا آیا۔

مالوہ کی مہم کا چرچا ہو رہا تھا۔ عرض کی۔ فدوی بذاتِ خود جائے گا۔ اور اپنے خرچ خاص سے اس مہم کو سر کریگا۔ چنانچہ خود لشکر لے کر گیا۔ امرائے دربار مدد کی جگہ بدخواہی پر کمر بستہ ہو گئے۔ اطراف کے زمینداروں میں مشہور کیا کہ خان خاناں پر بادشاہ کا غضب ہے۔ اور بادشاہ کی طرف سے خفیہ حکم لکھ لکھ کر بھیجے۔ کہ جہاں موقع پاؤ اس کا کام تمام کر دو۔ اب اس کا رعب داب کیا رہا۔ اس حالت میں اگر وہ کسی سردار یا زمیندار کو توڑ کر موافق کرے۔ اور انعام یا اعزاز کے وعدے کرے۔ تو کون مانتا ہے۔ انجام یہ ہوا کہ وہاں سے بھی ناکام پھرا۔

بنگالہ کی مہم کا بیڑا اُٹھایا۔ وہاں بھی دو غلے دغاباز دوستوں نے دونوں طرف مل کر کام خراب کر دیئے بلکہ نیک نامی تو درکنار پہلے الزاموں پر طرّہ زیادہ ہوا کہ خان خاناں جہاں جاتا ہے جان بُوجھ کر کام خراب کرتا ہے۔ بات وہی ہے کہ اقبال کا ذخیرہ ہو چکا۔ جس کام پر ہاتھ ڈالتا تھا بنا ہوا بگڑ جاتا تھا۔

اللہ اللہ یا تو وہ عالم کہ جو بات ہے۔ پوچھو خان بابا سے۔ جو مقدمہ ہے۔ کہو خان خاناں سے۔ سلطنت کے سفید و سیاہ کا کُل اختیار۔ آفتابِ اقبال اس اوج پر کہ جس سے اُونچا ہونا ممکن نہیں (مشکل یہ ہے کہ اس نقطہ پر پہنچ کر ٹھہرنے کا حکم نہیں) افسوس اب اُس کے ڈھلنے کا وقت آ گیا۔ ظاہری صورتیں یہ ہوئیں کہ بادشاہی ہاتھیوں میں ایک مست ہاتھی فیلبان کے قابو سے نکل گیا۔ اور بیرم خاں کے ہاتھی سے جا لڑا۔ ہر چند بادشاہی فیلبان نے روکا مگر ایک تو ہاتھی اُس پر مست نہ دب سکا۔ اور ایسی بے جگہ ٹکر ماری کہ بیرم خاں کے ہاتھی کی انتڑیاں نکل پڑیں خان بڑے خفا ہوئے اور فیلبان شاہی کو قتل کیا۔

انہی دنوں میں ایک خاصہ کا ہاتھی مستی میں آ کر جمنا میں اُتر گیا۔ اور بدمستیاں

کرنے لگا۔ بیرم خاں بھی کشتی میں سوار سیر کرتے پھرتے تھے کہ ہاتھی اپنی ہتنیائی کرنے لگا۔ اور ٹکر کو دریائی ہاتھی پر آیا۔ یہ حال دیکھ کر کناروں سے غل اور دریا میں شور اُٹھا۔ ملاح بھی گھبرا گئے۔ ہاتھ پاؤں مارتے تھے اور دل ڈوبے جاتے تھے۔ خان پر عجب حالت گذری۔ بارے مہاوت نے ہاتھی کو دبالیا۔ اور بیرم خاں اس آفت سے بچ گئے۔ اکبر کو خبر پہنچی۔ مہاوت کو باندھ کر بھیج دیا۔ مگر یہ پھر چال چوکے کہ اُسے بھی وہی سزا دی۔ اکبر کو بڑا رنج ہوا۔ اور تھوڑا بھی ہوا ہوگا۔ تو بڑھانے والے موجود تھے قطرہ کو دریا بنا دیا ہوگا۔ غلطی پر غلطی یہ ہوئی کہ بادشاہ کے خاصہ کے ہاتھی اُمرا کو تقسیم کر دیئے کہ اپنے اپنے طور پر اُنہیں تیار کرتے رہیں۔ اس کا عذر یہی ہوگا۔ کہ نوجوان بادشاہ کے خیالات انہی کے سبب سے پریشان ہوتے ہیں۔ نہ یہ ہونگے۔ نہ یہ خرابیاں ہونگی۔ اور اس کا ہر وقت کا مشغلہ یہی تھا۔ وہ بہت گھبرایا اور دق ہوا +

خانخاناں کے دشمن تو بہتیرے تھے مگر ماہم بیگم۔ ادھم خاں اس کا بیٹا۔ شہاب خاں اس کا رشتہ کا داماد۔ اور اکثر رشتہ دار ایسے تھے کہ اندر باہر ہر طرح کی عرض کا موقع ملتا تھا۔ اکبر اس کا اور اس کے لواحقوں کا حق بھی بہت مانتا تھا۔ یہ علامہ بڑھیا ہر وقت لگاتی۔ بجھاتی رہتی تھی۔ اور جو اُن میں سے موقع پاتا تھا۔ بات بات پر اُکساتا تھا۔ کبھی کہتے تھے کہ یہ حضور کو بچہ سمجھتا ہے اور خاطر میں نہیں لاتا۔ بلکہ کہتا ہے کہ میں نے تخت پر بٹھایا۔ جب چاہوں اُٹھا دوں۔ اور جسے چاہوں بٹھا بٹھا دوں۔ کبھی کہتے کہ شاہ ایران کے مراسلے اس کے پاس آتے ہیں۔ اور اس کی عرضیاں جاتی ہیں۔ فلاں سوداگر کے ہاتھ تحائف بھیجے تھے +

درباری رقیب جانتے تھے کہ بابر اور ہمایوں کے وقت کے پرانے پرانے خدمت گذار کہاں کہاں ہیں اور کون اشخاص ہیں جن کے دل میں خان خاناں کی رقابت یا مخالفت کی آگ سُلگ سکتی ہے۔ اُن کے پاس آدمی بھیجے۔ تمہیں یاد ہے شیخ محمد غوث گوالیاری کا دربار سے کیونکر سلسلہ ٹوٹا۔ اور وہ اُن سب باتوں کو خان خاناں کے اختیارات کا پھل سمجھے تھے۔ اُن کے پاس بھی خطوط بھیجے۔ اور مقدمات کے اینچ پینچ سے آگاہ کر کے برکت انفاس کے طلبگار ہوئے۔ نہ مرشدِ کامل تھے۔ نیت خالص سے شریک ہوئے +

اگرچہ سلسلہ کلام پھیلتا جاتا ہے مگر اتنی بات کہے بغیر آزاد آگے نہیں چل سکتا کہ باوجود تمام اوصاف و کمالات اور دانائی و فرزانگی کے بیرم خاں میں چند باتیں تھیں جو زیادہ تر اُس کی برہمی کا سبب ہوئیں۔ (۱) اُولوالعزم صاحب جرأت شخص تھا۔ جو مناسب تدبیر دیکھتا تھا کر گذرتا تھا۔ اس میں کسی کا لحاظ نہ کرتا تھا۔ اور اس وقت تک زمانہ ایسا پایا تھا کہ سلطنت کی نازک حالتوں اور بھاری مہموں میں دوسرا شخص ہاتھ بھی نہ ڈال سکتا تھا۔ اب وہ وقت نکل گئے تھے۔ پہاڑ کٹ گئے تھے۔ دریا پایاب ہو گئے تھے۔ کام ایسے پیش آتے تھے کہ اور بھی کر سکتے تھے۔ مگر یہ بھی جانتے تھے کہ خان خاناں کے ہوتے ہمارا چراغ نہ جل سکیگا۔ (۲) وہ اپنے اوپر کسی اور کو دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ پہلے وہ ایسے مقام میں تھا کہ اُس سے اوپر جانے کو رستہ بھی نہ تھا۔ اب سڑک صاف بن گئی تھی اور ہر شخص کے ہونٹ بادشاہ کے کان تک پہنچ سکتے تھے۔ پھر بھی اس کے ہوتے بات کا پیش جانا مشکل تھا۔ (۳) عظیم الشان مہموں اور پیچیدہ معرکوں کے لئے اُسے ایسے بالیاقت شخصوں اور اور سامانوں کا تیار رکھنا واجب تھا۔ جن سے وہ اپنی برجستہ تدبیروں اور بلند ارادوں کو پورا کر سکے۔ اس کے لئے روپیوں کی نہریں اور چشمے جاگیریں اور علاقے قابو میں ہونے چاہئیں۔ اب تک وہ اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اب اُن پرداروں کو بھی قابض ہونے کی ہوس ہوئی۔ لیکن یہ خطر ضرور تھا کہ اُس کے سامنے قدم جمنے مشکل ہوں گے (۴) اُس کی سخاوت اور قدردانی ہر وقت بالیاقت اشخاص کا مجمع اور بہادر سپاہیوں کا انبوہ اس قدر فراہم رکھتی تھی کہ تیس ہزار ہاتھ اُس کے دسترخوان پر پڑتا تھا۔ اسی واسطے جس مہم پر چاہتا فوراً ہاتھ ڈال دیتا تھا۔ اس کی تدبیر کا ہاتھ ہر ملک و مملکت میں پہنچ سکتا تھا (۵) اُسے یہ خیال ضرور ہوگا۔ کہ اکبر وہی بچہ ہے جو میری گود میں کھیلا ہے۔ اور یہاں بچے کے لہو میں خودمختاری کی گرمی سرسرانے لگی تھی۔ اس پر حریفوں کی اشتعالک ہر وقت گرم لئے جاتی تھی +

یہ سب کچھ تھا مگر جو جو خدمتیں اس نے عقیدت و اخلاص سے کی تھیں ان کے نقش اکبر کے دل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی تھا کہ کسی

کو نوکر نہ رکھ سکتا تھا۔ کسی کو کچھ دے نہ سکتا تھا۔ خان خاناں کے متوسّل اچھے اچھے علاقوں میں تعینات تھے۔ وہ باسامان اور خوش لباس نظر آتے تھے۔ جو خاص بادشاہی نوکر کہلاتے تھے۔ وہ ویران جاگیریں پاتے تھے اور ٹوٹے پھوٹے حال سے پھرتے تھے۔ بھانڈا یہاں سے پھوٹتا ہے کہ ۹۶۷ھ ۵ سنہ جلوس میں اکبر اور بیرم خاں مع اہل دربار آگرہ میں تھے۔ مریم مکانی دلّی میں تھیں۔ حریف ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اور ہر دم فساد کے منتر اس پر دم کرتے چلے آتے تھے۔ بیانہ کے مقام میں یہی ذکر ایک جلسہ میں چھڑا۔ مرزا شرف الدین[1] اکبر کے بہنوئی بھی موجود تھے انہوں نے صاف کہدیا کہ اُس نے بندوبست کر لیا ہے۔ آپ کو تخت سے اُٹھائے اور کامران کے بیٹے کو بٹھادے۔ خود غرضوں کی صلاحیں مطابق ہوئیں اور اکبر شکار کو اُٹھا۔ آگرہ سے جالیسر اور سکندرہ ہوتے ہوتے خورجہ ہو کر سرائے بگھل میں آن اُترے۔ ماہم نے رستہ میں دیکھا کہ اس وقت بیرم خاں سے میدان خالی ہے۔ بسُورتی صورت بنا کر اکبر کے سامنے آئی۔ اور کہا کہ بیگم کا ضعیفی اور ناطاقتی سے عجب حال ہے۔ کئی خط میرے پاس آئے ہیں۔ حضور کے دیکھنے کو ترستی ہیں۔ بادشاہ کو بھی اس بات کا خیال ہو گیا۔ ادہم خاں اور اکثر رشتہ دار کہ صاحب رُتبہ امیر تھے۔ دلّی ہی میں تھے۔ اسی عرصہ میں اُن کی عرضیاں پہنچیں۔ آخر لہو کا جوش تھا۔ بادشاہ کا دل کڑھ گیا۔ اور دلّی کو چلے[2]۔ شہاب خاں پنجہزاری امیر تھا۔ اور ماہم کا رشتہ دار تھا۔ اس کی بی بی پاپا آغا مریم مکانی کی رشتہ دار تھی۔ اُس وقت وہی دلّی کا حاکم تھا دلّی پچیس تیس کوس رہی ہوگی کہ وہ بڑھ کر استقبال کو پہنچا اور بہت سے نذرانے

[1] مرزا شرف الدین ایک کاشغری خواجہ زادہ تھے۔ جب آئے تو ایسے گربہ مسکین تھے کہ اکبر نے خانخاناں کی صلاح سے اپنی بہن کی شادی کر دی۔ خان خاناں کے بعد باغی ہو گئے۔ وہ ملک کو تباہ کرتے پھرتے تھے۔ امرا فوجیں لئے پھرتے تھے۔ خانخاناں ہی کا رعب داب تھا کہ ایسوں کو دبا رکھا تھا۔ ان سرکش گردنوں نے جو کچھ کیا اُس کی سزا پائی +

[2] اہل تاریخ کہتے ہیں کہ بادشاہ آگرہ سے شکار کو نکلے تھے۔ رستے میں یہ کارسازیاں ہوئیں۔ ابوالفضل کہتے ہیں کہ اکبر نے ان لوگوں کے ساتھ اندر اندر بندوبست کر لئے تھے۔ شکار کا بہانہ کر کے دلّی میں آئے۔ اور خان خاناں کی مہم کو طے کیا +

پیشکش گزرانے اور شہاب الدین احمد خاں گیا۔ بعد اس کے خلوت میں گیا۔ کانپتی ہانپتی صورت بناکر بولا کہ حضور کے قدم دیکھے۔ زہے طالع مگر اب جاں نثاروں کی جانوں کی خیر نہیں۔ خان خاناں سمجھیگا کہ حضور کا دلی میں آنا ہمارے اشارہ سے ہوا ہے۔ پس جو مصاحب بیگ کا حال ہوا سو ہمارا ہوگا۔ محل میں ماہم یہی رونا رویا بلکہ اُس کے اختیارات اور انجام کی قباحتیں دکھاکر تنکے کو پہاڑ کر دکھایا۔ اور کہا کہ اگر بیرم خاں ہے تو حضور کی سلطنت نہیں۔ اور سلطنت تو اب بھی وہی کرتا ہے۔ سرِ دست تو یہی مشکل ہے کہ وہ کہیگا کہ آپ میری بے اجازت گئے۔ ان کی اشارت سے گئے۔ اتنی طاقت کس میں ہے کہ اُس کا مقابلہ کر سکے۔ یا اُس کے غصہ کو سنبھال سکے۔ اب شفقت شاہانہ یہی ہے کہ اجازت ہوجائے یہ قدیمی خانہ زاد خانہ خدا کو چلے جائیں۔ وہاں غائبانہ دعاؤں سے بجالائینگے +

اکبر نے کہا میں خان بابا کو تمہاری عفوِ تقصیر کے لئے لکھتا ہوں۔ چنانچہ شقہ لکھا کہ ہم آپ مریم مکانی کی عیادت کو یہاں آئے ہیں۔ اُن لوگوں کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔ اس خیال سے اُن کے دل بہت پریشان ہیں۔ تم ایک خط اپنی مُہر و دستخط سے انہیں لکھ بھیجو کہ ان کی تشفی خاطر ہوجائے اور اطمینان سے ادائے خدمت میں مصروف رہیں وغیرہ وغیرہ۔ اتنی گنجائش دیکھتے ہی سب پھوٹ بہے۔ شکایتوں کے دفتر کھول دیئے۔ شہاب الدین احمد خاں نے اصلی اور وصلی کئی مقدمے اور مثلیں تیار رکھی تھیں۔ ان کے حالات عرض کئے۔ دو تین رفیق گواہی کے لئے تیار کر رکھے تھے۔ اُنہوں نے گواہیاں دیں۔ غرض اس کی بداندیشی اور بغاوت کے ارادے ایسے بادشاہ کے دل پر نقش کر دیئے کہ اُس کا دل پھر گیا۔ اور سوا اس کے چارہ نہ دیکھا۔ کہ اپنی حالت کو اُن کی صلاح و تدبیر کے حوالے کر دے +

اِدھر خان خاناں کے پاس جب شقہ پہنچا اور ساتھ ہی ہوا خواہوں کے خطوط پہنچے کہ دربار کا رنگ بے رنگ ہے تو کچھ حیران ہوا کچھ پریشان ہوا۔ کمال عجز و انکساری کیساتھ عرضی لکھی۔ اور قسم ہائے شرعی کے ساتھ لکھا۔ جس کا خلاصہ یہ کہ جو خانہ زاد اس درگاہ کی خدمت وفا و اخلاص سے کرتے ہیں غلام کے دل میں ہرگز اُن کی طرف سے بُرائی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ عرضی خواجہ امین الدین محمود کہ پھر خواجہ جہاں ہوئے اور حاجی محمد خاں

سیستانی اور رسول محمد خاں اپنے معتبر سرداروں کے ہاتھ روانہ کی۔ اور کلام اللہ ساتھ بھیجا کہ قسموں کا وزن زیادہ ہو۔ یہاں کام حد سے گزر چکا تھا۔ تحریر کا اثر کچھ نہ ہُوا۔ کلام مجید بالائے طاق اور عجز و نیاز کے امانت دار قید ہو گئے۔ شہاب الدین احمد خاں باہر وکیل مطلق ہو گئے۔ ماہم اندر ہی بیٹھی حکم احکام جاری کرنے لگی۔ اور مشہور کر دیا کہ خان خاناں حضور کی غضبی میں آیا۔ بات منہ سے نکلتے ہی دُور پہنچ گئی۔ امراء اور ملازم دربار جو آگرہ میں خان خاناں کے پاس تھے اُٹھا اُٹھ کر دلّی کو دوڑے۔ دامن گرفتہ لوگ اپنے ہاتھ کے رکھے ہوئے نوکر الگ ہو ہو کر چلنے شروع ہوئے۔ یہاں جو آتا ماہم اور شہاب الدین احمد خاں اُس کا منصب بڑھاتے۔ جاگیریں اور خدمتیں دلواتے +

صوبجات اور اطراف و جوانب میں جو امرا تھے اُن کے نام احکام جاری کئے شمس الدین خاں اتگہ کو بھیرہ علاقہ پنجاب میں حکم پہنچا کہ اپنے علاقہ کا بندوبست کر کے لاہور کو دیکھتے ہوئے جلد دلّی میں حاضر حضور ہو۔ منعم خاں بھی احکام و ہدایات کے ساتھ کابل سے طلب ہوئے۔ یہ پرانے سردار کہنہ عمل سپاہی تھے کہ ہمیشہ بیرم خاں کی آنکھیں دیکھتے رہے۔ ساتھ ہی شہر پناہ اور قلعہ دہلی کی مرمت اور مورچہ بندی شروع کر دی۔ واہ رے بیرم تیری ہیبت +

یہاں خانخاناں نے اپنے مصاحبوں سے مشورہ کیا۔ شیخ گدائی اور چند اور شخصوں کی یہ رائے تھی کہ ابھی حریفوں کا پلّہ بھاری نہیں ہُوا۔ آپ یہاں سے جریدہ سوار ہوں۔ اور نشیب و فراز سمجھا کر بادشاہ کو پھر قابو میں لائیں کہ فتنہ انگیزوں کو فساد کا موقع نہ ملے۔ بعض کی رائے تھی کہ بہادر خاں کو فوج دے کر مالوہ پر بھیجا ہے خود وہاں چلو اور ملک تسخیر کر کے بیٹھ جاؤ۔ پھر جیسا موقع ہو گا دیکھا جائیگا۔ بعض کی صلاح تھی کہ خان زمان کے پاس چلو۔ پورب کا علاقہ افغانوں سے بھرا ہُوا ہے۔ صاف کرو اور چند روز وہاں بسر کرو +

خانخاناں ہر شخص کا بلکہ زمانے کا مزاج پہچانے ہوئے تھا۔ اُس نے کہا۔ کہ اب حضور کا دل مجھ سے پھر گیا۔ کسی طرح بننے کی نہیں۔ تمام عمر دولت خواہی میں گذری۔ بڑھاپے میں بدخواہی کا داغ پیشانی پر لگانا ہمیشہ کے لئے منہ کالا کرنا ہے۔

ان خیالوں کو بھول جاؤ۔ مجھے حج اور زیارات کا مدت سے شوق تھا۔ خدا نے خود سامان کر دیا ہے۔ ادھر کا ارادہ کرنا چاہئے۔ امرا اور رفقا جو ساتھ تھے انہیں خود دربار کو رخصت کر دیا۔ وہ سمجھا اور خوب سمجھا کہ یہ سب بادشاہی نوکر ہیں۔ انہوں نے اگرچہ مجھ سے بہت فائدے اٹھائے ہیں۔ بلکہ اکثر میرے ہاتھ کے بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اُدھر بادشاہ ہے۔ اگر میرے پاس رہے تو بھی عجب نہیں کہ اُدھر خبریں دیے رہے ہوں یا دبنے لگیں۔ اور اخیر کو اُٹھ بھاگیں۔ بہتر ہے کہ میں خود انہیں رخصت کر دوں۔ وہاں جا کر شائد کچھ اصلاح کی صورت نکالیں۔ کیونکہ آخر مجھ سے نقصان نہیں پایا۔ پایا ہے تو فائدہ ہی پایا ہے۔ بیرم خاں نے خان زماں کے بھائی بہادر خاں کو فوج دے کر مالوہ کی مہم پر بھیجا تھا۔ دربار کا یہ حال دیکھ کر بلا بھیجا کہ اسکی ضروریات کی دربار سے کون خبر لیگا۔ دربار سے اس کے نام بھی حکم طلب پہنچا۔ اس میں کئی مطلب ہوں گے۔ اوّل یہ کہ وہ دونوں بھائی خان خاناں کے دو بازو تھے۔ مبادا کہ بے اختیار ہو کر اُٹھ کھڑے ہوں۔ دوسرے یہ کہ ذاتی فائدہ کی امید پر اس سے پھریں اور ادھر مڑیں۔ اگر نہ مڑیں تو منحرف تو نہ ہوں۔ مگر بہادر بچپن میں اکبر کے ساتھ کھیلا ہوا تھا اور اکبر اُسے بھائی کہتا تھا۔ اس لئے ہر بات میں اس سے بے تکلف تھا۔ غالباً اُن کے ڈھب کا نہ نکلا ہوگا۔ اور خان خاناں کی طرف سے صفائی کے نقش بٹھاتا ہوگا۔ اس لئے بہت جلد اُسے اٹاوہ کا حاکم کر کے مغرب سے مشرق میں پھینک دیا۔

شیخ گدائی وغیرہ رفقا نے صلاحیں دیں۔ اور خان خاناں نے بھی چاہا تھا کہ آپ حضور میں حاضر ہو اور جو باتیں جرم و گناہ قرار دی گئی ہیں۔ ان کی عذر و معذرت کر کے صفائی کرے۔ بعد اس کے رخصت ہو۔ یا جیسا موقع دیکھے ویسا کرے۔ لیکن حریفوں نے وہ بھی نہ چلنے دی۔ انہیں یہ ڈر ہوا۔ جب یہ اکبر کے سامنے آیا۔ اپنے مقاصد کو پُر اثر تقریر کے ساتھ اس طرح ذہن نشین کریگا کہ جو نقش ہم نے اتنے دنوں میں بٹھائے ہیں سب مٹ جائینگے۔ اور بنی بنائی عمارت کو چند باتوں میں ڈھا دیگا۔ اکبر کو یہ ڈرایا کہ وہ خود صاحبِ فوج و لشکر ہے۔ امرا سب اُس سے ملے ہوئے ہیں۔ نمک حلالوں کی تعداد ابھی بہت کم ہے۔ اگر وہ یہاں آیا تو خدا جانے

کیا صورت ہو۔ بادشاہ بھی لڑکا ہی تھا ڈر گیا۔ اور صاف لکھ بھیجا کہ ادھر آنے کا ارادہ نہ کرنا۔ ملازمت نہ ہوگی۔ اب تم حج کو جاؤ۔ پھر آؤ گے تو پہلے سے بھی زیادہ خدمت پاؤ گے۔ بڑھا خدمتگزار اپنے مصاحبوں کی طرف دیکھ کر رہ گیا کہ تم کیا کہتے تھے اور میں کیا کہتا تھا۔ اور اب کیا کہتے ہو۔ غرض حج کا ارادہ مصمم کیا۔

اکبر کی خوبیوں کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ میر عبداللطیف قزوینی کہ اب ملاّ پیر محمد کی جگہ اُستاد تھے اور دیوان حافظ پڑھایا کرتے تھے۔ انہیں فہمائش کر کے بھیجا اور زبانی پیغام دیا کہ تمہارے حقوق خدمت اور اخلاص عقیدت عالم پر روشن ہیں۔ ابھی تک ہماری طبیعت سیر و شکار کی طرف مائل تھی۔ کاروبار ملکی تم پر چھوڑ دیئے تھے۔ اب مرضی ہے کہ مہماتِ خلائق کو بذاتِ خود سرانجام فرمائیں۔ تم مدت سے ترکِ دنیا کا ارادہ رکھتے ہو اور سفر حجاز کا شوق ہے۔ یہ نیک ارادہ مبارک ہو۔ پرگنات ہندوستان سے جو علاقہ پسند ہو وہ لکھو تمہاری جاگیر ہو جائیگا۔ گماشتے تمہارے اس کا محاصل جہاں تم کہو گے وہاں پہنچا دینگے۔ یہ پیغام بھیجا اور فوراً خود بھی اسی طرف کوچ کیا۔ چند امرا کو آگے بڑھا دیا۔ کہ خان خاناں کو سرحد کے باہر نکال دو۔ جب یہ لوگ قریب پہنچے تو اُس نے انہیں لکھا۔ کہ مَیں نے دُنیا کا بہت کچھ دیکھ لیا اور کر لیا۔ اب سب سے ہاتھ اُٹھا چکا۔ مدت سے ارادہ تھا کہ خانہ خدا اور روضہ ہائے مقدسہ پر جا کر بیٹھوں۔ اور یاد الٰہی میں مصروف ہُوں۔ الحمد لِلّٰہ کہ اب اس کا سلسلہ ہاتھ آیا ہے۔ اُس دریا دل نے سر و چشم کہکر قبول کیا اور بہت خوشی سے تعمیل کی۔ ناگور سے طوغ و علم۔ نقارہ۔ فیل خانہ۔ تمام اسباب امیرانہ اور شوکتِ شاہانہ کا سامان حسین قلی بیگ اپنے بھانجے کے ساتھ روانہ کر دیا۔ جھجر کے مقام میں پہنچا۔ اس کی عرضی جو مضامین نیاز اور صدق دل کی دعاؤں سے سہرائی ہوئی تھی۔ درگاہ میں پڑھی گئی۔ اور حضور خوش ہو گئے۔ اب وہ وقت آیا کہ خان خاناں کے لشکر کی چھاوُنی پہچانی نہ جاتی تھی۔ جو رفیق دونوں وقت ایک قاب میں کھانے پر ہاتھ ڈالتے تھے بہت ان میں سے چلے گئے۔ انتہا ہے کہ شیخ گدائی بھی الگ ہو گئے۔ فقط چند رشتہ دار اور وفا کے بندے تھے۔ وہی ساتھ رہے۔ (ایک ان میں حسین خاں افغان بھی تھے ان کا حال الگ لکھا جائیگا)

ابو الفضل اکبر نامہ میں کئی ورق کا ایک فرمان لکھتے ہیں کہ دربار سے اُس محروم القسمت کے نام جاری ہُوا تھا۔ اسے پڑھ کر بے درد بے خبر لوگ تو نمک حرامی کا جرم لگائیں گے۔ لیکن قابل اعتبار دو شخصوں کا حال ہوگا۔ ایک وہ کہ جس نے اس کے جزوی جزوی حالات کو نظر انصاف سے دیکھا ہوگا۔ وہ آئندہ ہمدردی اور رفاقت سے توبہ کریگا۔ دوسرے جس نے کسی ہونہار امیدوار کے ساتھ جانفشانی اور جانبازی کا حق ادا کیا ہوگا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آئے گا۔ بلکہ آتش غضب سے جگر جلیگا اور دھوآں منہ سے نکلیگا۔

فرمان مذکور میں اس کی تمام خدمتوں کو مٹایا ہے۔ اُس کے اقربا کی جانفشانیوں کو خاک میں ملایا ہے۔ اُس پر خود پروری۔ خویش پروری۔ اور ملازم پروری کے الزام لگائے ہیں۔ اس پر جُرم لگائے ہیں۔ کہ پٹھان سرداروں کو بغاوت کی ترغیب دی۔ خود فلاں فلاں طریقوں سے بغاوت کے منصوبے باندھے۔ اُس میں علی قلی خاں اور بہادر خاں کو بھی لپیٹ لیا ہے۔ بڑھاپے کی نمک حرامی و بیوفائی سے خبیث خیالات اور کثیف الفاظ اس کے حق میں صرف کر کے کاغذ کو سیاہ کیا ہے۔ ان دردوں کو کون جانے؟ بدنصیب بیرم خاں جانے یا جس ناکام کی بیرم خاں جیسی خدمتیں برباد ہوئی ہوں اس کا دل جانے۔ خصوصاً جب یقین ہو کہ یہ ساری باتیں دشمن کر رہے ہیں۔ اور گودوں کا پالا ہُوا آقا ان کے ہاتھوں میں کاٹ کی پتلی ہے۔

ع یارب مباد کس را مخدوم بے عنایت

کم ظرف دشمن کسی طرح اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ اس کے پیچھے چند امیروں کو فوج دے کر روانہ کیا تھا۔ کہ جائیں اور سرحد ہندوستان سے نکال دیں۔ جب وہ نزدیک پہنچے تو بیرم خاں نے انہیں لکھا کہ مَیں نے دنیا کا بہت کچھ دیکھ لیا۔ اور اس سلطنت میں سب کچھ کر لیا۔ کوئی ہوس دل میں نہیں۔ مَیں سب سے ہاتھ اُٹھا چکا۔ مدت سے دل میں شوق تھا کہ خانہ خدا اور روضہ ہائے مقدسہ کی ان آنکھوں سے زیارت کروں۔ الحمد للہ کہ اب اس کا سلسلہ ہاتھ آیا ہے۔ تم کیوں تکلیف کرتے ہو۔ وہ سب چلے آئے۔

ملا پیر محمد جس کو خان خاناں نے حج کو روانہ کر دیا تھا۔ اُنہیں اُسی وقت حریفوں نے

پیغام بھیج دیئے تھے کہ یہاں گل کھلنے والا ہے۔ جہاں پہنچے ہو۔ وہیں ٹھہر جانا۔ وہ
گجرات میں بلّی کی طرح تاک لگائے بیٹھے تھے۔ اب حریفوں کے پرچے پیام پہنچے کہ
بڈھا شیر ادھ موا ہو گیا۔ آؤ شکار کرو۔ یہ سُنتے ہی دوڑے جھجر کے مقام میں ہی ملازمت
ہوئی۔ یاروں نے علم نقارہ دلوا کر فوج کا سردار کیا کہ خانخاناں کے پیچھے پیچھے جائیں۔
اور ہندوستان سے مکہ کو نکال دیں۔ ادہم خاں ماہم کا بیٹا اور بڑے بڑے سردار
ان کے ساتھ ہوئے۔ ادھر خان خاناں نے ناگور پہنچ کر خبر پائی کہ مارواڑ کے راجہ مالدیو
نے گجرات دکن کا رستہ روک رکھا ہے۔ سلطنت کے نمک حلال سے اُسے صدمے
پہنچے ہوئے تھے۔ دُور اندیشی کر کے ناگور سے خیمہ کا رُخ پھیرا کہ بیکانیر سے ہوتا ہُوا
پنجاب سے نکل کر قندھار کے رستے مشہدِ مقدس کی راہ لے۔ مگر دربار سے جو احکام
جاری ہو رہے تھے اُنہیں دیکھ کر دل ہی دل میں گھٹ رہا تھا۔ حریفوں نے زمینداران اطراف
کو لکھا کہ یہ زندہ نہ جانے پائے۔ جہاں پاؤ کام تمام کر دو۔ ساتھ ہی ہوائی اُڑائی۔ کہ
خان خاناں پنجاب کو بغاوت کے ارادے سے چلا ہے۔ وہاں ہر قسم کے سامان آسانی
سے بہم پہنچ سکتے ہیں۔ ایسا دق ہُوا کہ رائے بدل گئی۔ ان سفلوں کو کیا خاطر میں لاتا
تھا صاف کہہ دیا کہ جن مفسد دل اور بدکرداروں نے حضور کو مجھ سے ناراض کیا ہے۔
اب انہیں سزا دے کر بادشاہ سے رخصت ہو کر حج کو جاؤں گا۔ فوج بھی جمع کرنی
شروع کی۔ اور امرائے اطراف کو مضامین حالات مذکورہ سے اطلاع دی۔ ناگور سے
بیکانیر آیا۔ راجہ کلیان مل اس کا دوست تھا۔ اور حق پوچھو تو حریفوں کے سوا کون تھا
جو اس کا دوست نہ تھا۔ وہاں آئے۔ دھوم دھام کی ضیافتیں ہوئیں۔ کئی دن آرام
لیا۔ اتنے میں خبر آئی کہ ملّا پیر محمد تمہیں ہندوستان سے جلاوطن کرنے آتے ہیں۔
دل جل کر خاک ہو گیا۔ ملّا کا اس طرح آنا کچھ چھوٹا سا زخم نہ تھا۔ مگر اُنہوں نے قناعت
نہ کی۔ اس پر داغ بھی دیا۔ یعنی ناگور میں ٹھہر کر خان خاناں کو ایک خط لکھا۔ اس میں طنز
کی چنگاریاں تو بہت سی تھیں۔ مگر ایک شعر بھی درج تھا ؎

آمدم در دل اساس عشق محکم ہمچناں		با غمت جانِ بلا فرسودہ ہمدم ہمچناں

خانخاناں نے بھی ترکی کا جواب ترکی لکھا۔ مگر یہ فقرہ اس میں بہت برجستہ
واقع ہُوا تھا۔ آمدن مردانہ اما رسیدہ توقف کردن زنانہ۔ ہر چند چوٹیں پہلے سے

بھی کر رہا تھا اور اُس نے یہ فقرہ بھی لکھا۔ مگر مسجد کے ٹکڑا گدا کو ۴۰ برس نمک کھلا کر امیرالامرا بنایا تھا۔ آج اُس سے یہ باتیں سُننی پڑیں۔ عجب صدمہ دل پر گذرا۔ چنانچہ اسی دل شکستگی کے عالم میں ایک عریضہ حضور میں لکھا جس کے کچھ فقرے ہاتھ آئے ہیں۔ وہ خون کے قطرے ہیں۔ جو دل فگار سے ٹپکے ہیں۔ ان کا رنگ دکھلانا بھی واجب ہے:۔

چوں بموجب اظہار و آرزوئے حاسداں۔ حقوق خدمت دیرینہ سنہ واسطہ آں دودماں پامال تہمت کفرانِ نعمت درخدمت ولی نعمت گردیدہ۔ و معاندان در حلال دانستن خون رافضی فتوے دادہ اند۔ برائے محافظت جاں کہ در ہمہ مذہب واجب است مے خواہم بمدد رفاقت خود را ازیں بلّیہ نجات دہم۔ بدیں ہیئت (کہ باظہار اہلِ غرض اسباب بغی آمادہ میدانند) درخدمت آں خداوند (ہرچند نفس الامراء زادۂ بیت اللہ باشد) آمدن کفر میدانم و بر عالمے ظاہر است کہ در خاندانِ ما ترکان نمک حرامی بظہور نیامدہ لہٰذا راہ مشہد اختیار نمودہ ام کہ بعد طوافِ روضۂ امام علیہ السلام و عتبات نجف اشرف و کربلائے معلّٰی و خواندن فاتحہ دراں مکانہائے شریف برائے بقائے سلطنت و عمر آں ولی نعمت از سرِ نو احرام کعبۃ اللہ بندم۔ التماس آنست کہ اگر بندہ را در جرگۂ نمک حراماں واجب القتل میدانند۔ یکے از بندہ ہائے بے نام ونشاں را تعین فرمائید کہ سرِ بیرم بریدہ برسناں جلوہ دہاں برائے تنبیہ و عبرت دیگر بدخواہانِ دولت بحضور بیارود۔ ع گر قبول اُفتد زہے عز و شرف۔ والا سردارئے فوج سوائے ملائے خارجی کہ از نمک پروردہ ہائے نمک بحرام و اخراجی فدوی است بدیگرے یکے از بندہ ہائے درگاہِ والا مقرر شود +

اس نازک موقع پر کہ بدنصیبی کا پیچ تھا اُس وفادار جاں نثار نے چاہا تھا کہ اپنی اور بادشاہ کی ناراضی کا پردہ رہ جائے۔ اور عزت کی پگڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ملک سے نکل جائے۔ مگر قسمت نے بڈھے کی داڑھی لونڈوں یا طفل مزاج بڈھوں کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ بدنیت بداندیش نہ چاہتے تھے کہ وہ سلامت جانے پائے۔ غرض جب بات بگڑ جائے اور دل پھر جائیں تو الفاظ و عبارت کا زور کیا کر سکتا ہے۔ البتہ اتنا ہوا کہ جب بادشاہ نے یہ عرضی پڑھی تو آب دیدہ ہوئے اور

دل کو رنج ہوا۔ ملا پیر محمد کو بلالیا۔ اور آپ دلی کو پھرے۔ مگر حریفوں نے اکبر کو سمجھایا کہ خانخاناں پنجاب کو چلا ہے۔ اگر یہ پنجاب میں جا پہنچا۔ اور وہاں بغاوت کی تو مشکل ہوگی پنجاب ایسا ملک ہے کہ جس قدر فوج اور سامانِ فوج چاہیں ہر وقت بہم پہنچ سکتا ہے کابل کو چلا گیا تو قندھار تک قبضہ کر لینا اُس کے آگے کچھ دشوار نہیں اور خود نہ کر سکا تو دربار ایران سے مدد لانی بھی اُسے آسان ہے۔ ان مصلحتوں پر نظر کر کے فوج کی سرداری شمس الدین محمد خاں اتکہ کے نام کی اور پنجاب کو روانہ کیا۔ سچ پوچھو تو آگے جو کچھ ہوا۔ اکبر کے لڑکپن اور ناتجربہ کاری سے ہوا۔ سب مؤرخ بالاتفاق لکھتے ہیں کہ بیرم خاں کی نیت میں فساد نہ تھا۔ اگر اکبر شکار کھیلتا ہوا خود اُس کے خیمے پر جا کھڑا ہوتا تو قدموں پر آ ہی پڑتا۔ بات بنی بنائی تھی۔ یہاں تک طول نہ کھنچتا۔ نوجوان بادشاہ کچھ بھی نہ کرتا تھا۔ جو کچھ تھے بڑھیا اور بڑھیا والوں کے کرتوت تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اُسے آقا سے لڑا کر نمک حرامی کا داغ لگائیں۔ اُسے گھبرا کر بھاڑ کی صورت میں دوڑائیں۔ اور اگر جل کر اسی حالتِ موجودہ کے ساتھ پلٹ پڑا تو شکار ہمارا مارا ہوا ہے۔ اس غرض سے وہ آتش کے پرکالے نئی ہوائیاں اُڑاتے تھے اور کبھی اس کے ارادوں کی کبھی اکبر کے حکموں کی رنگا رنگ پھلجھڑیاں چھوڑتے تھے۔ کہن سال سپہ سالار سنتا تھا پیچ و تاب کھاتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ اس بغاوت کے شوشہ سے وہ نیک نیت نیک رائے دنیا سے بے آس اہل دنیا سے بیزار بیکانیر سے پنجاب کی حد میں داخل ہوا۔ امرائے احباب کو لکھا کہ میں حج کو جاتا تھا مگر سُنتا ہوں کہ چند اشخاص نے خدا جانے کیا کیا کہکر مزاج اشرف بادشاہی کو میری طرف سے متغیر کر دیا ہے۔ خصوصاً ماہم اتکہ کہ استقلال کے گھمنڈ کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ میں نے بیرم خاں کو نکالا۔ اب ہمت یہی چاہتی ہے کہ ایک دفعہ آکر بدکرداروں کو سزا دینی چاہیئے۔ پھر نئے سرے سے رخصت لے کر سفر مقدس پر متوجہ ہونا چاہیئے ٭

اس نے اہل و عیال اور مرزا عبدالرحیم ۳ برس کے بیٹے کو جو بڑا ہو کر خانخاناں اور اکبری سپہ سالار ہوا تھا۔ تمام نقد و جنس مال و دولت اور اسباب کے ساتھ بٹھنڈہ کے قلعہ میں چھوڑا۔ شیر محمد دیوانہ اس کا خاص الخاص ملازم اور قدیم الخدمت

اور ایسا باعتبار تھا کہ بیٹا کہلاتا تھا۔ وہ بٹھنڈا کا حاکم تھا۔ اور اس پر کیا منحصر ہے۔ جو اس وقت کے امرا اور سردار تھے سب اس کے عیال تھے۔ اس کے بھروسے پر خاطر جمع کر کے آپ دیپال پور کو روانہ ہوا۔ دیوانہ نے مال واسباب سب ضبط کر لیا۔ اور آدمیوں کی بڑی بے عزتی کی۔ خانخاناں کو جب خبر پہنچی تو خواجہ مظفر علی اپنے دیوان کو اور درویش محمد ازبک کو بھیجا کہ شیر محمد دیوانہ کو سمجھائیں۔ دیوانہ کو کتّے نے کاٹا تھا وہ کب سمجھتا تھا۔ ع اے عاقلاں کنارہ کہ دیوانہ مست شد۔ ان دونوں کو بھی مفسد ٹھہرایا اور قید کر کے حضور میں بھیج دیا۔

خانخاناں کا مطلب ان انتظاموں سے یہ تھا۔ کہ جو کچھ میرا مال ومتاع ہے۔ دوستوں کے پاس رہے کہ ضرورت کے وقت مجھے مل جائیگا۔ میرے پاس ہو تو خدا جانے کیا اتفاق ہے۔ دشمنوں اور لٹیروں کے ہاتھ تو نہ آئے۔ میرے کام نہ آئے میرے دوستوں کے کام آئے۔ انہی دوستوں نے وہ نوبت پہنچائی۔ یہ رنج کچھ تھوڑا نہ تھا۔ اس پر عیال کا قید ہونا۔ اور دشمنوں کے ہاتھ میں جانا۔ غرض نہایت دق ہؤا۔ اور زمانہ کا یہ حال تھا۔ کہ اگر کسی سے مصلحت بھی چاہتا تو وہاں سے مایوسی کی خاک آنکھوں میں پڑتی تھی اور وہ وہ باتیں پیش آتی تھیں۔ جن کا عشر عشیر بھی تحریر میں نہیں آسکتا۔ حیران پریشان۔ غیرت وغصہ میں بھرا ہؤا تھاڑہ کے گھاٹ سے ستلج اُترا۔ اور جالندھر پر آیا۔

دربار دہلی میں بعض کی رائے ہوئی کہ بادشاہ خود جائیں۔ بعض نے کہا کہ فوج جائے۔ اکبر نے کہا۔ دونوں رایوں کو جمع کرنا چاہئے۔ آگے فوج جائے۔ پیچھے ہم ہوں۔ چنانچہ شمس الدین محمد خاں اتکہ بھیرہ سے پہنچ لئے تھے۔ انہیں فوج دے کر آگے بھیجا اتکہ خاں بھی کوئی جنگ آزمودہ سپہ سالار نہ تھا۔ سلطنت کے کاروبار دیکھے تھے۔ مگر برتے نہ تھے۔ البتہ نیک طبع متحمل مزاج۔ سن رسیدہ شخص تھا۔ اہل دربار نے انہی کو غنیمت سمجھا۔

بیرم خاں کو اوّل خیال یہ تھا کہ اتکہ خاں پرانا رفیق ہے وہ اس آگ کو بجھائیگا مگر خان خاناں کا منصب ملتا نظر آتا تھا۔ وہ بھی آتے ہی ہمدماں حضور میں داخل ہو گئے۔ اور خوشی خوشی فوج لے کر روانہ ہوئے۔ ماہم کی عقل کا کیا کہنا ہے صاف پہلو بچا

لیا۔ اور بیٹے کو کسی بہانہ سے دلّی میں چھوڑ دیا۔

خان خاناں جالندھر پر قبضہ کر رہا تھا کہ خان اعظم ستلج اُتر آئے اور گناچور کے میدان میں ڈیرے ڈال دیئے۔ خان خاناں کے لئے اس وقت تھے تو دو ہی پہلو تھے۔ یا لڑنا اور مرنا۔ یا دشمنوں کے ہاتھوں قید ہونا اور مشکیں بندھوا کر دربار میں کھڑے ہونا۔ خیر وہ خان اعظم کو سمجھتا کیا تھا جالندھر کو چھوڑ کر پلٹا۔

اب مقابلہ تو پھر ہوگا۔ مگر پہلے اتنی بات کہنی ضرور ہے کہ خانخاناں نے اپنے آقا پر تلوار کھینچی۔ بہت بُرا کیا۔ لیکن ذرا چھاتی پر ہاتھ رکھ کر دیکھو۔ جو جو خیال اور رنج و ملال اس وقت اس کے مایوس دل پر چلتے ہوئے تھے اُن پر نظر نہ کرنی بھی بے انصافی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو جو خدمتیں اس نے بابر اور ہمایوں سے لے کر اس وقت تک کی تھیں وہ ضرور اس کی آنکھوں کے سامنے ہوں گی۔ آقا کی وفاداری کا نباہنا۔ اودھ کے جنگلوں میں چھپنا۔ گجرات کے دشتوں میں پھرنا۔ شیرشاہ کے دربار میں پکڑے جانا۔ اور ان نازک وقتوں کی دشواریاں سب اسے یاد ہوں گی۔ ایران کا سفر اور قدم قدم کی کٹھن منزلیں اور شاہ کی درباداریاں بھی پیش نظر ہوں گی۔ اسے یہ بھی خیال ہوگا کہ کیسی جان بازی اور جان جوکھوں سے ان مہموں کو اس نے سرانجام دیا۔ سب سے زیادہ یہ کہ جو گروہ مقابل میں نظر آتا ہے اُن میں اکثر وہ بڈھے دکھائی دیتے ہیں۔ جو ان وقتوں میں اس کے منہ کو تکتے تھے۔ اور ہاتھوں کو دیکھتے تھے۔ یا کل کے لڑکے ہیں کہ جنہوں نے ایک بڑھیا کی بدولت نوجوان بادشاہ کو پھسلا رکھا ہے۔ یہ باتیں دیکھ کر اسے ضرور خیال ہوا ہوگا کہ جو ہو سو ہو۔ ان سفلوں اور نا اہلوں کو جنہوں نے کچھ نہیں دیکھا ایک دفعہ تماشا تو دکھا دو کہ حقیقت ان کی بادشاہ کو بھی معلوم ہو جائے۔

پرگنہ دگدار[1] نواح گناچور میں کہ جنوب مشرق جالندھر پر تھا دونوں چھاؤنیوں کے دھوئیں طرفین کو دکھائی دینے لگے۔ بڈھے سپہ سالار نے پہاڑ اور لکھی جنگل کو

---

[1] بلوک۔ مین صاحب لکھتے ہیں کہ کنور پھلور۔ گوناچور کے جنوب مغرب میں تھا۔ فرشتہ کہتا ہے کہ یہ لڑائی ماچھی واڑہ کے باہر ہوئی۔ بعض نے لکھا ہے یہ مُلّا صاحب کا قول ہے اور یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ دکن کے فرشتہ کو پنجاب کی کیا خبر۔

پشت پر رکھ کر ڈیرے ڈال دیئے اور فوج کے دو حصّے کئے۔ ولی بیگ ذوالقدر۔ شاہ قلی محرم، حسین خاں ٹکریہ وغیرہ کو فوجیں دے کر آگے بڑھایا۔ دوسرے حصّے کے چاروں پرے باندھ کر آپ بیچ میں قائم ہوا۔ اس کے رفیق تعداد میں تھوڑے تھے۔ مگر مروت اور مردانگی کے جوش نے ان کی کمی کو بہت بڑھا دیا تھا۔ ہزاروں دلاوروں اس کی قدردانی کے ہاتھ سے فیض پائے تھے۔ ان سب کا مول بے گنتی کے آدمی تھے جو رفاقت کے نام پر جان قربان کرنے نکلے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ بڈھا جواں مرد ہے۔ اور مرد کا ساتھ مرد ہی دیتا ہے۔ وہ اس غصّہ میں آگ ہو رہے تھے کہ مقابل میں وہ لوگ تھے جنہیں لوالہوسی نے مرد بنایا ہے۔ جب تلوار مارنے کے وقت تھے تو کچھ نہ کر سکے۔ اب میدان صاف ہے تو نوجوان بادشاہ کو پھسلا کر چاہتے ہیں کہ بڈھے خانہ زاد کی محنتیں برباد کریں۔ سو وہ بھی ایک بڑھیا کے بھروسے پر۔ وہ نہ ہو تو اتنا بھی نہیں۔ ادھر بڈھے سید یعنی خانِ اعظم نے بھی فوجوں کی تقسیم کر کے صفیں باندھیں۔ قرآن سامنے لا کر سب سے عہد و پیمان لئے۔ بادشاہی عنایتوں کا امیدوار کیا۔ سو اتنی ہی اس بچارے کی کرامات تھی +

جس وقت سامنا ہوا تو بیرم خانی فوج نہایت جوش و خروش سے لیکن بالکل بیباکی اور بے پرواہی سے آگے بڑھی کہ آؤ۔ دیکھیں تو سہی تم ہو کیا چیز۔ جب قریب پہنچے تو یکدلی نے ان کی جانوں کو اٹھا کر اس طرح فوج بادشاہی پر دے مارا گویا بیرم کے گوشت کا ایک میچا تھا کہ اچھل کر حریف کی تلواروں میں جا پڑا... جو مرنے تھے مرے۔ جو بچے۔ آپس میں ہنستے کھیلتے اور دشمنوں کو ریلتے دھکیلتے چلے۔

کیا تڑپنا دلِ مضطر کا بھلا لگتا ہے	کہ جب اچھلے ہے ترے سینہ سے جا لگتا ہے

ہائے۔ ان کے دلوں میں ارمان ہوگا کہ اس وقت نوجوان بادشاہ آئے۔ اور باتیں بنانے والوں کی بگڑی حالت دیکھے۔ ع ببیں کہ از کہ شکستی و باکہ پیوستی ۔ خانِ اعظم ہٹے۔ مگر اپنے رفیقوں سمیت کنارہ ہو کر ایک ٹیلہ کی آڑ میں تھم گئے +

پرانے فتحیاب نے جب میدان کا نقشہ حسبِ مراد دیکھا تو ہنس کر اپنی فوج کو جنبش دی۔ ہاتھیوں کی صف کو آگے بڑھایا۔ جس کے بیچ میں فتح کا نشان۔ اس کا تخت رواں ہاتھی تھا۔ اور اُس پر وہ آپ سوار تھا۔ یہ فوج سیلاب کی طرح اتگہ خاں پر

بڑلی۔ یہاں تک تمام مؤرخ بیرم خاں کے ساتھ ہیں۔ آگے اُن میں پھوٹ پڑتی ہے۔ اکبری اور جہانگیری عہد کے مصنّف کوئی مردانہ کوئی نیم زنانہ ہو کر کہتے ہیں کہ اخیر میں بیرم خاں نے شکست کھائی۔ خافی خاں کہتے ہیں کہ ان مصنفوں نے رعایت سے بات کو چھپایا ہے ورنہ شکست اتکہ خاں پر پڑی۔ اور بادشاہی لشکر پریشان ہو گیا۔ بادشاہ خود بھی لودیانہ سے آگے بڑھ چکا تھا۔ اب خواہ شکست کے سبب سے خواہ اس لحاظ سے کہ ولی نعمت کے سامنے کھڑے ہو کر اسے لڑنا منظور نہ تھا۔ بیرم خاں اپنے لشکر کو لے کر لکھی جنگل کی طرف پیچھے ہٹا۔

منعم خاں کابل سے بلائے ہوئے آئے تھے۔ لودیانہ کی منزل پر آداب بجا لائے۔ کئی سردار ساتھ تھے۔ ان میں تردی بیگ کا بھانجا مقیم بیگ بھی موجود تھا۔ اس کی ملازمت ہوئی۔ دیکھو! لوگ کیسے کیسے مصالح کہاں کہاں سے سمیٹ کر لاتے ہیں۔ ملا صاحب فرماتے ہیں منعم خاں کو خان خاناں کا خطاب اور وکیل مطلق کا عہدہ ملا۔ دخل الولی وخرج الولی کا نکتہ کھل گیا۔ اکثر امراء کو اپنی اپنی حیثیت بموجب منصب اور انعام دئے۔ اسی منزل میں قیدی اور زخمی ملاحظہ سے گذرے۔ جو لڑائی میں گرفتار ہوتے تھے۔ نامی سرداروں میں ولی بیگ ذوالقدر خان خاناں کا بہنوئی حسین قلی خاں کا باپ تھا۔ کہ گنوں کے کھیت میں زخمی پڑا پایا تھا۔ یہ بھی ترکمان تھا۔ اسمٰعیل قلی خاں کا بڑا بھائی تھا۔ حسین خاں ٹکریہ کی آنکھ پر زخم آیا تھا۔ کہ اس کے جمالِ شجاعت پر چشم زخم ہوا تھا۔ ولی بیگ بہت زخمی تھا۔ چنانچہ زنداں میں زندگانی کی قید سے چھوٹ گیا۔ اس کا سر کاٹ کر ممالک مشرقی میں بھیجا کہ شہر بشہر تشہیر ہو۔

مشہور یہ تھا کہ ولی بیگ ذوالقدر خانخاناں کو زیادہ تر برہم کرتا ہے پورب میں خان زماں اور بہادر خاں تھے کہ بیرم خانی ذیلدار کہلاتے تھے۔ اور اس کا سر بھیجنے سے حریفوں کا یہی مطلب ہوگا۔ کہ دیکھو تمہارے حمایتیوں کا یہ حال ہے لے جانے والا بھی چوبدار چھوٹی امت کا آدمی تھا۔ اور حریفوں کا آدمی تھا۔ کہ دربار کے فتحیاب تھے۔ خدا جانے اس نے کیا کہا ہوگا اور کس طرح پیش آیا ہوگا۔ بہادر خاں کو برداشت کہاں۔ رنج نے اس کی آتش غضب کو بھڑکایا۔ اور اس نے چوبدار کو مروا ڈالا

یہ گستاخی اس کے حق میں بہت خرابی پیدا کرتی مگر اس کے مصاحبوں اور دوستوں نے اسے پاگل بنادیا۔ چند روز ایک مکان میں بند رکھا اور حکیم علاج کرتے رہے۔ اور جھوٹ شہرت اُنہوں نے بھی نہیں دی۔ یار پرستی اور وفاداری بھی تو ایک مرض ہے۔ اہل دربار نے بھی اس وقت پردہ ہی رکھنا مصلحت سمجھا اور ٹال گئے کیونکہ وہ دونوں بھائی میدان جنگ میں طوفان آتش تھے۔ چند سال بعد ان سے بھی کسر نکالی +

اتکہ خاں بھی دربار میں پہنچے۔ اکبر نے خلعت و انعام سے اُمرا کے دل بڑھائے۔ لشکر کو ماچھی واڑہ پر چھوڑا۔ اور آپ لاہور پہنچے کہ دارالسلطنت ہے ایسا نہ ہو کہ واقعہ طلب لوگ اُٹھ کھڑے ہوں۔ یہاں خاص و عام کو اقبال کی تصویر دکھا کر تشفی دی۔ اور پھر لشکر میں پہنچے۔ دامن کوہ میں بیاس کے کنارہ پر **تلواڑہ** اُن دنوں مضبوط مقام تھا۔ اور راجہ گنیش وہاں راج کرتا تھا۔ خان خاناں پیچھے ہٹ کر وہاں آیا۔ راجہ نے بہت خاطر کی۔ اور سب سامانوں کا ذمہ لیا۔ اُسی کے میدان میں لڑائی جاری ہوئی۔ پرانا سپہ سالار تجویز و تدبیر میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ چاہتا تو چٹیل میدان میں سے لشکر اُگا دیتا۔ پہاڑ کو اسی لئے پشت پر رکھا تھا کہ مقابلہ پر بادشاہ کا نام ہے۔ اگر پیچھے ہٹنا پڑے تو پھیلنے کو بڑے بڑے ٹھکانے تھے۔ غرض لڑائی برابر جاری تھی۔ اس کی فوج مورچوں سے نکلتی تھی اور لشکر بادشاہی سے لڑتی تھی۔ ملا صاحب کہتے ہیں۔ ایک موقع پر لڑائی ہو رہی تھی۔ اکبری لشکر میں سے سلطان حسین جلائر کہ نہایت سجیلا جوان اور دلاور اور دیدار و امیر زادہ تھا۔ میدان میں زخمی ہو کر گرا۔ بیرم خانی جوان اس کا سر کاٹ کر مبارک باد کہتے لائے اور خان خاناں کے سامنے ڈال دیا۔ دیکھ کر افسوس کیا۔ رومال آنکھوں پر رکھ کر رونے لگا۔ اور کہا۔ سو لعنت ہے اس زندگی پر۔ میری شامت نفس سے ایسے ایسے جوان ضائع ہوتے ہیں! باوجودیکہ پہاڑ کے راجہ اور رانا برابر چلے آتے تھے۔ فوج اور ہر طرح کے سامان سے مدد دیتے تھے۔ اور آئندہ کے لئے وعدے کرتے تھے۔ مگر اس نیک نیت نے ایک کی نہ سُنی۔ انجام کا خیال کر کے آخرت کا رستہ صاف کر لیا۔ اُسی وقت جمال خاں اپنے غلام کو حضور میں

بھیجا۔ کہ اجازت ہو فدوی حاضر ہوا چاہتا ہے۔ ادھر سے مخدوم الملک ملا عبداللہ
سلطان پوری فوراً چند سرداروں کو لے کر روانہ ہوئے کہ دلجوئی کریں اور لے آئیں۔
ابھی لڑائی جاری تھی۔ وکیل دونوں طرف سے آتے اور جاتے تھے۔ خدا جانے تکرار
کس بات پر تھی منعم خاں سے نہ رہا گیا۔ چند امرا و مقربان بارگاہ کے ساتھ بے تحاشا
خانخاناں کے پاس چلا گیا۔ کہن سال سردار تھے۔ کہنہ عمل سپاہی تھے۔ قدیمی
رفاقتیں تھیں۔ مدتوں ایک جگہ رنج و راحت کے شریک رہے تھے۔ دیر
تک دل کے درد کہتے رہے۔ ایک نے دوسرے کی بات کی داد دی منعم خاں کی
باتوں سے اسے یقین آیا کہ جو کچھ پیام آئے ہیں واقعی ہیں۔ فقط سخن سازی نہیں
ہے۔ غرض خانخاناں چلنے کو تیار ہوا۔ جب وہ کھڑا ہوا۔ بابا زنبور اور شاہ قلی محرم
دامن پکڑ کر رونے لگا۔ کہ ایسا نہ ہو جان جائے۔ یا عزت پر حرف آئے منعم خاں نے
کہا اگر زیادہ ڈر ہے تو ہمیں یرغمال میں یہاں رہنے دو۔ خیر یہ پرانی محبت کی شوخیاں
تھیں۔ ان لوگوں سے کہا کہ تم نہ چلو۔ انہیں جانے دو۔ اگر انہوں نے اعزاز و اکرام پایا
تو تم بھی چلے آنا۔ ورنہ نہ آنا۔ اس بات کو انہوں نے مانا اور وہیں رہ گئے۔ اور رفیقوں
نے بھی روکا۔ پہاڑ کے راجہ اور رانا مرنے مارنے کے عہد و پیمان باندھے موجود تھے۔
وہ بھی کہتے رہے۔ اور امداد فوج اور سامان جنگ کی تیاریاں دکھاتے رہے۔ مگر وہ
نیکی کا پُتلا اپنے نیک ارادہ سے نہ ٹلا۔ اور سوار ہو کر چلا۔ جو فوج اس کے مقابلے پر
دامن کوہ میں پڑی تھی۔ اس میں ہزاروں ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ
امرائے شاہی جو یہاں سے گئے ہیں انہیں بیرم خاں نے پکڑ رکھا ہے۔ کوئی کہتا
تھا ہرگز نہ آئیگا۔ وقت ٹالتا ہے اور سامان بہم پہنچاتا ہے۔ پہاڑ کے راجہ مدد کو
آئے ہیں۔ کوئی کہتا تھا پہاڑ کے رستے علی قلی خاں اور شاہ قلی محرم[1] آتے ہیں۔ کوئی کہتا
تھا۔ صلح کا پیچ مارا ہے۔ رات کو شبخون ماریگا۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں ہو
رہی تھیں کہ وہ جریدہ لشکر میں داخل ہو گیا۔ تمام فوج نے خوشی کا غل مچایا اور نقاروں
نے دُور دُور تک خبر پہنچائی۔ کچھ میل فاصلہ پر حاجی پور دامن کوہ میں بادشاہ کے خیمے

[1] یاد کرو یہ وہی شاہ قلی محرم ہیں جو میدان جنگ سے ہوائی ہاتھی کو ہیموں سمیت پکڑ کر لے آئے تھے۔
خانخاناں نے اسے بچہ سا پالا تھا۔ محرم ترکوں میں ایک درباری عہدہ ہے۔

تھے۔ سنتے ہی حکم دیا کہ تمام امرائے دربار استقبال کو جائیں۔ اور قدیمی عزت و احترام سے لائیں۔ ہر شخص جاتا تھا۔ سلام کرتا تھا پیچھے ہو لیتا تھا۔ وہ شاہ نشان سپہ سالار جس کی سواری کا غل نقارہ کی آواز کوسوں تک جاتی تھی۔ اس وقت چپ چاپ۔ سکوت کا عالم تھا۔ گھوڑا تک نہ ہنہناتا تھا۔ وہ آگے آگے خاموش چلا آتا تھا۔ اس کا گورا گورا چہرہ اس پر سفید ڈاڑھی۔ ایک نور کا پتلا تھا کہ گھوڑے پر دھرا تھا۔ چہرے پر مایوسی برستی تھی۔ اور نگاہوں سے ندامت ٹپکتی تھی۔ تمام انبوہ چپ چاپ پیچھے تھا۔ سناٹے کا سماں بندھا تھا۔ جب بادشاہی خیمہ کا کلس نظر آیا تو گھوڑے سے اتر پڑا۔ ترک جس طرح گنہگار کو بادشاہ کے حضور میں لاتے ہیں۔ اس نے آپ بکتر سے تلوار کھول کر گلے میں ڈالی۔ پٹکے سے اپنے ہاتھ باندھے۔ عمامہ سر سے اتار کر گلے میں لپیٹا۔ اور آگے بڑھا خیمہ کے پاس پہنچا۔ تو خبر سن کر اکبر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ لب فرش تک آیا۔ خان خاناں نے دوڑ کر سر پاؤں پر رکھ دیا اور ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا۔ بادشاہ بھی اس کی گودوں میں کھیل کر پلا تھا۔ آنسو نکل پڑے۔ اٹھا کر گلے سے لگایا۔ اور اس کی قدیمی جگہ یعنی دست راست پر پہلو میں بٹھایا۔ آپ اس کے ہاتھ کھولے۔ دستار سر پر رکھی۔ خان خاناں نے کہا۔ آرزو تھی کہ حضور کی نمک حلالی میں جان کو قربان کردں۔ اور شمشیر بند بھائی جنازہ کا ساتھ دیں حیف کہ تمام عمر کی جانفشانی اور جاں نثاری خاک میں مل گئی۔ اور خدا جانے ابھی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ یہی شکر ہے۔ کہ اخیر وقت میں حضور کے قدم دیکھنے نصیب ہو گئے۔ یہ سن کر دشمنوں کے پتھر دل بھی پانی ہو گئے۔ دیر تک تمام دربار مرقع تصویر کی طرح خاموش رہا۔ کوئی دم نہ مار سکتا تھا +

ایک ساعت کے بعد اکبر نے کہا۔ کہ خان بابا اب صورتیں تین ہیں جس میں تمہاری خوشی ہو کہد و (۱) حکومت کو جی چاہتا ہے تو چندیری و کالپی کا ضلع لے لو وہاں جاؤ اور بادشاہی کرو (۲) مصاحبت پسند ہے تو میرے پاس رہو۔ جو عزت و توقیر تمہاری تھی اس میں فرق نہ آئیگا۔ (۳) حج کا ارادہ ہو تو بسم اللہ۔ روانگی کا سامان خاطر خواہ ہو جائیگا۔ چندیری تمہاری ہو چکی۔ محاصل تمہارے گماشتے جہاں کہو گے پہنچا دیا کریں گے۔ خان خاناں نے عرض کی کہ قواعد اخلاص و اعتقاد میں اب تک کسی طرح کا

قصور اور فتور نہیں آیا۔ یہ سارا تردد فقط اس لئے تھا کہ حضور میں پہنچ کر رنج و ملال کی بنیاد کو آپ دھوؤں۔ الحمدللہ جو آرزو تھی پوری ہوگئی۔ اب عمر آخر ہوئی۔ کوئی ہوس باقی نہیں۔ تمنا ہے تو یہی ہے کہ آستانہ الٰہی پر جا پڑوں۔ اور حضور کی عمر و دولت کی دعا کیا کروں۔ اور یہ معاملہ جو پیش آیا۔ اس سے بھی مطلب فقط یہ تھا کہ فتنہ انگیزوں نے جو اوپر سے اوپر مجھے باغی بنا دیا تھا۔ اس شبہ کو خود حضور میں پہنچ کر رفع کروں۔ غرض حج کی بات قائم ہوگئی۔ حضور نے خلعت خاص اور خاصہ کا گھوڑا عنایت کیا۔ منعم خاں دربار سے اپنے خیمے میں لے گیا۔ خیمے ڈیرے اسباب خزانے سے لے کر باورچی خانہ تھا جو تھا سب حوالہ کر کے آپ نکل آیا۔ بادشاہ نے پانچ ہزار روپیہ نقد اور بہت کچھ اسباب دیا۔ ماہم اور ماہم والوں کے سوا کوئی شخص نہ تھا۔ جس کے دل میں اس کی محبت نہ ہو۔ اپنے اپنے منصب کے بموجب نقد و جنس جمع کیا۔ کہ ترکوں کی رسم تھی۔ اور اسے چندوغ کہتے ہیں۔ چنانچہ ناگور کے رستہ گجرات دکن کو روانہ ہوا۔ حاجی محمد خاں سستانی ۳ ہزاری امیر کہ اُن کا مصاحب اور قدیمی رفیق تھا۔ بادشاہ نے اسے فوج دے کر رستہ کی حفاظت کے لئے ساتھ کیا۔

رستہ میں ایک دن کسی بن میں سے گذر ہوا۔ پگڑی کا کنارہ کسی ٹہنی میں اس طرح اُلجھا کہ پگڑی گر پڑی۔ لوگ اسے بُرا شگون سمجھتے ہیں۔ اس کے چہرے پر بھی ملال ہوا۔ حاجی محمد خاں سیستانی نے خواجہ حافظ کا شعر پڑھا ؂

در بیاباں چوں بہ شوق کعبہ خواہی زد قدم | سرزنش ہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

یہ سُنکر وہ ملال خوشی کا خیال ہوگیا۔ پٹن گجرات میں پہنچا۔ یہیں سے گجرات کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ عہد قدیم میں اسے نہر والہ کہتے تھے۔ موسیٰ خاں فولادی وہاں کا حاکم اور حاجی خاں الوری بڑی تعظیم سے پیش آیا۔ اور دھوم سے ضیافتیں کیں۔ اس سفر میں کچھ کام تو تھا نہیں۔ کیونکہ کاروبار کی عمر تمام ہوئی تھی۔ اس لئے جہاں خانخاناں جاتا تھا۔ دریا۔ باغ۔ عمارت کی سیر کر کے دل بہلاتا تھا۔

سلیم شاہ کے محلوں میں ایک کشمیرن بی بی تھی۔ اس سے سلیم شاہ کی ایک بیٹی تھی۔ وہ خانخاناں کے لشکر کے ساتھ حج کو چلی تھی۔ وہ خان خاناں کے بیٹے مرزا عبدالرحیم کو بہت چاہتی تھی۔ اور وہ لڑکا بھی اس سے بہت ہلا ہوا تھا۔ اور خان خاناں اپنے فرزند یعنی مرزا عبدالرحیم

سے لڑکی کی شادی کرنی چاہتا تھا۔ اس بات کا افغانوں کو بہت خار تھا (دیکھو خافی خاں اور ماثر) ایک دن شام کے وقت سہس لنگ[1] وہاں کے تلاؤ میں نواڑے پر بیٹھا پانی پر ہوا کھاتا پھرتا تھا۔ مغرب کے وقت کشتی سے نماز کے لئے اُترا۔ مبارک خاں لوہانی ایک افغان تیس چالیس افغانوں کو لے کر سامنے آیا۔ ظاہر یہ کیا کہ ہم ملاقات کو آئے ہیں۔ بیرم خاں نے مروّت واخلاص سے پاس بلا لیا۔ اس نامبارک نے مصافحہ کے بہانے پاس آکر پشت پر ایک خنجر مارا کہ سینہ سے پار نکل آیا۔ ایک اور ظالم نے سر پر تلوار ماری کہ کام تمام ہو گیا۔ اس وقت کلمہ اللہ اکبر زبان سے نکلا۔ غرض جس شربت شہادت کی وہ خدا سے التجا مانگتا تھا۔ اور دعائے سحری میں التجا کیا کرتا تھا۔ اور مردانِ خدا سے تمنا کیا کرتا تھا۔ خدا نے اسے نصیب کیا۔ لوگوں نے نامبارک سے پوچھا کہ کیا سبب تھا جو یہ غضب کیا۔ کہا کہ ماچھی واڑہ کی لڑائی میں ہمارا باپ مارا گیا تھا۔ ہم نے اس کا بدلہ لیا +

نوکر چاکر یہ حال دیکھ کر تتر بتر ہو گئے۔ اللہ اللہ کبھی وہ دولت وصولت اور کجا یہ حالت کہ اس کی لاش سے خون پڑا بہتا تھا اور کوئی نہ تھا کہ آکر خبر بھی لے۔ اس بیکس کے کپڑے تک اُتار لئے گئے۔ آب رحمت ہو ہوا پر کہ خاک کی چادر اُڑھا کر پردہ کیا۔ آخر وہیں کے فقراء و مساکین نے شیخ حسام الدین کے مقبرہ میں کہ مشائخ کبار میں مشہور تھے اور سلطان الاولیا کے خلفا میں تھے۔ دفن کر دیا۔ قاسم ارسلان نے تاریخ کہی۔ ماثر میں لکھا ہے۔ کہ ایک رات اسے خواب میں یہ تاریخ معلوم ہوئی تھی ؎

بیرم بہ طواف کعبہ چوں بست احرام	در راہ شد از شہادتش کار تمام
در واقعہ ہاتفے پئے تاریخش	گفتہ کہ شہید شد محمد بیرام

لاش دلی میں لا کر دفن کی حسین قلی خاں خان جہاں نے ۹۸۵ھ میں مشہد مقدس

[1] وہاں کی مشہور سیرگاہ تھی بھس ہندی میں ہزار کو کہتے ہیں اور لنگ گھر کو۔ اس تالاب کے گرد ہزار مندر تھے۔ شام کو جب اس کے گنبدوں پر دھوپ ہوتی تھی تو ان کی روشنی اور کلسوں کی چمک کا پانی میں عکس۔ اور کناروں کا سبزہ عجب بہار دیتا تھا اور جب چراغ جلتے۔ ان میں روشنی ہوتی تھی۔ اس کے عکس جو پانی میں پڑتے تھے تو سارا تلاؤ جگمگ جگمگ کرتا تھا +

میں پہنچائی ۔

لاوارث قافلہ پر جو مصیبت گذری ۔ عبدالرحیم خان خاناں[1] کے حال میں پڑھو۔

عبرت ۔ خدا کی شان دیکھو ! جن جن لوگوں نے اس کی برائی میں اپنی بھلائی سمجھی تھی ۔ ایک برس کے پس و پیش میں دنیا سے گئے ۔ اور ناکام و بدنام ہو گئے ۔ سب سے پہلے میر شمس الدین محمد خاں اتکہ اور گھنٹہ بھر نہ گذرا کہ ادہم خاں ۔ ۴۰ دن نہ ہوئے تھے کہ ماہم ۔ دوسرے ہی برس پیر محمد خاں ۔

خرابی خان خاناں کا اصلی سبب ۔ اس مہم کا سبب خواہ بیرم خاں کی سینہ زوری کہو ۔ خواہ یہ کہو کہ اس کے زبردست اختیارات اور احکام کی امرا کو برداشت نہ ہوئی ۔ خواہ یہ سمجھو کہ اکبر کی طبیعت میں خود حکمرانی کا جوش پیدا ہو گیا تھا ان باتوں میں سے کوئی بھی نہ ہو ۔ خواہ سب کی سب ہوں ۔ حق پوچھو تو سب کے دلوں میں فتیلہ لگانے والی وہی مردانی عورت تھی ۔ جو مردوں کو چالاکی اور مردانگی کا سبق پڑھاتی تھی یعنی ماہم[2] اتکہ ۔ وہ اور اس کا بیٹا چاہتے تھے کہ سارے دربار کو نگل جائیں ۔ میر شمس الدین محمد خاں اتکہ جس کے نام پر مہم مذکور کی فتح لکھی گئی اُنھوں نے جب خاتمہ مہم کے بعد دیکھا کہ ساری محنت برباد گئی ۔ اور ماہم والے سلطنت کے مالک بن گئے ۔ تو اکبر کو ایک عرضی لکھی ۔ باوجودیکہ اپنی شرافت اور متانت کے جوہر کی ہر حرف میں رعایت رکھی ہے ۔ پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے داغ داغ ہو رہے ہیں ۔ عرضی مذکور اکبر نامہ میں درج ہے ۔ میں نے اس کا ترجمہ ان کے حال میں لکھا ہے ۔ اس سے بہت سی رمزیں مہم مذکور ۔ اور ماہم کی کینہ وری کی عیاں ہوں گی

بیرم خاں کا مذہب (ملا صاحب فرماتے ہیں) اس کا دل پُرگداز تھا ۔ اکابر اور مشائخ کے کلام پر بہت اعتقاد رکھتا تھا ۔ ذراسی معرفت کے نکتہ پر آنسو بھر لاتا تھا ۔ صحبت میں ہمیشہ قال اللہ و قال الرسول کا ذکر تھا ۔ اور خود باخبر انسان تھا ۔

حکایت ۔ سیکری میں کسی فقیر گوشہ نشین سے ملنے گیا ۔ اہل جلسہ میں سے ایک شخص نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ کے کیا معنی

---

[2] دودھ پلانے والی کو اتکہ کہتے تھے ۔

ہیں۔ اُنہوں نے تفسیر نہ پڑھی تھی۔ چپکے بیٹھے رہے۔ خان خاناں نے کہا تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ بِالْقَنَاعَةِ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِالسُّؤَالِ۔ لیکن عقیدہ تفصیل کی طرف مائل تھا۔ حافظ محمد امین جو خاص بادشاہی اور خاندانی خطیب تھے اُن سے کہا کرتا تھا کہ جناب علی مرتضیٰ کے القاب میں چند کلمے اور اصحابوں سے زیادہ پڑھا کرو +

تباہی سے پہلے ایک علم اور پرچم مرصّع مشہد مقدس میں چڑھانے کو تیار کیا تھا۔ اس پر کروڑ روپیہ لاگت آتی تھی۔ اور قاسم ارسلاں نے علم امام ہشتم اس کی تاریخ کہی تھی۔ پرچم پر مولوی جامی کی یہ غزل بھی لکھی تھی +

سلام علیٰ آلِ طٰہٰ و یٰس	سلام علیٰ آل خیر النبیین
سلام علیٰ روضۃ حل فیہا	امام یباہی بہ الملک والدین
امام بحق شاہِ مطلق کہ آمد	حریم درش قبلہ گاہ سلاطین
شہ کاخ عرفان گلِ باغ احسان	دُرِ دُرج امکان مہِ برج تمکین
علی ابن موسےٰ رضا کز خدایش	رضا شد لقب چوں رضا بودش آئین

یہ علم بھی ضبطی میں گیا۔ اور خیر خواہان دولت نے خزانہ میں داخل کیا +

اخلاق۔ کل مؤرخ نئے اور پرانے بیرم کے حق میں سوا تعریف کے کچھ نہیں لکھتے۔ فاضل بداونی تو کسی سے نہیں چوکتے۔ وہ بھی جہاں اس کا ذکر کرتے ہیں خوبی اور شگفتگی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ پھر بھی خالی تو نہ چھوڑنا چاہیئے تھا۔ جس سال میں اس کا خاتمہ بالخیر کرتا ہے۔ وہاں کہتا ہے۔ اس سال میں خان خاناں نے ہاشمی قندھاری کی ایک غزل دست بُرد ترکانہ میں اُڑا کر اپنے نام سے مشہور کی۔ صلہ میں ۵۰ ہزار روپیہ نقد دے کر پوچھا۔ آرزو پوری ہوئی۔ اُس نے کہا۔ پوری تو جب ہو کہ پوری ہو (یعنی آرزو جب پوری ہو کہ لاکھ روپے کی رقم پوری ہو) یہ لطیفہ بہت پسند آیا۔ ۵۰ ہزار بڑھا کر پورے لاکھ کر دیئے۔ خدا جانے کیا ساعت تھی چند ہی روز میں غزل کا مضمون اور ادبار کا اثر ظاہر ہو گیا۔ **غزل**

من گیستم عنان دل از دست دادۂ	دزدست دل بلاہِ غم از پا فتادۂ
دیوانہ وار در کمر کوہ گشتۂ	بیے اختیار سر بگر بیاباں نہادۂ
گلہے چو شمع ز آتش دل در گرفتۂ	گر چوں فتیلہ بادلِ آتش فتادۂ
بیرم زفکر اندک و لبسار دارغیم	ہرگز نہ گفتہ ایم کہ یا زیادۂ

آزاد - دیکھو مُلّا صاحب نے ظرافت کا نشتر مارا تھا - وہاں سے سخاوت کا چشمہ بہ نکلا - یہ وہی نیّت کا پھل ۔

(نمبر ۲ - سخاوت) رام داس لکھنوی - سلیم شاہی زمانہ کا گویا تھا کہ موسیقی میں دوسرا تان سین کہلاتا تھا - وہ اس کے دربار میں آیا اور گایا - خزانہ میں اس وقت کچھ نہ تھا - اس پر لاکھ روپیہ دیا - اس کا گانا بہت پسند تھا - چنانچہ خلوت اور جلوت میں محرم اور ہمدم تھا - جب وہ گاتا تھا تو خان خاناں کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے - ایک جلسہ میں نقد جنس جو اسباب موجود تھا سب دے دیا - اور آپ الگ اُٹھ گیا ۔

(نمبر ۳ - سخاوت) جھجار خاں ایک سردار افغان امیروں میں سے باقی تھا - علم طوغ اور نقارہ سے اس کی سواری چلتی تھی - ملا صاحب کیا مزہ سے لکھتے ہیں اخیر عمر میں سپاہگری چھوڑ کر تھوڑی سی مدد معاش پر بیٹھ رہا تھا - زہد اور عبادت کی برکت سے قناعت کی دولت پائی تھی - اس نے قصیدہ کہہ کر سُنایا - خان خاناں نے لاکھ روپیہ دے کر کل سرکار سرہند کا امین کر دیا ۔

چوں مہرۂ نگین سما شد بزیر آب	پرگار قاتمش بزمین داد لعل نایاب

خواجہ کلاں بیگ کا لطیفہ ٹھیک ہوا کہ سخن فہمی عالم بالا ہم معلوم شد - حاصل کلام یہ ہے کہ اس کی ہمّت عالی کی نظر میں لک بھی لک رخس تنکا ، تھا - نہ یہ گھاس پھوس کہ پانی پر سوار نظر آتے ہیں ۔

(نمبر ۴ - اور ایک لطیفہ) میر علاء الدولہ اپنے تذکرہ میں فہمی قزوینی کے حال میں لکھتے ہیں کہ خاندان وزارت سے تھا - لیکن بے قید اور تکلفات سے آزاد رہتا تھا - رنگ سرخ اور آنکھیں کیری تھیں - ایک جلسہ میں بیرم خاں نے اُسے دیکھ کر کہا - مرزا - خون مرچہ بر روئے دوختہ - مرزا نے کہا برائے چشم زخم - خانخاناں خوش ہوئے - ہزار روپے - خلعت - گھوڑا اور ایک لاکھ کی جاگیر عنایت کی - فہمی اکبری تعریف میں اکثر قصائد کہا کرتا تھا - ایک قصیدہ کے دو شعر تذکرہ مذکور سے مجھے پہنچے ہے

منم ہمیشہ ثنا خواں کہ بادشاہ سلامت	دُعا ہمے کنم از جاں کہ بادشاہ سلامت

خطِ نوشتہ زافشاں کہ بادشاہ سلامت		بریں کتابۂ نیلی رواق کاتب قدرت

(نمبر ۵ - سخاوت) ۳۰ ہزار شریف شمشیرزن اس کے دسترخوان پر کھاتا تھا۔ اور ۲۵ - امیر بالیاقت صاحب تدبیر اس کے ملازم تھے۔ کہ برکت خدمت سے پنج ہزاری منصب اور طبل و علم ہوئے - دیکھو ماثر +

غیرت مردانہ - جب میدان جنگ کے لئے ہتھیار سجنے لگتا تو دستار سر ہاتھ میں اُٹھاتا اور کہتا۔ الٰہی یا فتح یا شہادت - بدھ کے دن معمول تھا کہ ہمیشہ شہادت کی نیت سے حجامت اور غسل کیا کرتا ہے۔ مآثرالامرا +

علو حوصلہ - اس آفتاب کا اقبال عین اوج پر تھا - دربار لگا ہوا تھا ایک سید سادہ لوح کسی بات پر خوش ہوئے - کھڑے ہوکر کہا - نواب کی حصول شہادت کے لئے سب فاتحہ پڑھیں - اور دعا کریں - سب اہل دربار سید صاحب کا منہ دیکھنے لگے - اس عالی حوصلہ نے مسکرا کر کہا - جناب سید! بایں اضطراب غمخواری نکنید۔ شہادت عین تمنا است مگر نہ بایں زودی - دیکھو اقبال نامہ اور مآثرالامرا۔ انہی کتابوں میں ہے کہ ہمیشہ بدھ کے دن خط بنواتا تھا غسل کرتا تھا۔ اس نیت سے کہ میں شہادت کے لئے مستعد اور مہیا رہوں) - ہمیشہ اس نعمت کے لئے دعا کرتا رہتا تھا اور اہل اللہ سے دعا چاہتا تھا +

نقل - ایک شب دربار خاص میں ہمایوں بادشاہ بیرم خاں سے کچھ کہہ رہے تھے - رات زیادہ گئی تھی - نیند کے مارے بیرم خاں کی آنکھیں بند ہونے لگیں - بادشاہ کی بھی نگاہ پڑ گئی - فرمایا بیرم! من بشما مے گویم - خواب مے کنید - بیرم نے کہا - قربانت شوم از بزرگان شنیدہ ام کہ در سہ مقام حفاظت سہ چیز واجب است۔ در حضرت بادشاہان حفظ چشم - در خدمت درویشان نگہداری دل - در پیش علما پاسبانی زبان - در ذات حضور صفات سہ گانہ جمع مے بینم - فکر مے کنم کدام کدام شاں را نگہدارم - اس جواب سے بادشاہ بہت خوش ہوئے (مآثرالامرا)

آزاد - اس برگزیدہ انسان کے کل حالات پڑھ کر صاحب نظر صاف کہدینگے کہ اس کا مذہب شیعہ ہوگا - لیکن اس کہنے سے کیا حاصل - ہمیں چاہئے کہ اس کی چال ڈھال دیکھیں - اور گذرگاہ دنیا میں آپ چلنا سیکھیں - اس عالی حوصلہ دریادل نے

دوست و دشمن کے انبوہ میں کس ملنساری اور سلامت روی سے اور بے تعصبی اور اور خوش اعتدالی سے گذارہ کیا ہوگا۔ وہ شاہانہ اختیار رکھتا تھا۔ کل سلطنت کے کاروبار اس کے ہاتھ میں تھے۔ اور شیعہ سُنّی جن کے شمار ہزاروں اور لاکھوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ سب کی غرضیں اور اُمیدیں اس کے دامن کھینچتی تھیں۔ باوجود اس کے کیسا دونوں فرقوں کو دونوں ہاتھوں پر برابر لئے گیا کہ مورخاں وقت میں کوئی اس کے تشیع کا ثبوت نہ کرسکا۔ ملّا صاحب جیسے نظرباز نے بہت تاڑا تو یہ کہا کہ تفضیل پر مائل تھا۔ اہل اسلام میں ایک فرقہ وہ ہے کہ خلافت میں حضرت علی کو چوتھے درجہ میں رکھتے ہیں۔ مگر کہتے ہیں کہ فضائل و اوصاف میں پہلے تینوں خلفا سے افضل تھے۔ جن سنّت جماعت لوگوں کو اُس سے کام پڑتا اُن پر اس قدر اخلاق اور سخاوت مبذول کرتا تھا کہ امرائے اہل سنّت نہ کرتے تھے دیکھو مخدوم الملک کا حال ؞

تصنیف

ہر تذکرہ و تاریخ میں لکھتے ہیں کہ شعر کا نکتہ شناس تھا اور خود بھی خوب کہتا تھا۔ ماثر الاثر میں ہے کہ اُستادوں کے شعروں میں ایسی اصلاحیں کیں کہ اہل سخن نے انہیں تسلیم کیا۔ ان سب کا مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اور اور اس کا نام دخلیہ رکھا تھا فارسی اور ترکی زبان میں تمام کمال دیوان لکھے اور قصاید بلیغ نظم کئے۔ ملّا صاحب اکبر کے زمانہ میں لکھتے ہیں کہ آج کل اس کے دیوان زبانوں اور ہاتھوں پر رواں ہیں۔ محوی شاعر کے حال میں لکھا ہے کہ اس کی یہ رباعی بیرم خاں کے دیوان میں لوح دیباچہ پر درج ہے۔

از کون و مکاں نخست آثار نبود	کاشیا ہمہ از دو حرف کن شد موجود
آمد چو ہمیں دو حرف مفتاح وجود	شد مطلع دیباچہ دیوان شہود

افسوس کا دن آج ہے۔ جس میں اس کی ایک غزل بھی پوری نہیں ملتی۔ تاریخوں اور تذکروں میں متفرق اشعار ہیں۔ ہفت اقلیم ملا امین رازی میں ایک قصیدے کے بھی بہت سے شعر لکھے ہیں جس کا مطلع ہے ؎

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر افسر اد	اگر غلام علی نیست خاک بر سر اد

امیر الامرا خان زماں علی قلی خاں شیبانی

علی قلی خاں اور اس کے بھائی بہادر خاں نے خاک سیستان سے اُٹھ کر رستم کا نام روشن کر دیا۔ ملا صاحب سچ کہتے ہیں جس بہادری اور بے جگری سے انہوں نے تلواریں ماریں۔ لکھتے ہوئے قلم کا سینہ پھٹا جاتا ہے۔ یہ شاہ نشان سپہ سالار دولت اکبری میں بڑے بڑے کارنامے دکھاتے اور خدا جانے ملک کو کہاں سے کہاں پہنچاتے۔ حاسدوں کی نالائقی اور کینہ وری ان کی جانفشانیوں اور جانبازیوں کو دیکھ نہ سکی۔ آزاد۔ میں اس معاملے میں انہیں اعتراض سے پاک نہیں رکھ سکتا وہ آخر دربار میں سب کو جانتے تھے۔ اور سب کچھ جانتے تھے خصوصاً بیرم خاں کی بربادی اور جانفشانی دیکھ کر چاہئے تھا کہ ہوشیار ہو جاتے۔ اور قدم قدم پر سوچ سمجھ کر پاؤں رکھتے۔ افسوس کہ پھر بھی نہ سمجھے۔ اور وہ جانبازیاں جن سے دربار دلاوری میں رستم و اسفندیار کے برابر جگہ پاتے سب اپنی بربادی میں خرچ کیں۔ یہاں تک کہ نمک حرامی کا داغ لے کر دنیا سے گئے +

حیدر سلطان ان کا باپ قوم کا ازبک تھا۔ اور شیبانی[1] خاں کے خاندان میں سے تھا۔ اُس[2] نے ایک اصفہانی عورت سے شادی کی تھی۔ شاہ طہماسپ نے جو فوج ہمایوں کے ساتھ کی اس میں بہت سے سردار با اعتبار تھے۔ اُن ہی میں حیدر سلطان اور اس کے دونوں بیٹے بھی تھے۔ قندھار کے حملوں میں باپ بیٹے ہمت مردانہ کے جوہر دکھاتے رہے۔ ایران کا لشکر رخصت ہوا تو حیدر سلطان ہمایوں کے ساتھ رہا۔ بلکہ ایسی خصوصیت حاصل کی کہ ایرانی سپہ سالار اس کی معرفت حاضر ہو کر رخصت ہوا۔ اور خطا واروں کی خطا اس کی سفارش سے معاف ہوئی +

---

[1] وہی شیبانی خاں جس نے بابر کو ملک فرغانہ سے نکالا بلکہ تیمور کا نام ترکستان سے مٹایا +

[2] بہ قول فرشتہ و خانی خاں وغیرہ کا ہے۔ مگر بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ جام پر قزلباش اور ازبک میں سخت لڑائی ہوئی۔ اس میں حیدر سلطان قزلباشوں کی شمول سے سرخرو ہوا۔ اور ان ہی میں سکونت اختیار کر کے ایک اصفہانی عورت سے شادی کر لی +

اس کی خدمتوں نے ہمایوں کے دل میں ایسا گھر کیا تھا کہ اس وقت قندھار کے سوا کچھ پاس نہ تھا۔ پھر بھی شال کا علاقہ اس کی جاگیر میں دیا تھا۔ بادشاہ ابھی اسی طرف تھا کہ لشکر میں وبا پڑی۔ اس میں سلطان حیدر نے قضا کی۔ چند روز بعد ہمایوں نے کابل کی طرف علم کا پرچم کھولا۔ شہر آدھ کوس رہا تو مقام کیا۔ امرا کی تقسیم اور فوج کی ترتیب کی۔ دونوں بھائیوں کو خلعت دے کر سوگ سے نکالا۔ اور بہت دلاسا دیا۔ علی قلی خاں اس وقت بکاول بیگی (کھانا کھلانے کا داروغہ تھا) جب کامران طالیقان پر قلعہ بند ہو کر ہمایوں سے لڑ رہا تھا۔ روز جنگ کے میدان گرم ہوتے تھے دونوں بھائی دلوں میں دلاوری کے جوش اور فوجیں رکاب میں لئے تلواریں مارتے پھرتے تھے۔ اس میں علی قلی خاں کے لباس نوجوانی کو زخموں سے گلرنگ کیا۔ ہندوستان پر ہمایوں نے فوج کشی کی۔ اس میں بھی دونوں بھائی شمشیر دو دم کی طرح میدان میں چلتے تھے۔ اور دشمنوں کو کاٹتے تھے۔

ہمایوں نے لاہور میں آکر دم لیا۔ ہر چند پشاور سے یہاں تک افغان ایک میدان بھی نہ لڑے مگر اُن کے مختلف سردار جا بجا جمعیتوں کے انبوہ لئے دیکھ رہے تھے کہ کیا ہوتا ہے۔ خبر لگی کہ ایک سردار دیپال پور پر فوج فراہم کر رہا ہے۔ بادشاہ نے چند امرا کو سپاہ و سامان دے کے روانہ کیا۔ اور شاہ ابو المعالی کو سپہ سالار کیا۔ وہاں مقابلہ ہوا۔ اور افغانوں نے میدان جنگ میں حد سے بڑھ کر حوصلہ دکھایا۔ شاہ ملک حسن کے سپہ سالار تھے لیکن وہاں نگاہوں کی تلواریں ناز کے خنجر نہیں چلتے۔ فوج کا میدان میں لڑانا اور خود شمشیر کا جوہر دکھانا اور بات ہے جب میدان کارزار گرم ہوا۔ تو ایک جگہ افغانوں نے شاہ کو گھیر لیا۔ سیستانی شیر اپنے رفیقوں کے ساتھ دھاڑتا اور للکارتا پہنچا۔ اور وہ ہاتھ مارے کہ میدان مار لیا۔ بلکہ شہرت و ناموری کا نشان یہیں سے ہاتھ آیا۔ ستلج پار کی لڑائی میں جو خان خاناں کی فوج نے میدان مارا۔ یہ سایہ کی طرح پیچھے پیچھے فوج لئے پہنچے۔

لشکر بادشاہی میں ایک آوارہ گمنام۔ بے سر و پا سپاہی قنبر نام تھا اور اپنی سادہ مزاجی سے **قنبر دیوانہ** مشہور تھا۔ لیکن کھانے کھلانے والا تھا۔ اس لئے جہاں کھڑا ہوتا تھا۔ کچھ نہ کچھ لوگ اس کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ جب ہمایوں نے

سرہند پر فتح پائی تو وہ لشکر سے جُدا ہو کر لُوٹتا مارتا چلا گیا۔ گاؤں اور قصبوں پر گرتا تھا۔ جو پاتا تھا لُوٹتا تھا اور لوگوں کو دیتا تھا۔ خدائی لشکر ساتھ ہوتا جاتا تھا۔ قنبر دیوانہ تھا مگر اپنے کام کا ہوشیار تھا۔ کچھ کچھ قیمتی چیزیں ہاتھی۔ گھوڑے جو ہاتھ آتے۔ عرائض بندگی کے ساتھ حضور میں پہنچاتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ سنبھل میں جا پہنچا۔ ایک نامی افغان بہادر سردار وہاں کا حاکم تھا۔ اس نے مقابلہ کیا۔ تقدیر کی بات ہے کہ باوجود جمعیت و سامان کے بے جنگ ویران ہو گیا +

جب قنبر نے جمعیت امیرانہ بہم پہنچائی۔ تو دماغ میں خیالات شاہانہ سمائے کہ میں مالک ملک اور صاحب تاج ہو گیا۔ یہ دیوانہ عجب مزے کی باتیں کرتا تھا اس کا دسترخوان وسیع تھا۔ اچھے کھانے پکواتا تھا۔ سب کو بٹھاتا اور کہتا "بخورید مال مالِ خدا۔ جان جانِ خدا۔ قنبر دیوانہ بکاول خدا۔ ہاں بخورید۔" اس کا دل دسترخوان سے بھی زیادہ وسیع تھا۔ اس سخاوت نے یہاں تک جوش و خروش دکھایا کہ کئی دفعہ گھر کا گھر لُٹا دیا۔ آپ باہر نکل کر کھڑا ہوا اور کہا مال خدا ئیست۔ ہاں بندہا ئے خدا بیائید بگیرید۔ بردارید۔ ونگزارید" انسان کا یہ بھی قاعدہ ہے۔ کہ ترقی کے وقت جب اُونچا ہوتا ہے۔ تو خیالات اس سے بھی بہت اُونچے ہو جاتے ہیں ؎

جتنے نشے ہیں یاں روش نشۂ شراب ہو جاتے بدمزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

ادب آداب بھول گیا۔ اور حقیقت میں یاد ہی کب کئے تھے جو بھولتا۔ ایک لشکری آدمی بلکہ صحرائی جانور تھا۔ بہرحال جو لوگ اس کی رکاب میں جانفشانیاں کرتے تھے انہیں آپ ہی بادشاہی خطاب دینے لگا۔ آپ ہی علم و نقارے بخشنے لگا۔ انہی بھولی بھالی باتوں میں یہ بھی ضرور تھا۔ کہ رعایا کے ساتھ بعض بعض بے اعتدالیاں کرتا تھا۔ جب آدمی کا ستارہ بہت چمکتا ہے تو اس پر نگاہ بھی زیادہ پڑنے لگتی ہے۔ لوگوں نے حضور میں ایک ایک بات چُن کر پہنچائی۔ بادشاہ نے **علی قلی خاں کو خان زمان** کا خطاب دے کر روانہ کیا کہ سنبھل قنبر سے لے لو۔ بداؤں اس کے پاس رہے۔ اسے بھی خبر پہنچی اور ساتھ ہی علی قلی خاں کا وکیل پہنچا کہ فرمان آیا ہے چل کر تعمیل کر۔ وہ کب خاطر میں لاتا تھا۔ جاہل سپاہی تھا سنبھل کو سنبھر کہتا تھا۔ دربار میں بیٹھتا۔ اور کہتا۔ سنبھر۔ قنبر۔ سنبھر و علی قلی خاں چہ؟ مثل ہماں است کہ دہ کسے درختان

کسے۔ علی قلی خاں کو کیا واسطہ۔ مُلک میں نے مارا کہ تو نے ؟ خان نے پہنچ کر بدایوں کے پاس لشکر ڈالا اور اُسے بُلا بھیجا۔ قنبر کب آتے تھے۔ یہ کہتے تھے کہ تو میرے پاس کیوں نہیں آتا۔ تو بادشاہی بندہ ہے تو میں بھی حضرت کا غلام ہوں۔ مجھے بادشاہ کے ساتھ تجھ سے زیادہ قرب ہے۔ اپنے سر کی طرف اُنگلی اُٹھاتا اور کہتا کہ یہ سر تاج شاہی سمیت پیدا ہوُا ہے۔ خان نے فہمائش کے لئے اپنے معتبر بھیجے انہیں قید کر لیا۔ بھلا خان زماں اس پاگل کو کیا خاطر میں لاتا تھا۔ آگے بڑھ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ دیوانہ نے یہ بُرا کیا کہ ان دنوں میں رعایا کو زیادہ تر ناراض کرنے لگا کسی کا مال لے لیا کسی کے عیال لے لئے۔ لوگوں کی بے اعتباری کے سبب سے رات کو آپ مورچے مورچے پر قلعداری کا اہتمام کرتا پھرتا تھا ✦

باوجود اس دیوانہ پن کے سیانا بھی ایسا تھا کہ ایک دفعہ آدھی رات کو پھرتے پھرتے ایک بنئے کے گھر میں پہنچا جُھک کر زمین سے کان لگائے۔ چند قدم آگے پیچھے بڑھ کر ہٹ کر پھر دیکھا۔ پھر پہلی جگہ آکر بیلداروں کو آواز دی اور کہا کہ ہاں۔ آہٹ معلوم ہوتی ہے۔ یہیں سے کھودو۔ دیکھا تو وہیں نقب کا سرا نکلا۔ کہ علی قلی خاں باہر سے سُرنگ لگا رہا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوُا کہ قلعہ خدا جانے کن وقتوں کا بنا ہوُا تھا۔ باہر والوں نے جس طرف سے سرنگ لگائی فصیل میں سال کے شہتیر اور لوہے کی سلاخیں پائی تھیں۔ بنانے والے نے آثار بھی پانی تک پہنچا دیا تھا۔ خان زماں کو کسی حکمت عملی سے پتہ لگ گیا۔ وہی ایک جگہ تھی جہاں سے اندر سُرنگ جا سکتی تھی ✦

بہر حال اگر قنبر تاڑ نہ جاتا تو اسی دن علی قلی خاں کی فوج سُرنگ کی راہ سر توڑ اندر چلی آتی۔ خان بھی یہ زیر کی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ خیر شہر کے لوگ اس سے تنگ تھے۔ خان کے معتبر جو قلعے میں قید تھے۔ اُنھوں نے اندر اندر شہر کے لوگوں کو ملا لیا۔ جب رعایا پھر گئی۔ پھر کیا ٹھکانا! باہر والوں کو پیغام بھیجا کہ رات کو اس بُرج پر فلانے وقت اُس مورچے سے حملہ کرو۔ ہم کمندیں ڈال کر اور زینے لگا کر چڑھا لینگے۔ شیخ حبیب اللہ وہاں کے رؤسائے سرکردہ میں سے تھے۔ اور شیخ سلیم چشتی کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ وہ خود اس معاملے میں شریک تھے۔

چنانچہ رات کے وقت شیخ زادہ کے برج کی طرف سے چڑھا ہی لیا اور ایک طرف آگ بھی لگادی۔ شب اپنی سیاہ چادر تانے سوتی تھی اور دنیا غافل پڑی تھی۔ قنبر سیاہ بخت نے وقت کو غنیمت سمجھا اور ایک کالا کمبل اوڑھ کر بھاگ گیا۔ مگر اسی دن علی قلی خاں کے شکاری خرگوش کی طرح جنگل سے پکڑ لائے۔ با مروت سپہ سالار نے ہر چند کہا۔ کہ فرمان شاہی کی بے ادبی کی ہے۔ توبہ اور معذرت کر۔ دیوانہ کس کی سنتا تھا کہا کہ معذرت چہ معنی دارد۔ آخر جان کھوئی اور مدت تک اس کی قبر درگاہ بن کر شہر بداؤں کو روشن کرتی رہی۔ لوگ پھول چڑھاتے اور مرادیں پاتے تھے۔ علی قلی خاں نے اس کا سر کاٹ کر عرضی کے ساتھ دربار میں بھیج دیا۔ رحمدل بادشاہ (ہمایوں) کو یہ بات پسند نہ آئی بلکہ ناراضی کے ساتھ فرمان لکھا کہ جب وہ اظہار بندگی کرتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ معذرت کو حضور میں حاضر ہو تو پھر یہاں تک کیوں نوبت پہنچائی۔ اور جب گرفتار ہو کر آیا تو قتل کیوں کیا +

انہیں دنوں میں ہمایوں کے ہمائے حیات نے پرواز کی۔ اقبال چتر بنا اور اکبر کے سر پر قربان ہوا۔ ہیموں ڈھوسر افغانوں کے گھر کا نمک خوار ممالک مشرقی میں حق نمک ادا کرتے کرتے بہت قوت پکڑ گیا تھا۔ اور روز بروز زوروں پہ چڑھتا جاتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ۱۳ برس کا شہزادہ بادشاہ ہندوستان ہوا ہے۔ تو فوج لے کر چلا۔ بڑے بڑے امرائے افغان اور جنگ کے بے شمار سامان لئے طوفان کی طرح پنجاب پر آیا۔ تغلق آباد پہ تردی بیگ کو شکست دی۔ دلّی میں جس کا تخت بادشاہوں کی ہوس کا تاج ہے۔ جشن شاہانہ کیا۔ اور دلّی جیت کر بکرماجیت بن گیا +

شادی خاں ایک پرانا افغان شیر شاہی پٹھانوں میں سے ادھر کے علاقے دبائے ہوئے تھا۔ خان زماں اس سے لڑ رہا تھا۔ جب ہیموں کا غلغلہ اٹھا تو بہادر نے مناسب سمجھا کہ پرانے خاک تودہ پر تیر اندازی کرنے سے بہتر ہے کہ نئے دشمن پر جا کر تلوار کے جوہر دکھاؤں۔ اس لئے ادھر کا معاملہ ملتوی کر کے دلّی کا رخ کیا۔ مگر لڑائی کے وقت تک میدان میں نہ پہنچ سکا۔ میرٹھ میں تھا کہ سنا۔ امرا بھاگے۔ یہ دلّی سے اوپر اوپر جمنا پار[1] ہوا اور کرنال سے ہوتا ہوا پنجاب ہی کی طرف چلا۔ دلّی کے بھگوڑے

[1] باغپت کے گھاٹ اترا ہوگا۔

سرہند میں جمع ہو رہے تھے۔ یہ بھی انہیں میں شامل ہوا۔ اکبر آئے سب کی ملازمت ہوئی۔ تردی بیگ باہر سے باہر ہی مر چکے تھے۔ اکبر نے عنایت و مرحمت بلکہ انعام و اکرام سے شکستہ دلوں کی مرہم پٹی کی۔ یہ سب خان خاناں کی تدبیریں تھیں

رستہ میں خبر پہنچی کہ ہیموں دلی سے چلا۔ خان خاناں نے لشکر کے دو حصے کئے۔ پہلے حصے کے لئے چند جنگ آزمودہ امیروں کو انتخاب کیا۔ خان زماں کے سر پر امیر الامرائی کلگی تھی۔ اُس پر سپہ سالاری کا چتر لگایا۔ سکندر وغیرہ امراء کو ساتھ کیا۔ اپنی بھی فوج ساتھ کی اور اسے ہراول کر کے آگے روانہ کیا۔ دوسری فوج کو اکبر کی رکاب میں لیا۔ اور شکوہ شاہانہ کے ساتھ آہستہ آہستہ چلا۔ پیش قدم سپہ سالار اگرچہ نوجوان تھا مگر فنون جنگ میں قدرتی لیاقت رکھتا تھا میدان کا اندازہ دیکھتا تھا۔ فوج کا بڑھانا۔ لڑانا موقع وقت کا سمجھنا۔ حریف کے حملہ کا سنبھالنا۔ عین موقع پر خود دھاوے سے نہ چوکنا وغیرہ وغیرہ۔ غرض ان مقدموں میں اُسے ایک استعداد خداداد تھی کہ جس انجام کو سوچ کر ہاتھ ڈالتا تھا۔ وہی شکار پکڑ لاتا تھا۔ اِدھر ہیموں کو اس انتظام کی خبر پہنچی۔ خاطر میں نہ لایا۔ دلی مار کر دل بہت بڑھ گیا تھا۔ ترکی کا جواب ترکی دیا۔ افغانوں کے دو عالیجاہ سردار انتخاب کئے کہ ان دنوں میدان جنگ میں چلتی تلوار بنے ہوئے تھے۔ اُنہیں ۲۰ ہزار فوج دی اور توپ خانہ کہ دریائے آتش کا دہانہ تھا ساتھ روانہ کیا۔ کہ پانی پت پر جا کر ٹھہرو۔ ہم بھی آتے ہیں +

نوجوان سپہ سالار کے دل میں دلاوری کی اُمنگ بھری ہوئی کہ اُس بکرماجیت سے مقابلہ ہے جس کے سامنے سے پرانا سپاہی اور نامور سپہ دار بھاگ نکلا۔ اور جواں بخت نوجوان تخت پر بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے اِتنے میں سُنا کہ حریف کا توپ خانہ پانی پت پر آ گیا۔ چند سرداروں کو آگے بھیجا کہ جا کر چھینا جھپٹ کریں۔ اُنھوں نے پہنچ کر لکھا کہ غنیم کا وزن بہت بھاری ہے۔ سیستانی شیر خود جھپٹا اور اس صدمے سے جا کر گرا کہ ٹھنڈے لوہے سے گرم لوہے کو دبا لیا۔ اور ہاتھوں ہاتھ توپ خانہ چھین لیا۔ صدہا گھوڑے ہاتھی شیروں کے ہاتھ آئے +

ہیموں کو توپ خانہ ہی پر بڑا گھمنڈ تھا۔ جب یہ خبر سُنی تو ایسا جھنجھلایا کر اُٹھا جیسے دال میں بگھار لگا۔ اور سارا لشکر لے کر روانہ ہوا۔ ۳۰ ہزار جوشن پوش۔ ۱۵ سو ہاتھی جن میں پانسو جنگی فیل مست اُن کے چہروں کو کالے پیلے رنگ پھیر کر ہیبت ناک بنایا تھا۔ اور سروں پر ڈراؤنے جانوروں کی کھالیں ڈالی تھیں۔ لوہے کی پاکھریں پیٹ پر پڑی مستکوں پر ڈھالیں۔ گرد چھریاں کٹاریں کھڑی سونڈوں میں زنجیریں اور تلواریں ہلاتے۔ ہر ہاتھی پر ایک ایک سُورما سپاہی اور مہنت مہاوت بٹھایا تھا۔ کہ دیوزاد لڑائی کے وقت خاطر خواہ کام دیں۔ ادھر بادشاہی فوج میں کُل ۱۰ ہزار کی جمعیت تھی جن میں ۵ ہزار جنگی دلاور تھے +

سیستانی رستم نے جب حریف کی آمد آمد سُنی تو جاسوس دوڑائے۔ لیکن بادشاہ کے آنے یا کمک منگانے کا کچھ خیال نہ کیا۔ فوج کو تیاری کا حکم سُنایا۔ اور اُمرا کو جمع کر کے مجلس مشاورت آراستہ کی۔ میدان جنگ کے پہلو تقسیم کئے۔ پہلے یہی خبر آئی تھی کہ ہیموں پیچھے آتا ہے۔ شادی خاں سپہ سالاری کرتا ہوا فوج کو لاتا ہے۔ دفعتہً پرچہ لگا کہ ہیموں خود ہی ساتھ آیا ہے۔ پانی پت سے ایک پڑاؤ آگے بڑھ کر گھرونڈہ پر مورچے باندھے ہیں۔ خان زماں کا آگے بڑھنے کا ارادہ تھا مگر تھم گیا۔ اور شہر سے ہٹ کر مقابلے پر لشکر جمایا۔ چاروں پہلو اُمرا پر تقسیم کر کے فوجوں کا قلعہ باندھا۔ بیچ میں آپ اقبال کا نشان علم کیا۔ ایک بڑا سا چتر تیار کیا اُسے اپنے سر پر لگایا۔ اور سپہ سالاری کی شان بڑھا کر قلب میں جا کھڑا ہوا۔ لڑائی شروع ہوئی اور میدان کارزار گرم ہوا۔ طرفین کے بہادر بڑھ بڑھ کر تلواریں مارنے لگے۔ خان زمانی جان نثار بے جگر ہو کر حملے کرتے تھے۔ اور تلوار کی آنچ پر اپنی جان کو دے دے مارتے تھے۔ مگر باوجود اس کے کامیاب نہ ہو سکتے۔ دھاوا کرتے تھے اور بکھر جاتے تھے۔ کیونکہ کم تھے۔ لیکن سیستانی شیر کا جوش سب کے دلوں پر چھایا ہوا تھا کسی طرح باز نہ آتے تھے۔ لڑتے تھے مرتے تھے اور شیروں کی طرح بپھر بپھر کر جا پڑتے تھے +

ہیموں ہوائی[۵] ہاتھی پر سوار قلب لشکر کو سنبھالے کھڑا تھا اور فوج کو لڑا رہا تھا۔ آخر میدان کا اندازہ دیکھ کر اُس نے ہاتھی ہول دیے۔ کالے پہاڑوں نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور کالی گھٹا کی طرح آئے۔ اکبری نمک خوار خاطر میں نہ لائے۔ بھاگے مگر

[۵] ہیموں کے ہاتھی کا نام ہوائی تھا

ہوش وحواس سے۔ کالے پانی کے سیلاب کو رستہ دیا۔ اور لڑتے بھڑتے ہٹتے
چلے گئے۔ لڑائی کے وقت لشکر کا رُخ اور دریا کا بہاؤ ایک حکم رکھتا ہے۔ جدھر کو
پھر گیا پھر گیا۔ غنیم کے ہاتھیوں کی صف بادشاہی فوج کے ایک پہلو کو ریلتی ہوئی
لے گئی۔ خان زمان اپنی جگہ کھڑا تھا۔ اور سپہ سالاری کی دُوربین سے چاروں طرف
نظر دوڑا رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ سیاہ آندھی جو سامنے سے اُٹھی برابر کو نکل گئی۔
اب ہیموں قلب لشکر کو لئے کھڑا ہے۔ یکبارگی فوج کو للکار کر حملہ کیا۔ حریف ہاتھیوں
کے حلقے میں تھا۔ اور گرد بہادر افغانوں کا غول تھا۔ اُس نے پھر بھی حلقے ہی کو ریلا۔
ترک تیروں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے بڑھے۔ اُدھر سے ہاتھی تلواریں سونڈوں میں
پھراتے اور زنجیریں جھلاتے آگے آئے اس وقت علی قلی خاں کے آگے بیرم خانی
جوان جانفشانی کر رہے تھے۔ جن میں حسین قلی خاں اُس کا بھانجا سپہ سالار تھا۔
اور شاہ قلی محرم وغیرہ مصاحب سردار تھے۔ سچ یہ ہے کہ بڑا ساکھا کیا۔ اور ہاتھیوں کے
حملے کو حوصلے اور ہمّت سے روکا۔ وہ سینہ سپر ہو کر آگے بڑھے۔ اور جب دیکھا کہ
گھوڑے ہاتھیوں سے بدکتے ہیں تو کود پڑے اور تلواریں کھینچ کر صفوں میں گھس
گئے۔ اُنھوں نے تیروں کی بوچھاڑ سے سیاہ دیوزادوں کے مُنہ پھیر دئے اور کالے
پہاڑوں کو خاک تودہ سا بنا دیا عجب گھمسان کا رن پڑا۔ ہیموں کی بہادری تعریف کے
قابل ہے۔ وہ ترازو باٹ کا اُٹھانے والا۔ دال چپاتی کا کھانے والا۔ ہودے کے بیچ
میں ننگے سر کھڑا تھا۔ فوج کا دل بڑھاتا تھا اور فتح کا **منتر** جو کسی گیانی گنوان یا پنڈت
بدیاوان نے بتایا تھا جپے جاتا تھا۔ فتح شکست خدا کے اختیار ہے۔ سپاہ کا ستھراؤ
ہو گیا۔ شادی خاں افغان اُس کے سرداروں کی ناک تھا۔ کٹ کر خاک پر گر پڑا۔ فوج اناج
کے دانوں کی طرح کھنڈ گئی۔ پھر بھی اس نے ہمّت نہ ہاری۔ ہاتھی پر سوار۔ چاروں طرف
پھرتا تھا۔ سرداروں کے نام لے لے کر پکارتا تھا۔ کہ سمیٹ کر پھر جمع کرلے۔ اتنے
میں ایک قضا کا تیر اس کی بھینگی آنکھ میں ایسا لگا کہ باہر نکل گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ
سے تیر کھینچ کر نکالا۔ اور آنکھ پر رومال باندھ لیا۔ مگر زخم سے ایسا بیقرار اور بیحواس ہوا
کہ ہودے میں گر پڑا۔ یہ دیکھ کر اُس کے ہواخواہوں کے جی چھوٹ گئے سب تتر بتر
ہو گئے۔ اکبر کے اقبال اور خان زمان کی تلوار پر اس مہم کا فتح نامہ لکھا گیا۔ ہیموں کی

گرفتاری اور قتل کی کیفیت دیکھو صفحہ ۱۳۔ اس کے صلے میں سرکار سنبھل اور میانِ دوآب کا علاقہ اس کی جاگیر ہو گیا۔ اور خود امیر الامرا خان زمان ہوئے۔ بلکہ حق پوچھو تو (بقول بلوک مین صاحب) خان زمان نے ہندوستان میں تیموری سلطنت کی بنیاد رکھنے میں بیرم خاں سے دوسرا نمبر حاصل کیا۔ سنبھل کی سرحد سے تمام جانب مشرق میں افغان چھائے ہوئے تھے۔ رکن خاں روحانی ایک پرانا پٹھان اُن کا سردار تھا۔ خان زمان فوج لے کر چڑھا۔ لکھنؤ تک تمام شمالی ملک صاف کر دیا۔ اور ان ملکوں میں ایسا لڑا کہ ایک ایک میدان اس کا کارنامہ تھا دفتر روزگار پر۔ اکبر قلعہ مانکوٹ کا محاصرہ کئے پڑا تھا کہ حسن خاں بچکوٹی نے سرکار سنبھل پر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس فساد کی خبر سُن کر یا اکبر ادھر آئیگا یا خان زمان جو آگے بڑھا جاتا ہے وہ اس طرف اُلجھیگا۔ خان زمان لکھنؤ کے مقام میں تھا کہ حسن خاں ۲۰ ہزار آدمی سے آیا۔ اور خان زمان کے پاس کل تین چار ہزار فوج افغاں دریا کے سرو ہی اُتر آئے۔ بہادر خاں کی فوج نے گھاٹ پر روکا۔ خان زمان کھانا کھاتا تھا۔ خبر آئی کہ غنیم آن پہنچا۔ یہ ہنس کر کہتے ہیں کہ ایک بازی شطرنج تو کھیل لو۔ مزے سے بیٹھے ہیں اور چالیں چل رہے ہیں۔ پھر خبردار نے خبر دی کہ غنیم نے ہماری فوج کو ہٹا دیا۔ آواز دی کہ ہتیار لانا۔ بیٹھے بیٹھے ہتیار سجے۔ جب خیمے ڈیرے لٹنے لگے اور لشکر میں بھاگڑ پڑ گئی۔ تب بہادر خاں سے کہا کہ اب تم جاؤ۔ وہ آگے گیا۔ دیکھے تو دشمن دست، دگریبان ہے۔ جاتے ہی چھری کٹاری ہو گیا۔ پھر آپ تھوڑے سے رفیق کہ رکاب میں تھے لے کر چلا۔ نقارہ پر چوٹ مار کر جو گھوڑے اُٹھائے تو اس کڑک دمک سے پہنچا کہ غنیم کے قدم اُٹھ گئے اور ہوش اُڑ گئے۔ اُن کے انبوہ کو گٹھڑی کر کے پھینک دیا۔ افغان اس طرح بھاگے جاتے تھے، جیسے گلہ ہائے گوسپند۔ سات کوس تک فرش کرتا چلا گیا۔ کشتے کٹے پڑے تھے۔ اور زخمی لوٹتے تھے۔ سبدلیا اور دل سنگار اس لڑائی کے ہاتھیوں میں ہاتھ آئے تھے۔ سنہ ۹۶۴ھ میں جون پور پر قبضہ کر کے سکندر عدلی کا قائم مقام ہو گیا +

سنہ ۳ جلوس میں ہی اس کے باغ عیش میں نحوست کے کوّے نے

گھونسلا بنایا۔ تم پہلے سُن چکے ہو۔ اس کا باپ اُذبک تھا اور اس لئے قومی حماقتوں کا بھی ظہور ضرور تھا۔ احمق نے شاہم بیگ ایک خُوب صُورت خوش ادا نوجوان کو نوکر رکھ لیا۔ کہ پہلے ہمایوں بادشاہ کے پیش خدمتوں میں تھا۔ فتحیاب حدود لکھنؤ میں تھا۔ اور شاہم بھی اُس کے پاس تھا۔ جس طرح امرائے دنیا کا دستور ہے ہنستے کھیلتے عیش کرتے تھے۔ اور سرکاری خدمتیں بھی اس طرح بجالاتے تھے کہ ترقیٔ منصب کے ساتھ تحسین و آفرین کے خلعت حاصل کرتے تھے۔ اور دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے۔

اگرچہ وہ شیبانی خاں کی نسل میں تھا۔ اور اس کا باپ خاص اُذبک تھا۔ لیکن ماں ایرانی تھی۔ اور اُس نے ایران میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے مذہب شیعہ تھا۔ قابلِ افسوس یہ بات ہے کہ اس کی دلاوری اور تیزیٔ طبع نے اُسے حد سے زیادہ بے باک کر دیا تھا۔ اس کی صحبتوں میں خواہ خلوت ہو خواہ جلوت، بد کلام اور بے لگام جُہلا جمع ہوتے تھے۔ اُن سے کُھلم کُھلا بے تہذیب گفتگوئیں ہوتی تھیں کہ جو کسی طرح مناسب نہیں۔ اہلِ سنّت جن کا دورہ اس وقت آفتاب کا دورہ تھا۔ لہو کے گھونٹ پیتے تھے۔ لیکن اکبر کے دل پر اس کی خدمتیں نقش بر نقش

اے عجب زمانہ تھا۔ شاہ قلی محرم ایک بہادر نامی امیر تھے انہی دنوں میں اُنہوں نے بھی عاشق مزاجی کے میدان میں جولانی دکھائی۔ قبول خاں ایک مقبول نوجوان کہ رقص میں مور اور آواز میں کوئل تھا۔ اس پر شاہ قلی دیوانے تھے اکبر باوجودیکہ ترک تھا مگر اتفاق ہے کہ اس شوق سے نفرت تھی۔ جب سنا تو قبول خاں کو بلا کر پہرے میں دلبیا امیر مذکور کو بڑا رنج ہوا۔ گھر کو آگ لگا دی۔ اور جوگیوں کی جون بدل کر جنگل میں جا بیٹھے خانخاں کے دبلدار دن میں تھے خان خاناں نے ان کی دلداری کے لئے ایک غزل بھی کہی اور جوگی جی کو جا کر سنائی۔ ادھر انہیں سمجھایا۔ ادھر حضور میں عرض کی اور جوگی سے امیر بنا کر پھر دربار میں داخل کیا۔ کیا کہوں۔ سمرقند و بخارا میں جو تماشے اس شوق کے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ جی چاہتا ہے کہ لکھوں مگر قانون وقت قلم کو جنبش نہیں کرنے دیتا۔ یہ وہی شاہ قلی محرم ہیں جو ہیموں کا ہاتھی گھیر لائے تھے اور انہی چار امیروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے بیرم خاں کی رفاقت سے بُرے وقت میں بھی منہ نہ موڑا تھا۔ بادشاہی خدمتیں بھی ہمیشہ جانفشانی سے بجا لاتے رہے۔ محرم اب بھی ترکستان میں معتبر اور معزز عہدہ اہلِ دربار کا ہے۔

بڑھاتی تھیں۔ اور دونوں بھائی خانخاناں کے دونوں ہاتھ تھے۔ اس لئے کوئی بول نہ سکتا تھا۔
غنیم کے لشکر میں سے ایک شخص بھاگا۔ اور ملا پیر محمد کے پاس آکر کہا کہ آپ کی پناہ میں آیا ہوں۔ اب شرم آپ کے ہاتھ ہے۔ ملا صاحب نے سفارش کرنی چاہی۔ مگر جانتے تھے کہ وہ ایک بے پرواہ سینہ زور آدمی ہے۔ اس لئے اُدھر کچھ سلسلہ نہ ہلایا۔ مذہبی حالات سُن سُن کر یہی آگ بگولا ہو رہے تھے۔ اس لئے اُس کی عیاشی کے معاملات کو بڑی آب و تاب سے حضور میں عرض کیا۔ اور ایسا چمکایا کہ نوجوان بادشاہ خلافِ عادت آپے سے باہر ہوگیا۔ پھر بھی خان خاناں موجود تھے۔ اُنہوں نے اِدھر جلتی آگ پر تقریروں کے چھینٹے دئے۔ اُدھر خان زماں کی طرف پرچے اُڑائے۔ اپنے معتبر دوڑائے۔ اُسے بُلا بھیجا۔ اپنے اوپر جو حریف اندر اندر وار کر رہے تھے اُن کے نشیب و فراز سمجھائے۔ اور رُخصت کر دیا۔ اُس وقت آگ دب گئی*

سنہ جلوس میں حکم پہنچا کہ شاہم کو بھیج دو۔ یا نکال دو۔ اور خود لکھنؤ کو چھوڑ کر جونپور پر فوج کشی کرو کہ افغانوں کے سردار وہاں جمع ہیں۔ تمہاری جاگیر اور امرا کو عنایت ہوئی۔ یہ مہم جون پور میں تمہاری کمک ہوں گے۔ امرائے مذکور جو فوجیں جرار لے کر روانہ ہوئے اُنہیں حکم ہوا کہ اگر خان زمان فرمان کی تعمیل کرے تو کمک کرو ورنہ کالپی وغیرہ کے حاکموں کو ساتھ لے کر اسے صاف کرو۔ خان زماں سن کر حیران رہ گیا کہ ذراسی بات جس پر اس قدر قہر و عتاب۔ وہ اپنے حریفوں کو خوب جانتا تھا۔ سمجھا کہ نوجوان شہزادہ بادشاہ ہوگیا ہے۔ ملاندلیشوں نے پیچ مارا۔ شاہم کو روانہ دربار نہ کیا۔ کہ مبادا جان سے مارا جائے۔ لیکن اپنے علاقے سے نکال دیا۔ برج علی اپنے معتبر ملازم اور مصاحب کو حضور میں بھیجا کہ مخالفوں نے جو اُلٹے نقش بٹھائے ہیں۔ اُنہیں عجز و انکسار کے ہاتھ جوڑ کر اچھی طرح مٹائے۔ بادشاہ دلی میں تھے۔ قلعہ فیروز آباد میں اُترے ہوئے تھے۔ کم بخت برج علی جب حضور میں پہنچا۔ تو پہلے ملا پیر محمد سے ملنا واجب تھا کہ وکیل مطلق ہو گئے تھے۔ ملا قلعے کے بُرج پر اُترے ہوئے تھے۔ بُرج علی سیدھا بُرج پر چڑھ گیا۔ اور اخلاص و نیاز کے پیغام پہنچائے اُن کا دماغ بُرج آتشبازی کی طرح اُڑا جاتا تھا۔ بڑے خفا ہوئے۔ وہ بھی آخر جان نثار و نمک حلال کا وکیل تھا۔ شاید کچھ جواب دیا ہوگا۔ یہ ایسے جامے سے باہر

ہوئے کہ حکم دیا۔ باندھ کر ڈال دو۔ اور مار کر تھیلا کر دو۔ اس پر بھی دل کا بخار نہ نکلا۔ کہا
کہ بُرج پر سے گرا دو۔ اُسی وقت گرا دیا گیا۔ اور دم کے دم میں جسم کی عمارت زمین سے
ہموار ہو گئی۔ قسائی پیر محمد نے قہقہہ مار کر کہا۔ آج نام کا اثر پورا ہوا۔ خان زمان نے
شاہم کا تو پھر نام بھی نہ لیا۔ مگر بُرج علی کی جان اور اپنی بے عزتی کا سخت رنج ہوا۔
خصوصاً اس سبب سے جو رقیبوں نے جوڑ مارا وہ چل گیا۔ اور اس کی بات بھی بادشاہ
تک نہ پہنچی۔ خان خاناں موجود تھے۔ ان کو بھی خبر نہ ہوئی تھی۔ کہ اوپر ہی اوپر کام تمام
ہو گیا۔ پھر سُنا تو سوا افسوس کے کیا ہو سکتا تھا۔ اور حقیقت میں اینٹیں خان خاناں
کی بنیاد کی بھی نکل رہی تھیں۔ چند ہی روز میں بادشاہ نے آگرہ کو کوچ کیا۔ رستے
میں خان خاناں اور پیر محمد خاں کی بگڑی اور ایک کے بعد ایک پر آفت آئی +

اگرچہ دربار کے رنگ بدرنگ ہو رہے تھے۔ مگر دریا دل سپہ سالار
ان نااہلوں کو کیا خاطر میں لاتے تھے۔ خان زمان اور خان خاناں کی صلاح ہوئی کہ اُن
کی زبانیں تلواروں سے کاٹنی چاہئیں۔ چنانچہ ایک طرف خان خاناں نے فتوحات
پر کمر باندھی۔ دوسری طرف خان زمان نے نشان کھولا کہ آب تیغ سے داغِ بدنامی
کو دھوئے۔ کوڑیہ افغان نے آپ ہی سلطان بہادر اپنا خطاب رکھا۔ بنگالہ میں
اپنا سکّہ و خطبہ جاری کر دیا۔ خان زمان جونپور میں تھا۔ کہ وہ تیس چالیس ہزار سوار
سے چڑھ آیا۔ یہ اس وقت بھی دستر خوان پر تھے کہ اُس نے آن لیا۔ جب خدمتگاروں
کے ڈیرے اور اپنے سرا پردے لٹوا لئے۔ تو خاطر جمع سے اُٹھے۔ اور رفیقوں
اور جان نثاروں کو لے کر چلے بلکہ حریف اُن کے ڈیرے میں پہنچا تو دستر خوان اُسی
طرح بچھا پایا۔ خیر۔ یہ باہر نکل کر سوار ہوئے۔ نقارہ بجا کر اِدھر اُدھر گھوڑا مارا۔
نقارہ کی آواز سُنتے ہی کھنڈے ہوئے نمک خوار سمٹے۔ ان گنتی کے سواروں سے
جو تلوار لے کر پلٹے تو افغانوں کے دُھوئیں اُڑا دئے۔ بہادر خاں نے اس مہم میں وہ
بہادری دکھائی۔ کہ رستم و اسفندیار کے نام کو مٹا دیا۔ جو افغان بہادری کے دعوؤں
سے ہزار ہزار سوار کے وزن میں تُلتے تھے اُنہیں کاٹ کاٹ کر خاکِ ہلاک پر ڈال دیا۔
ان کی فوج میدانِ جنگ میں کم رہی تھی۔ لُوٹ کے لالچ پر سب خیموں میں گھس
گئے تھے۔ توشہ دان بھر رہے تھے۔ اور گٹھڑیاں باندھ رہے تھے۔ جس وقت

نقارہ بجا۔ اور ترک تلواریں لے کر پل پڑے۔ وہ اس طرح بھاگے جیسے مہال سے مکھیاں اُڑیں۔ ایک نے پلٹ کر تلوار نہ کھینچی۔ خزانے اور مال خانے سامانِ جنگ بلکہ سامانِ سلطنت گھوڑے ہاتھی سب چھوڑ گئے۔ اور اتنی لوٹ ہاتھ آئی۔ کہ پھر فوج کو بھی ہوس نہ رہی۔ میوات کے مُفسد کہ سرشوری کے بانے باندھے بیٹھے تھے اور ہزاروں سرکش پٹھان دہلی و آگرہ کو گھڑدوڑ کے میدان بناتے پھرتے تھے جن کی گردن کی رگیں کسی تدبیر سے ڈھیلی نہ ہوتی تھیں۔ اُس نے سب کو آب شمشیر سے ٹھیک کر دیا۔ ان خدمتوں کا اتنا اثر ہوا کہ پھر چاروں طرف سے اس کی واہ وا ہونے لگی۔ بادشاہ بھی خوش ہو گئے۔ بدگویوں کی زبانیں قلم ہو گئیں۔۔ اور حاسدوں کے منہ دوات کی طرح کھُلے رہ گئے۔

اکبر جو چند روز بیرم خاں کی مہم میں مصروف رہا۔ تو ممالک مشرقی کے افغانوں نے فرصت کو غنیمت سمجھا۔ اور سمٹ کر اتفاق کیا۔ انہوں نے کہا۔ کہ ادھر کے علاقہ میں جو کچھ ہے خان زمان ہے۔ اسے اُڑا دیں تو میدان صاف ہے۔۔ عدلی افغانوں کا بیٹا کہ قلعۂ چنار کا مالک ہو کر بہت بڑھ چڑھ چکا تھا۔ اسے شیر خاں بنا کر نکالا۔ وہ بڑی جمعیت اور دعوے کے ساتھ لشکر لے کر آیا۔ خان زمان جون پور میں تھا۔ اگرچہ وہ خود دل شکستہ تھا۔ اور خان خاناں کی تباہی نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ لیکن سنتے ہی تمام امرائے اطراف کو جمع کر لیا۔ اور چاہا کہ غنیم کو روکے لیکن اُدھر کا پلّہ بھاری پایا۔ کہ ۲۰ ہزار سوار۔ ۵۰ ہزار پیادے۔ پانسو ہاتھی اُس کے ساتھ تھے۔ خان زمان نے چڑھ کر جانا مناسب نہ سمجھا۔ غنیم اور بھی شیر ہو کر آیا۔ اور دریائے گودی پر آن پڑا جس کے کنارے پر جون پور آباد ہے۔ خان زمان اندر اندر تیاری کرتا رہا۔ اور کچھ نہ بولا۔ وہ تیسرے دن دریا اُترا۔ اور بڑے گھمنڈ سے بڑھا خود چند سرداروں کے ساتھ فوج سے موج مارتا پُرانے پٹھانوں کو لئے سلطان حسین شرقی کی مسجد کی طرف آیا۔ اور چند نامور سرداروں کے زور سے داہنے کو دبایا کہ لعل دروازہ پر حملہ کرو۔ کئی تلوارئے افغانوں کو بائیں پر ڈالا کہ شیخ پھول کے بند کا مورچہ توڑیں۔ اکبری دلاور بھی آگے بڑھے اور لڑائی شروع ہوئی۔

میدانِ جنگ میں خان زمان کا پہلا اصول تو اعدِ غنیم کے حملے کا سنبھالنا تھا۔

اُسے دائیں بائیں ادھر اُدھر کے سرداروں پر ڈالتا تھا۔ اور آپ بڑے ہوش و حواس سے مستعد کھڑا رہتا تھا۔ جب دیکھتا کہ حریف کا زور ہو چکا۔ تب تازہ دم آپ اُس پر حملہ کرتا تھا۔ اور اس طرح ٹوٹ کر گرتا تھا کہ امان نہ دیتا تھا۔ اور دشمن کے دھوئیں اُڑا دیتا تھا۔ چنانچہ یہ بازی بھی اسی چال سے جیتا۔ حریف ایسے لشکرِ کثیر اور جمِ غفیر اور سامانِ وافر کو برباد کر کے ناکام بھاگا۔ اور ہاتھی۔ گھوڑے۔ جواہر۔ نفائس لاکھوں روپے کے خزانے اور مال خان زمان کو گھر بیٹھے دے گیا۔ خدا دے تو بندہ اس کا مزہ کیوں نہ لے۔ اُنہوں نے امرا کو بانٹا۔ سپاہ کو انعام بے شمار دیا۔ آپ سامانِ عیش و آرام درست کر کے بہاڑیں اُڑائیں۔ یہ ضرور ہے کہ جو کچھ اس مہم میں ہاتھ آیا اس کی فہرست حضور میں نہ عرض کی۔ اور یہ دوسری فتح تھی جونپور میں۔

خان زمان پر اکبر کی پہلی یلغار

چغلخوروں کی طبیعت بندر کی خصلت کا چھاپا ہے۔ ان سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ کوئی نہ کوئی شے نوچنے کریدنے کے لئے ضرور چاہئے۔ فتوحاتِ مذکورہ کی خبریں سُنکر پھر بادشاہ کو بھکانا شروع کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اکبر ہاتھیوں کا عاشق ہے۔ اس لئے خزانوں اور عجائب و نفائس کے بیانوں کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اس لڑائی میں خان زمان کو وہ وہ ہاتھی ہاتھ آتے ہیں کہ دیکھنے والے دیکھتے ہیں اور جھومتے ہیں۔ چنانچہ جب بادشاہ ادہم خاں کا بند و بست کر کے مالوہ سے پھرے تو آتے ہی پھر توسنِ ہمت پر سوار ہوئے۔ منعم خاں و خواجہ جہاں وغیرہ امرائے قدیم کو ساتھ لیا۔ اور کالپی کے رستے یکایک کڑہ مانکپور پر جا اُترے۔ دونوں بھائیوں کو بھی خبر ہو گئی تھی۔ وہ بھی جونپور سے یلغار کئے چلے آتے تھے۔ کنارۂ گنگا مقام کڑہ پر سجدۂ بندگی میں جھک کر سربلند ہوئے۔ جان مال سب حاضر کر دئے۔ ہاتھیوں پر سارا جھگڑا اُٹھا تھا۔ اُنہوں نے بہت سے مست ہاتھی لُوٹ کے۔ بلکہ اپنے فیل خانہ کے بھی نذر گزرانے۔ ان میں سے دلبستکاں۔ پلنتہ۔ دلیل۔ شبدلیا۔ جگموہن بادشاہ کو ایسے پسند آئے کہ حلقۂ خاصہ میں

داخل ہوئے۔ اکبر عفو و کرم کا دریا تھا۔ اس کے علاوہ بہادر خاں کے ساتھ کھیلا
ہؤا تھا۔ اس لئے اسے بھائی کہا کرتا تھا۔ خان زمان کی دلاوری اور جاں نثاریوں
نے اسے اپنا عاشق بنا رکھا تھا۔ اس لئے دونوں بھائیوں کی طرف سے دل میں گھر
تھا۔ ہنسی خوشی ملا۔ اعزاز و اکرام بڑھائے۔ خلعت پہنائے۔ زینِ زرین اور
سازِ مرصع کے ساتھ گھوڑوں پر چڑھا کر رخصت کیا۔ چغلخوروں کو بڑے بھروسے
تھے۔ مگر جو جو باتیں اُنھوں نے کان میں پھُونکی تھیں ان کا ذکر زبان تک نہ آیا۔
اس صلح کی تاریخیں بھی شاعروں نے کہیں ایک مجھے بھی پسند ہے +

منہی اقبال دریں کہنہ دیر ۔۔۔ غلغلہ انداخت کہ الصلح خیر

دونوں بھائی ملک گیری کے میدان میں کارنامے دکھاتے تھے اور ملک داری
کے معاملوں میں پانی پر سنگین نقش جماتے تھے۔ مگر دربار کی طرف سے بے دلی اور
آزردگی اُٹھاتے تھے۔ اکبر جیسے بادشاہ کو ایسے جاں بازوں کی قدردانی واجب تھی۔
اور جانباز بھی قدیم الخدمت۔ چنانچہ ۹۷۱ھ میں ملّا عبداللہ سلطان پوری۔ مولانا
علاء الدین لاری۔ شہاب الدین احمد خاں اور وزیر خاں کو بھیجا۔ کہ انہیں سمجھاؤ اور
نصیحت کرو۔ توبہ کراؤ اور کہو کہ نااُمید نہ ہو تا رحمتِ بادشاہی کا دریا تمہارے
واسطے لہریں مار رہا ہے +

فتح خاں اور حسن خاں افغان لشکر کثیر افغانوں کا لیکر قلعۂ رہتاس سے گھٹا
کی طرح اُٹھے اور سلیم شاہ کے بیٹے کو بادشاہ بنا کر مہم کا منصوبہ جمایا۔ ولایت بہار
کو تسخیر کیا۔ اور بجلیوں کی طرح اِدھر اُدھر کوندنے لگے۔ بعض علاقے خان زمان کے
بھی دبا لئے۔ دونوں بھائیوں نے ابراہیم خاں اُزبک اور مجنوں خاں قاقشال کو آگے
بڑھایا۔ مگر دیکھا کہ افغانوں کا ٹڈی دَل زور میں بھر آتا ہے۔ میدان میں مقابلہ نہ
ہو سکیگا۔ اس لئے دریائے سون کے کنارے اندر باری پر قلعے کو دمدموں اور
مورچوں سے استحکام دیا تھا۔ اور مقابلے کو تیار بیٹھا تھا۔ ایک دن ارکانِ بادشاہی
بیٹھے گفتگو کر رہے تھے جو غنیم آن پہنچا۔ اور آتے ہی خان زمان کی فوج کو لپیٹتا سپیٹتا
شہر کی طرف آیا۔ خان زماں کا لشکر بھاگا اور افغان خیموں۔ ڈیروں کو بلکہ آس پاس
کے گھروں کو لُوٹنے لگے۔ یہ اُسی وقت اُٹھ کھڑا ہؤا۔ اور سوار ہو کر نکلا۔ جو ہمراہی

ساتھ ہو سکے اُنہیں لے کر دیوار قلعہ کے نیچے آیا۔ ایک پہلو میں کھڑا قدرت الٰہی کا تماشہ دیکھتا ہے۔ اور لطیفۂ غیبی کا منتظر ہے۔ کہ حسن خاں تبتی کو دیکھتا ہے۔ بختِ بلند نام ہاتھی پر سوار چلا آتا ہے۔ یہ فوج لے کر سامنے ہوا۔ اور حملے کے لئے آواز دی۔ دشمن کی فوج بہت تھی۔ حملہ کی ضرب کمزور پڑی اور فوج کھنڈ گئی۔ یہ چند آدمیوں کے ساتھ مرنے پر مصمم ہو کر بُرج کی طرف دوڑا۔ توپ تیار دھری تھی۔ غنیم ہاتھی پر سوار ہتیباٹی کرتا چلا آتا تھا۔ خان زمان نے اپنے ہاتھ سے شست باندھ کر جھٹ توپ داغ دی۔ خدا کی شان گولہ جو توپ سے نکلا۔ قضا کا گولہ تھا۔ ہاتھی اس طرح اُلٹ کر گرا جیسے بُرج گرا۔ اُس کے گرتے ہی پٹھانوں کے اوسان خطا ہوئے +

جب بیرم خاں نے بہادر خاں کو مالوہ کی مہم پر بھیجا تھا تو کوہ پارا نام ہاتھی دیا تھا۔ وہ دیو مست کہیں اسی طرف زنجیروں سے جکڑا کھڑا تھا اور بدمستی کر رہا تھا۔ افغانی مہاوتوں کو اس کے کرتوتوں کی خبر نہ تھی۔ آتے ہی زنجیریں کھول دیں کہ چڑھ کر قبضہ کریں۔ وہ ابھی زنجیروں سے نہ نکلا تھا کہ قابو سے نکل گیا۔ ایک فیلبان کو وہیں چیر ڈالا۔ اور زنجیر کو چکراتا اس طرح چلا گویا آندھی اور بھونچال ساتھ ہی آئے لشکر میں قیامت مچ گئی۔ غنیم نے جانا کہ خان زمان نے گھات سے نکل کر پہلو مارا۔ جو پٹھان لوٹ پر پڑے ہوئے تھے بدحواس ہو کر بھاگے۔ خان زمان کی فوج اس امداد الٰہی کو دیکھ کر پلٹی اور افغانوں کے پیچھے دوڑی۔ مارے۔ باندھے۔ لاکھوں روپیہ کے مال اور اسباب گراں بہا۔ نامی ہاتھی۔ عمدہ گھوڑے اور بے شمار عجائب و نفائس ہاتھ آئے۔ اس نے اس خداداد فتح کے شکرانے میں بادشاہ کے لئے تحائف خسروانہ بھیجے اور امرا کو گراں بہا رخصتانوں سے گرانبار کر دیا +

دُوسری فوج کشی

خان زمان کا گھوڑا ہوائے اقبال میں اُڑا جاتا تھا کہ پھر نحوست کی ٹھوکر لگی۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ دشمن ہر وقت دونوں بھائیوں کے درپے تھے۔ مگر وہ بھی

کچھ اپنے نشۂ دلاوری سے۔ کچھ غفلت عیاشی سے دشمنوں کو چغلخوری کے لئے موقع دیتے تھے۔ شکائتیں پیش ہوئیں کہ لڑائیوں میں جو خزانے اور اشیائے عجیب و نفیس ہاتھ آئی ہیں۔ سب لئے بیٹھا ہے۔ بھیجتا کچھ نہیں۔ ان میں صف شکن اور کوہ پارہ دو ہاتھیوں کی ایسی تعریف کی کہ اکبر سُنکر مست ہو گئے۔ اور یہ بھی ضرور ہے کہ جب خان زمان اور بہادر خاں کے جلسوں میں حریفوں کی درانداز یوں کے ذکر آتے تھے تو وہ اُنہیں خاطر میں بھی نہ لاتے ہونگے۔ فتوحات کی مستی اور اقبال کے نشے میں اپنے کارناموں کو خاندان کے فخر سے چمکاتے تھے۔ اور حریفوں کے خاکے اُڑاتے تھے۔ حریف ان باتوں کو اکبر کے سامنے ایسے پیرائے میں ادا کرتے تھے جس سے کنایوں کے نشتر بادشاہ کی طرف چبھتے تھے۔ اور اُسے بغاوت کے شُبہے پڑتے تھے۔ یہ شُبہے اس سے زیادہ تر خطرناک نظر آتے ہونگے کہ اس کی رکاب میں ۳۰ ہزار جرّار لشکر ایرانی۔ تورانی افغان راجپوت کا تھا کہ جدھر خود گھوڑا اُٹھاتا تھا۔ آندھی اور بھونچال ساتھ آتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض صحبتوں میں اکبر کی زبان پر یہ بات آئی کہ شیبانی خاں کے خاندان پر یہ کیا ناز کیا کرتے ہیں۔ جانتے نہیں کہ اُس کی بدولت فردوس مکانی نے کیا کیا مصیبتیں اُٹھائیں اور آزار پائے۔ میں اُذبک کا تخم ہندوستان میں نہ چھوڑوں گا۔ بدترین اتفاقات یہ کہ انہی دنوں میں عبداللہ خاں اُذبک وغیرہ کئی سرداروں سے برابر بداعمالیاں ظہور میں آئیں۔ وہ بھی جب دربار کی طرف سے مایوس ہوئے خان زمان کے پاس پہنچے۔ اور سب نے مل کر بغاوت کی +

باغیوں نے ملک بغاوت کی تقسیم اس نقشے پر کی کہ سکندر خاں اُذبک اور ابراہیم خاں (خان زمان کا ماموں) لکھنؤ میں رہیں۔ خان زمان۔ بہادر خاں دونوں بھائی کڑہ مانکپور میں قائم ہوں۔ جب یہ خبریں مشہور ہوئیں اور بدنظروں نے صورت حال کو دُور دُور سے دیکھا۔ تو اِدھر اُدھر سے جمع ہو کر خان زمان پر آئے کہ وہی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ اور حقیقت میں جو کچھ تھا وہی تھا۔ نمک حلالی کے سوداگروں میں مجنوں خاں اور باقی خاں قاقشال جمعیت اور جتھے والے لوگ تھے جو بہادری اور جانفشانی دکھا کر چاہتے تھے کہ بدنصیب خان زمان کی دہ پشت کی محنت مٹائیں اور اپنے نقش بادشاہ کے دل پر بٹھائیں۔ وہ ان کی کیا حقیقت سمجھتا تھا۔ مار مار کر بھگا دیا۔ مجنوں خاں

بھاگ بھی نہ سکے۔ مانکپور میں گھر گئے۔ اُن کے رفیق محمد امین دیوانہ پکڑے گئے۔ دربار شاہی میں ابھی آصف خاں صاف اور جُرم بغاوت سے پاک تھے۔ وہ مجنوں خاں کی مدد کو آئے۔ محاصرہ سے نکالا۔ اپنے خزانے کھول دیئے۔ سپاہ کی کمر بندھوائی۔ مجنوں خاں کو بھی بہت سا روپیہ دیا۔ انھی کی بدولت اُس نے پھر پر و بال درست کیے اور دونوں مِل کر خان زمان کے سامنے بیٹھ گئے۔ دربار کی طرف عرضیاں پرچے دوڑائے رونے اُڑائے۔ بڈھے خاں باقی نے اپنی عرضی میں ایک شعر بھی لکھا۔ مطلب یہ تھا کہ حضور خود آئیں اور بہت جلد آئیں ؎

اے شہ سوارِ معرکہ آرائے رندِ رزم	از دست رفتہ معرکہ پا در رکاب کن

اکبر مالوہ کی یلغار مار کر آیا تھا۔ یہ حال دیکھ کر سمجھا کہ معرکہ بے ڈھب ہے۔ فوراً منعم خاں کو روانہ کیا۔ کہ فوج لے کر قنوج کے گھاٹ اُتر جاؤ۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مقابلہ کس سے ہے۔ اور یہ جو لوگ آگ لگاتے ہیں اور سپہ سالاری کا دم بھرتے ہیں ان کا وزن کیا ہے۔ چنانچہ کئی دن تک خود لشکر کشی کے سامانوں میں صبح سے شام تک غرق رہا۔ آس پاس کے امرا اور فوج کو فراہم کیا۔ جو موجود تھے۔ انہیں پورا سپاہی بنایا۔ اس لشکر میں ۱۰ ہزار فقط ہاتھی تھے۔ باقی تم آپ سمجھ لو۔ باوجود اس کے شکار کی شہرت دی اور نہایت پھُرتی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ جو مختصر جمعیت خاص اپنی رکاب میں تھی۔ وہ قابل شمار بھی نہ تھی +

منعم خاں کہ ہراول ہو کر روانہ ہؤا تھا۔ ابھی قنوج میں تھا کہ اکبر بھی جا پہنچے مگر وہ کہن سال عجیب سلیم الطبع صلح جو سردار تھا۔ وہ بے شک بادشاہ کا نمک حلال جاں نثار تھا۔ مگر مقدمے کی تہ کو سمجھا ہؤا تھا۔ اُسے کسی طرح منظور نہ تھا کہ لڑائی ہو۔ اور خدمتگذار موروثی اپنے دشمنوں کے ہاتھوں مفت برباد ہو۔ چنانچہ اس وقت خان زمان محمد آباد میں بے خبر بیٹھا تھا۔ اگر یہ گھوڑے اُٹھا کر جا پڑتا تو وہ آسان گرفتار ہو جاتا۔ منعم خاں نے ادھر تو اُسے ہشیار کر دیا۔ ادھر لشکر کو روک تھام سے لے چلا کہ ابھی سامان ناتمام ہے۔ سارے لوازمات جنگ فراہم کر کے چلنا چاہیئے۔ اس عرصے میں خان زمان کہیں کے کہیں پہنچے۔ باوجود ان باتوں کے اس کی طرف سے کئی سرداروں کو پیغام سلام کر کے توڑ لیا تھا۔ انہیں حضور میں

پیش کر کے خطائیں معاف کروائیں۔ بادشاہ نے اُسے وہیں چھوڑا اور یلغار کر کے لکھنؤ پہنچے۔ سکندر خاں پیچھے ہٹا۔ اور بھاگا بھاگ جونپور پہنچا۔ کہ سب مِل کر بچاؤ کی صورت نکالیں۔ بادشاہ بھی ان کے منصوبے کو تاڑ گئے۔ اُنھوں نے بھی اُدھر ہی کا رُخ کیا۔ اور منعم خاں کو حکم بھیجا کہ لشکر کو لے کر جونپور کی طرف چلو۔ خان زماں آخر پُرانے سپاہی تھے۔ یہ بھی بادشاہ کو سامنے سے آتے دیکھ کر متفرق رہنا مصلحت نہ سمجھتے تھے۔ آصف خاں و مجنوں خاں کا مقابلہ چھوڑا اور جونپور پہنچے۔ رفیقوں سے جا کر حال بیان کیا۔ اُنھوں نے جب سُنا کہ بادشاہ ادھر آتے ہیں۔ سب اکٹھے ہو کر عیال سمیت جونپور سے نکلے اور پیچھے ہٹ کر دریا پار اُتر گئے +

اکبر اگرچہ بادشاہ تھا۔ مگر وقت پر اس طرح کے جوڑ توڑ مارتا تھا جیسے عمدہ اہلکار اور پُرانے سپہ سالار۔ اسے معلوم تھا کہ خان زمان نے امرا و راجگانِ بنگالہ سے موافقت کر لی۔ راجہ اُڑیسہ جو مشرقی راجاؤں میں سپاہ و سامان کے باب میں نامور ہے۔ سلیمان کرارانی اُس کے ملک پر کئی دفعہ گیا ہے اور قابو نہیں پایا تھا۔ پاتر بھاٹ کہ سلیم شاہ کے مصاحبوں سے تھا۔ اور فنِ موسیقی اور ہندی شاعری میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ اسے اور حسن خاں خزانچی کو راجہ اُڑیسہ کے پاس بھیجا اور فرمان لکھا سلیمان کرارانی علی قلی خاں کی مدد کو آئے۔ تو تم آ کر اُس کے مُلک کو تہ و بالا کر دینا۔ راجہ نے آئی ہوئی مراد کو ادب کے سر پر لیا اور بہت سے ہاتھی اور نفیس تحفے اس ملک کے بھیج کر اطاعت منظور کی۔ تلیج خاں کو رہتاس پر راہی کیا۔ کہ فتح خاں تبتی افغان شیر خانی کو معافی تقصیرات سے مطمئن کرے اور کہے کہ جب خانزمان لشکر شاہی کی طرف متوجہ ہو تو رہتاس سے اُتر کر اس کے ملک میں بغاوت برپا کرے۔ اس نے پہلی دفعہ اطاعت کے وعدے کر کے فیل بخت بلند کو تحائف پیشکش سے گرانبار کیا۔ اب دوبارہ پھر بھیجا۔ اس نے وعدہ وعید میں قلیچ خاں کو رکھا۔ اسے جب قرائن سے حال معلوم ہوا تو رخصت ہو کر ناکام واپس آیا +

اکبر خود جونپور میں جا پہنچے۔ آصف خاں جنھوں نے نمک حلال بنکر مجنوں خاں کو قلعہ بندی سے نکالا تھا۔ پانچ ہزار سوار سے حضور میں حاضر ہوئے۔ انہیں سپہ سالاری ملی کہ باغیوں پر فوج لے کر جاؤ۔ ساتھ ہی بعض امرا کو سوارانِ افغان اور راجگان اطراف کے

پاس بھیجا کہ اگر خان زمان بھاگ کر تمہارے علاقے میں آئے تو روک لو۔ چنانچہ حاجی محمد خاں سیستانی ۔ بیرم خانی بڈھوں میں سے باقی تھا۔ اُسے سلیمان کرارانی کے پاس بھیجا تھا۔ کہ کُل بنگالہ کا حاکم تھا۔ اور پُرانے افغانوں میں سے وہی کُھرچن رہ گیا تھا۔ خان زمان کئی برس سے یہاں تھا اور اس عرصے میں بڑی رسائی سے اُس ملک میں کارروائی کی تھی۔ سلیمان کرارانی کی اُس سے بڑی رفاقت تھی۔ اُہں نے جھٹ حاجی محمد خاں کو پکڑ کر خان زمان کے پاس بھیج دیا۔ وہ اوّل تو ہموطن سیستانی۔ دوسرے بیرم خانی پُرانا رفیق۔ جب بڈھے کہن سال کو جواں دولت ۔ جوان اقبال کے سامنے لائے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت ہنسے۔ ہاتھ پھیلا پھیلا کر گلے ملے۔ بیٹھ کر صلاحیں ہوئیں ۔ بڈھے نے تجویز نکالی کہ دل میں نمک حرامی یا دغا نہیں کسی غیر بادشاہ سے معاملہ نہیں۔ تم یہیں حاضر رہو۔ ماں کو میرے ساتھ روانہ کرو۔ وہ محل میں جائینگی۔ بیگم کی معرفت عرض کرینگی۔ باہر مَیں موجود ہُوں۔ بگڑی بات بن جائیگی۔ دشمنوں کی کچھ پیش نہ جائیگی +

اب ذرا خیال کرو۔ اکبر تو جونپور میں ہیں۔ آصف خاں اور مجنوں خاں خان زماں کے سامنے کرڑہ مانک پور میں فوجیں لئے پڑے ہیں۔ درباری نمک حراموں نے آصف خاں کو پیغام بھیجا کہ رانی درگاوتی کے خزانوں کا حساب سمجھانا ہوگا۔ کہو دوستوں کو کیا کھلواؤ گے؟ اور چوراگڈھ کے مال میں سے کیا تحفے دلواؤ گے ۔ اُسے کھٹکا تو پہلے بھی تھا۔ اب گھبرا گیا۔ لوگوں نے اُسے یہ بھی شُبہ ڈالا کہ یہ خان زمان کے مقابلے پر بھیجنا۔ فقط تمہارا سر کٹوانا ہے۔ آخر ایک دن سوچ سمجھ کر آدھی رات کے وقت اُس نے خیمے ڈیرے اُکھیڑے اور میدان سے اُٹھ گیا۔ اُس کیساتھ وزیر خاں اُس کا بھائی اور سرداران ہمراہی بھی اُٹھ گئے۔ بادشاہ نے سُنتے ہی اسکی جگہ تو منعم خاں کو بھیجا کہ مورچہ قائم رہے اور شجاعت خاں کو اس کے پیچھے دوڑایا۔ شجاعت خاں مانک پور پر پہنچ کر چاہتے تھے کہ دریا اُتریں۔ آصف خاں تھوڑی دُور بڑھا تھا جو خبر پائی کہ مقیم بیگ پیچھے آتا ہے۔ جاتے جاتے پلٹ پڑا۔ اور دن بھر اس طرح جان توڑ کر لڑا کہ مقیم بیگ کا شجاعت خانی خطاب خاک میں مل گیا آصف رات کو اپنی جمعیت اور سامان سمیت فتح کا ڈنکا بجاتا چلا گیا۔ صبح

کو انہیں خبر ہوئی دریا اُتر کر اپنی شجاعت کے روئے سیاہ کو دھویا اور پیچھے پیچھے دوڑے۔ ترک تھے مگر ترکوں کا قول بھول گئے تھے کہ جو حریف کمان بھر نکل گیا۔ تیروں کے پلے نکل گیا۔ خیر جیسے گئے ویسے ہی دربار میں آن حاضر ہو گئے۔

خان زمان عرصۂ جنگ کا یکا شطرنج باز تھا منعم خاں ابھی اس کے مقابلے پر نہ پہنچا تھا جو اس نے دیکھا کہ بادشاہ بھی ادھر ہی چلے آئے۔ اودھ کا علاقہ خالی ہے۔ اپنے بھائی بہادر خاں کو سپہ سالار کر کے اودھ کو فوج روانہ کی۔ اور سکندر خاں کو اس کی فوج سمیت ساتھ کیا کہ جاؤ اور اُدھر کی طرف ملک میں بدعملی پھیلاؤ۔ بادشاہ نے سنتے ہی چند کہنہ عمل سرداروں کو فوجیں دے کر اودھر کی طرف روانہ کیا۔ میر معز الملک مشہدی کو ان کا سردار مقرر کیا مگر یہ خلعت ان کے قد پر کسی طرح ٹھیک نہ تھا۔ انہیں یہ حکم دیا کہ بہادر کو روک لو۔ بھلا ان سے بہادر کب رُکتا تھا۔

ادھر منعم خاں، خان زمان کے مقابل پہنچے۔ دونوں قدیمی یار اور دلی دوست تھے۔ پیغام سلام ہوئے۔ بی بی سرو قد ایک پراتم بڑھیا۔ بابر بادشاہ کے محلوں کا تبرک باقی تھیں۔ انہیں منعم خاں کی حرم سرا میں بھیجا۔ باہر چند معتبر اور کارداں اشخاص بھیجے۔ حاجی محمد خاں بھی جا کر شامل ہوئے۔ انہیں دنوں میں یہ بھی ہوائی اُڑی تھی کہ چند اکبری جانباز اس تاک میں ہیں کہ موقع پا کر خان زماں اور بہادر خاں کا کام تمام کر دیں۔ اس لئے علی قلی خاں کو آنے میں تامل ہوا۔ آخر یہ ٹھیری کہ بوسہ بہ پیغام سے کام نہیں چلتا۔ خان زماں اور منعم خاں مل کر گفتگو کریں۔ اور بات قرار پا جائے۔ باوجود شہرت مذکور کے اس بات کو علی قلی خاں نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ دونوں کی فوجیں دریائے جوسا کے کناروں پر آ کر کھڑی ہوئیں۔ اُدھر سے خان زمان۔ شہریار گل۔ سلطان محمد میر آب آہوئے حرم اپنے غلام کو لے کر کشتی میں سوار ہوئے ادھر سے منعم خاں خانخاناں۔ مرزا غیاث الدین علی۔ بایزید بیگ۔ میر خاں غلام۔ سلطان محمد قبق (کدو) کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر چلے۔ سماں دیکھنے کے قابل تھا۔ فوج در فوج اور صف در صف ہزاروں آدمی تھے۔ دار یار گنگا کے کناروں پر کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ مرزا ہے جو پانی میں بجلیاں

چمکتی نظر آئیں - غرض بیچ دریا میں ملاقات ہوئی - دل میں جوش، سینہ صاف تھا - خان زمان سامنے سے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے - ملسے اور ترکی میں کہا کفت لیق سلام علیکم - جُوں ہی کشتی برابر آئی - بے باک دلاور کود کر خان خاناں کی کشتی میں آ گئے جُھک کر گلے ملے - اور بیٹھے - پہلے خدمت فروشیاں کیں - پھر رفیقوں کے ظلم و ستم - بادشاہ کی بے پروائی - اپنی بے یاری و بے مددگاری پر روئے - خانخاناں عمر میں بھی بڑے تھے - کچھ داد دیتے رہے - کچھ سمجھاتے رہے - آخر یہ ٹھیری کہ ابراہیم خاں اُذبک ہم سب کا بزرگ ہے - اور خزانہ اور اجناس گراں بہا اور ہاتھی جو کہ ہر جگہ فساد کی جڑ ہیں لے کر جائیں - ملّا حرم میں جا کر عفو تقصیر کی دُعا کرے - اور تم میری طرف سے حضور میں یہ عرض کرو کہ اس روسیاہ سے بہت گناہ ہوئے ہیں - مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا - ہاں چند جانفشانی اور جاں نثاری کی خدمتیں بجا لا کر اس سیاہی کو دھو لوں - اُس وقت خود حاضر ہونگا *

دوسرے دن منعم خاں چند امرا کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر خان زماں کے خیموں میں گئے - اُس نے آداب بزرگانہ کے ساتھ پیشوائی کی جشن شاہانہ کا سامان کیا - دھوم دھام سے مہمان داری کی - خواجہ غیاث الدین وہی پیغام لے کر دربار میں گئے - وہاں سے خواجہ جہاں - کہ مہمات سلطنت ان کے ہاتھوں پر طے ہوتے تھے - خان زماں کی تسلّیِ خاطر کے لئے آئے منعم خاں نے کہا کہ اب کچھ بات نہیں رہی - خان زماں کے ڈیرے پر چل کر گفتگو ہو جائے - خواجہ جہاں نے کہا کہ وہ بے باک ہے اور مزاج کا تیز ہے - اور وہ پہلے بھی مجھ سے خوش نہیں - مبادا کوئی بات ایسی ہو جائے کہ پیچھے افسوس کرنا پڑے - جب منعم خاں نے بہت اطمینان دیا تو کہا کہ اچھا اس سے کوئی آدمی یرغمال میں لے لو - خان خاناں نے یہی کہلا بھیجا - وہ دل کا دریا تھا - اس نے فوراً ابراہیم اُذبک اپنے ماموں کو بھیج دیا - غرض منعم خاں اور صدر جہاں خان زماں کے لشکر میں گئے - سب نشیب و فراز دیکھ کر بندوبست پختہ ہوئے - دوسرے دن صدر جہاں کا بھی ڈر نکل گیا - پھر گئے اور ابراہیم خاں اُذبک کے ڈیرے پر بیٹھ کر باتیں ہوئیں - مجنوں خاں قاقشال وغیرہ سرداروں کو بھی خان زمان سے گلے ملوادیا - خان زمان کے دربار میں چلنے پر بہت گفتگوئیں ہوئیں - اُس نے نہ مانا اور کہا کہ ابراہیم خاں

ہم سب کا بزرگ ہے اور ریش سفید ہے۔ باہر یہ۔ اندر والدہ جائے۔ اور فی الحال خطا معاف ہو جائے۔ پھر آبدیدہ ہو کر کہا کہ مجھ سے سخت گناہ اور کمال روسیاہی ظہور میں آئی ہے۔ سامنے نہیں جاتا خدمت لائقہ بجاؤں گا اور سیاہی کو دھوڈنگا جبھی حاضر دربار ہونگا +

دوسرے دن یہ امرا تمام اجناس گراں بہا اور اچھے اچھے ہاتھی جن میں بال سندر اور اچپلہ وغیرہ بھی تھے لیکر دربار کو روانہ ہوئے۔ خان خاناں نے چادر کی جگہ تیغ و کفن ابراہیم خاں کے گلے میں ڈالا۔ وہ سر ننگا پاؤں ننگے طورۂ چنگیز خانی کے بموجب بائیں طرف سے سامنے لاکر کھڑا۔ اور دونوں ہاتھ اُٹھاکر عرض کی ع خواہی بدار خواہی بکش رائے رائے تست + خان خاناں نے عفو تقصیر کی دُعائیں کیں۔ خواجہ جہاں آمین آمین کہتے گئے۔ اکبر نے کہا کہ خان خاناں تمہاری خاطر عزیز ہے۔ ہم نے ان کے گناہ سے درگزر کی۔ مگر دیکھئے کہ یہ راہ عقیدت پر رہتے ہیں یا نہیں۔ خاں خاناں نے دوبارہ عرض کی کہ ان کی جاگیر کے باب میں کیا حکم ہے۔ فرمایا تقصیریں معاف کردیں تو جاگیریں کیا حقیقت ہیں۔ تمہاری خاطر سے وہ بھی بحال کیں۔ شرط یہ ہے کہ جب تک لشکر اقبال ہمارا ان حدود میں ہے۔ خان زمان دریا پار رہے۔ جب ہم دار الخلافہ میں پہنچیں۔ تو اس کے وکیل حاضر ہوکر دیوان اعلیٰ سے سندیں ترتیب کروالیں۔ اور ان کے بموجب عمل کریں۔ خان خاناں شکر کے سجدے بجالایا۔ اور پھر کھڑے ہوکر کہا۔ دولپشت کے قدیم الخدمت ہونہار جوانوں کی جانیں حضور کے عفو و کرم سے بچ گئیں۔ یہ کام کرنے والے ہیں اور کام کرکے دکھائینگے۔ حکم ہُوا کہ ابراہیم خاں کے گلے سے تیغ و کفن اُتاریں۔ بادشاہ حرم سرا میں گئے تو وہ عمر نوح سامنے آئی۔ جس کا سانس فقط بیٹوں کی آس پر چلتا تھا۔ قدموں پر گر پڑی۔ ہزاروں دعائیں دیں۔ بیٹوں کی نااہلیاں بھی کہتی جاتی تھی۔ عفو قصور کی سفارشیں بھی کرتی جاتی تھی روتی تھی اور دعائیں دیتی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اکبر کو رحم آیا۔ جو کچھ دربار میں کہکر آیا تھا سمجھایا اور بہت دلاسا دیا۔ خاں زماں کو باہر سے خاں خاناں نے لکھا۔ اندر سے ماں نے بیٹوں کو خوشخبری دی اور لکھا کہ کوہ پارہ اور صف شکن وغیرہ ہاتھی اور تحفے تحائف جلد روانہ کردو۔ ان کی خاطر جمع ہوئی اور سب چیزیں بڑے تحمل کے ساتھ بھیجدیں +

امرائے شاہی اور بہادر خاں کی لڑائی

ادھر تو مہم طے ہوئی۔ اب اُدھر کا حال سنو۔ یہ تو تم سُن چکے کہ بہادر اور سکندر خاں کو خان زماں نے اودھ کی طرف بھیج دیا تھا۔ کہ ملک میں خرابی کر کے خاک اُڑاؤ۔ بہادر نے جاتے ہی خیر آباد پر قبضہ کر لیا۔ اور ملک میں کھیل گیا۔ یہ بھی دیکھ چکے کہ ادھر سے ان کے روکنے کے لئے اکبر نے میر معزّ الملک وغیرہ امرا کو فوج دے کر بھیجا۔ اب ذرا تماشا دیکھو۔ دربار میں تو یہ معاملے ہو رہے ہیں۔ وہاں جب بادشاہی لشکر پاس پہنچا تو بہادر خاں جہاں تھا وہیں تھم گیا۔ معزّ الملک کے پاس وکیل بھیجا۔ حرم سرا میں اُس کی بہن کے پاس عورتیں بھیجیں اور یہ پیغام دیا کہ خان زماں کی منعم خاں کے ذریعے سے عرض و معروض ہو رہی ہے۔ ہمارے لئے تم درگاہ بادشاہی میں سفارش کرو۔ کہ خطائیں معاف ہو جائیں۔ فی الحال ہاتھی وغیرہ جو کچھ ہیں وکیل لے جائے گا۔ جب ہم خطاؤں سے پاک۔ اور تقصیریں معاف ہو جائیں گی۔ تو خود حاضر دربار ہوں گے ✦

معزّ الملک مصر غرور کا فرعون اور شدّاد بنا ہوا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ جو میں ہوں سو ہے کون؟ آسمان پر چڑھ گیا اور کہا نمک حرامو! تم آبِ تیغ کے سوا پاک نہیں ہو سکتے۔ تمہارے داغ کو میں آب شمشیر سے دھوؤں گا۔ اتنے میں لشکر خاں میر بخشی (بادشاہ نے عسکر خاں خطاب دیا۔ لوگوں نے استر خاں بنا دیا) اور راجہ ٹوڈر مل جا پہنچے کہ صلح یا جنگ جو کچھ مناسب سمجھیں فیصلہ کر دیں۔ بہادر خاں پھر بادشاہی لشکر کے کنارے پر آیا۔ معزّ الملک کو بلایا۔ اور سمجھایا کہ بھائی والدہ ابراہیم کو درگاہ میں بھیجا چاہتے ہیں۔ بلکہ اب تک بھیج دیا ہو گا۔ اور عفو تقصیر کی اُمید قوی ہے۔ جب تک وہاں سے جواب نہ مل جائے تب تک ہم بھی تلوار پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔ تم بھی اس عرصے میں صبر کرو۔ معزّ الملک تو آگ تھے۔ راجہ رنجک پہنچے۔ جوں جوں بہادر اور سکندر دھیمے ہوتے تھے۔ یہ آگ بگولا ہوئے جاتے تھے۔ اور سوا حرف سخت کے کچھ کہتے ہی نہ تھے۔ وہ بھی آخر بہادر خاں تھے۔ جب ناکام پھرے تو ناچار مرتا کیا نہ کرتا! اپنے لشکر میں جا کر

کام کی فکر میں لگے ؎

وقتِ ضرورت چو نماند گریز	دست بگیرد سرِ شمشیر تیز

نواحِ خیر آباد میں فوج تیار کر کے سامنے ہوئے۔ اُدھر سے معزّ الملک بادشاہی لشکر کو لئے کر بڑے گھمنڈ سے آگے بڑھے۔ بہادر خاں اگرچہ اس موقع پر بہت دل شکستہ اور پریشان تھا۔ مگر وہ سینے میں شیر کا دل اور ہاتھی کا کلیجہ لے کر پیدا ہوا تھا۔ فوج جما کر سامنے ہوا۔ دھاوا ادھر اُدھر سے برابر ہوا۔ اور دونوں لشکر اس صدمے سے ٹکرائے جیسے دو پہاڑوں نے ٹکر کھائی۔ میدان میں محشر برپا ہو گیا بادشاہی فوج نے سکندر کو ایسا ریلا کہ بھاگا۔ پشت پر ایک جھیل تھی۔ کود پھاند کر اُتر گیا۔ بہت ڈوبے۔ بہت مارے گئے۔ اور امرائے شاہی اپنی اپنی فوجوں کو لیکر سب اُنہیں کے پیچھے دوڑے۔ سکندر تو بھاگا مگر بہادر خاں سدِ سکندر ہو کر کھڑا رہا۔ اس نے دیکھا کہ معزّ الملک تھوڑی سی فوج کے ساتھ سامنے ہے۔ باز کی طرح جھپٹ کر گرا۔ معزّ الملک زبان کے بہادر تھے نہ کہ میدان کے۔ بہادر نے پہلے ہی حملے میں اُلٹ کر پھینک دیا۔ شاہ بداغ خاں جمے تھے۔ انہیں گھوڑے نے پھینکا۔ بیٹے نے زور کیا کہ اُٹھائے۔ نہ ہو سکا۔ اپنی جان لے کر نکل گیا۔ باپ کو ازبکوں کے حوالے کر گیا +

ٹوڈرمل اور لشکر خاں مدد کے لئے جدا رہے تھے۔ شام تک الگ الگ لڑتے رہے۔ رات کو سیاہ چادر کے پردے میں وہ بھی سرک گئے۔ قنوج میں پہنچے۔ اور بھاگے بھٹکے بھی آ کر جمع ہوئے۔ بادشاہ کو عرضی لکھی۔ اُس میں حریفوں کے ظلم وستم کو بڑی آب وتاب سے ادا کیا۔ التجا یہ کہ ایسے نمک حراموں کو قرار واقعی سزا دینی چاہیئے۔ حق یہ ہے کہ معزّ الملک کی تلخ مزاجی اور کج اخلاقی۔ اور ٹوڈرمل کی سختیوں نے امرائے ہمراہی کو بہت جلا رکھا تھا۔ وہ بھی وقت پر جان بوجھ کر پہلو دے گئے۔ ورنہ رسوائی کی نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ پرانے پرانے جانباز جن میں حسین خاں بھی شامل تھے میدان سے ٹلنے والے نہ تھے۔ مرنے اور مٹنے والے تھے +

دربار میں ابراہیم خاں تیغ وکفن اُتار کر خلعت اور ہار پہن چکے تھے علی قلی خاں کے وکیل بھی نقد وجنس۔ تحفہ تحائف۔ کوہ پارہ اور صف شکن روانہ دربار ہو چکے

تھے۔کہ یہ عرضی پہنچی۔بادشاہ نے کہا۔خیر۔اب تو ہم خان خاناں کی خاطر سے خانزماں کے اور اس کے ساتھ اوروں کے گناہ بھی بخش چکے۔ معز الملک اور ٹوڈرمل چپ چپاتے چلے آئے۔اور نفاق پیشہ مدت تک آداب و کورنش سے محروم رہے۔لشکر خاں بخشی گری سے معزول۔خواجہ جہاں سے مہر کلاں کہ مہر مقدس کہلاتی تھی چھن گئی۔اور سفر حجاز کو رخصت کیا +

کم بخت خان زماں پر نحوست کی چیل نے پھر جھپٹا مارا۔بادشاہ اس مہم سے فارغ ہو کر چنار گڈھ کا قلعہ دیکھنے گئے (اسے قلعہ نہ سمجھنا۔جنگل کا جنگل بلکہ کوہستان ہے کہ فصیل کے حلقے میں گھرا ہوا ہے) وہاں شکار کھیلے۔ہاتھی پکڑے۔اس میں دیر لگی۔ملک مذکور کئی برس سے خان زماں کی حکومت میں رہ چکا تھا۔یا تو بے انتظامی اس کی نہ دیکھ سکا۔یا بادشاہی اہلکاروں کی بدعملی نہ برداشت کر سکا۔غرض گنگا اتر کر جونپور غازی پور وغیرہ کا انتظام شروع کر دیا۔اس ارادہ پر کچھ سکندر خاں اذبک نے اکسایا تھا۔کچھ اس کے دل میں یہ دعوے بھی ہو گا کہ آخر ملک حضور کا مال ہے۔میں بھی حضور کا مال ہوں۔قدیمی جاں نثار ہوں۔اور انتظام ہی کرتا ہوں۔تباہ تو نہیں کرتا۔یاروں نے بادشاہ کو پھر چمکا دیا۔کہ دیکھئے حضور کے حکم کو خاطر میں نہیں لاتا۔انہوں نے فوراً اشرف خاں میر منشی کو بھیجا کہ جونپور میں جا کر انتظام کر لو۔خان زماں کی بڑھیا ماں کو قلعہ میں لا کر قید کر دو۔یہاں مظفر خاں کو لشکر اور چھاؤنی کا انتظام سپرد کیا۔آپ یلغار کر کے خان زماں کی طرف دوڑے اور سرسوار غازی پور میں جا پہنچے۔وہ اودھ کے کنارے پر تھا۔اور بے فکر کاروبار میں مصروف تھا۔دفعتہً بادشاہ کی آمد آمد کا غل سنا۔خزانہ و مال کی کشتیاں بھری چھوڑیں اور آپ پہاڑوں میں گھس گیا +

ادھر بہادر خاں اپنے بہادر دلاوروں کو جونپور لے کر آیا۔کمندیں ڈال کر قلعے میں کود گیا۔ماں کو نکالا۔اور میر منشی صاحب کو مضمون کی طرح باندھا اور لے گیا۔وہ چاہتا تھا۔کہ لشکر بادشاہی پر گر کر مظفر کو ظفر کی گردان پڑھائے۔مگر سنا کہ بادشاہ ادھر سے پھرے آتے ہیں۔اس لئے پھر سکندر سمیت دریا پار اتر گیا۔خان زماں نے اپنے معتبر یعنی میرزا میرک رضوی۔کے ساتھ ماں کو پھر خاناں کے پاس بھیجا۔معافی کے دروازہ کی زنجیر ہلائی۔اور عجز و نیاز کے ہاتھوں سے قدم لئے۔جو عرضی لکھی اس

میں یہ شعر بھی تھا ؎

بدیں امید ہائے شاخ در شاخ — کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

خان خاناں صلاح و اصلاح کے ٹھیکہ دار تھے۔ انہوں نے میر عبداللطیف قزوینی۔ مخدوم الملک۔ شیخ عبدالنبی صدر کو بھی ساتھ شامل کیا۔ سب کو ساتھ لے کر حضور میں حاضر ہوا۔ انہوں نے حال عرض کیا۔ آخر قدیمی پروردہ اور خدمت گزار تھے۔ اگلی پچھلی جاں نثاریوں نے شفاعت کی۔ اکبر نے کہا خطا معاف۔ جاگیر بحال مگر حضور میں آکر حاضر رہیں۔ یہ حکم لے کر روانہ ہوئے۔ جب لشکر کے پاس پہنچے تو خان زماں استقبال کو آیا۔ بڑی تعظیم و تکریم سے لے گیا۔ ضیافتیں کھلائیں۔ جواب میں عرض کیا کہ حضور بدولت و اقبال دار الخلافہ کو تشریف لے جائیں۔ دو تین منزل آگے بڑھ کر دونوں غلام حاضر حضور ہوتے ہیں۔ برسوں سے یہاں ملک داری اور ملک گیری کر رہے ہیں۔ حساب کتاب کا فیصلہ کر دیں۔ بزرگان مذکور کو بڑے اعزاز و احترام سے رخصت کیا۔ بہت سے تحائف دئے۔ انہوں نے پھر جا کر حضور میں عرض کی۔ یہ بھی قبول ہوئی۔ اور عہد و پیمان کو قسموں کی زنجیروں سے مضبوط کیا۔ بادشاہ دار الخلافہ میں داخل ہو گئے ٭

آزاد۔ تدبیر کے بندے ضرور کہیں گے کہ حاضر باشی دربار کا مورچہ بہت خوب ہاتھ آیا تھا۔ سپاہی تھے اہلکار نہ تھے اس لئے چال چوک گئے۔ یا یہ کہو کہ دُور رہنے میں جو آزاد حکومت کا مزا پڑ گیا تھا۔ اس نے جونپور مانک پور سے الگ نہ ہونے دیا۔ ورنہ موقع یہ تھا کہ جس بادشاہ کے حکموں سے وہ انہیں خراب کر رہے تھے۔ اب یہ پہلو میں بیٹھتے اور اُسی کی تلوار سے حریفوں کے ناک کان کاٹتے ٭

آصف خاں کا معاملہ بھی سُن لو۔ ایک وقت تو وہ تھا کہ اس نے مجنوں خاں کو خان زماں کی قید سے چھڑایا اور دونوں فوج لے کر خاں زماں کے مقابل ہو گئے۔ جب اہل دربار کے لالچ نے اسے بھی میدان وفاداری سے دھکیل کر نکال دیا۔ تو وہ جونا گڈھ میں جا بیٹھا۔ اب جو خانزماں کی مہم سے بادشاہ کی خاطر جمع ہوئی تو مہدی قاسم خاں کو اُس کی گوشمالی کے لئے بھیجا۔ حسین خاں وغیرہ چند امرائے نامی کو حکم دیا۔ کہ فوجیں لے کر اس کے ساتھ ہوں۔ آصف کو ہرگز اپنے سلیمان سے لڑنا منظور نہ تھا۔

درگاہ شاہی میں عفو تقصیر کی عرضی لکھی۔ مگر دعا قبول نہ ہوئی۔ ناچار خان زمان کو خط لکھا۔ اور آپ بھی جلد جا پہنچا۔ خان زمان کے زخم دل ابھی ہرے پڑے تھے جب ملا تو نہایت غرور اور بے پروائی سے ملا۔ آصف خاں دل میں پچتایا کہ ہائے یہاں کیوں آیا۔ ادھر سے جب مہدی خاں پہنچے تو میدان صاف دیکھ کر چوناگڈھ پر قبضہ کر لیا۔ اور آصف خاں کو خان زماں کے ساتھ دیکھ کر پہلو بچالیا +

یہاں خان زمان آپ تو فرمانفرما بن کر بیٹھے۔ آصف خاں کو کہا کہ پورب میں جا کر پٹھانوں سے لڑو۔ بہادر خاں کو اس کے ساتھ کیا۔ وزیر خاں آصف خاں کے بھائی کو اپنے پاس رکھا۔ گویا دونوں کو نظر بند کر لیا۔ اور نگاہ اُن کی دولت پر۔ وہ بھی مطلب تاڑ گئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے اندر اندر پرچے دوڑا کر صلاح موافق کی۔ یہ ادھر سے بھاگا۔ وہ اُدھر سے مکہ دونوں مل کر مانک پور پر آجائیں۔ بہادر خاں آصف کے پیچھے دوڑا۔ جونپور اور مانکپور کے بیچ میں سخت لڑائی ہوئی۔ آخر آصف خاں پکڑے گئے۔ بہادر خاں اُسے ہاتھی کی عماری میں ڈال کر روانہ ہوئے۔ ادھر وزیر خاں جونپور سے آتا تھا خبر سُنتے ہی دوڑا۔ بہادر خاں کے آدمی تھوڑے تھے اور تھکے ہوئے تھے۔ جو کچھ تھے لوٹ میں لگے ہوئے تھے۔ اس لئے حملے کو روک نہ سکا بھاگ نکلا اور لوگوں سے کہا کہ عماری میں آصف کا فیصلہ کر دیں۔ وزیر خاں پیش دستی کر کے جا پہنچا۔ اور بھائی کو نکال لے گیا۔ پھر بھی آصف کی انگلیاں کٹیں اور ناک پر زخم آیا انجام یہ ہوا کہ پہلے وزیر خاں حاضر ہوا۔ پھر آصف خاں کی خطا معاف ہو گئی +

میر مرتضےٰ شریفی۔ میر سید شریف جرجانی کی اولاد میں تھے۔ اُن کی تحقیقات و تصنیفات نے انہیں علم کے دربار سے فخر نوع بشر ثانی عقل ہادی عشر کا خطاب دلوایا تھا۔ یہ نہایت مقدس اور صاحب فضل و کمال تھے۔ ملا صاحب سال آئندہ کے حال میں لکھتے ہیں کہ دلّی میں فوت ہوئے۔ اور امیر خسرو علیہ الرحمۃ کے ہمسایہ میں دفن ہوئے۔ قاضیوں نے اور شیخ الاسلام نے حضور میں عرض کی کہ امیر خسرو ہندی ہیں اور سُنّی۔ میر مرتضےٰ ایرانی ہیں اور رافضی۔ کچھ شک نہیں کہ اُنہیں اس ہمسائے سے تکلیف ہوگی۔ حکم دیا کہ وہاں سے نکال کر اور جگہ دفن کر دو سبحان اللہ زمانہ کا اور خیالات کا انقلاب دیکھو چند ہی روز بعد یہ عالم ہوا کہ علمائے سینہ زور

میں سے ایک نہ رہا۔ اکبری دربار کا رنگ ہی اور ہو گیا۔ میر فتح اللہ شیرازی ۔ حکیم ابو الفتح ۔ حکیم ہمام وغیرہ وغیرہ صدہا ایرانی تھے۔ اور سلطنت کے کاروبار تھے۔ جو لوگ ایک زمانے میں دب کر نہایت سختی اُٹھاتے ہیں کچھ عرصے کے بعد زمانہ ضرور انہیں اُٹھا کر بلند کرتا ہے +

اکبر یہاں اس جھگڑے میں تھا۔ جو خبر پہنچی کہ کابل میں فساد عظیم برپا ہوا۔ اور مرزا حکیم فوج لے کر کابل سے پنجاب کی طرف آتا ہے۔ سُن کر بہت تردّد ہوا۔ امرائے پنجاب اس کے سینے پر خاطر خواہ ٹکر مار کر ہٹا سکتے تھے۔ مگر اکبر کو بڑا خیال یہ تھا کہ اگر وہ ادھر سے بھاگا اور ہماری طرف سے مایوس ہوا تو ایسا نہ ہو کہ بخارا میں اُذبک کے پاس چلا جائے۔ اس میں خاندان کی بدنامی بھی ہے۔ اور یہ قباحت بھی ہے کہ اگر اُذبک اسے ساتھ لے کر ادھر رُخ کرے۔ اور کہے کہ ہم فقط حقدار کو حق دلوانے آئے ہیں۔ تو قندھار۔ کابل۔ بدخشاں کا لے لینا اُسے سہل ہے۔ اس لئے تمام امرائے پنجاب کو لکھا کہ کوئی حکیم مرزا کا مقابلہ نہ کرے۔ جہاں تک آئے آنے دو۔ مطلب یہ کہ شکار ایسے موقع پر آجائے۔ جہاں سے بآسانی ہاتھ آجائے۔ ادھر خان زماں سے عفو تقصیر پر فیصلہ کر کے آگرہ کی طرف ہٹا +

خان زماں نے جب سُنا کہ حکیم مرزا پنجاب پر آتا ہے تو بہت خوش ہوا۔ اس واقعہ کو اپنے حق میں تائید آسمانی سمجھا اور کہا :-

ع خدا شرّے برانگیزد کہ خیر ما در آں باشد

جونپور میں اُس کے نام کا خطبہ پڑھا اور عرضی لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ۴۰ ہزار نمک خوار موروثی حضور کے حکم کا منتظر بیٹھا ہے۔ آپ جلد تشریف لائیں ۔ غزالی مشہدی خان زماں کے حضور میں ایک شاعر باکمال تھا۔ اس نے سکّہ کا سجع بھی کہہ دیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم وارثِ ملک است محمد حکیم

اتنی بات پر صبر نہ کیا جہاں جہاں امرائے بادشاہی تھے۔ فوجیں بھیج کر انہیں گھیر لیا۔ ابراہیم حسین مرزا وغیرہ کو لکھا کہ تم بھی اُٹھ کھڑے ہو یہ وقت پھر ہاتھ نہ آئیگا۔ اور خود فوج لے کر قنوج پر آیا +

اکبر کا اقبال تو سکندر کے اقبال سے شرط باندھے ہوئے تھا۔ پنجاب اور کابل

کی مہم کا فیصلہ اس آسانی سے ہو گیا کہ خیال میں بھی نہ تھا۔ چند روز پنجاب میں شکار کھیلتا رہا۔ ایک دن شکار گاہ میں وزیر خاں آصف خاں کا بھائی آیا۔ اور بھائی کی طرف سے بہت عذر معذرت کی۔ اکبر نے اس کی خطا معاف کر کے پھر پنجہزاری کی خدمت دی +

تیسری فوج کشی

مہم کابل کی تحقیقات سے اکبر کو یقین ہو گیا تھا۔ کہ یہ منصوبہ خان زماں کا پورا پڑتا تو تمام ہندوستان ایک آتشبازی کا میدان ہو جاتا۔ اس صورت میں واجب ہے کہ ان دونوں بھائیوں کا پورا تدارک کیا جائے۔ چنانچہ آصف خاں وزیر خاں کو حکم دیا کہ جاؤ اور کڑہ مانک پور کا ایسا کڑا انتظام رکھو کہ خان زماں اور بہادر خاں جنبش نہ کر سکیں۔ ۱۲ رمضان ۹۷۴ھ کو لاہور سے کوچ کیا۔ اور خود بھی جھٹ پٹ یلغار کر کے آگرہ پہنچا۔ جنگ آزمودہ امیروں کو فوجوں کے ساتھ روانہ کیا۔ ہراولی حسین خاں کے نام پر ہوئی۔ اس کی سخاوت اسے سدا مفلس رکھتی تھی۔ اب جو سنو اس کا صدمہ اٹھا کر آیا تھا تو بہت شکستہ حال ہو رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ شمس آباد اپنے علاقے پر گیا ہوا ہے۔ اس لئے قیا خاں گنگ ہراول ہوا۔ ۲۶ شوال کو آگرہ سے نکلا۔ سکیٹ مشرق آگرہ میں خبر لگی کہ خان زماں نے قنوج سے ڈیرے اٹھائے اور رائے بریلی کو چلا جاتا ہے۔ محمد قلی برلاس اور ٹوڈرمل کو ۶ ہزار فوج دے کر سکندر خاں ازبک کے روکنے کو بھیجا۔ اور آپ مانک پور کو مڑے اور چاروں طرف تیاری اور خبرداری کے فرمان بھیج دئے۔ رائے بریلی میں پہنچ کر سنا کہ خان زماں نے سلطان مرزا کی اولاد سے سازش کر لی ہے۔ مالوہ کو جاتا ہے۔ کہ ادھر کے علاقے فتح کرے۔ اور کچھ نہ ہو تو شاہان دکن کی پناہ میں جا بیٹھے +

علی قلی خاں کو یہ خیال تھا کہ جن جھگڑوں میں میں نے اکبر کو ڈالا ہے ان کا برسوں میں فیصلہ ہو گا۔ چنانچہ ایک قلعے پر کسی بادشاہی سردار کو گھیرے پڑا تھا۔ خبر پہنچی کہ اکبر آگرہ میں آن پہنچے۔ اور تمہاری طرف کو نشان لشکر لہراتا چلا آتا ہے۔ ہنس کر

یہ شعر پڑھا ؎

سمندِ تند مرِ تزین لعلِ او خورشید را ماند ۔۔۔ کہ از مشرق بمغرب رفت و یک شب در میاں ماند

پھر بھی وہ ہمّت کا پہاڑ اور تدبیر کا دریا تھا۔ شیر گڈھ (قنوج سے مانک پور کو چلا کہ بہادر خاں بھی وہیں تھا۔ یہ کسی اور سردار کو گھیرے پڑا تھا۔ دونوں بھائی گنگا کے کنارے کنارے چل کر سنگرور (مانک پور اور الٰہ آباد کے بیچ میں ہے۔ شاید نواب گنج کہلاتا ہے) کے پاس پل باندھ کر گنگا اُتر گئے۔ اکبر نے جب یہ خبریں سُنیں۔ تو یلغار کر کے چلا مگر رستے دو تھے۔ ایک عام شاہ راہ کہ طولانی تھا۔ دوسرا نزدیک تھا۔ مگر بیچ میں پانی نہ ملتا تھا۔ لوگوں نے حال عرض کیا۔ اور شاہ کو شاہراہ پر چلنے کی صلاح دی۔ بلند نظر بادشاہ نے کہا۔ کہ جو ہو سو ہو۔ جلد پہنچنا چاہیئے۔ توکل بخدا اِدھر ہی سے روانہ ہوا۔ اقبال کا زور دیکھو کہ رستے میں مینہ برسا ہوا تھا۔ جا بجا تلاؤ کے تلاؤ بھرے ملے۔ اور فوج اس آرام سے گئی کہ آدمی یا جانور کسی کو تکلیف نہ ہوئی ✦

غرض شب و روز مارا مار چلا گیا۔ رات کا وقت تھا کہ گنگا کے کنارے پر پہنچا۔ جس کے پار کڑہ مانک پور آباد ہے۔ کشتی ناؤ کچھ نہ تھی۔ سب کی صلاح یہی تھی۔ کہ یہاں ٹھیر کر اُمرا کا انتظار کریں۔ خاطر خواہ سامان سے آگے بڑھنا چاہیئے۔ کہ علی قلی خاں کا سامنا ہے۔ مگر اکبر نے ایک نہ سُنی۔ بال سُندر پر سوار تھا۔ آپ آگے بڑھا اور دریا میں ہاتھی ڈال دیا۔ خدا کی قدرت اقبال کا زور۔ گھاٹ بھی ایسا مل گیا۔ کہ دریا پایاب تھا۔ گنگا جیسا دریا اور ہاتھی کو کہیں تیرنا نہ پڑا۔ غرض بہت سے نامی اور جنگی ہاتھی ساتھ تھے اور فقط سو سواروں کے ساتھ پار ہوا۔ اور پچھلی رات چپ چاپ گنگا کے کنارے پر سو کر گزار دی۔ خان زماں کے لشکر میں بہت تھوڑا فاصلہ تھا۔ کہ نواب گنج سے پھر کر کڑہ کو دریا کے داہنے کنارے پرگنہ سنگرور میں آ گیا تھا۔ صبح ہوئی۔ تو علی قلی خاں کی فوج کے سر پر تھا۔ اس وقت آصف خاں بھی مسلّح اور تیار فوج لئے آن پہنچا۔ مجنوں خاں اور آصف خاں دمبدم خانزماں اور اس کے لشکر کی خبریں پہنچا رہے تھے۔ اور حکم یہ تھا کہ پہر میں دو دفعہ قاصد بھیجو۔ اور احتیاط رکھو کہ خان زماں کو خبر نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ نکل جائے علی قلی خاں اور بہادر خاں کو بادشاہ کے اس طرح پہنچنے کا شان گمان بھی نہ تھا۔ یہاں تمام رات

ناچ گانا تھا۔ اور شراب عشرت کا دور تھا۔ رنڈیاں چھم چھم ناچتی ہیں اور کہتی ہیں بشکن بشکن بشکن۔ مست مغل خماری آنکھیں کھولتے اور کہتے ہاں۔ بشکن بشکن کہ مبارک شگونیست۔ شکستیم دشمن را۔ ع

زدیم بر صف رنداں و ہر چہ بادا باد

غرض رات نے صبح کی کروٹ لی۔ ستارہ نے آنکھ ماری۔ اور شفق خونی پیالہ بھر کر مشرق سے نمودار ہوئی۔ نور کے تڑکے۔ بادشاہی فوج کا ایک آدمی ان کے خیمے کے پیچھے جاکر بہ آواز بلند چلایا کہ مستو! بےخبرو! کچھ خبر بھی ہے؟ بادشاہ خود لشکر سمیت آن پہنچے اور دریا بھی اتر لئے۔ اُس وقت خان زماں کے کان کھڑے ہوئے۔ مگر جانا کہ آصف خاں کی چالاکی ہے۔ مجنوں خاں قاقشال کو پھونس پتا بھی نہ سمجھتا تھا۔ کچھ پروانہ کی۔ خبر دینے والا بھی کوئی بادشاہی ہواخواہ تھا۔ چونکہ فوج بادشاہی بہت کم تھی۔ یعنی تین چار ہزار فوج امرا کی تھی۔ پانسو سوار بادشاہ کے ہمراہ آئے تھے۔ پیچھے پانسو ہاتھی بھی آن پہنچے تھے۔ بہر حال اکثر سردار نہ چاہتے تھے کہ اس میدان میں تلوار چل جائے۔ اُس شخص کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ کے آنیکی خبر سُن کر خان زمان بھاگ جائے۔ غرض نور کا تڑکا تھا کہ بادشاہی نقارہ پر چوٹ پڑی۔ یہ آواز سُنکر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور لشکر کا بندوبست کرنے لگے۔

۹۷۴ھ نو بجے پیر کا دن۔ عید قربان کی پہلی تاریخ تھی۔ منکروال (سنگروال)[1] علاقہ الہ آباد پر مقام تھا کہ میدان جنگ میں تلوار میان سے نکلی۔ دونوں بھائی شیر ببر کی طرح آئے اور اپنے اپنے پرے جماکر پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے۔ قلب میں خان زماں قائم ہوا۔ ادھر سے اکبر نے ہاتھیوں کی صف باندھ کر فوج کے پرے باندھے۔ پہلے ہی بادشاہی فوج سے بابا خاں قاقشال ہراول کی فوج لے کر آگے بڑھا۔ اور دشمن کی طرف سے جو ہراول اس کے سامنے آیا اُسے ایسا دباکر ریلا کہ وہ علی قلی خاں کی فوج میں جا پڑا۔ بہادر خاں دیکھ کر جھپٹا۔ اور اس صدمے سے آگر گرا کہ بابا خاں کو اُٹھا کر مجنوں خاں کی فوج پر دے مارا۔ اور باوجودیکہ اپنی فوج بے ترتیب ہو رہی تھی۔

[1] بلوک مین صاحب کہتے ہیں سنگروال کو اس فتح کے سبب سے اب تک فتح پور کہتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا گاؤں کڑہ کے جنوب مشرق میں ہے ۱۰-۱۱ میل پر۔ اور دریا سے بہت دور نہیں۔

دونوں کو اُلٹتا پلٹتا آگے بڑھا۔ دم کے دم میں صفوں کو تہ و بالا کر دیا۔ ادھر اُدھر چاروں طرف لشکر میں قیامت برپا ہوئی۔ اور ساتھ ہی قلب کا رُخ کیا۔ کہ اکبر امرا کے غول میں وہیں موجود تھا۔ بڑے بڑے سردار اور بہادر جاں نثار آگے تھے انھوں نے سینہ سپر ہو کر سامنا روکا مگر کھلبلی پڑ گئی +

بادشاہ بال سندر ہاتھی پر سوار تھے۔ اور مرزا عزیز کوکہ خواصی میں بیٹھے تھے ان کا خاندان گرد و پیش جما ہوا تھا۔ اکبر نے دیکھا کہ میدان کا رنگ بدلا۔ بنظر احتیاط ہاتھی سے کود کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور بہادروں کو للکارا۔ اب دونوں بھائیوں نے پہچانا کہ ضرور بادشاہ اس لشکر میں ہے۔ کیونکہ سرداروں میں کوئی ایسا نہ تھا۔ جو اس کے سامنے اس طرح جم کر ٹھہرے اور بندوبست سے جا بجا مدد پہنچائے۔ ساتھ ہی ہاتھیوں کا حلقہ نظر آیا۔ اب اُنھوں نے مرنا دل میں ٹھان لیا۔ اور جہاں جہاں تھے وہیں قائم ہو گئے۔ کیونکہ بادشاہ کا مقابلہ ایک غور طلب امر تھا۔ اسے وہ بھی نہ چاہتے تھے۔ ان بدنصیبوں نے بھی خوب لاگ ڈانٹ سے لڑائی جاری کر رکھی تھی۔ مگر نمک کی مار کا حربہ کچھ اور ہی ضرب رکھتا ہے۔ بہادر خاں کے گھوڑے کے سینے میں ایک تیر لگا کہ چراغ پا ہو کر گر پڑا۔ اور وہ پیادہ ہو گیا۔ بادشاہ کو ابھی تک اس کی خبر نہ ہوئی تھی۔ سب کو بدحواس دیکھ کر خود آگے بڑھا۔ اور فوجداروں کو آواز دی کہ ہاتھیوں کی صف۔ کو علی قلی خاں کی فوج پر ریل دو کہ بہادر خاں کو ادھر متوجہ ہونا پڑے۔ دونوں لشکر تہ و بالا ہو رہے تھے۔ علی قلی خاں اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ بار بار بہادر خاں کا حال پوچھتا تھا۔ اور مدد بھیجتا تھا۔ ابھی کچھ خبر نہ تھی کہ دونوں بھائیوں پر کیا گذری کہ اکبری بہادروں کو فتح کی رگ پھڑکتی معلوم ہوئی اور کامیابی کے آثار ظاہر ہونے لگے +

بات یہ ہوئی کہ ادھر سے پہلے ہیرانند ہاتھی علی قلی خاں کی فوج پر جُھکا۔ اُدھر سے مقابلے میں رودیانہ ہاتھی تھا۔ ہیرانند نے قدم کاٹ کر اس طرح کلہ کی ٹکر ماری کہ رودیانہ سینہ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اتفاقاً ایک تیر قضا کے تیر کی طرح علی قلی خاں کے لگا۔ دلاور بڑی بے پرواہی سے نکال رہا تھا کہ دوسرا تیر گھوڑے کے لگا۔ اور ایسا بیڈھب لگا کہ ہرگز سنبھل نہ سکا۔ گرا اور سوار کو بھی لے کر گرا۔ ہمراہیوں نے

دوسرا گھوڑا سامنے کیا۔ اتنے عرصے میں کہ وہ سوار ہو ایک بادشاہی ہاتھی باغیوں کو پامال کرتا ہؤا بلا کی طرح اس پر پہنچا۔ خانزماں نے آواز دی۔ فوجدار ہاتھی کو روکنا۔ مَیں سپہ سالار ہوں۔ زندہ حضور میں لے جا۔ بہت انعام پائیگا۔ اس کم بخت نے نہ سُنا۔ ہاتھی کو ہول ہی دیا۔ افسوس وہ خان زماں جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے فوجوں کے دھوئیں اُڑتے تھے۔ اسے ہاتھی روندکر ہوا کی طرح اور طرف نکل گیا۔ اور وہ خاک پر سسکتا رہ گیا۔ اللہ اللہ جس بہادر کو فتح و اقبال ہَوا کے گھوڑوں پر چڑھاتے تھے۔ جس عیش کے بندے کو ناز و نعمت مخملوں کے فرش پر لٹاتے تھے۔ وہ خاک پر پڑا دم توڑتا تھا۔ جوانی سرہانے کھڑی پیٹتی تھی۔ اور دلاوری زار زار روتی تھی۔ سارے ارادے اور حوصلے خواب و خیال ہو گئے تھے۔ ہاں۔ خان زماں! یہ یہاں کا معمولی قانون ہے۔ تم نے ہزاروں کو خاک و خون کو میں لٹایا۔ آؤ بھائی اب تمہاری باری ہے۔ اسی خاک پر تمہیں سونا ہوگا +

سرلشکر کے مرتے ہی لشکر پریشان ہوگیا۔ فوج شاہی میں فتح کا نقارہ بج گیا۔ اکبر ادھر اُدھر کمک دوڑا رہا تھا کہ اتنے میں نظر بہادر بہادر خاں کو اپنے آگے گھوڑے پر سوار کر کے لایا۔ اور حضور میں پیش کیا۔ اکبر نے پوچھا بہادر! چونی؟ کچھ جواب نہ دیا۔ اکبر نے پھر کہا۔ اس نے کہا۔ الحمد للہ علیٰ کلِ حالٍ۔ بادشاہ کا دل بھر آیا۔ بچپن کا عالم اور ساتھ کا کھیلنا یاد آیا۔ پھر کہا۔ بہادر مالشما چہ بدی کردہ بودیم کہ شمشیر بر روئے ما کشیدید۔ وہ شرمندہ شرمسار سر جھکائے کھڑا تھا۔ مارے خجالت کے کچھ جواب نہ دے سکا۔ کہا تو یہ کہا کہ الحمد للہ علیٰ کل حالٍ کہ در آخر عمر دیدار حضرت بادشاہ کہ ماحی گناہاں است نصیب شد۔ آفرین ہے اکبر کے حوصلے کو۔ گنہ بخش کا لفظ سنتے ہی آنکھیں نیچی کرلیں۔ اور کہا۔ بحفاظت نگہدارید۔ اس نے پانی مانگا۔ اپنی چھاگل میں سے پانی دیا +

اس وقت تک کچھ خبر نہ تھی۔ کہ علی قلی خاں کا کیا حال ہؤا۔ دولت خواہوں نے سمجھا کہ ایسے شیر بھائی کا قید ہونا علی قلی خاں نہ دیکھ سکیگا۔ قیامت برپا کریگا۔ اپنی جان پر کھیلیگا۔ مگر اسے چھڑا لے جائیگا۔ اس لئے کوئی کہتا ہے بے اطلاع۔ کوئی کہتا ہے اکبر کے اشارے سے شہباز خاں کمبو نے بے نظیر بہادر کا نقش

صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ مگر ملّا صاحب کہتے ہیں۔ کہ شہنشاہ اس کے قتل پر راضی نہ تھے +

بادشاہ میدان میں کھڑے تھے۔ نمک حرام پکڑے آتے تھے۔ اور مارے جاتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال خان زماں کا تھا۔ جو آتا تھا اس سے پوچھتے تھے۔ اتنے میں بابو فوجدار[1] پکڑا آیا۔ اس نے عرض کی کہ میں دیکھتا تھا۔ حضور کے ایک دنتنت ہاتھی نے اسے مارا ہے۔ ہاتھی اور مہاوت کے پتے بھی بتائے۔ بہت سے ہاتھی دکھائے۔ چنانچہ اُس نے نین سکھ ہاتھی کو پہچانا اور حقیقت میں اس کے ایک دانت تھا +

اکبر اب تک شبہ ہی میں تھا۔ حکم دیا۔ کہ جو نمک حراموں کے سر کاٹ کر لائے۔ انعام پائے۔ ولائیتی کے سر کے لئے اشرفی۔ ہندوستانی کے سر کے لئے روپیہ۔ ہائے کم بخت ہندوستانیو! تمہارے سر کٹ کر بھی سستے ہی رہے؟ لشکر کے لوگ بے سر و پا اُٹھ دوڑے۔ گودیں بھر بھر کر سر لاتے تھے۔ اور مٹھیاں بھر بھر کر روپے اشرفیاں لیتے تھے۔ ہر سر کو دیکھتے تھے۔ دکھاتے تھے۔ اور پہچانتے تھے۔ افسوس انہی سروں میں سے خان زماں کا سر بھی ملا کہ ادبار کا سر ہو گیا۔ سبحان اللہ۔ جس سر سے فتح کا نشان جدا نہ ہوتا تھا۔ جس سے اقبال کا خود اُترتا نہ تھا۔ جس چہرے کو کامیابیوں کی سرخی شگفتہ رکھتی تھی۔ اُس پر خون نے سیاہ دھاریاں کھینچی تھیں۔ نحوست نے خاک ڈالی تھی۔ کون پہچانے؟ سب کو تردد تھا ارزانی مل اس کا خاص اور معتبر دیوان بھی قیدیوں میں حاضر تھا۔ بلایا اور دکھا کر پوچھا۔ اُس نے سر کو اُٹھا لیا۔ اپنے سر پر دے مارا۔ اور ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا۔ خواجہ دولت کہ پہلے اس کے حرم سرا کا خواجہ سرا تھا۔ وہاں سے آ کر حضور میں ملازم اور پھر دولت خاں ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا اور کہا کہ مرنے والے کو عادت تھی کہ ہمیشہ پان بائیں طرف سے کھایا کرتا تھا۔ اس لئے ادھر کے دانت رنگین ہو گئے تھے۔ دیکھا تو ایسا ہی تھا +

اُس بدنصیب پر وہاں یہ گذری تھی۔ کہ نین سکھ تو روند کر چلا گیا وہیم جاں

[1] فوجدار فیلبان کو کہتے ہیں +

پڑا دم توڑتا تھا۔ کوئی گمنام چھاؤنی کا چکریا وہاں جا نکلا۔ اور مغل کو سسکتے دیکھ کر سر کاٹ لیا۔ اتنے میں ایک بادشاہی چیلا پہنچا۔ اس نے اس سے چھین لیا۔ اور دھکے دے کر دھتکار دیا۔ آپ آکر اشرفی انعام لے لی۔ ہائے زمانے کی گردش دیکھتے ہو! یہ اسی سیستانی رستم ثانی کا سر ہے۔ اس پر کتّے لڑ رہے ہیں۔ الٰہی کتّوں کا شکار نہ کروائیے۔ شکار بھی کروائے تو شیر ہی کا کروائیے۔ نہیں۔ نہیں۔ تیرے ہاں کیا کمی ہے۔ شیر کا پنجۂ قدرت دیجو۔ اور دُنیا کے کتّوں پر شیر رکھیو +

جب اکبر کو یقین ہوا کہ خان زمان کا بھی کام تمام ہوا۔ تو گھوڑے سے اُتر کر خاک پر پیشانی کو رکھ دیا۔ اور سجدۂ شکر بجا لایا۔ تمام اہل تاریخ اس مہم کے خاتمے پر عبارتوں کا زور دکھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ یہ فتح کارنامہائے جہان ستانی سے تھی۔ کہ فقط تائید حضرت ذو الجلال۔ اور تقویّت دولت و اقبال سے ظہور میں آئی وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ گرمی بشدّت تھی۔ مگر اسی دن بادشاہ الٰہ آباد میں چلے آئے۔ خان زمان! بل بے تری ہیبت اور واہ رے تیرا دبدبہ۔ مرد ہو تو ایسا ہو آزاد کو تیرے مرنے کا افسوس نہیں۔ مرنا تو ایک دن سب کو ہے۔ ہاں اس بات کا افسوس ہے۔ کہ خاتمہ اچھا نہ ہوا۔ تو اس سے بھی زیادہ تباہی و بدحالی سے مرتا۔ تیری لاش اس سے بھی سوا خراب و خوار ہوتی مگر آقا کی جاں نثاری میں ہوتی تو آبِ زر سے لکھی جاتی۔ خدا حاسدوں کا منہ کالا کرے۔ جنھوں نے دونوں بھائیوں کی سنہری سرخروئی کو روسیاہی کر دیا۔ آزاد بھی ایسے ہی بے لیاقت بد اصالت حاسدوں کے ہاتھ سے داغ داغ بیٹھا ہے۔ پھر بھی شکر ہے کہ روسیاہی سے محفوظ ہے۔ اور خدا محفوظ رکھے۔ یہ نا اہل خود کچھ نہیں کر سکتے۔ اوروں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں اور مورچے باندھتے ہیں۔ موقع پاتے ہیں تو افسروں سے اڑاتے ہیں۔ خیر آزاد بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اپنے تئیں خدا کے اور اُنھیں زمانے کے حوالے کر دیتا ہے۔ اُن کے اعمال ہی اُن سے سمجھ سمجھا لیتے ہیں ؎

تو بد کنندۂ خود را بروزگار گذار	کہ روزگار ترا چاکریست کینہ گذار

اتفاق ۔ خواجہ نظام الدین بخشی نے طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ میں ان دنوں

آگرہ میں تھا۔ ادھر تو مقابلے ہو رہے تھے۔ ادھر لوگ رات دن نئی نئی ہوائیاں اُڑا رہے تھے۔ اور پوستیوں اور افیمیوں کا تو کام یہی ہے۔ ایک دن دو چار دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ جی میں آیا کہ لاؤ ہم بھی ایک پھلجھڑی چھوڑیں مضمون یہ تراشا کہ خان زمان اور بہادر خان مارے گئے۔ بادشاہ نے اُن کے سر کٹوا کر بھیجے ہیں۔ دار الخلافہ کو چلے آتے ہیں۔ چند شخصوں سے ذکر کیا۔ شہر میں یہی چرچا فوراً پھیل گیا خدا کی قدرت کہ تیسرے دن اُن کے سر آگرہ میں پہنچ گئے۔ اور وہاں سے دِلّی اور لاہور ہوتے ہوئے کابل پہنچے۔ ملا صاحب لکھتے ہیں۔ کہ مَیں بھی اس تجویز میں شامل تھا ؎

بسا فالے کہ از بازیچہ برخاست		چو اختر در گذشت آں فال شد راست	

جن کو اُن سے فائدے تھے اُنہوں نے پُر درد اور غمناک تاریخیں کہیں ؎

چوں خانِ جہاں ازیں جہاں رفت بباد		بنیادِ فلک سراسر از پا افتاد	
تاریخ وفاتش از خرد جستم گفت		فریاد ز دستِ فلکِ بے بنیاد	

دوسری طرف والوں نے کہا۔ فتح اکبر مبارک۔ ایک تاریخ کا مصرع ہے ع

قتلِ دو نمک حرام بے دیں

اور اس میں ایک کی کمی ہے۔ قاسم ارسلان نے کہی تھی۔ لفظ اخیر کو دیکھنا۔ وہی مذہب کا اشارہ ہے آزاد کہتا ہے کہ شیعہ بیرم خاں بھی تھے۔ اُن کے لئے ہر شاعر اور ہر مؤرخ نے سوا تعریف کے زبان نہیں ہلائی۔ یہ انعام ہے اُسی بدزبانی کا کہ غیر مذہب کے لئے جو مُنہ میں آتا تھا کہہ اُٹھتے تھے۔ ایک شخص سے محبت رکھنی کچھ اور شے ہے اور بد کلامی اور بے تہذیبی کچھ اور شے ہے۔ اچھّا جیسا تم نے کہا تھا ویسا سُن لو اُستاد مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سُنے		ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

بُرج علی بچارا اس طرح سے کیوں گرا۔ اسی بنیاد پر۔ اپنے سر پر آسمان کیوں ٹوٹا۔ اسی بنیاد پر۔ خیر آزاد کو ان جھگڑوں سے کیا غرض ہے۔ بات میں بات نکل آئی تھی کہہ دی ؎

اگر دریافتی بر دانشت بوس		وگر غافل شدی افسوس افسوس	

بے لاگ تشریح تو یہ ہوئی ہے۔ کہ۔ دو خون شدہ۔ مگر اس کی بنیاد یہ ہوئی کہ پانچ برس پہلے جب اتکہ خاں کو ادہم خاں نے مارا۔ اور مارا گیا۔ تو کہنے والوں نے کہا تھا کہ۔ دو خوں شد۔ اب یہ دونوں مارے گئے ؎ ۔ ملا صاحب نے کہا۔ دو خوں شدہ ؎

خان زماں سخی تھا۔ عالی ہمت تھا۔ اور امیرانہ مزاج رکھتا تھا۔ فکر کا تیز اور مزاج کا ذکی تھا۔ علماء و شعرا اور اہلِ کمال کا بڑا قدرداں تھا۔ شہر زمانیہ اُسی کا آباد کیا ہوا شہر ہے۔ اور ریلوے کا سٹیشن بھی ہے۔ ۶ کوس غازی پور سے ہے۔ **غزالی** مشہدی اپنی بد اعمالی و بد اطواری کے سبب سے وطن کو بھاگ گیا۔ اور پھر کر دکن میں آیا۔ وہاں تنگ تھا۔ خان زماں نے ہزار روپیہ خرچ بھیجا اور بُلا بھیجا۔ ساتھ اس کے رباعی لکھی۔ دیکھنا ہزار کا اشارہ کس خوبصورتی سے کیا ہے۔ ؎

اے غزالی بحقِ شاہِ نجف	کہ سوئے بندگانِ بیچوں آئی
چونکہ بے قدر بودۂ آنجا	سرِ خود را بگیر و بیروں آئی

الفتی یزدی کہ شاعر تھا اور علوم ریاضی میں صاحبِ کمال تھا۔ خان زماں کے پاس نہایت خوشحالی کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ آپ بھی شعر کہتا تھا کہ۔ عاشق مزاجی کا مصالح ہے **سُلطان** تخلّص کرتا تھا اور شعر و شاعری کے جلسے رکھتا تھا۔ جب خان زماں نے غزل کہی جس کا مطلع ذیل میں لکھا جاتا ہے تو ادھر کے اضلاع میں بہت شاعروں نے اس پر غزلیں کہیں ؎

خان زماں	باریک چو مویست میانے کہ تو داری	گویا سرِ آں موست دہانے کہ تو داری
کسی اور صاحب طبع نے کہا	گفتم کہ گمانیست دہانے کہ تو داری	گفتا کہ یقین است گمانے کہ تو داری
[illegible]	سرچشمۂ خضر است دہانے کہ تو داری	ماہی ست دراں چشمہ زبانے کہ تو داری

ملا صاحب کو طرزِ قدما پسند ہے۔ اس لئے اس زمانے کی شاعری پر طنز کر کے کہتے ہیں۔ ایسی شاعری جس کا زمانہ جاہلیّت میں رواج تھا اور اب غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ ان دنوں میں اس سے توبۂ نصوح کرنی اچھی ہے۔ خان زماں کے چند شعر لکھ کر اس کا مذاقِ طبع دکھاتا ہوں: —

لہٗ	فغان و نالہ بسانِ جرس مکن اے دل	زجورِ یار شکایت بکس مکن اے دل
ولہ	صبا بحضرتِ جاناں بآں زماں کہ تو دانی	نیاز مندیٔ من عرض کن چناں کہ تو دانی
ولہ	دلبرے دارم کہ رویش چوں گل و مو سنبل است	سُنبلِ پرچین او افتادہ بر روئے گل است
ولہ	جانا! نہ بود مثلِ تو جانانۂ دیگر	مانندِ من دل شدہ دیوانۂ دیگر
	اے مغبچہ از دست تو پیمانہ نہ نوشم	مامست الستیم ز پیمانہ دیگر

شعرائے عصر کے سلسلے میں جو مُلّا صاحب نے **سلطان سبکلی** کا حال لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ قندھار کے علاقہ میں سبکل ایک گاؤں ہے **سلطان** وہاں کا رہنے والا تھا۔ لوگ اُسے چھپکلی کہتے تھے۔ وہ شرماتا تھا اور کہتا تھا کہ کیا کروں لوگوں نے کیسا کثیف اور مردار نام رکھ دیا ہے۔ **خان زمان** کا تخلّص بھی **سلطان** تھا۔ اُس نے سُبکلی کو خلعتِ گراں بہا کے ساتھ ہزار روپیہ بھیجا اور کہا کہ ملّا یہ تخلّص ہماری خاطر سے چھوڑ دو۔ اُس نے وہ ہدیہ پھیر دیا۔ اور کہا کہ واہ میرے باپ نے **سلطان محمد** میرا نام رکھا ہے۔ مَیں اس تخلّص کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ مَیں تم سے برسوں پہلے اس تخلّص سے شعر کہتا رہا۔ اور شہرت تمام حاصل کی ہے۔ خان زمان نے بلا کر سمجھایا۔ آخر کہا۔ کہ نہیں چھوڑتے تو ہاتھی کے پاؤں میں کچھواتا ہوں۔ اور غصّہ ہو کر ہاتھی بھی منگا لیا اُس نے کہا زہے سعادت کہ شہادت نصیب ہو۔ جب خان زمان نے بہت دھمکایا تو مولٰینا علاؤالدین لاری خان زمان کے اُستاد موجود تھے اُنھوں نے کہا کہ مولٰینا جامی کی ایک غزل دو اگر فی البدیہہ جواب کہدے تو معاف کرو اور نہ کہہ سکے تو نہیں اختیار ہے دیوان موجود تھا۔ یہ مطلع نکلا ؎

دل خطت را رقم صنعِ الٰہی دانست	بر سرِ سادہ رُخاں حجّتِ شاہی دانست

محمد سلطان نے اُسی وقت غزل لکھی اِس کا مطلع ہے ؎

ہر کہ دل را صدف سرِّ الٰہی دانست	قیمتِ گوہرِ خود را بکماہی دانست

باوجودیکہ کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی خان زمان بہت خوش ہوا۔ تحسین و آفرین کی اور اس سے چند در چند زیادہ انعام دے کر اعزاز سے رُخصت کیا۔ پھر سلطان وہاں نہ رہ سکا۔ خان زمان سے رخصت بھی نہ ہوا اور نکل گیا۔ (مُلّا صاحب کہتے ہیں) حق یہ ہے کہ بے مروّتی اُسی کی تھی۔ خانزمان جیسا امیر اس انسانیت کے ساتھ تخلّص مانگے اور وہ

ایسے بزرگوں سے قیل و قال کرے مناسب نہ تھا۔

آزاد - ملا صاحب بے لاگ کہنے والے ہیں۔ شاہ و وزیر پیر و مرید کسی سے چوکتے نہیں اور مذہب کی کھٹک سے دونوں بھائیوں سے خفا بھی ہیں۔ تاریخ قتل میں نمک حرام بھی کہا۔ بے دین بھی کہا۔ پھر بھی جہاں خانزماں اور بہادر خاں کا ذکر آیا ہے ان کے کارنامے بیان کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے ہیں اور باغ باغ ہوتے ہیں۔ اور جہاں بغاوت کا ذکر کیا ہے وہاں بھی حاسدوں کی فتنہ پردازی کا اشارہ ضرور کیا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ ان کے اوصاف ذاتی نیکی فیض رسانی کمال کی قدر دانی۔ دلاوری شمشیر زنی۔ میں نے خوب دیکھا وصف اصلی میں ایک پُرزور تاثیر ہے۔ خواہ اپنا ہو خواہ بیگانہ۔ اصلیت اپنے حق کو اس کے منہ میں سے اس طرح کھینچ کر نکالتی ہے۔ جیسے سُنار جنتری میں سے تار نکالتا ہے۔

بہادر خاں بھی موزوں طبیعت تھا۔ مُلا آصفی کی زمین میں اس کی غزل کا مطلع ہے۔

آصفی	
برما شبِ غم کار بسے تنگ گرفتہ	کو صبح کہ آئینہ ما زنگ گرفتہ

بہادر	
آں شوخ جفا پیشہ بکف سنگ گرفتہ	گویا بمنِ خستہ رہ جنگ گرفتہ
بنشستہ مہ من بہ سر مسندِ خوبی	شاہے ست کہ بابر سر اورنگ گرفتہ
از نالہ وے بس نکند بے تو بہادر	زینساں کہ نے غم زِ تو در چنگ گرفتہ

یہ لکھ کر (ملا صاحب فرماتے ہیں) ان کا اتنا ہی بہت ہے۔ کلام الملوک ملوک الکلام اس کا اصلی نام محمد سعید خاں تھا۔ ہمایوں کے عہد میں بیرم خاں کی مصلحت سے زمینداور کا حاکم رہا۔ اکبری عہد میں خطا معاف ہوئی۔ بیرم خاں کا دور تھا ملتان کا حاکم ہو گیا۔ سنہ ۲ جلوس میں مانکوٹ کی مہم میں بلایا گیا۔ نام کی بہادری کو کام کی بہادری سے ثابت کیا۔ پھر ملتان گیا اور بلوچوں کی مہم ماری۔ سنہ ۳ جلوس میں مالوہ کی مہم پر گیا۔ بیرم خاں کی مہم میں اہل دربار نے اُسے لیا اور وکیل مطلق کر دیا چند ہی روز کے بعد اٹاوہ کا حاکم کر کے بھیج دیا۔ جس پھرتی کے ساتھ اس نے اپنے بھائی

کے کارناموں میں حصّہ لیا۔ اس کا تماشا ابھی دیکھ چکے۔ اخیر وقت کا حال بھی دیکھ لیا کہ شہباز خاں کمبو کی بے دردی سے کبوتر کی طرح شکار ہوگیا۔ اٹاوہ میں تھے جب ولی بیگ ذوالقدر کا سر بادشاہی قورچی لے کر پہنچا۔ اُنھوں نے اُسے مروا ڈالا۔ خیر خواہوں نے اس خیال سے کہ مبادا بادشاہ کے دل پر ملال آئے اُنہیں دیوانہ بنا دیا۔ اور اس بہانہ سے بلا ٹل گئی ٭

منعم خاں خان خاناں

اس نامور سپہ سالار اور پنجہزاری امیر کا سلسلہ کسی خاندان امارت سے نہیں ملتا۔ لیکن یہ بات اُس سے بھی زیادہ فخر کی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی ذات سے خاندان امارت کا بانی ہوُا۔ اور امرائے اکبری میں وہ رتبہ پیدا کیا کہ ۹۷۸ھ میں جو عبداللہ خاں اُزبک فرمانروائے ترکستان کی طرف سے سفارت آئی۔ اس میں خاص منعم خاں کے نام سے علیحدہ تحائف کی فہرست تھی۔ وہ قوم کا ترک اور اس کا اصلی نام منعم بیگ تھا۔ بزرگوں کا حال فقط اتنا معلوم ہے کہ باپ کا نام بیرم بیگ تھا۔ ہمایوں کی خدمت سے منعم خاں ہوکر اُن کا اور فضیل بیگ اُن کے بھائی کا نام بھی سلسلۂ تاریخ میں مسلسل ہوُا۔ مگر ابتدائی حال میں فقط اتنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی عمدہ نوکر ہے۔ اور جو حکم آقا دیتا ہے اُسے پورا کرتا ہے۔ شیر شاہی معرکوں میں ساتھ تھا۔ تباہی کی حالت میں شریکِ حال تھا۔ وہ مصیبت کا سفر جو سندھ سے جودھ پور تک ہوُا۔ اس میں اور اس کی واپسی میں شاملِ ادبار تھا جب اکبر تخت نشین ہوُا تو منعم خاں کی عمر ۵۰ برس سے زیادہ تھی۔ اس عرصے میں جو اُس نے ترقی نہ کی اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنجیدہ مزاج دُور اندیش احتیاط کا پابند تھا۔ اور آگے بڑھنے میں ہمیشہ حکم کا محتاج تھا۔ سلاطین سلف کے زمانے ملک گیری شمشیر زنی اور ہمّت کے عہد تھے۔ ان میں وہی شخص ترقّی کر سکتا تھا۔ جو ہمّت حوصلہ اور دلاوری رکھتا ہو۔ اور اُس کی سخاوت رفیقوں کا مجمع اس کے

گرد رکھتی ہو۔ ہر کام میں بڑھ کر قدم رکھے اور آگے نکل کر تلوار مارے۔ وہ بھی ان اوصاف کا استعمال خوب جانتا تھا۔ مگر جو کچھ کرتا تھا۔ اپنی جیب سے پوچھ کر اور اعتدال سے اجازت لے کر کرتا تھا۔ اکثر باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عزت کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ وہاں قدم نہ رکھتا تھا جہاں سے اُٹھانا پڑے۔ کسی کے تنزل میں ترقی نہ چاہتا تھا۔ اور تنازع کے مقام میں نہ ٹھیرتا تھا۔ یاد کرو جب بدگویوں کی چغل خوری سے ہمایوں کابل سے یلغار کر کے قندھار پر گئے تو بیرم خاں نے خود چاہا کہ منعم خاں کو اس کی جگہ قندھار میں چھوڑیں لیکن جس طرح ہمایوں نے نہ مانا اُسی طرح منعم خاں نے بھی منظور نہ کیا +

کسی کے وقت میں رفاقت کرنی بڑے مردوں کا کام ہے۔ جبکہ ہمایوں سندھ میں شاہ حسین ارغوان کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اور لشکر ادبار اور فوج بدنصیبی کے سوا کوئی اس کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ افسوس اُس وقت منعم خاں نے بھی ایک بدنامی کا داغ پیشانی پر اُٹھایا۔ لشکر کے لوگ بھاگ بھاگ کر جانے لگے۔ خبر لگی۔ کہ منعم خاں کا بھائی یقیناً اور منعم خاں بھی بھاگنے پر تیار ہیں۔ ہمایوں نے قید کر لیا۔ افسوس کہ یہ شک بہت جلد یقین بن گیا۔ اور منعم خاں بھی بھاگ گئے۔ اس عرصے میں بیرم خاں آن پہنچے۔ بادشاہ کو ایران لے گئے۔ ادھر سے پھرے تو افغانستان میں یہ بھی پھر آن ملے۔ خیر صبح کا بھولا شام کو گھر آئے تو وہ بھی بھولا نہیں کہلاتا +

یہ علو حوصلہ اس کا قابل تعریف ہے کہ چغل خوروں کی بدگوئی نے ہمایوں کو بدگمان کیا۔ اُس نے چاہا کہ قندھار بیرم خاں سے لے کر منعم خاں کے سپرد کر دیں۔ منعم خاں نے خود انکار کیا اور کہا کہ ہندوستان کی مہم سامنے ہے۔ اس وقت حکام اور احکام کا اُلٹ پلٹ کرنا مناسب مصلحت نہیں ہے +

سنہ ۹۶۱ھ میں ہمایوں افغانستان کا بندوبست کر رہا تھا۔ بیرم خاں قندھار کا حاکم تھا۔ اکبر کی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ ہمایوں نے منعم خاں کو اکبر کا اتالیق مقرر کیا۔ اس نے شکریئے میں جشن شاہانہ ترتیب دیا۔ مع اہل دربار بادشاہ کی ضیافت کی اور پیشکش ہائے شائستہ نذر گذرانے۔ جیسی اُس وقت بادشاہی تھی ویسا ہی جشن شاہانہ ہو گا۔ ویسے ہی پیشکش ہونگے +

اسی سنہ میں ہمایوں ہندوستان پر فوج لے کر چلا۔ محمد حکیم مرزا ایک برس کا بچہ تھا۔ اس ستارہ کو ماہ جوجک بیگم اس کی ماں کے دامن میں لٹا کر کابل کی حکومت اس کے نام کی۔ بیگمات کو بھی یہیں چھوڑا۔ اور کل کاروبار کا انتظام منعم خاں کے سپرد کیا ✦

جب اکبر تخت نشین ہؤا۔ تو شاہ ابو المعالی کا بھائی میر ہاشم ادھر تھا۔ کھمرو۔ ضحاک۔ غوربند اس کی جاگیر تھے۔ یہاں شاہ نے بدنیتی کے آثار دکھلائے۔ اس باتدبیر سردار نے وہاں میر ہاشم کو لطائف الحیل سے بُلا کر قید کر لیا۔ ادھر بادشاہ خوش ہو گئے۔ ادھر اپنے پہلو سے کانٹا نکل گیا۔ تمام افغانستان تھا اور یہ تھے۔ حکومت کے نقارے بجاتے پھرتے تھے ✦

جب ہمایوں ہندوستان کو چلا تھا۔ تو بدخشاں کا ملک مرزا سلیمان کو دے آیا تھا۔ اور ابراہیم مرزا اس کے بیٹے سے بخشی بیگم اپنی بیٹی کی شادی کر دی تھی۔ جب یہاں ہمایوں مر گیا۔ تو مرزا سلیمان اور اس کی بیگم کی نیت بگڑی۔ بیگم ہمایوں کے پُرسے کا بہانہ کر کے کابل میں آئی وہ نام کو حرم بیگم تھی۔ لیکن اپنے طنطنے سے سلیمان بلکہ سارے خاندان کو جورو بنا کر ولی نعمت بیگم کا لقب پیدا کیا تھا۔ ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ سُنا۔ کابل میں دیکھا کہ منعم خاں ہیں یا بیگمات ہیں۔ سب حالات معلوم کر کے گئی۔ پھر ادھر سے مرزا سلیمان فوج لے کر آئے۔ مرزا ابراہیم اپنے بیٹے کو ساتھ لائے کہ اس سے ہمایوں کی بیٹی منسوب تھی۔ غرض مرزا نے آ کر کابل کو گھیر لیا منعم خاں نے آمد آمد کی خبر سُنتے ہی اکبر کو عرضی کی اور خندق فصیل کی مرمت کر کے قلعہ بند ہو بیٹھا۔ بمقتضائے احتیاط لڑائی میدان میں ڈالی۔ ادھر سے اطمینان کا فرمان گیا۔ بدخشی حملے کرتے تھے۔ اندر والے توپ و تفنگ سے جواب دیتے۔ اتفاقاً بیگمات کے لینے کو اکبر نے چند امیر کچھ فوج کے ساتھ بھیجے تھے۔ یہ ابھی اٹک بھی نہ اُترے تھے وہاں خبر مشہور ہو گئی کہ ہندوستان سے مدد آ گئی۔ اس زمانے میں علمائے شریعت سے بڑے کام نکلتے تھے۔ مرزا سلیمان گھبرا گیا۔ اُس نے قاضی نظام بدخشی کو قاضی خاں بنایا تھا۔ بہت سے پیغام سلام سمجھا کر منعم خاں کے پاس بھیجا۔ قاضی صاحب کے پاس مطالب و دلائل کا سرمایہ اس سے زیادہ نہ تھا

کہ مرزا سلیمان بڑا دیندار۔ پرہیزگار۔ خدا پرست بادشاہ ہے۔ طریقت و شریعت کی برکتوں سے فیض یافتہ ہے۔ وہ بھی خاندان تیموریہ کا چراغ ہے۔ بہتر ہے کہ اس کی اطاعت اختیار کرو۔ اور ملک سپرد کر دو۔ لڑائی کی قباحتیں بندگان خدا کی خونریزی اور خونریزی کے گناہ دکھا کر بہشت و دوزخ کے نقشے کھینچ دئے۔ مَنْ قَتَلَ نفساً فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا +

منعم خاں بھی پرانم بڈھے تھے۔ انہوں نے باتوں کے جواب باتوں ہی سے دئے۔ اور باوجود بے سامانی اور تنگدستی کے مہمان داریوں اور ضیافتوں اور روشنی میں اس قدر جمعیت اور سامان کے رہدبے دکھائے کہ قاضی خاں کی آنکھیں کھُل گئیں۔ اور اصلیت حال اصلا نہ کھلی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ سامان قلعہ داری کافی و وافی ہے ذخیرے برسوں کے لئے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن جو باتیں آپ نے فرمائیں۔ انہی خیالوں سے اب تک اندر بیٹھا ہوں۔ ورنہ جنگِ میدان میں کلہ شکن جواب دیتا۔ احتیاط کا سررشتہ ہاتھ سے دینا سپاہی کا کام نہیں۔ دربار سے بھی کمک روانہ ہوئی ہے۔ اور پیچھے سامان برابر چلا آتا ہے۔ لیکن آپ بھی مرزا کو سمجھائیں۔ کہ ابھی تو ہمایوں بادشاہ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا۔ ان کی عنایتوں کو خیال کرو۔ کفرانِ نعمت کا داغ نہ اٹھاؤ۔ محاصرہ اُٹھاؤ۔ اہلِ عالم کیا کہینگے۔ قاضی صاحب ناامید ہو کر صلح کی طرف پھرے۔ منعم خاں بھی مصلحتاً راضی ہو گئے۔ مگر ایلچی کارواں تھا۔ پہلے شرط یہ کی۔ کہ مرزا کے نام کا خطبہ پڑھا جاوے۔ دوسرے ہماری سرحد بڑھائی جائے۔ منعم خاں نے برائے نام ایک گمنام مسجد میں چند آدمی جمع کروا کر خطبہ پڑھوا دیا۔ مرزا سلیمان اُسی دن محاصرہ اُٹھا کر چلے گئے۔ نئے علاقے میں اپنا معتبر چھوڑ گئے۔ مگر وہ ابھی بدخشاں میں نہ پہنچے تھے کہ اُن کا معتبر ایک ناک دو کان سلامت لے کر پہنچ گیا۔ غرض منعم خاں نے فقط حکمت عملی کے زور سے کابل کو بربادی سے بچا لیا +

افسوس جب بڈھے شیر (منعم خاں) نے دُور تک میدان صاف دیکھا۔ تو پہلے حملے میں گھر کی بلی کو شکار کیا۔ دولتِ بابری کے خدمت گذاروں میں خواجہ جلال الدین محمود ایک مصاحب دربار تھے کہ اُن کی خوش طبعی کو یاوہ گوئی نے بدمزہ کر دیا تھا۔

باوجود اس کے خود تیز طبع، آتش دماغ۔ بڑا فخر اس بات کا تھا کہ ہم شاد قلی ہیں۔ اس گھمنڈ کی سختیوں اور تمسخر کی تیزیوں نے تمام اہل دربار کا ناک میں دم کر دیا تھا خصوصاً منعم خاں کہ جل کر کوئلہ ہو رہا تھا۔ اور دربار کا حال بھی معلوم تھا کہ بیرم خاں ناراض ہے۔ ہمایوں کے وقت میں منعم خاں کو اتنی طاقت کہاں تھی جو خواجہ سے انتقام لیتے۔ مگر اب کہ کابل میں حاکم با اختیار ہوئے۔ اور جھاڑو گھر کے مالک ہو گئے کچھ آپ سمٹے کچھ فتنہ سازوں نے کمر بندھوائی۔ خواجہ غزنی کے حاکم تھے۔ خان نے انہیں عہد و پیمان کر کے غزنی میں بلایا اور قید کر لیا۔ اسی عالم میں چند نشتر اُن کی آنکھ میں لگوائے اور سمجھے کہ بینائی سے معذور ہو گئے۔ انہیں تو اس خیال میں کچھ پرواہ نہ رہی۔ خواجہ بڑے کرامات والے تھے۔ کوئی دم چراتا ہے۔ وہ آنکھیں چرا گئے تھے چند روز کے بعد جلال الدین اپنے بھائی کے پاس بھاگ گئے کہ بنگش کے رستے سے قلات اور کوئٹے سے ہو کر دربار اکبری میں جا پہنچے۔ منعم خاں نے سنتے ہی آدمی دوڑائے پھر بیچارے کو پکڑ منگایا۔ بظاہر قید کیا۔ چند روز کے بعد اندر ہی اندر کام تمام کر دیا۔ ایسے سلیم الطبع آدمی سے خونِ ناحق ہونا وہ بھی اس بے عزتی و بے مروّتی سے کمال افسوس کا مقام ہے ۔

جب دربار میں بیرم خاں کی بربادی کی تدبیریں ہو رہی تھیں۔ تو اہل مشورہ نے اکبر سے کہا کہ جو پرانے پرانے نمک خوار دُور و نزدیک ہیں انہیں اس مہم میں شامل کرنا ضرور ہے۔ چنانچہ منعم خاں کو بھی کابل سے بُلایا تھا۔ اُس نے وہاں غنی خاں اپنے بیٹے کو چھوڑا۔ اور خیز اخیز لدھیانے کے مقام میں اکبر کو سلام کیا۔ اکبر اُس وقت خان خاناں کے تعاقب میں تھا۔ شمس الدین محمد خاں اتکہ آگے آگے تھے۔ حضور سے خان خاناں کے خطاب کے ساتھ وکالت کا منصب حاصل کیا۔ لیکن اس کی نیک نیّتی کا ثبوت اس روئداد سے ہو سکتا ہے جو بیرم خاں کے حال میں لکھی گئی۔ کہ جب لڑائی کے بعد بیرم خاں سے پیغام سلام ہونے لگے۔ تو کس بیتابی سے اُس کے پاس دوڑا چلا گیا۔

جب خان خاناں کا قصہ فیصل ہو گیا تو منعم خاں خان خاناں تھے۔ اکبر مہم سے فارغ ہو کر آگرہ میں گئے۔ بیرم خاں کا عالیشان محل جس کے پاؤں میں دریا کا پانی لوٹتا

لوٹ کر لے۔ بس مارتا تھا۔ منعم خاں کو انعام فرمایا۔ اُسے خیال تھا کہ خان خاناں کا عہدہ اور کُل اختیارات مجھے ملینگے۔ لیکن پانسا پلٹ گیا۔ اکبر کی آنکھیں کُھلنے لگی تھیں۔ وہ سلطنت کے کاروبار اپنی رائے پر کرنے لگا۔ ماہم سے وکالت کے کاروبار چھن گئے۔ میر اتکہ وکیل مطلق ہو گئے۔ ماہم اور ماہم والوں کو بھی سخت ناگوار ہوُا۔ ادہم خاں ماہم کے بیٹے کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی۔ منعم خاں نے اُسے بھڑکایا اور شہاب خاں نے تیل ڈالا۔ نوجوان بھڑک اُٹھا۔ کوتہ اندیش نے بر سر دیوان جلسۂ امرا میں آ کر میر اتکہ کو قتل کیا۔ لیکن جب وہ قصاص میں قتل ہوُا تو جو جو اس فتنہ پردازی میں شریک تھے۔ اُنہیں سخت خطرہ ہوُا۔ شہاب خاں کا رنگ زرد ہو گیا۔ منعم خاں بھی گھبرائے۔ اور شنہ جلوس تھے کہ بھاگے۔ اکبر نے اشرف خاں میر منشی کو بھیجا وہ فہمائش سے مطمئن کر کے لے آئے۔ مگر چند روز کے بعد قاسم خاں میر بحر کے ساتھ پھر آگرہ سے بھاگے۔ دو تین آدمی ساتھ لئے۔ بوسہ کے گھاٹ پر کشتی کی سیر کا بہانہ کیا وہاں جا کر مغرب کی نماز پڑھی۔ اور رستے سے کٹ کر الگ ہوئے کابل کا ارادہ کیا۔ روپڑ سے ہو کر بجواڑہ میں آئے۔ علاقہ ہوشیار پور میں آ کر کوہ کا دامن پکڑا۔ پہاڑوں پر چڑھتے۔ اور کھڈوں میں اُترتے قسمت کی مصیبت بھرتے **سروت** علاقہ میان دوآب میں جا پہنچے۔ کہ میر محمود منشی کی جاگیر تھا۔ جنگل میں اُترے ہوئے تھے۔ وہاں کا شقدار قاسم علی اسپ **خلاب** سیستانی گشت کرتا ہوُا اُدھر آ نکلا۔ وہ انہیں پہچانتا نہ تھا مگر وضع سے معلوم کیا کہ سردار ہیں کہیں رُو پوش بھاگے جاتے ہیں۔ اُسی وقت علاقے کو پھرا۔ چند سپاہی اور کچھ گاؤں کے زمیندار ساتھ لے کر گیا اور انہیں گرفتار کر کے لے آیا۔ سید محمود بارہہ بہادر اور عالی ہمت اور سردار عالیشان لشکر اکبری کے تھے۔ اس علاقے میں اُن کی جاگیر تھی۔ کسی سبب سے اس نواح میں تھے اُنہیں خبر کی۔ کہ دو شخص امرائے بادشاہی سے نظر آتے ہیں۔ اِدھر سے جاتے ہیں۔ اور آثار و اطوار سے خوفزدہ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ دیکھئے یہ کون صاحب ہیں۔ یہ آٹھ پہر کے ساتھ رہنے سہنے والے۔ انہوں نے پہچانا۔ بڑے تپاک سے ملاقاتیں ہوئیں۔ موقع کو غنیمت سمجھا اپنے گھر لائے تعظیم و تکریم سے رکھا۔ مہمان داری کے حق ادا کئے۔ اور اعزاز و اکرام سے اپنے فرزندوں اور بھائی بندوں کے ساتھ خود

لے کر حضور میں حاضر ہوئے۔

یہاں لوگوں نے اکبر کو بہت کچھ لگایا بجھایا تھا۔ بلکہ یہ بھی اشارہ کیا تھا کہ اس کا گھر ضبط کرنا چاہیئے۔ اکبر نے کہا کہ فقط وہم سے منعم خاں نے ایسا کیا ہے۔ وہ نہ جائیگا۔ اور اگر گیا بھی۔ تو کہاں گیا؟ کابل ہمارا ہی ملک ہے۔ کوئی ان کے گھر کے گرد پھٹکنے نہ پائے۔ وہ بندۂ قدیم الخدمت اس خاندان کا ہے۔ ہم اُس کا سب اسباب وہیں بھجوادیں گے۔ جب یہ آئے تو سب کے منہ بند ہو گئے۔ بادشاہ نے بہت دلجوئی کی۔ اور وہی مرحمت اس کے حال پر مبذول فرمائی جو کچھ چاہیئے تھی۔ وکالت کا منصب اور خان خاناں کا خطاب بحال رکھا۔

۹۷۰ھ میں منعم خاں نے ایک ہمت دلاورانہ کی اور افسوس کہ اس میں ٹھوکر کھائی۔ مجمل تمہید اُس کی یہ ہے کہ وہ یہاں تھا۔ اور غنی خاں اُس کا بیٹا کابل میں قائمقام تھا۔ اس نااہل لڑکے نے وہاں رعایا کو اپنی سختی سے اُمرا کو نااہلی سے ایسا تنگ کیا کہ حکیم مرزا کی ماں (چوچک بیگم) بھی دق ہو گئی۔ فضیل بیگ منعم خاں کا بھائی آنکھیں[1] نہ رکھتا تھا۔ مگر فتنہ و فساد کی ناک میں سرتاپا آنکھیں تھا۔ وہ بھی نااہل بھتیجے کی خودسری سے تنگ تھا۔ اس نے اور اہل خدمت نے بیگم کو بھڑکایا۔ اس کی اور ابوالفتح اس کے بیٹے کی صلاحوں سے نوبت یہ ہوئی۔ کہ ایک دن غنی خاں فالیز کی سیر سے پھر کر آیا۔ لوگوں نے شہر کا دروازہ بند کر لیا۔ وہ کئی دروازوں پر دوڑا آخر دیکھا۔ کہ ہمت کا موقع نہیں۔ اب قید کا وقت ہے۔ اس لئے کابل سے ہاتھ اُٹھا کر ہندوستان کی طرف پاؤں بڑھایا۔ وہاں فضیل بیگ کو بیگم نے مرزا کا اتالیق کر دیا۔ اندھے سے سوا بے ایمانی کے کیا ہونا تھا۔ اُس نے اچھی اچھی جاگیریں آپ لیں اور اپنے وابستوں کو دیں۔ بُری بُری مرزا کے متعلقین کو دیں۔ ابوالفتح بیٹا تحریر وغیرہ کے کام کرتا تھا۔ یہ عقل کا اندھا تھا۔ باپ خودغرضی۔ بداعمالی۔ شراب خوری کے حاشئے چڑھاتا تھا۔ لوگ پہلے سے بھی زیادہ تنگ ہوئے۔ آخر ابوالفتح دخترِ رز کی بدولت بزم دغا میں مارے گئے۔ سرکٹ کر نیزے پر چڑھ گیا۔ اندھا بھاگا مگر پکڑا آیا۔ اور آتے

---

[1] جب ہمایوں کے بھائیوں نے لناوت کی تو منعم خاں ہمایوں کے ساتھ تھا فضیل بیگ کامران کے ہاتھ آگیا۔ وہ مردم آزاری کا مشتاق تھا۔ اُس نے فضیل کو اندھا کر دیا۔

ہی بیٹے کے پاس پہنچا۔ اب ولی بیگ کابل کے صاحب اختیار ہوئے۔ یہ پورے دلی تھے۔ انہوں نے اکبر کو بھی لڑکا سمجھا۔ اور خود ہی بادشاہی کی ہوا میں اُڑنے لگے۔ وہاں کے شور و شر دیکھ کر اکبر کو یہاں تک خطرہ ہوا کہ کابل ہاتھ سے نکل نہ جائے منعم خاں کچھ خوبی آب و ہوا سے کچھ جسمانی آسائشوں کی طفیل سے کچھ آزادانہ حکمرانی کے مزے سے ہمیشہ کابل کی آرزو رکھتا تھا۔ اس لئے اکبر نے حکیم مرزا کی اتالیقی اور حکومتِ کابل اُس کے نام پر کر کے اُدھر روانہ کیا۔ اور کئی امیر اُس کی مدد کے لئے فوج دے کر ساتھ کئے منعم خاں کابل کے نام پر جان دے رہے تھے کابلیوں کی سرشوری و سینہ زوری کو ذرا خاطر میں نہ لائے۔ دولتِ حضوری کی بھی قدر نہ سمجھے۔ حکم ہوتے ہی روانہ ہو گئے۔ اور کوچ بہ کوچ منزلیں لپیٹ کر جلال آباد کے قریب جا پہنچے۔ امرا کا اور فوج کمک کا بھی انتظار نہ کیا +

بیگم اور اُس کے مشورہ کاروں کو جب یہ خبر پہنچی۔ تو خیال کیا کہ منعم خاں کے بیٹے نے یہاں بہت ذلت اُٹھائی ہے۔ بھائی بھتیجے اُس خواری سے مارے گئے ہیں۔ خدا جانے آکر کس کس سے کیا سلوک کرے۔ اس لئے باسامان جمعیت بہم پہنچائی۔ اہل فساد نے مرزا کو بھی فوج کے ساتھ لیا۔ اور مقابلے پر آئے۔ پہلو یہ سوچا کہ اگر ہم نے فتح پائی تو سبحان اللہ اور شکست پائی تو یہاں نہ رہینگے۔ بادشاہ کے پاس چلے جائینگے غرض بیگم نے ایک سردار کو فوج دے کر آگے بڑھایا۔ کہ قلعہ جلال آباد کا استحکام کرے۔ منعم خاں کو جب یہ خبر پہنچی تو ایک جنگ آزمودہ سردار کو اُس کے روکنے کے لئے بھیجا۔ وہ اس عرصے میں قلعے کا بندوبست کر چکا تھا۔ اس نے جلال آباد کے میدان میں لڑائی ڈال دی۔ اتنے میں خبر لگی۔ کہ بیگم اور مرزا بھی آن پہنچے +

منعم خاں کیسے ہی جوش و خروش میں ہوں۔ مگر اپنی سلامت روی کی چال نہ چھوڑتے تھے۔ جبار بردی ایک سردار بابر کے عہد کا تھا کہ اب لباسِ فقیری میں امیری کرتا تھا۔ وہ بھی ہوائے کابل میں منعم خاں کے ساتھ اُڑا جاتا تھا۔ اُسے بھیجا کہ مرزا سے جا کر گفتگو کرے۔ کشت و خون کی نوبت نہ پہنچے۔ باتوں میں کام نکل آئے۔ اور یہ منتر نہ چلے تو لڑائی کل پر ڈالے۔ آج ملتوی رکھے۔ کہ ستارہ[1]

[1] ترکوں میں مشہور ہے کہ یلدوز ایک ستارہ ہے لڑائی کے میدان میں جس فریق کے سامنے ہوتا ہے اسکی شکست ہوتی ہے۔

سامنے ہے۔ فوج ہراول میں ثمر یکہ[1] گھوڑا دوڑاتے آیا۔ اور کہا کہ غنیم بہت کم ہے ایسی عالت میں لڑائی کل پر نہ ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ ہراساں ہو کر نکل جائے اور بات بڑھ جائے۔ منعم خاں اور حیدر محمد خاں دونوں کابل کے عاشق تھے اور سپاہگری پر مغرور۔ رکابی فوج کی ہمّت اور اپنے حوصلے پر گھوڑے بڑھاتے چلے گئے۔ اور چار باغ کے پاس خواجہ رستم کی منزل پر میدان جنگ قائم ہوا۔ خان خاناں جب اپنے اصول سے باہر قدم رکھتے تھے۔ جبھی خطا پاتے تھے۔ اُن کا سردار جو ہراول بن کر گیا تھا مارا گیا۔ اور ایسا سخت کشت و خون ہوا کہ فوج برباد ہو گئی۔ اور انہوں نے شکست کھائی۔ بہت سے ہمراہی کابلیوں سے جا ملے۔ نقد جنس ۲۰ لاکھ کا خزانہ اور توشہ خانہ سب کابلی لٹیروں کو دے کر آپ بحالِ تباہ وہاں سے بھاگے۔ اور غنیمت ہوا کہ وہ لوٹ پر گر پڑے ورنہ خود بھی شکار ہو جاتے +

منعم خاں بیہوش۔ بدحواس پرجھڑے دُم بچے پشاور میں پہنچے۔ مدّت تک سوچتے رہے۔ آخر اکبر کو سارا حال لکھا اور عرض کی کہ بندۂ منعم نے نعمت حضوری اور مرحمت بادشاہی کی قدر نہ جانی۔ اُس بداعمالی کی یہی سزا تھی۔ اب مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ حکم ہو تو مکّے کو چلا جائے۔ گناہوں سے پاک ہو گا۔ جب حضور میں حاضر ہونے کے قابل ہو گا۔ یہ التجا قبول نہیں تو کچھ جاگیر سرکار پنجاب میں مرحمت ہو جائے کہ صورت حال درست کر کے شرف زمین بوس حاصل کروں +

منعم خاں کچھ مارے ڈر کے کچھ مارے شرم کے پشاور میں بھی نہ ٹھیر سکا۔ اٹک اُتر کر گکھڑوں کے علاقے میں چلا آیا۔ سلطان آدم گکھڑ بڑی آدمیت اور حوصلے سے پیش آیا۔ اور شان کے لائق مہمانداری کی۔ حیران بیٹھا تھا۔ کہ کیا کرے۔ نہ چلنے کو رستہ نہ بیٹھنے کو جگہ نہ دکھانے کو مُنہ۔ بارے اکبر نے اپنے قدیم الخدمت ملازم کو بڑی تسلّی اور دلاسے کے ساتھ جواب لکھا۔ کہ کچھ خیال نہ کرو۔ تمہاری جاگیر سابق بحال ہے۔ اپنے ملازم بدستور علاقوں پر بھیج دو۔ آپ چلے آؤ۔ عنایات الطاف اس قدر ہوں گے کہ سب نقصان پورے ہو جائینگے۔ اور رنج کا

[1] یکہ ایک قسم کے انتخابی اور بہادر سواروں کا رسالہ ہوتا ہے کہ اسے یکہ سواروں کا رسالہ کہتے ہیں۔ اکبر کے عہد خوش اعتقادی اور دین الٰہی وغیرہ کی نیدیں لگا کر یکوں کو احدی کہنے لگے اس میں توحید خاص کا اشارہ تھا +

مقام نہیں۔ عالم سپاہ گری میں اکثر ایسی صورتیں پیش آتی ہیں۔ انشاء اللہ جو ہرج ہوئے ہیں سب کا تدارک ہو جائیگا۔ منعم خاں کی خاطر جمع ہوئی۔ دربار میں حاضر ہوئے۔ اور جلد آگرہ کے قلعدار ہو گئے۔ اور کئی سال تک یہ خدمت انہی کے نام پر رہی +

۹۷۲ھ میں جب کہ اکبر نے علی قلی خاں سیستانی پر فوج کشی کی۔ تو چند روز پہلے منعم خاں کو فوج دے کر آگے روانہ کیا۔ اور اُس نے اپنی سلامت روی اور دونو طرف کی دلسوزی و خیر اندیشی سے کارنمایاں کئے کہ بادشاہ بھی خوش ہو گئے۔ اگرچہ آگ لگانے والے بہت تھے لیکن اُس کی کوشش اسی میں عرق ریزی کر رہی تھی کہ سلطنت کا قدیم الخدمت برباد نہ ہو۔ آخر نیک نیتی کامیاب ہوئی اور مہم کا خاتمہ صلح و صفائی پر ہوا۔ دشمنوں نے اُس کی طرف سے بادشاہ کو شبہے بھی ڈالے مگر کچھ اثر نہ ہوا +

۹۷۵ھ میں جب خانزمان اور بہادر خاں کے خون سے خاک رنگین ہوئی اور مشرقی فساد کا خاتمہ ہوا۔ تو منعم خاں کو دارالخلافہ آگرہ میں چھوڑ گئے تھے۔ اِسے بُلا بھیجا۔ بڑھاپے میں اقبال کا ستارہ طلوع ہوا۔ تمام علاقہ علی قلی خاں کا۔ تمام جونپور۔ بنارس۔ غازی پور۔ چنار گڈھ۔ زمانیہ سے لے کر دریائے جوسا کے گھاٹ تک عطا فرمایا۔ اور خلعتِ شاہانہ اور گھوڑا دے کر رخصت کیا۔ وہ بڑے حوصلہ اور تدبیر کے ساتھ وہاں حکومت کرتا رہا۔ اور سلیمان کرارانی اور لودی وغیرہ افغانوں کے سردار جو ملکِ بنگالہ اور اضلاع مشرقی میں افغانوں کے عہد سے حاکم مستقل اور صاحبِ لشکر تھے اُنہیں بھی کچھ صلح اور کچھ جنگ کے سامان دکھا کر دباتا رہا۔ اور حق پوچھو تو یہی آخری تین برس اُس کی عمر دراز کا نچوڑ تھے۔ جسے خانخاناں کے خطاب سے اُس کے نام کو تاجدار کر سکتے ہیں۔ اور یہی بنگالہ کی مہم ہے جس کی بدولت وہ دربار اکبری میں آنے کے قابل ہوا ہے۔ اور سلیمان سے عہد نامہ کر کے اکبر کا سکّہ جاری کر دیا +

اکبر چتوڑ کی مہم پر تھا۔ خان خاناں کو خبر پہنچی کہ زمانیہ پر جو اسد اللہ خاں نمک خوار بادشاہی حکومت کر رہا ہے۔ اس نے سلیمان کرارانی کے پاس آدمی بھیجا ہے کہ تم اس علاقے پر قبضہ کر لو۔ خان خاناں نے فوراً فہمائش کے لئے معتبر بھیجے۔ وہ بھی

سمجھ گیا۔ اور قاسم موشکی خان خاناں کے گماشتے کو علاقہ سپرد کر کے خدمت میں
حاضر ہؤا۔ افغانوں کا لشکر جو قبضہ کرنے آیا تھا۔ ناکام پھر گیا +

سلیمان کا وزیر لودھی تھا۔ کہ دریائے سون تک، وکیل مطلق کے اختیار
سے کام کرتا تھا۔ اس نے جب اکبری فتوحات پے در پے دیکھیں۔ بعد خانخاناں
کو سلیم الطبع صلح جو سنجیدہ مزاج پایا تو دوستی کے رنگ جمائے تاکہ ملکِ سلیمان
آسیب میں نہ آئے۔ چنانچہ نامہ و پیام اور دوستی کی بنیاد اور تحفے تحائف اُن پر
عمارتیں چننے لگے +

چتوڑ کے محاصرہ نے طول کھینچا۔ سُرنگوں کے اُڑنے میں فوج بادشاہی بہت
برباد ہوئی۔ سلیمان کے خیالات بدلے۔ یہ خبریں سُنکر اپنے آصف کے ذریعے سے
منعم خاں کو بُلا بھیجا۔ کہ محبت سے ملاقات کر کے بنیاد اتحاد کو محکم کریں۔ خیر خواہوں نے
احتیاط پر نظر کر کے روکا۔ مگر نیک نیت دلاور بے تکلف چلا گیا۔ ساتھ چند امرا اور
فوج میں کل تین سو آدمی ہوں گے۔ لودی لینے آیا۔ بایزید سلطان کا بڑا بیٹا کئی منزل
پیشوائی کو آیا۔ جب پٹنہ پانچ چھ کوس رہا تو خود استقبال کو آیا۔ بڑے اعزاز و احترام
سے ملا۔ پہلے خان خاناں نے جشن کر کے اُسے بُلایا۔ دوسرے دن اُس نے مہمانی
سلیمانی کر کے انہیں بُلایا۔ بڑے اعزاز و احترام کئے۔ گراں بہا تحفے پیشکش کئے۔ مسجدوں
میں اکبری خطبہ پڑھا گیا۔ سکّے نے سُنہری روپہری لباس پہنا +

سلیمان کے دربار میں دیو سیرت مصاحب بھی تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ
اکبر تو مہم میں مصروف ہے۔ ادھر جو کچھ ہے منعم خاں ہے۔ اسے ماریں تو یہاں سے
وہاں تک ملک خالی ہے۔ لودھی کو بھی خبر ہو گئی۔ وہی اس صلح صفائی کا سفیر تھا۔ اُس نے
سمجھایا کہ ایسا نہ چاہئے۔ مہمان بُلا کر دغا کرو گے تو خاص و عام ہمیں کیا کہیں گے اور
اکبر جیسے با اقبال بادشاہ سے بگاڑنا خلافِ مصلحت ہے۔ یہ خان خاناں نہ ہوگا۔ اور
خان خاناں بنا کر بھیج دیگا۔ ان گنتی کے آدمیوں کو مار کر ہمارے ہاتھ کیا آئیگا۔ اور
ہمارے سر پر خود دشمن قوی موجود ہیں۔ جن کے روکنے کے لئے ہم نے یہ سدِّ سکندر
اُٹھائی ہے۔ اسے آپ گرانا عقل دُور اندیش کے خلاف ہے۔ وہ یہ کہتا تھا مگر افغان
غل مچائے جاتے تھے منعم خاں کو بھی خبر پہنچی۔ اُس نے لودی کو بُلا کر صلاح کی۔ لشکر کو

وہیں چھوڑا۔ اور چند آدمیوں کے ساتھ وہاں سے اُڑ نکلے۔ جب بڑھیا پری شیشے سے نِکل گئی تو دیوزادوں کو خبر ہوئی۔ اپنی بدنیتی پر پچتائے۔ جلسے بیٹھے صلاحیں ہوئیں۔ آخر بایزید اور لودھی جریدہ خان خاناں کے پاس آئے۔ اور اعزاز و احترام کے مراتب طے کر کے چلے گئے۔ خان خاناں گنگا اُتر کر تین منزل آئے تھے جو چتوڑ کا فتحنامہ پہنچا۔ پھر تو ان کا ایک زور دہ چند ہوگیا۔ لیکن ان کی سلامت روی نے سلیمان کو مطمئن کر رکھا تھا۔ وہ اپنے حریفوں کے پیچھے پڑا۔ اور سب کو دغا و جفا سے فنا کر دیا۔ مگر چند ہی روز میں خود لقمۂ فنا ہوگیا +

جبکہ داؤد ملکِ سلیمان پر قابض ہوا۔ اور تخت پر بیٹھا۔ باپ کا ایک خیال دماغ میں نہ رہا۔ تاج شاہی سر پر رکھا۔ بادشاہی کی ہوا میں اُڑنے لگا۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ سکہ جاری کیا۔ اکبر کو عرضی تک نہ لکھی۔ اور جو دربار اکبری کے لئے آئین عمل میں لانے تھے سب بھول گیا۔

اکبر گجرات کو مار کر قلعہ سُورت پر تھے کہ پھر خبریں پہنچیں منعم خاں کو حکم پہنچا کہ داؤد کو درست کرو۔ یا ملکِ بہار فتح کر لو۔ سپہ سالار لشکر جرار لے کر گیا۔ اور داؤد کو ایسا دبایا کہ اُس نے لودھی اُن کے قدیم دوست کو بیچ میں ڈال کر دو لاکھ روپیہ نقد اور بہت سی اشیائے گراں بہا پیشکش گزرانیں۔ یہ جنگ کے نقارے بجاتے گئے تھے۔ صلح کے شادیانے گاتے چلے آئے +

اکبر جب بندر سُورت کا قلعہ فتح کر کے پھرا۔ تو ہمت میں جوانی کا جوش و خروش اقبال کا سمندر طوفان اُٹھا رہا تھا۔ فتوحات موجوں کی طرح ٹکراتی تھیں۔ ٹوڈرمل کو منعم خاں کے پاس بھیجا۔ کہ خود جا کر ملک اور اہل ملک کی حالت دیکھو۔ اور اُن کے ارادوں پر غور کرو۔ منعم خاں سے بھی دریافت کرو کہ اس صورت حال کو دیکھ کر تمہاری کیا رائے ہے۔ وہ گیا اور جلد واپس آیا اور جو حالات معلوم کئے تھے سب بیان کئے۔ یہاں فوراً منعم خاں کے نام آغاز جنگ اور امرا کے لئے روانگی بنگالہ کے فرمان جاری ہوئے +

داؤد کی بدنصیبی سے اُس کے منافق سرداروں کے ساتھ اس قدر جلد بگاڑ ہوا جس کی امید نہ تھی۔ پیچ تو ہمیشہ سے چلتے تھے۔ اب چند ہاتھیوں پر داؤد کو

لودی سے لڑادیا۔ لودی نے ایسے ہی وقتوں کے لئے ادھر راہ نکال رکھی تھی منعم خاں سے مدد مانگی۔ انھوں نے فوراً چند سردار اور ایک فوج معقول روانہ کی۔ چند روز کے بعد اُن کی تحریریں آئیں۔ کہ وہ تو داؤد سے بل گیا۔ اور ہمیں رخصت کر دیا۔ خان خاناں بڑھاپے کے گریبان میں گردن جھکائے سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا اور کرنا کیا چاہیئے۔ ساتھ ہی اُن کے مخبر خبر لائے کہ لودی کو داؤد نے مروا ڈالا۔ یہ ایسے ہی موقع کی تاک میں تھے۔ فوج کشی کرنے میں تھا تو اُسی کا کھٹکا تھا۔ فوراً لشکر لیکر پٹنہ اور حاجی پور آئے۔ اب نوجوان کی آنکھیں کُھلیں۔ اور لودی کی یاد آئی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا +

اسپِ دولت بزیرِ رانِ تو بود		چوں تو کم تاختی کسے چہ کند
مہرۂ عیش بر مرادِ تو بود		لیک بد یافتی کسے چہ کند

فصیل اور قلعۂ پٹنہ کی مرمّت شروع کردی۔ یہاں غلطی یہ کھائی۔ کہ تلوار میان سے نہیں نکلی۔ گولی بندوق میں نہیں پڑی۔ اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ خانخاناں نے محاصرہ ڈالا۔ اور بادشاہ کو عرضی کی کہ اس ملک میں لڑائی بے سامانِ دریائی کے نہیں ہوسکتی۔ ادھر سے جھٹ جنگی کشتیاں۔ جنگِ دریائی کے سامان اور رسدِ فراواں سے بھر کر روانہ ہوئیں۔ بڈھا سپہ سالار خود بھی مدّت سے تیاری کر رہا تھا۔ اور اِدھر اُدھر فوجیں دوڑائیں۔ مگر نہایت احتیاط سے کام کرتا تھا۔ جہاں کچھ بھی خطر دیکھتا تھا۔ جرأت نہ کرتا تھا۔ فوراً پہلو بچا جاتا تھا۔ روپیہ کی بھی کفایت کرتا تھا۔ ہاں سامانِ جنگ اور رسد وغیرہ کی ضرورت دیکھتا تو لاکھوں لٹاتا تھا۔ چنانچہ گوکھپور فتح کیا۔ افغانوں کا یہ حال تھا۔ کہ ایک جگہ سے پریشان ہو کر بھاگتے تھے۔ دوسری جگہ اُس سے زیادہ جمعیت اور استقلال کے ساتھ جم جاتے تھے۔ وہ سرداروں کو فوج دیکر مقابلے پر بھیجتا تھا۔ اور وقت پر خود بھی پہنچتا تھا۔ مگر ساتھ ملا لینے کی تاک میں رہتا تھا +

پٹنہ کے محاصرہ نے طول کھینچا۔ خان خاناں نے عرضی کی۔ کہ اگرچہ لڑائی جاری ہے اور جاں نثار حقِ نمک ادا کر رہے ہیں مگر برسات نزدیک ہے۔ جتنا جلد فیصلہ ہو اتنا ہی مناسب ہے۔ اور جب تک حضور نہ آئیں یہ آرزو نہ بر آئیگی۔ بادشاہ نے

اسی وقت ٹوڈرمل کو روانہ کیا۔ اور مہمات اطراف کا بندوبست کر کے حکم دیا کہ لشکر تیار ہو۔ اور اس سفر کی مسافت دریا میں طے ہو۔ لشکر آگرہ سے خشکی کے رستے روانہ ہوا۔ اور آپ معہ بیگمات اور شہزادہائے کامگار اور امرائے باوقار کشتیوں پر سوار ہوئے۔ بادشاہ جوان اقبال جوان ارکان دولت جوان ابوالفضل فیضی ملّا صاحب انہی دنوں دربار میں پہنچے تھے فتح و اقبال اشارے کے منتظر۔ عجب شان و شکوہ سے چلے۔ دریا میں عیش کا دریا بہلجاتا تھا۔ اس سواری کا تماشا دیکھنا ہو تو ملّا صاحب کے حال میں دیکھو۔ کہ اکبر بلکہ خاندان چغتائی میں کسی کو ایسا موقع نصیب نہ ہوا ہوگا +

منعم خاں ہر طرف تدبیر کے گھوڑے دوڑاتے تھے اور افغانوں کو ملاتے تھے۔ جو قابو میں نہ آتے تھے انہیں دباتے تھے۔ اُن کے لشکر کو بڑی مصیبت پڑتی۔ مگر حسین خاں پنی جو اُدھر سے آکر ملا تھا۔ اس سے یہ نکتہ ہاتھ آیا۔ کہ برسات میں دریا بہت چڑھیگا۔ اس لئے پن پن کا بند توڑ دینا چاہئے۔ کہ پانی گنگا میں جا گرے۔ یہ بند اُستاد نے اسی غرض سے باندھا تھا۔ کہ پانی قلعے کے گرد آجائے۔ غنیم آئے تو یہاں ٹھیر نہ سکے۔ پٹنہ میں حاجی پور سے رسد برابر پہنچ رہی تھی۔ چاہا کہ پہلے حاجی پور کو فتح کر لیں۔ مگر فوج ایسی وافر نہ تھی۔ اس لئے ارادہ رہ گیا +

داؤد نے بھی بند کی حفاظت کے لئے بڑی احتیاط سے فوج رکھی تھی۔ مگر مجنوں خاں رات کی سیاہ چادر اوڑھ کر اس پھرتی سے کام کر آیا کہ نیند کے مستوں کو خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ شرم کے مارے ایسے بھاگے کہ داؤد کے پاس تک نہ جا سکے۔ آوارہ و سرگرداں گھوڑا گھاٹ پہنچے +

بادشاہ منزل بمنزل خشکی و تری کی سیر کرتے۔ شکار کھیلتے چلے جاتے تھے ایک دن داس پور کنار گنگا پر منزل تھی۔ کہ اعتماد خاں خواجہ سرا لشکر گاہ سے پہنچا۔ لڑائی کا حال عرض کیا۔ اور اس کے بیان سے غنیم کا نہایت زور ہوا۔ میر عبدالکریم اصفہانی کو بلا کر سوال کیا۔ اُنہوں نے حساب کر کے کہا ؎

برو ملک از کفِ داؤد بیروں	بزودی اکبر از بخت ہمایوں

بلکہ جب بادشاہ فتح پور سے آگرہ میں آکر سامان روانگی کر رہے تھے۔ اُسی وقت میر نے یہ حکم لگایا تھا ؎

گرچہ باشد لشکرت جرّار بے حد و شمار	لیک باشد فتح و نصرت در قدوم شہر یار

شیو پور پر ٹوڈر مل بھی حاضر ہوئے۔ اور ہر مورچے کا حال مفصل بیان کیا۔ منعم خاں کی طرف سے حضوری کے باب میں عرض کی۔ فرمایا دو کوس سے زیادہ استقبال نہ کریں۔ کہ محاصرے کا مدار انہی پر ہے۔ سب امرا اپنے اپنے مورچے پر قائم رہیں۔ ٹوڈر مل رات ہی رات رخصت ہوئے۔ یہ سفر دو مہینے دس دن میں ختم ہوا۔ کوئی نقصان ایسا نہیں ہوا۔ کہ قابل تحریر ہو۔ البتہ چند کشتیاں طوفان گرداب میں آکر بتاسہ کی طرح بیٹھ گئیں۔ جب بادشاہ چھاؤنی کے سامنے پہنچے۔ تو خان خاناں نے بہت سی کشتیاں اور نواڑے سامانِ آرائش کے ساتھ جنگی آتش بازی سے سجائیں خود استقبال کو چلا۔ توپ خانوں پر گولہ انداز قواعد اور نظام کے ساتھ بیٹھے۔ رنگ رنگ کی بیرقیں لہراتی بڑی شکوہ و شان سے آیا۔ اور رکاب کو بوسہ دیا۔ حکم ہوا تمام توپوں کو مہتاب دکھادو۔ توپ خانوں نے بھی اس زناٹے سے سلامی اُتاری کہ زمین میں بھونچال آگیا۔ اور کوسوں تک دریا دھواں دھار ہو گیا۔ نقاروں کا غُل۔ دماموں کی گرج۔ کرنا کی کڑک۔ قلعے والے حیران ہو کر دیکھنے لگے کہ قیامت آگئی۔ چھاؤنی پنج پہاڑی پر تھی۔ کہ دریا سے اس طرف ہے۔ بادشاہ منعم خاں ہی کے ڈیروں میں آئے۔ اُس نے بڑی طمطراق سے آرائش کی تھی۔ سونے کے طبق جواہر اور موتیوں سے بھر کر کھڑا ہوا۔ لپ بھر بھر کر نچھاور کرتا تھا۔ اور کہتا تھا ؎

کلاہ گوشۂ دہقان بہ آسمان رسید	کہ سایہ بر سرش انگند چوں تو سلطانے

نفیس تحائف۔ گراں بہا جواہر نذر گزرانے۔ کہ حد و حساب سے باہر تھے۔ پرانے پرانے امیر۔ خدمت گار۔ بابری نئے نئے نوجوان جاں نثار اکبری کہ مہینوں ہوئے خدمت سے محروم تھے۔ سینوں میں جوشِ وفا۔ دلوں میں شوق۔ مُنہ میں دُعا۔ بچوں کی طرح دوڑے آئے۔ جُھک جُھک کر سلام کرتے تھے۔ اور دل شوقِ بندگی کے مارے قدموں میں لوٹے جاتے تھے ؎

کیا تڑپنا دلِ مضطر کا بھلا لگتا ہے	جب اُچھلتا ہے ترے سینے سے جا لگتا ہے

اکبر ایک ایک کو دیکھتا تھا۔ نام لے لے کر حال پوچھتا تھا۔ اور نگاہیں کہتی تھیں۔ کہ دل میں وہی محبت لہراتی ہے جو ماں کے سینے سے دودھ بن کر پیارے بچوں کے منہ میں ٹپکتی ہے۔ غرض سب اپنے اپنے خیموں اور مورچوں کو رخصت ہوئے

دوسرے دن خود بادشاہ سوار ہوئے۔ اور مورچوں پر پھر کر قلعے کا ڈھنگ اور لڑائی کا رنگ دیکھا یہی صلاح ہوئی۔ کہ پہلے حاجی پور کا فیصلہ کیا جائے۔ پھر پٹنہ کا فتح کر لینا آسان ہے۔ چنانچہ خانِ عالم کو چند سرداروں کے ساتھ تعینات کیا۔ خان خاناں نے ایک ایلچی داؤد کے پاس بھیجا تھا۔ اور بہت سی نصیحتیں وصیتیں کہلا بھیجی تھیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ خان فرزند ابھی تک اختیار تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اپنی صورتِ حال کو دیکھو۔ اکبری اقبال کو سمجھو۔ اتنی جانیں برباد ہوئیں بہتر ہے کہ اور خون نہ ہوں۔ مال و ناموس خلائق پر رحم کرو۔ جوانی اور سرخوشی کی بھی حد ہوتی ہے۔ بہت کچھ ہو چکا۔ اب بس کرو کہ عالم کی تباہی حد سے گزر چکی ہے اس دولتِ خداداد کے دامن سے اپنی گردنیں کیوں نہیں باندھ دیتے کہ سب مصلحتیں پوری ہو جائیں۔ لڑکا سُرتا تھا۔ اُس نے بہت سوچ سوچ کر ایلچی کو رخصت کیا۔ اور اپنا معتبر ساتھ کیا۔ چنانچہ وہ بھی اسی دن حاضر حضور ہؤا۔ خلاصہ جواب یہ کہ حاشا و کلا سرداری کا بار اپنے سر پر لینے کی خوشی نہیں۔ مجھے لودی نے اس بلا میں ڈالا۔ ادھر وہ اس کی سزا کو پہنچا۔ اب عقیدت بادشاہی میرے دل پر چھا گئی ہے جتنی جگہ جس جگہ ملے قناعت اور سرمایہ سعادت ہے۔ خوردسالی اور مستی جوانی میں یہ حرکت ہو گئی۔ کہ مُنہ نہیں دکھا سکتا۔ اور جب تک کوئی خاطر خواہ خدمت کر کے سرخرو نہ ہوں۔ حاضر نہیں ہؤا جاتا ✦

بادشاہ سمجھ گئے۔ کہ لڑکا چالاک ہے اور نیت درست نہیں۔ ایلچی سے کہا کہ اگر داؤد صدق دل سے عقیدت رکھتا ہے تو ابھی چلا آئے۔ یہاں انتقام کا کبھی خیال نہیں ہؤا۔ اگر نہیں آتا تو تین صورتیں ہیں (۱) یا تو وہ اُدھر سے آئے۔ ہم ادھر سے آتے ہیں۔ ایک اُدھر کا سردار اِدھر آ جائے۔ اور ایک اِدھر کا اُدھر جائے۔ دونوں لشکروں کو روکے رہیں کہ کوئی اور دلاور باہر نہ جانے پائے۔ ہم دونوں بخت آزمائی کے میدان میں کھڑے ہوں۔ اور جس حربہ سے وہ کہے قسمت کے ہاتھوں سے

لڑائی کا فیصلہ کر لیں۔ (۲) یہ نہیں تو ایک سردار جس کی قوت اور دلاوری پر اُسے پورا بھروسا ہو۔ اُدھر سے۔ اور ایک ادھر سے نکلے۔ جو فتح پائے اُس کے لشکر کی فتح۔ (۳) اگر اس فوج میں ایسا کوئی نہ ہو۔ تو ایک ہاتھی ادھر کا لو اور ایک اُدھر کا لو۔ اور لڑا دو۔ جس کا ہاتھی جیتے اُس کی فتح۔ وہ ایک بات پر بھی راضی نہ ہوا۔ بادشاہ نے ۳ ہزار سوار جرّار عین طوفان آب میں کشتیوں پر سوار کئے۔ قلعہ گیری کے اسباب زنبورک رہکلے۔ بان۔ جزائل۔ توپ تفنگ۔ عجیب و غریب حربے اور بہت سا میگزین دیا۔ اور یہ سب سامان اس دھوم دھام اور آرائش و نمائش سے روم و فرنگ کے باجوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ کہ کان گونجتے تھے اور دل سینوں میں جوش مارتے تھے۔ بادشاہ خود پہاڑی پر چڑھ گئے۔ اور دُوربین لگائی۔ میدان جنگ گرم تھا۔ اکبری بہادر قلعہ شکن حملے کر رہے تھے۔ اور قلعہ والے جواب دے رہے تھے۔ قلعے کی توپوں کے گولے اس زور سے آتے تھے کہ تین کوس پر سراپردہ تھا۔ بیچ میں دریا بہتا تھا۔ اور وہ سروں پر سے جاتے تھے۔ جاں نثاروں نے سُن لیا تھا کہ جوہرشناس ہمارا چشم دُوربین سے دیکھ رہا ہے۔ اس طرح جان توڑ کر دھاوے کرتے تھے کہ بس ہو۔ تو گولا بنیں اور قلعے میں جا پڑیں۔ یہاں سے لشکروں کے ریلے دکھائی دیتے تھے۔ آدمی نہ پہچانے جاتے تھے۔ بات یہ تھی کہ چڑھاؤ کے مقابل سے پانی کا سینہ توڑ کر کشتیوں کو لے جانا سخت محنت اور دیر چاہتا تھا۔ مگر پرانے پرانے ملاحوں نے خان عالم کی رہنمائی کی۔ بڑے بڑے دلاور سردار۔ سورما سپاہی چُن کر کشتیوں پر سوار کئے۔ کچھ دن باقی تھا۔ کہ ملاحوں نے چڑھاؤ کے سینے پر کشتیوں کو چڑھانا شروع کیا۔ پانی کی چادر اوڑھ لی اور منہ پر دریا کا پاٹ لپیٹا۔ راتوں رات ایک ایسی نہر میں لے گئے کہ عین حاجی پور کے نیچے آکر گرتی تھی۔ پچھلی رات باقی تھی کہ بیڑا یہاں سے چھوٹا۔ صبح ہوتے جس غُل سے قلعہ والے اُٹھے وہ شور قیامت تھا۔ سب گرداب حیرت میں ڈوب گئے کہ اتنی فوج کدھر سے آئی اور کیونکر آئی۔ اُنھوں نے بھی گھبرا کر کشتیاں تیار کیں۔ اور مقابلے پر پہنچے کہ طوفان کو آگے نہ بڑھنے دیں۔ پہلے توپوں اور بندوقوں نے پانی پر آگ برسائی۔ لڑائی بہت زور پر تھی۔ اور فی الحقیقت اس سے زیادہ جان لڑانے کا وقت کونسا ہوگا۔

عصر کا وقت تھا کہ اکبری شفقت کا دریا چڑھاؤ پر آیا۔ بہت سے بہادر انتخاب کئے۔ کہ کشتیوں پر سوار ہو کر جائیں۔ اور میدان جنگ کی خبر لائیں۔ قلعہ والوں نے دیکھ کر اوپر سے گولے برسانے شروع کئے۔ اور اٹھارہ کشتیاں ان کے روکنے کو بھیج دیں۔ بیچ منجدھار میں ٹکر ہوئی۔ دیکھ گئے تھے۔ کہ بادشاہ ہمارا دیکھ رہا ہے۔ دریا کے دھوئیں اڑاتے اور آگ برساتے پانی پر سے ہوا کی طرح گذر گئے۔ حریف دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر بھی چڑھاؤ کی چھاتی توڑ کر جانا کچھ آسان نہ تھا اور کمک کو غنیم نے دریا میں روک رکھا تھا۔ دور ہی سے مقام جنگ پر گولے مارنے شروع کئے۔ ان کے گولوں نے غنیم کی ہمت کا لنگر توڑ دیا۔ اور کشتیاں ہٹانی شروع کیں۔ اب کمک کے ملاح پہلو کاٹ کر چلے۔ اگرچہ قلعے سے گولے پڑنے شروع ہوئے۔ مگر یہ بھاگا بھاگ ایک موقع کے گھاٹ پر جا پہنچے اور وہاں سے کشتیوں کو چھوڑا۔ کہ تیر کی طرح سیدھی معرکۂ جنگ پر آئیں۔ بادشاہی فوج کناروں پر اتری ہوئی تھی۔ اور سینہ بہ سینہ لڑائی ہو رہی تھی۔ افغانی سرداروں نے کوچہ بندی کر کے بھی لڑائی ڈالی۔ مگر تقدیر سے کون لڑ سکے۔ خلاصہ یہ کہ حاجی پور فتح ہو گیا اور بادشاہی فوج قلعے پر قابض ہو گئی۔

اس فتح سے داؤد کا لوہا ٹھنڈا ہو گیا۔ باوجودیکہ بیس ہزار سوار جرار اور جنگی ہاتھی مست بے شمار اور توپ خانہ آتش بار ساتھ تھا۔ رات ہی کو کشتی میں بیٹھا اور پٹنہ سے نکل کر لوگر کو بھاگ گیا۔ سری ہر بنگالی جس کی صلاح سے لودھی کو مار کر بکر ماجیت خطاب دیا تھا۔ اس نے کشتیوں میں خزانہ ڈالا اور پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ گوجر خاں کررانی جس کا رکن الدولہ خطاب تھا۔ جو کچھ اٹھا سکا اٹھایا۔ وہ ہاتھیوں کو آگے ڈال کر خشکی کے رستے بھاگ گیا۔ ہزاروں آدمی کی بھیڑ دریا میں کود کود پڑی۔ اور طوفان اجل کے ایک جھکولے میں ادھر سے ادھر پہنچی۔ ہزار در ہزار آدمی گھبرا گھبرا کر برجوں اور فصیلوں پر چڑھ گئے۔ اور وہاں سے کود کر گہری خندق کا بھراؤ ہو گئے۔ بہتیرے کوچہ و بازار میں ہاتھی گھوڑوں کے نیچے پامال ہو گئے۔ دریائے طیران جب دریائے پن پن پر پہنچے تو گوجر خاں نے ہاتھیوں کو آگے ڈالا اور پل سے اتر گیا۔ بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ پل بھی بوجھ نہ اٹھا سکا۔

آخر ٹوٹ گیا۔ بہتیرے نامی گرامی افغان تھے۔ کہ اسباب اور ہتھیار پھینک کر ننگے پانی میں گرے اور گردابِ اجل میں چکر مار کر بیٹھ گئے۔ سر تک نہ نکالا۔ پچھلا پہر تھا کہ خان خاناں نے آکر خبر دی۔ بہادر بادشاہ اُسی وقت تلوار پکڑ کر اُٹھ کھڑا ہؤا۔ خان خاناں نے عرض کی۔ کہ صبح کو حضورِ اقبال کا قدم شہر میں رکھیں۔ کہ خبر بھی تحقیق ہو جائے اور اختیار کی باگ بھی ہاتھ میں رہے۔ اکبر شعاعِ آفتاب کے ساتھ دہلی دروازے کے رستے پٹنہ میں داخل ہؤا۔ اور نظرِ عبرت سے داؤد کے محلوں کو دیکھا تاریخ ہوئی۔ فتح بلادِ پٹنہ۔ مگر دوسرا نگینہ نگیں سلیمان ہے۔ ع

	کہ ملکِ سلیمان ز داؤد رفت	

خلوت کے چمن میں حکم ہؤا۔ مشورت کی بُلبلیں آئیں۔ کہ بنگالہ کے لئے کیا صلاح ہے۔ بعض کا زمزمہ ہؤا کہ برسات میں ملکِ مقبوضہ کا بندوبست ہو۔ جاڑے کی آمد میں بنگالہ پر خونریزی سے گلزار کا خاکہ ڈالا جائے۔ بعض نے نغمہ سرائی کی کہ غنیم کو دم نہ لینے دو۔ اڑ جائیں اور چھُری کٹاری ہو جائیں۔ کہ یہی بہار ہے۔ فتح کے گلچین اور سلطنت کے باغبان نے کہا کہ ہاں یہی ہانک سچی ہے۔ ساتھ ہی خانخاناں نے التجا کی۔ اس واسطے اُسی کو مہم سپرد ہوئی۔ چنانچہ دس[1] ہزار لشکر خونخوار۔ امرا۔ بیگ اور بیلچے۔ سب کمک کے لئے ساتھ دیئے۔ اور سپہ سالاری منعم خاں کے نام پر قرار پائی۔ نواڑے۔ کشتیاں اور آتش خانے جو ساتھ آئے تھے سب عطا ہوئے۔ بہار کا ملک اس کی جاگیر ہؤا۔ بعد اس کے جاں نثاروں اور وفاداروں کو جاگیریں اور انعام خلعت و خطاب۔ ہر ایک کی خدمت درجے کے لائق دے کر آپ دریا کے رستے آئے تھے۔ اُسی رستے شادیانے بجاتے فتح کے بادبان اُڑاتے خوشی کی لہریں بہاتے دارالخلافہ کو روانہ ہوئے ✤

سالہا سال سے وہ ملک افغانستان ہو رہا تھا۔ داؤد سراسیمہ ہو کر بنگالہ کے رُخ بھاگا۔ خان خاناں اور ٹوڈرمل چھاؤنی ڈال کر ٹانڈہ میں بیٹھے۔ ٹانڈہ گور کے مقابل میں گنگا کے داہنے کنارے پر ہے۔ اور بنگالہ کا مرکز ہے اِدھر اُدھر سرداروں کو پھیلا دیا۔ وہ جا بجا لڑتے تھے۔ افغان شکستیں کھاتے تھے مضبوط اور مستحکم مقاموں کو

---

[1] مآثرالامرا میں، ۲۰ ہزار لشکر ہے ✤

چھوڑتے تھے اور جنگلوں میں گھس جاتے تھے۔ پہاڑوں پر چڑھ جاتے تھے ایک جگہ سے بھاگ جاتے تھے۔ دوسری جگہ جم جاتے تھے۔ کہیں بھاگتے تھے۔ کہیں بھگاتے تھے۔ چنانچہ اوّل سورج گڑھ فتح ہوا۔ پھر منگیر مارا۔ ساتھ ہی بھاگل پور اور پھر کھل گاؤں لیا۔ گڑھی باوجود قدرتی استحکام کے بے جنگ ہاتھ آئی۔ وہ ملکِ بنگالہ کا دروازہ ہے۔ اُس کے ایک پہلو کو پہاڑ نے دوسرے کو پانی نے مضبوط کیا ہے۔ اُنہوں نے دو طرف سے دبا کر ایسا تنگ کیا کہ بے جنگ ہاتھ آگیا۔ خان خاناں کی جاگیر پہلے بہار میں تھی اب بنگالہ میں کر دی۔ اُس نے خواجہ شاہ منصور اپنے دیوان کو وہاں بھیج دیا۔ خبر آئی کہ داؤد ٹانڈہ پہنچا ہے۔ وہاں بیٹھیگا۔ اور ادھر کے مقامات کا استحکام کر رہا ہے۔ محمد قلی خاں برلاس کو پرانا اور کہنہ عمل سپاہی تھا فوج دے کر ادھر روانہ کیا۔ اور آپ ٹانڈہ میں بیٹھ کر ملک کے بندوبست میں مصروف ہوا کہ مرکز ملک کا تھا ✦

افغانوں کو جو خرابی نصیب ہوئی فقط آپس کی پھوٹ سے ہوئی۔ لودی کو داؤد نے مروا ڈالا تھا۔ اور گوجر سے بگاڑ تھا۔ ایک موقع ایسا پڑا کہ اتفاق کے فائدے کو دونوں نے سمجھا۔ اور آپس میں صفائی ہو گئی۔ صلاح یہ ٹھیری کہ دونوں مل جائیں۔ اور فوجیں ملا کر لشکر شاہی سے مقابلہ کریں۔ شاید نصیبہ یاوری کرے داؤد نے کٹک بنارس کو مضبوط کر کے اہل و عیال کو وہاں چھوڑا۔ اور دونوں سردار لشکر خونخوار درست کر کے مقابلہ کو چلے ✦

خان خاناں سُنتے ہی ٹانڈہ سے روانہ ہوا۔ اور ٹوڈرمل کے لشکر کے ساتھ شامل ہو کر کٹک بنارس کا رُخ کیا۔ رستے میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ افغانوں کو شیر شاہ کا پڑھایا ہوا سبق یاد تھا۔ لشکر کے گرد خندق کھود کر قلعہ باندھ لیا۔ اس طرح کئی دن تک لڑائی جاری رہی۔ طرفین کے بہادر نکلتے تھے۔ افغان ہمّت مردانہ کرتے تھے۔ تُرک تُرکتاز دکھاتے تھے۔ لڑائی کی انتہا نظر نہ آتی تھی۔ دونوں حریف تنگ ہو گئے۔ ایک دن میدان میں صفیں جما کر فیصلہ کے لئے آمادہ ہوئے۔ ہاتھی بنگالہ کی ہری گھاسیں کھا کر افغانوں سے سوا مست ہو رہے تھے۔ پہلے وہی بڑھے۔ خان خاناں بھی اکبری امرا کو دائیں بائیں اور پس و پیش جمائے بیچ میں

آپ کھڑا تھا۔ لیکن ستارہ اُس دن سامنے تھا۔ اور اُنہیں پہلے ستارہ آنکھیں دکھا چکا تھا۔ اس لئے لڑائی کا ارادہ نہ تھا حکم دیا کہ آج حریف کے حملے کو دُور دُور سے سنبھالو۔ ہاتھیوں کو توپوں اور زنبوروں سے روکو۔ آگ کی مار۔ خدا کی پناہ حریف کے کئی نامی ہاتھی آگے بڑھے تھے۔ اُلٹے ہی پھر گئے۔ اور اکثر اُڑ گئے۔ بہت سے نامور افغان اُن پر سوار ہو گئے۔ گوجر خاں داؤد کی فوج پیش قدم کا سردار تھا۔ وہ حملہ کر کے ہراول پر آیا۔ خان عالم سردار ہراول نوجوان سردار تھا۔ اُس کی جرأت دیکھ کر نہ رہ سکا۔ اور حملہ کیا۔ لیکن دلاوری کے جوش میں بہت تیزی کر گیا اُس کی فوج بندوقیں خالی کرتی چلی جاتی تھی۔ خان خاناں روک تھام کے انتظام میں تھے یہ حال دیکھ کر آدمی بھیجا کہ فوج کو روکو۔ یہاں اُس کے دلاور غنیم پر جا پڑے تھے بڈھے سپہ سالار نے جھنجھلا کر پھر سوار دوڑایا اور بتاکید کہلا بھیجا کہ کیا لڑکپن کرتے ہو۔ جلد فوج کو پھیر لاؤ۔ وہاں لڑائی دست و گریبان ہو گئی تھی۔ اور صورت یہ تھی کہ گوجر خاں نے بہت سے ہاتھیوں کو سامنے رکھ کر حملہ کیا تھا۔ سراگائے کی دُمیں۔ چیتوں۔ شیروں اور پہاڑی بکروں کی کھالیں جن کے چہروں پر سینگ اور دانت تک بھی موجود تھے۔ ہاتھیوں کے چہروں پر چڑھائے تھے۔ ترکوں کے گھوڑوں نے نہ یہ صورتیں دیکھی تھیں۔ نہ یہ بھیانک آوازیں سُنی تھیں۔ بدک بدک کر بھاگے اور کسی طرح نہ تھم سکے۔ فوج ہراول ہٹ کر اور سمٹ کر مقدمۃ لشکر میں جا گھسی۔ سردار ہراول (خاں عالم) ثابت قدمی سے کھڑا رہا۔ مگر ایسا گرا۔ کہ قیامت ہی کو اُٹھیگا۔ کیونکہ حریف کا ہاتھی آیا اور اُسے پامال کر گیا۔ افغانوں نے خوشی کا شور و فغاں کیا۔ اور گوجر خاں نے اُنہیں لے کر اس زور سے حملہ کیا کہ سامنے کی فوج کو رولتا ہوا قلب میں جا پڑا +

یہاں خود خان خاناں امرائے عالیشان کو لئے کھڑا تھا۔ بڈھوں نے جوانوں کو بہت سنبھالا۔ مگر سنبھلے کون؟ گوجر مارا مار بگٹوٹ چلا آتا تھا۔ سیدھا آیا۔ اور اتفاق یہ کہ خان خاناں ہی سے مٹ بھیڑ ہو گئی۔ بے وفا پلاؤ خور بھاگ گئے۔ اور گوجر خاں نے برابر آکر کئی ہاتھ تلوار کے مارے۔ یہاں خان خاناں کمر میں دیکھتے ہیں تو تلوار بھی نہیں۔ غلام جو تلوار لئے رہتا تھا۔ خدا جانے کہاں کا کہاں جا پڑا۔

کوڑا ہاتھ میں تھا۔ وہ تلواریں مارتا تھا۔ یہ کوڑے سے پیش آتے تھے۔ سر و گردن اور بازو پر بھی زخم کھائے۔ اور زخم بھی کاری کھائے۔ اچھے ہونے پر بھی کہا کرتا تھا۔ کہ سر کا زخم اچھا ہو گیا ہے مگر بینائی بگڑ گئی۔ گردن کا گھاؤ بھر گیا ہے مگر مڑکر نہیں دیکھ سکتا۔ کندھے کے زخم نے ہاتھ نکما کر دیا۔ اچھی طرح سر تک نہیں جا سکتا۔ باوجود اس کے پھرنے کا خیال تک نہ تھا۔ کئی امرا رفاقت میں تھے وہ بھی زخمی ہو گئے۔ اس عرصے میں حریف کے ہاتھی بھی آ پہنچے۔ اور خان خاناں کا گھوڑا ہاتھیوں سے بدکنے لگا۔ روکا مگر بے قابو ہو گیا۔ آخر ٹھوکر بھی کھائی۔ کچھ نمک حلال نوکروں نے باگ پکڑ کر کھینچی کہ ٹھیرنے کا موقع نہیں۔ اس بچارہ کو فکر یہ کہ میں سپہ سالار ہو کر بھاگونگا۔ تو سفید ڈاڑھی لے کر کسے منہ دکھاؤں گا۔ خیر اُس وقت اُنکی دردخواہی غنیمت ہوئی۔ اس طرح بھاگے گویا فوج والوں کو فراہم کرنے گئے ہیں۔ گھوڑا دوڑا ئے تین چار کوس بھاگے گئے۔ اور افغان بھی اُردوے بادشاہی تک دبائے چلے آئے۔ تمام خیمے اور سارا بازار لُٹ گیا۔ مگر بادشاہی سردار کہ بھاگ کر چاروں طرف کھنڈ گئے تھے۔ کچھ دُور جا کر ہوش میں آئے۔ پھر پلٹے اور افغان جو مارا مار چیونٹیوں کی قطار چلے جاتے تھے۔ اُن کے دونوں طرف لپٹ گئے۔ برابر تیروں سے چھیدتے چلے جاتے تھے۔ اور اس لمبے تانتے کی گنڈیریاں کترتے جاتے تھے۔ نوبت یہ ہوئی کہ اپنے بیگانے کسی میں سکت نہ رہی۔ اور افغان خود تھک کر رہ گئے۔ گوجر پٹھانوں کو ہلکارتا اور للکارتا تھا کہ مارلو مارلو۔ خانجہاں تو مار لیا ہے اب تردد کیا ہے۔ باوجود اس کے مصاحب جو برابر میں تھے۔ اُن سے کہتا تھا کہ فتح ہو گئی مگر دل کا کنول نہیں کھلتا تھا۔ کہ اتنے میں اسے مدد غیبی کہو یا اکبری اقبال سمجھو کہ کسی کمان سے ایک تیر چلا جو گوجر خاں کی جان کے لئے قضا کا تیر تھا۔ اُس نے فتحیاب بہادر کو گھوڑے سے گرا دیا۔ ساتھیوں نے سر پر سردار نہ دیکھا تو بے سرو پا بھاگے۔ یا تو افغان مارا مار چلے جاتے تھے یا خود مرنے لگے۔ اُس اُلٹ پلٹ میں خان خاناں کو ذراسی فرصت نصیب ہوئی تو ٹھیر کر سوچنے لگا کہ کچھ کرنا چاہیئے۔ اور کیا کرنا چاہیئے؟ اتنے میں اُس کا نشانچی بھی نشان لئے آن پہنچا۔ ساتھ ہی غل ہوا کہ گوجر خاں مارا گیا۔ خان خاناں نے گھوڑا پھیرا۔ اور ادھر اُدھر جو دلاور تھے وہ

بھی اکٹھے ہو گئے۔ جو افغان تیر کے پلّے پر نظر آیا اُسے پرونا شروع کیا +

قلب جو گزری سو گزری۔ مگر لشکر بادشاہی میں ٹوڈرمل اپنے لشکر کو لئے دائیں پر کھڑے تھے۔ اور شاہم خاں جلائر بائیں پر۔ یہاں خان عالم کے ساتھ خان خاناں کے مرنے کی بھی اُڑ گئی تھی۔ لشکر کے دل اُڑے جاتے تھے۔ اور یہ رنگ جمائے جاتے تھے۔ ادھر گوجر کی کامیابی دیکھ کر داؤد کا دل بڑھ گیا۔ اور فوج کو جنبش دی۔ تاکہ دائیں سے دھکّا دے کر گوجر سے جا ملے۔ راجہ اور شاہم نے جب یہ طور دیکھا تو اس طرح کھڑے ہونا اپنا بھی مناسب نہ دیکھا۔ گھوڑے اُٹھائے اور توکل بخدا افغانوں کے دائیں بائیں پر جا گرے۔ جس وقت ٹوڈرمل اور داؤد میں لڑائی ترازو ہو رہی تھی۔ سادات بارہہ کے سردار حریف کے دائیں بازو پر ٹوٹ پڑے اور اسے برباد کر کے اپنے دائیں کی مدد کو پہنچے۔ یہ حملہ اس زور کا ہوا۔ کہ غنیم کے دونوں بازوؤں کو توڑ کر قلب میں پھینک دیا۔ جہاں داؤد سپہ سالاری کا چتر چمکا رہا تھا۔ اُس کے جنگی اور نامی ہاتھی صف باندھے کھڑے تھے۔ اُنہیں ترکوں نے تیروں سے چھلنی کر دیا۔ اور اُس کی جمعیت میں ہل چل پڑ گئی۔ اتنے میں نقارہ کی آواز آئی۔ اور خان خاناں کا علم کہ فتح کا نمودار نمونہ تھا۔ دُور سے آشکارا ہوا۔ امرا اور افواج شاہی کے گئے ہوئے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ داؤد کو جب خبر پہنچی کہ گوجر خان مارا گیا ہے۔ رہے سہے حواس بھی اُڑ گئے اور لشکر کے قدم اُٹھ گئے۔ تمام اسباب اور سامان اور بڑے بڑے دل بادل ہاتھی برباد کر کے سیدھا کٹک بنارس کو بھاگ گیا +

خان خاناں نے خدا کی درگاہ میں شکر کے سجدے کئے کہ بگڑی بات کا بنانے والا وہی ہے۔ ٹوڈرمل کو کئی سرداروں کے ساتھ اس کے پیچھے روانہ کیا اور خود اُسی منزل میں مقام کر کے زخمیوں کے اور اپنے علاج میں مصروف ہوا۔ ہزاروں افغان تتّر بتّر ہو گئے۔ سرداروں کو پھیلا دیا۔ اور تاکید کی۔ کہ ایک کو جانے نہ دیں۔ میدان جنگ میں ان کے سروں سے ۸ کلہ مینار بلند کئے کہ فتح کی خبر آسمان تک پہنچائیں +

داؤد کٹک[1] بنارس میں پہنچ کر قلعے کے استحکام میں مصروف ہوا مفسد

[1] مآثر الامرا میں کٹک اڑیسہ لکھا ہے +

پھر فراہم ہو کر اُس کے ساتھ ہو گئے۔ یہ بھی گفتگو ہوئی۔ کہ جو شکست پڑی۔ بعض بے احتیاطیوں سے پڑی ہے۔ اب کے بند و بست سے کام کرنا چاہئے۔ اُس نے دل میں ٹھان لی۔ کہ مر جانا ہے۔ یہاں سے بھاگنا نہیں۔ لیکن خان خاناں کو گھر میں مہم پیش آئی۔ اوّل تو مدت سے بادشاہی لشکر سفر میں خانہ بہ باد پھرتا تھا۔ دوسرے بنگالہ کی بیماری اور مرطوب ہوا سے تنگ تھے۔ اس لئے سپاہی سے لے کر سردار تک سب گھبرا گئے۔ راجہ ٹوڈرمل نے ہر چند تسلی اور دلاسے کے منتر پھونکے۔ اور دلاوری کے نسخوں سے مردہ بھی بنایا۔ مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ خان خاناں کو سب حال لکھا اور کہلا بھیجا کہ تمہارے آئے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اقبال شہنشاہی سے کام بن چکا ہے۔ لیکن کام چوروں کی بے ہمتی سے پھر مشکل ہو جائیگا۔ ان لوگوں سے کچھ امید نہیں۔ خان خاناں کے زخم ابھی ہرے تھے۔ سنگھاسن پر بیٹھ کر روانہ ہوا۔ سامنے جا کر ڈیرے ڈال دیئے۔ لالچ کے بھوکوں کو روپے اشرفی سے پرچایا۔ غیرت والوں کو اونچ نیچ دکھا کر سمجھایا۔ اور وہی اپنا الصلح خیر کا ختم شروع کیا۔ غنیم کو بھی بے سامانی اور سرگردانی نے تنگ کر دیا تھا۔ پیغام سلام دوڑنے لگے۔ کئی دن وکیلوں کی آمد و رفت اور گفتگوؤں کی ردّ و بدل ہوئی۔ یہاں بھی امرا کے ساتھ مشورے ہوتے رہے۔ اکثر امرا راضی تھے۔ کہ جلد فیصلہ ہو اور صحیح سلامت گھروں کو پھریں۔ ہاں ٹوڈرمل نہ مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ غنیم کی جڑ اُکھڑ گئی ہے۔ خرگوش کی طرح چاروں طرف بھاگا پھرتا ہے۔ اب اس کا پیچھا چھوڑنا نہ چاہیئے۔ داؤد حیران کہ قلعہ داری کا سامان نہیں۔ میدان جنگ کی طاقت نہیں بھاگنے کا رستہ نہیں۔ ساتھ ہی خبر آئی۔ کہ جو فوج بادشاہی گھوڑا گھاٹ پر گئی تھی وہ بھی فتح کر کے گھوڑوں پر سوار ہو گئی۔ اس خبر سے داؤد کی زرہ ڈھیلی ہوئی ناچار جھکا۔ بڈھے سرداروں کو بھیجا۔ وہ خان خاناں اور امرائے بادشاہی کے پاس آئے۔ یہ خود ہی تیار بیٹھے تھے۔ پھر بھی تمام امرائے بادشاہی کو جمع کر کے جلسۂ مشورت جمایا۔ سب نے اتفاق کیا۔ مگر راجہ ٹوڈرمل ناراض تھے۔ لیکن غلبہ رائے کا صلح پر تھا۔ راجہ نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر کثرت رائے کے سامنے کچھ پیش نہ گئی۔ اور چند شرطوں پر صلح ٹھیری۔ داؤد ایسے اضطراب

میں تھا۔ کہ جو کچھ کہا گیا چار ناچار قبول کیا۔ اور احسان مند ہو کر قبول کیا۔

خان خاناں نے بڑے تو زک و احتشام سے جشن جمشیدی ترتیب دیا۔ لشکر کے باہر ایک بڑا اور بلند چبوترہ تیار کرا کر سراپردہ شاہانہ قائم کیا۔ بہت دور تک سڑک کی داغ بیل ڈالی۔ دونوں طرف صفیں باندھ کر بادشاہی فوجیں بڑے جاہ و تجمل سے کھڑی ہوئیں۔ اندر سراپردہ کے بہادر سپاہی خلعت زرّین اور لباس فاخرہ پہنے۔ دائیں بائیں اور پس و پیش کھڑے۔ امراء اور سردار کمال جاہ و حشم سے اپنے اپنے رتبے پر قائم۔ دو امیر داؤد کو لینے گئے۔ اور وہ افغان بچہ۔ نوجوان رعنا اور صاحب جمال زیبا تھا۔ بڑی کرّ و فر سے بزرگانِ افغان کو ساتھ لے کر آیا۔ اور اُردوے خان خاناں کے بیچ میں ہو کر دربار میں داخل ہوا۔

سپہ سالار کہن سال گرمجوشی کے ساتھ عزّت و احترام سے پیش آیا۔ مگر جس طرح بزرگ خوردوں سے۔ آدھی دُور تک سراپردہ میں استقبال کیا۔ داؤد نے بیٹھتے ہی تلوار کمر سے کھول کر خانخاناں کے سامنے دھر دی اور کہا۔ چون مثل شما عزیزاں زخمے و آزارے رسد من از سپاہگری بیزارم۔ حالا داخل دُعاگویانِ درگاہ شدم۔ خان خاناں نے تلوار اُٹھا کر اپنے نوکر کو دے دی۔ اُس کا ہاتھ پکڑا برابر تکئے سے لگا کر بٹھایا۔ بزرگانہ اور مشفقانہ طور سے مزاج پُرسی اور باتیں کرنے لگا۔ دسترخوان آیا۔ انواع و اقسام کے کھانے۔ رنگا رنگ کے شربت۔ مزے مزے کی مٹھائیاں چُنی گئیں۔ خانخاناں خود ایک ایک چیز پر اُس کی صلح کرتا تھا میووں کی تشتریاں اور مربّوں کی پیالیاں آگے بڑھاتا تھا۔ نورچشم! باباجان اور فرزند کہہ کر باتیں کرتا تھا۔ دسترخوان اُٹھا۔ پان کھائے۔ میرمنشی قلمدان لے کر حاضر ہوا۔ عہدنامہ لکھا گیا۔ خانخاناں نے خلعت گراں بہا اور شمشیر مرصّع جس کے قبضہ اور ساز میں جواہرات گراں بہا جڑے ہوئے تھے۔ خزانہ شاہی سے منگا کر دی۔ اور کہا حالا ماکمر شمارا بنوکری بادشاہ مے بندیم۔ اُسے جس وقت تلوار باندھنے کو پیش کی۔ تو اُس نے آگرہ کی طرف مُنہ کیا اور جُھک جُھک کر تسلیم و آداب بجالایا۔ خان خاناں نے کہا۔ شما طریقۂ دولت خواہی اختیار کردہ اید۔ ایں شمشیر از جانب شہنشاہ بربندید۔ و ولایت بنگالہ را چنانچہ التماس خواہم کرد۔

موافق آں فرمان عالیشان خواہد آمد۔ اُس نے تلوار کا قبضہ آنکھوں سے لگایا۔ اور بارگاہ خلافت کی طرف رُخ کر کے سجدۂ تسلیم کیا۔ یعنی نوکران حضور میں داخل ہوتا ہوں۔ غرض بہت سے تکلف، بجالا کر اور بہت سے نفائس اور عجائب تحفے دے کر اور لے کر اُسے رُخصت کیا۔ اور یہ دربار بڑی گرمی اور شگفتگی سے برخاست ہوا +

یاد رکھنے کے قابل یہ بات ہے۔ کہ ایسا عالیشان دربار آراستہ ہوا۔ اور وہی بات کا پورا ٹوڈر مل تھا کہ اُس میں شامل نہ ہوا بلکہ صلحنامہ پر بھی مہر نہ کی۔ سپہ سالار اس مہم کو طے کر کے گور میں آیا مصلحت اس میں یہ بھی کہ گھوڑا گھاٹ جو ان بھڑوں کا چھتہ تھا۔ وہ یہاں سے پاس ہے۔ بادشاہی چھاؤنی چھاتی پر دیکھ کر افغان خوب دب جائیں گے۔ گور عہد قدیم میں دارالخلافہ تھا۔ اور اب بھی اپنی دلکشائی و سرسبزی سے آنکھوں میں کُھبا ہوا ہے۔ اس کا نادر قلعہ اور بے نظیر عمارتیں گرتی چلی جاتی ہیں۔ سب نئی ہو کر اُٹھ کھڑی ہونگی +

(ملا صاحب لکھتے ہیں) خان خاناں ان جھگڑوں سے فارغ ہو کر عین برسات کے دنوں میں ٹانڈہ کو چھوڑ کر گور میں آیا۔ وہ بھی خوب جانتا تھا۔ کہ ٹانڈہ کی آب و ہوا معتدل اور صحت بخش ہے۔ گور کی ہوا خراب۔ پانی بدبو اور کمزور ہے مگر ع

صید را چوں اجل آید سوئے صیاد رود

امرا نے بھی کہا مگر اُس کے خیال میں نہ آیا۔ اور ارادہ یہ کہ گور کو نئے سرے سے آباد کیجئے۔ تمام امرا اور اہل لشکر کو حکم دیا۔ کہ یہیں چلے آؤ۔ افسوس کہ گور آباد نہ ہوا۔ البتہ گوریں بہت سی آباد ہو گئیں۔ بہت سے امرا اور سپاہی کہ میدان مردی میں تلواریں مارتے تھے۔ بستر مرگ پر عورتوں کی طرح پڑے پڑے مر گئے[1]۔ عجیب عجیب مرض۔ انوکھی بیماریاں جن کے نام جاننے بھی مشکل ہیں۔ بیچاروں کے گلوگیر ہوئیں۔ فوج در فوج بندے خدا کے روز آپس میں رخصت ہوتے تھے اور جان دیتے تھے۔ ہزاروں کا لشکر گیا تھا۔ شاید سو آدمی جیتے گھر پھرے ہوں گے نوبت یہ ہوئی کہ زندے مُردوں کے دفن سے عاجز ہو گئے۔ جو مرتا پانی میں بہا دیتے

[1] حاجی محمد خاں سیستانی۔ بیرمخانی اور خاں زمانی بڈھے۔ اشرف خاں میر منشی قدیمی بھی انہی میں رخصت ہوئے +

ہر دم اور ہر ساعت خان خاناں کو خبر یں پہنچتی تھیں۔ ابھی وہ امیر مر گیا۔ ابھی وہ امیر سرد ہو گیا۔ پھر بھی سمجھتا نہ تھا۔ بڑھاپے میں مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی نازک مزاجی کے سبب سے کوئی کھُلم کھُلا جتا بھی نہ سکتا تھا کہ یہاں سے نکل جانا مصلحت ہے۔ اتفاق یہ کہ اتنی مدت ایک وہی شخص تھا کہ بیمار نہ ہوا دفعتہً خبر لگی کہ جنید افغان نے صوبہ بہار میں بغاوت کی۔ انہیں بھی گور سے نکلنے کو بہانہ ملا۔ اور تو سب اُدھر روانہ ہوئے۔ ٹانڈہ میں آکر (جس کی ہوا لوگ اچھی سمجھتے تھے) ان کی طبیعت علیل ہو گئی۔ دس دن بیمار رہے۔ گیارھویں دن روانہ ہوئے۔ اسی برس سے زیادہ عمر تھی۔ ۹۸۳ھ میں موت کے فرشتہ نے پکارا۔ خدا جانے مالک کو جا کر حساب سمجھایا یا رضوان کو۔ وہ جاہ و جلال۔ عزّ و کمال۔ خواب تھا یا کہ خیال۔ وارث کوئی نہ تھا۔ برسوں کی جمع کی ہوئی کمائی کا بادشاہی خزانچیوں نے آکر میزان مستوفی ملا لیا۔ غالباً اس کی کفایت شعاری سے خفا ہو کر ملّا صاحب نے یہ فقرے فرمائے ہیں۔ کچھ اور گناہ تو تمہیں معلوم ہوتا۔ خیر یہ مرنے کے بعد اُس غریب کو جو چاہیں سو فرمائیں سان کی زبان اور قلم سے کون بچا ہے۔ اور ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ آج سینکڑوں برس کی بات ہے۔ ہمارا قیاس آج ایک بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔ اصلیت پر کیا پہنچ سکتا ہے۔

منعم خاں کے اخلاق و عادات

اکثر معاملات سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اُن کے مزاج میں رفاقت کا جوش بہت تھا۔ اور دل اُس کا دوستوں کی دردمندی سے بہت جلد اثر پذیر ہوتا تھا۔

تمہیں یاد ہے۔ بیرم خاں کا حال۔ کہ لڑتے لڑتے دفعتہً اُس کے خیالات خلوص عقیدت پر مائل ہوئے۔ اور اکبر کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے پیغام بھیجا۔ یہاں حریفوں نے اکبر کے دل میں پھر شک شبہے ڈالے۔ اُدھر اُسے بھی خطر تھا۔ گفتگو نے وکیلوں کی آمد و رفت میں طول کھینچا۔ ملّا صاحب فرماتے ہیں۔ ہنوز معرکۂ جنگ بر پا بود و آمد و رفت وکیلاں بر جا کہ منعم خاں با معدودے

بے تحاشا در انجا رفت و خان خاناں را آورد۔ یہ اس کی صفائی دل کا جوش اور نیت کی نیکی تھی۔ ورنہ خان خاناں کا منصب اور خطاب بھی اُسے مل چکا تھا۔ اُس کے دل میں رقابت کے خیال اور منصب چھن جانے کا خطر پڑ جاتا تو عجب نہ تھا ✤

علی قلی خاں کے معرکے یاد کرو۔ کس کس طرح اس کی معافی تقصیرات میں کوششیں کرتا رہا۔ اور بار بار کرتا رہا۔ پہلی ہی معافی پر ٹوڈرمل نے عرضی لکھی کہ بہادر خاں بھائی خان زمان کا اپنی حرکت سے باز نہیں آتا۔ بادشاہ نے عرضی سُن کر کہا کہ منعم خاں کی خاطر سے ہم اس کی خطا معاف کر چکے ہیں لکھ دو کہ فوجیں لئے چلے آئیں خان زمان دوبارہ بگڑا اور منعم خاں سے ملتجی ہوا۔ اُس نے دیکھا۔ کہ اب میری عرض کی گنجائش نہیں۔ اُسے بھی لکھا۔ اور شیخ عبد النبی صدر۔ میر مرتضٰی شریفی۔ ملا عبد اللہ سلطان پوری کی وساطت سے پھر حضور میں عرض کی۔ آپ دست بستہ۔ آنکھیں بند۔ سر جھکائے کھڑا تھا۔ آخر گناہ معاف ہی کروا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ بعض امرائے حسد پیشہ کی چالاکی نے ان دونوں بھائیوں کو بلائے ادبار میں گرفتار کیا ہے۔ یہ اور وہ پرانے جان نثار سلطنت کے تھے۔ اس لئے بیچ میں بھی خان زمان کو اکثر دربار کی ایسی باتوں کی خبریں اور تدارک کی صلاحیں دیتا رہتا تھا۔ جس میں حریفوں کے صدمے سے بچ کر سعادت مندی کی راہ پر آجائے کہ نمک حرام نہ کہلائے ۔ چغل خوروں نے عرض بھی کی کہ منعم خاں اس سے ملا ہوا ہے۔ وہ اپنی نیک نیتی سے ایک قدم بھی نہ ہٹا ✤

تمہیں یاد ہو گا۔ کہ بیرم خاں کی مہم در پیش تھی۔ جو منعم خاں کابل سے بُلایا ہوا آیا۔ اور لدھیانے کے مقام پر حاضر دربار ہوا۔ اُس نے مقیم خاں کو بھی پیش کیا۔ کہ تردی بیگ کا بھانجا تھا اور ایسے موقع پر اس کا پیش کرنا گویا منارۂ ترقی پر اُٹھا کر پھینک دینا تھا۔ وہ تو تردی بیگ کا بھانجا تھا۔ جب دربار میں زنبہ ہم زبانی حاصل ہوا۔ اور شجاعت خاں خطاب ہو گیا۔ تو ایک دن دربار خلوت میں منعم خاں کو ایسے الفاظ کہے کہ تورۂ ترکانہ اور دربار شاہانہ کے خلاف تھے اکبر خفا ہوا۔ منعم خاں ان دنوں بنگالہ میں تھے۔ شجاعت خاں کو اُس کے پاس بھجوا دیا یعنی اس نے تمہارے حق میں یہ یہ کہا ہے۔ تم ہی اس سے سمجھ لو۔ آفرین ہے منعم خاں کے

حوصلے کو کہ بڑی عزت اور توقیر سے پیش آیا۔ اس کی دلجوئی و خاطرداری کی۔ اور لائق حال جاگیر اپنے پاس تجویز کر دی۔ وہ بھی بلند نظر امیرزادہ تھا۔ نہ رہنے کو راضی ہؤا نہ جاگیر قبول کی۔ خانخاناں نے یہ بھی قبول کیا۔ حضور میں اس کی معافی کے لئے عرض داشت لکھی۔ اور سامان اعزاز کے ساتھ رخصت کیا +

انہیں احکام نجوم اور تاثیر شگون وغیرہ کا بھی خیال ضرور تھا۔ یاد کرو۔ کابل میں جب ان کے بھائی بندوں کا فساد ہؤا۔ اور یہ یہاں سے گئے۔ قلعہ اٹک پر معرکہ ہؤا۔ اُس دن اُنہوں نے لڑائی کو روکنا چاہا۔ کہ منحوس ستارہ سامنے ہے۔ گوجر خاں کی لڑائی جس میں خود زخمی ہوئے۔ وہاں بھی جام میں یہی شربت تھا۔ لطف یہ کہ دونوں جگہ پینا پڑا ؎

جو کہ قسمت میں لکھا ہے جان ہو دیگا وہی	پھر عبث کا ہے کو طالع آزمائی کیجئے

اگرچہ ہمدردی اور رحم و کرم اُن کے اصلی مصاحب تھے۔ مگر خواجہ جلال الدین محمود کے ساتھ کابل میں جو سلوک کیا۔ نہایت بدنما داغ اُس کے دامن نیک نامی پر رہا +

اضلاع مشرقی میں اُس نے مسجدیں اور عالیشان عمارتیں اپنی عالی ہمتی کی یادگار چھوڑی ہیں۔ جونپور میں بھی کئی عمارتیں تھیں۔ مگر ۹۷۵ھ میں دریائے گومتی پر پُل باندھا ہے۔ وہ اب تک جوں کا توں موجود ہے۔ تین سو برس گزر چکے زمانے کے صدمے اور دریا کے چڑھاؤ ایک کنکر کو جنبش نہیں دے سکتے۔ اس کی طرز عمارت اور نزاکت کی خوبیاں ہندوستان کی قدیمی تعمیروں کی شان و شکوہ بڑھاتی ہیں اور سیاحانِ عالم سے داد لیتی ہیں۔ یہی پُل ہے جسے لوگ کہتے ہیں۔ کہ اُن کے غلام کا نام فہیم تھا۔ اور پُل مذکور بھی اُسی فہیم غلام کے اہتمام سے بنا تھا۔ بہرحال پُلِ مذکور کی جانب مشرق حمام کے پاس ایک محراب پر یہ اشعار کندہ ہیں ؎

خان خاناں خانِ منعم اقتدار	بستہ ایں پل را بہ توفیقِ کریم
نام او منعم از آں آمد کہ ہست	بر خلائق ہم کریم و ہم رحیم
از صراط المستقیمش ظاہر است	شاہ را ہے سوئے جنات النعیم
رہ بتاریخش بری گر افگنی!	لفظِ بدرا از صراطِ مستقیم

منعم خاں جس طرح آپ اپنے خاندان کے بانی تھے۔ اسی طرح اپنی ذات پر خاتمہ کر گئے۔ اولاد میں فقط **غنی خاں** ایک بیٹا تھا۔ مگر جیسا باپ لائق تھا ویسا ہی وہ ناخلف نالائق ہوا۔ بالیاقت باپ اُسے پاس نہ رکھ سکا۔ کابل کے مفسدے کے بعد چند روز خراب و خوار۔ پھر دکن کو چلا گیا۔ وہاں ابراہیم عادل شاہ کی سرکار میں نوکر ہو گیا۔ پھر خدا جانے کیا ہوگا۔ دیکھو مآثرالامرا +

زناں بار دار اے مرد ہشیار	اگر وقتِ ولادت مار زایند
ازاں بہتر بہ نزدیک خردمند	کہ فرزندانِ ناہموار زایند

ملا صاحب کہتے ہیں۔ کہ جونپور کے علاقے میں جھک مارتا پھرتا تھا۔ اسی عالم میں زندگی کی رسوائی سے مخلصی پائی +

بزرگانِ قدیم کی عمدہ یادگار مولوی عظیم اللہ صاحب رغمیؔ ایک عاشق فضل و کمال غازی پور زمینہ میں رئیس خاندانی ہیں۔ اُن کے والدین علوم و فنون خصوصاً شعر و سخن کے شیفتہ و شیدا تھے۔ اور اسی ذوق و شوق میں خصوصاً شیخ امام بخش ناسخ کی محبت کے سبب سے ہمیشہ گھر چھوڑ کر لکھنؤ جاتے تھے اور مہینوں وہیں رہتے تھے۔ مولانا رغمیؔ سلمہم اللہ کا پانچ برس کا سن تھا۔ اُسی عمر سے یہ والد کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ عالمِ طفولیت سے شیخ مرحوم کی خدمت میں رہے۔ اور سال ہا سال فیض حضوری سے بہرہ یاب ہوئے۔ انہی سے شعر کی اصلاح لی۔ بلکہ رغمیؔ تخلص بھی انہی نے عنایت فرمایا۔ کہ تاریخ تلمذ پر مشتمل ہے مدغمیؔ موصوف اُردو و فارسی میں صاحب تصنیفات ہیں۔ اور نظم و نثر میں مجلدات ضخیم مرتب کی ہیں چونکہ سرکار۔ انگریزی میں بھی عمدہ اور با اعتبار عہدوں کا سرانجام کر کے پنشن پائی ہے اس لئے علاقہ مذکور میں تاریخی اور جغرافی حالات کی تحقیقات کامل رکھتے ہیں۔ آبحیات کی برکت سے بندہ آزاد کو بھی اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ اُنہوں نے شفقت فرما کر ریاست قدیم اور واقفیت خاندانی کی معلومات سے جون پور اور غازی پور زمینہ کے بہت سے حالات عنایت کئے۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ اکبر بادشاہ ۹۷۲ھ میں یہاں آئے۔ اور جس مقام پر پل مذکور ہے یہیں کھڑے ہو کر تعمیر کی فرمائش فرمائی۔ خان خاناں نے معماروں کو بلا کر کہا۔ اُنہوں نے

عرض کی یہاں پانی بہت گہرا ہے اور ہمیشہ رہتا ہے۔ ابراہیم لودھی نے بھی ارادہ کیا تھا۔ اُس وقت یہاں سے آدھ کوس جانب مشرق بدیع منزل کے پاس جگہ تجویز ہوئی تھی۔ کہ گرمی میں وہاں پانی کم ہو جاتا ہے۔ خان خاناں نے کہا بادشاہ نے اسی مقام کو پسند کیا ہے۔ کہ قریب قلعہ ہے۔ بہتر ہے۔ کہ یہیں پُل بنے۔ چنانچہ اُنہوں نے اوّل دکن کی جانب میں نہایت مستحکم اور عالیشان پانچ محراب کا ایک پُل بنایا۔ اُس کی تاریخ بھی کسی شخص نے کہی تھی۔ اگرچہ اب عبور زمانہ سے حروف مٹ گئے ہیں۔ مگر مولوی صاحب موصوف نے اُسی نظر عنایت سے جو آزاد کے حال پر مبذول ہے پڑھ کر سب نکالے۔ اور یہ قطعہ تحریر فرمایا ؎

مقدمے ساخت سلطان والسلاطین	سرشتہ آب و خاکش از مسرت
بعشرت کامران بادا کہ آمد!	در او قبلۂ ارباب حاجت
الٰہی تا قیامت باد معمور	ازیں بانی بنائے عمر و دولت
چو از پیرِ خرد تاریخ آں جُست	حکیم پُر خرد گفتا بہ عشرت

خانِ اعظم مرزا عزیز کوکلتاش خاں

تمام تاریخیں اور تذکرے خان اعظم کی عظمت امیرانہ اور شجاعت رستمانہ اور لیاقت اور قابلیت کی تعریفوں سے مرصّع ہیں۔ لیکن اس قسم کے حالات کم ہیں۔ جن سے یہ نگینے اس کی انگوٹھی پر ٹھیک آجائیں۔ ہاں اکبر کے ہم سن تھے ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی عنایتوں اور شفقتوں نے رتبے اور قدر و منزلت بہت بڑھائی تھی۔ بلکہ اُن کی سپاہیانہ طبیعت اور بادشاہ کی نازبرداریوں نے لاڈلے بچّوں کی طرح ضدّی اور بدمزاج کر دیا تھا۔ خیر میں حالات لکھتا ہوں۔ ناظرین اُن سے آپ ہی نتیجے نکال لیں گے۔ اُس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ ہیں نہایت دلکش اور دلچسپ ہیں۔

اُس کے والد میر شمس الدین محمد خاں تھے۔ کہ اکبری عہد میں خان اعظم اور اتکہ خاں کہلاتے تھے ۔

اکبر ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔ جو بادشاہ بیگم نے میرزا عزیز کی ماں سے کہدیا تھا کہ میرے ہاں لڑکا ہوگا تو اُسے تم دودھ پلانا۔ اکبر پیدا ہوا۔ ان کے ہاں ابھی بچہ پیدا نہ ہوا تھا۔ اس عرصہ میں اور بیبیاں اور بعض خواصیں دودھ پلاتی رہیں۔ پھر ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو انہوں نے دودھ پلایا۔ اور زیادہ تر انہی نے یہ خدمت ادا کی۔ جب ہمایوں ہندوستان سے بالکل مایوس ہوا۔ اور راہ قندھار سے ایران کو روانہ ہوا۔ تو ان میاں بیوی کو اکبر کے پاس چھوڑ گیا۔ خدا کے آسرے پر دونوں دُکھ بھرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہمایوں وہاں سے پھر کر آیا۔ کابل کو فتح کیا۔ اور اکبر کے اقبال کے ساتھ اُن کا ستارہ بھی نحوست سے نکلا۔ اکبر ان کے سبب سے ان کے سارے خاندان کی رعایت بدرجۂ غایت کرتا تھا۔ اور عزت کے مدارج پر جگہ دیتا تھا۔ یہ بھی ہمیشہ خطرناک موقع پر جاں نثاری کا قدم آگے رکھتے تھے۔ اکبر خانِ اعظم کی ماں کو جی جی کہتا تھا۔ اور بڑا ادب بلکہ ماں سے زیادہ خاطر کرتا تھا (حالات آیندہ سے واضح ہوگا)

۹۶۹ھ میں خانِ اعظم شمس الدین محمد خاں اتکہ شہید ہوئے تو اکبر نے مرزا عزیز کی کہ چھوٹے بیٹے تھے بہت دلداری کی۔ تمام خاندان کو تسلی دی۔ چند روز کے بعد خان اعظم خطاب دیا۔ مگر ہمیشہ پیار سے مرزا عزیز اور مرزا کوکہ کہتا تھا۔ ہر وقت مصاحبت میں رہتے تھے۔ جب ہاتھی پر سوار ہوتے تھے تو اکثر انہی کو خواصی میں بٹھاتے تھے۔ اُن کی گستاخی اور بے اعتدالی کو بھائی بیٹوں کا ناز سمجھتے تھے۔ خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ جب اس پر غصہ آتا ہے تو دیکھتا ہوں۔ کہ میرے اور اس کے بیچ میں دودھ کا دریا بہہ رہا ہے۔ مَیں چُپ رہ جاتا ہوں اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر میرزا عزیز مجھ پر تلوار بھی کھینچ کر آئے تو جب تک یہ وار نہ کر لے میرا ہاتھ اس پر نہ اُٹھیگا۔ خان اعظم کو بھی اس بات کا بڑا ناز تھا۔ کہ ہم اکبر بادشاہ کے عزیز بلکہ بھائی ہیں۔ اخبار قربت ان کے اس قدر دُور دور پہنچے تھے کہ ۹۷۸ھ میں جو عبداللہ خاں اُزبک کی طرف سے سفارت آئی اس میں تحائف سلطنت کے

ساتھ ان کے اور منعم خاں خان خاناں کے نام علیحدہ علیحدہ تحائف آئے - آزاد - باوجود ان محبتوں کے نہ سمجھنا کہ اکبر کسی کے حال سے غافل تھا - جب محمد حکیم مرزا کابل سے بغاوت کر کے آیا تھا اور بعد اس کے ۹۷۴ھ میں چتوڑ کی مہم میں اسے خبریں پہنچی تھیں کہ اتکہ خیل یک رُخ نہیں - اور یہ آئین سلطنت تھا کہ جب ایک حاکم مدت تک ایک مقام پر رہتا تھا تو اس کی جاگیر تبدیل کر دیتے تھے - چنانچہ ۹۷۵ھ میں تمام اتکہ خیل کو پنجاب سے بُلا لیا - پنجاب حسین قلی خاں کو مل گیا - مرزا عزیز ہمیشہ حضور میں رہتے تھے - اس لئے دیپال پور اُن کی جاگیر بدستور رہا - اَوروں کو چند روز کے بعد سنبھل - قنوج وغیرہ کے علاقے مل گئے +

دیپال پور کا علاقہ خاص ان کی جاگیر تھا - ۹۷۸ھ میں بادشاہ پاک پٹن سے زیارت کر کے ادھر آئے - انہوں نے عرض کی کہ لشکر شاہی مدت سے برابر تکلیف سفر اُٹھا رہا ہے - چند روز حضور یہاں آرام فرمائیں - بادشاہ نے کئی مقام کئے - اور مع شہزادوں اور امرائے دربار ان کے گھر گئے - خان اعظم نے ضیافتوں اور مہمانداریوں میں بڑی عالی ہمتی دکھائی - رخصت کے دن گرانبہا نذرانے پیشکش گزرانے - عربی اور ایرانی گھوڑے جن پر سونے روپے کے زین - کوہ پیکر ہاتھی - نقرئی اور طلائی زنجیریں سونڈھوں میں جھلاتے - مخمل زربفت کی جھولیں - سونے چاندی کے آنکس - موتی - جواہرات گراں بہا سے مرصّع کرسیاں - پلنگ - سونے - چاندی کی چوکیاں سینکڑوں باسن طلائی و نقرئی - جواہرات قیمتی بڑے عجائب اجناس ملکِ فرنگ - روم - خطا - یزد کے نفائس تحائف خارج از حد و قیاس حاضر کئے - شہزادوں اور بیگماتوں کو لباس اور زیور ہائے گرانمایہ پیش کئے - تمام ارکانِ دولت اور اراکینِ سلطنت - کل اربابِ منصب - اہل فضل - اہل کمال جو ملازم رکاب تھے بلکہ تمام لشکر کو خوانِ انعام سے فیض پہنچائے اور سخاوت کے دریا میں پانی کی جگہ دودھ کے طوفان اُٹھائے - اس کے نمک خوار مظفر حسین کو دیکھنا - کیا مزے کی تاریخ کہی ہے - ع

مہمان عزیز اند شہ و شہزادہ

آزاد - ہاں - بادشاہ کا دودھ بھائی ایسا ہی دریا دل ہونا چاہیئے - ملّا صاحب نے اس ضیافت میں فقط اتنا لکھا ہے "ایسی ضیافت کی کہ کم کسی نے کی ہوگی" خود سمجھ لو

کہ انشاہی کچھ کیا ہوگا۔ جو حضرت کا قلم انتشار سا ہے۔ آزاد۔ اکبر اگرچہ ناخواندہ بادشاہ تھا۔ مگر ملک داری اور ملک گیری کے علم میں ماہر کامل تھا۔ وہ اپنے امیروں کو اس طرح حکمرانی کشورستانی کی تعلیم کرتا تھا۔ جیسے کوئی کامل مولوی اپنے شاگردوں کو کتاب کے سبق یاد کرواتا ہے۔ ان میں سے ٹوڈرمل۔ خان خاناں۔ مان سنگھ۔ خانِ اعظم بااستعداد شاگرد نکلے ✦

سنہ ۹۷۹ھ میں جو صوبہ گجرات فتح کیا تھا۔ انہیں جاگیر میں عنایت ہوا۔ کہ انتظام کرو۔ لیکن اکبر تو ادھر آیا۔ وہاں محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا نے فولاد خاں دکنی اور سرشور افغانوں وغیرہ سے موافقت کر کے لشکر فراہم کیا اور مقام پٹن پر آکر ڈیرے ڈال دئے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ حسین مرزا کی جرأت و شجاعت کا یہ عالم تھا کہ جنگ کے معرکوں میں دلاوران زمانہ کے حوصلے سے بڑھ کر قدم مارتا تھا۔ خانِ اعظم نے امرائے شاہی کو اطراف سے جمع کیا۔ بعض امرائے اکبری جو حسب الحکم اپنی خدمتوں پر جاتے تھے خود دوڑ کر آئے اور شامل ہوئے۔ غرض لشکر آراستہ ہو کر باہر نکلا۔ غنیم بھی اُدھر سے اپنی جمعیت سنبھال کر آگے بڑھا جب پلہ جنگ کے پہنچے۔ تو طرفین نے اپنے اپنے لشکروں کے پرے باندھ کر بازی شطرنج کی طرح ایک دوسرے کو قوی پشت کیا۔ اتنے میں خبر لگی۔ کہ غنیم کا ارادہ ہے پیچھے سے حملہ کرے اُنہوں نے چند اُمرا کو الگ کر کے فوج دی۔ اور اُس کے بندوبست سے خاطر جمع کی ✦

جب خانِ اعظم نے میدان میں آکر فوج کو قائم کیا۔ تو غنیم نے لشکر شاہی کی جمعیت اور سرداروں کا بندوبست دیکھ کر لڑائی کو ٹالنا چاہا۔ اور صلح کا پیغام دے کر ایک سردار کو بھیجا۔ امرائے شاہی صلح پر راضی ہو گئے۔ مگر ایک امیر گھوڑا مار کر خانِ اعظم کے پاس پہنچا۔ اور کہا کہ زنہار صلح منظور نہ فرمایئے کہ دغا ہے۔ جب آپ کی فوجیں اپنے مقاموں پر چلی جائینگی۔ یہ پھر سر اُٹھائیں گے۔ خانِ اعظم نے اُس کی دُور اندیشی پر تحسین کی۔ اور غنیم کو جواب میں کہلا بھیجا کہ صلح منظور ہے۔ لیکن تمہاری نیت صاف ہے تو پیچھے ہٹ جاؤ کہ ہم تمہارے مقام پر آن اُتریں۔ اُنہوں نے یہ بات نہ مانی ✦

خان اعظم نے فوج کو آگے بڑھایا۔ غنیم کی دائیں فوج نے بائیں پر حملہ کیا اور اس کڑاک دمک سے آیا۔ کہ خان کی فوج کا بازو اُکھڑ گیا۔ قطب الدین قدیم الخدمت سردار تھا۔ وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ وہیں گڑ کر کھڑا ہو گیا۔ آفرین ہے ہمت مردانہ پر کہ جب غنیم کے ہاتھی نے حملہ کیا۔ تو بڑھ کر اُس کی مستک پر ایک ایسا ہاتھ تلوار کا مارا کہ مستک کا پیٹ کھول دیا۔ تعجب یہ کہ فوج ہراول پر زور پڑا تو وہ بھی مقابلہ میں ٹھیر نہ سکی۔ اور آگے کی فوج بھی درہم برہم ہو کر پیچھے ہٹی۔ بھاگنے والے بھاگتے بھی تھے۔ لڑتے بھی تھے۔ حریف اُن کے پیچھے گھوڑے مارے چلے جاتے تھے +

خان اعظم قلب کو لئے کھڑا تھا۔ اور تقدیر الٰہی کا منتظر تھا۔ اتنے میں پانسو سوار کا ریلا اُس پر بھی آیا۔ مگر ٹکر کھا کر پیچھے ہٹا۔ غنیم نے جب دیکھا۔ کہ میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ اور دائیں میں اتنی طاقت نہیں کہ بائیں کی مدد کو آئے۔ بادشاہی سردار دُور سے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ تو وہ مطمئن ہو کر ٹھیرا کہ اب کیا کرنا چاہئے

ایک دن فاضل خاں فوج لے کر خانپور دروازہ سے نکلے اور لڑنے لگے۔ غنیم ایسے اُمنڈ کر آئے کہ سب کو سمیٹ کر قلعہ میں گھسیڑ دیا۔ فاضل خاں سخت زخمی ہوئے اور غنیمت سمجھو کہ جان لے کر بھاگے۔ سلطان خواجہ گھوڑے سے گر کر خندق میں جا پڑے فصیل پر سے رسا ڈالا۔ ٹوکرا لٹکایا۔ جب نکلے۔ سب کے جی چھوٹ گئے۔ اور کہہ دیا۔ کہ اس غنیم کا مقابلہ ہماری طاقت سے باہر ہے۔ عرضیاں اور خطوط دوڑانے شروع کئے۔ یہی عرائض کی تحریر تھی اور یہی پیام کی تقریر۔ کہ اگر حضور تشریف لائیں تو جانیں بچینگی۔ ورنہ کام تمام ہے۔ محل میں جی جی آتی تھی اور روتی تھی۔ کہ واری میرے بچے کو جا کر لے آؤ۔ اکبر عمدہ عمدہ سرداروں اور سپاہیوں کو لے کر سوار ہوا۔ اور اس طرح گیا کہ ۲ دن کا رستہ ۷ دن میں لپیٹ کر ساتویں دن گجرات سے تین کوس پر دم لیا۔ فیضی نے جو سکندر نامہ کے جواب میں اکبر نامہ لکھنا چاہا تھا اُس میں اِس معرکہ کا خوب سماں باندھا ہے ؎

بہ یک ہفتہ تا احمد آباد رفت	تو گوئی کہ بر مرکب آباد رفت
یلاں بر شتر ترکش اندر کمر	شتر چوں شتر مرغ در زیر پر

لڑائی کا بیان ہفت خوان رستم کی داستان ہے اکبر کے حال میں دیکھ لو +
علاء الدولہ نے تذکرہ میں لکھا ہے۔ کہ جب اکبر نے گجرات فتح کی۔ تو شاہزادہ سلیم کی وکالت اور نیابت کے ساتھ دو کروڑ ساٹھ لاکھ کا علوفہ کر کے مدار الملک احمد آباد سے پایہ تخت گجرات میں ممتاز کیا۔ اُس دن ایک تقریب خاص کے سبب سے مَیں بھی حاضر تھا اور میں مرزا کا ملازم بھی تھا۔ شب برات کی ۱۵ تاریخ تھی۔ میں نے اُسی وقت تاریخ کہی۔ ع

	گفتا کہ یہ شب برات داوند بدو	

دوسرے سال فتوحات بنگالہ کے شکرانے میں بادشاہ فتح پور سے اجمیر گئے۔ دو بڑے بڑے نقارے جو لُوٹ میں آئے تھے وہاں نذر چڑھائے۔ خان اعظم پہلے سے اشتیاق حضوری میں عرضیاں دَوڑا رہے تھے۔ یلغار کر کے احمد آباد سے پہنچے۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے۔ اُٹھے اور چند قدم بڑھ کر گلے لگایا +

۹۸۲ھ میں مرزا سلیمان کی آمد آمد تھی۔ اور ضیافت کے وہ سامان ہو رہے تھے۔ کہ جس سے جشنِ جمشید کی شان شکوہ گرد تھی۔ انہیں حکم پہنچا۔ کہ تم بھی حاضر دربار ہو تاکہ زمرہ امرا میں پیش ہو۔ خان اعظم ڈاک بٹھا کر فتح پور میں حاضر ہوئے +

نکتہ۔ اکبر ہندوستان کے لوگوں کو عمدہ عہدے اور با اعتبار خدمتیں بہت دینے لگا تھا۔ اور اس کے کئی سبب تھے۔ کچھ تو اس لئے کہ اس کے باپ اور دادا نے ہمیشہ بخارا اور سمرقند کے لوگوں سے خطا پائی تھی۔ اور اس سے بھی اکثر ترکوں نے بغاوت کی تھی۔ کچھ اس سبب سے کہ یہاں کے لوگ صاحب علم۔ بالیاقت۔ باتدبیر اپنے ملک کے حال سے باخبر ہوتے تھے۔ اور اطاعت بھی صدق دل سے کرتے تھے۔ کچھ اس سبب سے کہ ان کا ملک تھا۔ اس لئے اس سے فائدہ اُٹھانا بھی پہلے ان کا حق تھا۔ بہر حال ترک اس بات سے جلتے تھے۔ اور اکثر طرح طرح سے بدنام کرتے کبھی کہتے تھے بد مذہب ہو گیا۔ کبھی یہی کہتے تھے کہ بزرگوں کے خدمت گاروں اور حق داروں کے حق بھول گیا۔ اس موقع پر کہ مرزا سلیمان آنے والا تھا۔ بادشاہ باتدبیر نے اسے یہ بات دکھانی مصلحت سمجھی کہ دیکھو جو لوگ باوفا اور جان نثار ہیں۔ میں اُن کو اور اُن کی اولاد کو کتنا بڑھاتا ہوں۔

اور کس قدر عزیز رکھتا ہوں اور مرزا عزیز کو دیکھئے کس رتبۂ عالی پر پہنچایا ہے۔ کہ میری اتکہ کا لڑکا ہے اور اُس کے علاوہ بھی بہت سے قدیم الخدمت اور کہنہ عمل اہل سیف و اہل قلم موجود تھے انہیں پیش کیا۔

انہی دنوں میں داغ کا آئین جاری ہوا تھا۔ امرا کو یہ قانون ناگوار تھا۔ بادشاہ نے مرزا عزیز کو اپنا سمجھ کر فرمایا۔ کہ پہلے خانِ اعظم اپنے لشکر کی موجودات دیگا۔ ہٹیلے نواب کی آنکھوں پر ان دنوں جوش جوانی نے پردہ ڈالا تھا۔ ایک میاں باؤلے اوپر سے پی بھنگ ہمیشہ کے لاڈلے تھے۔ یہ اپنی ہٹ پر آکر اڑ گئے۔ اور نئے قانون کی قباحتیں صاف صاف کہنی شروع کیں۔ بادشاہ نے کچھ فہمائش کی۔ اور ارکانِ دولت نے تائید میں تقریریں کیں۔ یہ جواب میں کس سے رُکتے تھے۔ بادشاہ نے تنگ آکر کہا۔ کہ ہمارے سامنے نہ آؤ۔ کئی دن بعد آگرہ بھیج دیا کہ اپنے باغ میں رہیں۔ اور آمد و رفت کا دروازہ بند۔ نہ یہ کہیں جائیں۔ نہ کوئی اُن کے پاس آئے۔ باغ مذکور کا نام باغ جہاں آرا تھا۔ کہ خود ذوق شوق کی نہروں سے سرسبز کیا تھا۔

۹۸۳ھ میں بادشاہ کو خود خیال آیا۔ اور تقصیر معاف کر کے پھر صوبۂ گجرات میں رخصت کرنا چاہا۔ یہ تو پورے ضدی تھے۔ نہ مانا۔ بادشاہ نے پھر کہلا بھیجا۔ کہ وہ ملک سلاطین عالیجاہ کا تخت گاہ ہے۔ اس نعمت اور حضور کی عنایت کا شکرانہ بجالاؤ۔ اور جاؤ۔ اُنہوں نے کہلا بھیجا کہ میں نے سپاہی گری چھوڑ دی۔ میرا نام اہل دعا کے لشکر میں رہنے دیجئے۔ قطب الدین خاں اُن کے حقیقی چچا کو بھیجا۔ کہن سال بڈھے نے بہت سے نشیب و فراز دکھلا کر سمجھایا۔ ماں نے بھی کہا۔ جھنجھلائی اور خفا بھی ہوئی۔ مگر یہ کس کی سنتے تھے۔ ادھر مرزا خان کی قسمت زور کر رہی تھی اور خان خاناں ہونا تھا۔ بادشاہ نے اُسے بھیج دیا۔ وہ شکرانے بجالایا۔ اور سجدے کرتا ہوا روانہ ہوا۔ اُن کی خطا تو ہر وقت معاف تھی۔ مگر یہ کہو ۹۸۶ھ میں اُنہوں نے بھی معافی خطا کو منظور کیا۔

۹۸۷ھ میں مرزا پر سے بڑی کل بل ٹلی۔ بادشاہ خلوت میں تھے دفعتہً دولت خانہ اقبال سے غوغائے عظیم کی آوازیں بلند ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ مرزا کو کہ زخمی ہوئے۔ حقیقت حال یہ تھی کہ بھوپت چوہان اٹاوہ کا راجہ باغی ہو کر ملک بنگالہ میں چلا گیا تھا۔ بنگالہ تسخیر ہو گیا تو وہ پھر اپنے علاقہ میں آیا اور رعیت کو پر چانے۔ چوروں

اور رہزنوں کو دبانے لگا۔ حکام بادشاہی نے اُسے دبایا اور دربار میں عرضی کی۔ حکم ہُوا۔ ملک مذکور مرزا کی جاگیر ہے۔ یہ جا کر اس کا بندوبست کریں۔ وہ بھاگ کر راجہ ٹوڈرمل اور بیربر کے پاس آیا۔ اور جرم بخشی کا رستہ نکالا۔ مرزا کو یہ حال معلوم ہُوا۔ حضور میں عرض کی۔ حکم ہُوا کہ شیخ ابراہیم۔ شیخ سلیم چشتی کے خلیفہ اُسے بُلائیں۔ اور حال دریافت کریں۔ وہ ظاہر میں بندگی اور دل سے مرزا کی گھات میں تھا۔ راجپوتوں کی جمعیت سے لشکر میں آیا۔ اور شیخ سے کہا۔ کہ مرزا مجھے اپنی پناہ میں لیں۔ اور جرم بخشی کا ذمہ لے کر حضور میں لے چلیں۔ ورنہ میں اپنی جان کھو دونگا۔ شیخ اُسے اور مرزا کو لے کر حضور میں حاضر ہوئے۔ آئین تھا کہ بارگاہ میں بے اجازت کسی کو ہتھیار بند نہ آنے دیتے تھے۔ اُس کی کمر میں جمدھر تھا۔ ایک پہرہ والے نے جمدھر پر ہاتھ رکھا۔ وہ بدگمان ہُوا۔ اور جھٹ جمدھر کھینچ لیا۔ مرزا نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس نے اُنھیں زخمی کیا پالکی میں پڑ کر گھر گئے۔ دوسرے دن حضور نے جا کر آنسو پونچھے اور دم دلاسوں کی پٹی چڑھائی +

۹۸۸ھ میں پھر نحوست آئی۔ اُس کی کہانی بھی سننے کے قابل ہے۔ ان کا دیوان کچھ روپیہ کھا گیا تھا۔ اُنھوں نے اُسے **طالب** اپنے غلام کے سپرد کیا۔ کہ روپیہ وصول کرے۔ اُس نے دیوان جی کو باندھ کر لٹکا دیا۔ چوبکاری شروع کر دی۔ اور ایسا مارا کہ مار ہی ڈالا۔ دیوان کا باپ روتا پیٹتا حضور میں حاضر ہُوا۔ بڈھے کی حالت دیکھ کر بادشاہ کو بہت رنج ہُوا۔ قاضی لشکر کو حکم ہُوا کہ تحقیقات کرے خان اعظم نے کہا کہ غلام کو مَیں نے سزا دے دی۔ میرا مقدمہ حضور قاضی کے ہاتھ میں نہ ڈالیں۔ اس میں میری بے عزتی ہے۔ بادشاہ نے یہ عرض منظور نہ کی۔ یہ خفا ہو کر پھر گھر جا بیٹھے۔ کئی مہینے کے بعد بادشاہ نے خطا معاف کی۔ ۹۸۸ھ میں بنگالہ میں فساد ہُوا مظفر خاں سپہ سالار مارا گیا۔ تو ان کو پنجہزاری منصب عنایت کیا۔ ابھی تک **خان اعظم** اُن کے باپ کا خطاب بھی امانت رکھا تھا۔ وہ عنایت فرما کر راجہ ٹوڈرمل کی جگہ بنگالہ کی مہم پر سپہ سالار کر دیا۔ کئی امیر کہنہ عمل سپاہی اور پرانے تیغ زن فوجوں سمیت ساتھ گئے۔ انھیں بھی بھاری بھاری خلعت اور عمدہ گھوڑے دے کر اعزاز بڑھایا۔ مشرقی امرا کے نام فرمان جاری ہوئے۔ کہ یہ آتے ہیں۔ سب اُن کی اطاعت کرنا اور

حکم سے باہر نہ ہونا ‍‍٭

منعم خاں خان خاناں اور حسین قلی خاں خانجہاں اُس ملک میں برسوں تک رہے تلواروں نے خون اور تدبیروں نے پسینے بہائے۔ مگر ملک مذکور کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ ایک طرف تو افغان جو اپنا ملک سمجھتے تھے جا بجا فساد کرتے تھے۔ دوسری طرف بادشاہی امرا جو نمک حرام ہو رہے تھے۔ وہ کبھی آپ کبھی افغانوں کے ساتھ مِلکر مار دھاڑ کرتے پھرتے تھے۔ خان اعظم فوجیں بھیج کر اُن کا بندوبست کرتے تھے۔ اُن پر بس نہ چلتا تھا۔ امرائے ہمراہی پر خفا ہوتے تھے۔ بہت غصّے ہوتے تو ایک چھاؤنی چھوڑ کر دوسری چھاؤنی میں چلے جاتے تھے۔ امرا بہت چاہتے تھے۔ کہ انہیں خوش رکھیں۔ مگر وہ خوش ہی نہ ہوتے تھے۔ ٹوڈرمل بھی ساتھ تھے۔ کمر باندھے پھرتے تھے۔ کبھی اِدھر۔ کبھی اُدھر۔ ایک برس سے زیادہ یہ دو برس تک اُدھر رہے۔ اور رات دن انہیں میں غلطان و پیچان پڑے رہے۔ امارت بھی خرچ کی۔ روپیہ دے کر بھی باغیوں کو پرچایا۔ پر اس ملک کے معاملے ایسے نہ تھے کہ پاک وصاف ہو جائیں۔ ۹۹۰ھ میں جب بادشاہ کابل کی مہم فتح کر کے فتح پور میں آئے تو ۹۹۱ھ کے جشن میں آکر شامل دربار ہوئے۔ اور وہاں بغاوت ہو گئی۔ اور بنگالہ سے لے کر حاجی پور تک باغیوں نے لے لیا۔ خان اعظم مہم بنگالہ کے لئے دوبارہ خلعت اور فوج لے کر روانہ ہُوئے۔ اور اس کا بندوبست کیا۔ ۹۹۲ھ میں عرضی کی کہ اس کی ہوا مجھے موافق نہیں۔ چند روز رہا تو زندگی میں شبہ ہے۔ بادشاہ نے بُلا لیا ‍٭

اکبر کا دل مدت سے دکن کی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ ۹۹۳ھ میں اِدھر کے اضلاع سے ملک مذکور میں فتنہ و فساد کی خبریں آئیں۔ میر مرتضیٰ اور خداوند خاں امرائے دکن برار سے احمد نگر پر چڑھ گئے۔ کہ نظام الملک کا پایہ تخت تھا۔ وہاں سے شکست کھا کر راجہ علی خاں حاکم خاندیس کے پاس آئے کہ اکبر کے پاس جاتے ہیں مرتضیٰ نظام شاہ نے راجہ علی خاں کے پاس آدمی بھیجے۔ کہ فہمائش کر کے روک لو۔ وہ روانہ ہو گئے تھے۔ اس لئے آدمی بھیجے کہ خوانین کو روکیں۔ وہ نہ رُکے اور نوبت تلوار و تفنگ کی پہنچی۔ انجام یہ کہ انہیں لوٹ کھسوٹ کر ذخیرہ وافر جمع کیا۔ اور وہ آگرہ پہنچے۔ راجہ علی خاں

بڑا دور اندیش اور صاحب حکمت تھا۔ خیال ہؤا کہ بہادر اکبر کو یہ امر ناگوار نہ گزرا ہو وہ جانتا تھا کہ اکبر ہاتھی کا عاشق ہے ۱۵۰ ہاتھی بیٹے کے ہاتھ روانہ دربار کئے۔ بزم نوروزی میں اُس نے اور بہت سے نفائس اور اسباب و اجناس پیشکش گزرانے ساتھ ہی تسخیر دکن کے رستے دکھائے۔ خان خاناں تو احمد آباد میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ تمام امرا اور سرداروں کے نام فرمان جاری ہوئے۔ چند امرا کو ادھر روانہ کیا۔ اور خان اعظم کو فرزندی کا خطاب اور سپہ سالار قرار دیکر حکم دیا کہ برار لیتے ہوئے احمد نگر کو جا مارو۔ اُنہوں نے ہنڈیا میں جا کر مقام کیا۔ اور فوج بھیجکر سانول گڑھ پر قبضہ کیا۔ ناہر راؤ اطاعت میں حاضر ہؤا۔ اور راجہ بھی کمر بستہ خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ اور ملک گیری کا ہنگامہ گرم ہؤا۔ بادشاہ نے ملک مالوہ کے عمدہ عمدہ مقام پیارے کوکہ کی جاگیر کر دیئے۔ جب امرا کو اُن کی ہمراہی کے فرمان پہنچے تو سب فراہم ہوئے۔ تقدیر کے اتفاق سے نااتفاقی کی آندھی اُٹھی اور اندھیرا پھیلنا شروع ہؤا۔ سپہ سالار پر بدگمانی غالب آئی اور ایسا گھبرایا کہ انتظام کارشتہ تباہ ہو گیا۔ ماہم بیگم کی نشانی شہاب الدین احمد خاں موجود تھے۔ اُن کی صورت دیکھ کر باپ کا خون آنکھوں میں اُتر آیا۔ خان اعظم اکثر صحبتوں میں اس بڈھے کہن سال کو ذلیل کرنے لگے۔ شاہ فتح اللہ شیرازی کو بادشاہ نے اصلاح و تدبیر کے لئے ساتھ کر دیا تھا۔ کہ یہ اُدھر کے مُلک اور مُلک والوں سے واقف تھے۔ اور اُن کی تدبیروں کو وہاں کے لوگوں میں بڑا اثر تھا۔ یہ نفاق کے حرفوں کو مٹاتے تھے۔ کینہ وری کی آگ کو دباتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ دیکھو یہ موقع آپس کی عداوت کا نہیں ہے۔ مہم خراب ہو جائیگی۔ باپ سب کا اکبر بادشاہ ہے۔ اُس کی بات میں فرق آئیگا۔ مُلک مُلک میں رسوائی ہوگی۔ خان اعظم اُن سے بھی خفا ہو گئے باوجودیکہ شاہ فتح اللہ اُستاد بھی تھے۔ مگر رقیب کا خیر خواہ ٹھیرا کر بزرگی کو طاق پر رکھا۔ خود خان اعظم اور اُن کے مصاحب سر مجلس تمسخر اور تضحیک سے شاہ موصوف کو آزردہ کرنے لگے۔ **شاہ** تدبیر کے ارسطو اور عقل کے افلاطون تھے۔ لطائف الحیل سے ان باتوں کو ٹالتے اور وقت گزارتے تھے۔ اور شہاب الدین احمد خاں بڈھے سردار کی تو اس قدر خواری ہوئی کہ وہ خفا ہو کر فوج سمیت رائیسین وداجین اپنے علاقے

کو اُٹھ گیا۔ اُنھوں نے بجائے دلداری اور دلجوئی کے اس پر جرم قائم کیا۔ کہ یہ ایک تو بادشاہ کا بھائی دوسرے سپہ سالار۔ میری اجازت بغیر جانا چہ معنی دارد۔ فوج لے کر اُس کے پیچھے دوڑے۔ تولک خاں قوچی کہ شجاعت اور ہمت میں نظیر نہ رکھتا تھا۔ اور دست راست کی فوج کا سپہ سالار تھا اُسے بھی کچھ تہمت لگائی اور غافل قید کر لیا۔ دشمن دل میں ڈر رہا تھا کہ خدا جانے بادشاہی لشکر کب اور کن کن پہلوؤں سے حملہ کر بیٹھے۔ جب اُس نے دیکھا کہ دیر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور پھر خبریں پہنچیں کہ امرا اپنے ہی گھر میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ تو وہ شیر ہو گیا۔ چند امرا کے ساتھ ۲۰ ہزار فوج کی۔ جن میں محمد تقی کو سپہ سالار کیا۔ وہ مقابلہ کو روانہ ہوئے۔ مرزا محمد تقی خود راجہ علی خاں کے پاس گئے۔ بعض دکنی سردار جو ہوا کا رُخ دیکھ رہے تھے وہ بھی بدہوا ہو گئے۔ قریب تھا کہ سلطنت کی نوبت رسوائی تک پہنچے۔ میر فتح اللہ پھر بیچ میں آ کر آپس کی مصلحت اور غنیم کی مصالحت میں آ کر شامل ہو گئے۔ یہی غنیمت ہوئی کہ پردہ رہ گیا +

راجہ علی خاں حاکم خاندیس دکن کے حصوں کا سردار اور مالک شمشیر تھا۔ وہ خان اعظم کی رفاقت کو مستعد ہو گیا تھا۔ یہ حال دیکھ کر اُس نے بھی موقع پایا۔ برار اور احمد نگر کے امرا اور اُن کی فوجوں کو ساتھ لے کر چلا۔ مرزا عزیز نے یہ سُن کر اُدھر سے شاہ فتح اللہ کو بھیجا کہ فہمائش کریں۔ وہ دکن کے جنگلوں کا شیر تھا۔ اب کس کی سُنتا تھا۔ سیدھا آیا۔ شاہ فتح اللہ وہاں سے ناکام پھرے اور آزردہ اور بیزار ہو کر خان خاناں کے پاس گجرات چلے گئے۔ راجہ علی خاں کی آمد آمد دیکھ کر خان اعظم گھبرائے۔ امرا کو مشورہ کے لئے جمع کیا۔ جو آدمی دوست و دشمن کو نہ پہچانے اور موقع کو نہ سمجھے۔ اُن کے لئے مشورہ کیا؟ اور صلاح کون دے؟ کئی دن مقام ہنڈیا میں آمنے سامنے پڑے رہے۔ مقابلے کی طاقت نہ پائی۔ رفیقوں پر اعتبار نہ ہوا۔ ایک شب چُپ چپاتے کسی گمنام رستہ سے نکل ملک برار کا رُخ کیا۔ ایلچ پور اس کا پایہ تخت تھا۔ اُس کا اور جس شہر کو پایا۔ لوٹ کھسوٹ کر ستیاناس کر دیا۔ اور دولت بے قیاس سمیٹی۔ ہتیا راؤ اِدھر کا راجہ ساتھ ہو گیا تھا۔ وہ گڈھب رستوں میں رہنمائی کرتا آتا تھا۔ راہ میں

اُس پر خیال ہوُا کہ یہ غنیم سے ملا ہوُا ہے۔ وہ بدگمانی کی تلوار سے غصّے کی درگاہ میں قربانی ہوُا +

ایلچ پور میں پہنچ کر بعض امرا کی صلاح ہوئی کہ اسی طرح باگیں اُٹھائے چلے چلو اور احمد نگر تک دم نہ لو۔ کہ دارالملک دکن کا ہے۔ بعضوں نے کہا کہ یہیں ڈیرے ڈال دو۔ اور جو ملک لیا ہے اس کا انتظام کرو۔ انہیں کسی کی بات پر بھروسہ نہ تھا۔ یہاں بھی نہ تھمے۔ اور نہ دربار کا رُخ کیا۔ غنیم سوچتا رہ گیا کہ دانشمند سپہ سالار سپہ لئے ہوئے ملک کو چھوڑ کر چلا گیا۔ خدا جانے اس میں کیا پیچ کھیلا ہے یہاں اندر کچھ بھی نہ تھا۔ وہ جریدہ اُن کے پیچھے دوڑا +

اس رستے میں عجب حالت گذری۔ قدم اُٹھائے چلے جاتے تھے۔ بھدّے ہاتھی اور بھاری بھاری بوجھ رہے جاتے تھے۔ انہیں کوچے کاٹ کر ڈالتے جاتے تھے۔ کہ ہاتھی دشمن کے ہاتھ آئیں۔ تو اُن کے کام کے نہ ہوں۔ دشمن کو راہ میں ہنڈیا شہر ملا کہ بادشاہی علاقہ تھا۔ ایلچ پور کے بدلے میں اُسے لوٹ مار کر ٹھیکرا کر دیا۔ غنیم کی چنداول (لشکر کے پچھلے حصّہ) سے لڑائی ہوتی چلی آتی تھی۔ رستے میں آرام لینے کی مہلت نہ ملی۔ ایک موقع پر تھم کر لڑائی ہوئی۔ اُس میں بھی جگ ہنسائی ہوئی غرض ہزار جان کندن سے ندربار کی حد میں لشکر کو چھوڑا۔ اور آپ احمد آباد کی طرف چلے۔ یہ اس خیال خام میں گئے تھے۔ کہ خان خاناں میرا بہنوئی ہے۔ اُس سے مدد لاؤں گا اور غنیم کو مار کر تباہ کروں گا۔ خان خاناں بھی دربار اکبری کی ایک اعلےٰ رقم تھے۔ وہ فوراً محمود آباد کی منزل میں نظام الدین احمد کے ڈیروں میں آکر ملے کہ بڑودہ کو جاتے تھے۔ اُن کی گرمجوشی اور تپاک اور اختلاط کا کیا بیان ہو سکے۔ دن کو مشورے رہے۔ اور یہ ٹھیری کہ اس وقت احمد آباد چلے چلو۔ بہن بھی وہیں ہیں۔ اُن سے ملو۔ پھر مل کر دکن پر چلو۔ چنانچہ وہ دونوں ادھر گئے۔ نظام الدین احمد امرا اور افواج ہمراہی کو لئے بڑودہ کو روانہ ہوئے۔ بڑودہ میں پھر دونوں خان آئے۔ خان اعظم تو پھر آگے بڑھ گئے۔ کہ جب تک خان خاناں لشکر لے کر احمد آباد سے آئیں میں لشکر ندربار کو تیار کرتا ہوں۔ خان خاناں پھر احمد آباد گئے۔ اور نظام الدین احمد کو لکھا کہ جب تک میں نہ آؤں۔ بڑودہ سے نہ بڑھنا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں فوج

آراستہ کو لے کر پہنچے اور بھڑوچ کو چلے۔ وہاں پہنچے تھے جو خان اعظم کے خط آئے کہ اب تو برسات آگئی۔ اس سال لڑائی موقوف رکھنی چاہیئے۔ سال آئندہ میں سب مل کر چلینگے۔ راجہ علی خاں اور دکنی سردار اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ یہ سب کو گالیاں دیتے نذربار سے دربار میں آن حاضر ہوئے +

سنہ ۹۹۵ھ میں صلاح ہوئی۔ کہ دودھ میں مٹھاس ملاؤ تو اور بھی مزہ دے گا۔ خان اعظم کی بیٹی سے شاہزادہ مراد کی شادی ہو جائے۔ شاہزادہ اُس وقت ۷ برس کا تھا۔ مریم مکانی یعنی اکبر کی والدہ کے گھر میں یہ شادی رچی۔ خان اعظم کی عظمت بڑھانی تھی۔ بادشاہ خود برات لے کر گئے اور دھوم دھام سے دلہن بیاہ لائے۔

سنہ ۹۹۶ھ میں لڑکا بھی پیدا ہوا۔ اور مرزا رستم نام رکھا +

سنہ ۹۹۷ھ میں احمد آباد گجرات خان خاناں سے لے کر پھر انہیں دیا۔ یہ کہتے تھے کہ مالوہ کا ملک اچھا ہے۔ مَیں تو وہ لونگا۔ وہ اکبر بادشاہ تھا خدا جانے اُس نے اپنی تجویز میں اور کیا کیا مصلحتیں مدنظر رکھی تھیں۔ مشورہ کے لئے جلسہ بٹھایا۔ الحمدللہ صلاح بھی ایسی ٹھیر گئی۔ جس میں ان کی ضد پوری ہوئی۔ یہ ساز و سامان کر کے ادھر روانہ ہوئے +

سنہ ۹۹۹ھ میں خان اعظم نے ایسا میدان مارا کہ کسی فتحیاب سے پیچھے نہ رہا۔ جام سرسال اُس ولایت کے اعلےٰ حکمرانوں میں سے تھا۔ اور ہمیشہ فسادوں کی تاک میں رہتا تھا۔ اُس نے مظفر گجراتی کو پیر مرد بنا کر نکالا۔ سورٹھ کا حاکم دولت[1] خاں اور راجہ کنگار کچھ کا حاکم بھی شامل ہوا۔ ۲۰ ہزار کا بلوہ باندھ کر لڑنے کو آئے۔ خان اعظم نے اِدھر اُدھر خطوط لکھے۔ کوئی مدد کو نہ آیا۔ اس ہمت والے نے دل نہ ہارا۔ اور جس طرح ہو سکا جمعیت کی صورت پیدا کر کے نکلا۔ غنیم نے بڑے حوصلے سے فوجوں کو بڑھایا۔ خان اعظم نے چند سرداروں کو فوج دے کر آگے روانہ کر دیا۔ ان سے کوتہ اندیشی یہ ہوئی کہ غنیم کے ساتھ صلح کی گفتگوئیں کیں۔ اُن کے دماغ اور بھی بلند ہو گئے۔ اور جنگ کے نقارے بجاتے آگے بڑھے۔ ضدی سپہ سالار کو غصہ آیا۔ باوجودیکہ ۱۰ ہزار سے زیادہ جمعیت نہ تھی۔ اور غنیم کے ساتھ ۳۰ ہزار فوج تھی۔ یہ سامنے ڈٹ گیا۔ اور لشکر کو

[1] دولت خاں فرمانروائے ملک سورٹھ میں خان غوری کا بیٹا تھا۔ اور کہتا تھا کہ مَیں سلاطین غور کی اولاد ہوں +

سات فوجوں میں تقسیم کیا۔ قلب میں اپنا فرزند خورم چاروں طرف امرائے شاہی اپنی اپنی فوجوں سے قلعہ باندھ کر کھڑے ہوئے۔ اور انہیں سپاہ کی مدد سے قوی پشت کیا۔ انورا پنے بیٹے کو چھ سو سواروں سے الگ کیا۔ اور خود بہت سے سورما سپاہیوں کی جمعیت میں چار سو سوار لے کر کھڑے ہوئے۔ کہ جدھر وقت پڑے فوراً پہنچیں۔ اُدھر سے مظفر نے میدان میں فوجیں قائم کیں۔ کہ یکایک مینہ برسنا شروع ہؤا۔ اور بارش کا تار لگ گیا۔ جس انداز سے لڑائی شروع ہوئی تھی وہ ملتوی ہو گیا۔ اور طرفین سے ترکانہ حملے ہوتے رہے۔ غنیم بلندی پر تھا۔ یہ نیچے تھے۔ بڑی دقتیں پیش آئیں۔ مشکل یہ ہوئی کہ ادھر رسد بند ہو گئی۔ دو دفعہ شب خون بھی لے گئے۔ مگر ناکام پھرے۔

جب تکلیفیں حد سے گزر گئیں تو خان اعظم نے اُس میدان میں فوج کو لڑانا مناسب نہ سمجھا۔ چار کوس کوچ کر کے جام کے علاقے میں گھس گیا۔ یہاں مینہ نے ذرا امان دی۔ جنگل نے جانوروں کے لئے گھاس دی۔ لُوٹ مار نے غلّہ کی رسد پہنچائی۔ مظفر کو ناچار ادھر کودنا پڑا۔ اور دریا کو بیچ میں ڈال کر ڈیرے ڈال دیئے۔ بڑی بات یہ ہوئی۔ کہ طول مدّت کے سبب سے غنیم کی سپاہ کو بال بچوں کے فکر ہوئے لشکر کو چھوڑ ادھر بھاگنے لگے۔ مگر مظفر کہاں سُنتا تھا۔ جس حال میں تھا قائم رہا۔ فوجوں میں روز چھینا جھپٹی ہو جاتی تھی۔ مگر ایک دن میدان ہؤا۔ اور میدان بھی وہ ہؤا کہ فیصلہ ہی ہو گیا۔

دونوں سپاہ دار اپنی اپنی سپاہ کو لے کر نکلے۔ اور قلعے باندھ کر سامنے ہوئے۔ اوّل خان اعظم کے بائیں کی فوج پیش قدمی کر کے بڑھی۔ اور ایسی بڑھی کہ ہراول سے بھی آگے نکل گئی۔ اور پل کے پل میں غنیم کی فوج سے چھُری کٹاری ہو گئے سرداروں نے خود بڑھ کر تلواریں ماریں۔ اور ایسے لڑے کہ مر گئے۔ افسوس یہ کہ جو فوجیں خان اعظم نے مدد کو رکھی تھیں وہ پہلو بچا کر پیچھے آ گئیں۔ اور دشمن اُن کا پیچھا کرتا ڈیروں تک چلا آیا۔ اُسے وہاں پہنچ کر چاہئے تھا کہ پیچھا مارتا۔ اُس نے گٹھڑیاں باندھنی شروع کر دیں۔ البتہ ہراول ہراول سے خوب ٹکرایا۔ اور باقی فوجیں بھی بڑھ بڑھ کر دست و گریبان ہو گئیں۔ لشکرِ غنیم راجپوت گھوڑوں سے کود پڑے۔ اور کمر پٹکے آپس میں

باندھ باندھ کر سدِ سکندر کی طرح ڈٹ گئے ۔ کام تیر تفنگ سے گزر گیا۔ اور دست بدست
معاملہ آ پڑا۔ قریب تھا کہ لشکر شاہی کا حال بدحال ہو جائے۔ اتنے میں آگے کی فوج
نے بڑھ کر غنیم کے بائیں کو اُلٹ دیا۔ خان اعظم منتظر وقت کھڑا تھا۔ جھٹ لشکر کو
للکارا۔ اور گھوڑے اُٹھائے۔ اُسے خدائی اقبال کہنا چاہیئے۔ کہ ادھر اُس نے باگ
لی۔ اُدھر دشمن کے قدم اُکھڑے۔ مظفر اور جام بے ہوش بدحواس بھاگے۔ اُس کے کئی
سردار دو ہزار بہادروں کے ساتھ میدان میں کھیت رہے۔ تھوڑی دیر میں سامنا
صاف ہو گیا۔ نقد و جنس۔ توپ خانہ۔ ہاتھی۔ سامان امارت اور اسباب جاہ و حشمت
جس قدر فوج شاہی کے ہاتھ آیا۔ اُس کا حساب نہیں۔ اکبری لشکر کے سو بہادروں
نے جانیں عزّت پر قربان کیں۔ اور پان سو نے زخموں سے چہرہ گلرنگ کیا۔ شیخ فیضی نے
فتوحاتِ عزیزی (۹۹۹ھ) تاریخ کہی +

خان اعظم سخاوت کے شہزادہ تھے۔ اور کیوں نہ ہوں؟ بادشاہ کے بھائی
تھے۔ امرائے لشکر کو خلعت۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ نقد و جنس بے حساب دیئے۔
انشاء پرداز بھی اچھے تھے۔ بادشاہ کو اپنی لڑائی کا نامہ خوب بنا بنا کر لکھا۔ وہاں بھی
اندر محلوں میں باہر درباروں میں بڑی مبارک بادیں ہوئیں۔ خان اعظم کے سردار
غنیموں کے پیچھے دوڑے۔ **خورم** فرزند فوج لے کر مظفر کا پتا لیتا چلا۔ رستے میں بعض
قلعوں کو فتح کرنا چاہا۔ مگر امرائے ہمراہی کی سُستی سے کام کی درستی نہ ہوئی۔ خان اعظم نے
بھی اس وقت فوج کا بڑھانا اور ملک کا پھیلانا مصلحت نہ سمجھا۔ ہاتھ پاؤں ساتھ نہ دیں تو
دل کیا کرے۔ امرا اور فوجوں نے اپنے اپنے علاقوں میں آرام لیا +

۱۰۰۰ھ میں خبر لگی کہ دولت خاں جو جام کی لڑائی میں تیر کھا کر بھاگا تھا۔
تیر اجل کا نشانہ ہوا۔ خان اعظم لشکر آراستہ کر کے نکلا۔ اور جوناگڈھ کی تسخیر پر کمر
باندھی۔ کہ ملک سوہرٹھ کا حاکم نشین شہر تھا۔ پہلا شگون یہ ہوا کہ جام کے بیٹے اُس
ملک کے چند سرداروں کے ساتھ آکر لشکر میں شامل ہو گئے۔ ساتھ ہی کوکہ بنگلور
سومنات اور ۱۶ بندر بے جنگ قبضہ میں آگئے۔ قلعہ جوناگڈھ کی مضبوطی فولاد کے
ساتھ شرط باندھے کھڑی تھی۔ خان اعظم نے توکّل بخدا محاصرہ ڈالا۔ معلوم ہو گیا تھا۔
کہ کاٹھی لوگ قلعے میں رسد پہنچا رہے ہیں۔ ایک سردار کو بھیج کر ان کا بندوبست کیا

اقبال اکبری کا زور دیکھو۔ کہ اُسی دن قلعے کے میگزین میں آگ لگ گئی۔ غنیم نے اگرچہ نقصان سخت اُٹھایا۔ مگر حوصلہ ذرا نہ ٹوٹا۔ قلعے والے اور بھی گرم ہوئے۔ سَو توپ پر فتیلہ پڑتا تھا۔ اور برابر ڈیڑھ من کا گولہ گرتا تھا۔ پرتگالی توپچی نے گول اندازی میں ایسی جان لڑائی کہ گولی کی طرح حوصلہ سے نکل پڑا۔ اور خندق میں گر کر ٹھنڈا ہو گیا خان اعظم نے بھی سامنے ایک پہاڑی ڈھونڈھ کر نکالی۔ اس پر توپیں چڑھائیں اور قلعے پر گولے اتار نے شروع کر دیئے۔ قلعے میں بھونچال اور قلعہ والوں میں تلاطم مچ گیا۔ خلاصہ یہ کہ قلعہ والے تنگ ہو گئے۔ آخر میاں اور تاج خان پسران دولت خاں نے کنجیاں حوالہ کر دیں۔ اور پچاس سردار صاحب نشان و لشکر آکر حاضر ہوئے۔ خان اعظم نے اُن کی بڑی دلداری کی۔ بھاری خلعت۔ بلند منصب اور بڑی بڑی جاگیریں دے کر خوش کیا۔ خود بھی بہت خوشی کے جشن کئے۔ ہاں جو بادشاہ کے بھائی ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور خوش کیوں نہ ہوں اب تو سومنات قبضے میں آیا۔ محمود غزنوی ہو گئے۔ اور حق بھی یہ ہے کہ بڑا کام کیا۔ اکبری سلطنت کا باٹ سمندر کے کنارے تک پہنچا دیا۔ یہ کچھ تھوڑی خوشی کا مقام نہیں۔ اکبر کو بھی اس بات کی بڑی آرزو تھی۔ کیونکہ اُسے دریائی طاقت کے بڑھانے کا دل سے خیال تھا۔

اب خان اعظم سمجھا کہ جب تک مظفر ہاتھ نہ آئیگا۔ یہ فساد فرو نہ ہو گا۔ اس نے کئی سردار نامی فوجیں دے کر روانہ کئے۔ اور انور اپنے بیٹے کو ساتھ کیا مظفر نے ملک ہار کے راجہ کے پاس پناہ لی تھی کہ دوارکا کا مندر وہیں ہے راجہ بھی اس کی مدد پر کمر بستہ ہوا۔ یہ فوجیں اس طرح سرتوڑ پہنچیں کہ دوار کا بے جنگ ہاتھ آگیا۔ راجہ نے مظفر کو اہل و عیال سمیت ایک جزیرے میں بھیج دیا تھا جب اُنہوں نے راجہ کو دبایا۔ تو وہ بھی اُس کے پیچھے بھاگا۔ اُنہوں نے گھوڑا اُٹھا کر رستے میں جا لیا۔ وہ پلٹ کر اڑا۔ اور خوب جان توڑ کر لڑا۔ دریا کے کنارے تھے۔ زمین کہیں بلند۔ کہیں گہری۔ جگہ ناہموار۔ سوار کا گزارہ نہ تھا۔ اکبری بہادروں نے گھوڑے چھوڑ دیئے۔ اور خوب تلواریں ماریں۔ راجہ اور اُس کی فوج نے بھی کمی نہیں کی۔ شام تک تلوار کی آنچ سے میدان میں آگ لگی ہوئی تھی۔

مگر قضا سے کون لڑے۔ گلے پر چھوٹا سا تیر کھا کر راجہ کی گلو خلاصی ہوئی۔ مگر مظفر گڑھوں میں گرتا پڑتا نکل کر کچھ میں پہنچا۔ وہاں کے راجہ نے چھپا رکھا۔ اور مشہور ہؤا کہ دریا میں ڈوب گیا +

خان اعظم کو جب خبر پہنچی۔ تو عبد اللہ اپنے بیٹے کو اور فوج دے کر کچھ کو روانہ کیا۔ عام یہ خبر سُن کر گھبرایا۔ بال بچوں کو لے کر دوڑا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ تہمت یا بدگمانی میرے خانۂ دولت کو برباد کر دے۔ عبد اللہ سے رستے ہی میں آکر ملا۔ اور بنیاد اخلاص کو مستحکم کیا۔ کچھ کے راجہ نے بھی وکیل بھیجے۔ بہت سا عجز و انکسار کیا۔ اور کہا کہ بیٹے کو حاضر دربار اور مظفر کی تلاش کرتا ہوں۔ یہ روئیداد خان اعظم کے پاس جوناگڈھ میں پہنچی۔ اُس نے لکھا۔ کہ اگر صدق دل سے دولت خواہی بادشاہی اختیار کی ہے تو مظفر کو ہمارے حوالہ کر دو۔ اُس نے پھر لمبی لمبی تقریریں ایچ پیچ کے جملوں میں ملفوف کر کے بھیجیں۔ خان اعظم نے کہا کہ فقروں سے کام نہیں چلتا۔ غنیم کو میرے حوالے کرو۔ نہیں تو برباد کرونگا۔ اور ملک تمہارا جام کے دامن میں ڈال دونگا۔ راجہ کا مطلب اس طول میں فقط وقت گزارنا تھا۔ کہ شاید کوئی اور نکاس کا پہلو نکل آئے۔ جب سب رستے بند پائے۔ تو کہا مورپی کا ضلع قدیم سے میرے علاقے میں تھا۔ وہ مجھے دے دو۔ اور جگہ بتا دیتا ہوں۔ تم جا کر گرفتار کر لو۔ خان اعظم نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ چند سوار ادھر سے روانہ ہوئے۔ جام کے آدمی ساتھ گئے۔ مظفر بے خبر بیٹھا تھا۔ اُس سے کہا۔ کہ فلاں سردار تمہاری ملاقات کو آیا ہے۔ وہ بے تکلف نکل آیا۔ خان اعظم کے سپاہیوں نے چاروں طرف سے گھیر کر پکڑ لیا۔ خوشی کا جوش کہتا تھا۔ کہ ابھی لے اُڑیں۔ اور مصلحت کہتی تھی۔ کہ اگر رستے میں اُس کے جاں نثار آکر جانوں پر کھیل جائیں تو کیا ہو۔ بہر حال اندھیرے کے پردے کا انتظار کیا۔ اور راتوں رات خان اعظم کی طرف لے کر دوڑے۔ مظفر صبح ہوتے نماز کے بہانے اُترا۔ اور طہارت وضو کے لئے ایک درخت کے نیچے گیا۔ جب دیر تک نہ آیا تو اُنہوں نے آواز دی۔ وہاں سے جواب بھی نہ آیا۔ آخر جا کر دیکھا۔ بکرا سا ذبح کیا پڑا تھا۔ اُسے بھی اسی روز سیاہ کا خیال تھا۔ اس لئے حجامت کے لوازمات پاس

رکھا کرتا تھا۔ کہ اُس میں اُسترا ابھی لگا رہے۔ آج کام آیا۔ سرکٹ کر خان اعظم کے پاس آیا۔ اُس نے روانہ دربار کر دیا۔ کہ فسلوی جڑھ کٹ گئی۔

۹۸۸ھ میں خان اعظم سے وہ کام ہوا۔ کہ تمام اہل تاریخ اس کی تعریفوں کے وظیفے پڑھتے ہیں۔ اور ملا صاحب نے تو اس کی دینداری پر اپنی انشا پردازی کے سہرے چڑھائے ہیں۔ مگر تھوڑی سی تمہید بغیر اس معاملے کا مزا نہ آئیگا۔ یہ تو تم نے بار بار سُن لیا۔ کہ اکبر نے انہیں فرزندی کا خطاب دے رکھا تھا۔ اور اپنی خدمت میں رکھ کر تربیت کیا تھا۔ جیسا عزیز اس کا نام تھا ویسا ہی اُسے عزیز رکھتے تھے۔ اور تمام ارکان دولت میں عزت دیتے تھے۔ اپنی خواصی میں بٹھاتے تھے۔ اور خاص خاص موقع پر اُسے ضرور یاد کرتے تھے۔ لیکن اس کی طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی۔ کہ ہمیشہ جاہل اور کوتہ اندیش بلکہ ضدی اور لاڈلے بچوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر بگڑ بیٹھتا تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ اکبر اُس کی گستاخیوں کا بھی کچھ خیال نہ کرتا تھا۔ بلکہ خود اُسے مناتا تھا۔ اور عنایت و انعام سے خوش کرتا تھا۔ ایک پیچ یہ بھی تھا۔ کہ خان اعظم شیخ ابوالفضل کو اکبر کی عقل کی کنجی سمجھتا تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا۔ کہ شیخ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جو احکام اس کی خلاف مرضی دربار سے پہنچتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ شیخ کی فطرت ہے۔ اُس کا ترکانہ مزاج اور سپاہیانہ طبیعت اپنی آزردگی کو چھپا نہ سکتے تھے۔ صاف صاف ظاہر بھی کر دیتے تھے۔

خان اعظم سپاہی زادہ تھا۔ اور خود سپاہی تھا۔ ایسے لوگوں کو مذہب کی پاسداری ہوتی ہے۔ تو سخت تعصب کے ساتھ ہوتی ہے۔ دربار میں تحقیقات مذاہب اور اصلاح اسلام کی تدبیریں جاری تھیں۔ اس اصلاح میں ڈاڑھیوں پر ایسی وبا آئی تھی۔ کہ اکثر امرا بلکہ علماء نے ڈاڑھیاں منڈوا ڈالی تھیں۔ داڑھی کی جڑ کو ڈھونڈھ کر پتال سے نکالا تھا۔ ملا صاحب نے تاریخ کہی تھی۔ جس کا مصرعہ مقصود ہے۔ ع

بگفتار ریشہا بر باد دادہ مفسدے چندے

انہی دنوں میں وہ بنگالہ سے فتح پور میں آیا ہوا تھا۔ یہاں ہر وقت یہی چرچے رہتے تھے۔ اُس کے سامنے کسی مسئلے میں بحث ہونے لگی۔ ضدی سپاہی کو اُس وقت مذہب کی ضد آگئی۔ اُس نے بھی گفتگو شروع کی۔ وہاں علماو فضلا ر

کے خاکے اُڑجاتے تھے۔ یہ تو کیا حقیقت تھے۔ اُنہوں نے بہت زورِ طبیعت اور مبلغ استعداد دکھایا ہوگا۔ تو مولانا روم کی مثنوی یا حدیقۂ حکیم سنائی کے شعر سند میں پڑھے ہونگے۔ وہاں یہ سپر کیا کام آتی تھی۔ غرض سپاہی بگڑا دل تو پہلے ہی سے دل میں بھرے تھے۔ نوبت یہ ہوئی کہ بادشاہ کے سامنے ہی شیخ کو اور بیر بر کو آگے دھر لیا۔ اگرچہ تعزیر عام بے دین اور بداعتقادوں کے باب میں کرتے تھے۔ مگر بات کا رخ انہی دونوں کی طرف تھا۔ خیر وہ جلسہ انہی مکھم باتوں میں طے ہوگیا۔

اس کے علاوہ بادشاہ نے آئین باندھا تھا۔ کہ امرائے سرحدی کو ایک مدت مقررہ کے بعد موجودات دینے کو حاضر ہونا چاہیئے۔ خان اعظم کے نام فرمان طلب گیا۔ قدیمی لاڈلے تھے۔ متواتر فرمان گئے۔ نہ آئے۔ اکبر کے احکام ابوالفضل کی انشاء پردازی۔ رنگارنگ کے مضامین دست بستہ حاضر تھے۔ خدا جانے کیا کیا لکھا۔ مگر انشا پردازی کا ایک جادو نہ چلا۔ ان کی داڑھی بہت لمبی تھی۔ اور اس کے باب میں تقریریں اور تحریریں ہوچکی تھیں۔ مآثرالامرا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک دفعہ یہ بھی لکھا گیا "ظاہر اپشم ریش شما گرانی میکند کہ ایں ہمہ تعلل در آمدن دارند"۔ جام کی لڑائی پر قرار پایا تھا۔ کہ منت مانو یہ مہم فتح ہو جائیگی تو داڑھی درگاہ اکبری میں چڑھاؤں گا۔ جب مہم فتح ہوئی تو ادھر سے تقاضے شروع ہوئے۔ اس نے جواب میں داڑھی سے بھی لمبی عرضی لکھی اور سخت لکھی۔ یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ مگر وہ حاضر دربار نہ ہوا تھا۔ سینکڑوں مقدمات مالی و ملکی تھے۔ دربار سے اکثر احکام اور بھی کچھ اُس کے خلاف مقصد کچھ خلاف طبع گئے۔ خدا جانے وہ شیخ کی خطرت تھی۔ یا خان کی بدگمانی تھی۔ اس کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ سیدھا سپاہی۔ صاف صاف آزردگی اور نہایت آشفتگی ظاہر کرتا تھا۔ ان میں کبھی کبھی یہ بھی لکھتا تھا کہ میں نے دنیا چھوڑ دی۔ حج کو چلا جاؤنگا۔ غرض اب اکبر کو خبر نویس کی تحریر سے اور بعض امرا کے عرائض سے بھی معلوم ہوا کہ اُس ہٹیلے نے مصمم ارادہ کرلیا۔ بادشاہ نے فرمان لکھے اور بڑھیا ماں نے برابر خطوط لکھے۔ کہ خبردار خبردار ایسا ارادہ نہ کرنا۔ مگر وہ کب سننے والا تھا۔ جو کرنا تھا

دہی کر گزرا ٭

ملا صاحب نے مرزا کوکہ کے حج کو جانے کا حال لکھ کر اکبر کی بد مذہبی کے اشاروں سے عجب بدنما عکس دلوں پر ڈالا ہے۔ اُسے پڑھ کر مجھے بھی خیال تھا۔ کہ وہ خوش اعتقاد امیر فقط جوش دینداری سے ہندوستان چھوڑ کر نکل گیا۔ پھر مدت دراز میں جب بہت سی کتابیں نظر سے گذریں تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہ تھا۔ جہاں اور بچوں کی سی ضدیں تھیں، وہاں یہ بھی ایک بات تھی۔ مثلاً یہ کہ فرمانوں کی پشت پر جہاں میری مہر ہوتی تھی۔ وہاں قلیچ خاں کی مہر کیوں ہوتی ہے۔ اور جو کام میں کرتا تھا وہ قلیچ خاں اور ٹوڈرمل کیوں کرتے ہیں۔ چنانچہ ابوالفضل کے دفتر دوم میں ایک بڑا طولانی مراسلہ ہے۔ کہ شیخ موصوف نے خان اعظم کے نام لکھا ہے۔ اول ڈیڑھ بلکہ دو صفحے میں بہت سی حکمت اخلاق اور فلسفہ و اشراق سے تمہیدیں پھیلائی ہیں۔ بعد اس کے جو کچھ لکھتے ہیں۔ اس کا ترجمہ کرتا ہوں۔ اور جس قدر ممکن ہے۔ مطابقت الفاظ کے ساتھ لکھتا ہوں۔ مراسلہ مذکور اگرچہ ظاہر میں شیخ کی طرف سے ہے۔ مگر حقیقت میں بادشاہ کے ایما سے لکھا ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی کئی خط ہیں۔ جن سے دلداری اور دلجوئی کے دودھ اور شربت ٹپکتے ہیں۔ غرض شیخ مراسلہ مذکور میں لکھتے ہیں۔ جو کچھ میں سمجھتا ہوں۔ اس کے لکھنے سے پہلے سرگذشت واقعی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قرۃ العین شمس الدین احمد نے نامۂ والا شکوہ (تمہارے لڑکے نے تمہارا خط) عرض اقدس میں پہنچایا۔ چونکہ حضرت مقام وفور عنایت و عطوفت میں تھے۔ یکبارگی حیران رہ گئے۔ اگرچہ پہلے ہمیشہ خلوتوں میں تمہارے اخلاص قدیمی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی کوتہ اندیش حرف نامناسب تم سے منسوب کرتا تھا۔ تو اس قدر مہربانی ظاہر فرماتے تھے کہ وہ تنگ حوصلہ شرمندہ ہو جاتا تھا۔ ہمیشہ تمہارے خشکی دماغ[1] کے دنوں میں خلوت اور دربار میں نہایت توجہ ظاہر ہوتی تھی۔ خصوصاً ان دنوں میں کہ اخلاص دولت

[1] خشکی دماغ کے لفظ کو دیکھو۔ اور مؤرخوں نے بھی قید سابقہ کے ذکر میں یہی لفظ استعمال کیا ہے معلوم ہوتا ہے اس وقت جو دربار میں آپ نے یاوہ گوئی کی تھی اور نظر بند ہوئے تھے اس حرکت ناشائستہ کا نام خشکی دماغ رکھا گیا تھا اور قید کا حکم اس پردے میں تھا کہ علاج معالجہ ہوتا ہے ٭

کی (میری) رفاقت اور توجہ شہنشاہی کی برکت سے تم رحمت الٰہی کے منظور نظر ہو کر
خدمات لائقہ سے کامیاب ہوئے۔ کیا جام کی فتح۔ کیا جوناگڈھ کی۔ کیا تنّو (مظفرؔ)
وغیرہ کا گرفتار کرنا۔ کیا کہوں۔ کہ حضرت کیسے تمہارے مشتاق ہوئے ہیں۔
دن رات تمہاری یاد میں گزرتی ہے۔ ہمیشہ اس بات کے طلبگار ہیں۔ کہ کب وہ
دن ہوگا۔ کہ اپنے سامنے تمہیں مرحمت ہائے خسروانہ سے مالامال کریں +

جو کچھ تم نے والدۂ مقدسہ اور فرزندانِ عزیز کو لکھا تھا۔ اُس سے ایسا شوق
آستان بوسی ظاہر ہوتا تھا۔ کہ اسی نوروز عالم افروز میں اپنے تئیں پہنچاؤ گے نوروز
نہیں۔ تو شرف آفتاب میں تو خواہ مخواہ پہنچو گے۔ دفعتہً ایک شخص نے عرض کی۔ کہ
تم سرانجام خدمت کو ناتمام چھوڑ کر اس خیال سے خود جزیرے کو چلے گئے کہ اسے
تسخیر کرو گے۔ حضور کو تعجب ہؤا۔ اس خیرخواہِ جمہور سے (مجھ سے) پوچھا۔ میں نے
عرض کی۔ کہ ایسی باتیں دشمن کے سوا کوئی نہیں کہہ سکتا۔ وہاں کچھ دغدغہ ہوگا۔ خود
ملازمت حضور میں آنے والے ہیں۔ گئے ہونگے تو اس لئے گئے ہونگے کہ جا کر خرخشہ
صاف کر دیں۔ اور خاطر جمع سے حضور میں آئیں۔ خلوص عقیدت میں فتور واقع ہو؟
یہ کب ہو سکتا ہے۔ حضور نے پسند فرمایا۔ اور کہنے والا شرمندہ ہو گیا۔ اب کہ
حضرت حد سے زیادہ تم پر متوجہ ہیں۔ اور اس سبب سے کہ عنایت روز افزوں
حضور کی تمہارے باب میں جلوۂ ظہور دے رہی ہے۔ کوتاہ حوصلہ ناتواں ہیں۔ پیچ و
تاب میں ہیں۔ اتفاقاً کشن داس (تمہارا وکیل) پہنچا۔ اور جو خط تم نے مجھے لکھا تھا۔
مجھ سے مشورہ کئے بغیر ہی حضور کے دست اقدس میں دیا۔ حسب الحکم قرۃ العین
شمس الدین نے مضمون عرض کیا۔ سُن کر بہت تعجب ہؤا۔ کمترین سے فرمایا دیکھو
ہماری عنایت کس درجہ پر ہے۔ اور عزیز اب بھی اس طرح لکھتا ہے۔ جہاں اسکی
مہر ہوتی تھی۔ پہلے یہاں مظفر خاں۔ راجہ ٹوڈرمل اور اور لوگ مہر کرتے تھے یہ گلہ تھا
تو اس وقت کرنا چاہئے تھا۔ اگرچہ وہاں بھی گلہ کرتے ہیں۔ تو اس قوت بازوئے
سلطنت کے (تمہارے) حق میں ہماری بے عنایتی کی دلیل نہیں ہو سکتی تھی۔ بات
فقط یہ ہے۔ کہ گھر کے کام آخر کسی سے لینے چاہئیں۔ جس کو یہ خدمتیں سپرد ہوں۔
ایک مقام پر مہر کرنی اسی خدمت کا جز ہے۔ اعظم خاں گھر میں ہو۔ اور اس خدمت

پر متوجہ ہو۔ تو اوّل اور اولیٰ۔ وہ جس طرح امیر الامرا ہے۔ امیر معاملہ بھی ہوگا۔ یہ سب اُس کے تابع ہوں گے۔ یہ بدگمانی تمہاری خاطر اقدس کو ذرا ناگوار ہوئی۔ خیر خواہان بزم مقدس نے (میں نے) مناسب موقع باتیں عرض کرکے بہت اچھی طرح اس کا تدارک کر دیا۔ قرۃ العین کو جو تم نے لکھا تھا۔ اور جو واقعہ تم نے دیکھا تھا۔ اور فتوحات مذکورہ کو اس کا نتیجہ سمجھا تھا۔ اس کا ذکر کر دیا۔ جو نذر تم نے بھیجی تھی۔ وہ خیال شہنشاہی کی اور جو کچھ تمہارے مخلصوں نے کہا تھا۔ اُس کی بھی مؤیّد ہوئی"۔

پھر لمبی تقریروں میں تقریباً دو صفحہ حکمت اخلاق کے طور پر لکھتے ہیں۔ اور مختلف طبقات انسان کی تفصیل و تقسیم کرکے کہتے ہیں۔ قلیچ خاں کا شکوہ بیجا ہے۔ تم اور طبقہ سے وہ اور گروہ سے۔ باوجود اس کے منصب حالت اور اعتبار میں تمہارے پاسنگ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ تم کو کہ تمہاری فرزندی کی نسبت اس کے خاص الخاص۔ بادشاہی توجہیں تمہارے لئے تمام۔ بادشاہ زبان گوہر فشاں پر فرزند کا لفظ تمہارے لئے آتا ہے۔ اُس سے قطع نظر جو خدمات شائستہ تم سے اور تمہارے خاندان سے ہوئیں۔ زمانے کے کون سے امیر کو یہ رتبہ ہے۔ کہ اس مجموعے میں تمہارے ساتھ برابری کر سکے۔ پھر تمہیں کب زیبا ہے۔ کہ اُس کا نام اپنے پدر بزرگوار کے برابر لاکر شکوہ کرو۔ اور مرزا اور راجہ کا نام لے کر اپنے برابر کر دو۔ ہاں یہ غصّے کی رنگ آمیزیاں ہیں مگر غضب ہے۔ کہ تم جیسے بزرگ کے پاس غصّے کو راہ ہو۔ اور اس سے ایسے دب جاؤ۔

اگر کنارہ کشی سبب مذکور سے بیجا ہے۔ تو آخر پہلے بھی یہی حال تھا (کہ تم سے پہلے اور لوگ اس عہدے پر کام کرتے۔ پس تم نے ان کی جگہ کام کرنا کیونکر گوارا کر لیا تھا) اور بات تو وہی ہے جو کہ زبان شہنشاہی پر گذری ہے "عزیز من مجلسوں میں کیسے کیسے آدمی کیسے آدمیوں کی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر غصّے ہو کر گلہ کرو تو وہاں بھی کرو۔ کہ کیسا آدمی کیسے آدمی کی جگہ بیٹھ گیا ہے۔ مہر تو ایک نام کا نقش ہے۔ کہ دوسرے نقش کی جگہ ہو گیا۔ دیکھو تو سہی۔ اس میں اور اُس میں کہاں سے کہاں تک فرق ہے"۔

پھر ایک ڈیڑھ صفحہ کا طول کلام کر کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔ چونکہ تم دولت خواہ حقیقی اس درگاہ کے ہو۔ اس لئے میں نے اتنا طول کلام کیا۔ اب دو کلموں پر اختصار کرتا ہوں۔ کہ تم کسی چیز کے پابند نہ ہو۔ آستان بوسی کا ارادہ کرو۔ اور اپنے تئیں حضور میں پہنچاؤ۔ کہ یہاں خورمی۔ خوشحالی۔ کامروانی کے سوا کچھ اور نہ ہوگا۔ ظاہرا تو یہی ہے۔ کہ چل لئے ہوگے۔ تم بزرگ زمانہ ہو۔ اگر خاطر روشن ادھر مائل ہو۔ تو اور باتیں کہوں۔ کہ دین و دنیا میں کام آئیں۔ ورنہ خیر اندیشی دائم تو قائم ہے۔ کہ دادار جہاں آفرین نے دل کو عطا کی۔ دل نے ہاتھ کے حوالہ کی۔ اس نے قلم کو دی۔ قلم نے کاغذ پر لکھ دی خدا ہمیں اور تمہیں ان باتوں سے محفوظ رکھے۔ جو کہ باید و شاید نہیں +

اُس نے بھی جواب میں ان کی موچھیں پکڑ پکڑ کر خوب ہلائی ہیں۔ ایک پُرانے مجموعہ میں سے اُس کی اصل عرضداشت کی نقل میرے ہاتھ آئی +

ایک عرضداشت عین روانگی کے وقت لکھی ہے۔ اُس میں اور مطالب بھی مندرج ہیں۔ اس مطلب کے متعلق جو فقرے ہیں ان کا ترجمہ لکھتا ہوں "

بدخواہان دین و دولت نے آپ کو راہِ راست سے ہٹا کر بد عاقبتی کے رستے میں بدنام کر دیا ہے۔ اور نہیں جانتے۔ کہ کون سے بادشاہ نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے۔ آیا کلام اللہ جیسا قرآن آپ کے لئے نازل ہوا ہے۔ یا شق القمر جیسا معجزہ آپ سے ہوا ہے؟ چار یار با صفا جیسے اصحاب آپ کے ہیں؟ کہ آپ اپنے تئیں بدنامی سے متّہم کرتے ہیں۔ بہ نسبت ان خیر خواہوں کے جو حقیقت میں بدخواہ ہیں۔ عزیز کوکہ فدویت رکھتا ہے۔ اور قصد بیت اللہ کرتا ہے۔ اس ارادہ سے کہ وہاں بیٹھ کر آپ کے لئے راہِ راست پر آنے کی دُعا کرے گا۔ اُمّیدوار ہے کہ اس گنہگار کی دُعا قاضی الحاجات کی درگاہ میں قبول ہو کر اثر بخشے گی۔ اور وہ آپ کو راہ راست پر لائیگا +

ان دنوں اُس کے حسن تدبیر اور آب شمشیر سے دریائے شور کے کنارے تک اکبری عملداری پہنچ گئی تھی۔ اور پندرہ[1] بندر حلقۂ حکومت میں آ گئے تھے۔ جوں جوں بادشاہ لطف و محبت کے فرمان لکھتے گئے۔ اس کا وہم بڑھتا گیا۔ خدا جانے کیا سمجھا۔ کہ ہرگز آنا مناسب نہ دیکھا۔ اُس نے وہاں کے لوگوں میں یہ ظاہر

[1] دیکھو! کہاں سے کہاں تک سمندر کا کنارہ قبضے میں آگیا ہے +

کیا۔ کہ بندر دیو کو دیکھنے جاتا ہوں۔ فقط چند غمگسار مصاحبوں سے راز کھولا۔
اور کسی سے ذکر نہ کیا۔ اول بندر پور پر پہنچا۔ یہ مقام سمندر کے کنارے تھا۔
اُس میں بڑا وسیع اور سنگین قلعہ تھا۔ اور گھر بھی اکثر سنگین ہی تھے۔ یہاں سے
بنگلور آیا۔ اور وہاں کے لوگوں سے کہا۔ کہ بندر دیو کو دبانے جاتا ہوں۔ امرائے
شاہی کو رخصت کر کے اُن کی جاگیروں پر بھیج دیا۔ حکّام بندر سے اقرار نامے
لئے۔ کہ آپ کی بے اجازت سوداگرانِ ملک غیر کو لنگرگاہِ دیو میں نہ آنے دیں گے۔
مطلب اس سے یہ تھا کہ پرتگالی قوم برسا کو دبائے اور دھمکائے رکھے۔ اُس کا
رعب وداب ایسا پھیل رہا تھا۔ کہ وہ دب گئے۔ اور خاطر خواہ شرطوں پر اقرار نامے
لکھ دیئے۔ مرزا نے کئی جہاز بادشاہی بنوائے تھے۔ ان میں ایک کا نام جہاز الٰہی
تھا۔ یہ بھی اقرار ہو گیا کہ جہاز الٰہی آدھا دیو بندر میں بھرینگے۔ باقی آدھے کو جہاں
کپتان جہاز چاہے بھرے۔ خرچ اس کا کہ ۱ہزار محمودی ہوتا تھا۔ ان سے
طلب نہ کرے۔ جہاز جہاں چاہے جائے کوئی روک نہ سکے۔ جام اور بہار
ادھر کے با اقتدار حاکم تھے۔ انہیں اسی دھوکہ میں رکھا۔ کہ ہم براہِ سمندر بندر بندر
سندھ پہنچینگے۔ وہاں سے ملتان کے رستے دربار حضور میں جا کر آداب بجا لائینگے۔
تمہیں رفاقت کرنی ہوگی۔ اس عرصے میں کنارہ کنارہ منزل بمنزل چلا جاتا تھا۔
کہ پرتگالیوں کا عہد نامہ بھی دستخط ہو کر آ گیا۔ سومنات کے گھاٹ پر پہنچ کر بخشی
بادشاہی وغیرہ اشخاص کو قید کر لیا۔ کہ مبادا فوج کو سمجھا کر متفق کر لیں۔
اور مجھے روکیں +

سومنات کے پاس بندر بلاور میں پہنچ کر جہاز الٰہی پر سوار ہوا۔ خرم۔
انور۔ عبد الرّسول۔ عبد اللطیف۔ مرتضیٰ قلی۔ عبد القوی چھ بیٹوں کو اور چھ بیٹیوں
اور اہل حرم۔ نوکر چاکر۔ لونڈی۔ غلاموں کو اس میں بٹھایا۔ ملازم بھی سو سے زیادہ
ساتھ لئے۔ نقد و جنس سے جو کچھ ساتھ لے سکا وہ بھی لیا۔ کھانے پینے کے لئے کافی
ذخیرہ بھرا۔ اور ہندوستان کو ہندوستانیوں کے حوالے کر دیا +

جس وقت وہ خیمہ سے نکل کر جہاز کی طرف چلا۔ ایک عالم تھا۔ جس کے
مشاہدے سے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو اور دلوں میں دریائے شوق

لہراتے تھے۔ تمام لشکر اور فوجیں آراستہ کھڑی تھیں۔ جب وہ لشکر کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔ نقاروں پر ڈنکے پڑے۔ پلٹنوں اور رسالوں نے سلامی دی۔ ترم اور طنبور۔ ساز فرنگی۔ عربی۔ ہندی باجے بجنے لگے۔ جو سپاہی ہمیشہ لڑائیوں اور پردیس کے دُکھوں۔ سردی گرمی کے دنوں میں اس کے شریک حال اور احسانوں اور انعاموں سے مالا مال رہتے تھے۔ غم سے لبریز کھڑے تھے۔ جن لوگوں کو قید کیا تھا۔ چھوڑ دیا۔ اور معذرت کر کے خطا معاف کروائی۔ سب سے دُعا کی درخواست کی۔ اور لمبے لمبے ہاتھوں سے سلام کرتا ہوا جہاز میں جا بیٹھا۔ ناخدا سے کہا۔ کہ خانۂ خدا کے رُخ پر بادبان کھول دو۔ ملّا صاحب نے تاریخ کہی ؎

بجائے راستان شد خان اعظم	دلے در زغم شاہنشاہ کج رفت
چو پرسیدم ز دل تاریخ سالش	بگفتا میرزا کوکہ بہ حج رفت

نازبردار بادشاہ کو جب یہ خبر پہنچی۔ تو ناگوار بھی ہوا۔ اور رنج بھی ہوا۔ دل کے خیالات عجیب وغریب فقروں میں زبان سے ٹپکے۔ اور کہا کہ مرزا عزیز کو میں ایسا چاہتا ہوں۔ کہ اگر وہ مجھ پر تلوار کھینچ کر آتا۔ تو میں ضبط کرتا۔ وہ زخمی کر لیتا۔ تب ہاتھ ہلاتا۔ افسوس اس کم فرصت نے محبت کی قدر نہ جانی اور سفر کر بیٹھا۔ خدا کرے کامیاب مقصد ہو۔ اور خیر و خوشی سے پھر آئے۔ میں یہود اور نصاریٰ اور غیروں سے بھی اپنایت کے رستے بیں ہوں۔ وہ تو پروردگار کے رستے پر جاتا ہے۔ اُس سے کیونکر مخالفت کا خیال ہو سکتا ہے۔ محمد عزیز سے ایسی محبت ہے کہ وہ مجھ سے ٹیڑھا بھی چلے۔ تو میں سیدھا ہی چلونگا۔ - - - - - - - - اُس کی بُرائی نہ چاہوں گا۔ بڑا خیال یہ ہے۔ کہ اگر رنج دُوری میں ماں کا کام تمام ہوگا۔ تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ کاش اب بھی کئے پر پچتائے اور پھر آئے۔ اسی غم و غصہ کے عالم میں اکبر نے کہا کہ چند روز ہوئے۔ جی جی میرے پاس آئیں۔ ایک کٹورہ پانی کا میرے سر پر سے وار کر پیا۔ اور کہا۔ الٰہی بہ خویشتن برگرفتم۔ میں نے حال پوچھا۔ کہا آج رات کو - - - میں نے ایک ایسا ہی خواب دیکھا ہے۔ مجھے کبھی اس بات کا خیال تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ میرے قالب میں بیٹے کو دیکھا تھا۔ اور

جیجی تو مارے غم کے مرنے کے قریب ہوگئی۔ بادشاہ نے بہت دلجوئی اور دلداری کی (شمسی)[1] شمس الدین اس کے بڑے بیٹے نے بچپن سے حضور میں پرورش پائی تھی۔ اُسے ہزاری منصب دیا۔ شادمان کو پانصدی کر دیا۔ آباد جاگیریں دیں۔ اور ادھر ملک جو خالی پڑا تھا۔ اُس کی حکومت مراد کے نام کر کے بندوبست کر دیا +

خانِ اعظم جو یہاں سے گئے تھے۔ تو دماغ میں یہ دعوے بھرے تھے کہ ہم اکبر بادشاہ کے بھائی ہیں۔ اُس کا جلال و جاہ لوگوں سے پیغمبری بلکہ خدائی کے اقرار لیتا ہے۔ اور میں ایسا دیندار حق پرست ہوں کہ اُس کی درگاہ کو چھوڑ کر چلا آیا ہوں۔ مگر وحدہٗ لاشریک ذوالجلال والاکرام کا دربار تھا۔ وہاں انہیں کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ انہوں نے سخاوت کو مدد پر بلایا۔ وہ ہزاروں اور لاکھوں سے حاضر ہوئی۔ لیکن اس دروازے پر ایسے ایسے بہت مینہ برس جاتے تھے۔ شریف مکہ اور وہاں کے خدام و علما خاطر میں بھی نہ لائے۔ بلکہ بے دماغی اور تلخ مزاجی اُن کی مصاحب وہاں بھی ساتھ تھی۔ اور بچوں کی سی ضدیں ہر وقت موجود تھیں۔ ان رفیقوں کی بدولت شرمائے۔ مکہ سے بہت تکلیفیں اُٹھائیں۔ غرض اصلی خدا کے گھر میں گزارہ نہ ہو سکا۔ نقلی خدا کا گھر پھر غنیمت نظر آیا۔ باوجود اس کے مکہ معظمہ و مدینہ منورہ میں حجرے خرید کر وقف کئے کہ حاجی اور زائر آکر رہا کریں۔ مدینہ منورہ کے خرچ ہر سالہ کی برآورد بنا کر پچاس برس کا مصارف وہاں کے شرفا کو دیا۔ اور رخصت ہوئے۔ سفر کی عمر کوتاہ۔ یہاں لوگ سمجھے بیٹھے تھے کہ آپ ہرگز نہ آئینگے +

سنہ ۱۰۰۲ھ میں یکایک خبر آئی کہ خانِ اعظم آگئے۔ اور گجرات میں پہنچ گئے۔ اب حضور میں چلے آتے ہیں۔ بادشاہ پھول کی طرح کھل گئے۔ فرمان کے ساتھ گرانبہا خلعت اور بہت سے عمدہ گھوڑے روانہ کئے۔ محل میں بڑی خوشیاں ہوئیں۔ اُن سے بھی رہا کہاں جاتا تھا۔ گجرات سے عبداللہ کو ساتھ لیا۔ بندر ملاول کے رستے چوبیسویں دن لاہور میں آن حاضر ہوئے۔ خورم کو کہہ دیا کہ تم سارے قافلہ کو لیکر

[1] اکبر اسے شمسی کہا کرتا تھا۔ یہی نام مشہور ہو گیا تھا۔ دیکھنا۔ اس میں بھی وہی اشارہ ہے سورج والا۔

منزل بہ منزل آئے۔ حضور میں آ کر زمین پر سر رکھ دیا۔ اکبر نے اُٹھایا۔ مرزا عزیز۔
مرزا عزیز کہتے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ خوب بھینچ کر گلے لگایا۔
جی جی کو وہیں بلا بھیجا۔ بڑھیا بیچاری سے چلا نہ جاتا تھا۔ بیٹے کی جدائی میں
جاں بلب ہو رہی تھی۔ تھرتھراتی سامنے آئی۔ خوشی کے مارے زار زار روتی تھی۔
وہ اس بے قراری سے دوڑ کر لپٹی کہ دیکھنے والے بھی رونے لگے۔ بادشاہ کے آنسو
جاری تھے۔ اور حیران دیکھ رہے تھے۔ خانِ اعظم نے خدا سے لڑ جھگڑ کر دُعا
قبول کرائی ہو گی۔ پنجہزاری منصب خانِ اعظم خطاب پھر عنایت کیا۔ اور کہا کہ
گجرات۔ پنجاب۔ بہار جہاں چاہو جاگیر لو۔ انہیں بہار پسند آیا۔ بیٹوں کو بھی
منصب اور جاگیریں عطا ہوئیں +

شمس الدین	ہزاری	عبداللہ	۴ صدی
خورم	ہشت صدی	عبداللطیف	۲ صدی
انور	ششش صدی	مرتضیٰ قلی	صدو پنجاہی
شادمان	پانصدی	عبدالقوی	صدو پنجاہی

اب انہیں بھی خوب نصیحت ہو گئی تھی۔ آتے ہی خاص مریدوں کے سلسلے میں داخل ہو گئے۔ حضور میں سجدہ ادا کیا۔ داڑھی درگاہ
میں چڑھائی۔ اور جو جو لوازم خوش اعتقادی کے تھے سب بجا لائے۔ پھر تو ہر صحبت
اور ہمزبانی میں پیش پیش تھے۔ حاجی پور۔ غازی پور جاگیر مل گیا۔ دین الٰہی کے اصول کی علامی
سے تعلیم پانے لگے۔ خاقانی نے خوب کہا: ؎

دریں تعلیم شد عمر و ہنوز ابجد ہمی خوانم	ندانم کے سبق آموز خواہم شد بدیں دانش

۱۰۰۳ھ میں ایسے بڑھے اور چڑھے کہ وکیل مطلق ہو کر سب سے اونچے ہو گئے
چند روز بعد مہر اُزک (مہر انگشتری)، اور پھر مہر توزوک (مہر درباری) بھی انہی کو سپرد
ہو گئی۔ اس کا دو انچ قطر کا دائرہ تھا۔ گرد ہمایوں سے لے کر امیر تیمور تک سلسلہ
چغتائیہ کا دَورہ تھا۔ بیچ میں جلال الدین اکبر بادشاہ کا نام روشن تھا۔ مہر مذکور
فرامین عطائے۔ مناصب و جاگیر اور مہمات ملک داری کے عظیم الشان فرمانوں
پر اعزاز و اعتبار بڑھاتی تھی۔ یہ اُس وقت کی صنعت گری کا عمدہ نمونہ تھا۔
جسے تاریخی کتابوں میں ملا علی احمد کا کارنامہ صنعت کہکر ذکر کیا ہے۔ میں نے کئی
فرمانوں میں دیکھی ہے اور حقیقت میں دیکھنے کے قابل ہے +

لطیفہ - شاہجہان بادشاہ نے **ابو طالب** حکیم اپنے **ملک الشعرا** کو مہرداری کی خدمت عطا کرنی چاہی اُس نے فوراً یہ شعر پڑھا ؎

چو مہر تو دارم چہ حاجت بہ مُہرم	مرا مہرداری بہ از مُہر داری

حکم ہوا کہ سلطنت کے حکم احکام سپرد ہفتے میں دو دن سر دیوان بیٹھا کریں دیوان بخشی مستوفی تمام اہل عمل ان کی ہدایات کے بموجب کام کیا کریں +

سنہ ۱۰۰۸ھ میں جب خود بادشاہ نے قلعہ آسیر کا محاصرہ کیا - یہ ساتھ تھے - مورچوں پر جاتے تھے - اطراف کو دیکھتے تھے - اور حملہ کے رُخ قرار دینے میں ابوالفضل کے ساتھ عقل لڑاتے تھے - حملے کے دن انھوں نے اور اُن کی فوج کی پیشقدمی نے خوب کام کیا +

سنہ ۱۰۰۸ھ میں وہیں جی جی کا انتقال ہوگیا - جو بچپن میں انھیں کند ھے سے لگائے پھرتی تھی - بادشاہ نے بہت غم کیا - چند قدم اس کے جنازے کو کندھا دیا - اور چار ابرو کی صفائی کی - کہ آئین چنگیزی تھا - خانِ اعظم اور اُن کے رشتہ داروں نے بھی صفائی میں ساتھ دیا - اگرچہ حکم دیا تھا کہ اس رسم میں ہماری رفاقت ضرور نہیں - مگر اتنے حکم پہنچنے میں کئی ہزار ڈاڑھیوں کی صفائیاں ہوگئی تھیں +

سنہ ۱۰۱۰ھ میں ہفت ہزاری شش ہزار سوار کا منصب عطا ہوا - اور خسرو ولد جہانگیر سے اُن کی بیٹی منسوب ہوئی - سامان ساچق کہ ایک شاہانہ سواری تھی - اُس کا اندازہ اس سے قیاس کرنا چاہیئے کہ جہاں آرائش کے ہزاروں سامان گرانبہا تھے وہاں ایک لاکھ روپیہ نقد تھا - امرائے دربار ساچق لے کر ان کے گھر گئے - اسی سنہ میں شمس الدین خاں ان کے بیٹے کو دو ہزاری منصب دے کر گجرات بھیج دیا +

سنہ ۱۰۱۱ھ میں **شادمان** اور **عبداللہ** کو ہزاری منصب عطا ہوئے - **انور** ان دونوں سے بڑا تھا - مگر بڑا ہی شرابی تھا - اس لئے نمبر میں سب سے پیچھے پڑا تھا - اب ذرا ہوش میں آیا - اکبری دربار میں ان بچوں کے لئے بہانہ ہی چاہیئے تھا وہ بھی ہزاری ہوگیا +

۱۰۱۴ھ میں نحوست کا سیارہ سیاہ چادر اوڑھ کر سامنے آیا۔ اکبر بیمار ہؤا اور اُس کی حالت نے ناامیدی کے آثار دکھائے۔ تو انہوں نے اور مان سنگھ نے بعض رازداروں کی معرفت اُس کا مافی الضمیر دریافت کیا کہ حکم ہو تو خسرو کی ولیعہدی کی رسمیں ادا کر دی جائیں۔ وہ حقیقت میں جہانگیر سے محبت نہیں عشق رکھتا تھا۔ یا یہ کہو۔ کہ اُس دُور اندیش۔ معاملہ فہم۔ تجربہ کار بادشاہ نے سمجھا۔ کہ اس وقت نئی بنیاد ڈال کر یہ عمارت اُٹھانی برف کے ستونوں پر گنبد قائم کرنا ہے۔ ان کے ارادے تاڑ گیا۔ اور حکم دیا۔ کہ مان سنگھ اسی وقت بنگالہ (اپنی جاگیر) کو روانہ ہو جائے۔ اور وہاں جا کر اس اس طرح بند و بست کرے۔ مآثر میں ہے کہ جہانگیر اکبر کے اشارے سے شہر میں ایک محفوظ مکان میں جا بیٹھا تھا۔ چنانچہ شیخ فرید بخشی اور بعض اور دولت خواہ جا پہنچے۔ اور شیخ اُسے اپنے گھر لے گئے +

خان اعظم نے جب سُنا کہ راجہ مان سنگھ جاتے ہیں۔ خسرو کو بھی ساتھ لئے جاتے ہیں۔ تو اُسی وقت اپنے قبائل کو راجہ کے گھر بھیج دیا۔ اور کہلا بھیجا۔ کہ اب میرا بھی یہاں رہنا مناسب نہیں۔ مگر کیا کروں۔ خزانوں اور اجناس خانوں کیلئے بغیر چارہ نہیں اور بار برداری ہے نہیں۔ راجہ نے کہا۔ دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ اس وقت میں تم سے جُدا نہ ہوں۔ مگر مجھ سے خود سامان نہیں سنبھل سکتا۔ آخر اکبر کا انتقال ہؤا۔ اور جس بادشاہ کو کبھی دُولہا بنا کر جشن کے تخت پر بٹھاتے تھے۔ کبھی خواصی میں بیٹھ کر میدان جنگ میں لاتے تھے۔ اُس کے جنازے کو کندھا دیا +

جہانگیر تخت نشین ہؤا۔ امرا نے حاضر دربار ہو کر مبارکباد کی نظریں دیں۔ نئے بادشاہ نے کمال مرحمت سے خان اعظم کی عظمت بڑھائی۔ اور کہا کہ جاگیر پر نہ جاؤ میرے پاس ہی رہو۔ غالباً اُس سے یہ مطلب ہوگا کہ دربار سے دُور ہوگا تو بغاوت کے سامان مہیا کرنے کو میدان فراخ پائیگا۔ آخر خسرو باغی ہؤا۔ اور جہانگیر کے دل پر نقش ہو گیا۔ کہ اس کے لڑکے کا کیا حوصلہ تھا۔ یہ جرأت اسے خان اعظم کی پشت گرمی سے ہی ہوئی ہے۔ جب اُس کی مہم سے فارغ ہؤا تو یہ عتاب و خطاب میں آئے اور اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ خان اعظم کو خسرو کی بادشاہت کا بڑا ارمان تھا۔ وہ

اس آرزو میں ایسا آپے سے باہر تھا کہ اپنے رازداروں کو کہا کرتا تھا۔ کاش ایک کان میں کوئی کہے کہ خسرو بادشاہ ہو گیا۔ اور دوسرے کان میں حضرت عزرائیل موت کا پیغام دے دیں۔ مجھے مرنے کا افسوس نہ ہوگا۔ مگر ایک دفعہ اُس کی بادشاہت کی خبر سُن لوں +

غرض اب یہ نوبت ہوئی۔ کہ دربار میں جاتے تھے تو کپڑوں کے نیچے کفن پہن کر جاتے تھے۔ کہ دیکھئے زندہ پھروں یا نہ پھروں۔ بڑا عیب اُس میں یہ تھا۔ کہ گفتگو میں سخت بیباک تھا۔ اُس کی زباں اُس کے قابو میں نہ تھی۔ جو مُنہ میں آتا تھا۔ صاف کہہ بیٹھتا تھا۔ موقع بے موقع کچھ نہ دیکھتا۔ اس امر نے جہانگیر کو تنگ اور اکثر اہل دربار کو اُس کو دشمن کر دیا تھا۔ چنانچہ اسی جوشِ غضب کے دنوں میں جہانگیر[1] نے امرائے خاص کو ٹھیرالیا۔ خلوت میں لے گئے۔ اور خانِ اعظم کا مقدمہ جلسۂ مشورت میں ڈالا۔ جب گفتگوئیں ہونے لگیں۔ تو امیر الامرا نے کہا۔ کہ اس کے فنا کر دینے میں دیر کیا لگتی ہے۔ بادشاہ کی مرضی دیکھ کر **مہابت خاں** بولا کہ میں تو سپاہی آدمی ہوں۔ مجھے صلاح مشورہ نہیں آتا۔ سروہی رکھتا ہوں۔ کمر کا ہاتھ مارتا ہوں۔ دو ٹکڑے نہ کر دے تو میرے دونوں ہاتھ قلم۔ خاں جہاں (غالباً خانِ اعظم کا خیرخواہ تھا یا عموماً نیک نیت تھا) نے کہا۔ حضور میں تو اس کے طالع کو دیکھتا ہوں۔ اور حیران ہوتا ہوں۔ ایک خانہ زاد کی نظر سے گزرا۔ جہاں دیکھا۔ حضور کا نام روشن نظر آیا۔ اور وہیں خانِ اعظم کا نام بھی موجود۔ قتل کرنا اس کا کچھ مشکل نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ظاہر کوئی خطا معلوم نہیں ہوتی۔ اگر اسے حضور نے مارا۔ تو تمام عالم میں وہی مظلوم مشہور ہوگا۔ جہانگیر اس پر ذرا دھیما ہوا۔ اتنے میں سلیمہ سلطان بیگم پردے کے پیچھے سے پکار کر بولیں۔ حضور! محل[2] کی بیگمات اُس کی سفارش کو آئی ہیں۔ حضور

---

[1] مآثر الامرا میں ہے کہ ایک شب امیر الامرا سے سخت کلامی کی۔ بادشاہ نے اُٹھ کر مشورہ کا جلسہ کیا امیر الامرا نے کہا کہ "در کشتن او توقف نمے خواہد"۔ مہابت خاں نے کہا "مرا در کنگاش دخلے نیست سپاہیم شمشیر سروہی دارم۔ بکمر او میزنم۔ اگر دو حصہ نہ کند دست مرا ببرند"۔

[2] حضرت۔ ہمہ بیگمہا بجہت شفاعت میرزا کوکہ در محل جمع شدہ اند۔ اگر تشریف آرند بہتر و الا برمے آیند

آئیں۔ تو آئیں ورنہ سب باہر نکل پڑینگی۔ بادشاہ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حرم میں چلے گئے۔ وہاں سب نے مل کر ایسا سمجھایا کہ خطا معاف ہو گئی۔ خان اعظم نے افیم تک بھی نہ کھائی تھی۔ بادشاہ نے خاصہ کی گولیاں (اپنے کھانے والی گولیاں) دیں۔ اور رخصت کیا۔ یہ آگ تو دب گئی۔ مگر چند ہی روز بعد خواجہ ابوالحسن تربتی نے خاص اُس کے ہاتھ لکھا ایک خط مدت سے لگا رکھا تھا۔ اب پیش کیا۔ اُس کا حال جس طرح جہانگیر نے خود اپنی توزک میں لکھا ہے۔ ترجمہ لکھتا ہوں۔ میرا یقین کہتا تھا۔ کہ خسرو اُس کا داماد ہے۔ اور وہ ناخلف میرا دشمن ہے۔ اُس کے سبب سے میری ذات سے خان اعظم کے دل میں ضرور نفاق ہے۔ اب اُس ایک خط سے معلوم ہوا۔ کہ خبث طبعی کو اُس نے کسی وقت بھی جانے نہیں دیا۔ بلکہ میرے والد بزرگوار سے بھی جاری رکھا تھا۔ مجمل یہ ہے کہ ایک موقع پر اُس نے ایک خط راجہ علی خاں کو لکھا تھا۔ اوّل سے آخر تک بدی اور بدلپسندی اور ایسے مضمون کہ کوئی دشمن کے لئے بھی نہیں لکھتا۔ اور کسی کی طرف نسبت نہیں کر سکتا چہ جائیکہ حضرت عرش آشیانی جیسے بادشاہ اور صاحب قدر دان کے حق میں وغیرہ وغیرہ۔ یہ تحریر برہان پور میں راجہ علی خاں کے دفتر خزانہ میں سے ہاتھ آئی۔ اُسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگر بعض خیالات کا۔ اور اُس کی ماں کے دودھ کا ملاحظہ نہ ہوتا۔ تو بجا ہوتا۔ کہ اپنے ہاتھ سے اسے قتل کرتا۔ بہرحال بُلایا اور اُس کے ہاتھ میں وہ نوشتہ دے کر کہا۔ کہ سب کے سامنے بہ آواز بلند پڑھے مجھے گمان تھا۔ کہ اُسے دیکھ کر اُس کی جان نکل جائیگی۔ انتہائے بے شرمی اور بیحیائی ہے کہ اس طرح پڑھنے لگا۔ گویا اس کا لکھا ہی نہیں۔ کسی اور کا لکھا ہوا پڑھوایا ہے۔ وہ پڑھ رہا ہے۔ حاضران مجلس بہشت آئین۔ بندہائے اکبری و جہانگیری۔ جس نے وہ تحریر دیکھی اور سُنی۔ لعنت و نفرین کرنے لگے۔ اُس سے پوچھا۔ کہ قطع نظر ان نفاقوں کے جو مجھ سے کئے اور اپنے اعتقاد ناقص میں اُن کے لئے کچھ وجہیں بھی قرار دی تھیں۔ والد بزرگوار نے کہ تجھ کو اور تیرے خاندان کو خاک راہ سے اُٹھا کر اس رتبۂ اعلیٰ تک پہنچایا۔ کہ اس درجے پر پہنچے۔ (جس پر ہم جنس اور ہم رتبہ لوگ رشک کرتے ہیں) بات کیا ہوئی تھی ؟ کہ دشمنان و

مخالفان دولت کو ایسی باتیں لکھیں۔ اور اپنے تئیں حرامخوروں اور بدنصیبوں میں جگہ دی۔ سچ ہے۔ سرشت اصلی اور پیدائش طبعی کو کیا کرے۔ جب تیری طبیعت نے آب نفاق سے پرورش پائی ہو۔ تو ان باتوں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جو کچھ مجھ سے کیا تھا اُس سے میں درگزرا۔ اور جو منصب تھا پھر اُسی پر سرفراز کیا۔ گمان تھا۔ کہ تیرا اتفاق خاص میرے ہی ساتھ ہوگا۔ اب جو یہ بات معلوم ہوئی۔ کہ اپنے مربی اور خدائے مجازی سے بھی اس درجے پر تھا۔ تو تجھے تیرے اعمال اور تیرے مذہب کے حوالے کیا۔ یہ باتیں سُنکر چُپ رہ گیا۔ ایسی روسیاہی کے جواب ہیں کہے کیا؟ جاگیر کی موقوفی کا حکم دیا اور جو کچھ اس ناشکرے نے کیا تھا۔ اگرچہ اُس میں عفو اور درگزر کی گنجائش نہ تھی۔ مگر بعضے لحاظوں کی رعایت کر کے درگزر کی۔ (مؤرخ کہتے ہیں کہ نظربند بھی رہے)۔

سنہ ۱۷ جلوس میں خسرو کے ہاں بیٹا (خان اعظم کا نواسہ) پیدا ہوا۔ بادشاہ نے بلند اختر نام رکھا۔ خان اعظم کو گجرات عنایت ہوا۔ اور حکم ہوا کہ وہ حاضر دربار رہے۔ جہانگیر قلی خاں اُس کا بڑا بیٹا جاکر ملک کا کاروبار کرے۔

سنہ ۱۰ جلوس میں اُسے داور بخش یعنی خسرو کے بیٹے کا اتالیق کیا۔ اسی سنہ میں امرائے جلیل القدر دکن پر بھیجے گئے۔ اور مہم بگڑ گئی۔ معلوم ہوا کہ سبب اس خرابی کا آپس کا نفاق اور بے اتفاقی خان خاناں کی تھی۔ اس لئے خان اعظم کو چند امرا اور منصب داروں کے ساتھ فوج دے کر کمک کے لئے بھیجا۔ دس ہزار سوار۔ دو ہزار احدی۔ کل بارہ ہزار۔ تیس لاکھ روپیہ خرچ خزانہ۔ کئی حلقے ہاتھیوں کے ساتھ گئے۔ خلعت فاخرہ۔ کمر شمشیر مرصع۔ گھوڑا اور فیل خاصہ اور پانچ لاکھ روپیہ امداد کے طور پر عنایت ہوا۔ اسی سنہ میں خورم پسر خان اعظم کو جونا گڑھ کی حکومت دے کر بھیجا تھا۔ اُسے کامل خاں خطاب ملا۔

سنہ ۱۰۲۲ھ میں خان اعظم کے بیٹے کو شادمان کا خطاب دے کر ایک ہزاری ہفت صدی ذات، پانسو سوار کے ساتھ علم مرحمت ہوا۔

خان اعظم کا ستارہ جو ابھی نحوست کے گھر سے نکلا۔ اسی سنہ میں پھر

رجعت کھا کر اُلٹا گرا۔ وہ برہان پور میں آرام سے بیٹھا امارت کی بہاریں لوٹ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ **اودے پور** پر مہم کیا چاہتے ہیں۔ بڈھے سپہ سالار کو بہادری اور دلاوری کا جوش آیا۔ عرضی کی۔ حضور کو یاد ہوگا۔ دربار گہربار میں جب مہم رانا کا ذکر آتا تھا۔ تو فدوی عرض کیا کرتا تھا۔ آرزو ہے کہ یہ مہم ہو۔ اور فدوی جاں نثار ہو۔ بندگان حضور پر یہ بھی روشن ہے۔ کہ یہ مہم وہ ہے جس میں فدوی مارا بھی جائے۔ تو شہید راہِ خدا ہے۔ فتح یاب ہوا۔ تو غازی ہونے میں کیا کلام ہے اس جاں نثاری سے جہانگیر بہت خوش ہوا۔ اور کمک مدد توپ خانے نقد خزانے وغیرہ جو کچھ درخواست کی سرانجام ہوگیا۔ یہ روانہ ہوئے۔ اودے پور کے کوہستان میں جا کر مہم شروع ہوئی۔ وہاں سے عرضی کی۔ کہ جب تک نشان اقبال ادھر کی ہوا میں نہ لہرائیگا۔ کھلنا اس عقدے کا دشوار ہے۔ جہانگیر اُٹھے۔ یہاں تک کہ دائرہ اجمیر میں جا اُترے۔ شاہزادہ خورم (شاہجہان) کو دو ہزار سوار خوش اسپ امرائے کہنہ عمل اور بہت سے سامان ضروری دے کر آگے روانہ کیا۔ یہ سب وہاں پہنچے اور کاروبار جاری ہوا +

آزاد کلیہ قاعدہ ہے۔ کہ باپ کے باتدبیر جاں نثار بیٹے کے عہد میں بے عقل سینہ زور۔ بلکہ سرشور گنے جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ دادا کے وقت کے۔ اور وہ بھی خانِ اعظم۔ ان کی اور شاہزادوں کی رائے نے مطابقت نہ کھائی۔ کام بگڑنے لگے۔ اُدھر شاہزادہ کی عرضیاں آئیں۔ ادھر خبرنویسوں کے پرچے پہنچے۔ اور امرائے لشکر کی تحریروں سے اُن کی تائید ہوئی۔ سب سے زیادہ ان کی اپنی بدمزاجی اور بددماغی

ع۔ گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

غرض بادشاہ کے دل پر نقش ہوگیا۔ کہ فساد خان اعظم کی طرف سے ہے یہ خیال اتنا ہی رہتا تو بھی بڑی بات نہ تھی۔ بہت ہوتا۔ تو بُلا کر ان کے علاقے پر بھیج دیتے۔ بڑا چغلخور ان کا وہ رشتہ تھا۔ کہ خسرو کے خسر تھے اور وہ جرم لغاوت میں خود معتوب تھا۔ چنانچہ شاہزادہ خورم نے صاف لکھا۔ کہ خان اعظم اُسی رعایت سے مہم کو برباد کیا چاہتا ہے۔ اس کا یہاں رہنا کسی طرح مناسب نہیں مست السنت بادشاہ نے فوراً مہابت خاں کو روانہ کیا۔ اور حکم دیا۔ کہ خان اعظم کو اپنے ساتھ

لے کر آؤ۔ وہ گیا اور خان کو عبداللہ اُس کے بیٹے سمیت حاضر دربار کیا۔ آصف خاں کے سپرد ہوئے۔ کہ قلعۂ گوالیار میں قیدیوں کی طرح محبوس رکھو۔ بلکہ چند روز پہلے خسرو کے لئے ماں بہنوں کی منت و زاری سے اجازت ہو گئی تھی۔ کہ حضور میں آیا کرے۔ اب اُسے بھی حکم ہؤا کہ بدستور آنا بند۔

اللہ شکر خورہ کو شکر ہی دیتا ہے۔ آصف خاں نے حضور میں عرض کی۔ کہ خان اعظم قیدخانہ میں مجھ پر عمل پڑھتا ہے۔ ترک حیوانات۔ خلوت۔ عورتوں سے علیحدگی وغیرہ وغیرہ عمل مذکور کے لئے شرط ہے۔ وہ اسے خود حاصل ہے بادشاہ نے حکم دیا کہ تمام خانہ داری کے لوازمات اور آسائش کے سامان وہیں بھیج دو۔ اور دستر خوان پر بھی سب طرح کے کھانے۔ امیرانہ نعمتیں۔ یہاں تک کہ مرغ۔ مرغابی۔ تیتر کے کباب لگانے لگے۔ خان اعظم کہتا تھا۔ کہ مجھے عمل کا سان گمان بھی نہ تھا۔ خدا جانے اِدھر ہی ادھر یہ معاملہ کیونکر ہو گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد خسر تو چھُٹ گئے۔ خسرو اُسی طرح قید رہے۔ مگر رہائی کے وقت اقرار نامہ لکھوا لیا۔ کہ بے پوچھے بات نہ کرونگا۔ بادشاہ جدروپ گسائیں سے بڑی محبت کے ساتھ ملتے تھے۔ اُس کی فقیرانہ اور حکیمانہ باتیں سُنکر محظوظ ہوتے تھے۔ بلکہ اُس کی فرمائش کو ٹالتے نہ تھے۔ خان اعظم اُن کے پاس گئے اور بڑے عجز و انکسار کے ساتھ التجا کی۔ چنانچہ ایک دن جو جہانگیر گسائیں کے پاس گئے تو اُس نے عارفانہ اور صوفیانہ تقریروں میں مطلب ادا کیا۔ اُس کا اثر پورا ہؤا۔ آکر حکم دیا۔ کہ خسرو بدستور دربار میں حاضر ہؤا کرے۔ افسوس یہ کہ اخیر عمر میں مرتے مرتے خان اعظم نے ایک بیٹی کے رنڈاپے کا داغ اُٹھایا۔ یعنی ۱۰۳۰ھ میں خسرو مر گیا۔ شاہجہان مہم دکن پر رخصت ہؤا تھا۔ وہ آکر باپ سے اس بدنصیب بھائی کی سفارش کیا کرتا تھا۔ اس موقع پر جہانگیر نے اُسے کہا۔ مَیں دیکھتا ہوں خسرو ہمیشہ آزردہ اور مکدر رہتا ہے۔ اور کسی طرح اس کا دل شگفتہ نہیں ہوتا۔ اُسے تم اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ اور جس طرح مناسب سمجھو حفاظت میں رکھو۔ وہ دکن میں بھائی کے ساتھ تھا کہ دفعتہً درد قولنج اُٹھا اور مر گیا۔ بعض مؤرخ یہ بھی کہتے ہیں۔ رات کو اچھا اچھا سویا صبح دیکھو تو فرش پر مقتول پڑا ہے۔

۱۰۳۲ھ جلوس ۱۸ میں داور بخش خسرو کے بیٹے کو صوبہ گجرات عنایت ہوا انہیں بھی ساتھ رخصت کیا ✦

۱۰۳۳ھ جلوس انیس میں بدمزاجی اور خوش مزاجی نفاق و اتفاق کے جھگڑے تمام ہوئے ۔ ساری باتیں زندگی کے ساتھ ہیں ۔ مر گئے کچھ بھی نہیں ۔ احمد آباد گجرات میں خان اعظم نے دنیا سے انتقال کیا ۔ جنازہ کو دلی میں لائے ۔ سلطان مشائخ کے ہمسایہ میں اتکہ خاں سوتے تھے ۔ ان کے پہلو میں بیٹے کو لٹا کر اماں زمین کے سپرد کر دیا ✦

خان اعظم کی ہمّت ۔ شجاعت ۔ سخاوت ۔ لیاقت کی تعریفوں میں تمام تاریخوں اور تذکروں کی ایک زبان ہے میں اوّل اس باب میں جہانگیر بادشاہ کا کلام لکھتا ہوں ۔ توزک میں کہتے ہیں ۔ میرے اور میرے والد بزرگوار نے اُس کی ماں کے دودھ کا خیال کر کے اُسے سب اُمرا سے بڑھا دیا تھا ۔ اور اُس سے اور اُس کی اولاد کی طرف سے عجیب عجیب باتوں کی برداشت کرتے تھے ۔ علم سیر و فن تاریخ میں اُسے کامل یادداشت تھی ۔ تحریر اور تقریر میں بے نظیر تھا ۔ نستعلیق خوب لکھتا تھا ۔ ملّا باقر ولد ملّا میر علی کا شاگرد تھا ۔ یہ بات بالاتفاق ہے ۔ کہ ارباب استعداد اس کے قطعے کو اساتذہ مشہور کی تحریر سے کم درجہ نہ دیتے تھے مدّعا نویسی میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا ۔ مگر عربیت سے عاری تھا ۔ لطیفہ گوئی میں بےمثل تھا ۔ شعر بھی اچھا کہتا تھا ۔ یہ رُباعی اُس کے واردات حال سے ہے ✦

عشق آمد و از جنوں بر د مندم کرد	وارستہ زصحبتِ خرد مندم کرد
آزاد ز بندِ دین و دانش گشتم	تا سلسلۂ زلف کسے بندم کرد

جو کچھ حالات بیان ہوئے سمجھنے والا اُس سے نتیجے نکال سکتا ہے ۔ مگر مآثر الامرا وغیرہ تاریخوں سے صاف صاف ثابت ہے کہ اُس کی خود پسندی خود رائی ۔ بلند نظری ۔ بلکہ اوروں کی بداندیشی حد سے گذری ہوئی تھی ۔ اور اکبر کی دلداری اور ناز برداری نے ان قباحتوں کو پرورش کیا تھا ۔ جس کے حق میں جو چاہتا تھا کہہ بیٹھتا تھا ۔ کسی انسان یا مقام یا انجام کا ہرگز لحاظ نہ کرتا تھا ۔ اسی واسطے یہ بات زبان زد تھی ۔ کہ اسے اپنی زبان پر اختیار نہیں ۔ آخر اقرار نامہ لیا گیا ۔ کہ جب

تک تم سے بات نہ پوچھیں - تم نہ بولو +

لطیفہ - ایک دن جہانگیر نے جہاں قلی (ان کے بیٹے) سے کہا - کہ ضامن پدر می شوی؟ اُس نے کہا - در ہر امر مگر زبان +

سلاطین چغتائیہ کا آئین تھا کہ جب کوئی امیر حکم بادشاہی لے کر دوسرے امیر کے پاس جاتا تھا - تو وہ اُس کا استقبال کر کے بڑی تعظیم سے ملتا تھا جس وقت یہ ادائے پیغام کرتا تھا - وہ کھڑے ہو کر بموجب قواعد مقررہ کے کورنش و تسلیم بجالاتا تھا - خصوصاً جبکہ خبر کسی ترقی یا عنایت و مرحمت کی ہوتی تھی - تو زیادہ تر شکرانے کرتا تھا - بہت سی دعائیں دیتا تھا - اور جو امیر آتے تھے انہیں تحائف نقد و جنس ساتھ کر کے رخصت کرتا تھا +

جب جہانگیر نے اُن کی خطا معاف کی - اور پنجہزاری منصب پر بحال کرنے لگا - تو دربار میں بُلایا - شاہجہان سے کہا - کہ بابا (شاہجہان کو بابا - یا - بابا خورم کہا کرتا تھا) مجھے یاد ہے کہ تمہارے دادا نے - جب انہیں دو ہزاری منصب عنایت فرمایا - تو شیخ فرید بخشی اور راجہ رام داس کو بھیجا - کہ جا کر منصب کی مبارک باد دو - جب وہ پہنچے تو یہ حمام میں تھے - وہ ڈیوڑھی پر بیٹھے رہے - ایک پہر کے بعد یہ نکلے - دیوان خانہ میں آکر بیٹھے اور انہیں سامنے بلایا یا مبارکباد لی - بیٹھے سر پر ہاتھ رکھا (یہ آداب کورنش ہؤا) اور کہا تو یہ کہا - اب اس کے لئے اور فوج رکھنی پڑی - اُن کا خیال بھی نہ کیا اور رخصت کر دیا - بابا مجھے شرم آتی ہے کہ بحالی منصب پر مرزا کو کہ کھڑے ہو کر تسلیم بجالائے - خیر تم اُس کی طرف سے کھڑے ہو کر آداب بجالاؤ +

استعداد علمی - تحصیل علمی اُن کی عالمانہ تھی - لیکن درباداری اور مصاحبت میں بے نظیر تھی - ہر بات ایک لطیفہ تھی - فارسی کے فصیح انشا پرداز اور عمدہ مطلب نگار تھے - زبان عربی تحصیل نہ کی تھی - مگر کہا کرتے تھے - در عربی واہ عربیم +

لطیفہ - اُن کا قول تھا - کہ جب کسی معاملے میں کوئی مجھ سے کچھ کہتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا - اور اُسی بنا پر کارروائی کی صورت سوچنے لگتا

ہوں۔ جب وہ کہتا ہے۔ نواب صاحب آپ خلاف نہ سمجھیں۔ میں سچ کہتا ہوں تب مجھے شبہ پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ قسم کھاتا ہے۔ تو یقین ہو جاتا ہے کہ جھوٹا ہے +

مصاحبت اور علم مجلس میں بے نظیر تھے اور مزے کی باتیں کرتے تھے

لطیفہ۔ فرمایا کرتے تھے کہ امیر کے لئے چار بیبیاں چاہئیں مصاحبت اور باتوں چیتوں کے لئے ایرانی۔ خانہ سامانی کے لئے خراسانی۔ سیج کیلئے ہندوستانی۔ چوتھی تُرکانی۔ اُسے ہر وقت مارتے دھاڑتے رہیں کہ اور بیبیاں ڈرتی رہیں +

چند فقرے آزاد کو ایسے لکھنے پڑے کہ خانِ اعظم کی روح سے شرمسار ہے۔ لیکن مؤرّخ کا کام ہر بات کا لکھنا ہے۔ اس لئے مآثر الامرا کے ورق کو اپنی برأت کا گواہ پیش کر کے لکھتا ہے کہ وہ خبث و نفاق، سخت مزاجی و بد کلامی میں سر آمد عہد تھے۔ اور تند غضب تھے۔ جب کوئی عامل ان کی سرکار میں معزول ہو کر آتا تھا۔ مستوفی اُن کا روپیہ طلب کرتا۔ اگر دے دیتا تو دے دیا۔ ورنہ اتنا مارتا کہ مر جاتا۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ مار کھا کر بچ نکلتا تو پھر کوئی مزاحمت ہی نہ تھی۔ لاکھ روپیہ ہی کیوں نہ ہو +

کوئی برس نہ گزرتا تھا کہ اُن کے غصّے کا اُسترا ایک، دو دفعہ اپنے ہندو مُنشیوں کے سر اور مُنہ صاف نہ کرتا ہو۔ **رائے درگاداس** ان کے خاص دیوان تھے۔ ایک موقع پر اور منشیوں نے گنگا اشنان کی رخصت لی۔ نواب اُس وقت کچھ خوشی کے دم میں تھے۔ کہا کہ دیوان جی تم ہر برس اشنان کو نہیں جاتے۔ اُس نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ میرا اشنان تو حضور کے قدموں میں ہو جاتا ہے (وہاں بھدرا نہ ہوا یہاں ہو گیا) سمجھ گئے۔ وہ قانون منسوخ کر دیا +

نماز کے مقیّد نہ تھے۔ مگر مذہب کا تعصّب بہت تھا +

اُن کی طبیعت میں زمانہ سازی ذرا نہ تھی۔ نور جہاں کی وہ اوج موج رہی! اور اُس کی بدولت اعتماد الدّولہ اور آصف جاہ کے دربار میں بھی ایک عالم کی رجوع تھی۔ مگر یہی نہ گئے۔ بلکہ نور جہاں کے دروازے تک بھی قدم نہ اُٹھا۔ برخلاف خانخاناں کے، وہ ضرورت کے وقت **رائے گوردھن** اعتماد الدّولہ کے دیوان کے

گھر پر بھی جا موجود ہوتے تھے +

خان اعظم کے بیٹے جہانگیری عہد میں باعزت واحترام رہے +

سب سے بڑا شمس الدین	جہانگیر قلی خطاب تھا اور تین ہزاری کے رتبے تک پہنچا +
شادمان	شادمان، خان ہوئے +
خورم	اکبر کے عہد میں جوناگڈھ پر تھا۔ گجرات میں باپ کیسا تھ تھا۔ جہانگیری عہد میں کامل خاں خطاب پایا۔ رانائے اودے پور کی مہم میں شاہجہان کے ساتھ تھا +
مرزا عبداللہ	جہانگیر نے سردار خاں خطاب دیا۔ جب کوکہ گوالیار کے قلعے میں قید ہوئے تو یہ بھی ساتھ تھے +
مرزا انور	زین خاں کوکہ کی بیٹی اس سے منسوب تھی۔ یہ سب تین ہزاری اور دو ہزاری کے رتبے کو پہنچے +

خان اعظم کے حالات سے اتنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک جاہل مزاج مسلمان خواہ ٹرا سپاہی یا ضدی امیرزادہ تھا۔ بعض باتیں ایسی بھی ہو جاتی تھیں۔ جن سے اُسے لوگ احمق کہتے تھے۔ نقلیں جو اس باب میں مشہور ہیں۔ وہ کتابی نہیں ہیں اس لئے درج کتاب نہیں کرتا۔ اتنا ضرور ہے کہ سادگی کہو۔ کم فہمی نام رکھو۔ غرض یہ وصف اُس خاندان کے لہو میں داخل تھا۔ ان کے چچا میر محمد خاں اتکہ خاں اور خان کلاں کہلاتے تھے۔ اکبر نے کمال خاں گکھڑ کے ساتھ کیا۔ کہ اُس کے بھائی بندوں نے سرشوری کرکے اُسے نکال دیا ہے۔ تم فوج لے کر جاؤ۔ اور اُس کا حق دلوادو + چند امیر صاحب فوج اور بھی ساتھ تھے۔ بادشاہی سرداروں نے جاکر پہاڑوں کو ہلا ڈالا۔ آدم خاں گکھڑ کمال خاں کا چچا قید ہوا۔ لشکر خاں اس کا بیٹا کشمیر کو بھاگ گیا اور پکڑا آیا۔ مگر دونو اپنی موت سے مر گئے۔ امرائے شاہی نے مُلک کمال خاں کو سپرد کر دیا اور آگرہ میں آکر حضور کو سلام کیا۔ خان کلاں سب سے آگے تھے۔ بادشاہ نے اُن کی سلامی لینے کے واسطے دربار عالی ترتیب دیا۔ خان موصوف نے اپنی ساری بہادری کا زور لگاکر ایک قصیدہ بھی کہا۔ اُس دن امرا۔ فضلاء۔ شعراء وغیرہ اکابر سلطنت کے لئے حاضر ہونے کا حکم تھا۔ خان نے کہا۔ کہ ایسے دربار پر بہار

پر میرا قصیدہ پڑھا جائے۔ تو بڑی بہار ہے۔ بادشاہ کو بھی اس گھرانے کا بڑھانا منظور تھا۔ بلکہ اسی واسطے یہ دربار کیا تھا۔ غرض تمام جلسہ مُرتب و مکمل، آراستہ اور بادشاہ بھی دل و جان سے کان لگائے۔ کہ دیکھیں خاں کلاں کیا کہتے ہیں۔ اور انہیں بھی بڑے انعام کی اُمید۔ غرض پہلا ہی مصرع پڑھا:-

بحمد اللہ کہ دیگر آمدم فتح گگر کردہ

لوگ تو انہیں پہلے سے جانتے تھے۔ آپس میں نگاہیں لڑیں۔ اور دلوں میں گُدگُدیاں ہوئیں۔ کہ دیکھئے آگے کیا کہتے ہیں۔ اتنے میں **عبدالملک خاں** ان کا داماد آن پہنچا۔ اور آگے بڑھ کر بولا۔ خانم دیگر آمدیم بخوانید۔ کہ نامردان دیگر ہم در رکاب شما بودند۔ اتنا کہنا تھا کہ ایک قہقہہ اُڑا۔ اور ہنسی کے مارے سب لوٹ گئے۔ خان کلاں نے دستار زمین پر دے ماری۔ اور کہا۔ بادشاہوں۔ داد از دست ایں مردک ناقابل کہ ہمہ مشقت مرا ضائع ساخت۔

عبدالملک خاں کی حقیقت بھی سُن لو۔ اپنا سجع آپ کہا تھا۔ اور مہر درباری کے نگینے پر کھدوا کر اپنے تئیں رسوا کیا تھا ؎

عبد را چوں بر ملک افزوں کنی
پس الف لامے درو اندروں کنی

مُلا شیری شاعر ہندی نے اُن کی تعریف میں قصیدہ کہا تھا۔ کہ تمام دو رُخے مضامین سے رنگین تھا۔ ایک شعر اُسی کا مُلا صاحب نے لکھ دیا ہے ؎

اگر گنوار بیاید مقابل تو گریز
کہ صاحبی و مقابل نمے شوی بگنوار

حسین خاں ٹکریہ

یہ سردار نورتن کے سلسلے میں آنے کے قابل نہیں۔ مگر اپنے اسلام اور دینداری میں اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا۔ جن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے سیدھے سادے مسلمانوں کے کیا طور و طریقے تھے۔ سب سے زیادہ یہ کہ مُلّا صاحب کے حالات اور خیالات کو اس سے بڑا تعلق ہے۔ جہاں اس کا ذکر آتا ہے۔ بڑی محبّت سے لکھتے ہیں۔ مآثر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ بہادر افغان اوّل بیرم خاں خان خاناں کا نوکر ہُوا۔ اور اُسی وقت سے ہمایوں کے ساتھ تھا۔ جب کہ اس نے ایران سے آکر قندھار کا محاصرہ کیا۔ اور فتح پائی۔ شجاعت ہر معرکے میں اسے بے جگر کرکے آگے بڑھاتی رہی۔ اور جانفشانی اس کے درجے بڑھاتی رہی۔ مہدی قاسم خاں ایک معزز سردار تھا۔ وہ اس کا ماموں تھا۔ اور اُس کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی تھی +

یہ اکبر کے عہد میں بھی یا اعتبار رہا۔ جبکہ سکندر سور کو اکبری لشکر نے دباتے دباتے جالندھر کے پہاڑوں میں گھسیڑ دیا۔ اور پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ تو سکندر قلعۂ مانکوٹ میں بیٹھ گیا۔ امراء روز لڑتے تھے اور جوہر دکھاتے تھے۔ اس بہادر نے ان لڑائیوں میں وہ کام کئے کہ رستم ہوتا تو داد دیتا۔ حسن خان اس کے بھائی نے بڑھ کر قدم مارا۔ کہ جان کو نام پر قربان کیا۔ حسین خاں نے وہ وہ تلواریں ماریں۔ کہ ادھر سے اکبر اور اُدھر سے سکندر دونوں دیکھتے تھے اور عش عش کرتے تھے۔ اور روز بروز بادشاہ زرخیز علاقے اُس کی جاگیر میں دیتے تھے۔ ان حملوں میں حسن خاں ان کا بھائی جان باز بہادروں میں سرخرو ہوکر دنیا سے گیا۔ بادشاہ جب ۹۶۵ھ میں لڑائی کے بعد ہندوستان کو چلے تو اُسے صوبہ پنجاب عنایت کیا +

لطیفہ۔ جب یہ حاکم لاہور تھے تو ایک لمبی ڈاڑھی والا مردِ معقول ان کے دربار میں آیا۔ یہ حامیٔ اسلام تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ مزاج پُرسی سے معلوم ہُوا

کہ وہ تو ہندو ہے۔ اُس دن سے حکم دیا۔ کہ جو ہندو ہوں وہ کندھے کے پاس ایک رنگین کپڑے کا ٹکڑا ٹکوایا کریں۔ لاہور بھی ایک عجیب چیز ہے یہاں کے لوگوں نے ٹکریہ نام رکھ دیا۔ اس سے معلوم ہؤا کہ جس طرح اب پیوند کو ٹاکی کہتے ہیں اُس وقت اسے ٹکڑی کہتے تھے +

۹۶۶ھ میں اندری سے آگرہ میں آئے۔ اور چند سرداران نامی کیساتھ فوجیں لے کر رنتھنبور پر گئے۔ مقام سوپر پر میدان ہؤا۔ بہادر پٹھان دھاوے کا شیر تھا۔ ایسے متواتر حملے کئے۔ کہ رائے سرجن رانا قلعے میں گھس گیا۔ یہ اُسے دبا رہا تھا۔ کہ خان خاناں کے ساتھ زمانے نے دغا کی۔ اور عالم کا نقشہ بدلتا نظر آیا۔ جن لوگوں کے رنگ جمتے جاتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ اُن کی پہلے سے لاگیں چلی آتی تھیں (صادق محمد خاں وغیرہ) اس لئے دل شکستہ ہوگیا۔ اور مہم کو ناتمام چھوڑ کر گوالیار میں آیا۔ مالوے کا ارادہ تھا۔ کہ خان خاناں نے آگرہ سے خط لکھا اور بُلا بھیجا۔ بُرے وقت میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ بڑے بڑے سردار اس کے دامن گرفتہ کہلاتے تھے۔ پچیس اُن میں سے پنجہزاری تھے۔ باقی کا شمار تم سمجھو۔ ان میں سے فقط چھ امیر تھے جنھوں نے جان اور مال کو بات پر قربان کرکے خان خاناں کا ساتھ دیا۔ اور ان میں سے ایک حسین خان تھے۔ ایک شاہ قلی خاں محرم +

جب گنا چور کے میدان میں خان خاناں کا انکہ خاں کی فوج سے مقابلہ ہؤا تو وفاداروں نے خوب خوب جوہر دکھائے۔ چار دلاور سردار میدان جنگ میں زخمی ہو کر گرے۔ اور بادشاہی فوج کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے۔ انہی میں خان مذکور تھا۔ ایک زخم اس کی آنکھ پر آیا۔ کہ زخم نہ تھا۔ جمالِ دلاوری کے لئے چشم زخم تھا۔ مہدی قاسم خاں اور اس کا بیٹا دربار میں بااعتبار تھے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ بھی حسین خاں کے جوہرِ وفا سے خوب واقف تھا۔ اسی واسطے عزیز رکھتا تھا۔ ساتھ اس کے اپنے بدنیت مصاحبوں سے واقف تھا۔ چنانچہ حسین خاں کو اُس کے سالے کے حوالے کر دیا۔ اس میں ضرور یہ غرض تھی۔ کہ بداندیشوں کی بدی سے محفوظ رہے۔ جب اچھا ہؤا تو خدمتیں بجالانے لگا۔ چند

روز کے بعد پٹیالی[1] کا علاقہ ملا۔ کہ امیر خسرو کی ولادت گاہ ہے ✦
۹۷۴ھ میں مہدی قاسم خاں حج کو چلے حسین خاں اس کے بھانجے بھی تھے۔ داماد بھی حُسن اعتقاد سے پہنچانے کو سمندر کے کنارے تک ساتھ گیا۔ پھرے ہوئے آتا تھا جو دیکھا کہ ابراہیم حسین مرزا وغیرہ شہزادگان تیموری نے اُدھر کے شہروں اور جنگلوں میں آفت برپا کر رکھی ہے۔ ایک مقام پر غُل ہُوا کہ شہزادۂ مذکور فوج لئے لوٹتا مارتا چلا آتا ہے۔ یہ بالکل بے سر و سامان تھے مقرب خاں ایک دکنی سردار کے ساتھ ستواس میں پناہ لی۔ قلعے میں ذخیرہ نہ تھا۔ گھوڑے۔ اونٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ سب کاٹ کر کھا گئے۔ مقرب خاں کی کہیں سے مدد نہ پہنچی۔ ابراہیم مرزا ہر چند پیام بھیجتا تھا۔ قلعہ والوں کے سر پر شجاعت کھیل رہی تھی۔ کسی طرح صلح پر راضی نہ ہوتے تھے۔ ادھر مقرب خاں کا باپ اور بھائی ہنڈیہ میں گھرا ہُوا تھا۔ مرزا کی فوج نے ہنڈیہ کو توڑ ڈالا۔ اور بڈھے کا سر کاٹ کر بھیج دیا۔ مرزا نے اسے نیزے پر چڑھا کر مقرب خاں کو دکھایا۔ اہل قلعہ کو کہا کہ مقرب خاں کے اہل و عیال کا یہ حال ہُوا۔ تم کس بھروسے پر لڑتے ہو۔ ہنڈیا کے ٹھیکرے تو یہ موجود ہیں۔ مقرب خاں نے مجبور ہو کر شہر حوالے کر دیا۔ اور خود بھی جا کر سلام کیا۔ حسین خاں کو بھی قول دے کر امان دی اور قسم کھا کر باہر نکالا۔ یہ یک رُخہ بہادر اپنی بات کا پورا تھا۔ ہرگز نہ مانا اور سامنے نہ گیا۔ کہ اپنے بادشاہ کے باغی کو سلام کرنا پڑیگا۔ اُس نے بہت کہا کہ میری رفاقت اختیار کرو۔ یہ ان سے کب ہو سکتا تھا۔ آخر اجازت دی کہ جہاں چاہو چلے جاؤ۔ اکبر کو سب خبریں پہنچ گئی تھیں۔ جب دربار میں آیا۔ خان زماں کی مہم در پیش تھی۔ اور قدر دانی و دلداری کے بازار گرم تھے۔ بہت عنایت کی۔ قلعہ بندی کی مصیبت نے کمال مفلس و بدحال کر دیا تھا۔ ۹۷۴ھ میں ۳ ہزاری منصب اور شمس آباد کا علاقہ بھی ملا۔ مگر سخاوت کی بد انتظامی اسے تنگدست ہی رکھتی تھی۔ وہ یہاں علاقے کا انتظام اور اپنی فوج کی درستی میں مصروف تھا کہ اکبر نے خان زماں پر فوج کشی کی۔ اور یہ اُس کی تیسری دفعہ تھی۔ جس میں اکبر کا ارادہ تھا۔ کہ اب کی دفعہ ان کا فیصلہ ہی کر دے۔ اس

[1] دریائے گنگا کے کنارے تھا ✦

فوج کشی میں جس قدر پھرتی تھی۔ اس سے زیادہ سنگینی اور استحکام تھے۔ ملّا صاحب لکھتے ہیں۔ اوّل لشکر کی ہراولی اس کے نام ہوئی تھی۔ مگر چونکہ وہ ستو اس سے قلعہ بندی اُٹھا کر آیا تھا۔ اور مفلس اور پریشان حال ہو رہا تھا۔ اس لئے دیر ہوئی۔ بادشاہ نے اس کی جگہ قیا خاں گنگ کو ہراول کیا۔ ملّا صاحب کہتے ہیں میں ان دنوں اس کے ساتھ تھا۔ شمس آباد میں ٹھیر گیا۔ وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا +

آزاد۔ اس مہم میں حسین خاں کے شامل نہ ہونے کا سبب یہی ہے۔ جو ملّا صاحب نے کہا۔ لیکن یہ بھی عجب نہیں کہ وہ اور علی قلی خاں وغیرہ سب بیرم خانی اُمرت تھے۔ حسین خاں یک رُخہ سپاہی تھا۔ اور یہ جانتا تھا۔ کہ منافقانِ حسد پیشہ نے خواہ مخواہ اسے باغی کروایا ہے۔ اس لئے نہ چاہا۔ کہ اس مہم میں شامل ہو۔ اور دوست کے مُنہ پر بے تقصیر تلوار کھینچے۔ اور دیکھنا وہ اس کی کسی لڑائی میں شامل نہیں ہوا +

میر معز الملک کی ہمراہی میں بہادر خاں کی لڑائی میں شامل تھے۔ محمد امین دیوانہ کہ وہ بھی خاص بیرم خاں کا پالا ہوا۔ ہراول کا سردار تھا۔ اور حسین خاں بھی اپنی فوج میں موجود تھے۔ ملّا صاحب یہاں لکھتے ہیں۔ بہت سے بہادر اس معرکے میں موجود تھے۔ مگر معز الملک کی بدمزاجی اور لالہ ٹوڈرمل کے روکھے پن سے بیزار تھے اُنہوں نے لڑائی میں تن نہ دیا۔ ورنہ سرمیدان خواری نہ ہوتی +

۹۷۷ھ میں لکھنؤ کا علاقہ اس کی جاگیر میں تھا۔ کہ مہدی قاسم خاں ان کا خسر حج سے پھرا۔ بادشاہ نے لکھنؤ اس کی جاگیر میں دے دیا۔ حسین خاں اس علاقے کا اپنی جاگیر سے نکلنا نہ چاہتا تھا۔ ان کی مرضی یہ تھی کہ مہدی قاسم خاں خود بادشاہ سے کہیں اور لینے سے انکار کریں۔ اُس نے لے لیا۔ یہ بہت خفا ہوئے۔ اور آیہ ہذا فراق بینی و بینک پڑھا۔ اس طرح کہ قیامت پر دیدار جا پڑے۔ باوجودیکہ مہدی قاسم خاں کی بیٹی کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ اس پر اس کے باپ کے جلانے کو اپنے چچا کی بیٹی سے نکاح کر لیا۔ اُسے پٹیالی میں رکھا۔ اور قاسم خاں کی بیٹی کو خیر آباد اس کے بھائیوں میں بھیج دیا۔ نوکری سے بیزار ہو گیا۔ اور کہا کہ اب خدا کی نوکری کرینگے۔ اور جہاد کر کے دین خدا کی خدمت بجا لائینگے +

کہیں سُن لیا تھا۔ کہ اودھ کے علاقے سے کوہ شوالک میں داخل ہوں۔ تو ایسے مندر اور شوالے ملتے ہیں۔ کہ تمام سونے چاندی کی اینٹوں سے چُنتے ہوئے ہیں۔ چنانچہ لشکر تیار کر کے دامن کوہ میں داخل ہوُا۔ پہاڑیوں نے اپنے معمولی پیچ کھیلے۔ گاؤں چھوڑ دیئے۔ اور تھوڑی بہت مار پیٹ کے بعد اونچے اونچے پہاڑوں میں گھُس گئے۔ حسین خاں بڑھتا ہوُا وہاں جا پہنچا۔ جہاں سلطان محمود کا بھانجا پیر محمد شہید ہوُا تھا۔ اور شہیدوں کا مقبرہ موجود تھا۔ اُس نے شہیدوں کی پاک روحوں پر فاتحہ پڑھی۔ قبریں مسمار پڑی تھیں۔ ان کا چبوترہ باندھا اور آگے بڑھا۔ دُور تک نکل گیا۔ مقام جوائل پر جا پہنچا۔ اور وہاں تک گیا۔ کہ جہاں اجمیر دارالخلافہ ان کا دو دن کی راہ رہ گیا۔

یہاں سونے چاندی کی کان ابریشم مشک اور تمام عجائب و نفائس ولایت تبت کے ہوتے ہیں۔ اس سرزمین کی قدرتی تاثیر ہے۔ نقارہ کی دمک۔ لوگوں کے غل اور گھوڑوں کے ہنہنانے سے برف پڑنے لگتی ہے۔ چنانچہ یہی آفت برسنی شروع ہوئی۔ گھاس کے پتّے تک نایاب ہو گئے۔ رسد کا رستہ ہی نہ تھا۔ بھوک کے مارے لوگوں کے حواس جاتے رہے حسین خاں دلاور کا دل اپنی جگہ بدستور قائم تھا۔ اُس نے لوگوں کے دل بہت بڑھائے۔ جواہرات اور خزانوں کے لالچ دیئے۔ سونے چاندی کی اینٹوں کی بھی کہانیاں سنائیں۔ مگر سپاہی دل ہار چکے تھے۔ کسی نے قدم نہ اُٹھایا۔ اور اُس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر زبردستی کھینچ لائے۔ پھرتے ہوئے پہاڑیوں نے رستہ روکا۔ چاروں طرف سے اُمنڈ آئے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کھڑے ہوئے اور تیر برسانے شروع کئے۔ ان تیروں پر زہریلی ہڈیوں کی پیکان چڑھی تھی۔ پتھروں کی بارش تو ان کے نزدیک کچھ بات ہی نہ تھی۔ بڑے بڑے بہادر سورما شہید ہو گئے۔ جو جیتے پھرے وہ زخمی تھے پانچ پانچ چھ چھ مہینے کے بعد زہر کی تاثیر سے وہ بھی مر گئے۔

حسین خاں پھر دربار میں حاضر ہوئے۔ اکبر کو بھی افسوس ہوُا۔ مگر اس نے عرض کی۔ مجھے کانت گولہ کا علاقہ جاگیر ملے کہ دامنِ کوہ ہے۔ مَیں اُن سے انتقام لئے بغیر نہ چھوڑونگا۔ درخواست منظور ہوئی۔ اُس نے بھی کئی دفعہ پہاڑ کے دامن

کو ہلا ہلا دیا۔ مگر اندر نہ جا سکا۔ اور اپنے پُرانے پُرانے سپاہی جو پہلی دفعہ بچا کر لایا تھا۔ انہیں اب کی دفعہ موت کا زہر آب پلایا۔ پہاڑ کا پانی ایسا لگا۔ کہ بن لڑے مر گئے۔

۹۸۰ھ میں کہ اکبر خان اعظم کی مدد کے لئے خود یلغار کر کے گیا تھا میدان جنگ کی تصویر تم دیکھ چکے ہو۔ رستم و اسفندیار کے معرکے آنکھوں میں پھر جاتے تھے۔ ملّا صاحب لکھتے ہیں کہ حسین خاں اس موقع پر پیش قدم تھا۔ اور اکبر شمشیر زنی دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اُسی وقت بلوایا اور شمشیر خاصہ کہ جسے کاٹ اور گھاٹ کی خوبی سے اور جوہر دشمن کشی سے ہلاکی خطاب دیا تھا انعام فرمائی۔

ابراہیم حسین مرزا لُوٹتا مارتا ہندوستان کی طرف آیا۔ کہ اکبر گجرات میں ہے ادھر میدان خالی ہے۔ شاید کچھ بات بن جائے۔ حسین خاں کی جاگیر اُس وقت کانت گولہ ہی تھی۔ پنیالی اور بداؤں کے سرکش دبانے آئے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں ابراہیم کے آنے سے بھونچال آگیا۔ مخدوم الملک اور راجہ بہاڑا مل فتح پور میں وکیل مطلق تھے۔ دفعتہً ان کا خط حسین خاں کے پاس پہنچا۔ کہ ابراہیم دو جگہ شکست کھا کر دلّی کی اطراف میں پہنچا ہے اور پائے تخت کا مقام ہے کہ خالی پڑا ہے۔ اُس فرزند کو چاہیئے۔ کہ جلد اپنے تئیں وہاں پہنچائے۔ یہ ایسے معرکوں کے عاشق تھے خط دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رستے میں خبر لگی کہ راجہ اودلیر جو ابتدائے جلوس اکبری سے ہمیشہ نواحی آگرہ میں رہزنی اور فساد کرتا رہتا ہے اور قزاق بنا پھرتا ہے۔ اور بڑے بڑے نامی امیروں کے ساتھ سخت معرکے مار کے اچھے اچھے بہادروں کو ضائع کر چکا ہے۔ اس وقت نورا ہے کے جنگل میں چھپا ہوا بیٹھا ہے۔ رمضان کی ۱۵ تھی حسین خاں اور اُس کے لشکر کے لوگ روزے سے تھے اور بے خبر چلے جاتے تھے۔ ٹھیک دو پہر کا وقت تھا۔ کہ یکایک بندوق کی آواز آئی۔ اور فوراً لڑائی شروع ہو گئی۔ راجہ اودلیر نے جنگل کے گواروں کو ساتھ لیا تھا۔ درختوں پر تختے باندھ رکھے تھے۔ ڈاکو ان پر مزے سے بیٹھ گئے۔ اور جنگل پہاڑوں کو تیر و تفنگ کے منہ پر دھر لیا۔

لڑائی کے شروع ہوتے ہی حسین خاں کے زانو کے نیچے گولی لگی۔ ران

میں دوڑ گئی۔ اور گھوڑے کی زین پر جا کر نشان دیا۔ اُسے ضعف آگیا چاہتا تھا کہ گرے مگر بہادری نے سنبھالا۔ ملا عبدالقادر بھی ساتھ تھے۔ لکھتے ہیں۔ کہ مَیں نے پانی چھڑکا۔ آس پاس کے لوگوں نے جانا روزہ کا ضعف ہے۔ مَیں نے باگ پکڑ کر چاہا کہ کسی درخت کی اوٹ میں لے جاؤں۔ آنکھ کھولی۔ خلاف عادت چیں بجبیں ہو کر مجھے دیکھا اور جھنجھلا کر کہا کہ باگ پکڑنے کا کیا موقع ہے بس اُتر پڑو۔ اُسے وہیں چھوڑ کر سب اُتر پڑے۔ ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ اور اور طرفین سے اتنے آدمی مارے گئے۔ کہ وہم بھی اُن کے شمار میں عاجز ہے شام کے قریب اس قلیل جماعت کے حال پر خدا نے رحم کیا۔ فتح کی ہوا چلی۔ اور مخالف اس طرح سامنے سے چلنے شروع ہوئے۔ جیسے بکریوں کے ریوڑ چلے جاتے ہیں۔ سپاہیوں کے ہاتھوں میں حرکت نہ رہی۔ جنگل میں دوست دشمن غٹ بیٹ ہو گئے۔ باہم پہچانتے تھے اور ضعف کے مارے ایک کا ہاتھ ایک پر نہ اُٹھتا تھا۔ بعض مقبول اور مستقبل بندوں نے جہاد کا بھی ثواب لیا۔ اور روزہ بھی رکھا۔ برخلاف فقیر کے کہ جب بے طاقت ہونے لگا۔ تو گھونٹ پانی بہم پہنچا کر گلا تر کیا۔ بعضے بیچاروں نے بے آبی سے جان دی۔ اچھے یار تھے کہ اچھی شہادت کو پہنچے +

بڈھا سردار حسین خاں فتح پا کر کانت گولہ کو گیا۔ کہ سامان درست کرے اور علاقے کا بندوبست کرے۔ اتنے میں سُنا کہ حسین مرزا نواحی لکھنؤ میں سنبھل سے ۱۵ کوس پر ہے۔ سنتے ہی پالکی میں پڑ کر چل کھڑا ہوا۔ مرزا بانس بریلی کو کترا گیا۔ اور وہ یلغار کر کے دوڑا۔ مرزا کو خان کی بہادری کا حال خوب معلوم تھا۔ لکھنؤ کے نواحی میں فقط سات کوس کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اگر لڑائی ہوتی تو خدا جانے قسمت کا پاسا کس پہلو پڑتا۔ مگر جو حالت اس وقت حسین خاں کی اور لشکر کی تھی۔ اس کے لحاظ سے مرزا نے غلطی کی جو نہ آن پڑا۔ اور بچ کر نکل گیا۔ حق یہ ہے کہ اُس کی دھاک کام کر گئی +

حسین خاں سنبھل پر گیا۔ آدھی رات تھی۔ نقارے کی آواز پہنچی پُرانے پُرانے سردار انبوہ لشکر لئے موجود تھے جانا کہ مرزا آن پہنچا۔ سب قلعے کے

دروازے بند کرکے بیٹھ رہے۔ اور مارے رعب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آخر قلعے کے نیچے کھڑے ہو کر آواز دی کہ حسین خاں ہے تمہاری مدد کو آیا ہے۔ اُس وقت خاطر جمع ہوئی تو پیشوائی کو نکلے۔ دوسرے دن سب امرا کو جمع کرکے مشورت کی۔ سب کی رائے یہ تھی۔ کہ گنگا کے کنارے پر اہار کے قلعے میں اور امرا بھی لشکر لئے بیٹھے ہیں۔ اُن کے ساتھ چل کر ملنا چاہئے۔ اور جو صلاح ہو سو عمل میں آئے۔ حسین خاں نے کہا۔ بارک اللہ مرزا کہ یہ دُور دست ملک اور گنتی کے سواروں سے یہاں تک آن پہنچا۔ تمہارے پاس اضعاف مضاعف لشکر اور بیس تیس سردار پرانے سپاہی اور سنبھل کے قلعے میں ہیں۔ اُدھر وہ قلعہ اہار والے سردار ہیں۔ کہ جمعیت بے شمار رکھتے ہیں اور چوہے کی بلوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ اب دو باتوں کا موقع ہے۔ یا تم گنگا پار اُتر جاؤ۔ اہار والے پُرانے بہادروں کو بھی ساتھ لو۔ اور مرزا کا رستہ روکو۔ کہ پار نہ اُتر سکے۔ اور میں پیچھے سے آتا ہوں۔ جو کرے سو خدا۔ یا میں جھٹ پٹ پار اُتر جاتا ہوں۔ تم پیچھے سے دباؤ۔ کہ شہنشاہی دولت خواہی کا حق یہی ہے۔ اس پر ان میں سے ایک راضی نہ ہوا۔ ناچار جو اسوار ساتھ تھے۔ انہیں کو لے کر بھاگا بھاگ اہار پر پہنچا۔ اُنہیں بھی باہر نکالنا چاہا۔ جب نکلے تو بہت ملامت کی اور جمع کرکے کہا کہ غنیم ولایت کے بیچ میں آن پڑا ہے۔ اور یہاں بدحواسی کا یہ عالم ہے۔ گویا لشکر میں خرگوش آگیا۔ اگر جلد جنبش کرتے ہو تو کچھ کام ہو جائیگا۔ زندہ ہاتھ آئیگا اور فتح تمہارے نام ہوگی۔ اُنھوں نے کہا کہ ہمیں تو دِلّی کی حفاظت کا حکم تھا۔ ہم وہاں سے ریلتے ہوئے یہاں تک لے آئے۔ خواہ مخواہ مقابلہ کیا ضرور ہے۔ خدا جانے انجام کیا ہو +

ادھر مرزا امروہہ کو لوٹتا ہوا چومالہ کے گھاٹ سے گنگا پار ہوا۔ اور لاہور کا رستہ پکڑا۔ حسین خاں امرا پر دولت خواہی ثابت کرکے اُن سے جُدا ہوا۔ اور گڑھ مکتسر پر اس طرح جھپٹ کر آیا کہ حریف سے دست و گریبان ہو جائے۔ امرا میں سے جنھوں نے ساتھ دیا۔ ترک سبحان قلی اور فرخ دیوانہ تھا۔ پیچھے اہار والے امیروں کے بھی خط آئے۔ کہ ذرا ہمارا انتظار کرنا کہ ۹ سے گیارہ اچھے ہیں۔ مرزا کے سامنے میدان خالی تھا۔ جیسے خالی شطرنج میں رُخ پھرتا ہے

اسی طرح مرزا پھرتا تھا۔ اور آباد شہروں کو لوٹتا مارتا چلا جاتا تھا۔ پائل نواح انبالہ میں فحش و فضیحت بندگان بے گناہ کے عیال کی حد سے گزر گئی غرض حسین خاں پیچھے پیچھے دبائے چلا آتا تھا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے امرا تھے۔ سرہند میں آ کر سب رہ گئے حسین خاں ہی لپٹا چلا آیا۔ اور سوار اس کے رفاقت میں سو سے زیادہ نہ تھے۔ لودیانہ میں خبر پائی۔ کہ لاہور والوں نے دروازے بند کر لئے۔ اور مرزا شیر گڑھ اور دیپال پور کو گیا ؛

حسین قلی خاں بیرم خاں کا بھانجا کانگڑہ کو گھیرے پڑا تھا۔ اس نے مرزا کی آمد آمد سُنتے ہی پہاڑیوں سے صلح کا ڈھنگ ڈالا۔ اُنھوں نے منظور کیا۔ بہت سے نقد جنس جن میں پانچ من سونا تھا۔ لعل بہا میں لیا۔ اور وعدہ کر لیا کہ سکہ خطبہ بادشاہی جاری رہیگا۔ چند نامی سردار اُس کے ساتھ تھے۔ جن میں راجہ بیربر بھی شامل تھے۔ سب کو لے کر سیل کی طرح پہاڑ سے اُترا۔ حسین خاں سُنتے ہی تڑپ گیا۔ اور قسم کھائی کہ جب تک حسین قلی خاں سے نہ جا ملوں روٹی حرام ہے۔ یہ دیوانگی کہ ہزار درجہ ان عاقلوں کی عقلوں پر شرف رکھتی ہے۔ اُسے اُڑائے لئے جاتی تھی۔ جھنی وال علاقہ شیر گڑھ میں پہنچ کر شیخ داؤد جھنی وال سے کہ بڑے خدا رسیدہ فقیر تھے ملاقات کی۔ کھانا آیا تو اُنھوں نے عذر بیان کیا۔ اُنھوں نے کہا۔ آزردنِ دلِ دوستاں جہل است ؛ کفارہ یمین سہل اس خوش اعتقاد نے تعمیل حکم سعادت سمجھ کر اُسی وقت غلام آزاد کیا۔ اور کھانا کھایا۔ فاضل بداؤنی بھی اس یلغار میں ساتھ تھے۔ کہتے ہیں کہ رات کو وہیں رہے اور کل رسد کا سامان شیخ کے ہاں سے ملا۔ میں لاہور سے تیسرے دن وہاں پہنچا۔ اور حضرت کی حضوری میں وہ کچھ آنکھوں سے دیکھا کہ خیال میں بھی نہ تھا۔ چاہا تھا۔ کہ دنیا کے کاروبار چھوڑ کر اُن کی جاروب کشی کیا کروں۔ مگر حکم ہؤا کہ فی الحال ہندوستان جانا چاہئے۔ رخصت ہو کر بحالِ خراب و دلِ پریشان کہ خدا کسی کو نصیب نہ کرے۔ رخصت ہؤا۔ چلتے وقت نالہ ہائے بے اختیار دل سے نکلے ؎

دل بہ اُمید صدائے کہ در تو برسد	نالہا کرد دریں کوہ کہ فرہاد نہ کرد

حضرت کو خبر ہوئی۔ باوجودیکہ تین دن سے زیادہ کسی کو حکم نہ تھا۔ مجھے چوتھے دن بھی رکھا۔ بہت سے فیض پہنچائے اور ایسی باتیں کہیں۔ کہ اب تک مزے لیتا ہے ؎

میروم سوئے وطن وزور دِل بے اختیار ؎ نالۂ دارم کہ پنداری بہ غربت میروم

حسین قلی خاں مرزا سے چھری کٹاری ہوا چاہتا تھا۔ حسین خاں اس کے پیچھے تھا۔ تلنبہ ایک منزل رہتا تھا۔ حسین قلی خاں کو خط لکھا کہ چار سو کوس یلغار مار کر یہاں تک آیا ہوں۔ اگر اس فتح میں مجھ کو بھی شریک کرو۔ اور ایک دن لڑائی میں دیر کرو تو آثارِ محبت سے دُور نہ ہوگا۔ وہ بھی آخر بیرم خاں کا کھایا تھا۔ یہ سُنتے ہی ظاہراً خوش باشد کہا۔ اور گھوڑے کو ایک قمچی اور کر گیا۔ اُسی دن مار امار تلنبے کے میدان میں جہاں سے ملتان ۴۰ کوس رہتا ہے تلواریں کھینچ کر جا پڑا۔ مرزا کو اُس کے آنے کی خبر بھی نہ تھی۔ شکار کو گیا تھا۔ فوج کچھ کوچ کی تیاری میں تھی۔ بعضے بے سامان پریشان تھے۔ جنگ میدان کی لڑائی کا انتظام بھی نہ ہو سکا۔ مرزا کا چھوٹا بھائی۔ پیش دستی کر کے حسین قلی خاں کی فوج پر آن پڑا۔ زمین کی ناہمواری سے گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا نوجوان لڑکا پکڑا گیا۔ مرزا اتنے میں شکار سے پھرے اتنے میں کام ہاتھ سے جا چکا تھا۔ ہر چند سپاہیانہ کوششیں کیں اور مردانہ حملے کئے۔ کچھ نہ ہو سکا۔ آخر بھاگ نکلا۔ فتح کے دوسرے دن حسین خاں جا پہنچے۔ حسین قلی خاں نے میدانِ جنگ دکھایا۔ اور ہر ایک کی جانفشانی کا حال بیان کیا۔ حسین خاں نے کہا کہ غنیم جیتا نکل گیا ہے۔ تمہیں تعاقب کرنا چاہئے تھا۔ کہ جیتا پکڑ لیتے۔ کام ابھی ناتمام ہے۔ اُس نے کہا کہ نگر کوٹ سے یلغار کر کے آیا ہوں۔ لشکر نے وہاں بڑی بڑی محنتیں اُٹھائیں۔ اب ان میں طاقت نہیں رہی یہی بڑی فتح تھی۔ حالانوبت یارانِ دیگر ست حسین خاں نے اس امید پر کہ شاید اُس کی بھی نوبت آ جائے اور محنت پانسو کوس کی یلغار کی بھول جائے۔ اُس سے رخصت ہو کر چلا۔ تھکے ماندے آدمیوں کو ہاتھی اور نقارہ سمیت لاہور بھیج دیا۔ اور آپ مرزا بیچارا کے پیچھے چلا۔ جہاں بیاس اور ستلج ملتے ہیں۔ وہاں مرزا بدنصیب پر جنگل کے ڈاکوؤں نے شب خون مارا۔ ایک تیر اُس کی گدی میں ایسا لگا کہ منہ میں

نِکل آیا۔ جب حال بہت بدحال ہوا۔ تو اس نے بھیس بدلا۔ ساتھی ساتھ چھوڑ چھوڑ کر الگ ہوئے۔ اور جدھر گئے مارے گئے۔ مرزا نے دو تین قدیمی غلاموں کیساتھ فقیرانہ لباس کیا۔ اور شیخ ذکریا نام ایک گوشہ نشین کے پاس پناہ لی۔ وہ مرشدِ کامل تھے۔ ظاہر بیں رحم کا مرہم دکھایا۔ اندر اندر سعید خاں حاکم ملتان کو خبر دی اس نے جھٹ اپنے غلام کو بھیجا۔ وہ قید کر کے لے گیا۔ حسین خاں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے گرفتاری کی خبر سنتے ہی ملتان پہنچے۔ سعید خاں سے ملے۔ اس نے کہا کہ مرزا سے بھی ملو۔ حسین خاں نے کہا کہ ملاقات کے وقت اگر تسلیم بجا لاؤں تو شہنشاہی کے اخلاص کے خلاف ہے۔ اور نہیں کرتا تو مرزا دل میں کہیگا کہ اس راہزن کو دیکھو جب ستو اس کے محاصرے میں مَیں نے امان دے کر چھوڑا تو کس کس طرح کی تسلیمیں کی تھیں۔ آج ہم اس بدحالی میں ہیں تو پرواہ بھی نہیں کرتا۔ مرزا نے یہ بے تکلفانہ بات سُنکر کہا کہ آیئے بے تسلیم ہی ملئے۔ کہ ہم نے معاف کیا۔ مگر وہ جب گیا تو تسلیم بجالایا۔ مرزا افسوس کر کے کہتا ہے کہ ہمیں سرکشی اور جنگ کا خیال نہ تھا۔ جب جان پر بن گئی۔ تو سر لے کر ملکِ بیگانہ میں نِکل آئے یہاں بھی نہ چھوڑا۔ قسمت میں تو یہ ذلت پہنچنی تھی۔ کاش تیرے سامنے سے بھاگتے کہ ہم جنس تھا۔ مجھ ہی کو کچھ فائدہ ہوتا۔ حسین قلی خاں کہ دین و مذہب سے بیگانہ ہے اُس سے شکست کھانے کا افسوس ہے +

حسین خاں وہاں سے کانت گولہ یعنی اپنی جاگیر پر گئے۔ وہاں سے اِدھر تو حسین خاں اُدھر حسین قلی خاں دربار میں پہنچے۔ مسعود حسین مرزا کی آنکھوں میں ٹانکے لگائے باقیوں میں سے ہر ایک کے رتبے کے بموجب کسی کے منہ پر گدھے کی۔ کسی پر سؤر کی۔ کسی پر کتّے کی۔ کسی پر بیل کی کھال سب چہروں اور سینگوں سمیت چڑھائیں۔ اور عجیب مسخراپن کے ساتھ دربار میں حاضر کیا۔ تین سو آدمی کے قریب تھے۔ مرزا کے ساتھیوں میں سے تقریباً سو آدمی تھے کہ دعویٰ کے بہادر تھے۔ اور خانی اور بہادری کے خطاب رکھتے تھے۔ حسین قلی خاں سب کو پناہ دے کر جاگیر پر لے گئے۔ وہاں خبر پائی کہ حضور میں ان کی خبر پہنچ گئی ہے۔ اس لئے سب کو رخصت کر دیا۔ آخر بیرم خاں کا بھانجا تھا جب مفصّل حال لڑائی کا

بیان کیا تو ان لوگوں کے نام بھی لئے مگر کہا کہ قیدیوں کے باب میں حضور سے قتل کا گلہ نہیں ہے۔ فدوی نے سب حضور کے صدقے میں چھوڑ دئے اکبر نے بھی کچھ نہ کہا۔ اور حسین خاں سے بھی کچھ نہ پوچھا حسین قلی خاں کو اُس کی نیک نیتی کا پھل ملا۔ کہ خان جہاں کا خطاب ملا +

۹۸۲ھ میں جبکہ پٹنہ پر مہم تھی۔ اور اکبر کو دل سے اس مہم میں اہتمام تھا۔ منعم خاں خان خاناں کی سپہ سالاری تھی۔ بھوج پور کے علاقے میں بادشاہ دَورہ کرتے پھرتے تھے۔ قاسم علی خاں کو بھیجا کہ بچشم جا کر معرکۂ جنگ دیکھے اور ہر ایک جانفشانی کا حال عرض کرے۔ وہ واپس آیا اور سب حال بیان کیا حسین خاں کا حال پوچھا تو اُس نے کہا کہ کوچک خاں اُس کا بھائی تو حق الخدمت بجا لاتا ہے مگر حسین خاں کانت گولہ سے اَوَدھ میں آکر لوٹتا پھرتا ہے۔ بادشاہ نہایت خفا ہوئے۔ اور انجام اس کا یہ ہوا کہ جب کچھ عرصہ بعد دَورہ کرتے ہوئے دلّی میں پہنچے تو حسین خاں بھی پٹیالی اور بھونگاؤں میں آیا ہوا تھا۔ ملازمت کو حاضر ہوا معلوم ہوا کہ مجرا بند ہے۔ اور شہباز خاں کو حکم ہے کہ طناب دولت خانہ کی حد سے باہر نکال دو۔ اس قدیمی نمک خوار کو نہایت رنج ہوا۔ ہاتھی۔ اونٹ۔ گھوڑے جو کچھ سامان امارت کا تھا سب لٹا دیا۔ کچھ ہمایوں کے روضے کے مجاوروں کو دیا۔ کچھ مدرسہ اور خانقاہوں کے غریبوں کو دیا۔ اور کفنی گلے میں ڈال فقیر ہو گیا۔ کہ اُسی نے مجھے نوکر رکھا تھا۔ وہی میرا قدر دان تھا۔ اب میرا کوئی نہیں۔ اُس کی قبر پر جھاڑو دیا کرونگا۔ جب یہ خبر حضور میں پہنچی تو مہربان ہوئے۔ شال خاصہ عنایت ہوئی۔ اور ترکش خاص کا تیر پروانگی کے لئے دیا۔ کانت گولہ اور پٹیالی کی ایک کروڑ بیس لاکھ دام کی جاگیر ہوتی تھی۔ حکم دیا کہ بدستور سابق مقرر ہے۔ اور کروڑی مداخلت نہ کرے۔ جب سوار داغ و محلہ پر حاضر کریگا تو جاگیر تنخواہ کے لائق پائیگا۔ وہ لکھ لٹ مسخرا ۱۰ سوار بھی نہ رکھ سکتا تھا۔ بحسب ضرورت دفع الوقت کر کے جاگیر پر پہنچا +

۹۸۲ھ میں فاضل بدایونی لکھتے ہیں حسین خاں کہ سپاہی پیشہ بہادروں میں سے تھا۔ اس کے ساتھ معنوی علاقے کے ساتھ میرا رابطہ عظیم و قدیم تھا۔ اور

اور خالصاً لِلّٰہ محبت تھی۔ داغ و محلّہ کی خدمت سپاہی کی گردن توڑنے والی اور لذتوں کو خاک میں ملانے والی ہے۔ آخر وہ بھی نہ کر سکا۔ چنانچہ ظاہری دیوانگی اور باطنی فرزانگی کے ساتھ جاگیر سے روانہ ہوا۔ رفیقانِ خاص کی جماعت جو طوفانِ آتش اور سیلابِ دریا سے مُنہ توڑنے والی نہ تھی۔ اور کسی طرح اُس کی رفاقت نہ چھوڑ سکتی تھی۔ انہیں ساتھ لیا۔ اور علاقوں کے زمیندار جنہوں نے جاگیرداروں کو خواب تک میں بھی نہیں دیکھا تھا اُنہیں پامال کرتا ہوا کوہ شمالی کا رُخ کیا۔ جس کا مدت العمر سے عاشق تھا۔ سونے چاندی کی کانیں وہاں کی سامنے تھیں۔ اور اس وسیع دل میں نقرئی اور طلائی مندروں کا شوق تھا کہ جن میں عالم نہ سماتا تھا ✦

بسنت پور ایک نہایت بلند اور مشہور جگہ ہے یہ تو وہاں پہنچا۔ یہاں جو زمیندار اور کروڑی اس کے سامنے چوہے کے بلوں میں چھپ رہے تھے۔ اُنہوں نے اب مشہور کیا کہ حسین خاں باغی ہو گیا۔ اور یہی عرضیاں حضور میں بھی پہنچیں۔ حضرت شہنشاہی نے بعض امرا سے دریافت کیا۔ زمانے کی وفاداری دیکھو۔ کہ جو لوگ قرابت قریبی رکھتے تھے۔ اُنہوں نے کلمۂ حق سے پہلو بچا لیا اور کہا تو اور جو کچھ بولے بُرے ہی بولے ✦

غرض یہاں تو اپنے یہ بیگانگی خرچ کر رہے تھے۔ وہاں اس نے بسنت پور جا گھیرا۔ اور بے قاعدہ محاصرہ ڈالا۔ بہت سے کار آزمودہ رفیق کام آئے۔ اور خود شانہ کے نیچے کاری زخم کھایا۔ ناچار اور ناکام وہاں سے اُلٹا پھرا۔ اور کشتی سوار دریائے گنگا کے رستے گڑھ مکتیسر میں پہنچا کہ پٹیالی جا کر اہل و عیال میں رہے۔ اور علاج کرے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے۔ کہ وہ منعم خاں کے پاس چلا تھا کہ وہ حضور کا قدیمی بڈھا خدمت گذار اور میرا یار ہے۔ اس کے ذریعے سے خطا معاف کراؤنگا۔ صادق محمد خاں بھرتی کر کے جا پہنچا اور قصبہ بارہہ پر جا پکڑا۔ جو کچھ متن میں ہے۔ یہ ملا صاحب اُن کے نمک حلال دوست کی تحریر ہے۔ ابوالفضل اکبر نامے میں لکھتے ہیں کہ حسین خاں ملک لوٹتے پھرتے تھے۔ بادشاہ سُنکر دوبارہ ناراض ہوئے۔ اور ایک سردار کو ساداتِ بارہہ اور ساداتِ امروہہ کی جمعیت سے روانہ کیا۔ وہ کچھ خوابِ مستی سے ہوش میں آیا۔ کچھ زخم سے دل شکستہ ہو رہا تھا۔

بہرحال ہدایت کے رستے پر آیا۔ جواو باش ساتھ تھے وہ فوج بادشاہی کی خبر سُنتے ہی بھاگ گئے۔ خان نے ارادہ کیا کہ بنگالہ منعم خاں خان خاناں اپنے قدیمی دوست سے ملے۔ اور اُس کی معرفت درگاہ میں توبہ کرے۔ گڈھ مکتیسر کے گھاٹ سے سوار ہوکر چلا تھا۔ کہ بار ہہ کے مقام پر گرفتار ہُوا۔

صادق محمد خاں ایک امیر تھا کہ فتح ہند سے بلکہ جنگِ قندھار سے نزاکت مزاج اور تعصب مذہب کے سبب حسین خاں کا اس کے ساتھ بگاڑ تھا بموجب بادشاہ کے حکم کے اُس کے ہاں لاکر اُتارا۔ اور شیخ مہنا طبیب بھی فتحپور سے علاج کے لئے آیا۔ دیکھ کر حضور میں عرض کی زخم خطرناک ہے۔ حکیم عین الملک کو بھیجا۔ مجھ سے اُن سے پہلا سابقہ تھا۔ ساتھ ہی لے کر میں آیا۔ ملاقات کی۔ ایام گرما کی حسرت اور قدیمی محبتیں۔ اور اندنوں کی باتیں یاد آئیں۔ آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ آنسو بھر آئے۔ اور دیر تک باتیں کچھ کچھ کہتے رہے ؎

ہر جا من واو جملہ بہم باز رسیدیم ۔۔۔ از بیم بد اندیش لب خویش گزیدیم
بے واسطۂ گوش ولب از راہِ دل و چشم ۔۔۔ بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

اتنے میں بادشاہی جراح پٹی بدلنے آئے۔ بالشت بھر سلائی چلی گئی۔ زور سے کریدتے تھے۔ کہ دیکھیں زخم کہاں تک ہے۔ وہ مردانہ نیش کو نوش کی طرح پیے جاتا تھا۔ تیوری پر بل نہ لاتا تھا۔ بے تکلف مسکراتا تھا اور باتیں کئے جاتا تھا ؎

رویم شگفتہ از سخنِ تلخ مردم است ۔۔۔ زہر است در دہاں لبم در تبسم است

افسوس کہ دیدار قیامتی اور رخصت والپسین تھی۔ جب ہم فتح پور پہنچے تو تین چار دن بعد سُنا کہ اوّل اسہال ہُوا پھر انتقال ہوگیا۔

جس سخی نے عالم عالم خزانے مستحقوں کو بخش دئے اس کے پاس کچھ نہ تھا کہ دفن دکفن میں لگائیں۔ خواجہ محمد یحیٰی نقشبندی کوئی بزرگ اس زمانے میں بڑے پیر مشہور تھے۔ اُنہوں نے بڑی عزت و احترام سے مسکن غریباں میں پہنچایا ؎

در خاک چگونہ خفتہ تو انم دید ۔۔۔ آنرا کہ مرا ز خاک برداشتہ بود

وہاں سے پتیالی میں لاکر اُس گنج الٰہی کو زیر خاک کیا کہ وہیں اس کے رشتہ دار دفن تھے۔ ملا صاحب نے گنج بخشی سے تاریخ نکالی ۹۸۵ھ فاضل بداؤنی لکھتے

ہیں۔ کہ جس دن اس کی وفات کی خبر پہنچی تو میر عدل اس دن بھکر کو روانہ ہوتے تھے۔ میں انہیں رخصت کرنے گیا اور یہ حال بیان کیا۔ زار زار روئے اور کہا کہ کوئی دنیا میں رہے تو اس طرح رہے جیسے حسین خاں ؎

غلام ہمتِ آنم کہ زیر چرخ کبود ... زہر چہ رنگِ تعلق پذیرد آزاد است

اتفاق یہ کہ میر مرحوم سے بھی وہی ملاقات یادگار رہی۔ انہوں نے خود بھی کہا کہ سب یار چلے گئے دیکھئے پھر تمہیں ہم دیکھ سکیں یا نہیں عجب بات منہ سے نکلی تھی کہ وہی ہوا ؎

تا دریں گلہ گوسفندے ہست ... نہ نشیند اجل ز قصابی

فاضل مذکور نے اس بہادر افغان کی دینداری۔ سخاوت اور بہادری کی اتنی تعریفیں لکھی ہیں کہ ان وصفوں کے ساتھ اگر پیغمبر نہیں تو اصحابوں سے کسی طرح کم نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں جن دنوں لاہور میں حاکم مستقل تھے تو ثقہ لوگوں سے سُنا گیا کہ دنیا کی نعمتیں موجود تھیں مگر وہ جَو کی روٹی کھاتے تھے فقط اس خیال سے کہ آنحضرتؐ نے یہ ہر مزے کے کھانے نہیں کھائے میں کیونکر کھاؤں۔ پلنگ اور نرم بچھونوں پر نہ سوتے تھے کہ حضرتؐ نے اس طرح آرام نہیں فرمایا۔ میں کیونکر ان آراموں سے لطف اُٹھاؤں ہزاروں مسجدوں اور مقبروں کی تعمیر اور ترمیم کروائی *

اکثر علما و سادات و مشائخ اس کی صحبت میں رہتے تھے۔ اس لئے سفر میں چارپائی پر نہ سوتا تھا۔ تہجّد کی نماز کبھی قضا نہیں کی۔ لاکھوں اور کروڑوں کی جاگیر مگر طویلے میں اس کے خاصے کا ایک گھوڑے سے زیادہ نہ تھا۔ کبھی ایسا مستحق آجاتا تھا کہ وہ بھی لے جاتا تھا۔ اکثر سفر خواہ مقام میں پیادہ ہی رہ جاتا تھا۔ نوکر غلام اپنے گھوڑے کس کر لے آتے تھے کسی شاعر نے قصیدہ کہا تھا۔ اُس میں یہ مصرع بھی تھا اور واقعی سچ تھا ع :- خانِ مفلس غلام باسامان

قسم کھائی تھی کہ روپیہ جمع نہ کرونگا۔ کہتا تھا۔ جو روپیہ میرے پاس آتا ہے۔ جب تک خرچ نہیں کر لیتا۔ پہلو میں تیر سا کھٹکتا ہے۔ روپیہ علاقے پر سے آنے نہ پاتا تھا۔ وہیں چٹھیاں پہنچ جاتی تھیں اور لوگ لے جاتے تھے۔ نذرمان

رکھی تھی۔ کہ جو غلام ملک میں آئے پہلے ہی دن آزاد رہے۔ شیخ خیر آبادی اس زمانے میں ایک بزرگ کہلاتے تھے۔ وہ ایک دن کفایت شعاری کے فواید اور روپیہ کے جمع کرنے کے لئے نصیحت کرنے لگے۔ غصّے ہو کر جواب دیا "پیغمبر صاحب نے کبھی ایسا کیا ہے۔ حضرت اُمید تو یہ تھی۔ کہ اگر ہم پر حرص ہوا غالب ہو تو آپ نصیحت کریں۔ نہ کہ دنیا کے اسباب کو ہماری نگاہوں میں جلوہ دیں"

فاضل مذکور کہتے ہیں کہ وہ قوی ہیکل قد و قامت کی شان و شوکت سے بڑا دیدار و جوان تھا۔ میں ہمیشہ میدان جنگ میں اُس کے ساتھ نہیں رہا۔ مگر کبھی کبھی جو جنگلوں میں لڑائیاں ہوئیں تو موجود تھا۔ حقیقت یہ ہے جو بہادری اس میں پائی۔ پہلوانوں کے نام افسانوں میں دیکھی جاتی ہے۔ شاید ان میں ہو تو ہو جب لڑائی کے ہتھیار سجتا تھا تو دُعا کرتا تھا الٰہی یا شہادت یا فتح۔ بعض شخصوں نے کہا۔ کہ پہلے فتح کیوں نہیں مانگتے۔ جواب دیا کہ عزیزان گذشتہ کے دیکھنے کی تمنا مخدومان موجود کے دیدار سے زیادہ ہے۔ سخی ایسا تھا کہ اگر جہان کے خزانے اور روئے زمین کی سلطنت اسے مل جاتی۔ پھر بھی وہ پہلے ہی دن قرضدار نظر آتا +

کبھی ایسا اتفاق ہوتا تھا چالیس چالیس پچاس پچاس ایرانی مجنس ترکی گھوڑے سوداگر لائے ہیں۔ فقط اتنا کہہ کر کہ تو دانی و خدا قیمت ہو گئی، اور ایک ہی جلسے میں سب بانٹ دئے۔ اور جن کو نہیں پہنچے۔ ان سے باخلاق تمام عذر کیا۔ میری پہلی ملاقات آگرہ میں ہوئی۔ پانسو روپے اور ایک ایرانی گھوڑا کہ اُسی وقت لیا تھا مجھے دے دیا ؎

شاہ ہر روز م ندید و بے سخن صد لطف کرد	شاہ بزدم دید و مدحش گفتم و ہیچم نداد

کیا کیجئے ع ہر کہ را ہر چہ ہست میگویند

جب مرا تو ڈیڑھ لاکھ روپے سے زیادہ قرض نکلا۔ چونکہ قرض خواہوں سے نیکی اور نیک معاملگی کرتا رہا تھا۔ سب آئے۔ خوشی خوشی تمسک پھاڑے اور مغفرت کی دعائیں دے کر چلے گئے۔ جس طرح اوروں کے وارثوں سے

جھگڑے ہوتے ہیں اس کے بیٹوں سے کوئی کچھ نہ بولا +

مجھ سے ان کی تعریف کا حق کب ادا ہو سکتا ہے۔ مگر اس لئے کہ نوجوانی عمر کی۔ بہار کا موسم ہوتا ہے۔ وہ اُس کی خدمت میں گذرا۔ اور اُس کے التفات کی بدولت میری حالت نے بہت اچھی پرورش پائی۔ کہ شہرہ زماں اور انگشت نمائے جہانیاں ہوا۔ اُسی کی تقریب سے یہ توفیق پائی کہ بندگانِ خدا کو علم و آگاہی کے فوائد پہنچا سکتا ہوں۔ اس لئے اپنے دفتر میں بعض وصف اس کے کہ ہزاروں میں سے ایک اور بہت میں سے تھوڑے ہیں۔ افسوس ہے اس وقت پر کہ بڑھاپے کی خواری اور نحوست کی سرگردانی کا موسم ہے۔ اسی طرح خیالات سے کئی صفحے سیاہ کر کے کہتے ہیں۔ کہ ہم نے آپس میں عہد قدیم کو استحکام دیا تھا۔ خدا سے اُمید ہے کہ میرا اس کا حشر بھی ساتھ ہی ہو۔ وَمَا ذالِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ۔ اللہ کے نزدیک یہ کچھ بڑی بات نہیں +

ابوالفضل نے اُنہیں تین ہزاری کی فہرست میں لکھا ہے۔ اُن کا بیٹا یوسف خاں جہانگیر کے دربار میں امیر تھا۔ اُس نے مرزا عزیز کوکہ کیساتھ دکن میں بڑی شجاعت دکھائی۔ وہ ۵ سنہ جہانگیری میں شاہزادہ پرویز کی مدد پر گیا تھا۔ یوسف خاں کا بیٹا عزت خاں تھا۔ وہ شاہجہان کی سلطنت میں حق خدمت ادا کرتا تھا +

مہیش داس راجہ بیربر

ان کا نام اکبر کے ساتھ اسی طرح آتا ہے۔ جیسے سکندر کے ساتھ ارسطو کا نام۔ لیکن جب اُن کی شہرت کو دیکھ کر حالات پر نظر کرو۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ارسطو سے بہت زیادہ لائے تھے۔ اصل کو دیکھو تو بھاٹ ہے علم و فضل کو خود ہی سمجھ لو کہ بھاٹ کیا اور اُس کے علم و فضل کی بساط کیا۔ کتاب تو بالائے طاق رہی۔ آج تک ایسا اشلوک نہیں دیکھا۔ جو گنوان پنڈتوں کی سبھا میں فخر کی

آواز سے پڑھا جائے۔ ایک دُہرا نہ سُنا کہ دوستوں میں دُہرایا جائے۔ لیاقت کو دیکھو تو ٹوڈرمل کُجا اور یہ کُجا۔ مہمات اور فتوحات کو دیکھو تو کسی میدان میں قبضہ کو نہیں چھوا۔ اُس پر یہ عالم ہے کہ سارے اکبری نورتن میں ایک دانہ بھی اُن کے قدر و قربت سے لگّا نہیں کھاتا۔

بعض مؤرخ لکھتے ہیں کہ اصلی نام مہیش داس تھا اور قوم برہمن، اکثر کہتے ہیں کہ بھاٹ تھے۔ برہیہ تخلص کرتے تھے۔ ملّا صاحب بھاٹ کے ساتھ برہمداس نام لکھتے ہیں۔ کالپی وطن تھا۔ اوّل رام چندر بھٹ کی سرکار میں نوکر تھے۔ جس طرح اور بھاٹ شہروں میں پھرتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی پھرا کرتے تھے۔ اور اسی طرح کے کبت کہا کرتے تھے۔

ابتدائے جلوس میں کہیں اکبر سے مِل گئے تھے۔ قسمت کی بات تھی خدا جانے کیا بات بادشاہ کو بھا گئی۔ باتوں ہی باتوں میں کچھ سے کچھ ہو گئے۔

بیشک قربت اور مصاحبت کی حیثیت سے کوئی عالیجاہ امیر اور جلیل القدر سردار اُن کے رُتبہ کو نہیں پہنچتا۔ لیکن تاریخ سلطنت کے سلسلہ میں جو تعلق انہیں ہے۔ وہ نہایت تھوڑا نظر آتا ہے۔

(ذرا دیکھنا۔ ملّا صاحب اُن کا حال کس طرح لکھتے ہیں) ۹۸۰ھ میں نگرکوٹ حسین قلی خاں کی تلوار پر فتح ہوا۔ شرح اس قصہ کی مُجملاً یہ ہے۔ کہ بادشاہ کو لڑکپن سے برہمنوں بھاٹوں اور اقسام طوائف ہنود کی طرف میلان خاطر اور التفات خاص تھا۔ اوائل جلوس میں ایک برہمن بھاٹ منگتا برہم داس نام کالپی کا رہنے والا کہ ہنود کے گُن گانے اُس کا پیشہ تھا۔ لیکن بڑا ٹُرّتا اور سیانا تھا۔ اُس نے ملازمت میں آکر تقرب و ہمزبانی کی بدولت مزاج میں دخل پیدا کیا۔ اور ترقی کرتے کرتے منصب عالی کو پہنچ کر یہ عالم ہوا۔ ع

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

اوّل کب رائے (کوی کبت کہنے والا۔ کب رائے۔ کبت کہنے والوں کا راجہ۔ گویا ملک الشعراء) پھر راجہ بیربر خطاب ہوا۔

بنیاد اس مہم کی یہ تھی کہ بادشاہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر کانگڑہ کی فتح کا

حکم دیا۔ اور راجہ بیربر بناکہ ملک مذکور ان کے نام کر دیا۔ حسین قلی خاں کو فرمان بھیجا۔ کہ کانگڑہ پر قبضہ کر کے راجہ بیربر کی جاگیر کر دو۔ مصلحت اس میں یہی ہوگی۔ کہ ہندوؤں کا مقدس مقام ہے۔ برہمن کا نام درمیان رہے۔ حسین قلی خاں نے امرائے پنجاب کو جمع کیا۔ لشکر اور توپ خانے فراہم کئے۔ قلعہ کشائی اور پہاڑ کی چڑھائی کے سامان ساتھ لئے۔ راجہ جی کو نشان کا ہاتھی بنا کر آگے رکھا اور روانہ ہؤا۔ سپہ سالار جس عرق ریزی سے گھاٹیوں اُترا اور چڑھائی چڑھا۔ اسکے بیان میں مؤرّخوں کے قلم لنگڑے ہوتے ہیں۔ غرض کہیں لڑائی کہیں رسائی سے کانگڑہ پر پہنچا۔ **آزاد**۔ ایسی محنت اور جانکاہی کے مقاموں میں راجہ جی کیا کرتے ہوں گے؟ چلاتے اور غل مچاتے ہونگے۔ مسخرا پن کے گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہوں گے۔ قلیوں اور مزدوروں کو گالیاں دیتے ہونگے۔ اور ہنسی ہنسی میں کام نکالتے ہونگے۔ کانگڑہ کا محاصرہ بڑی سختی کے ساتھ ہؤا اس فوج میں کیا ہندو کیا مسلمان سب ہی شامل تھے۔ دھاوے کے جوش میں جو سختیاں ہوئیں۔ اس میں راجہ جی بہت بدنام ہوئے۔ چونکہ پنجاب پر ابراہیم مرزا باغی ہو کر چڑھ آیا تھا۔ اس لئے حسین قلی خاں نے صلح کر کے محاصرہ اُٹھایا۔ راجہ کانگڑہ نے بھی غنیمت سمجھا۔ اس لئے جو شرطیں پیش کیں۔ خوشی سے منظور کیں۔ چوتھی شرط پر سپہ سالار نے کہا کہ حضور سے یہ ولایت راجہ بیربر کو مرحمت ہوئی تھی۔ اُن کے لئے کچھ خاطر خواہ ہونا چاہیئے۔ یہ بھی منظور ہؤا۔ اور جو کچھ ہؤا سا تنا ہؤا۔ جس میں ترازو کی تول فقط پانچ من سونا بوزن اکبری رکھا گیا۔ اور ہزاروں روپیہ کے عجائب ونفائس بادشاہ کے لئے۔ بیربر جی کو اور جھگڑوں سے کیا غرض تھی اپنی دکشنا لے لی اور گھوڑے پر چڑھ کر ہوا ہوئے۔ اکبر گجرات اور احمد آباد کی طرف مارا مار کوچ کو تیار تھا۔ اُسے سلام کیا۔ اور اسیسیں دیتے لشکر میں شامل ہوگئے

اواخر ۹۹۰ھ میں راجہ بیربر نے ضیافت کے لئے عرض کیا۔ اور بادشاہ منظور فرما کر اُن کے گھر گئے۔ وہی چیزیں جو کبھی کبھی عنایت کی تھیں۔ حاضر کیں۔ نقد کو نثار کیا۔ باقی پیشکش کر دیا اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

آزاد۔ صورت حال اور ہوگی عجب نہیں کہ اہل دربار اور اہلِ خلوت نے اُن پر تقاضے شروع کئے ہوں۔ کہ سب امرا حضور کی ضیافت کرتے ہیں۔ تم کیوں نہیں کرتے ہو

لیکن ظاہر ہے۔ کہ امرا لڑائیوں پر جاتے تھے۔ ملک مارتے تھے۔ حکومتیں کرتے تھے۔ دولتیں کماتے تھے۔ انعام و اکرام بھی پاتے تھے۔ وہ بادشاہ کی ضیافتیں کرتے تھے۔ تو شاہانہ جاہ و جلال سے گھر سجاتے تھے۔ جس کی ادنےٰ بات یہ کہ سوا لاکھ روپیہ کا چبوترہ باندھتے تھے۔ مخمل و زربفت و کمخواب راہ میں پانداز بچھاتے تھے۔ جب قریب پہنچتے تھے۔ تو سونے چاندی کے پھول برساتے تھے۔ دروازے پر پہنچتے تھے۔ تو موتی طبق کے طبق نچھاور کرتے تھے۔ لاکھوں روپے کے تحائف جن میں لعل جواہر۔ شالیں۔ مخمل ہائے زربفت۔ اسلحہ گراں بہا۔ لونڈیاں حسین۔ غلام صاحب جمال۔ ہاتھی۔ گھوڑے کہاں تک تفصیل لکھوں۔ خلاصہ یہ کہ جو کماتے تھے سو لٹاتے تھے۔ راجہ بیربر کے لئے یہ رستے بند تھے۔ اُنھوں نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ جو کچھ اُنھوں نے دیا تھا۔ وہی اُن کے سامنے رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ مگر وہ شرمانے والے نہ تھے۔ کچھ نہ کچھ کہا بھی ہو گا۔ وہ تو حاضر جوابی کی پھلجڑی تھے۔ آزاد ہوتا تو اتنا ضرور کہتا۔ کہ عطائے شما بہ لقائے شما۔ ع

	ہر چہ ز ایشاں میرسد آخر بد ایشاں میرسد	

بیربر دربار سے لے کر محل تک ہر جگہ ہر وقت رمے ہوئے تھے۔ اور اپنی دانائی اور مزاج شناسی کی حکمت سے ہر بات پر حسب مراد حکم حاصل کرتے تھے۔ اسی واسطے راجہ اور مہاراجہ امرا اور خوانین لاکھوں روپے کے تحفے بھیجتے تھے۔ بادشاہ بھی اکثر راجاؤں کے پاس انھیں سفیر کر کے بھیجتے تھے۔ یہ نہایت زیرک اور دانا تھے۔ کچھ تو قومی قربت سے کچھ منصب سفارت سے کچھ اپنے چٹکلوں اور لطیفوں سے وہاں بھی جا کر گھل مل جاتے تھے۔ اور وہ کام نکال لاتے تھے۔ کہ لشکروں سے نہ نکلتے تھے۔ ۹۸۴ھ میں بادشاہ نے رائے لون کرن کے ساتھ راجہ ڈونگر پور کے پاس بھیجا۔ راجہ اپنی بیٹی کو حرم سرائے اکبری میں داخل کیا چاہتا تھا۔ مگر بعض باتوں سے رُکا ہوا تھا۔ اُنھوں نے جاتے ہی ایسا منتر مارا۔ کہ سب بچار بھلا دیئے۔ ہنستے کھیلتے مبارک سلامت کرتے سواری لے آئے۔

۹۹۱ھ میں زین خاں کوکہ کے ساتھ راجہ رام چندر کے دربار میں گئے۔

بیربھدر اُس کا بیٹا آنے میں اندیشہ کرتا تھا۔ اُنہوں نے اُسے بھی باتوں باتوں میں لبھالیا۔ اسی طرح وغیرہ وغیرہ +

اسی سنہ میں راجہ بیربر پر سے بڑی کل بل ٹلی۔ اکبر نگرچین کے میدان میں چوگان بازی کر رہے تھے۔ راجہ جی کو گھوڑے نے پھینک دیا۔ خدا جانے صدمہ سے بے ہوش ہوگئے۔ یا مسخراپن سے دم چرا گئے۔ پکارا۔ پکارا۔ بڑی محبت سے سر سہلایا۔ اور اٹھوا کر گھر بھجوایا +

اسی سنہ میں ایک دن میدان چوگان بازی میں بادشاہ ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ کہ اور تماشا ہو گیا۔ دل چاچر ہاتھی سرشوری اور بدمزاجی میں مشہور تھا۔ کہ یکایک دو پیادوں پر دوڑ پڑا۔ وہ بھاگے۔ دل چاچر اُن کے پیچھے بھاگا جاتا تھا۔ کہ بیربر سامنے آگئے۔ انہیں چھوڑ کر ان پر جھپٹا۔ راجہ جی میں بھاگنے کے اوسان بھی نہ رہے۔ بدن کے لدھڑ۔ عجب عالم ہوا۔ اور انبوہ خلائق میں غل اُٹھا۔ اکبر گھوڑا مار کر خود بیچ میں آگئے۔ راجہ جی تو گرتے پڑتے۔ ہانپتے کانپتے بھاگ گئے۔ ہاتھی چند قدم بادشاہ کے پیچھے آکر تھم گیا۔ وارے اکبر تیرا اقبال ؀

سواد اور باجوڑ کا علاقہ ایک وسیع ملک پشاور کے مغرب میں ہے۔ اُس کی خاک ہندوستان کی طرح زرخیز اور بارآور ہے۔ اور آب و ہوا کا اعتدال اور موسم کی سردی اس پر اضافہ۔ شمال میں سلسلہ ہندوکش۔ مغرب میں کوہ سلیمان کا زنجیرہ۔ جنوب میں خیبر کی پہاڑیاں ہیں۔ کہ دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی ہیں یہ علاقہ بھی ایک حصہ افغانستان کا ہے۔ یہاں کے تناور اور دلاور افغان بُردُرانی کہلاتے ہیں۔ ملک کی حالت نے انہیں سرشور اور سینہ زور بنا کر اپنی قوموں میں ممتاز کیا ہے۔ اور ہندوکش کی برفانی چوٹیوں تک چڑھا دیا ہے۔ علاقہ مذکور میں تیس تیس چالیس چالیس میل کے میدان یا وادیاں ہیں۔ اور ہر میدان میں سے پہاڑوں کو چیر کر درے نکلتے ہیں۔ یہ اور میدانوں اور وادیوں سے ملتے ہیں۔ کہ ہوا کی لطافت زمین کی سبزی۔ پانی کی روانی میں کشمیر کو جواب دیتی ہیں۔ یہ وادیاں یا تو دروں پر ختم ہوتی ہیں۔ جن کے گرد اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ یا گھنے گھنے جنگلوں میں جاکر

غائب ہو جاتی ہیں۔ ایسا ملک حملہ آوروں کے لئے سخت دشوار گزار ہوتا ہے۔ مگر وہاں کے لوگوں کے لئے کچھ بات ہی نہیں۔ چڑھائی اُترائی کے مشاق ہیں۔ رستے جانتے ہیں۔ جھٹ ایک وادی سے دوسری وادی میں جا نکلتے ہیں۔ کہ جہاں ناواقف آدمی دنوں بلکہ ہفتوں تک پہاڑوں میں ٹکراتا پھرے +

اگرچہ وہاں کے افغان سرشوری اور رہزنی کو اپنا جوہر قومی سمجھتے ہیں لیکن ایک علمی شخص نے پیری کا پردہ تان کر اپنا نام پیر روشنائی رکھا۔ اور خیل ہائے مذکورہ سے بہت جاہلوں کو فراہم کر لیا۔ کوہستان مذکور جس کا ایک ایک قطعہ قدرتی قلعہ ہے۔ ان کے لئے پناہ ہو گیا۔ وہ کنارا اٹک سے لے کر پشاور اور کابل تک رستہ مارتے تھے۔ اور لوٹ مار سے آبادیوں کو ویران کرتے تھے۔ بادشاہی حاکم فوجیں لے کر دوڑتے تو وہ سینہ زوری سے سرتوڑ مقابلہ کرتے۔ اور دبتے تو اپنے پہاڑوں میں گھس جاتے۔ ادھر یہ لوگ پھرے۔ ادھر سے وہ پھر نکلے۔ اور پیچھا مار کر فتح کو شکست کر دیا۔ ۹۹۳ھ میں اکبر نے چاہا کہ اُن کی سخت گردنوں کو توڑ ڈالے۔ اور ملک کا پورا بندوبست کرے۔ زین خاں کوکلتاش کو چند امرا کے ساتھ فوجیں دے کر روانہ کیا۔ وہ لشکر شاہی اور سامان کوہ کشائی اور رسد کے رستے کر کے ملک میں داخل ہوا۔ پہلے باجوڑ پر ہاتھ ڈالا +

میرے دوستو! یہ کوہستان ایسا بے ڈھنگا ہے۔ کہ جن لوگوں نے اُدھر کے سفر کئے ہیں وہی وہاں کی مشکلوں کو جانتے ہیں۔ ناواقفوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ جب پہاڑوں میں داخل ہوتے ہیں تو پہلے زمین تھوڑی تھوڑی چڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ پھر دُور سے ابر سا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے سامنے دائیں سے بائیں تک برابر چھایا ہوا ہے۔ اور اُٹھتا چلا آتا ہے۔ جوں جوں آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی قطاریں نمودار ہوتی ہیں۔ اُن کے بیچ میں سے گھس کر آگے بڑھے۔ تو اُن سے اُونچی اُونچی پہاڑیاں شروع ہوئیں۔ ایک قطار کو لانگھا تھوڑی دور چڑھتا ہوا میدان اور پھر وہی قطار آ گئی۔ یا تو وہ پہاڑ بیچ میں سے پھٹے ہوئے ہیں (درہ) ان کے بیچ میں سے نکلنا پڑتا ہے۔ یا کسی پہاڑ کی کمر پر سے چڑھتے ہوئے اوپر ہو کر پار اُتر گئے۔ چڑھائی اور اُترائی میں۔ اور پہاڑ کی دھاروں کے

دونوں طرف گہرے گہرے گڑھے نظر آتے ہیں۔ کہ دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ ذرا پاؤں بہکا اور گیا۔ پھر تحت الثریٰ سے ورے ٹھکانا نہیں۔ کہیں میدان آیا۔ کہیں کوس دو کوس جس طرح چڑھے تھے۔ اُسی طرح اُترنا پڑا۔ کہیں برابر چڑھتے گئے۔ رستے میں جابجا دائیں بائیں درے آتے ہیں۔ کہیں اور طرف کو رستہ جاتا ہے۔ اور اُن دروں کے اندر کوسوں تک برابر خلقِ خدا پڑی بستی ہے۔ جن کا کسی کو حال معلوم نہیں۔ کہیں دو پہاڑیوں کے بیچ میں کوسوں تک گلی گلی چلے جاتے ہیں۔ غرض سرابالا (چڑھائی) سرا نشیب (اُترائی) کمرِ کوہ (چڑھائی کے بیچ میں جو پہاڑ کے پہلو بہ پہلو راہ ہو) گریبانِ کوہ (پہاڑ میں شگاف ہو) تنگیِ کوہ (دو پہاڑوں کے بیچ میں جو گلی جاتی ہو) تیزیٔ کوہ (پہاڑ کی دھار پر جو رستہ چلتا ہو) دامنِ کوہ (پہاڑ کے اُتار کا میدان) ان الفاظ کے معنے وہاں جا کر کھل سکتے ہیں۔ گھر بیٹھے تصور کریں تو سمجھ میں نہیں آسکتے۔

یہ تمام پہاڑ بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے درختوں سے چھائے ہوئے ہیں۔ دائیں بائیں پانی کے چشمے اوپر سے اُترتے ہیں۔ زمین پر کہیں مہین مہین اور کہیں نہر ہو کر بہتے ہیں۔ کہیں دو پہاڑیوں کے بیچ میں ہو کر بہتے ہیں۔ کہ پل یا کشتی بغیر پار اُترنا مشکل ہے۔ اور چونکہ پانی بلندی سے گرتا آتا ہے اور پتھروں میں ٹکراتا ہوا بہتا ہے۔ اس لئے اس زور سے جاتا ہے کہ پایاب گزرنا ممکن نہیں۔ گھوڑا ہمت کرے تو پتھروں پر پاؤں پھسلتے ہیں۔ ایسے بے ڈھنگے رستوں میں اور تمام دائیں بائیں دروں میں اور دامانِ کوہستان میں افغان آباد ہوتے ہیں۔ دُنبوں اور اُونٹوں کی پشم کے کمبل۔ نمدے۔ شطرنجیاں اور ٹاٹ بُنتے ہیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی تمبوٹیاں کھڑی کر لیتے ہیں۔ دامنِ کوہ میں کوٹھے کوٹھڑیاں ڈال لیتے ہیں۔ وہیں کھیتی کرتے ہیں۔ جنگلوں کے سیب۔ بہی ناشپاتی اور انگور اُن کے قدرتی باغ ہیں۔ وہی کھاتے ہیں اور مزے سے جیتے ہیں۔ جب کوئی بیرونی دشمن حملہ کرتا ہے تو سامنے ہو کر مقابلہ کرتے ہیں۔ ایک اُونچی پہاڑی پر چڑھ کر نقارہ بجاتے ہیں۔ جہاں جہاں تک آواز پہنچی۔ ہر شخص کو پہنچنا واجب ہے۔ دو دو تین تین وقت کا کھانا۔ کچھ روٹیاں۔

کچھ آٹے گھر سے باندھے ۔ ہتھیار لگائے اور آن موجود ہوئے ۔ جب ٹڈی دل سامنے پہاڑیوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے تو بادشاہی لشکر جو میدان میں لڑنے والے ہیں۔ دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں ۔ اور جب خیال آتا ہے کہ کتنے اور کیسے پہاڑ ہم طے کر کے یہاں تک آئے ہیں ۔ پیچھے تو وہ رہے ۔ اور آگے یہ بلا ۔ نہ زمین کے نہ آسمان کے اُس وقت خدا یاد آتا ہے +

جس وقت مقابلہ ہوتا ہے ۔ تو افغان نہایت بہادری سے لڑتے ہیں ۔ جب دھاوا کرتے ہیں تو توپوں پر آپڑتے ہیں ۔ لیکن بادشاہی لشکروں کے سامنے تھم نہیں سکتے ۔ جب دبتے ہیں تو پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں ۔ اور دائیں بائیں کے دروں میں گھس جاتے ہیں ۔ وہ قوی ہیکل اور طاقت مند ہوتے ہیں ۔ دیس کے لوگوں کو فقط اونچی زمین پر چڑھنا ہی ایک مصیبت نظر آتی ہے ۔ اُن کا یہ عالم ہے کہ سر میں یا دل و جگر میں گولی یا تیر لگ گیا تو گر پڑے ۔ بازو ۔ ران ۔ ہاتھ ۔ پاؤں میں لگے ۔ تو خاطر میں کبھی نہیں لاتے ۔ بندر کی طرح درختوں میں گھستے ۔ پہاڑوں پر چڑھتے چلے جاتے ہیں ۔ اس عالم میں گولی لگی ۔ بہت ہوا تو ہاتھ مارا ۔ ذرا کھجا لیا ۔ جیسے بھڑ نے ڈنک مارا ۔ بلکہ مچھر نے کاٹا +

بڑی مشکل جو بادشاہی لشکروں کو پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ جتنا آگے بڑھتے ہیں ۔ نادان جانتے ہیں ۔ کہ میدان سامنے کھلا ۔ اور حقیقت میں موت کے منہ میں گھستے جاتے ہیں ۔ وہ افغان جو سامنے ہٹ کر آگے بھاگ گئے تھے یا دائیں بائیں دروں میں گھس گئے تھے ۔ پہاڑیوں کے نیچے جا کر اوپر چڑھ آتے ہیں ۔ اور دروں کے اندر کی مخلوق بھی آن پہنچتی ہے ۔ اوپر سے گولیاں اور تیر برساتے ہیں ۔ مدنہ پتھر ۔ اور حقیقت تو یہ ہے ۔ کہ ایسے موقع پر جہاں فوج سمجھ چکی تھی ۔ کہ میدان صاف کر کے آگے بڑھے ہیں ۔ اُن کا فقط غل مچانا کافی ہوتا ہے ۔ اور سامنے کی لڑائی تو کہیں گئی ہی نہیں ۔ وہ میدان تو ہر وقت طیار ہے ۔ جب تک کمر میں آٹا بندھا ہے لڑ رہے ہیں ۔ ہو چکا ۔ گھروں کو بھاگ گئے ۔ کچھ رہ گئے ۔ کچھ کھانا باندھ لائے کچھ اور نئے آن شامل ہوئے ۔ غرض بادشاہی لشکر جتنا آگے بڑھے ۔ اور پچھلی مسافت زیادہ ہو ۔ اتنا ہی گھر کا رستہ بند ہوتا جاتا ہے ۔ اور وہ بند ہوا تو سمجھ لو کہ خبر بند ۔ رسد بند

گویا سب کام بند +

زین خاں نے لڑائی کی شطرنج بہت اسلوب سے پھیلائی۔ اور بادشاہ کو لکھا کہ لشکر اقبال کے بڑھنے کو کوئی روک نہیں سکتا۔ افغانوں کے بڈھے بڈھے سردار جاددریں گلے میں ڈال کر عفو تقصیر کے لئے حاضر ہو گئے ہیں۔ لیکن جو مقامات قابل احتیاط ہیں۔ اُن کے لئے اور لشکر مرحمت ہونا چاہئے۔ اس وقت بیربر کا جہاز عمر کہ مرادوں کی ہوا میں بھرا چلا جاتا تھا۔ دفعتہً گرداب میں ڈوبا۔ دربار میں امر تجویز طلب یہ تھا کہ کس امیر کو بھیجنا چاہئے۔ جو ایسے کڈھب رستوں میں لشکر کو لے جائے اور پیچیدہ صورتوں کو جو وہاں پیش آئیں۔ سلیقہ کے ساتھ سنبھالے۔ ابوالفضل نے درخواست کی کہ فدوی کو اجازت ہو۔ بیربر نے کہا۔ غلام۔ بادشاہ نے قرعہ ڈالا۔ موت کے فرشتہ نے بیربر کا نام سامنے دکھایا۔ اُس کے چٹکلوں اور لطیفوں سے بادشاہ بہت خوش ہوتے تھے۔ اور ایک دم بھی جدائی گوارا نہ تھی۔ لیکن خدا جانے کسی جوتشی نے کہ دیا۔ یا خود ہی خیال آ گیا۔ کہ یہ مہم بیربر کے نام فتح ہوگی۔ ہر چند جی نہ چاہتا تھا۔ مگر مجبوراً اجازت دی۔ اور حکم دیا۔ کہ خاصہ کا توپ خانہ بھی ساتھ چاہئے۔ انداز محبت خیال کرو۔ کہ جب رخصت ہونے لگا۔ تو اُس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بیربر جلدی آنا۔ جس دن روانہ ہوا۔ شکار سے پھرتے ہوئے خود اس کے خیموں میں گئے۔ اور بہت سی نشیب و فراز کی باتیں سمجھائیں۔ یہ فوج وافی اور سامان کافی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ڈوک کی منزل میں پہنچے تو سامنے ایک تنگی تھی۔ افغان دونوں طرف پہاڑوں پر چڑھ کھڑے ہوئے۔ بیربر تو دُور سے کھڑے غل مچاتے رہے۔ مگر اور امرا زور دے کر بڑھے۔ پہاڑ کے جنگلی بے سر و پا وحشی ہوتے ہیں۔ اُن کی حقیقت کیا ہے۔ مگر اُنھوں نے اس شدت سے اور سختی سے فوج شاہی کا سامنا کیا۔ کہ اگرچہ بہت سے افغان مارے گئے۔ مگر بادشاہی فوج بھی بہت سی بھاری چوٹیں کھا کر ہٹی۔ اور چونکہ دن کم رہ گیا تھا۔ دا جب ہوا کہ دشت کو اُلٹے پھر آئیں +

بادشاہ بھی سمجھتے تھے کہ مسخرے بھاٹ سے کیا ہونا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد حکیم ابوالفتح کو بھی فوج دے کر روانہ کیا تھا۔ کہ دشت میں پہنچ کر وہاں کی

فوج کو لینا۔ اور کوہ ملکندر کی گھاٹی سے نکل کر زین خاں کے لشکر میں جاملنا۔ زین خاں اگرچہ ہندوستان کی ہوا میں سرسبز ہؤا تھا۔ لیکن سپاہی زادہ تھا۔ اس کے باپ دادا اُسی خاک سے اُٹھے تھے۔ اور اُسی خاک میں تلواریں مارتے اور کھاتے دنیا سے گئے تھے۔ وہ جب ملک باجوڑ میں پہنچا تو جاتے ہی چاروں طرف لڑائی پھیلادی۔ ایسے دھاوے کئے۔ کہ پہاڑ میں بھونچال ڈال دیا۔ ہزاروں افغان قتل کئے۔ اور قبیلے کے قبیلے گھیر لئے۔ بال بچے قید کر لئے۔ اور ایسا تنگ کیا کہ اُن کے ملک اور سردار طنابیں گلے میں ڈال ڈال کر آئے کہ اطاعت کے لئے حاضر ہوئے ہیں +

زین خاں اب ولایت سواد کی طرف متوجہ ہؤا۔ افغان سامنے کے ٹیلوں اور پہاڑیوں سے ٹڈیوں کی طرح اُمنڈ کر دوڑے۔ اور گولیاں اور پتھر اولوں کی طرح برسانے شروع کئے۔ ہراول کو ہٹنا پڑا۔ مگر مقدمہ کی فوج نے ہمت کی کہ ڈھالیں منہ پر لیں۔ اور تلواریں سونت لیں۔ غرض جس طرح ہؤا تنگی سے نکل گئی۔ انہیں دیکھ کر اوروں کے دلوں میں بھی ہمت کا جوش سر سرایا۔ غرض کہ جس طرح ہؤا فوج اوپر چڑھ گئی۔ اور افغان بھاگ کر سامنے کے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ زین خاں اوپر جاکر پھیلا۔ چکدرہ میں چھاؤنی ڈال کر گرد مورچے تیار کئے۔ اور قلعہ باندھ لیا۔ چونکہ چکدرہ ولایت مذکور کا بیچوں بیچ مقام ہے اور یہاں سے ہر طرف زور پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے سامنے کراکر کا پہاڑ اور بنیر کا علاقہ رہ گیا۔ باقی سب ضلع قبضہ میں آگیا +

اسی عرصہ میں راجہ بیربر اور حکیم بھی آگے پیچھے پہنچے۔ اگرچہ راجہ کی اور زین خاں کی پہلے سے چشمک تھی۔ لیکن جب ان کے آنے کی خبر پہنچی۔ تو حوصلۂ سپہ سالاری کو کام میں لایا۔ استقبال کر کے آیا۔ اور رستے ہی میں ان سے آکر ملا۔ صفائی اور گرمجوشی سے باتیں کیں۔ پھر آگے بڑھ گیا۔ اور لشکر کے عبور اور انتظام راہ میں مصروف رہا۔ وہ دن بھر کھڑا رہا۔ تمام فوجوں اور بھیڑ اور بار برداریوں کو اُن برف پوش پہاڑوں سے اُتارا اور آپ وہیں اُتر پڑا۔ رات اُسی جگہ گذاری کہ پٹھان پیچھے نہ آن پڑیں۔ حکیم فوج لے کر پہلے قلعہ چکدرہ پر دوڑ گئے۔ صبح کو

قلعہ پر سب شامل ہوئے۔ کوکلتاش نے وہاں جشن کیا۔ ان لوگوں کو اپنا مہمان قرار دے کر بہت خاطرداری کی۔ اور مہمانی کے بڑے بڑے سامان کرکے اپنے خیموں پر بلایا۔ کہ تجویزوں پر اتفاق رائے ہو جائے۔ اس مقام پر راجہ بھوٹ نے بہت سی شکائتیں کیں۔ اور کہا کہ بادشاہی توپ خانہ ہمارے ساتھ ہے بندگانِ دولت کو چاہئے تھا۔ کہ اس کے گرد آکر جمع ہوتے اور یہاں صلاح و مشورہ کی گفتگو ہوتی +

اگرچہ مناسب یہ تھا کہ کوکلتاش کی سپہ سالاری کے لحاظ سے راجہ بیربر توپ خانہ اس کے حوالے کر دیتے۔ اور سب اس کے پاس جمع ہوتے۔ لیکن پھر بھی زین خاں بے تکلف چلا آیا۔ اور سب سردار بھی اس کے ساتھ چلے آئے۔ ---------

--------- البتہ ناگوار گذرا۔ بدترین اتفاق یہ کہ حکیم اور راجہ کی بھی صفائی نہ تھی۔ یہاں حکیم اور راجہ میں گفتگو بڑھ گئی۔ اور راجہ نے گالیوں تک نوبت پہنچا دی۔ کوکلتاش کے حوصلہ کو آفرین ہے کہ بھڑکتی آگ کو دبایا اور صلاحیت و صفائی کے ساتھ صحبت طے ہو گئی۔ لیکن تینوں سرداروں میں اختلاف ہی رہا۔ بلکہ روز بروز عداوت اور نفاق بڑھتا گیا۔ ایک کی بات کو ایک نہ مانتا تھا۔ ہر شخص یہی کہتا تھا۔ کہ جو مَیں کہوں سب اسی طرح کریں +

زین خاں سپاہی زادہ تھا۔ سپاہی کی ہڈی تھا۔ خود بچپن سے لڑائیوں ہی میں جوانی تک پہنچا تھا۔ وہ اس ملک کے حال سے بھی واقف تھا۔ اور جانتا تھا کہ ادھر کے لوگوں سے کیونکر میدان جیت سکتے ہیں حکیم نہایت دانشمند تھا۔ مگر دربار کا دلاور تھا۔ نہ کہ ایسے کڈھب پہاڑوں کا۔ اور پہاڑی وحشیوں کا۔ تدبیریں خوب نکالتا تھا مگر دُور دُور سے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کہنے اور برتنے میں بڑا فرق ہے۔ اس کے علاوہ اُسے یہ بھی خیال تھا۔ کہ مَیں بادشاہ کا مصاحب خاص ہوں۔ وہ تو میری صلاح بغیر کام نہیں کرتے۔ یہ ایسے کیا ہیں بیربر جس دن سے لشکر میں شامل ہوئے تھے۔ جنگلوں اور پہاڑوں کو دیکھ دیکھ کر گھبراتے تھے۔ ہر وقت بدمزاج رہتے تھے۔ اور اپنے مصاحبوں سے کہتے

تھے۔ حکیم کی ہمراہی اور کوکہ کی کوہ تراشی دیکھئے کہاں پہنچاتی ہے۔ رستے میں بھی جب ملاقات ہو جاتی تو بُرا بھلا کہتے اور لڑتے۔ آزاد اس کے دو سبب تھے۔ اوّل تو یہ کہ وہ محلوں کے شیر تھے۔ نہ مردِ شمشیر۔ دوسرے بادشاہ کے لاڈے تھے انہیں یہ دعوےٰ تھا کہ ہم اس جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں کوئی جا ہی نہیں سکتا۔ ہمیں ان کی مزاج میں وہ دخل ہے کہ ٹھیری ٹھیرائی صلاح توڑ دیں۔ زین خاں کیا مال ہے۔ اور حکیم کی کیا حقیقت ہے۔ غرض خود پسندیوں نے مہم کو بگاڑ دیا۔

زین خاں کی رائے یہ تھی۔ کہ میری فوج مدّت سے لڑ رہی ہے۔ تمہاری فوج میں سے کچھ چکدرہ کی چھاؤنی میں رہے اور اطراف کا بندوبست کرتی رہے۔ کچھ میرے ساتھ شامل ہو کر آگے بڑھے۔ یا تم میں سے جس کا جی چاہے آگے بڑھے راجہ اور حکیم دونوں میں سے ایک بھی اس بات پر راضی نہ ہوئے اُنہوں نے کہا۔ حضور کا حکم یہ ہے کہ انہیں لوٹ مار کر برباد کر دو۔ ملک کی تسخیر اور قبضہ مدّ نظر نہیں ہے۔ ہم سب ایک لشکر ہو کر مارتے دھاڑتے اِدھر سے آئے ہیں۔ دوسری طرف سے نکل کر حضور کی خدمت میں جا حاضر ہوں۔ زین خاں نے کہا۔ کس محنت و مشقت سے یہ ملک ہاتھ آیا ہے۔ حیف رہیگا کہ مفت چھوڑ دیں اچھا اگر کچھ بھی نہیں کرتے تو یہی کرو کہ جس رستے آئے ہو اُسی رستے پھر کر چلو کہ انتظام پختہ ہو جائے۔

راجہ تو اپنے گھمنڈ میں تھے۔ اُنہوں نے ایک نہ سُنی۔ اور دوسرے دن اپنے ہی رستہ روانہ ہوئے۔ ناچار زین خاں بھی اور اور سردار لشکر بھی فوج اور سامان ترتیب دے کر پیچھے پیچھے ہو لئے۔ اور دن بھر میں پانچ کوس پہاڑ کاٹا۔ دوسرے دن کے لئے قرار پایا کہ رستہ سخت ہے۔ تنگ تنگ گھاٹیاں اور بڑا پہاڑ سامنے ہے۔ اور تیز چڑھائی۔ بار برداری۔ بھیر۔ بنگاہ سب ہی کا گذرنا ہے۔ اس لئے آدھ کوس پر جا کر منزل کریں۔ دوسرے دن سویرے سے سوار ہوں۔ کہ آرام سے برف پوش پہاڑ کو پائمال کرتے ہوئے سب اُتر جائیں۔ اور خاطر جمع سے منزل پر اُتریں۔ یہی سب کی صلاح ٹھیری تھی۔ کہ تمام امرا کو چٹھیاں بٹ گئیں۔

نور کے تڑکے دریائے لشکر نے جنبش کی۔ ہراول کی فوج نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر نشان کا پھریرا دکھایا تھا کہ افغان نمودار ہوئے۔ اور دفعتہ اوپر نیچے دائیں بائیں سے ہجوم کیا۔ خیر پہاڑوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بادشاہی لشکر نے مقابلہ کیا۔ اور انہیں مارتے ہٹاتے آگے بڑھ گئے۔ جب مقام مقررہ پر پہنچے تو ہراول اور اُس کے ساتھ جو خیمے ڈیرے والے تھے۔ اُنہوں نے منزل کردی +

قسمت کی گردش دیکھو۔ بیربر کو کسی نے خبر دی تھی کہ یہاں افغانوں کی طرف سے شب خون کا ڈر ہے۔ چار کوس آگے نکل چلو گے تو پھر کچھ خطر نہیں۔ یہ منزل پر نہ اُترے۔ آگے بڑھتے چلے گئے۔ دل میں سمجھے کہ دن بہتیرا ہے۔ چار کوس چلنا کیا مشکل ہے۔ اب وہاں پہنچ کر نچنت ہو جائیں گے۔ آگے میدان آجائیگا۔ پھر کچھ پرواہ نہیں۔ اور امرا آپ ہی آرہینگے۔ چلو آگے ہی بڑھ چلو۔ لیکن اُنہوں نے آگرہ اور سیکری کا رستہ دیکھا تھا۔ وہ پہاڑ کب دیکھے تھے اور اُن کی منزلیں کب کاٹی تھیں۔ جو لوگ بادشاہی سواری کے ساتھ ڈولہ۔ پالکیوں۔ تام جاموں میں پھرے۔ انہیں کیا خبر کہ یہ معاملہ کیا ہے اور شبخون کا موقع کیا ہے۔ اور شبخون ماریں بھی تو پہاڑی کہ کیا لیں گے۔ مگر یہ سمجھتا بھی تو جنگی ہی لوگوں کا کام ہے۔ نہ بھاٹوں کا۔ وہ سمجھے کہ جو کچھ ہے یہی چار کوس کا معاملہ ہے آخر نہیں جنگی لشکر آگے پیچھے چلے +

آزاد۔ میرے دوستو! وہ ملک تو دنیا ہی نئی ہے۔ کیونکر لکھوں کہ تمہارے تصور میں تصویر کھینچوں۔ یہ عالم ہے کہ چاروں طرف پہاڑ۔ درختوں کا بن۔ گھاٹی ایسی تنگ کہ دو تین آدمی بمشکل چل سکیں۔ رستہ ایسا کہ پتھروں کی اُتار چڑھاؤ پر ایک لکیر سی پڑی ہے۔ اُسی کو سڑک سمجھ لو۔ گھوڑوں ہی کا دل ہے۔ اور انہیں کے قدم ہیں۔ کہ چلے جاتے ہیں۔ کبھی دائیں پر۔ کبھی بائیں پر کہیں دونوں طرف کھڈ ہیں۔ کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ذرا پاؤں ادھر اُدھر ہوا۔ لڑکا اور گیا۔ یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ نفسی نفسی پڑی ہوتی ہے۔ ایک بھائی لڑکا جاتا ہے۔ دوسرا بھائی دیکھتا ہے اور آگے ہی قدم اُٹھاتا جاتا ہے۔ کیا ذکر جو سنبھالنے کا خیال آئے

چلتے چلتے ذرا کھلا آسمان اور کھلا میدان آیا تو سامنے ایک دیوار پہاڑوں کی معلوم ہوئی ۔جس کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں ۔خیال آتا ہے ۔کہ اس سے گذر جائیں گے ۔تو مشکل آسان ہو جائیگی ۔ دن بھر کی منزل مار کر اوپر پہنچے ۔وہاں جا کر کچھ میدان آیا ۔اور دُور دُور چوٹیاں دکھائی دیں ۔اُتر کر ایک اور گھاٹی میں جا پڑے کہ پھر وہی آسمانی دیواریں موجود ۔وہ پہاڑ چھاتی پر غم کا پہاڑ ہو جاتے ہیں الٰہی کیوں کر یہ کوہِ غم کٹے ۔دل کہتا ہے کہ بس مر لئے یہیں ۔بعض موقع پر ایک جانب کو ذرا چھوٹے چھوٹے ٹیلے نمودار ہوتے ہیں ۔مسافر کا دل تازہ ہو جاتا ہے ۔کہ بس اب ان میں سے نکل کر میدان میں چلے جائینگے ۔مگر اُن سے آگے بڑھ کر ایک میدان آیا ۔کئی کوس بڑھ کر پھر ایک درہ میں گھسنا پڑا ۔چشموں کی چادریں گرنے کی آوازیں آنے لگیں ۔آدھ کوس ، کوس بھر کے بعد پھر وہی اندھیرا ۔مشرق مغرب تک کا پتہ نہیں ۔یہ کیسے معلوم ہو کہ دن چڑھا ہے یا ڈھل رہا ہے ۔اور آبادی کا تو ذکر ہی نہ کرو +

غرض بیربر تو اسی بھلاوے میں آگے بڑھ گئے کہ ہمّت کر کے نکل جاوینگے تو آج ہی سب کا خاتمہ ہو جائیگا ۔پیچھے والے آپ ہی چلے آوینگے ۔مگر یہ آنا دربار یا عیدگاہ سے گھر آنا تو نہ تھا ۔جو لوگ اُتر پڑے تھے ۔اور کچھ خیمے لگا چکے تھے اُنھوں نے جو دیکھا کہ راجہ بیربر کی سواری چلی ۔اور وہ آگے جاتے ہیں سمجھے کہ ہمیں حکم غلط پہنچا یا رائے پلٹ گئی ۔سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔جو ابھی آ کر کھڑے ہوئے تھے ۔وہ دوڑ پڑے ۔اور جو ڈیرے لگا چکے تھے یا لگا رہے تھے وہ گھبرا گئے ۔کہ ان سب کو سمیٹیں ۔اور بغل میں مار کر بھاگ چلیں ۔آخر خیمے گرا دیئے ۔کچھ لپیٹے اور کچھ باندھے اور پیچھے پیچھے بھاگے ۔ہندوستان کے رہنے والے لوگ پہاڑوں سے اور رات اور دن کی مار مار ۔ہر وقت کے خوف خطر سے تنگ ہو ہی رہے تھے ۔یہ حالت دیکھ کر جو خاطر جمع سے چلے آتے تھے اُن میں بھی گھبراہٹ پیدا ہوئی اور بے تحاشا آگے کو بھاگے ۔افغانوں کے آدمی بھی اُنہیں میں ملے جُلے آتے تھے ۔اور دائیں بائیں پہاڑوں پر لگے ہوئے تھے ۔ اُنھوں نے جو ہل چل دیکھی ۔لُوٹنا شروع کر دیا +

اگر لشکر شاہی کے لوگ ہوش و حواس درست رکھتے۔ یا بیربر کو خدا توفیق دیتا کہ وہیں باگ روک کر کھڑا ہو جاتا۔ تو اُن لٹیروں کو مار لینا اور ہٹا دینا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ مگر لاڈلے راجہ کو ضرور خیال ہؤا ہوگا کہ اتنا بڑا لشکر ہے۔ نکل ہی آئیں گے۔ جو مر جائیں سو مر جائیں تم تو چلو۔ لشکر جو کوسوں کی قطار میں دریا کی طرح چڑھاؤ میں چلا آتا ہے۔ ایک تلاطم میں پڑ گیا۔ افغانوں کا یہ عالم تھا۔ کہ لوٹ مار باندھ اپنا کام کئے جاتے تھے۔ رستہ کڈھب۔ گھاٹیاں تنگ۔ بُرا حال ہؤا۔ زین خاں بچارہ خوب خوب اُڑا۔ آگے بڑھ کر اور پیچھے والوں کو سنبھال کر جان لڑائی۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ مقام بے موقع۔ بیل۔ خچریں۔ اونٹ۔ لدے پھندے لوٹ لے گئے۔ آدمی بھی بے شمار ضائع ہوئے۔ اور جو اُن کے ہاتھ آئے پکڑ کر لے گئے۔ غرض لڑتے مرتے چھ کوس آئے +

دوسرے دن **زین خاں** نے مقام کیا کہ لوگ ٹوٹے پھوٹے کی مرہم پٹی کر لیں۔ اور ٹھیر کر ذرا دم لیں۔ آپ راجہ بیربر کے ڈیرے گیا۔ اور امرا کو جمع کر کے مشورہ کا جلسہ کیا۔ اکثر اہل لشکر ہندوستانی ہی تھے۔ ملک اور ملک کی حالت سے گھبرا گئے تھے۔ کثرت رائے یہی ہوئی کہ نکل چلو۔ اُس نے کہا کہ آگے پہاڑ اور ٹیلے بیڈھب ہیں۔ لشکر والوں کے دل ٹوٹ گئے ہیں۔ افغان دلیر ہو کر پہاڑوں پر اُمنڈ آئے ہیں۔ لکڑی۔ چارہ۔ پانی۔ دانہ بہت ملتا ہے۔ میری صلاح یہی ہے۔ کہ چند روز قیام کریں۔ اور اپنی حیثیت درست کر کے باغیوں کو ایسی گوشمالی دیں۔ کہ اُن کے بگڑے ہوئے دماغ درست ہو جائیں۔ اور یہ صلاح نہ ہو تو ان کے بھائی بند عیال۔ مال مویشی بھی ہمارے قبضہ میں ہیں۔ وہ پیغام سلام کرینگے۔ اور اطاعت کر کے عفو تقصیر چاہینگے۔ قیدی اُن کے حوالے کر کے خاطر جمع کے ساتھ یہاں سے چلینگے یہ صلاح بھی پسند نہ ہو۔ تو حضور میں سب عرض حال لکھ کر بھیجیں اور کمک منگائیں اُدھر سے فوج آکر پہاڑوں کو روک لے۔ ہم ادھر سے متوجہ ہوں لیکن یہ ہندوستانی دال خور جنہوں نے گھر کی ماما نچتڑیاں کھائیں۔ پہاڑ ان سے کب کٹے۔ ایک بات پر بھی صلاح نہ ٹھیری۔ مطلب وہی کہ یہاں سے نکل چلو۔ اور گھر چل کر توری پھلکے اُڑاؤ +

غرض دوسرے دن کمال اضطراب اور بے سروسامانی میں خیمے ڈیرے اُکھیڑ روانہ ہوئے۔ بھیر۔ بنگاہ ہمیشہ پیچھے ہوتی ہے۔ اور افغانوں کا قاعدہ ہے کہ اُنہی پر گرا کرتے ہیں۔ اس لئے زین خاں آپ چنداول ہؤا۔ منزل سے اُٹھتے ہی لڑائی شروع ہوئی۔ افغانوں کا یہ عالم کہ سامنے پہاڑوں پر سے اُمنڈ آتے ہیں۔ کھڈوں۔ گھاٹیوں اور مار پیچوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ دفعتہً نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ہندوستانی چیخیں مارتے ہیں۔ اور ایک ایک پر گرے پڑتے ہیں۔ جہاں گھاٹی یا درہ آتا۔ وہاں قیامت آجاتی۔ آدمی اور جانور۔ زندہ اور مردہ کوئی نہ دیکھتا تھا۔ پامال کئے چلے جاتے تھے۔ سنبھالنے اور اُٹھانے کا تو کیا ذکر۔ سردار اور سپاہی کوئی پوچھتا نہ تھا۔ زین خاں بچارا جا بجا دوڑتا تھا۔ اور سپر کی طرح جان آگے دھرے دیتا تھا۔ کہ لوگ آسانی سے گذر جائیں۔

جب شام ہوئی تو افغانوں کی ہمت بڑھی۔ ادھر ان کے دل ٹوٹ گئے۔ وہ چاروں طرف سے اُمنڈ کر گرے۔ اور تیر اندازی و سنگ باری کرنے لگے۔ بادشاہی لشکر اور بھیر میں ایک کہرام مچ گیا۔ پہاڑ تہ و بالا ہوگیا۔ رستہ ایسا تنگ تھا۔ کہ دو سوار بھی برابر چل نہ سکتے تھے۔ اور اندھیرا ہوگیا۔ افغانوں نے بھی موقع پایا۔ آگے پیچھے اوپر نیچے سے گولی تیر پتھر برسانے شروع کئے۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ آدمی۔ اونٹ۔ گائے۔ بیل ایک پر ایک گرتا تھا۔ قیامت کا نمونہ تھا۔ اُس دن بہت آدمی ضائع ہوئے۔ رات ہوگئی۔ زین خاں نے مارے غیرت کے چاہا۔ کہ ایک جگہ اڑ کر راہِ اخلاص میں جان قربان کردے۔ ایک سردار آیا۔ اور باگ پکڑ کر اُس انبوہ میں سے نکالا۔ گھاٹیوں میں اتنے آدمی گھوڑے۔ ہاتھی پڑے تھے کہ رستہ بند ہوگیا تھا۔ ناچار گھوڑا چھوڑ کر پیادہ ہؤا۔ اور بے راہ ایک پہاڑی پر چڑھ کر بھاگا۔ ہزار دشواری سے منزل پر جان بچائی۔ لوگ بھی گھبراہٹ میں کہیں کے کہیں جا پڑے۔ بعضے سلامت پہنچے۔ بعض قید ہوگئے۔ حکیم ابوالفتح بڑی جان کندن سے منزل پر پہنچے۔ مگر افسوس یہ کہ راجہ بیربر کا پتہ نہ لگا۔ اور وہ کیا ہزاروں آدمی جانوں سے گئے۔ جن میں اکثر بادشاہ شناس اور درباری منصب دار تھے۔ اور قیدیوں کی تو گنتی کہاں۔ غرض ایسی

شکست فاش ہوئی کہ تمام اکبری سلطنت میں کبھی اس خرابی کے ساتھ فوج نہیں
بھاگی۔ چالیس پچاس ہزار میں سے کچھ بھی باقی نہ رہا۔ زین خاں اور حکیم ابوالفتح
نے کمال بدحالی کے ساتھ اٹک میں آکر دم لیا۔ پٹھانوں کو اتنی لوٹ ہاتھ آئی کہ
سات پشت تک بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ اس خبر کے سننے سے خصوصاً راجہ
بیربر کے مرنے سے کہ مصاحبانِ بزم و اُنس اور محرمانِ انجمن قدس میں سے
تھا۔ خاطرِ قدسی پر اس قدر بارِ غم ہوا۔ کہ گویا ابتدائے جلوس سے آج تک
نہ ہوا تھا۔ دو رات دن معمولی سرور نہ کیا۔ بلکہ کھانا تک نہ کھایا۔ مریم مکانی
نے بہت سمجھایا۔ بندگانِ عقیدت کیش نے نالہ و زاری کی تو طبیعت کو مجبور کر کے
کھانے پینے پر متوجہ ہوئے۔ زین خاں اور حکیم وغیرہ سلام سے محروم کئے گئے۔ لاش
کی بڑی تلاش رہی۔ مگر افسوس کہ وہ بھی نہ پائی۔

مُلا صاحب اس بات پر بہت خفا ہیں۔ کہ اس کا رنج کیوں کیا۔ لکھتے ہیں
اور کن کن شوخیوں کے ساتھ لکھتے ہیں۔ جو لوگ سلام سے محروم ہوئے تھے ان کی
خطا معاف ہوگئی۔ اور چونکہ بیربر جیسے مصاحب کو آپس کے نفاق میں برباد کیا۔
(اور نفاق تو ثابت تھا) اس لئے چند روز نظر سے مردود اور کورنش سے محروم
رہے۔ پھر وہی درجہ تھا۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ گئے۔ کسی امیر کے مرنے کا ایسا رنج
نہیں کیا جیسا بیربر کا کیا (کہتے تھے) افسوس اُس کی لاش کو گھاٹی میں سے نکال
نہ سکے۔ اُسے آگ تو مل جاتی۔ پھر آپ ہی تسلی دیتے تھے۔ خیر وہ ساری قیدوں
سے آزاد۔ پاک اور الگ تھا۔ نیرِ اعظم کی روشنی اُس کے پاک کرنے کو کافی ہے۔ اور
پاک کرنے کی تو اُسے حاجت بھی نہ تھی۔

آزاد۔ لوگ جانتے تھے۔ کہ بیربل آٹھ پہر بادشاہ کے دل کا بہلاوا ہے
اب جو اس کے مرنے سے ایسا بیتاب و بے قرار دیکھا تو رنگا رنگ کی خبر لانے
لگے۔ کوئی جاتری آتا اور کہتا کہ میں جوالاجی سے آتا ہوں۔ جوگیوں کے ایک غول
میں بیربر چلا جاتا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ سنیاسیوں کے ساتھ بیٹھا کتھا بانچ رہا
تھا۔ بادشاہ کے دل کی بے قراری ہر بات کی تصدیق کرتی تھی۔ خود کہتے تھے
کہ وہ علائق دنیا سے الگ تھا اور غیرت والا تھا۔ تعجب کیا ہے۔ شکست کی

شرمندگی سے فقیر ہو کر نکل گیا ہو۔ درباری احمق ان خیالات کو اور پھیلاتے تھے۔ اور ان پر حاشئے چڑھاتے تھے +

لاہور میں روز نئی ہوائی اُڑتی تھی۔ آخر یہاں تک ہؤا کہ بادشاہ نے ایک آدمی کانگڑہ بھیجا۔ کہ بیربر کو ڈھونڈھ کر لاؤ۔ دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ اُس کی زندگی کا ڈھکوسلا اور بادشاہ کا اُس پر یقین ایسا مشہور ہؤا کہ جابجا چرچا ہو گیا یہاں تک کہ کالنجر اس کی جاگیر تھا۔ وہاں کے منشیوں کی عرضیاں آئیں۔ کہ یہاں تھا۔ ایک برہمن اسے پہلے سے خوب جانتا تھا۔ اُس نے تیل ملنے میں خط و خال پہچانے۔ اور یہاں ضرور ہے مگر کہیں چھپا ہؤا ہے۔ حضور سے فوراً کروڑی کے نام فرمان جاری ہؤا۔ اس احمق نے ایک غریب مسافر کو حماقت سے یا ظرافت سے بیربر بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ اب جو فرمان پہنچا۔ اور تحقیق کیا تو سمجھا کہ دربار میں سخت ندامت ہو گی۔ بلکہ نوکری کا خطر ہے۔ اُس نے حجام کو تو بھیج دیا اور بے گناہ مسافر کو مفت مار ڈالا۔ جواب میں عرضی کر دی کہ یہاں تھا تو سہی مگر قضا نے سعادت پابوس سے محروم رکھا۔ دربار میں دوبارہ ماتم پُرسی ہوئی پھر مرنے کی سوگواریاں ہوئیں۔ کروڑی اور نوکر وہاں کے اس جرم میں طلب ہوئے۔ کہ حضور کو کیوں نہ خبر کی۔ قید رہے۔ شکنجۂ سزا میں آئے۔ ہزاروں روپیہ جرمانہ بھرے۔ آخر چھٹ گئے۔ واہ مرنے کا بھی مسخراپن رہا۔ اور لوگوں کی جانوں کو مفت عذاب میں ڈالا +

اگرچہ بیربر کا منصب دوہزاری سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن عنایت اس قدر تھی۔ کہ ہزاروں اور لاکھوں کے جواہر۔ برس بلکہ مہینوں میں عطا ہو جاتے۔ **صاحب السیف والقلم** خطاب میں داخل تھا۔ مراسلوں اور فرمانوں میں قلم آٹھ آٹھ سطریں سیاہ کر لیتا تھا۔ جب ان کا نام صفحہ پر ٹپکتا تھا۔ ان کے مرنے کی خبر خود امرائے عالیشان کو لکھ لکھ کر بھیجی۔ چنانچہ عبدالرحیم خان خاناں کے نام ایک چھ صفحے کا طولانی فرمان لکھا ہے۔ ابوالفضل کے پہلے دفتر میں موجود ہے۔ اکبر اُسے ایسا محرمِ راز سمجھتا تھا۔ کہ کسی طرح کا پردہ نہ تھا۔ انتہا ہے۔ کہ آرام کے وقت حرم سرا کے اندر بھی بُلا لیتے تھے۔ اور حق پوچھو تو اُن کے چٹکلوں اور چہلوں کا

وہی وقت تھا کہ خلوت خاص اور مقام بے تکلف ہوتا تھا +

بیربر دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل تھے۔ اور مُرید باخلاص تھے۔ اور مراتب چہار گانہ کی منزلوں میں سب سے آگے دوڑے جاتے تھے ملّا صاحب ان سے بہت خفا معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہ بُرا کرتے ہیں۔ کہ **ملعون۔ کافر** اور **سگ بے دین** وغیرہ الفاظ سے زبان آلودہ کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے۔ کہ بیربر جی ہنسی میں اسلام اور اسلام والوں کو بھی جو چاہتے تھے سو کہہ جاتے تھے۔ مسلمان امیروں کو یہ بات ناگوار ہوتی ہوگی۔ چنانچہ شہباز خاں کمبوہ چار ہزاری منصبدار جو اکثر مہموں میں سپہ سالار بھی ہؤا۔ (شہر اللہ نام تھا لاہوری تھے) اُس نے بھی ایک موقع دربار خاص میں اُنہیں ایسا بُرا بھلا کہا کہ بادشاہ کی طبیعت بے لطف ہوگئی۔ اور خود بیربر کے طرف دار ہو گئے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ بیربر ہی بادشاہ کو عقاید ہنود کی طرف زیادہ تر کھینچتا ہے +

صفحہ   میں تم نے دیکھ لیا۔ کہ بادشاہ نے شیطان پورہ آباد کیا تھا لیکن خفیہ دریافت کرتے رہتے تھے۔ اور بڑی احتیاط تھی۔ کہ امراء میں سے کوئی وہاں نہ جائے۔ ایک دفعہ خبر دینے والے نے خبر دی کہ بیربر جی کا دامن بھی وہاں سے ناپاک ہؤا۔ جانتے تھے کہ بادشاہ اس جُرم سے بہت ناراض ہوتے ہیں۔ یہ کوڑا گھاٹم پور اپنی جاگیر میں چلے گئے تھے۔ ان کے خبرداروں نے بھی انہیں خبر دی۔ کہ بھانڈا پھوٹ گیا ہے۔ یہ سُن کر بہت گھبرائے۔ اور کہا۔ مَیں تو اب جوگی ہوکر نکل جاؤں گا۔ جب بادشاہ کو خبر ہوئی۔ تو دلجوئی اور خاطر داری کے فرمان لکھے اور بُلا لیا +

بیربر کے مرنے پر اکبر کی اس قدر بے قراری اور یادگاری دیکھ کر لوگ تعجب کرتے ہیں۔ کہ ایسے عالم فاضل تجربہ کار بہادر سردار دلاور ارکان دربار موجود تھے۔ اور اکثر ان میں سے ان کے سامنے ہی مرے تھے۔ یہ کیا سبب کہ بیربر کے برابر کسی کے مرنے کا رنج نہیں ہؤا۔ یہ امر کچھ زیادہ غور طلب نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک امیر اپنے کام اور رتبہ کا صاحبِ کمال تھا۔ اور ہر ایک کام کے لئے خاص خاص موقع ہوتا تھا۔ مثلاً علماء و فضلاء کا جلسہ ہو۔ علمی تحقیقاتیں ہوں۔ شعرو

شاعری ہو۔ وہاں خواہ مخواہ فیضی۔ ابوالفضل۔ شاہ فتح اللہ۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام یاد آئینگے۔ بیربر ایسے تھے کہ کچھ جانیں خواہ نہ جانیں۔ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ دخل در معقولات کرنے کو موجود تھے۔ مذاہب تقلیدی تو اعتراضوں کے زیرِ مشق بن رہے تھے۔ کتاب اور سند سے کچھ بحث ہی نہ تھی۔ کیا ہندو۔ کیا مسلمان۔ زیرِ تحققات تھے۔ اُس نے اس معاملے میں وہ رتبہ پیدا کیا تھا کہ وہ اور ابوالفضل وغیرہ دینِ الٰہی اکبر شاہی کے خلیفہ تھے۔ جب منقولات کا یہ حال ہو۔ تو معقولات کا کیا کہنا ہے۔ اُس میں تو جس کا چاہیں خاکہ اُڑائیں۔ اور جسے چاہیں مسخرا بنائیں +

ملکی انتظام اور دفتر کے بندوبست ہوں تو راجہ ٹوڈرمل اور علمائے مذکور یاد آئینگے۔ بیربر اگرچہ ان کا غذوں کے کیڑے نہ تھے۔ مگر ایک عجیب رقم تھے۔ کچھ تیزی فکر کچھ مسخراپن سے وہاں بھی جو عقل میں آتا تھا کہتے تھے۔ بلکہ زبانی جمع خرچ سے سب میزان مستوفی ملادیتے تھے۔ اور جب موقع دیکھتے تو مناسب وقت کوئی دُہرہ۔ کوئی کبت۔ کوئی لطیفہ کا گلدستہ بھی سرِ مجلس حاضر کرتے تھے +

مہماتِ ملکی ہوں تو وہاں بھی حاضر۔ بے تلوار جنگ کرتے تھے۔ اور بے توپ توپخانے اُڑاتے تھے۔ سواری شکاری کے وقت کبھی کوئی امرا میں سے پھنس جاتا تھا تو ساتھ ہولیتا تھا۔ ورنہ اُن کا کیا کام تھا۔ یہ سپاہی بن کر سیر شکار کے وقت بھی آگے آگے ہوجاتے۔ اور باتوں کے نون مرچ سے وہیں کباب تیار کرکے کھلاتے۔ لیکن شیر۔ چیتے کی بو پاتے تو ایک ہاتھی کے ہودہ میں چھپ جاتے +

تفریح کی صحبت ناچ رنگ کے تماشے یا اس قسم کی خلوتیں ہوں تو راجہ اندر بھی تھے۔ وہاں ان کے سوا دوسرے کو دخل کب ہوسکتا ہے۔ ان مجلسوں کا سنگار کہو۔ باتوں کا گرم مصالح کہو۔ جو سمجھو بجا ہے۔ پھر خیال کرو کہ ہر دم اُن کا غم اور ہر لحظہ وہ یاد نہ آتے تو کون یاد آتا +

بڑا افسوس یہ ہے کہ اکبر نے ان کے لئے کیا کیا کچھ نہ کیا۔ مگر اکبر کے لئے اُنہوں نے کوئی یادگار نہ چھوڑی۔ سنسکرت کے اشلوک تو درکنار۔ بھاٹ کا ایک

دُہرا بھی ایسا نہیں جسے دلوں کی اُمنگ کسی موقع پر بول اُٹھا کرے۔ ہاں، اکثر لطیفے ہیں۔ کہ متھرا کے چوبوں اور مندروں کے مہنتوں کی زبان پر ہیں۔ جب مفت کی رسویوں سے پیٹ پھُلا کر چت لیٹ جاتے ہیں تو پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ ڈکاریں لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ واہ بیربر جی واہ کیا اکبر بادشاہ کو غلام بنایا تھا۔ بعضے کہتے ہیں۔ کہ اگلی جون میں بیربر راجہ تھے۔ اور اکبر اُن کے داس تھے اور پھر ایک لطیفہ کہتے ہیں۔ اور کروٹیں لے لے کر گھڑیوں تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ بڈھے بڈھے بنیوں بلکہ پُرانے پُرانے منشیوں کو بھی یہ لطیفے تاریخ دانی اور علم مجلس کا سرمایہ ہوتے ہیں +

میں نے چاہا تھا کہ کچھ تصنیف نہیں ملتی۔ تو خاتمۂ احوال میں چند رنگین اور نمکین چٹکلے ہی لکھوں مگر بہت کم لطیفے ایسے ملے۔ جن میں عالمانہ یا شاعرانہ کسی طرح کا لطف ہو۔ پُرانی پُرانی بیاضیں بڑی تلاش سے پیدا کیں۔ اور جہاں لطائفِ بیربل کا نام سُنا۔ وہیں کوشش کا ہاتھ پہنچایا لیکن جب پڑھنے لگا۔ تو تہذیب نے ورق میرے ہاتھ سے چھین لیا +

ایک پہیلی ان کی مدت سے یاد ہے وہ ہی لکھی جاتی ہے۔ باتوں کا صراف اس سے بھی اُن کی لیاقت اور متانت کا کھوٹا کھرا پرکھیگا +

مال پوا

گھی میں غرق سواد میں میٹھا + بن بیلن وہ بیلا ہے + کہیں بیربل سُنیں اکبر + یہ بھی ایک پہیلا ہے

آزاد سے پوچھو تو سیّد انشا کے مال پوے اس سے کہیں مزے کے ہیں غزل کے تین شعر یہ ہیں

یہ اب حسن پر اپنے گھمنڈ کرتے ہیں
گرو جی چیلوں کو اپنے پسند کرتے ہیں

کہ اپنے شیش محل ہی میں ڈنڈ کرتے ہیں
شراب ان کو کہیں مست پلائیو انشا

کھلا کے مال پوے ترتراتے تو ہن بھوگ
کہ وہ تو مست ہوئے مجلس کو بھنڈ کرتے ہیں

اُن کے ایک بیٹے کا نام ہرم رائے تھا۔ درباداری اور راجاؤں کی ملاقات وغیرہ میں خدمات بادشاہی بجالاتا تھا۔ بڑے بیٹے کا نام لالہ تھا۔ وہ بھی حاضر دربار رہتا تھا۔ ۱۰۱۰ھ میں استعفا دیا۔ اور کہا کہ مہابلی! اب بھگوان کی یاد کیا کرونگا۔ بادشاہ نے بہت خوش ہو کر عرضی منظور کی۔ وہ حقیقت میں ترقی نہ ہونے سے ناراض تھا۔ اور

بادشاہ نے عیاشی کے سبب سے اُس کی ترقی مناسب نہ دیکھی تھی۔غرض یہاں سے رخصت ہو کر گیا اور الٰہ آباد میں ولیعہد کی نوکری کر لی۔ابوالفضل کہتے ہیں کہ تند خوئی اور خودکامی سے فضول خرچ ہے اور تمنائے طلب کو بڑھائے جاتا ہے پیش نہیں جاتی۔ حماقت میں جا پڑا۔اور ادھر کا خیال باندھا۔وہ بات بھی نہ بن پڑی۔ خدیو عالم نے رخصت فرما کر اس کے مرض کا علاج کیا۔

راجہ بیربر کی تصویر دیکھ کر تعجب آتا ہے کہ اتنا بھدا آدمی اتنا زیرک اور دانا کیونکر تھا۔جس کی تیز فہمی کی سب مؤرخ تعریف کرتے ہیں۔

مخدوم الملک مُلّا عبداللہ سُلطانپوری

فرقۂ انصار سے تھے۔اور بزرگ اُن کے ملتان سے سلطان پور میں آکر آباد ہوئے تھے۔عربیت اور فقہ وغیرہ علوم و فنون جو کہ علمائے اسلام کے لئے لوازمات سے ہیں۔اُن میں یگانہ تھے۔مآثرالامرا میں ہے۔کہ مولانا عبدالقادر سرہندی سے کسب کمال کیا تھا۔خاص و عام کے دلوں پر اُن کی عظمت ابر کی طرح چھائی ہوئی تھی۔اور ہر بات آیت اور حدیث کا حکم رکھتی تھی۔اس خیال سے جو بادشاہ وقت ہوتا تھا۔زیادہ تر اُن کا لحاظ رکھتا تھا۔ہمایوں عموماً علماء کے ساتھ اعزاز و اکرام سے پیش آتا تھا۔مگر ان کی نہایت تعظیم کرتا تھا۔اُس سے مخدوم الملک و شیخ الاسلام خطاب لیا تھا۔اور بعض کہتے ہیں کہ شیخ الاسلام شیر شاہ نے بنایا تھا۔اُس نیک نیت بادشاہ کے کاروبار سلطنت میں اعتبار و اعتماد کے ساتھ ایک خصوصیت خاص رکھتے تھے۔ جب ہمایوں تباہ ہو کر ایران کی طرف گیا۔تو اُن کی بزرگی و اقتدار کے اثر شیر شاہی سلطنت کو برکتیں پہنچانے لگے۔راجہ پورن مل رائسین اور چندیری کا راجہ انہی کے عہد و پیمان کے اعتبار پر حاضر دربار ہوا۔اور آتے ہی شیر شاہ کی دولت و صولت کا شکار ہوا۔اس کے عہد میں بھی باعزاز رہے۔سلیم شاہ کے عہد میں اس سے بھی زیادہ ترقی کی اور انتہا درجہ کا زور پیدا کیا۔چنانچہ شیخ علائی کے حال میں بھی کچھ کچھ لکھا گیا۔

اُنھوں نے اُن کے اور اُن کے پیر کے قتل میں کوشش کا حق ادا کیا۔ اور انجام کو شیخ علائی مظلوم انہی کے فتووں کی اسناد لے کر بہشت میں پہنچے +

اُسی عہد میں موضع جھنی علاقۂ لاہور میں شیخ داؤد جھنی وال ایک بزرگ مشائخ صاحبِ معرفت تھے کہ عبادت و ریاضت اور زہد و پارسائی نے مریدوں کے انبوہ سے اُن کی خانقاہ آباد کی تھی۔ اور دُور دُور تک خاص و عام ان کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے۔ ملّا صاحب کہتے ہیں۔ قوّتِ ربانی اور نسبتِ حقانی سے فقر کے سلسلوں کو ایسا رواج دیا تھا۔ کہ جس کا غلغلہ نفخ صُور تک خاموش نہ ہوگا۔ جن دنوں ملّا عبداللہ سلطانپوری نے کہ مخدوم الملک کہلاتے ہیں سعی و کوشش کی کمر اہل اللہ کے استیصال پر باندھی اور اکثروں کے قتل کا باعث ہوئے۔ تو گوالیار سے سلیم شاہ کا فرمان طلب بھیج کر بلوایا۔ وہ ایک دو خادموں کو لے کر جریدہ روانہ ہوئے۔ اور شہر کے باہر مخدوم الملک سے ملاقات ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ شیخ نے پوچھا کہ فقرائے بے تعلق کے طلب کا کیا سبب ہے۔ مخدوم الملک نے کہا کہ میں نے سُنا ہے تمہارے مرید ذکر کے وقت یا داؤد یا داؤد کہتے ہیں۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ سُننے میں شُبہ ہؤا ہوگا۔ یا وُدود کہتے ہوں گے۔ اس تقریب سے ایک دن یا ایک شب رہ کر اُن سے مواعظ اور نصائح بلند اور معارف اور حقائق ارجمند بیان کئے کہ مخدوم الملک کے دل پر بھی اثر ہؤا۔ اور اُنھیں عزّت سے رخصت کر دیا +

ملّا صاحب کا دل بھی ان کی شدّتوں سے پکّا پھوڑا ہو رہا ہے۔ جہاں ذرا سا رخنہ پاتے ہیں۔ پھوٹ بہتے ہیں۔ چنانچہ زمرۂ فقرا میں میں لکھتے ہیں۔ جب شاہ عارف حسینی احمد آباد گجرات سے پھر کر آئے تو لاہور میں مقام کیا۔ بہت لوگ کمالات پر گرویدہ ہوئے۔ اُنھوں نے بعض جلسوں میں گجرات کے زمستانی میوے منگا کر لاہور میں لوگوں کو کھلائے۔ پنجاب کے علما جن کے ستون مخدوم الملک تھے۔ انھیں لپٹ گئے۔ گناہ یہ قرار دیا کہ آخر یہ میوے اَوروں کے باغوں کے ہیں۔ اور انھوں نے بے اجازت ان میں تصرّف کیا ہے۔ اس لئے ان کا تصرّف حرام اور کھانے والوں کا کھانا حرام ہے۔ وہ تنگ ہو کر کشمیر چلے گئے۔ سلیم شاہ اگرچہ مخدوم الملک کا نہایت ادب کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر جو رخصت کرنے

کو لبِ فرش تک آیا تو جوتیاں سیدھی کر کے اُن کے سامنے رکھیں۔ مگر یہ سب باتیں اس مطلب براری کے لئے تھیں کہ جانتا تھا۔ عوام کے دلوں میں ان کی باتوں کا اثر ہے۔ اور بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ سفرِ پنجاب میں مصاحبوں کے حلقے میں بیٹھا تھا۔ کہ مخدوم تشریف لائے۔ دور سے دیکھ کر بولا۔ ہیچ میدانید کہ ایں کہ می آید؟ ایک مصاحب نے عرض کی بفرمایند۔ سلیم شاہ نے کہا بابر بادشاہ را پنج پسر بود۔ چہار پسر از ہندوستان رفتند یکے ماندہ۔ مصاحب نے پوچھا۔ آں کیست۔ کہا۔ ایں ملّا کہ می آید۔ سرمست خاں نے کہا تقریب نگاہداشتن ایں چنیں مفتن چیست؟ سلیم شاہ نے کہا۔ چہ تواں کرد۔ بہتر سے اڑ دمی یابم اور جب ملا عبداللہ پہنچے۔ توان کو تخت پر بٹھایا۔ ایک تسبیحِ مروارید۔ کہ اُسی وقت پیشکش میں گذری۔ تھی دہ دی۔ کہ ۲۰ ہزار کی تھی +

سلیم شاہ کے دل پر مخدوم کے باب میں جو ہمایوں کے طرفداری کے نقش تھے۔ اُسے فقط بدگمانی نہ سمجھنا۔ کیونکہ جب ہمایوں فتحیابی کے نشان گاڑتا ہوا کابل میں آن پہنچا۔ تو لاہور میں بھی خبر مشہور ہوئی۔ حاجی پراچہ ان دنوں میں یہاں ایک سوداگر تھا۔ کابل میں اُس کی آمد و رفت تھی۔ مخدوم نے احتیاطاً خط نہ لکھا۔ مگر اس کی معرفت ایک جوڑی موزوں کی اور ایک قمچی بطور تحفہ بھیجی۔ اس کے یہ معنی تھے کہ میدان صاف ہے۔ موزے چڑھاؤ۔ اور گھوڑے کو قمچی کرو۔ آزاد میں سوچتا ہوں کہ اپنے حریفوں کے شان و شکوہ اور شاہانہ اقتدار دیکھ کر شیخ مبارک کیا کُڑھتا ہو گا؟ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب صاحبِ کمال لوگ نارسائی اور بے قدری کے گڑھوں میں پڑ جاتے ہیں۔ اور کم قدر لوگ بخت اور نصیب کی یاوری سے اوجِ کمال پر پہنچتے ہیں۔ تو گرنے والوں کے دلوں پر سخت چوٹیں لگتی ہیں۔ اس حالت میں کبھی تو وہ اپنے کمالِ علمی کو دولتِ بے زوال اور غیروں کے اتفاقی اقبال کو دودھ کا اُبال کہہ کر جی خوش کر لیتے ہیں۔ کبھی گوشہ نشینی کے ملک بے خطر کی تعریفیں کر کے دل بہلا لیتے ہیں۔ کبھی بادشاہوں کی خدمت کو بند غلامی کہہ کر اپنی آزادی حالت کو بادشاہت سے بھی اونچا مرتبہ دے دیتے ہیں۔ بے شک افراطِ علم اور کمال کا نشہ انسان کے خیالات کو بلند اور طبیعت میں آزادی اور بے پروائی پیدا کرتا ہے اور جاہ و جلال کے فخروں کو بہت

ناچیز کر کے دکھاتا ہے۔ مگر دنیا بُرا مقام ہے۔ اور اہل دنیا بُرے لوگ ہیں۔ یہ ظاہر پرست حکومت کے بندے اور دولت کی اُمّت ہیں۔ اور مشکل یہ ہے کہ انہی لوگوں میں گذارہ کرتا ہے۔ ان کے طمطراق ظاہری پر شیخ مبارک کا علو حوصلہ نہیں دبتا ہوگا۔ لیکن جو ذلتیں اور مصیبتیں اور جان کے خطر پیش آتے تھے۔ ان میں خدا ہی دکھائی دیتا ہوگا۔ آزادی کی خیالی باتوں سے موجود مصیبتوں کے زخم۔ اور محسوس تکلیفوں کے داغ راحت و آرام کے پھول نہیں بن جاتے۔

جب ہمایوں نے پھر آکر ہندوستان پر قبضہ کیا۔ تو مخدوم صاحب ہی خاص الخاص تھے۔ اور مختار کُل لیکن اکبر کے آغاز سلطنت میں مخدوم صاحب پر عجب نحوست آئی۔ جب اکبر نے ہیموں پر فوج کشی کی تو سکندر خاں افغان اپنی قومی جمعیت کے ساتھ پہاڑوں میں دبکا بیٹھا تھا۔ یہ خبر سُن کر نکلا۔ اور ملک میں پھیل کر علاقہ سے روپیہ تحصیل کرنے لگا۔ حاجی محمد خاں سیستانی حاکم لاہور تھا۔ اسے معلوم ہؤا کہ سکندر انہی کے اشارہ پر باہر نکلا ہے۔ مخدوم صاحب کی پُرزری اور مال داری بھی مشہور تھی۔ حاجی نے روپیہ نچوڑنے کے لئے موقع پایا۔ انہیں کئی شخصوں کے ساتھ پکڑ کر شکنجے میں کس دیا۔ بلکہ مخدوم صاحب کو آدھا زمین میں گاڑ دیا۔ اور جو گنج قارون انہوں نے سالہا سال میں دفینہ کیا تھا۔ دم میں کھینچ لیا۔ خان خاناں نام کو تو ترک سپاہی تھا۔ مگر تدبیر سلطنت کا ارسطو تھا۔ اُس نے سُنا تو بہت خفا ہؤا۔ اور جب فتح کے بعد بادشاہ کے ساتھ پھر لاہور میں آیا۔ تو حاجی کے وکیل کو مخدوم صاحب کے گھر بھیجا کہ عذر تقصیر بجالائے۔ اور انہیں لاکھ بیگھہ کی جاگیر علاقہ مان کوٹ میں دی۔ چند روز میں پہلے سے بھی زیادہ اختیارات کر دئے۔ کیونکہ بادشاہ لڑکا ناتجربہ کار تھا۔ اور ایسے اشخاص کی تالیف قلوب مصلحت وقت تھی۔ بڑے بڑے معاملے سلطنت کے ان کی معرفت سرانجام پاتے تھے۔

آدم خاں گکھڑ پنڈی اور جہلم کے علاقے کا اولوالعزم سردار تھا۔ وہ انہی کی معرفت حضور میں آیا۔ خان خاناں کی تدابیر سلطنت کا عقل کل تھا۔ اس نے آدم خاں سے بھائی بندی کا صیغہ پڑھا۔ اور پگڑی بدل بھائی ہوئے جب خانخاناں

کی اور اکبر کی بگڑی اور انجام کو خانخاناں نے حضور میں رجوع کا پیغام بھیجا۔ اور اس کے لینے کو یہ اور منعم خاں گئے۔ خان زماں کی عفو تقصیرات میں انہی کی شفاعت کام کرتی تھی۔ مگر جب اکبر کو خود سلطنت کے سنبھالنے کی ہوس ہوئی۔ تو اُس نے آئین مملکت کا انداز بدلا۔ اور دلداری اور ملنساری پر ملک داری کی بنیاد رکھی۔ اس کے خیالات انہیں ناگوار معلوم ہونے لگے۔ اور اس میں بھی شک نہیں۔ کہ انہوں نے بڈھے بڈھے بادشاہوں کو ہاتھوں میں کھلایا تھا۔ جب نوجوان لڑکے کو تخت پر دیکھا ہوگا۔ تو یہ بھی بڑھتے بڑھتے حدِ اعتدال سے بڑھ گئے ہوں گے۔ اس عرصے میں فیضی اور ابوالفضل پر خدا کا فضل ہوا۔ پہلے بڑا بھائی ملک الشعرا ہوگیا۔ پھر چھوٹے نے میر منشی ہوکر مصاحبتِ خاص کا رتبہ پایا۔ شیخ مبارک پر جو جو مصیبتیں مخدوم کے ہاتھوں سے گذری تھیں۔ بیٹوں کو بھولی نہ تھیں۔ اُنہوں نے ان کے تدارک کے فکر کرکے اکبر کے کان بھرنے شروع کئے۔ اور اکبر کے خیالات بھی بدلنے شروع ہوئے +

فاضل بدایونی لکھتے ہیں۔ کہ اکبر ہر شب جمعہ کو علما و فضلا و سادات و مشائخ کو بلاتا تھا۔ اور خود بھی جلسے میں شامل ہوکر علوم و فنون کے تذکرے سُناکرتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اسی جگہ لکھتے ہیں۔ مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری کو بے عزت کرنے کے لئے بلاتے تھے۔ اور حاجی ابراہیم و شیخ ابوالفضل کہ نیا آیا تھا۔ اور اب نئے مذہب کا مجتہد بلکہ مرشد برحق اور داعی مطلق تھا۔ اس کے ساتھ چند اور نوعلموں کو مباحثے پر چھوڑ دیتے تھے۔ اس کی ہر بات میں شک و شبہے پیدا کرتے تھے۔ اس میں بعض امرائے مقرب بھی بادشاہ کے اشارے سے کاوش اور کاہش میں تراوش کرنے لگے۔ کبھی کبھی ٹپکتے تھے۔ تو عجیب و غریب نقلیں مخدوم سے روایت کرتے تھے۔ اور بڑھاپے میں یہ آیت اس پر ٹھیک صادق آئی۔ وَمِنْکُمْ مَنْ یُّرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ (یعنی تم میں سے ذلیل عمر کی طرف دھکیلے جائینگے) چنانچہ ایک شب خان جہاں نے عرض کی۔ کہ مخدوم الملک نے فتوے دیا ہے کہ ان دنوں حج کو جانا فرض نہیں بلکہ گناہ ہے۔ بادشاہ نے سبب پوچھا۔ بیان کیا کہ خشکی سے جائیں تو رافضیوں کے ملک سے گزرنا پڑتا ہے۔ تری کی راہ جائیں۔ تو فرنگیوں سے معاملہ پڑتا ہے۔ وہ بھی ذلت ہے۔

جہاز کے عہد نامے پر حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی تصویریں کھنچی ہوتی ہیں۔ اور یہ بت پرستی ہے پس دونوں طرح ناجائز ہے +

ایک حیلہ شرعی نکال رکھا تھا۔ یعنی ہر سال کے اخیر پر تمام روپیہ بی بی کو ہبہ کر دیتا تھا اور سال کے اندر پھر واپس لے لیتا تھا۔ کہ زکوٰۃ سے بچ جائیں۔ اور اس کے علاوہ اکثر حیلے معلوم ہوئے۔ کہ بنی اسرائیل کے حیلے بھی ان کے آگے شرمندہ ہیں غرض اس طرح کی رذالت۔ خباثت۔ جہالت۔ مکاری و دنیاداری و ستمگاری کی باتیں کہ شہروں کے مشائخ و فقرا سے خصوصاً ائمہ و اہل استحقاق سے بے حد و حساب کی تھیں ایک ایک ظاہر ہوئی۔ اور یَوْمَ تُبْلَی السَّرَائِرُ کا راز دلوں پر کھل گیا +

دربار کے لوگ بہت سی باتیں کہ اُس کی ذلت اور اہانت اور مذمت پر مشتمل تھیں۔ بیان کرتے تھے۔ اور جب پوچھا کہ برشما حج فرض شدہ؟ تو جواب دیا کہ نے +

ملا صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ ابوالفضل بادشاہ کے اشارے سے بموجب مصرع مشہور۔ ع کہ یک عنایت قاضی بہ از ہزار گواہ

صدر اور گواہ اور حکیم الملک اور مخدوم الملک کے ساتھ دلیرانہ لپٹتا تھا۔ اور اعتقادیات میں مباحثے کرتا تھا۔ بلکہ اُن کی بے عزتی میں ذرا بھی کسر نہ رکھتا تھا۔ اور بادشاہ کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ سترے بہترے بڈھوں نے آصف خاں میر بخشی کی معرفت خفیہ پیغام بھیجا۔ کہ کیوں خواہ مخواہ ہم سے اُلجھتے ہو۔ (چرا با مادر مے افتی ۔ واہ ملا صاحب!) اس نے کہا ہم ایک شخص کے نوکر ہیں۔ بینگنوں کے نوکر نہیں +

یہ اشارہ اس مشہور لطیفے کی طرف تھا۔ کہ کوئی کھانا کھا رہا تھا۔ بینگن بہت مزا دئے۔ فرمایا کہ وزیر بینگن بہت خوب ترکاری ہے۔ وزیر نے لطف و لذت اور طب و حکمت بلکہ نقل حدیث سے بھی اُس کی تعریفیں کیں۔ پھر ایک موقع پر بادشاہ نے کہا۔ کہ وزیر بینگن تو بُری ترکاری ہے۔ وزیر نے پہلے سے زیادہ ہجو کردی۔ بادشاہ نے کہا کہ اس دن تو تم نے اس قدر تعریف کردی۔ اور آج ایسی ہجو کرتے ہو۔ یہ کیا بات ہے۔ اُس نے عرض کی کہ خانہ زاد حضور کا نوکر ہے۔ بینگنوں کا نوکر نہیں۔ فدوی تو حضور کے کلام کی تائید کریگا +

پھر ایک جگہ ملا صاحب فرماتے ہیں۔ بڑی خرابی یہ ہوئی۔ کہ مخدوم اور شیخ صدر

کی بگڑ گئی۔ مخدوم الملک نے ایک رسالہ لکھا۔ کہ شیخ عبدالنبی نے خضر خاں شروانی کو پیغمبر صاحب کے بُرا کہنے کی تہمت لگا کر اور میر حبش کو رفض کے الزام میں ناحق مار ڈالا۔ اور اس کے پیچھے نماز بھی جائز نہیں کہ باپ نے عاق کر رکھا ہے۔ اور اسے بواسیر خونی بھی ہے۔ شیخ موصوف نے انہیں بے علمی اور گمراہی کے الزام لگانے شروع کئے۔ مُلّانوں کے دو گروہ دو رویہ سبطی اور قبطی ہو گئے۔ نئے نئے مسئلوں میں جھگڑنے لگے انجام اس لڑائی کا یہ ہُوا۔ کہ دونوں گر پڑے۔ یعنے بادشاہ دونوں سے بے اعتقاد ہو گیا۔ بلکہ سنی۔ شیعہ حنفی تو بالائے طاق رہے۔ اصل اصول میں خلل پڑ گئے۔ اور ان کی بد اعتقادی میں اصل اعتقاد کچھ کا کچھ ہو گیا۔ تقلیدی مذہب کو بے عقل سمجھ کر تحقیق شروع ہو گئی۔ زمانے کا رنگ بدل گیا۔ یا تو یہ شیخ مبارک سے بلکہ ہر شخص سے بات بات پر سند طلب کرتے تھے۔ اور اُس پر رد و قدح کرتے تھے۔ یا اب ان سے دلیلیں طلب ہوتی تھیں۔ اور کچھ کہتے تھے۔ تو اس میں ہزار رخنے نکلتے تھے۔

مخدوم الملک کے دماغ میں ابھی تک پرانی ہوا بھری ہوئی تھی۔ انہیں بجائے خود یہ دعوے تھے۔ کہ جسے ہم بادشاہ اسلام کہینگے۔ وہی تخت اسلام پر قائم رہ سکیگا۔ جو بادشاہ ہم سے پھر جائیگا اُس سے خدائی پھر جائیگی۔ اس عرصے میں دربار شاہی کے عالموں نے محضر تیار کر لیا۔ کہ بادشاہ عادل مجتہد وقت اور امام عصر ہے۔ اور مسائل اختلافی میں وہ اپنی صوابدید پر ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دے سکتا ہے۔ غرض تو انہیں دونوں سے تھی۔ مگر برائے نام سب علما طلب ہوئے۔ کہن سال بزرگوں نے جبراً و قہراً مہریں کر دیں۔ مگر بہت بُرا معلوم ہُوا۔ مخدوم نے فتوےٰ دیا۔ کہ ہندوستان ملک کفر ہو گیا۔ یہاں رہنا جائز نہیں۔ اور خود مسجد میں رہنا اختیار کیا اور اکبر کو کبھی کہنے کہ شیعہ ہو گیا ہے۔ کبھی ہندو۔ کبھی نصاریٰ وغیرہ وغیرہ۔

یہاں زمانے کا مزاج آب وہوا کے ساتھ بدل چکا تھا۔ ان کے نسخے نے کچھ اثر نہ کیا۔ اور بادشاہ نے کہا کیا مسجد میرے ملک میں نہیں؟ یہ کیا لچر باتیں ہیں۔ آخر ۹۸۷ھ میں جس طرح ہوا۔ دونوں صاحبوں کو مکہ معظمہ روانہ کر دیا۔ اور کہہ دیا کہ بے حکم وہاں سے نہ آئیں۔ احمد کہ بہ مکتب نمیرود و لے برندش۔ ماثر الامراء میں ہے کہ شیخ ابن حجر مکی ان دنوں زندہ تھے۔ چونکہ مذہب کی سنگینی میں دونوں صاحبوں کے

خیالات ہم وزن تھے۔ اس لئے بڑی یکدلی اور محبت سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ وہیں رہتے تھے۔ یہ مسافر تھے۔ اس لئے قافلہ میں آئے۔ اور انہیں لے گئے۔ باوجودیکہ موسم نہ تھا۔ مگر بلطف رسائی اور زور آشنائی سے کعبے کا دروازہ کھلوا کر مخدوم صاحب کو زیارت کروائی +

آزاد - جناب مخدوم اور شیخ ممدوح بلحاظ اعتقادات کے ایک سے ایک بھاری ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مخدوم صاحب کی تصنیفات نے شہرت و اعتبار کا درجہ نہیں پایا۔ اور اسی سبب سے نایاب ہیں۔ شیخ ابن حجر مکی کی کتابیں مستند اور مشہور ہیں۔ ہاں تقریب بادشاہی اور دربار کی رسائی سے مخالفان مذہب کی سزا و ایذا کے لئے جو اختیارات اور موقعے مخدوم صاحب نے پائے۔ وہ کسی کو کب نصیب ہوئے ہیں۔ مخدوم صاحب نے شیعوں کو قتل۔ قید اور رفاک ناکلمی سے ہمیشہ دبائے رکھا۔ مگر ان کی تردید میں کوئی خاص تصنیف نہیں لکھی۔ شیخ صاحب کی صواعق محرقہ اب بھی بجلی کی طرح دور دور سے چمک کر سنی بھائیوں کی آنکھوں کو روشنی دکھاتی ہے۔ مگر شیعہ بھائی بھی رد و قدح کے لئے چقماق لئے تیار ہیں۔ چنانچہ قاضی نور اللہ نے نسخہ صوارم مہرقہ اس کا جواب لکھا۔ افسوس لڑنا جھگڑنا اور باہم تفرقے ڈالنا جہلا کا کام ہے۔ علماء کو چاہئے تھا۔ کہ ان کی حرارت جہالت کو طباشیر علم کی ٹھنڈائی سے بجھاتے۔ قسمت کی گردش دیکھو کہ وہی لوگ دیاسلائیوں کے بکس کاغذوں میں لپیٹ کر رکھ گئے ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ	چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

مآثر الامرا میں ہے۔ کہ افغانوں کا تمام زمانہ اور ہمایوں اور اکبر کی نصف سلطنت میں مخدوم صاحب معزز معتبر اور ہوشیاری۔ متانت رائے۔ تجربات اور جمع اموال سے شہرت رکھتے تھے۔ وہاں پہنچ کر ہندوستان کے مزے یاد آتے تھے اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ مگر یہ کہ محفلوں اور مجلسوں میں بیٹھ کر اکبر کو کافر بناتے تھے۔ جو حکومتوں کے مزے یہاں اُڑائے تھے۔ ایسے نہ تھے کہ آسانی سے بھول جاتے۔ تڑپتے تھے اور مجبور وہیں پڑے تھے۔ آخر اس بوجھ کو مکے کی زمین اُٹھا سکی نہ مدینے کی۔ جہاں کے پتھر تھے وہیں پھینکے گئے۔ شعر:-

که برون در چه کردی که درون خانه آئی		به طواف کعبه رفتم بحرم رہم ندادند
کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی		بزمیں چو سجدہ کردم ززمیں ندا برآمد

ملّا صاحب اگرچہ مخدوم صاحب اور شیخ صدر دونوں سے خفا تھے۔
مگر بادشاہ پر ان سے بہت زیادہ خفا تھے۔ اس مقام تک انہیں کیا خبر تھی۔ کہ
دونوں بزرگوں کا انجام کیا ہوگا۔ فرماتے ہیں۔ بادشاہ نے ۹۸۶ھ میں خواجہ محمد یحییٰ کو
کہ حضرت خواجہ احرار قدس اللہ روحہٗ کے پوتوں میں تھے۔ میر حاج قرار دے کر
۴ لاکھ روپے حوالہ کئے۔ اور شوال کے مہینے میں اجمیر سے روانہ کیا۔ شیخ عبدالنبی اور
مخدوم الملک کو جنہوں نے آپس میں لڑ جھگڑ کر اگلوں اور پچھلوں سے بھی بے اعتقاد
کر دیا تھا۔ اور دین حق سے پھرنے کا سبب یہی تھے۔ اس قافلے کے ساتھ مکّے
کو خارج کر دیا۔ کہ اِذَا تَعَارَضَا تَسَاقَطَا (دو ٹکرائینگے تو دونوں گرینگے) چنانچہ
دوسرے برس مقصد کو پہنچے۔ اور انجام کار کہ اسی کا اعتبار ہے۔ عارضی آلائش
سے پاک ہو گئے۔ اور ایمان بچا لے گئے۔ ہم نے اپنا کام آخر کیا۔ تاریخ ہوئی۔ کہ
هُوَ عَزِيزُ قَوْمٍ وَلَّوْا (اس قوم کا معزز ہے جو گمراہ ہو گئی) ماثر الامرا میں ہے۔ کہ
باوجود اس حالت اور رستے کی رفاقت کے شیخ و صدر کیا راہ میں کیا مقامات متبرکہ
میں صاف نہ ہوئے۔ مخالفت قائم رہی +

ظاہری سبب یہ ہوا کہ محمد حکیم مرزا حاکم کابل سوتیلا بھائی اکبر کا باغی ہو کر
پنجاب پر آیا۔ ادھر خان زمان نے ملک مشرقی میں بغاوت کی۔ قاعدہ ہے کہ چھوٹی
چھوٹی باتیں بڑی بڑی ہو کر جلد دور پہنچ جاتی ہیں۔ یہ خبر مکّے تک بھی پہنچی۔ مکّے
تک خبر پہنچنے میں یہاں انتظام ہو گیا۔ مگر دونوں صاحبوں نے خبر سنتے ہی موقع
غنیمت سمجھا۔ سوچے کہ اکبر پر بے دینی کا الزام لگا کر اور فتووں کے کارتوسوں سے
زور دے کر حکیم مرزا کو قائم مقام کر دیں۔ تو پھر سلطنت ہاتھ میں ہے۔ گلبدن بیگم
سلیمہ سلطان بیگم اکبر کی پھوپھیاں وغیرہ بیگمات بھی حج سے پھر کر آتی تھیں۔
انہیں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اور گجرات دکن میں پہنچ کر ٹھیرے۔ کہ حال
معلوم کریں۔ یہاں حکیم مرزا کا معاملہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ اکبری اختیاروں کو
دیکھ کر بہت ڈرے۔ بیگمات سے سفارش کروائی۔ اکبر کے کان میں ان کے

کلمات طیبات اوّل سے آخر تک حرف بحرف پہنچ رہے تھے۔ مہمات ملکی اور مصالح سلطنت میں عورتوں کی سفارش کا کیا کام۔ حاکموں کو حکم پہنچے۔ کہ نظربند رکھیں۔ اور بآہستگی مسلسل کر کے روانہ کر دیں۔ مخدوم صاحب کیفیت حال سُنکر بے حال ہو گئے۔ اور ابھی روانہ دربار نہ ہوئے تھے۔ کہ ملکِ عدم کی روانگی کے لئے اجل کا حکم پہنچا۔ سنہ ۹۹۰ھ میں بمقام احمد آباد دنیا سے انتقال کیا۔ مآثرالامرا میں ہے کہ بادشاہ کے حکم سے کسی نے زہر دے دیا۔ اگر یہ سچ ہے تو ہاتھوں کا کیا اپنے سامنے آگیا۔ جس فسادِ مملکت کا خطرہ دکھا کر انہوں نے شیخ علائی کو مارا تھا۔ اسی مصلحت ملکی میں مارے گئے۔ جنازہ احمد آباد سے جالندھر میں آیا۔ اور خاک سے روپوش ہوا +

ان کے املاک اور مکانات لاہور میں تھے۔ اور گھر میں بڑی بڑی قبریں تھیں۔ جن کے لمبے لمبے طول و عرض بزرگان مرحوم کی مقدار بزرگی ظاہر کرتے تھے ان پر سبز غلاف پڑے رہتے تھے۔ اور دن ہی سے چراغ جل جاتے تھے۔ ہر وقت تازے پھول پڑے رہتے تھے۔ یہاں پھول پتّے لگانے والوں نے پتے لگائے اور کہا کہ حضور یہ مزار دکھاوے کے بہانے ہیں۔ حقیقت میں دفینے اور خزانے ہیں کہ خلقِ خدا کے گلے کاٹ کاٹ کر جمع کئے ہیں۔ (ملّا صاحب فرماتے ہیں) قاضی علی فتح پور سے لاہور میں آیا۔ اور اتنے خزینے اور دفینے نکلے۔ کہ وہم کی کنجی بھی ان کے قفلوں کو نہ کھول سکے۔ اُس کے گورخانے میں سے چند صندوق نکلے کہ ان میں سونے کی اینٹیں چنی ہوئی تھیں۔ مُردوں کے بہانے سے دفن کئے تھے۔ شکنجے میں کسے گئے۔ تین کروڑ روپے دم نقد نکلے۔ اور جو مال لوگوں کے پاس گئے یا رہ گئے وہ عالم الغیب کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ یہ ساری اینٹیں کتابوں سمیت کہ انہیں بھی اینٹیں ہی سمجھنا چاہیئے۔ سب اکبری خزانے میں داخل ہو گئیں۔ بیٹے اُس کے چند روز قید شکنجے میں رہے۔ اور آخر ٹلّی کی ٹکیا کو محتاج ہو گئے +

فاضل بداؤنی نے جو مضامین مذکورہ بالا کے بعد اُن کے علم و فضل کی تعریف کی ہے اُس میں لکھا ہے کہ **تنزیہ الانبیا اور شمائل نبوی** ان کی عالمانہ

تصنیفات ہیں۔ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے۔ مُلّائے موصوف ترویج شریعت میں
بڑی کوشش کرتے تھے۔اور متعصب سُنّی تھے۔ بہت سے بے دین اور رافضی
ان کی سعی سے اس ٹھکانے لگے۔جو کہ اُن کے لئے تیار ہوا تھا (یعنی جہنم)

فاضل موصوف نے ان سے اپنی ملاقات کا حال جو لکھا ہے بعینہٖ ترجمہ
اس کا لکھتا ہوں۔جس سال اکبر نے گجرات فتح کی تھی۔ مخدوم الملک وکالت کی
خدمت پر تھے۔اور عین جاہ و جلال میں تھے۔ میں پنجاب سے پھرتا ہوا وہاں پہنچا۔
ابوالفضل اور میں ابھی نوکر نہ ہوئے تھے۔ حاجی سلطان تھانیسری اور ہم سب
مل کر گئے۔کہ شیخ کی باتیں سُنیں۔آپ فتح پور سیکری کے دیوان خاص میں بیٹھے
تھے۔روضۃ الاحباب کا تیسرا دفتر سامنے دھرا تھا۔اور کہہ رہے تھے کہ مقتدایاں
ولایت چہ خرابی ہا در دین کردہ اند۔اور یہ شعر اس میں سے پڑھا۔ شعر:۔

ہمیں بس بود حق نمائی او	کہ کردند شک در خدائی او

اور کہا کہ او از رفض ہم گذرانیدہ کار را بجائے دیگر رسانیدہ کہ حلول باشد۔ قرار دادہ ام
کہ ایں جلد را بحضور شیعہ بسوزم۔ میں گوشہ گمنام سے نکل کر آیا تھا۔ مخدوم موصوف
کے حالات و اختیارات کی خبر نہ تھی۔ پہلی ہی ملاقات تھی۔میں نے کہا کہ یہ تو اُس شعر
کا ترجمہ ہے جو امام شافعی کی طرف منسوب ہے ؎

لو ان المرتضیٰ ابدیٰ محلّہ	لصار الناس طرّاً سجداً لہ
کفیٰ فی فضل مولیٰنا علی	وقوع الشک فیہ انہ اللہ

مخدوم نے میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا کہ یہ کس سے منقول ہے۔میں نے
کہا شرح دیوان امیر سے۔ فرمایا۔ شارح دیوان کہ قاضی میر حسین میبذی ہے۔ وہ
بھی متہم بہ رفض ہے۔میں نے کہا خیر یہ اور بحث نکلی۔ شیخ ابوالفضل اور حاجی سلطان
بار بار منہ پر ہاتھ رکھ کر اشارے سے مجھے منع کرتے تھے۔پھر بھی میں نے
اتنا کہا کہ بعض معتبر لوگوں سے سُنا ہے کہ تیسرا دفتر میر جمال الدین کا نہیں۔ان
کے بیٹے سید میرک شاہ کا ہے۔یا کسی اور کا ہے۔اسی واسطے اس کی عبارت پہلے
دو دفتروں سے نہیں ملتی۔کہ نہایت شاعرانہ ہے۔ محدثانہ نہیں۔جواب دیا کہ بابلے
سخن در دفتر دوم نیز چیزہا یافتہ ام۔کہ دلالت صریح بر بدعت و فساد اعتقاد دارد۔

وبراں حواشی نوشتہ ام وغیرہ وغیرہ۔ شیخ ابوالفضل برابر بیٹھے تھے۔ میرے ہاتھ کو زور سے ملتے تھے۔ کہ چپکے رہو۔ آخر مخدوم نے پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ ان کی کچھ تعریف توکرو۔ لوگوں نے مجملاً حال بیان کیا۔ بارے صحبت خیر و عافیت سے ختم ہوئی۔ وہاں سے نکل کر یاروں نے کہا کہ شکر کرو آج بڑی بلا ٹلی۔ کہ وہ تمھارے حال سے معترض نہ ہوئے۔ نہیں تو کون تھا کہ بچا سکے۔ وہ ابوالفضل کو ابتدا میں دیکھ دیکھ کر اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے۔ چہ خلل ہا کہ در دین ازیں نخیزد۔ غرض کہ مخدوم موصوف ۹۹۰ھ میں فوت ہوئے۔ اور شیخ مبارک نے اپنی آنکھوں سے ایسے سخت دشمن کی تباہی دیکھ لی۔ اور بڑی بات یہ ہوئی۔ کہ اپنے لڑکوں کے ہاتھ سے دیکھی۔ خدا کی شان ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے۔ کہ جن لوگوں کی زمانہ مساعدت کرتا ہے۔ اور جاہ و جلال اور اقبال کے عالم میں وہ کسی پر جبر کرتے ہیں۔ انجام کو اُسی کے ہاتھوں یا اس کی اولاد کے ہاتھوں اُس سے بدتر حالت اُن پر گزر جاتی ہے۔ خدا ہم کو اختیار کے وقت عاقبت بینی کی عینک عطا کرے۔ بعض تاریخوں میں لکھا ہے۔ کہ کشف الغمہ۔ عصمت الانبیاء۔ منہاج الدین سیر نبوی میں ان کی تصنیفات سے تھیں۔ مآثر الامرا میں منہاج الدین اور حاشیہ شرح مُلّا لکھا ہے +

اُن کا بیٹا حاجی عبدالکریم باپ کے بعد لاہور میں آیا۔ اور پیری مریدی کا سلسلہ جاری کیا۔ آخر ۱۰۴۵ھ میں وہ بھی باپ کے پاس پہنچا۔ خاک کا قالب لاہور میں نوین کوٹ کے پاس دفن ہؤا۔ کہ وہیں زیب النساء کا باغ تعمیر ہؤا۔ شیخ یحییٰ۔ اللہ نور۔ عبدالحق۔ اعلیٰ حضور بھی اُن کے بیٹے تھے۔ شیخ بدایونی افسوس کر کے کہتے ہیں کہ شیخ یحییٰ باپ کے بعد حرکات مکروہ کا نمونہ ہؤا +

شیخ عبدالنّبی صدر

شیخ عبدالنّبی ولد شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس - اصل وطن اندری علاقہ گنگو۔ اور خاندان مشائخ میں نامور تھا۔ ابتدا میں دل عبادت و ریاضت کی طرف بہت مائل تھا۔ ایک پہر کامل حبس دم کے ساتھ ذکر میں مصروف رہتے تھے۔ کئی دفعہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ گئے۔ وہاں علم حدیث حاصل کیا۔ اہل سلسلہ چشتیہ میں تھے آباؤ اجداد کی محفل حال وقال میں غنا اور سماع بھی تھا۔ اُنھوں نے وہاں سے آکر ناجائز سمجھا۔ اور محدثین کا طریقہ اختیار کیا۔ تقوے۔ پرہیزگاری۔ طہارت۔ پاکیزگی اور عبادت ظاہری میں مشغول رہتے تھے۔ اور درس وتدریس وعظ و نصیحت میں بشدت سرگرم تھے۔ اکبر کو اپنی سلطنت میں تقریباً ۱۸ برس تک مسائل اسلام کی پابندی اور علمائے اسلام کی عظمت کا بڑا خیال رہا۔ ۹۷۲ھ میں مظفر خاں وزیر کل تھا۔ اسی کی سفارش سے انہیں صدر الصدور کر دیا۔

فاضل بداؤنی کہتے ہیں۔ کہ عالم عالم اوقاف و انعامات اور وظائف بااستحقاق بخشے۔ اور اس قدر کہ اگر تمام بادشاہانِ ہند کی بخششوں کو ایک پلّے میں رکھیں۔ اور اُس عہد کے انعام کو ایک پلّہ میں۔ تو بھی یہی جھکتا رہیگا۔ یہاں تک کہ بتدریج رفتہ رفتہ پلّہ اصلی پر آن ٹھیرا۔ اور قضیہ بالعکس ہو گیا۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ مخدوم الملک کا ستارہ غروب پر تھا۔ اور شیخ صدر طلوع پر تھے تعظیم و احترام کا یہ حال تھا۔ کہ کبھی کبھی علم حدیث کے سننے کو بادشاہ خود اُن کے گھر جاتے تھے۔ ایک دفعہ جُوتے ان کے سامنے اُٹھا کر رکھے۔ شہزادہ سلیم کو حجرۂ تعلیم میں داخل کیا۔ کہ مولانا جامی کی چہل حدیث کا سبق لیا کرے۔ شیخ کی ترغیب اور برکات صحبت سے خود بھی احکام شرعی کی پابندی میں حد سے

گذر گئے تھے۔ آپ اذان دیتے تھے۔ اور امامت کرتے تھے۔ اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے تھے۔

عالم شباب میں جشن سالگرہ کی تقریب پر لباس زعفرانی پہن کر محلسرا سے باہر آئے۔ شیخ موصوف نے منع کیا۔ اور شدت تاکید کو اس جوش و خروش سے ظاہر کیا۔ کہ عصا کا سرا بادشاہ کے جامہ کو لگا۔ مگر انھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ حرم سرا میں چلے آئے۔ اور ماں سے شکایت کی۔ ماں نے کہا۔ لو تم! جانے دو۔ یہ کچھ رنج کا مقام نہیں باعثِ نجات ہے۔ کتابوں میں لکھا جائیگا۔ کہ ایک پیر مفلوک نے ایسے بادشاہ عالی جاہ کو عصا مارا۔ اور وہ فقط شرع کے ادب سے صبر کر کے برداشت کر گیا[1]۔

سلاطین سلف کے عہد میں مسجدوں کے امام بادشاہ کی طرف سے ہوا کرتے تھے۔ اور وہ سب صاحب خاندان عالم فاضل متقی پرہیزگار ہوتے تھے۔ سلطنت سے اُن کے لئے جاگیریں مقرر ہوتی تھیں۔ چنانچہ اُنھیں دنوں میں حکم ہوا۔ کہ تمام ممالک محروسہ کے امام جب تک اپنی مدد معاش اور جاگیروں کے فرمان پر صدر الصدور کی تصدیق اور دستخط حاصل نہ کر لیں۔ تب تک کروڑی اور تحصیلدار اُس کی آمدنی انہیں مجرا نہ دیں۔ یہ با استحقاق لوگ انتہائے ممالک مشرقی سے لے کر سرحد سندھ تک سب صدر کے حضور میں پہنچے۔ جس کا کوئی قوی حامی امرا میں سے ہو گیا یا مقربان شاہی میں سے کسی کی سفارش ہاتھ آ گئی۔ اس کا کام بن گیا۔ جن کو یہ وسیلہ میسر نہ ہوا۔ وہ شیخ عبدالرسول اور شیخ کے وکیلوں سے لے کر فراشوں۔ دربانوں۔ سائیسوں اور حلال خوروں تک کو بھی بھاری بھاری رشوتیں دیتے تھے۔ اور جو ایسا کرتے تھے وہ گرداب سے ناؤ نکال لے جاتے تھے۔ جن بدنصیبوں کو یہ موقع ہاتھ نہ آتا تھا وہ لکڑیاں کھاتے تھے۔ اور پامال ہوتے تھے۔ بہت سے نامراد اس بھیڑ اور انبوہ میں لوؤں کے مارے مر مر گئے۔ بادشاہ کو بھی خبر پہنچی۔ مگر اقبال زور پر تھا۔ صدر عالی کے قدر کی تعظیم اور علو شان سے منہ پر نہ لا سکے۔

شیخ جب مسند جاہ و جلال پر بیٹھتے تھے۔ تو دربار کے بڑے بڑے عالیشان

[1] مآثر الامرا میں ہے کہ کپڑوں پر زعفران کے چھینٹے دیئے ہوئے تھے۔

امرا اہل علم اور اہل صلاح کو ساتھ لے کر شیخ کے دیوان خانہ میں شفاعت اور سفارش کے طور پر لاتے تھے۔ شیخ بدمزاجی سے پیش آتے تھے۔ اور کسی کی تعظیم بھی کم کرتے تھے بڑے مبالغوں سے اور بڑی عجز و زاری سے ہدایہ اور عالمانہ کتابوں کے پڑھانے والوں کو سو بیگھہ یا کچھ کم زیادہ زمین ملتی تھی۔ اس سے زیادہ ہوتی تو سالہا سال کی مقبوضہ زمین بھی کاٹ لیتے تھے۔ اور عوام گمنام۔ ذلیل و خوار یہاں تک کہ ہندوؤں کو بھی اپنی مرضی سے دیتے تھے۔ اس طرح علم و علمار کی قیمت روز بروز گھٹتی گئی"۔

عین دیوان میں دوپہر کے بعد جب کرسی غرور پر بیٹھ کر وضو کرتے تھے تو آب مستعمل کی چھینٹیں تمام سر اور مُنہ پر اور امرائے کبار اور مقربان بلند رتبہ کے کپڑوں پر پڑتی تھیں۔ اور وہ کچھ پرواہ نہ کرتے تھے۔ غرض کے بندے خلق خدا کی کارسازی کے لئے برداشت کرتے تھے۔ اور خوشامد اور لگاوٹ سے جس طرح شیخ چاہتے تھے۔ سلوک بھی کرتے تھے۔ لیکن پھر جب وقت آیا۔ تو جو کچھ نگلا تھا سب اُگلوا لیا۔ کسی بادشاہ کے زمانہ میں کسی صدر کو یہ تسلّط اور تصرّف اور استقلال حاصل نہیں ہوُا۔ اور بات تو یہ ہے۔ کہ اس کے بعد خاندان مغلیہ میں دین کے زور اور مذہبی اختیارات کے ساتھ صدر کا عہدہ ہی غدر میں آگیا۔ پھر صدر الصدور ہوُا نہ وہ اختیارات ہوئے۔

چند ہی روز گذرے تھے کہ آفتاب ڈھلنے لگا۔ فیضی و ابوالفضل بھی دربار میں آن پہنچے تھے۔ ۹۸۵ھ میں یہ حکائتیں شہ کانٹوں کی سروں میں بادشاہ کے کان تک پہنچیں۔ ان کا اثر کچھ زیادہ نہ ہوُا۔ مگر یہ حکم ہوُا کہ جن کی معافی پانسو بیگھہ سے زیادہ ہو۔ وہ خود حضور میں فرمان لے کر حاضر ہوں۔ اور اس میں بہت سی کارسازیاں کھُلیں۔ چند روز کے بعد ہر صوبہ ایک ایک امیر کے سپرد ہو گیا۔ چنانچہ پنجاب مخدوم الملک کے حصے میں آیا۔ یہیں سے دونوں کے دلوں میں غبار پیدا ہوئے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں خاک اُڑنے لگی۔ بادشاہ کی مرضی پاکر شیخ ابوالفضل سر دربار مسائل میں مناظرے اور مباحثے کرنے لگے۔ ایک دن دسترخوان پر بادشاہ امرا کے ساتھ کھانا کھاتے تھے شیخ صدر نے مزعفر کے قاب میں ہاتھ ڈالا۔ شیخ ابوالفضل نے اُسے زعفران کا چھینٹا دے کر کہا کہ اگر زعفران نجس یا حرام ہے۔ تو اس کا کھانا کیونکر حلال ہو سکتا ہے؟

مسئلہ شرعی ہے۔ کہ تین دن تک حرام کا اثر باقی رہتا ہے۔ اگر حلال ہے۔ تو وہ اعتراض اور احتساب کیا تھا۔ ہر صحبت میں اس قسم کے مسائل پر نوک جھوک ہو جاتی تھی ✦

ایک دن جلسۂ امرا میں اکبر نے کہا کہ تعداد نکاح کی کہاں تک جائز ہے۔ جوانی میں تو کچھ اس باب کا خیال نہ تھا جتنے ہو گئے۔ ہو گئے۔ اب کیا کرنا چاہئے۔ ہر شخص کچھ کچھ عرض کرتا تھا۔ اکبر نے کہا کہ ایک دن شیخ صدر کہتے تھے کہ بعض کے نزدیک نو۹ تک بیبیاں جائز ہیں۔ بعض اشخاص بولے کہ ہاں ابن ابی لیلےٰ کی یہی رائے ہے کیونکہ ظاہر آیت کے لفظ یہی ہیں۔ فانکحوا ما طاب لکم مثنیٰ وثلاث ورباع یعنی نو۹ اور جنہوں نے دو دو تین تین چار چار کے معنوں کا خیال کیا وہ ۱۸ بھی کہتے ہیں۔ مگر ان روایتوں کو ترجیح نہیں۔ اسی وقت شیخ سے پچھوا بھیجا۔ انہوں نے وہی جواب دیا۔ کہ میں نے اختلاف علماء کا بیان کیا تھا فتوے نہیں دیا تھا۔ یہ بات بادشاہ کو بُری لگی۔ اور کہا اگر یہ بات ہے۔ تو شیخ نے ہم سے نفاق برتا۔ جب کچھ اور کہا اور اب کچھ اور کہتے ہیں۔ اور اس بات کو دل میں رکھا ✦

جب یہ باتیں ہونے لگیں۔ اور بادشاہ کا مزاج لوگوں نے پھرا دیکھا۔ تو زمانے کے لوگ جو وقت کے منتظر بیٹھے تھے۔ بات بات میں گل کترنے لگے۔ یا تو یہ عالم تھا کہ محدثی کا نقارہ بجتا تھا۔ کیونکہ مدینہ منورہ سے حدیث کا فیض لے کر آئے ہیں۔ اور امامت ان کا حق کہ امام اعظم کی اولاد ہیں۔ یا اب یہ حال ہوا۔ کہ مرزا عزیز کوکہ نے کہا۔ کہ حدیث الحزم سوء الظن کو بچہ بچہ جانتا ہے۔ حاے مہملہ اور زاے معجمہ سے ہے۔ شیخ نے شہزادہ کو حاے معجمہ اور راے مہملہ سے پڑھا دیا ہے۔ جس کو علم حدیث پر بڑا گھمنڈ ہے۔ اُس کا یہ حال ہے۔ آپ نے اس کا رتبہ اس حد تک پہنچا دیا۔ اب اسے ابوالفضل اور فیضی کا اقبال سمجھو۔ خواہ مخدوم اور صدر کا ادبار کہو۔ بڑی قباحت یہ ہوئی۔ کہ دونوں کی آپس میں بگڑ گئی۔ اور جن جن مسئلوں اور فتووں میں افراط و تفریط ہوئی تھی۔ ان میں ایک دوسرے کا پردہ فاش کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ میر حبش کا قتل رفض کے جرم میں اور خضر خاں شروانی کا قتل اس جرم میں کہ پیغمبر صاحب کی جناب میں بےادبی کی۔ تہمت بے اصل تھا۔ اسی عرصے میں میر مقیم اصفہانی اور میر یعقوب حسین خاں

حاکم کشمیر کی طرف سے تحائف پیشکش لے کر آئے۔ یہاں یہ چرچا ہؤا۔ کہ کشمیر میں جو سُنّی شیعہ کے فساد میں ایک شیعہ قتل ہؤا تھا۔ اور اُس کے عوض میں سنّی مفتی مواخذہ میں آکر قید اور قتل ہوئے۔ اس کا باعث میر مقیم تھا۔ شیخ صدر نے اس جرم کے انتقام میں میر مقیم اور میر یعقوب دونوں کو قتل کیا۔ کہ شیعہ تھے۔ اب لوگوں نے کہا۔ کہ یہ بھی خون ناحق ہوئے۔ ان مقدموں کے علاوہ بھی دونوں جلیل القدر عالم نئے نئے مسئلوں پر جھگڑے پیدا کرتے تھے۔ جس کا انجام یہ ہؤا کہ بادشاہ دونوں سے بے اعتقاد ہو گیا فیضی و ابوالفضل کو اس قسم کے موقع غنیمت ہوتے ہونگے۔ وہ ضرور شیعوں کو زور دیتے ہونگے اور بادشاہ کو بر سر رحم لاتے ہونگے اور انہی باتوں سے رفض کی تہمت میں آکر مفت کا داغ کھاتے ہونگے +

ملّا صاحب کہتے ہیں۔ رہی سہی بات یہاں سے بگڑی کہ انہی دنوں میں متھرا کے قاضی نے شیخ صدر کے پاس استغاثہ کیا۔ کہ مسجد کے مصالح پر ایک سر شور اور مالدار برہمن نے قبضہ کر کے شوالہ بنالیا اور جب روکا تو اس نے پیغمبر صاحب کی شان میں بےادبی کی۔ اور مسلمانوں کی بھی بہت اہانت کی۔ شیخ نے طلبی کا حکم بھیجا۔ وہ نہ آیا۔ نوبت اکبر تک پہنچی۔ چنانچہ بیربل اور ابوالفضل جاکر اپنی رسائی اور اعتبار کے ذمے پر لے آئے ابوالفضل نے جو کچھ لوگوں سے سُنا تھا عرض کیا۔ اور کہا بےادبی بے شک اس سے ہوئی۔ علماء کے دو فریق ہو گئے۔ بعض نے قتل پر بعض نے جرمانہ اور تشہیر کا فتوے دیا۔ اور باتوں کا طول کلام دور تک پہنچا۔ شیخ صدر بادشاہ سے قتل کی اجازت مانگتے تھے۔ مگر وہ صاف حکم نہ دیتے تھے۔ انتا کہ کر ٹال دیتے تھے۔ کہ احکام شرعی تمہارے متعلق ہیں۔ ہم سے کیا پوچھتے ہو۔ برہمن مدت تک قید رہا۔ محلوں میں رانیوں نے بھی سفارشیں کیں۔ مگر شیخ صدر کا بھی کچھ نہ کچھ خیال کیا۔ آخر جب شیخ نے بہت تکرار سے پوچھا۔ تو کہا کہ بات وہی ہے کہ جو میں کہہ چکا ہوں۔ جو مناسب جانوں وہ کرو۔ شیخ نے گھر پہنچتے ہی قتل کا حکم دے دیا +

جب یہ خبر اکبر کو پہنچی تو بہت خفا ہؤا۔ اندر سے رانیوں نے اور باہر سے راجا مصاحبوں نے کہنا شروع کیا۔ کہ ان ملّاؤں کو حضور نے اتنا سر پر چڑھایا ہے کہ اب آپ کی خوشی کا بھی خیال نہیں کرتے۔ اور اپنی حکومت و جلال دکھانے کے لئے لوگوں

کو بے حکم قتل کر ڈالتے ہیں۔ ایسی ایسی باتوں سے اس قدر کان بھرے کہ بادشاہ کو تاب نہ رہی۔ اور جو مادہ مدت سے غلیظ ہو رہا تھا یکبارگی پھوٹ بہا۔ رات کو انوپ تلاؤ کے دربار میں آکر پھر اس مقدمہ کا حال بیان کیا۔ فتنہ[1] انگیز اکسانے والوں سے اور نوخیز مفتیوں سے مسئلہ کی تحقیق کرتے تھے۔ ایک کہتا تھا۔ بھلا رد و قدح کے جواب سوال کس نے کئے ہوں گے۔ دوسرا کہتا تھا۔ شیخ سے تعجب ہے۔ وہ تو اپنے تئیں امام اعظم کی اولاد کہتے ہیں۔ اور ان کا فتوے یہ ہے۔ کہ کفار مطیع اسلام پیغمبر کی شان میں بے ادبی کرے تو عہد شکنی اور ابراء ذمہ نہیں ہوتا۔ فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے لکھا ہے۔ شیخ نے اپنے جد کی مخالفت کیوں فرمائی؟

فاضل بدایونی لکھتے ہیں۔ یکبارگی دور سے مجھ پر نظر پڑی۔ میری طرف متوجہ ہوکر اور نام لے کر آگے بلایا۔ اور کہا کہ آگے آؤ۔ میں سامنے گیا۔ پوچھا کہ تو نے بھی سنا ہے کہ اگر ۹۹ روائتیں مقتضی قتل ہوں۔ اور ایک روایت موجب رہائی ہو۔ تو مفتی کو چاہیے۔ کہ روایت اخیر کو ترجیح دے۔ میں نے عرض کی۔ حقیقت میں جو حضرت نے فرمایا۔ اسی طرح ہے۔ اور مسئلہ ہے۔ ان الحدود و العقوبات تندرئ بالشبہات اس کے معنی فارسی میں ادا کئے۔ افسوس کے ساتھ پوچھا۔ شیخ کو اس مسئلہ کی خبر نہ تھی؟ کہ اس برہمن بیچارے کو مار ڈالا۔ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے کہا البتہ شیخ عالم ہے۔ باوجود اس روایت کے جو دیدہ و دانستہ قتل کا حکم دیا۔ ظاہر یہی ہے کہ کوئی مصلحت ہوگی۔ فرمایا وہ مصلحت کیا ہے۔ میں نے کہا یہی کہ فتنہ کا دروازہ بند ہو۔ اور عوام میں جرأت کا مادہ نہ رہے۔ ساتھ شفائے قاضی عیاض کی روایت نظر میں تھی وہ بیان کی۔ بعض خبیثوں نے کہا۔ کہ قاضی ایاز تو مالکی ہے۔ اس کی بات حنفی ملکوں میں سند نہیں ہے۔ بادشاہ نے مجھ سے کہا تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا اگرچہ مالکی ہے لیکن اگر مفتی محقق سیاست پر نظر کر کے اس کے فتوے پر عمل کرے۔ تو شرعاً جائز ہے۔ اس باب میں بہت قیل و قال ہوئی۔ بادشاہ کو لوگ دیکھتے تھے کہ شیر کی طرح مونچھیں کھڑی تھیں۔ اور پیچھے سے مجھے منع کر رہے تھے کہ نہ بولو۔ یکبارگی بگڑ کر فرمایا۔ کیا نامعقول باتیں کرتے ہو۔ فوراً تسلیم بجا لا کر پیچھے ہٹا۔ اپنی ذیل میں آن کھڑا ہوا۔ اور اس دن سے مجلس مباحثہ اور ایسی جرأت سے کنارہ کر کے گوشہ

[1] ان سے فیضی اور فضل مراد ہوں گے۔

اختیار کیا۔ کبھی کبھی دور سے کورنش کر لیتا تھا۔ شیخ عبدالنبی کا کام روز بروز تنزل پانے لگا۔ اور آہستہ آہستہ کدورت بڑھتی گئی۔ دل پھرتا گیا۔ اوروں کو ترجیح ہونے لگی۔ اور نئے پرانے اختیار ہاتھ سے نکلنے لگے۔ دربار میں بالکل جانا چھوڑ دیا۔ شیخ مبارک بھی تاک میں لگے ہی رہتے تھے۔ انہی دنوں میں کسی مبارک باد کے لئے آگرہ سے فتح پور میں پہنچے۔ ملازمت کے وقت بادشاہ نے یہ سارا ماجرا سنایا۔ اُنہوں نے کہا کہ آپ خود مجتہد اور اپنے زمانہ کے امام ہیں۔ شرعی اور ملکی احکام کے اجرا میں ان کی ضرورت کیا ہے۔ کہ سوا شہرت بے اصل کے علم سے کچھ بہرہ نہیں رکھتے۔ بادشاہ نے کہا۔ جب تم ہمارے اُستاد ہو۔ اور سبق تم سے پڑھا ہو۔ تو ان ملّانوں کی منت سے مخلصی کیوں نہیں دیتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی بنیاد پر محضر اجتہاد تیار ہوا۔ کہ جسکی تفصیل شیخ مبارک کے حال میں نقل کی گئی ہے +

شیخ صدر اپنی مسجد میں بیٹھے۔ اور بادشاہ اور اہل دربار کو بے دینی اور بد مذہبی سے بدنام کرنے لگے۔ مخدوم الملک سے ان کی بگڑی ہوئی تھی۔ بُرا وقت دیکھا۔ تو دونوں ہمدرد مل گئے۔ ہر شخص سے کہتے تھے۔ کہ جبراً مُہریں۔ ورنہ یہ امامت کیا ہے اور عدالت کیا ہے۔ آخر مخدوم الملک کے ساتھ ہی انہیں بھی حج کو روانہ کر دیا۔ اور حکم دیا۔ کہ وہیں عبادت الٰہی میں مصروف رہیں۔ بے حکم نہ آئیں۔ بیگمات نے سفارش اور شفاعت کی مگر قبول نہ ہوئی۔ کیونکہ روز نئی شکائتیں پہنچتی تھیں۔ اور ان سے بغاوت کے خطر پیدا ہوتے تھے۔ شیخ نے آخر حق رفاقت ادا کیا۔ کہ ٹھکانے لگا دیا ؎

کہ کنارے تو تجھے گور کے پہنچاتا ہے	یہ سمجھ عشق کے دریا کے تلاطم کا سلوک

لیکن اب بھی ظاہری عزت کو قائم رکھا۔ چنانچہ ایک فرمان شرفائے مکّہ کے نام لکھا۔ اور اکثر تحائف ہندوستان کے اور بہت سا زر نقد روانہ کیا۔ کہ شرفائے موصوف اشخاص خاص کو دیں۔ یہ وہاں پہنچے نئی دنیا نظر آئی۔ ان کے فضل و کرامت کو مکّہ اور مدینہ میں کیا وزن ہو سکتا تھا۔ ان کے علم و فضل کو علمائے عرب کب خاطر میں لاتے تھے۔ اور خاطر میں کیا لاتے مسائل علمی تو بالائے طاق بڈھے بیچاروں کے منہ سے ان کے سامنے پوری بات بھی نہ نکلتی تھی۔ ساتھ اس کے جب ہندوستان کے

جاہ و جلال اور حکومتوں کے مزے یاد آتے ہونگے۔ تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتے ہوں گے۔ اور کچھ بس نہ چلتا تھا۔ اکبر اور اس کے خیر خواہوں کو اس طرح بدنام کرتے تھے کہ ادھر روم اُدھر بخارا تک آواز پہنچتی تھی +

۹۸۹ھ میں پھر بادشاہ نے اہل حج کا قافلہ روانہ کیا۔ بادشاہی میر حاج ساتھ گیا۔ شرفائے مکہ کے نام لکھا۔ اور اُس میں یہ بھی درج کیا۔ کہ ہم نے شیخ عبد النبی اور مخدوم الملک کے ہاتھ زر نقد اور اکثر تحائف ہندوستان کے روانہ کئے تھے ہر فرقہ اور مقام کے لوگوں کے لئے رقمیں تھیں۔ کہ بموجب فہرست کے دے دینا۔ وہاں بحصہ رسدی ہر شخص کو تقسیم ہو۔ اور فہرست سے الگ بھی کچھ روپیہ دیا تھا کہ بعض بعض اشخاص کو خفیہ طور پر دینا۔ اور اس میں کسی اور کا حق نہیں۔ یہ خاص انہیں اشخاص کا حصّہ ہے۔ اور یہ رقم فہرست میں نہ لکھی تھی۔ شیخ صدر کو یہ بھی حکم تھا کہ جو عجیب و نفیس چیزیں اُدھر کے مُلکوں میں ملیں وہ لے لینا۔ اور اُس مد کے لئے جو رقم دی گئی تھی۔ اگر کافی نہ ہو۔ تو جو رقم خفیہ دینے کو دی ہے۔ اس میں سے روپیہ لے لینا۔ پس یہ لکھئے۔ کہ آپ کو اُنھوں نے کتنا روپیہ پہنچایا۔ یہ بھی سُنا گیا ہے۔ کہ بعض بد عمل شریروں نے فضائل مآب کمالات اکتساب شیخ معین الدین ہاشمی شیرازی کے باب میں حسد و عداوت سے تہمت لگائی ہے۔ اور اس کی ایذا و اہانت کے درپے ہوتے ہیں۔ اور مشہور کیا ہے کہ فاضل موصوف نے ہمارے نام پر کوئی رسالہ لکھا ہے۔ اُس میں بعض باتیں ملت برحق اور شریعت پاک کے مخالف درج کی ہیں۔ نعوذ باللہ من شرور انفسہم۔ اس کی تصنیفات سے کوئی شے کہ خلاف معقول و منقول ہو۔ ہرگز ہرگز سماعت اشرف تک نہیں پہنچی۔ اور جب سے فاضل مذکور دربار میں پہنچا۔ کوئی امر تقوے و پرہیزگاری اور اطاعت شرع مصطفوی کے سوا نہیں دیکھا گیا۔ ان شریروں۔ بدکاروں۔ حاسدوں۔ شیطانوں کو تنبیہ کرو اور سزا دو۔ اور فاضل مذکور کو ان فتنہ پردازوں اور مفسدوں کے ظلم سے چھڑاؤ۔ اور تعجب اُن لوگوں سے ہے۔ کہ ایسے طوفان شیطان جنھیں بچے بھی یقین نہ کریں۔ وہ سُن کر کس طرح مان گئے۔ اور شیخ معین الدین جیسے شخص کے درپے آزار ہو گئے۔ ایسے لوگوں کو مقامات متبرکہ سے نکال کر پھر نہ آنے دو +

قسمت کی گردش دیکھو۔ کہ انہیں بھی مخدوم الملک کے ساتھ ہندوستان کو

پھرنا مصلحت معلوم ہوا ؎

گر اب کے پھرے جیتے وہ کعبے کے سفر سے ۔۔۔ تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

اے حضرات! خانہ خدا میں پہنچ لئے۔ جب ایک دفعہ ہندوستان کا منہ کالا کر چکے تو پھرنا کیا تھا۔ مرزا بیدل نے کیا خوب کہا ہے ؎

رفتن و نا آمدن باید ز آب آموختن ۔۔۔ خانہ ویرانی بہ عالم از حباب آموختن

مگر روسیاہ طمع سیاہ قسمت کا لکھا پورا ہونا تھا۔ وہ کھینچ کر لایا۔ اور خانہ خدا سے اس طرح بھاگے۔ جیسے قیدی کالے پانی سے بھاگتا ہے۔ سبب وہی تھا۔ کہ چند مہینے پہلے یہاں ممالک مشرقی میں امرا نے بغاوتیں کی تھیں۔ انہیں کے سلسلے میں محمد حکیم مرزا کابل سے چڑھ کر پنجاب آیا۔ اور لاہور کے میدان میں آن پڑا۔ یہ خبریں وہاں بھی پہنچیں۔ بڑھاپا تھا مگر بجھے ہوئے ذوق شوق کے کوئلے پھر چمک اُٹھے۔ یہ بھی اور مخدوم بھی سمجھے کہ حکیم مرزا ہمایوں کا بیٹا ہے۔ کچھ وہ ہمت کریگا۔ کچھ ہم دینداری کے زور لگائیں گے۔ اکبر کو بے دین کر کے اکھاڑ پھینکینگے۔ نوجوان لڑکا بادشاہ ہوگا۔ یہ پرانی جڑیں بھی پھر ہری ہو جائینگی۔ اس کی شاہی ہوگی۔ ہماری خدائی ہوگی ؎

دنیا فراخ است اے پسر تو گوشۂ ما گوشہ ۔۔۔ ہم چوں ملخ از کشت شہ تو خوشۂ ما خوشہ

یہاں دربار میں انتظام کی چلتی ہوئی کلیں تیار ہوگئی تھیں۔ انہیں مہینے بلکہ برس لگے یہاں دنوں کے اندر سب بندوبست ہو گئے۔ ان غریبوں کو ہندوستان کی مٹی کھینچ کر لائی تھی۔ افسوس کہ اخیر وقت میں خراب ہوئے۔ اُسوقت کمبایت اُتاری کا بندر تھا۔ احمد آباد گجرات میں آئے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ سبحان اللہ وہاں سے لیکر ہندوستان۔ پنجاب۔ کابل تک ایک میدان ہے۔ اور سونے چاندی کا دریا ہے کہ لہراتا ہے۔ یا باغ ہے کہ لہلہاتا ہے۔ مخدوم تو وہیں جان بحق ہوئے ؎

شب فراق میں آخر تڑپ کے مر گئے ہم ۔۔۔ بھلا ہوا کہ نہ دیکھی سحر جدائی کی

شیخ صدر فتح پور کے دربار میں آکر حاضر ہوئے۔ یہاں عالم ہی اور تھا۔ پیر کہن سال نے جب دیکھا تو عقل حیران اور منہ کھلا رہ گیا۔ کہ الٰہی یہ وہی ہندوستان ہے۔ یہ وہی دربار ہے۔ جس میں شاہان دین دار کے جلوس تھے۔ اب دو ستون جو ایوان سلطنت کو اُٹھائے کھڑے ہیں۔ وہی فضل و فیضی ہیں۔ مبارک کے

بیٹے۔ جو گوشۂ مسجد میں بیٹھا طالب علموں کو پڑھاتا تھا۔ سو بھی پکار کر نہیں۔ چپکے چپکے۔ اے پروردگار تیری شان۔ اے پروردگار تیری قدرت ع

کبھی کے دن ہیں بڑے اور کبھی کی رات بڑی

یہاں بھی پہنچانے والوں نے خبریں پہنچا دی تھیں۔ اکبر کی بیدینی اور بداعتقادی کے باب میں جو جو باتیں ان کی برکت سے مکّہ اور مدینہ میں مشہور ہوئی تھیں حرف بحرف بلکہ حاشیہ چڑھ کر آئی تھیں۔ اکبر آگ بگولا ہو رہا تھا۔ جب گفتگو ہوئی تو ادھر کہن سال کی پرانی عادتیں خدا جانے کیا کہہ دیا۔ یہاں اب خدائی کے دعوے۔ شعر

الٰہی دیکھئے صحبت برار ہو کیوں کر　　زباں دراز ہوں میں اور بدزباں صیاد

خود بادشاہ نے انہیں کچھ سخت الفاظ کہے (الٰہی تیری امان) یہ وہی شیخ صدر ہیں جن کے گھر میں خود حصول سعادت کے لئے جاتے تھے جس ہاتھ سے جوتی ان کے سامنے رکھی آج وہی ہاتھ تھا۔ کہ اس عالم کہن سال کے مُنہ پر زور کا مکّا ہو کر پڑا۔ اس وقت اس بچارے نے اتنا کہا کہ بکارد چرا نمے زنی +

جب مکّہ کو بھیجا تھا تو اہل قافلہ کے خرچ اور وہاں کے علماء و شرفا کے لئے ستّر ہزار روپیہ بھی دیا تھا۔ ٹوڈرمل کو حکم ہوا۔ کہ حساب سمجھ لو۔ اور تحقیقات کے لئے شیخ ابوالفضل کے سپرد کر دیا دفتر خانہ کی کچہری میں جس طرح اور کروڑی قید تھے اسی طرح یہ بھی قید تھے۔ اور وقت پر حاضر ہوتے تھے۔ شان الٰہی! جن مکانوں میں وہ خود دربار کرتے تھے اور امرا اور علما حاضر ہوتے تھے کوئی پوچھتا نہ تھا۔ آج وہاں خود جوابدہی میں گرفتار تھے۔ غرض مدت تک یہی حال تھا۔ اور شیخ ابوالفضل کی حوالات میں تھے۔ ایک دن سُنا کہ رات کو گلا گھونٹ کر مروا ڈالا[1]۔ اور یہ بھی بادشاہ کا اشارہ لیکر کیا تھا۔ دوسرے دن عصر کا وقت ہو گیا تھا اور مناروں کے میدان میں لاش پڑی تھی۔ ملا صاحب کسقدر خفا تھے۔ اُس مرحوم کا دم نکل گیا اور انکا غصہ نہ نکل چکا۔ ترحم اللہ مغفرت تو درکنار فرماتے ہیں شبے او را خفہ کردند و بحق واصل شد۔ در روز دیگر درمیان منارہا تا نماز دیگر افتادہ بود ان فی ذالک لعبرۃ لاولی الابصار۔ و شیخ کنبی تاریخ یافتند۔ ع گرچہ الشیخ کالنبی گفتند + کالنبی نیست شیخ ماکنبی ست یہ شعر اکثر اشخاص اُن کی شان میں پڑھا کرتے تھے (کنب۔ بھنگ) اور (بحق واصل شد) کے لفظ کو دیکھو اس میں کیا کام کر گئے۔ چاہو یہ سمجھ لو کہ ذات حق کیساتھ واصل ہو گئے۔ چاہو یہ کہو کہ امر حق کو پہنچ گئے

[1] معتمد خاں نے اقبال نامہ میں صاف لکھدیا ہے کہ ابوالفضل نے بادشاہ کے اشارہ سے مروا ڈالا +

شیخ مبارک اللہ

عرف شیخ مبارک

زمانے میں دستور ہے کہ بیٹے کا پتہ باپ کے نام سے روشن ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ بڑا مبارک باپ ہے جو خود کمال سے صاحب برکت ہو۔ اور بیٹوں کی ناموری اس کے نام کو زیادہ تر روشن کرے۔ یعنی کہا جائے کہ یہ وہی شیخ مبارک ہے جو فیضی اور ابوالفضل کا باپ تھا۔ وہ علوم عقلی میں حکیم الٰہی اور علوم نقلی میں صاحب اجتہاد تھا اور شیخ اس کا خاندانی لقب تھا۔ وہ نام کا مبارک تھا مگر مقدر ایسا منحوس لایا تھا۔ کہ اہل حسد کی عداوت سے دو ثلث اپنی زندگی کے یعنی ۶۳ برس اس مصیبت میں کاٹے کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ حریف ہمیشہ فوجیں باندھ باندھ کر اس پر حملے کرتے رہے۔ اور وہ ہمت کا پورا۔ تسبیح ہاتھ میں۔ عصا آگے رکھے بیٹھا تھا سبق پڑھاتا تھا۔ یا کتاب دیکھتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ دیکھیں تمہارے حملے ہارتے ہیں یا ہمارا تحمل۔ باوجود فضائل و کمالات کے جب اُس کی مصیبت دیکھی جاتی ہے۔ اور بعد اُس کے بیٹوں کی قابلیت و اقبال کے ساتھ اُس جاہ جلال پر نظر کی جاتی ہے تو ایک داستان قابل عبرت معلوم ہوتی ہے۔

مختلف نوشتوں اور کتابوں سے ان کے نہایت جزوی جزوی حالات معلوم ہوئے۔ میں بھی جہاں تک ممکن ہوگا۔ چھوٹے سے چھوٹا نکتہ نہ چھوڑونگا۔ اور اہل نظر کو دکھاؤں گا۔ کہ ان باکمالوں کی کوئی بات ایسی نہیں۔ جو غور کے قابل نہ ہو۔ چاہتا تھا کہ اس مقام پر ان کے نسب نامہ کو قلم انداز کروں۔ مگر ان جیوں اور دستاروں میں بھی ایسے پیچیدہ راز نظر آتے ہیں جنہیں کھولے بغیر آگے نہیں چلا جاتا۔ ناظرین عنقریب معلوم کر بس گے۔ کہ ان کے کمال نے زمانے کو کس قدر ان کی مخالفت پر مسلح کیا تھا۔ زیادہ تر دشمن ان کے ہم پیشہ بھائی یعنی علماء و فضلاء تھے۔ خانی خان لکھتے

ہیں کہ لوگوں کو ان کے نسب میں کچھ طعن تھا۔ چنانچہ بیٹوں کے ایک خط کے جواب میں شیخ مبارک نے دشمنوں کی تہمت کو دھویا ہے۔ اور انہیں تسلی دی ہے۔ بیٹوں کا خط نہیں ہاتھ آیا۔

خط شیخ مبارک بنام ابوالفضل و فیضی

بابائے من۔ از فضلائے ایں عہد کہ ہمہ جو فروش و گندم نما اند۔ و دیں را بدنیا فروختہ تہمت آں بر ما بستہ اند از گفتہ حرف آنہا نباید رنجید۔ و از انکہ از طرف نجابت ما گفتگو دارند۔ دل پُر تشویش نباید نمود۔ در ایامے کہ والد من تفویض ودیعت حیات نمود۔ من بحد تمیز نہ رسیدہ بودم۔ والدۂ من مرا در سایۂ عواطف یکے از سادات ذوے الاحترام در کمال عسرت پرورش مے داد۔ اور در تربیت من از طرف درس علمی و دیگر تادیب کمال سعی بکار مے برد از انکہ پدرم مرا حسب فرمودۂ بزرگے موسوم بہ مبارک ساختہ بود۔ روزے یکے از ہمسایہ ہائے حسد پیشہ آں سید والا نژاد کہ غمخواری و تیمار داری ما بیکساں می نمود مادرم را بکلمات درشت رنجانیدہ مرا بعدم نجابت مطعون نمود۔ والدہ ام گریہ کناں نزد آں سید والا مقام کہ از نسب و حسب پدرم اطلاع داشت۔ رفتہ نالش تعدی او نمود۔ و آں سید او را زجر و توبیخ تمام نمود۔ الحال الحمد للہ کہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ ما و شما را از فضل بے پایان خویش در سایۂ لطف و کرم پادشاہ عادل باذل فخر زمین و زمن بدیں رتبہ و پایہ رسانده کہ فضلائے عصر از راہ ہم چشمی حسدے دارند و رشک مے برند۔ الیٰ آخرہٖ۔

اس خط کے انداز سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ لوگ انہیں لونڈی بچہ یا غلام بچہ کہتے ہوں گے۔ کیونکہ مبارک اکثر غلاموں کا نام ہوتا ہے۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ کے خاتمے میں اپنا نسب نامہ اس طوالت سے لکھا ہے۔ کہ میں حیران تھا۔ اس طول کا سبب کیا ہوگا۔ جب یہ رقعہ نظر سے گزرا تو سمجھا کہ وہ دل کا بخار بے اس تفصیل کے نہیں نکل سکتا تھا۔

خلاصۂ تحریر ابوالفضل آئین اکبری کے خاتمے میں

اگرچہ خاندان کی نسب سرائی کرنی ایسی ہے۔ جیسے کوئی کمال درجہ کا مفلس بزرگوں کی ہڈیاں لے کر سوداگری کرے۔ یا نادانی کی جنس کو بازار میں ڈالے۔

اپنے عیب کو نہ دیکھے اور غیروں کے ہنر پر آپ فخر کرے۔ دل نہ چاہتا تھا کہ کچھ لکھوں اور بے حاصل افسانہ سناؤں۔ دنیا میں اس سلسلے کا پابند کسی منزل کو نہیں پہنچتا۔ اور صورت کے چشمے سے معنی کا باغ ہرا نہیں ہوتا ؎

چو ناداناں نہ در بندِ پدر باش — پدر بگذار و فرزندِ ہنر باش
چہ حاصل زانکہ آتش راست فرزند — چو دود از روشنی نبود نشاں مند

زمانے کے محاورے میں نسب۔ تخمہ۔ نژاد۔ ذات وغیرہ اسی کو کہتے ہیں اور اُسے بلند اور پست درجوں میں پابند کرتے ہیں۔ ہشیار دل آگاہ جانتا ہے۔ کہ ان درجوں کے معنے یہ ہیں۔ کہ باپ دادا کا سلسلہ جو برابر چلا آتا ہے گویا اس لڑی کے دانوں میں سے ایک کو لے لیا۔ اور جو ان میں ظاہری امارت یا حقیقت شناسی میں بڑا ہوا اور کسی نام یا لقب یا سکونت کے سبب سے مشہور ہو گیا۔ اس کو باپ دادا کہہ کر فخر کرنے لگے۔ عام لوگ سب کو آدم صفی اللہ کی اولاد کہتے ہیں۔ سمجھ والے لوگ ان قصہ خوانوں کی باتوں پر دل لگا کر اور خیال نہیں کرتے۔ اور فاصلے کی دوری دیکھ کر بیچ کی فصلوں کی پرواہ ہی نہیں کرتے۔ جو بیدار دل سعادت کو چُن لیتے ہیں۔ وہ ان کہانیوں کو خواب راحت کا سامان کیوں سمجھیں۔ اور ان کمالوں پر تکیہ کر کے تلاش حقیقت سے کیوں باز رہیں ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی — کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

قسمت کا لکھا کہ مجھے ایسے ہی صورت پرستوں اور رسم کے بندوں میں ڈال دیا۔ اور ایسے گروہ میں ملا دیا۔ جو کہ خاندان کے فخر کو کمال سے ہنر سمجھتے ہیں۔ ناچار کچھ وہ بھی لکھ دیتا ہوں۔ اور ویسے ہی لوگوں کے لئے بھی دسترخوان لگا لیتا ہوں۔ بزرگانِ کرام کا شمار ایک لمبی کہانی ہے۔ مگر زندگی کے دم بڑے قیمتی ہیں۔ ان نالائق باتوں کے عوض میں انہیں کیونکر بیچوں۔ خیر یہی سمجھ لو۔ کہ کچھ ان میں سے علوم رسمی میں۔ کچھ لباس امیری میں۔ کچھ دنیاداری میں۔ کچھ خلوت اور گوشہ نشینی میں زندگی بسر کر گئے۔ مدت تک یمن کی زمین ان بیدار دلوں کا وطن تھا۔ شیخ موسیٰ پانچویں پشت میں میرے دادا تھے۔ انہیں ابتدائے حال میں خلق سے وحشت ہوئی۔ گھر اور گھرانے کو چھوڑ کر غربت اختیار کی۔ علم و عمل کو رفاقت میں لیا اور معمورۂ جہاں کو عبرت کے

قدموں سے طے کیا۔ نویں صدی میں علاقۂ سندھ قصبۂ ریل میں پہنچ کر گوشہ نشین ہوئے۔ اور خدا پرستان حقیقت کیش سے دوستی کا پیوند کر کے خانہ داری اختیار کی۔ ریل ایک دلچسپ آبادی علاقہ سیوستان میں ہے۔ شیخ موسٰے اگرچہ جنگل سے شہر میں آئے مگر دنیا کے تعلقوں میں پابند نہ ہوئے۔ آگاہی کا سجادہ تھا۔ اور بے بدل زندگی کو نفش بد قلموں کی اصلاح میں صرف کرتے تھے۔ بیٹے پوتے ہوئے۔ وہ بھی انہیں کے عمل درآمد کو آئین سمجھتے تھے۔ دسویں صدی کے شروع میں شیخ خضر کو آرزو ہوئی کہ ہند کے اولیا کو بھی دیکھیں۔ اور دریائے عرب کی سیر کر کے اپنے بزرگوں کی نسل سے ملاقات کریں۔ بہت سے رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ ہند میں آئے۔ ناگور[1] میں پہنچے۔ یہاں کئی بزرگوں کے ایما سے مسافرت کے ارادہ کو سکونت سے بدل کر لوگوں کی ہدایت میں مصروف ہوئے۔ پہلے کئی بچے مر گئے تھے۔ ۹۱۱ھ میں شیخ مبارک نے ملک معنی سے عالمِ وجود میں ہستی کی چادر کندھے پر ڈالی۔ اس لئے **مبارک اللہ** نام رکھا۔ کہ اللہ مبارک کرے۔ چار برس کی عمر تھی کہ بزرگوں کی قوتِ تاثیر سے عقل و آگاہی کی طاقت روز بروز بڑھنے لگی۔ ۹ برس کی عمر میں سرمایہ کمال بہم پہنچایا۔ ۱۴ برس کی عمر میں علومِ رسمی حاصل کر لئے۔ اور ہر ایک علم میں ایک ایک متن یاد کر لیا۔ اگرچہ عنایتِ ایزدی ان کی قافلہ سالار تھی۔ بہت بزرگوں کی خدمت میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ مگر شیخ عطن کے پاس زیادہ تر رہتے تھے۔ اور ان کی تعلیم سے دل کی پیاس اور زیادہ ہوتی تھی۔

شیخ عطن ترک نژاد تھے۔ ۱۲۰ برس کی عمر پائی۔ سکندر لودھی کے زمانہ میں ناگور کو وطن اختیار کیا۔ اور شیخ سالار ناگوری سے خداشناسی کی آنکھیں روشن کیں۔ ایران توران اور دُور دُور کے ملکوں سے عقل و آگاہی کا سرمایہ لائے تھے۔

اس عرصہ میں شیخ خضر کو پھر سندھ کا خیال ہوا۔ کہ چند رشتہ دار وہاں ہیں۔ انہیں جا کر لے آئیں۔ لیکن یہ سفر انہیں آخرت کا سفر ہوا۔ یہاں ناگور میں بڑا قحط پڑا اور ساتھ ہی وبا آئی۔ کہ آدمی آدمی کو نہ پہچانتا تھا۔ لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ آئے۔ اس آفت میں شیخ مبارک اور ان کی والدہ رہ گئی۔ باقی سب مر گئے۔ شیخ مبارک کے

[1] ناگور اجمیر کے شمال مغرب میں ہے۔

دل میں تحصیل علم اور جہاں گردی کا شوق جوش مار رہا تھا۔ مگر والدہ اجازت نہ دیتی تھی۔ اور خودسری طبیعت میں نہ تھی۔ وہیں اصلاح طبیعت میں مصروف رہے۔ اور تحصیل علوم اور کسب فنون نہایت کاوش اور کاہش سے کرتے رہے۔ فن تاریخ اور عام احوالات سے ایسی آگاہی حاصل کی جس کی بدولت عالم میں مشہور ہو گئے چند روز کے بعد **خواجہ عبداللہ احرار** کی خدمت میں پہنچے۔ کہ وہ ان دنوں نوشدارو ے حقیقت کی جستجو میں سیاحی کرتے ہندوستان میں آ نکلے تھے۔ اُن سے تلاش الٰہی کا رستہ معلوم کیا۔ اور بہت سے فیض معنوی حاصل کئے +

نوٹ:- خواجہ احرار نے ۱۲۰ برس کی عمر پائی۔ بڑی بڑی سیاحیاں کیں۔ اور ۴۰ برس ختا و ختن کے ملکوں میں بسر کئے۔ وہ شیخ مبارک پر نہایت شفقت کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی تصنیفات و ملفوظات میں جہاں درویشے پرسید و درویشے گفت آتا ہے۔ اس سے شیخ مبارک ہی مراد ہیں خواجہ احرار ۲۰ فروری ۱۴۹۰ء کو سمرقند میں فوت ہوئے۔ ان کا نام حضرت اہل اللہ میں خواجہ خواجگان مشہور ہے +

اس عرصے میں والدہ کا انتقال ہوگیا۔ دل کی وحشت دوبالا ہوئی۔ دریائے اسود کا رُخ کیا۔ ارادہ تھا۔ کہ کرۂ زمین کا دورہ کریں۔ اور فرقہ فرقہ اشخاص سے ملاقات کر کے فیض کمال حاصل کریں۔ احمد آباد گجرات میں پہنچے۔ وہ شہر اپنی شہرت کے بموجب اہل کمال کی جمعیت سے آراستہ تھا۔ اور ہر طرح کی تکمیل کا سامان موجود تھا۔ یہ بھی مشہور تھا۔ کہ **سید احمد گیسو دراز** کی درگاہ سے فیض برکت کے چشمے بہتے ہیں۔ اور وہ ان کے ہم وطن بھی تھے۔ غرض یہاں سفر کی خورجین کندھے سے ڈال دی۔ علما و فضلا سے ملاقات ہوئی۔ تحصیل میں تدریس کا سلسلہ جاری ہوا۔ چاروں اماموں کی کتابیں اصولاً و فروعاً حاصل کیں۔ اور ایسی کوششیں کیں۔ کہ ہر ایک میں اجتہاد کا مرتبہ پیدا ہو گیا۔ اگرچہ اپنے بزرگوں کی پیروی کر کے حنفی طریقہ رکھا۔ مگر عمل میں ہمیشہ انتہائی درجہ کی احتیاط کرتے رہے۔ بڑا خیال اس بات کا تھا کہ جو کچھ نفس سرکش کو مشکل معلوم ہو وہی ہو۔ اسی عرصے میں علم ظاہری سے علم معنوی کی طرف گذر ہوا۔ بہت سی کتابیں تصوف اور علم اشراق کی دیکھیں۔ بہتیری تصنیفیں منطق اور الٰہیات کی پڑھیں۔ خصوصاً حقائق شیخ محی الدین عربی اور شیخ ابن فارض اور شیخ صدر الدین قونوی اور بہت سے اہل حال اور اہل قال کی تصنیفات نظر سے گذریں۔ نئے نئے نکتے حل ہوئے۔ اور عجب عجب پردے

دل پر سے اُلٹے ٭

پروردگار کی بڑی نعمتوں سے ایک نعمت یہ ملی کہ **خطیب ابوالفضل گازرونی**
کی ملازمت حاصل ہوئی۔ انہوں نے قدردانی اور آدم شناسی کی آنکھوں سے دیکھا۔
اور بیٹا کر لیا۔ بہت سا معقولات کا سرمایہ دیا۔ اور ہزاروں باریکیاں۔ تجرید۔ شفا۔
اشارات۔ تذکرہ اور مجسطی کی کھولیں۔ اس صحبت میں حکمت کے بُستاں سرانے اور
ہی طراوت دکھائی۔ اور بینش و بصیرت کا چشمہ رواں ہو گیا۔ خطیب دانشمند کو شاہان
گجرات کی کشش و کوشش نے شیراز سے کھینچا تھا۔ چنانچہ انہی کی برکت نے
اُس ملک میں علم و حکمت کا خزانہ کھولا۔ اور دانش و دانائی کو نئی روشنی دی۔ اُنہوں
نے انبوہ در انبوہ زمانے کے دانشوروں کو دیکھا تھا۔ اور ان سے بہت کچھ پایا تھا۔
مگر علوم حقیقی و فنون عقلی میں مولانا جلال الدین دوانی کے شاگرد تھے ٭

شیخ مبارک نے وہاں اور عالموں اور خدارسیدہ بزرگوں کی خدمت سے بھی
سعادتوں کے خزانے بھرے۔ اور تصوف کے کئی سلسلوں کی سند لی۔ شیخ عمر ٹھٹوی
کی خدمت سے بڑا نور حاصل کیا۔ اور سلسلہ کبرویہ کا چراغ روشن ہوا۔ شیخ یوسف مجذوب
ایک مست آگاہ دل ولی کامل تھے۔ ان کی خدمت میں جانے لگے۔ اور خیال اس
بات پر جما کہ علمی معلومات کو دل سے دھو کر علوم حقیقی کا خیال باندھیں اور دریائے
شور کا سفر کریں۔ شیخ موصوف نے فرمایا کہ دریا کے سفر کا دروازہ تمہارے لئے
بند ہوا ہے۔ آگرہ میں جا کر بیٹھو۔ اور وہاں مقصد نہ حاصل ہو تو ایران و توران کا
سفر کرو۔ جہاں حکم ہو وہاں بیٹھ جاؤ۔ اور اپنی حالت پر علوم رسمی کی چادر کا پردہ کر لو (کہ
تنگ ظرفوں کے دل حقائق معنوی کی برداشت نہیں رکھتے) ٭

۶ محرم ۹۵۰ھ کو آگرہ میں آ کر اُترے کہ قسمت کی چڑھائی کی پہلی منزل تھی۔
شیخ علاؤ الدین مجذوب سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے فرمایا کہ اس شہر اقبال میں بیٹھو۔
اور سفر کا خاتمہ کرو۔ ایسی بشارتیں دیں کہ وہاں سے قدم اُٹھانا مناسب نہ سمجھا۔
چنانچہ شہر کے مقابل دریائے جمنا کے اُس پار کنارہ پر چار باغ[1] کی بستی تھی۔ وہاں
میر رفیع الدین چشتی انجوی[2] کے ہمسائے میں اُترے۔ اور قریشی گھرانے میں کہ

[1] پہلے اسے چار باغ کہتے تھے پھر ہشت بہشت ہوا بابر نے نئی بنیاد ڈالی کر نور افشاں کہلوایا اب رام باغ کہلاتا ہے۔
[2] انجو شیراز میں واقع ہے ٭

علم و عمل سے آراستہ تھا۔ شادی کی۔ سید موصوف محلّہ کے رئیس تھے ان کے رہنے کو غنیمت سمجھے۔ آشنائی ہوئی تھی۔ دوستی ہوگئی۔ گرمجوشی اور شگفتگی سے ربط ہوگیا۔ وہ صاحب دولت اور صاحب دستگاہ تھے۔ اُنہوں نے اپنے رنگ میں ملانا چاہا۔ مگر انہوں نے نہ مانا۔ اور توکّل کے آستانہ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اندر حق شناسی کے شغل تھے۔ باہر درس و تدریس۔

جب سنہ ۹۵۴ھ میں سید موصوف کا انتقال ہوگیا۔ تو شیخ مبارک نے پھر گوشۂ عزلت سنبھالا۔ بڑا شغل کوشش کا یہی تھا کہ باطن کو دھوتے رہتے تھے اور ظاہر کو پاک رکھتے تھے۔ روئے نیاز کارساز حقیقی کی طرف کیا۔ اور علوم و فنون کے درس میں دل بہلانے لگے۔ اوروں کی گفتگوؤں کو اپنے حال کا پردہ کرلیا۔ خواہش کی زبان کاٹ ڈالی۔ معتقدوں میں سے کوئی بااحتیاط آدمی اخلاص سے نذر لاتا۔ تو ضرورت کے قابل لے لیتے۔ باقی لوگوں سے معذرت کرکے پھیر دیتے۔ اور ہمّت کے ہاتھ اُس سے آلودہ نہ کرتے۔ سنہ ۹۵۴ھ ۱۵۴۷ء ۴۳ کی عمر میں فیضی اور سنہ ۹۵۸ھ ۱۵۵۱ء ۴۷ برس کی عمر میں ابوالفضل یہیں پیدا ہوئے۔

چند روز میں چھوٹے سے لے کر بڑے تک اسی چشمے پر آنے لگے اور داناؤں اور دال شوروں کا گھاٹ ہوگیا۔ بعضے حسد کے مارے سازشیں کرنے لگے۔ بعضے محبّت سے ملے اور رفیق خلوت ہو گئے۔ شیخ مبارک کو نہ اس کا رنج تھا۔ نہ اُس کی خوشی تھی۔ شیر شاہ اور سلیم شاہ نے اور بعض لوگوں نے چاہا۔ کہ یہ خزانہ شاہی سے کچھ لیں اور جاگیر مقرر ہو جائے۔ ہمّت بلند تھی۔ نظر نہ جھکی۔ اس سے ترقّی کا رتبہ اور بڑھا۔ پرہیزگاری اور احتیاط کا یہ عالم کہ بازار میں کہیں گانا ہوتا۔ تو قدم اُٹھا کر جلد نکل جاتے۔ چلتے تو دامن اور پائجامہ اُونچا کرکے چلتے تھے۔ کہ نجس نہ ہو جائے۔ کوئی محفل میں نیچا پاجامہ پہن کر آتا تو جتنا زیادہ ہوتا پھڑوا ڈالتے۔ لال کپڑا پہنے دیکھتے تو اُتروا ڈالتے۔ ظاہر پرست اور بوالہوس جلتے اور گھبراتے۔ انہیں مباحثوں کے جھگڑے اور دکان داری کی بھیڑ بھاڑ بڑھانی منظور نہ تھی۔ ہاں حق کے اظہار اور بدکاروں کی ملامت میں ذرا تخفیف نہ کرتے تھے۔ جو بد کتے انہیں پر چاتے نہ تھے۔

چند عالم اس عہد کے خصوصاً جو کہ فضیلت اور پارسائی کے دعووں سے سلطنت میں دخیل تھے۔ وہ شیخ مبارک سے سخت عداوت رکھتے تھے۔ **مخدوم الملک** ملا عبد اللہ سلطان پوری ہمایوں۔ شیر شاہ۔ سلیم شاہ کے درباروں میں شریعت کے مالک بنے ہوئے تھے۔ **شیخ عبد النبی** مشائخ واجب التعظیم میں سے تھے۔ ان کے کلاموں کی لوگوں کے دلوں میں تاثیر تھی۔ کیونکہ درباری زور کے ساتھ اپنے درس و تدریس مسجدوں کی امامت۔ خانقاہوں کی نشست اور مجلسوں کے وعظوں سے دلوں کو دبوچ کر رکھا تھا۔ چاہتے تو احکام سلطنت پر مخالفت شرع کا فتویٰ لگا کر خاص و عام میں دلولہ ڈال دیتے تھے۔ ان کی معرفت اکثر مقاصد بادشاہی رعایا سے آسان نکل آتے تھے۔ ان مصلحتوں پر نظر کر کے بادشاہِ وقت بھی ان کی خاطرداری کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلۂ مقدمات سے بڑھ کر احکامِ سلطنت تک انہی کے فتووں پر منحصر تھے۔ جب یہ لوگ بادشاہوں کی محفل سے اُٹھتے تھے۔ تو بڑے بڑے ارکانِ سلطنت اور اکثر خود بادشاہ لبِ فرش تک پہنچانے آتے تھے۔ بعض موقع پر خود بادشاہ ان کے سامنے جوتیاں سیدھی کر کے رکھ دیتے تھے +

شیخ مبارک کیا معلومات کتابی۔ کیا تحریر و تقریر میں۔ ان لوگوں کے بس کا نہ تھا۔ ایسے عالم کے خیالات کو بھی سمجھ لو کہ کیسے ہوں گے۔ وہ ضرور ان بزرگوں کو خاطر میں نہ لاتا ہوگا مولوی مُلا نے دسترخوانوں کی مکھیاں ہوتے ہیں۔ عام علماء بیان مسائل اور فتاووں میں ملائے مخدوم اور شیخ صدر کا منہ دیکھتے ہوں گے۔ شیخ مبارک پروا بھی نہ کرتا ہوگا۔ اور سچ بھی ہے۔ جس کا علم و عمل ہر وقت حق پرستیوں کا دائرہ گرد رکھتا ہو۔ اور خود دنیا کی دولت اور جاہ و منصب کی ہوس نہ رکھتا ہو۔ اسے کیا ضرورت ہے۔ کہ جس گردن کو خدا نے سیدھا پیدا کیا۔ اُسے اوروں کے سامنے جھکائے۔ اور وہ رائے جسے قدرت سے آزادی کی سند ملی ہے۔ اُسے دنیا کے لالچ کے لئے نااہلوں کے ہاتھ بیچ ڈالے +

جب کسی غریب مُلا یا مشائخ پر مخدوم یا صدر کوئی سخت گرفت کرتے تو وہ بیچارا شیخ کے پاس آتا تھا۔ شیخ کی شوخ طبیعت کو یہ شوق تھا مسجد ہی میں بیٹھے بیٹھے ایک نکتہ ایسا بتا دیتے تھے کہ جب وہ جا کر جواب پیش کرتا تھا تو حریف کبھی

فقر کی بغل جھانکتے تھے۔ کبھی حدیث کا پہلو ٹٹولتے تھے۔ مگر جواب نہ پاتے تھے۔ ایسی ایسی باتوں سے رقیب ہمیشہ اس کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ اور رنگا رنگ کی تہمتوں سے طوفان اُٹھاتے تھے۔ چنانچہ ابتدا میں مہدویت کی تہمت لگائی۔ اصلیت اس کی فقط اتنی تھی۔ کہ شیر شاہ کے عہد میں شیخ علائی مہدوی ایک فاضل تھا۔ وہ جس طرح علم و فضل میں صاحب کمال تھا۔ اسی طرح پرہیزگاری میں حد سے گزرا ہوا تھا اور حدت طبع نے اس کی سحر بیانی کو آتش بیانی کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔ یہ نہیں ثابت ہوتا کہ شیخ مبارک اس کے معتقد یا مرید تھے۔ لیکن خواہ اس سبب سے کہ طبیعت بھی ہم جنس طبیعت کی عاشق ہوتی ہے۔ اور ہم جنس طبیعتوں میں مقناطیسی کشش ہے۔ خواہ اس سبب سے کہ مخدوم الملک ان کے قدیمی رقیب اُس کے دشمن ہو گئے تھے۔ غرض تیز طبع پرہیزگاروں میں محبت اور صحبت کا سلسلہ ضرور تھا۔ اور شیخ مبارک اکثر جلسوں اور معرکوں پر اس کی رفاقت میں شامل ہوتے تھے۔ جو بات اس کی حق ہوتی تھی۔ بے خطر تصدیق کرتے تھے۔ با اقتدار دشمنوں کی مطلق پروا نہ کرتے تھے۔ بلکہ جب اپنے جلسوں میں بیٹھتے تو حریفوں پر لطیفوں کے پھول پھینکتے تھے نتیجہ اس کا یہ ہوا۔ کہ شیخ علائی بیچارے مارے گئے۔ اور شیخ مبارک مفت بدنام ہو گئے ✦

پہلے ہمایوں اور پھر شیر شاہ و سلیم شاہ کے وقت میں افغانی دور تھا۔ اس میں آئے دن کے تغیرات سے ملک کا حال بھی پریشان تھا اور علمائے مذکور کا زور بھی زیادہ تھا۔ اس لئے شیخ مبارک عقل و دانش کا چراغ گوشہ میں بیٹھکر روشن کرتے تھے۔ اور حقیقت کے نکتے چپکے چپکے کہتے تھے۔ جب ہمایوں پھر آیا۔ تو شیخ نے بے خطر ہو کر مدرسے کو رونق دی۔ اس کے ساتھ ایران و ترکستان کے دانا و دانش پسند لوگ آئے۔ اُن سے علوم کا زیادہ چرچا پھیلا۔ ان کا مدرسہ بھی چمکا۔ اسی عرصے میں زمانے کی نظر لگی۔ ہمایوں مر گیا۔ ہیموں نے بغاوت کی علمی صحبتوں کی رونق جاتی رہی۔ بہت لوگ گھروں میں بیٹھ گئے۔ کچھ شہر چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ شیخ کو اس قدر شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ کہ ہیموں نے بھی بعض صلاح مشوروں میں ان سے پیغام سلام کئے بلکہ شیخ کی سفارش پر اکثر اشخاص کی جاں بخشی اور مخلصی بھی کر دی۔ مگر یہ اس سے

پرچے نہیں۔ ساتھ ہی قحط پڑا کہ تباہی عام خلقت پر عموماً اور خاص لوگوں کے لئے خصوصاً ارزاں ہو گئی۔ گھر اور گھرانے فنا ہو گئے۔ ویرانی کا یہ عالم ہوا کہ شہر میں گنتی کے گھروں کے سوا کچھ نہ رہا۔ شیخ کے گھر میں اُن دنوں زن و مرد ۷۰ آدمی تھے۔ لیکن اس بے پروائی سے گزران کرتے تھے کہ کوئی کہتا تھا کیمیا گر ہیں۔ کوئی جانتا تھا جادوگر ہیں۔ بعضے دن فقط سیر بھر اناج آتا تھا۔ اسے مٹی کی ہانڈی میں اُبال لیتے تھے۔ وہی آب جوش بانٹ کھاتے تھے۔ اور ایسے آسودہ نظر آتے تھے گویا اس گھر میں روزی کا کچھ خیال ہی نہیں۔ عبادت کے سوا ذکر نہ تھا۔ اور شغل کتاب کے سوا فکر نہ تھا اس وقت فیضی آٹھویں برس میں اور ابوالفضل پانچویں برس میں تھے۔ وہ اس عالم میں ایسے خوش رہتے تھے کہ لوگ دنیا کی نعمتیں کھا کر نہ خوش ہوتے ہوں گے۔ اور باپ ان سے زیادہ۔ کیونکہ وہ ہر طرح ان کی خوبیوں کا سرچشمہ تھا۔

جب اکبری دور شروع ہوا۔ عالم میں امن ہوا۔ شیخ کا مدرسہ پھر گرم ہوا۔ اور علوم نقلی و عقلی کی درس و تدریس ایسی چمکی کہ شیخ کے نام پر علم و کمال کے طلب گار ملک ملک سے آنے لگے۔ درباری عالموں کو آتش حسد نے پھر بھڑکایا۔ پرانے علم فروشوں کو اپنی فکر پڑی۔ اور نوجوان بادشاہ کے کان بھرنے شروع کئے۔

دنیا جہاں احتیاجوں کا مینہ برستا ہے بہت بُری جگہ ہے۔ جس وقت کہ شیخ عبدالنبی صدر اہل حاجت کے لئے درگاہ تھا۔ اور ائمہ مساجد اور علماء و مشائخ کو جاگیروں کے اسناد اُن سے ملتے تھے۔ شیخ مبارک دنیا کے صدموں سے لڑتے لڑتے تھک گیا۔ اس پر عیال کا انبوہ ساتھ ہے

توڑا کمر شاخ کو کثرت نے ثمر کی	دنیا میں گرانبار ئی اولاد غضب ہے

گذارہ کا رستہ ڈھونڈھنے لگا۔ کہ کسی طرح دن بسر کرے۔ وہ یہ بھی سمجھا ہوگا۔ کہ ان عالم نما زہد فروشوں میں میرا سرمایہ کس سے کم ہے۔ جو مَیں اپنا حصّہ نہ مانگوں۔ کہ میرا حق ہے۔ چنانچہ علم کے لحاظ سے دور نزدیک سمجھ کر شیخ صدر کے پاس گیا۔ پھر بھی اپنی آزادی کا پہلو بچایا یا فیضی کو ساتھ لیتا گیا۔ اور عریضہ میں لکھا کہ سو بیگھہ زمین مدد معاش کے طور پر اس کے نام ہو جائے۔ شیخ صدر خدائی اختیاروں کے صدر نشین تھے۔ وہاں فقط عرضی داخل دفتر نہ ہوئی بلکہ بڑی بے نیازی اور کراہت کے ساتھ

جواب ملا کہ یہ رافضی مہدوی ہے نکال دو۔ عذاب کے فرشتے دوڑے اور فوراً اُٹھا دیا۔ اللہ اللہ۔ پیر کہن سال۔ کوہ کمال۔ دریائے دانش۔ دل پر کیا گذری ہوگی۔ آسمان کی طرف دیکھ کر رہ گیا ہوگا۔ اور آنے پر پچھتایا ہوگا۔ مگر زمانے نے کہا ہوگا۔ نہ گھبرانا ہمارا مزاج خود ان معجونوں کی برداشت نہیں رکھتا۔ یہ پرانے برج تمہارے نوجوانوں کی گھڑدوڑ میں ڈھائے جائینگے۔ اور جلد ڈھائے جائینگے +

علمائے مذکور نے ایک موقع پر اہل بدعت تشیع اور بد مذہبی کے جرم میں پکڑے بعض کو قید کیا۔ بعض کو جان سے مار ڈالا۔ ابوالفضل کہتے ہیں۔ بعض بدگوہر میرے والد کو شیعہ سمجھ کر بُرا کہنے لگے۔ اور نہ سمجھے کہ کسی مذہب کے اصول و فروع کو جاننا اور شے اور ماننا اور شے ہے۔ خاص مقدمہ یہ ہوا کہ ایک سید عراق (ایران) کا رہنے والا یگانۂ زمانہ تھا۔ وہ ایک مسجد میں امام تھا اور علم کے ساتھ عمل کا پابند تھا۔ علمائے وقت اس سے بھی کھٹکتے تھے۔ مگر اکبر کی توجہ ہر بات پر تھی۔ اس لئے کچھ صدمہ نہ پہنچا سکتے تھے۔ ایک دن دربار میں مسئلہ پیش کیا کہ میر کی پیش نمازی درست نہیں۔ یہ عراقی ہیں۔ اور حنفی مذہب کی ایک روایت ہے۔ کہ اہل عراق کی گواہی معتبر نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ جس کی گواہی معتبر نہیں۔ اس کی امامت کیونکر صحیح ہو سکتی ہے امامت کے جانے سے سید کا گذارہ مشکل ہو گیا۔ وہ شیخ سے اتحاد برادرانہ رکھتا تھا۔ ان سے دردِ دل بیان کیا۔ انہوں نے بہت سی ہوش افزا تقریریں سُنا کر اس کی خاطر جمع کی۔ اور ردِّ جواب پر دلیری دے کر سمجھایا کہ یہ لوگ روایت کے معنے نہیں سمجھتے۔ جو سند لاتے ہیں۔ اس میں عراق سے عراق عجم مراد نہیں۔ عراق عرب مراد ہے۔ امام صاحب (امام ابوحنیفہ) کے وقت میں عراق عجم کا یہ حال کہاں تھا۔ جواب ہے۔ کتابوں میں فلاں فلاں مقام پر اس کی توضیح ہے۔ اور یہ سمجھتے کہ کسی مقام کے آدمی ہوں۔ سب یکساں نہیں ہیں۔ ایک اشرفِ اشراف ہیں۔ وہ حکماء علماء سادات ہیں۔ دوسرے اشراف۔ ان سے امرا اور زمیندار وغیرہ مراد ہیں۔ تیسرے اوساط۔ ان سے اہل حرفہ اور اہل بازار مراد ہیں۔ چوتھے ادنیٰ اور پواج کہ وہ ان سے بھی نیچے ہیں۔ مقدمات میں ہر ایک کے لئے سزا کے بھی چار درجے رکھے ہیں۔ نیکی بدی کا موقع ہو تو اس آئین کی رعایت کیوں نہ ہو۔ اور بات درست ہے۔ اگر ہر مجرم کو برابر ہی گوشمالی دیں۔ تو

شاہراہِ عدالت سے انحراف ہو۔ یہ سُن کر سید خوش ہو گئے۔ اور تحریر حضور میں گزرانی۔ دشمن دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مگر سمجھ گئے۔ کہ اس آگ کی دیا سلائی کہاں سے آئی۔ اس قسم کی تائیدیں اور امدادیں کئی دفعہ کھلم کھلا بھی ہوئیں (شیخ فضل لکھتے ہیں)۔ مسئلۂ مذکور جاہلوں میں شورش کا سرمایہ ہو گیا۔ سبحان اللہ گروہا گروہ خلائق کا اتفاق ہے۔ کہ کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں ایک نہ ایک بات کی کسر نہ ہو۔ اور ایسا بھی کوئی مذہب نہیں کہ سر تا پا باطل ہی ہو۔ اس صورت میں اگر ایک ماہر شخص اپنے مذہب کے برخلاف کسی غیر مذہب کے مسئلہ کو اچھا کہے تو اس کی باریکی پر غور نہیں کرتے دشمنی پر تیار ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ شیخ مبارک کو مہدویت کے ساتھ تشیع کی بھی تہمت لگ گئی۔

(ملا صاحب لکھتے ہیں) میں جس زمانہ میں شیخ مبارک سے پڑھتا تھا۔ تو ایک فتوے شیخ کا لکھا ہوا لے کر میاں حاتم سنبھلی کے پاس گیا وہ بھی اُس زمانہ میں فاضل مسلّم الثبوت تھے۔ اور فقہ میں امام اعظم ثانی کہلاتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ کہ شیخ کی مولویت کیسی ہے۔ میں نے ان کی ملّائی اور پارسائی اور فقر و مجاہدات و ریاضیات اور امر معروف اور نہی منکر کا حال جو کچھ جانتا تھا۔ بیان کیا۔ کہ شیخ اس زمانہ میں نہایت احتیاط کے ساتھ پابند تھے۔ میاں نے کہا کہ درست ہے۔ میں نے بھی بہت تعریف سنی ہے۔ مگر کہتے ہیں۔ کہ مہدویہ طریقہ رکھتے ہیں۔ یہ بات کس طرح ہے؟ میں نے کہا کہ میر سید محمد کی ولایت اور بزرگی تو مانتے ہیں۔ مگر مہدویت نہیں مانتے۔ میاں نے فرمایا کہ میر کے کمالات میں کسے کلام ہے۔

وہاں میر سید محمد میر عدل بھی بیٹھے تھے۔ میری گفتگو سُن کر وہ بھی متوجہ ہوئے۔ اور پوچھا کہ انہیں لوگ مہدوی کیوں کہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ نیکیوں کی تاکید اور برائیوں سے بشدّت منع کرتے ہیں۔ پھر پوچھا۔ میاں عبدالحی خراسانی (کہ چند روز صدر بھی کہلاتے تھے) ایک دن خان خاناں کے سامنے شیخ کی مذمت کر رہے تھے۔ تم جانتے ہو۔ اس کا کیا سبب ہوگا؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ ایک دن شیخ مبارک نے انہیں رقعہ لکھا تھا۔ اس میں بہت سی باتیں نصیحت کی تھی۔ از انجملہ یہ بھی تھا۔ کہ تم مسجد میں نماز جماعت میں کیوں نہیں شامل ہوتے۔ میاں عبدالحی نے بُرا مانا۔ اور

جماعت کی تاکید سے یہ نتیجہ نکالا کہ مجھے رافضی کہا ہے۔ میر عدل موصوف بولے۔ یہ استدلال تو ایسا ہے۔ کہ کوئی کسی کو کہے تم نماز جماعت نہیں پڑھتے۔ اور جو نماز جماعت نہ پڑھے وہ رافضی ہے۔ تو تم بھی رافضی ہو۔ اور ظاہر ہے۔ کہ اس شخص کا کبریٰ مسلم نہیں ہے۔ اسی طرح یہ مقدمہ کہ شیخ امر معروف کرتا ہے۔ اور جو امر معروف کرتا ہے۔ وہ مہدوی ہے۔ یہ بھی نامسلم ہے۔ غرض معلوم ہوتا ہے۔ ان کے باب میں اس قسم کے چرچے خاص و عام میں رہتے تھے +

اہل تجربہ جانتے ہیں کہ دنیا کے لوگ جب حریف پر غلبہ دشوار دیکھتے ہیں۔ تو اپنے مددگاروں اور طرفداروں کی جمعیت بڑھانے کے لئے مخالف مذہب کا الزام اس کے گلے باندھ دیتے ہیں۔ کیونکہ عوام الناس اس نام سے بہت جلد جوش میں آجاتے ہیں۔ اور اس بہانہ سے حریف کے خراب کرنے کو مفت کا لشکر ہاتھ آجاتا ہے۔ پس عجب نہیں۔ کہ جب علمائے مذکور نے شیخ مبارک کے فضل و کمال کو اپنے بس کا نہ دیکھا تو رنگ رنگ کے پہلوؤں سے بدنام کیا۔ سلیم شاہ کے عہد میں مہدویوں کی طرف سے بغاوت کا خطر تھا۔ اس وقت مہدویت کی علت لگائی۔ اکبر کے اوائل عہد میں ترکانِ بخارا کا ہجوم تھا۔ وہ ایرانی مذہب کے سخت دشمن تھے۔ اس کے وقت میں رافضی رافضی کہہ کر بدنام کر دیا۔ کہ وار پورا پڑے۔ اور اس میں بھی شک نہیں۔ کہ شیخ مبارک صاحب اجتہاد تھا۔ اور مزاج کا آزاد تھا جس مسئلہ میں اُس کی رائے شیعوں کی طرف مائل ہوتی ہوگی۔ صاف بول اُٹھتا ہوگا +

تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمایوں کے عہد میں بہت ایرانی ہندوستان میں آگئے تھے۔ مگر تقیہ کے پردہ میں رہتے تھے۔ مذہب ظاہر نہ کرتے تھے۔ اور اکثر اُن میں صاحب اقتدار بھی ہوگئے تھے۔ یہ بھی طبعی امر ہے کہ جب ہمارے دشمن کا کوئی حریف باقبال پیدا ہوتا ہے۔ تو اُسے اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ فائدہ و بے فائدہ اس سے مل کر دل خوش ہوتا ہے۔ اور زبان خود بخود اُس کی ہمداستانی پر حرکت کرتی ہے ملّائے مخدوم اور شیخ صدر کے جو سلوک شیعوں سے تھے۔ وہ ان کے حال میں معلوم ہونگے۔ شیخ مبارک ضرور شیعوں سے ملتا ہوگا۔ اور گفتگوؤں میں ان کا ہمداستان ہوتا ہوگا + ع

۔	شیخ تیری ضد سے چھوڑوں دین وایماں تو سہی	

خیر یہ کچھ ایسی ملامت کی بھی بات نہیں۔ آخر وہ انسان تھا۔ فرشتہ تو نہ تھا ۔

یہ بھی قاعدہ ہے۔ کہ جب انسان اپنے مقابل میں دشمنوں کو نہایت قوی دیکھتا ہے۔ اور ان کی عداوت کے تدارک اپنی طاقت سے باہر پاتا ہے تو ایسے بااقتدار لوگوں سے رشتے ملاتا ہے۔ جو دشمنوں سے پھٹے ہوئے ہوں۔ اور بُرے وقت میں اس کے کام آئیں۔ اس کے حریفوں کو دیکھو۔ کیسے زبردست اختیارات رکھتے تھے۔ اور انہیں کس بیدردی سے اس بیچارے کے حق میں خرچ کرتے تھے جو عالم سنت وجماعت تھے۔ اُن سے اس غریب کو اصلاً توقع نہ تھی۔ عزت اور ننگ و ناموس کسے عزیز نہیں۔ جان عزیز کسے پیاری نہیں۔ وہ اگر غیروں سے نہ ملتا تو کیا کرتا۔ اور اُن کی اوٹ میں جان نہ بچاتا تو کہاں جاتا۔ میں نے ابوالفضل و فیضی کے حال میں شیعہ وسنی کے معاملہ پر صلح وصلاحیت کے چند خیال لکھے ہیں۔ کہ شاید دونوں تلواروں کی تیزیاں کچھ گلاوٹ پر آئیں لیکن عجیب منحوس ساعت تھی جس وقت شیعہ وسنی کا فساد پڑا تھا۔ ۱۳ سو برس گذرے۔ اور طرفین نے ہزاروں صدمے اُٹھائے۔ اور اہل صلاحیت نے بھی بہتیرے ہی زور لگائے۔ مگر دونوں میں سے ایک بھی رستہ پر نہ آیا۔

(خلاصۂ تحریر ابوالفضل) اہل حسد ہر وقت جوش میں اُبلتے پھرتے۔ اور فساد کے چھتوں پر فتنہ کی بھڑیں اُمڈی رہتی تھیں لیکن جب اکبری سلطنت کے نور پھیلنے لگے۔ تو ۹۶۷ھ میں شیخ مبارک کے مدرسہ پر دانش و داد کا علم بلند ہوا۔ بزرگان روزگار نے شاگردی میں قدم جمائے۔ رجوع خلائق کے ہنگامے گرم ہوئے۔ اہل حسد گھبرائے کہ اگر نمونہ اُن اوصاف کا شاہ جوہر طلب تک پہنچا اور دلنشیں ہوگیا۔ تو ہمارے پرانے اعتباروں کی کب آبرو رہے گی۔ اور انجام اس کا کس رسوائی تک پہنچیگا۔ چنانچہ شیخ اپنے بڑھاپے اور علم وفضل کے سرور میں اور بیٹے جوشِ علم و جوانی کے نشے میں بےخبر بیٹھے تھے۔ کہ دشمنوں نے ایک سازش کی۔ اور اس کے سبب سے شیخ کو ایسی خطرناک مصیبتیں اُٹھانی پڑیں۔ کہ دل امان امان کرتا ہے۔ شیخ ابوالفضل نے کچھ تفصیل خود اکبرنامہ کے خاتمہ پر لکھی ہے۔ جس عبارت میں اس جادو بیاں

نے افسون گری کی ہے۔ اس کا خلاصہ بیں لانا محال ہے۔ خیر جہاں تک قلم میں طاقت ہے کوشش تو کرتا ہوں۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

علمائے حسد پیشہ بادشاہی دربار میں مکر و فریب کی جنس کو سوداگری میں لگا کر فتنہ اور فساد اُٹھائے تھے۔ مگر نیک اشخاص موجود تھے۔ نیکی کے پانی سے آگ بجھا دیتے تھے۔ اکبر کے ابتدائی زمانہ میں راستی پیشہ سچے ملنسار الگ ہو گئے تھے۔ شیطانوں اور فتنہ پردازوں نے قابو پائے۔ مقربان درگاہ کا سرگروہ عداوت پر کمر باندھ کر تیار ہوا (مخدوم مراد ہے یا صدر) پدر بزرگوار ایک دوست الٰہی کے گھر گئے تھے اور مَیں ساتھ تھا۔ کہ وہ مغرور تکبر فروش وہاں آیا۔ اور مسئلے بگھارنے لگا۔ مجھے جوانی کے نشہ میں عقل کی مستی چڑھی ہوئی تھی۔ آنکھ کھول کر مدرسہ ہی دیکھا تھا۔ بازار معاملات کی طرف قدم بھی نہ اُٹھایا تھا۔ اس کی بیہودہ بکواس پر قدرت نے میری زبان کھولی۔ مَیں نے بات کی نوبت وہاں تک پہنچائی۔ کہ وہ شرما کر اُٹھ گیا۔ اور دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ اسی وقت سے احمقانہ انتقام کی فکر میں پڑا۔ جو فتنہ گر ہار کر بیٹھ رہے۔ اُنہیں جا کر پھر بھڑکا دیا۔

والد بزرگوار ان کی دغابازیوں سے نچنت اور مَیں علم کے نشوں میں چور۔ دنیا پرست بے دینوں نے عقلمند دَغولیوں کی طرح حق گذاری اور دین آرائی کے رنگ میں جلسے جمائے۔ چند لالچیوں کے دلوں پر شبخون مار کر اکثروں کو گوشہ نشینی میں بھیج دیا۔ اور بندوبست کرنے لگے۔ ایک دورُخا۔ مکار۔ دوغلا دغاباز پیدا کیا۔ کہ روباہ بازی سے والد کی دانش نگاہ میں نیک بن کر گھسا ہوا تھا۔ اور اندر سے اودھر یک دل دو قالب تھا۔ دشمنوں نے اُسے ایک پٹی پڑھا کر اور بیہوشی کا منتر سکھا کر آدھی رات کو بھیجا۔ وہ شعبدہ باز نیرنگ ساز اندھیری رات میں منہ بسورتا آنکھوں میں آنسو۔ بڑے بھائی (فیضی) کے حجرہ میں پہنچا۔ اور طلسمات کے ڈھکوسلے سُنا کر بھائی بیچارے کو گھبرا دیا۔ اسے دغا و فریب کی کیا خبر۔ بہکاوے میں نہ آتا تو کیا کرتا۔ کہا یہ کہ بزرگانِ زمانہ مدت سے آپ کے دشمن ہو رہے ہیں۔ اور کھوٹے ناشکروں کو شرم آتی نہیں۔ آج اُنہوں نے قابو پا کر بلوہ کیا ہے۔ کچھ علماء مدعی کھڑے ہوئے ہیں۔ چند عمامہ بند گواہ ہوئے ہیں۔ اور جو طوفان باندھے ہیں۔ ان کے لئے حیلے

حوالے تیار کئے ہیں۔سب جانتے ہیں۔کہ ان شخصوں کو بارگاہِ مقدس میں کیسا درجۂ اعتبار ہے۔اپنی گرم بازاری کے لئے کیسے کیسے سرفرازوں کو اکھیڑ کر پھینک دیا۔اور کیا کیا ستم کئے ہیں۔میرا ایک دوست اُن کی رازگاہ میں ہے۔اُس نے اس آدھی رات میں آکر مجھے خبر دی۔میں بیقرار ہو کر ادھر دوڑا۔ایسا نہ ہو۔کہ تدارک کا وقت ہاتھ سے جاتا رہے۔صلاح یہ ہے۔کہ کسی کو خبر نہ ہو۔شیخ کو ابھی کہیں لے جا کر چھُپا دو۔ جب تک دوست جمع ہو کر حقیقت حال بادشاہ تک نہ پہنچائیں۔سب چُھپے رہیں۔بھائی سیدھا سادھا نیک ذات اُسے وہم زیادہ ہوا۔بے اوسان شیخ کی خلوت گاہ میں آیا۔اور حال بیان کیا۔شیخ نے فرمایا کہ دشمن تو غالب ہو رہے ہیں۔مگر خدا موجود ہے۔بادشاہ عادل سر پر ہے۔عقلائے ہفت کشور موجود ہیں۔اگرچند بے دیانت اور بے دینوں کو حسد کی بدمستی نے بےچین کیا ہے تو اصلیت بھی اپنی جگہ قائم ہے۔دریافت کا دروازہ بند نہیں ہو گیا۔اور یہ بھی سمجھ لو۔اگر تقدیر الٰہی میں ہمارا آزار نہیں لکھا تو سارے دشمن اُمنڈ آئیں۔بال بیکا نہ کر سکینگے۔اور دغا کا ایک داؤں نہ چلیگا۔ہاں خدا کی مرضی یہی ہے۔تو خیر۔ہم نے بھی اس خاک تودہ سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ہنستے کھیلتے نقد زندگی حوالے کر دیتے ہیں +

قسمت کی گردش نے عقل لے لی تھی۔غم و غصہ سپرد کر دیا تھا فیضی حقیقت طرازی کو افسانہ سرائی اور خوشی کے اُبھار کو سوگواری سمجھے۔چھری پر ہاتھ ڈال کر کہا۔کہ دنیا کے معاملے اَور ہیں۔اور تصوّف کی داستان اور شے ہے۔اگر آپ نہیں چلتے تو مَیں اپنا کام تمام کرتا ہوں۔پھر آپ جانئے۔مَیں تو روزِ بد نہ دیکھوں۔یہ سُنکر باپ کی محبت اُٹھ کھڑی ہوئی۔پیر نورانی کے جگانے سے مَیں بھی جاگا۔ مجبوراً اسی اندھیری رات میں تینوں پیادہ پا نکلے۔نہ کوئی راہبر۔نہ پاؤں میں طاقت۔ پدر بزرگوار چُپ نیرنگئے زمانہ کا تماشہ دیکھیں۔مَیں اور بھائی جانتے تھے۔کہ زمانہ کے کار و بار اور دنیا کے معاملوں میں ہم سے سوا نادان کون ہو گا۔گفتگو شروع ہوئی۔کہ جائیں تو کہاں جائیں۔جس کا وہ نام لیتے مَیں نہ مانتا۔جسے مَیں کہتا وہ اعتراض کرتے۔عقل حیران کہ کیا کیجئے۔ (ابوالفضل اس عالم میں کہتے ہیں) ؎

دشمناں دست کیں بر آوردند	دوستے مہرباں نمے یابیم
یک جہاں آدمی ہمے یابیم	مردمے درمیاں نمے یابیم
ہم بدشمن دروں گریزم ازانکہ	یاری از دوستاں نمے یابیم

مَیں ابھی نوجوان ناتجربہ کار صبح ولادت کا منہ نہار۔ خاکی بازار کا دوالیہ معاملات دنیا کے خواب و خیال سے خبر تک نہیں۔ بڑے بھائی ایک شخص کو صاحب حقیقت سمجھے ہوئے تھے۔ وہیں پہنچے۔ آسودہ دلوں کو دیکھ کر اس کا دل ٹھکانے نہ رہا۔ گھر سے نکل کر پچتایا۔ ہکا بکا رہ گیا۔ مگر مجبور، دم لینے کو جگہ بتائی۔ اُس ویرانہ میں گئے۔ تو اُس کے دل سے سوا پریشان۔ عجب حالت گذری۔ اور غضب غم و اندوہ چھایا۔ بڑے بھائی پھر بھی مجھ ہی پر جھنجھلانے لگے۔ کہ زیادہ عقل نے زیادہ خراب کیا۔ باوجود کمی تجربہ کے تم ٹھیک سوچے تھے۔ اب کیا علاج اور فکر کا رستہ کیا ہے۔ اور کہاں ہو کہ ذرا بیٹھ کر آرام کا سانس تو لیں۔ مَیں نے کہا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ اپنے کھنڈلے کو پھر چلو۔ گفتگو آن پڑے تو مجھے وکیل کر دو۔ یہ جو ارباب زمانہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کی چادریں اُتار لوں گا۔ اور بند کام کھُل جائیگا۔ والد نے کہا آفرین ہے۔ مَیں بھی اسی کے ساتھ ہوں۔ بھائی پھر بگڑے۔ اور کہا تجھے ان معاملوں کی خبر نہیں۔ ان لوگوں کی مکاری اور چھل بٹّوں کو تو کیا جانے۔ اب گھر کو چھوڑ دو۔ اور رستہ کی بات کہو۔ اگرچہ مَیں نے تجربہ کے جنگل نہیں پائے تھے اور نفع نقصان کا مزہ نہیں اُٹھایا تھا۔ مگر خدا نے دل میں ڈالی۔ مَیں نے کہا۔ دل گواہی دیتا ہے کہ اگر کوئی آسمانی بلا نہ آن پڑے تو فلاں شخص رفاقت کرے۔ ہاں کوئی سخت موقع آن پڑے۔ تو تھمنا بھی مشکل ہے۔ رات کا وقت اور وقت تنگ۔ دل پریشان۔ خیر ادھر ہی قدم اُٹھائے۔ پاؤں میں آبلے۔ دلدل اور رپٹن کے میدان، چلے جاتے تھے۔ مگر توبہ توبہ کرتے جاتے کہ کیا وقت ہے۔ توکل کی رسی مٹھی سے نکلی ہوئی۔ مایوسی کی راہ سامنے۔ ایک عالم اپنا متلاشی۔ قدم بھی مشکل سے اُٹھتا تھا۔ اور سانس سخت جانی ہی سے آتا تھا۔ عجب حالت تھی۔ رات ہے تو خطرناک۔ کل ہے تو روز قیامت۔ بد ذاتوں کا سامنا۔ غرض صبح ہوتے اس کے دروازے پر پہنچے۔ وہ گرمجوشی سے ملا۔ اچھے خلوت خانہ میں اُتارا غم ہائے

گوناگوں ذرا الگ ہوئے۔ دو دن نچنت گذرے اور کچھ خاطر جمع سے بیٹھے۔ مگر بیٹھنا کہاں۔ خبر آئی کہ آخر حسد کے جلوتروں نے شرم کا پردہ پھاڑ کر دل کے پھپھولے پھوڑے۔ پکے دغولیوں کی چال چلے ہیں۔ جس رات ہم گھر سے نکلے۔ صبح کو عرض معروض کر کے بادشاہ کو بھی بامزہ کیا۔ اُنہوں نے حکم دیا۔ کہ ملکی اور مالی کام تو بے تمہاری صلاح کے چلتے نہیں۔ یہ تو خاص دین و آئین کی بات ہے۔ اس کا سرانجام تمہارا کام ہے۔ محکمہ عدالت میں بلاؤ۔ جو شریعت فتوے دے۔ اور بزرگان زمانہ قرار دیں وہ کرو۔ انہوں نے جھٹ بادشاہی چوبداروں کو ہلکار کر بھیج دیا۔ کہ پکڑ لاؤ۔ حال انہیں ہی معلوم تھا۔ ڈھونڈھ بھال میں بہت عرقریزی کی۔ کچھ بدذات شیطان ساتھ کر دیئے تھے۔ گھر میں نہ پایا۔ تو جھوٹ بات کو سچ بنا کر گھر کو گھیر لیا۔ پہرے بٹھا دیئے۔ اور شیخ ابوالخیر (چھوٹے بھائی) ناسمجھ لڑکے کو گھر میں پایا۔ اسی کو پکڑ کر لے گئے۔ ہماری روپوشی کے افسانے کو بڑی آب و تاب سے عرض کیا۔ اور اُسے اپنی باتوں کی تائید سمجھے۔ خدا کی قدرت دیکھو۔ بادشاہ نے سُن کر خود فرمایا۔ کہ شیخ کی عادت ہے۔ سیر کو نکل جاتا ہے۔ اب بھی کہیں گیا ہوگا۔ ایک درویش گوشہ نشین ریاضت کیش۔ دانش اندیش پر اتنی سخت گیری کیوں؟ اور بے فائدہ اُلجھنا کس لئے اس بچہ کو ناحق لے آئے۔ اور گھر پر پہرے کیوں بٹھا دئے؟ اسی وقت بھائی کو چھوڑ دیا۔ اور پہرے بھی اُٹھ آئے۔ گھر پر امن و امان کی ہوا چلی۔ ابھی نحوست رستہ میں تھی۔ اور وہم غالب تھا۔ روز اُلٹی سلٹی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ پھر چھپنا ہی مصلحت سمجھے۔

اب کمینے بدذات شرمائے۔ مگر سوچے کہ اس وقت یہ آوارہ و سرگردان پھر رہے ہیں۔ ان کا کام تمام کر دینا چاہیئے۔ دو تین سینہ سیاہ بھیجو۔ کہ جہاں پائیں فیصلہ کر دیں۔ انہیں ڈر یہ ہوا تھا۔ کہ مبادا بادشاہ کے الفاظ سُن کر حضور میں آموجود ہوں۔ اور دین و داد کے دربار کو عقل کے اُجالے سے روشن کر دیں۔ اس لئے بادشاہ کے جواب کو چھپایا۔ دہشت اور وحشت کی ہوائیاں اُڑا کر بھولے بھالے دوست اور زمانہ ساز یاروں کو ڈرا دیا۔ رنگ برنگ کے بانے باندھے۔ ان کا یہ عالم ہوا۔ کہ اندیشہ ہائے دور دراز میں ڈانواں ڈول ہو کر امداد خیالی سے بھی بھاگنے لگے۔

ایک ہفتہ گذرا تو صاحب خانہ نے گھبرا کر آنکھیں پھیریں۔ اور اُس کے نوکروں نے بھی فرش مروّت کو اُلٹ دیا۔ وہموں کی سلوٹوں میں ہماری عقل بھی دب گئی۔ خیال یہ ہؤا کہ دربار والی خبر جو سُنی تھی۔ شاید جھوٹ ہو۔ اور بادشاہ خود متلاشی ہوں وقت بُرا ہے۔ زمانہ پیچھے پڑا ہوا ہے۔ مبادا یہ گھر والا ہی پکڑوا دے۔ عجب غم و اندوہ دل پر چھایا اور بڑا اندیشہ ہؤا۔ میں نے کہا اتنا تو میں جانتا ہوں۔ کہ دربار والی خبر ضرور صحیح ہے۔ نہیں تو بھائی کو کیوں چھوڑا۔ اور پہرے گھر سے کیوں اُٹھے۔ امن و امان کے زمانہ میں ہزاروں ہوائیاں اُڑاتے تھے۔ اور اچھے اچھے اشراف کمر باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اب تو دنیا میں آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ گھر والا اگر ڈر اُٹھا تو عجب کیا ہے اور یہ بھی سمجھ لو کہ اُسے ہمارا پکڑوانا ہوتا۔ تو ظاہر داری کو نہ بدلتا۔ اور اس میں دیر کیوں کرتا ہاں یہ ہے کہ بہت سے شیطانوں نے اسے بولا دیا ہے۔ اور نوکروں کو گھبرا دیا ہے کہ ہم تلخی و بدخوئی دیکھ کر نکل جائیں۔ اور اس کا پیچھا چھوڑ دیں +

ہوش و حواس ٹھکانے کر کے پھر صلاح سوچنے لگے۔ روز مصیبت کو دیکھا تو کل کی رات سے بھی سوا اندھیرا تھا۔ بُرا وقت سامنے آیا۔ پہلے جان پہچان نکالنے اور حال کی رائے لگانے پر مجھے سب نے آفرین کی۔ اور آئندہ کے لئے ستونِ مشورت قرار دیا۔ خورد سالی سے قطع نظر کر کے عہد کیا کہ اب اس کے خلاف رائے نہ کرینگے۔ شام ہوئی تو اس ویرانے سے نکلے۔ دل ہزار پارہ۔ دماغ شوریدہ۔ سینہ زخم اندوز۔ خاطر گرانبار اندوہ رفیق خیال میں نہیں۔ پاؤں میں زور نہیں۔ پناہ کا ٹھکانہ نہیں۔ زمانہ میں امن و امان نہیں۔ ایک قصبہ نظر آیا۔ اس بھوت نگر اندھیر پورے میں بجلی سی چمکی۔ اور چہرۂ نشاط کا رنگ نکھرا۔ (ایک شاگرد کا گھر معلوم ہؤا) دل خوش ہو گئے وہاں جا کر ذرا آرام کا سانس لیا۔ ہر چند گھر اس کے دل سے سوا تنگ اور دن پہلی رات سے بھی اندھیرا تھا۔ مگر ذرا دم لیا۔ اور بے ٹھکانے سرگردانی سے ٹھکانے ہوئے گوشہ میں فکر دوڑنے لگے۔ اور عقلیں سوچ میں لمبے لمبے قدم مارنے لگیں +

جب آرام کی جگہ اور اطمینان کا منہ کسی طرف نظر نہ آیا۔ تو میں نے جواب کی عبارت اس طرح سجائی۔ کہ یہ اچھے اچھے دوست اور پرانے شاگرد۔ خوش اعتقاد مریدوں کا حال چند ہی روز میں روشن ہو گیا۔ اب صلاح وقت ہے۔ کہ یہ

شہر وبال خانۂ عقل اور گزندگاہِ کمال ہے۔ یہاں سے نکل چلیں۔ ان دوستوں اور بے استقلال آشناؤں سے جلد کنارے ہوں۔ خوب دیکھ لیا۔ ان کی وفاداری کا قدم ہوا پر ہے۔ اور پائداری کی بنیاد موجِ دریا پر۔ اور شہر کو چلو۔ کہیں خلوت کا گوشہ ملے۔ کوئی انجان خوش سعادت اپنی پناہ میں لے۔ وہاں سے بادشاہ کا حال معلوم ہو۔ مہر و قہر کا اندازہ ٹٹولیں۔ گنجائش ہو تو نیک اندیش انصاف طرازوں سے پیام سلام ہوں۔ زمانہ کا رنگ ڈھنگ دیکھیں۔ وقت مدد کرے اور بخت یاری دے تو اچھا۔ نہیں تو میدانِ عالم تنگ نہیں پیدا ہوا۔ پرندہ تک کے لئے گھونسلہ اور شاخ ہے اسی منحوس شہر پر قیامت کے قبالے نہیں لکھے۔ ایک اور امیر دربار سے اپنے علاقہ کو رخصت ہوا ہے۔ اور آبادی کے پاس اُترا ہے۔ اُسی کے روزنامۂ احوال میں کچھ نور کی سطریں نظر آتی ہیں۔ سب سے ہاتھ اُٹھاؤ۔ اور اُس کی پناہ میں چلو۔ مقام بھی بے نشان ہے۔ شاید ذرا آرام ملے۔ اگرچہ دنیاداروں کی آشنائی کا بھروسہ نہیں۔ مگر اتنا تو ہے۔ کہ ان فتنہ پردازوں سے اُس کا لگاؤ نہیں۔

بڑے بھائی بھیس بدل کر اُس کے پاس پہنچے۔ وہ سُنکر بہت خوش ہوا۔ اور ہمارے آنے کو غنیمت سمجھا۔ خوف و خطر کا زور تھا۔ اس لئے بھائی کئی ترک دلاوروں کو ساتھ لینے آئے۔ کہ بدذات ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ رستہ میں کوئی آفت پیش نہ آئے۔ اندھیری رات مایوسی کی چادر اوڑھے پڑی تھی۔ کہ وہ دل آگاہ پھر کر آیا۔ اور آرام کی خوشخبری اور آسودگی کا پیام لایا۔ اسی وقت بھیس بدل کر روانہ ہوئے۔ اور رستے سے الگ الگ اس کے ڈیرہ میں داخل ہوئے۔ اس نے نہایت اطمینان اور عجب خوشی ظاہر کی۔ آسائش نے مژدہ سعادت سُنایا۔ دن آرام سے گذرا۔ زمانہ کے فتنہ و فساد سے خاطر جمع بیٹھے تھے کہ یکایک جو پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے بھی سخت تر بلا آسمان سے برس پڑی۔ یعنی امیر مذکور کے لئے دربار سے پھر طلب آئی۔ لوگوں نے جس شراب سے پہلے احمق کو بدحواس کیا تھا۔ اس بھولے بھالے کو بھی بولا دیا۔ اُس نے آشنائی کا ورق ایسا دفعتہً اُلٹ دیا۔ کہ رات ہی کو وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک اور دوست کے گھر آئے۔ اس نے تو پیر نورانی کے آنے کو ورود مبارک سمجھا۔ مگر ہمسایہ میں ایک بدذات فتنہ پرداز تھا۔ اس لئے بہت گھبرایا۔

اور حیرت نے باولا بنا دیا۔ جب لوگ سو گئے۔ تو یہاں سے بھی نکلے۔ اور بے ٹھکانے نکلے۔ ہر چند فکر دوڑائے۔ اور دل ٹھکانے کر کے ذہن لڑائے۔ کوئی جگہ سمجھ میں نہ آئی۔ ناچار دل ڈانواں ڈول۔ خاطر غم آلود۔ اسی امیر کے ڈیروں میں پھر آئے۔ عجیب تر یہ کہ وہاں کے لوگوں کو ہمارے نکلنے کی خبر بھی نہ تھی۔ خیر بے آس۔ بے سہارے تھوڑی دیر حواس جمع کر کے بیٹھے۔ بڑے بھائی کی رائے ہوئی۔ کہ عقل کی رہنمائی نہ تھی۔ وہم کی سرگردانی تھی جو یہاں سے نکلے تھے۔ ہر چند میں نے کہا۔ کہ اس کی حالت کا رنگ بدلنا اور نوکروں کا آنکھ پھیرنا صاف دلیل ہے۔ مگر اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا۔ امیر مذکور کی بدمزگی بڑھتی جاتی تھی۔ مگر کچھ ہو بھی نہ سکتا تھا۔ جب اس اوچھے تنگ ظرف دیوانہ مزاج نے دیکھا۔ کہ یہ قباحت کو نہیں سمجھتے۔ اور خیمہ سے نہیں نکلتے۔ تو روز روشن۔ نہ بات کی نہ صلاح کوچ کر گیا۔ پیسہ کے بندے (نوکر چاکر اُس کے) خیمہ اُکھاڑ روانہ ہوئے۔ ہم تینوں میدان خاک پر بیٹھے رہ گئے۔ عجب حالت ہوئی۔ نہ جانے کو راہ۔ نہ ٹھیرنے کو جگہ۔ پاس اسپ فروشی کا بازار لگا تھا۔ نہ کوئی پردہ نہ کچھ اوٹ۔ چار طرف یا تو دو رُخے آشنا اور دشمنان صد رنگ تھے۔ یا ناواقف کرخت پیشانی یا بدعہد بے وفا دوڑتے پھرتے تھے۔ ہم دشت بے پناہ میں خاک بیچارگی پر بیٹھے۔ حال بدحال صورت پراگندہ۔ زمانہ ڈراونا۔ غم و اندوہ کے لمبے لمبے کوچوں میں خیالات ڈانواں ڈول پھرنے لگے +

اب اُٹھنے کے سوا چارہ کیا تھا۔ ناچار چلے۔ بد اندیشوں کی بھیڑ میں بیچوں بیچ سے ہو کر نکلے۔ حفاظت الٰہی نے اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اسی پر توکل کیا۔ اُس خطرگاہ سے باہر آئے۔ اب ہمراہی و دمسازی کی عمارت کو دریا برد کیا۔ بیگانوں کی ملامت اور آشناؤں کی صاحب سلامت کو سلام کر کے ایک باغیچہ میں پہنچے۔ یہ چھوٹی سی جگہ بڑی پناہ گاہ کا گھر معلوم ہوا۔ گئے ہوش ٹھکانے آئے۔ اور عجب قوت حاصل ہوئی۔ مگر یہ معلوم ہوا۔ ادھر بھوتوں کا گزر ہے (جاسوس) اور اُنھوں نے پھرتے پھرتے تھک کر یہیں کہیں دم لیا ہے۔ الٰہی پناہ۔ دل پارہ پارہ۔ حالت پریشان وہاں سے بھی نکلے۔ غرض جہاں جاتے تھے بلائے ناگہانی ہی نظر آتی تھی۔ دم لیتے تھے اور بھاگ نکلتے۔ گھبراہٹ کی دوڑا دوڑ اور اندھوں کی بھاگا بھاگ تھی۔ اس عالم میں

ایک باغبان ملا۔ اس نے پہچان لیا۔ ہم گھبرا گئے۔ اور ایک سناٹے کا عالم ہو گیا۔ قریب تھا کہ دم نکل جائے۔ مگر اُس سعادت مند نے بڑی تسلی دی۔ اپنے گھر لایا۔ بیٹھ کر غمخواری کی۔ اگرچہ بھائی کا اب بھی ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ مگر میرا دل خوش ہوتا تھا۔ اور خوشی بڑھتی جاتی تھی۔ اس کی خوشامد سے دوستی کے ورق پڑھ رہا تھا۔ اور پیر نورانی کے خیالات خدا سے لو لگائے سجادۂ معرفت پر ٹہل رہے تھے۔ اور نیرنگئ تقدیر کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ کچھ رات گئے پھر باغ والا آیا۔ اور شکایت کرنے لگا۔ کہ مجھ جیسے مخلص معتقد کے ہوتے اس شورش گاہ میں آپ کہاں رہے؟ اور مجھ سے کنارہ کیوں کیا؟ فی الحقیقت یہ بیچارہ جتنا نیک تھا۔ میرے قیاس میں اتنا نہ تُلا تھا۔ ذرا دل شگفتہ ہؤا۔ مَیں نے کہا دیکھتے ہو۔ طوفان آیا ہؤا ہے۔ یہی خیال ہؤا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ دوستوں کو ہمارے سبب سے دشمنوں کا آزار پہنچے۔ وہ بھی ذرا خوش ہؤا۔ اور کہا اگر میر کھنڈلا پسند نہیں تو اور جگہ نکالتا ہوں۔ نچنت ہو کر وہاں بیٹھو۔ ہم نے منظور کیا۔ وہاں جا اُترے۔ اور جیسا جی چاہتا تھا۔ ویسی ہی خلوت پائی۔ گھر والوں کی بھی خاطر جمع ہوئی۔ کہ جیتے تو ہیں۔ ایک مہینے سے زیادہ اس آرام خانہ میں رہے۔ یہاں سے آشنایان با انصاف اور دوستان با اخلاص کو خط لکھے۔ ہر شخص کو خبر ہوئی۔ اور تدبیریں کرنے لگا۔ ادھر بھائی نے ہمت کی کمر باندھی۔ پہلے آگرہ اور وہاں سے فتح پور پہنچے کہ اردوے معلےٰ میں جو دوست تدبیروں میں دلسوزی کر رہے ہیں اُنہیں اور گرمائیں۔ ایک دن صبح کا وقت تھا۔ کہ محبت کا پتلا دور اندیش بھائی ہزاروں غم و اندوہ کو رفاقت میں لئے پہنچا۔ زمانۂ سنگدل کا پیام لایا کہ بزرگان دربار میں سے ایک شخص نے شیاطین کی افسانہ سازی کا حال سُن کر مارے غصہ کے نیازمندی اور آداب کے نقاب منہ سے اُلٹ دیئے تند اور سخت تقریر سے عرض کیا کہ حضور! کیا آخری دَور تمام ہوتا ہے؟ قیامت آ گئی؟ حضور کی بادشاہی میں بدکار بدماغوں کو فراغتیں ہیں۔ اور نیک مردوں کو سرگردانی۔ یہ کیا قانون چل رہا ہے۔ اور کیسی خدا کی ناشکری کی ہے۔ بادشاہ نے نیک نیتی پر رحم کر کے فرمایا۔ کس کا ذکر کرتے ہو؟ اور کس شخص سے تمہاری مراد ہے؟ خواب دیکھا ہے یا دماغ عقل پریشان ہو رہا ہے۔ جب اُس نے

نام لیا تو حضرت اُس کی کج فہمی پر بگڑے اور کہا۔ کہ اکابران زمانہ نے اُس کی دل آزاری اور جان کھونے پر کمر باندھ کر فتوے تیار کئے ہیں۔ مجھے ایک دم چین نہیں دیتے اور میں جانتا ہوں کہ آج شیخ وہاں موجود ہے (صاف ہمارے مقام کا نام لے دیا) مگر جان کر انجان بنتا ہوں۔ کسی کو کچھ کسی کو کچھ کہہ کر ٹال دیتا ہوں۔ تجھے خبر نہیں یوں ہی اُبلا پڑتا ہے۔ اور حد سے بڑھا جاتا ہے۔ صبح آدمی بھیج کر شیخ کو حاضر کرو۔ اور علماء کا ہنگامہ جمع ہو۔ بڑے بھائی نے یہ شورش سنتے ہی راتوں رات یلغار کر کے اپنے تئیں ہمارے پاس پہنچایا۔

ہم نے پھر وہی بھیس بدلا۔ کسی کو خبر نہ کی۔ اور (آگرہ کو) چل کھڑے ہوئے مگر ایسی پریشانی ہوئی کہ تمام ایام نحوست میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ کھل گیا تھا کہ لوگ کہاں تک ساتھ ہیں۔ اور دادگر شہریار سے کیا کیا کہا ہے۔ اور غیب دان کو کتنی خبر ہے۔ لیکن پریشانی نے سخت بولا دیا۔ کہ خدا جانے وقت پر اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ پہلے موت کے منہ سے بھاگے جاتے تھے۔ اب موت کے منہ میں چلنے لگے۔ اندھیری رات۔ آوارگی کا رستہ۔ چپ چاپ سناٹے کے عالم میں چلے جاتے تھے۔ کہ آفتاب نے دنیا کو نورستان کیا۔ اب یہ عالم کہ بدگوہر اندھیرچیوں کا ہجوم۔ شہر کا رستہ۔ بدذات جاسوسوں کا ہنگامہ۔ یار و یاور کوئی نہیں۔ اُترنے کو جگہ نہیں۔ زبان فصیح لڑکھڑائی جاتی ہے۔ زبان شگافتہ رسل بے چارہ کیا لکھ سکے۔ گھبرائے بولائے۔ ایک ویران کھنڈر میں گھس گئے۔ شہر کے شور و شر اور دشمنوں کی نظر سے ذرا آسودہ ہوئے۔ بادشاہ عالم کی نوازش کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ سب کی رائے ہوئی کہ گھوڑوں کا سامان کریں۔ اور یہاں سے فتح پور سیکری کو چلیں۔ وہاں فلانے شخص سے قدیمی صداقت کا سلسلہ ہے۔ اُنہیں کے گھر جا بیٹھیں۔ یہ غوغا تھم جائے۔ اور بادشاہ عنایت فرمائیں۔ پھر دیکھ لینگے۔

غرض معقول لوگوں کی طرح سامان کر کے رات کو روانہ ہوئے۔ وہ حاسدوں کے خیالات سے بھی اندھیرے اور بدذاتیوں کے افسانہ سے کہیں لمبے تھے۔ چلے جاتے تھے۔ راہبر کی بیوقوفی اور کج روی میں بھٹکتے بھٹکتے صبح ہوتی تھی۔ کہ اُس اندھیر خانہ میں پہنچے۔ وہ نادان جگہ سے تو نہ پھسلا۔ مگر ایسے ڈراونے ڈھکوسلے

سُنائے کہ بیان نہیں ہو سکتے۔ مہربانی کے رنگ میں کہا۔ کہ اب وقت گذر گیا۔
اور بادشاہ کا مزاج تم سے برہم ہو گیا۔ پہلے آ جاتے تو کچھ صدمہ نہ پہنچتا۔ مشکل کام
آسانی سے بن جاتا۔ پاس ہی ایک گاؤں ہے۔ جب تک بادشاہ نوازش پر مائل ہوں
وہاں چند روز بسر کرو۔ گاڑی پر بٹھایا اور روانہ کر دیا۔

مصیبت در مصیبت پیش آئی۔ وہاں پہنچے تو جس زمیندار کی اُمید پر بھیجا
تھا وہ گھر میں نہ تھا۔ اس اُجاڑ نگری میں جا اُترے۔ مگر بے جا۔ وہاں کے داروغہ
کو کوئی کاغذ پڑھوانا تھا۔ اُس نے پیشانی سے دانائی کے آثار معلوم کر کے بُلا بھیجا
وقت تنگ تھا۔ ہم نے انکار کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہوا۔ کہ یہ گاؤں تو ایک
سنگدل بدمغز کا ہے۔ اُنھوں نے بیوقوفی کی کہ یہاں بھیجا۔ ہزار بیقراری اور غم و اندوہ
کے ساتھ جانوں کو وہاں سے نکالا۔ ایک انجان سا رہبر ساتھ تھا۔ بھولتے بھٹکتے
آگرہ کے پاس ایک گاؤں میں آکر اُترے کہ وہاں ایک گھر میں آشنائی کی بُو آتی
تھی۔ اُس دن کے راہ رستے لپیٹ سپیٹ کر تیس کوس راہ چلے۔ وہ بھلا مانس بڑی
مروّتوں سے پیش آیا۔ مگر معلوم ہوا۔ کہ ایک جھگڑالو جعلساز کی زمین وہاں ہے اور
کبھی کبھی ادھر بھی آن نکلتا ہے۔ آدھی رات تھی کہ اندوہناک دلوں کو لے کر یہاں
سے بھی بھاگے۔ صبح ہوتے شہر میں پہنچے۔ ایک دوست کے گھر میں امن کا گوشہ
پایا۔ نامرادی کا خاکدان۔ فراموشی کی خوابگاہ۔ نااہلی کا بھوت نگر۔ کم ظرفی کا گنج بورہ
تھا۔ ذرا آرام سے دم لیا۔ دم بھر نہ گذرا تھا۔ کہ اس بے مروّت خدا آزار۔ خود مطلب
نے یہ سُرسُری چھوڑی۔ کہ ہمسایہ میں ایک، فتنہ کار بد روزگار رہتا ہے۔ نئی بلا نظر آئی۔
اور عجب مصیبت نے شکل دکھائی۔ پاؤں دوڑا دوڑ سے۔ سر راتوں کے سفر سے۔
کان گھڑیالوں سے۔ آنکھیں بیخوابی سے فرسودہ ہو گئی تھیں۔ عجیب درد و غم دل پر
چھایا۔ اور رنج کا پہاڑ چھاتی پر آن پڑا۔ سب کے فکر سوچ بچار میں لگ گئے۔
صاحب خانہ اِدھر اُدھر جگہ ڈھونڈتا پھرے۔ دو دن عجب کشاکش میں بسر ہوئے۔
ہر سانس یہی کہتا تھا کہ دم آخر ہوں۔

پیر نورانی کو ایک سعادت مند کا خیال آیا۔ اور صاحب خانہ نے بڑی جستجو
سے اس کا گھر نکالا۔ اتنی بات بھی ہزاروں سلامتی کے شادیانے تھے۔ اُسی وقت

اس کی خلوت گاہ میں پہنچے۔ اُس کی شگفتہ روی اور کشادہ پیشانی سے دل خوش ہوگیا اُمیدوں کے گلبن پر کامیابی کی نسیم لہرانے لگی۔ اور چہرۂ حال پر اور ہی شگفتگی آئی۔ اگرچہ مریدنہ تھا۔ مگر سعادت کے ذخیرے بھرے ہوئے تھے۔ گمنامی میں نیک نامی سے جیتا تھا۔ کم مائیگی میں امیری سے رہتا تھا۔ تنگ دستی میں دریادلی کرتا تھا۔ بڑھاپے میں جوانی کا چہرہ چمکاتا تھا۔ اس کے ہاں خلوت گاہ پسندیدہ ہاتھ آئی۔ تدبیریں ہونے لگیں۔ اور پھر خطوط بازی شروع ہوئی۔ اس آرام آباد میں دو مہینے ٹھیرے۔ بارے مقصود کا دروازہ کھُلا۔ خیراندیش حق طلب مدد کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور کاروانِ اقبال مندیا وری کرنے کو بیٹھ گئے۔ اوّل تو میل ملاپ کی میٹھی میٹھی باتوں سے فتنہ ساز۔ حیلہ پرداز اور کھوٹے بداعمالوں کو پرچایا۔ اور پتھروں کو موم کیا۔ پھر شیخ کے کمالات اور نیکیاں اور خوبیاں ایک خوبصورتی کے ساتھ حضور تک پہنچائیں۔ اورنگ نشین اقبال نے دُور بینی اور قدرشناسی کی رُو سے جواب دیئے۔ کہ محبّت سے لبریز تھے۔ بزرگی اور مردمی کے رستہ سے بُلا بھیجا۔ میرا تو اُن دنوں تعلق دنیا کی طرف سر جُھکتا ہی نہ تھا۔ پیر نورانی بڑے بھائی کو ساتھ لے کر دربار ہمایوں میں گئے۔ رنگا رنگ کی نوازشوں سے رتبے بڑھے۔ یہ دیکھتے ہی ناشکروں میں سنّاٹا ہؤا۔ بھڑوں کا چھتّا چُپ چاپ ہو گیا۔ اور عالم کا تلاطم تھم گیا۔ درس کا ہنگامہ گرم ہؤا۔ خلوت گاہِ تقدّس کی آئین بندی ہوئی۔ نیک مردوں کے قانون زمانہ نے جاری کئے۔ (ابوالفضل اُس عالم میں کہتے ہیں)*

اے شب نہ کنی آں ہمہ پرخاش کہ دوش	رازِ دل من چُناں مکُن فاش کہ دوش
دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم	ہاں اے شبِ وصل آں چناں باش کہ دوش

حضرت دہلی کے شوقِ طواف نے پیرِ نورانی کا دامن کھینچا۔ مجھے چند شاگردوں کے ساتھ لے گئے۔ جب سے آگرہ میں آکر بیٹھے تھے۔ اس گوشۂ نورانی میں عالم معنی پر اس قدر خیال جما تھا۔ کہ عالم صورت پہ نگاہ کی نوبت نہ آتی تھی یکبارگی عالم سفلی کے مطالعہ نے دل کا گریبان پکڑا۔ اور ہمّت کا دامن پھیلایا۔ کہ رشتۂ خاکی کے علاوہ میرے ساتھ پیوند معنی تھا۔ مجھے کہا کرتے تھے۔ کہ خاندان کی ابوالآبائی تیرے نام رہی۔ مجھ سے راز کی گٹھڑی کھولی۔ کہ آج مجھے جانماز پر نیند آگئی۔ کچھ جاگتا تھا۔

کچھ سوتا تھا۔ انوار سحری میں خواجہ قطب الدین اور شیخ نظام الدین اولیا خواب میں آئے۔
بہت سے بزرگ جمع ہوئے۔ وہاں بزم مصالحت جمع ہوئی۔ اب عذر خواہی کے لئے
اُن کے مزاروں پر چلنا مناسب ہے۔ کہ چند روز اس سرزمین میں اُن کے طور پر
مصروف رہیں۔ والد مرحوم اپنے بزرگوں کے طریقہ کے بموجب مسائل ظاہری کی
بہت حفاظت کرتے تھے۔ طنبور و ترانہ اصلا نہ سنتے تھے۔ حال قال جو صوفیوں
میں عام ہے پسند نہ کرتے تھے۔ اس رنگ کے لوگوں کو مطعون کرتے تھے۔ خود
بہت پرہیز کرتے تھے۔ اور سخت ممانعت فرماتے تھے۔ اور دوستوں کو روکتے
تھے۔ ان بزرگوں نے اس رات اس یزداں پرست، کا دل لُبھا لیا۔ (یہ بھی سب کچھ
سُننے لگے)، بہت سے بزرگ اس گلزار زمین (دلّی) میں پڑے سوتے تھے۔ ان کی
خاک پر گذر ہؤا۔ دل پرنور کے طبقے کھُل گئے اور فیض پہنچے۔ اگر اس سرگذشت کی
تفصیل لکھوں تو دنیا کے لوگ کہانی سمجھینگے۔ اور بدگمانی سے گنہگار کرینگے۔ یہانتک
کہ مجھے بھی زاویۂ تجرّد سے بارگاہِ تعلّق میں لے گئے۔ دولت کا دروازہ کھولا۔ اعزاز کا مرتبہ
بلند ہؤا۔ اور حرص کے متوالے حسد کے لوٹے مارے لوگ دیکھ کر بولا گئے۔ میرے
دل کو درد اور اُن کے حال پر رحم آیا۔ اور خدا سے عہد کیا۔ کہ ان اندھوں کی زیاں کاریوں کا
خیال دل سے بھُلا دوں۔ بلکہ اس کے عوض میں نیکی کے سوا کچھ خیال نہ کروں۔ توفیق الٰہی
کی مدد سے اس خیال میں غالب رہا۔ مجھے عجیب خوشی اور سب کو اور ہی طاقت حاصل
ہوئی۔ اُن کی بلند پروازیاں تو دیکھ لیں۔ اب ملّا صاحب کی بھی دو دو باتیں سُن لو۔ کہ
اتنے اونچے سے کس طرح نیچے پھینکتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

جن دنوں میر حبش وغیرہ اہل بدعت (شیعہ) گرفتار اور قتل ہوئے۔ ان دنوں
شیخ عبد النبی صدر اور مخدوم الملک وغیرہ تمام علماء نے متفق اللفظ و المعنے ہو کر عرض کی۔
کہ شیخ مبارک مہدوی بھی ہے اور اہل بدعت (شیعہ) بھی ہے۔ گمراہ ہے اور گمراہ کرتا ہے
غرض برائے نام اجازت لے کر درپے ہوئے کہ بالکل رفع دفع کر کے کام تمام کر دیں۔
محتسب کو بھیجا کہ شیخ کو گرفتار کر کے حاضر کرے۔ شیخ بچوں سمیت روپوش ہو گیا تھا۔
وہ ہاتھ نہ آیا۔ اس لئے اُس کی مسجد کا ممبر ہی توڑ ڈالا۔ شیخ سلیم چشتی ان دنوں جاہ و جلال
کے اوج پر تھے۔ شیخ مبارک نے اوّل اُن سے التجا کر کے شفاعت چاہی۔ شیخ نے بعض

خلفا کے ہاتھ کچھ خرچ اور پیغام بھیجا کہ یہاں سے تمہارا نکل جانا مصلحت ہے۔ گجرات چلے جاؤ۔ اُنہوں نے نااُمید ہو کر مرزا عزیز کوکہ سے توسّل نکالا۔ اس نے ان کی مُلّائی اور درویشی کی تعریف کی۔ لڑکوں کی فضیلت کا حال بھی عرض کیا اور کہا کہ مرد متوکل ہے کوئی زمین حضور کے انعام کی نہیں کھاتا۔ ایسے فقیر کو کیا ستانا؟ غرض مخلصی ہو گئی۔ گھر آئے اور ویران مسجد کو آباد کیا +

شیخ مبارک کا نصیبہ نحوست سے نکاح کئے بیٹھا تھا۔ ۶۳ برس کی عمر میں مبارکی آئی۔ اور انہیں دیکھ کر مُسکرائی یعنی ۹۷۴ھ میں شاعری کی سفارش سے فیضی دربار میں پہنچے۔ ۹۸۱ھ میں ابوالفضل جا کر میر منشی ہو گئے۔ اور جس عمر میں لوگ سترّے بہترّے کہلاتے ہیں۔ پیر نورانی جوانی کا سینہ اُبھار کر اپنی مسجد میں چہل قدمی کرنے لگے +

اب اقبال و ادبار کی کشتی دیکھو۔ جوان عقلوں نے حریفوں کی بوڑھی تدبیروں کو کیونکر پچھاڑا۔ اُدھر تو ابوالفضل اور فیضی کی لیاقتیں انہیں ہاتھوں ہاتھ آگے بڑھا رہی تھیں اور مصلحت اُنہیں وہ رستے دکھاتی تھی۔ کہ اکبر بلکہ زمانہ کے دل پر اُن کی دانائی کے نقش بیٹھ رہے تھے۔ ادھر شیخ الاسلام (مخدوم الملک) اور شیخ صدر سے ایسی باتیں ہونے لگیں جن سے خود بخود ہوا بگڑ گئی۔ اکبر کی قدر دانی اور جوہر شناسی سے دربار میں بہت عالم ہندوستان ایران و توران کے آ کر جمع ہو گئے۔ چار ایوان کا عبادت خانہ علم کا اکھاڑا تھا راتوں کو علمی جلسے ہؤا کرتے۔ اکبر خود آ کر شامل ہوتا۔ علمی مسائل پیش ہوتے تھے۔ اور دلائل کی کسوٹی پر کسے جاتے تھے۔ جو جو ایذائیں اُن بزرگوں کے ہاتھوں باپ نے عمر بھر سہی تھیں اور انہوں نے بچپن میں دیکھی تھیں وہ بھُولی نہ تھیں۔ اس لئے ہمیشہ گھات میں لگے رہتے تھے۔ اور حریفوں کی شکست کے لئے ہر مسئلہ میں دلائل فلسفی اور خیالات عقلی سے غلط مبحث کر دیتے تھے۔ بوڑھوں کی بوڑھی عقل اور بوڑھی تہذیب کو جوانوں کی جوان عقل) اور جوان تہذیب دبائے لیتی تھی۔ اور بے اقبالی بڈھوں کا ہاتھ پکڑے ایسے رستوں پر لئے آجاتی تھی جس سے خود گر گر پڑتے تھے +

اسے شیخ مبارک کی دور اندیشی کہو۔ خواہ علو ہمت سمجھو۔ یہ بڑی دانائی کی۔ کہ باوجود بیٹوں کے علو اقتدار اور کمال جاہ و جلال کے آپ دربار کی کوئی خدمت نہ لی۔ مگر عقل کے پتلے تھے۔ کبھی کبھی صلاح مشورے کے لئے۔ کبھی کسی مسئلہ کی تحقیق کے لئے

اور اکبر کو خود بھی علمی مباحثوں کے سننے کا شوق تھا۔ غرض کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیدا کرتے تھے۔ کہ اکبر جہاں ہوتا وہیں خود شیخ مبارک کو بلایا کرتا تھا۔ پیر نورانی نہایت شگفتہ بیان اور خوش صحبت تھا۔ اس کی رنگین طبیعت دربار میں بھی خوشبو اور خوش رنگ پھول برسایا کرتی تھی۔ بادشاہ بھی اس کی باتیں سن کر خوش ہوتا تھا۔ شیخ کسی فتح عظیم یا شادی یا عید وغیرہ کی مبارک باد پر ضرور آتے تھے۔ اور تہنیت کی رسم ادا کر کے رخصت ہوتے تھے +

جب ۹۸۱ھ میں اکبر گجرات فتح کر کے آئے تو بموجب رسم قدیم کے تمام عمائد اور رؤسا اور مشائخ و علما مبارک باد کو حاضر ہوئے۔ شیخ مبارک بھی آئے اور ظرافت زبان کی قینچی سے یہ پھول کترے۔ سب لوگ حضور کو مبارک باد دینے آئے ہیں۔ مگر عالم غیب سے میرے دل پر یہ مضمون ٹپکا رہے ہیں۔ کہ حضور چاہئے۔ ہمیں مبارکباد دیں۔ کیونکہ خداوند عالم نے ہمیں دوبارہ سعادت عظمےٰ عطائی فرمائی۔ یعنے حضور کا جوہر مقدس۔ حضور نے ایک ملک مارا تو حقیقت کیا ہے۔ اگرچہ بڑھاپے کا ناز تھا۔ مگر یہ انداز اکبر کو بہت پسند آیا۔ اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ اور اکثر اس نکتہ کو یاد کیا کرتے تھے +

نقیب خاں خلوت کی صحبت میں تاریخی اور علمی کتابیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اکثر حیوٰۃ الحیوان بھی پڑھی جاتی تھی۔ اس کی عبارت عربی تھی۔ معنی سمجھانے پڑتے تھے۔ اس لئے ابوالفضل کو حکم دیا اور شیخ مبارک نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ کہ اب بھی موجود ہے +

اکبر کو علمی تحقیقاتوں کا شوق تھا۔ اور اس کے لئے زبان عربی کا جاننا ضروری ہے۔ اس لئے خیال ہوا کہ عربی زبان حاصل کرے۔ لڑکوں نے کہا ہوگا۔ کہ ہمارے شیخ کو جو پڑھانے کا ڈھب ہے۔ وہ ان مسجدی ملّانوں میں سے کسی کو نصیب نہیں۔ باتوں باتوں میں کتابیں دل میں اتار دیتے ہیں۔ شیخ مبارک بلائے گئے فیضی انہیں ساتھ لے کر حاضر ہوئے۔ اور صرف ہوائی شروع کی۔ اس صحبت میں فیضی نے یہ بھی عرض کی کہ شیخ ما تکلف اصلاً ندارد۔ اکبر نے کہا۔ آرے تکلفات راہمہ بر شما

ا اس سے یہ مطلب ہوگا کہ جو آداب و تعظیم کے الفاظ اور قواعد دربار میں مقرر ہو گئے تھے اگر شیخ بجا نہ لائے تو بادشاہ کو ناگوار نہ گذرے اور شیخ جس طرح اپنے جلسۂ احباب میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں اسی طرح بادشاہ کے سامنے بھی باتیں کرتے ہیں +

گذاشتہ اند۔ چند روز کے بعد ہجوم تعلقات سے وہ شوق جاتا رہا۔ اور شیخ کا آنا بھی اتفاقی تقریبوں پر رہ گیا۔ کبھی کبھی آتے اور حکمت۔ فلسفہ۔ تاریخ۔ نقل۔ حکایات۔ غرض اپنی شگفتہ بیانی سے بادشاہ کو خوش کر جاتے ؛

شیخ کو علمِ موسیقی میں مہارت تھی۔ ایک دفعہ بادشاہ سے اس امر میں گفتگو آئی۔ بادشاہ نے کہا۔ کہ اس فن کا جو سامان ہم نے بہم پہنچایا ہے تمہیں دکھائینگے۔ چنانچہ شیخ منجو اور تان سین وغیرہ چند کلاونتوں کو بُلا بھیجا کہ شیخ کے گھر جا کر اپنا کمال دکھائیں شیخ نے سب کو سُنا۔ اور تان سین سے کہا۔ شنیدم تو ہم چیزے میتوانی گفت۔ آخر سب کو سُن کر کہا۔ کہ جانوروں کی طرح کچھ بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ اس کے حریفوں کا چلتا حربہ یہی تھا۔ کہ شریعت کے زور اور فتووں کی فوج سے سب کو دبا لیا کرتے تھے۔ اور جسے چاہتے تھے کافر بنا کر رسوا و خوار کرتے تھے۔ بادشاہ وقت کو بغاوت عام کے خطر پیدا کر کے ڈرایا کرتے تھے۔ احکام اسلام کو ہر مسلمان سرِ آنکھوں پر لیتا ہے۔ لیکن بعض موقع پر یہ زور ناگوار بھی ہوتا ہے۔ خصوصاً بادشاہ اور اُس کی ملکی مصلحتیں۔ کہ ان کے نازک موقع کسی پابندی کو سہار نہیں سکتے۔ اکبر دل میں دق ہوتا تھا۔ مگر جس طرح ہوتا انہیں سے گزارہ کرتا تھا۔ حیران تھا کہ کیا کرے۔ جن دنوں شیخ صدر نے ایک متھرا کے برہمن کو شوالہ اور مسجد کے مقدمہ میں قتل کیا۔ اُنہی دنوں میں شیخ مبارک بھی کسی مبارک بادی کی تقریب سے حضور میں آئے۔ ان سے بھی اکبر نے بعض بعض مسئلے بیان کئے۔ اور اہل اجتہاد کے سبب سے جو جو دقتیں پیش آتی تھیں۔ وہ بھی بیان کیں۔ شیخ مبارک نے کہا۔ کہ بادشاہ عادل خود مجتہد ہے مسئلہ اختلافی میں بہ مناسبتِ وقت جو حضور مصلحت دیکھیں حکم فرمائیں۔ ان لوگوں نے شہرت بے اصل سے ہوا باندھ رکھی ہے۔ اندر کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کو ان سے پوچھنے کی حاجت کیا ہے۔ اکبر نے کہا کہ ہرگاہ شما اُستادِ ما باشید و سبق پیش شما خوانده باشیم۔ چرا مارا از منّتِ ایں ملّایاں خلاص نمے سازید۔ آخر سب جزئیات و کلیات پر نظر کر کے تجویز ٹھہری کہ ایک تحریر آیتوں اور روایتوں کی اسناد سے لکھی جائے۔ جس کا خلاصہ یہ کہ امام عادل کو جائز ہے۔ کہ اختلافی مسئلہ میں اپنی رائے کے بموجب وہ جانب اختیار کرے۔ جو اُس کے نزدیک مناسب وقت ہو۔ اور علماء و مجتہدین کی رائے پر

اس کی راے کو ترجیح ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مسودہ اس کا خود شیخ مبارک نے کیا۔ اگرچہ اصل مطلب اُنہی چند اشخاص سے تھا۔ جو احکام اور مہمات سلطنت میں سنگِ راہ ہؤا کرتے تھے۔ مگر علما و فضلا۔ قاضی القضات مفتی اور بڑے بڑے عالم جن کے فتووں کو مہمات خلائق میں بڑی بڑی تاثیریں تھیں۔ سب بُلائے گئے۔ کہ اس پر مہریں کر دیں۔ زمانہ کے انقلاب کو دیکھو! آج شیخ مبارک، صدر محفل میں بیٹھے تھے حریف اُن کے طلب ہوئے تھے۔ عوام النّاس کی صف میں آ کر بیٹھ گئے۔ اور جبراً قہراً مہریں کر کے چلے گئے۔ محضر مذکور کی بعینہٖ نقل یہ ہے:۔

نقل محضر

مقصود از تشئید ایں مبانی و تمہید ایں معانی آنکہ۔ چوں ہندوستان صینت عن الحدثان بمیامن معدلتِ سلطانی و تربیت جہاں بانی مرکز امن و امان و دائرہ عدل و احسان شدہ۔ طوائف انام از خواص و عام خصوصاً علمائے عرفان شعار و فضلائے دقائق آثار کہ ہادیان بادیۂ نجات و سالکان مسالک اوتوا العلم درجات اند از عرب و عجم رو بدیں دیار نہادہ توطن اختیار نمودند۔ جمہورِ علمائے فحول کہ جامع فروع و اصول و حاویٔ معقول و منقول اند۔ و بدین و دیانت و صیانت اتصاف دارند بعد از تدبیر وافی و تامل کافی در غوامض معانی آیۂ کریمہ اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم و احادیث صحیح ان احب النّاس الی اللّٰہ یوم القیامۃ امام عادل من یطع الامیر فقد اطاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی و غیر ذالک من الشواھد العقلیہ و الدلائل النقلیہ قرار دادہ حکم نمودند کہ مرتبہ سلطان عادل عند اللّٰہ زیادہ از مرتبہ مجتہد است و حضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المومنین ظل اللّٰہ علی العالمین ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی خلد اللّٰہ ملکہ ابداً اعدل و اعلم و اعقل باللّٰہ اند۔ بنا بریں اگر در مسائل دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است بذہن صائب و فکر ثاقب خود یک جانب را از اختلافات۔ بجہت تسہیل معیشت بنی آدم و مصلحت انتظام عالم اختیار نمودہ بہ آں جانب حکم فرمانید متفق علیہ میشود۔ و اتباع آں بر عموم برایا و کافۂ رعایا لازم و متحتم است و ایضاً اگر بموجب رائے صواب

سمائے خود حکمے را از احکام قرار دہند کہ مخالف نصے نباشد و سبب ترفیہ عالمیان بودہ باشد۔ عمل برآں نمودن برہمہ کس لازم و متحتم است و مخالف آں موجب سخط اخروی و خسران دینی و دنیوی است داین مسطور صدق و نور حسبتہ للہ و اظہار الاجرائے حقوق الاسلام بمحضر علمائے دین و فقہائے مہدیین تحریر یافت و کان ذالک فی شہر رجب ۹۸۷ھ سبع و ثمانین و تسعمائتہ +

فاضل بداؤنی نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ اگرچہ عالمان مذکور میں سے یہ صورت کسی کو گوارا نہ تھی۔ مگر دربار میں بلائے گئے۔ اور بُری طرح لائے گئے۔ جبراً قہراً دستخط کرنے پڑے۔ عوام الناس میں لاکر بٹھادیا۔ کسی نے تعظیم بھی نہ دی۔ اور شیخ مبارک نے کہ اعلم علمائے زمان تھا خوشی خوشی دستخط کر کے اتنا زیادہ لکھا۔ کہ ایں امریست کہ من بجان و دل خواہاں واز سالہائے باز منتظرِ آں بودم۔ پھر شیخ صدر اور مُلّائے مخدوم کا جو حال ہوا اُن کے حالات میں معلوم ہوگا۔ دیکھو اور خدا سے پناہ مانگو +

مُلّا صاحب کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔ شیخ مبارک زمانہ کے علمائے کبار میں سے ہے۔ اور صلاح و تقوے میں ابنائے زمان اور خلائق دوران سے ممتاز۔ اُس کے حالات عجیب و غریب ہیں۔ چنانچہ ابتدا میں ریاضت اور بہت مجاہدہ کیا۔ امر معروف اور نہی منکر میں اس قدر کوشش تھی۔ کہ اگر اُس کی مجلس وعظ میں کوئی سونے کی انگوٹھی یا اطلس یا لال موزے یا سُرخ زرد کپڑے پہن کر آتا تو اُسی وقت اُتروا دیتا تھا۔ ازار ذرا ایڑیوں کے نیچے ہوتی تو اُتنی پھڑوا ڈالتا۔ راہ چلتے کہیں گانے کی آواز آتی۔ تو بڑھ کر نکل جاتا۔ آخر حال میں ایسا گانے کا عاشق ہوا کہ ایک دم بغیر آواز یا گیت یا راگ یا ساز کے آرام نہ تھا۔ غرض مختلف رستوں کا چلنے والا تھا۔ اور انواع و اقسام کے رنگ بدلتا تھا۔ افغانوں کے عہد میں شیخ علائی کی صحبت میں تھا۔ اوائل عہدِ اکبری میں نقشبندیہ کا زور تھا۔ تو اس سلسلہ سے لڑی ملادی تھی۔ چند روز مشائخ ہمدانیہ میں شامل ہوگیا۔ اخیر دنوں میں دربار پر ایرانی چھا گئے تھے تو اُن کے رنگ میں باتیں کرتا تھا۔ اسی طرح اور سمجھ لو۔ گویا تُکَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِھِمْ پر اُس کا عمل تھا۔ بہر حال ہمیشہ علوم دینیہ کا درس رکھتا۔ شعر۔ معمّا اور اور فنون اور تمام فضائل پر حاوی تھا۔ برخلاف علمائے ہند کے خاص علم تصوف کو خوب کہتا تھا اور سمجھتا تھا۔ شاطبی علم

قرأت میں نوک زبان پر تھی - اور اس طرح اس کا سبق پڑھاتا تھا کہ جو حق ہے - قرآن مجید دس قرأتوں سے یاد کیا تھا - بادشاہوں کے دربار میں کبھی نہ گیا - باوجود ان سب باتوں کے نہایت خوش صحبت تھا - نقل و حکایات اور واقعات دلچسپ کے بیان سے صحبت اور درس کو گلزار کر دیتا تھا - کہ احباب کا اس کے جلسہ کو اور شاگردوں کا سبق چھوڑنے کو دل نہ چاہتا تھا - اخیر عمر میں آنکھوں سے معذور ہو گیا تھا - اور درس و تدریس بھی چھوڑ دی تھی - مگر علم الٰہیات کی تصنیف چلی جاتی تھی - اس عالم میں ایک تفسیر شروع کی - وہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں اس قدر مبسوط اور مفصل ہوئی کہ جسے امام فخر الدین رازی کی تفسیر کا ہم پلہ سمجھنا چاہئے - اور مطالب و مضامین بھی انواع و اقسام کی تحقیقوں کے ساتھ درج تھے - **منبع نفائس العلوم** اس کا نام رکھا - اور عجیب بات یہ ہے - کہ اس کے دیباچہ میں ایسے ایسے مطلب لکھے ہیں کہ اُن سے دعوئے مجددی اور نئی صدی کی بُو آتی ہے - اور جو تجدید تھی وہ تو معلوم ہی ہے - (یعنی دین الٰہی اکبر شاہی) جن فنون میں تفسیر مذکور تمام کی ہے - ابن فارض کا قصیدۂ تائیہ کہ سات سو شعر کا ہے - اور قصیدۂ بردہ اور قصیدۂ کعب ابن زہیر اور اور بزرگوں کے قصائد و وظائف کے طور پر حفظ پڑھا کرتا تھا - یہاں تک کہ ۱۷ ذی القعدہ ۱۰۰۴ھ کو اس جہان سے گذر گیا - اُس کا معاملہ خدا کے حوالے - باوجود اس کے کوئی مُلّا اس جامعیت کے ساتھ آج تک نظر نہیں آیا - مگر حیف ہے - کہ حُبِّ دنیا اور جاہ و حشمت کی نحوست سے فقر کے لباس میں دین اسلام کے ساتھ کہیں ملاپ نہ رکھا - آگرہ میں آغازِ جوانی میں مَیں نے بھی کئی برس اُس کی ملازمت میں سبق پڑھے تھے - الحق صاحبِ حق عظیم ہے - مگر بعض امور دُنیاداری اور بے دینی کے سبب سے اور اس لئے کہ مال و جاہ اور زمانہ سازی اور مکر و فریب اور تغیرِ مذہب و ملت میں ڈوب گیا - جو سابقہ تھا اصلا نہ رہا - قل انا و ایاکم لعلی ھدی او فی ضلال مبین کہدے کہ تم اور ہم راہ پر ہیں یا گمراہ ہیں (کون جانتا ہے) عوام الناس کی بات ہے - کہ ایک بیٹا باپ پر لعنت کرتا تھا - رفتہ رفتہ قدم آگے بڑھایا وغیرہ وغیرہ آگے جو کچھ مُلّا صاحب نے لکھ دیا ہے - مَیں لکھنا جائز نہیں سمجھتا - مُلّا صاحب کی سینہ زوریاں دیکھو - بھلا بیٹا ماں یا باپ سے کہہ سکتا ہے - کہ جاؤ ہمارا تمہارا سابقہ نہ رہا ؟ اور اُس کے کہنے سے ماں باپ کے حقوق سارے اُڑ جائینگے ؟ کبھی نہیں - جب یہ نہیں تو

اُستاد کے حق کیوں کر مٹ سکتے ہیں۔ اچھا جو معلومات۔ قابلیت اور فہم و ادراک کی استعداد اُس کی تعلیم سے حاصل ہوئی ہے۔ سب کی ایک پوٹلی باندھ کر اُس کے حوالہ کر دو۔ اور آپ جیسے اوّل روز گھر سے اُس کے پاس آئے تھے۔ ویسے ہی کورے رہ جاؤ پھر ہم بھی کہہ دینگے۔ کہ آپ کا تعلق اُس سے کچھ نہ رہا۔ اور جب یہ نہیں ہو سکتا تو تمہارے دو حرف کہہ دینے سے کب چھٹکارا ہو سکتا ہے۔

شیخ مبارک اور اُس کے بیٹوں نے کیا خطا کی۔ برسوں لکھا پڑھا۔ ایسا عالم بنایا کہ علمائے وقت سے کلہ بکلہ گفتگوئیں کر کے سب کی گردنیں دبانے لگے۔ اس عالم میں بھی جب کوئی مصیبت آئی تو فوراً سینہ سپر ہو کر مدد کو حاضر ہو گئے۔ اس پر اُن کا یہ حال ہے کہ جہاں نام یاد آجاتا ہے۔ ایک نہ ایک الزام لگا جاتے ہیں۔ اپنی تاریخ میں علمائے عصر کی شکایت کرتے کرتے کہتے ہیں۔ شیخ مبارک نے خلوتِ بادشاہی میں بیربر سے کہا۔ کہ جس طرح تمہارے ہاں کتابوں میں تحریفیں ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں بھی ہیں قابلِ اعتبار نہیں رہیں۔ اگر حق پوچھو تو اس بیچارے نے کیا جھوٹ کہا۔ مگر اُس کی قسمت۔ اَوروں کی باتیں اس سے ہزار من سنگین و وزنی ہوتی ہیں۔ اُنہیں اُن کی حماقت یا ظرافت میں ڈال کر ٹال دیتے ہیں۔ ان کے مُنہ سے بات نکلی اور کفر۔

ابوالفضل خود لکھتے ہیں۔ رایاتِ اقبال (لشکرِ اکبری) لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ اور مصالحِ ملکی کے سبب سے ٹھیرنا پڑا تھا۔ اس پیرِ حقیقت (والد ماجد) کی جدائی سے دل بیقرار تھا۔ سال جلوس ۳۲ ۹۹۵ھ تھے۔ مَیں نے التجا کی کہ یہیں تشریف لائیے۔ صورت و معنی کے واقفِ حال (والدِ موصوف) نے عرض قبول کی۔ ۶ رجب کو تشریف لائے۔ یہاں گوشۂ وحدت میں خوشی کو افزائش دیتے تھے۔ اب سب کام چھوڑ دیئے تھے۔ حال کا روزنامچہ لکھ کر نفس ابوالبدائع کی زینت میں وقت گزارتے تھے۔ علوم ظاہری پر توجہ کم ہوتی تھی۔ ذات و صفات پر در دگاہ میں گفتگو فرماتے تھے۔ اور عبرت کا سرمایہ لیتے تھے۔ دریائے آزادی کے کنارہ پر بیٹھے رہتے تھے۔ اور بے نیازی کا دامن پکڑے تھے کہ مزاج قدسی اعتدالِ بدنی سے متغیّر ہوا۔ ایسی بیماری اکثر ہوتی تھی۔ دفعتہً سفرِ واپسین کی آگاہی ہوئی۔ مجھ بے حواس کو بُلایا اور ہوش افزا باتیں زبان سے نکلیں۔

---

[1] دیکھو آئین اکبری کا خاتمہ۔ اکبرنامہ میں لکھتے ہیں کہ گردن میں ایک پھوڑا نکلا تھا۔ ۱۱ دن میں کام تمام ہو گیا۔

قرأت میں نوک زبان پر تھی۔ اور اس طرح اس کا سبق پڑھاتا تھا کہ جو حق ہے۔ قرآن مجید
دس قرأتوں سے یاد کیا تھا۔ بادشاہوں کے دربار میں کبھی نہ گیا۔ باوجود ان سب باتوں کے
نہایت خوش صحبت تھا۔ نقل و حکایات اور واقعات دلچسپ کے بیان سے صحبت اور
درس کو گلزار کر دیتا تھا۔ کہ احباب کا اس کے جلسہ کو اور شاگردوں کا سبق چھوڑنے کو
دل نہ چاہتا تھا۔ اخیر عمر میں آنکھوں سے معذور ہو گیا تھا۔ اور درس و تدریس بھی چھوڑ
دی تھی۔ مگر علم الٰہیات کی تصنیف چلی جاتی تھی۔ اس عالم میں ایک تفسیر شروع کی۔
وہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں اس قدر مبسوط اور مفصل ہوئی کہ جسے امام فخر الدین رازی
کی تفسیر کا ہم پلہ سمجھنا چاہیے۔ اور مطالب و مضامین بھی انواع و اقسام کی تحقیقوں کے
ساتھ درج تھے۔ **منبع نفائس العلوم** اس کا نام رکھا۔ اور عجیب بات یہ ہے۔ کہ
اس کے دیباچہ میں ایسے ایسے مطلب لکھے ہیں کہ اُن سے دعوئے مجدّدی اور نئی صدی
کی بُو آتی ہے۔ اور جو تجدید تھی وہ تو معلوم ہی ہے۔ (یعنی دین الٰہی اکبر شاہی) جن دنوں
میں تفسیر مذکور تمام کی ہے۔ ابن فارض کا قصیدۂ تائیہ کہ سات سو شعر کا ہے۔ اور قصیدۂ
بردہ اور قصیدۂ کعب ابن زہیر اور اور بزرگوں کے قصائد وظائف کے طور پر حفظ پڑھا کرتا
تھا۔ یہاں تک کہ ۱۷ ذی القعدہ ۱۰۰۰ھ کو اس جہان سے گذر گیا۔ اُس کا معاملہ خدا کے
حوالے۔ باوجود اس کے کوئی مُلّا اس جامعیت کے ساتھ آج تک نظر نہیں آیا۔ مگر حیف
ہے۔ کہ حُبِّ دنیا اور جاہ و حشمت کی نحوست سے فقر کے لباس میں دین اسلام کے ساتھ
کہیں ملاپ نہ رکھا۔ آگرہ میں آغاز جوانی میں مَیں نے بھی کئی برس اُس کی ملازمت میں
سبق پڑھے تھے۔ الحق صاحبِ حق عظیم ہے۔ مگر بعض امور دُنیا داری اور بے دینی کے
سبب سے اور اس لئے کہ مال و جاہ اور زمانہ سازی اور مکر و فریب اور تغیر مذہب و
ملت میں ڈوب گیا۔ جو سابقہ تھا اصلاً نہ رہا۔ قل انّا و ایّاکم لعلیٰ ھدًی او فی
ضلال مبین کہدے کہ تم اور ہم راہ پر ہیں یا گمراہ ہیں (کون جانتا ہے) عوام الناس
کی بات ہے۔ کہ ایک بیٹا باپ پر لعنت کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ قدم آگے بڑھایا وغیرہ وغیرہ
آگے جو کچھ مُلّا صاحب نے لکھ دیا ہے۔ مَیں لکھنا جائز نہیں سمجھتا۔ مُلّا صاحب کی سینہ
زوریاں دیکھو۔ بھلا بیٹا ماں یا باپ سے کہہ سکتا ہے۔ کہ جاؤ ہمارا تمہارا سابقہ نہ رہا؟
اور اُس کے کہنے سے ماں باپ کے حقوق سارے اُڑ جائینگے؟ کبھی نہیں۔ جب یہ نہیں تو

اُستاد کے حق کیوں کر مٹ سکتے ہیں۔ اچھا جو معلومات۔ قابلیت اور فہم و ادراک کی استعداد اُس کی تعلیم سے حاصل ہوئی ہے۔ سب کی ایک پوٹلی باندھ کر اُس کے حوالہ کردو۔ اور آپ جیسے اوّل روز گھر سے اُس کے پاس آئے تھے۔ ویسے ہی کورے رہ جاؤ پھر ہم بھی کہہ دینگے کہ آپ کا تعلق اُس سے کچھ نہ رہا۔ اور جب یہ نہیں ہو سکتا تو تمہارے دو حرف کہہ دینے سے کب چھٹکارا ہو سکتا ہے ❊

شیخ مبارک اور اُس کے بیٹوں نے کیا خطا کی۔ برسوں لکھایا پڑھا۔ ایسا عالم بنایا کہ علمائے وقت سے کلہ بکلہ گفتگوئیں کر کے سب کی گردنیں دبانے لگے۔ اس عالم میں بھی جب کوئی مصیبت آئی تو فوراً سینہ سپر ہو کر مدد کو حاضر ہو گئے۔ اس پر اُن کا یہ حال ہے کہ جہاں نام یاد آجاتا ہے۔ ایک نہ ایک الزام لگا جاتے ہیں۔ اپنی تاریخ میں علمائے عصر کی شکایت کرتے کرتے کہتے ہیں۔ شیخ مبارک نے خلوتِ بادشاہی میں بیربر سے کہا۔ کہ جس طرح تمہارے ہاں کتابوں میں تحریفیں ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں بھی ہیں قابل اعتبار نہیں رہیں۔ اگر حق پوچھو تو اس بیچارے نے کیا جھوٹ کہا۔ مگر اُس کی قسمت۔ اوروں کی باتیں اس سے ہزار من سنگین و وزنی ہوتی ہیں۔ اُنہیں اُن کی حماقت یا ظرافت میں ڈال کر ٹال دیتے ہیں۔ ان کے مُنہ سے بات نکلی اور کفر ❊

ابوالفضل خود لکھتے ہیں۔ رایاتِ[1] اقبال (لشکر اکبری) لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ اور مصالح ملکی کے سبب سے ٹھیرنا پڑا تھا۔ اس پیر حقیقت (والد ماجد) کی جدائی سے دل بیقرار تھا۔ سال جلوس ۳۲ سنہ ۹۹۵ھ تھے۔ مَیں نے التجا کی کہ یہیں تشریف لائیے۔ صورت و معنی کے واقف حال (والد موصوف) نے عرض قبول کی۔ ۶ رجب کو تشریف لائے۔ یہاں گوشۂ وحدت میں خوشی کو افزائش دیتے تھے۔ اب سب کام چھوڑ دیئے تھے۔ حال کا روزنامچہ لکھ کر نفس ابوالبدائع کی زینت میں وقت گزارتے تھے۔ علوم ظاہری پر توجہ کم ہوتی تھی۔ ذات و صفات پروردگار میں گفتگو فرماتے تھے۔ اور عبرت کا سرمایہ لیتے تھے۔ دریائے آزادی کے کنارہ پر بیٹھے رہتے تھے۔ اور بے نیازی کا دامن پکڑے تھے کہ مزاج قدسی اعتدال بدنی سے متغیر ہوا۔ ایسی بیماری اکثر ہوتی تھی۔ دفعتہً سفر واپسین کی آگاہی ہوئی۔ مجھ بے حواس کو بُلایا اور ہوش افزا باتیں زبان سے نکلیں۔

[1] دیکھو آئین اکبری کا خاتمہ۔ اکبر نامہ میں لکھتے ہیں کہ گردن میں ایک پھوڑا نکلا تھا۔ ۱۱ دن میں کام تمام ہو گیا ❊

رخصت کے لوازمات ظاہر ہونے لگے۔ ہمیشہ پردہ میں باتیں ہوتی تھیں۔ میرے دل کا (جس پر اسرار قدرت کے صاحب حوصلہ ہونے کا بھروسہ تھا) یہ عالم ہوا۔ کہ خونِ جگر کے گھونٹ گلے سے اُترنے لگے۔ بڑی بیقراری سے کچھ اپنے تئیں سنبھالا۔ اور اُسی پیشوائے ملکِ تقدّس نے زورِ معنوی لگایا جب تھما۔ سات دن بعد کمال آگاہی اور عین حضوری میں ۱۷ ذیقعد ۱۰۰۱ھ تھی۔ کہ ریاض قدس کو ٹہلتے چلے گئے۔ ملک شناسائی کا سورج چھپ گیا۔ عقل ایزد شناس کی آنکھ جاتی رہی۔ دانائی کی کمر خم ہو گئی۔ دانش کا وقت اخیر ہو گیا۔ مشتری نے چادر سر سے پھینک دی۔ عطارد نے قلم توڑ ڈالا ؎

رفت آنکہ فیلسوف جہاں بود بر دلش	در ہائے آسمان معانی کشودہ بود
بے او یتیم و مردہ دل اند اقربائے او	کو آدم قبیلہ و عیسےٰ دودہ بود

مُلّا صاحب نے شیخ کامل تاریخ کہی۔ شیخ فیضی نے فخر الکمل اور اسی شہر لاہور میں امانت رکھا۔

لطیفہ۔ مُلّائے موصوف اس واقعہ کی کیفیت ادا فرماتے ہیں۔ اسی سال میں ۱۷ ذیقعد کو شیخ مبارکِ دانا دنیا سے گذر گئے۔ بیٹوں نے ماتم میں سر و ابرو کو منڈا کر ڈاڑھی مونچھ سے جا ملایا۔ اس چار ضرب کی تاریخ **شریعت جدید** ہوئی۔

شیخ ابو الفضل خود اکبر نامہ کے ۱۰۰۲ھ میں لکھتے ہیں۔ بادشاہ لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ اس نگار نامہ کا مینا کار (بندہ ابو الفضل) فضل آباد میں۔ پدر گرامی اور مادر بزرگوار کی خوابگاہ پر گیا۔ فرمایا تھا۔ اس لئے دونوں برگزیدگان الٰہی کے نقش آگرہ کو روانہ کئے۔ وہاں اپنے پرانے ٹھکانے میں آرام کیا۔

شیخ مرحوم نے آٹھ بیٹے چھوڑے۔ ابو الفضل نے اکبر نامہ کے خاتمہ میں خدا کی ۳۲ عنائتیں اپنے حال پر لکھی ہیں۔ ان میں سے چھبیسویں یہ کہ بھائی دانش آموز سعادت گزیں۔ رضا جو۔ نیکوکار عطا کئے۔ دیکھنا ایک ایک کو کس کس سانچے میں ڈھالتے ہیں (۱) بڑے بھائی کا حال کیا لکھوں۔ باوجود ایسے کمالات ظاہری و باطنی کے میری خوشی بغیر بڑھ کر قدم نہ اُٹھاتا تھا۔ اپنے تئیں میری رضا کا وقف کر کے تسلیم میں ثابت قدم رہتا تھا۔ اپنی تصانیف میں مجھے وہ کچھ کہا ہے۔ جس کا شکریہ میری طاقت سے باہر ہے۔ چنانچہ ایک قصیدہ فخریہ میں فرمایا ہے ؎

جائیکہ از بلندی و پستی سخن رود ۔۔۔ از آسمان بلند تر - از خاک کمترم
با ایں چنیں پدر کہ نوشتم مکارمش ۔۔۔ در فضل مفتخر نہ گرامی برادرم
برہان علم و فضل ابوالفضل کز دمش ۔۔۔ دارد زمانہ مغز معانی معطرم
صد سالہ رہ میانِ من و اوست در کمال ۔۔۔ در عمر گر از دو سہ سالے فزوں ترم
در چشم باغباں نشود قدر او بلند ۔۔۔ گر از درخت گل گذرد شاخ عرعرم

اس کی (فیضی بھائی کی) ولادت ۹۵۴ھ میں ہوئی تھی۔ تعریف کس زبان سے لکھوں اسی کتاب میں کچھ لکھ کر دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ آتشکدہ کو آب بیان سے بجھایا ہے سیلاب کا بند توڑا ہے۔ اور بے صبری کا مردِ میدان بنا ہوں۔ اس کی تصنیفات گویائی اور بینائی کے ترازو اور مرغانِ نغمہ سرا کا مرغزار ہیں۔ وہی اس کی تعریف کر لینگے۔ اور کمال کی خبر دینگے۔ خصائل و عادات کی یاد دلائینگے ٭

(۲) شیخ ابوالفضل نے اپنی تصویر کو جس رنگ میں نکالا ہے۔ اُن کے ہی حال میں دکھاؤنگا اس محراب میں نہ سجے گی ٭

(۳) شیخ ابوالبرکات۔ اس کی ولادت ۱۷ شوال ۹۶۰ھ میں ہوئی۔ علم و آگاہی کا اعلیٰ ذخیر نہیں جمع کیا۔ پھر بھی بڑا حصہ پایا۔ معاملہ دانی۔ شمشیر آرائی۔ کارشناسی میں پیش قدم گنا جاتا ہے۔ نیک ذاتی۔ درویش پرستی اور خیر عام میں سب سے بڑھا ہوا ہے ٭

(۴) شیخ ابوالخیر۔ ۲ جمادی الاوّل ۹۶۷ھ کو پیدا ہوا۔ اخلاق کی بزرگیاں اور اشرافوں کی خوبیاں اس کی خوے ستودہ ہیں۔ زمانہ کے مزاج کو خوب پہچانتا ہے۔ اور زبان کو اس طرح قابو میں رکھتا ہے جس طرح اور اعضا کو (کم سخن ہے) شیخ ابوالفضل کے رقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں سب بھائیوں میں ان سے تعلق خاص تھا۔ ان کی سرکار کے کاغذات اسی بھائی کے حوالے تھے۔ کتب خانہ بھی اسی کے سپرد تھا۔ اکثر احباب کے خطوط میں فرمائشوں اور ضروری کاموں کا شیخ ابوالخیر پر حوالہ دیتے ہیں ٭

(۵) شیخ ابوالمکارم۔ پیر کی رات ۲۳ شوال ۹۷۶ھ کو پیدا ہوا۔ ذرا جنون میں آجاتا تھا۔ پدر بزرگوار زور باطن سے پکڑ کر درستی کے رستہ پر لاتے تھے معقول و منقول اُسی دانائے رموز انفس و آفاق کے سامنے ادا کئے۔ حکمائے سلف کے پرانے تذکرے کچھ کچھ میر فتح اللہ شیرازی کی شاگردی میں پڑھے۔ دل میں رستہ ہے اُمید ہے کہ

ساحل مقصود پر کامیاب ہوگا*

(۶) شیخ ابوتراب - ۲۳ ذی الحجہ ۹۸۸ھ کو پیدا ہوا۔ اس کی ماں اور ہے - مگر سعادت کی خورجیں بھر کر لایا ہے۔ اور کسب کمالات میں مشغول ہے*

(۷) شیخ ابوحامد - ۲ ربیع الآخر ۱۰۰۲ھ پیر کو پیدا ہوا۔
(۸) شیخ ابوراشد - پیر غرہ جمادی الاولیٰ کو اسی سنہ میں پیدا ہوا
} یہ دونوں لونڈی کے پیٹ سے

تھے لیکن اصالت کے آثار پیشانی پر چمکتے ہیں - پیر نورانی نے ان کے آنے کی خبر دی تھی۔ نام بھی رکھ دیئے تھے ۔ ان کے ظہور سے پہلے اسباب سفر باندھا - خدا سے اُمید ہے کہ ان کے انفاس گرامی کی برکت سے دولتِ خوش نصیبی کے ساتھ ہمنشیں ہوں - کہ رنگ رنگ کی نیکیاں جمع ہوں۔ بڑے بھائی (فیضی) نے تو ہستی کا اسباب باندھا اور عالم کو غم میں ڈالا - امید ہے کہ اور پھلے پھُولے نونہالوں کو خوشی - کامرانی اور سعادت دوجہانی کے ساتھ خدا عمر دراز کرے - اور صورت و معنی - دینی اور دنیادی نیکیوں سے سربلندی دے*

مختلف تاریخوں سے جو جا بجا پتے لگے ہیں۔ تو **چار بیٹیاں** بھی شمار میں آئی ہیں*

ان میں سے ایک عفیفہ کے حال میں ملا صاحب ۹۹۸ھ میں فرماتے ہیں - ان دنوں میں خداوند خاں دکنی رافضی کہ شیخ ابوالفضل کی بہن حسب الحکم اُس کے نکاح میں آئی تھی - ولایت گجرات میں قصبہ **کری** جاگیر پا کر وہیں دوزخ کے ٹھکانے پہنچا۔ **دوسری** کی شادی میر حسام الدین سے ہوئی - یہ غازی خاں بدخشی کے بیٹے تھے - باپ کے بعد ہزاری منصب نصیب ہوا - اور دکن بھیجے گئے - خان خاناں کا دربار دریائے قدرت تھا - دنیا موتی رولتی تھی - ان سے تو دو پشت کی آشنائی تھی - یہ بھی غوطے لگانے لگے - مگر عین شباب میں محبت الٰہی کا جذبہ ہوا - خان خاناں سے کہا کہ ترک دنیا کا ارادہ دل پر چھا گیا ہے - درخواست کروں گا تو منظور نہ ہوگی میں دیوانہ ہو جاتا ہوں - آپ حضور میں لکھ کر مجھے دلی بھیج دیجئے - کہ جو عمر باقی ہے - سلطان المشائخ کے مزار پر بیٹھ کر گزار دوں - خان خاناں نے منتیں کر کے روکا کہ یہ دیوانگی ہزار فرزانگی سے افضل ہے - مگر ملتوی رکھنی چاہیئے - نہ مانا - دوسرے دن

کپڑے پھاڑ کر پھینک دیئے۔ کیچڑ مٹی بدن کو ملی۔ اور کوچہ و بازار میں پھرنے لگے
بادشاہ کو عرضی ہوئی۔ وہاں سے دتی کی رخصت حاصل ہو گئی۔ ۳۰ برس کمال زہد اور
پرہیزگاری سے وہیں گزار دیئے۔ علم سے بہرہ کامل رکھتے تھے۔ مگر سب کو آب
فراموشی سے دھو کر تلاوت قرآن مجید اور ذکر الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ شاہ باقی باللہ
جن کا وطن سمرقند اور ولادت کابل میں ہوئی تھی۔ اور مزار اب بھی قدم شریف کے
رستہ کو آباد کرتا ہے۔ اُس وقت زندہ تھے۔ چنانچہ اُن سے ہدایت حاصل کی۔
۱۰۲۳ھ میں انتقال ہوا۔ پاک دامن بی بی نے شوہر کے اشارہ سے تمام زر و زیور فقرا
و مساکین کو بانٹ کر آلائش دنیا سے دامن پاک کیا تھا۔ جب تک جیتی رہی۔ ۱۲ ہزار
روپے سال خانقاہ کے خرچ کے لئے بھیجتی رہی۔ **تیسری** راجہ علی خاں حاکم خاندیس
کے بیٹے سے بیاہی۔ اُس کا بیٹا صفدر خاں ۵ سنہ جلوس میں ہزاری منصب دار ہوا
چوتھی لاڈلی بیگم۔ اس کی شادی اعتقاد الدولہ اسلام خاں شیخ علاء الدین چشتی سے
ہوئی تھی۔ کہ شیخ سلیم چشتی کے پوتے تھے۔ اور حسن اخلاق اور خصائل مرضیہ کے سبب
سے خاندان کی برکت تھے۔ جہانگیر تخت نشین ہوا۔ تو اُنہیں اسلام خاں خطاب پنجہزاری
منصب اور بہار کا صوبہ عنایت ہوا۔ کہ کوکلتاش کا رشتہ ملا ہوا تھا۔ ۳ سنہ جلوس
میں بنگالہ بھی مرحمت ہوا۔ باوجودیکہ اکبر کے عہد میں ملک مذکور پر لاکھوں آدمیوں کے
خون بہے تھے۔ پھر بھی پٹھانوں کی کھر چن کناروں میں لگی پڑی تھی۔ ان میں عثمان خاں
قتلو لوہانی کا بیٹا تھا۔ کہ اب تک اس کی جڑ نہ اُکھڑی تھی۔ شیخ نے خونریز لڑائیوں سے
اُس کا استیصال کیا۔ چنانچہ ۶ سنہ جلوس میں شش ہزاری منصب سے اعزاز پایا۔
اور ۱۰۲۲ھ میں دنیا سے کوچ کر کے فتح پور سیکری میں کہ بزرگوں کا مدفن تھا خواب
آرام کیا +

ان کی سخاوت و دریا دلی کے حالات دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ اپنے دسترخوان
خاص کے علاوہ ایک ہزار طبق طعام اور اس کے لوازمات ملازموں کے لئے ہوتے تھے۔
گراں بہا زیور اور قیمتی کپڑوں کے خوان نوکر لئے کھڑے رہتے۔ جس کی قسمت ہوتی تھی
انعام دیتے تھے۔ جھروکہ درشن۔ دیوان عام۔ دیوان خاص وغیرہ مکانات دربار کہ لوازم
سلاطین ہیں۔ اُنہوں نے بھی آراستہ کئے تھے۔ ہاتھی بھی اُسی طرح لڑاتے تھے۔

باوجودیکہ نہایت متقی پرہیزگار تھے۔ کسی قسم کا نشہ یا امر ممنوع عمل میں نہ لاتے تھے۔
لیکن کل بنگالہ کی کنچنیاں نوکر تھیں۔ اسی ہزار روپیہ مہینہ جس کا ۹ لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ سال
ہوا فقط ان کی تنخواہ کی رقم تھی۔ باوجود اس کے اپنے لباس میں ذرا تکلف نہ کرتے تھے۔
دستار کے نیچے موٹے کپڑے کی ٹوپی اور قبا کے نیچے ویسا ہی کرتا پہنے رہتے تھے۔
دسترخوان پر ان کے سامنے پہلے مکئی اور باجرے کی روٹی۔ ساگ کی بھجیا اور سٹھی کے
چاولوں کا خشکہ آتا تھا۔ لیکن ہمت و سخاوت میں حاتم کو مات کرتے تھے۔ جب
بنگالہ میں تھے تو ۱۲۰۰ ہاتھی اپنے منصبداروں اور ملازموں کو دیئے ۲۰ ہزار سوار و پیادے
فرقہ شیخ زادہ سے نوکر تھے۔ اکرام خاں ہوشنگ بیٹا لاڈلی بیگم سے تھا۔ یہ دکن میں تعینات
تھا۔ پھر اسیر کا قلعہ مل گیا۔ شیر خاں تنور کی بیٹی اس سے بیاہی تھی۔ مزاج موافق نہ
آیا۔ اس کے بھائی بہن کوہے گئے۔ حقیقت میں بدمزاج اور ظالم طبع تھا۔ شاہجہان
کے عہد میں کسی سبب سے معزول ہو کر دو ہزاری کے منصب سے گرا۔ نقدی مقرر ہو گئی
فتح پور سیکری میں دادا کی قبر کے متولی ہو کر بیٹھ گئے ✦

آگرہ میں اکبر کے روضہ سے کوس بھر مشرق کو ایک مقبرہ ہے کہ لاڈلی کا روضہ کہلاتا
ہے وہاں کے کہن سال لوگ کہتے ہیں کہ پہلے اس کے گرد بڑا احاطہ اور عالیشان دروازہ
تھا۔ اندر کئی قبریں تھیں۔ مگر کتبہ کسی پر نہ تھا۔ ایک پر تعویذ سنگ مرمر کا تھا۔ گرد
فتح پور کے سنگ سرخ کی دیوار تھی۔ بیل صاحب مفتاح التاریخ میں کہتے ہیں۔ کہ
شیخ مبارک فیضی اور ابوالفضل یہیں دفن ہیں۔ لیکن ابوالفضل نے خود آئین اکبری میں لکھا
ہے کہ بابر بادشاہ نے جمنا کے اس پار چار باغ یادگار آباد کیا ہے۔ اس شگرف نامہ کا
نقاش وہیں پیدا ہوا ہے۔ والد اور بڑا بھائی وہاں سوتے ہیں۔ شیخ علاء الدین مجذوب اور
میر رفیع الدین صفوی اور بہت سے کار آگاہ بھی وہیں آرام کرتے ہیں۔ خیر مردہ بدست
زندہ ہے۔ وہاں سے اٹھا کر یہاں رکھ دیا ہوگا۔ اب پتہ نہیں لگتا۔ کہ بوسیدہ ہڈیاں
کب منتقل ہوئیں۔ اور کس نے کیں۔ ہاں عالیشان دروازہ کا کتبہ بہ آواز بلند پکارتا ہے
کہ شیخ مبارک یہاں ہیں ✦

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبہ ثقتی

ھذہ الروضۃ للعالم الربانی والعارف الصمدانی جامع العلوم شیخ مبارک

قدس سرہ قد وقف بنیانہ بحر العلوم شیخ ابوالفضل سلمہ اللہ تعالیٰ فی ظل دولۃ الملک العادل یطلبہ المجد والاقبال والکرم جلال الدین والدنیا اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ تعالیٰ ظلال سلطنتہٖ باہتمام حضرت ابی البرکات فی سنۃ اربع والف

لطیفہ سبحان اللہ با پیر نورانی ۹۰ برس کی عمر۔ وہ وہ اوصاف کمالات۔ آنکھوں سے معذور۔ ماشاءاللہ اتنے بیٹے بیٹیاں۔ اور ان کے بھی بیٹے بیٹیاں۔ اس پر تمہاری ہمت۔ چلتے چلتے کرامات چھوڑ گئے۔ اور ایک نہیں دو دو +

ابوالفیض فیضی فیاضی

۹۵۴ھ میں جبکہ ہندوستان کی سلطنت سلیم شاہ کی سلامتی میں متفکر تھی۔ شیخ مبارک شہر آگرہ میں چار باغ کے پاس رہتے تھے۔ کہ نہال امید میں پہلا پھول کھلا۔ اقبال پکارا کہ مراد کا پھل لائیگا۔ کامیاب ہوگا۔ اور کامیابی پھیلائیگا۔ ابوالفیض اس کا نام ہے معصوم بچہ باپ کی نحوست کے سایہ میں پلا۔ وہ افلاس کی خشک سالی اٹھاتا۔ عداوت اعدا کے کانٹے کھاتا جوانی کی بہار کو پہنچا۔ لیکن ایک لحاظ سے ان دنوں کو بھی اقبال کے دن سمجھو کہ عمر کے ساتھ اس کی فضیلت اور کمالات بھی جوان ہوتے گئے۔ اس مصیبتوں کی داستان اس کے باپ کے حال میں سن چکے۔ اور اکثر دلچسپ حالات ابوالفضل کے بیان میں دیکھو گے۔ اس نے علم و فضل کا سرمایہ باپ سے پایا۔ اور علوم عقلی و نقلی جو ایشیا میں مروج تھے ان میں مہارت حاصل کی۔ مگر فن شعر میں جو کمال دکھایا وہی ثابت کرتا ہے۔ کہ فیضی کا دل و دماغ فیضان قدرت سے شاداب تھا۔ اور ملک الشعرا اپنی شاعری ساتھ لے کر آیا تھا۔ باپ اگرچہ شاعر نہ تھا۔ لیکن ہمہ دان فاضل تھا۔ بیٹے کے کلام کو دیکھتا تھا۔ اُسے نکتہ نکتہ سے آگاہ کرتا تھا۔ زبان کو فصاحت کی چاٹ لگاتا تھا۔ اور اُس سے رموز سخن کے سرچشمے کھولتا تھا۔ فن طب کو حاصل کیا۔

مگر اس سے فائدہ فقط اتنا لیا کہ بندگانِ خدا کو معالجہ سے فیض پہنچاتا تھا۔ اور کچھ اُجرت نہ لیتا تھا۔ جب ہاتھ میں زیادہ رسائی ہوئی تو دوا بھی اپنے پاس سے دینے لگا۔ جب خدا نے دستگاہ بڑھائی ۔ اور فرصت نے تنگی کی۔ تو رفاہ کی نظر سے ایک شفاخانہ بنوا دیا +

ان باپ بیٹوں کے حال قادر مطلق کی قدرت نمائی کا ایک عمدہ نمونہ ہیں۔ جبکہ دشمنوں کا اخیر حملہ ان پر طوفانِ نوح کی طرح گزر گیا۔ اور وہ صحیح و سلامت نکلے۔ تو خدا کا شکر بجالائے۔ اس میں اکبر کی نیک اندیش نیت کا حال بھی معلوم ہوا۔ اور زمانہ کا رنگ دربار کی حالت کے ساتھ بدلتا نظر آیا۔ بڈھا فاضل اپنے لُٹے گھر اور گری ہوئی مسجد میں آکر بیٹھا۔ ٹوٹے پھوٹے ممبر پر چراغ رکھ کر درس و تدریس کا دروازہ کھول دیا۔ اور تعلیم ہدایت کے جلسے پھر گرم کئے۔ وہ دیکھتا تھا کہ بادشاہ فضل و کمال کا طالب ہے اور اہل دانش اور باتدبیر لوگوں کو ڈھونڈتا ہے۔ جو اشخاص اس سلسلہ میں نامزد ہوتے ہیں۔ دربار میں پہنچ کر معزز مقام پاتے ہیں۔ اس کا کمال اپنے بازوے پرواز کو دیکھتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ مگر آفرین ہے غیور ہمت اور بے نیاز دل کو کہ اُمرا کے دروازوں کی طرف نہ جھکتا تھا +

شیخ فیضی جس کا آئے دن کے صدموں نے قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ اب اُس کی طبیعت بھی ذرا کھلنے لگی تھی۔ شاخ طبع سے جو پھول جھڑتے تھے اُن کی مہک میدان عالم میں پھیل کر دربار تک پہنچنے لگی۔ ۹۷۴ھ میں بادشاہی لشکر نے چتوڑ پر علم اُٹھائے تھے جو کسی تقریب سے دربار میں اس کا ذکر ہوا۔ کمال کے جوہری کو جواہر کے شوق نے ایسا بیقرار کیا کہ فوراً طلب فرمایا۔ دشمن بھی لگے ہی ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اس حسن طلب کو طلبی عتاب کے پیرایہ میں ظاہر کیا۔ اور حاکم آگرہ کے نام لکھا کہ فوراً گھر سے بلاؤ۔ اور سواروں کے ساتھ روانہ کرو۔ کچھ رات گئی تھی۔ کہ چند ترکوں نے آکر گھر پر غل مچایا۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ہم بادشاہ کے شوق کا گلدستہ لینے آئے ہیں۔ یا مجرم کے پکڑنے کو آئے ہیں۔ دشمنوں نے بہادرانِ شاہی کو بہکا دیا تھا۔ کہ شیخ بیٹے کو چھپائے رکھیگا۔ اور حیلے حوالے کریگا۔ ڈراوے اور دھمکاوے کے بغیر نہ دیگا۔ اتفاقاً فیضی باغ میں سیر کو گئے تھے۔ اور اہل حسد کا سارا مطلب یہ تھا۔ کہ وہ ڈر کر بھاگ جائے۔ کچھ نہ ہو تو شیخ اور

اُس کے عیال تھوڑی دیر پریشانی و سرگردانی میں نور ہیں۔ شیخ کو خبر ہوئی۔ اُس نے بے تکلف کہہ دیا کہ گھر میں نہیں۔ سپاہی اُزبک بے عقل۔ نہ خود کسی کی سمجھیں نہ کوئی اُن کی سمجھے۔ اس پر بادشاہی حکم اور شیطانوں کا دل میں وسوسہ ڈالا ہوا قریب تھا کہ خناسوں کا وسواس سچ کا رُوپ بدل کر فتنہ برپا کر دے کہ اتنے میں فیضی بھی آن پہنچے بے حیا بے شرم شرمندہ ہو گئے۔ آمدنی کے رستے بند تھے۔ سفر کا سامان کہاں! بلکے شاگردوں اور اہل ارادت کی سعی سے یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ اسی رات ہی کو فیضی روانہ ہوئے گھر اور گھرانے کے لوگ غم میں ڈوب گئے۔ کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ کئی دن کے بعد خبر پہنچی کہ خسرو آفاق نے غریب نوازی فرمائی ہے۔ کچھ خطرہ کا مقام نہیں ہے۔ فیضی بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئے۔ تو حضور جس بارگاہ میں تھے اُس کے گرد جالی کا کٹھرا تھا۔ انہیں باہر کھڑا کیا۔ یہ سمجھے کہ اس طرح کلام کا مزا نہ آئیگا۔ اُسی وقت قطعہ پڑھا قطعہ

بادشاہا درون پنجرہ ام	از سر لطف خود مرا بادہ
زانکہ من طوطیٔ شکر خائم	جائے طوطی درون پنجرہ بہ

اکبر اس حاضر کلامی سے بہت خوش ہوا اور پاس آنے کی اجازت دی۔ جو قصیدہ اوّل دربار میں پڑھا اُس کا مطلع یہ ہے ؎

سحر نوید رساں قاصد سلیمانی	رسید ہمچو سعادت کشادہ پیشانی

تین کم دو سو شعر ہیں۔ اور ہر شعر سے کمال شاعری کے ساتھ فضیلت اور فلسفہ و حکمت کے فوارے جاری ہیں۔ اور چونکہ رستے میں کہا ہے۔ اور موقع وقت سامنے ہے۔ اس لئے اکثر مناسب حال معلوم نہایت خوبصورتی سے ادا ہوئے ہیں چنانچہ بادشاہی سواروں کے پہنچنے پر جو گھر میں گھبراہٹ پڑی اور اپنی طبیعت کو جو اضطراب ہوا ہے۔ اس وقت کی پریشانی اور بے قراری کی حالتیں عجیب عجیب رنگ سے دکھائی ہیں اور جہاں موقع پایا ہے۔ دشمنوں کے مُنہ میں بھی تھوڑی خاک بھر دی ہے

ازاں زماں چہ نویسم کہ بود بے آرام	سفینۂ دلم از موج خیز طوفانی
گہے چو وہم سراسیمہ کز کدام دلیل	برم ظنون و شکوک از علوم ایقانی
چرا بود متخالف رسوم اسلامی	چرا بود متشابہ حروف فرقانی
زباں کشیدہ بدار القضائے عجب و ریا	شہود کذب زدعوئے گراں ایمانی
اگر حقیقت اسلام در جہاں اینست	ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

وہ بلند خیال شاعر کہ ایک شگفتہ مزاج عالم تھا۔ اپنی شگفتہ بیانی اور دانش خداداد اور فراخ دانی کی بدولت نہایت کم عرصہ میں درجہ مصاحبت تک پہنچ گیا۔ اور چند ہی روز میں ایسا ہوگیا۔ کہ مقام ہو۔ یا سفر کسی عالم میں بادشاہ کو اس کی جدائی گوارا بھی۔ اس نے اعلیٰ درجہ کا اعتبار پیدا کیا۔ ابوالفضل بھی دربار میں بلائے گئے۔ اور یہ عالم ہوا کہ مہمات سلطنت میں کوئی بات بغیر ان کی صلاح کے نہ ہوتی تھی۔ فیضی نے کوئی ملکی و مالی خدمت نہیں لی۔ اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ادھر ڈالتا۔ تو پہلے شاعری سے ہاتھ اُٹھاتا۔ لیکن ملک و مال کے جزوی جزوی معاملے اس کی صلاح پر منحصر تھے +

ایک پُرانی کتاب میرے ہاتھ آئی اس کے دیباچہ سے معلوم ہوا۔ کہ اس وقت تک ہندوستان کے بادشاہی دفتروں کے کاغذ ہندو ملازم ہندی اصول کے بموجب رکھتے تھے۔ ولایتی ہوتے تھے۔ تو اپنے طور پر لکھتے تھے۔ اور اس سے دفاتر شاہی میں عجب خلط ملط ہو رہا تھا۔ اکبر کے حکم سے ٹوڈر مل فیضی۔ میر فتح اللہ شیرازی۔ نظام الدین بخشی۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام مل کر بیٹھے۔ اور کاغذات دفتر کے لئے قواعد و ضوابط باندھے۔ اسی کے ضمن میں حساب کے قواعد بھی لکھے گئے۔ کہ سب محاسب ایک طور پر عملدرآمد کریں۔ اور تحریروں میں اختلاف نہ ہو +

جو شاہزادہ پڑھنے کے قابل ہوتا تھا۔ اکبر اس کی استادی سے فیضی کو اعزاز دیتا تھا۔ کہ تعلیم و تربیت کرو۔ چنانچہ سلیم۔ مراد۔ دانیال سب اس کے شاگرد تھے۔ اور اسے بھی اس امر کا بڑا فخر تھا۔ اپنی ہر تحریر میں دو باتوں کا شکر درگاہ الٰہی میں بجالاتا ہے۔ اوّل یہ کہ درگاہ شہنشاہی میں قربت ہوئی۔ دوسرے شہزادوں کی استادی سے اعزاز پایا۔ مگر بار بار ہزار عجز و انکسار سے کہتا ہے۔ کہ ان کے دل پر سب کچھ روشن ہے۔ مجھے آتا کیا ہے۔ جو انہیں سکھاؤں۔ میں اُن سے آپ آداب اقبال کا سبق لیتا ہوں +

نظر غور سے دیکھو ان کے اور ان کے حریفوں کی معرکہ آرائی کے انداز اور آئین جنگ۔ بالکل ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ حریف کہتے تھے۔ کہ سلطنت شریعت کے تابع ہے۔ ہم صاحب شریعت ہیں۔ اسواسطے صاحب سلطنت کو واجب ہے

کہ جو کچھ کرے ہماری اجازت بغیر نہ کرے۔ اور جب تک ہمارا فتوے ہاتھ میں نہ ہو۔ تب تک سلطنت کو ایک قدم بڑھانا یا ہٹانا جائز نہیں۔ اس کے مقابل میں ان کا دستور العمل یہ تھا۔ کہ صاحبِ سلطنت خدا کا نائب ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے۔ عین مصلحت ہے۔ اور جو مصلحت ملکی ہے وہی شریعت ہے۔ ہم کو ہر حال میں اس کا اتباع اور اطاعت واجب ہے۔ جو وہ سمجھتا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے۔ جو وہ حکم کرے اس کا بجالانا ہمارا فخر ہے۔ نہ کہ اس کا حکم ہمارے فتوے کا محتاج ہے +

آزاد۔ آج کل کے روشن دماغ کہتے ہیں۔ کہ دونوں بھائی حد سے زیادہ خوشامدی تھے۔ درست ہے۔ ان لوگوں کے سامنے بجلی چمکتی ہے۔ مگر پیچھے بالکل اندھیرا ہے۔ انہیں کیا خبر ہے۔ کہ موقع وقت کیا تھا۔ اور ان کا میدان کیسے پرانے پُر زور اور جنگ آزمودہ دشمنوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہی آئینِ جنگ اور یہی توپ و تفنگ تھے جنہوں نے ایسے حریفوں پر فتحیاب کیا۔ ایک امن امان کی حکومت ہے۔ جیسے محفل تصویر اس میں بیٹھ کر جو چاہیں باتیں بنائیں نئی سلطنت کا بنانا اور اپنے حسب مطلب بنانا اور پرانی جڑوں کو زمین کی تہ میں سے نکالنا انہیں لوگوں کا کام تھا جو کر گئے۔ خوشامد کیا آسان بات ہے۔ پہلے کوئی کرنی تو سیکھے۔ ۹۹۰ھ میں آگرہ۔ کالپی۔ کالنجر کی تحقیقات معافی کیلئے صدر الصدور کی مسند پر بیٹھے +

سلاطین چغتائیہ میں **ملک الشعرا** کا خطاب سب سے اوّل غزالی شہیدی کو ملا ہے۔ اس کے بعد شیخ فیضی کو ملا۔ یہ خطاب بھی اس نے اپنی درخواست سے نہ لیا تھا۔ اس کو اعلیٰ درجہ کی قربت اور اقتدار حاصل تھا۔ مگر اُس نے کسی منصب یا حکومت کی ہوس نہ کی۔ ملکِ سخن کی حکمرانی خدا سے لایا تھا۔ اسی پر قانع رہا۔ اور یہ کچھ تھوڑی نعمت تو نہیں تھی۔ اکبر نامہ میں شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ۹۹۶ھ میں یہ خطاب ہوا۔ اتفاق یہ کہ دو تین ہی دن پہلے شگفتگیِ طبع نے ایک قصیدہ کے اشعار میں رنگ کھایا ہے

آں روز کہ فیض عام کردند	مارا ملک الکلام کردند	مارا بہ تمام در ربودند
تا کارِ سخن تمام کردند	از بہرِ صعودِ فکرتِ ما	آرائشِ ہفت بام کردند

اکبر اُس کو اور اُس کے مرصّع کلام کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ بلکہ اُس کی بات بات کو خلعت اور دربار کا سنگار جانتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دونوں بھائی

ہر خدمت کو ایسی سنجیدگی اور خوبصورتی سے بجالاتے ہیں۔ کہ جو اس کے لئے مناسب ہے اُس سے بھی بہتر درجہ پر پہنچا دیتے ہیں۔ اور ہر کام جانفشانی اور دلی عرقریزی سے بجا لاتے ہیں۔ اس واسطے انہیں اپنی ذات سے وابستہ سمجھتا تھا۔ اور بہت خاطرداری اور دلداری سے کام لیتا تھا۔ فیضی کو کچھ فرمائش کی تھی۔ یہ حضور میں کھڑے لکھ رہے تھے۔ اکبر چُپ تھا اور ان کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ بیر بر بھی بڑے مُنہ چڑھے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے کچھ بات کی۔ اکبر نے آنکھ سے منع کیا۔ اور کہا۔ "حرف مے زنید شیخ جیو چیزے مے نویسد"۔ اس فقرے سے اور وقت اخیر کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بادشاہ اُنہیں شیخ جیو (شیخ جی) کہا کرتا تھا۔

اکبر کو آرزو تھی۔ کہ کل ہندوستان میرے زیر قلم ہو۔ اور سلاطین دکن ہمیشہ آزاد رہنا چاہتے تھے۔ اور اکثر آزاد رہتے تھے۔ چغتائیہ کے انداز حکومت بھی کچھ اور تھے۔ اہل دکن کو پسند نہ تھے۔ اور وہ اس طرح کی اطاعت کو بڑی بیعزتی سمجھتے تھے۔ کہ سکہ۔ خطبہ۔ بحالی۔ برطرفی۔ تبدیلی عطیہ۔ ضبطی وغیرہ میں کسی کے حکم کے تابع ہوں۔ اُن کی صورت حال ایسی تھی۔ کہ ان باتوں کو اکبر کھلم کھلا کہہ بھی نہ سکتا تھا۔ چنانچہ کبھی نامہ و پیام بھیجتا تھا۔ کبھی انہیں آپس میں لڑوا دیتا تھا۔ کبھی حدود دکن پر کسی امیر کو بھیج کر خود ہی لڑائی ڈال دیتا تھا۔ انہی میں بُرہان الملک فرمانروائے احمد نگر تھا۔ کہ اپنے ملک سے تباہ ہو کر دربار اکبری میں حاضر ہؤا۔ چند روز یہاں رہا۔ انہوں نے روپے اور سامان سے مدد کی۔ اور راجی علی خاں حاکم خاندیس کو بھی فرمان سفارشی لکھا۔ چنانچہ اس کی یاوری سے اپنے ملک پر قابض ہؤا۔ مگر جب حکومت حاصل ہوئی۔ تو جو انہیں اُمیدیں تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ اب ارادہ ہؤا کہ فوج کشی کریں۔ لیکن یہ بھی اُن کا آئین تھا۔ کہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا دوستی اور محبت کے نام سے کام نکالتے تھے۔ چونکہ وہاں کے حاکم شاہانہ زور رکھتے تھے۔ اور سکہ خطبہ بھی اپنے نام کا رکھتے تھے۔ اس لئے ۹۹۹ھ / ۱۵۹۱ء میں ایک ایک امیر دانا کو ہر ایک کے پاس بھیجا۔ راجی علی خاں حاکم خاندیس کی سفارت شیخ کے سپرد ہوئی۔ برہان الملک کی فہمائش امین الدین کے نام ہوئی۔ شیخ ابوالفضل کی تجویز سے یہ قرار پایا۔ کہ راجی علی خاں کے کام سے فارغ ہو کر شیخ فیضی اور امین الدین بُرہان الملک کے پاس جائیں۔ اور حقیقت میں راجی علی خاں ملک دکن کی کُنجی تھا۔

اور امارت موروثی عمر کی درازی عقل کی تدبیر۔ دولت وافر۔ جمعیت سپاہ نے اس کی کوشش کو ملک مذکور میں بڑی تاثیر دی تھی۔ مَیں نے فیضی کی وہ عرضداشتیں دیکھیں جو اُس نے وہاں پہنچ کر اکبر کو لکھی تھیں۔ ان سے رسوم زمانہ کے قانون اور اکبری دربار کے بہت سے آئین و آداب روشن ہوتے ہیں۔ اور ان آداب و آئین کا باندھنے والا کون تھا یہی آئین بند تھے۔ کہ ارسطو و اسکندر کو آئینہ گری سکھاتے تھے۔ عرائض مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اس خدمت سے جو اعتبار اور اعزاز کا عالی منصب تھا ہرگز خوش نہ تھا۔ وہ اپنے آقا کی حضوری کا عاشق تھا۔ چنانچہ حرف حرف سے افسوس جدائی اور اشتیاق مجرائی ٹپکتا ہے +

عرضی ایک رپورٹ ہے۔ جو اصل مقام اور رستہ کے جزوی جزوی حالات سے اطلاع دیتی ہے۔ مَیں یہاں صرف اُس صورت حال کا ترجمہ لکھتا ہوں۔ کہ کس طرح راجی علی خاں کو فرمان شہنشاہی دیا۔ اور خلعت پہنایا۔ اور خان مذکور کس طرح پیش آیا۔ فیضی لکھتے ہیں:۔

فدوی نے خیمے اور سرا پردے اُس شان سے ترتیب دئے تھے۔ جیسے بندگان درگاہ عالم پناہ کے لئے شایان ہوتے ہیں۔ سرا پردوں کے دو درجے کئے تھے۔ دوسرے درجے میں تخت عالی سجایا تھا۔ تمام زر لفت لپیٹ دیا تھا۔ اوپر مخمل زرباف کا شامیانہ تانا تھا۔ تخت پر شمشیر بادشاہی۔ خلعت خاصہ اور فرمان عالی رکھا تھا۔ امرائے موجودہ تخت کے گرد باداب شائستہ ترتیب سے کھڑے تھے۔ انعامی گھوڑے بھی آئین مناسب کے ساتھ سامنے تھے۔ راجی علی خاں اپنے ارکین اور وکلائے حکام دکن کو ساتھ لئے اُن آداب و قواعد کے ساتھ آیا۔ جو کہ بندگی اور دولتخواہی کے لئے لازم ہیں۔ دور سے پیادہ ہوا۔ جو سرا پردہ پہلے درجہ میں تھا اس میں بڑے ادب سے داخل ہوا۔ اور اپنے ہمراہیوں کو لئے آگے بڑھا۔ دوسرے سرا پردہ میں پہنچا۔ دُور سے تختِ عالی دکھائی دیا۔ تسلیم بجالایا اور ننگے پاؤں ہوا تھوڑی دور چلا تھا کہ کہا گیا یہاں ٹھہر جاؤ۔ اور تین تسلیمیں بجالاؤ۔ نہایت آداب سے تین تسلیمیں ادا کیں اور وہیں ٹھہرا رہا۔ تب بندہ نے فرمانِ معلّٰے کہ دونوں ہاتھوں پر لے کر اُسے ذرا آگے بُلایا اور کہا بندگانِ عالی حضرت ظلّ الٰہی نے کمال عنایت اور بندہ نوازی سے تمہیں

دو فرمان بھیجے ہیں۔ ایک یہ ہے۔ اس نے فرمان کو دونوں ہاتھوں میں لیا۔ ادب سے
سر پر رکھا۔ اور پھر تین تسلیمیں ادا کیں۔ بعد ازاں مَیں نے کہا۔ کہ دُوسرا فرمان میں ہوں
پھر تسلیم بجا لایا۔ تب مَیں نے کہا کہ حضور نے خلعت خاصہ عنایت فرمایا ہے۔ تسلیم بجا
لایا اور پہنا۔ اسی طرح تلوار کے لئے تسلیم کی۔ جب حضور کے حرف عنایت کا نام آتا
تھا تسلیمیں بجا لاتا تھا۔ پھر اس نے کہا برسوں ہوئے آرزو ہے کہ بیٹھ کر تم سے باتیں
کروں۔ یہ فقرہ اس نے کمال شوق سے کہا تھا۔ اس لئے مَیں نے کہا بیٹھئے۔ ادب سے
میرے سامنے بیٹھ گیا۔ بندہ نے مناسب وقت حکمت آمیز حقیقت آئین مطالب
بیان کئے۔ کہ جو اس کے قیام سعادت کی رہنمائی کریں۔ ان سب کا خلاصہ اوصاف الطاف
اور جاہ و جلال بندگان حضور کے تھے۔ اُس نے عرض کی حضرت کا بندۂ دولتخواہ ہوں۔ اُنہی
کا بنایا ہؤا ہوں۔ اُنہی کا نظر یافتہ ہوں۔ حضرت کی خوشی چاہتا ہوں۔ اور عنایت کا
امیدوار ہوں۔ مَیں نے کہا حضرت کی عنایت تم پر بہت ہے۔ تمہیں اپنوں کی نگاہ
سے دیکھتے ہیں۔ اور بندۂ خاص سمجھتے ہیں۔ اس سے زیادہ دلیل اس کی کیا ہوگی۔ کہ
مجھ جیسے غلام خاص کو تمہارے پاس بھیجا۔ متواتر تسلیمیں بجا لایا۔ اور خوش ہؤا۔ اس
عرصہ میں دو دفعہ اُٹھنے کو اشارہ کیا گیا۔ اس نے کہا۔ اس صحبت سے سیری نہیں
ہوتی جی چاہتا ہے شام تک بیٹھا رہوں۔ چار پانچ گھڑی بیٹھا۔ خاتمہ مجلس پر پان
اور خوشبو حاضر ہوئی۔ مجھ سے کہا تم اپنے ہاتھ سے دو۔ مَیں نے کئی بیڑے اپنے ہاتھ
سے دیئے بڑی تعظیموں سے لئے۔

پھر کہا گیا کہ بندگان حضرت کے دوام دولت کے لئے فاتحہ پڑھو۔ نہایت
ادب سے فاتحہ پڑھی۔ پھر کمال تواضع سے لب فرش کے پاس تخت کے سامنے کھڑا
ہؤا۔ بادشاہی گھوڑے حاضر تھے۔ باگ ڈور کو چوم کر کندھے پر رکھ لیا اور تسلیم کی۔
شاہزادۂ عالمیان شاہ مراد کا گھوڑا سامنے لائے تو اس کی باگ ڈور گلے میں لپیٹ کر
تسلیمیں کیں۔ اور رخصت ہؤا۔ بندہ کے آدمی گن رہے تھے کُل پچیس تسلیمیں کیں۔ بہت
کشادہ پیشانی تھا۔ اور خوش تھا۔ پہلی تسلیم پر مجھ سے کہا فرمایئے تو حضرت کے لئے
ہزار سجدے کروں۔ مَیں نے اپنی جان حضرت پر فدا کر دی ہے۔ خدوی نے کہا تمہارے
اخلاص و ارادت کے لئے تو یہی شایاں ہے۔ مگر سجدہ کے لئے حضرت کا حکم نہیں۔

خاصان درگاہ اپنے جوش اخلاص کے مارے سجدہ میں سر جھکا دیتے ہیں۔ تو حضرت منع فرماتے ہیں۔ کہ یہ درگاہ خدا ہی کے واسطے ہے +

ایک برس ۸ مہینے ۱۴ دن میں دونوں سفارتوں کا سرانجام کر کے سنہ ۱۰۰۱ھ میں حضور میں حاضر ہوئے۔ تعجب یہ کہ برہان الملک پر ان کا جادو نہ چلا۔ بلکہ جو پیشکش بھیجے وہ بھی مناسب حال نہ تھے۔ راجہ علی خاں تجربہ کار بڈھے تھے۔ انہوں نے اعلیٰ درجہ کے تحائف و نفائس عریضہ کے ساتھ بھیجے۔ اور بہت سے عجز و انکسار کے مضمون ادا کئے۔ یہاں تک کہ شاہانہ چیزوں کے ساتھ بیٹی بھی سلیم کے لئے بھیج دے۔ یہاں آکر پھر وہی مصاحبت وہی گرمجوشیاں وہی درباداریاں۔ شاعری پھول برساتی تھی۔ غور تصنیف کان سے جواہر نکالتی تھی۔ مگر اس سفر سے آکر زندگی کا طور کچھ اور ہو گیا تھا۔ اکثر خاموش رہتے تھے۔ اُسی عالم میں بادشاہ کی تحریک سے خمسہ پر پھر ہاتھ ڈالا۔ تفسیر وغیرہ کتابیں بھی اخیر ہی میں نکالیں۔ اُنہیں دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ یہ کرتے کیا تھے؟ آٹھ پہر کے دن رات کے تو یہ کام نہیں +

سنہ ۱۰۰۳ھ کے اخیر میں طبیعت بے لطف ہوئی۔ ضیق النفس (دمہ) تنگ کرنے لگا۔ ۴ مہینے پہلے دق ہو کر یہ رباعی زبان سے نکلی۔ رباعی

دیدی کہ فلک بمن چہ نیرنگی کرد	مرغ دلم از قفس بد آہنگی کرد
آں سینہ کہ عالمے درو مے گنجید	تا نیم نفس بر آورم تنگی کرد

اخیر میں سب سے دل اُٹھا لیا تھا۔ اور مرض بھی کئی جمع ہو گئے تھے۔ دو دن بالکل چُپ رہے۔ شاہ دانش نواز خود خبر کو آئے۔ پکارا تو آنکھ کھولی۔ آداب بجا لائے۔ مگر کچھ کہہ نہ سکے۔ دیکھ کر رہ گئے۔ ہائے افسوس اس موقع پر حکم بادشاہی کا زور کیا چل سکتا تھا۔ اُنہوں نے بھی رنج کھایا۔ اور آنسو پی کر چلے گئے۔ بادشاہ اُسی دن شکار کو سوار ہوئے۔ آخرت کے مسافر نے بھائی سے کہا۔ تم حضور سے چار دن کی رخصت لے لو۔ چوتھے دن خود روانہ ہو گئے۔ ۱۰ صفر سنہ ۱۰۰۴ھ تھی جو فضل و کمال کے گھر سے نالہ و ماتم کا شور اُٹھا۔ شعر و سخن نے نوحہ خوانی کی کہ لفظوں کا صراف اور معنی کا موقع کار مر گیا۔ بیماری کی حالت میں یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے +

گر ہمہ عالم بہم آید بجنگ	بے نشو و پائے یکے مور لنگ

مرنے کا وقت ایسا نازک ہوتا ہے کہ ہر شخص کا دل پگھل جاتا ہے۔ مگر حق تو یہ ہے۔ کہ ملا صاحب بڑے بہادر ہیں۔ دیکھو اس کے مرنے کی حالت کو کس طرح بیان کرتے ہیں۔ مَیں باحتیاط ترجمہ کرتا ہوں۔ محاورہ میں فرق رہ جائے تو اہل ذوق معاف فرمائیں۔ ۱۰ صفر کو ملک الشعرا فیضی اس عالم سے گذر گیا۔ چھ مہینے تک ایسے مرضوں کی شدت اُٹھائی کہ ضد ایک دوسرے کی تھے ضیق النفس۔ استسقا اور ہاتھ پاؤں کا ورم۔ خونی قے نے طول کھینچا۔ مسلمانوں کے جلانے کو کتوں سے گھلا ملا رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جان کندن کی سختی میں بھی کتے کی آواز نکلتی تھی۔ ایجاد شرائع اور دین اسلام کے انکار میں بڑا تعصب رکھتا تھا۔ اس لئے اس وقت بھی دین کے مقدمہ میں ایک متقی پرہیزگار صاحب علم سے لایعنی۔ بیہودہ کفر کی باتیں کہتا تھا۔ کہ اُس کے عادات میں داخل تھیں (شاید اس سے اپنی ذات بابرکات مراد ہے) پہلے بھی ان باتوں پر اسرار رکھتا تھا۔ اُس وقت بھی کہتا رہا۔ یہاں تک کہ اپنے ٹھکانے پہنچا۔ **تاریخ** وے فلسفی و شیعی و طبعی دہری۔ ایک اور ہوئی قاعدہ الحاد شکست (کئی تاریخیں اور ایسی ہی ناموزوں کہی ہیں۔ کہاں تک لکھوں پھر لکھتے ہیں۔) آدھی رات تھی۔ اور وہ حالت نزع میں تھا۔ کہ بادشاہ خود آئے۔ بیہوش تھا محبت سے اس کا سر پکڑ کر اُٹھایا۔ اور کئی دفعہ پکار پکار کر کہا۔ شیخ جیو۔ ہم حکیم علی کو ساتھ لائے ہیں۔ تم بولتے کیوں نہیں۔ بے ہوش تھا۔ صدا ندا کچھ نہ تھی۔ دوبارہ پوچھا تو پگڑی زمین پر دے ماری۔ آخر شیخ ابوالفضل کو تسلی دے کر چلے گئے۔ ساتھ ہی خبر پہنچی کہ اس نے اپنے تئیں حوالہ کر دیا (مر گیا) اتنا کہہ کر بھی مُلّا صاحب کا دل خالی نہ ہوا۔ خاتمۂ کتاب میں شعرا کی ذیل میں پھر لکھتے ہیں۔ فنون جزئیہ میں مثلاً شعر معما عروض قافیہ تاریخ لغت طب خط انشا میں اپنا عدیل زمانے میں نہ رکھتا تھا۔ اوائل میں تخلص **مشہور** سے شعر کہے۔ آخر میں چھوٹے بھائی کے خطاب کی مناسبت میں کہ اُس کو علّامی لکھتے ہیں۔ شان بڑھانے کو **فیاضی** اختیار کیا۔ مگر مبارک نہ ہوا۔ ایک دو مہینے میں رخت زندگی باندھ کر گگھرٹ کے گگھرٹ حسرت ہمراہ لے گیا۔ سفاہت اور سفلہ پن کا موجد۔ غرور گھمنڈ اور کینہ کا مخترع۔ نفاق۔ خباثت ریا۔ حب جاہ۔ نمود اور شیخی کا مجموعہ تھا۔ اہل اسلام کے عناد و عداوت کی داد دی۔ اور اصل اصول دین کے طعن میں صحابہ کرام اور تابعین

کی مذمت میں اور اگلے پچھلے متقدمین متاخرین مشائخ کے باب میں کہ مر گئے اور زندہ ہیں بے اختیار اور بے دھڑک بے ادبی کرتا تھا۔ سارے علماء صلحا و فضلا کے باب میں خفیہ اور ظاہر رات اور دن یہی حال تھا۔ کل یہود و نصاریٰ ہنود اور مجوس اس سے ہزار درجہ بہتر۔ چہ جائے نظاریہ اور صباحیہ۔ تمام حرام چیزوں کو دین محمدی کی ضد سے مباح جانتا تھا۔ اور فرائض کو حرام۔ جو بدنامی سو دریاؤں کے پانی سے نہ دھوئی جائیگی۔ اس کے دھونے کو تفسیر بے نقط عین حالت مستی اور جنابت میں لکھا کرتا تھا۔ کتے اِدھر اُدھر سے پامال کرتے پھرتے تھے۔ یہاں تک کہ اسی انکار اور گھمنڈ کے ساتھ اصلی قرارگاہ کو بھاگ گیا۔ اور ایسی حالت سے گیا۔ کہ خدا دکھائے نہ سنائے۔

جس وقت بادشاہ عیادت کو گئے تو کتے کی آواز سنی اُن کے سامنے بھونکا۔ اور یہ بات خود سر دربار بیان فرمائی۔ منہ سوج گیا تھا۔ اور ہونٹ سیاہ ہو گئے تھے یہاں تک کہ بادشاہ نے شیخ ابوالفضل سے پوچھا۔ کہ اتنی سیاہی ہونٹوں پر کیسی ہے۔ شیخ نے مستی ملی ہے۔ اس نے کہا خون کا اثر ہے۔ قے کرتے کرتے سیاہ ہو گئے ہیں۔ بے شک جو مذمت اور طعن حضرت خاتم المرسلین کی شان میں کرتا تھا۔ اُس کے مقابل میں یہ باتیں پھر بھی بہت کم تھیں۔ رنگ رنگ کی تاریخیں مذمت آمیز لوگوں نے نکالی ہیں۔" مُلّا صاحب یہاں چھ تاریخیں موذی الفاظ میں لکھ کر پھر اس کی رُوح کو ایذا دیتے ہیں۔ ہاں صاحب جو اس کے اور اس کے باپ بھائی کے حقوق آپ پر ہیں وہ ادا نہیں ہوئے۔ کچھ اور دھواں دل میں باقی ہو۔ وہ بھی نکال لیجئے۔ جب وہ بے چارہ جیتا تھا اُسوقت بھی تمہارے بگڑنے پر نہ بگڑا بلکہ مصیبت میں کام ہی آتا تھا۔ اب مر گیا ہے جو چاہو سو کہہ لو ؎

سنا لے اور بھی دو گالیاں بہت اچھا	یہ کیا کہنا مجھے او بد زباں بہت اچھا

پھر مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ ٹھیک چالیس برس تک شعر کہتا رہا۔ مگر سب بے ٹھیک۔ استخواں بندی۔ خاصی مگر بے مغز اور سراپا بے مزہ۔ وادی شطحیات و فخریات و کفریات میں مشہور سلیقہ رکھتا تھا۔ لیکن ذوق حقیقت و معرفت اور چاشنی رُوحانی و عرفانی اور قبول خاطر عدانہ کرے۔ باوجودیکہ دیوان اور مثنوی میں ۲۰ ہزار سے

زیادہ شعر ہیں۔ مگر اس کی بجھی ہوئی طبیعت کی طرح ایک بیت میں بھی شعلہ
نہیں۔ مطرودی اور مردودی کے سبب سے کسی نے اُس کے کلام کی ہوس نہ کی برخلاف
اور ادنے شاعروں کے ؎

شعرے کہ بود ز نکتہ سادہ — ماند ہمہ عمر بیک سوادہ

اور عجب تر یہ ہے۔ کہ ان چھوٹے موٹے ڈھکوسلوں کی نقل کرنے میں بڑی
بڑی رقمیں تنخواہوں میں خرچ کیں اور لکھوا لکھوا کر دوست آشناؤں کو دور و نزدیک
بھیجے کسی نے بھی دوبارہ نہ دیکھا ؎

شعر تو مگر ز حرمتت ستر آموخت — کز گوشۂ خانہ میل بیروں نکند

یہاں شیخ فیضی کی وہ عرضی نقل کرتے ہیں۔ جو انہوں نے دکن سے ان کی
سفارش میں بادشاہ کو لکھی ہے۔ اور بعد اس کے پھر لکھتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ اس
کی طرف سے وہ محبت و اخلاص اور اُس کے مقابلہ میں اس قدر مذمت اور درشتی۔
یہ کیا مروت و وفا کا آئین ہے؟ خصوصاً مرنے کے بعد اس طرح کہنا عہد شکنوں میں
داخل ہونا۔ اور لاتذکروا موتکم الا بالخیر سے غافل ہونا ہے۔ یہ کیا زیبا
ہے؟ ہم کہیں گے یہ درست مگر کیا کیجئے کہ حق دین اور اس کے عہد کی حفاظت
سب حقوں سے بالاتر ہے۔ الحب للہ والبغض للہ قاعدہ مقررہ ہے مجھے چالیس
برس کامل اس کی مصاحبت میں گزرے۔ مگر وضعیں اس کی جو بدلتی گئیں اور
مزاج میں فساد آتا گیا اور حالتوں میں خلل پڑتا گیا۔ ان کے سبب سے رفتہ رفتہ
(خصوصاً مرض موت میں) سب تعلق جاتا رہا۔ اب اُس کا حق کچھ نہ رہا۔ اور صحبت بگڑ
گئی۔ وہ ہم سے گئے ہم اُن سے گئے۔ باوجود ان سب باتوں کے ہم خدا کی درگاہ میں
چلنے والے ہیں۔ یہاں سب کا انصاف ہو جائیگا۔ الاخلاء یومئذٍ بعضہم
لبعض عدوٌ الا المتقین (مُلا صاحب فرماتے ہیں) مال متروکہ میں سے
چھ ہزار چھ سو جلدیں نفیس صحیح کی ہوئی تھیں۔ جنہیں بطریق مبالغہ کہہ سکتے ہیں۔
کہ اکثر بخط مصنف یا عہد تصنیف کی تھیں۔ سب سرکار بادشاہی میں داخل ہو گئیں
فہرست پیش ہوئی تو تین قسموں میں تقسیم کیں۔ اعلیٰ نظم۔ طب۔ نجوم۔ موسیقی۔
اوسط حکمت۔ تصوف۔ ہیئت۔ ہندسہ۔ ادنیٰ تفسیر۔ فقہ اور باقی شرعیات+

ان میں ایک سو جلدیں نلدمن کی تھیں باقی کس شمار میں ہیں۔ مرنے سے چند روز پہلے بعض آشناؤں کے بہت کہنے سے چند بیتیں نعت اور معراج میں لکھ کر درج کر دی تھیں +

آزاد۔ ملا صاحب جو چاہیں فرمائیں۔ اب دونوں عالم آخرت میں ہیں۔ آپس میں سمجھ لیں گے۔ تم اپنی فکر کرو۔ وہاں تمہارے اعمال سے سوال ہوگا۔ یہ نہ پوچھینگے۔ کہ اکبر کے فلاں امیر نے کیا کیا لکھا۔ اس کا عقیدہ کیا تھا۔ اور تم اس کو کیسا جانتے تھے اور جہانگیر کے فلاں نوکر کا کیا کیا معاملہ تھا اور تم اسے کیا جانتے ہو ؎

کیا کہیں گے جو وہ پوچھیگا کیا کیا تم نے	اے ظفر ہم کو اگر خوف و خطر ہے تو یہی

اتنا تو پھر بھی کہونگا کہ نلدمن ہر کتب فروش کی دُکان میں ملتی ہے۔ جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ پونے دو سو شعر کی نعت مع کیفیت معراج اس نزاکت اور لطافت اور بلند پروازی کے ساتھ لکھی ہے۔ کہ انشاء پردازی اس کے قلم کو سجدہ کرتی ہے۔ نعت کا مطلع ہی دیکھو جواب ہو سکتا ہے؟ ؎

آں مرکز دورِ ہفت جدول	گرداب پسیں و موج اوّل

اب میں شیخ فیضی کی تصنیفات کی تفصیل اور ہر کتاب کی کیفیت حال لکھتا ہوں +

دیوان خود مرتب کیا اور دیباچہ لکھ کر لگایا۔ **طباشیر الصبح** نام رکھا۔ جب ترتیب دیا تو ایک دوست کو اس کی خوشخبری لکھ کر دل خوش کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰ برس سے زیادہ کی کمائی ہے۔ نو ہزار بیت کا ہے۔ غزلیں سلیس اور شستہ فارسی زبان میں ہیں۔ استعاروں کے پیچوں سے بہت بچتے ہیں۔ اور لطف زبان کا بڑا خیال رکھتے ہیں جس پر انہیں قدرت کامل حاصل ہے۔ باوجود اس کے اہل زبان کے حرف بحرف تابع ہیں۔ طبیعت جوش میں آتی ہے مگر زبان حد اعتدال سے نہیں بڑھ جاتی۔ اور اپنی طرف سے ایک نقطہ تصرف بھی نہیں کرتی۔ میں ضرور کہتا کہ سعدی کا انداز ہے۔ مگر وہ حسن و عشق میں زیادہ ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ حکمت اور نفس ناطقہ کی حقیقت اور خودی میں۔ خداشناسی اور شکوہ و معانی اور فخریہ و بلند پروازی کی ہوا میں اُڑتے ہیں۔ کفر و الحاد کے دعووں میں بڑے زور دکھاتے ہیں۔ حسن و عشق میں

نظم ایشیا کے اُستاد ہیں۔ ان کا نام فقط عادت کے سبب سے زبان پر آجاتا ہے۔ وہ فاضل کامل ہیں اور زبان عربی کے ماہر۔ کہیں کہیں ایک ایک مصرعہ یا آدھا آدھا مصرعہ عربی کا لگا جاتے ہیں۔ تو عجب مزہ دیتا ہے۔

قصائد میں متقدمین کے قدم بقدم چلے ہیں۔ اور جو کچھ کہا ہے نہایت برجستہ کہا ہے۔ غزلیں معہ قصائد بیس ہزار شمار میں آئی ہیں۔ اکبر کو جو اُن کا کلام پسند تھا۔ سبب اُس کا یہ تھا کہ اوّل تو عام فہم ہوتا تھا۔ صاف سمجھ میں آتا تھا۔ دوسرے اپنے آقا کی طبیعت کو سمجھ گئے تھے۔ اور حالات موجودہ کو دیکھتے رہتے تھے۔ وقت کو خوب پہچانتے تھے۔ اور طبیعت لائے تھے۔ حسب حال خوب لکھتے تھے۔ اور عین محل کہتے تھے۔ مطلب کو نہایت خوبصورتی اور برجستگی سے ادا کرتے تھے۔ دل لگتی اور من بھاتی بات ہوتی تھی۔ اکبر سُن کر خوش ہو جاتا تھا اور سارا دربار اُچھل پڑتا تھا۔

اکبر احمد آباد گجرات وغیرہ کی مہمیں فتح کر کے پھرا تو تمام فوج پیچھے پیچھے سب وہیں کی وردی۔ وہیں کے ہتھیار سجے۔ اکبر خود سپہ سالاروں کی طرح ساتھ۔ وہی لباس وہی اسلحہ۔ وہی دکن کا چھوٹا سا برچھا کندھے پر رکھے آگے آگے چلا آتا تھا۔ فتح پور کے قریب پہنچا تو کئی کوس آگے امرا استقبال کو حاضر ہوئے۔ فیضی نے بڑھ کر غزل پڑھی۔ (اکبر ان دنوں فتح پور سیکری میں بہت رہتا تھا) **مطلع**

نسیم خوش دلی از فتح پور مے آید		کہ بادشاہِ من از راہِ دُور مے آید	

۹۹۷ھ میں جب کشمیر کی مہم سے اطمینان ہوا تو بادشاہ گلگشت کو پہنچے۔ موسم بہار سے دل شگفتہ ہوئے فیضی نے جھٹ قصیدہ لکھا ہے۔ **مطلع**

ہزار قافلۂ شوق میکند شب گیر		کہ بارعیش کشاید بخطۂ کشمیر	

عرفی نے بھی کشمیر میں پہنچ کر بڑے زور کا قصیدہ لکھا ہے۔ مگر مضامین خیالیہ و بہاریہ میں بلند پروازی اور معنے آفرینی کی ہے۔ ان کا قصیدہ دیکھو۔ تو تمام مضامین حالیہ کی تصویر ہے۔ جب دربار شاہ یا جلسۂ احباب میں پڑھا گیا ہوگا۔ لٹا لُٹا دیا ہوگا۔ سفر کابل میں ڈکہ کی منزل پر اکبر گھوڑے سے گر پڑا۔ انہوں اس قطعہ سے آنسو پونچھے ہے

دوش از آسماں ضمیرم را		گرہ غصہ برجبیں اُفتاد	حالتے رخنت کز تصوّر آں

لرزہ در چرخ ہفتمین اُفتاد
خاکم اندر دہن مگر کز رخش
نور خورشید بر زمین اُفتاد
بلکہ روشن کند جہاں یکسر
کہ دلت نکتہ آفریں اُفتاد

ہم بسوے زحل غبار نشست
شاہ والا جلال الدین اُفتاد
چہ زیاں نور راز اُفتادن
بر زمیں نور چوں قریں اُفتاد
برخورد یارب از فروغ نظر

ہم در ابروے زہرہ چین اُفتاد
آسماں بانگ زد کہ غصہ مخور
نور را جوہر ایں چنیں اُفتاد
گفتم احسنت نکتہ گفتی
ہر کہ را دیدہ دوربین اُفتاد

عالم افروز باد آں جوہر
کہ بہ خورشید دلنشیں اُفتاد

میر قریش ایلچی توران آنے والا تھا۔ تجویز ہوئی کہ ۳۱؁ کا جلوس جشن قریب ہے اس میں اُس کی ملازمت ہو۔ دیوان خانۂ اٹک کی آئین بندی ہوئی۔ چنانچہ وہ حاضر ہوا۔ کشمیر فتح ہوا تھا۔ راجہ مان سنگھ بھی کوہستان سرحدی میں فرقہ روشنائی کی مہم مار کر آئے تھے۔ ہزاروں افغان قتل اور ہزاروں قید کر کے لائے تھے۔ فوج کی حاضری اور اُن کی حضوری بڑے شان و شکوہ سے دکھائی۔ شیخ فیضی نے قصیدہ پڑھا ✢

فرخندہ باد یارب بر مملکت ستانی
الرسبز خلافت آغاز قرن ثانی

انشائے فیضی جس کا حال ابھی بیان کرونگا۔ اس میں اکثر عرضداشتوں کی ذیل میں لکھتا ہے۔ آج صبح کا عالم دیکھ کر حضور پُر نُور کا خیال آیا۔ اور یہ غزل ہوئی۔ کہیں لکھتا ہے۔ باغ میں گیا تھا۔ فوّارے چھُٹ رہے تھے۔ حضور کی وہ تقریر یاد آئی۔ اور یہ شعر آبدار ٹپکا وغیرہ وغیرہ ✢

خمسہ۔ ۹۹۳؁ھ میں حضور کا حکم ہُوا کہ خمسۂ نظامی پر سب نے طبیعتیں آزمائی ہیں تم بھی فکر کی رسائی دکھاؤ۔ قرار پایا کہ:۔

مخزن اسرار پر	مرکز ادوار	۳ ہزار بیت کی لکھو۔ موجود ہے۔
خسرو شیریں پر	سلیمان و بلقیس	۴ ہزار بیت ہوں۔ اسکے متفرق اشعار ملتے ہیں۔
لیلیٰ مجنوں پر	نل دمن	کہ ہندوستان کے پرانے فسانوں میں سے ہے۔ ۴ ہزار بیت میں ہو ہر جگہ ملتی ہے ✢
ہفت پیکر پر	ہفت کشور	۵ ہزار بیت میں ہو۔ اسکا نام و نشان نہیں۔
سکندر نامہ پر	اکبر نامہ	اُتنے ہی شعروں میں ہو متفرق اشعار ہیں۔

پہلی کتاب اُسی دن شروع ہوئی۔ چند حروف بسم اللہ کی رموز میں ہوئے۔ اور اسی طرح نیرنگئ نفس۔ کیفیت سخن۔ قلم۔ آفرینش۔ دل۔ علم۔ نظر۔ تمیز۔ غرض جو کچھ

کہا تھا بادشاہ نے سُنا اور فرمایا۔ یہ مرّۃ القلوب ہے۔ باقی کتابوں کے بھی مختلف مقامات لکھے۔ مگر سلطنت کے کاروبار تھے۔ مہمات ملکی و مالی کے ہجوم تھے۔ اس لئے تین نسخے ناتمام رہے۔ ۱۰۰۳ھ میں اسے لاہور کے مقام میں ایک دن بادشاہ نے بلا کر پھر خمسہ کی تکمیل کے لئے تاکید فرمائی اور کہا کہ پہلے نل دمن تمام کر دو۔ چنانچہ چار مہینے میں کتاب مذکور لکھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ لطیف استعارے۔ رنگین تشبیہیں بلند مضامین۔ نازک خیالات۔ فصیح زبان۔ لفظوں کی عمدہ تراشیں اور دلکش ترکیبیں ادائے مطلب کے انداز دیکھنے کے قابل ہیں۔ جس دن حضور میں لے گیا۔ شگون کے کے لئے ۵ اشرفیاں بھی اس پر رکھیں۔ دعائیہ زبان پر۔ چہرہ کا رنگ کامیابی سے شگفتہ۔ دل خوشی سے باغ باغ۔ نذر گزرانی۔ فی الحقیقت جس کے قلم سے یہ تاج مرصع ہو کر اکبری دربار میں آئے۔ اور اکبر جیسے بادشاہ کے سامنے تعمیل فرمائش کے رتبے میں پیش ہو۔ صبح مراد کی بہار اسی کے لہلہاتے دل میں دیکھنی چاہیئے۔ میں نے انشا میں کئی رقعے دیکھے ہیں۔ دوستو عجیبت خوشی کے خیالات میں ختم کی خبریں دی ہیں +

بکرماجیت کے زمانہ میں کالیداس نامی صاحب کمال شاعر گذرا ہے۔ اس نے تو کتابیں بطور افسانہ اس نزاکت و لطافت سے نظم کی ہیں کہ جواب نہیں رکھتیں۔ ان میں سے ایک نل دمن کی داستان ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ فیضی ہی جیسا صاحب کمال ہو جو ایسے طلسم کی تصویر فارسی میں اُتارے۔ یہ کتاب ہندوستان اور ہندوستان کے شاعروں کے لئے فخر کا سرمایہ ہے۔ افسانۂ مذکور کی خوش نصیبی ہے۔ کہ فارسی کا شاعر بھی ملا تو ایسا ہی ملا۔ اہل زبان پڑھتے ہیں تو وجد کرتے ہیں۔ حق پوچھو تو مثنوی مذکور کی لطافت و نزاکت کا بڑا سبب یہ ہے۔ کہ سنسکرت زبان میں جو معنی آفرینی کے لطف تھے فیضی انہیں خوب سمجھتا تھا۔ ساتھ اس کے فارسی پر پوری قدرت رکھتا تھا۔ وہ اس کے خیالات ادھر لایا۔ اور اس طرح لایا کہ نزاکت اور لطافت اصل سے بڑھ گئی۔ اور فارسی میں ایک نئی بات نظر آئی اِس لئے سب کو بھائی +

ملا صاحب فرماتے ہیں۔ "ان دنوں ملک الشعرا کو حکم فرمایا کہ پنج گنج لکھو۔ کم و بیش پانچ مہینے میں نل دمن لکھی۔ کہ عاشق و معشوق تھے۔ اور یہ قصہ اہل ہند میں مشہور ہے چار ہزار دو سو شعر سے کچھ زیادہ ہیں۔ نسخہ مذکور مع چند اشرفیوں کے نذر گزرانا۔

نہایت پسند آیا۔ حکم ہُوا کہ خوشنویس لکھے۔ اور مُصوّر تصویریں کھینچے۔ اور نقیب خاں رات کو جو کتابیں سُناتے ہیں۔ اُن میں یہ بھی داخل ہو۔ مطلع کتاب یہ ہے ؎

اے در تنگ و پوے تو ز آغاز	عنقائے نظر بلند پرواز

اور حق یہ ہے۔ کہ ایسی مثنوی اس تین سو برس میں خسرو شیریں کے بعد ہند میں شاید ہی کسی نے لکھی ہو٭

آزاد۔ نعت کے جرم کی کیفیت ابھی سُن چکے۔ لطف یہ ہے کہ باوجود بیان مذکور کے شعرا کے سلسلہ میں آپ نے نشائی مہرکن کا حال لکھا ہے۔ پھر دینداری اور خوش اعتقادی و حُسنِ اخلاق وغیرہ کے اوصاف کے ساتھ اُس کے اشعار سے فیضی کی مٹی خراب کی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ کہ فیضی کو جس قصیدہ پر بڑا ناز ہے وہ یہ ہے۔

شکرِ خدا کہ عشق بتانست رہبرم	در ملّتِ برہمن و در دینِ آذرم

نشائیؔ نے اِس پر لکھا ہے ؎

شکرِ خدا کہ پیروِ دین پیغمبرم	حُبِّ رسول و آلِ رسول است رہبرم

نشائیؔ نے نل دمن پر بھی کچھ اشعار لکھے تھے۔ باوجودیکہ حضرت کتاب مذکور کو خودِ پسند کا خلعت پہنا چکے تھے۔ مگر اس پر بھی رہ نہ سکے۔ نشائیؔ نے جو خاکہ اُڑایا تھا۔ آپ نے اس میں سے پینتالیس شعر لکھ ہی دیئے۔ **مثنوی**

چند زنی لاف کہ در ساحری	سامریم سامریم سامری	ہر نفسم معجزۂ عیسویست
شعلۂ نور شجرِ موسویست	در سخنم نادرۂ روزگار	اہل سخن را منم آموزگار
ہر نفسم پردۂ جادو شکیب	ہر سخنم سحرِ ملائک فریب	خسروِ مُلکِ ہمہ دانی منم
عالمِ اقلیم معانی منم	جوہرِ ہر سلکِ سُخندانیم	صیرفی نقد سخن رانیم
این منم امروز دریں داوری	شعلۂ آتش بزباں آوری	دعوے ایجاد معانی مکن
شمع نۂ چرب زبانی مکُن	شعلہ سر شناز گہرہائے پاک	لاف مزن نیست چو در کیسہ خاک
طبع تو ہرچند در ہوش زد	یک سخن تازہ نشد گوش زد	آنچہ تو گفتی دگراں گفتہ اند
دُر کہ تو سفتی دگراں سفتہ اند	خانہ کہ از نظم بیارا ستی	آب و گلش از دگراں خواستی

سقف منقش کہ درین خانہ است
رنگ زرے از خانۂ بیگانہ است
طبع تو دارد روش باغباں

ساختہ باغے ز نہال کساں
سبزۂ آں باغ ز راغ دگر
ہر گل رعناش ز باغ دگر

غنچۂ آں گرچہ رواں پرور است
لیک ز خون جگر دیگر است
بید کہ بے میوہ سرے برکشید

ہر کس ازاں دانہ مشجر کشید
تازگیٔ آں نہ ز باران تُست
از خوئے پیشانیٔ یاران تست

چند پئے نقد کساں سوختن
چشم بمال دگراں دوختن
جمع مکن نقد سخن پروراں

کیسہ مکن پُر ز زر دیگراں
شربت بیگانہ فراموش کن
آب ز سر چشمۂ خود نوش کن

گر خضری آب حیات تو کُو
در شکری شاخ نبات تو کُو
نخل صفت سر بفلک میبری

میوہ بجز خستہ نمے آوری
سرو کہ بر چرخ بساید سرش
چاشنیٔ میوہ نباشد برش

بر سخن خویش تفاخر چراست
بر من دل خستہ تمسخر چراست
من اگر از شرم نگویم سخن

حمل بہ بیدانشیٔ من مکن
نے چو رطب سینہ پر از خستہ ام
ہمچو صدف پُر دُر و لب بستہ ام

من اگر از بند کشائم زباں
لب بکشائید زباں آوراں
طعنہ چو ابلیس بآدم مزن

حالت من در نگر و دم مزن
سامریم من کہ بزور فسُوں
لعبتے از سحر بر آرم بروں

غلغلہ در زہرہ و ماہ افگنم
نسخۂ ہاروت بچاہ افگنم
ایں منم آں ساحر جادو مزاج

کز سخنم یافتہ جادو رواج
من کہ بجادو سخنی شہرہ ام
ہم فلک و ہم مہ و ہم زہرہ ام

سامریاں در گرہ موئے من
بابلیاں در چہ جادوے من
دولت ایں کار بکام من است

سکّہ ایں ملک بنام من است
از سخنم طرز سخن یاد گیر
عار مکن دامن اُستاد گیر

ہر کہ باستاد ارادت برد
در دو جہاں گنج سعادت برد
یک سخن از نظم تو نبود درست

مضحکۂ اہل سخن نظم تست
گرچہ بروے تو نگوید کسے
عیب تو پیش تو بجوید کسے

لیک عقیب تو ملامت گراں
بر تو رسانند گراں تا گراں
شعر ترا گر بمیاں آورند

عیب تو یک یک بزباں آورند
شعر ترا پیش تو تحسیں کنند
در پس تو لعنت و نفریں کنند

نے تو بکس یار و نہ کس با تو یار
عیب تو بر تو نشود آشکار
وہ کہ یکے یار نداری دریغ

مونس و غم خوار نداری دریغ
تا بتو عیب تو نماید کہ چیست
تانچہ بجیب تو کشاید کہ چیست

مرکز ادوار سنہ ۱۰۰۴ھ میں شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں۔ کہ اُن کے کلام کی تلاش و ترتیب کے حالت میں ایک بیاض نظر آئی۔ کہ بہت شوریدہ لکھی ہوئی تھی۔ معلوم ہُوا کہ عالم بیماری میں اکثر زیر قلم رہتی تھی۔ اشعار کو دیکھا تو مراۃ القلوب (مرکز ادوار) کے وزن میں تھے پڑھی

نہ جاتی تھی۔ اُن کے ہم نشینوں اور ہمزبانوں سے کہا۔ وہ مل کر بیٹھے اور نا اُمید ہو کر اُٹھے۔ آخر میں متوجہ ہوا نور آگاہی اور دانش الٰہی سے بڑھ کر مطلب مطلب۔ اور مضمون مضمون کے شعر الگ الگ لکھے۔ اور ترتیب دے کر داستان داستان نئی سُرخی کے نیچے لکھی۔ جس پریشان نظم و نثر سے سخن آشنا مصاحبوں کا فکر نا امید ہو گیا تھا۔ وہ مرتب ہو کر تیار ہو گئی۔ جب مَیں نے اپنے بھتیجے[1] کو زندگی جاوید کا مژدہ سُنایا۔ مجھ پر شادمانی اور اس پر حیرانی چھا گئی۔ باقی تین کتابوں کے بھی کچھ اشعار اور بعض داستانیں لکھی تھیں۔ چنانچہ کچھ کچھ ان میں سے اکبرنامہ میں درج ہیں۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ فارسی کا کل کلام نظم و نثر پچاس ہزار بیت اندازہ میں آیا ہے۔ ترتیب کے وقت یہ بھی معلوم ہوا کہ پچاس ہزار اشعار اہل زمانہ کی طبیعتوں سے بلند دیکھ کر خود دریا برد کر دیئے تھے۔ بعض کتابوں میں ہے۔ کہ ۱۰۰۶ھ میں اس کی ترتیب تمام ہوئی۔

لیلاوتی۔ حساب کی کتاب سنسکرت میں تھی۔ اُس کے منہ سے ہندوستان کا اُبٹنا دھو کر فارس کا گلگونہ ملا۔ ذرا دیباچہ کی ابتدا دیکھنا کس انداز سے اُٹھے ہیں۔ رباعی

اوّل بثنائے بادشاہی گویم ۔ وانگہ بستائش آلٰہی گویم
ایں عقدۂ معنی بقلم بکشائیم ۔ دیں نکتۂ سربستہ کماہی گویم

رسم است کہ چوں بدرگاہ بادشاہی مشرف شوند نخست از مقربان بارگاہ توسل جویند ایں جا یگانۂ صمدیت و مقرب بارگاہ احدیت حضرت بادشاہ حقیقت آگاہ است۔ خلد اللہ ملکہ وابقاہ ؎

خواہی کہ چو من راہ ہدا ے بشناسی ۔ نشناختہ راہ راہ کجا بشناسی
ایں سجدۂ ناقبول سودت ندہد ۔ اکبر بشناس تا خدا بشناسی

مہابھارت کا ترجمہ بادشاہ نے دیا کہ نثر درست کر دو اور مناسب مقام پر نظم سے آرائش دو۔ دو پرب (فن) درست کئے تھے کہ اس سے زیادہ ضروری کام عنائیت ہو گئے اور آرائش ناتمام رہی۔

بھاگوت اور **اتھرون بید** کو بھی کہتے ہیں۔ کہ فارسی میں ترجمہ کیا مگر کتاب سے

[1] شاعر کے اشعار اس کے فرزند معنوی ہوتے ہیں۔ اسی رشتہ سے اُنہیں اپنا بھتیجا کہا ہے اور جب پریشان اشعار کو مرتب کر کے کتاب بنا دیا تو اسے زندگی جاوید حاصل ہو گئی۔

ثابت نہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ فیضی عالم نوجوانی میں بنارس پہنچا اور کسی بڑے گنوان پنڈت کی خدمت میں ہندو بن کر رہا۔ جب تحصیل کر چکا۔ تو رخصت کے وقت راز کھولا اور عفو تقصیر چاہی۔ اُس نے افسوس کیا۔ مگر اس کی ذہانت اور قابلیت سے بڑا خوش تھا۔ اس لئے عہد لے لیا۔ کہ **گاتیری** کا منتر اور **چاروں وید** بھاشا یا فارسی میں نہ کرنا۔ اس کہانی کا بھی سُراغ نہیں ملتا *

اساتذۂ سلف کی کتابوں سے جو عمدہ مقام پسند آیا۔ اُسے لکھتے گئے تھے وہ عجیب گلدستۂ نظم و نثر کا شیشۂ عطر کا مجموعہ تھا۔ شیخ ابو الفضل نے اس پر دیباچہ لکھا تھا (دیکھو حال ابوالفضل)

انشائے فیضی۔ ۱۰۳۵ھ میں نور الدین محمد عبداللہ خلف حکیم عین الملک نے ترتیب دی ہے۔ اور لطیفہ فیاضی اس کا نام رکھا ہے۔ باب اول میں عرضداشتیں ہیں۔ کہ اکثر سفارت دکن سے حضور بادشاہ میں عرض کی ہیں۔ یہ عرضیاں بڑی غور طلب رپورٹیں ہیں۔ کہ رموز سلطنت پر مشتمل ہیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہمیں بڑے بڑے نکتے سکھاتی ہیں۔ اوّل عجز و انکسار کے انداز۔ اور مجھے اس میں جتانے کے قابل یہ امر ہے کہ جب ہم ایشیا میں ہیں۔ اور ہمارے آقا کمال شوق سے آداب و تعظیم کے خریدار ہیں۔ تو ہمیں اس سے فائدہ اُٹھانے میں کیا عذر ہے۔ آقا کی خوشی بڑی گرانبہا شے ہے۔ جب قیمت میں فقط چند لفظ یا فقرے خرچ کر کے ملے اور ہم نہ لے سکیں تو ہم سے زیادہ کم عقل یا کم نصیب کون ہوگا۔ ساتھ ہی یہ ہے کہ فقط ایک خاکساری کا مضمون ہے جسے وہ انشا پرداز معنی آفرین کس کس طرح رنگ بدل کر پیش کرتا ہے اور مستعمل اور فرسودہ جنس کو کیسا خوش رنگ بنا بنا کر سامنے لاتا ہے۔ خدمت حضور سے جدائی کا رنگ بھی بہت ہے۔ اسے کس کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ اور اس کے ضمن میں یہ بھی کہ ایسی با اعتبار اور با اعزاز خدمت میری طبع کو کہ عاشق حضور ہے وبال معلوم ہوتی ہے۔ بعد اس کے اصل مطالب۔ پہلی عرضی میں اوّل رستہ کی حالت اپنی مملکت میں جس جس شہر سے گزرا ہے وہاں کی رُوداد۔ حاکم کی کیفیتِ کار روائی۔ اگر ضروری ہے تو ماتحتوں کی بھی خدمتگذاری۔ ملک دکن میں پہنچے تو سرزمین کی کیفیت۔ ملک کی حالت۔ ہر مقام میں پیداوار۔ پھول پھل کیا کیا ہیں۔ اور کیسے ہیں۔ اہل صنعت

کے صنائع۔ علما۔ حکما۔ شعراو غیرہ اہل کمال کے حالات اُن کی شاگردی کا سلسلہ کہ کن اُستادوں تک پہنچتا ہے۔ ہر ایک کی لیاقت۔ اخلاق۔ اطوار۔ ہر ایک پر اپنی رائے کہ کون پرانی لکیر کا فقیر ہے۔ کون نئی روشنی سے اثر پذیر ہے۔ اور کون ان میں سے حضوری دربار کے قابل ہے +

بعض لنگرگاہیں وہاں سے قریب ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے جاتے ہی سب طرف اپنے آدمی پھیلا دیئے تھے۔ چنانچہ ہر عرضی میں لکھتے ہیں۔ کہ میرا آدمی خبر لایا۔ فلاں تاریخ فرنگ کا جہاز اُترا۔ فلاں فلاں اشخاص روم کے ہیں۔ وہاں کے حالات یہ معلوم ہوئے۔ فلاں جہاز آیا۔ بندرعباس سے فلاں فلاں اشخاص سوار ہوئے۔ ایران کے فلاں فلاں اشخاص ہیں۔ وہاں کے یہ یہ حالات ہیں۔ عبداللہ خاں اُزبک سے ہرات پر لڑائی ہوئی۔ یہ تفصیل ہے۔ اور یہ انجام ہوا۔ آئندہ یہ ارادہ ہے۔ شاہ عباس نے تحائف تیار کئے ہیں۔ فلاں شخص کو ایلچی قرار دے کر حضور میں بھیجیگا۔ وہاں فلاں فلاں اشخاص عالم اور صاحب فضل و کمال ہیں +

عرائض مذکورہ سے اکبر کی طبیعت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے کہ کن کن باتوں سے خوش ہوتا تھا۔ اور باوجود سامان شہنشاہی کے ان اہل علم اور اہل دانش کے ساتھ کس درجہ بے تکلف تھا۔ اور یہ کیسی لطافت سے اُسے خوش کرتے تھے۔ اور کس درجہ کی ظرافت لطافت ہوتی تھی۔ جو اُس کے دل کو شگفتہ کرتی تھی۔ ان لطیفوں میں تم کو ایک نکتہ معلوم ہوگا۔ جو کہ مصلحت ملکی اور قانون حکمت سے آگاہ کریگا۔ وہ کیا ہ کم بخت اور منحوس جھگڑا تشیّع اور تسنّن کا۔ تم دیکھ چکے کہ علماء امرائے دربار تمام بخاری و سمرقندی تھے۔ اور کیسے زوروں پر چڑھے ہوئے تھے۔ مگر دیکھو گے اور سمجھو گے کہ انہوں نے اس معاملے کو کیسا خفیف کر دیا تھا۔ کہ دل لگی کا مصالح ہو گیا تھا۔ یہ عرضیاں بہت طولانی ہیں۔ میں ان میں سے ایک عرضی کی نقل لکھونگا۔ مگر اس میں سے بھی بعض مطالب کی عبارتیں چھوڑنی پڑینگی۔ کہ طبیعتوں کے ذوق بجھ نہ جائیں۔ اُن سے یہاں کچھ تعلق نہیں ہے +

ف۔ ان رقعوں میں جہاں شیخ ابوالفضل کا ذکر آیا ہے۔ تو انہیں نواب علامی۔ نواب اخوی۔ نواب اخوی علامی۔ کہیں اخوی شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں +

تفسیر سواطع الالہام - سنہ ۱۰۰۲ھ میں یہ تفسیر لکھی کہ علم و فضل کے ساتھ زور طبع اور حدت فکر کا زمانہ ہے۔ ۷۵ جزو کی کتاب تمام بے نقط قریب ایک ہزار بیت کے دیباچہ ہے۔ اُس میں اپنا۔ باپ کا۔ بھائیوں کا اور تحصیل علم کا حال ہے۔ بادشاہ کی تعریف اور قصیدہ لکھا ہے۔ ۹۹ فقرے کا خاتمہ ہے۔ کہ ادائے مطلب بھی ہے۔ اور ہر فقرہ تاریخ اختتام ہے۔ فضلائے عصر نے اس پر تقریظیں لکھیں۔ شیخ یعقوب کشمیری صیرفی تخلص نے زبان عربی میں لکھی۔ میاں امان اللہ سرہندی نے آغاز تصنیف کی تاریخ کہی۔ لارطب ولا یابس الا فی کتاب مبین نظر ثانی کرنے لگے تو خود اُس کی تاریخ **احرار الثانی** کہی۔ میر حیدر معمائی ایک فاضل کاشان ہے سے آئے تھے اُنہوں نے سورۂ اخلاص میں سے تاریخ نکالی۔ مگر بے بسم اللہ ۱۰۰۲۔ ملک الشعرا نے انہیں دس ہزار روپے انعام دیئے۔ مُلّا صاحب نے بھی دو تاریخیں اور ایک تقریظ لکھی یگر منتخب التواریخ میں جو بے نقط سُنائی ہیں تم دیکھ ہی چکے۔ یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ تفسیر مذکور میں مولانا جمال الدین تلہ[1] نے بہت اصلاح کی ہے۔ اور درست کردی ہے۔ خیر یہ جو چاہیں فرمائیں فیضی کو اس نعمت الٰہی کی بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے انشا میں کئی خط احباب علما کے نام ہیں۔ لکھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ پھولا نہیں سماتا۔ ان فقروں سے خوشی برستی ہے۔ ایک خط میں لکھتا ہے۔ دسویں[2] تاریخ ربیع الثانی سنہ ۱۰۰۲ھ کو میری تفسیر ختم ہوئی۔ لوگ تقریظیں[3] اور تاریخیں کہہ رہے ہیں۔ سید محمد شامی ایک بزرگ احمد نگر میں ہیں۔ اُنہوں نے بھی لکھی ہے۔ تم نے خود دیکھی ہوگی۔ مولانا ملک قمی نے اس کے باب میں رباعیاں کہی ہیں۔ تم نے سُنا ہوگا۔ مولانا ظہوری نے قصیدہ کہا ہے دیکھا ہوگا۔ یہاں بھی لوگوں نے خوب خوب چیزیں لکھی ہیں۔ اس میں خمسہ کے انتظام کی خوشخبری سُناتا ہے۔ بعض خطوط میں موارد الکلم کی خبریں بھی دیتا ہے۔

موارد الکلم۔ نصائح و مواعظ کی باتیں ہیں۔ کہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں لکھی ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے۔ کہ تفسیر مذکور لکھ کر طبیعت میں زور۔ زبان میں قدرت۔

---

[1] لاہور میں ایک محلّہ تھا۔ مولانا جمال الدین ان دنوں یہاں ایک فاضل کامل تھے اسی محلّہ میں رہتے تھے

[2] مولانا کمال الدین خطاط شیرازی کے نام انشا مذکور میں ایک خط ہے۔

[3] فیضی تقریظ کی جگہ اپنی تحریر میں توقیع لکھتے ہیں۔

کلام میں روانی اور لفظوں کی بہتات پیدا ہو گئی تھی۔ کہ جس پہلو سے چاہتا تھا مطلب ادا کر دیتا تھا۔ اس لئے وہی آیات و احادیث و کلام حکمار کے مضامین ہیں۔ جن کو بے نقط الفاظ میں ادا کیا ہے۔ **موارد الحکم سلک درر الحکم** تاریخی نام ہے ؛

ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ابتدا میں ایک رسالہ غیر منقوط بادشاہ ظل اللہ کے نام لکھا تھا۔ ملاحظہ کو بھیجتا ہوں۔ مگر بازیچۂ اطفال عرب ہے۔ کارنامہ صنادید ادب نہیں۔ **آزاد**۔ یہ رسالہ اب نہیں ملتا ؛

شیخ حسن کالپی وال کے نام بہت خط ہیں۔ ایک میں لکھتے ہیں۔ جب آؤ تو **مقصد الشعرا** ضرور لیتے آنا۔ کہ تذکرہ کا اختتام اس پر منحصر ہے۔ اور اور کتابوں میں سے بھی جو ہو سکے انتخاب۔ فرمائیے گا۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے دیباچہ میں آپ کا نام بھی لکھوں۔ **آزاد**۔ تذکرہ مذکور بھی نہیں ملتا۔ خدا جانے تمام بھی ہؤا تھا یا نہیں ؛

ان کی تصنیفات کی تعداد بعض کتابوں میں ۱۰۱ لکھی ہے۔ مگر مجھے اس شمار میں کلام ہے ؛

مذہب۔ فیضی اور ابوالفضل کے مذہب کا معاملہ اُن کے باپ کی طرح گو مگو رہا۔ ملائے بدایونی نے جو لکھا۔ تم نے دیکھ لیا۔ کوئی دہریہ کہتا ہے۔ کوئی آفتاب پرست بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ اس کی تصنیفات کو دیکھو۔ مگر اوّل سے آخر تک دیکھو۔ وہ بلند آواز سے پکار رہی ہے۔ کہ موحد کامل تھے۔ تب اس بدنامی نے کیونکر اشتہار پایا ؟ ہاں ذرا غور سے خیال کرو۔ کہ اکبر کے آغاز سلطنت اور اس سے پہلے ہمایوں اور شیر شاہ تک کے عہد میں مخدوم اور ان کے خادموں کے اختیارات کیسے بڑھے ہوئے تھے۔ تم نے دیکھ لیا کہ اُن کی خود بینی اور خود پسندی اور روکھی سوکھی دینداری کے زور دوسرے کو دنیا میں دیکھ نہ سکتے تھے۔ اُن کا یہ دعوے بھی تم نے دیکھ لیا۔ کہ علم فقط علم دین ہے۔ جو ہم ہی جانتے ہیں۔ اور جو ہم جانتے ہیں۔ اور جو ہم کہتے ہیں۔ وہی درست ہے۔ اور جو اس میں قیل و قال کرے وہ کافر۔ فیضی اور ابوالفضل نے آپ دیکھ لیا تھا۔ اور باپ سے اچھی طرح سُن لیا تھا۔ کہ ان بے دلیل دعویداروں کے ہاتھ سے کس آفت و عذاب میں عمر بسر ہوئی۔ تم یہ بھی جانتے ہو۔ کہ مخدوم و صدر نے قسمت کے زور سے ملک گیر بادشاہوں کے زمانے پائے تھے۔ اور شمشیر زنی اور فوج کشی کے

عہد دیکھے تھے۔ اب وہ زمانہ آیا کہ اکبر کو ملک گیری کم اور ملک داری کی زیادہ ضرورتیں پڑ رہی تھیں۔ انہیں یہ بھی یاد تھا کہ جب ہمایوں ایران میں تھا۔ تو شاہ طہماسپ نے ہمدردی کی خلوتوں میں اُس نے پوچھا۔ کہ سلطنت کی اس طرح خانہ بربادی کا کیا سبب ہؤا؟ اس نے کہا بھائیوں کی نااتفاقی۔ شاہ نے کہا۔ رعایا نے رفاقت نہ کی؟ ہمایوں نے کہا۔ کہ وہ غیر قوم اور غیر مذہب ہیں۔ شاہ نے کہا۔ اب کی دفعہ وہاں جاؤ۔ تو ان سے موافقت کر کے ایسی اپنایت پیدا کرو۔ کہ مخالفت کا نام درمیان نہ رہے۔ اکبر یہ بھی جانتا تھا۔ کہ مخدوم وغیرہ علما ہر دیگ کے چمچے ہیں۔ ہمایوں کے عہد میں اس کے خاص الخاص تھے۔ شیر شاہ ہؤا۔ اُسی کے ہو گئے۔ سلیم شاہ ہؤا اُسی کے ہو گئے۔ اور لطف یہ کہ وہ سب بھی جانتے تھے۔ بلکہ خاص خلوتوں میں بیٹھ کر کہتے تھے کہ اسے مخدوم نہ سمجھو۔ بابر کا پانچواں بیٹا ہند میں بیٹھا ہے۔ پھر بھی اس کی عظمت اور نذر و نیاز میں فرق نہ لاتے تھے۔ اکبر یہ بھی سمجھتا تھا۔ کہ ان عالموں نے بادشاہ اور امرائے بادشاہ کو ملک گیریوں کے لئے قربانی سمجھا ہے۔ ملک رانی اور حکمرانی کے مزے احکام شریعت کی آڑ میں ان کا شکار ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ بے ان کے فتویٰ کے بادشاہ کو ایک پتا ہلانے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ بے گناہوں کو قتل کروا دیتے تھے۔ خاندانوں کو تباہ کروا دیتے تھے۔ وُہ مُرِ مُرِ دیکھتا تھا اور دم نہ مار سکتا تھا۔ اکبر یہ بھی سمجھتا تھا۔ کہ بابر میرے دادا کو فقط ہموطن امرا کی نمک حرامی نے خاندانی سلطنت سے محروم کیا۔ اور جو ادھر کے ترک ساتھ ہیں۔ خاص نمک حرامی کا مصالح ہیں۔ عین وقت پر دغا دینے والے ہیں۔ اکبر یہ بھی دیکھ رہا تھا۔ کہ بہت ایرانی یا شیعہ میرے باپ کے ساتھ تھے۔ اور میرے ساتھ ہیں۔ وہ جاں نثاری کے میدان میں اپنی جانوں کو جان نہیں سمجھتے۔ باوجود اس کے انہیں دب کر اور اپنے مذہب کو چھپا کر رہنا پڑتا ہے۔ امرائے ترک انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا۔ کہ سب علما حسد کے پُتلے ہیں۔ آپس میں بھی ایک دوسرے کے روادار نہیں۔ روشن دماغ بادشاہ یہ سب حال دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ کہ کیا کرے اور کس طرح ان کے زوروں کو توڑے۔ اس نے ۹۸۲ھ میں ایک عالیشان مکان **چار ایوان** تیار کیا۔ اور عبادت خانہ قرار پایا۔ علما کا جلسہ ہوتا تھا۔ خود بھی شامل ہوتا تھا۔ ان سے تحقیق مسائل کرتا تھا۔ آپس میں مباحثے کرواتا تھا۔ اور ان کے جھگڑوں پر کان لگاتا تھا۔ کہ شاید اختلافوں میں کوئی

اتفاق مفید مطلب نکل آئے۔ فارغ التحصیل جوانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لیتا تھا۔ اور ان جلسوں میں شامل کرتا تھا۔ کہ اس زمانے کی آب و ہوا نے انہیں پالا ہے۔ جوان دماغ ہیں۔ جوان عقلیں ہیں۔ شاید مزاج زمانہ کے موافق رائے لائے ہوں۔ اور مصلحت زمانہ کے بموجب تجویزیں سوچتے ہوں +

دربار کی یہ کیفیت تھی۔ اور زمانہ کا وہ حال تھا۔ کہ شیخ فیضی پہنچے۔ پھر ملّا ئے بدایونی اور ساتھ ہی ابوالفضل بھی داخل دربار ہوئے۔ ان سب کی لیاقتیں ایک ہی تعلیم کا دودھ پی کر جوان ہوئی تھیں۔ تازے تازے علم طبیعتوں میں جوانی کے زور۔ ذہن تیز۔ فکر بلند۔ بادشاہ خود حمایت پر۔ اور سب جوان قریب العمر۔ ملّا صاحب کا حال دیکھو کہ سب سے پہلے نمبر پر ان کی بہادری نے فتح پائی۔ بڈھے بڈھے عالموں سے زبان بزبان اور کلہ بکلہ مقابلے ہوتے لگے۔ اور پرانی فضیلتیں جوانوں کی تقریروں سے اس طرح گرنی شروع ہوئیں۔ جیسے درخت سے پکے پھل گرتے ہیں۔ بے خبر لوگ شیخ مبارک فیضی و ابوالفضل کو مخدوم و صدر کے گرانے کا الزام دیتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے۔ کہ ان کا کچھ قصور نہ تھا۔ اب زمانے کا مزاج پرانے بوجھوں کا متحمل نہ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں سے نہ گرتے۔ تو خود بخود گرتے +

ان باپ بیٹوں کو جو دہریہ اور بدمذہبی کے الزام دیتے ہیں۔ یہ بھی تامّل کا مقام ہے۔ مجتہد کا کام کیا ہے؟ اصل مسئلہ کی صورت حال میں مصلحت مقام کا ہے۔ اور مناسبت وقت کا دیکھنا۔ دیکھو! شریعت کے اکثر احکام ایسے ملکوں کے لئے قرار دیئے گئے ہیں۔ جہاں جمعیت کثیر اہل اسلام کی تھی۔ اور غیر مذہب کے لوگ جزو ضعیف۔ صحرانشین۔ بے سروپا۔ خیال کرو۔ وہی احکام ایسے ملکوں میں کیونکر جاری کر سکتے ہیں۔ جہاں جمعیت قلیل اہل اسلام کی ہو اور گذارہ کرنا ان لوگوں کے ساتھ ہو۔ کہ جمعیت کثیر اور جم غفیر صاحب ملک اور صاحب شمشیر غیر قوم اور غیر مذاہب کے لوگ ہوں۔ اور ملک بھی اُنہیں لوگوں کو ہو۔ اچھا جاری کرتے ہو۔ کرو۔ بہت خوب سب کے سب شہید ہو جاؤ۔ مگر سمجھ لو۔ کہ یہ شہید کیسے شہید ہونگے +

بھلا مقتضائے وقت کے بموجب احکام نہ ہوتے۔ تو قرآن میں آیتیں منسوخ کیوں ہوتیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو خدا کیوں فرماتا۔ یمحواللہ مایشاء ویثبت وعندہٗ

ام الکتاب اکبر آخر ملک گیر اور ملک دار تجربہ کار بادشاہ تھا۔ وہ اپنے ملک کی مصلحت کو خوب سمجھتا تھا۔ اسی واسطے جب ان کے کسی فتوے کو خلاف مصلحت دیکھتا تھا۔ تو رد کرتا تھا۔ اور شریعت کی دلیل سے ان کا جواب چاہتا تھا۔ علمائے مذکور پہلے عربی فقرے اور علمی الفاظ بول کر اسے دبا لیتے تھے۔ اب اگر وہ بے اصول یا خلاف مصلحت گفتگو کرتے تھے۔ تو ابوالفضل و فیضی آیت یا حدیث سے کبھی علمائے سلف کے فتوے سے کبھی قیاس سے کبھی دلیل عقلی سے انہیں توڑ دیتے تھے۔ اور چونکہ بادشاہ کی رائے ان کی تائید پر ہوتی تھی۔ علما دیکھتے رہ جاتے تھے +

ملاّ ئے بدایونی تو کسی کا لحاظ کرنے والے نہیں جس کی بات بے جا سمجھتے ہیں۔ مونچھ پکڑ کر کھینچ لیتے ہیں۔ قاضی طوالیسی کے فتووں سے خفا ہو کر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالفضل کی وہ بات ٹھیک ہے۔ کہ اگر امام اعظم در زمانِ ما مے بود فقہے دیگر مے نوشت حریفوں کا اور بس نہ چلتا تھا۔ ان پر اور ان کے باپ پر قدیم سے زبانیں کھلی ہوئی تھیں۔ اب بھی رسوا کرتے تھے۔ کہ اُنہوں نے بادشاہ کو بد مذہب بنا دیا۔ ملا صاحب بھی رشک منصبی سے لبریز بیٹھے تھے۔ اگرچہ مخدوم اور شیخ صدر دونوں سے بیزار تھے۔ مگر ان کے معاملوں میں بھی یہ ہی حریفوں کے ساتھ ہمداستان ہو جاتے تھے۔ یہ بات تو بدیہی ہے۔ کہ باپ اور دونوں بیٹے علوم عقلی اور نقلی میں اعلیٰ درجہ کمال پر پہنچے ہوئے تھے۔ شیخ مبارک کی مہر فتووں پر لی جاتی تھی۔ لڑکوں کی جوانی نے ابھی یہ رتبہ انہیں نہ دیا ہو۔ لیکن اگر کسی مسئلہ میں یہ علمائے وقت سے اختلاف کریں۔ تو ایک مجتہد کی رائے کا دوسری رائے سے اختلاف ہے۔ جو ہمیشہ سے عام چلا آتا ہے۔ اور اس وقت بھی عام تھا۔ مجتہد اگر اپنے استنباط میں خطا کرے تو بھی مستحق ایک ثواب کا ہے۔ نہ یہ کہ اس کی تکفیر کی جائے +

البتہ ان کی تصنیفات کو بھی دیکھنا ضرور ہے۔ شاید ان سے کچھ عقاید کا حال کھلے۔ شیخ مبارک کی کوئی تصنیف اس وقت ہمارے ہاتھوں میں نہیں۔ لیکن یہ تو ثابت ہے کہ اسے سب مانتے ہیں۔ فیضی کی تفسیر **سواطع الالہام** اور **موارد الکلام** موجود ہے کہیں اہل فن کے اصول سے بال بھر نہیں سرکا۔ تمام آیات و احادیث اور بزرگوں کے کلمات و طیبات کے مضامین ہیں۔ زبانی باتوں میں ملا صاحب جو چاہیں کہیں۔ مگر

نفس مطالب میں جب نہ اب کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ وہ بے دینی و بدنفسی پر آجاتے۔ تو جو چاہتے لکھ جاتے انہیں ڈر کس کا تھا +

ابوالفضل کا کلام سبحان اللہ مطالب معرفت و حکمت میں اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہُوا ہے۔ دل میں کچھ ہوتا ہے جبھی زبان سے نکلتا ہے۔ ہانڈی میں جو ہوتا ہے۔ وہی ڈوئی میں آتا ہے۔ یہ خیالات ان پر اس طرح کیوں کر چھائے رہے تھے؟ ان کی عبارتوں کا یہ عالم ہے کہ ایک ایک نقطہ معرفت اور حکمت کا دریا بغل میں لئے بیٹھا ہے۔ اور یہ نہیں ہوتا جب تک کہ دل اور جان۔ حال و مقال سب اسی کے خیال پر وقف نہ کرے۔ اگر ان تحریروں کو فقط خیالات شاعرانہ اور عبارت آرائی اور انشا پردازی کہیں تو ان کی جان پر ظلم ہے۔ بھلا شعر و سخن کے سامان میں انہیں انہی کے خیالات کے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ عالم خیال کے بادشاہ۔ ملک سخن کے خُدا تھے جن مضامین میں چاہتے۔ اپنے مطالب کو رنگ دیتے۔ اور خلق و عالم سے واہ واہ لیتے +

بڑا الزام ان پر یہ ہے۔ کہ اکبر کو خالص مسلمان نہ رہنے دیا۔ صلح کل اور ملنساری کے رنگ سے رنگ دیا۔ آپ دہریہ تھے اسے بھی دہریہ کر دیا۔ میرے دوستو تین سو برس کی بات ہے۔ کیا خبر ہے۔ انہوں نے اُسے رنگ دیا۔ یا مطیع فرمان نوکر اپنے آقا کے مصالح ملکی میں رنگے گئے۔ اگر انہوں ہی نے رنگا۔ تو اس عقل رنگ آمیز کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ جو حریف کہ فتاوے شریعت کے بہانوں سے ہر وقت قتل کے درپے رہتے تھے۔ ان سے جان بھی بچائی۔ اور فتح بھی پائی +

وہ کہتے ہیں۔ کہ دنیا میں ہزاروں مذہب ہیں۔ خدا کا خود کیا مذہب ہے؟ ظاہر ہے کہ دنیا کے لحاظ سے ایک مذہب نہیں ہے۔ ورنہ وہ کل عالم کی پرورش کیوں کرتا؟ اپنے فیض کو عام کیوں رکھتا۔ اور سب کو ترقی کیوں دیتا۔ ایک مذہب جو حق ہے وہی رکھتا۔ باقی سب فنا۔ جب یہ بات نہیں ہے۔ اور وہ رب العالمین ہے۔ تو بادشاہ اس کا سایہ ہے۔ اس کا مذہب بھی وہی ہونا چاہئے۔ اسے واجب ہے کہ جو درگاہ الٰہی سے ملا ہے اسے سنبھالے۔ سب مذہبوں کی پرورش اور حفاظت و حمایت اور رعایت برابر کرے۔ اس طرح کہ گویا وہی اس کا مذہب ہے۔ تخلّقوا باخلاق اللہ اکبر اس بات کو خوب سمجھا ہُوا تھا۔ اور یہ لوگ سلطنت کے ہاتھ تھے یعنی سلطنت کی زبان تھے۔

سلطنت کے دل و جان تھے۔ ان کا مذہب کیونکر قرار دے سکے۔ علمائے وقت کی دست درازی جو اپنے مخالف مذہبوں کو فنا اور برباد کئے دیتی تھی۔ اگر یہ اس کے روکنے میں ساعی ہوئے۔ تو کیا برا ہے ؎

در حیرتم کہ دشمنیٔ کفر و دین چرا ست از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

رسم عام ہے۔ کہ اکثر تحریروں کے عنوان پر کوئی نام پروردگار کا لکھتے ہیں بے شک وہاں فقط اللہ اکبر لکھا جاتا تھا۔ مگر تم ہی خیال کرو۔ فیضی و ابوالفضل جو ارسطو و افلاطون کے دماغ کو استخوان بے مغز سمجھیں۔ ممکن ہے کہ اکبر کو خدا سمجھے ہونگے۔ خوش طبع رنگین خیال شاعر تھے۔ جہاں اور ہزاروں لطیفے تھے۔ یہ بھی ایک لطیفہ تھا۔ یاروں کے جلسوں میں بیٹھتے ہونگے تو آپ قہقہے اڑاتے ہونگے۔

تشیّع کا الزام بھی انہیں لگاتے ہیں۔ لیکن جن باتوں سے لوگوں نے انہیں شیعہ سمجھا۔ وہ غور طلب ہیں۔ شیخ مبارک کے حال میں تم سُن چکے۔ اس کے دامن پر یہ داغ لگایا گیا تھا۔ بیرم خاں کے حال میں تم پڑھ چکے۔ کہ ہمایوں سے بھی بخارائی اور ماوراءالنہری سردار اس مذہب کی بابت شکایت کرتے تھے۔ اکبر نے اپنے باپ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اور ساری داستانیں سُنی تھیں۔ خود دیکھ رہا تھا۔ کہ شیعہ اہل علم یا اہل قلم ہیں۔ تو اعلیٰ درجۂ کمال پر ہیں۔ جنگی یا ملکی خدمتیں سپرد ہوتی ہیں۔ تو جانیں توڑ کر عرقریزی کرتے ہیں۔ کیونکہ جانتے ہیں۔ چاروں طرف حریف تاک لگائے کھڑے ہیں فیضی و فضل جب دربار میں آئے ہونگے۔ تو اور بھی شیعہ دربار میں موجود تھے اس حالت میں کچھ اس سبب سے کہ اُنہوں نے خود علمائے اہل سنت کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھائے تھے اور اُنہوں نے امرائے دربار سے، اور آئندہ کے خطروں میں یہ اور شیعہ شریک تھے۔ اِنہوں نے اُنہیں غنیمت سمجھا ہوگا۔ اُنہوں نے انہیں۔ اس کے علاوہ یہ کتاب کے کیڑے اور علم و فن کے پُتلے اور حکیم ہمام۔ حکیم ابوالفتح۔ میر فتح اللہ شیرازی وغیرہ وغیرہ علوم و فنون کے دریا کی مچھلیاں تھیں۔ جنس کو جنس نے ربط دیا ہوگا۔ ہر امر میں ایک دوسرے کی تائید کرتے ہوں گے۔ ابوالفضل کے خطوط اس کے انشاؤں میں دیکھو۔ فیضی کے خطوط اس کے رقعات میں پڑھو۔ جو تحریریں ان کے نام ہیں۔ دل کی محبتیں کن کن الفاظ اور عبارتوں میں ٹپکتی ہیں۔ حکیم ابوالفتح اور میر فتح اللہ شیرازی مر گئے۔ تو فیضی

نے ان کے مرثیے کہے ۔ اور وہ کہے ۔ کہ سبحان اللہ وصلِ علی ۔ ابوالفضل نے اکبرنامے یا مراسلات میں جہاں ان کے مرنے کا ذکر لکھا ۔ عبارت کی سطریں اشبوہ ماتم نظر آتا ہے ۔ کسی جلسہ میں شیعہ سنّی کا مباحثہ ہوتا تھا ۔ تو ظاہر ہے ۔ کہ شیعہ اس زمانہ میں دب دب کر بولتے ہونگے ۔ یہ دونوں بھائی شیعوں کی تقریر کو قوّت دیتے تھے ۔ اسے خواہ خلق و مروّت کی پاسداری کہو خواہ مسافر پروری کہو ۔ خواہ دل کا میلان سمجھ کر شیعہ کہو ۔ اور بڑی بات تو وہی ہے ۔ کہ اکبر کو خود اس بات کا خیال تھا کہ یہ فرقہ کم ہے اور کمزور ہے ۔ ایسا نہ ہو کہ زور آوروں کے ہاتھ سے کوئی سخت نقصان اُٹھائے ۔ اور حق یہ ہے ۔ کہ شیخ مبارک کا حال دیکھو ۔ وہ خود اس تہمت میں گرفتار تھے ۔ اکبر کی ابتدائی سلطنت میں کئی شیعہ قتل ہوئے ۔ اور فتووں کے ساتھ قتل ہوئے ۔ ان کے عہد میں جو قتل ہوئے ۔ ان کی تجویز میں یہ بادشاہ کی رائے کی تائید کرتے رہے ۔ اس میں خواہ کوئی شیعہ سمجھے خواہ سنّی کہے ۔ خواہ دہریہ کہے ۔ خواہ لامذہب سمجھے ۔ مرزا جان جاناں مظہر کا ایک شعر جدِ مرحوم کی زبانی سُنا تھا ۔ دیوان میں نہیں دیکھا ۔ کیا مزے سے حُسنِ اعتقاد ظاہر کرتے ہیں ؎

ہُوں تو سنّی پر علی کا صدق دل سے ہوں غلام خواہ ایرانی کہو تم خواہ تورانی مجھے

مذہب کے معاملے میں ایک میرا خیال ہے ۔ خدا جانے احباب کو پسند آئے یا نہ آئے ۔ ذرا خیال کرکے دیکھو ۔ اسلام ایک ۔ خدا ایک ۔ پیغمبر ایک ۔ شیعہ اور سنی کا اختلاف ایک منصب خلافت پر ہے ۔ جس کے واقعہ کو آج کچھ کم تیرہ سو برس گزر چکے ہیں ۔ وہ ایک حق تھا ۔ کہ سنی بھائی کہتے ہیں ۔ جنہوں نے لیا ۔ حق لیا ۔ شیعہ بھائی کہتے ہیں ۔ کہ نہیں حق اوروں کا تھا ۔ ان کا نہ تھا ۔ اگر پوچھیں ۔ کہ اُنہوں نے اپنا حق آپ کیوں نہ لیا ؟ جواب یہی دینگے ۔ کہ صبر کیا ۔ اور سکوت کیا ۔ تم لینے والوں سے لے کر اس وقت دلوا سکتے ہو ؟ نہیں لینے والے موجود ہیں ؟ نہیں ۔ طرفین میں سے کوئی ہے ؟ اچھا جب یہ صورت ہے ۔ تو آج ۱۳ سو برس کے بعد اس معاملہ کو اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فسادِ عظیم کھڑا ہو جائے ۔ چار آدمی بیٹھے ہوں ۔ تو صحبت کا مزا جاتا رہے ۔ کام چلتے ہوں تو بند ہو جائیں ۔ دوستیاں ہوں تو دشمنی ہو جائیں ۔ دنیا جو مزرعۃ الآخرۃ ہے ۔ اس کا وقت کارہائے مفید سے ہٹ کر جھگڑے میں جا اُلجھے ۔ قوم کی اتحادی قوت ٹوٹ کر چند در چند گلے پڑ جائیں ۔ یہ کیا ضرور ہے ۔ بہت خوب تم ہی حق پر سہی ۔ لیکن

انہوں نے سکوت اور صبر کیا۔ پس اگر ان کے ہو۔ تو تم بھی صبر اور سکوت ہی کرو۔ زبانی بدگوئی اور بدکلامی کرنی اور بھٹیاریوں کی طرح لڑنا کیا عقل ہے؟ اور کیا انسانیت ہے؟ کیا تہذیب ہے؟ اور کیا حسنِ خلق ہے؟

۱۳ سو برس کے معاملے کی بات ایک بھائی کے سامنے اس طرح کہہ بیٹھیں جس سے اس کا دل آزردہ بلکہ جل کر خاک ہو جائے۔ اس میں خوبی کیا ہے۔ میرے دوستو! اوّل ایک ذراسی بات تھی۔ خدا جانے کن کن لوگوں کے جوش طبع اور کن کن سببوں سے تلواریں درمیان آکر لاکھوں خون بہہ گئے۔ خیر اب وہ خون خنک ہو گئے۔ زمانہ کی گردش نے پہاڑوں خاک اور جنگلوں مٹی ان پر ڈال دی۔ ان جھگڑوں کی ہڈیاں اکھیڑ کر تفرقہ کو تازہ کرنا اور اپنا بیت میں فرق ڈالنا کیا ضرور ہے۔ اور دیکھو اس تفرقہ کو تم زبانی باتیں نہ سمجھو۔ یہ وہ نازک معاملہ ہے۔ کہ جن کے حق کے لئے تم آج جھگڑے کھڑے کرتے ہو وہ خود سکوت کر گئے۔ تقدیری بات ہے۔ اسلام کے اقبال کو ایک صدمہ پہنچنا تھا۔ سو نصیب ہؤا۔ فرقہ کا تفرقہ ہو گیا۔ ایک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ پورا زور تھا۔ آدھا آدھا ہو گیا۔ اور دیکھو تم! ۱۳ سو برس کے حق کے لئے آج جھگڑتے ہو؟ نہیں سمجھتے کہ ان جھگڑوں کے تازہ کرنے میں تمہاری تھوڑی جمعیت اور مسکین فرقہ میں ہزاروں حقداروں کے حق برباد ہوتے ہیں۔ بنے ہوئے کام بگڑتے ہیں۔ روزگار جاتے ہیں۔ روٹیوں سے محتاج ہو جاتے ہیں۔ آئندہ نسلیں لیاقت، اور علم و فضل سے محروم رہی جاتی ہیں۔ میرے شیعہ بھائی اس کا جواب ضرور دینگے۔ کہ جوش محبت میں مخالفوں کے لئے حرف بد زبان سے نکل جاتے ہیں۔ اس کے جواب میں فقط اتنی بات کا سمجھنا کافی ہے۔ کہ عجب جوش محبت ہے۔ جو دو لفظوں میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اور عجب دل ہے جو مصلحت کو نہیں سمجھتا۔ ہمارے مقتداؤں نے جو بات نہ کی۔ ہم کریں۔ اور قوم میں فساد کا منارہ قائم کریں۔ یہ کیا اطاعت اور پیروی ہے۔

محبت تم جانتے ہو کیا شے ہے۔ ایک اتفاقی پسند ہے۔ تمہیں ایک شے بھلی لگتی ہے۔ دوسرے کو بھلی نہیں لگتی۔ اسی طرح بالعکس۔ - - - - - - - -

- - - کیا تم یہ چاہتے ہو۔ کہ جو چیز تمہیں بھاتی ہے۔ وہی سب کو بھائے؟ یہ بات کیونکر چل سکیگی۔ ابوالفضل نے ہی ایک جگہ کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے

کہ جو شخص تمہارے خلاف رستہ پر چلتا ہے یا حق پر ہے یا ناحق پر۔ اگر حق پر ہے تو احسان مند ہو کر پیروی کرو۔ ناحق پر ہے تو یا بے خبر ہے یا جان بوجھ کر چلتا ہے۔ بے خبر ہے تو اندھا ہے۔ واجب الرحم ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑو۔ جان بوجھ کر چلتا ہے۔ تو ڈرو۔ اور خدا سے پناہ مانگو غصہ کیا اور جھگڑا کیا +

میرے باکمال دوستو۔ میں نے خود دیکھا اور اکثر دیکھا کہ بے لیاقت شیطان جب حریف کی لیاقت اپنی طاقت سے باہر دیکھتے ہیں۔ تو اپنا جتھا بڑھانے کو مذہب کا جھگڑا بیچ میں ڈال دیتے ہیں۔ کیونکہ اس میں فقط دشمنی ہی نہیں بڑھتی۔ بلکہ کیسا ہی بالیاقت حریف ہو۔ اس کی جمعیت ٹوٹ جاتی ہے۔ اور ان شیطانوں کی جمعیت بڑھ جاتی ہے۔ دنیا میں ایسے نافہم بے خبر بہت ہیں۔ کہ بات تو نہیں سمجھتے۔ مذہب کا نام آیا۔ اور آپے سے باہر ہو گئے۔ بھلا دنیا کے معاملات میں مذہب کا کیا کام؟

ہم سب ایک ہی منزل مقصود کے مسافر ہیں۔ اتفاقاً گذرگاہ دنیا میں یکجا ہو گئے ہیں۔ رستہ کا ساتھ ہے۔ بنا بنایا کارواں چلا جاتا ہے۔ اتفاق اور ملنساری کے ساتھ چلو گے۔ ہل جل کر چلو گے۔ ایک دوسرے کا بوجھ اُٹھاتے چلو گے۔ ہمدردی سے کام بٹاتے چلو گے۔ تو ہنستے کھیلتے رستہ کٹ جائیگا۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو نقصان اُٹھاؤ گے۔ آپ بھی تکلیف پاؤ گے۔ ساتھیوں کو بھی تکلیف دو گے۔ جو مزہ کہ زندگی خدا نے دی ہے، بدمزہ ہو جائیگی +

مذہب کے معاملہ میں انگریزوں نے خوب قاعدہ رکھا ہے۔ ان میں بھی دو فرقے ہیں۔ اور ان میں سخت مخالفت ہے۔ پرٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک۔ دو دوست بلکہ دو بھائی۔ بلکہ کبھی میاں بیوی کے مذہب بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ وہ ایک گھر میں رہتے ہیں۔ اور ایک میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ ہنسنا۔ بولنا۔ رہنا۔ سہنا سب ایک جگہ۔ مذہب کا ذکر بھی نہیں۔ اتوار کو اپنی اپنی کتابیں اُٹھائیں۔ ایک ہی بگھی میں سوار ہوئے۔ باتیں چیتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک کا گرجا رستہ میں آیا۔ وہاں اُتر پڑا۔ دوسرا بگھی میں بیٹھا اپنے گرجا کو چلا گیا۔ گرجا ہو چکا۔ وہ بگھی میں سوار ہو کر آیا۔ رفیق کے گرجا پر آیا اسے سوار کر لیا۔ گھر پہنچے۔ اس نے اپنی کتاب اپنی میز پر رکھدی۔ اس نے اپنی میز پر۔ پھر وہی ہنسنا بولنا۔ کاروبار۔ اس کا ذکر بھی نہیں۔ کہ تم کہاں گئے تھے۔ اور وہاں کیوں نہ

گئے تھے۔ جہاں ہم گئے تھے *

آزاد! کہاں تھا۔ اور کہاں آن پڑا کجا ابوالفضل کا حال کجا سنی شیعہ کا جھگڑا۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ ملا صاحب کی برکت نے آخر تجھے بھی لپیٹ لیا *

اصل بات یہ ہے۔ کہ ابوالفضل اور ملا صاحب ساتھ دربار میں آئے۔ دونوں کو برابر خدمتیں اور عہدے ملے۔ یہ بیستی کے عہدے کو خاطر میں نہ لائے۔ سپاہیانہ عہدہ کو اپنے علم و فضل کے لئے ہتک سمجھا۔ اس لئے اختیار نہ کیا۔ اس نے شکرانۂ بندگانہ کے ساتھ منظور کیا۔ بادشاہ کو انکار ناگوار معلوم ہوا۔ ملا صاحب نے پرواہ نہ کی مباحثوں کی فتحیابی اور اپنے ترجمے کے کاغذوں کو دیکھ دیکھ خوش رہے۔ شیخ بیچارہ اپنی بے وسیلہ حالت کو دیکھ کر سمجھ گیا۔ اور بچپن بلکہ دو پشت سے جو مکروہات سہنے کی مشق ہو رہی تھی۔ اسے یہاں بھی کام میں لایا۔ انجام یہ ہوا۔ کہ کہیں کا کہیں نکل گیا۔ ملا صاحب دیکھتے رہ گئے۔ وہ دونوں بھائی خدمتگذاری کی برکت سے مصاحب خاص ہو کر سلطنت کی زبان ہو گئے۔ یہ مسجدوں میں تکفیر کرتے پھرے۔ گھر میں بیٹھ کر بڑھیوں کی طرح کوسنے کاٹتے رہے۔ بس اصلی سبب ان تحریروں کا وہی رنج ہم سبقی اور وہی رشک ہم مکتبی تھا۔ کہ سیاہی بن کر سفید کاغذ پر ٹپکتا تھا۔ اور بے اختیار گرتا تھا۔ ایک کتاب کے پڑھنے والے۔ ایک سبق کے یاد کرنے والے تم وزارت کی مسند پاؤ۔ مشیر شہنشاہ بن جاؤ۔ اور ہم وہی مُلّانے کے مُلّانے *

ذرا تصور کر کے دیکھو۔ مثلاً ملا صاحب اُن کے ہاں گئے۔ اور وہ راجہ مان سنگھ۔ دیوان ٹوڈرمل وغیرہ اراکین سلطنت سے مصلحت اور مشورہ میں مصروف ہیں۔ ان کی دعا بھی قبول نہ ہوتی ہوگی۔ ان کا دربار لگا ہوتا ہوگا۔ ان کی وہاں تک رسائی بھی بمشکل ہوتی ہوگی۔ وہ جس وقت حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام۔ میر فتح اللہ شیرازی سے بیٹھے باتیں کرتے ہوں گے۔ وہ تمام رکن دربار۔ انہیں ان مسندوں پر جگہ بھی نہ ملتی ہوگی۔ اگر ان کے ساتھ یہ مباحثۂ علمی میں دخل دیتے ہوں گے۔ تو ان کا کلام وقعت و وقار نہ پاتا ہوگا۔ یہ زور دیتے ہوں گے تو آخر ان کے گھر کے شاگرد تھے۔ دونوں بھائی اسی طرح ہنس کر ٹال دیتے ہونگے جس طرح ایک عالی رتبہ خلیفہ اپنے مدرسہ کے طالب علم کو باتوں باتوں میں اُڑا دیتا ہے۔ یہی باتیں دیا سلائی بن کر ان کے سینہ کو

سلگاتی اور ہر وقت غصّہ کے چراغ میں بتی اکساتی ہونگی۔ جس کے دھوئیں سے کتاب کے کاغذ سیاہ ہیں۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ اُنہوں نے فیضی کو اکثر جگہ ستم ظریف کے القاب سے یاد کیا ہے +

میرے دوستو۔ ان کی بہنوں اور بھائیوں کی شادیاں امرا اور سلاطین کے خاندانوں میں ہونے لگیں۔ انتہا یہ کہ خود بادشاہ بھی ان کے گھر پر چلا آتا تھا۔ مُلّا صاحب کو یہ بات کہاں نصیب تھی +

اخلاق و عادات

فیضی کی تصنیفات سے اور اُس کے اُن حالات سے جو اور مصنّفوں اور مؤرّخوں نے لکھے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شگفتہ مزاج۔ خوش طبع۔ خندہ جبیں شخص ہوگا۔ ہمیشہ ہنستا بولتا رہتا ہوگا۔ شوخی اور ظرافت اس کے کلام پر پھول برساتی ہونگی۔ اور فکر و تردد۔ غم و غصّہ کو کم پاس آنے دیتی ہوں گی۔ یہ بات ابوالفضل کی وضع سے کچھ فرق رکھتی ہے۔ ان پر متانت اور وقار چھائے ہوئے ہیں۔ تم غور سے خیال کرو۔ ان کے اشعار کیسے شگفتہ ہیں۔ خطوط اور رقعوں کو دیکھو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بے تکلف بیٹھے ہنستے ہیں۔ اور لکھتے جاتے ہیں۔ ان میں جا بجا لطیفے اور چٹکلے چھوڑتے جاتے ہیں۔ مُلّا صاحب نے بھی کئی جگہ لکھا ہے کہ ایک جلسے میں فلاں شخص سے اور مجھ سے فلاں مسئلے پر گفتگو ہوئی۔ اُس نے یہ کہا میں نے یہ کہا۔ شیخ فیضی بھی موجود تھا۔ ستم ظریفی اس کی عادت ہی ہے۔ یہ بھی اسی کے ساتھ ہمداستان تھا۔ آزاد سچ ہے میں نے بھی اکثر جلسوں کے حال میں خیال کیا۔ کہ بیشک شیخ فیضی ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ جاتے تھے۔ اور سخت بات کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے +

مُلّا صاحب اس وصف پر بھی جا بجا خاک ڈالتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ ستم ظریفی اس کی روش قدیمی تھی۔ گرمئے مجلس اور ہمزبانی کے لئے دوستوں کے اجتماع کا دل و جان سے طلبگار تھا۔ مگر سر کھلے ہوئے اور دل بجھے ہوئے رکھتا تھا۔ مصرعہ

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم!

شیخ فیضی سخی اور مہمان نواز تھے۔ آپ کا دیوان خانہ علما۔ شعرا اور اہل کمال کے لئے ہوٹل تھا۔ اپنے بیگانے دوست دشمن سب کے لئے دروازہ کھلا اور دسترخوان بچھا ملتا تھا جو اہل کمال آتے تھے یہ انہیں اپنے گھر میں اُتارتے۔ خود بھی بہت سلوک کرتے تھے۔ حضور میں پیش کرتے تھے۔ خدمتیں دلواتے تھے یا جو قسمت کا ہوتا تھا انعام و اکرام مل جاتا تھا۔ عرفی بھی جب آئے تھے تو پہلے ان ہی کے گھر میں مہمان رہے تھے۔ . . . .
عہد مذکور کی کتابوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حُسن اخلاق۔ لُطفِ طبع۔ شگفتگی مزاج ہر وقت فیضل و کمال کے گلدستوں سے ان کا دیوان خانہ سجائے رکھتی تھی۔ ساتھ اس کے آسائش و آرام کے سامان بھی ایسے آراستہ کئے تھے۔ کہ گھڑی بھر کی جگہ خواہ مخواہ پہر بھر بیٹھنے کو جی چاہے۔ مُلّا یعقوب صیرفی کشمیری (جنہوں نے ان کی تفسیر بے نقط پر عربی میں تقریظ لکھی ہے) جب کشمیر چلے گئے۔ تو وہاں سے ملا صاحب کو کئی خط لکھے ہیں۔ ایک خط میں بہت سے مضامین شوقیہ لکھے ہیں۔ اور یہاں کی صحبتوں کو یاد کرکے کہتے ہیں۔ نواب فیاضی کے خسخانۂ فیض میں دوپہر کی گرمی میں سیتل پاٹی کے فرش پر کہ ہوائے کشمیر سے بھی سرد ہے۔ جب بیٹھو اور برفاب پیو اور ان کے نکات شریفہ اور مقالات لطیفہ سُنو تو اُمید ہے کہ مجھ اسیرِ محبت و حرمان کو بھی یاد کرو گے

اے بزمِ وصل حاضر غائباں را دست گیر		زانکہ دست حاضران از غائباں کوتاہ نیست

اب آزاد اپنے طول کلام کو مختصر کرتا ہے۔ اور ان کے کلام کا کچھ کچھ نمونہ دکھاتا ہے +

غزل

بادہ در جوش است و رندان منتظر	ساقیا خذ ما صفا دع ما کدر		در خرابات مغاں بگذر کہ ہست
ہر صراحی چشمۂ ہر ساقی خضر	بندۂ ساقی شوم کز یک قدح		منکران عشق را ساز د مُقر
اے رفیق از من مشو غافل کہ ہست	عشق در فرہاد و مجنوں منحصر		گردلم بشکست خوشحالم کہ دوست
مطمئن شد عند قلت منکسر	عشق نتوانست پوشید ان غیر		شد ازاں مجنوں بعالم مشتہر

جام میخواہی بگو فیضی مدام		ہمچو حافظ ایہا الساقی ادر

ایضاً

ساقی جاں خیز کہ شد صبح عید
از چہ کنم بیہدہ منزل بعید
چشم تو لبس کردہ ز خونریز خلق
میکنم از دست تو خود را شہید

صبحک اللہ بصبح جدید
جان من و سلسلۂ زلف تو
غمزہ بفریاد کہ ہل من مزید
بر دم تیغ تو قضا کردہ نقش

رقص کناں کعبہ بہ پہلوئے من
عَلِقَتِ الروحُ بحبلِ الورید
گر تو نداری سر قربان من
اَنتَ حدیدٌ لکَ باسٌ شدید

فیضئ آزاد اسیر تو شد
اَسعدکَ اللہ بعیدٍ سعید

دیباچۂ مرکز ادوار

زمزمہ سنج نفس آتشین
عربدہ آموز نکتہائے مست

نخلہ سائے دل آتش نشین
حوصلۂ بخش جگرِ دل بدست

جوش صراحی طبرزد لباں
آب دہِ خندۂ گل پاسخاں
بتکدہ آرائے بتانِ بہار
چشمہ شگافِ رگِ خشک از زباں
نہ کرہ را بر سر کرسی نہاد
عجز بسر چشمۂ او رو سفید
دیدہ رمد سنج و بہاں پر شعاع
درک یکے مفلس بازار او
جان سخن در کف کنہش قتیل
صفحۂ افلاک و قلم پائے مور
راہ بہ تیغ اندر و بیخواب گیر
جام نہ و بادہ بسرشار در
قافلہ شد بہ چراغ دلیل
ہر دو دریں راہ بدست تہی
شوق بجز بادچہ سنجد بکیل

آب صبوحی قدح غبغباں
مہرہ کش تختۂ مینائے صبح
ناب دہِ مغکدہ لالہ زار
ذرہ دریں دشت سر افراز او
ہر چہ دریں دائرہ پرسی نہاد
رفت ز او صاف گریباں ز دست
عقل تہیدست و دکاں پر متاع
علم دریں قافلہ بیگانہ ایست
چوں قلم دررہ حرفش سبیل
نکتہ گراں مہمل و دانش خراب
دست ہمہ آتش و کشت آبگیر
قافلہ ہا ہست نشاں بر نشاں
قافلۂ یافت بوجداں سبیل
قافلہ را رفت بمشرق نشاں
فرق بجز خاک چہ نیرو زمیل

بادہ چکان لب آتش رُخاں
پنجہ کشائے ید بیضائے صبح
نکتہ نگار لب نطق از بیاں
ریگِ رواں قافلۂ راز او
معرفت از خاک درش ناامید
دُردکشاں نیز از و نیم مست
نطق یکے دالۂ گفتار او
عقل دریں سلسلہ دیوانہ ایست
جلوۂ خورشید سخن روز کور
قافلہ مستسقی و دریا سراب
غیر نہ خانہ و باغیار در
بادیہ در بادیہ محمل کشاں
رنگ نہ پرکردۂ روز بہی
تو سوئے مغرب شدہ محمل کشاں
شوق تو مستسقی و معنی شراب

موجۂ سیماب فروغ سراب
دست وگریباں بخودم چوں کنم
بو کہ زنم دست بداماں خویش
موج سخن جوہر تیغ من است
ساغر من شستہ تر از نوبہار
اینکہ بدروم بہ سخن راہ یافت
دورِ فلک بر خط اقلیم او
نشۂ او جوہر بنیش زدائے
خطبۂ شاہی خط پیشانیش
نامہ کہ مانند شہاں برسرش
نظم جہاں نسخۂ آئین او
خلق سبکدل زگرانباریش
دادگرِ زود رس و دیر گیر
ہست دو منشور جہانبانیش
دور شہنشاہیئے عالم ترا
باہمہ نور سحرستان تو
عالمِ پیر از تو بعہدِ شباب
آنچہ بروں جُست ز مدہوشیم
قفل ملائک ز صفیر منست
زیں دم روشن کہ زدہ صبح گاہ
کلکِ من از مرغِ سحر خیز تر
آمدم اینک ز شبستان غیب
عطسہ گرہ شد بدماغ شراب
چشمہ یکادم نفس تازہ را
تا جگر بحر کشم لخت لخت

بحر سخن تشنہ تحمید تو
سر زگریباں کہ بروں چوں کنم
من کہ چو مے جوش سحر مے زنم
بر دل دریا گہرم روشن ست
صبحۂ صبحم زنشاطِ دماغ
بال و پر از مدح شہنشاہ یافت
ساغرِ او ہمت دانا پسند
نکتۂ او جرعہ دانش فزائے
دست دہ لجۂ بے ساحلاں
آمدہ طغرائے ہُوَالاکبر ش
خسروِ خنداں دل فرخندہ چہر
فتنہ گراں خواب ز بیداریش
شاہد او معنی دانش نگار
جوہر تیغ و خطِ پیشانیش
در ازل از مدح تو بشنید طرف
شب نتواں یافت بدوران تو
باز دل تنگ بہم بر زدم
روح قدس گفت بسر گوشیم
چرخ بسے گشت کہ تا بد شبے
آئینہ بستند بر اکلیل ماہ
ایں چمن تازہ کہ پروردہ ام
میکدہ در دستِ گلستاں بجیب
حکمتے از پردہ بساز آدرم
تا دل دریا برم آوازہ را
گرنہ دہم دست نوائے بلند

ریگِ رواں سبحۂ توحید تو
چاک زدم پردۂ سامان خویش
موجہ بجیحوں نظر مے زنم
بادۂ من پختہ تر از روزگار
شُعلہ فگن بر سر مرغان باغ
جوہر کُل گوہرِ دیہیم او
بادۂ او پرتوہ عقل بلند
سرّ الٰہی دل ربانیش
نرخ نہِ گوہرِ دریا دلال
نقدِ خرد گوہر تمکین او
خندۂ او عقدہ کشائے سپہر
شیر دل و شیر کش و شیر گیر
ساقی او در ہمت دریا نثار
اے دو جہاں عقل مسلّم تُرا
نہ قلم و نہ ورق و ہفت حرف
عمر ابد بے تو بدور شراب
آبلۂ چند بہ نشتر زدم
انجمن شوق ضمیر منست
از پس نہ قرن چو من کو کسے
حرف من از صبح دلاویز تر
شام و سحر خون جگر خوردہ ام
زیں دم گیرا کہ زدم سینہ تاب
مغز فلاطوں بگذار آدرم
بر سر ساحل بکنم پائے سخت
در گلوئے صاعقہ پیچم کمند

نور ز خورشید برات آورم
از دم خضر آب حیات آورم
مہ بکفِ راہنمونان دہم
نکتہ رہ آورد بیونان دہم
صد گل مہتاب بکلکم درست
صد دُرِ نایاب بسلکم درست
راہ سخن را بہ سخن بستہ ام
این چہ طلسم ست کہ من بستہ ام
خامۂ من جلوہ کناں بدُ بہ مشت
بر رخِ اندیشہ کند خارپشت
رشحۂ کلکم ز نشاطِ نعیم
مجمرہ آد بجنت زجعد نسیم
از کفِ این بادہ کہ آمد بجوش
آبلہ زد بر لب دریا خروش
فخر معالی بفلک کوشیم
فرقِ معانی بزمیں بوسیم
بر درِ ہمت بہ تہی مائیگاں
گنج بہ بخشم ز سخن شائیگاں
من خمِ دریا دل گرداب جوش
بادۂ من لنگرِ طوفانِ ہوش

در بیانِ ہنگامِ صبح خیزی از مبدأ افیاض فیض بر دل ریختن

صبح کہ نقدِ دو جہاں ریختند
خلوتے از انجمن انگیختند
خلوت از انجمن آفتاب
شاہدِ او صبح سفیدہ نقاب
سوختہ یک شمع ہزاراں چراغ
خلوتے انداختہ نطعِ فراغ
شاہدِ خلوت گلِ کثرت بدست
آمدہ و بر رُخِ امکان نشست
صبحِ ازل شعشعۂ روے او
شامِ ابد سایۂ گیسوے او
پردہ زر خسارہ بر انداختہ
آئینہ را برقعِ رو ساختہ
زلفِ تقیّد بسرِ دوش او
حالِ تعیّن بہ بناگوش او
یک روش جلوہ کراں تا کراں
یک نگہ و غمزہ جہاں در جہاں
ہم مژہ اندر مژہ ہنگامہ خیز
ہم نگہ اندر نگہ افسانہ ریز
خارِ چمن ساختہ از رنگ و بُو
ہفت قدح کرد پر از نہ سبو
غمزہ نظرگاہ صنم دوستاں
بتکدہ در بتکدہ ہندوستان
رو برد شاہد برقع شگاف
کف بکف آئینہ مینا غلاف
چشمے و صد میکدہ مستی درو
بازی و صد بتکدہ ہستی درو
مرحلہ در مرحلہ نظارہ زار
قافلہ در قافلہ آئینہ بار
برقِ رُخش آئینہ بگداختہ
آئینہ در آئینہ پرداختہ
شیشہ حلی بستہ ز دستِ نگار
نغمہ گلو شستہ بخونِ بہار
شعلہ بہ پیچیدہ بگلبانگِ نے
شیشہ برقص آمدہ بر بوے مے
رفتہ و آئندہ بیک حال در
عالمِ تفصیل باجماں در
تشنہ نگاہاں مژہ انگیختند
چوں مژہا بر سرِ ہم ریختند
من بچنیں محفلِ ناکاستہ
بادلِ خود خلوتے آراستہ
خلوتے انگیختہ در انجمن
دل بمن و من بدل اندر سخن
نعرہ زناں سر بعبادت زدم
تا درِ معنی باشارت زدم
وحدتی از وحدت کثرت بری
بے خودی محو تماشا گری
نعل دریں بادیہ واژدوں زدم
بر قدمِ صبح شبے خوں زدم

سبب نحافت تن و بانتہا رسیدن عمر

اے شدہ خورشید سر بام خویش
تو شدہ نیلوفر ایں آفتاب
کف مبرا اے کہ سنگیت نیست
بر ورق آبکش ایں نقش بود

چند زنی پا بسرانجام خویش
آئینہ بگذار دریں زنگبار
جامہ مپیرا اے کہ رنگیت نیست
گرچہ دم سحر بیاں من ست

شبنم گلبرگ تو وقف سراب
از نفس خویش مشو سنگسار
خانہ میند اے بگرد وجود
حیرت من پند زبان من ست

در مقصود بکف آمدن باوجود کشایش دُنیا

شکر کہ جمازہ بمنزل رسید
منزل اوّل ز رہ آرزو ست
رہ بہ باندازۂ پائے من است
نوح فرو رفت دریں موج گاہ
دہ چہ کنم با قلم رہ گرائے
عمر طبیعش ز ازل تا ابد
بر حد ایں کعبۂ روحانیاں
ریختہ از بیختۂ کیمیا
از پئے ہنگامہ کشیدم ز جیب
گوہر انصاف برد رونما
بشکنم ایں کلکِ حقیقت سرائے

زورق اندیشہ بہ ساحل رسید
گرم رواں چوں نشوم آہ زن
گرم روم از دست سرائے منست
نیست مرا چوں برہ دل قدم
بادیۂ آتش چو بینہ پائے
جوش صنم خانۂ بالاست ایں
بر نہد اکلیل چو نصرانیاں
کردہ بہ یکدست سطرلاب دل
لعبتے از پردہ نشینانِ غیب
از رُخ ایں شاہد شیدائیاں
حرف جگر ریش و زبان سینہ چاک

گام نخست از قدم جست و جوست
رہ ہمہ یک گام و دو صد راہزن
خضر دریں بادیہ گم کرد راہ
رفتہ ام ایں راہ بپائے قلم
نادرہ طفلے بہ بقا نام زد
غلغل ناقوسِ مسیحاست ایں
کاخ نخست از رصد کبریا
دست دگر عقدہ بہ پرویں گسل
غمزہ زناں چوں شود ابرو نما
تا چہ بہ بینند تماشائیاں
فیضی ازیں فیض دلت تازہ بود

مغز ز جوش تو پر آوازہ باد

مثنوی سلیمان و بلقیس

الٰہی پردۂ تقدیس بکشائے
زبانے دہ مرا قدوس گویاں
ہمہ ذرات در تقدیس و تہلیل
پری در شہر دل در بند دارم
بتان ہند تسبیحم گسستند
نگین دل بدست اہرمن داد
چنانم از بلندی در دہ آواز
ز دوش جاں گزارم بار تن را
یکے الحان داؤدی کنم ساز
کنم زیں پردہ مغز خفتہ بیدار
اگر گویم تہی شد لجۂ ژرف
کہ خواہم آسماں را بند بکشاد
ز شور طبع سحری تازہ انگیخت
کہ چوب خشک او شکر شکست
کہ آں نورسے کہ جاں را رہبر آمد
سلیمان سخن و تخت برباد
بہ تخت معنی از سرمایہ بستن

سلیمان مرا بلقیس بہ نمائے
حصار قدس را کنگر بلند است
مرا لب پر ز افسون عزازیل
بلائے ہست من کیں جان من نیست
بہر مویم دو صد زنار بستند
دل من با بتاں آذری چند
کہ آید ہدہد شوقم بہ پرواز
در زیں منزل نکو تہماے والا
سلیماں را ہم زاں عالم آواز
گرہ شد ہفت دریا در گلویم
ز من باور کہ خواہد کرد ایں حرف
ز دیگ آرزو سرپوش برداشت
ز نوک خامہ بر کاغذ شکر ریخت
دگر رفتم کہ بگذارم مقابل
ازاں روزن باین روزن در آمد
بمن آمد یکے تدبیر کردن
ز گنج خود برو پیرایہ بستن
سلیماں را بہ تخت خود نشانیم

دریں بت خانہ ناقوس جویاں
بہر کنگر چہ سرہا در کمند است
چہ سازم با بتاں پیوند دارم
کہ دیو نفس در فرمان من نیست
دریں مشہد بغفلت ہر کہ تن داد
سلیمانے گرفتار پری چند
نشینم چارہ گر خلع بدن را
سبکرو خانہ گیرم راہ بالا
بہ بندم ارغنون عشق را تار
کشایش نیست ممکن تا نگویم
بخواہم گنج را از دل بروں داد
کف چند از دل پرجوش برداشت
مگر ہندوستان فردوس گشتست
شگاف خامہ را با روزن دل
اگرچہ رفت ازیں دیوان بیداد
بافسوں دیو را زنجیر کردن
بیا فیضی کہ داد دل ستانیم

مناجات کردن بجناب باری عز اسمہ بکمال عجز و زاری

بنام آنکہ دل را نقد جاں داد
کہ گر صدرہ اجل آید نمیریم
رسد بند سپہر آفرینش

سخن را زندگی جاوداں داد
زمیں را آں کرامت داد جودش
صفائح ساز اسطرلاب بینش

بجاں ما از دم منت پذیریم
کہ افتد نہ سپہر اندر سجودش
حلاوت بیز معجون معانی

ملاحت ریزِ ذوقِ نکتہ دانی
بہار انگیز باغِ زندگانی
جنوں آمیز سیرِ عشقبازاں
دعا گرداں دشنام از زبانہا
نشاطِ سینۂ اندوہناکاں
بذوقش سوبسو اطلس بدوشاں
سخن زد حرز بازوے دلِ ما
دراں نطعے کہ گسترده جلالش
قدر از قدرتش صنعت نگارے
زصد نقش عجب کز آب و گل ساخت
سخن باشہر علمش روستائے
از و مشائیاں را در قدم خار
من و اندیشہ اش ہیہات ہیہات
خرد در جستجویش اشتلم کرد
سپاس اندیشئے ما ناسپاسیست
اگر فیضی دلِ مرتاض داری
بدست آور زعجز ایں جانبہ پائے
ازاں منبع کہ دریائے فتوحست
نہ زاں دریاکشاں آتش آشام
کشیده صد ہزاراں چشمہ و جوئے
بر بنیاں یاد ہر خواہش گوارا
یکے از صد قدح ناگشتہ سرمست
کہ گنجانید دریا در سبدِ یم
نیم آخر ازاں آلوده صوفاں
بگفتار بلند و ہمت پست

ورق سوز کتاب کج حرفاں
طراوت بخش ریحانِ جوانی
جواہر سائے کحل چشمِ خونی
ہلاہل را طبرزد ساز جانہا
در آتش افگن دراعۂ شیدا
بشوقش موبمو پشمینہ پوشاں
جہاں نم قطرۂ نیساں جودش
ازاں گنجینۂ درصفِ نعالش
زعالم نسخۂ برداشت مجمل
مزاج آدمیت معتدل ساخت
خموشی ہیچ و قیل و قال ہیچ است
وزو اشراقیاں را سر بدیوار
تو جراءت بیں کہ ہمت میزند جوش
برفت و خویش را در راه گم کرد
دریں لبستاں زباں تا بد و روکرد
سرے نامیدۂ فیاض داری
زمن تا ذره باشد آں قدر فرق
مرا نم قطرۂ طوفانِ نوح است
گذشتہ آں ہمہ مردان آزرم
ولیکن ہمچناں العطش گوئے
لبے پرواز دیدم دیدۂ سیر
یکے بینی بہ بوئے رفتہ از دست
چو شد فیضِ ازل در چاره سازی
جگر بے آب و لب پر موجِ طوفاں
رفیقِ کاروانِ کعبہ جویاں

رقم شوئے خیالِ فیلسوفاں
فسوں آموز چشمِ عشوه سازاں
نمک افشانِ ناسورِ درونی
زلال چشمہ ساز چشمِ پاکاں
در آب انداز آب و دانۂ صید
سخن سنج از ترازوئے دلِ ما
عدم گنجینۂ نقدِ وجودش
قضا در کارگاہش پیشکارے
بنام آدمی کردش مسجّل
زباں در کوے قدسش بینوائے
کہ کشف ایں جاچو استدلال ہیچ است
کجا آمد زمیں اندیشۂ ذات
بگیرد قطرۂ دریا در آغوش
حدیث آنجاکہ از یزداں شناسیست
خموشی را بحیرت پیشرو کرد
سخن را چند باشی محمل آرائے
کہ مے ترسم زیک شبنم شوم غرق
من آں مستم کہ بحر دشم بیک جام
کہ طوفاں خشک کردند از دمِ گرم
دریں درگہ نہاں و آشکارا
تفاوت ہاست در مستاں ایں دیر
زفیض ابر احسانش چہ گویم
تن خود را زنم کردم نمازی
معاذ اللہ ازاں مستئے تہیدست
بتاں حرص را لبیک گویاں

صدشکر کہ ایں نگارخانہ
ناموس ہزار پیکر است ایں
بس رنگ بر نو بہار بستم
از مغز معانی استخواں بند
بانگ قلمم دریں شب تار
آغشتہ بخوں صد ترانہ
حرفش زخراش دل نشانی
دیں نادرہ سرگذشت دریاب
رنگیں چمنے بشعلہ شستہ
زاں ساں کہ در آسماں ستارہ
یک صاعقہ از سحاب عشق است
از شعلہ تراش کردہ ام برف
اسراف معانیم نظر کن
سیارۂ آسماں نقاب است
دادم بہ شب خیال سرگم
در دامن آسماں زدم دست
رو بہ نفس بساط روباں
از صبح ستارہ و ز من حرف
گرمی زدمے سحر گرفتم
من بودم و باد صبح گاہی
دست سخنم ز دل حلے بند
بستم بہ سخن طراز معنی
زیں پردۂ نو کہ دور بستم
در آتش خود سشناہ کردم
زنیساں بفنون نکتہ و رزی

بگرفت نگار جاودانہ
ہر نکتہ بہ شعلہ الیست ہمدوش
کیں غنچہ زخوں نگار بستم
پیچیدہ بہ نہ فلک سخن بیں
بس معنیٔ خفتہ کرد بیدار
ہم کردہ جنوں مست ہشیار
معنے زگداز ترجمانی
گل خندۂ آتشیں بہار است
جز مہر کیا درو زرستہ
ایں گل بہ بوستاں شمار است
یک شعشۂ آفتاب عشق است
افشاندہ ہزار دُر نایاب
زیں گنج بہ مفلساں خبر کُن
گل کردہ بہار بے خزانم
زانو رصد و معانی انجم
خورشید گوست اندریں کار
کلکم ز نشاط پائے کوباں
ہر صبح دمے زبیقراری
وز آتش فکر در گرفتم
دروازۂ صبح بر رخم باز
پائے قلم از جگر حنا بند
در فکر بآتشیں نظارہ
بر صبح تراز نور بستم
ہر چند نظر بلند دست است
بنشست سخن بہ تنگ و رزی

بُت خانۂ ہند را دراست ایں
ہر نقطۂ باغگرے ہم آغوش
گشتم بہ خیلے نکتہ پیوند
جان نو و قالب کہن بیں
درباب فسوں ایں فسانہ
ہم ساختہ عشق خفتہ بیدار
از ہر چہ گذشت رو بردتاب
آبستن گل شرارہ بار است
رخشندہ معانی از عیارہ
از من بہ بہار یادگار است
آنم کہ بسحر کارے ژرف
در دامن موج و جیب گرداب
ایں دودۂ شمع آفتاب است
افروخت چراغ بے دخانم
ہر صبح کہ از سخن شدم مست
من بودم و صبح ہر دو بیدار
میر بخت ز خردہ کارے ژرف
بر باد صبا زدم عماری
ہر صبح ز فیض بادشاہی
کلکم ز شگاف پرتو انداز
گل کرد ز من بہار معنی
چوں شعلہ بر آتشم سوارہ
ہر صبح کہ ساز راہ کردم
ایں جا چو قدم نہاد پست است
ہر نکتہ کہ خانہ باب بستنش

آورد دلم ز دور دستش
نسخیست به خون دل طرازش
خوں ناب بجوشد از دل سنگ
بر گردم ازیں نوادر آفاق
زنار برہمنان نہ دیر
بحرے کہ رسید سر بجوشش
خاک از نفسم گلاب دارد
ایں خط کہ دہم بنور مایہ
ہر نکتہ در و چو ناب در جوئے
آں گل کہ در و ہزار باغ است
افسردم در دے باغ شستم
ایں بادہ کہ جوشد از ایاغم
کیں نقش بروے کار بستم
ایں گل کہ بہارئے تنگ گست
کاقبال دو کون رونما داد
دارم بہ طرب دلے ہم آواز
گوید زنہ آسماں سروشم
برخیز کہ صبح بے نقاب ست
تو تشنہ جگر بہ خواب مدہوش
عمریست بزیر بار رنجم
یک جزر دمد از محیط راز است
بزمے ست جہاں بعیش پیوست
کلکم بنوائے ارغنونی
سازند سبو کشانہ فسانہ
من بار بدم تو خسرو عہد

دارم ز قلم بغیب راہے
لب زیر حقیقت از مجازش
در بادیہ گر کند ایں ساز
ناقوس کلیسہائے عشاق
فکرے کہ بود معانی انگیز
گرداب فلک بزیر موجش
مستانہ چو سر دہیم فغاں را
از کلک من ست نیم مایہ
ہر نقش از و گلیست بربار
آلیش ز رطوبت دماغ ست
دارم ز کشاکش درونی
خون ست چکیدہ از دماغم
بر طاق نظر کشیدم ایں دیر
ہر برگ گلے ہزار برگ ست
چوں جلوہ دہم بتے چنیں را
چوں حجرۂ ارغنوں بصد ناز
کائے نکتہ سرائے بزم شاہی
بیدار نشیں چہ وقت خواب ست
داری ز دل و زباں ترازو
تا گوہر بحر و کاں نسنجم
شاہنشاہا خرد پژوہا
دور تو شراب و آسماں مست
زیں بزم کہ عشرت تو ساقیست
مطرب نہ بزم بہ ترانہ
زیں خامہ کہ کردہ ام فلک سائے

کوسے بہ نہفتہ زیر کاہے
بر کوہش اگر کنند آہنگ
در ریگ رواں بر قصد آواز
بپچیدم ازیں دم سبک سیر
بحریست ز آب خود گہر ریز
آتش بہ دلم شراب دارد
آتشکدہ دم کنم معاں را
بر معنی از و چو آب در جوئے
ہر برگ از و بسے بگفتار
مستانہ گلے ز خویش رستم
ہر مو بنوائے ارغنونی
صد سحر فسوں بہ تار بستم
گو جلوۂ دیدۂ سبک سیر
ایں در کہ تواندش بہا داد
فغفور کشد چراغ چیں را
چوں پنبہ نہد سحر بگوشم
کلک تو نوائے صبح گاہی
سرچشمۂ فیض جوش در جوش
بر سنج گہر بزور بازو
ایں موجہ کہ جبہ اش فراز است
دریا گہرا فلک شکوہا
من مطرب پردہ ہائے خونی
گر من بردم ترانہ باقی ست
امروز باین نوائے چوں شہد
پیش تو ستادہ ام بیک پائے

ترکیب طلسم خوانیم بیں
تخت تو طراز جاوداں یافت
من بادۂ مست کار ہوشم
صد جوش زنم بگرم خونی
ایزد بدہاد دست کارم
کز ہند گل عراق برخاست

دیں خدمت جاودانیم بیں
ایں نامہ کہ عشق بر زباں برد
عیبم نبود اگر بجوشم
از قافلہ ات منم درائے
گر دادۂ ایزدی شمارم
پیراستہ ام معانی بکر

زیں پردہ کہ نسج آسماں یافت
طغرائے ترا بآسماں برد
با ایں تف آتش درونی
معذورم اگر کنی صدائے
صد بلبل مست نغمہ گر خاست
در گنجۂ طبع و دہلے فکر

زیں پیش کہ سکہ ام سخن بود | فیضی رقم نگین من بود
اکنوں کہ شدم بعشق مرتاض | فیاضیم از محیط فیاض

چو سلطان انجم ز خاور زمیں
زمستی بر آورد کف از دہاں
شہنشہ برادرنگِ شاہنشہی
ز روئے ادب ایستادہ بپا
بیکسو فقیہاں عالی مقام
سطرلاب دانان اختر شناس
بیک سو ہزبران میدان کیں
چو طوطی شکر ریز و شکر شکن
کہ ناگہ یکے قاصد تیز گام
بصورت چو مردم بمعنی چو دیو
شہنشاہ را ایں سخن کار کرد
در آفاق افگند آوازہ را
کشیدند چوں کہکشاں تنگ را
بہ اندک زماں رفتہ بسیار دور

برسم عرب گشت محمل نشیں
کشیدند از خط صبحش بہار
بسر تاج اقبال ظل الٰہی
بہ یکسو وزیران دانش پذیر
حکایت کناں از حلال و حرام
بہ یکسو دبیراں معجز رقم
کہ از ہم درانند گاوِ زمیں
ہمہ ملک و ملّت از و با نسق
رسانید از خان اعظم پیام
زیک چند باہم بر آمیختہ
برام آوری عزم یلغار کرد
ہمہ ساربانان کمربستہ چُست
بہ بستند چوں مہر و مہ زنگ را
قد خود بہ تعظیم کردہ دو تا

کف انداز شد بختئ آسماں
کہ پیوند خود نگسلد از قطار
سلاطین مسند نشین جا بجا
بتدبیر بر عقل کل نکتہ گیر
بیکسو حکیماں فطرت اساس
دقائق شناساں لوح و قلم
بیک سو ندیماں شیریں سخن
بروئش بخلق درونش بحق
کہ گجراتیانند پر مکر و ریو
ابر فتنۂ نو بر انگیختہ
نخستیں طلب کرد جمّازہ را
بولیس قرن کردہ نسبت درست
شتر چوں فرشتہ سرشتہ ز نور
کمر بستہ از بہر خدمت دو جا

بہ تعظیم بر سینہ بنہادہ دست | ز راہ ادب بادو زانو نشست

اندر بیان تعریف شتر گوید و سوار شدن اکبر شاہ بر شتر

خدیو عجم شاہ عالی تبار | چو شاہ عرب بر شتر شد سوار
شتر زیں سواری سرافراز شد

شتربان بعزم حدی ساز شد
بروں تاخت از آگرہ گرحرب
سواری بردنسبت مصطفٰی است
چو گلزار روئے زمیں ساختند
شتر نیز چوں ابر شد در خروش
شتر ہر زماں شورے انگیختہ
شتر را لبسیرت ملک خواندہ اند
چو درویش پوشیدہ برتن گلیم
زباغ جہاں گشتہ قانع بخار
گمان کردن ذتیز رو ترچو تیر
کز و مقدم شاہ شد سربلند

بسوئے زمامش چو شہ دست برد
چو خورشید کز شرق تازد لغرب
شہنشہ سوارئے جمازہ کرد
گل و خار باہم قریں ساختند
نماند ز ہر دوز خود ہیشیار
چو دیوانہ کف از دہاں ریختہ
صفاتِ شتر گر بگیرم بہ پیش
ریاضت کن و بردبار و سلیم
قوی ہیکلے از قدم تا بفرق
چو تیر و کماں در سفر ناگریز
براشتر چو آمد شہِ کامیاب

دمام ارادت بدستش سپرد
شتر مرکب انبیاست
رہ و رسم پیغمبری تازہ کرد
ز بلبل تماشائے آں سرہوش
یکے مست گل شد یکے مست خار
بزرگاں کہ عمرے شتر راندہ اند
دفا تر شود صد شتر بار پیش
زکف دادہ سررشتۂ اختیار
بدیدن چو ابرو برفتن چو برق
شتر را ہمیں سرفرازی پسند
چو از کوہ طالع شود آفتاب

بیان رفتن اکبر شاہ در احمد آباد

چو شاہِ ولایت شتر پیش راند
شتابندہ چوں ناقۃ اللّٰہ بود
شتر ہا برآورد شور و شغب
ہم از کوہ و صحرا برآوردہ گرد
جرس زیر گردن شترہائے شاہ
ز اشتر سواراں ہزاراں ہزار
کتل کردہ اسپاں تازی ہمہ
چو باراں کہ ریزد ز ابر سیاہ
ز اسپانِ ابلق ہمہ منتخب
چو سیماب نگرفتہ یک جا قرار

لبسرعت تراز فکرت خویش راند
بگردش شتر ہار داں یک بیک
فضائے عجم گشت پر از عرب
عرق ریختہ ز اشتراں چوں سطر
تو گوئی کہ در برج قوس است ماہ
یلاں برشتر ترکش اند کمر
پری دار در عین بازی ہمہ
دراں زرد ہائے ہلالی رکاب
شتابندہ چوں ابلق روز و شب
کبودش ز ابلق بہ انگیز تر

شتاباں برہ ناقۂ شاہ بود
چو بر گرد کعبہ گروہِ ملک
ہمہ کوہ کوہان و صحرا نورد
چو باران رحمت کہ ریزد ز ابر
چو اہل عرب از یمین و لیسار
شتر چوں شتر مرغ در زیر پر
سبہ تازیاں چوں چکاندہ براہ
شدہ گرم چوں زردۂ آفتاب
ہمہ از نفرہا تیر سیماب وار
زخنگ کبودش فلک تیز تر

شہنشہ شتاباں براہِ سفر
چو عمر گرامی شتابندہ تر

بیان رسیدن اکبر شاہ در احمد آباد

بیک ہفتہ در احمد آباد رفت   تو گوئی شہنشاہ کہ چوں باد رفت   رسانند ارباب معنی بعرض

کہ شاہ دلی را بود طے ارض   بر ارباب کشف و کرامت جلیست   کہ شہ را بحق رتبۂ ما دلیست

در انجا یلاں نبرد آزمائے   بماندند از ماندگی جا بجائے   یلاں چوں شتر ہا دواندند پر

شتر گشت چوں عنکبوتی شتر   زخیل سپاہے کہ ہمراہ بود   ہمیں شست کس بلکہ پنجاہ بود

ہمہ شیر مرداں روز مصاف   ہمہ نیزہ بازاں جوشن شگاف   ہمہ جنگ جویان بیداد کوش

ہمہ سنگ جاناں پولاد پوش   ہمہ یکہ تازان چابک سوار   کہ خود را زدے ہر یکے بر ہزار

ہمہ پاکبازاں مبرا ز عیب   رسیدند ناگہ چو مرداں غیب

جنگ بیان اکبر شاہ با سپاہ گجراتیاں

مخالف پئے جنگ آمادہ بود   میاں را بکیں بستہ استادہ بود   سپاہش فزوں تر ز مور و ملخ

بمیداں آں ہر یکے شوخ و شخ   شہنشاہ رخش ظفر تیز کرد   کمند جہاں گرد مہمیز کرد

یلاں باد پایاں بر انگیختند   بہم باد و آتش بر آمیختند   دلیراں گجراتیاں سبز رنگ

سراسر در آئینۂ ملک زنگ   ہزبراں شمشیر کیں بر فراشت   بصحرا ہمہ سبزہ و الا کاشت

زگجراتیاں و مغل ہر کہ خفت   زمیں زیر لعل و زمرد نہفت   فتادند گجراتیاں و مغل

زمیں گشت سر سبز و لشگفت گل   مغل بسکہ پرکالہ پرکالہ شد   ہمہ دشت و صحرا پر از لالہ شد

زگجراتیاں ریخت خون ہا بجنگ   چوں گلگوں مے از شیشۂ سبز رنگ   دراں عرصہ از بسکہ پیکار شد

زمیں پر ز شنگرف و زنگار شد   نہنگاں دریائے کیں در خروش   چو دریا ز ناب و تف و جود بجوش

پے جنگ پوشیدہ جوشن ہمہ   نہاں ہمچو آتش در آہن ہمہ   بجوش دلیراں پر از تف و تاب

بر آوردہ سر چوں نہنگاں در آب   سناں ریختہ خصم چوں از ستیز   قلم وار گردید شنگرف ریز

بہر سو درخشندہ زرین علم   شب تیرہ را شمع راہ عدم   سناں دلیراں دراں قلب گاہ

چو بالائے خوباں بدل کردہ راہ   خدنگ دلیراں ناوک فگن   بہ پرواز چوں مرغ روح از بدن

زلیس رفتہ پیکاں بہ تنہا درون   رواں شد ز ہر قطرہ دریائے خوں   خدنگ دلیراں گذشت از سپہر

چو از چرخ گردندہ تیر نظر

نقل عرضداشت فیضی بنام اکبر جو خاندیس سے لکھی

ذرہ ہیچ تر از ہیچ فیضی اولاً روئے ارادت بجانب آں قبلۂ مراد کہ ظاہر و باطنش نظرگاہ خداوندیست آوردہ ادائے سجدات اخلاص مے نماید۔ بوضوے روحانی کہ دل را بچشمہ سار صدق و صفا برونست و از غبار ریو وریا شستن نہ بآئین سالوسانِ صومعہ ظلمت کہ چند قطرہ آب را بر دست و روئے ریزند و دل را بہزار کدورت و تیرگئے نفسانی بیالے زند و ایں را پاکی نام نہند۔ ثانیاً دعائے دوام عمر و دولت و ازدیادِ عمر دل زندہ باطن بیدار قصد مے کند کہ زندگیِ حقیقی ہمانست و پاکان الٰہی باں زندہ اند و فنا را بگردِ سرا پردۂ عزتش راہ نیست و از دولت ہم دولت دوام آگاہی مراد مے دارد۔ الحمد اللہ کہ ہر دو عمر و زندگانی و ہر دو دولت و کامرانی بہ آنحضرت حاصل است۔ اگرچہ امثال ایں دعاہا از مثل ایں نامراداں از ادب دور مے نماید زیرا کہ برگزیدۂ کہ تن و جاں اشرفش پرورش یافتہ نظر خدائی است و آسمان و ستارہ را کہ بکارسازی او مے گردانند و نقد ہیچ مقصودے نیست کہ در دامن دولت او نہ بستہ اند۔ وہمگی بار عالم و عالمیاں بر دوش ہمت او نہادند بدعائے مشتے خاک تہیدست چہ احتیاج دارد۔ امّا بندۂ بیچارہ چکند کہ منصب بندگی دعاست دانایان ہر ملّت سر بر زمین نیاز می نہند و پروردگار ازیں سجدہ ہا بے نیاز است اگر بندہا عمر جاودانی بیابند و تمامی عمر در یک سجدہ بگذرانند حق سجود او بجانیاوردہ باشند و بندہ در قصیدۂ توحید گفتہ ؎

سر بہ زمین درت بر دل و بر داشتن		نے بطریقت درست نے بہ حقیقت روا

و در غزلے مے گوید ؎

در سجدۂ کہ سر نہ زتن مے شود جُدا		در ملّتِ وفا گنہش نام کردہ اند
یارب بسیل حادثہ طوفاں رسیدہ باد		بتخانۂ کہ خانقہش نام کردہ اند

زہے شرمندگئے بندہ کہ نام سجدہ بدرگاہ او مے برم اما امید میدارم کہ یک سجدۂ بے سر ہم در راہِ آنحضرت بجا آورم۔ الحاصل بعد از جہاں جہاں نیاز و عالم عالم مدح و

ثنا عرضہ داشت مے نماید۔

وقتے کہ بے سعادتی گریباں گیر بندہ شدہ از درگاہ عالی محروم ساخت ایام برسات بود در راہ بارانہائے فراواں شد و گل ولائے بے نہایت بود آہستہ آہستہ ایں راطے شدہ بواسطۂ نفس راست کردن چار دادا اصلاح شکست و ریخت در شہر ہائے بزرگ و دوسہ روز توقف در کار بود۔ دیگر از کار و بار حکام و گیرو دار عمال ممالک محروسہ کہ در اثنائے راہ بودند مبصرانہ و بے غرضانہ ملاحظہ کردہ نظارہ کناں گذشت بعضے را مجمل عرضداشت مے نماید۔

بلوچے کہ بفوجداری مقرر شدہ نزدیک بہ تنگے کوہ درمیان لدھیانہ و سرہند چسپیدہ است دزدانے کہ از کوہ فرود مے آیند دزدی وخوں کردہ چیزے مے برند باو ہم حق نذرے مید ہند۔ درآں حدود راہرواں را بسولیش مے کشند۔ حافظ خضر باوجود آں ہمہ پیر پیادست و پائے مے زند و در حد او امینتے ہست بذات خود امانت و دیانت دارد باغہارا بغایت دلکشا ساختہ میوۂ باغہائے اونان و خیرات نیست یک روز ہمراہ بندہ پیادہ بسیار گشت و گفت پیادہ مے گردم تا بدانند کہ ہنوز پیر و خرف نشدہ ام و در خدمت تقصیر نمے کنم۔ اہل سرہند از و آسودہ و رعایا خوش وقت اند و دعائے بندگان حضرت میکند۔

یعقوب بدخشی کروری تھانیسر خدمت فوجداری و عملداری تھانیسر و پرگنات ہردو بواجبی مے تواند کرد و متعہد ایمنئ راہ مے تواند شد۔ جرأت و تردد بواقعی از دست او مے آید۔

قاسم کروریئے پانی پت نویسندہ قدیمی سربراہ است از راستی و دیانت از ممتازاں تواند بود۔ شائستہ آن ست کہ بدرگاہ آسماں جاہ بودہ بخدمت کلی سرفراز باشد رعایائے آنجا گفتہ کہ حکم عالی بردہ عُشر شدہ امیدوارم کہ عمل براں نماید۔ بموجب وعدہ کہ بایشاں کردہ بود عرضداشت مے نماید۔

حکیم عین الملک نقش دہلی وارد و در خدمت روضۂ مقدسہ و مقامات پیران دہلی و خدمت فقراء و حُسن سلوک بمردم تقصیر نمے کند۔ و گوجران راہزن حاضرے باشند و متعہد بندہ اند کہ دزدی نشود پسرس عبداللہ جوان رشید است ہموارہ در خدمت

بادشاہی مے باشد۔ اُستاد یوسف مردِ دو عہد در دہلی ست ریش را در طنبو رسفید کردہ بود اکنوں لبش از ریش و دستش از ناخن سفید تر شدہ نیک محمد چوبانی مرد کار آمدنی است۔۔ ومستعد بزود خدمت است نمک را بحلالی مے خورد شائستہ توجہ عالی است +

چوں بدار السلطنت فتحپور رسید اول بآستاں بوسی دولت خانہ سرفراز شدہ برائے سلامتی حضرت دعا کرد از حقیقت شہر چہ نویسد عمارت گلیں ہمہ داخل زمیں شدہ دیوار ہائے سنگین الیستادہ باتش خانہا و خانہا را بعضے از دُور و بعضے از نزدیک نظارہ کرد عبرت گرفت۔ خصوصاً از خانۂ میر فتح اللہ شیرازی کہ بآبستن نہصد سال مادر ایام ادرا زادہ بود۔ دبدبہ آلہی بود کہ بحضرت کرامت فرمودہ بودند۔ باتش خانہائے حکیم ابوالفتح نیز رسد او ہم یگانۂ آفاق بود ازیں تعریف چہ بالا تر اکنوں وجود برادر گرامیش غنیمت است شائستہ مجلس اشرف است۔ سکنۂ مواضع فتح پور و پرگنات آں حدود مثل شیخ ابراہیم مردے مے طلبند۔ شیخ بایزید پسر شیخ احمد در قبیلہ خود براستی و درستی ذات واکثر صفات انسانی نظیر ندارد و لائق ایں خدمت است۔ نیک و بد آنحدود میداند و بہ اندک کس کار بسیار مے تواند کرد۔ ازینکہ دیگرے بیاید با و تفاوت بسیار است وخویشاں او ہم انتظام مے یابند و موجب معموری شہر است ومستعد تر است دو روز در فتح پور باہہائے سینہ خراش چاہ در ماندہ بود +

آنگاہ بدار الخلافہ آگرہ کہ صد ہزار مصر و بغداد فدائے آب وہوائے او باد رسید۔ دید بغایت معمور ومرفہ۔ از لطافت قلعۂ عالی کہ حصن حصین دولت و اقبال است چہ شرح دہد کہ حیرت افزائے جہاں نورداں تواند بود و از دریائے جوٗن کہ بلب ادب پائے قلعہ بوسیدہ مے گذرد چہ نویسد کہ آبروئے ہفت اقلیم است ؎

بادوے از آب نگارندہ تر	آب وے از باد گوارندہ تر

از در و دیوار شہر شوق مے بارد و درہا چشم انتظار کشادہ و دیوارہا بہ تعظیم مقام عالی الیستادہ امید کہ مجدداً بفر قدوم حضرت کامیاب گردد و اطوار شاہ قلی خاں

و سلوک او بغایت پسندیدہ است۔ شہر را برفاہیت نگاہ میدارد و معتر خاں بندۂ با اخلاص بادشاہی ست وجود او دریں شہر لازم است۔ از احوال فقرا و مساکین شہر خبر مے گیرد۔ ایں دو کس از ترددِ نظام الدین احمد بسیار مے گفتند کہ متمردان مواس را کہ مالگذاری نمے کردند و قلعہاے مضبوط و جاہاے قلب داشتند تنبیہ کرد۔ الحق از اصیلاں خانہ زاد کہ در پایۂ سریر والا تربیت یافتہ اند بغایت رشید است سی سال است کہ بخدمات اقدام مے نماید و روز بروز کار او در بیش است و در اخلاص و دیانت و کاردانی و بے ملاحظگی از مردم ممتاز است لائق آں شدہ کہ ہموارہ بر درگاہ عالی بودہ بر امور مالی و ملکی مطلع باشد و در نظر دیانت او خان خاناں و مرد احدی برابر است *

چوں بدھول پور رسید سراے دید از سنگ بغایت رفیع کہ صادق خاں ساختہ و متصل آں حمام گرمے میباشد و باغے دلکشا مشتمل بر عمارات دلکش۔ پسرش رشید آنجا بود۔ آں معمورہ را خوب نگاہ داشتہ و بر سر راہ بسیارے از بندہاے خدا فیض مے برند و آسائش مے یابند *

سیر قلعہ گوالیار نیز کردہ شد میر **مرتضےٰ** و **نذر خاں** پسر خداوند خاں کہ جوہر رشد از و پیدا است پیش از بندہ یک روز رسیدہ بودند و یکے از احدیاں از اودھ کو چانیدہ آوردہ بود و بجاگیر جدید میبرد و جمعیتے داشتند میر مرتضیٰ مرد کار آمدنی ست و تجربہ کار ست *

در قلعۂ نرور کشن داس مے باشد و در امنیت راہ آنچہ از دست او مے آید بجا مے آرد اما کار از اندازۂ اوست میر مصطفےٰ با متمردان نواحی سر بسر ہست *

تعریف ولایت مالوہ بہ کدام قلم نگارد آبہاے رواں دید کہ در ہر قدمے ازاں بایستے گذشت از ہمہ سو چشمہاے دلکشا چوں دلہاے پاکاں مے جوشید ازیں رباعی کہ گفتہ بود بیاد آمد * رباعی

زاہد بشگفت و گل تو پژمردہ ہنوز
شد باد رواں تو پاے افسردہ ہنوز
از تابش آفتاب در سینۂ سنگ
صد چشمہ بجوشید تو افسردہ ہنوز

زمینش ہمہ صالح زراعت بعضے ازاں قبیل کہ نیشکر بے آنکہ آب دہند

مے شود و سیراب بحدے کہ در پنج گزی آب بر مے آید ہزار شکر کہ بطنطنہ مخدوم عالی و موکب اقبال شاہزادۂ عالمیاں نزدیک رسیدہ کہ روح بناتی در قالب ایں گل زمین کہ گلشن مراد و گلزار عشرت ست در آید حق سُبحانہ تعالیٰ قدوم ایشاں را بر کل ایں ممالک کہ بر سمت قطب جنوبی واقع شدہ مبارک گرداند و ایشاں را در نور آفتاب دولت آنحضرت چوں قطب ثابت و پایدار دارد ٭

سرونج شہر لیست کہ حکم بندر دارد و بلند خاں خواجہ سرا در ویرانی او تقصیر نے کند و خانہائے کہ خویشاں شہاب خاں و منصبداراں و سائر مردم بتدریج ساختہ بودند چوب ہائے او راکندہ فروختہ و در و دیوار ہم شکستہ۔ اگرچہ از پیری دست و پایش میلرزد و عنقریب است کہ دیوار گلبن بدنش از ہم ریزد اما دلش ہمچناں سنگین است ٭

در سجادلپور خواجہ امین خویش وزیر خاں برعایا سلوک خوب کردہ و تقاوی دادہ و پرگنہ معمور ساختہ و ہمہ چیز خود مے رسد کارخانہائے پارچہ بافی ترتیب دادہ کہ چیرہ و فوطہ برائے حضرت مے بافند و دُکان کاروانی واکردہ از دست او خیلے خدمت و سربراہی مے آید اگر خدمت سرونج بعہدہ او باشد شہر معمور میشود قابل توجہ و تعمیر است ٭

رائق و فائق اجین بلکہ تمامی مالوہ محب علی است از دست او کار مے آید ابراہیم قلی پسر اسمٰعیل خاں با جمعیت در اجین بود قاضی بابا مردے خوب ست باغچۂ نیشکرے دارد کہ قابل تعریف است در ہیچ جا بایں لطافت نیشکر خوب نمے شود ٭

مندو دیدہ شد ویرانہ است عبرت افزا نربدا پایاب بود شتران و کارواں با اسباب گذشتہ۔ اسمٰعیل قلی خاں نظر آقا یوز باشی را در حد جاگیر خود نگاہ داشتہ سابق نوکر خان خاناں بود مرد لیست لائق خدمات بادشاہی و قابل ترقیات است دریں راہ قاصداں راجی علی خاں ہمیشہ با مکتوبات مے آمدند چوں بجاگیر او در آمد مردم مردم خوب منزل بمنزل مے رسیدند و رسوم و آداب کہ مے باشد بجا مے آوردند کیفیت ملاقات او آں بود کہ معروض داشت۔ آوازہ فرقدوم موکب جہاں نورد حضرت شاہزادۂ

عالمیان گوش ہوش اہل دربار را بار کردہ است۔ راجی علی خاں ہمیشہ مے گوید سعادت این دیار است کہ شاہزادۂ عالمیاں سایۂ دولت و اقبال براں می گسترند این سایہ بر سر من مستدام باد۔ حقیقت خدمت گاری و خیر خواہی من بر حضرتِ ایشاں روز بروز ظاہر خواہد شد و نتائج خدمات قدیم و جدید من بظہور خواہد پیوست و موجب سرفرازی من پروردگار عالم پناہ خواہد شد حالا در ساختگی پیشکش است کہ با عرضہ داشت مبارک قدوم شاہزادۂ عالمیان دریں دو سہ روز روانہ سازد و جہیز لائق جہتہ دو صبیہ بر ساختگی مے کند کہ بندہ ہمراہ گرفتہ روانہ درگاہ معلےٰ شود یکے را کہ از دست برائے شاہزادہ بزرگ ادام اللہ اقبالہ آنجا بیارد۔ و یکے را کہ دختر پسر است۔ بحضرت شاہزادۂ عالمیان مدظلہ العالی در مالوہ حسب الحکم رساند اگر بندگانِ حضرت نیز از روئے التفات در فرمانے کہ بحضرت شاہزادہ اصدار فرمائید اشارت بہ قبول این معنی فرمایند بندہ نوازیست مبادا حضرت شاہزادہ فرمایند کہ بما حکم نرسیدہ و در فرمان جہاں مطاع قید نہ شدہ ملاحظہ دارد کہ بایں تقریب کہ از اختراعات واہمہ است توقفے واقع شود واجب بود معروض داشت۔

دو روز از رسیدن برہان پور گذشتہ بود کہ فرمان عالمیاں مشتمل بر حکم رفتن بندہ پیش برہان نظام الملک شرف ورود یافت۔ نمیداند کہ بندہ چہ بیطالعی دارد کہ از درگاہ معلےٰ روز بروز دور تر مے شود روزگار انتقام ایام دوام ملازمت کہ در سی سال حاصل بود دریں چند روز مے خواہد بکشد بغیر از صبر چارہ نیست امیدوار است کہ اگر مہلتے نصیب باشد عنقریب مراجعت نمودہ باستاں بوس عالی کہ متضمن سعادت جاودانی است کامیاب گردد۔ دریں راہ ہر جا درویشے شکستہ و مجذوبے شنید تنہا و پنہاں ملازمت کرد۔ ہر گاہ التماس دعا برائے حضرت نمود اکثرے ہمیں گفتہ اند کہ آنحضرت را چہ احتیاج بدعائے ماست کار آں حضرت خدا ساختہ است بایں وجہ او محتاجیم و فی الواقع امروز کدام آرزو ست کہ آنحضرت را بوجہ کمال حاصل نباشد سایۂ عدالت آں حضرت بر مفارق عالم و عالمیاں ابدی باد۔

برہان پور و حوالئے او اندک جائے ست بغایت تنگ اکثرے بوستان ہر جا قطع زمینے بودہ مزروع شدہ از میوۂ انجیر خوب مے شود و خربزہ فرنگی ہم بشاخ

درخت بست بست وسی سی خوشہ جنبانست کم نیست داقسام کیلہ کہ مے تواں خورد فراوانست۔ خربزۂ ہندوستانی ہم ہفتہ باشد کہ رسیدہ وہوائے اینجا در دے ماہ الٰہی بطورے گرم است کہ روز بجامہ یکتہی مے باشد وشبہا لقبا اندک احتیاج مے شود۔ آبہا خیلے تغیر کردہ از نزدیک شدن ایام نوروز وتصور دور بودن از درگاہ عالی باطن را بے آرام مے یابد۔ امّا ازانجاکہ پرتو عنایت آں حضرت بر دُوراں و نزدیکاں چوں نور آفتاب عالمتاب یکساں مے تابد۔ فی الجملہ خود را تسلی مے دہد و بتقدیرات ایزدی ورضائے شاہنشاہی خوش وقت ست حق تعالیٰ آں حضرت را علی الدوام برحاضر وغائب وقریب بعید وفقیر وغنی سایہ گستردارد ؎

یارب سرخیل کامیاباں باشی
فرماں دہ آسماں خیاباں باشی
تاسایہ وآفتاب باشند بہم
در سایۂ آفتاب تاباں باشی

(۳) **عرضداشت** ۔ مشتے خاک سرگرداں فیضی بجمیع ذرات وجود ہزاراں ہزار تسلیم وسجود بتقدیم رسانیدہ بمسامع والائے عاکفان عالی حضرت شاہنشاہی ظل الٰہی ؎

شاہ جہاں پرور اقلیم بخش
فکرت او حجت اثبات حق
او چو جم و جام نظر بر کفش
ہر چہ نہ از عقل بہ نزدش جنوں
شیر دل وشیر کش و شیر گیر

تخت فرازندۂ دیہیم وتخش
قوت کونین بباز دے او
او چو سلیماں خرد آصفش
شیر شکارے کہ بہ بخت جواں
تیز رَو و زُود رس و دیر گیر
رتبہ ہمنامی حق یافتہ

طلعت او آئینۂ ذات حق
گنج دو عالم بتر از روئے او
ہر چہ نہ از فکر بہ نزدش فسوں
کردہ شکارے دل بے آہواں
از ورق غیب سبق یافتہ

رُباعی

شاہے کہ لوائے رفعتش دُور زدند
در انجمنش ترانۂ سور زدند
آں شب کہ فروغ او جہاں را بگرفت
انجم بہ نظارہ عطسۂ نور زدند

رُباعی

شاہے کہ وجود او کمال است کمال
اندیشہ بوصف او محال است محال
ہر چند کہ اسم او جلال است جلال
ذاتش ہمہ مظہر جمال است جمال

ذرہ وار خاک کردار معروض مے دارد - ابتدائے عرض حال از تجلیات صبح صادق کہ زمان عشرت صبوحی کشاں خلوت خانۂ نوروز ہنگام جوش و خروش زمزمہ سازاں جلوہ گاہ حضور است مے نماید سحرہا چوں از خواب (کہ در محرومی غشی کہ بحالت بحراں عارض شود و مرگ ناگہانی برابر میداند) سراسیمہ بر مے خیزد بہ سفیدہ سحری کہ بہزاراں نور جلوہ گری مے کند چشم حیرت مے کشاید بہ تصور آنکہ ایں آں سفیدۂ صبح دولت و بیاض سعادت است کہ آں حضرت در انتظار ظہور آں بادیدہ و دل بیدار بدولت مے نشنید بعد ازاں کہ خطوط شعاعے نیر عالمتاب از مشرق بمشرق مے پیوندد و از ہر خط مثل نور بدیدہ مے کشند و پیغام سرور بہ دل مے رساند کہ ایں ہماں سررشتۂ نور است کہ باں حضرت رابطۂ صوری و معنوی دارد چوں طلوع آں نور اعظم و نیر اکبر تمام و کمال میشود دیدہ را باں نور الانوار آب و دل را باں روح الارواح تاب میدہد و دوام بقا و سجدۂ لقائے آں حضرت را بہزاراں دعا و نیاز مے خواہد و ایں ذرہ راست در باب صبح صادق ؎

دریاب کہ صبح عیش رو بنمود است
خورشید در نور بدل بکشود است
بنگر بہ سفیدہ دم کہ پیشانی چرخ
در سجدۂ خورشید غبار آلود است

رباعی

بنگر بہ سفیدہ تازہ نہ گلشن از و
گلچیناں را شگوفہ در دامن او
نے گرد نے ز لشکر خورشید است
گردے کہ شود چشم جہاں روشن از و

رباعی

ہر صبح دل فیض طلب مے باید
دریوزۂ نور از دل شب مے باید
ای ذرہ چرا بے سر و پائے گردی
در حضرت خورشید ادب مے باید

رباعی

شد صبح جہاں روشنی از سر بگذشت
زینندۂ سپہر زیب دیگر بگرفت
خورشید کراں تا بکراں نور افگند
سرتاسر عالم ہمہ در زر بگرفت

دیگر از احوال روز و شب چہ نویسد کہ با دیار ہا ہمراز و با درہا ہم آواز ہست و شادمانی منحصر دراں مے داند کہ خطہائے خدمت ابوی و اخوی از پایۂ سریر خلافت

مے رسد مشتمل بر صحت مزاج اقدس کہ چوں طبیعت بہار باعتدال سر رشتہ اند و
حرف سعادت جاودانی بر لوحۂ پیشانی بکلک ازلی نوشتہ و آنکہ در دارالسلطنت
بر تخت عز و جلال کہ مرکز دولت و اقبال است نشۂ انتظام عالم و عالمیان بہ قوانین
عقل کامل و اسالیب عدل شامل مے فرمایند و مژدہ فتح و نوید نصرت از اطراف و
اکناف ممالک محروسہ مے رسد۔ ازیں بشارت ہائے ربانی سجدہائے شکر پرورگار
بتقدیم مے رساند و ایں نیم نفس باقی ماندہ را بہ ہمیں مژدہ ہائے دلاویز وابستہ میداند و
چوں حالات ایں حدود مو بموے بر ضمیر انور کہ آئینہ گیتی نمائے عقل کل میداند روشن
است۔ برہماں اکتفامی نماید برہان نظام الملک از خاک برداشتہائے آنحضرت و
پروردۂ نعمت آں دولت خانہ خود را میداند۔ چہار ماہ کامل ہست کہ بر سر جاگیر
عادل خاں رفتہ از احمد نگر بمسافت ہفتاد و پنج کروہے نشستہ و بر کنار آب
نہاوڑہ کہ آبیست بزرگ و سرحدیست میاں جاگیر ہر دو قلعہ گلبن ساختہ و
عادل خاں ہنوز در قلعہ بیجاپور نشستہ و لشکر خود را با شاہزادہ ہزار سوار فرستاد
و ہر روز جمعے از طرفین بر آمدہ جنگ مے کند و از جانبین جماعتے کشتہ میشود
و دریں ایام باقرار اکہ عموی برہان نظام الملک مے شود در بیجاپور لفلاکت مے بودہ
عادل خاں او را برداشتہ و پیش رو لشکر خود کردہ گفتہ کہ تو ہم بحکومت مے رسی
و ازیں معنی فی الجملہ نگرانی راہ یافتہ و راجی علی خاں دو کس اعتمادی خود را پیش نمودہ
احتمال دارد کہ دریں ماہ گرگ آشتی فرار یابد اما ہنوز اثرے پیدا نیست نقتے کہ از
احمد نگر مے رفت مبالغہ عظیم کردہ شد و بے طاقتی ہا نمودہ شد بعجز۔ تمام گفت کہ
پیشکش تیار مے شود یا آنکہ نیمہ را رفتہ بود دو مرتبہ پیش او رسید و چندانکہ
در حوصلہ گنجد نصیحت ہائے روشن (کہ درجات دانش و قانون معاملہ پسند نماید) رہنمونی
کردہ شد گفت ہنوز پیشکش تیار نشدہ بے اختیار در شہر پُر شورش کہ از فتنہ
سازاں و اوباشاں لبالب است تکیہ بر اقبال آں حضرت کردہ توقف نمود ہمیشہ
خط مے نویسد کہ شما را معاملہ باآں درگاہ است ملاحظہ نمایند کہ مبادا ایں ہمہ
اہمال و مکث بر خاطر اشرف گراں آید جواب مے دہد کہ دریں روزے رسیدہ
با پیشکش ہائے لائق شما را بدرگاہ عالم پناہ رواں مے سازم چوں تربیت کردہ و

نظر یافتۂ حضرت است امیدوار است کہ ہمیشہ بر شاہزادہ سعادت سلوک نماید و سلوک او مقبول درگاہ حضرت شود تا عاقبت او بخیر باشد ہمہ چیز بر آں حضرت ظاہر است و ہمہ دقائق احوال نیز بر ضمیر اقدس پرتو خواہد انداخت۔ احمد نگر را احمد بنا کردہ کہ پدر نظام الملک بحری است کہ جد ایں برہان است بایں طریق برہان بن احمد و احمد قلعہ ساختہ از شہر چار پنج تیر پرتاب دور است و حاکم آنجا مے نشیند و اطراف قلعہ میدان ست و شہر طولانی آباد شدہ و حصارے ندارد و از احمد نگر دو کروہی چشمہ ایست کہ آب را بطریق کاریز بہ شہر آوردہ و تقسیم کردہ در بعضے خانہاے بزرگان جدول پوشیدہ از آں آب رسیدہ و حوضکہا است کہ پُر میشود و باقی مردم بہ تمام و کمال شور آبہاے چاہ مے خورند و مولانا عبد الرحمٰن جامی از بوالعجبی ہاے عالم گفتہ اند ؎

مستلزم ممات بود زہر و قیمتی است	سرمایۂ حیات بود آب و کم بہاست

در ایام جنوں مرتضےٰ بیروں شہر صلابت خاں بنامش باغے ساختہ فرح بخش نام سرد لبسیار دارد و عمارتے است درمیان حوض بندہ آں را ندیدہ و ہواے ایں حدود چندانے گرم نیست در عین سرطان کہ تیر ماہ الٰہی است شبہا احتیاج بلحاف مے شود از میوہ ہاے خربزۂ خود اصلا نیست۔ چیزے درشت بے مزہ مے شود کہ مردم ایں جا مے گفتند خربزہ است بندہ باور نکردہ از میوہ ہا انجیر ایں جا بد نیست و انگور فخرے و دیگر اقسام ہم مے شود اما فراواں نہ۔ اننانس از اطراف بسیار مے آرند +

امرت پھل و کیلہ فراواں است انبہ ایں جا بد نیست گل سُرخ بغایت کم با وجود کمی کم بو۔ ہم چنبہ و دیگر گل ہاے ہندوستان بسیار است درخت صندل در باغہا نشاں مید ہند درخت فلفل بسیار ست چند درخت انبہ ایں جاست کہ در دلو و حوت بر مے دہد و از محترفہ زرگراں خوب و پارچہ بافاں بے بدل اند۔ از ہمہ چیز دکن پارچہ است کہ میتواں گفت کاغذ و پارچہ خوب در دو جا مے سازند و مے بافند یکے در پتن و دیگر در دولت آباد۔ بیش ازیں چند سال دہ بار ایں جا قتل عام شد و یک کس از مردم ولایت زندہ نماندہ و تا سہ روز مے کشتند مردم خوب از فضلا و تجار وغیرہ آنکہ دریں مدت جمع شدہ بودند بہ قتل رسیدند و خانہاے آنہا را لغارت بردند

دیکبار دیگر بعد از آمدن برہان الملک تاراج عظیم بر سر غریباں شد و ہر کہ بر سر اسباب خود
مے ایستاد مے کشتند و زخمی مے کردند برادران شیخ منوّر ایں جا غارت زدہ و زخمی
ہستند و از شرم بخانۂ خود نمی تواند رفت و شیخ منوّر ایں جا امیدوار عنایت است
و سوداگران افغان لاہوری تاراج زدہ بسیار مے گردند و بعضی مردم و ملازماں عصمت
قباب سلیمہ سلطان بیگم نیز غارت یافتہ ہستند اسبابے کہ بدست ایں طور اوباشاں
اُفتادہ باشد چگونہ باز بدست می آید۔ بیفائدہ می گردند و سرگردانند +

دیگر ابراہیم عادل خاں حاکم بیجاپور بیست و دو سالہ است و برادر زادۂ
علی عادل خاں خالی از جوہر سعادت نیست ارادت غائبانہ بحضرت دارد چون دلاور حبشی
تربیت کردۂ او تسلّط دارد و ایں دلاور را بدکردہ اند حالا پیش نظام الملک ہست و محمد قلی
قطب الملک تشیع دارد +

معمورۂ ساختہ و عمارت پرداختہ بھاگ نگر نام بنام بھاگ متی کہ فاحشۂ کہنہ و معشوقۂ
قدیم اوست حالا ولایت دکن از آنچہ در جاگیر ایں دو سہ کس مقرر است و چہ از آنچہ راجہا
دارند و سلوک اینہا با یک دیگر مبصر اند۔ باوجود چندیں موانع ملاحظہ کردہ شد اگر دمے
چند دیگر مہلت باشد بحضور اشرف بہ تفصیل عرضہ داشت خواہد نمود و ایں ولایت را داخل
ممالک محروسہ مے شمارد و یک مرتبۂ طنطنۂ قدم اشرف و آوازۂ موکب عالی ایں حدود
رسید۔ ایں غزل بطریق حسب حال روئے نمود۔ چوں از دل اخلاص منزل برخاستہ
امید بہ وقوع انجامد۔ غزل

نسیم صبح مشک افشاں ز گرد راہ مے آید — مگر از موکب اقبال اکبر شاہ مے آید
شبستاں سعادت را ز نقل نے لبالب کن — کرشمہ در بوستاں و شمع در خرگاہ مے آید
مغنی حجلہائے ارغنوں را قفل بر در نہ — کہ در گوشم صدائے کوس اکبر شاہ مے آید
بہ مہد سایۂ دولت جہاں گو بادشاہی کن — کہ بال افشاں ہمائے چتر ظل اللہ مے آید
اگر غم در غم شادی نمیرد جائے آں دارد — نشاط دوستاں بر دشمناں جانکاہ مے آید
منجم بر سعادتہائے روز افزوں کواکب را — بشارت دہ کہ بر اوج ثریا ماہ مے آید
بہ ہمت فتح عالم کن کہ در میداں سر یاراں — ز صد لشکر بیاید آنچہ از یک آہ مے آید
دعا را می برم تا آسماں بردست و ایں باشد — کہ از دست دعاگویان دولتخواہ مے آید
دم صبح سعادت میدہد غافل مشو فیضیؔ — کہ فیض صبح گاہی بر دل آگاہ مے آید
خموشی را بلند آوازہ کن ایں جا کہ از حیرت — عبادت نیک مے خیزد نفس کوتاہ مے آید

حضرتا بر ہم زدگی ضمیر و آشفتگی دماغ نہ آنچناں سراسیمہ دارد کہ سرو سامان سخن آرائے و برگ و نوائے اندیشہ پیمائے ماندہ باشد دلیل این معنی ست کہ لسان الغیب وارد شدہ *

	یک نکتہ ازین معنی گفتیم و ہمیں باشد		کے شعر تر انگیزد خاطر کہ حزیں باشد

گاہ گاہے درد دلی و حسب حالی بے اختیار بیروں تراود گاہ ہمہ حسب حالت گاہ در یک بیت دو بیت درج مے یابد باقی بطفیل گفتہ مے شود چنانچہ روشن غزل است کہ ہر بیتے از حالتے خبر مے دہد و آنکہ تمام غزل بیک وتیرہ واقع مے شود نادر مے افتد یک مرتبہ عرضداشت بدرگاہ مے فرستاد و ایں غزل در حسب حال آں روئے نمود *

فرستادہ ام گل بدست گیاہے	زبہر کلہ گوشۂ کج کلاہے
نفس ریزۂ بستر بر بال شوقے	جگر پارۂ ماند بر برگ آہے
گرو دادہ دل در کف تیرہ شامے	گرہ کردہ دم بادم صبح گاہے
مژہ بند بر موکب شہر یارے	نظر باز بر جلوۂ شاہ راہے
بایں نیم آہے کہ تا لب بجنبد	تسلی دہ آرزو گاہے گاہے
ہزاراں غم آورد روبا کہ گویم	کہ بر نیم جاں کس نیارد سپاہے
چرا مے زند شعلہ سرتا بپایم	اگر مو بمویم ندارد گناہے
زخوں ناب مژگاں چہ بیروں تراوم	چہ گلہا کہ سہ روز شب گیاہے
چہ پرسی کہ در خاک و خوں کیست فیضی	بیفتاد صیدے ز فتراک شاہے

یک مرتبہ بعضے ہمراہاں بطریق خالی شدن شہر و گریز اگریزی مردم داخل فتنہ و فساد بیدلی کردند و بندہ نصیحت گر اینہا بودم و مے گفتم کہ یاراں مرا بفتراک اقبال ابد قرین بندید و ایں را حصار الٰہی بشمارید و غم مخورید دریں باب ایں غزل روئے نمود * غزل

باز یاران طریقت سفرے در پیش است	رہ نوردان بلا را خطرے در پیش است	پا نہ نہادہ دریں بادیۂ قافلہ سوز
ہر کہ دیدیم ز اندیشہ سرے در پیش است	کس نمی گوید م از منزل اول خبرے	صد بیابان بگذشت و دگرے در پیش است
ہمرہاں ایں ہمہ نومید نباشید از کن	کہ دعائے سحرم را اثرے در پیش است	ما نہ آنیم کہ نادیدہ قدم بگذاریم
شکر کن قافلہ را رہبرے در پیش است	عاقبت ناصیۂ ما شود آئینہ بخت	کوکب طالع ما را نظرے در پیش است

اے صبا بر سرِ آفاق گلِ مژده بریز
فیضی از قافلۂ کعبه رواں نیست بروں

که شب تیرۂ ما را سحرے در پیش است
ایں قدر ہست که از ما قدرے در پیش است

آخرالامر بعضے ہمراہان تاب ہمراہی نیاورده و کوته اندیشی نموده رفتند به تقریب آنہا گفته شد حسب حال است که نوشته مے شود ؎

زہم رہاں به که نالم که تہی کردند
که محمل دلم از بار خود تہی کردند
بگرد نالۂ شب گیر بختیاں گرم
بده بکوئے آنانکه گمراہی کردند

بمیر قافلۂ عشق بے رہی کردند
گذاشتن چو منے را نه از مروت بود
که در سماع نشستند و خرگہی کردند
نوید بخت به فیضی رساں که اہل طلب

ہزار بادیه زیں ناموفقاں آباد
براهِ عقل نرفتند و ابلہی کردند
بیار ساقی از آں شمع راه گرم رواں
جمازه گرم بیادِ شہنشہی کردند

دیگر در ایام طراوت بہار و لطافت اردی بہشت که نسیم آں از دل دود مے انگیخت و ہوائے آں بر جگر آتش مے بیخت دو بیت گفته شده بود در میان ایں غزل است که در زمین غزل میر شاہی واقعه شده است ؎

ما ساده لوح دیر و خطِ سرنوشتِ ما
بالعرسالکانِ مرا سرنوشت ما
معلوم شد که حاصل ما زیں بہار چیست
پیرِ مغاں که بر سرِ خم ماند خشتِ ما

عکس است از کتابه طاق کنشت ما
اے کبک مست قہقہه بر باغ ما مبر
روزے که برق فتنه وزد گرد کشت ما
فیضی به بیں به ناصیۂ ما که عشق کرد

در راه ما دلیر تگاپو مکن که ہست
گل غنچه میکند دم اردی بہشت ما
تعظیم حالِ دردکشاں داشت در نظر
محوِ سجود دیت رقم سرنوشت ما

و در ہمیں ایام یکبار فواره مے جوشید ایں غزل حسب حال روئے نمود ؎

میکشد شعله سرے از دلِ صد پارۂ ما
ہر کسے روزِ ازل تختۂ تعلیم گرفت
ہیچ دانی دل ما خورد چرا بشکستند
رونقِ عہد به بینند که بر بستر خوں
خون پاکاں بود امروز دریں شہر که ہست
دیدۂ او بگذار جگر انباشته باد
فیضی از نقد جہاں گرچه تہی دستانیم

جوش آتش بود امروز بفوارۂ ما
عشق مشاطگی آموخت ز نظارۂ ما
آسماں آئینها ساخت ز سیارۂ ما
فتنه مے بارد از آئین ستمگارۂ ما
جرعۂ مژده فشاں بر لب خونخوارۂ ما
ہر که گوید خبرے از دلِ آوارۂ ما
کیمیا ساز برد زنگ ز رخسارۂ ما

تربت میر حسن دہلوی در دولت آباد است غالباً ہمراه سلطان علاؤالدین آمده ایں جا عمر مستعار را بآخر رسانید بخاطر رسید که دیوان او کشوده یک غزل تبرکاً تیمناً تتبع نموده شود

اتفاقاً این غزل آمد ؎

بازنوائے بلبلاں عشق تو یاد میدہد
ہر کہ بہ عشق نیست خوش عمر بباد میدہد

شکستہ بستہ گفتہ شد از اتفاقات حسنہ آنکہ نام حضرت شاہزادۂ عالمیاں قافیہ بود و بنام ایشاں مزین ساختہ فرستادہ و این معنی را تفاؤل بر فتح و نصرت نمود بعرض اشرف نیز مے رساند ؎

صبح کہ ترک مست من شیشہ کشاد میدہد
عقل بخاک مے دہد صبر بباد میدہد

ہم مژہ اش ستیزہ را دشنہ بدست میدہد
ہم نگہش زمانہ را عربدہ باد میدہد

آہ کہ بر دماغ دل مے بزندم نسیم خوں
جرعہ بساغرے کہ آں ترک نژاد میدہد

جلوۂ کاروان ما نیست بناقۂ جرس
شوق تو راہ می برد درد تو زاد میدہد

بیکسم و شکستہ دل تشنہ ابر داہمہ
گر بخورند خون من کیست کہ داد میدہد

فیضی نامراد من از غم دہر غم مخور
زانکہ مراد اہل دل شاہ مراد میدہد

تاج ستاں و تاج بخش باد کہ در سپہ کشی
باغ غبار موکبش تاج قباد میدہد

الحاصل در ہر آنے و در ہر شانے آں حضرت ملحوظ و مشہود ند و مناقب و معالی آں حضرت ہموارہ در نظر است و حالات و کمالات در پیش دیدہ جلوہ گر در نظم و نثر حضرت و این حالت دریں غزل درج نمودہ شد ؎

ہر نظم گوہریں کہ بیادِ تو گفتہ ام
دل رخنہ کردہ و جگر خویش سفتہ ام

از دیدہ صد نگاہ فراہم نمودہ ام
تا گرد صد نظارہ ز راہ تو رفتہ ام

بیداری ستارہ گواہ است کز فراق
شب بگذرا ندم کہ بر آتش نخفتہ ام

بر بستہ ام شگاف دل از پارۂ جگر
تا بنگری کہ درد تو در دل نہفتہ ام

دارم ہزار پارہ دلے وہ چہ حسرت است
کاندر خزاں ہجر تو گلگل شگفتہ ام

چوں جلوہ تو در دل و در دیدۂ من است
تا خود حدیث گفتہ و از خود شنفتہ ام

فیضی گماں مبر کہ غم دل نگفتہ ماند
اسرار عشق آنچہ تواں گفت گفتہ ام

دیگر امثال شش جہاز از ہرمز دریائے شدہ بود خواجہ معنائی جہری کہ عمدہ تجار است بار فقائے دولت اسپ عراقی داشتہ تا سہ جہاز بکوہ رفت و قاعدۂ فرنگیاں است کہ چہار اسپ را بکوہ مے برند و اسپاں را آنچہ خواہش مے کنند مے گیرند و

باقی را مے گزارند و لبسہ جہاز در اردی بہشت ماہ الٰہی در بندر چیول کہ داخل جاگیر
نظام الملک است رسیدہ ایں مردم گفتہ اند کہ لبست و چہار روز در دریا بودیم
بعضے سوداگراں و بعضے قزلباشاں را کہ از صرصر حوادث و فتن عراق و فارس فرار نمودہ
بعزیمت آستاں بوس آں حضرت بمامن ممالک محروسہ رسیدہ اند کلانتر اینہا
حسن قلی افشار ست جوان بہادر ست در زمان طہماسپ حکومت بعضے از نواحے
اصفہاں کردہ و دیگر حسین بیگ لشکر نویس است کہ در ایام حکومت یعقوب خاں
نتوانست آنجا قرار بہ بودن داد۔ و ایں دو کس با کوچ خود آمدند و در چیول فکر زاد راہ
مے کنند بہ بندہ خطہا فرستادہ استمالے طلب داشتہ بودند بندہ یک جواب بہر دو
نوشتہ بود خط اینہا بجنس و نقل خط خود ارسال داشتہ بنظر اقدس خواہد گذشت۔
دیگر از اہل جہاز حمزہ حسن بیگ است کہ خویش خان خاناں است عزیمت تتہ دارد
دیگر حاجی ابراہیم رکابدار سابق شاہ طہماسپ بود عنایت بیگ او را مے شناسد و
غلامے زرگر ہم مے داند چندے از اہل جہاز تا احمد نگر رسیدہ اند احوال عراق و
فارس و روم و آں حدود بطورے کہ معلوم شد خلاصۂ آں بعرض مے رساند۔ شاہ عباس
بہ لبست سالگی رسیدہ و عین شعلۂ جوانی اوست زائچہ طالع دو برادر او کہ ابو طالب
میرزا و طہماسپ میرزا نام دارند مصحوب عرضہ داشت ارسال داشتہ منجماں درگاہ احوال
و احکام از آغاز و انجام عرض خواہند نمود شاہ عباس بہ تفنگ اندازی و چوگان بازی و
شکار شغفے تمام دارد و بباز شاہین مائل ست پارسال دو مرتبہ در نیزہ بازی از
اسپ افتاد یک مرتبہ در اصفہاں و یک مرتبہ در شیراز و در ہر مرتبہ بزانوے او
آسیب عظیم رسیدہ اما بخیر گذشت آثار شجاعت و جلادت و غیرت از پیشانی
احوال او مے درخشد با وجود مستی جوانی و شاہی کہ ہوش ربائے اکثر جواناں است۔
جوہر رشد و عقل از و می تابد ہنوز بنفس خود بہ مہمات سلطنت پرداختہ و کار و بار ملک و
مال بہ عملہ و فعلہ گذاشتہ۔ فرہاد خاں وکیل مطلق العنان و مصاحب دائمی اوست
و حاتم بیگ اردبادی کہ از درایت و کفایت بہرۂ تمام دارد وزیر حکومت است۔
نزدیک رسیدہ کہ شاہ ہم از خواب گراں غفلت بیدار شود و از مستی ایں بادۂ ریا
ہشیار گردد۔ و ازیں کہ اکثر ولایت خراسان از بے پروائی و پریشاں رائی از دست

رفتہ بغایت متاثر است و در استخلاص آں اہتمام دارد پارسال مے خواست کہ برسر
خراساں لشکری چوں قریب ہری رسید طاعونہ پیدا شد بعضے را در تہ بغل و بعضے را
در بیخ ران کہ مفرغ اعضائے رئیسہ اند بثرہ مقدار نخود یا زیادہ یا کم بر مے آید و از ہم
مے گذشتند۔ شاہ ہم تپ کرد و فتح عزیمت نمود و بجانب قزوین شتافتہ و
فرہاد خاں با بعضے امرائے خراساں و بعضے شہر را گرفتہ در حوالی مشہد رسید و
چندیں ہزار اُزبک را دراں میاں گشت۔ پسر عبداللہ خاں از براہ یلغار کردہ و برسر
او رفت داد بموجب قرار داو کہ بشاہ کردہ بود برگشتہ بہ قزوین آمد مردم کارداں مے
گفتند کہ پسر عبداللہ خاں با پنج شش ہزار کس کہ دریں یلغار رسیدہ بودند اگر
فرہاد خاں مے ایستاد کار از پیش بردہ بود شاہ را پارسال منجماں منع مے کردند کہ بہ
خراسان متوجہ نشود و بہ امسال مے گفتند کہ لشکر بہ کشد فتح از جانب شاہ خواہد بود
و بہ ہمیں مضمون خطے از خان احمد گیلانی کہ از عالم نجوم بہرہ مند است نیز رسیدہ و
دیگر دولتیار کرد درمیان تبریز و قزوین با بست ہزار کس نامردی کرد یک مرتبہ شاہ
بجہتہ دفع او حسین خاں حاکم قم را با پانزدہ ہزار کس فرستادہ بود حسین خاں شکست
یافتہ بود احتمال داشت۔ کہ چوں بخراساں متوجہ شود دولتیار برسر قزوین بیاید شاہ
در دہم رمضان سال گذشتہ خود برسر دولتیار رفت بعضے برادران دولتیار ایں معنی را
فہمیدہ خود شمشیر در گردن کردہ پیش شاہ آمد۔ شاہ او را در صندوق کردہ در قزوین آورد
و سوخت مردم مے گفتند کہ دفع او کم از دفع اُزبک نبود شاہ در ہمہ ایام تورچی را
پیش خان احمد گیلانی فرستادہ بود و برسر پرخاش شدہ بود کہ ما را ایں ہمہ حوادث
روے از شما داد ہیچ اثر یک جہتی ظاہر نشد خان احمد ضعیف نالی کردہ پیری و ناتوانی
را درمیان آورد۔ اظہار کمال خلوص وارادت نمودہ و گفتہ کہ ولایت و ناموس من ہمہ
تعلق بشاہ دارد و صبیۂ خود را بہ فرزند شاہ کہ صفی نام دارد و در مشہد متولد شدہ و شش
سالہ است نامزد ساختہ عریضہ نوشت شاہ ایں معنی قبول نمودہ از قزوین حاتم بیگ
را با جمعے از علما بگیلان فرستاد و در شب برات گذشتہ عقد غائبانہ کردہ اند۔ و رفتن
و آمدن ایں مردم بہ چہل روز کشید خان احمد آرزو ابریشم و قماش کار است و دیگر
تحفہا قریب بدہ ہزار توماں فرستاد و بردہ ہا ہم خوب پیش آمد بعد ازاں شاہ از قزوین

به اصفہان متوجہ شد در راہ خطے رسید کہ در یزد جماعۃ ازبک قریب بصد و پنجاہ کس
بہ بہانۂ سوداگری آمدہ اند و بہ سپاہی مے مانند بحاکم یزد نوشت کہ آنہارا تا رسیدن
من بہ حکمت نگاہ دارد و چوں شاہ در یزد آمد آنہارا پرسید و خواست کہ آزار رساند
گفتہ اند کہ ما سوداگرانیم اگر شما سوداگران را آزار مے رسانید سوداگران ولایت شما ہم
آنجا بسیار اند شاہ آنہارا گذاشت و از یزد باصفہاں آمد و قورچیاں را باہتمام
تمام بولایت ہا فرستاد و مقرر ساخت کہ در ہمیں نوروز حوالے طہران کہ ہمہ لشکر
از اطراف جمع باشد و قرار داد کہ امراء قورچیاں کوچ خود را ہمراہ برند تا بر سر ناموس خود
بودہ خیال برگشتن بخود راہ ندہند و انتظار خیر باد کار سلطان کہ بدرگاہ عالم پناہ آمدہ بسیار
مے برد و توقع داشت کہ فکر لشکر ازیں جانب بطرف خراساں تعین شود ظاہر آنست
کہ اگر امرائے اطراف ولایت تمرد و مخالفت نہ نمودہ باشند بعد از نوروز بر خراساں
لشکر کشیدہ باشد و منجماں عراق مے گفتند کہ شاہ را دریں سال خطرے عظیم و
قاطعے در درجہ طالع اورسیدہ تاچوں بگذرد و شاہ را رگ غیرت در جنبش است
و داعیہ تردد دارد تا تقدیر چیست شاہ لشکرے کہ از ممالک خود طلبیدہ
بایں تفصیل است +

ذوالفقار خاں برادر خاں حاکم اردبیل و دامغان دہ ہزار کس حسین خاں قجر
باجماعۃ قجر دوازدہ ہزار کس۔ شاہ قلی سلطان شاملو حاکم ہمدان چہار ہزار کس۔ چراغ
سلطان حاکم رے چہار ہزار کس فرخ خاں برادر مرتضےٰ خاں ترکمان پنج ہزار کس ۔
محمد قلی سلطان پسر مرتضیٰ خاں دو ہزار کس۔ بنیاد خاں حاکم شیراز مع توابع دہ ہزار کس۔
حاکم یزد مع توابع پنج ہزار کس۔ امیر حمزہ خاں و سیاوش خاں معہ پیادہ و
سوار چہار ہزار کس۔ ملک سلطان محمد ہشت ہزار کس۔ ملک سلطان شاملو ہزار
کس۔ احمد سلطان ذوالقدر ہزار کس۔ فرخ حسین خاں شاملو پنج ہزار کس۔ پسر
علی خاں ہزار کس۔ یادگار علی سلطان حاکم خوارزم دشمنان سوار و پیادہ دو ہزار کس
پیادہ و سوار اصفہان دہ ہزار کس۔ جماعہ پیادہ از جمیع شہرہا پانزدہ ہزار کس۔
تفصیل لشکر قورچی خاصہ غیرہ بست ہزار کس۔ نورباشی وغیرہ سوار یازدہ ہزار
کس۔ پیادہ ہشت ہزار کس تفصیل لشکر غلامان شاہ دیو جمشید حاکم قزوین دو ہزار

کس - دیو حسین سہ ہزار کس - دیو ایدال دو ہزار کس - ایں لشکر از صد ہزار کس زیادہ
است مردم مے گفتند اکثر خواہند آمد کہ ہنگامۂ اہتمام عظیم است تا امروز دریں صحبت
شدہ باشد +

دیگر یکے از عراق مبارک نام در نواحے شہر شوستر خروج کردہ و مکرا بہ لشکر
روم جنگ کردہ ہمہ محل برایشاں ظفر یافتہ و خود را از محبّان شاہ میگیرد و دم بجہتی
مے زند و تحفہ گرامی مے فرستد - دو سال شدہ و در بصرہ و بغداد از رہگذر او بر ترلیست
یکے از مخالفان او آمدہ ملازم شاہ شد - بادشاہ او را داخل قورچیاں ساختہ روزے بہ شاہ
گفت کہ مبارک بشما فیلسوفی مے کند اگر باور ندارد او اسپے دارد کہ بہ نہصد تومان
خریدہ و امروز چشم زمانہ مثل او تگاورے ندیدہ باشد از و طلب دارند اگر فرستاد
ہر چہ او مے گوید راست است - در ساعت شاہ باو خطے مے نویسد کہ ما بر جناح
سفریم و شنیدہ ایم کہ چنیں اسپے دارید خاطر مائل باں شدہ است بفرستید اگر میسّر شود
از سواران کار آمدنی نیز آنچہ در وقت گنجد بفرستید کہ دریں لیساق با ما باشند چوں ایں
خط بمبارک مے رسید در ہماں روز ہماں وقت ہماں مرکب با سی صد اسپ دیگر
با پسر خود معہ شش ہزار سوار روانہ مے سازد و ایں ہا پیش شاہ رسیدند دیگر دہ ہزار
عرب از اعراب عامری در نواحے خراساں جمع شدند و از برائے دین و مذہب قرار بہ جنگ
اُزبک دادند - انتظار شاہ میکشیدند +

دیگر از وقائع پارسال آنکہ شاہ عباس دو برادر خورد خود را کہ ابوطالب مرزا و طہماسپ
مرزا نام داشتند میل کشیدہ و اسمٰعیل مرزا و پسر حمزہ مرزا میل کشیدہ چوں بسیار خورد
سال بود میل یافتن تاب نتوانست آورد بہ ہماں عذاب جاں بحق تسلیم کردہ شاہ عباس
دو پسر دارد یکے مرزا صفی کہ بعرض رسید دیگر مرزا حیدر کہ پارسال ولادت یافتہ و
سلطان محمد پدرش نابینائے مطلق شدہ ہمراہ شاہ عباس مے باشد و برائے او خیمہ علیحدہ
مے زنند اندک چیزے باو مقرر شدہ بفسق و فجور مشغول است ہزالی و خندہ و رقاصی
و خواندگی بر مزاج او غالب است +

دیگر پیرارنہ سال در اردبیل وبائے عظیم شدہ - چنانچہ بسیارے از مردم شہر را
گذاشتہ باطراف رفتہ بودند و ایں جا کہ ماندہ بودند تمام دکمال مردہ بودند و سوداگر

بسیار خانہ بخانہ مردم افتادہ بود و در خانہا ئے جمعے بگل برآوردہ بودند چوں بشاہ ایں
خبر رسید قورچی تعیین نماید کہ ضبط اموال و تحقیق مردم مہلک نماید +

دیگر از احوال پیرانہ سال آنکہ چوں بکتاش خاں کہ حاکم کرماں و یزد بود جمعیتے داشت
دلبشاہ عباس سرکشی مے کرد یعقوب خاں ذوالقدر کہ حاکم شیراز بود بفرمودۂ شاہ عباس
بر سر یزد رفت و بکتاش را کشت و اسباب فراواں بدست او افتاد و دماغ آں
تنگ حوصلہ خللے پیدا کردہ و باو بیخردی و سودائے کوتہ اندیشی در سر او پیچیدہ
چنانچہ بہ مردم خود مے گفت کہ من از شاہ طہماسپ حاصل شدہ ام و بہ بادشاہی بر سر
دور شیراز بنیاد خودسری و سرکشی مے کرد و نزدیک بقعہ شیخ سعدی قلعہ ساخت
و شاہ عباس از اصفہان مکرر او را طلبیدہ و اموالے کہ بدست او افتادہ بود طلب
داشت نہ خود رفت نہ از اموال چیزے کہ بکار آید فرستاد شاہ از اصفہان با دوازدہ
ہزار کس یلغار کردہ بہ شیراز رسید واو در قلعہ اصطخر شیراز با چہار صد کس متحصن شدہ شاہ
چہار ماہ نشست جماعتے کثیر را بر دور قلعہ تعین نمودہ در مجلس خود مے گفت کہ با عتمادے
تر از یعقوب نوکرے نداریم و دشمناں او را ترسانیدند واو ہم متوہم شدہ پیش ما نمے
تواند رسید- ایں خبر مکرر باو رسیدہ شاہ ہم معتمداں را فرستاد و بہ افسون و افسانہ
او را از قلعہ کشیدہ شاہ از تقصیرات او در گذشت با آنکہ روزے خان بیگ کہ ملازم
یعقوب خاں بود بہ شاہ گفت کہ یعقوب خاں قصد شما دارد و جمعے را بریں کار موافق
ساختہ شاہ قبول ایں معنی بنمود تا روزے بہ شکار برآمدند با جمعے از افراد خاں بیگ باز
درعین شکار بہ شاہ گفت کہ یعقوب خاں در زیر جامہ زرہ پوشیدہ و بر سر غدر است شاہ
بہ تقریبے دست بر دوشش میرساندے یابد کہ زرہ پوشیدہ است- بہ بہانۂ درد
ترک شکار کردہ بہ شہر مے آید روز دیگر در دیوان خانہ مے نشیند و مے گوید کہ یعقوب خاں
را حاضر ساختند و جمعے از نوکران او را کہ ہر یکے بہ لقبے و خطابے بدنام کردہ بود آوردند
اتفاقاً پیش ازیں بچند روز ریسماں بازاں ریسمانہا کشیدہ بودند کہ ریسماں بازی کنند
یعقوب خاں را بجائے خود مے گوید کہ بنشنید او را بہ تمسخر آنجا مے لنشاند و شاہ خود عصائے
گرفتہ پیش او مے ایستد و مے گوید کہ شاہی بہ یعقوب خاں مے رسد ایشاں شاہ باشند
و ما نوکراں آنگاہ شاہ ایستادہ بہ آواز بلند مے گوید کہ شاہ یعقوب خاں چنیں حکم میفرمائید

که فلاں نوکر مارا در ریسماں بہ کشند ہمچناں او را مے کشیدند تا آنکہ ہلاک می شد و ہمچنیں ہر یکے را بہ طرزے خاص کشتند آخر نوبت بہ یعقوب خاں مے رسد او را آویختہ در شکنجہ کردند و بہ سیاست تمام لقمہ سگاں ساختند و حکومت فارس بہ بنیاد خاں ذوالقدر دادہ خود باصفہاں آمد و قریب دو ماہ آنجا بودہ بقزوین رسید و تتمہ احوال سابقہ معروض شد +

دیگر از اخبار روم آنست کہ سلطان مراد در استنبول است صرع قدیم کہ داشتہ دریں ایام طغیاں کردہ چنانکہ بعضے اوقات از صباحے تعشی مے کرد تا آخر روز گاہ بہ نیم روز تا نیم شب۔ سوار نمے تواند شد در سواری بسیار مے گرد۔ تا سہ فرسخے ایں طرف تبریز در تصرف رومیہ است و کوتل شمال سرحد شہ و قراحسن استاد جلو را پارسال بہ استنبول فرستادہ سرحد مشخص کردند۔ و حاکم تبریز خواجہ سرا یست جعفر نام بہ تدبیر و شجاعت در گنجہ سرداں وقرا باغ قلعہا ساختہ و استحکام نمودہ و رومیہ ہمسائیگی قزلباشاں راضی تساند از ہمسائیگی اُزبک غالباً سلطان مراد بہ عبداللہ خاں نوشتہ بود کہ باعث تاخیر و اہمال چیست۔ ازاں طرف شما بیایند و ازیں طرف ما مے آئیم۔ تا قزوین سرحد جانبین بودہ باشد۔ عبداللہ خاں نوشتہ خراساں خود بقزوین منتہی مے شود و نزدیک است کہ گرفتہ شود۔ مے آئیم داعیۂ حج و شوق ملاقات درج کردہ بود و رومیہ را ایں حرف و در انکار ناخوش آمدہ رنجیدہ در کنگاش آں بودند کہ بہ شاہ عباس کمک بدہند پسر مرزا حمزہ پیش رومیہ است۔ اگرچہ رومیہ او را طلبیدہ اند کہ بادصیت خواہیم کرد اما محالست کہ خلاف قانون کنند و در طلبید نش حیلۂ چند خیال کردہ اند +

دیگر سرآمد دانشمنداں عراق و فارس میر تقی الدین محمد است کہ مشہور بہ تقیا انسا است و بہ دانشمندی او امروز در ولایت کسے نیست از شاگرداں میر فتح است۔ وقتے کہ میر فتح اللہ و مولانا مرزا جان در شیراز کوس دانشمندی مے زدند او نیز یکے از مدرساں مشہور شیراز بودہ بندہ مدتست کہ صیت کمالات او مے شنود از میر فتح اللہ مکرر تعریف او شنیدہ و کسے را کہ ایں چنیں شاگردے ماندہ باشد دلیل کمال او بر عالمیاں ہمیں بس +

ملا محمد رضائے ہمدانی از شیراز مے رسد و از دماغ سوختہائے مدرسہ است

دجوہر فضیلت و اہلیت از وظاہر مے گوید۔ میر تقی الدین محمد آرزوئے آستاں بوس۔
حضرت لبسیار داشتہ زادراہ بہم نرسید و فرصتے بدست نیفتادہ وگرنہ دریں قافلہ
مے آید اگر فرمان عالیشان بہ انعامے بہ طلب او برود سرفرازی اوست یادگار میر فتح اللہ و
فرزند معنوی الیشانست بموجب آنکہ گفتہ اند +

	اے گل بتو خورسندم تو بوئی کسے داری	

امید است کہ بدرگاہ معلیٰ رسیدہ از مجلس عالی کہ محل تدریس علوم کونی والہی ومقام اکتساب کمالات
انفسی و آفاقی است مستفیض گردد +

و دیگر قاضی زادہ ہمدانست کہ ابراہیم نام دارد و بہ پیمانۂ دانشمندی شفا
درس مے گوید و بر شرح اشارات حاشیہ نوشتہ۔ ترقیات عظیمش روئے دادہ و در
اُردوئے شاہ است واین محمد رضا کہ آمدہ قرابتے دارد +

و دیگر شیخ بہاء الدین اصفہانی است در بعلبک متولد شدہ و ہفت سالہ ہمراہ پدر
بہ ہرات آمدہ و پیش پدر خود مُلا عبد اللہ یزدی تحصیل نمودہ در جمیع علوم تبحرے دارد و
ممتاز است در اصفہاں مے باشد +

دیگر از مستعدان صاحب فطرت عالی و مشرب والا کہ لائق مجلس عالی تواند بود
چلپی بیگ است در شیراز و قزوین تحصیل کردہ و دریں دوازدہ سال اورا ترقیات عظیم
رو نمودہ دارد و ہمہ جا مے گویند و حالا در شیراز است اگر ذرہ توجہ عالی بجانب او ہم
شود بجائے خود است +

دیگر در احمد نگر دو شاعر خاکی نہاد صافی مشرب اند و در شعر مرتبۂ عالی دارند
یکے ملک قمی کہ بکس کمتر اختلاط مے کند و ہمیشہ مژہ ترسے دارد از دست ایں رباعی
دیک بیت۔ رباعی

	در ہر کہ غبارے نگری قلزم شو من در تو گم و تو نیز در من گم شو		ہر جا کہ بمردمے رسی مردم شو آمیزش حسن و عشق سر ازلیست

	بیت	

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد	رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر

دیگر ملائے ظہوری کہ بغایت رنگین کلام است و مکارم اخلاق تمام عزیمت آستاں

بوس دار داز دست این رباعی و دو بیت

گر نام اثر برد دعا از ما نیست صبرے کہ زبا نیست جدا از ما نیست	حاجت کہ گہے شود روا از ما نیست دردے کہ کشد نیک دوا از ما نیست

بیت

بیاباں کرد او غم نامہ پروازے نمے داند	کف خونی مگر بر بال مرغ نامہ برریزد

بیت

شوق صد بار فزوں میکشدم ہر نفسے	این قدر مہر روا نیست کسے را بہ کسے

دیگر از حکایت ہائے رنگین کہ بندہ شنیدہ آنست کہ آذ یکے را گرفتہ بودند کہ کلادہ ریسماں بخود داشت چوں پرسیدند گفت والدہ پیرے دارم بر من دادہ است کہ اگر توانی بخون رافضی رنگین کُن کہ چوں بمیرم کفن مرا بر آں بدوزند +

مولانا ظہوری نقل کردہ کہ روزے در باغ یکے از شرفائے مکہ معظمہ مجمعے بودہ و اقسام مردم برکنار حوض نشستہ مے داشتند بہ تقریبے یکے از اہالی ماوراء النہر گفتہ کہ فردا چہار یار بہ چہار گوشہ حوض کوثر نشستہ آب بمومناں خواہند داد محمود صباح نیشاپوری در آں مجمع بود برخواستہ گفتہ نامعقول می گویند حوض کوثر مدور است و ساقیش حضرت مرتضیٰ علی دگر یختہ شیخ عطار فرمودے

زنادانی دلے پُرجہل و پُرمکر چو حلقہ ماندۂ بردر تُرا چہ	گرفتار علی ماندی و بُوبکر چو یک دم زیں تخیل می زستی	گر آں بہتر و ایں بہتر ترا چہ ندانم تا خدا را کے پرستی

اہل عالم در ہر دو لائے یکے از مردم را معبود خود ساختہ و از خدا غافل شدہ توجہ باں شخصے دارند +

در ولایت دکن اصل دکنیاں داور الملک را مے پرستند و در عوام مشہور بہ دا الملک است یکے از سپاہیان گجرات بودہ و ہمانجا کشتہ شد در بست سی جا قبر بنام او ساختہ اند و ازدحام دارند +

دیگر سید محمود گیسو دراز است و قبر او در گلبرگہ است کہ داخل جاگیر عادل خاں است سابق در دہلی صومعہ مشیخت داشتہ سالے کہ حضرت صاحبقرانی فساد ہندوستان را شنیدہ متوجہ فتح آں بودند سید مذکور دکن آمدہ +

ملا عبد اللطیف بربری بشوق عربی شگفته بودند و در برہان پور مے بود و عرائض راجی علی خاں را او انشا مے کرد نقل غریب بفقیر گذرانیده که یکے از اولاد سید محمود گیسو دراز حضرت اللہ نام دارد پیش ازیں یکسال در برہان پور آمدند خادم از پیش من آمد که حضرت اللہ آمدند و دعا مے رسانند و مے فرمایند که کجا فرود مے آئیم گفتم خوش آمدند و صفا آوردند درخانه خود فرود آیند سه روز ملاقات به ملا عبد اللطیف گفت که میدانید که من کیستم حضرت مریم را بعرش بردند و حضرت میر سید گیسو دراز را حاضر ساختند و بی بی را با حضرت میراں عقد بستند ما نتیجۂ ایشانیم۔ ملا عبد اللطیف مے گوید که من گفتم عجب است که بفرنگ تشریف نه بردند گفت آں ولایت برادر ماست معلوم نیست که مردم آنجا سلوک لائق بما کنند یا نه بنده از خواجه نظام الدین احمد نام ایں برادر علیٰحدہ مکرر شنید غالباً به گجرات ہم رفته بود ❖

دیگر شنیده شد که تحریر نام حکیمے بود نظام الملک بحری اورا از فرنگ طلبیده اعتبار کرده بود که روزے ایں حکیم در مجلس او از خواجگی شیخ شیرازی که از دانشمنداں مشہور است و از شاگرداں خواجه جلال الدین محمود پرسید که اگر سر دنیا آتش افروزند و مانعے نباشد از کوه تل آں آتش دیده مے شود و آنکه مے گویند که تحت فلک قمر کرۂ آتش ہست چرا دیده نمے شود با آنکه مانعے نیست خواجگی شیخ جواب دادند که از جہت بعد مسافت دیده نمے شود حکیم فرنگی نظام الملک گفت اگر حکم شود رقص کنم که ایں سخن صد رقص دارد ہماں ساعت شاه طاہر رسیده پرسید سخن مے گذرد تقریر کردند گفت خواجگی شیخ غلط کرده ہمه عناصر بسیط اند و مرئی نمے شوند ایں آتش که مرئی مے شود بجہته ترکیب اجزائے ارضی ❖

دریں دیار نام حکیم مصری بسیار است و کارنامہائے علاج او بے شمار الحق بایں دانائی و دقیقه رسی و تشخیص امراض و تحقیق معالجات و تصرف صریح در مزاج۔ و حدس کامل و تامل تمامی عقل درست و دیانت تمام و درستی کلام و مہربانی عموم و تجربۂ بسیار۔ و میمنت دست وے یعنی خال و شفتگی طبع و کشادگیٔ پیشانی و مبارکی روئے امروز طبیبے مثل او نشان نمے دہند۔ و حکیم مشہور آفاق بودند۔ یکے حکیم عماد الدین محمود او مد تیست که در مشہد رحلت نموده دیگرے حکیم کمال الدین حسین او را خان احمد گیلانی از عراق

طلبیدہ بود پیش او قانون مے خواند بیرانہ سال سفر کرد حکیم ابوالفتح کہ شاگرد رشید حکیم عمادالدین محمود بود غریب دریافتے ورسائی در ہمہ چیز داشت طیے یک گوشہ فضائل او بودہ نادرہ زماں بود بندہ او را دیدہ بودم ۔ سہم الغیب در طالع داشت و در ایام مرض زائچہ طالع ہمیشہ حاضر میداشت اتفاقاً در ہماں چند روزہ ما گرفتہ بود در برج طالعش و ایں خطرناک مے باشد یک بار در ایام بیماری گنگادھر گفت از اوضاع کواکب معلوم مے شود کہ علاجے کہ میکنند نہ علاج ایں مرض است ۔ بہتر ازیں در علاج فکر نہ کنید اما چوں قضا رسیدہ باشد دوا برعکس نتیجہ میدہد چنانچہ مولوی معنوی فرمودہ ؎

از قضا سرکنگبین صفرا فزود ۔۔۔ روغن بادام خشکی مے نمود

حکیم ہمام استاد دیدہ است و اجازت نامہائے استاداں دارد بہ بندہ نمودہ بود و از عمل و حدس و صداقت و علم و فضل او بسیار مے گفتند نوشتہ و الحق چنیں است و غریب فطرۃ عالی دارد و نظر حضرت کیمیائے و کمال بخش مستعد آنست خوشا صاحب استعدادے کہ آئینہ فطرت او بخاک ایں آستاں انجلا یابد حق سبحانہٗ آں حضرت را برائے تکمیل خلائق دیرگاہ دارد مستعدان ہفت اقلیم آرزومند آستاں بوس اند و صیت غریب پروری و دانا نوازی حضرت بہ مغرب و مشرق رسیدہ و اقبال آں حضرت مقناطیس دلہاست ۔

ایں جا دو طبیب اند پیش نظام الملک یکے حکیم کالنشی داد چیزے بخواندہ و اسمے برخود بستہ و بد نیست کہ اینجاست شاید حکیم مصری مے شناختہ باشد و دیگرے حکیم علی گیلانی است واسطی مائل بادنے سالے شد کہ از شیراز آمدہ و دیگر جمعے از ہندیاں رسمی اند و کسے کہ او امتیازے داشتہ باشد نیست و ایں حکیم علی گیلانی شاگرد حکیم میر فتح اللہ شیرازی است و مدتیست کہ تعریف حکیم فتح اللہ شنیدہ مے شود و بقدر حالتے دارد پار سال او را جانی بیگ ٹھٹھہ چہل توماں فرستاد از شیراز طلبیدہ بود و الحال در ٹھٹھہ است اگر بخان خاناں حکم مے شود ۔ کہ بدرگاہ فرستد سرفرازی اوست و از آنجا راہ شیراز ہم نزدیک است و مردم تردد مے کنند اگر تقیاء نسابہ را حکم طلب شود بندہ نوازی است ۔

از مردم بلاد طالب علم که فی الجمله امتیازے داشته باشد کسے در دکن نیست ملا محمد قاسم از طالبعلماں زبوں مرد لیست ۔ مے گویند که پیش میر فتح الله و مولانا مرزا جان شاگردی کرده اما بوئے از ایشاں ندارد و چند غریب مفلوک گدا مشرب از جبل عامل و نجف و کربلائے هستند که شیعه اند و باقی دکنیاں قدیم بعضے سُنّی و بعضے شیعه اند واکثرے از حبشی زادها اعتبار دارند و بزرگ اند و پدران اینها کلاں بودند و کسے که معتبر باشد خال خال است عرضداشت تا ایں جا رسیده بود که قاصداں فقیر از جائے که نظام الملک است رسیدند آنچه بتازگی روئے نمود آنست که باقر عموی نظام الملک با پانزده هزار سوار بایں ولایت آمده یک قصبه را سوخته و تاراج کرده در بست کروہے شهر رسیده و تفرقۂ غریب در شهر و حوالے راه یافته بعضے میگویند که بشهر میرسد و بعضے میگویند که پیرار مے رسد که حاکم آنجا سیف الملک یا اُذبکے ست و راجی علی خاں هم بریں است و ایں ساختگی ست و بعضے مے گویند بملازمت شاهزادۂ عالمیان مے رود و نظام الملک جمعے کثیر از دنبال فرستاده و خود هم در مقام آمدن است که بزودی خود را بشهر رساند و دوا شده کارش بوجود در تزلزل ست ✦

و دیگر دلاور خاں حبشی ده دوازده سال بیجاپور را بنوعے ضبط کرده بود که ایں عادل خاں بے گفته او آب نمے توانست خورد و بیروں نمے توانست آمد و اهل بیجاپور تمام از دست بدبختی او بجاں آمده بودند و خلقے را به تنگ داشته پارسال جمعے کثیر هجوم کرده به اشاره عادل خاں مے خواستند که او را بگیرند گریخته ایں جا آمد همراه نظام الملک بود در ینولا عادل خاں از انجا قول و عهد فرستاده طلبید که او امیدوار شده رفت در ساعت چشم او را کندند و اموال مے طلبید و او پسرے داشت محمد خاں نام که عادلخاں آرزو مے کرد که بطرز جاهائے او بر آلش بدوزند و صورت نمے یافت او را هم چشم مے کنند از دهشت قالب تهی کرد دریں دو روز و وحشتے است دریں شهر و فتنه خیزی که به شرح راست نمے آید ۔ ع

	نه پائے رفتن و نه جائے ماندن است مرا	

چوں بحکم حضرت آمده و در وقت پائے بوس رخصت دست حضرت بر پشت

پندہ رسیدہ ہماں دستِ مبارک حضرت را احصار خود دانستہ باتوکلے درست و اخلاص کابل و دِلے آزاد و نظرے راست بر متکائے ادب نشستہ است و توجہ باطن را بیاد قدرے خود و خداوندخود پیوستہ ہموارہ سایۂ عدالت و جلالت آں حضرت برنزدیکاں و دوران شاہ در جمیع حوادثات زمانی باد +

آزاد - اگرچہ مَیں نے کتاب مذکور میں سے فقط دو عرضیاں لکھی ہیں مگر اسکے مطالعہ سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) یہ کہ کس قدر صاف اور سلیس لکھتا ہے۔ اور کلام میں شیرینی اور لذت خداداد ہے،

(۲) اس عہد کے ملازم اپنے بادشاہ کے ساتھ کس آداب و تعظیم کے لباس میں ادائے مطلب کرتے تھے۔ اور تعظیم کے علاوہ دلداری اور دلربائی کا اثر کس قدر بھرتے تھے۔ جس کی ہم ہجو کرنا چاہیں تو فقط اتنا کہنا کافی ہے کہ خوشامد۔ خوشامد! مگر مَیں کہتا ہوں کہ خوشامد ہی سہی مگر یہ خوشامد بھی قصداً نہ تھی۔ اُن کے دل اس قدر احسانوں سے لبریز ہو رہے تھے۔ کہ تمام خیالات خوشامد اور دعائیں ہو کر دل سے چھلکتے تھے +

(۳) ان خطوط کو پڑھ کر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا ان کا ایک شگفتہ مزاج خوش باش آدمی ہے۔ خط لکھ رہا ہے اور مسکرا رہا ہے +

(۴) تم خیال کرو تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں جو ملازم کسی خدمت پر جاتے تھے تو روزِ رخصت سے لے کر منزلِ مقصود تک جو جو باتیں مفید و متعلق اپنے آقا کے مشاہدہ میں آتی تھیں سب کا پہنچانا داخل خدمت تھا۔ یہ نہ تھا کہ جس کام پر مامور ہوئے اسی کام کی نیت اور اُسی منزل کی سیدھ باندھی اور چلے گئے ایک رسید کی رپورٹ بھیج دی کہ کام اس طرح سرانجام ہوگیا اور بس۔ اور سبب اس کے ظاہر ہیں +

(۵) اس عرضی میں اور اور عرائض بھی تم دیکھو گے عبداللہ اُذبک والئے توران اور شاہ عباس والئ ایران اور تعلقات شاہ روم کے اخبار پر بہت اٹکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو ان کا بڑا خیال ہوگا۔ اور وہ فقط سندھ اور کابل و کشمیر کے قوس میں گردش کر کے اُن کے خیالات پر نظر نہ رکھتا تھا بلکہ سمندر کا پھیر کھا کر اُن کا پتہ لگاتا تھا۔ دیکھو فیضی کی ایک انشا جو فقط عبارت آرائی کے شوق سے کسی نے جمع کر دی تھی اس سے یہ نکتے کھلے۔ ورنہ اور امراء جو ادھر کی سرحد کے علاقوں پر

تھے۔ یہ باتیں ان کی خدمت کا جزو ہونگی۔ افسوس وہ تحریریں ایسی نیست و نابود ہوئیں کہ ہمیں اُن تک پہنچنے کی اُمید بھی نہیں ہو سکتی۔

(۶) تمہیں یاد ہوگا کہ اکبر کا جہازی شوق (جہازرانی کا) یہاں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسے لنگر گاہوں اور سمندر کے کناروں پر قبضہ کرنے کا بڑا خیال تھا۔ اور ہر پہلو سے دریائے قوت کو بڑھاتا تھا۔ اور یہ خیال فقط شاہانہ شوق نہ تھا بلکہ نظامِ سلطنت اور مُلکی مصلحت پر تھا۔

(۷) تم نے دیکھا؟ اثنائے راہ کے شہروں کا گزیٹیر لکھتا جاتا تھا۔ بعض شہروں کی صورت حال لکھتا ہے۔ ان کے مشہور مقاموں کی تاریخ لکھ دیتا ہے ان کی پیداوار یں لکھتا ہے۔ کہاں کیا کیا چیزیں عمدہ بنتی ہیں۔ یہ بھی لکھ دیتا ہے۔ اس میں دل ربائی بھی چلی جاتی ہے۔ کہ کپڑے کے کارخانے میں حضور کے لئے دستار اور پٹکے بن رہے ہیں مگر وہی باتیں لکھتا ہے جو ابھی بادشاہ تک نہیں پہنچیں۔ ہر شہر کے علما و فضلا و حکما اور اہل کمال کا حال لکھتا ہے۔ اور ان کی تعریف میں وہ الفاظ خرچ کرتا ہے جن سے ان کے جوہر اصلی کُھل جائیں۔ اور معلوم ہو جائے کہ وہ اس کے ڈھب کے ہیں یا نہیں۔ اور ہیں تو کس درجہ پر ہیں۔ اور کتنی قدردانی کے قابل ہیں۔ ہر شہر کی مشہور درگاہوں کا حال لکھتا ہے۔ اس میں جہاں جگہ پاتا ہے ظرافت کا گرم مصالحہ بھی چھڑکتا جاتا ہے اور تین سو برس کے بعد آج ہمیں خبر دیتا ہے کہ اکبر کن کن باتوں کا طلبگار تھا اور اس کا عہد کیسا عہد تھا۔ ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد	کسے را باکسے کارے نباشد

(۸) اس کے اشعار اور لطائف و ظرائف کو پڑھ کر اکبر کی طبیعت کا تصور بندھ جاتا ہے کہ وہ کن خیالات کا بادشاہ تھا۔ اور دربار اکبری کے اراکین جب اس کے گرد جمع ہوتے ہونگے تو ایسی ہی باتوں سے اُسے خوش کرتے ہونگے۔

(۹) تم نے شیعہ سُنّی کے لطیفے بھی دیکھے۔ انہیں پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ غلطی ہے اُن لوگوں کی جو کہتے ہیں کہ فیضی و فضل شیعہ تھے یا شیعوں کے طرفدار تھے۔ یہ جب اکبر کے گرد بیٹھتے ہونگے اور شیعوں اور سُنیوں کو جھگڑتے دیکھتے ہونگے تو ہنستے ہونگے کیونکہ اصل معاملہ کو سمجھے ہوئے تھے۔ جانتے تھے کہ بات ایک ہی ہے

تنگ چشم - کم حوصلہ سخن پرور - صندلیوں نے اور بھوکے پلاؤ خوروں نے خواہ مخواہ جھگڑے پیدا کر دیئے ہیں +

(۱۰) اس کے آب دار کلام سے خصوصاً اس خط سے جو مُلّا صاحب کی سفارش میں لکھا ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو اُن کے مخالف رائے تھے بلکہ عنادی مخالفت رکھتے تھے - اس سے بھی مخالفت فقط اتنی بات پر ختم ہو جاتی تھی کہ خیر تمہاری رائے یہ ہے اور ہماری رائے یہ ہے - ان کی مخالفت رائے انہیں عداوت اور کینہ وری اور انتقام کے درجے پر نہ پہنچاتی تھی جبھی ہر صحبت میں خوش بیٹھتے تھے اور خوش ہو کر اُٹھتے تھے - خدا ہمیں بھی خوش رہنے والی اور خوش رکھنے والی طبیعت روزی کرے +

شیخ عبد القادر بدایونی امام اکبر شاہ

امام اکبر شاہ کہلاتے تھے - اور علمائے عصر میں فضیلت کا درجہ رکھتے تھے ترجمہ اور تالیف میں اکبر کی فرمائشوں کو عمدہ طور پر سرانجام کرتے تھے - اسی خدمت کی بدولت ان کے جواہر معانی صفائی بیان کے ورقوں میں جگمگائے اور ان کی کثرت تصانیف اپنی عمدگی سے الماری کے درجۂ اول پر قابض ہو گئی - جو تاریخ کہ ہندوستان کے حالات میں لکھی ہے وہ اکبر کے دربار اور اہل دربار کے حالات سے تاریخی عبرتوں کا اعلیٰ نمونہ ہے - ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مہمات سلطنت اور کاروبار زمانہ کو خوب سمجھتے تھے +

فاضل مذکور میں بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر شخص کے خصائل اور جزوی جزوی عادات اور اطوار کو چُنتے ہیں اور اس خوب صورتی سے بیان کرتے ہیں کہ جب پڑھو نیا لطف حاصل ہوتا ہے - اہل ذوق دیکھینگے اور جہاں تک ممکن ہو گا میں دکھاتا جاؤں گا کہ وہ امرائے دربار میں جس کے برابر سے نکلتے ہیں ایک چٹکی ضرور لیتے جاتے ہیں -

امرائے دربار سے ان کا اس قدر بگاڑ نہ ہوتا۔ مگر اس کا سبب یہ تھا کہ اُنھوں نے
مُلّائی کے دائرے سے قدم نکالنا نہ چاہا اور اسی کو دُنیا کا فخر اور دین کی دولت سمجھا۔
انہیں کبھی تو بے علم یا کم لیاقت لوگ مراتب عالی پر نظر آئے۔ اور یہ ناگوار گزرا۔
اکثر چھوٹے تھے کہ آنکھوں کے سامنے بڑے ہوئے یا برابر سے آگے بڑھ گئے۔
کبھی باہر سے آئے۔ اور مختلف خدمات کی سُنہری مسندوں پر بیٹھ کر صاحب جاہ و
جلال ہو گئے۔ اور یہ مُلّا کے مُلّا ہی رہے۔ ایسے لوگوں کو ان کی فضیلت علمی ضرور خاطر
میں نہ لاتی ہو گی۔ بلکہ چاہتی ہو گی کہ میرا ادب پیش نگاہ رکھیں۔ ادھر دولت اور حکومت
کو اتنا دماغ کہاں؟ میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ ایسے موقع پر دونوں طرف سے کوتاہیاں
اور قباحتیں ہوتی ہیں۔ اہل علم کو تو ان پر غصہ ہونے کے لئے کوئی سبب درکار ہی نہیں
فقط اہل دول کی سواری اپنے جاہ و حشم کے ساتھ برابر سے نکل جانی کافی ہے۔ اگر وہ
اپنے کاروبار کے افکار میں غلطاں و پیچاں جاتے ہوں تو بھی یہی کہتے ہیں کہ اللہ رے
تمہارا غرور آنکھ بھی نہیں ملاتے کہ ہم سلام ہی کر لیں۔ امارت کے تو مالک بن گئے۔
بھلا کوئی دو سطریں ہم لکھ دیں پڑھ بھی لو گے؟ اور اہل دول بھی اکثر کم ظرف ہوتے ہیں کہ
جب کسی درجے پر پہنچتے ہیں تو اپنا سلام علماء کے ذمّہ فرض سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس پر
قناعت نہ کر کے چاہتے ہیں کہ ہماری دربار داریاں کریں۔ اور چونکہ بادشاہ کی خلوت
جلوت میں دخل رکھتے ہیں۔ اُنہیں ان غریبوں کے کاروبار میں بولنے کے لئے بہت
موقع ملتے ہیں۔ چنانچہ کبھی انکے کاموں میں خلل ڈالتے ہیں۔ کبھی ان کی تصانیف پر جس
کی عبارت بھی نہیں پڑھ سکتے ناک بھوں چڑھا دیتے ہیں۔ اور مصنّف کے دل سے
کوئی پُوچھے تو اس کے دین و دنیا کی کائنات وہی ہے۔ کبھی نالائق کو لا کر اُن سے
بھڑا دیتے ہیں۔ اور اپنے ہم جنسوں کی سفارشوں کو رفاقت میں لے کر اُنہیں آگے بڑھا
لے جاتے ہیں۔ یہ باتیں رفتہ رفتہ دشمنی کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ اور جب کہیں ان کا
مقدمہ پیش پاتے ہیں تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر خراب کرتے ہیں۔ غریب اہل علم سے
اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہاں قلم اور کاغذ پر ان کی حکومت ہے۔ یہ بھی جہاں موقع پاتے ہیں
اپنے گھسے ہوئے قلم سے وہ زخم دیتے ہیں کہ قیامت تک نہیں بھرتے۔

ان کی تاریخ اپنے مضمون و مقصود کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ الماری کے

سر پر تاج کی جگہ رکھی جائے۔ سلطنت کے عمومی انقلاب اور جنگی مہمات سے ہر شخص آگاہ ہو سکتا ہے لیکن صاحب سلطنت اور ارکانِ سلطنت میں سے ہر ایک کے اطوار و اسرار اور نہاں و آشکار سے جو وہ آگاہ تھے دوسرا نہ ہوگا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تصنیف کے سلسلے اور فضائل علمی اور علم مجلسی وغیرہ ان کے اوصاف۔ اکبر کی خلوت و دربار میں ہمیشہ پاس جگہ حاصل کرتے تھے اور ان کے معلومات اور حُسن صحبت کے لطائف سے امرائے دربار اپنی دوستانہ صحبتوں کو گلزار کرتے تھے۔ علماء و فقراء اور مشائخ تو ان کے اپنے ہی تھے۔ لطف یہ ہے کہ انہیں میں رہتے تھے مگر خود ان کی قباحتوں میں آلودہ نہ ہوتے تھے۔ دُور کے دیکھنے والوں میں تھے۔ اس لئے اُنہیں حُسن و قبح خوب نظر آتا تھا۔ اُونچی جگہ پر کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس لئے ہر جگہ کی خبر اور ہر خبر کی تہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ اکبر اور ابوالفضل و فیضی اور مخدوم و صدر سے خفا بھی تھے۔ اس لئے جو کچھ ہؤا صاف صاف لکھ دیا۔ اور اصل بات تو یہ ہے۔ کہ طرز تحریر کا بھی ایک ڈھب ہے۔ یہ خوبی ان کے قلم میں خداداد تھی۔ ان کی تاریخ میں یہ کوتاہی ضرور ہے کہ مہمات اور فتوحات کی تفصیل نہیں۔ اور واقعات کو بھی مسلسل طور پر بیان نہیں کیا۔ لیکن اس خوبی کی تعریف کس قلم سے لکھوں۔ کہ اکبری عہد کی ایک تصویر ہے۔ جزئیات اور اندرونی اسرار ہیں کہ اور تاریخ نویسوں نے مصلحتہً یا بے خبری سے قلم انداز کر دئے۔ ان کی بدولت ہم نے سارے عہد اکبری کا تماشا دیکھا۔ باوجود ان باتوں کے جو کم نصیبی ان کی ترقی میں سنگ راہ ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ زمانے کے مزاج سے اپنا مزاج نہ ملا سکتے تھے۔ جس بات کو خود بُرا سمجھتے تھے۔ اسے چاہتے تھے کہ سب بُرا سمجھیں۔ اور اسے عمل میں نہ لائیں جس بات کو اچھا سمجھتے تھے اسے چاہتے تھے کہ اسی طرح ہو جائے۔ قباحت یہ تھی کہ جس طرح طبیعت میں جوش تھا اسی طرح زبان میں زور تھا۔ اس واسطے ایسے موقع پر کسی دربار اور کسی جلسے میں بغیر بولے نہ رہا جاتا۔ اس عادت نے مجھ ناقابل کی طرح ان کے لئے بھی بہت سے دشمن بہم پہنچائے تھے۔

وہ حقیقت میں مذہبی فاضل تھے۔ فقہ۔ اصُول فقہ اور حدیث کو خوب حاصل کیا تھا۔ عشق کی حرارت سے دِل گداز تھا۔ تصوف سے طبعی تعلق تھا۔ علوم عقلی کو

پڑھا تھا۔ مگر اس کا شوق نہ تھا۔ زیادہ تر عادتیں اس لئے بگڑی تھیں کہ ان کی نضیلت نے شیر شاہ اور سلیم شاہ کے زمانے میں پرورش پائی تھی۔ ان بادشاہوں کا خیال قدیمی اصول کے بموجب یہ تھا کہ ہند ہندوؤں کا ملک ہے۔ ہم اہل اسلام ہیں۔ مذہب کے زور سے اتحاد اور اتفاق پیدا کریں۔ جب ان پر غلبہ اور قدرت پائینگے یمصنف مذکور اگر اس عہد میں ہوتا تو خوب رونق پاتا۔ مگر اتفاقاً زمانہ کا ورق اُلٹ گیا۔ اور آسمان نے اکبر کے اقبال کی قسم کھالی۔ اکبر کے ہاں بھی پندرہ برس تک قال اللہ اور قال الرسول کے چرچے رہے۔ اور اہل علم اور اہل فقر کے گھروں میں رات شب قدر اور روز نو روز ہوتے رہے۔ مگر مسائل علمی کے ہجوم میں کبھی کبھی معقولات بھی دربار میں گھس آتے تھے یمعقول بادشاہ کو معقولات کی معلومات کا بھی شوق پیدا ہوا۔ ہر ایک زبان۔ ہر ایک مذہب اور ہر علم کے عالم دربار میں آئے۔ بلکہ قدردانی سے بُلائے گئے۔ پہلے شاعری کی سفارش سے فیضی آئے۔ ان کا دامن پکڑ کر ابوالفضل بھی آن پہنچے۔ بہت سے فاضل ایران و توران کے پہنچے۔ اسی ضمن میں یہ بھی ثابت ہوا کہ مذہب کا اختلاف جس نے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو گروہ باندھ باندھ کر ایک کو دوسرے کے لہو کا پیاسا کر دیا ہے۔ نہایت خفیف اور اعتباری فرق ہے اور اس اختلاف میں زیادہ کاوش کریں۔ تو بنی آدم یعنی ایک دادا کی اولاد میں تلوار درمیان آجاتی ہے اور بہشت اور دوزخ کا فرق جا پڑتا ہے۔ اس لئے اکبر کے خیالات بدلنے شروع ہوئے۔ اُس نے کہا انسان اُنس سے نکلا ہے۔ خدا نے مل کر رہنے کو بنایا ہے اس لئے ملنساری اور اتحاد و ارتباط کو اصولِ سلطنت قرار دینا چاہیئے +

پُرانے عالم پُرانی باتوں کے خوگرفتہ تھے۔ اُنہیں یہ باتیں ناگوار ہوئیں۔ اکبر نے اُنہیں رستہ پر کھینچنا چاہا۔ اُنہوں نے گردنیں سخت کیں۔ ناچار یا توڑنا یا بیچ سے ہٹانا واجب ہوا۔ ان خیالات کی ابتدا تھی جو فاضل مذکور دربار میں پہنچا۔ اس نے اوّل اوّل ترقی کے قدم خوب بڑھائے۔ یہ نوجوان عالم اپنے علم کے جوش اور ترقی کی اُمنگ میں تھا۔ بڈھے مُلّانوں کو اور ان کی بڈھی تعلیم کو توڑ توڑ کر اکبر کو خوش کیا۔ مگر یہ نہ سمجھا کہ اصول میرے اور بُڈھوں کے ایک ہیں۔ اور اب زمانے نے نیا مزاج پکڑا ہے۔ انہیں توڑونگا تو ساتھ ہی آپ بھی ٹوٹ جاؤنگا۔ غرض کچھ تو اس سبب سے کہ اُس نے پُرانی تہذیب

کے دامن میں پرورش پائی تھی۔ اور کچھ اس کی طبیعت بھی ایسی ہی واقع ہوئی تھی۔ اس لئے وہ نئے زمانے میں پرانے مسائل کو واجب العمل سمجھتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ مخالفت شروع ہوئی۔ اور چونکہ فقط فضل و فیضی (اس کے خلیفہ اور اُستاد بھائی) ہی نئے خیالات نہ رکھتے تھے بلکہ زمانہ کا مزاج بدلا ہوا تھا۔ اس لئے اس کے مزاج نے کسی سے موافقت نہ کھائی۔ اس کی تصنیفات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک زمانہ سے لڑائی باندھے بیٹھا ہے۔ مخدوم الملک اور شیخ صدر شریعت کا ٹھیکہ لئے ہوئے تھے۔ مگر وہ انہیں بھی قابل موافقت نہ سمجھتا تھا۔ کیونکہ دیانت و امانت اور سچے دل سے شریعت کی پابندی چاہتا تھا۔ اور ان بزرگوں کا حال جو کچھ تھا وہ معلوم ہوا۔ اور کچھ اس کے حال میں معلوم ہو جائیگا۔ یہی سبب ہے کہ یہ دونوں بلکہ کوئی مشہور عالم یا نامی عارف نہیں جو اس کے شمشیر قلم سے زخمی نہ ہوا ہو +

تعجب یہ ہے کہ ملا صاحب خود رُوکھے سُوکھے عالم تھے مگر طبیعت ایسی شگفتہ و شاداب لائے تھے جو انشا پردازی کی جان تھی۔ باوجود علم و فضل اور مشیخت فقر کے گاتے بجاتے تھے۔ بین پر بھی ہاتھ دوڑاتے تھے شطرنج دو دو طرح کھیلتے تھے۔ جس سے عوام کہتے ہیں۔ ہر فن مولا تھے۔ بہرحال وہ اپنی کتاب میں ہر ماجرے اور ہر معاملے کو نہایت خوبصورتی سے ادا کرتا ہے۔ اور اس کی حالت کی ایسی تصویر کھینچتا ہے کہ کوئی نکتہ اس کا باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کی ہر بات چٹکلا اور ہر فقرہ لطیفہ ہے۔ ہزاروں تیر اور خنجر اس کے شگاف قلم میں ہیں۔ اس کی تحریر میں عبارت آرائی کا کام نہیں۔ ہر حال کو بے تکلف لکھتا چلا جاتا ہے۔ اور اس میں جدھر چاہتا ہے سُوئی چبھو دیتا ہے۔ جدھر چاہتا ہے نشتر۔ جدھر چاہتا ہے چھُری چاقو۔ چاہتا ہے تو ایک تلوار کا ہاتھ جھاڑ جاتا ہے۔ اور اس خوبصورتی سے کہ دیکھنے والا تو درکنار زخم کھانے والا بھی لوٹ ہی جاتا ہوگا۔ خود اپنے اوپر بھی پھبتیاں اور نقلیں کہتا جاتا ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اصلی حال کے لکھنے میں دوست دشمن کا ذرا لحاظ نہیں کرتا۔ جن لوگوں کو بُرا کہتا ہے۔ وہ بھی جہاں اپنے ساتھ سلوک کرتے ہیں لکھ دیتا ہے۔ جب کسی بات پر خفا ہوتا ہے تو وہیں صلواتیں سُنانے لگتا ہے +

وہ دیباچے میں لکھتے ہیں۔ جب میں حسب الحکم بادشاہی ملا شاہ محمد شاہ آبادی کی تاریخ

کشمیر کو درست کر چکا تو ۹۹۹ھ تھے۔ اس وقت اسی رنگ میں ایک تاریخ لکھنے کا خیال آیا مگر آزاد کو کتاب دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی تھوڑی لکھنے گئے ہیں اور رکھتے گئے ہیں۔ اخیر وقت میں سب کو مسلسل کیا ہے۔ اور خاتمے کو پہنچایا ہے کیونکہ ابتدا میں جو اکبر کا حال لکھا ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے محبت ٹپکتی ہے۔ اور اخیر بیان سے ناراضی برستی ہے۔ فقرا اور علماء اور شعراء کے حال جو خاتمے میں لگائے ہیں۔ یہ غالباً سب اخیر کے لکھے ہوئے ہیں۔ کہ بہتوں کی خاک ہی اُڑائی ہے اور زیادہ تر تصدیق میرے خیال کی اس درد انگیز بیان سے ہوتی ہے۔ جو میں نے ایک اور مقام میں درج کیا ہے۔ مُلّا صاحب خود فرماتے ہیں کہ خواجہ نظام الدین نے جو ۳۰ برس کا حال اکبر کا لکھا ہے۔ وہاں تک کے حالات مہماتِ بادشاہی اس سے لئے ہیں۔ باقی دو برس کا حال مَیں نے خاص اپنی معلومات سے لکھا ہے اب جو نکتے مَیں نے مجمل لکھے ہیں ان کی تفصیل اور اپنے خیالوں کی تصدیق مُلّا صاحب کے حالات سے کرتا ہوں۔

فاضل مذکور اگرچہ بداؤنی مشہور ہیں۔ مگر موضع ٹونڈہ[1] میں پیدا ہوئے۔ کہ بساور کے پاس ہے۔ اسے ٹونڈہ بھیم بھی کہتے ہیں۔ یہ علاقہ بادشاہوں کے عہد میں سرکار آگرہ میں تھا۔ اور صوبۂ اجمیر سے بھی متعلق رہا۔ ان کی ننیہا بیانہ میں تھی۔ جو آگرہ اور اجمیر کی سڑک کے کنارے پر ہے۔ وہ خود شیر شاہ کے حال میں اس کے عدل و حُسنِ انتظام کے حالات لکھتے لکھتے کہتے ہیں جس طرح پیغمبر صاحب نے نوشیرواں کے زمانے پر فخر کر کے فرمایا ہے کہ بادشاہ عادل کے زمانے میں میری ولادت ہوئی ہے۔ الحمد للہ میں بھی اس بادشاہ کے عہد میں ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ (۲۱ اگست ۱۵۴۰ء) کو پیدا ہوا ساتھ ہی نہایت شکستہ دلی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ باوجود اس کے کہتا ہوں کہ کاش اس گھڑی اور اس دن کو سال و ماہ کے دفتر سے مٹا دیتے۔ تاکہ مَیں عدم کے خلوت خانے میں عالمِ خیال اور عالمِ مثال کے لوگوں کے ساتھ رہتا۔ کوچہ ہستی میں قدم نہ رکھنا پڑتا۔ اور یہ رنگا رنگ کی مصیبتیں نہ جھیلنی پڑتیں جو دین و دنیا کے ٹوٹے کی نشانیاں ہیں۔ پھر آپ ہی عذر کرتے ہیں۔ استغفر اللہ مجھ شکستہ خیال کی کیا مجال ہے کہ امرِ الٰہی میں ہوم مار

[1] آگرہ سے اجمیر کو جاتے ہوئے پہلی منزل منڈاکر۔ ۲ فتحپور۔ ۳ خانوہ متصل بجونہ۔ ۴ گردہر۔ ۵ بساور۔ ۶ ٹونڈہ۔

سکوں۔ ڈرتا ہوں۔ کہیں ایسی دلیر زبانی سے دین کے معاملے میں گستاخی نہ ہو جائے کہ وبال دوام کا ثمرہ دے۔ چنانچہ پیغمبر صاحب کے اور چند بزرگوں کے قول بھی اسی مضمون کے نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ جو خدا کو نہ بھائے اُس سے توبہ ہے ؎

گِل را چہ مجال است کہ گوید بہ کلال	کز بہر چہ سازی و چرا مے شکنی

انہوں نے شیر شاہ کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ بنگالہ سے رہتاس پنجاب تک ۴ مہینے کا رستہ ہے اور آگرہ سے منڈو تک کہ مالوہ میں ہے۔ سڑک پر دو طرفہ میوہ دار درخت سائے کے لئے لگائے تھے۔ کوس کوس بھر پر ایک سرا۔ ایک مسجد۔ ایک کنواں بنوایا تھا۔ ہر جگہ ایک مؤذن ایک امام تھا۔ غریب مسافروں کے کھانے پکانے اور خدمت کے لئے ایک ہندو ایک مسلمان نوکر تھا۔ لکھتے ہیں کہ اس وقت تک ۵۲ برس برس گذرے ہیں۔ اب بھی ان کے نشان باقی ہیں۔ انتظام کا یہ عالم تھا کہ ایک بڈھا پھوس اشرفیوں کا طباق ہاتھ پر لئے چلا جائے۔ جہاں چاہے پڑ رہے۔ چور یا لٹیرے کی مجال نہ تھی۔ کہ آنکھ بھر کر دیکھ سکے۔ اور جس سال مصنّف پیدا ہوا تھا۔ اسی سال شیر شاہ نے یہ حکم دیا تھا (آزاد۔ قلعۂ رہتاس کو اس نے عملداری کی سرحد قرار دیا تھا اور اس کا استحکام کیا تھا۔ کہ گکھڑوں کے زبردست صدموں کے لئے سدِّراہ رہے۔ قلعۂ مذکور جس پہاڑ پر ہے۔ زمانہ قدیم میں کوہ بالناتھ کہلاتا تھا۔ اب ضلع جہلم سے متعلق ہے)۔

ملّا صاحب نے بساور میں پرورش پائی۔ اور اکثر جگہ محبّت کے ساتھ اسے اپنا وطن کہتے ہیں۔ بزرگوں کا حال کہیں مفصّل نظر سے نہیں گزرا۔ خاندان امیر نہ تھا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ فاروقی شیخ تھے۔ اور ددھیال ننھیال دونوں صاحب علم اور دیندار گھرانے تھے علمی اور دینی نعمتوں کی قدر پہچانتے تھے۔ ان کے ملوک شاہ ابن حامد شاہ بھی شرفا میں گنے جاتے تھے۔ اور شیخ پنجو سنبھلی کے شاگرد تھے۔ اور معمولی کتابیں عربی و فارسی کی پڑھی تھیں۔ ان کے نانا مخدوم اشرف تھے۔ سلیم کے عہد میں فرید تارن ایک پنجہزاری سردار بجواڑہ متصل بیانہ صوبہ آگرہ میں تھا۔ اس کی فوج میں ایک جنگی عہدہ دار تھے۔ غرض فاضل مذکور ۹۵۲ھ سے ۹۶۰ھ تک اپنے والد ملوک شاہ کے دامن میں رہے پانچ برس کی عمر تھی۔ جب سنبھل میں قرآن وغیرہ پڑھتے رہے۔ پھر نانا نے پیارے نواسے کو اپنے

پاس رکھا۔ اور بعض ابتدائی کتابیں اور مقدماتِ صرف و نحو بھی خود پڑھائے۔ فاضل بدایونی بچپن ہی سے ایک خوش اعتقاد مسلمان تھے۔ اور اہل فقر کی صحبت کو نعمت الٰہی سمجھتے تھے۔ سید محمد مکی ان کے پیر بھی وہیں رہتے تھے۔ وہ علم قرأت میں کامل تھے اور ۷ قرأتوں پر قدرت رکھتے تھے۔ ان ہی سے قرأت اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھنا سیکھا۔ اس وقت ۹۶۰ھ سلیم شاہی دور تھا۔ مگر یہ شاگردی بہت مبارک ہوئی کہ ایک دن اسی کی سفارش سے دربار اکبری میں پہنچے۔ اور ۷ اماموں میں داخل ہو کر امام اکبر شاہ کہلائے۔

خود لکھتے ہیں کہ ۱۲ برس کی عمر تھی کہ والد نے سنبھل میں آکر میاں حاتم سنبھلی کی خدمت میں حاضر کیا۔ ۹۶۱ھ میں ۱۲ برس کی عمر تھی (اس سے معلوم ہوا کہ ۹۴۹ھ میں پیدا ہوئے تھے) ان کی خانقاہ میں رہ کر قصیدہ بردہ یاد کیا۔ وظیفہ کی اجازت حاصل کی۔ اور فقہ حنفی میں تبرّکاً کنز کے چند سبق پڑھے اور مرید ہوا۔ اسی سلسلہ میں کہتے ہیں۔ میاں نے ایک دن والد مرحوم سے کہا کہ ہم تمہارے لڑکے کو اپنے اُستاد میاں شیخ عزیز اللہ صاحب کی طرف سے بھی کلاہ اور شجرہ دیتے ہیں۔ تاکہ علم ظاہری سے بھی بہرہ ور ہوں۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ فن فقہ اُنھوں نے حاصل کیا۔ اگرچہ تقدیر نے اُنہیں اور شغلوں میں لگایا مگر وہ عمر بھر اسی کے ذوق شوق میں رہے۔ ملّا صاحب کی تیزی طبع کی کیفیت اس بیان سے معلوم ہوتی ہے کہ عدلی افغان کے حال میں لکھتے ہیں ۹۶۱ھ میں میاں کی خدمت میں آنے سے پہلے بادشاہوں سرداروں نے بدایوں پر باغیوں سے لڑ کر فتح پائی۔ میری ۱۲ برس کی عمر تھی جبھی میں نے تاریخ کہی تھی۔ چہ لبس خوب کردہ اند۔ اس میں ایک زیادہ تھا۔ جب میاں کی خدمت میں آیا تو ایک دن باتوں باتوں میں فرمانے لگے کہ ان دنوں میں یہ خبر سُن کر فی البدیہہ ہم نے کہہ دیا تھا۔ فتح ہائے آسمانی شد۔ دیکھو تو کتنے ہوتے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ ایک کم ہوتا ہے۔ فرمایا قدما کی رسم خط کے بموجب ایک ہمزہ اور لگا دو۔ میں نے عرض کی۔ ہاں پھر تو پوری ہے۔

شیخ سعد اللہ نحوی کہ فن مذکور میں بے مثل تھے۔ اور اسی سبب سے نحوی ان کے نام کا جز ہو گیا تھا۔ بیانہ میں رہتے تھے۔ جب فاضل مذکور نانا کے پاس آئے تو ان سے کافیہ پڑھا۔ ہیموں نے سر اُٹھایا۔ اور لشکر اس کا لوٹتا مارتا بساور پر آیا۔ یہ اس وقت

سنبھل میں تھے۔ تمام بسا اور لُٹ کر برباد ہوگیا۔ خود بڑے افسوس سے لکھتے ہیں کہ
والد کا کتب خانہ بھی لُٹ گیا۔ دوسرا ہی برس تھا جو قحط کی مصیبت آئی۔ کہتے ہیں۔ کہ
بندگانِ خدا کی بدحالی دیکھی نہ جاتی تھی۔ ہزاروں آدمی بھوکوں سے مرتے تھے اور آدمی کو
آدمی کھائے جاتا تھا +

۹۶۶ھ میں علم کے شوق نے باپ بیٹوں کے دلوں میں حبِ وطن کی گرمی
کو ٹھنڈا کر دیا۔ اور آگرہ میں پہنچے۔ مولینا مرزا سمرقندی سے شرح شمسیہ اور بعض اور
مختصرات پڑھے۔ لکھتے ہیں۔ کہ یہ شرح میر سید محمد ولد میر علی ہمدانی کی ہے اور
میر سید علی وہی شخص ہیں جن کی برکت سے خطۂ کشمیر میں اسلام پھیلا +

قاضی ابوالمعالی بخارائی کو جب عبداللہ خاں اُزبک نے جلاوطن کیا تو وہ بھی آگرہ
میں آئے۔ اُن کے جلاوطن کرنے کا قصہ بھی عجیب ہے۔ خود لکھتے ہیں۔ کہ جب علم منطق
توران میں پہنچا۔ تو دیکھتے ہی لوگ بڑے شوق سے متوجہ ہوئے۔ مگر مصالحہ ایسا تیز لگا کہ
سب فلسفی فیلسوف ہوگئے۔ جب کسی نیک بخت صاحبدل کو دیکھتے تو اس کی
ہنسی کرتے اور کہتے۔ گدھا ہے گدھا۔ لوگ منع کرتے تو کہتے کہ ہم دلیل منطقی سے
ثابت کر دیتے ہیں۔ دیکھو ظاہر ہے کہ یہ لاحیوان ہے۔ اور حیوان عام ہے۔ انسان
خاص ہے۔ جب حیوانیت اس میں نہیں تو انسانیت جو کہ اس سے خاص ہے
وہ بھی نہیں۔ پھر گدھا نہیں تو کیا ہے۔ جب ایسی ایسی باتیں حد سے گزر گئیں۔ تو
مشائخ صوفیہ نے فتوے لکھ کر عبداللہ خاں کے سامنے پیش کیا۔ اور منطق کا پڑھنا
پڑھانا حرام ہوگیا۔ اس میں قاضی ابوالمعالی۔ ملا عصام۔ ملا مرزا جان اور اکثر شخص
بدعقیدہ ہوکر وہاں سے نکالے گئے۔ کہتے ہیں۔ کہ چند سبق شرح وقایہ کے مَیں نے
بھی قاضی ابوالمعالی سے پڑھے اور حق یہ ہے کہ وہ اس علم میں دریائے بے پایاں تھے۔
نقیب خاں بھی اس سبق میں شریک ہوئے +

آزاد ۔ مبارک عہد اور مبارک وقت تھا۔ اکبر کی سلطنت کا طلوع۔ بیرم خاں
کا دور۔ شیخ مبارک کی برکتیں۔ علم و کمال کی برکت علم و کمال پھیلانے لگی تھی۔ کہ فاضل
بداؤنی حلقۂ درس میں داخل ہو کر فیضی ابوالفضل کے اور نقیب خاں کے ہم درس ہوئے
شیخ مبارک کے ذکر میں خود فرماتے ہیں۔ جامع اوراق عنفوان شباب میں آگرہ میں چند

سال اُن کی ملازمت میں سبق پڑھتا رہا۔ الحق ان کا حق عظیم مجھ پر ہے۔ مہر علی بیگ سلدوز ایک جاں نثار خان خاناں۔ اور نامی سردار اپنے زمانے کا تھا۔ اُس نے ان باپ بیٹوں کو اپنے ہاں رکھا۔ ملا صاحب کی شگفتہ مزاجی اور خوش صحبتی نے مہر علی کے دل میں محبت کو ایسی جگہ دی۔ کہ ایک دم جدائی گوارا نہ تھی۔ شیر شاہی سرداروں میں عدلی کا غلام جمال خاں چنار گڑھ کا حاکم تھا۔ اقبال اکبری کے دربار سے اس نے خود التجا کی۔ کہ حضور سے کئی شائستہ اور کارداں امیر یہاں آئیں تو قلعہ سپرد کردوں۔ بیرم خاں نے مہر علی بیگ کا جانا تجویز کیا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم بھی چلو۔ یہ خود بھی ملّا تھے اور ملّا کے بیٹے تھے۔ علم کے شوق نے اجازت نہ دی۔ اس نے ان کے والد اور شیخ مبارک کو مجبور کیا۔ اور یہاں تک کہا کہ یہ نہ چلینگے تو میں بھی جانے سے انکار کردوں گا۔ غرض پیارے دوست کی تمنّا ... اور دونوں بزرگوں کے کہنے سے رفاقت اختیار کی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

عین برسات تھی۔ مگر دونوں بزرگوں کی رضاجوئی مقدم سمجھی۔ باوجود نوسفری کے تحصیل علم میں خلل ڈالا۔ اور سفر کے خوف و خطر اُٹھائے۔ قنوج۔ لکھنوتی۔ جون پور۔ بنارس کی سیر کرتا۔ عجائب عالم کو دیکھتا۔ جا بجا مشائخ و علماء کی صحبتوں سے فیض لیتا ہوا چلا۔ چنار میں پہنچے تو جمال خاں نے بڑی ظاہر داریوں سے خاطرداریاں کیں مگر دل میں دغا معلوم ہوئی۔ مہر علی بیگ نے ہمیں وہیں چھوڑا۔ آپ سیر مکانات کے بہانے سوار ہوا۔ اور صاف نکل گیا۔ جمال خاں بدنامی سے گھبرایا۔ ہم نے کہا "کچھ مضائقہ نہیں۔ کسی نے ان کے دل میں کچھ شبہ ڈالا ہوگا۔ خیر ہم سمجھا کر لے آتے ہیں"۔ غرض اس پیچ سے یہ بھی نکل آئے۔ قلعہ پہاڑ کے اوپر ہے۔ نیچے دریا بڑے زور شور سے بہتا ہے۔ کشتی ایک جگہ بے قابو ہوگئی۔ مولینا آخر ملّا تھے۔ بہت گھبرا کر لکھتے ہیں۔ کشتی بڑے خطرناک گرداب میں جا پڑی۔ اور دامن کوہ میں کہ دیوار قلعہ کے پاس تھی موجوں میں اُلجھ گئی۔ ہوا بھی ایسی مخالف چلنے لگی کہ ملاحوں کی کچھ پیش نہ جاتی تھی اگر دشت و دریا کا خداوند ناخدائی نہ کرتا۔ تو کشتیٔ اُمید گرداب بلا میں آکر کوہ اجل سے ٹکرا چکی تھی۔ دریا سے نکل کر جنگل میں آئے۔ شیخ محمد غوث گوالیاری جو ہندوستان میں بڑے مشائخ سے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پہلے اس جنگل میں اور پہاڑ کے دامن میں یادالٰہی

کے ساتھ گزران کیا کرتے تھے۔ ہم اس مقام پر سے گئے۔ ایک رشتہ دار اُن کا آموجود ہوا۔ اُس نے ساتھ لے جا کر غار دکھایا کہ یہاں ۱۲ برس تک بیٹھے رہے۔ اور بناسپتی کھا کر زندگی کی ✦

آگرہ میں تھے۔ کہ ۹۶۹ھ میں والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی لاش بساور میں لے گئے اور تاریخ لکھی ہے

سر دفترِ افاضلِ دوران ملوک شاہ	آں بحرِ علم معدنِ احسان وکانِ فضل
چوں بود در زمانہ جہانے زفضل ازاں	تاریخ سال فوت دے آمد جہانِ فضل

۹۷۰ھ میں خود سہسوان علاقہ سنبھل میں تھے۔ جو خط پہنچا کہ مخدوم اشرف نانا بھی بساور میں مرگئے۔ **فاضل جہاں** اُن کے مرنے کی تاریخ ہوئی۔ لکھتے ہیں کہ مَیں نے اکثر جزئیات اور علوم غریبہ (منطق و فلسفہ) ان سے پڑھے تھے۔ اور اُن کے بڑے بڑے حق میرے اور اہل علم کے ذِمّہ تھے۔ نہایت رنج ہوُا۔ والد کا داغ بھی بھول گیا۔ برس دن کے اندر دو صدمے گزرے۔ بے فکر طبیعت پر عجب پریشانی گزری دنیا کے فکر جن سے مَیں کوسوں بھاگتا تھا یکمرتبہ چاروں طرف سے تن تن کر سامنے آئے۔ اور رستہ روک لیا۔ والد مرحوم میری طبیعت کی آزادی اور بے پروائی دیکھ دیکھ کر کہا کرتے تھے۔ کہ یہ سارے ولولے اور شورشیں تمہاری مجھ تک ہیں مَیں نہ ہونگا۔ تو دیکھنے والے دیکھیں گے کہ تم کیسے بے قید رہتے ہو۔ اور دُنیا اور دُنیا کے کاروبار کو کیونکر ٹھوکر مار کر چھوڑ دیتے ہو۔ آخر وہی ہوُا کہ اب دنیا ماتم خانہ نظر آتی ہے مجھ سے زیادہ کوئی ماتم زدہ نہیں۔ دو غم ہیں۔ اور دو ماتم ہیں اور میں اکیلا ہوں۔ ایک سر ہے دو خمار کی طاقت کہاں سے لائے۔ ایک سینہ دو بوجھ کیونکر اُٹھائے ✦

پٹیالی میں امیر خسرو پیدا ہوئے ہیں۔ یہ علاقہ حسین خاں کی جاگیر میں تھا۔ لکھتے ہیں ۹۷۳ھ میں یہاں پہنچ کر حسین خاں سے ملے۔ جوانی کے ذوق اور ہمّت کے شوق نے دربار شاہی کی طرف دھکیلا۔ مگر اُس افغان دیندار کی محبت ایمانی اور خوبیوں کی کشش نے رستے میں روک لیا۔ خود لکھتے ہیں یہ شخص صاحب اخلاق تھا۔ متواضع درویش سیرت۔ سخی۔ پاکیزہ روزگار۔ پابند سنت و جماعت۔ علم پرور فضل دوست تھا۔ نیکی سے پیش آتا تھا۔ اُس کی صحبت سے جدائی اور نوکری کرنے کو جی نہ چاہا۔

دس برس تک انہی گمنام گوشوں میں ...... رہا۔ وہ نیک لوگوں کی خبر گیری کرتا تھا ہیں اُس کی رفاقت کرتا تھا۔ ملّا صاحب نے اس پرہیزگار اور بہادر افغان کی بڑی تعریفیں لکھی ہیں۔ اور اس قدر لکھی ہیں۔ کہ پیغمبروں تک نہیں تو اصحاب و اولیاء کے اوصاف تک ضرور پہنچا دیا ہے۔ چونکہ اس کے حال میں ان کے اور اکبر کے عہد کے بہت حالات دست و گریبان ہیں۔ اس لئے اُس کا حال علیحدہ لکھونگا۔ کہ دلچسپ باتیں ہیں۔ اس دلاور افغان نے ہمایوں کی مراجعت سے لے کر اکبر کے سال ۲۲ جلوس تک بڑی جاں نثاری اور وفاداری دکھائی۔ اور ۳ ہزاری تک منصب حاصل کیا۔ غرض دو دیندار متفق الخیال مسلمان رہتے تھے۔ اور مزے سے گزران کرتے تھے +

قیس صحرا میں اکیلا ہے مجھے جانے دو		خوب گزریگی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

حسین خاں کے پاس ۹۷۳ھ سے ۹۸۱ھ تک ۸ برس رہے۔ قال اللہ و قال الرسول سے اپنا اور اس کا دل خوش کرتے تھے۔ بے تکلفی کی صحبتوں میں جی بہلاتے تھے۔ علماء و فقرا کی خدمتیں کرتے تھے۔ جاگیر کے کاروبار اور وکالت کو حُسن لیاقت اور شیرینی گفتار سے رسائی دیتے تھے +

۹۷۵ھ میں رخصت لے کر بداؤن گئے اور ملّا صاحب دوبارہ دولہا بنے شادی کی آرائش۔ سامان۔ بناؤ سنگار سب ڈیڑھ سطر میں ختم کیا۔ مگر عجیب خوبصورتی سے بلکہ عبارت سے جھلکتا ہے کہ بی بی خوبصورت پائی اور انہیں بھی بہت پسند آئی دیکھنا کیا مزے سے کہتے ہیں۔ اس برس میں راقم تاریخ کی دوسری شادی واقع ہوئی۔ اور بموجب مضمون وَالْآخِرَةُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی۔ مبارک نکلی۔ تاریخ کہی گئی ؎

	چوں مرا از عنایتِ ازلی عقل تاریخ کد خدائی را		از دواجے بماہ چہرے شد ۹۷۵ھ گفت ماہے قریں مہرے شد	

آزاد۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلی سے خوش نہ تھے۔ خدا جانے اُس کے جیتے جی دوسری شادی کی یا بچاری مر گئی تھی۔ اُس کا تو افسوس بھی نہ کیا +

چند ہی روز میں لڑکا پیدا ہوا۔ یہ حسین خاں کے پاس پہنچے۔ وہ ان دنوں لکھنؤ

میں اپنی جاگیر پر تھے۔ اُن کی بدولت چند روز اودھ کی سیر کی۔ وہاں کے علماء وفقراو اہل اللہ سے ملاقاتیں کرکے بہت سے فیض حاصل کئے۔

حسین خاں جاگیر کی تبدیلی کے سبب سے بادشاہ سے خفا ہو گئے اور کوہستان میں فوج لے کر گئے کہ جہاد کرکے دین خدا کی خدمت کرینگے۔ سونے چاندی کے مندر ہیں اُنہیں لوٹینگے اور خود ترویج اسلام کرینگے۔ اس موقع پر یہ رخصت ہوکر بداؤں چلے گئے مگر دو سخت صدمے اُٹھائے۔ لکھتے ہیں۔ شیخ محمد چھوٹے بھائی کو میں نے جان کے برابر پالا تھا بلکہ جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ اُس نے بہت سے اخلاق حمیدہ حاصل کئے تھے اخلاق ملکی ملکہ ہو گئے تھے۔ ایک معقول گھرانے میں اس کی شادی کی۔ افسوس کیا خبر تھی۔ کہ اس کار خیر میں ہزار مصیبتوں کی شرت ہے۔ تین مہینے شادی پر نہ گذرے تھے کہ اُس کو اور نور چشم عبداللطیف کو زمانے کی نظر لگ گئی۔ پلک مارتے۔ ہنستا کھیلتا بچہ گود سے گور میں چلا گیا۔ وہ میری زندگی کا ہرا بھرا پودا تھا۔ اور میں زمانے کا شہریار تھا حیف اپنے ہی شہر میں پردیسی کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ مُلا صاحب نے اس مصیبت میں بہت شعر کہے ہیں۔ ایک ترکیب بند بھائی کے مرثیے میں لکھا ہے۔ دل پر درد کا ابر چھایا ہوا تھا۔ اس لئے کلام بھی تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلا ہے۔ میں بھی اس کے لطف سے اپنے دوستوں کو محروم نہ رکھونگا۔ باوجود اس کے نظم مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا صاحب کی زبان میں نظم کا ڈھب ایسا نہیں جیسا نثر کا۔ اور یہ قاعدے کی بات ہے ؎

یارب این روز چہ روز یست کہ افتاد مرا ۔۔۔ دین چہ جانکاہ بلائیست کہ رو داد مرا
ہیچ کس نیست کہ فریاد من او را نرسید ۔۔۔ نرسد ہیچ کسے لیک بفریاد مرا
ماہ من آخر شب رفت پس پردۂ غیب ۔۔۔ بین کزیں حاملۂ غیب چہ غم زاد مرا
مایۂ شادی و اُمیدِ دلم رفت بخاک ۔۔۔ بعد ازیں دل بچہ اُمید شود شاد مرا
گرچہ بنیادِ من از صبر قوی بود ولے ۔۔۔ سیلِ غم آمد و انداخت ز بنیاد مرا
آں کسے را کہ کنم یاد بروزے صد بار ۔۔۔ دہ کہ یکبار بسالے نہ کند یاد مرا
چرخ بے داد چہ غمہا کہ بمن داد کنوں ۔۔۔ داد خود از کہ ستانم کہ دہد داد مرا

حال دل ہیچ ندانم بکہ گویم چہ کنم
چارۂ درد دل خود زکہ جویم چہ کنم

اے فلک وہ کہ دلم خستہ و ویران کردی
خاطر جمع مرا باز پریشان کردی

گوہرے کان یکم بود ز اغیار نہان
آشکار از نظرم بردی و پنہان کردی

سرو من بردی ازیں باغ بزندانِ لحد
باغ را برمن ماتم زدہ زندان کردی

یوسفم را بہ کف گرگ سپردی و مرا
در غمش معتکفِ کلبۂ احزان کردی

در گلِ تیرہ نہادی گلِ نورستۂ من
روز من با شبِ تیرہ زچہ یکساں کردی

حاصل آں کس کہ ازو بود سر و سامانم
بردی او را و مرا بے سر و ساماں کردی

آں برادر کہ دریں شہر غریب آمدہ بود
جاش در دشت بہ پہلوئے غریباں کردی

وقت گل آمد و شد جائے محمد در خاک
جائے آنست کہ از غصہ کنم بر سر خاک

آخر اے دیدہ چہ دیدی کہ زعالم رفتی
دیدہ پوشیدہ ازیں دیدۂ پرنم رفتی

چشم تاریک مرا روشنی از روئے تو بود
روشنی رفت زدل تا تو زچشم رفتی

بودۂ چشم مرا ہمچو نگیں در خاتم
چوں نگیں عاقبت الامر ز خاتم رفتی

دلت از ہیچ ممر شاد نشد در عالم
حیف صد حیف کہ ناشاد زعالم رفتی

جانِ پاک تو دریں مرحلہ بس غمگیں بود
رخت بستی و ازیں مرحلۂ غم رفتی

بر دل از کار جہاں ہیچ نہ بودت بارے
بارے از کار جہاں خوش دل و خورم رفتی

بودم از مہد ترا مونس و ہمدم ہمہ دم
در لحد بہر چہ بے مونس و ہمدم رفتی

رفتی و حسرتِ تو زیں دل حیراں نہ رود
غمت از دل نرود تا زغمت جاں نہ رود

کیست آں کس کہ نشانِ تو بمن گوید باز
خبر جان رواں گشتہ بہ تن گوید باز

قصۂ گل کہ فرو ریخت زآسیب خزاں
کیست القصہ کہ با مرغِ چمن گوید باز

قاصدے کو کہ غم و درد مرا روبرو
یک بیک پیش تو بر وجہ حسن گوید باز

یا تو گوید سخنم را بہ زبانی و انگاہ
بہر تسکیں ز زبانِ تو سخن گوید باز

تنگ دل غنچہ صفت گشتم و کس پیدا نیست
کز تو حرفے بمن اے غنچہ دہن گوید باز

ہست صد پیچ و شکن در دلم از ماتم تو
کہ بتو زیں دل پُر پیچ و شکن گوید باز

دور رفتی چو نیامد زدیار تو کسے
کہ ز احوال تو یک شمہ بمن گوید باز

روم و بر سرِ گورِ تو قیامے بکنم
تا جوابے شنوم از تو سلامے بکنم

گویم اے گوہر نایاب چہ حالست ترا　　باتن خستہ و بے تاب چہ حالست ترا
تو بخواب اجل و بے تو قیامت برخاست　　خیز و سر برکن ازیں خواب چہ حالست ترا
از جدائی تو احباب بسے بدحال اند　　اے جدا ماندہ ز احباب چہ حالست ترا
شدہ از دوری اصحاب بنزدیک ہلاک　　دور از صحبت اصحاب چہ حالست ترا
بود جائے تو بہ محراب و کنوں مے نگرم　　ماندہ خالی ز تو محراب چہ حالست ترا
مے خورم خون جگر بے تو مرا پرس گہے　　کہ دریں خوردن خونناب چہ حالست ترا
بر گلت صد گل سیراب دمید از اشکم　　زیر گل اے گل سیراب چہ حالست ترا

در چنیں منزل غمناک بہ نزدیک تو کیست
مونس روز و انیس شب تاریک تو کیست

اے صنم از رخ خوب تو جدا افتادہ　　وز فراق تو بصد گونہ بلا افتادہ
تو بصحرائے و من ماندہ دریں شہر غریب　　اللہ اللہ تو کجا من بہ کجا افتادہ
بار گل ہم نکشیدی و ندانم ایں بار　　بر تو صد پشتہ خس و خار چرا افتادہ
قدر وصل تو ندانستم و ایں بود جزا　　کہ ملاقات تو با روز جزا افتادہ
کردمے جاں بسر کار تو لیکن چہ کنم　　کہ سر و کار تو با حکم خدا افتادہ
سال تاریخ تو شد گفت چو حسرت افتادہ　　آں سہی سرو چہ ناگاہ ز پا افتادہ
قادری نالہ و فریاد نمے دارد سود　　در دعا کوش کہ نوبت بدعا افتادہ

از خدا خواہ کہ کارش ہمہ محمود بود
ہم خدا از وے و ہم او ز تو خوشنود بود

یارب اندر چمن خلد گزارش بادا　　قصر فردوس بریں جائے قرارش بادا
در گلستان جناں چوں گزرد جلوہ کناں　　حور و غلماں ز یمین و ز یسارش بادا
در شب تار چو عزم سفر عقبے کرد　　نور اسلام چراغ شب تارش بادا
بر مزارش چو کسے نیست کہ افروزد شمع　　پرتو لطف خدا شمع مزارش بادا
از عروس کہن دہر چو بگرفت کنار　　نو عروسان بہشتی بکنارش بادا
ہیچ یارے چو نشد ہمدم او بعد از مرگ　　دمبدم رحمت حق ہمدم و یارش بادا
مردماں قطرۂ اشکے کہ فشانند برو　　گردد آں قطرۂ در ناب و نثارش بادا

تا ابد مسکن او وزدہ علیین باد ایں دعا از من و از روح امیں آمیں باد

ایک خاندانی شخص کسی عورت پر عاشق ہو کر مر گیا۔ اس کے ماجرے کو انہوں نے افسانہ کے طور پر لکھا ہے اور مزے سے لکھا ہے۔ اخیر میں طول کلام کا عذر کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی کہتے ہیں۔ خدا مجھے بھی یہی نعمت نصیب کرے۔ ساتھ ہی ایک اور شعبدہ بازئی حضرتِ عشق یاد آگئی اسے بھی ٹانک گئے۔ مگر اس کا لکھنا واجب تھا۔ کیونکہ شیخ صدر پر اور شیخ محمد غوث کے خاندان پر بھی ایک نشتر مارنے کا موقع ملتا تھا۔ یہ معاملہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے اور خوبصورتی سے ادا ہوا ہے۔ اس لئے میں لکھتا ہوں۔ فرماتے ہیں:۔

حکایت ۔ شیخ زادگان گوالیار میں سے ایک شخص تھے کہ شیخ محمد غوث گوالیاری سے قرابتِ قریبہ رکھتے تھے۔ صلاح و صلاحیت کا لباس پہنتے تھے اور نام کے سر پر تاج شاہی کا تاج رکھتے تھے۔ وہ ایک ڈومنی پر عاشق ہو گئے۔ کیا ڈومنی تھی! ؎

در مغربِ زلف عرض دادہ در چنبرِ زلف کردہ پنہاں بر دامن ہجر و وصل بستہ	صد قافلہ ماہ و مشتری را دستار سپہر چنبری را بدبختی و نیک اختری را

بادشاہ کو خبر پہنچی۔ انہوں نے کنچنی کو پکڑوا کر منگایا۔ مقبل خاں کو دیدی کہ مقربان خاص میں تھا۔ یاروں کو شیخ زادہ صاحب کے ڈھنگ معلوم تھے باوجودیکہ مقبل خاں نے رنڈی کو محفوظ مکان میں رکھا اور باہر کا دروازہ چُن دیا تھا۔ مگر وہ ہمت کی کمند ڈال کر پہنچے اور لے ہی اڑے۔ شیخ ضیاء الدین شیخ محمد غوث کے بیٹے کہ اب بھی باپ کی مسند پر ہدایت و ارشاد فرماتے ہیں۔ اُن کے نام بادشاہی حکم پہنچا۔ انہوں نے بھی نصیحتوں وصیتوں سے سمجھا کر ڈومنی سمیت دربار میں حاضر کیا۔ بادشاہ نے چاہا کہ اس خانہ برانداز سے شیخ زادہ کا گھر بسا دیں۔ مگر شیخ ضیاء الدین اور اور لوگ راضی نہ ہوئے۔ کہ نسل بگڑ جائیگی۔ خاندان خراب ہو جائیگا۔ شیخ زادہ خانہ خراب کو تاب کہاں تھی۔ چھری مار کر مر گیا۔ کفن و دفن پر علماء میں تکرار ہوئی۔

شیخ ضیاء الدین نے کہا شہید عشق ہے۔ اسی طرح خاک سپرد کردو۔ شیخ عبدالنبی صدر عالی قدر اور اُور علماء اور قاضی اُن کے تصدیقچی کہتے تھے کہ ناپاک مرا۔ آسودۂ عشق نہیں۔ آلودۂ فسق ہے۔ ملا صاحب کا اس طرح فرمانا یا تو اس سے ہے کہ خود عاشق مزاج تھے اور اسی واسطے عاشقوں کے طرفدار تھے۔ یا یہ کہ شیخ صدر پر چوٹ کرنے میں خواہ مخواہ مزا آتا تھا +

۹۷۹ھ میں ایک اپنا ماجرا بیان کرتے ہیں جس سے تاریخ نویسی کی روح شاداب ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ نگار کو کیونکر واقعیت نگار ہونا چاہئے لکھتے ہیں کہ اس سال میں عجیب خوفناک واقعہ ہوا۔ کانت گولہ حسین خاں کی جاگیر میں تھا۔ میں وہاں آیا۔ صدارت کا عہدہ تھا۔ اور فقرا کی خدمت میرے سپرد تھی۔ شیخ بدیع الدین مدار کا مزار مکن پور علاقہ قنوج میں ہے۔ مجھے زیارت کا شوق ہوا۔ آدمی نے آخر کچا دودھ پیا ہے غفلت اور ظلم و جہل سے اس کی سرشت ہے۔ بیجا جسارت کر بیٹھتا ہے اور خسارت و ندامت اُٹھاتا ہے۔ اُس نے حضرت آدم سے بھی میراث پائی ہے۔ غرض انہیں بلاؤں نے میری عقل کی آنکھوں پر بھی پردہ ڈالا۔ ہوس کا نام عشق رکھا۔ اور اس کے جال میں پھنسا دیا۔ قسمت کی تحریر پر قلم چل چکا تھا۔ وہ پیش آئی۔ اور ایک سخت بے ادبی عین درگاہ میں واقع ہوئی۔ مگر غیرت اور عنایت الٰہی شامل حال ہوئی۔ کہ اس گناہ کی سزا ابھی یہیں ہوگئی۔ یعنی طرف ثانی کے چند آدمیوں کو خدا نے تعین کیا کہ تلواریں کھینچ کر چڑھ آئے۔ اور پے در پے ۹ زخم سر۔ ہاتھ اور کندھوں پر لگائے۔ سب زخم خفیف تھے۔ مگر سر کا گھاؤ گہرا تھا کہ ہڈی توڑ کر مغز پر پہنچا۔ اور تہی مغزی کا ثمرہ پایا۔ اُلٹے ہاتھ کی چھنگلی بھی کٹ گئی۔ وہیں بیہوش ہو کر گر پڑا۔ میں تو سمجھا کام تمام ہوا۔ مگر ملک آخرت کی سیر کر آیا۔ اور خیر گزر گئی۔ خدا کرے عاقبت بخیر ہو +

وہاں سے بانگر مؤ کے قصبے میں آیا۔ ایک بہت اچھا جرّاح ملا اس نے علاج کیا ہفتے میں زخم بھر آئے۔ اسی مایوسی کی حالت میں خدا سے وعدہ کیا کہ حج کرونگا۔ مگر ابھی تک کہ ۱۰۰۴ھ ہے پورا نہیں ہوا۔ خدا موت سے پہلے توفیق دے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيز۔ اے پروردگار تیرے آگے کچھ بڑی بات نہیں۔ پھر بانگر مؤ سے

کانت گولہ میں آیا غسل صحت کیا۔ مگر زخموں نے پانی چُرایا اور نئے سرے سے بیمار ہو گیا۔ خدا حسین خاں کو بہشت نصیب کرے ایسی پدری اور برادری محبت خرچ کی کہ انسان سے نہیں ہو سکتی۔ موسم کی سردی نے زخموں کو بہت خراب کیا تھا۔ مگر خان موصوف نے اس شفقت و محبت سے تیمار داری کی کہ خدا اسے جزائے خیر دے حلوائے گذر کھلایا اور ہر طرح خبر گیری کی۔ وہاں سے بداؤں آیا۔ یہاں ناسور کو پھر چیرا لگا۔ یہ عالم ہوا۔ گویا موت کا دروازہ کھل گیا۔ ایک دن کچھ جاگتا تھا کچھ سوتا تھا دیکھتا ہوں چند سپاہی مجھے پکڑ کر آسمان پر لے گئے ہیں۔ اور کچھ لوگ ہیں جیسے بادشاہی یساول۔ عصا اور چوبیں ہاتھوں میں لئے دوڑتے پھرتے ہیں۔ ایک منشی بیٹھا ہے اور کچھ فردیں دیکھ رہا ہے۔ بولا کہ لے جاؤ۔ لے جاؤ یہ آدمی وہ نہیں ہے۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ خیال کیا تو دیکھا کہ درد کو آرام ہے۔ سبحان اللہ عوام سے بچپن میں سُنا کرتا تھا۔ تو کہانی سمجھتا تھا۔ اب یقین آ گیا کہ عالم امکان وسیع ہے۔ اور خدا کی قدرت غالب ہے +

اس سال بداؤں میں بڑی آگ لگی۔ اور اتنے بندے خدا کے جل گئے کہ گِنے نہ گئے۔ سب کو چھکڑوں میں بھر کر دریا میں ڈال دیا۔ ہندو مسلمان کچھ معلوم نہ ہوا۔ شعلے نہ تھے موت کی آنچ تھی۔ ہائے جان بڑی پیاری ہے۔ مرد عورت فصیل پر چڑھے۔ اور باہر کُود کُود پڑے۔ جو بچ گئے وہ جلے بھُنے لنگڑے لُولے رہے اپنی آنکھوں سے دیکھا پانی آگ پر تیل کا کام کرتا تھا۔ شعلے دھر دھر کرتے تھے۔ اور دُور تک آواز سُنائی دیتی تھی۔ آگ نہ تھی۔ خدا کا قہر تھا۔ بہتوں کو خاک کر کے پامال کر دیا۔ بہتوں کو گوشمالی دے دی۔ چند روز پہلے ایک مجذوب میاں دوآب کے علاقہ سے آیا تھا۔ مَیں نے اُسے گھر میں اُتارا۔ باتیں کرتے کرتے ایک دن کہنے لگا۔ کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ مَیں نے کہا کیوں؟ بولا کہ یہاں خدائی کا تماشا نظر آئیگا خرابانی تھا مجھے یقین نہ آیا +

اِسے فقط تقدیر کا اتفاق کہتے ہیں۔ کہ ۹۸۱ھ میں ۱۰ برس کے دوست بلکہ دینی بھائی حسین خاں سے ان کا بگاڑ ہو گیا۔ اور اس کا راز کچھ نہ کھُلا کہ بات کیا تھی وہ سیدھا سادھا سپاہی باوجود رتبہ آقائی کے مقام عذر خواہی میں آیا۔ بداؤں میں

اُن کی ماں کے پاس گیا اور سفارش چاہی مگر ملا صاحب بھی ضد کے پُورے تھے ایک نہ مانی - کیونکہ اُنہوں نے دربار شاہی میں جانے کی تجویز مصمم کر لی تھی۔

تماشا یہ کہ اسی سنہ میں اکبر کے دماغ کو علم کے شوق نے روشن کرنا شروع کیا - دریادل بادشاہ محدود العقل علماء کی یاوہ گویوں سے تنگ ہو کر فہمیدہ اور مصلحت سنج لوگوں کی قدر کرنے لگا۔ رات کو چار ایوان کے عبادت خانہ میں جلسہ ہوتا تھا تمام علما و فضلا جمع ہوتے تھے ۔ اور ان سے علمی مباحثے سُنتا تھا - ملا صاحب کی جوانی کی عمر - علم کا جوش - طبعیت کی اُمنگ - ان کے دل میں بھی ہوس نے موج ماری ہے +

فیض ہنر ضائع است تا ننمائیند		عود بر آتش نہند مشک بسائیند	

فیضی ابوالفضل وغیرہ ہمدرس جو اُن کے ساتھ گوشۂ مسجد اور صحن مدرسہ میں بیٹھ کر ذہن لڑاتے تھے - اُن کی باتوں کے گھوڑے بھی دربار شاہی میں دوڑنے لگے تھے یہ بھی بداؤں سے آگرہ میں آئے - آخر ذالحجہ ۹۸۱ھ تھا کہ جمال خاں قورچی سے ملاقات ہوئی - ملا صاحب خود کہتے ہیں وہ اکبر کے مصاحبان خاص میں سے تھا - اور باوجودیکہ پانصدی عہدہ دار تھا - مگر سیدھا سپاہی اور دیندار خوش اعتقاد مسلمان تھا - ساتھ اس کے ظرافت طبع خداداد جوہر تھا - مصاحبت کے زور سے جو تصرف بادشاہ کے مزاج میں اسے حاصل تھا - وہ کسی امیر کو نصیب نہ تھا - سخی تھا اور کھانے کھلانے والا تھا - ۹۸۲ھ میں مر گیا - دُنیا میں نیک نام رہا عقبیٰ میں نیکی ساتھ لے گیا +

جمال خاں ان کے پیچھے نماز پڑھ کر اور علمی تقریریں سُنکر بہت خوش ہوا - اکبر کے سامنے لایا اور کہا کہ حضور کے لئے پیش نماز لایا ہوں - خود فرماتے ہیں تدبیر کے پاؤں میں تقدیر کی زنجیر پڑی ہے - ۹۸۱ھ میں حسین خاں سے ٹوٹ کر بداؤں سے آگرہ میں آیا - جمال خاں قورچی اور مرحوم جالینوس حکیم عین الملک کے وسیلے سے ملازمت شاہنشاہی حاصل کی - ان دنوں جنس دانش کا بڑا رواج تھا - پہنچتے ہی اہل نشست میں داخل ہو گیا - یہاں تک کہ جو علما تبحر کے نقارے بجاتے تھے - اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے - بادشاہ نے ان سے لڑا دیا - خوب بات کو پرکھتے تھے

خدا کی عنایت اور قوتِ طبع اور تیزی فہم اور دل کی دلیری سے (کہ عالم جوانی کا لازمہ ہے) بہتوں کو زیر کیا۔ پہلی ہی ملازمت میں فرمایا۔ کہ یہ بداؤنی فاضل حاجی ابراہیم سرہندی کا سرکوب ہے۔ چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح سے زک پائے۔ میں نے اُسے بھی خوب خوب الزام دیئے۔ اور بادشاہ بہت خوش ہوئے۔ شیخ عبدالنبی صدر عالی قدر پہلے ہی خفا ہوئے تھے کہ ہم سے بالا بالا آن پہنچا۔ اب جو مناظروں میں مقابل دیکھا تو وہی مثل ہوئی۔ کہ ایک تو سانپ نے کاٹا اُس پر کھائی افیم۔ خیر آخر رفتہ رفتہ اُن کی کلفت بھی اُلفت سے بدل گئی۔ ملا صاحب اس فتحیابی پر ناحق خوش ہوئے۔ اُنہیں خبر نہ تھی کہ یہ فتح اپنی فوج کی شکست ہوئی ہے۔ کیونکہ آہستہ آہستہ بادشاہ کل علماء سے بے اعتقاد ہو گیا۔ پھر اُن کے ساتھ یہ بھی نظروں سے گر گئے۔ ساتھ ہی لکھتے ہیں۔ انہی دنوں میں شیخ ابوالفضل خلف شیخ مبارک جس کی عقل و دانش کا ستارہ چمک رہا تھا ملازمت میں آیا۔ اور انواع و اقسام کی عنایتوں سے امتیاز پایا۔ تھوڑی دور آگے چل کر کہتے ہیں۔ بادشاہ نے ملایان فرعون صفت کے کان ملنے کے لئے (جس کی مجھ سے امید نہ رہی تھی) انہیں خاطر خواہ پایا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے اور ابوالفضل دونوں کے حالات پڑھ کر معلوم ہو جائیگا۔ کہ اکبر کی نظر توجہ ان کی طرف تھی وہ ادھر پھر گئی۔ اسے اُس کی قسمت کا زور کہو۔ خواہ اس کی مزاج شناسی سمجھو۔ اور یہی رشک تھا۔ جو ہمیشہ تیزاب بلکہ زہریلے الفاظ بن کر اُن کے قلم سے ٹپکتا ہے +

غرض فاضل مذکور ہر صحبت اور ہر جلسے میں موجود رہتے تھے۔ جو خاص خاص علما کیا سفر کیا مقام میں کہیں جدا نہ ہوتے تھے ان میں یہ بھی شامل ہو گئے۔ پہلے ہی سفر کا حال جو لکھتے ہیں اُس کے ترجمہ کو پڑھو اور خیال کرو۔ کہ ایک نوجوان آدمی جب ایک عظیم الشان بادشاہ کی رکاب میں رہ کر شاہانہ شان اور سلطنت کے سامان دیکھتا ہے تو اُس کے دل میں کیسے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور دیکھو! ابھی تک وہ موقع ہے کہ آقا کا دل شفقت سے اور نئے نمک خوار کا سینہ وفاداری کے جوش سے لبریز ہے۔ چنانچہ انہی دنوں میں اکبر شاہانہ لشکر لے کر منعم خاں کی مدد کو چلا کہ پٹنے پر پٹھانوں سے لڑ رہا تھا۔ فوج کو آگرہ سے خشکی کے رستے روانہ کیا۔ اور آپ مع بیگمات اور شاہزادہ ہائے کامگار اور امرا کے دریا کے رستے چلا۔ ابھی تک ملا صاحب مہربان

ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ رُباعی:۔

شاہنشہ داد گستر دین پرور بنشست بروئے بحر چوں سکندر	جمشید جہاں ستاں محمد اکبر ہم بحر بفرمان وے آمد ہم بر

بڑے شاہزادے کو بھی ساتھ لیا تھا۔ کشتیوں کی کثرت سے پانی نظر نہ آتا تھا۔ نئے نئے انداز کی کشتیاں آسمانی بادبان چڑھے ہوئے۔ کسی کا نام نہنگ سر۔ کوئی شیر سر وغیرہ وغیرہ۔ رنگ برنگ کی بیرقیں لہراتی۔ دریا کا شور۔ ہوا کا زور۔ پانی کے سرّاٹے۔ بیڑا چلا جاتا تھا۔ ملّاح اپنی بولی میں گاتے جاتے تھے عجب عالم تھا۔ قریب تھا کہ پرندے ہوا میں اور مچھلیاں پانی میں رقص کرنے لگیں۔ وہ تماشا دیکھا کہ بیان میں نہیں آتا۔ جہاں چاہتے اُتر پڑتے تھے۔ اور شکار کھیلتے تھے۔ جب چاہتے تھے چل کھڑے ہوتے تھے۔ رات کو لنگر ڈال دیتے تھے۔ وہیں علمی بحثیں ہوتی تھیں۔ شعر شاعری کے چرچے بھی ہوتے تھے فیضی ساتھ تھے ملّا صاحب اسی سال میں آئے تھے یہ بھی ساتھ تھے +

طبقات اکبری وغیرہ کتابوں میں اس سے کچھ زیادہ کر کے لکھتے ہیں۔ کہ جو جو شاہانہ سامان خشکی کے سفر میں ہوتے ہیں سب کشتیوں پر سے چلے۔ کل کارخانے مثلاً توپ خانہ۔ سلاح خانہ۔ خزانہ۔ نقار خانہ۔ کرکراق خانہ (توشہ خانہ) فراش خانہ جبہ خانہ۔ باورچی خانہ۔ طویلے وغیرہ وغیرہ سب کشتیوں پر تھے۔ ہاتھیوں کے لئے بڑی بڑی کشتیاں تیار ہوئیں۔ اور ہاتھی وہ ساتھ لئے کہ ڈیل ڈول مستی اور تندخوئی میں مشہور تھے۔ بال سندر کے ساتھ دو ہتھنیاں ایک کشتی میں سیمن بال اور دو ہتھنیاں ایک کشتی میں وغیرہ۔ جو آرائشیں خیموں ڈیروں میں ہوتی ہیں وہ سب کشتیوں میں اور اُن کی پوششوں میں کی تھیں۔ اُن میں الگ الگ کمرے۔ کمروں کی عُمدہ تقسیم۔ محرابوں اور طاقوں کی تراشیں۔ گھروں کی طرح کئی کئی منزلیں زینوں کے چڑھاؤ اُتار۔ ہوا کے لئے کھڑکیاں اور روشنی کے لئے تابدان۔ ہر بات میں نئے نئے ایجاد۔ رومی۔ چینی۔ فرنگی مخملوں اور باناتوں کے پردے اور فرش ہائے بوقلموں۔ ہندوستانی دستکاریوں کی تفصیل کہاں تک ہو۔ کہ ایک افسانہ عجائب خانہ ہُوا جاتا ہے۔ یہ سب سامان دریا میں بساط شطرنج کی طرح بہ ترتیب و انتظام

چلتا تھا - بیچ میں بادشاہ کی کشتی ہوتی تھی بڑی عالیشان جیسے جہاز +

ملا صاحب کہتے ہیں - دوسرے سال شہنشاہ نے مجھ پر عنایت فرمائی اور بڑی محبت سے کہا کہ **سنگھاسن بتیسی** کی ۳۲ کہانیاں جو راجہ بکرماجیت کے حال میں ہیں - سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کر کے طوطی نامہ کے رنگ پر نظم و نثر میں ترتیب دو اور ایک ورق نمونے کے طور پر آج ہی پیش کرو - برہمن زبان دان مدد کے لئے دیا - چنانچہ اسی دن ایک ورق شروع حکایت سے ترجمہ کر کے گزرانا - پسند فرمایا تمام ہوئی تو **نامۂ خرد افزا** تاریخی نام قرار پایا اور پسند و قبول ہو کر کتب خانے میں داخل ہوئی - حق پوچھو تو ملا صاحب کو تاریخ گوئی میں کمال ہے +

۹۸۳ھ تک صحبتیں موافق طبع تھیں - کیونکہ ان کے کلام کی بنیاد اصول و فروع مذہب پر تھی - اور بادشاہ نے بھی ابھی تک اس دائرے سے قدم نہ بڑھایا تھا یہ بعض علماء سے اس لئے ناراض تھے - کہ فقط جو فروشی اور گندم نمائی سے دیندار اور سلطنت میں صاحب اختیار بنے ہوئے تھے - وہ مخدوم اور صدر اور اُن کی اُمت کے لوگ تھے - اور بعض سے اس لئے خفا تھے کہ زبانی جمع خرچ اور لفاظی اور دھوکے کی دلیلوں سے دعویدار بنے ہوئے تھے - مگر ان کا لوہا سب پر تیز ہوا کہ آتے ہی ہر ایک کو دبا لیا - جو ذرا بے اصول بولتا تھا فوراً کان پکڑ لیتے تھے چنانچہ حکیم الملک کے ساتھ جو معرکہ کیا وہ تم نے دیکھا +

۹۸۳ھ تک کے حالات اور چار ایوان کے معرکوں میں اپنے اور اور عالموں کے لطائف و ظرائف خوشی خوشی لکھتے چلے جاتے ہیں - کہ دفعتہً قلم کی رفتار بدلتی ہے - اور صاف معلوم ہوتا ہے - کہ قلم سے حرف اور آنکھوں سے آنسو برابر بہہ رہے ہیں - چنانچہ لکھتے ہیں :-

آج ان معرکوں کو ۱۰ برس گزرے ہیں - وہ مناظرے اور مباحثے کرنیوالے کیا محقق اور کیا مقلد سو سے زیادہ تھے ایک نہیں نظر آتا - سب نے موت کے نقاب میں منہ چھپا لئے - خاک ہو گئے اور اُن کی خاک بھی اُڑ گئی ؎

زخیل دردکشاں غیر ما نماند کسے	بیار بادہ کہ ماہم غنیمتیم بسے

جب نعمت جاتی ہے تو قدر آتی ہے۔ اب اُن ہمصحبتوں کو یاد کرتا ہوں۔ اور روتا ہوں۔ آہیں بھرتا ہُوں۔ نالے کرتا ہوں۔ اور مرتا ہوں۔ کاش اس حسرت آباد میں چند روز اور بھی ٹھہر تے۔ وہ جو کچھ تھے غنیمت تھے کہ بات کا رُخ اُن ہی کی طرف ہوتا تھا۔ اور بات کا مزا انہیں سے تھا۔ اب کوئی بات کے قابل ہی نہیں + رُباعی

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند	در پائے اجل یگاں یگاں لپست شدند
بودند تُنک شراب در مجلسِ عمر	یک لحظہ زما پیشترک مست شدند

عبارت ہائے مذکورہ بالا کے انداز سے اور آیندہ کی عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سلسلہ عین کامیابی اور لطفِ گرمجوشی کے عالم میں لکھا گیا تھا۔ لیکن وہ عبارتِ نظم و نثر جو ماتم زمانہ سے سیہ پوش ہے پیچھے حاشئے پر لکھی ہوگی۔ اور وہ بھی ۹۱ یا ۹۲ھ کے پس و پیش میں ہوگی نہ ۹۹۹ھ جیسا کہ اُنہوں نے دیباچہ کتاب میں تحریر کیا ہے +

۹۸۳ھ میں مرزا سلیمان والی بدخشاں ادھر بھاگ کر آیا تو اکبر نے بڑے جاہ و جلال سے استقبال کیا۔ مرزا بھی عبادت خانہ (چار ایوان) میں آتا تھا۔ مشائخ و علماء سے گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ (ملّا صاحب فرماتے ہیں) صاحب حال شخص تھا۔ اس سے معرفت کے بلند خیالات سُنے گئے۔ کبھی نماز جماعت نہیں چھوڑی۔ ایک دن مَیں نے عصر کی نماز پڑھ کر فقط دعا پر اکتفا کیا۔ الحمد نہ پڑھی۔ مرزا نے اعتراض کیا کہ حمد کیوں نہیں پڑھی۔ مَیں نے کہا کہ آنحضرت کے عہد میں نماز کے بعد فاتحہ کا معمول نہ تھا بلکہ بعض روائتوں میں مکروہ بھی آیا ہے۔ مرزا نے کہا کہ ولایت میں علم نہ تھا یا علماء نہ تھے؟ (ملا بھی جھگڑنے کو آندھی تھے) مَیں نے کہا کہ ہمیں کتاب سے کام ہے نہ کہ تقلید سے بادشاہ نے خود فرمایا۔ کہ آیندہ سے پڑھا کرو۔ مَیں نے قبول کیا۔ مگر کتاب میں کراہت کی روایت نکال کر دکھا دی +

گجرات کی لُوٹ میں اعتماد خاں گجراتی کے کتب خانے کی نفیس نفیس کتابیں خزانۂ عامرہ میں جمع تھیں۔ بادشاہ چار ایوان کے جلسوں میں علماء کو تقسیم کرتے تھے لکھتے ہیں کہ مجھے کئی کتابیں دیں۔ انہیں میں ایک انوار المشکوٰۃ بھی تھی۔ اس میں ایک فصل

بہ نسبت اور نسخوں کے زیادہ تھی۔ اس وقت تک بھی بادشاہ اکثر مسئلوں میں انہیں کو مخاطب کر کے بات کہتے تھے اور ہر بحث میں پوچھتے تھے کہ حقیقت مسئلے کی کیا ہے +

حضور میں ۷ امام تھے۔ ہفتے کے ۷ دن۔ ایک ایک دن باری باری سے نماز پڑھایا کرتے تھے۔ دوسرے سال میں ملا صاحب کہتے ہیں۔ کہ خوش آوازی کے سبب سے جیسے طوطی کو پنجرے میں ڈالتے ہیں۔ اسی طرح مجھے اُن میں داخل کر کے بدھ کی امامت عنایت ہوئی۔ اہتمام حاضری کا خواجہ دولت ناظر کے سپرد تھا۔ عجب سخت مزاج خوجہ تھا۔ لوگوں کو بڑا دق کرتا تھا۔ الخصیّ لاذکرٌ ولا اُنثیٰ (خوجہ ہیچ‌طانہ زن زناں نہ زن مردان) +

اسی سال میں بیستی کا منصب دیا کچھ خرچ بھی عنایت کیا۔ اور پہلی ہی دفعہ میں فرمایا۔ کہ بیستی کے منصب کے بموجب گھوڑے داغ کے لئے حاضر کرو۔ لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالفضل بھی اسی عرصے میں پہنچے تھے۔ اور ہم دونوں کی وہی مثال ہے جو شیخ شبلی نے اپنے اور جُنید کے لئے کہی تھی۔ میں اور یہ دو جلی ٹکیاں ہیں۔ ایک تنور میں سے نکلی ہیں۔ ابوالفضل نے جھٹ قبول کر کے کام شروع کر دیا۔ اور اس عرق ریزی سے خدمت بجالایا کہ آخر دو ہزاری منصب اور وزارت کے درجے کو پہنچ گیا (جس کی ۱۲ ہزار کی آمدنی ہے) میں ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی سے اپنے کمل کو بھی نہ سنبھال سکا۔ سادات انجو میں سے ایک شخص نے ایسے ہی موقع پر اپنے اوپر آپ تمسخر کیا تھا وہ میرے حسب حال ہے۔ ؎

مرا داخلی سازی و بیستی	مبینا و مادر بدیں نیستی	

مجھے اُن دنوں میں یہی خیال تھا کہ قناعت بڑی دولت ہے کچھ جاگیر ہے کچھ بادشاہ انعام اکرام سے مدد کریں گے۔ اسی پر صبر کروں گا۔ سلامت اور عافیت کے گوشے میں بیٹھوں گا۔ علم کا شغل اور دل کی آزادی کا شیوہ نامرادی ہے۔ اسے سنبھالے رہونگا ؎

جاہ دنیا مطلب دولت فانی بگذارا	جاہ دیں بس بود و دولت اسلام ترا	

افسوس کہ وہ بھی میسر نہ ہوئی (یہاں میر سید محمد میر عدل کی نصیحت یاد کرتے ہیں۔

ملّا صاحب بہت اچھی اُٹھان سے اُٹھے۔ مگر افسوس کہ رہ گئے اور بُری طرح رہ گئے۔ وہ ترقی پاتے اور خاطرخواہ سے بھی زیادہ پاتے۔ مگر ضدّی شخص تھے اور بات کی پرورش ایسی کرتے تھے کہ اُس پر ہر طرح کا نقصان اُٹھاتے تھے۔ اور اُسے فخر سمجھتے تھے۔ ابوالفضل کو زمانے کے گھسوں نے خوب سبق پڑھائے تھے۔ وہ سمجھ گیا۔ مُلّا صاحب کو بیستی کا عہدہ بِلا انکار کیا۔ اُس نے فوراً منظور کیا۔ اور اطاعت و تسلیم کی۔ اُسی کا نیک ثمرہ پایا۔

اس کی تائید اُن کی تحریروں سے ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ۹۸۳ھ میں مَیں نے رخصت مانگی۔ نہ ملی۔ بادشاہ نے ایک گھوڑا اور کچھ روپیہ دیا۔ ہزار بیگھہ زمین دی۔ اور کہا کہ فوجی دفتر سے تمہارا نام نکال دیتے ہیں۔ اُن دنوں میں بیستی کے عہدے پر نظر کر کے یہ انعام مجھے بہت معلوم ہوا۔ کہ ہزاری کا ہم پلہ ہے۔ بادشاہی ہمزبانی ہے علم کا سلسلہ ہے۔ خدمت کا بجالانا ہے۔ سپاہی کی تلوار اور بندوق نہیں اُٹھانی پڑتی۔ یہ سب کچھ درست مگر صدر کی ناموافقت اور زمانہ کی بدمددی سے خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ اور آیندہ ترقی کا رستہ نہ تھا۔ اتنا ہوا کہ فرمان میں مددمعاش کا لفظ لکھا گیا۔ نہ کہ جاگیر (جاگیر میں خدمت بھی بجالانی پڑتی تھی) ہر چند عرض کی کہ اتنی زمین پر ہمیشہ حاضری کیونکر ہوسکیگی۔ فرمایا کہ فوج کے زمرہ میں ترقی مل جائیگی انعام سے بھی امداد ہوا کرے گی۔ شیخ عبدالنبی صدر صاف بولے کہ تمہارے ساتھیوں میں کسی کو اتنی مددمعاش نہیں دی۔ اب تک ۲۲ برس ہوئے۔ آگے رستہ بند ہے اور مددیں قدرت الٰہی کے پردہ میں ہیں۔ ایک دو دفعہ سے زیادہ انعام کی بھی صورت نہ دیکھی۔ وعدے ہی وعدے تھے۔ اور اب تو زمانے کا ورق ہی اُلٹ گیا۔ البتہ خدمتیں ہیں۔ جن کا کچھ نتیجہ نہیں۔ اور مہمل پابندیاں ہیں کہ مفت گلے پڑی ہیں کوئی لطیفہ غیبی ہو تو ان سے چھٹکارا ہو ؎

یا وفا۔ یا خبرِ وصل تو۔ یا مرگِ رقیب	بازیِ چرخ ازیں یک دو سہ کارے بکند

رضینا بقضاء اللّٰہ وصبرنا علیٰ بلاء اللّٰہ وشکرنا نعماء اللّٰہ ؎

بہ ہمہ حال شکر باید کرد	کہ مبادا ازیں بتر گردد

حیرتی شاعر پر شاہ طہماسپ کی عنایتیں دیکھ کر یہ قطعہ فضولی بغدادی نے

کہا تھا وہ میری فضولیوں کے مناسب حال ہے ؎

من ز خاکِ عرب و حیرتی از ملکِ عجم	ہر دو گشتیم باظہار سخن کام طلب
یافتیم از دو کرم پیشہ مرادِ دلِ خویش	او زر از شاہ عجم۔ من نظر از شاہ عرب

دُنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے معلوم ہے۔ کارساز بندہ نواز سے اُمید ہے۔ کہ عاقبت بخیر ہو۔ اور خاتمہ سعادت ایمان پر ہو۔ ماعندکم ینفد و ماعند اللہ باق جو تمہارے پاس ہے ہو چکیگا۔ جو خدا کے پاس ہے وہی رہیگا ؎

اُمید از کرم اے کارساز ما ایں است	کہ ناامید نہ سازی اُمیدواراں را

اب اختلافی مسئلے نکلنے لگے۔ جس سے بادشاہ اور شیخ صدر وغیرہ کے دلوں میں اختلاف پڑ کر حالتیں مختلف ہوگئیں (پہلا مسئلہ یہ تھا کہ ایک خاوند کے جوروئیں کر سکتا ہے؟ میں نے جو کچھ معلوم تھا عرض کیا)۔ (دیکھو حال شیخ عبدالنبی صدر صفحہ ۳۹۷)

اسی سال میں لکھتے ہیں۔ شیخ بھاون کہ ولایت دکن کا ایک برہمن دانا ہے ملازمت میں آیا۔ اور شوق و رغبت کے ساتھ مسلمان ہو کر خاصہ کے چیلوں میں داخل ہوا۔ حکم ہوا کہ **اتھر بن بید** (چوتھا بید) جس کے اکثر احکام اسلام سے ملتے ہیں بیان کرے۔ اور فقیر فارسی میں ترجمہ کرے۔ اُس کی بعض عبارتیں ایسی مشکل تھیں۔ کہ وہ بیان نہ کر سکتا تھا۔ اور مطلب سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں نے عرض کی۔ پہلے شیخ فیضی کو پھر حاجی ابراہیم سرہندی کو حکم ہوا۔ مگر جیسا جی چاہتا تھا نہ لکھ سکا۔ اب اُن مسودوں کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ اس کے احکام میں سے ایک یہ ہے کہ جب تک ایک فقرہ (جس میں برابر بہت سے لام لام آتے ہیں جیسے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ) نہ پڑھے تب تک نجات نہ ہوگی۔ اور کئی شرطوں کے ساتھ گائے کا گوشت بھی جائز ہے اور مردے کو یا تو جلائیں۔ نہیں تو دفن کریں وغیرہ۔

۹۸۴ھ میں بادشاہ بمقام اجمیر میں تھے کہ مان سنگھ ولد بھگوان داس کو درگاہ حضرت معینیہ میں لے گئے۔ خلوت کر کے مدد چاہی۔ خلعت اور گھوڑا اور تمام لوازم سپہ سالاری دے کر رانا کیکا کی مہم کو کندہ و کونبھل میر کو روانہ کیا۔ بڑے بڑے بہادر سردار اور پانچ ہزار رکتی سوار بادشاہی خاصہ کمک کو ساتھ گئے۔ اور

اُس کی اپنی فوج الگ تھی۔ لکھتے ہیں کہ اجمیر سے تین کوس تک برابر امیروں کے سراپردے لگے تھے۔ **قاضی خاں** اور **آصف خاں** کے رخصت کرنے کو میں بھی گیا۔ رستے میں غزا کے شوق نے بے اختیار کر دیا۔ پھرتے ہوئے سیدھا شیخ عالی قدر **شیخ عبدالنبی صدر** شیخ الاسلام کے پاس پہنچا اور کہا آپ حضور سے رخصت لے دیں۔ انہوں نے اقبال تو کیا۔ مگر سید عبدالرسول ایک نامعقول بوالفضول اُن کا وکیل تھا۔ اُس پر ڈال دیا۔ مَیں نے دیکھا کہ بات دُور جا پڑی۔ نقیب خاں کے ساتھ دینی بھائی چارا تھا۔ اُس نے کہا کہ امیر لشکر ہندو نہ ہوتا تو سب سے پہلے مَیں اس مہم کے لئے رخصت لیتا۔ مَیں نے اُس کی خاطر جمع کی۔ کہ ہم اپنا امیر بندگانِ حضرت کو جانتے ہیں مان سنگھ وغیرہ سے کیا کام ہے۔ نیت درست چاہئے۔ حضرت شاہنشاہی اُونچے چبوترے پر پاؤں لٹکائے مرزا مبارک کی طرف مُنہ کئے بیٹھے تھے۔ کہ نقیب خاں نے میرے لئے عرض کی۔ اوّل فرمایا کہ اس کا تو امامت کا عہدہ ہے۔ وہ کیوں کر جا سکتا ہے؟ اُس نے عرض کی کہ غزا کی آرزو ہے مجھے بُلا کر پوچھا بہت ہی جی چاہتا ہے؟ عرض کی بہت! فرمایا سبب کیا؟ عرض کی دعا ہے کہ سیاہ داڑھی کو ہواخواہی میں سُرخ کر دوں ؎

کارِ تو بخاطر است خواہم کردن	یا سرخ کنم روے ز تو یا گردن

فرمایا کہ انشاء اللہ فتح ہی کی خبر لاؤ گے۔ مراقبے میں سر جھکا کر توجّہ سے رخصت کی فاتحہ پڑھی۔ مَیں نے چبوترے کے نیچے سے پابوس کے لئے ہاتھ بڑھائے آپ نے اُوپر کھینچ لئے۔ جب مَیں دیوان خانہ سے نِکلا تو پھر بُلایا۔ ایک لپ بھر کر اشرفیاں دیں اور کہا خدا حافظ۔ گنیں تو ۹۵ تھیں۔ شیخ عبدالنبی صدر کی رخصت کو گیا۔ ان دنوں مہربان ہو کر پہلی کلفت کا اُلفت سے مبادلہ کیا تھا۔ فرمایا صفوں کا آمنا سامنا ہو تو مجھے بھی دعاے خیر سے یاد کرنا کہ بموجب حدیث صحیح کے قبولِ دُعا کا وقت ہوتا ہے۔ دیکھنا! بھولنا نہیں! قبول کر کے مَیں نے بھی فاتحہ (دُعا) چاہی۔ اور گھوڑا کس یارانِ یکدل کے ساتھ مل روانہ ہُوا۔ ع

ہر روز بہ منزلے و ہر شب جائے

یہ سفر اوّل سے آخر تک بڑی مبارکی سے طے ہُوا۔

ان کی انشا پردازی نے میدان جنگ کی تصویر نہایت خوبصورتی سے کھینچی ہے۔ مگر اس میں بھی لوگوں کے پہلوؤں میں قلم کی نوکیں چبھوتے جاتے ہیں۔ (دیکھو راجہ مان سنگھ کا حال) جب فتح ہوئی اور رانا بھاگ گیا۔ تو امرا مشوروں کے لئے بیٹھے اور علاقے کا بندوبست شروع کیا۔ **رام پرشاد** ایک بڑا اونچا اور جنگی ہاتھی رانا کے پاس تھا۔ بادشاہ نے کئی دفعہ مانگا تھا۔ اُس نے نہ دیا تھا۔ وہ بھی لوٹ میں آیا۔ امرا کی صلاح ہوئی کہ اسے فتح نامہ کے ساتھ حضور میں بھیجنا مناسب ہے۔ آصف خاں نے میرا نام لیا۔ کہ یہ فقط ثواب کے لئے آئے تھے۔ ان کے ساتھ بھیج دو۔ مان سنگھ نے کہا۔ ابھی تو بڑے بڑے کام پڑے ہیں۔ یہ میدان معرکہ میں صف جنگ کے آگے امامت کرینگے۔ مَیں نے کہا۔ یہاں کی امامت کے لئے قضا ہے۔ میرا اب یہ کام ہے کہ میں جاؤں اور بندگانِ حضرت کی صف کے آگے امامت ادا کروں۔ مان سنگھ اس لطیفے پر بہت خوش ہوئے۔ احتیاطاً تین سو سوار ہاتھی کے ساتھ کئے اور سفارش نامہ لکھ کر رخصت کیا بلکہ موہنے تک تھانے بٹھانے کے بہانے شکار کھیلتے پہنچانے چلے آئے کہ ۲۰ کوس ہے مَیں **ماکھور** اور **مانڈل گڑھ** سے ہوتا ہوا آنبیر کے رستے آیا۔ کہ مان سنگھ کا وطن تھا۔ اُسی کے پہلو میں اب جے پور آباد ہے۔ رستہ میں جابجا لڑائی کی کیفیت اور مان سنگھ کی فتح کا حال سُناتا آتا تھا۔ لوگ تعجب کرتے تھے۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا۔ آنبیر سے پانچ کوس پر ہاتھی بجن میں پھنس گیا۔ غضب یہ کہ جوں جوں آگے جاتا تھا۔ زیادہ دھستا جاتا تھا۔ آخر ملانے ہی تھے۔ انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت گھبرائے اور یہیں سے سمجھ لو کہ مہمات سلطنت اور اُس کے خطرناک بوجھ ایسے لوگوں کی گردن پر پڑیں تو چھاتی بچے یا پھٹے۔ کہاں ابو الفضل اور اُس کے کارنامے۔ اکبر لشکر جرّار لئے آسیر کے گرد پڑا ہے۔ محاصرہ نے طول کھینچا۔ ایک شب اندھیرا۔ بادل گرجے مینہ برسے۔ ابو الفضل فوج لے کر زیر دیوار پہنچا۔ اور رسّے ڈال کر شمشیر بکف قلعے میں کُود پڑا۔ پہلے کوئی اتنا بڑا دل دکھائے جب اس کے باب میں زبان ہلائے۔ باتیں کرنے سے کیا ہوتا ہے ✤

وہاں کے لوگ آئے اور کہا کہ اگلے برس بھی یہاں ایک بادشاہی ہاتھی پھنس گیا تھا۔ اس کا یہی علاج ہے کہ ٹھلیوں مشکوں میں پانی بھر بھر کر ڈالتے ہیں۔ ہاتھی نکل آتا

ہے۔ سقے بلائے اُنہوں نے بہت سا پانی ڈالا۔ جب آہستگی سے آپ ہاتھی نکلا اور گرداب ہلاکت سے نجات پائی ✦

لکھتے ہیں بڑی مشکل سے ہاتھی نکلا۔ ہم انبیر میں پہنچے۔ وہاں کے لوگ پھولے نہ سماتے تھے اُن کے فخر کا سر آسمان سے جا لگا۔ کہ ہمارے راجہ کے لڑکے نے ایسا معرکہ مارا۔ خاندانی رقیب کا کلہ توڑا اور ہاتھی چھین لیا۔ ٹونڈہ میں سے گزر ہوا۔ یہاں میں پیدا ہوا تھا۔ بساور میں آیا۔ ع اوّل ارضٍ مسّ جلدی ترابہا (پہلے اسی زمین کی خاک میرے بدن کو لگی ہے) اس بیان میں ان کی تحریر سے بڑی خوشی اور عجیب محبت ٹپکتی ہے۔ بے شک ایک شریف ملا لڑائی سے جیتا پھرے اور لڑائی جیت کر پھرے اس پر اتنے سارے بادشاہی اور جنگی سپاہی اور اتنا بڑا ہاتھی لے کر اپنے گاؤں میں آئے اور وہاں کا ایک ایک آدمی دیکھنے آئے وہ خوش نہ ہو تو کون ہو؟ اور محبت بھی جتنی ٹپکے تھوڑی ہے۔ جس خاک پر کھیل کر بڑے ہوئے اور جس زمین کی گود میں لوٹ کر پلے اسکی محبت نہ ہو تو کس کی ہو؟

غرض جوں توں کر کے فتح پور پہنچے (راجہ بھگوان داس راجہ مان سنگھ کے باپ تھے) ان کے کوکہ کی معرفت فتح نامہ اور ہاتھی حضور میں گزرانا۔ فرمایا اس کا نام کیا ہے؟ عرض کی رام پرشاد۔ فرمایا کہ سب پیر کی پرورش سے ہوا۔ اس کا نام پیر پرشاد ہے۔ پھر فرمایا۔ تمہاری تعریف بھی بہت لکھی۔ سچ کہو۔ کونسی فوج میں تھے۔ اور کیا کیا کام کیا۔ عرض کی کہ بادشاہوں کے حضور میں سچ بھی ڈرتے لرزتے کہا جاتا ہے۔ فدوی جھوٹ کیوں کر عرض کر سکتا ہے۔ چنانچہ سب واقعی حالات عرض کئے۔ پوچھا جنگی لباس تھا یا ننگے ہی رہے؟ عرض کی زرہ بکتر تھا۔ فرمایا کہاں سے مل گیا۔ عرض کی سید عبداللہ خاں سے۔ سب جواب پسند آئے۔ تودۂ گنج میں سے ایک لپ بھر کر انعام فرمائی۔ ۹۶ اشرفیاں تھیں۔ پھر پوچھا شیخ عبدالنبی سے مل لئے؟ عرض کی گرد راہ سے دربار میں پہنچا ہوں۔ کیونکر مل سکتا تھا۔ ایک دوشالہ نخودی بڑھیا دیا کہ یہ لیتے جاؤ۔ شیخ سے ملو اور کہو کہ اسے اوڑھو۔ ہمارے خاصے کارخانے کا ہے۔ تمہاری ہی نیت سے فرمائش کی تھی۔ میں لے گیا اور پیغام پہنچایا۔ شیخ خوش ہوئے۔ پوچھا کہ رخصت کے وقت میں نے کہہ دیا تھا کہ صفوں کا آمنا سامنا ہو تو دعا سے یاد کرنا۔ میں نے کہا کل مسلمانوں کے حق میں جو دعا

ہے وہ پڑھی تھی۔ کہا کہ یہی کافی ہے۔ اللہ اللہ۔ یہ وہی شیخ عبدالنبی ہیں۔ آخر حال یہ ہوا کہ اس بدحالی کے ساتھ دُنیا سے گئے کہ خدا دکھائے نہ سُنائے۔ چاہیے کہ سب کو عبرت ہو جائے۔

ہر کہ را پرورد گیتی عاقبت خونش بریخت		سال آں فرزند چوں باشد کہ خصمش مادر است

گوکندہ کی مہم میں لکھتے ہیں کہ مان سنگھ۔ آصف خاں۔ غازی خاں بدخشی کو جریدہ بُلا بھیجا۔ آصف خاں اور مان سنگھ باہم نفاق رکھتے تھے۔ چند روز سلام سے محروم رہے۔ مگر ملا صاحب۔ غازی خاں مہتر خاں۔ علی مراد اُزبک۔ خنجری ترک۔ اور ایک دو اور بھی تھے۔ کہ عنایات اور سرفرازی عہدہ سے معزز ہوئے۔ اور یہ مہم ۹۸۵ھ میں طے ہوئی۔

اس وقت تک اس فاضل مصنّف میں مخالفت نے نقطۂ انتشار سے پایا تھا کہ انتظامی امورات میں یا ملازموں کے کاروبار میں بعض باتیں خلاف طبع معلوم ہوتی تھیں۔ البتہ طبیعت شوخ اور زبان تیز تھی۔ جو لطیفہ کسی پر سوجھتا تھا۔ نوک قلم سے ٹپک پڑتا تھا۔

مَیں اسی سنہ میں رخصت لے کر وطن گیا تھا۔ بیماری کی شدّت نے بستر سے ہلنے نہ دیا تھا۔ صحت پا کر روانہ دربار ہوا۔ رستے میں سید عبداللہ خاں بارہہ سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے کہا۔ کہ راہ پُرخطر ہے۔ رضوی خاں کے ساتھ پھرتا پھراتا دیپال پور ملک مالوہ میں آکر حاضر ہوا۔ یہاں ۲۲ سال جلوس کے جشن کی دھوم دھام تھی۔ قرآن۔ حمائل اور خطبوں کی بیاض کہ جن کی تصنیف میں انواع و اقسام صنائع و بدائع خرچ ہوئے تھے۔ حضور میں پیش کی۔ یہ دونوں نایاب چیزیں حافظ محمد امین خطیب قندھاری کی تھیں۔ کہ ۷ اماموں میں سے ایک امام ہے۔ اور خوش خوانی اور خوش الحانی میں آج اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ راہ بسادر کی ایک منزل میں اس کا مال چوری گیا تھا۔ اس میں سے عبداللہ خاں نے یہ دونوں چیزیں بہم پہنچا کر رستے میں مجھے دی تھیں۔ بادشاہ خوش ہو گئے۔ حافظ کو بلایا اور خوش طبعی کے طور پر کہا کہ یہ حمائل ہمارے واسطے ایک جگہ سے آئی ہے۔ لو اسے تم رکھو۔ حافظ نے دیکھتے ہی پہچان لی۔ جان میں جان آگئی۔ تسلیمات بے حد اور سجدۂ شکر گزاری بجا لا کر عرض کی کہ حضور نے اسی دن

سید عبداللہ خاں سے فرمایا تھا۔ کہ انشاءاللہ تم پیدا کرو گے۔ وہ چیزیں کہیں نہ جانے پائینگی۔ پھر مجھ سے حال پوچھا۔ عرض کی لبساور کے علاقے مزدور حوض اور کوئیں کھودتے ہیں۔ دن کو کام کرتے ہیں۔ رات گورستہ مارتے ہیں۔ انہیں نے مال چرایا تھا۔ ایک اُن میں سے پھوٹ گیا۔ اس بیچ میں نکل آئیں۔ پھر فرمایا حافظ خاطر جمع رکھو انشاءاللہ اور اسباب بھی مل جائیگا۔ عرض کی خانہ زاد کو تو حمائل اور اس بیاض سے مطلب تھا کہ بزرگوں کی موروثی یادگار ہے۔ اور مجھے بڑھاپے نے ایسی تصنیفات سے عاجز کر دیا ہے۔ آخر جو فرمایا تھا وہی ہوا کہ باقی اسباب بھی بیلداروں کے پاس سے نکلا اور فتحپور میں سید عبداللہ خاں نے خود آکر پیش کیا۔

اسی سنہ میں لکھتے ہیں کہ میں وطن سے آیا۔ اور از سرِ نو امامت کا حکم ہوا۔ خواجہ دولت ناظر تعینات ہے۔ کہ خواہ نخواہ ہفتے میں ایک دفعہ چوکی پر حاضر کرے۔ ٹھیک وہی مثل ہے! احمد بہ مکتب نمیرود وے برندش۔

اسی سنہ میں ملا صاحب کو بڑا رنج ہوا حسین خاں ٹکریہ مر گئے۔ ان کے ہم دم، ہم عقیدہ۔ دوست۔ آقا۔ جو کچھ کہو یہ تھے۔ اگرچہ ۹۸۱ھ میں ان سے بھی کسی گو مگو معاملہ پر کھٹک کر الگ ہوئے تھے۔ مگر چونکہ آج کل کے زمانہ اور ارباب زمانہ سے بہت ناراض ہیں۔ اس لئے زیادہ رنج ہوا۔ حسین خاں ایک شیر دل سپاہی اور پکے سُنّی مسلمان تھے۔ ان کی زندگی بھی اکبری عہد کے ایک حصے کا رنگ الگ دکھاتی ہے۔

۹۸۵ھ میں راجہ مجھولہ کو بانس بریلی کے علاقے میں دامن کوہ کے انتظام کے لئے بھیجا۔ اُس نے وہاں سے ایک رپورٹ کی۔ چند درخواستوں میں سے ایک یہ تھی۔ درگاہ سے جدا ہو کر اس صحرائے بیابان میں آگیا ہوں۔ کوئی رفیق و آشنا ساتھ نہیں اگر شیخ عبدالقادر بداؤنی کو بھیج دیا جائے۔ تو وہ اس ملک کے نیک و بد سے خوب واقف ہے۔ لوگ اس کے اعتبار پر رجوع بھی ہو جائیں گے۔ اور دربار میں اُسے کوئی ایسی خدمت بھی سپرد نہیں ہے۔ اس کے حال پر مرحمت اور بندہ درگاہ کی سرافرازی کا سبب ہوگا۔ والحکم اعلیٰ۔ خواجہ شاہ منصور نے ایک ایک فقرہ پڑھ کر سنایا۔ اور حرف بہ حرف ہر بات کا جواب جو فرمایا وہ لکھا۔ اس مطلب پر نہیں کی نہ ہاں سے

موبر آمد کف دموے تو نامد بہ کفم — این چنیں بخت کہ من دارم این خوکہ تراست

اسی برس اجمیر کے مقام سے حسب معمول حاجیوں کا قافلہ روانہ کیا۔ شاہ ابوتراب کو میر حاج بنایا۔ بہت کچھ سامان دئے۔ اور حکم عام دیا کہ جو چاہے جائے۔ شاہ موصوف اکابر سادات شیراز سے تھے۔ اور سلاطین گجرات ان سے بڑا اعتقاد رکھتے تھے۔ مَیں نے شیخ عبدالنبی صدر سے کہا۔ کہ مجھے بھی رخصت لے دو۔ شیخ نے پوچھا کہ ماں جیتی ہے؟ کہا کہ ہاں۔ پوچھا بھائیوں میں سے کوئی ہے؟ کہ اس کی خدمت کرتا رہے۔ میں نے کہا گزارے کا وسیلہ تو مَیں ہی ہوں۔ کہا کہ ماں کی اجازت لے لو تو اچھا ہے۔ بھلا وہ کب اجازت دیتی تھیں۔ یہ سعادت بھی رہ گئی۔ اب حسرت کے مارے بوٹیاں کاٹتا ہوں۔ اور کچھ نہیں ہو سکتا ؎

نہ کرد لطفِ تو کارے نہ وقتِ کار گذشت — نشد وصالِ تو روزے و روزگار گذشت

ابھی تک ملّا صاحب کو یہ اعتقاد باقی تھا کہ بادشاہ ظل اللہ۔ نائب رسول اللہ ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ مَیں لشکر کے ساتھ ریواڑی کے ضلع میں تھا۔ وطن سے خبر آئی کہ ایک لونڈی کے پیٹ سے بیٹا پیدا ہؤا ہے۔ مدت کے بعد اور بڑے انتظار کے بعد ہؤا تھا۔ خوشی خوشی اشرفی نذر لے گیا۔ اور نام کے لئے عرض کی۔ فرمایا تمہارے باپ اور دادا کا کیا نام ہے۔ عرض کی ملوک شاہ بن حامد شاہ۔ ان دنوں یا ہادی کا وظیفہ ورد تھا۔ فرمایا اس کا نام عبدالہادی رکھو۔ حافظ محمد ابن خطیب نے ہر چند کہا۔ نام رکھنے کے بھروسے نہ رہو۔ حافظوں کو بلاؤ اور لڑکے کی درازی عمر کے لئے قرآن پڑھواؤ۔ مَیں نے خیال نہ کیا۔ آخر ۶ مہینے کا ہو کر مر گیا۔ خیر خدا میرے لئے اس کا ثواب ذخیرہ رکھے اور اسے قیامت کے دن میرا شفیع کرے۔

اُسی منزل سے ۵ مہینے کی رخصت لے کر بساور آیا۔ اور بعض ضرورتوں بلکہ فضولیوں کے سبب سے وعدہ خلافی کر کے سال بھر پڑا رہا۔ ایسی ایسی کم خدمتی اور مخالفتوں نے رفتہ رفتہ نظروں سے گرا دیا۔ اور بالکل توجہ نہ رہی۔ آج تک ۱۸ برس ہوئے ۱۸ ہزار عالم سامنے سے گزر گیا۔ اسی محرومی میں مبتلا ہوں۔ نہ روئے قرار ہے نہ راہ فرار ہے۔ رباعی

بختے نہ کہ با دوست بیامیزم من — صبرے نہ کہ از عشق بپرہیزم من
دستے نہ کہ با قضا در آویزم من — پائے نہ کہ از میانہ بگریزم من

بادشاہ ۹۸۶ھ میں پنجاب کا دورہ کر کے دریا کے رستے دہلی پہنچے۔ اور آبی کشتی سے اُتر کر کشتی خاکی پر سوار ہوئے۔ سانڈنیوں کی ڈاک بٹھادی اور عین وقت پر اجمیر پہنچ کر عرس میں شامل ہوئے۔ دوسرے ہی دن رخصت ہو کر آگرہ کو پھرے۔ نور کا تڑکا تھا۔ صبح طباشیر بکھیر رہی تھی۔ کہ ٹونڈہ کی منزل میں پہنچے (ملا صاحب لکھتے ہیں۔) میں بساور سے چل کر استقبال کے لئے پہنچا ہوا تھا۔ حاضر خدمت ہو کر کتاب الاحادیث نذر گزرانی۔ اس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب بیان کئے ہیں۔ اور نام بھی تاریخی رکھا ہے۔ کتاب کتب خانہ شاہی میں داخل ہوئی۔ الحمد للہ کہ غیر حاضری اور وعدہ خلافی کا ذکر ہی نہ آیا (۹۷۸ھ سے پہلے کی تصنیف ہو گی) ان کا قلم بھی آزادی کی طرح نچلا نہ رہتا تھا۔ کچھ نہ کچھ کئے جاتے تھے۔ لکھا۔ ڈال رکھا۔ ع

غنیمت جمع کن غازنگے روزے شود پیدا

اب تک یہ حال تھا کہ آقا اپنے ملازم کو ہر وقت محبت کی آنکھ سے دیکھتا تھا۔ اور قدردانی اور پرورش کے خیال کر کے خوش ہوتا تھا۔ اور عقیدت مند ملازم ہر بات میں ہوا خواہی۔ خوش اعتقادی اور جاں نثاری کے خیالات کو وسعت دے کر ہزار طرح کی اُمیدیں رکھتا تھا۔ لیکن اب وہ وقت آگیا۔ کہ دونوں اپنی اپنی جگہ آکر رُک گئے۔ اور دونوں کے خیالات بدل گئے۔ دربار اور اہل دربار کے حالات تم نے دیکھ لئے عالم بدل گیا تھا۔ اور حریف نئی دنیا کے لوگ تھے۔ اور ملا صاحب کی طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی۔ کہ کسی سے میل نہ کھاتی تھی۔ دینداری فقط بہانہ تھی۔ اور اس میں بھی شک نہیں۔ کہ فضل وفیضی ان کے ہم درس وہم سبق جس طرح اعلےٰ مراتب فضل وکمال میں تھے۔ اُسی طرح اعلےٰ مراتب جاہ وجلال میں اُڑے جاتے تھے۔ اور اکثر اہل علم جو کتابی استعداد میں ملا صاحب کے ہم پلہ بلکہ ان سے کم تھے۔ وہ زمانے کے موافق رفتار کر کے بہت بڑھ گئے تھے۔ اس لئے بھی ان کا جی چھوٹ گیا تھا۔ اور ہمت قاصر ہو گئی تھی۔ حق پوچھو تو یہ اپنی ذات سے اسی کام کے تھے۔ جس میں جوہر شناس بادشاہ نے رکھا۔ اور یہ اسے کرتے رہے۔ اور اُسی میں مر گئے۔ اکبر کے حال میں جو جو باتیں میں نے لکھی ہیں۔ اکثر انہی کی کتاب سے لی ہیں۔ اور وہ سب درست ہیں۔ مگر یہ بھی کہتا ہوں۔ کہ ملا صاحب نے انہیں بُرے اور بدنما موقع پر ترتیب دے کر

دکھایا ہے۔ اور مصلحت ملکی کے امورات کو ایسے مقاموں پر سجایا ہے۔ کہ خواہ مخواہ اُن سے اکبر اور اکثر علما و امرا خصوصاً فضل و فیضی کے حق میں بے دینی اور بدنیتی کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس میں ضرور اُن کے رشکِ منصبی کو دخل تھا۔ چنانچہ اُس عرصے کے بعد زمانے کی شکایت لکھتے لکھتے کہتے ہیں:۔

مجھے یاد ہے کہ ان معاملات کی ابتدا میں شیخ ابوالفضل سے ایک جلسے میں گفتگو ہوئی۔ فتح پور کے دیوان خاص میں بیٹھے تھے کہنے لگے۔ کہ ہمیں اسلام کے کُل مصنفوں سے دو باتوں کا گلہ ہے۔ **اوّل** یہ کہ جس طرح پیغمبر صاحب کے حالات اور واقعات سال بسال لکھے اسی طرح اور پیغمبروں کے حال نہ لکھے۔ مَیں نے کہا قصص الانبیا تو ہے۔ بولے نہیں وہ تو بہت مجمل ہے تفصیل سے لکھنا چاہئے تھا۔ میں نے کہا کہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ مفسّرین اور اہل تاریخ کے نزدیک اتنا ہی ثابت ہُوا ہوگا۔ باقی ثبوت کو نہ پہنچا۔ جواب میں کہا۔ کہ یہ جواب نہیں ہو سکتا **دوسرے** یہ کہ کوئی ادنےٰ پیشہ ور نہیں جس کا نام تذکرۃ الاولیا اور نفحات الانس وغیرہ میں نہیں لکھا۔ اہل بیت نے کیا گناہ کیا تھا۔ کہ اُنہیں نہ داخل کیا اور یہ نہایت تعجب کا مقام ہے۔ یہاں بھی جو کچھ وقت نے گنجائش دی کہ گیا۔ مگر کون سنتا ہے۔ مَیں نے پوچھا کہ ان مشہور مذہبوں میں سے تمہاری رغبت کدھر زیادہ ہے۔ بولے کہ جی چاہتا ہے۔ چند روز لامذہبی کے صحرا میں سیر کروں۔ مَیں نے کہا کہ نکاح کی قید اُٹھا دو[1]۔ تو خوب ہو۔ ؎

برداشت غل شرع بتائیدِ ایزدی	از گردنِ زمانہ علےٰ ذکرہ السّلام

ہنسنے لگے۔ چونکہ ان دنوں میں اور مطالب و مقاصد بھی در پیش تھے۔ میں نے گوشۂ عزلت میں جان بچائی۔ اور آیت فرار پڑھی کہ نظروں سے گر گیا۔ پہلی آشنائی بیگانگی ہو گئی۔ اور الحمد للہ کہ میں اس حال میں خوش ہوں۔ رُباعی

دل در تنگ دلپو نشد نکو شد کہ نشد	جز در تو فرو نشد نکو شد کہ نشد
گفتی کہ بر نجم ار نکو شد کارت	دیدی کہ نکو نشد نکو شد کہ نشد

[1] آزاد۔ ذرا حضرت کی فرمائش کو دیکھو اور ذوق طبع کا خیال کرو۔ کیا ارمان دل میں بھرے ہونگے جو یہ لفظ زبان سے نکلا۔ اور ان کے تلو حوصلہ کو دیکھو۔ کہ ان باتوں کو کیا ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔

سمجھ لیا کہ نہ میں رعایت کے قابل ہوں نہ یہ خدمت کے قابل اور اس پر سراسر راضی ہوں ؎

بیا تا تکلف بہ یکسو نہیم ۔۔۔ نہ از تو قیام و نہ از ما سلام

کبھی کبھی دور پا انداز سے کورنش کر لیتا ہوں اور دیکھ لیتا ہوں ۔ ع

کہ صحبت بر نیاید تا موافق نیست مشرب ہا

دیکھئے آگے قسمت میں کیا ہے ؎

دیدم کہ دیدن رخت از دور خوشتر است ۔۔۔ صحبت گزاشتم ز تماشائیاں شدم

ان جزئیات وخصوصیات کی تفصیل اور ان معرکوں کی ترتیب سال وار سلک تحریر میں لانی ناممکن ہے۔ اس لئے اس طریق پر اکتفا کیا۔ اور خدا ہر حال میں اپنے بندہ کا حافظ اور مددگار رہے۔ اُسی کے بھروسے پر ان معاملات کے لکھنے میں دلیری کی تھی ورنہ جو کچھ کیا ہے احتیاط کی منزل سے دُور ہے۔ اور خدا گواہ ہے وکفی باللہ شہیدا کہ اس کے لکھنے میں دردِ دین اور ملت مرحومہ اسلام کی دلسوزی کے سوا اور کچھ غرض نہیں ہے۔ اور حسد اور تعصب اور عداوت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں ۔

۹۸۷ھ میں لکھتے ہیں۔ چالیس برس کی عمر میں خدا نے ایک فرزند **محی الدین** نام عنایت فرمایا۔ بساور میں پیدا ہوا۔ اللہ علم نافع اور عمل مقبول نصیب کرے ۔

انہی ایام میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ میں خدمت سے بچ کر الگ ہو گیا تھا۔ اور اپنے تئیں نیست و نابود سمجھ لیا تھا۔ وطن سے پھر کر آیا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ اجمیر کے مقام میں قاضی علی نے مجھے بھی پیش کیا۔ دہی ہزار بیگھہ مدد معاش کہ وقت عزیز کے برباد کرنے والی ہے۔ اس کا نام بھی سنایا ؎

بدرگاہ حکام و درگاہ و بیگہ ۔۔۔ روی تا کنی بیگہ چند حاصل

فرمایا کہ میں جانتا ہوں۔ اس کے فرمان میں کچھ شرط بھی لگائی تھی؟ عرض کی ہاں بشرطِ خدمت۔ فرمایا۔ پوچھو کچھ ضعف تھا کہ حاضر نہ ہو سکے۔ غازی خاں بدخشی بھٹ بول اُٹھے۔ ضعف طالع۔ ابوالفضل[1] نے بھی زور دیا۔ مقربوں میں سے ایک ایک نے امامت سابق کے لئے سفارش کی۔ یہاں نماز معزول ہو گئی تھی۔ اور امامت بھی

[1] آفرین ہے فیضی وابوالفضل کی ہمت و مروت کو کبھی بُرے وقت میں ان کے لئے کلمہ خیر سے نہ چوکے۔ حق یہ ہے کہ جب ایسے تھے تب ایسے رتبہ کو پہنچے تھے ۔

تخفیف میں آگئی تھی۔ شہباز خاں بخشی نے عرض کی۔ خدمت میں تو ہمیشہ ہی رہتے ہیں فرمایا ہم کسی سے زبردستی خدمت نہیں چاہتے۔ اگر خدمت نہیں چاہتا تو آدھی زمین رہی۔ میں نے فوراً تسلیم کی (گستاخانہ حرکت) نہایت ناگوار گزری) اور منہ پھیر لیا۔ قاضی علی نے پھر عرض کی۔ کہ اس کے باب میں کیا حکم ہے۔ شیخ عبد النبی صدر الٰہی نکالے نہ گئے تھے لشکر ہی میں تھے۔ فرمایا ان سے پوچھو۔ کہ بغیر خدمت کے کتنی زمین کا استحقاق تھا۔ شیخ نے مولانا الہ داد امروہہ کی زبانی کہلا بھیجا کہ عیال دار ہے۔ اور سُنا جاتا ہے کہ خرچ بھی رکھتا ہے۔ حضور اس طرح فرماتے ہیں نو سات آٹھ سو بیگھہ تو ضرور چاہیئے۔ مقربان دربار نے یہ عرض بھی مناسب نہ سمجھی اور مجھے حضوری خدمت پر مجبور کیا۔ ناچار میں پھنس گیا۔ ع

مرغِ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

اور یہ ساری ناراضی اُسی بات پر تھی۔ کہ داغ کی خدمت کے لئے کہا اور بار بار کہا کیوں نہ قبول کر لی۔ اور میں بھی سمجھتا رہا اور یہی کہتا رہا ؎

شادم کہ یک سوار ندارم پیادہ ام	فارغ ز قیدِ شاہم و از شاہزادہ ام

یہ بڑی خوبی کی بات ہے کہ ملّا صاحب نے اپنی تاریخ میں غیر کی یا اپنی کوئی بات چھپائی نہیں۔ لکھتے ہیں مظہری نام ایک لونڈی تھی۔ کہ جس میں ظہور قدرت کا نمونہ تھا۔ میں اس پر عاشق ہو گیا۔ اس کے عشق نے ایسی آزادی اور وارستگی طبیعت میں پیدا کی۔ کہ سال بھر برابر بساور میں پڑا رہا۔ اور عجیب عجیب عالم دل پر گزر گئے ۹۸۹ھ میں برس دن کی غیر حاضری کے بعد فتح پور میں جا کر ملازمت حاصل کی۔ ان دنوں سفر کابل سے پھر کر آئے تھے۔ شیخ ابو الفضل سے پوچھا۔ اس سفر میں یہ کیونکہ رہ گیا تھا۔ عرض کی یہ تو مدد معاشیوں میں ہیں۔ بات ٹل گئی۔ کابل کے پاس بھی صدر جہاں سے کہا تھا۔ کہ جو لوگ اہل سعادت ہیں ساتھ ہیں یا رہ گئے ہیں؟ دونوں کی فہرست پیش کرو۔ خواجہ نظام الدین مرحوم مصنّف تاریخ نظامی سے نئی نئی شناسائی ہوئی تھی مگر ایسی ہوئی تھی گویا سیکڑوں برس کی محبت تھی۔ دلسوزی) اور الفت طبعی سے (کہ سب پر عام اور مجھ پر خاص تھی) بیمار لکھوا دیا اور سچ لکھوایا تھا۔ کیونکہ خدا کے ساتھ معاملہ آسان ہے بندوں کا ڈر اور اُس سے طمع بڑا سخت مرض ہے۔ مدت مفارقت میں خواجہ مذکور نے

خط پر خط لکھے - کہ دیر بہت ہوئی ہے - کم سے کم لاہور - دلی - متھرا جہاں تک ہو سکے - استقبال میں کوشش کرنی چاہیئے - کہ دنیا کی رسم ہے - اور احتیاط شرط ہے اور مجھے اُس عالم میں ایک ایک ساعت عمر جاودان سے بہتر تھی - عاقبت اندیشی کجا اور نفع و نقصان کا خیال کجا - آخر توکّل خدا نے اپنا کام کیا ؎

تو با خدائے خود انداز کار و خوش دل باش | کہ رحم اگر نہ کند مدعی خدا بکند

اس عالم میں کبھی خواب میں شعر موزوں ہو جاتے تھے ایک دفعہ رات کو سوتے میں یہ شعر کہا مدتوں پڑھتا رہا اور روتا رہا ؎

آئینہ ما روئے ترا عکس پذیر است | گر تو نہ نمائی گنہ از جانب ما نیست

عزت اور جلال الٰہی کی قسم ہے - آج ۱۷ برس ہوئے ہیں - اب تک وہ لذت دل سے نہیں جاتی - اور جب یاد کرتا ہوں زار زار روتا ہوں - کاش کبھی دیوانہ ہو جاتا - ننگے سر ننگے پاؤں نکل جاتا - اور جنجال سے چھٹ جاتا ؎

خوش آنکہ دیدروئے ترا و سپرد جاں | آگہ نشد کہ ہجر کدام و وصال چیست

وہ فیض دل کو پہنچا - اور وہ کچھ سمجھا کہ عمر دل تک لکھوں - اور شکر کروں تو عشر عشیر بھی نہ ادا ہو۔

سنہ ۹۹۰ھ میں حکم ہوا کہ ہجرت کے ہزار سال پورے ہو گئے - سب جگہ ہجری تاریخ لکھتے ہیں - اب ایک ایسی تاریخ کی کتاب لکھی جائے جس میں پورا ہزار سال کا حال شاہان اسلام کا درج ہو - درحقیقت مطلب یہ تھا کہ اور تاریخوں کی ناسخ ہو - اس کا نام تاریخ الفی ہو - سنوں میں بجائے ہجرت کے لفظ رحلت لکھیں - اول روز وفات سے برس برس دن کا حال ۷ شخصوں کے سپرد ہوا - چنانچہ سال اول نقیب خاں کو دوم شاہ فتح اللہ کو - اسی طرح حکیم ہمام - حکیم علی - حاجی ابراہیم سرہندی کہ انہی دنوں میں گجرات سے آیا تھا - مرزا نظام الدین احمد اور فقیر (فاضل بدایونی) دوسرے ہفتے میں پھر اسی طرح ۷ آدمی تجویز ہوئے - اسی طرح جب ۳۵ برس کا حال مرتب ہوا تو ایک شب میری تحریر میں ساتویں برس کا حال پڑھا جاتا تھا اس میں خلیفۂ حقانی شیخ ثانی کے زمانے میں بعض روائتیں تھیں جس میں شیعوں اور سنیوں کا اختلاف ہے - نماز کے پانچ وقتوں کے تقرر کا ذکر تھا - اور شہر نصیبین کی فتح کے ذکر میں تھا کہ بڑے بڑے مرغوں کے

برابر چیونٹے وہاں سے نکلے۔ بادشاہ نے اس مقام پر بے حد مناقشہ اور مواخذہ کیا۔ آصف خاں ثالث یعنی مرزا جعفر نے بہت بدمددی کی۔ البتہ شیخ ابوالفضل اور غازی خاں بدخشی ٹھیک ٹھیک توجیہیں کرتے تھے۔ مجھ سے پوچھا کہ یہ باتیں کیوں کر لکھیں؟ مَیں نے کہا جو کتابوں میں دیکھا تھا۔ سو لکھا ہے۔ اختراع نہیں کیا۔ اس وقت روضۃ الاحباب اور اور تاریخ کی کتابیں خزانے سے منگا کر نقیب خاں کو دیں کہ تحقیق کرو۔ اُس نے جو کچھ تھا وہ کہہ دیا۔ خدا کی عنایت کہ اُن بے جا گرفتوں سے مخلصی ہوئی۔ چھتیسویں سال سے ملا احمد ٹھٹوی کو حکم ہوا کہ تم تمام کرو۔ یہ حکم حکیم ابوالفتح کی سفارش سے ہوا۔ ملا احمد متعصب شیعہ تھا۔ جو چاہا سو لکھا۔ اس نے چنگیز خاں کے زمانے تک دو جلدیں تمام کیں۔ ایک رات مخالفت مذہب کے جوش سے مرزا فولاد برلاس اس کے گھر آیا۔ اور کہا کہ حضور نے یاد کیا ہے۔ وہ گھر سے نکل کر ساتھ ہوا۔ رستے میں مار ڈالا۔ اور خود بھی سزا کو پہنچا۔ پھر ۹۹۰ھ تک آصف خاں نے لکھا۔ ۱۰۰۲ھ میں مجھے حکم ہوا کہ اس تاریخ کو سرے سے مقابلہ کرو۔ اور سنوں کے پس و پیش کو درست کرو۔ اول دو جلد کو درست کیا۔ اور جلد سوم کو آصف خاں پر چھوڑا۔ شیخ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتے ہیں۔ کہ اس کا دیباچہ میں نے لکھا ہے۔

اسی برس کے وقائع میں سے مہابھارت کا ترجمہ ہے۔ یہ ہندوؤں کی بڑی نامی کتابوں میں سے ہے۔ رنگ رنگ کے قصے نصیحتیں۔ اخلاق۔ آداب معاش۔ معرفت اعتقاد۔ بیان مذاہب۔ طریق عبادات۔ اور اُس کے ذیل میں کوروں۔ پانڈوں کی لڑائی کہ ہندوستان کے فرمانروا تھے۔ جسے ۴ ہزار برس سے زیادہ ہوئے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ۸ ہزار برس سے زیادہ ہوئے۔ ظاہرا حضرت آدم سے بھی پہلے ہی ہوں گے۔ ہند کے لوگ اس کے پڑھنے اور لکھنے کو عبادت عظیمہ جانتے ہیں۔ اور مسلمانوں سے

لہ دل چاہتا تھا کہ جیسے ملا صاحب پاک نویس مؤرخ ہیں ویسا ہی اُن کا آئینہ بھی داغ تعصب سے پاک نظر آئے۔ مگر افسوس اُنھوں نے ملا احمد مظلوم کے باب میں جو فحش و فضیحت کی نجاست اُچھالی ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ قلم تحریر مارے شرم کے سر نہیں اُٹھاتا۔ اور مجھے قانون تہذیب اجازت نہیں دیتا۔ کہ دامن ورق کو اس کی نقل سے نجس کروں۔ مَیں شیعہ بھائیوں کی بدزبانی پر خون جگر کھاتا تھا۔ اس سُنّی بھائی نے دل جلا کر خاک کر دیا۔

چھپاتے ہیں (اکبر پر چوٹ کرکے کہتے ہیں) اس حکم کا سبب یہ تھا۔ کہ انہیں دنوں میں **شاہنامہ** با تصویر لکھوایا تھا۔ اور **امیر حمزہ** کا قصّہ بھی ۱۷ جلدوں میں با تصویر مرتب ہوکر ۱۵ برس کے عرصے میں تیار ہؤا تھا۔ قصّہ **ابومسلم** اور **جامع الحکایات** وغیرہ کو بھی مکرر سُنا اور لکھوایا۔ خیال آیا کہ یہ سب شاعری اور شاعروں کی تراشیں ہیں۔ مگر کسی مبارک وقت میں لکھی گئی تھیں۔ اور ستارہ موافق تھا۔ اس لئے خوب شہرت پائی ہے۔ پس ہندی کتابیں کہ دانایان عابد و مرتاض نے لکھی ہیں۔ اور سب صحیح اور قطعاً درست ہیں۔ اور ان لوگوں کے دین کا اور عقاید اور عبادت کا مدار اس پر ہے۔ ہم انہیں اپنے نام سے فارسی میں کیوں نہ ترجمہ کریں۔ کہ عجیب ہیں۔ اور نئی باتیں ہیں)۔ دین اور دنیا کی سعادت ہے۔ اور دولت و حشمت بے زوال کا باعث ہے۔ اور کثرتِ اموال و اولاد کا سبب ہے۔ چنانچہ اس کے خطبے میں یہی لکھا۔ غرض اس کام کے لئے خود پابندی اختیار کی اور پنڈتوں کو جمع کیا۔ کہ اصل کتابوں کا ترجمہ بتایا کریں۔ چند شب آپ اس کے معنی نقیب خاں کو سمجھاتے رہے۔ وہ فارسی میں لکھتا گیا۔ تیسری رات فقیر (ملّا صاحب) کو بُلا کر فرمایا۔ کہ نقیب خاں کے ساتھ شامل ہوکر لکھا کرو۔ تین چار مہینے تک ۱۸ میں سے دو پرب (فن) میں نے لکھے۔ اس پر سُناتے وقت کیا کیا اعتراض نہ سُنے۔ حرام خور اور شلغم خور کیا تھا؟ وہ یہی اشارے تھے۔ گویا میرا حصّہ ان کتابوں میں یہ تھا۔ سچ ہے قسمت کا لکھا ضرور ہوتا ہے۔ پھر تھوڑا **ملا شیری** اور **نقیب خاں** نے لکھا۔ اور تھوڑا حاجی سلطان تھانیسری نے تنہا تمام کیا۔ پھر شیخ فیضی کو حکم ہؤا کہ نظم و نثر لکھو۔ وہ بھی دو (پرب) فن سے آگے نہ بڑھے۔ پھر حاجی مذکور نے دوبارہ لکھی۔ اور جو جو فروگزاشتیں پہلی دفعہ رہ گئی تھیں انہیں طابق النعل بالنعل درست کیا۔ ۱۰۰ جز کچھ ریچ لکھے ہوئے تھے۔ اور ترجمہ کی مطابقت میں نقطۂ مگس کی بھی تاکید تھی کہ رہ نہ جائے۔ آخر حاجی بھی ایک سبب سے بھکر کو نکالا گیا۔ اب اپنے وطن میں ہے۔ اکثر ترجمہ بتانے والے کوروں اور پانڈوں کے پاس پہنچے۔ جو باقی ہیں انہیں خدا نجات دے اور توبہ نصیب کرے۔ اس کا نام **رزم نامہ** رکھا۔ اور دوبارہ با تصویر لکھوا کر امرا کو حکم ہؤا کہ مبارک سمجھ کر نقل کروائیں۔ شیخ ابوالفضل نے دو جُز کا خطبہ بھی لکھ کر لگایا +

ف - بختاور خاں نے مراۃ العالم میں لکھا ہے۔ کہ ملّا صاحب کو خدمت مذکور کے صلہ میں ۱۵۰ اشرفی اور دس ہزار تنگہ سیاہ انعام ہوئے ۔

۹۹۲ھ میں لکھتے ہیں۔ فقیر کو حکم دیا کہ رامائن کا ترجمہ کرو۔ یہ مہابھارت سے بھی پہلے کی کتاب ہے۔ ۲۵ ہزار اشلوک ہیں۔ ہر اشلوک ۶۵ حرف کا ہے ایک افسانہ ہے کہ رام چندر اودھ کا راجہ تھا اُس کو رام بھی کہتے ہیں۔ اور قدرت الٰہی کا ظہور سمجھ کر پوجا کرتے ہیں۔ مجمل حال اس کا یہ ہے کہ اُس کی رانی سیتا کو ایک دہ سرا دیو عاشق ہو کر لے گیا۔ وہ جزیرہ لنکا کا مالک تھا۔ رام چندر اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اس جزیرہ میں پہنچا۔ بے شمار لشکر بندروں اور ریچھوں کا جمع کیا۔ کہ محاسب وہم کو اس کے شمار کی خبر نہیں۔ چار کوس کا پل سمندر کا باندھا۔ بعض بندروں کو تو کہتے ہیں ۔ کود پھاند کر اُچھل گئے۔ بعضے اپنے پاؤں سے پل اُترے۔ ایسی بعید العقل باتیں بہت ہیں۔ کہ عقل نہ ہاں کہتی ہے نہ ناہ۔ بہر تقدیر رامچندر بندر سوار پل سے اُترا۔ ایک ہفتہ گھمسان کی لڑائی لڑے۔ راون کو بیٹوں پوتوں سمیت مارا۔ ہزار برس کا خاندان برباد کیا۔ اور لنکا اس کے بھائی کو دے کر پھرا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ رامچندر ۱۰ ہزار برس تمام ہندوستان کی حکومت کر کے اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ اس فرقہ کا خیال ہے کہ عالم قدیم ہے کوئی زمانہ نوع بشر سے خالی نہیں۔ اور اس واقعہ کو لاکھ در لاکھ برس گزر گئے۔ اور آدم خیر البشر کو جسے سات ہزار برس ہوئے، مانتے ہی نہیں۔ یہ واقعات یا تو سچ نہیں فقط کہانی ہیں۔ اور خیال محض۔ جیسے شاہنامہ۔ امیر حمزہ کا قصہ۔ یا اس زمانے کا ہوگا کہ جنات اور حیوانات کی سلطنت روئے زمین پر تھی۔ ان دنوں کے واقعات عجیبہ میں سے یہ ہے۔ کہ دیوان خانہ فتح پور میں ایک حلال خور کو لائے اور کہتے تھے۔ کہ عورت تھی مرد ہو گیا۔ چنانچہ ایک پنڈت رامائن کے مترجموں میں سے دیکھ آیا۔ کہتا تھا ایک عورت ہے شرم کے مارے گھونگٹ نکالے ہوئے ہے بولتی نہیں۔ حکما اس امر کی تائید میں دلیلیں پیش کرتے تھے۔ کہ ایسے معاملے بہت پیش آئے ہیں ۔

۹۹۳ھ شروع ہوا نوروز کے جاہ و جلال کا عالم کیا لکھا جائے۔ آئین بندی تو آئین میں داخل ہو گئی تھی۔ امرا کے ہاں ضیافتوں میں گئے اور نذرانہ بھی لئے زیادہ

یہ ہوا کہ نذریں اور پیشکش سب سے لئے۔ فاضل بداؤنی لکھتے ہیں۔ ذرۂ بے مقدار کسی شمار میں نہیں۔ ہاں ہزار بیگھہ زمین کے سبب سے نام کا ہزاری ہے حضرت یوسف والی بڑھیا کی مثال یاد کرکے ۴۰ روپے لے گیا۔ اور قبول کا درجہ پایا۔

	ع
خدمت پسند نیست دگر خدمتے بیار	

اب فاضل مذکور دربار کی صورت حال سے بہت تنگ تھے۔ موقع وہ تھا کہ عبدالرحیم خانخاناں کی بہار اقبال نوروز منا رہی تھی۔ خود ۹۹۳ھ میں لکھتے ہیں۔ کہ انہی دنوں میں مرزا نظام الدین احمد نے گجرات سے مجھے لکھا کہ خانخاناں نے یہاں سے روانہ ہوتے وقت وعدہ کیا ہے۔ کہ ملا الہ داد امروہہ کو اور تم کو حضور سے عرض کرکے لیتا آؤنگا جب خانخاناں پہنچیں۔ تو بموجب آداب مقررہ کے تم جاکر اُن سے ملاقات کرو۔ اور حضور سے اجازت لے کر چلے آؤ اور اس ولایت کی بھی سیر کرو۔ کہ عجب عالم ہے۔ پھر جیسی صلاح ہوگی کیا جائیگا۔ فتح پور کے دیوان خانہ میں مکتب خانہ ہے۔ یہیں مترجم بیٹھتے ہیں۔ جب خان خاناں یہاں آئے تو میں جاکر ملا۔ مگر وہ جھٹ پٹ رخصت ہوکر پھر گجرات کو روانہ ہوگیا۔ اور جو ارادہ میں نے نجات کا سرمایہ سمجھا تھا۔ وہ اندر ہی اندر رہ گیا۔ اسے بھی مدت گزر گئی۔ سچ ہے وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ جو ہم چاہتے ہیں نہیں ہوتا۔ خدا چاہتا ہے سو ہوتا ہے۔

افسوس اب وہ وقت آیا کہ ان کے دوست آشنا دنیا سے چلنے شروع ہوگئے۔ لکھتے ہیں کہ بادشاہ کابل کو جاتے تھے۔ سیالکوٹ کی منزل میں ملا الہ داد امروہہ نے سینے پر داغ کھایا۔ اس کی حرارت جگر تک پہنچی۔ حکیم حسن کا مسہل ہوا۔ اور دو دن میں واصل حق ہوئے۔ ع

مرگ نوش است شربتت بادا	

خوب یار تھا۔ اللہ رحمت کرے ۔

اے دل ترا کہ گفت بدنیا قرار گیر	ایں جان نازنین را اندر حصار گیر
بنگر کہ تا تو آمدۂ چند کس برفت	آخر یکے ز رفتن شاں اعتبار گیر

۹۹۷ھ میں لکھتے ہیں۔ رامائن کا ترجمہ کرکے رات کے جلسے میں پیش کی۔ خاتمہ اس شعر پر تھا:۔

ما قصہ نوشتیم بہ سلطاں کہ رساند
جاں سوختہ کردیم بہ جاناں کہ رساند

بہت پسند آیا پوچھا کے جز ہوئے؟ عرض کی مسودہ ۷۰ جز کے قریب تھا۔ صاف ہو کر ۱۲۰ ہوئے۔ فرمایا کہ جیسا مصنفوں کا دستور ہے۔ ایک دیباچہ بھی لکھ دو۔ مگر اب طبیعت میں امنگ نہیں رہی۔ اور لکھتا تو بے نعت لکھتا اس لئے ٹال گیا۔ اس نامۂ سیاہ سے کہ میرے نامۂ عمر کی طرح تباہ ہے خدا سے پناہ مانگتا ہوں۔ کفر کی نقل کفر نہیں۔ صاحب فرمان کے حکم سے لکھی ہے۔ اور بہ کراہت لکھی۔ ڈرتا ہوں کہ اس کا پھل پھٹکار نہ ملے۔ اور توبہ کہ توبہ پاس نہیں۔ درگاہِ توّاب وہاب میں قبول ہو لکھتے ہیں کہ انہی دنوں میں ایک دن مترجموں کی خدمتوں پر نظر کر کے حکیم ابو الفتح سے فرمایا۔ کہ بالفعل یہ شال پوشاک خاص اسے دے دو۔ گھوڑا اور خرچ بھی عنایت ہوگا اور شاہ فتح اللہ عضد الدولہ سے فرمایا کہ علاقہ بساور در و بست تمہاری جاگیر میں کیا جو جاگیر اس میں سے اماموں کو دی ہوئی ہے۔ وہ بھی تمہیں معاف۔ پھر میرا نام لے کر کہا کہ یہ جوان بداؤنی ہے۔ ہم نے اس کی مدد معاش سوچ سمجھ کر بساور سے بداؤں میں کر دی۔ جب میرا فرمان تیار ہوا تو برس دن کی رخصت لے کر بساور پہنچا۔ وہاں سے بداؤں آیا۔ ارادہ تھا۔ کہ گجرات احمد آباد چل کر مرزا نظام الدین احمد سے ملوں۔ کیونکہ ۹۹۳ھ میں اس نے بلا بھیجا تھا۔ تعلقات میں پھنس کر رہ گیا + ؎

نیم ملول کہ کارم نکو نشد بد شد
شود شود نشود گو مشو چہ خواہد شد

علاقہ کشمیر میں شاہ آباد ایک قصبہ ہے۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی فاضل جامع معقول و منقول تھے۔ انہوں نے حسب الحکم کشمیر کی تاریخ لکھی تھی۔ ملا صاحب لکھتے ہیں۔ ۹۹۹ھ میں فرمائش کی کہ اسے خلاصہ اور سلیس فارسی میں لکھو۔ دو مہینے میں تیار کر کے گزرانی اور اخیر میں لکھا ؎

درعرض یک دو ماہ بتقریب حکم شاہ
این نامہ شد چو خط پری پیکراں سیاہ

پسند ہو کر کتب خانہ میں داخل ہوئی۔ سلسلے میں پڑھی جاتی تھی۔ **آزاد**۔ افسوس ک اصل اور اصلاحی دونوں تاریخیں اب نہیں ملتیں۔ ہاں ابو الفضل نے آئین اکبری میں شاہ محم کی کتاب کا اشارہ کیا ہے۔ کہ راج ترنگنی سے ترجمہ ہوئی تھی۔ اور وہ سنسکرت میں ہے +

ایک دن حکیم ہمام نے معجم البلدان کہ ۲۰۰ جز کی ضخامت ہوگی۔ بڑی تعریف سے پیش کی۔ اور کہا کہ یہ عربی ہے۔ فارسی میں ترجمہ ہو جائے تو بہت خوب ہے۔ اس میں بہت حکایات عجیب و فوائد غریب ہیں۔ ملا احمد ٹھٹھہ۔ قاسم بیگ۔ شیخ منور وغیرہ دس بارہ شخص ایرانی اور ہندی جمع کر کے جز تقسیم کر دئے۔ مترجموں کے آرام کے لئے فتحپور میں پرانے دیوان خانہ میں مکتب خانہ تھا۔ ملا صاحب کے حصے میں دس جزو آئے۔ ایک مہینہ میں تیار کر دیئے۔ سب سے پہلے گزرانے اور اس حسن خدمت کو رخصت کا وسیلہ کیا کہ قبول ہوئی +

اگرچہ ان کی قابلیت اور کارگزاری ہمیشہ اکبر کی جوہرشناسی کو مرحمت کے رستے پر کھینچ لاتی تھی۔ مگر دونوں کے خیالات کا اختلاف بیچ میں خاک اڑا کر کام خراب کر دیتا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ بڑے تامل سے ۵ ماہ کی اجازت ہوئی۔ رخصت کے وقت خواجہ نظام الدین نے عرض کی کہ ان کی ماں مر گئی ہے۔ عیال کی تسکین و تسلی کے لئے جانا ضرور ہے۔ رخصت دی مگر ناراضی کے ساتھ۔ سلام کے وقت صدر جہاں نے مکرر کہا۔ سجدہ بکن۔ وہ مجھ سے ادا نہ ہوا۔ فرمایا جانے دو۔ بلکہ رنجیدگی کے سبب سے کچھ دیا بھی نہیں +

غرض خواجہ نظام الدین شمس آباد اپنی جاگیر پر جاتے تھے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ وطن میں جا کر ایک کتاب لکھی۔ کہ نجات الرشید اس کا تاریخی نام ہے۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ خواجہ موصوف نے مجھے ایک فہرست گناہاں صغیرہ و کبیرہ کی دی۔ اور کہا کہ یہ بہت مجمل ہے۔ تفصیل اور با دلیل نہیں۔ تم اسے اس طرح لکھ دو کہ نہ بہت طولانی ہو نہ ایسی مختصر وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اس کی تعمیل واجب سمجھی وغیرہ وغیرہ +

آزاد - یہ مصنفوں کے معمولی بہانے ہیں۔ درحقیقت کتاب مذکور میں ان مسائل کی تفصیل ہے۔ جو ان دنوں میں علمائے دیندار یا اکبری دربار میں اختلافی شمار ہوتے تھے۔ اس میں مہدوی فرقہ کا حال بھی مفصل ہے۔ اسے اس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے کہ ناواقف انہیں بھی مہدویت پر مائل سمجھتے ہیں۔ مگر بات یہ ہے۔ کہ میر سید محمد جونپوری جنہوں نے اصل میں مہدویت کا دعوے کیا۔ ان کے داماد شیخ ابوالفضل گجراتی

سے مُلّا صاحب کو رابطہ اور کمال اعتقاد تھا۔ اور بعض ذکر شغل بھی ان سے حاصل کئے تھے۔ علاوہ بر آں فرقۂ مذکور کے بانی یا مجتہد کمال شدّت کے ساتھ مسائل شرعی کے پابند تھے۔ اور یہ ایسے لوگوں کے عاشق تھے۔ شاید اس لئے ان کی باتوں کو ہر جگہ اچھی طرح بیان کیا ہے +

اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ ۹۹۶ھ میں گھر میں بیمار ہوگیا اور بداؤں پہنچا۔ اہل و عیال کو بھی وہیں لایا۔ معالجہ کرتا رہا۔ مرزا پھر لاہور چلے آئے۔ میں گھر رہا۔ نامۂ خرد افزا دسنگھاسن بتیسی) کتاب خانے میں سے کھوئی گئی تھی سلیمہ سلطان بیگم نے برابر حضور میں تقاضا کرنا شروع کیا۔ اس کے لئے مجھے کئی دفعہ یاد کیا۔ ہرچند دوستوں کے قاصد بھی بداؤں پہنچے۔ مگر ایسے ہی سبب ہوئے کہ آنا نہ ہوا۔ حکم دیا کہ مدد معاش بند کر دو۔ اور آدمی بھیجو کہ گرفتار کر لائیں۔ مرزا ــــ مذکور کو خدا غریق رحمت کرے غائبانہ یار فروشیاں کیں۔ شیخ ابوالفضل نے مکرر عرض کی کہ کوئی ایسا ہی امر مانع ہوا ہوگا۔ ورنہ وہ تو رُکنے والا نہیں +

لکھتے ہیں کہ جب برابر حکم پہنچنے شروع ہوئے۔ تو بداؤں سے روانہ ہوا۔ حضور کشمیر کے سفر میں تھے۔ بھنبر کی منزل میں حاضر ہوا۔ حکیم ہمام نے عرض کی کہ کورنش کی آرزو رکھتا ہے۔ فرمایا کہ وعدے سے کتنے دن بعد آیا ہے۔ عرض کی۔ پانچ مہینے پوچھا کس تقریب سے۔ عرض کی بیماری کے سبب سے۔ اکابر بداؤں کا محضر اور حکیم عین الملک کی عرضی بھی اسی مضمون کی دلّی سے لایا ہے۔ سب کچھ پڑھ کر سنایا۔ فرمایا بیماری پانچ مہینے نہیں ہوتی۔ اور کورنش کی اجازت نہ دی۔ شاہزادہ دانیال کا لشکر رہتاس پر پڑا تھا۔ میں شرمندہ۔ افسردہ۔ دل مردہ۔ غمگین وہاں آن پڑا۔ ان دنوں شیخ فیضی دکن کی سفارت پر تھے۔ جب ان کی مصیبت کی خبر سُنی تو ایک عرایضہ سفارش میں لکھا۔ انشائے فیضی میں درج ہے +

عالم پناہا! درینولا وہ خویش مُلّا عبدالقادر از بداؤں مضطرب حال و گریبان دریاں رسیدہ وانمودند کہ مُلّا عبدالقادر چندگاہ بیمار بود و از موعدے کہ بدرگاہ داشتہ۔ متخلف شدہ و امراکساں بادشاہی بہ شدّت تمام بردہ اند تا عاقبتش کجا انجامد۔ گفتند کہ امتداد بیماری او بعرض اشرف نرسیدہ۔ شکستہ نوازا مُلّا عبدالقادر

اہلیت تمام دارد و علوم رسمی آنچہ ملایان ہندوستان میخوانند خواندہ - پیش وقت ابوی
کسب فضیلت کردہ و قریب بسی و ہفت سال - مے شود کہ بندہ او را مے دانم و با
فضیلت علمی طبع نظم و سلیقۂ انشائے عربی و فارسی و چیزے از نجوم ہندی و حساب
یاد داشت در ہمہ وادی وقوف در نغمۂ ولایت و ہندی و خبرے از شطرنج کبیر و صغیر
دارد و مشق بین بقدرے کردہ - باوجود بہرہ مند بودن ازیں ہمہ فضائل بہ بے طمعی و
قناعت و کم تردد نمودن - و راستی و درستی و ادب و نامرادی و شکستگی و گزشتگی و
بے تعینی و ترک اکثر رسوم تقلید و درستی اخلاص و عقیدت بدرگاہ بادشاہی موصوف
است وقتے کہ لشکر بر سر کونبھلمیر تعین مے شد او التماس نمودہ بامید جاں سپاری
رفت و آنجا تردد سے کرد و زخمی ہم شد و بعرض رسیدہ انعام یافت - لعل مرتبہ
او را جلال خاں قورچی بدرگاہ آوردہ بعرض رسانیدہ بود کہ من امامے برائے حضرت پیدا
کردہ ام کہ حضرت را خوش خواہد آمد - و میر فتح اللہ اند کے از احوال او بعرض اقدس
رسانیدہ بود و خدمت اخوی بر حال او مطلع اند - اما مشہور است ع

	جوے طالع زخروارے ہنر بہ	

چوں درگاہ راستانست - دریں وقت کہ بے طاقتی زور آوردہ - بندہ خود را
حاضر پایہ سریر والا دانستہ احوال او بعرض رسانید - اگر دریں وقت بعرض نمے
رسانید - نوعے از ناراستی و بے حقیقتی بود - حق سبحانہ بندہ ہائے درگاہ را در سایۂ فلک
پایۂ حضرت بادشاہ بر راہِ راستی و حق گزاری و حقیقت شناسی قدم ثابت کرامت فرماید
و آں حضرت را بر کلِ عالم و عالمیان سایہ گستر و شکستہ پرور و عطا پوش و خطا پوش بہزاران
ہزار دولت و اقبال و عظمت و جلال دیر گاہ داراد - بعزت پاکانِ درگاہ الٰہی و دردمندان
سحر خیز صبح گاہی - آمین - آمین ✢

یہ عریضہ اگرچہ بر وقت نہ پہنچ سکا - اُس وقت ڈاک نہ تھی - تار نہ تھا - مگر
جب لاہور میں آکر حضور میں پڑھا گیا تو سفارش کا انداز بہت پسند آیا - **شیخ ابوالفضل**
کو حکم دیا کہ **اکبر نامہ** میں نمونے کے طور پر داخل کردو - اور فاضل مذکور نے بھی اپنی
لیاقت کا سرٹیفکیٹ سمجھا - یہی سبب ہے کہ اپنی تاریخ میں بجنسہ نقل کر دیا ✢

غرض فاضل مذکور شاہزادہ کے لشکر میں آکر پڑے - لکھتے ہیں کچھ سمجھ میں نہ

آتا تھا کہ کیا کروں حصن حصین کا ختم اور قصیدۂ بردہ کا وظیفہ شروع کیا۔ اللہ بیکسوں اور بے قراروں کی خوب سُنتا ہے۔ الحمد للہ دُعا قبول ہوئی۔ پانچ مہینے بعد لشکر شاہی کشمیر سے پھرا۔ اور لاہور میں آکر خدا نے پھر بادشاہ کو مہربان کیا +

جامع رشیدی تاریخ کی ایک بڑی موٹی کتاب ہے۔ اس کا ترجمہ مطلوب تھا۔ یارانِ مشفق و موافق مرزا نظام الدین احمد وغیرہ نے مجلس خلوت میں غائبانہ میرا ذکر کیا۔ بارے ملازمت کا حکم ہؤا۔ مَیں حاضر ہؤا۔ ایک اشرفی نذر گزرانی۔ بڑی التفات سے پیش آئے۔ سب ندامت شرمساری۔ بعد دشواری۔ آسانی سے خدا نے رفع کر دی۔ الحمد للہ علےٰ ذالک۔ جامع رشیدی کے انتخاب کے لئے حکم ہؤا۔ کہ علامی شیخ ابوالفضل کی صلاح سے کرو۔ اس میں شجرہ خلفائے عباسیہ۔ مصریہ۔ بنی امیہ کا تھا۔ کہ آنحضرت پر ختم ہوتا ہے۔ اور وہاں سے حضرت آدم تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح تمام انبیائے اولوالعزم کے شجرے عربی سے فارسی میں لکھ کر حضور میں گزرانے اور خزانۂ عامرہ میں داخل ہوئے +

اسی سنہ میں لکھتے ہیں۔ کہ تاریخ الفی کے تین دفتروں میں سے دو تو ملا احمد رافضی علیہ ما علیہ نے اور تیسرا آصف خاں نے لکھا ہے۔ ملا مصطفےٰ کاتب لاہوری کہ یار اہل ہے۔ اور احدیوں میں ملازم ہے۔ اب مجھے حکم ہؤا تھا کہ اسے ساتھ لے کر پہلے دفتر کا مقابلہ اور تصحیح کرو۔ چنانچہ اسے بھی تمام کیا۔ شرف آفتاب کا جشن تھا۔ یہی نذرانہ گزرانا۔ اور تحسین کا درجہ پایا۔ فرمایا کہ اس نے بہت متعصبانہ لکھا ہے دفتر دوم کو بھی صحیح کرو۔ ایک برس اس میں بھی صرف کیا۔ مگر اپنے تعصب کی تہمت سے ڈر کر سلسلہ سال کو مسلسل کیا۔ مطالب سے متعرض نہیں ہؤا اور اصل کو ذرا نہیں بدلا کہ ایسا نہ ہو۔ اور جھگڑا اُٹھ کھڑا ہو۔ گویا مرض کو طبیعت پر چھوڑ دیا ہے کہ آپ دفع کرے گی +

لطیفہ۔ ایک شخص کو دیکھا کہ گٹھلیوں سمیت کھجوریں کھا رہا ہے۔ کسی نے پوچھا کہ گٹھلیاں کیوں نہیں پھینکتے۔ کہا کہ میری تول میں یونہی چڑھی ہیں۔ یہی حال میرا ہے کہ قسمت میں یونہی لکھا ہے +

اسی سال میں خواجہ ابراہیم کا انتقال ہؤا۔ یہ میرے دوستان خاص میں سے

تھے ۔ خواجہ ابراہیم حسین ہی اُن کی تاریخ ہوئی ۔ اللہ رحمت کرے ۔
اسی سال میں خداوند عالم نے توفیق دی ۔ کہ ایک قرآن مجید لکھ کر تمام کیا اور لوح جدول وغیرہ درست کر کے پیر و مرشد شیخ داؤد جہنی وال کی قبر پر رکھا ۔ اُمید ہے کہ اور کتابیں جو میرے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ ہیں ۔ یہ اُن کا کفّارہ اور مونس ایام حیات اور شفیع بعد ممات ہوگا ۔ اللہ رحم کرے تو کچھ بڑی بات نہیں +
۱۰۰۲ھ میں مصیبتوں کے کوڑے اور عبرتوں کے تازیانے ایسے لگے کہ جن لہو و لعب اور گناہوں میں اب تک مبتلا تھا اُن سے توبہ کی توفیق نصیب ہوئی ۔ اور خدا نے میری بداعمالی سے مجھے آگاہ کیا ۔ ع

آہ گر من چنیں بمانم آہ

نیک فالی کے طور پر **استقامت** اُس کی تاریخ کہی ۔ ملک الشعرا فیضی نے عربی میں قطعہ لکھا ۔ آخر کا شعر یہ ہے ؎

لقد تاب شیخی عن الحوبۃ   وتاریخہ ۔ سابق التوبۃ

مرزا نظام الدین خدمات بادشاہی میں قلیچ خاں جیسے کہنہ عمل سردار کے ساتھ لاگ ڈانٹ رکھتا تھا ۔ بادشاہ کے دل میں گھر کر لیا تھا ۔ اور نہایت چستی و چالاکی سے مہمات سلطنت کو سرانجام کرتا تھا حسن کفایت اور تدبیر اور اخلاص اور دیانت و عرق ریزی کے سبب سے بادشاہ بہت مرحمت اور اعتماد فرمانے لگے تھے ۔ چنانچہ قلیچ خاں اور اور امرا کو کہ مزاج میں دخل رکھتے تھے اور درگاہ سے جدا نہ ہو سکتے تھے ۔ اِدھر اُدھر بھیج دیا ۔ اور اس کے لئے ابتدائی رعایت خیال کیا تھا ۔ عنایت گوناگوں کے ارادے تھے چاہتے تھے کہ اس کا جوہر عالی جو قابل نشو و نما ہے صحرائے ظہور میں نکالیں ۔ یکایک عین ترقی اور اوج کار و بار میں چشم زخم عظیم پہنچی ۔ کہ اپنے بیگانے کسی کو اُمید نہ تھی ۔ تپ محرقہ سے ۴۵ برس کی عمر میں عالم بے وفا سے گزر گیا ۔ اور نام نیک کے سوا کچھ ساتھ نہ لے گیا ۔ اُس کے حُسن اخلاق دیکھ کر بہت سے احباب کو اُمیدیں تھیں ۔ خصوصاً مجھ حقیر کو کہ یگانگی دینی اور اخلاص دلی رکھتا تھا ۔ جو اغراض دنیا سے پاک ہے ۔ آنکھوں سے اشکِ حسرت بہائے ۔ سنگ نااُمیدی سینے پر مارا ۔ انجام کو صبر و شکیبائی کے سوا چارہ نہ دیکھا ۔ کہ اہلِ صفا کی خصلت اور پرہیزگاروں کی عبادت ہے ۔ اور اس واقعہ کو

سخت ترین مصائب جان کر عبرت کُلّی سمجھا۔ اب کسی سے رفاقت و محبّت نہ کرونگا۔ گوشۂ گمنامی اختیار کیا ؎

مجلسِ وعظ رفتنت ہوس است	مرگِ ہمسایہ واعظِ تو بس است

دریائے راوی پر پہنچے تھے۔ کہ کشتی حیات کنارے لگ گئی۔ یہ واقعہ ۲۳ر صفر ۱۰۰۳ھ میں ہوا۔ جنازہ لشکر سے لاہور لائے۔ اور اُسی کے باغ میں دفن کیا۔ خاص و عام میں کم اشخاص ہوں گے۔ جو اُس کے جنازے پر نہ روئے ہوں گے۔ اور اُس کے اخلاقِ کریم کو یاد کر کے بے قرار نہ ہوئے ہونگے۔ مُلّا صاحب کی نظم دیکھو فرماتے ہیں ؎

بر ہیچ آدمی اجل ابقا نمے کند	سلطان قہر ہیچ محابا نمے کند
عام است حکمِ میر اجل بر جہانیاں	ایں حکم بر من و تو بہ تنہا نمے کند

یہ قطعہ تاریخ میں ہوا ؎

رفت مرزا نظام الدین احمد	سوئے عقبیٰ و جست ز یبا رفت
جوہرِ او ز بسکہ عالی بود	در جوارِ ملک تعالےٰ رفت
قادری یافت سال تاریخش	گوہرے بے بہا ز دنیا رفت

اُنھوں نے بھی ہندوستان کی تاریخ لکھی تھی جس میں اکبر کا ۳۸ برس کا حال بہ تفصیل ہے۔ اور طبقات اکبری نام ہے۔ مُلّا صاحب نے نظامی ۱۰۰۱ھ سے اس کی تاریخ لکھی اور تاریخ نظامی نام رکھا۔ صاف صاف حالات بے مبالغہ و عبارت آرائی لکھے ہیں۔ جن سے معاملات و مہمات کی اصلیت واضح ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ کسی سے خوش ہیں۔ نہ خفا ہیں۔ جو جس کی بات ہے جوں کی توں درج کر دی ہے ✦

اسی سال میں لکھتے ہیں۔ کہ چالیسواں سال جلوس کا شروع ہوا۔ جشن کے موقع پر تحویل سے دو دن پہلے دیوان خاص میں۔ جھروکے پر بیٹھے تھے۔ مجھے بلایا۔ میں اُدھر گیا۔ آگے بُلایا اور شیخ ابوالفضل سے کہا۔ ہم تو شیخ عبد القادر کو جوان فانی۔ صوفی مشرب سمجھے ہوئے تھے۔ وہ تو ایسا فقیہ متعصّب نکلا۔ جس کے تعصّب کی رگِ گردن کو کوئی تلوار کاٹ ہی نہیں سکتی۔ شیخ نے پوچھا۔ حضور کس کتاب میں؟

کیا لکھا ہے کہ حضور ایسا فرماتے ہیں۔ فرمایا اسی رزم نامہ میں (مہابھارت) ہم نے رات کو نقیب خاں کو گواہ کر دیا۔ اُس نے کہا تقصیر کی۔ مَیں نے آگے بڑھ کر عرض کی۔ فدوی فقط مترجم تھا۔ جو دانایان ہندی نے بیان کیا بے تفاوت ترجمہ کر دیا۔ اگر اپنی طرف سے لکھا تو تقصیر کی اور بہت بُرا کیا۔ شیخ نے یہی مطلب عرض کر دیا۔ چپکے ہو رہے +

اس اعتراض کا سبب یہ تھا۔ کہ مَیں نے ایک حکایت رزم نامہ میں لکھی تھی۔ مضمون یہ کہ ہندوؤں میں سے ایک پنڈت نزع کے وقت لوگوں سے کہتا تھا۔ آدمی کو چاہئے کہ جہل اور غفلت کی حد سے قدم بڑھا کر سب سے پہلے صانع بیچوں کو پہچانے اور عمل کا رستہ چلے اور فقط علم بے عمل پر نہ رہے کہ اس کا کچھ نتیجہ نہیں۔ نیک طریقہ اختیار کرے اور جتنا ہو سکے گناہوں سے باز رہے۔ یقین جانے کہ ہر کام کی پرسش ہوگی۔ یہیں مَیں نے یہ مصرع بھی لکھ دیا تھا + ع

ہر عمل اجرے و ہر کردہ جزائے دارد

اسی کو کہا کہ منکر نکیر۔ حشر۔ نشر۔ حساب۔ میزان وغیرہ سب کو درست لکھ دیا ہے۔ اور آپ جو تناسخ کے سوا کسی چیز کے قائل نہیں۔ اسے اُس کی مخالفت قرار دیا اور مجھے تعصب اور فقاہت کے ساتھ متہم کیا + ؎

تا کے ملامت مژۂ اشکبار من	یکبار ہم نصیحت چشم سیاہ خویش

آخر میں مقربانِ درگاہ کو سمجھایا کہ ہندو جزا۔ سزا اور اچھے بُرے کاموں کے قائل ہیں۔ ان کا اعتقاد یہ ہے۔ کہ جب کوئی مرتا ہے تو لکھنے والا جو عمر بھر اُس کے اعمال لکھتا رہا ہے۔ قابض ارواح فرشتہ کے پاس لے جاتا ہے۔ اس کا نام بادشاہ عدل ہے۔ وہ بھلائیوں بُرائیوں کا مقابلہ کر کے کمی بیشی نکالتا ہے۔ پھر مرنے والے سے پوچھتے ہیں کہ پہلے بہشت میں چل کر آرام کی نعمتیں لو گے یا دوزخ میں چل کر عذاب سہو گے۔ جب دونوں درجے طے ہو چکتے ہیں تو حکم ہوتا ہے۔ کہ پھر دنیا میں جاؤ وہ ایک قالب مناسب حال اختیار کر کے زندگی بسر کرتا ہے۔ اور اسی طرح دورے کرتا رہتا ہے۔ اخیر کو نجات مطلق پاتا ہے۔ اور آواگون سے چھوٹ جاتا ہے۔ غرض یہ معرکہ بھی خیریت سے گُذر گیا +

شرف آفتاب کے دن صدر جہاں سے کہا کہ روضۂ منوّرہ خواجہ اجمیر پر کوئی متوّلی نہیں ہے۔ فاضل بدایونی کو کر دیں تو کیسا ہے؟ کہا بہت خوب ہے۔ دو تین مہینے تک دربار کی خدمت میں بہت دوڑتا پھرا کہ ان سرگردانیوں سے چھوٹ جاؤں۔ کئی دفعہ عرضیاں بھی لکھیں۔ جواب ہی پر موقوف رہا۔ میرا دل یہی چاہتا تھا۔ کہ رخصت لوں اور فرشتۂ غیب کہتا تھا ؎

گر دست در کارے زنی زنجیر در دستت نہم	در خمّ مے غرقت کنم گر نام ہشیاری بری

عید کی شب کو صدر جہاں نے عرض کی کہ اس کی رخصت کے باب میں کیا حکم ہے۔ فرمایا یہاں اسے بہت کام ہیں۔ کبھی کبھی خدمت نکل آتی ہے۔ کوئی اور آدمی ڈھونڈھ لو۔ ارادۂ الٰہی اس امر پر نہ آیا۔ خدا جانے اس دربدری اور سگ مگسی میں کیا مصلحت ہے ؎

از درِ خویش مرا بر درِ غیرے ببری	باز گوئی کہ چرا بر درِ غیرے گزری
سالہا در طلبِ روئے نکو در بدرم	روئے بنماؤ خلاصم کن ازیں دربدری

انہیں دنوں میں میرے سامنے ایک دن شیخ ابوالفضل سے کہا۔ کہ اگرچہ فاضل بداؤنی اجمیر کی خدمت بھی خوب کر سکتا ہے۔ مگر ہم ترجمہ کے لئے انہیں اکثر چیزیں دیتے ہیں۔ یہ خوب لکھتا ہے۔ اور ہماری خاطر خواہ لکھتا ہے۔ جدا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ شیخ نے بھی اور اور امرا نے بھی تصدیق کی۔ اُسی دن حکم دیا۔ کہ باقی افسانۂ ہندی کہ سلطان زین العابدین بادشاہ کشمیر کے حکم سے تھوڑا سا ترجمہ ہؤا ہے۔ اور بہت سا باقی ہے۔ اور **بحر الاسماء** اس کا نام رکھا ہے۔ اُسے ترجمہ کر کے پُورا کر دو۔ چنانچہ اخیر جلد کہ ساٹھ جزو ہیں ۵ مہینے میں تمام کر دی۔ انہی دنوں میں ایک شب خوابگاہ خاصہ میں پایہ تخت کے پاس بُلایا۔ صبح تک مقدمات مختلفہ میں باتیں کرتے رہے پھر فرمایا کہ **بحر الاسماء** کی پہلی جلد جو سلطان زین العابدین نے ترجمہ کرائی تھی اُس کی فارسی قدیم غیر متعارف ہے۔ اسے بھی مانوس عبارت میں لکھو۔ اور جو کتابیں تم نے لکھی ہیں اُن کے مسودے تم آپ رکھو۔ مَیں نے زمین بوس کر کے دل و جان سے قبول کیا اور کام شروع کیا۔ (مبارک ہو زمیں بوس کی قسم ٹوٹی) بادشاہ نے بہت عنایت کی۔ ۱۰ ہزار تنکہ مرادی دیئے۔ اور گھوڑا انعام فرمایا۔ انشاء اللہ یہ کتاب جلد اور خوبصورتی کے ساتھ

دو تین مہینے میں تیار ہو جائیگی - اور وطن کی رخصت جس پر جان دے رہا ہوں وہ بھی حاصل کرونگا - اللہ بڑا قادر ہے اور قبولیت اُسے سزاوار ہے +

افسوس اب وہ زمانہ آیا کہ ان کے رفیقوں کے خیمے ڈیرے چلے جاتے ہیں - اور یہ افسوس کر رہے - ۱۰۰۳ھ کے اخیر میں رو رو کر کہتے ہیں - دو دلی دوست اور چلے گئے - شیخ یعقوب کشمیری صیرفی تخلص درگاہ سے رخصت لے کر وطن گئے تھے مر گئے إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

یاراں ہمہ رفتند و در کعبہ گرفتند
از نکتۂ مقصود نشد فہم حدیثے
ما شُست قدم بر درِ خمار بماندیم
لَا دین وَلَا دُنیا بے کار بماندیم

۲۷ ذی الحجہ کو حکیم عین الملک کہ راجی علی خاں کے پاس ایلچی بن کر گئے تھے - وہاں سے رخصت ہو کر ہنڈیہ میں آئے - (یہ ان کی جاگیر تھی) یہیں سے سفر آخرت اختیار کیا - (ان کی امداد جلال خاں قورچی کی وساطت سے ملّا صاحب حضور میں پہنچے تھے) +
سبحان اللہ یار دوست ایک ایک کو دیکھتا ہوں کہ صحبت سے بیزار ہو کر سُبکسار منزل آخرت کو دوڑ گئے - اور دوڑے جاتے ہیں - ہم اُسی بیدلی اور پریشانی میں انجام کار سے غافل ہو کر بیہودگی میں عمر برباد کر رہے ہیں - قطعہ

اے دل چو آگہی کہ فنا در پئے بقاست
با روزگار عہد تو بستی نہ روزگار
این آرزوے دور و دراز از پئے چراست
پس این نفیر چیست کہ ایام بیوفاست

محرم ۱۰۰۴ھ میں حکیم حسن گیلانی نے بھی قضا کی - نہایت درویش نہاد - مہربان - خلاص شخص تھا - رُباعی

بے خار اگر گلے میسّر بودے
زیں کُہنہ سرائے زندگانی مارا
ہردم بہ جہاں لذّتِ دیگر بودے
خوش بودے اگر نہ مرگ بر در بودے

انہی دنوں میں چند اشخاص اخلاص چہارگانہ کے ساتھ مریدوں میں داخل ہوئے - ڈاڑھیوں کو بھی صفائی بتائی - ان میں کوئی تو ایسے عالم تھے کہ اپنے تئیں فاضل سمجھتے تھے - کوئی خرقہ پوش خاندانی مشائخ تھے - کہ کہتے تھے ہم حضرت غوث الثقلین کے فرزند ہیں - اور ہمارے شیخ طریقت نے فرمایا ہے - کہ بادشاہ ہند کو لغزش ہوئی ہے - تم جا کر بچاؤ گے وغیرہ وغیرہ - ملّا صاحب ان کا خوب خاکہ اُڑاتے ہیں - اور ان کی

مُنڈی ڈاڑھیوں میں خاک ڈال کر کہتے ہیں۔ کہ موتراش چند تاریخ ہوئی +

اسی سنہ میں ۱۰ صفر کو شیخ **فیضی** نے بھی انتقال کیا۔ ان کے مرنے کا حال بہت خرابی کے ساتھ لکھ کر کہتے ہیں۔ کہ چند ہی روز میں حکیم **ہمام** بھی دنیا سے گئے دوسرے ہی دن **کمالائے صدر** بھی۔ دونوں کے گھروں پر اُسی وقت بادشاہی پہرے بیٹھ گئے۔ اور مال خانے مُقفل ہو گئے۔ ان کے مُردے کفن کے چیتھڑے کو محتاج تھے۔ یہاں تاریخ کو ختم کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ حال تھے ان بعض اجزا کے جن جزوں سے زمانہ مرکب تھا۔ کہ صفر ۱۰۰۴ھ مطابق سال چہلم جلوس بسبیل اجمال مجھ شکستہ دل کے قلم شکستہ رقم سے مرقوم ہوا۔ اور بغیر خلاف کے بے تکلف عبارت کی لڑی میں پرو دیا۔ باوجودیکہ تفصیل کے لحاظ سے دریائے عماں میں سے ایک بُلبلا ہے۔ اور ابر باراں سے ایک قطرہ ہے۔ مگر جو کچھ لکھا ہے سمجھ کر اور رقم خلل سے بچا کر لکھا ہے الّا ماشاء اللہ ؎

مراد ما نصیحت بود گفتیم		حوالت باخدا کردیم و رفتیم	

چونکہ تاریخ نظامی کے مصنف نے امرائے عہد کے حال بھی لکھے ہیں۔ جن میں سے اکثر مرحوم چلے گئے۔ مَیں نے اُن فضولیوں کے ذکر سے زبانِ قلم کو آلودہ نہیں کیا ؎

من وفائے نہ دیدہ ام زکساں		گر تو دیدی دعائے ما برساں	

خاتمہ کتاب میں لکھتے ہیں۔ روز جمعہ ۲۳ جمادی الثانی ۱۰۰۴ھ میں طول کلام کو کوتاہی دے کر اتنے پر بس کرتا ہوں۔ تاریخ عمل نخرجہ سے نکالی ؎

شکر للہ کہ بہ تمام رسید		منتخب از کرم ربانی	
سال تاریخ زدل جستم گفت		انتخابے کہ ندارد ثانی	

افسوس یہ ہے۔ کہ اسی سال میں کتاب تمام کی اور اسی سال کے اخیر میں خود تمام ہو گئے۔ ۵۷ برس کی عمر تھی۔ وطن بہت پیارا تھا۔ وہیں مرے وہیں پیوند خاک ہو گئے ؎

آخر گل اپنی خاک درمیکدہ ہوئی	پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ایسے صاحب کمال اور کمال آفرین لوگوں کا مرنا نہایت افسوس کا مقام ہے۔
اُنہوں نے اپنے معاصروں کا غم کس کس خوبصورتی سے کیا۔ کوئی نہ تھا کہ ان کی خوبی کے لائق ان کا افسوس کرتا۔ ان کے مرنے پر افسوس کرنا کمال کی لاوارثی پر افسوس کرنا ہے۔

خوشگوار نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ **باغ انبہ** واقع **عطاپور** نواح **بدایوں** میں دفن ہوئے۔ مَیں کہتا ہوں کہ اُس وقت یہ نام اور مقام ہونگے اب شہر سے دور ایک کھیت میں تین چار قبریں۔ اُن پر تین چار درخت آم کے ہیں۔ اور یہ **مُلّا کا باغ** کہلاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انہی میں مُلّا صاحب کی قبر بھی ہے غالباً **خوشگوار** کے بعد یہ مقام کبھی **مُلّا کا باغ** بھی کہلایا ہوگا۔ **عطاپور** اور **باغ انبہ** کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ البتہ جس محلے میں اُن کے گھر تھے۔ اب بھی لوگوں میں زبان زد ہے اور **پتنگی ٹیلہ** کہلاتا ہے **سید بارہ** میں ہے۔ مگر ٹیلہ یا گھر کا اثر آثار کچھ نہیں۔ وہاں کے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اولاد کا سلسلہ ایک بیٹی پر ختم ہو گیا تھا اور اُسکی نسل **خیرآباد** علاقہ **اودھ** میں باقی ہے۔

اکبر کے عہد میں اس کتاب نے رواج نہ پایا۔ مُلّا صاحب نے بڑی احتیاط سے مخفی رکھی تھی۔ **جہانگیر** کے زمانے میں چرچا ہوا۔ بادشاہ نے بھی دیکھی۔ حکم دیا کہ اس نے میرے باپ کو بدنام کیا ہے۔ اس کے بیٹے کو قید کرو۔ اور گھر کو لُوٹ لو۔ چنانچہ جو وارث تھے گرفتار آئے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم تو اُس وقت خُرد سال تھے۔ ہمیں خبر نہیں۔ اُن سے مچلکے لئے کہ ہمارے پاس سے نکلے تو جو چاہو سزا دو۔ کتب فروشوں سے مچلکے لئے۔ کہ یہ تاریخ نہ خریدیں نہ بیچیں۔ خافی خاں نے شاہجہان سے محمد شاہ تک زمانہ دیکھا ہے۔ وہ حال مذکور لکھ کر کہتا ہے۔ تعجب ہے کہ باوجود اس تشدد کے خاص دارالخلافہ میں کتب فروشوں کی دُکانوں پر سب سے زیادہ بداؤنی ہی نظر آتی ہے۔ بادشاہ کی اس خفگی کی شہرت عام ہو گئی تھی۔ اس لئے قاسم فرشتہ۔ شیخ نورالحق دہلوی (ولد شیخ عبدالحق محدث دہلوی) اور مؤلف تاریخ زبدۃ تین مؤرخ جہانگیری عہد میں تاریخ لکھ رہے تھے۔ کسی نے اس ذکر سے قلم کو آشنا نہیں کیا۔

شیخ ابوالفضل

۶ محرم ۹۵۸ھ اسلام شاہ کا عہد تھا۔ کہ شیخ مبارک کے گھر میں مبارک سلامت کا چرچا ہُوا۔ ادب نے آنکھ دکھائی کہ خاموش! دیکھو! ادب و دانش کا پُتلا پردۂ شکم سے نکل کر ماں کی گود میں آن لیٹا۔ باپ نے اپنے اُستاد کے نام پر بیٹے کا نام ابوالفضل رکھا۔ مگر وہ فضل و کمال میں اُس سے کئی آسمان اوپر چڑھ گیا۔ اور جاہ و جلال کا تو کیا کہنا ہے۔ شیخ مبارک کا حال بھی پڑھ ہی چکے ہو۔ یاد کر لو۔ کہ کیسی تکلیف اور مصیبت میں پرورش پائی ہوگی۔ طالب علمی کا سارا زمانہ۔ افلاس کی نحوست۔ دل کی پریشانی اور دشمنوں کی ایذائیں سہہ کر گزرا۔ مگر وہ لاعلاج صدمے اس کے۔ لئے روز نیا سبق اور تعلیم کی مشق تھے۔ جب اس طرح صبر اور برداشت کرتے ہیں۔ اور اس سلامت روی سے رستہ چلتے ہیں تب اکبر جیسے شہنشاہ کی وزارت تک پہنچتے ہیں۔ اُس نے مبارک باپ کے دامن میں پل کر جوانی کا رنگ نکالا۔ اور اُسی کے چراغ سے چراغ جلا کر قندیل عقل کو روشن کیا۔ اس زمانہ میں مخدوم اور صدر وغیرہ علماء بادشاہی بلکہ خدائی اختیار رکھتے تھے۔ جُوں جُوں اُن کے جابرانہ احکام اور سینہ زور فتوے جاری ہوتے تھے۔ اس کی تحصیل ذوق اور مطالعہ کا عرق ریز شوق زیادہ ہوتا تھا۔ اقبال جوش و خروش کر رہا تھا۔ اور حال استقبال کو کھینچتا تھا۔ کہ حریفوں کی فنا میں کیوں دیر کر رہا ہے۔

ابوالفضل نے اکبر نامہ کا دفتر سوم لکھ کر خاتمہ میں اپنی ابتدائی تعلیم کا حال کچھ زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اگرچہ اُس میں بہت سی باتیں فضول معلوم ہونگی لیکن ایسے لوگوں کی ہر بات قابل سننے کے ہے۔ اس واقعہ نویس کے ہاتھوں کو بوسہ دیجیے کہ اُس نے جس طرح ہر شخص کے حالات کھُلم کھُلا لکھے۔ اسی طرح اپنے سفید و سیاہ کو بھی صاف ہی دکھایا۔ انسان آخر انسان ہے۔ اس پر مختلف اوقات میں مختلف حالتیں گزرتی ہیں۔ البتہ نیک طبع لوگ اُس سے بھی نیکی کا سبق لیتے

ہیں۔ ویو طبع انسان صورت پر پھسلتے ہیں اور دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔

ابتدائی حالات

برس سوا برس کی عمر میں خدا نے کرم کیا۔ کہ صاف باتیں کرنے لگا۔ پانچ برس کا تھا۔ کہ قدرت نے استعداد کی کھڑکی کھول دی۔ ایسی باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ جو اوروں کو نصیب نہیں ہوتیں۔ پندرہ برس کی عمر میں پدر بزرگوار کے خزائن عقل کا خزانچی اور جواہر معانی کا پہرہ دار ہو گیا۔ اور خزانہ پر پاؤں جما کر بیٹھ گیا۔

تعلیمی مطالب سے سدا دل مرجھاتا تھا۔ اور زمانہ کی رسموں سے طبیعت کوسوں بھاگتی تھی۔ اکثر تو کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ والد اپنے ڈھب سے عقل و دانش کے منتر پھونکتے تھے۔ ہر فن میں ایک رسالہ لکھ کر یاد کرواتے تھے۔ اگرچہ ہوش بڑھتا تھا۔ مگر مکتب علم کا کوئی مطلب دل کو نہ لگتا تھا۔ کبھی تو ذرا بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اور کبھی شبہے رستہ روکتے تھے۔ اور زبان یاوری نہ کرتی تھی۔ کہیں رُکا ڈہکلا کر دیتا تھا۔ تقریر کا بھی پہلوان تھا۔ مگر بیان نہ کر سکتا تھا۔ لوگوں کے سامنے آنسو نکل پڑتے تھے۔ اور اپنے تئیں آپ ملامت کرتا تھا (اسی دفتر میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں) جو اہل علم کہلاتے ہیں۔ اُنہیں بے انصاف پایا۔ اس لئے تنہائی اور غربت کو جی چاہتا تھا دن کو مدرسہ میں عقل کا نور پھیلاتا۔ رات کو ویرانوں میں جاتا۔ کوچۂ نامرادی کے دیوانوں کو ڈھونڈھتا اور ان مفلس خزانچیوں سے ہمّت کی گدائی کرتا۔

اس عرصہ میں ایک طالب علم سے محبّت ہو گئی۔ کچھ عرصہ تک خیال اُدھر لگا رہا۔ چند روز نہ گذرے تھے کہ اُس کی ہمزبانی اور ہمنشینی کے لئے دل مدرسہ کی طرف کھنچنے لگا۔ اُچاٹ دل اور اُکھڑی ہوئی طبیعت اُدھر جھک پڑی۔ قدرت کا طلسمات دیکھو کہ مجھ کو اُڑا دیا۔ اور کو لے آئے۔ دگو یا ئیں۔ ئیں نہ رہا بالکل بدل گیا۔ ہاشر باعی

در دیر شدم ماحضرے آوردند	لیعنی ز شراب ساغرے آوردند
کیفیّتِ ادمرا زخود بے خود کرد	بُردند مراؤ دیگرے آوردند

حکمت کی حقیقتوں نے چاندنی کھلا دی۔ جو کتاب دیکھی بھی نہ تھی پڑھنے سے زیادہ روشن ہو گئی۔ اگرچہ خاص عطائے الٰہی تھی۔ نعمت نے عرش مقدّس سے

نزول کیا تھا۔ لیکن پدر بزرگوار نے بڑی مدد کی۔ اور تعلیم کا تار ٹوٹنے نہ دیا۔ کشائش طبع کا بڑا سبب وہی بات ہوئی۔ دس برس تک آپ کہتا رہا۔ اوروں کو سُناتا رہا۔ دن رات کی بھی خبر نہ ہوئی۔ معلوم نہ تھا کہ بھوکا ہُوں یا پیٹ بھرا ہے۔ خلوت میں ہوں کہ صحبت میں۔ خوشی ہے یا غم ہے۔ نسبتِ الٰہی اور رابطۂ علمی کے سوا کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ نفسانی دوست حیران ہوتے تھے۔ کیونکہ دو دو تین تین دن غذا نہ پہنچتی تھی وہ عقل کا بھوکا تھا۔ کچھ پروا نہ ہوتی تھی۔ ان کا اعتقاد بڑھتا تھا کہ ولی ہو گئے۔ مَیں جواب دیتا تھا کہ تمھیں عادت کے سبب سے تعجب آتا ہے۔ ورنہ دیکھو کہ بیمار کی طبیعت مرض کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ تو کیونکر کھانے سے بے پروا ہوتی ہے۔ اُس پر کسی کو تعجب نہیں آتا۔ اسی طرح دل اندر سے کسی کام میں لگ جائے اور سب کچھ بُھلا دے تو تعجب کیا ہے +

بہت کتابیں کہتے سُنتے حفظ ہو گئیں۔ علوم کے عالی عالی مطالب کہ پُرانے ورقوں میں پڑے پڑے گھس پس گئے تھے۔ صفحۂ دل پر روشن ہونے لگے۔ ابھی دل لگی نے وہ پردہ بھی نہ کھولا تھا۔ اور بچپن کی پستی سے عقل کی بلندی پر بھی نہ چڑھا تھا۔ اسی وقت سے متقدمین پر اعتراض سوجھتے تھے۔ لڑکپن پر نظر کر کے لوگ مانتے نہ تھے۔ میرا دل جھنجلاتا تھا۔ تجربہ نہ تھا۔ طبیعت میں جوش آتا مگر پی جاتا تھا۔ ابتدائی طالب علمی میں جو اعتراض کہ مَیں مُلّا سعد الدین اور میر سید شریف پر کیا کرتا تھا۔ بعضے دوست لکھتے جاتے تھے۔ یکبارگی مطوّل پر خواجہ ابو القاسم کا حاشیہ آیا۔ اس میں وہ اعتراض موجود پائے۔ سب حیران رہ گئے۔ انکار سے باز آئے۔ اور اَور نظر سے دیکھنے لگے اب وہ شندان کا روزن مِل گیا۔ اور معرفت کا دروازہ کھُلا +

ابتدا میں جب میں نے پڑھانا شروع کیا۔ تو حاشیۂ اصفہانی کا ایک نسخہ مِلا۔ کہ آدھے سے زیادہ صفحے دیمک کھا گئی تھی۔ لوگ مایوس کہ نکما ہے۔ مَیں نے اوّل گلے سڑے کنارے کتر کر پیوند لگائے۔ صبح نور و ظہور کے وقت بیٹھنا عبارت کی ابتدا انتہا دیکھنا۔ ذرا سوچنا اور ہر جگہ مطلب کھُل جاتا۔ اُسی کے بموجب مسودہ کر کے عبارت جماتا۔ اور اُسے صاف کر دیتا۔ اُنہیں دنوں میں وہ پوری کتاب بھی مِل گئی۔ مقابلہ کیا تو ۳۲ جگہ مترادف لفظوں کا فرق تھا۔ اور تین چار جگہ قریب قریب۔

سب دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ محبت کی دل لگی جتنی زیادہ ہوتی تھی۔ اتنی ہی روشنی دل کو زیادہ روشن کرتی تھی۔ بیس برس کی عمر میں آزادی کی خوشخبری پہنچی۔ اُس سے بھی دل بھر گیا۔ اب پہلا جنون شروع ہوا۔ علوم و فنون آراستگی پر۔ جوانی کی اُمنگ کا زور شور۔ دعووں کا دامن پھیلا ہوا۔ دانش و بینش کا آئینہ جہاں نما ہاتھ میں تھا۔ نئے جنون کا غُل کان میں پہنچنے لگا۔ اور ہر کام سے رُکنے کے لئے زور کرنے لگا۔ اُن دنوں میں شہنشاہ روشن دل نے مجھے یاد فرما کر چھپاؤ کے گوشہ سے گھسیٹا وغیرہ وغیرہ +

آزاد۔ ابوالفضل نے باپ کے ساتھ دشمنوں کے ہاتھ سے بڑے بڑے صدمے اُٹھائے۔ اخیر کا حملہ سب سے زیادہ سخت تھا۔ اُس کی کچھ تفصیل۔ شیخ مبارک کے حال میں لکھی گئی ہے۔ مُلا کی دوڑ مسجد تک۔ شیخ مذکور تو قسمت کے دکھ بھر کر پھر اپنی مسجد میں آن بیٹھے۔ اُس پیر نورانی کو درباروں سرکاروں کا کبھی شوق نہیں ہوا تھا۔ مگر ہونہار جوانوں کو اقبال نے بیٹھنے نہ دیا۔ ان کے دلوں میں اظہار کمال کا جوش ہوا۔ اور سچ بھی ہے۔ چاند سورج اپنی روشنی کیونکر سمیٹ لیں لعل و یاقوت آب و تاب کو کس طرح پی جائیں۔ چنانچہ ۹۷۴ھ میں شیخ فیضی باریاب حضور ہوئے ۹۸۱ھ ۲۰ برس کی عمر تھی۔ کہ ابوالفضل پر بھی خدا کا فضل ہوا۔ اور دیکھو کہ اُنھوں نے اس عالم میں اس نعمت کو کس سلیقہ کے ساتھ سنبھالا +

ابوالفضل دربارِ اکبری میں آتے ہیں۔

اکبری سلطنت پھیلتی جاتی تھی اور سلطنت انتظام اور قانون انتظام کی محتاج تھی۔ خصوصاً اس سبب سے کہ طالب انتظام قدیمی قانون انتظام کو بدلنا اور وسعت دینا چاہتا تھا۔ اور ملک کو فقط تلوار سے پھیلانا مصلحت نہ دیکھتا تھا۔ بلکہ اہل ملک کے ساتھ مل کر تقویت دینا چاہتا تھا۔ جو قوم اور مذہب اور رسم و رواج کل باتوں میں مخالف تھے۔ اس کے علاوہ تُرک جو خود اپنی قوم تھی۔ اُس سے اس کا دل بے اختیار اور بیزار تھا۔ دربار پر مذہبی علماء اور پرانے خیالوں کے امرا چھائے ہوئے ہوئے تھے۔ نئی بات تو درکنار۔ کوئی مناسب وقت تبدیلی ہوتی۔ تو ذرا سی بات پر

چمک اُٹھتے تھے۔ اور اس میں بے اختیاری اور بے عزتی سمجھتے تھے۔ ملک پرور بادشاہ نے اسی واسطے ایک مکان عالیشان بناکر چار ایوان نام رکھا۔ اور علما اور اہل طریقت اور امرا وغیرہ کے گروہ قرار دے کر رات کو جلسہ مقرر کیا۔ کہ شاید مصلحت وقت اور امر مناسب پر اتفاق رائے پیدا ہو۔ ان لوگوں میں مباحثوں اور مناظروں سے اور آپس کے رشک و حسد سے خود آپس میں جھگڑے پڑنے لگے۔ کسی مسئلہ کا حال نہ کُھلتا تھا۔ کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ ہر چند ایک ایک کو ٹٹولتا تھا۔ اور تقریروں اور تجویزوں کے چقماق کو ٹکراتا تھا۔ مگر اصلیت کا پتنگا نہ چمکتا تھا۔ دق ہوتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ اس عرصہ میں ملّا صاحب پہنچے۔ انہوں نے جوانی کے جوش۔ ناموری اور ترقی کے شوق میں اکثروں کو توڑا۔ اور ایسے آثار دکھلائے جس سے معلوم ہؤا کہ نئے دماغوں میں نئے خیال پیدا ہونے کی اُمید ہو سکتی ہے۔ اس نوجوان کے خیالات کا چرچا بھی پھیل رہا تھا۔ اور جس چشمہ سے ملّا صاحب نے سیرابی پائی تھی۔ وہ اُسی کی مچھلی تھا۔ بڑا بھائی خود دربار میں موجود تھا۔ اقبال نے اُسے دربار کی طرف جذب مقناطیس کے زور سے کھینچا۔ اگرچہ اس میدان میں اس کے موروثی خونخواروں کا ہجوم تھا۔ مگر یہ بھی موت سے کُشتیاں لڑتا۔ قسمت کی نحوستوں کو ریلتا دھکیلتا۔ دربار میں جا ہی پہنچا۔ خدا جانے فیضی نے کسی موقع پر عرض کی یا کسی سے کہلوایا۔ غرض چراغ سے چراغ روشن ہؤا۔ چنانچہ خود اکبر نامہ میں لکھا ہے اور اپنے ابتدائی خیالات کا نئے رنگ سے نقشہ کھینچا ہے*

۹۸۱ھ انیسواں سال جلوس تھا۔ کہ اس نگار نامہ کے نقشبند ابو الفضل مبارک نے درگاہِ مقدس میں سر جھکا کر رتبہ کو بلند کیا۔ عالمِ خلوت کے پیٹ سے نکل کر پانچ برس میں رسمی تمیز حاصل ہوئی۔ صورت و معنی کے باپ نے تربیت کی نظر سے دیکھا۔ ۱۵ برس کی عمر میں فنون حکمی اور علوم نقلی سے آگاہ ہو گیا۔ اگرچہ اُنھوں نے دانش کا دروازہ کھول دیا۔ اور دربار حکمت میں بار ملی۔ مگر بخت کی بے یاری سے خود بینی اور خود آرائی میں تھا۔ چند روز رونق اور بھیڑ بھاڑ پیدا کرنے میں کوشش رہی۔ طالبان دانش کے ہجوم نے غور کا سرمایہ بہت بڑھایا۔ اور اس فرقہ کو بے تمیز اور بے انصاف پایا۔ اس لئے خیال ہؤا کہ تنہائی اختیار کیجئے اور

غریب الوطن ہو کر رہئے۔ دانایان ظاہر بین کا اختلاف اور تقلیدی صورت پرستوں کا رواج تھا۔ مَیں حیرت کے کُوچہ میں حیران کھڑا دیکھتا تھا۔ چُپ رہ نہ سکتا تھا۔ بولنے کی طاقت نہ تھی۔ پدر بزرگوار کی نصیحتیں صحرائے جنون میں نہ جانے دیتی تھیں مگر پریشانی خاطر کا پورا علاج بھی نہ ہوتا تھا۔ کبھی خطۂ خطا کے داناؤں کی طرف دل کھینچتا۔ کبھی کوہ لُبنان کے مرتاضوں کی طرف جُھکتا۔ کبھی تبّت کے لامہ لوگوں کے لئے تڑپتا۔ کبھی دل کہتا کہ پادریاں پرتگال کی رفاقت کا دم بھروں۔ کبھی یہ کہ موبدان فارس اور ژندو استا کے رموز دانوں میں بیٹھ کر آتشِ اضطراب کو بجھاؤں۔ کیونکہ سیانوں اور دیوانوں دونوں سے جی بیزار ہو گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔

اس سحر بیان نے کئی جگہ اپنا حال لکھا ہے مگر جہاں ذکر آگیا ہے نئے ہی رنگ سے طلسمات باندھا ہے۔ آزاد اُس سے زیادہ متحیّر ہے۔ نہ سب کو لکھ سکتا ہے نہ چھوڑ سکتا ہے۔

شیخ موصوف کی تحریروں کا خلاصہ یہ ہے کہ نصیبے نے یاوری کی اور حضور بادشاہی میں علم و فضل کا مذکور ہؤا۔ اُدھر سے طلب ہوئی۔ مگر میرا دل نہ چاہتا تھا۔ برادران گرامی اور دوستانِ خیر اندیش ہمزبان ہو گئے کہ بادشاہ صورت و معنی کا دربار ہے۔ ضرور حاضر ہونا چاہیئے۔ یہاں دل کا جنون تعلّق کی زنجیریں توڑے ڈالتا تھا۔ خدائے مجازی (والد بزرگوار) نے پردہ کھول کر سمجھایا کہ اورنگ نشینِ اقبال (اکبر) کے کمالاتِ حقیقی کو کوئی نہیں جانتا۔ کہ وہ دین و دنیا کا مجمع البحرین اور صورت و معنی کا مشرق انوار ہے۔ جو عقدے دل میں پڑے ہیں وہیں جا کر کُھلیں گے۔ اُن کی خوشی کو اپنی مرضی پر مقدم سمجھا۔ دُنیا کی دولت سے گنجینہ دار معنی کا (میرا) ہاتھ خالی تھا۔ آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھی۔ بادشاہ آگرہ میں آئے ہوئے تھے۔ کورنش کی سعادت حاصل کی۔ اوراق مذکور نے تہیدستی کا عذر ادا کیا۔ وہ حسن قبول سے منظور ہؤا۔ میں نے دیکھا کہ اکسیر ملازمت سے دل کی سوزش کو تسکین ہو گئی۔ اور ذات قدسی کی محبّت نے دل کو دبوچ لیا۔ بنگالہ کی مہم درپیش تھی۔ اشغال سلطنت کے سبب سے گمنام گوشہ نشیں کے حال پر توجہ نہ ہوئی وہ چلے گئے۔ میں رہ گیا۔

وہاں سے بھی بھائی کے خطوں میں لکھا آتا تھا کہ بادشاہ تجھے یاد کیا کرتے

ہیں۔ مَیں نے سورۂ[1] فتح کی تفسیر لکھنی شروع کر دی۔ جب پٹنہ فتح کر کے پھرے اور اجمیر گئے تو معلوم ہوا۔ کہ وہاں بھی یاد فرمایا۔ اقبال کے نشان فتح پور میں آئے تو والد بزرگوار سے رخصت لے کر گیا۔ بھائی کے پاس اُترا دوسرے دن مسجد جامع میں کہ شاہنشاہی عمارت ہے جا کر حاضر ہوا۔ جب بادشاہ آئے۔ تو مَیں نے دُور سے کورنش کر کے نور سمیٹا۔ شہریار جوہر شناس نے خود نظر دُور بین سے دیکھ کر بلایا زمانہ اور اہل زمانہ کے حال کچھ کچھ معلوم تھے۔ اور پلّہ بھی دُور کا تھا۔ جانا کہ شاید کسی ہمنام کو بلایا ہو۔ جب معلوم ہوا کہ میری ہی قسمت نے یاوری کی ہے تو دوڑا۔ اور آستان جلال پر پیشانی رکھ دی۔ اُس دین اور دنیا کے مجموعے نے کچھ دیر تک مجھ سے باتیں کیں۔ سورۂ فتح کی تفسیر میں نے مرتب کر لی تھی۔ نذر گذرانی۔ بزم اقدس کے خواصوں سے میرے وہ وہ حال بیان کئے۔ کہ مجھے بھی معلوم نہ تھے۔ اس پر بھی دو برس تک میری طبیعت اچاٹ تھی۔ اور دل کا جنون تنہائی کی طرف کھینچتا تھا۔ مگر جان کی گردن میں کئی کمندیں پڑ گئی تھیں۔ مرحمت پر مرحمت بڑھتی جاتی تھی۔ ناچیز سے ایک چیز کر دیا۔ اور مدارج تربیت پایہ بپایہ بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ بیت المقدس مقصود کی کُنجی ہاتھ آ گئی ✦

غرض ابوالفضل حاضر دربار ہوئے۔ تو مزاج شناسی اور ادب خدمت اور اطاعت فرمان اور علم و لیاقت اور ظرافت باملتانت سے اس طرح اکبر کا دل ہاتھ میں لیا۔ کہ ہر وقت روئے سخن انہیں دونوں بھائیوں کی طرف ہوتا تھا۔ مخدوم و صدرؔ کے گھر میں ماتم پڑ گئے۔ اور حق بجانب تھا۔ کیونکہ وہ شیخ مبارک کے فضل و کمال کو اگر دبا سکتے تھے تو حکومتِ دربار کے زور سے۔ اب یہ میدان بھی ہاتھ سے گیا۔ اور چند ہی روز میں اس کے نوجوان لڑکے مقدمات دربار اور مہمات سلطنت میں شامل ہونے لگے ✦

[1] اس پیر کمسن سال اور اس کے جوانوں کے انداز دیکھو کہ کوئی نکتہ لطافت اور نزاکت سے خالی نہ تھا پہلی دفعہ جو پائے تخت میں ملازمت ہوئی تو آیۃ الکرسی کی تفسیر نذر گذرانی تھی۔ اس میں یہ نکتہ رکھا تھا کہ آیۃ الکرسی حفظ بلیات کیلئے پڑھا کرتے ہیں۔ حضور مہم پر چلے ہیں حفظ الٰہی شامل حال رہے۔ فتح پور میں سورۂ فتح کی تفسیر نذر دی۔ اس میں یہ لطیفہ تھا کہ فتح مبارک ہو۔ اور یہ فتوحات مشرقی کا دیباچہ ہے ✦

ملا صاحب کا انداز بیان بھی ایک لذت رکھتا ہے۔ ذرا دیکھئے اس معاملہ کو کیا مزے سے بیان کرتے ہیں۔ اجمیر سے پھر کر ۹۸۲ھ میں بمقام فتح پور تھے۔ خانقاہ کے پاس بادشاہ نے عبادت خانہ مرتب کیا۔ کہ ہم ایوان پر مشتمل تھا۔ اسکی تفصیل بہت طویل ہے۔ کسی اور تقریب میں لکھی جائے گی۔ انہیں دنوں شیخ ابوالفضل شیخ مبارک ناگوری کا سپوت بیٹا۔ جسے علامی لکھتے ہیں۔ اور جس نے جہان میں عقل و دانش کا غلغلہ ڈال دیا ہے۔ اور صباحیوں کے عقیدوں کا چراغ روشن کیا ہے۔ کہ خود صبح روشن میں چراغ جلاتا تھا۔ اور بموجب قول عرب کے کہ من تخالف تصرّف۔ جس نے مخالفت کی۔ اسی کا تصرف ہو گیا۔ اس نے تمام مذہبوں کی مخالفت کو اپنا فرض سمجھ لیا ہے۔ اور اس کام پر کس کر کمر باندھی ہے۔ غرض درگاہ میں آکر ملازمت بادشاہی کو اپنی طبیعت میں داخل کر لیا۔ تفسیر آیۃ الکرسی نذر گزرانی اور تفسیر اکبری تاریخ ہوئی۔ اور اس میں بہت سے دقائق اور نکات قرانی درج تھے۔ اور کہتے ہیں۔ کہ باپ کی تصنیف تھی۔ بادشاہ نے ملایانِ فرعون صفت کے کان ملنے کے لئے (جس کی مجھ سے مراد ہے) اس کو خاطر خواہ پایا۔

پھر شیخ مبارک اور اُس کے بیٹوں پر جو دھواں دھار مصیبتیں مخدوم اور صدر کے ہاتھوں گذری تھیں۔ اُن سے چند سطریں سیاہ کر کے ملا صاحب لکھتے ہیں۔ پھر ان کا دَورِ دورا ہو گیا۔ اور شیخ ابوالفضل نے بادشاہ کی حمایت اور زور خدمت اور زمانہ سازی اور بے دیانتی۔ اور مزاج شناسی۔ اور بے انتہا خوشامد سے جس گروہ نے چغلیاں کھائیں اور ناروا کوششیں کی تھیں۔ اُنہیں بُری طرح رسوا کیا۔ اُن پُرانے گنبدوں کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا۔ بلکہ تمام بندگانِ خدا۔ مشائخ و علماء۔ عابد و صلحاء۔ یتیم و ضعفا سب کے وظیفے اور مدد معاش کاٹ لینے کا باعث وہی ہوا۔ پہلے زبان حال و مقال سے کہا کرتا تھا۔ رُباعی

یارب بجہانیاں دلیلے بفرست	فرعون صفت چو لشکر پیلے بفرست
فرعون وشاں دست بر آوردستند	موسیٰ و عصا و رود نیلے بفرست

جب اس طریقے پر فساد اُٹھنے لگے۔ تو اکثر یہ رُباعی اُس کی زبان پر تھی۔ رُباعی:-

چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش	آتش بدو دست خویش در خرمن خویش
اے وائے من و دوست من و دامن خویش	کس دشمن من نیست منم دشمن خویش

بحث کے وقت اگر کسی مجتہد کا کلام سند میں پیش کرتے۔ تو کہتا کہ فلانے حلوائی۔ فلانے موچی۔ فلانے چرم گر کے قول پر ہم سے حجت کرتے ہو۔ بات تو یہ ہے کہ تمام مشائخ و علماء کا انکار اُسے مبارک ہوا۔ **آزاد**۔ یہ رشک ان پر ملا صاحب ہی کو نہیں ہوا۔ کہ ہم سبق اور ہم عمر تھے۔ بڑے بڑے بڈھے اور صاحب کمال ارکان دربار تڑپتے تھے اور رہ جاتے تھے ۔

اگر ہم حاکم کی مزاج شناسی کا سبق پڑھنا چاہیں تو بھی ایک نکتہ کافی ہے کہ ابوالفضل اور ملا صاحب موصوف آگے پیچھے دربار میں پہنچے تھے۔ بادشاہ کی نظر کسی پر کم نہ تھی۔ ملائے موصوف کو بیستی کا منصب عطا کیا۔ اور خرچ کو روپیہ بھی دیا۔ کہ گھوڑے پیش کر کے داغ کرا دو۔ اُنہوں نے قبول نہ کیا۔ ابوالفضل بھی ایک ملائے مسجد نشین کے بیٹے تھے۔ اور مسجد سے نکل کر دربار میں پہنچے تھے۔ اُنہوں نے فوراً تعمیل کی۔ اور جو خدمت ہوئی بجا لائے۔ نہ کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ بیچارے ملا کے ملا ہی رہے۔ (ذرا دیکھو ملا صاحب کس مزے سے اس مصیبت کا رد نا روتے ہیں) ۔

ابوالفضل انشا پردازی کا بادشاہ تھا۔ اور اکبر نے بھی پرکھ لیا تھا کہ اس کا دماغ بہ نسبت ہاتھوں کے بہت خوب لڑیگا۔ بلکہ ہاتھ میں قلم تلوار سے زیادہ کاٹ کریگا۔ اس لئے دارالانشا کی خدمت اسے سپرد کی۔ اور مہمات سلطنت کی تاریخ بھی اس کے اہتمام میں تھی۔ اس کے علاوہ ہر حکم کو بڑی احتیاط اور عرقریزی سے سرانجام کرتا تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ بادشاہ کے دل میں بڑا اعتبار اور اعتماد پیدا کیا۔ اور ہر طرح کے صلاح و مشورے میں اس کی رائے ضروری ہو گئی۔ یہاں تک کہ پیٹ میں درد ہوتا۔ تو حکیم بھی ان کی صلاح سے مشخص ہوتا تھا۔ پھنسی پر مرہم لگتا تھا تو ان کی تجویز نسخہ میں شامل ہوتی تھی۔ ابوالفضل نے اب ملائی کے کوچہ سے گھوڑا دوڑا کر امرائے منصبداران کے میدان میں جھنڈا گاڑا ۔

۹۹۳ھ کے جشن میں لکھتے ہیں۔ کہ فلاں فلاں امرائے منصبدار کو اس اس

خدمت کے صلہ میں یہ یہ منصب عطا ہوئے۔ راقم شگرف نامہ کے لئے کسی خدمت نے سفارش نہ کی حضور سے ہزاری منصب عطا ہو گیا۔ اُمید ہے کہ عمدہ خدمتیں سعادت کے چہرہ کو روشن کریں +

۹۹۷ھ میں بادشاہ کے ساتھ لاہور میں تھے۔ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ نہایت رنج ہوا۔ قلق کی کیفیت اس سے معلوم کر لو۔ اور بار بار یہ شعر پڑھتے تھے کہ عرفی نے ایسے موقع پر کہا تھا۔ شعر:-

خوں کہ از مہر تو شد شیر و بہ طفلی خوردم	باز آں خوں شد و از دیدہ بروں مے آید

خود لکھتے ہیں۔ آج اقبال نامہ کا مصور (میں) ذرا بیہوش ہو گیا۔ اور غمہائے گوناگوں میں ڈوب گیا۔ خبر پہنچی۔ کہ بانوے خاندان۔ خاتون دودمان عصمت کی ماں مہراندوز جہاں ناپائدار سے عالم علوی کو چلی گئی +

چوں مادر من بزیر خاک است	گر خاک بسر کنم چہ باک است	دانم کہ بدیں شغب فزائی
زانجا کہ تو رفتہ نیائی	لیکن چہ کنم کہ ناشکیبم	خود را بہ بہانہ مے فریبم

شہریار غمگین نواز نے آکر سایہ عاطفت ڈالا۔ اور زبان گوہر بار پر یہ لفظ گذرے۔ اگر سب اہل جہاں پائداری کا نقش رکھتے۔ اور ایک کے سوا کوہ راہ نیستی میں نہ جاتا۔ تو بھی اس کے دوستوں کو رضا۔ وتسلیم کے سوا چارہ نہ تھا۔ جب اس کارواں سرا میں کوئی دیر تک نہ ٹھہرے گا۔ تو خیال کرو۔ کہ بے صبری کی ملامت کا کیا اندازہ کر سکیں۔ اس گفتار دلآویز سے دل ہوش میں آگیا۔ اور جو مناسب وقت تھا اُس میں مصروف ہو گیا +

۹۹۹ھ میں خود لکھتے ہیں۔ آج فرزند عبدالرحمن کے گھر میں روشن ستارہ نے روشنی بڑھائی۔ نشاط گوناگوں کا ہنگامہ ہوا۔ گیتی خداوند (اکبر) نے بشوتن نام رکھا۔ اُمید ہے۔ کہ فرخی و فیروزی بڑھائے۔ اور شائستگی عمر دراز سے پیوند پائے +

اسی سنہ میں لکھتے ہیں۔ کہ شاہزادہ سلیم (جہانگیر) کے خردسال بیٹے خسرو کی بسم اللہ کا دربار ہوا۔ اوّل بادشاہ وحدت بخش درگاہ الٰہی میں عجز و انکسار بجا لائے۔ اور کہا کہو الف۔ پھر انہیں حکم دیا۔ کہ روز تھوڑی دیر بیٹھ کر پڑھا دیا کرو۔ اُنھوں نے

چند روز کے بعد چھوٹے بھائی شیخ ابوالخیر کے سپرد کر دیا ✣

سنہ ۱۰۰۰ھ میں لکھتے ہیں۔ کہ اقبال نامہ کے نقش طراز کو دو ہزاری منصب عطا ہوُا۔ اُمید ہے۔ کہ خدمتگذاری اپنی زبان سے اس کا شکریہ ادا کرے۔ اور حضور کی جوہر شناسی نزدیک و دُور آشکارا ہو ✣

سنہ ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء میں فیضی کی تصنیفات کو دیکھا۔ کہ اجزائے پریشان تھے۔ بڑے بھائی کے جگر کے ٹکڑے اس بدحالی میں دیکھے نہ گئے۔ ان کی ترتیب پر متوجہ ہوئے۔ سنہ ۱۰۰۶ھ / ۹۸-۱۵۹۷ء میں ان کی ترتیب سے فارغ ہوُا۔ دو برس اس کام میں صرف ہوئے۔ اس عرصہ میں دو ہزار پانصدی کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ چنانچہ آئین اکبری میں جو منصبداروں کی فہرست لکھی ہے۔ اُس میں اپنا عہدہ بھی لکھا ہے ✣

ابوالفضل بڑے سُرتے اور سیانے تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے۔ کہ اکبر کے سوا تمام دربار میں ایک بھی ان کا دل سے خیر خواہ نہیں ہے۔ مگر ایک چال چوکے اور بہت چوکے۔ شیخ مبارک نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی۔ اُنہوں نے اسکی نقلیں تیار کیں۔ اور ایران توران اور ملک روم وغیرہ میں بھیجیں۔ حاسد ہر وقت تاک لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ اُنہوں نے خدا جانے کس پیرایہ میں اس مضمون کو اکبر کے سامنے ظاہر کیا۔ کہ اُسے ناگوار گزرا۔ چغل خوروں کی باتیں کس نے سُنی ہیں۔ کہتا کہ کیا کیا موتی پروئے ہوں گے۔ شاید یہ کہا ہو۔ کہ حضور کے سامنے یہ اہل دین کو مقلّد کہتا ہے۔ اور تقلید کی قباحتیں۔ اور دینیات کی خرابیات ظاہر کرتا ہے۔ اور دل سے اعتقاد مفسّرانہ رکھتا ہے۔ یا یہ کہا ہو۔ کہ حضور سے کہتا ہے۔ مَیں آپ کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ بلکہ حضور کو صاحب شریعت اور صاحب ملّت اعتقاد کرتا ہے۔ اور باطن میں شاید یہ کہا ہو۔ کہ تفسیر مذکور کے خطبے میں حضور کا نام داخل نہیں کیا۔ شاید سلاطین مذکورہ کے دربار میں رستہ نکالتا ہو۔ غرض جو کچھ کہا اُس نے بادشاہ کے دل میں بُرا اثر پیدا کیا۔ ایک تاریخ میں لکھا ہے۔ کہ جہانگیر نے یہ ماجرا باپ کے گوش گذار کیا تھا۔ ابوالفضل بڑے اداشناس تھے۔ اس بات کا بڑا رنج ظاہر کیا۔ جیسے کوئی ماتم زدہ سوگ لے کر بیٹھتا ہے۔ اس طرح گھر میں بیٹھ رہے۔ دربار میں آنا چھوڑ دیا۔ ملنا جُلنا ترک کر کے اپنے بیگانے کی آمد و رفت بند کر دی۔

بادشاہ کو اِس حال کی خبر ہوئی۔ اس لئے علو حوصلہ سے کام لیا۔ اور کہلا بھیجا کہ آ کر اپنی خدمتیں سنبھالو۔ اِس اثنا میں بہت پیغام سلام ہوئے۔ آخر خود لکھتے ہیں۔ کہ میں آگاہ دلی کے رستہ پر بیٹھا اور سمجھا۔ کہ بادشاہ دوربین کو کم فہمی کی تہمت کیا لگاتا ہے نافہمی تو تیری۔ ایسی باتیں دشمنوں کی آرزوئیں پوری کرتی ہیں۔ یہ کیا خیال آ گیا کہ اُلٹا چلنے لگا ہے اور بے وقت داد بیداد کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض پھر جو بادشاہ نے بلایا تو پہلے نقش مٹا کر درگاہ والا میں گئے۔ اور عواطف گوناگوں نے غموں سے سبکدوش کر دیا +

۱۰۰۵ھ میں لکھتے ہیں۔ کشمیر کو جاتے ہوئے رجوڑی میں مقام ہوا۔ شاہزادہ سلیم (جہانگیر) بے اجازت حاضر درگاہ ہوا۔ رستہ میں کچھ بے انتظامی ہو گئی تھی۔ (ایسا اکثر ہوتا ہے) چند روز کورنش سے محروم رکھ کر عتاب کی ادب گاہ میں رکھا (کہ پیچھے ہٹ کر ڈیرہ کرو) اس دادگری کی تحقیق میں انہیں بھی شامل کیا۔ اور شاہزادہ کی اظہار شرمساری سے خطا معاف ہوئی +

یہ تو ظاہر ہے۔ کہ وہ اکبر کا مصاحب۔ مشورہ کار۔ صاحب اعتبار۔ میر منشی۔ وقائع نگار۔ واضع قوانین۔ صاحب دیوان بلکہ اُس کی زبان۔ نہیں نہیں۔ اس کی عقل کی کنجی یا یہ کہو کہ سکندر کے سامنے ارسطو تھا۔ اور زبان سے لوگ کچھ ہی کہیں۔ اگر پوچھیں۔ کہ وہ ان رتبوں کی لیاقت رکھتا تھا یا نہیں۔ تو غیب سے آواز آئیگی۔ کہ اس کا رتبہ ان سے بہت بلند تھا۔ اس کے احکام کے طرز بیان۔ اور امرا کے کاروبار پر اصلاحیں۔ اور اُن کی جانفشانی میں ہمیشہ کوتاہیاں جتانا بھی غضب تھیں۔ کہنے والے ضرور کہتے ہوں گے۔ اور بے خبر اب بھی سمجھتے ہوں گے کہ اکبر کے پاس بیٹھ کر باتوں کے طوطے مینا بناتے تھے۔ عین معرکوں کے نازک وقتوں پر کام کا سرانجام دینا کچھ اور بات ہے۔ اگر خود جنگ کے میدانوں میں ہوتے تو شیخ صاحب کو معلوم ہوتا۔ کہ قدم قدم پر کیا کیا مشکلیں پیش آتی تھیں۔ یہ سب سچ۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جب یہ پہاڑ خود اُس کے سر پر آن پڑا۔ تو اُسے انتہائے مردانگی اور نہایت خوش اسلوبی سے سنبھالا دیکھنے والے حیران تھے۔ کہ ایک ملّائے مسجد نشین کا بیٹا بادشاہت کے بوجھ اُٹھائے چلا جاتا ہے۔ اور کس خوبصورتی سے جاتا ہے

میں مختصر طور پر اس کی کاردانی کے چند نمونے دکھاتا ہوں *

۱۰۰۶ھ میں اس کی ترقی کے اندازوں نے چال بدلی۔ دکن کے معاملے بہت پیچیدہ ہو گئے۔ اس مہم کو اکبر نے شاہزادہ مراد کے نام پر بامراد کیا تھا۔ اور بہت سے تجربہ کار سپہ سالار اور نامور سردار فوجیں دے کر ساتھ کئے تھے۔ شاہزادہ آخر نوجوان لڑکا تھا۔ ایسے کہنہ عمل سپہ سالاروں کا دبانا اس کا کام نہ تھا ایک کی صلاح پر کام کرتا تھا۔ دو برخلاف ہو کر بجائے مدد کے اُس کی محنت کو برباد کرتے تھے۔ سب سے زیادہ مصیبت یہ تھی۔ کہ شاہزادہ کو شراب کی لت پڑ گئی تھی۔ اُس نے بالکل بدحال کر دیا تھا۔ اس لئے زیادہ تر کاروبار ابتر ہو گئے تھے۔ جب یہ خبریں متواتر دربار میں پہنچیں۔ تو اکبر بہت متردد ہوا۔ اور سوا اس کے چارہ نہ ہوا۔ کہ ابوالفضل کو جس کی جدائی کسی طرح گوارا نہ تھی۔ دربار سے جدا کرے *

اکبر اقبال کا لشکر لئے پانچ برس سے پنجاب میں پھرتا تھا۔ اور لاہور میں چھاؤنی چھائی تھی۔ نتیجے اس کے بھی اچھے حاصل ہو گئے تھے۔ کیونکہ کشمیر فتح ہو گیا۔ یوسف زئی وغیرہ علاقہ سرحد کی مہمیں حسب دلخواہ سرانجام ہو گئیں۔ عبداللہ خاں اُزبک کے رخنے بند ہوتے رہے۔ اور وہ ملک گیر بادشاہ ۱۰۰۵ھ میں ناخلف بیٹے کی بداعمالی سے راہئ ملک بقا ہوا۔ اُس کے ملک کا انتظام برہم ہو گیا۔ اس اکبر کو ملک موروثی پر قبضہ کرنے کے لئے اس سے بہتر موقع نہ تھا۔ لیکن برہان الملک کی تباہی مملکت کے سبب سے دکن کا دسترخوان بھی سامنے تیار تھا۔ اور مدت سے امرا اور افواج کی آمد و رفت جاری تھی۔ مراد کی کیفیت احوال سے اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ دکن کی سپاہ سپہ سالار سے خالی ہوا چاہتی ہے۔ دونوں بیٹوں کو بلایا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ سلیم کو فوج دے کر ترکستان کی مہم پر بھیجے۔ وہ شرابی کبابی لڑکا بدمست ہو رہا تھا۔ دانیال کی خبر لگی کہ وہ الہ آباد سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ اور اُس کا ارادہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ناچار خود لاہور سے نکلا کہ اُسی کو ساتھ لیتا ہوا احمد نگر کو جائے۔ اور دکن سے فارغ ہو کر توران کی مہم کا بندوبست کرے *

اکبر کو ابوالفضل کی نیک نیتی اور عقل و تدبیر پر ایسا اعتبار تھا۔ کہ اس کے کہے کو اپنا کہا سمجھتا تھا۔ اور جس معاملہ میں یہ کسی سے اقرار کرتا تھا۔ اُسے اکبر اپنی زبان کا

اقرار سمجھتا تھا۔ ان باتوں کی تصدیق اس عبارت سے ہوتی ہے جو اُس نے شاہزادہ دانیال کو اپنی عرضداشت میں لکھی ہے۔ قبلہ ابوالفضل! ہشتم مرداد الٰہی حضرت ظل اللّٰہی در شب شرف آفتاب در غسل خانہ بزبان مبارک خود فرمودند کہ ابوالفضل! من مطالعہ کردہ چنیں یافتہ ام کہ بہ مہم دکن یا تو روی یا من۔ والّا ہیچ صورت انجام کار صورت پذیر نیست و نخواہد شد۔ ہر گاہ تو روی یقین است۔ کہ شاہزادہ از گفتن تو بیروں نخواہد بود۔ تا تو باشی دیگر مصلحت نخواہد کرد۔ و سخن ہر کوتاہ حوصلہ کم اندیش بے شعور ہیولا نخواہد گوش کرد۔ مناسب دولت آنست کہ بتاریخ غرہ ماہ پیشخانہ بکشی۔ در ہشتم ماہ راہی شوی۔ بندہ بعرض اقدس رسانید کہ گوسفند بکار قربانی مے آید یا بکار بریانی دیگر چہ چیز است۔ خوب است ہر گاہ کہ قبلہ چنیں میفرمانبد مرا دریں چہ عذر است۔

غرض ۱۰۰۶ھ میں شیخ کو سلطان مراد کے لانے کا حکم ہوا۔ اور فرمایا کہ اگر مہم دکن امرا اُس ملک کے رکھنے کا ذمہ لیں تو شاہزادہ کے ساتھ چلے آؤ۔ ورنہ شہزادہ کو روانہ کردو۔ خود وہیں رہو۔ آپس میں اتفاق رکھو۔ اور مرزا شاہرخ کے ماتحت رہنے کی سب کو ہدایت کردو۔ مرزا کو بھی علم ونقارہ دے کر مالوہ کو رخصت کیا۔ کہ اس کی جاگیر تھی۔ وہاں سے سپاہ کا سامان کرے۔ اور جب دکن میں بلائیں۔ جھٹ جا پہنچے۔ شیخ برہان پور کے پاس پہنچے۔ بہادر خاں فرمانروائے خاندیس اسیر کے قلعہ سے اُتر کر چار کوس لینے آیا۔ کمال آداب سے فرمان و خلعت لے کر سجود عجز بجا لایا۔ انہیں ٹھیرانا چاہا۔ مگر یہ نہ رُکے۔ اور سوار ہو کر برہان پور جا اُترے۔ بہادر خاں وہیں پہنچا۔ انہوں نے بہت سی تلخ نما شیریں اثر باتیں کہہ کر مصلحت کا رستہ دکھایا۔ کہ فوج کشی میں شامل ہو۔ اس نے آسان سی بات کے لئے مشکل حیلے حوالے پیش کئے۔ البتہ کبیر خاں اپنے بیٹے کو دو ہزار فوج دے کر روانہ کردیا۔ انہیں گھر لے جانا چاہا۔ کہ ضیافت کرے۔ اُنہوں نے کہا تم ساتھ چلتے تو ہم بھی چلتے۔ اس نے بہت سے تحائف پیش کئے۔ ابوالفضل کو باتیں بتانی کون سکھائے ایسے طوطے مینا اُڑائے کہ اس کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ آسیر کو چلا گیا۔ اور یہ آگے بڑھ گئے جو ناز و نیاز کا زور اس پر دکھاتے بجا تھا۔ کہ اس کے چچا خداوند خاں سے ان کی بہن بیاہی ہوئی تھی۔ اور راجی علی خاں اس کا باپ دربار اکبری میں پورا نیاز و اخلاص رکھتا

تھا۔ چنانچہ سہیل خاں دکنی کی مہم میں خان خاناں کی رفاقت میں موجود تھا اور بکمال مردانگی کے ساتھ سرِ میدان مارا گیا +

خود ابو الفضل لکھتے ہیں کہ بہت سے امرا کو میرے لئے اس خدمت کا نامزد ہونا گوارا نہ تھا۔ اُنھوں نے متفق ہو کر ایسا پیچ مارا کہ اُن کی دُمبازیوں سے پُرانے پُرانے رفیق مجھ سے الگ ہو گئے۔ ناچار ہو کر نئی سپاہ کا بندوبست کیا۔ نصیبہ مددگار تھا۔ بہت لشکر جمع ہو گیا۔ بدخواہوں نے ملامت کی جالی لگا کر مجھ سے کہا کہ کیا کرتے ہو اس میں خطا ہے۔ مَیں دست بردار نہ ہوا۔ وہ شورش کی اُمید میں آنکھیں کھولے ہی رہے۔ کہ میں شاہزادہ کی چھاؤنی سے ۳۰ کوس پر جا پہنچا۔ یہاں قاصدان تیز رفتار مرزا یوسف خاں وغیرہ شاہزادہ کے لشکر سے خطوط لے کر پہنچے۔ کہ عجب بیماری نے گھیر لیا ہے۔ جھٹ یہاں پہنچو۔ شاید حکمار کے ادل بدل سے کچھ فائدہ ہو۔ اور اعلیٰ ادنے تباہی سے بچ جائیں۔ اگرچہ بزرگانِ درگاہ کی طرف سے دل کملایا ہوا تھا۔ اور ہمراہی بھی روکتے تھے۔ مگر میں سب کو شیطانی وسوسے سمجھا۔ اور پھرتی کو تیز کیا۔ سارا فکر یہی تھا۔ کہ زندگی ولی نعمت کے کام میں کھپاؤں اور زبانی اقبال مندی کو کارگزاری سے دکھائیں۔ دیول گاؤں سے اور تیز ہو گیا۔ شام ہوتے جا پہنچا۔ اور وہ دیکھا کہ کوئی نہ دیکھے۔ کام علاج سے گذر چکا تھا۔ گرداگرد انبوہ در انبوہ آدمی آوارہ۔ سرداروں کو یہ خیال کہ شہزادہ کو شاہ پور لے کر پھر چلو۔ میں نے کہا اس عالم میں چھوٹے بڑے شکستہ دل ہو رہے ہیں۔ عجب بلوہ ہو رہا ہے۔ غنیم پاس۔ مُلک بیگانہ۔ پھر چلنا گویا آفت کا شکار ہونا ہے۔ گفتگو میں اُس گلدستہ (شاہزادے) کی پریشانی زیادہ بڑھ گئی۔ حالت بدحال ہوئی اور شاہزادہ جاں بحق ہوا۔ کچھ لوگ بدنیتی سے اسباب سنبھالنے میں۔ بعضے بال بچوں کی حفاظت میں الگ ہو گئے۔ مدد الٰہی سے اس شورش میں دل نہ ہارا۔ جو کچھ کرنا چاہئے تھا۔ اس کے سرانجام میں لگ گیا۔ جنازہ کو عورات سمیت شاہ پور بھیج دیا۔ اور اُس مسافر کو وہیں خاک میں امانت رکھا۔ بعض اشخاص پُرانی چھاؤنی سے نکل کر فتنہ انگیزی کرنے لگے۔ جتنی نمائش ہوئی۔ اتنی نخوت زیادہ ہوئی۔ اس عرصہ میں میری سپاہ جو پیچھے رہ گئی تھی آن پہنچی۔ یہ تین ہزار سے زیادہ تھی۔ اب میری بات

کی اور بھی چمک ہوئی۔ جو ٹیڑھے چلتے تھے۔ وہ ماننے کی بات پر کان دھرنے لگے۔ مگر چھوٹے سے بڑے تک کو یہی خیال تھا کہ پھر چلیں منعم خاں کے مرنے کی۔ بنگالہ کے بغاوت کی۔ شہاب الدین احمد خاں کے گجرات سے نکل آنے کی۔ اور اس ملک کے فتنہ و فساد کی باتیں الگ الگ رنگ سے سُنائیں۔ میری رجوع خاص درگاہ الٰہی میں تھی۔ اقبال بادشاہی کے نور سے آنکھ روشن تھی۔ اس لئے جو جہان کو پسند تھی مجھے بُری لگتی تھی۔ بہت سے بدنیت جُدا ہو گئے۔ مَیں نے کارساز حقیقی کی طرف دل کا رُخ کیا۔ اور آگے ہی بڑھنے کا خیال رہا۔ فتح دکن کے لئے نشان بڑھایا۔ اس بڑھنے سے دلوں میں اور ہی زور آ گئے۔ سرحد کے لوگوں کو شکر گزار کر ہی رکھا تھا۔ انہیں اور اس ملک کے اکثر نگاہبانوں کو فہمائش کے خطوط لکھے۔ تنگدستوں کے ہاتھ روکے۔ شاہزادہ کے خزانہ میں سے جو کچھ حضور میں بھیجنے کے قابل نہ تھا۔ اور جو اپنے ساتھ تھا۔ اور جو قرض مل سکا۔ سب نچھاور کیا۔ تھوڑے عرصہ میں جو لوگ چلے گئے تھے۔ پھر آئے اور کاروبار کا ہنگامہ گرم ہو گیا۔ شاہزادے کے کل علاقہ کا انتظام اچھّی طرح ہو گیا۔ البتہ ناسک کا رستہ خراب اور عرصہ دُور کا۔ خبر دیر میں پہنچتی تھی وہ رہ گیا۔ کیونکہ جب شاہزادہ کے مرنے کی خبر پہنچی۔ تو وہی کار پرداز ملک تھا۔ نااُمیدی نے فوج کو تتر بتر کر دیا۔ جو لوگ مَیں نے بھیجے انہوں نے کم ہمتی کی۔ جو ملک نکل گیا تھا۔ وہ تو نہ آ سکا۔ البتہ اور اکثر مضافات علاقہ میں زیادہ ہو گئے۔ (اکبر کے اقبال نے آکر اس واقعہ کی پیشگوئی کر دی ہو گی۔ جو اس نے پہلے سے شیخ کو بھیج دیا۔ اگر یہ نہ جا پہنچتا اور شاہزادہ مر جاتا تو تمام فوج تباہ ہو جاتی ملکوں میں رسوائی ہوتی۔ اور ایسی مشکلیں پیش آتیں۔ کہ برسوں میں بھی ملک نہ سنبھلتا) درگاہ والا کے دمسازوں نے میرے عرائض نہ سُنائے اور ایسی سرگذشت کو (شہزادہ کامرنا) بدخیالی سے چھپایا۔ بادشاہ کو حال معلوم ہو جاتا تو فوج اور خزانہ فوراً روانہ کرتا مَیں تو درگاہِ الٰہی میں عرض کر رہا تھا۔ اور گیتی خداوند (اکبر) کی توجّہ روز افزوں تھی۔ سپاہ کا سرانجام ایسا ہُوا کہ اہلِ زمانہ کا خیال سنبھال بھی نہ سکے۔ دُور و نزدیک کے لوگ حیران رہ گئے۔ خدا کی قدرت امکان کی طاقت سے باہر ہے۔ مجھ ناتوان سے کیا ہو سکتا ہے۔ **بیت**

کہ گفت آفرینے سزاوار او		نہ من ماندہ ام خیرہ در کار او

دربار کے طعن و تعریض کرنے والوں کو خاموشی اور پچتاوے دلپوچ لیا۔
بد اندیش طوفان باندھتے تھے۔ کہ بادشاہ نے آپ شیخ کو دربار سے دُور پھینکا ہے
کارساز حقیقی نے اسی کو میری بلند نامی کا سرمایہ کر دیا۔ اور ان کو ندامت خانۂ جاوید
میں بٹھا دیا۔ غرض انتظام مہمات میں مصروف ہوا۔ سُندر داس کو فوج دے کر
تلتم کے قلعہ پر بھیجا۔ اس نے کار آگہی سے بعض ملک نشینوں کو بُلایا۔ اُنہیں میں سے
ایک جا کر قلعدار کو ساتھ لے آیا۔ تھوڑی رگڑ جھگڑ میں قلعہ ہاتھ آگیا۔

سوئید بیگ اور میرا بیٹا ادب خانہ زندان میں تھے۔ چندر وز بعد اُسے
بھی مہم دکن پر نامزد کر کے دولت آباد کو بھیجا۔ قلعہ نشینوں نے لکھا۔ کہ اگر عہد و
پیمان سے یہ خاطر جمع ہو جائے۔ کہ ہمارے مال و اسباب سے تعرض نہ ہوگا۔
تو کنجیاں دیتے ہیں۔ اس کا سرانجام ہو گیا۔ کچھ حبشی اور دکنی مفسد ادھر کے
علاقہ میں تھے۔ عبدالرحمٰن فرزند کو پندرہ سو سوار اپنے اور اتنی ہی بادشاہی
فوج ساتھ کر کے ان کی سرکوبی کو روانہ کیا۔ جب شاہزادے کے مرنے سے شورش
گرم ہوئی تھی۔ میں نے مرزا شاہرخ کو بہت بُلایا۔ لوگ ایسے ہنگاموں پر ہزاروں
ہوائیاں اُڑاتے ہیں۔ چنانچہ وہ خدا جانے کیا کیا خیال کر کے رہ گئے۔ مجھے مرزا سے
یہ اُمید تھی۔ کہ فرمان نہ پہنچتا۔ تو بھی وقت پڑے پر بے قرار ہو کر اپنے تئیں
پہنچاتے مگر وہ کہنے والوں کے کہنے میں آ گئے۔ جب فرمان عتاب آمیز برابر پہنچے۔
اور آخر بادشاہ نے حسین سزاول کو بھیجا تو کام ناکام روانہ ہوئے۔ خیر اب لشکر
فیروزی میں آکر شامل ہو گئے۔ میں استقبال کر کے ڈیروں میں لے آیا۔ ایسے مردانہ
پارسا گوہر کے آنے سے دل کھل گیا۔ شیر خواجہ کہنہ عمل سردار سلطان مراد کی ہمراہی میں
ایک فوج کا افسر ہو کر گیا تھا۔ اور سرحد میں پرگنہ بیر کی حفاظت کر رہا تھا برسات
کا موسم آیا۔ خبر لگی کہ دکھنیوں نے فوجیں جمع کرنی شروع کی ہیں اور عنبر و فرہاد
۵ ہزار سوار حبشی و دکنی اور ۷۰ مست ہاتھی لے کر آنے والے ہیں۔ شیر خواجہ کے
پاس فقط ۳ ہزار فوج تھی۔ خود پیشدستی کر کے اور شہر سے کئی کوس آگے بڑھ کے
غنیم پر جا پڑا۔ لیکن کمی فوج کے سبب لڑتا۔ بھڑتا ہٹتا اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔

شیر خواجہ زخمی ہوا تھا۔ مگر اس کے شکست دینے کی خبر اُڑ گئی۔ اُس نے ادھر بھی خط بھیجدیا تھا۔ مَیں نے اور فوج روانہ کر دی تھی۔ جب یہ خبر پہنچی۔ تو مصلحت کی انجمن جمائی۔ کسی کی صلاح نہ تھی۔ مینہ موسلادھار برس رہا تھا۔ اُسی عالم میں مَیں جریدہ روانہ ہوا۔ لشکر کے کاروبار مرزا شاہرخ کے سپُرد کر گیا۔ شیخ عبدالرحمٰن (اپنے بیٹے) کو دولت آباد سے بُلایا۔ کہ آپ کنارہ گنگ پر جاؤ۔ اور سپاہ سمیٹو۔ کہیں آپ کہیں بیٹا جا بجا چوکیاں جماتے پھرتے تھے۔ کہ آگے کا کام چلتا رہے۔ اور پیچھے سے خاطر جمع رہے۔ سرداران شاہی میں سے کوئی ہمت والا نظر نہ آتا تھا۔ مرزا یوسف خاں ۲۰ کوس پر تھے۔ مَیں جریدہ ادھر روانہ ہوا۔ اور رات کو پہنچ کر اُسے بھی مدد پر آمادہ کیا۔ اِدھر اُدھر کی فوجوں کو سمیٹ کر ساتھ لیا۔ اور لشکر کی حیثیت درست کر کے آگے بڑھا۔ گنگ گوداوری چڑھاؤ پر تھا۔ قسمت سے دفعتاً اُتر گیا۔ اور فوج پایاب گذر گئی۔ جو غنیم کی فوج دریا کے کنارہ پر پڑی تھی۔ وہ ہراول کی جھپٹ میں اُڑ گئی۔ دوسرے دن لشکر قلعہ بیر کے گرد سے بھی اُٹھ گیا۔ درگاہ الٰہی میں شکرانے بجا لایا۔ اور شادیانوں کے جلسے کئے۔ دریائے گنگ کے کنارہ چھاؤنی ڈالی۔ اور اس ملک میں رعب بیٹھ گیا۔ اکبر نے جب دیکھا کہ امرائے موجودہ سے مہم دکن نہیں سنبھلتی تو شاہزادہ دانیال کو فوج دے کر روانہ کیا اور خاں خاناں کو اتالیق کا منصب دیا +

(ابوالفضل لکھتے ہیں) اسی دن بڑے شاہزادے (سلیم یعنی جہانگیر) کو صوبہ اجمیر دے کر رانا کی مہم سپرد کی۔ شہریار کو اس سے بڑی محبت ہے اور ہر دم محبت کا درجہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔ مگر وہ بادہ خوار ہمنشیں ہے۔ نیک و بد کی خبر نہیں۔ چندروز سلام کی اجازت نہ دی۔ بارے مریم مکانی کی سفارش سے کورنش کی دولت پائی۔ اور پھر عہد کیا۔ کہ رستے سے چلو نگا۔ اور خدمت کروں گا۔ بادشاہ آپ مالوہ میں آ کر شکار کھیلنے لگے کہ سب طرف زور رہے۔ خان خاناں کو دانیال کی رفاقت کے لئے روانہ کیا۔ اور حکم دیا کہ جب خان خاناں وہاں پہنچے ابوالفضل روانۂ درگاہ ہو۔ مَیں نے بڑی خوشیاں کیں۔ اور اسی عرصہ میں قلعہ تبالہ فتح کیا +

اکبر کو خبر پہنچی تھی۔ کہ بڑا شہزادہ رستے میں دیر کرتا ہے۔ میر عبدالحی میر عدل

کو نصائح سے گرانبار کر کے بھیجا۔ میں احمد نگر کو روانہ ہوا۔ چاند بی بی برہان الملک کی بہن اب اُس کے پوتے (بہادر) کو دادا کا جانشین کر کے مقابلہ کو تیار ہوئی۔ کچھ فوج نے اس کی بندگی اختیار کی۔ آبھنگ خاں بہت سے فتنہ انگیز حبشیوں کو لئے بچہ کو بادشاہ مانتا تھا۔ مگر چاند بی بی کی جان کی فکر میں تھا۔ وہ بیگم امرائے بادشاہی کو خوشامد کے پیام بھیجتی تھی۔ اور دکھنیوں کو بھی دوستی کی داستانیں سُناتی تھی۔ مجھ سے بھی وہی رستہ شروع کیا۔ میں نے جواب دیا کہ اگر پیش بینی اور روشن اختری سے درگاہ الٰہی کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ تو اس سے بہتر کیا ہے۔ جو عہد و پیمان ہیں۔ مَیں نے اپنے ذمہ لئے۔ ورنہ باتوں سے کیا فائدہ اور آئندہ کو رستہ بند۔ اُس نے ہوا خواہ سمجھ کر دوستی کے پیوند کو مضبوط کیا۔ سچی قسموں کے ساتھ اپنے ہاتھ کا لکھا عہد نامہ بھیجا۔ کہ جب تم آبھنگ خاں کو زیر کر لو گے تو قلعہ کی کنجیاں سپرد کر دُوں گی۔ مگر اتنا ہے۔ کہ دولت آباد میری جاگیر میں رہے اور یہ بھی اجازت ہو کہ چند روز وہاں جا کر رہوں۔ جب چاہوں حاضر درگاہ ہوں۔ بہادر کو روانۂ دربار کر دوں گی۔ افسوس میرے ہمراہیوں کے دل نہ دینے سے کام میں دیر ہو گئی۔ شاہ گڑھ میں لشکر دیر تک پڑا رہا۔ اور شاہزادے کی آمد آمد بجھ گئی۔ آبھنگ خاں کی بداندیشی بھڑک اُٹھی۔ شمشیر الملک کو (کہ حکومت برار اُس کے خاندان میں تھی) قید خانہ سے نکال کر فوج لے اور دولت آباد سے ہوتا ہوا برار کو چلا۔ کہ وہاں فوج بادشاہی کا مال و اسباب اور اہل و عیال ہیں یہ لوگ گھبرائینگے۔ اور لشکر میں تفرقہ پڑ جائیگا۔ مجھے تو پہلے سے خبر تھی۔ مرزا یوسف خاں وغیرہ کو فوج دے کر اُدھر بھیج چکا تھا۔ مگر یہ بے پروائی کے خواب شیریں میں رہے۔ وہ ولایت برار میں داخل ہوا اور کھلبلی مچا دی۔ بہت پاسبانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اکثر محبت کے مارے اہل و عیال کی غمخواری کو اُٹھ دوڑے۔ مَیں نے اُدھر فوج بھیجی۔ اور خود احمد نگر کو روانہ ہوا۔ کہ باہر کے بدگوہروں کی گردن دباؤں۔ اور چاند بی بی کی بات کا کھوٹا کھرا دیکھوں۔ ایک منزل چلے تھے۔ کہ مخالفوں نے سب طرف سے سمٹ کر احمد نگر کا رُخ کیا کہ اسے بچائیں۔ مگر اقبال اکبری نے خبر اُڑا دی کہ شمشیر الملک مر گیا یوسف خاں بھی چونک کر دوڑے۔ کئی سرداروں کو آگے بڑھا دیا۔ اُنھوں نے دم نہ

لیا مارا مار چلے گئے۔ رات کو ایک جگہ جا لیا۔ عجب ہل چل مچی۔ اسی حال میں شمشیر الملک مارا گیا اور فتح کا شادیانہ بجا ٭

مہم کامیابی کے رستہ پر تھی۔ اور اُن کا لشکر دریائے گنگ کے کنارہ منگی پٹن پر تھا۔ جو شاہزادے کے احکام متواتر پہنچے۔ کہ تمہاری عرقریزی نزدیک و دور کے دلوں پر نقش ہو گئی۔ ہم چاہتے ہیں۔ کہ ہمارے سامنے احمد نگر فتح ہو۔ تم ارادہ سے باز رہو۔ اب ہمیں راہ نوردی میں دیر نہ ہو گی۔ یہاں لشکر میں ایک نئی شورش اُٹھی۔ شاہزادہ جب برہان پور پہنچا۔ تو بہادر خاں قلعہ آسیر سے نہ اُترا۔ شاہزادے نے چاہا کہ اُس بدماغ کی گردن مسل ڈالے۔ مرزا یوسف خاں احمد نگر کی فوج کشی میں تھا۔ اور آگے بڑھا چاہتا تھا۔ اُسے بُلا لیا۔ یہ دیکھ کر اوروں نے بھی اُدھر کا رُخ کیا۔ بہتیرے سردار بے اجازت بھی اُٹھ چلے۔ غنیم جو دل میں تھرا رہا تھا۔ یہ حال دیکھ کر شیر ہو گیا۔ کئی دفعہ شبخون مارا۔ بہادروں نے خوب دل لڑائے۔ اور اچھی دھکا پیل کی۔ حفاظت الٰہی اور متواتر فتحوں سے غنیم تتر بتر ہو گئے۔ اور آبھنگ خاں نے خوشامد اور عاجزی شروع کی ٭

چالش گیہاں خدیو بکشایش احمد نگر

اکبر کو دانیال اور بہادر خاں کے معاملہ کی خبریں پہنچیں (ابوالفضل نے بھی لکھا ہو گا کہ شاہزادہ لڑکپن کرتا ہے۔ احمد نگر کا بنتا ہوا کام بگڑ جائیگا۔ آسیر کا کام تو جب حضور چاہیں گے بنا بنایا موجود ہے) شاہزادے کے نام فرمان جاری ہوا کہ احمد نگر پر چڑھے چلے جاؤ۔ بہادر خاں کا حاضر نہ ہونا سرتابی سے نہیں ہے۔ اس معاملہ کو ہم سمجھ لیں گے۔ شہزادہ روانہ ہوا۔ اور بادشاہ آگے بڑھے۔ بہادر خاں نے کبیر خاں اپنے بیٹے کو چند خاصوں کے ساتھ حضور میں بھیج کر عمدہ پیشکش گذرانے۔ لیکن باوجود آمد و رفت امرا اور متواتر فہمائشوں کے حاضر نہ ہوا۔ ناچار لشکر کشی کا حکم ہوا۔ اور ابوالفضل کو فرمان پہنچا۔ کہ انتظامِ سپاہ مرزا شاہرخ کے سپرد کر کے برہان پور میں چلے آؤ۔ اگر بہادر خاں نصیحت کو سمجھ کر ہمراہی کرے تو گناہ سابقہ کے عفو کا مژدہ سُنا کر ساتھ لے آؤ۔ ورنہ جلد حضور میں حاضر ہو کر

مشورت کرنی ہے +

یہ برہان پور کے قریب پہنچے تو بہادر خاں آکر ملا۔ ان کی نصیحتیں سُن کر ہمراہی کے رستہ پر آیا۔ مگر گھر جا کر پھر پلٹ گیا۔ اور بیہودہ سا جواب دیدیا۔ یہ حسب فرمان آگے بڑھے۔ یہاں جشن نوروزی کی دھوم دھام ہو رہی تھی۔ رات کا وقت تھا پریاں ناچ رہی تھیں۔ نغمہ پرداز جادوگری کر رہے تھے۔ تاروں بھرا آسمان چاندنی رات کی بہار تھی۔ پھولوں بھرا چمن دونوں کے مقابلے ہو رہے تھے۔ مبارک ساعت میں درگاہ پر آکر پیشانی رکھدی۔ اکبر کے دل کی محبت اس سے قیاس کرنی چاہئے کہ اس وقت یہ شعر پڑھا ؎

فرخندہ شبے باید وخوش مہتابے	تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

شیخ شکر یہ میں بڑی دیر تک اسی طرح چپکے رہے۔ خان اعظم شیخ فرید بخشی بیگی اور ان کو حکم ہوا کہ جا کر آسیر کو گھیرو اور مورچے لگا دو۔ جلد ہی تعمیل ہوگئی۔ شیخ فرید والی فوج اپنی کمی اور غنیم کی زیادتی سے دُور بینی کرکے تین کوس پر تھم گئے۔ مگر کچھ بلند نظر (غالباً خان اعظم مراد ہیں) اشخاص نے رنج دیا اور حضور مکدر ہوگئے۔ جب شیخ حضور میں آئے اور حقیقت سُنائی تو کدورت رفع ہو گئی۔ ابوالفضل کو اُسی دن ۴ ہزاری منصب اور صوبہ خاندیس کا انتظام سپرد ہؤا۔ اُنھوں نے جا بجا آدمی بٹھائے۔ ایک طرف بھائی شیخ ابوالبرکات کو بہت سے داناؤں کے ساتھ بھیجا۔ دوسری طرف شیخ عبدالرحمن اپنے فرزند کو۔ بندگان آلہی کے ہمّت سے تھوڑی فرصت میں سرکشوں کی گردنیں خوب سُبلیں۔ اکثروں نے فرمانبرداری کے عیش کمائے۔ سپاہ نے اطاعت کی۔ زمینداروں کی خاطر جمع ہوگئی۔ اور اپنے کھیت سنبھالے +

ابوالفضل نے بادشاہی عنایت واعتبار اور اپنی لیاقت اور حسن تدبیر سے ایسی رسائی پیدا کی تھی کہ اس کی تدبیروں اور تحریروں کی کمندوں نے علاقہ کے حاکموں کو کھینچ کر دربار میں حاضر کر دیا۔ بھائی اور بیٹا خاندیس کے ملک میں جانفشانی کر رہے تھے۔ بادشاہ نے شیخ کو چار ہزاری منصب سے سربلند کیا۔ صفدر خاں کہ راجی علی خاں کا پوتا اور شیخ کا بھانجا تھا۔ وہ حسب الطلب آگرہ سے حاضر حضور ہؤا۔ اور ہزاری منصب عنایت ہؤا۔ کہ خاندانی سردارزادہ ہے۔ اس کی فہمائش کی ملک میں اچھی تاثیر

ہوگی۔ (ابوالفضل کے انجام کو جہانگیر سے بڑا علاقہ ہے۔ اکبر نامہ کے مطالعہ سے دلوں کے حال جا بجا کھلتے ہیں۔ اس مقام پر میں فقط اِس واقعہ کا ترجمہ لکھتا ہوں۔ جو مہم مذکور میں پیش آیا۔ کہ شیخ خود لکھتے ہیں) اس سال کے واقعات سلطنت میں بڑے شاہزادے کی ناہنجاری ہے۔ اس نونہال دولت کو رانائے اودے پور کی گوشمالی کے لئے بھیجا تھا۔ اُس نے آرام طلبی اور بادہ خواری اور بدصحبتی کے ساتھ کچھ مدت اجمیر میں گذاری۔ پھر اودے پور کو اُٹھ دوڑا۔ اُدھر سے رانا نے آکر ہل چل مچادی اور آباد مقام لُوٹ لئے۔ مادھو سنگھ کو فوج دے کر اُدھر بھیجا۔ رانا پھر پہاڑوں میں گھُس گیا۔ اور پھرتی ہوئی فوج پر شبخون لایا۔ بادشاہی سردار اَڑے مگر کیا ہو سکتا تھا۔ ناکام پھرے۔ یہ خدمت شائستگی سے سرانجام ہوتی نظر نہ آئی۔ مصاحبوں کے کہنے میں آکر پنجاب کا ارادہ کیا کہ وہاں جا کر دل کے ارمان نکالے۔ دفعتہً افغانان بنگالہ کی شورش کا شور اُٹھا۔ راجہ مان سنگھ نے ادھر کا رستہ دکھایا۔ مہم کو ناتمام چھوڑ کر اُٹھ دوڑا۔ آگرہ سے چار کوس اوپر چڑھ کر جمنا اُترا۔ مریم مکانی کے سلام کو بھی نہ گیا۔ وہ ان حرکتوں سے آزردہ ہوئیں۔ پھر بھی محبت کے مارے آپ پیچھے گئیں۔ کہ شاید سعادت کی راہ پر آجائے۔ ان کے آنے کی خبر سُن کر شکارگاہ سے کشتی پر بیٹھا۔ اور جھٹ دریا کے رستے آگے بڑھ گیا۔ وہ مایوس ہو کر چلی آئیں اُس نے الہ آباد پہنچ کر لوگوں کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ بہار کا خزانہ ۳۰ لاکھ سے سوا تھا۔ وہ لیا اور بادشاہ بن بیٹھا۔ بادشاہ کو محبت بے حد تھی۔ کہنے والوں نے اصل سے بھی زیادہ باتیں بنائیں۔ اور لکھنے والوں نے عرضیاں بھیج کر سمجھائیں۔ باپ کو ایک بات کا یقین نہ آیا۔ فرمان بھیج کر اس سے حال دریافت کیا تو بندگی کا ایک افسانۂ طولانی سُنا دیا۔ کہ مَیں بے گناہ ہوں اور آستان بوسی کو حاضر ہوتا ہوں۔

اس عرصہ میں ابوالفضل کی کارگذاریاں جاری تھیں۔ بہادر خاں کو اور اسکے سرداروں کو خطوط لکھتے تھے اور اسکے اثر کہیں کم کہیں پُورے ظاہر ہوتے تھے ایک موقع پر اپنے پیارے شہر یار کے حال میں لکھتے ہیں

لعل باغ میں آکر آرام لیا۔ اُس گلشن کی چمن پیرائی راقم کے سپرد تھی۔ مَیں دیر تک عجز و نیاز سے شکرانے کرتا رہا۔ سعادتوں کے دروازے کُھلے۔ **بیت**

ترا گھر میرا منزل گاہ ہوا ایسے کہاں طالع	خدا جانے کدھر کا چاند آج اسے ماہر نکلا

فتح آسیر

آسیر[1] کے پہاڑ کے اوپر عمدہ اور مستحکم قلعہ ہے مضبوطی اور بلندی میں بے مثل۔ کمرگاہِ کوہ میں شمال کو قلعۂ مالی ہے۔ جو اُس نادر قلعہ میں جائے۔ اِس میں ہو کر جائے۔ اس قلعہ کے شمال میں چھوٹی مالی ہے۔ اس کی تھوڑی سی تعمیری دیوار ہے۔ باقی پہاڑ کی دھار دیوار ہو گئی ہے۔ جنوب کو اُونچا پہاڑ ہے۔ کردہ نام۔ اس کے پاس کی پہاڑی ساپن کہلاتی ہے۔ سرکشوں نے ہر جگہ کو توپوں اور سپاہیوں سے مضبوط کر رکھا تھا۔ کوتہ اندیش جانتے تھے کہ کوٹ نہ سکیگا۔ غلہ گراں۔ منڈیاں دُور۔ قحط سے سب بے دل ہو رہے تھے۔ اور قلعہ والوں کی زر فشانی نے آس پاس کے بہت سے لوگوں کو پُھسلا لیا تھا۔

بادشاہی سردار اپنے اپنے مورچوں سے حملے کرتے تھے۔ مگر غنیم پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ شیخ نے ایک پہاڑ کی گھاٹی سے ایسا چور رستہ معلوم کیا۔ جہاں سے فعتہً مالی کی دیوار کے نیچے جا کھڑے ہوں۔ بادشاہ سے عرض کر کے اجازت لی۔ اور جو امرا محاصرہ میں جانفشانی کر رہے تھے سب سے مل کر قرار پایا۔ کہ فلاں وقت میں حملہ کروں گا۔ جب نقارہ اور کرنا کی آواز بلند ہو۔ تم بھی سب نقارہ بجاتے نکل پڑو۔ کام ناکام سب نے مانا۔ مگر اکثروں نے اس بات کو کہانی سمجھا۔

ایک رات کہ اندھیری بھی بہت تھی۔ اور مینہ برس رہا تھا۔ آپ خاصگی سپاہ کی ٹولیاں باندھ کر پایہ بپایہ ساپن پہاڑی پر چڑھاتا رہا۔ پچھلی رات تھی کہ پہلے فوج نے اُسی چور رستہ سے ہو کر مالی کا دروازہ جا توڑا۔ بہت سے دلاور قلعہ میں گُھس گئے اور نقارے اور کرنا بجانے شروع کر دیے۔ میں یہ سنتے ہی خود دوڑا۔ پوہ پھٹتی تھی کہ سب جا پہنچے۔ دوسری طرف سے دیوار پر ٹھابیں ڈال کر سب سے پہلے آپ قلعہ میں کُود پڑا۔ پھر اور بہادر چیونٹیوں کی قطار ہو کر چڑھ گئے۔ تھوڑی دیر میں غنیم کا ورق اُلٹ گیا۔ اُس نے قلعہ آسیر کی راہ لی اور مالی قبضہ میں آ گیا۔ اس ناکامی کے سبب سے

[1] آسا آہیر کا بنایا ہوا ہے کہ کسی زمانہ میں بڑا صاحب ہمت اور فتحیاب جوانمرد تھا۔ بیشمار خزانے اُسکی بنیاد استواری میں دبا کر دُنیا سے اُٹھ گیا۔

بہادر خاں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اُدھر سے خبر آئی کہ دانیال اور خانخاناں نے احمد نگر فتح کیا۔ سب سے زیادہ یہ کہ قلعہ میں بیماری پھیل گئی اور غلّوں کے ذخیرے ایسے سڑ گئے۔ کہ انسان تو درکنار حیوان تک مُنہ نہ ڈالتے تھے۔ رعیت اور سردار سب کے جی چھوٹ گئے۔ اور کچھ عرصہ تک قیل و قال ہوتی رہی۔ آخر گھبرا کر قلعہ آسیر بھی حوالہ کر دیا۔ ۱۰۰۹ھ ۱۶۰۱ء

غیرتِ مردانہ۔ سلطان بہادر گجراتی کے غلاموں میں سے ایک پرانہ بڈھا تھا۔ کہ سلطان کی تباہی کے بعد (ہمایوں کے آغاز سلطنت میں) یہاں آن بیٹھا تھا قلعہ کی کُنجیاں اُسی کے سپرد تھیں۔ اب اندھا ہوگیا تھا۔ جوان جوان بیٹے تھے۔ پاسبانی کے بُرج ایک ایک کے حوالے تھے۔ اُس نے سپردگی قلعہ کی خبر سُنتے ہی جان خدا کے سپرد کی۔ اُس کے بیٹوں کی ہمت دیکھو کہ سُن کر بولے۔ اب اس دولت کو اقبال نے جواب دیا۔ زندگی بے حیائی ہے۔ یہ کہہ کر افیم کھالی۔ ناسک والوں نے پناہ مانگی تھی مگر امرا کی بے پروائیوں سے زور پکڑ نے پکڑتے بگڑ گئے۔ اور مقدمہ ایک مہم ہو گیا۔ خانخاناں کو احمد نگر اور انہیں عمدہ خلعت اور خاصے کا گھوڑا اور علم و نقارہ سے سربلند کر کے اُدھر روانہ کیا۔

اُدھر تو اقبال اکبری ملک گیری اور کشور کشائی میں طلسم کاری کر رہا تھا۔ اِدھر خیر اندیشوں کی عرضیاں اور مریم مکانی کا مراسلہ آیا۔ کہ جہانگیر کھُلم کھُلا باغی ہو گیا۔ بادشاہ نے سب کام اُسی طرح چھوڑے اور امرا کو خدمتیں سپرد کر کے ادھر روانہ ہوا۔

ناسک کی مہم شروع ہو گئی تھی۔ جو انہیں فرمان پہنچا۔ کہ احمد نگر کی طرف جا کر خان خاناں کے ساتھ خدمت بجالاؤ۔ یہ حیران رہ گئے۔ کہ یہاں بہت سے دلاوروں کو سمیٹا تھا۔ ناسک کا قلعہ اور سرکشوں کی گردن ٹوٹا چاہتی تھی۔ خدا جانے جو جیلہ پرداز خدمت میں حاضر تھے۔ اُنہوں (یعنی خانخاناں کے طرفداروں) نے بادشاہ کی رائے پھیر دی۔ یا اصلیت حال معلوم نہ ہوئی۔ خانخاناں کی طرفداری حد سے گزر گئی۔ کہ مجھے یہاں سے بُلا لیا۔ عبدالرحمٰن کو مہم سپرد کر کے تعمیل حکم بجالایا۔ یہاں پہنچے تو خان خاناں انہیں کبھی صلاح و مشورے میں رکھتے تھے۔ کبھی کسی کی سرکوبی کو۔ کبھی کسی کی سرکوبی کو۔ کبھی کسی دکھنی سردار کی فہمائش کو بھیجتے تھے۔ یہ دل میں تنگ

تھے۔ مگر اُن کی طبعیت میں یہ بات داخل تھی۔ کہ احکام بادشاہی کو اس طرح بجالاتے تھے۔ گویا اُن کی اصل رائے یہی ہے۔ اُن کا دل تحمّل کا پہاڑ تھا۔ اور حوصلہ دریائے ذخار۔ یہاں بھی حکم کی تعمیل کو اپنا فرض سمجھ کر وقت کے منتظر تھے +

آزاد ۔ زال دنیا عجیب چیز اور عجیب طرح کی علامۂ دہر ہے۔ مرد دین دار کو بھی دہریہ کر دیتی ہے۔ دیکھو جن دو دوستوں کے مراسلے۔ عاشق و معشوق کے قبالے نظر آتے تھے۔ جب اس بڑھیا پر دونوں کا معاملہ آن پڑا۔ تو ایسے بگڑے کہ سب بھول گئے +

یہ بھی اور ان کا بیٹا بھی باوجود مُلّا ہونے کے اکبری دولت میں ترکتازِ ترکانہ و حیلہ ہائے مردانہ سے وہ کام کرتے تھے۔ کہ دیکھنے والوں کی عقل حیران تھی +

اکبر نامہ کے ۳۶ سنہ جلوس کے آخر میں ایک مقام کی عبارت اہل نظر کو آگاہ کرتی ہے۔ کہ وہ بالیاقت کار آگاہ کسی خدمت میں ہو۔ مگر اُس کا رُعب داب کس مقدار پر تھا +

مجھ راقم شگرفنامہ کو ناسک پر بھیجا۔ رستہ میں شہزادہ کی ملازمت حاصل کی۔ اُنہوں نے اپنی خواہش ظاہر کی۔ کہ ہمارے حضور میں آجاؤ۔ مَیں نے بھی قبول کی۔ وہی راجو کی مہم تھی۔ جس کا وبال میرے سر پر رکھنا چاہتے تھے۔ مَیں نے جواب دیا۔ کہ حضور کے فرمانے سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن آپ کام پر توجّہ نہیں فرماتے۔ ایسا امرِ عظیم چند لالچی تنگ چشموں پر چھوڑ دیا ہے۔ بے پروائی اور ناتواں بینی کے ہنگامہ میں کیونکر کام ہو سکے ؟ بارے کچھ سمجھے۔ کارسازی کا آپ ذمّہ لیا۔ اور گھوڑا اور خلعت دے کر اُدھر روانہ کیا۔ پہلی منزل میں اپنے قدم مبارک سے اعزاز بڑھایا۔ (یعنی میرے خیمہ میں آئے۔) خاص کمر کا جمدھر اور نامور ہاتھی بھی عنایت فرمایا +

معتمد خاں نے اقبال نامہ میں لکھا ہے۔ کہ ۱۰۰۹ھ / ۱۶۰۱ء میں ۲۰ ہاتھی معہ ہتھنال اور ۱۰ عمدہ گھوڑے انعام ہوئے۔ ۱۰۱۰ھ میں ایک خاصہ کا گھوڑا۔ اس کے ساتھ ایک گھوڑا عبدالرحمٰن کو عنایت کیا۔ اور ۲۰ گھوڑے پھر بھیجے۔ ایک شیخ ابوالخیر کو

عنایت فرمایا۔ کہ شیخ کو بھی بھیج دو۔ اسی سنہ میں ۵۰ ہزار روپیہ شیخ کو انعام ملا۔ اور ایسے ایسے انعاموں کی انتہا نہ تھی۔ ہمیشہ ہی ملتے رہتے تھے۔ اسی سال میں شیخ کو پنجہزاری منصب مرحمت ہوا۔ غرض تخمیناً تین برس دکن میں اس طرح بسر ہوئے کہ ایک ہاتھ میں شمشیر و علم تھا۔ اور ایک ہاتھ میں کاغذ و قلم تھا۔ رمضان ۱۰۱۰ھ میں وہیں اکبر نامہ کی جلد سوم تمام کی ہوگی۔ اور اُس کا خاتمہ تصنیفات کا خاتمہ تھا ✦

اِس ارسطو نے یہ بات اپنے سکندر کے دل پر نقش کر دی تھی۔ کہ فدوی حضور کی ذات قدسی سے غرض رکھتا ہے اور یہ امر واقعی تھا۔ وہ کہا کرتا تھا اور سچ کہتا تھا۔ کہ آپ کی خیر طلبی اور ہوا خواہی اور جاں نثاری میرا دین و آئین ہے۔ جس کی بات ہوگی بے رو رعایت عرض کر دُوں گا۔ امرا بلکہ شہزادوں تک سے بھی غرض نہیں اور چونکہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ اس لئے اکبر کے دل پر یہ نقش پورا بیٹھا تھا۔ شہزادے خصوصاً سلیم اسے اپنا چغلخور سمجھ کر ناراض رہتے تھے۔ اکبر نے مہم دکن سے پھر کر سلیم (جہانگیر) کے ساتھ ظاہری صورت حال کو درست کر لیا تھا۔ ۱۰۱۱ھ ۱۶۰۲ء میں سلیم نے پھر سلامت روی کا رستہ چھوڑا اور ایسا بگڑا کہ اکبر گھبرایا۔ یہ بھی خیال تھا کہ ہونہار شہزادہ کو ولیعہد سلطنت خیال کر کے امرا ضرور سازش رکھتے ہوں گے۔ مان سنگھ کی بہن اس سے بیاہی ہوئی تھی۔ جس کے شکم سے خسرو شہزادہ پیدا ہوا تھا۔ خان اعظم کی بیٹی خسرو سے بیاہی ہوئی تھی۔ غرض بادشاہ نے ابوالفضل کو لکھا کہ مہم کے کاروبار عبدالرحمٰن فرزند کے سپرد کرو۔ اور آپ جریدہ ادھر روانہ ہو۔ ابوالفضل نے اس کے جواب میں نہایت اطمینان اور تشفی کے مضامین سے عرضی بھیجی۔ اور لکھا کہ فضل الٰہی اور اقبال اکبر شاہی کارسازی کریگا۔ تردد کا مقام نہیں۔ اور فدوی حاضر خدمت ہوا ✦

چنانچہ احمد نگر میں عبدالرحمٰن کو مہم کے کاروبار سمجھا کر لشکر اور سامان وہیں چھوڑا۔ آپ جریدہ فقط ان آدمیوں کو لے کر روانہ ہوا۔ کہ جن کے بغیر گزارہ نہ تھا۔ سلیم شیخ سے بہت خفا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا۔ کہ اگر یہ حضور میں آپہنچا تو باپ کی آزردگی اور بھی زیادہ ہو جائیگی۔ اور اِدھر اُدھر کے راجاؤں اور سرداروں سے ساز باز کر کے ایسی

تدبیریں کرے گا کہ میرا کام برہم ہو جائیگا۔ جب سُنا کہ جریدہ دکن سے چلا ہے۔ تو راجہ مدھکر کا بیٹا راجہ نرسنگھ دیو کہ انڈچھہ کا بندیلہ سردار تھا۔ اُن دنوں میں رہزنی کر کے دن کاٹتا تھا۔ اور اس بغاوت میں شہزادہ کے ساتھ تھا۔ اُسے سلیم نے خفیہ لکھا کہ کسی طرح رستہ میں شیخ کا کام تمام کر دے۔ اگر خدا نے تخت نصیب کیا تو خاطر خواہ رُتبہ اور انعام سے سرفراز کرونگا۔ اس نے دربار شاہی میں بہت بیعزتی اُٹھائی تھی۔ اس لئے نہایت خوشی سے اس خدمت کو قبول کیا اور دوڑا دوڑا اپنے علاقے میں جا پہنچا۔

جب شیخ اجین میں پہنچا تو خبر اُڑ رہی تھی کہ راجہ اس اس طرح ادھر آیا ہوا ہے۔ رفیقاں جاں نثار نے شیخ سے کہا۔ کہ ہماری جمعیت تھوڑی ہے۔ اگر یہ خبر سچ ہے تو مقابلہ مشکل ہوگا۔ بہتر ہے کہ اس رستہ کو چھوڑ کر چاندہ کی گھاٹی سے چلیں۔ قضا آ چکی تھی۔ شیخ نے بے پروائی سے کہا۔ کہ بکتے ہیں۔ چور کا کیا حوصلہ ہے جو بندگان شاہی کا رستہ روکے۔

ربیع الاوّل کی پہلی سنہ ۱۰۱۱ھ جمعہ کا دن صبح کا وقت تھا۔ شیخ منزل سے اُٹھا دو تین آدمی ساتھ باگ ڈالے جنگل کا لطف اُٹھاتا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاتا باتیں کرتا آگے چلا جاتا تھا۔ سرائے برار سے آدھ کوس رہا تھا۔ اور قصبہ انتری ۳ کوس سوار نے دوڑ کر عرض کی کہ دو گرد و غبار اُٹھا ہے اور رُخ اس طرف معلوم ہوتا ہے شیخ نے باگ روکی اور غور سے دیکھا۔ گدائی خاں افغان قدیمی جاں نثار برابر تھا۔ اُس نے عرض کی ٹھیرنے کا وقت نہیں۔ دشمن بڑے زور میں آتا معلوم ہوتا ہے۔ ادھر جمعیت بہت کم ہے۔ اس وقت صلاح یہی ہے کہ تم آہستہ آہستہ چلے جاؤ۔ میں ان چند بھائیوں اور ہمراہیوں سے جانفشانی کر کے روکتا ہوں۔ ہمارے مارتے مرتے تک فرصت بہت ہے۔ یہاں سے قصبہ انتری دو تین کوس ہے بخوبی پہنچ جاؤ گے۔ پھر کچھ خطر نہیں۔ رائے رایاں اور راجہ راج سنگھ دو تین ہزار آدمیوں سے وہاں اُترے ہوئے ہیں۔ شیخ نے کہا گدائی خاں تجھ جیسے شخص سے تعجّب ہے کہ ایسے وقت پر یہ صلاح دیتا ہے۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ نے مجھ فقیر زادے کو گوشۂ مسجد سے صدر مسند پر بٹھایا۔ میں آج اُن کی شناخت کو

خاک میں ملادوں۔ اور اس چور کے آگے سے بھاگ جاؤں کس مُنہ سے؟ اور کس عزت سے ہمچشموں میں بیٹھ سکونگا؟ اگر زندگی ہوچکی ہے اور قسمت میں مرنا ہی لکھا ہے تو کیا ہو سکتا ہے۔ یہ کہہ کر نہایت دلاوری اور بے باکی سے گھوڑا اُٹھایا۔ گدائی خاں پھر گھوڑا مار کر آگے آیا۔ اور کہا کہ سپاہیوں کو ایسے معرکے بہت پڑتے ہیں۔ اَڑنے کا وقت نہیں ہے۔ انتری میں جانا اور ان لوگوں کو ساتھ لے کر پھر ان پر آنا اور اپنا انتقام لینا تو سپاہیانہ پیچ ہے۔ قضا آچکی تھی۔ کسی عنوان راضی نہ ہوُا۔ یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ غنیم آن پہنچا۔ اور ہاتھ ہلانے کی فرصت نہ دی۔ شیخ بڑی بہادری سے تلوار پکڑ کر ڈٹا چند افغان ساتھ تھے۔ جانیں نثار کر کے سرخرو ہوئے۔ شیخ نے کئی زخم کھائے۔ مگر ایک برچھے کا زخم ایسا لگا کہ گھوڑے سے گر پڑا۔ جب لڑائی کا فیصلہ ہوُا۔ تو لاش کی تلاش ہوئی۔ دیکھا۔ کہ وہ دلاور جو کبھی اکبری تخت کا پایہ پکڑ کر عرض و معروض کرتا تھا۔ اور کبھی سمندِ فکر پر چڑھ کر عالمِ خیال کو تسخیر کرتا تھا۔ ایک درخت کے نیچے خاکِ بیکسی پر بے جان پڑا ہے۔ زخموں سے خون بہتا ہے۔ اور اِدھر اُدھر لاشے پڑے ہیں۔ اُسی وقت سر کاٹ لیا۔ اور شہزادے کے پاس بھجوا دیا۔ شہزادے نے پاخانہ میں ڈلوا دیا۔ کہ دنوں وہیں پڑا رہا۔ قسمت میں یونہی لکھا تھا۔ ورنہ شہزادے کی خفگی کیسی ہی سخت ہو کہہ دیتا کہ خبردار شیخ کا بال بیکا نہ ہو اور شرط یہ ہے کہ زندہ ہمارے سامنے حاضر کرو۔ مگر شرابی۔ کبابی ناتجربہ کار لڑکے کو اتنے ہوش و حواس کہاں تھے جو سمجھتا کہ جیتے پر ہر وقت اختیار ہوتا ہے۔ مر ہی گیا تو کیا ہو سکتا ہے +

امرائے اکبری کے دلوں کا حال اس نکتہ سے کھلتا ہے کہ کوکلتاش خاں نے تاریخ لکھی مصرع

تیغ اعجاز نبی اللہ سر باغی برید

مگر اُس نے خود خواب میں اُس سے کہا کہ میری تاریخ تو بندہ ابوالفضل کے اعداد سے نکلتی ہے افسوس) یہ ہے کہ ملا ئے بدایونی اُس وقت نہ رہے تھے۔ اگر ہوتے تو خوشیاں مناتے۔ اور خدا جانے کیا گُل پھول لگا کر مضامین قلمبند کرتے +

جہانگیر جس طرح ہر بات بے پروائی سے کر گزرتا تھا۔ اُسی بے پروائی سے

اپنی توزک میں لکھ بھی لیتا تھا۔ چنانچہ جہاں تخت نشین ہو کر امرا کو منصب دیے ہیں وہاں کہتا ہے۔ بندیلی راجپوتوں میں سے راجہ نرسنگھ دیو پر میری نظر عنایت ہے۔ وہ شجاعت نیک ذاتی۔ سادہ لوحی میں اپنے ہمرتبہ لوگوں میں امتیاز تمام رکھتا ہے ۳ ہزاری منصب پر سرفراز ہوا۔ ترقی اور رعایت کا سبب یہ ہوا۔ کہ اخیر کے دنوں میں میرے والد نے شیخ ابوالفضل کو دکن سے بلایا۔ وہ ہندوستان کے شیخ زادوں سے زیادتی فضل و دانائی میں امتیاز تمام رکھتا تھا۔ اور ظاہر حال کو زیور اخلاص سے سجا کر میرے والد کے ہاتھ بھاری قیمت پر بیچتا تھا۔ اُس کا دل مجھ سے صاف نہ تھا۔ ہمیشہ ظاہر و باطن چغلیاں کھاتا رہتا تھا۔ اُن دنوں میں (کہ فتنہ انگیزوں کے فسادوں سے والد بزرگوار مجھ سے ذرا آزردہ تھے) یقین تھا کہ اگر دولت ملازمت حاصل کرے تو اس غبار کو زیادہ اُڑائیگا۔ اور میری دولت مواصلت کو روکے گا۔ اور ایسا کر دیگا۔ کہ مجھے ناچار سعادت خدمت سے محروم رہنا پڑے نرسنگھ دیو کا ملک شیخ کے سرِ راہ تھا۔ اور ان دنوں وہ بھی سرکشوں میں تھا۔ میں نے بار بار پیغام بھیجے کہ اگر اس فتنہ انگیز کو روک کر نیست و نابود کر دے تو رعایت کلی پائیگا۔ چنانچہ توفیق اُس کی رفیق ہوئی۔ جب شیخ اُس کے نواح ولایت میں گزرتا تھا وہ آن پڑا۔ تھوڑی سی ہمت میں اُس کے ہمراہیوں کو تتر بتر کر ڈالا۔ سر الہ آباد میں میرے پاس بھیج دیا۔ اگرچہ اس بات سے عرض آشنائی کی خاطر مبارک بہت آزردہ ہوئی۔ مگر کم سے کم اتنا ہوا کہ میں بےجنست اور بےخطر ہو کر آستان بوسی کو گیا اور رفتہ رفتہ کدورتیں صفائی سے بدل گئیں۔

ہندوستان کے مؤرخ آخر انہی بادشاہوں کی رعایا تھے۔ بےرعایت لکھتے تو بیچارے رہتے کہاں ؟

ملا محمد قاسم فرشتہ اپنی معتبر تاریخ میں اس واقعہ کی بابت فقط اتنا لکھتے ہیں)۔ کہ اس سنہ میں دکن سے شیخ ابوالفضل حاضر حضور ہوتے تھے رستہ میں رہزنوں نے مار ڈالا فقط۔ اور یہ لکھنا ان کا بےجا نہ تھا۔ دیکھ لو کہ فقط حقیقت نویسی کے جُرم میں ملا عبدالقادر کے گھر اور اُن کے بیٹے پر جہانگیر کے ہاتھوں کیا آفت گزری۔ اور خود زندہ ہوتے تو خدا جانے کیا حال ہوتا۔

ڈیلیٹ نام ایک ڈچ سیاح نے اس واقعہ کا حال لکھا ہے۔ اُسے اپنی تحریر میں کسی کا خطرہ نہ تھا۔ اس لئے عجیب نہیں کہ جو کچھ لکھا سچ ہی لکھا ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ سلیم الہ آباد میں آیا اور سلطنت کا دعوےٰ کیا۔ خطبہ اپنے نام کا پڑھوایا۔ روپے اشرفی پر اپنا سِکّہ لگایا۔ بلکہ زرِ مذکور کو مہاجنوں اور اہل معاملہ کے لین دین میں ڈلوا کر آگرہ تک پہنچایا۔ کہ باپ دیکھے اور جلے۔ باپ نے یہ سب حال شیخ کو لکھا اس نے جواب میں لکھا۔ کہ حضور خاطر جمع رکھیں۔ جس قدر جلد کہ ممکن ہے مَیں حاضر ہوا۔ اور شہزادہ کو مناسب خواہ نامناسب حالت سے حضور میں حاضر ہونا پڑیگا۔

غرض شیخ نے کاروبار کی درستی کر کے کئی دن بعد دانیال سے اجازت لی۔ دو تین سو آدمی ساتھ لے کر روانہ ہوا۔ اور حکم دیا۔ کہ اسباب پیچھے آئے۔ سلیم کو سب خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اور جانتا تھا۔ کہ شیخ کے دل میں میری طرف سے کیا ہے۔ ڈرا کہ اب باپ اور بھی ناراض ہوگا۔ اس لئے جس طرح ہو شیخ کو روکنا چاہیئے۔ راجہ نرسنگھ دیو صوبۂ اُجین میں رہتا تھا۔ اُسے لکھا کہ نردا اور گوالیار کے آس پاس گھات میں لگا رہے اور جہاں موقع پائے اُس کا سر کاٹ کر بھیج دے۔ اس پر بہت سے انعام و اکرام اور پنجہزاری منصب کا وعدہ کیا۔ راجہ نے خوشی سے منظور کر لیا۔ ہزار سوار ۳ ہزار پیادے لے کر تین چار کوس پر آن لگا۔ اور جاسوسی کے لئے قراول اِدھر اُدھر پھیلا دیئے کہ خبر دیتے رہیں۔ شیخ کو اس گھات کی بالکل خبر نہ تھی۔ جب کالے باغ میں پہنچا۔ اور نردا کا رُخ کیا۔ تو راجہ کو خبر لگی۔ وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ یکایک آکر ٹوٹ پڑا۔ اور چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور شیخ اور اُس کے رفیق بڑی بہادری سے لڑے۔ مگر دشمنوں کی تعداد بہت تھی۔ اس لئے سب کے سب کٹ کر کھیت رہے۔ شیخ کی لاش دیکھی تو ۱۲ زخم آئے تھے۔ اور ایک درخت کے نیچے پڑا تھا۔ وہاں سے اُٹھا کر سر کاٹا۔ اور شہزادے کے پاس بھیج دیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ فقط

آزاد۔ شیخ کو اس معاملہ میں تمام آلِ تیمور کے مؤرخ الزام دیتے ہیں۔ کہ وہ خود پسند اور خود رائے آدمی تھا۔ اپنی عقل کے سامنے کسی کو سمجھتا ہی نہ تھا۔ یہاں بھی خود رائی کی اور اس کا نتیجہ پایا۔ لیکن درحقیقت یہ مقدمہ غور طلب ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اسے اپنے جوہرِ کمالات اور عقل و دانش سے آگاہی تھی۔ اور اکبر کے دربار میں

جو جانفشاں محنتیں اور جاں نثار خدمتیں کی تھیں اُن پر بھروسہ تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال ہوگا۔ کہ مجھ جیسے شخص کے لئے شہزادہ نے یہ حکم نہ دیا ہوگا کہ جان سے مار ڈالے۔ بلکہ یہ بھی خیال ہوگا کہ اگر اُس شرابی کبابی لڑکے نے کہہ بھی دیا ہوگا تو جو سردار ہوگا وہ مجھے جان سے مارنے کا قصد نہ کرے گا۔ بہت ہوگا تو باندھ کر اُس کے سامنے حاضر کر دیگا۔ امرا بغاوت کرتے ہیں۔ فوجوں کی فوجیں کاٹ کر ڈال دیتے ہیں۔ مُلک لوٹ کر تباہ کر دیتے ہیں۔ پھر بھی تیموری درباروں میں اُن کی خطائیں اس طرح معاف ہو جاتی ہیں کہ مُلک و منصب بحال رہ کر پہلے سے سوا عالی رُتبے پاتے ہیں۔ اور یہاں تو کچھ بات بھی نہیں۔ اتنا ہی ہے کہ شہزادے کو میری طرف سے باپ کے سامنے چغلیاں کھانے کا خیال ہے۔ پس اتنی بات کے لئے میدان سے بھاگنا اور بھگوڑا کہلانا کیا ضرور ہے۔ نامردی اور بزدلی کا داغ کیوں اُٹھاؤں اور یہیں ڈٹ جاؤں۔ انجام یہی ہوگا کہ پکڑ کر شہزادے کے سامنے لے جائینگے۔ یہ سکندر و افلاطون غصہ کے بھوت بن جائیں تو پری بنا کر شیشہ میں اُتارلُوں۔ وہ تو مُورکھ شہزادہ ہے۔ وہ منتر ایسے پھونکوں گا کہ اُٹھ کر ساتھ ہو جائے۔ اور ہاتھ باندھ کر باپ کے پاؤں میں جا رہے۔ مگر وہی بات کہ تقدیر الٰہی۔ وہ کچھ سمجھا تھا اور معاملہ کچھ نکلا۔ اور تم بھی ذرا غور کر کے دیکھو کہ وہ بندیلہ بھی دھاڑمار لٹیرا ہی تھا۔ جو اس طرح پیش آیا۔ کوئی راجہ ہوتا۔ اور راج نیت کی ریت کا برتنے والا ہوتا۔ تو اس وحشیانہ طور سے شیخ کا کام تمام نہ کرتا۔ نہ بات نہ چیت۔ نہ لڑائی کا آگا نہ پیچھا۔ کچھ معلوم ہی نہ ہُوا۔ سینکڑوں بھیڑیئے تھے کہ چند بکریوں پر آن پڑے۔ اور دم کے دم میں چیر پھاڑ کر بھاگ گئے۔

اب اِدھر کی سُنو۔ کہ جب مرنے کی خبر دربار میں پہنچی تو سناٹے کا عالم ہو گیا۔ سب حیران رہ گئے۔ سوچتے تھے کہ بادشاہ سے کہیں کیا؟ کیونکہ اکبر جانتا تھا۔ کہ وہی میرا ایک ذاتی خیر اندیش ہے اور ان میں کوئی امیر دل سے اُس کا خیر خواہ نہیں خدا جانے کیا خیال گزرے اور کدھر بجلی گر پڑے۔ آل تیمور میں دستور قدیم تھا۔ کہ جب کوئی شہزادہ مرتا تھا۔ تو اس کی خبر بادشاہ کے سامنے صاف بے دھڑک نہیں کہہ دیتے تھے۔ اُس کا وکیل سیاہ رومال سے ہاتھ باندھ کر سامنے آتا تھا۔ اور خاموش کھڑا رہتا تھا یعنی یہی ہوتے تھے کہ اُس کے آقا نے انتقال کیا۔

اکبر اُسے اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اِس لئے وکیل سر جھکائے رومال سے ہاتھ باندھے آہستہ آہستہ ڈرتا ہؤا تخت کے گوشہ کی طرف آیا۔ اکبر دیکھ کر متحیر ہوگیا۔ اور کہا خیر باشد کیا ہؤا۔ جب اُس نے بیان کیا تو اس قدر غمناک اور بے قرار ہؤا کہ کسی بیٹے کے لئے یہ حال نہ ہؤا تھا۔ کئی دن تک دربار نہ کیا۔ اور کسی امیر سے بات نہ کی۔ افسوس کرتا تھا اور روتا تھا۔ بار بار چھاتی پر ہاتھ مارتا تھا اور کہتا تھا۔ کہ ہائے شیخوجی بادشاہت لینی تھی تو مجھے مارنا تھا۔ شیخ کو کیا مارنا تھا۔ اس کا بے سر لاشہ آیا تو یہ شعر پڑھا۔ شعر

زاشتیاق پائے بوسی بے سر و پا آمدہ	شیخ ما از شوق بے حد چوں سوئے ما آمدہ

۵۲ برس چند مہینے کا سن۔ مرنے کے دن نہ تھے۔ مگر موت نہ دن دیکھتی ہے نہ رات۔ جب آجائے۔ وہ ہی اُس کا وقت ✦

ابوالفضل کی قبر اب بھی انتری میں موجود ہے۔ جو گوالیار سے پانچ چھ کوس کے فاصلہ پر ہے۔ اور مہاراجہ سیندھیا کا علاقہ ہے۔ اس پر ایک غریبانہ وضع کی عمارت ہے۔ ابوالفضل نے اپنے باپ اور ماں کی ہڈیاں لاہور سے آگرہ پہنچائی تھیں۔ کہ اُن کی وصیت پوری ہو۔ مگر اُس کی لاوارث لاش کا اُٹھانے والا کوئی نہ ہؤا۔ کہ جہاں گرا وہاں ہی خاک کا پیوند ہؤا۔ اُس کے دل کی روشنی اور نیک نیتی کی برکت ہے۔ کہ آج تک انتری کے لوگ ہر جمعرات کو وہاں ہزاروں چراغ جلاتے اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں ✦

گورِ مجنوں پہ کہیں آج چراغاں ہوگا	جگنو اُڑ اُڑ کے چلے جاتے ہیں صحرا کی طرف
ایک ہیں دستِ صنم ایک میں قرآں ہوگا	ہاتھ چومینگے مرے گبر و مسلماں دونو

اکبر بیٹے کو تو کیا کہتے۔ رائے رایاں کو فوج دے کر بھیجا۔ کہ نرسنگھ دیو کو اُس کی بد اعمالی کی سزا دو۔ عبدالرحمٰن کو فرمان لکھا کہ جس کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ تم اس کے ساتھ شامل خدمت ہو۔ اور باپ کی کینہ خواہی اور انتقام سے اپنی حلال زادگی اہل عالم پر آشکارا کرو۔ یہ دونوں مدت تک جنگلوں اور پہاڑوں میں اُس کے پیچھے مارے مارے پھرے وہ کہیں نہ ٹھیرا۔ لڑتا رہا بھاگتا رہا۔ شیخ نے سچ کہا تھا کہ رہزن ہے وہ کس طرح جم کر لڑتا۔ آخر دونوں تھک کر چلے آئے ✦

افسوس کے قلم اور سیہ بختی کی سیاہی سے لکھنے کے قابل یہ بات ہے۔ کہ جو فضل و کمال تھا۔ وہ **فضل اور فیضی** کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا۔ اتنے بھائی اور عبدالرحمٰن اکلوتا بیٹا تھا۔ سب خالی رہ گئے +

ابو الفضل کے مذہب کا بیان ۔ دربار اکبری کی سیر کرنے والوں کو شیخ مبارک کے مذہب کا حال معلوم ہے۔ ابوالفضل اُس کا رشید بیٹا تھا سمجھ لو کہ اس کے خیالات بھی باپ کے خیالات کی نسل پاک تھے۔ البتہ زمانہ کی آب و ہوا سے ذرا رنگ بدل گیا تھا۔ اگرچہ ان نقطوں کو شیخ مبارک فیضی۔ مُلّا صاحب وغیرہ کے بیان میں دائرہ کی گردش سے پھیلا چکا ہوں۔ مگر حق یہ ہے۔ کہ مجھے بھی ان کے بار بار کہنے میں مزا آتا ہے۔ اس لئے ایک دفعہ پھر دل کا ارمان نکالتا ہوں۔ شاید کہ باتوں باتوں میں رُوے حقیقت سے پردہ اُٹھ جائے۔ میرے دوستو تمہیں معلوم ہے اور پھر معلوم کرو۔ کہ شیخ مبارک ایک فاضل ہمہ دان تھا۔ اس دماغ ایسا روشن لے کر آیا تھا کہ چراغ علم کے لئے قندیل فروزاں تھا۔ وہ ہر علم کی کتابیں کامل اُستادوں سے پڑھا تھا اور پڑھاتا تھا اور نظر اُس کی تمام علوم عقلی و نقلی پر برابر چھائی ہوئی تھی۔ باوجود اس کے جو کچھ دل کو حاصل ہو گیا تھا۔ وہ کتابوں کے الفاظ و عبارت میں محدود نہ تھا۔ اور بات وہی تھی جو اُس کی سمجھ میں آگئی تھی +

اسی عہد میں کئی عالم تھے کہ کتابی علوم میں پُورے تھے یا ادھورے۔ مگر نصیبوں کے پورے تھے۔ جس کی بدولت شاہانِ وقت کے دربار میں پہنچ کر شاہی بلکہ خدائی اختیار دکھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ گھی میں تر اور اُنگلیاں رزق کی کُنجیاں دیکھ کر بہت سے علمائے مسند نشین اور مشائخ اور ائمہ مساجد گرد بیٹھے اُن کا کلمہ پڑھا کرتے تھے۔ شیخ مبارک دربار شاہی کا ہوسناک نہ تھا۔ اس کا دل خدا نے ایسا بنایا کہ جب اپنی مسجد کے چبوترہ پر بیٹھتا۔ اور چند طالب علم کتاب کھولے ہوتے۔ تو ایسا لہکتا اور چہکتا تھا کہ وہ لطف باغ میں نہ گل کو حاصل ہے نہ بلبل کو۔ اور بات یہ ہے کہ شاہوں کے دربار اور امرا کی سرکار کی طرف اُس کے شوق کا قدم اُٹھتا ہی نہ تھا۔ البتہ جب کسی غریب پر علمائے مذکور اختیار جابرانہ اور فتووں کے زور سے ظلم کرتے اور وہ التجا لاتا۔ تو اُسے آیتوں اور روایتوں سے سپر

تیار کر دیتا تھا۔ جس سے اُس کی جان بچ جاتی تھی۔ اور اِس بات میں وہ کسی کی پروا نہ کرتا تھا۔ اُن لوگوں کو بھی خبر ہو جاتی تھی۔ اور اپنے جلسوں میں اُس کے چرچے خطرناک الفاظ سے کرتے تھے کبھی رافضی بناتے۔ کبھی مہدوی ٹھیراتے۔ اور اس جرم کی سزا اُس زمانہ میں قتل ہی تھی۔ لیکن اِس کی فضیلت اور حقیقت کا بھروسا اُسے زور دیتا تھا۔ وہ سن کر ہنس دیتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ ہیں کون؟ اور ہیں کیا؟ اور سمجھتے کیا ہیں؟ کبھی گفتگو کا موقع آن پڑا تو سمجھا دینگے +

شیخ مبارک کی اس رسم و راہ نے اُسے اکثر خطر میں ڈالا۔ اور سخت تکلیفوں میں مبتلا کیا۔ لیکن اُسے کچھ بھی پرواہ نہ ہوئی۔ اور ان کے اختلافوں کو ہنسی کھیل سمجھ کر نباہتا رہا۔ ایشیا کے مذاہب مروّجہ خصوصاً فرقہ ہائے اسلام کی کتابوں پر اس کی معلومات چاندنی کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ دشمنوں کی ایذا اور آزار عام دیکھ کر کتب متفرقہ کو اور نظر سے دیکھنے لگا۔ جب کوئی مسئلہ اس طرح کا آتا۔ فوراً کتابی حوالوں سے حریفوں کی حرفت کو بند کرتا یا اختلافی مسئلہ دکھا کر ایسا شبہ پیدا کر دیتا۔ کہ دق ہو کر رہ جاتے لیکن جو کچھ کہتا تھا سوچ سمجھ کر اور حق کو جانچ کر سند اور اصلیت کی بنیاد پر کہتا تھا۔ کیونکہ رقیبوں کے فتووں میں شاہانہ زور ہوتا تھا۔ اگر یہ حق پر نہ ہوتا تو جان پر حرف آتا تھا +

ہمایوں۔ شیرشاہ۔ سلیم شاہ کی بادشاہی میں اُن لوگوں کی خدائی رہی۔ اور اکبری دَور میں چند سال سلطنت ان کی زبان پر چلتی رہی۔ نوجوان بادشاہ کو خیال ہوا۔ کہ دائرۂ سلطنت کو تمام ہندوستان پر پھیلائے۔ اور چونکہ یہاں مختلف قوم اور مختلف مذہب کے لوگ ہیں۔ اس لئے واجب ہوا۔ کہ اپنایت اور محبت کے ساتھ قدم بڑھائے۔ اس نے اس کوشش میں کامیابی بھی پائی۔ مگر علمائے مذکور اس راہ میں چلنا کفر سمجھتے تھے۔ ملک پرور کو واجب ہوا کہ اس کے لئے اِسی ڈھب کے کارگزار بہم پہنچائے۔ فیضی و فضل ہمہ دان عالم تھے۔ اور ہمہ رنگ طبیعت رکھتے تھے۔ انہوں نے آقا کے حکم اور خدمت کے لوازمات کو اُس کی مرضی سے بھی بڑھ کر سرانجام دیا۔ کار سلطنت کا دستور العمل اس امر کو قرار دیا کہ خدا ربّ العالمین اور خلائق کا آسودہ و آباد کرنے والا ہے۔ ہندو مسلمان۔ گبر و ترسا اُس کے نزدیک

سب برابر ہیں۔ بادشاہ سایۂ خدا ہے۔ اُسے بھی یہی بات مدنظر رکھنی واجب ہے۔
اس چھوٹے سے نکتے میں کئی مطلب نکل آئے۔ سلطنت کی بنیاد محکم ہو گئی۔ بادشاہ
کی قربت حاصل ہو گئی۔ جن حریفوں سے جان کا خطر تھا۔ خود بخود ٹوٹ گئے۔
البتہ وہ اور اُن کی اُمّت جو سلطنت اور دولت کو فقط اسلام ہی کا حق سمجھے ہوئے تھے
اُن کے کاروبار پہلی اوج موج پر نہ رہے۔ انہوں نے انہیں بدنام کر دیا۔ اور حق
بات یہی ہے۔ کہ بادشاہ کی فرمائش کو اِس کی مرضی سے بھی کئی درجے بڑھا کر بجا
لاتے تھے۔ بادشاہ کی خوشی دیکھی تو عمامہ بڑھا کر کھڑکی دار پگڑی باندھ لی۔ عبا اُتار
کر جامہ پہن لیا وغیرہ وغیرہ۔ ایک ہندو کو شیخ صدر نے فتوے شریعت کے
زور سے مروا ڈالا۔ اُنہوں نے گفتگو کے معرکہ میں شیخ صدر کی رفاقت نہ کی۔ بادشاہ
کی تقریر کی تائید کرتے رہے۔ اسی ذیل میں ملّا صاحب چوٹ کرتے ہیں۔ مُلکِ
فرنگ کے ریاضت کیش داناؤں کو پادہری کہتے ہیں۔ اور مجتہد کامل کو کہ مصلحتِ
وقت کے بموجب تغیّر احکام بھی کر سکتا ہے۔ اور بادشاہ بھی اُس کے حکم سے
عدول نہیں کر سکتا۔ پاپا کہتے ہیں۔ وہ لوگ انجیل لائے۔ تثلیث کی دلیلیں پیش کیں۔
اور نصرانیت کی حقیّت ثابت کر کے مذہب عیسوی کو رواج دیا۔ بادشاہ نے شاہزادہ
مراد کو فرمایا اور اُنہوں نے شگون برکت کے طور پر چند سبق پڑھے۔ ابوالفضل ترجمہ
کے لئے مقرر ہوئے۔ بسم اللہ کی جگہ یہ مصرعہ تھا۔ ع

اے نامی تو ژژ و کرستو ۔ سبحانک لاشریک یاہو
شیخ فیضی نے کہا

پھر ایک جگہ داغ دیتے ہیں۔ تو سارے علاقہ گجرات سے آتش پرست آئے
انہوں نے دین زردشت کی حقیّت ظاہر کی۔ اور آگ کی تعظیم کو عبادت عظیم بیان کر کے
اپنی طرف کھینچا۔ کیانیوں کی راہ و روش اور ان کے مذہب کی اصلاحیں بتائیں۔ حکم
ہوا کہ شیخ ابوالفضل کا اہتمام ہو۔ اور جس طرح ملک عجم کے آتشکدے ہر دم روشن
رہتے ہیں۔ یہاں بھی ہر وقت کیا دن کیا رات روشن رکھو۔ کہ آیات الٰہی میں سے
ایک آیت اور اُس کے نوروں میں سے ایک نور ہے +

خیر ان باتوں کا مضائقہ نہیں۔ کیونکہ سلطنت کے معاملات کچھ اور ہیں اور
ملکی مصلحت کا مذہب جدا ہے۔ ان میں اکبر پر بھی اعتراض نہیں کر سکتے۔ یہ تو

اُس کے نوکر تھے۔ جو آقا کا حکم ہوتا تھا بجالانا واجب تھا۔ یہاں تک مقدمہ سہل ہے
ہاں مشکل یہ ہے۔ کہ جب شیخ مبارک مر گئے۔ تو شیخ ابوالفضل نے معہ بھائیوں کے بھدرا
کیا۔ اصل فقط اتنی تھی۔ کہ بادشاہ ہر مذہب کے ساتھ محبّت و رغبت ظاہر کرتا تھا۔
ہندوؤں کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اس لئے اُن سے زیادہ مانوس تھے +
چنانچہ جب **اتگہ** مر گئی، اور **مریم مکانی** کا انتقال ہوا تو دونوں دفعہ اکبر نے
خود بھدرا کیا اور دلیل یہ تھی کہ عہد قدیم میں سلاطین ترک بھی ایسے موقع پر بھدرا کیا
کرتے تھے۔ بادشاہ کی خوشی اس میں دیکھی انہوں نے بھی بھدرا کیا یہ سب باتیں
بادشاہ کی دلجوئی اور اس کی مصلحت ملکی کے لئے تھیں۔ ورنہ فیضی و فضل جو اپنی تیزی
فکر اور زور زبان سے دلائل افلاطون اور براہین ارسطو کو روئی کی طرح دھنکتے تھے وہ
اور دین الٰہی اکبر شاہی پر اعتقاد لائینگے یا جزئیات مذکورہ اُن کا عقیدہ ہو جائیگا۔
توبہ توبہ +
سب کچھ کرتے ہونگے۔ اور پھر اپنے جلسوں میں آکر کہتے ہوں گے۔ کہ آج
کیا احمق بنایا ہے۔ دیکھا ایک مسخرہ بھی نہ سمجھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جیسے اُن کے
زبردست حریف تھے۔ اور لاعلاج موقعے پڑتے تھے۔ وہ ایسی تجویزوں کے بغیر ٹوٹ
بھی نہ سکتے تھے۔ یاد کرو مخدوم الملک وغیرہ کا پیام اور ابوالفضل کا جواب کہ ہم بادشاہ کے
نوکر ہیں بینگنوں کے نوکر نہیں +
انشائے ابوالفضل کو دیکھو کہ خانخاناں نے جو ایک مراسلہ شیخ ابوالفضل کو لکھا تھا۔
اُس میں یہ بھی پوچھا تھا۔ کہ تمہاری صلاح ہو تو ایرج کو دربار میں بھیج دوں۔ کہ دین و
آئین سے باخبر ہو۔ یہاں میرے ساتھ لشکر میں رہے۔ اور جنگلوں میں سرگرداں
پھرتا ہے۔ شیخ نے اس کے جواب میں خط لکھا ہے۔ اور نکتہ مذکورہ کے باب میں یہ فقرہ
لکھا ہے۔ دربار میں ایرج کا بھیجنا کیا ضرور ہے۔ تمہیں اس میں اصلاح عقیدہ کا
خیال ہے۔ یہ اُمید بے حاصل ہے۔ اب تم خیال کرو کہ دربار کی طرف سے اُس کے اصلی
خیالات کیا تھے۔ جو یہ فقرہ قلم سے ٹپکا ہے +
اس کی تصنیفات کو دیکھو۔ جہاں ذرا سا موقع پاتا ہے۔ کس خلوص عقیدت سے
مضامین عبودیت اور حق بندگی ادا کرتا ہے۔ اور انہیں فلسفۂ الٰہی کے مسائل میں اس

طرح تضمین کرتا ہے۔ کہ افلاطون بھی ہوتا۔ تو اُس کے ہاتھ چوم لیتا۔ ابوالفضل کے دفتر دوم وسوم کو دیکھئے۔ اُس کی تعریف شیخ شبلی کریں یا جنید بغدادی۔ آزاد کیا کہے سہ

کیونکہ سودا میں کروں وصف بنا گوش اُسکا	نہیں ہے آب گہر سے یہ زباں پاک ہنوز

شاہ ابوالمعالی لاہوری نے اپنے ایک رسالہ میں لکھ دیا ہے کہ میں شیخ ابوالفضل کو اچھا نہ جانتا تھا۔ ایک شب دیکھا کہ اُسی کو لاکر بٹھایا ہے۔ اور وہ آنحضرت کا جُبّہ پہنے ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہؤا۔ کہ اُس کی بخشش کا وسیلہ ایک مناجات ہوئی ہے۔ جس کا پہلا فقرہ ہے۔ الٰہی نیکاں را بوسیلۂ نیکی سرفرازی بخش و بداں را بمقتضائے کرم دلنوازی کن +

ذخیرۃ الخوانین میں لکھا ہے کہ رات کو فقرا کی خدمت میں جاتا تھا۔ اشرفیاں نذر دیتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ ابوالفضل کی سلامتی ایمان کی دعا کرو۔ اور یہ لفظ اُس کا تکیہ کلام تھا کہ آہ کیا کروں۔ بار بار کہتا تھا اور ٹھنڈے سانس بھرتا تھا +

اکبر نے کشمیر میں ایک عالیشان عمارت بنائی تھی۔ کہ ہندو مسلمان جس کا دل رجوع ہو وہاں آکر بیٹھے۔ اور معبود حقیقی کی یاد میں مصروف رہے۔ اس پر عبارت مفصلۂ ذیل نقش کی تھی۔ کہ ابوالفضل نے ترتیب دی تھی۔ ذرا اِس کے الفاظ کو دیکھو۔ کس صدق دل سے ٹپکتے ہیں +

الٰہی بہر خانہ کہ مے نگرم جویائے تواند۔ و بہر زباں کہ مے شنوم گویائے تو۔ شعر

کفر و اسلام در رہت پویاں	وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں

اگر مسجد ست بیاد تو نعرۂ قدوس مے زنند و اگر کلیسیاست بشوق تو ناقوس مے جنبانند۔ رباعی

اے تیر غمت را دل عشاق نشانہ	خلقے بتو مشغول و تو غائب زمیانہ
گہ معتکف دیرم و گہ ساکن مسجد	یعنی کہ ترا مے طلبم خانہ بخانہ

اگر خاصان ترا بکفر و اسلام کارے نیست ایں ہر دو را در پردۂ اسلام تو بارے نہ

کفر کافر را و دیں دیندار را	ذرۂ دردِ دل عطار را

ایں خانہ بہ نیت ائتلاف قلوب موحدان ہندوستان خصوصاً معبود پرستان عرصۂ کشمیر تعمیر یافتہ +

بفرمانِ خدیو تخت و افسر	چراغ آفرینش شاہ اکبر
نظام اعتدال ہفت معدن	کمال امتزاج چہار عنصر

خانہ خرابے کہ نظر صدق نینداختہ ایں خانہ را خراب سازد باید کہ نخست معبد خود را بینداز و چہ اگر نظر بہ دل است باہمہ ساختنی ست و اگر چشم بر آب و گل است ہمہ بر انداختنی۔ **مثنوی**

خداوندا چو داد کار دادی	مدار کار بر نیت نہادی
توئی بر کارگاہِ نیتِ آگاہ	بہ پیش شاہ داری نیت شاہ

بلوک مین صاحب لکھتے ہیں۔ کہ عمارت عالمگیر کے عہد میں منہدم ہوئی۔

ملّا صاحب کی تاریخ کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ کہ جس کے باپ سے فیض تعلیم پایا۔ اُسی کے مذہب و اعتقاد پر ٹوکرے بھر بھر خاک ڈالی۔ بات یہ ہے۔ کہ جب ایک مطلوب پر دو طالبوں کے شوق ٹکراتے ہیں تو ایسے ہی شرارے اُڑتے ہیں۔ دربار میں دونوں جوان آگے پیچھے پہنچے۔ شاگرد کے خیالات چند روز بھی اُستاد اور خلیفہ کے ساتھ درست نہ رہے۔ یہ ضرور تھا کہ ابوالفضل نے بادشاہ کے مزاج اور مناسبت وقت اور اپنی مصلحتِ حال کی نظر سے اکثر باتیں ایسی کیں۔ کہ ملّا صاحب کا فتوےٰ اس کے برخلاف ہوگیا۔ لیکن حق یہی ہے کہ اُن کی روز افزوں ترقی۔ و مبدم کی قربت مُلّا صاحب سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس لئے بگڑتے تھے اور تڑپتے تھے اور جس رستے سے جگہ پاتے تھے بخارات نکالتے تھے۔ پھر بھی لیاقت کی خوبی دیکھو۔ کہ علم و فضل اور تصنیفات میں کچھ سُقم نہیں نکال سکے۔ مگر روئے حسد سیاہ تفسیر اکبری پیش کرنے کا حال اپنی کتاب میں لکھا تو بھی شوشہ لگا دیا۔ کہ لوگ کہتے ہیں۔ اس کے باپ کی تصنیف ہے۔ اچھا یہی ہے تو اُس کے باپ کا مال ہے۔ آپ کے باپ کا تو نہیں۔ اُس کا باپ تو ایسا تھا۔ تمہارا تو باپ بھی ایسا نہ تھا۔ اور اگر حقیقت میں ابوالفضل ہی کی تصنیف تھی۔ تو اس سے زیادہ فخر کیا ہوگا۔ کہ ۲۰ برس کی عمر میں ایک نوجوان ایسی تفسیر لکھے۔ جسے علما اور اہل نظر شیخ مبارک جیسے شخص کا کلام سمجھیں۔ ابوالفضل نے سُنا ہوگا۔ تو کئی چُھچے خون دل میں بڑھ گیا ہوگا۔ ان باپ بیٹوں کے باب میں ملّائے موصوف کا عجیب حال ہے۔ کسی کی بات ہو۔ کسی کا ذکر ہو۔ جہاں موقع پاتے ہیں۔ ان بیچاروں میں سے کسی نہ کسی کے ایک نشتر مار دیتے

ہیں۔ چنانچہ زمرۂ علما میں **شیخ حسن موصلی** کا حال لکھتے ہیں۔ کہ شاہ فتح اللہ کا شاگرد رشید ہے۔ اور خلاصۂ احوال یہ ہے۔ کہ فنونِ ریاضی اور طبعی اور اقسام حکمت میں ماہر ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ فتح کابل کے موقع پر حضور میں پہنچا تھا۔ بڑے شاہزادے کی تعلیم پر معمور ہُوا۔ شیخ ابوالفضل نے بھی یہ علوم اُس سے خفیہ پڑھے۔ اور دقائق اور باریکیاں حاصل کیں۔ پھر بھی اُس کی تعظیم نہ کرتا تھا۔ آپ فرش پر بیٹھتا اور اُستاد زمین پر۔ آزاد خیال کرد۔ کجا شیخ حسن۔ کجا اس کا کمال فضیلت۔ کہیں کا ذکر۔ کہیں کا فکر۔ ابوالفضل غریب کو ایک ٹھوکر مار گئے فیضی بیچارے کو بھی ایسے ہی نشتر مارتے جاتے تھے کہیں ایک ہی تبر میں دونوں کو چھید جاتے ہیں۔ دیکھو فیضی کے حال میں +

شیخ کی انشا پردازی ۔ شیخ کی انشا پردازی اور مطلب نگاری کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ یہ نعمت خداداد ہے۔ کہ خدا کے ہاں سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ ہر ایک مطلب کو اس خوبصورتی سے ادا کرتا ہے کہ سمجھنے والا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ بڑے بڑے انشا پردازوں کو دیکھو۔ جہاں عبارت میں لطف اور کلام میں زور پیدا کرنا چاہتے ہیں تو بہار سے رنگ لیتے ہیں۔ اور حسن و جمال سے خوبی مانگ کر کلام کو رنگین و نمکین کرتے ہیں۔ یہ قادر الکلام اپنے پاک خیالات اور سادہ الفاظ میں اصلی مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ ہزار رنگینیاں ان پر قربان ہوتی ہیں۔ اُس کے سادگی کے باغ میں رنگ آمیزی کا مصوّر آ کر قلم لگائے تو ہاتھ قلم ہو جائیں۔ وہ انشا پردازی کا خدا ہے۔ اپنے لطف خیال سے جیسی مخلوق چاہتا ہے الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ جس عالم میں لکھتا ہے نیا ڈھنگ ہے۔ اور جتنا لکھتا جاتا ہے عبارت کا زور بڑھتا اور چڑھتا چلا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ طبیعت میں تھکن معلوم ہو میں اس کی تصنیف کے ایک ایک نسخہ کی کیفیّت لکھوں گا۔ اور جہاں تک میری ناتمام لیاقت اور نارسا قلم پہنچیگا۔ وہاں تک ان کا حال آئینہ کرونگا +

یہ الفاظ جو اُس کے کمال کے باب میں لکھتا ہوں نہ سمجھنا کہ آج کے رواج بے کمالی کی نسبت سے لکھتا ہوں۔ نہیں اُس وقت کہ ہفت اقلیم کے اہل کمال جمع تھے۔ اور پائے تخت ہندوستان میں ولایتوں کے علماء اور ارباب کمال کا جمگھٹا تھا۔ جب بھی تمام انبوہ کو چیر کر اور سب کو کہنیاں مار کر آگے نکل گیا۔ اُس کے

دست و قلم میں زور تھا۔ کہ ملکوں کے اہل کمال کھڑے دیکھا کرتے تھے۔ اور یہ آگے بڑھتا تھا اور نکل جاتا تھا۔ ورنہ کون کسی کو بڑھنے دیتا ہے۔ وہ مرگیا ہے اور آج تک اس کی تحریر سب سے آگے اور سب سے اونچی نظر آتی ہے۔

امین احمد رازی نے اسی عہد میں تذکرۂ ہفت اقلیم لکھا ہے۔ اس ایرانی کے انصاف پر بھی ہزار آفرین ہے۔ کہ ہندوستانی شیخ کے باب میں اس طرح حق کو ظاہر کیا۔ "بے شائبہ تکلف و سخنوری و بے غائلہ تصنیف و مدح گستری۔ امروز در عقل و فہم نظیر و عدیل ندارد۔ باآنکہ ہموارہ در خدمت شاہنشاہی چوں عرض بجوہر قائم است۔ اگر ساعتے فرصتے مے یابد۔ اوقات را بتحصیل سخنانِ فضلا و تحقیق مطالب حکما مصروف میدارد و درانشا ید بیضا دارد۔ چہ نوادر حکایات بعبارت تازہ در سلک تحریر مے کشد۔ و از تکلفات منشیانہ و تصنیفات مترسلانہ اجتناب واجب مے داند و شاہد ایں معنی اکبر نامہ است وہمچنیں لبشعر خواندن رغبت بسیار دارد و بہ نزاکت و دقت نظم نیک مے رسد و احیاناً بنابر آزمودنِ طبع جواہر نظمے ازکان اندیشہ بیروں مے آرد۔"

تصنیفات۔ اکبر نامہ دفتر اول میں سلسلۂ تیموریہ کا حال ہے مگر مختصر۔ بابر کا کچھ زیادہ ہمایوں کا اس سے زیادہ (عام ترتیب میں یہ جلد اول ہے) پھر اکبر کا ۱۷ برس کا حال۔ اسے قرن اول قرار دیا ہے۔ کیونکہ ۱۳ برس کی عمر میں تخت نشینی کے ۱۷ برس کا حال یہ کل ۳۰ برس ہوئے۔ (عام ترتیب میں اس پر جلد دوئم ختم ہوتی ہے)

دیباچہ میں کچھ عذر بھی لکھے ہیں۔ جیسا کہ باکمال مصنفوں کا انکسار ہوتا ہے۔ یہ منصفانہ تحریر قابل تعریف ہے۔ کہ میں ہندی ہوں فارسی میں لکھنا میرا کام نہیں تھا۔ بڑے بھائی کے بھروسے پر یہ کام شروع کیا۔ اور افسوس یہ کہ تھوڑا ہی لکھا گیا تھا جو ان کا انتقال ہوا۔ دس برس کا حال ان کی نظر سے اس طرح گذرا ہے کہ انہیں اس پر بھروسہ نہ تھا۔ میری خاطر جمع نہ تھی۔

دفتر دوم ۱۸ سنہ جلوس یعنی قرن ثانی سے شروع کیا ہے۔ اور ۴۶ سنہ جلوس ۱۰۱۱ھ پر ختم کیا۔ (عام ترتیب میں جلد سوم ہے۔ باقی آخر عہد اکبر کا حال عنایت اللہ محب نے لکھ کر تاریخ اکبری پوری کی۔ مگر مروج نہیں۔ اسے الفنسٹین صاحب

محمد صالح کی طرف منسوب کرتے ہیں) +

جلد اوّل - جس میں ہمایوں کا حال ختم کیا ہے - اس کی عبارت سلیس منشیانہ محاورہ متانت سے دست و گریبان ہے +

جلد دوم - اکبر کی ۱۷ سالہ سلطنت کا حال ہے - اس میں مضامین کا جوش و خروش - لفظوں کی شان و شکوہ - عبارت زور شور پر ہے - اور بہار کے رنگ اُڑتے ہیں - اس کا اندازہ عالم آرائے عباسی اور انشائے طاہر وحید سے ملتا ہے +

جلد سوم میں رنگ بدلنا شروع ہُوا ہے - عبارت بہت متین سنجیدہ اور مختصر ہوتی جاتی ہے - یہاں تک کہ اُس کے دہ سالہ اخیر کو دیکھیں تو آئین اکبری کے قریب قریب جا پہنچتی ہے - لیکن جس جس رنگ میں ہے اُسے پڑھ کر دل کہتا ہے کہ یہی خوب ہے - ہر جشن جلوس پر بلکہ بعض بعض معرکوں کی ابتدا میں ایک ایک تمہید چند سطر یا آدھے صفحے کی - کہیں بہاریہ رنگ میں - کہیں حکیمانہ انداز میں ہے اس میں دو دو شعر بھی نہایت خوبصورتی کے ساتھ تضمین ہیں - جن میں اکثر رنگینی کم - متانت زیادہ - نمونہ کے طور پر چند جلوسوں کے دیباچے لکھتا ہوں +

آغاز سال ہژدہم الٰہی از جلوس مقدس شاہنشاہی دریں ہنگام سعادت پیرائے اشعۂ رایات سلطان بہار صیقلگر مرأت طبائع شد چمن را بپرند سوری و پرنیان سمن آئین بستند - شمال و صبا خس و خاشاکِ خزاں از گلستانِ روزگار و دفتند اعتدال ہوا چوں عدالت شاہنشاہی نیرنگ سازِ بدائع نگار - و نازگیہائے شگرف و نادرہ کاریہائے نو شگفت افزائے جہانیاں شد ے

خواست پریدن چمن از چابکی	خواست چکیدن سمن از نازکی
قافلہ زن یاسمن و گل بہم	قافیہ گو قمری و بلبل بہم

پس از سپری شدن ہشت ساعت و ہفت دقیقہ شب چہار شنبہ ششم ذلقعد ہفصد و ہشتاد قمری نیر اعظم - فروغ افروز عالم - پرتو محاذات بہ برج حمل انداخت و عالم عنصری فروغ ملک روحانی گرفت +

آغاز سال بست و دوم الٰہی از جلوس اقدس شاہنشاہی شہریار معدلت دوست در حواشئے دیپال پور عبادت نشاء تجرد و تعلق را در نقاب شکار بتقدیم رسانید

صورت را بہ معنی مزاج یکتائی مے بخشد و ظاہر را پایۂ باطن میدہد۔ گلبانگ اعتدال ربیعی چہرہ افروزِ انبساط آمد۔ نشاط را بارگاہ فراخ زوند و ہنگامۂ بخشش رونق دیگر پذیرفت۔ شب دوشنبہ بستم ذو الحجہ بعد از ہفت ساعت و دوازدہ دقیقہ، فروغ افزاے نورستانِ ایزدی پرتو خرمی بحمل انداخت۔ مناظر صورت را رنگ آمیزی مطالع انوار حقیقت در گرفت۔ آسماں جواہر نیسانی بار مغانی بر زمین فرو ریخت۔ و اُو بہ نثارِ قدوم نورسیدگانِ ملک تقدس ہزاراں نقش دلفریب بیروں فرستاد۔ گیتی خدیو مراسم سپاس گذاری را آئین تازہ پیش گرفت۔ و بخشائش را روز بہجت پدید آمد ؎

جہاں از نقش قدرت شد چو صورتخانۂ مانی
زمیں از خرمی گوئی کشادہ آسماں استی

چمن از نور حکمت شد چو فکرِ بوعلی سینا
کشادہ آسماں گوئی شگفتہ بوستاں استی

آغاز سال بست و ششم الٰہی از جلوس شاہنشاہی ؎

علم دولتِ نوروز بصحرا برخاست
چہ ہوائیست کہ خلدش بتحیر بنشست

فیض روح القدس از عالم بربار خاست
چہ زمینے است کہ چرخش تو لا برخاست

شب پنجشنبہ پنجم صفر نہصد و نود ہلالی بعد از سپری شدن شش ساعت و بست و دو دقیقہ نور پردازِ جہان صورت و معنی و بار خداے عالم پنہاں و پیدا بہ برج حمل نظرِ خرمی انداخت و عنصری عالم را چوں روحانی ملک نور آگین گردانید۔ جشن شادمانی آرائش تازہ یافت۔ صلاے عیش بلند آوازہ شد۔ ساز انچہ در سرِ آغاز ایں سال خجستہ تالیش ظہور داد۔ نہضت رایات ہمایوں است بصوبِ دریاے سندھ۔

آغاز سال بست و نہم از مبداے جلوس۔

دریں سر آغاز روز افزوں و تازہ کاری دولت ابد پیوند رسیدنِ نوخواستگان دیریں بقا جہاں را شادمانی دیگر بخشید و بے برگانِ آفرینش را تازہ آب بر روے کار آمد۔

نظم

شکایتہا ہمیں کردی کہ بہمن برگ ریز آمد
ز رعدِ آسماں بشنو تو آواز دہل یعنی

بیا برخیز گلشن بیں کہ بہمن در گریز آمد
عروسی دارد ایں بستاں کہ بستاں بر جہیز آمد

نقشبنداں کار آگاہِ سلطنت در نیرنگئے آرائشِ دولت خانہ والا نگہی بکار بردند دیگر بن روشے اساس ازیں بر نہادند۔ بست و پنجم اسفندارمذ در بستاں سراے کہ چہار کروہے فتحپور بفرمائش حضرت مریم مکانی سرسبز و شاداب است۔ بزم عشرت

پیراستند و برخے پردگیاں دراں روحانی منزل گاہ بار یافتند۔ اشارہ یہ ہے کہ اس سال سلیم کی شادی ہے ✦

جس طرح ملا صاحب وقت پر رُک نہیں سکتے اس وقت **آزاد** بھی رہ نہیں سکتا۔ اُن کی روح سے چند ساعت کے لئے معافی مانگتا ہے۔ اور اہل انصاف کو دکھاتا ہے۔ کہ ہر شخص کے کمال میں بلکہ بات بات میں بال کی کھال اُتارتے تھے اور بیشک صرافِ سخن تھے۔ لفظ لفظ کو خوب پرکھتے تھے۔ لیکن میں حیران ہوں۔ کہ رات دن ابوالفضل فیضی سے شیر و شکر رہتے تھے۔ اور ان کلاموں کو اُن کی زبانوں سے سُنتے تھے۔ اور اپنے کلام کو بھی دیکھتے تھے۔ باوجود اس کے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ کہ اکبر نامہ کے عہد تحریر میں مجھ سے ایک رکن سلطنت نے کہا کہ بادشاہ نے شہر **نگر چین** آباد کیا ہے۔ اکبر نامہ کے انداز میں تم بھی اُس کی تعمیر کی صورت حال لکھو۔ آپ نے اس پر ایک آدھے صفحہ کی عبارت لکھی ہوگی۔ اُسے بھی اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے۔ یہ ضرور ہے۔ کہ اپنا بیٹا سب کو خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مُلّا صاحب اور سب برابر بھی تو نہیں۔ اندھیرے اُجالے میں فرق نہ معلوم ہوا۔ بیشک اکبر نامہ کا انداز یہی ہے۔ مضامین کا ہجوم۔ عبارت کا جوش و خروش۔ لفظوں کی دھوم دھام۔ کلمات مترادف کی بہتات۔ ہر واقعہ کے ساتھ اُس کی دلیل و برہان کٹی کٹی کاف بیانیہ جملے معترضے۔ فقرہ پر فقرہ چڑھتا چلا آتا ہے۔ گویا کمان کیانی ہے کہ کھنچتی ہی چلی جاتی ہے۔ اُنھوں نے اس کی نقل کی ہے۔ خیر وہ تو کب ہو سکتی ہے۔ بیٹھے مُنہ چڑاتے ہیں۔ اور اخیر کے شعر پر تو رو ہی دیئے۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ بھی شعر لکھتا ہے۔ مگر سبحان اللہ جیسے انگوٹھی پر یاقوت جڑ دیا۔ بھلا اس عبارت کو کتاب میں نقل کر کے اپنے تئیں رسوا کرنا کیا ضرور تھا۔ (**مُلّا صاحب کی عبارت**) دریں سال تعمیر شہر نگر چین واقع شد وسطرے چند کہ یکے از اعیان دولت در وقت تالیف اکبر نامہ بفقیر فرمودہ بود کہ دریں باب بنویسد۔ آں را بجنس ایراد مے نماید۔ چوں مہندس کارخانۂ ابداع۔ اندیشہ بلند شہر یار کامگار را کہ معمار معمورۂ گیتی خصوصاً بنائے مقصورۂ ہند است۔ از آغاز فطرت اختراع آئین ایجاد فرمودہ تا بمقتضائے۔ **بیت**

جہاندار داند جہاں داشتن	یکے را بُریدن دگر کاشتن

ہر سہ منزلے وہر گل زمینے راکہ ہوائے آں معتدل وفضائے آں نسخ تابش گوارا۔ وسوادش مسطح باشد تعمیر بخشیدہ محل نزول اجلال مواکب اقبال سازد چہ اختیار اماکن متنزہ ومساکن طیبہ ومنازل مروّحہ۔ ومیاہ عذب۔ بہر ابقائے نعمت صحت بدنی۔ واحتمائے اعتدال مزاج انسانی کہ وسیلۂ معرفت وطاعت یزدانی ہماں تواند بود۔ از جملۂ سنّۂ ضروریہ است۔ خصوصاً وقتے کہ بعضے از مصالح ملکی نیز مثل سیر وشکار وغیرہ باں منضم گردد۔ بنابریں دواعی دریں سال خجستہ فال بعد از معاودت از سفر مالوہ کہ اولیائے دولت منصور واعدائے ملک مقہور شدہ بودند۔ پیشنہاد ہمت والا نہمت واقتضائے رائے جہاں آرا چناں اُفتاد کہ گکروَلی را بیک فرسنگے آگرہ واقع شدہ وباعتبار لطافت آب ونظافت ہوا بر خیلے امکنہ رجحانے ومزیتے تمام داشتہ معسکر حشم ہمایوں ومخیم دولت ابد پیوند گردانیدہ واز مضائق مداخل ومعارج شہر قدسی مآثر را فراغتے حاصل گشتہ اوقات فرخندہ سمات را گاہے بچوگان بازی۔ وگاہے بدوانیدن سگان تازی وپرانیدن جانوراں گوناگوں مصروف سازند۔ وبنائے آں معمورۂ بلند اساس را بشگون استحکام مبانئے قصر سلطنت بزوال تفاؤل از دیاد جاہ وجلال گرفتہ۔ فرمان نافذ براں گونہ عز اصدار یافت۔ کہ باریافتگان قرب ومنظوران نظر عاطفت ہر کدام از برائے خود درآں مکان مرفہ عمارت عالی ومنازل رفیع بنیاد نہند ودر اندک مُدّت سوادِ آں بقعۂ لطیف از پرتو توجہ حضرت ظل اللہی۔ خال رُخ نو عروس عالم شد ونگر چین کہ عبارتست از امن آباد نام یافت۔ بیت

آمد از غیب پس پردۂ اقبال پدید	للہ الحمد ہر آں نقش کہ خاطر مے خواست

مُلّا صاحب نے گول مول فقرے میں لکھا ہے۔ نہیں کھلتا کہ فرمائش کرنیوالا کون تھا۔ غالباً آصف خاں یا قلیچ خاں ہونگے۔ امرا میں سے اُنہیں کے جلسوں میں آپ اکثر شامل رہا کرتے تھے۔ اور یہ بھی عجب نہیں۔ کہ ابوالفضل ہی نے فرمائش کر دی ہو۔ وہ بھی ثقہ ظریف تھے۔ کہا ہوگا کہ باتیں تو بہت بناتے ہیں۔ کچھ کر کے بھی تو دکھائیں۔ گھڑی دو گھڑی دل لگی رہیگی * ع

ہاں خلیفہ ہم بھی دیکھیں پہلوانی آپ کی

باوجود ان سب باتوں کے جو شخص اُس دریائے فصاحت کو اوّل سے آخر

تک بڑھیگا۔ اور پھر کنارہ پر کھڑے ہو کر دیکھیگا تو معلوم کر یگا۔ کہ اُس کے سرچشمہ پر پانی کا لطف اور لذت کچھ اور ہے۔ ۲۰ کوس پر کچھ اور ہے۔ بیچ میں کچھ اور ہے۔ اور پھر کچھ اور۔ یہ اتفاقات وقت کا مقتضا ہے۔ نئے ایجادوں میں ایسی تبدیلیاں ضرور ہوتی ہیں۔ یہ کوتاہی اس کی قابل ترمیم ہے۔ وہ جہاز سخن کا ناخدا ضرور اس بات کو سمجھا ہوگا۔ اور عجب نہیں۔ کہ اگر عمر وفا کرتی تو اوّل سے شروع کر کے اخیر تک ایک رفتار کر دکھاتا +

دفتر سوم **آئین اکبری** ۱۰۰۶ھ میں تمام کی۔ اس کی تعریف حد بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ ہر ایک کارخانہ کا۔ اور ہر ایک معاملہ کا حال۔ اس کے جمع و خرچ کا حال۔ ہر ایک کام کے ضوابط و قانون لکھے ہیں سلطنت کے صُوبہ صُوبہ کا حال۔ اُن کے حدود اربعہ۔ اُن کی مساحت۔ اس طرح کہ اوّل مختصر ہر جگہ کے تاریخی حال۔ پھر وہاں کی آمدنی اور خرچ۔ پیداوار قدرتی و صنعتی وغیرہ وغیرہ۔ وہاں کے مشہور مقام۔ مشہور دریا۔ نہریں یا نالے اور اُن کے سرچشمے۔ اور یہ کہ کہاں سے نکلے اور کہاں کہاں گزرتے ہیں۔ اور کیا فائدہ دیتے ہیں۔ اور کہاں کہاں خطر ہیں۔ اور کب کب ان سے نقصان پہنچے وغیرہ وغیرہ۔ فوج اور انتظام فوج۔ امرا کی فہرست اور اُن کے مدارج۔ اقسام ملازمان۔ اسامی اہل دربار و اہل خدمت فہرست اہل دانش علما و اہل کمال۔ اہل موسیقی۔ اہل صنعت۔ فقرائے صاحبدل۔ عام اہل ریاضت۔ تفصیل مزاروں اور مندروں کی اور ان کے حالات۔ بیان ان اشیاء کا جو ہندوستان کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ عقایدُ اہل ہند۔ علوم اہل ہند اور بہت سے حقائق و دقائق اُن کی کتابوں سے حاصل کئے تھے +

یہ باتیں آج کل کے اہل نظر کی آنکھوں میں نہ جچینگی کہ سرکاری رپورٹیں دیکھتے ہیں۔ اب ادنیٰ ادنیٰ ضلع کے ڈپٹی کمشنر یا مہتممان بندوبست اُس سے کئی درجہ زیادہ تحقیقیں اپنے ضلع کی سالانہ رپورٹوں میں لکھ دیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ زیادہ نظر وسیع رکھتے ہیں۔ اور پس و پیش پر برابر نگاہ دوڑاتے ہیں۔ اور زمانہ کی کارگذاری کو وقت بوقت دیکھتے چلے آتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اُس وقت اس سلسلہ کا سوچنا اور نظام باندھنا اور اس کا پھیلانا اور پھر سرانجام کو پہنچانا ایک کام رکھتا تھا۔

جو کرتا ہے وہی جانتا ہے۔ کہ لفظ لفظ پر کتنا لہو ٹپکانا پڑتا ہے۔ اب تو رستہ نکل آیا۔ دریا پایاب ہے جس کا جی چاہے اُتر جائے +

مطالب مندرجہ کی تحقیقوں پر نظر کیجئے تو عقل حیران ہوتی ہے۔ کہ کہاں سے یہ ذخیرہ پیدا کیا۔ اور کس خاک میں سے ذرّے چُن چُن کر یہ سونے کا پہاڑ کھڑا کر دیا۔ ایک ادنےٰ نکتہ دیکھ کر سمجھ لو کہ سات اقلیم کی معمولی تقسیم کر کے آپ بھی نئی تحقیقاتیں لکھی ہیں۔ اُن میں کہتا ہے۔ کہ اہل فرنگ کے سیاحوں نے آج کل ایک نیا جزیرہ دیکھا ہے۔ جس کا نام چھوٹی دنیا (ینگی دُنیا) رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے امریکہ مراد ہے۔ جو اُنہی دنوں کولمبس نے دیکھی تھی۔ مگر افسوس اس کتاب کی کم نصیبی پر کہ مُلّا صاحب نے کس خواری سے خاک اُڑائی +

آئین اکبری کی عبارت کے باب میں کچھ کہے بغیر آگے بڑھوں تو دربار انصاف میں مجرم قرار پاؤں۔ اس لئے کم سے کم اتنا کہنا واجب ہے کہ اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے۔ مقلوبی ترکیبیں۔ نئی تراشیں ۔ اس پر دل پذیر و دلکش دو دو تین تین لفظوں کے جملے سنجیدہ برگزیدہ صفحوں کا عطر اور ورقوں کی رُوح ہیں۔ فضول اور زائد لفظ ممکن نہیں کہ آنے پائے۔ تشبیہ اور استعارہ کا نام نہیں۔ اضافت پر اضافت آ جائے تو قلم کا سر کٹ جائے۔ پاک صاف سلیس اور اس پر نہایت برجستہ اور متین ہے تکلف عبارت آرائی۔ مبالغے اور بلند پروازیوں کا نام نہیں +

یہ انداز ابوالفضل نے اُس وقت اختیار کیا ہوگا۔ جب کہ آتش پرستوں کا مجمع خاندیس کے علاقہ سے ژند و پہلوی کی کتابیں لے کر آیا ہوگا۔ بیشک اس نے اس امر کا التزام نہیں رکھا۔ کہ عربی لفظ اصلاً عبارت میں نہ آنے پائے۔ لیکن انداز عبارت دساتیر اور اردیراف وغیرہ پارس کی کتب قدیمہ سے لیا ہے۔ اور یہ اصلاح اُس کی بالکل درست اور قرین مصلحت تھی۔ کیونکہ اگر فارسی خالص کی قید لگاتا تو کتاب مشکل ہو کر فرہنگ کی محتاج ہو جاتی۔ جس طرح اب ہر شخص پڑھتا ہے۔ اور مزے لیتا ہے۔ پھر یہ بات کب ہو سکتی تھی۔ غرض کہ جو کچھ اُس نے لکھا خوب ہی لکھا ہے۔ وہ اپنی طرز کا آپ ہی بانی تھا۔ اور اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ پھر کسی کی مجال نہ ہوئی۔ کہ اس انداز میں قلم کو ہاتھ لگا سکے۔ اللہ اللہ آئین اکبری کا خاتمہ

لکھتے لکھتے ایک مقام پر زور میں بھر کر کیا مزے سے لکھتا ہے اور سچ کہتا ہے

صد داستان بوالعجب آمد بروئے کار	حیراں شوند اگر دو سہ حرفے رقم زنند

نکتہ چینی جن لوگوں کے دماغوں میں نئی روشنی سے اُجالا ہو گیا ہے۔ وہ اس کی تصنیفات کو پڑھ کر یہ لکھتے ہیں کہ ابوالفضل ایشیائی انشاپردازوں میں سب سے بڑا مبالغہ پرداز مصنّف تھا۔ اس نے **اکبر نامہ** اور **آئین اکبری** کے لکھنے میں فارسی کی پُرانی لیاقت کو تازہ کیا ہے۔ اُس نے خوش بیانی اور یاوہ سرائی کے پردہ میں اکبر کی خوبیاں دکھائی ہیں اور عیب اس طرح چھپائے ہیں کہ جس کے پڑھنے سے ممدوح اور مداح دونوں سے نفرت ہوتی ہے۔ اور دونوں کی ذات وصفات پر بٹا لگتا ہے البتہ بڑا علامہ۔ عاقل۔ دانا۔ مدبّر تھا۔ دنیا کے کاموں کے لئے جیسی عقل کی ضرورت ہے وہ اس میں ضرور تھی۔ آزاد کہتا ہے۔ کہ جو کچھ الفاظ و عبارت کے پڑھنے والوں نے کہا یہ بھی ہے۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ کیونکہ فارسی کا ڈھنگ چھ سو برس سے یہی چلا آتا تھا۔ اس کے ایجادوں نے بہت اصلاح کی ہے اور خرابیوں کو سنبھالا ہے۔ باوجود اس کے جو زبان کے ماہر ہیں۔ اور رموز سخن کے تاڑنے والے ہیں۔ اور کلام کے انداز اور اداؤں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کہا اور جس پیرایہ میں کہا۔ کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی۔ اصل حقیقت کو لکھ دیا ہے۔ اور انشا پردازی کا آئینہ اوپر رکھ دیا ہے۔ یہ اسی کا کام تھا۔ یہ بھی اسی کا کام تھا۔ کہ سب کچھ کہہ دیا۔ اور جن سے نہ کہنا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھے۔ اور اب تک بھی نہیں سمجھتے۔ خوشامد کی بات کو ہم نہیں مانتے۔ ہر زبان کی تاریخیں موجود ہیں۔ کونسا مؤرخ ہے۔ کہ خوشامد شاہ اور حمایت قوم سے پاک ہو۔ وہ اپنے آقا کا ایک نمک حلال وفادار نوکر تھا۔ اُسی کے انصاف سے اس کے خاندان کی عزّت و آبرو بچی۔ اُسی کی حفاظت سے سب کی جانیں بچیں۔ اُسی کی بدولت اُس کے فضل و کمال نے قدر و قیمت پائی۔ اُسی کی قدردانی سے رُکن سلطنت ہو گیا۔ اسی کی پرورش سے تصنیفات ہوئیں۔ اور انہوں نے بلکہ خود اُس نے صدہا سال کی عمر پائی۔ خوشامد کیا چیز ہے؟ اُس کا تو دل عبادت کرتا ہوگا اور جان لوٹ لوٹ کر خاک راہ ہوئی جاتی ہوگی۔ اُس نے بہت سا ادب ظاہر کیا۔ شکریہ ادا کیا۔ لوگوں نے خوشامد نام رکھا اور خوشامد کی تو تعجب کیا؟ اور گناہ کیا کیا؟

آج کے لوگ اُس کی جگہ پر ہوتے تو اُس سے ہزار درجہ زیادہ بکواسیں کرتے - اور ایسا نہ کر سکتے - مگر اُن کی وہ قسمت کہاں - ہاں ہاں ایک بات ہے - اُس نے ہندوستان میں بیٹھ کر ایشیائی علوم اور زبان عربی و فارسی میں یہ کمال پیدا کیا کہ اکبر کا وزیر ہو گیا - تم اب انگریزی میں ایسا کمال پیدا کرو کہ سب کو پیچھے ہٹاؤ اور بادشاہ وقت کے دربار پر چھا جاؤ - پھر دیکھیں تم کتنے مصنّف ہو اور کیا لکھتے ہو - میرے دوستو دیکھو! وہ سلطنت کا ایک جزو تھا - آج ارکانِ سلطنت نظامِ ملکی کے لئے ہزار طرف سے حکمت عملی اور مصلحتیں کھیلتے ہیں - اگر ہر بات میں سچ - واقعیت، اور اصلیت پر چلیں اور لکھیں تو ابھی سلطنت درہم برہم ہو جاتی ہے - لوگوں کو حرف پڑھنے آ گئے ہیں - زبان چلنے لگی ہے - دوسرے کی بات کو سمجھتے نہیں - جو مُنہ میں آتا ہے کہے جاتے ہیں +

ابوالفضل کے بعد علامہ کا خطاب سلاطین تیموری میں سعد اللہ خاں چنیوٹی کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوا - کہ وزیر شاہجہان کا تھا - ملّا عبدالحمید لاہوری نے شاہجہان نامہ میں ایلچی ایران کے حال میں لکھا ہے کہ بادشاہ کی طرف سے ایک مراسلہ لکھا گیا - کہ سعد اللہ خاں نے لکھا تھا - وہیں اصل مراسلہ بھی نقل کر دیا ہے کیا کہوں ابوالفضل کی نقل تو کی ہے - ایک تمہید بھی اوّل میں ویسی ہی اُٹھائی ہے - الفاظ کی دُھوم دھام بھی دکھائی ہے - فقرہ پر فقرے بھی مترادف سوا کئے ہیں مگر یہ عالم ہے - جیسے کوئی نو رفتار لڑکا چلتا ہے - دو قدم چلے گر پڑے - اُٹھے چار قدم چلے بیٹھ گئے - اور یہ بات بھی اُس صورت میں حاصل ہوئی - کہ صاحب کمال جلدیں کی جلدیں لکھ کر رستہ بتا تا گیا تھا - بھلا وہ بات کجا - اسے دیکھو کہ رواں رو چلا جاتا ہے - نہ فکر کی پرواز تھکتی ہے - نہ قلم کی نوک گھستی ہے +

اب ملّا عبدالحمید کا حال سنو - سلطنت چغتائیہ میں شاہجہان کی سلطنت سیف و قلم کے سامانوں سے اعلیٰ درجہ کی با نام و نشان سلطنت تھی - علما و فضلا کے علاوہ ہر علم و فن کے باکمال اُس کے دربار میں موجود تھے - بادشاہ کو منظور ہوا کہ عہد سلطنت کا کارنامہ لکھا جائے - جستجو ہوئی کہ آج کل اعلیٰ درجہ کا انشاء پرداز کون ہے؟ کئی شخصوں کے لئے امیروں نے تقریب کی - کوئی پسند نہ آیا - مُلّا

عبد الحمید لاہوری اس سند سے پیش ہوئے کہ شیخ کے شاگرد ہیں۔ ان سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کچھ حال بھی نمونہ کے طور پر لکھ کر عرض کیا۔ حضور میں منظور ہوا۔ اور خدمت تحریر حوالہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ابوالفضل کا شاگرد بڈھا فرتوت شاہجہان کے زمانہ میں ہوگا تو کیا ہوگا۔ تھوڑا سا حال لکھ کر وہ ستر سے بہتر سے ہو گئے۔ باقی کتاب اور لوگوں نے لکھی۔ خیر کوئی لکھے۔ یہاں لکھنے کے قابل یہ بات ہے۔ کہ شاگرد ہونا اور شے ہے اور اُستاد کی بات حاصل ہو جانی اور شے ہے۔ شاہجہان نامہ کی عبارت آرائی۔ بہار افشانی۔ گلریزی۔ رنگینی مسلم۔ مترادف فقروں کے جوڑے لگے ہوئے ہیں مقفّی فقروں کے کھٹکے برابر چلے جاتے ہیں۔ مینا بازار لگا دیا۔ رسائل طغرا سجا دیئے۔ مگر اسے اکبر نامہ کی عبارت سے کیا نسبت۔

ملا عبد الحمید نازک خیال بہار بند انشا پرداز اچھے تھے۔ رنگین رنگین لفظ چُن کر لاتے تھے۔ اور بہاریہ فقروں میں معمولی طور پر سجاتے تھے۔ اور مطلب ادا کر دیتے تھے۔ اُس خلاق معانی کا کیا کہنا ہے۔ اُس کے خانہ باغ میں گل و سنبل کو لائیں تو رنگ اُڑ جائیں۔ طوطی و بلبل آئیں تو پر جل جائیں۔ وہاں تو فلسفہ و حکمت کی انشا پردازی ہے بیان و مطلب کے لئے آسمان طبع سے مضمون نہیں تارے اُتارتا تھا۔ اور فلسفی نظر سے جانچ کر اپنی قادر الکلام زبان کے سپرد کرتا تھا۔ وہ جن لفظوں میں چاہتی تھی ادا کر دیتی تھی۔ اور ایسا کہتی تھی۔ کہ آج تک جو سنتا ہے سر دُھنتا ہے۔ ہم فقروں کو بار بار پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ اُن کی عمدہ تراشیں۔ انوکھی ترکیبیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ فقط لفظوں کے پس و پیش سے مطالب کا زمین سے آسمان پر پہنچا دینا اسی کا کام ہے۔ صورت ماجرا ایسی بنیاد سے بیان کرتا ہے کہ دل تسلیم کرتا جاتا ہے۔ کہ یہ واقعہ جو ہوا زمانہ کی حالت حکم کرتی تھی۔ کہ اسی طرح واقع ہو۔ اور اسی کے بموجب نتیجہ نکلے۔ کیونکہ بنیاد اُس کی وہ تھی۔ اور وہ تھی وغیرہ وغیرہ +

مکاتبات علامی - یعنی انشائے ابوالفضل کہ مدرسوں اور مکتبوں میں عام و تام ہے۔ اس کے تین دفتر ہیں۔ انہیں اس کے بھانجے نے ترتیب دیا ہے۔ کہ نسبت فرزندی رکھتا تھا +

اوّل دفتر میں مراسلے ہیں۔ جو بادشاہ کی طرف سے سلاطین ایران و توران

کے لئے لکھے تھے۔ اور فرمان لکھے ہیں۔ کہ امرائے دولت کے لئے جاری ہوئے تھے۔ الفاظ کی شکوہ۔ معانی کا انبوہ۔ فقروں کی چُستی۔ مضامین کی بلندی۔ کلام کی صفائی۔ زبان کا زور دریا کا شور ہے۔ کہ طوفان کی طرح چلا آتا ہے۔ سلطنت کے مطالب۔ مُلکی مقاصد۔ اُن کے فلسفی دلائل۔ آیندہ نتائج کی ساری دلیلیں گویا ایک عالم ہے کہ بادشاہ طبع کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے۔ کہ مطالب اور الفاظ کو جس پہلو سے جس جگہ چاہتا ہے باندھ لیتا ہے۔ وہی عبداللہ خاں اوزبک کا قول زبان پر آتا ہے۔ کہ اکبر کی تلوار تو نہیں دیکھی۔ مگر ابوالفضل کا قلم ڈرائے دیتا ہے*

دفتر دوم میں اپنے خطوط اور مراسلے ہیں۔ کہ امرا اور احباب و اقربا وغیرہ کے نام لکھے ہیں۔ اُن کے مطالب اور قسم کے ہیں۔ اس لئے بعض مراسلے جو خانخاناں یا کوکلتاش خاں وغیرہ کے نام ہیں۔ وہ دفتر اوّل کی ہوائیں پرواز کرتے ہیں۔ باقی دفتر سوم کے خیالات میں مسلسل ہیں۔ پہلے دونوں دفتروں کے باب میں اتنی بات کہنی ضرور ہے۔ کہ سب پڑھتے ہیں۔ اور پڑھانے والے پڑھاتے ہیں۔ بلکہ علما و فضلا شرحیں اور حاشئے لکھتے ہیں۔ لیکن کچھ فائدہ نہیں۔ مزا اس کا جبھی آئیگا۔ کہ پڑھنے پڑھانے سے پہلے اِدھر بابر۔ ہمایوں۔ اکبر کی تاریخ۔ اُدھر سلاطین صفویہ کی تاریخ۔ ایران اور عبداللہ خاں کی تاریخ توران دیکھی ہو۔ راجگان ہند کے سلسلوں اور اُن کی رسم و رواج سے آگاہی ہو۔ دربار اور اہل دربار کے حالات سے اور اُن کے آپس کے جزئی معاملات سے بخوبی واقف ہو۔ یہ نہ ہو تو پڑھنے والا ساری کتاب پڑھ لیگا۔ ایک اندھا ہے کہ تمام عجائب خانہ میں پھر آیا۔ اور کچھ خبر بھی نہیں*

دفتر سوم میں اپنی بعض کتابوں کے دیباچے۔ بعض مصنّفین سلف کی کتابوں میں سے کسی کتاب کو دیکھا ہے۔ اُسے دیکھ کر جو خیال گزرے ہیں۔ انہیں کی تصویر ایک نثر کے رنگ میں کھینچ دی ہے۔ اُس زمانہ میں کوئی ریویو کا نام بھی ایشیا میں نہ جانتا تھا۔ اُس کے نکتہ یاب فکر کو دیکھو کہ تین سو برس پہلے اُدھر گیا۔ اکثر جگہ نفس ناطقہ کے مراتب عالی۔ طبعیت کی وارستگی۔ دل کی آزادی۔ جس میں دین و دنیا سے بیزاری۔ باوجود اس کے خیالات کی بلند پروازی کا ایک عالم آباد ہے۔ بے خبر کہتے ہیں کہ دونوں بھائی دہریئے تھے۔ بدمذہب تھے۔ وہاں آکر دیکھیں سبحان اللہ یہ جنید بغدادی

بول رہے ہیں یا شیخ شبلی اور حقیقت میں خدا جانے کیا ہیں۔ اس دفتر کے شائق کو چاہیئے کہ فلسفہ و حکمت کے ساتھ تصوّف اور حکمت اشراق سے بھی بہرہ کافی حاصل ہو۔ تب لُطف اُٹھائیگا۔ ورنہ کھانا کھائے جاؤ۔ نوالے چبائے جاؤ۔ پیٹ بھر جائیگا مزہ پوچھو تو کچھ نہیں +

اس میں بعض سفید بیاضوں پر دیباچے لکھے ہیں۔ کہ کسی میں چیدہ اور برگزیدہ اپنی پسند کے اشعار شعرائے باکمال کے لکھتے تھے۔ کسی میں بعض کتابوں کی کوئی عبارت یا تاریخی روایت پسند آتی تھی۔ وہ لکھ لیتے تھے۔ کسی میں کچھ موتی نظم یا نثر ہو کر اپنی طبیعت سے ٹپکتے تھے۔ وہ بھی ٹانک لیا کرتے تھے۔ کسی میں حساب کتاب کی یادداشت لکھتے تھے۔ افسوس وہ جواہر کے ٹکڑے اب کہاں ملتے ہیں۔ کتابوں پر خاتمے لکھے ہیں۔ یا ان پر اپنی رائے لکھی ہے اُن کے اخیر میں یہ بھی لکھ دیا ہے۔ کہ یہ فلاں تاریخ فلاں مقام میں لکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو کیفیت ہمیں آج اُن کے دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ اُسے اُسی وقت معلوم تھی۔ اکثر تحریریں لاہور میں۔ بعض کشمیر میں۔ بعض خاندیس میں لکھی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ انہیں پڑھ کر ہمیں ضرور خیال آتا ہے کہ لاہور میں اُس وقت کیا عالم ہوگا۔ اور وہ خود کس طرح یہاں بیٹھا ہوگا۔ جب یہ لکھ رہا ہوگا۔ کشمیر اور اُس کے اطراف میں دو دفعہ میرا گزر ہوا۔ کئی مقاموں پر دونوں بھائی یاد آئے اور دل پر عجب عالم گزرا (امیر حیدر بلگرامی سوانح اکبری میں لکھتے ہیں کہ مکاتبات ابوالفضل کے چار دفتر تھے۔ چوتھا خدا جانے کیا ہوا) +

عیار دانش ۔ کتاب کلیلہ و دمنہ ہے۔ اصل سنسکرت میں تھی۔ یہاں سے نوشیرواں نے منگائی۔ وہاں مدت تک اُسی عہد کی فارسی زبان میں جاری رہی۔ عباسیہ کے زمانہ میں بغداد میں پہنچ کر عربی میں ترجمہ ہوئی۔ سامانیوں کے عہد میں رودکی نے نظم کی۔ بعد اس کے کئی قالب بدل کر مُلّا حسین واعظ کی زبان سے فارسی متعارف کے کپڑے پہنے اور پھر اپنے اصلی وطن یعنی ہندوستان میں آئی۔ اکبر نے جو اسے دیکھا تو خیال آیا کہ جب اصل سنسکرت ہمارے پاس موجود ہے۔ تو اسی کے مطابق کیوں نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ کتاب مذکور پند و نصائح کے لحاظ سے خاص و عام کے لئے کارآمد ہے۔ یہ ایسی عبارت میں ہونی چاہئے جسے سب سمجھ سکیں۔ انوار سہیلی لغات و

استعارات کے انیچ پیچ میں آکر مشکل ہوگئی ہے۔ شیخ کو حکم دیا کہ اصل سنسکرت کو سامنے رکھ کر ترجمہ کرو۔ چنانچہ چند روز میں تمام کر کے ۹۹۶ھ میں خاتمہ لکھ دیا۔ مگر خاتمہ بھی وہ لکھا ہے کہ معنی آفرینی کی رُوح شاد ہوتی ہے +

ملّا صاحب اس پر بھی اپنی کتاب میں ایک وار کر گئے۔ اکبر کے احکام جدیدہ کی شکایت کرتے کرتے فرماتے ہیں۔ کہ اسلام کی ہر بات سے نفرت ہے۔ علوم سے بیزاری ہے۔ زبان بھی پسند نہیں۔ حروف بھی نامرغوب ہیں۔ ملّا حسین واعظ نے **کلیلہ دمنہ** کا ترجمہ **انوار سہیلی** کیا خوب لکھا تھا۔ اب ابوالفضل کو حکم ہوا۔ کہ اسے عام صاف ننگی فارسی میں لکھو۔ جس میں استعارہ و تشبیہ بھی نہ ہو۔ عربی الفاظ بھی نہ ہوں +

بالفرض مُلّا صاحب کی رائے اکبر کے باب میں بالکل واقعی ہو۔ لیکن اسی مقدمہ خاص کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ ابوالفضل پر ہر جگہ طعن بیجا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شیخ کا اور اس کے بزرگوں کا جو کچھ سرمایۂ فخر و کمال تھا۔ یہی عربی کے علوم اور عربی زبان تھی۔ اسے ان چیزوں سے نفرت و بیزاری ہونی ممکن نہیں۔ ہاں اپنے بادشاہ کا فرمانبردار نوکر تھا۔ اپنی مصلحت کو سمجھتا تھا۔ آقا اور نوکر کے مراتب کو خوب پہچانتا تھا۔ اگر وہ اس کے حکموں کی صدق دل سے تعمیل نہ کرتا تو کیا کرتا۔ نمک حرام ہوتا؟ اور خدا کو کیا جواب دیتا؟ اور اکبر کے اس حکم سے بیزاری کا نتیجہ کیونکر نکال سکتے ہیں؟ اگر ایک دُشواری کو آسانی کی منزل پر پہنچا دیا۔ تو اس میں کفر کیا ہوگیا۔ ملّا صاحب کے ہاتھ میں قلم ہے۔ یہ بھی اپنے ملک تصنیف کے اکبر بادشاہ ہیں۔ جو جی چاہے لکھ جائیں +

رقعات ابوالفضل۔ یہ اُس انداز کے خطوط ہیں۔ جو انگریزی ملازموں میں رنج کی (پرائیویٹ) تحریریں کہلاتی ہیں۔ ایک ایک فقرہ قابل دیکھنے کے ہے۔ ان سے اس کے طبعی حالات۔ دلی خیالات اور گھر کے معاملات معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بھی مزہ جبھی آئیگا۔ کہ اس عہد کے تاریخی حالات اور اہل زمانہ کے جزوی جزوی امورات سے خوب واقف ہو۔ سبحان اللہ جن شیخ ابوالفضل کے لئے ابھی لکھ چکا ہوں کہ کبھی شیخ شبلی ہیں اور کبھی جنید بغدادی۔ اُنہی نے خانخاناں کے باب میں جو جو کچھ لکھا ہے۔ میں اُسے پڑھ کر شرماتا ہوں اور خان خاناں بھی وہ کہ جب پہلے دفتر میں اُسے اکبر کی طرف سے فرمان لکھتے ہیں۔ تو

محبت کا یہ عالم ہے کہ دل و جان اور دم و ہوش فدا ہوئے جاتے ہیں۔ دوسرے خط ہیں
اپنی طرف سے خط لکھتے ہیں۔ تو محبت کا یہ عالم ہے۔ کہ دل و جان اور دم و ہوش فدا
ہوئے جاتے ہیں۔ بیرم خاں تو کیا؟ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ماں کے پیار بھرے سینہ
سے دُودھ بہلے ہے باوجود اس کے جبکہ خاندیس میں خان خاناں شہزادہ دانیال کے
ساتھ مُلک گیری کر رہا ہے۔ بعض اطراف میں خود لشکر لئے پھرتے ہیں۔ کبھی دونوں
پاس پاس آجاتے ہیں۔ کبھی دُور جا پڑتے ہیں۔ اور کام دونوں کے باہم دست و گریبان
ہیں۔ وہاں سے بعض عرضداشتوں میں اکبر کو اور اکبر کی ماں اور اکبر کے بیٹے۔ اور شہزادہ
سلیم یعنی جہانگیر کو عرضیاں لکھی ہیں۔ ان میں خانخاناں کی بابت وہ کچھ لکھتے ہیں اور
ایسے ایسے خیالات میں اوّل مضمونوں کو ادا کرتے ہیں کہ عقل حیران ہو کر کہتی ہے۔ یا
حضرت جنید آپ اور یہ خیالات یا حضرت بایزید آپ اور یہ مقالات۔ مَیں اُن میں
سے بعض عرائض کی نقلیں اخیر میں ضرور لکھوں گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ +

کشکول۔ فقیر کی کشتی گدائی کو کہتے ہیں۔ کہ ہر شخص نے دیکھی ہوگی۔ جو کچھ پاتا ہے۔
پلاؤ۔ خواہ چنے کے دانے۔ آٹا ہو کہ روٹی۔ دال کہ بوٹی۔ ہر طرح کا ٹکڑا۔ گھی میں تر ہو کہ سُوکھا
کچھ ساتھ ہو۔ کہ رُوکھا۔ باسی۔ تازہ۔ میٹھا۔ سلُونا۔ ترکاری۔ میوہ غرض سب کچھ
اس میں ہوتا ہے۔ صاحب شوق اور طالب استعداد جو کتابوں کی سیر کرتا ہے۔ وہ
ایک سادی کتاب پاس رکھتا ہے۔ جو مطلب پسند آتا ہے۔ کسی علم کا ہو۔ کسی فن
کا ہو نثر یا نظم اس میں لکھتا جاتا ہے۔ اسے کشکول کہتے ہیں۔ اکثر علما کے کشکول مشہور
ہیں۔ اور ان سے طالب شائق کو سرمایہ معلومات کا حاصل ہوتا ہے۔ دلّی میں مَیں نے
ایک نسخہ ابوالفضل کے کشکول کا دیکھا تھا۔ شیخ ابوالخیر کے ہاتھ کا لکھا ہُوا تھا +

جامع اللغات۔ ایک مختصر کتاب لغت میں ہے۔ عالم طالب علمی میں الفاظ جمع
کئے ہوں گے۔ اسے ابوالفضل جیسے محقق کی طرف منسوب کرتے ہوئے شرم آتی ہے

رزم نامہ (ترجمہ مہابھارت) پر دو جزو کا خطبہ لکھا ہے +

ان کی تصنیفات کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ عاشقانہ اور رنگین
مضامین زمین طبع میں بہت کم سرسبز ہوتے تھے۔ بہار یہ مضامین اور گل و بلبل اور حسن و
جمال کے اشعار کہیں اتفاقاً خاص سبب سے لانے پڑتے تو مجبور لاتے تھے طبعیت

کی اصلی پیداوار ہی جو کچھ تھی وہ نفس ناطقہ کے خیالات۔ حکمت۔ معرفت۔ فلسفہ۔ پند۔ نصیحت۔ دنیا کی بے حقیقتی اور اہل دنیا کی ہوسوں کی تحقیر ہوتی تھی۔ ان تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ جو کچھ لکھتے تھے۔ قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ اور طبیعت کی آمد سے کہتے تھے۔ انہیں اپنی تحریر میں جانکاہی اور عرق ریزی پر زور نہ ڈالنا پڑتا تھا۔ ان کے پاس دو جوہر خداداد تھے۔ اوّل مضامین و مطلب کی بہتات۔ دوسرے قدرت کلام اور الفاظ کی مساعدت۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہوتے تو کلام میں ایسی صفائی اور روانی نہ ہوتی +

نظم میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ اس کی طبیعت قدرتی شاعری سے محروم تھی۔ مَیں نے غور کر کے دیکھا ہے۔ جہاں کچھ لکھا ہے اور جتنا لکھا ہے۔ کہ کانٹے کی تول۔ یہ ضرور ہے کہ ضرورت کا بندہ اور وقت کا پابند تھا۔ بے ضرورت کوئی کام ہو۔ اس کے قانون میں جائز نہ تھا۔ جہاں مناسب و موزون دیکھتا ہے نثر کے میدان کو نظم کے گلدستوں سے سجاتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ طبیعت حاضر تھی۔ اور عین موقع پر مدد دیتی تھی۔ جو مضمون چاہتا تھا نہایت سنجیدہ اور برجستہ الفاظ اور چست ترکیب کے ساتھ موزوں کرتا تھا۔ مگر وہی کہ جتنی ضرورت ہو۔ بلکہ یہ سنجیدگی اور برجستگی بڑے بھائی کے کلام کو حاصل نہ تھی۔ اکثر مثنوی کے ڈھنگ میں چند شعر لکھتا ہے۔ اور نظامی کے مخزن اسرار اور سکندر نامہ سے ملا دیتا ہے۔ قصیدہ کے انداز میں انوری سے پہلو مارتا ہے۔ اور آگے نکل جاتا ہے +

شکل و شمائل ۔ اکبر نامہ کے خاتمہ میں شیخ نے خدا کی چند نعمتوں کا ذکر کیا ہے ان میں نمبر ۵ و ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں ڈیل ڈول میں معتدل تھے۔ اعضا میں تناسب اور اعتدال تھا۔ اکثر تندرست رہتے تھے۔ مگر رنگ کے کالے تھے۔ عرائض مندرجہ کے اخیر میں تم دیکھو گے کئی جگہ خان خاناں کی شکایت میں لکھتے ہیں۔ کہ حضور وہ جتنا رنگ کا گورا ہے اُتنا ہی دل کا سیاہ ہے۔ میں اگرچہ رنگ کا کالا ہوں۔ مگر دل کا سیاہ نہیں۔ اہل نظر نے ان کی تصنیفات کو اکثر پڑھا ہوگا۔ اور خیال کیا ہوگا۔ تو ضرور کھُل گیا ہوگا۔ کہ وہ ایک متین کم سخن متحمل شخص ہوں گے۔ چہرے سے ہر وقت معلوم ہوتا ہوگا۔ کہ کچھ سوچ رہے ہیں۔

ہر کام میں ہر بات میں چلنے پھرنے میں آہستگی ہوگی۔ چنانچہ یہی باتیں اسوقت کی تاریخوں کے متفرق مقاموں سے تراوش کرتی ہیں +

ماثر الامرا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کبھی حرف ناشائستہ ان کے منہ سے نہ نکلتا تھا۔ فحش یا گالی سے زبان آلودہ نہ کرتے تھے۔ غیر تو درکنار اپنے نوکر تک پر بھی خفا نہ ہوتے تھے۔ غیر حاضری کی تنخواہ اُن کی سرکار میں مجرا نہ لیتے تھے۔ جس کو وہ نوکر رکھتے تھے پھر موقوف نہ کرتے تھے۔ نکما نالائق ہوتا۔ تو اُسکی خدمتوں کو ادل بدل کرتے رہتے۔ جب تک رکھ سکتے رہنے ہی دیتے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر موقوف ہو کر نکلیگا۔ تو نالائق سمجھ کر کوئی نوکر نہ رکھیگا +

جب آفتاب حمل میں آتا اور نیا سال شروع ہوتا۔ تو گھر اور تمام کارخانوں کو دیکھتے۔ حساب کتاب کا فیصلہ کرتے۔ گوشواروں کی فہرست لکھوا کر دفتر میں رکھ لیتے اور کتابوں کو جلوا دیتے۔ سب پوشاک نوکروں کو بانٹ دیتے تھے۔ مگر پائجامہ سامنے جلوا دیتے تھے۔ (خدا جانے اس میں کیا مصلحت تھی) شیخ کی تین بیبیاں تھیں (۱) ہندوستانی۔ غالباً یہی گھر والی ہوگی۔ جس کے ساتھ ماں باپ نے شادی کر کے بیٹے کا گھر آباد کیا ہوگا (۲) کشمیرن۔ عجب نہیں کہ پنجاب اور کشمیر کے سفروں میں خود تفریح طبع کا سامان بہم پہنچایا ہو۔ اگرچہ اس متین فاضل اور منصفانہ خیالات کے آدمی سے یہ بات بعید ہے۔ مگر انسان ہے ایک وقت دل شگفتہ بھی ہوتا ہے (۳) ایرانی۔ اگر میری رائے غلط نہ ہو۔ تو یہ بی بی فقط زبان کی درستی اور خاص خاص محاورات رواں کرنے کی غرض سے کی ہوگی۔ فارسی کی انشا پردازی اُس کا کام تھا۔ زبان کا جویا تھا۔ ہزاروں محاورے ایسے ہوتے ہیں۔ کہ اپنے مقام پر خود بخود ہی ادا ہو جاتے ہیں۔ نہ پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے نہ بتانے والا بتا سکتا ہے۔ صاحب زبان سیاق تحریر میں بول جاتا ہے۔ اور طالب زبان وہیں گرہ میں باندھ لیتا ہے۔ پس خانہ داری جزئیات اور گھر کے کاروبار کی ادنیٰ ادنیٰ بات فرہنگ و مصطلحات سے کب حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ دونوں بھائیوں کی صحبت میں ہمیشہ ایرانی موجود رہتے تھے۔ اور تمام خدمتگار اور کسب و کار کے لوگ ایرانی ہی تھے۔ مگر گھریلو باتیں تو گھر ہی میں ہوتی ہیں۔ اصلی

محاورات اس ترکیب کے بغیر نہیں حاصل ہوتے ✦

دسترخوان ۔ کھانے کا حال سُن کر تعجب آتا ہے۔ اجناس کا وزن ۲۲ سیر ہوتا تھا کہ مختلف رنگوں سے پک کر دسترخوان پر لگتی تھیں۔ عبدالرحمٰن پاس بیٹھتا تھا اور خانساماں کی طرح دیکھتا رہتا تھا۔ خانساماں بھی سامنے حاضر رہتا تھا۔ دونوں خیال رکھتے تھے۔ کہ کس رکابی میں سے دو تین یا کئی نوالے کھائے جس کھانے میں سے ایک ہی دفعہ کھایا اور چھوڑ دیا۔ وہ دوسرے وقت دسترخوان پر نہ آتا تھا۔ کسی کھانے میں آب و نمک کا فرق ہوتا تو آپ فقط اشارہ کرتا۔ یعنی چکھو۔ وہ چکھ کر خانساماں کو دیتا۔ منہ سے کچھ نہ کہتا۔ خانساماں اس کا تدارک کرتا۔ جب دکن کی مہم پر تھا۔ دسترخوان وسیع اور کھانے ایسے پُرتکلّف اور عمدہ ہوتے تھے کہ آج کل کے لوگوں کو یقین نہ آئے۔ ایک بڑے خیمہ میں دسترخوان چُنا جاتا تھا۔ ہزار عمدہ قابیں کھانے کی معہ اس کے لوازمات کے ہوتی تھیں۔ اور سب امرا میں بٹ جاتی تھیں۔ پاس ہی اور بڑا خیمہ ہوتا تھا۔ اس میں کم درجہ کے لوگ جمع ہوتے تھے۔ اور کھانے کھاتے تھے باورچی خانہ ہر وقت گرم رہتا تھا۔ اور کھچڑی کی دیگیں تو ہر وقت چڑھی ہی رہتی تھیں جو بھوکا آتا تھا۔ رزق پاتا تھا۔ اور کھاتا تھا ✦

چھبیسواں شکرانہ ادا کرتے ہیں۔ کہ ۱۲ شعبان پیر کی رات ۹۷۹ھ میں لڑکا ہوا۔ مبارک دادا نے پوتے کا نام عبدالرحمٰن رکھا۔ خود فرماتے ہیں۔ اگرچہ ہندی نژاد ہے مگر مشرب یونانی رکھتا ہے۔ حضور نے اسے کوکہ یعنی اپنے دودھ بھائیوں میں شامل کیا ہے (اکبر ہی نے اس کی شادی سعادت یار خاں کوکہ کی بیٹی کے ساتھ کی تھی) ✦

ستائیسواں شکرانہ ہے۔ کہ ۳ ذیقعد ۹۹۹ھ جمعہ کو عبدالرحمٰن کے ہاں لڑکا ہوا۔ گیتی خداوند نے بشوتن نام رکھا ✦

عبدالرحمٰن

عبدالرحمٰن نے جو باپ کے ساتھ دکن میں جانبازیاں کیں کچھ کچھ بیان ہوئیں وہ حقیقت میں بڑا بہادر تھا۔ جن معرکوں میں جنگ آزمودہ سپاہی جھجک جاتے تھے۔ وہ جھپٹ کر جاتا تھا اور دلاوری اور دانائی کے زور سے ان معاملوں کو فیصلہ

کر دیتا تھا۔ اسے زمانہ کے اہل تاریخ تیر روئے ترکش لکھتے ہیں۔ تلنگانہ وغیرہ کی مہمیں مار کر اس نے باپ کے ساتھ دکن میں بڑا نام پیدا کیا۔ اکبر کے سرداروں میں شیر خواجہ کہنہ عمل سپاہی تھا۔ کہیں اُس کے ساتھ اور کہیں آگے بڑھ کر خوب خوب تلواریں ماریں اور ملک عنبر دکن کے بہادر سردار کو دھاوے مار مار کر اور میدان جما جما کر شکستیں دیں۔

جہانگیر کی یہ بات قابل تعریف ہے کہ اُس نے باپ کے غصہ کو بیٹے کے حق میں بالکل بھُلا دیا۔ دو ہزاری منصب عطا کیا۔ اور افضل خاں خطاب دیا۔ ۳ سنہ جلوس میں اسلام خاں اس کے ماموں کی جگہ بہار کا صوبہ دار کیا۔ بلکہ گورکھپور بھی جاگیر دیا۔ جب یہ بہار کا حاکم تھا۔ تو صدر مقام پٹنہ تھا۔ ایک جعلساز فقیر قطب الدین نام اُدھر آیا۔ اور لوگوں کو بہکایا۔ کہ میں جہانگیر کا بیٹا خسرو ہوں قسمت نے یاوری نہ کی مہم بگڑ گئی۔ اب اس حال میں پھرتا ہوں۔ کچھ واقعہ طلب لوگ لالچ سے کچھ رحم کھا کر اُس کے ساتھ ہو گئے۔ اُس نے فوراً پٹنہ پر دھاوا کیا۔ وہاں شیخ بنارسی اور مرزا غیاث عبدالرحمن کی طرف سے حاکم تھے اُنہوں نے ایسی نامردی کی۔ کہ جعلی خسرو قابض ہو گیا۔ اور کُل اسباب و خزانہ سب ہاتھ آیا۔ رحمن سُنتے ہی شیر کی طرح آیا۔ جعلی خسرو مورچے باندھ کر سامنے ہُوا دریائے پن پن پر لڑائی ہوئی۔ مگر پہلے ہی حملے میں جعلی فوج تتر بتر ہو گئی۔ اور وہ بھاگ کر قلعہ میں گھُس گیا۔ رحمن بھی پیچھے ہی پیچھے پہنچے اور پکڑ کر مار ڈالا۔ دونوں بزدل سرداروں کو دربار میں بھیج دیا۔ جہانگیر سزا کے معاملے میں بڑے دھیمے تھے۔ اُنہوں نے ان کے سر منڈوائے۔ عورتوں کے کپڑے پہنائے اور اُلٹے گدھوں پر بٹھا کر شہر میں پھرایا۔ چند ہی روز بعد رحمن بیمار ہوئے۔ جب دربار میں گئے بڑی عزت ہوئی۔ افسوس کہ ۸ سنہ جلوس جہانگیری میں باپ کے ۱۱ برس بعد مر گئے۔ بشوتن ایک بیٹا چھوڑا بشوتن نے جہانگیر کے عہد میں ۷ سو پیادہ۔ ۳ سو سوار کی افسری تک ترقی کی۔ شاہجہان کے عہد میں پانصدی کا منصب لیا۔ اور ۱۵ سنہ جلوس تک خدمتیں بجا لاتا رہا۔

میں نے وعدہ کیا تھا کہ **خانخاناں** وغیرہ کے باب میں جو اُنہوں نے پھُول کترے ہیں۔ آخر میں اُن کے ترجمہ سے ناظرین کا دل شگفتہ کرونگا۔ چنانچہ ایک عرضی مہم دکن سے بادشاہ کو لکھی ہے۔ اس میں القاب و آداب طولانی کے بعد حالات مختلفہ کے ذیل میں بعض امورات انتظامی خانخاناں کے متعلق لکھتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں قسم ہے

عزت الٰہی کی۔ اور اُس کی گواہی کافی ہے۔ کہ جو کچھ لکھا ہے۔ جو کہا ہے وہی ہے۔ اس میں ذرا بھی اور کچھ بھی شُبہ نہیں ہے واللہ باللہ ثم باللہ الطالب الغالب الحي الذي لايموت کہ کئی دفعہ کئی بار اس کے آدمیوں کو میرے پاس پکڑ کر لائے۔ اور اُس کے نوشتے اقبال بادشاہی کے برخلاف پکڑے اور بجنسہٖ شہزادہ والاگوہر کو دکھائے۔ تمام ارکانِ دولت انگشت بدندان ہو گئے۔ ہاتھ ملے اور رہ گئے۔ بیچارگی سے خاموش ہیں۔ عجز و انکسار کے سوا کوئی رستہ نہیں دیکھتے۔ چُپ بیٹھے ہیں۔ مگر بڑے چھوٹے۔ امیر غریب سب سمجھتے ہیں کہ مہم دکن کو اُسی نے اُلجھاوے میں ڈالا ہے۔ اور اُسی کے سبب سے رُکی ہوئی ہے۔

قبلۂ من۔ فدوی نے کئی دفعہ عریضہ میں عرض کیا ہے۔ مگر جواب شافی نہیں پاتا۔ عجب بات ہے کہ فدوی کی عرض بھی غرض سمجھی جاتی ہے۔ ابوالفضل اس درگاہ کا پلا ہوا ہے اور خاک سے اُٹھایا ہوا ہے۔ خدا نہ کرے کہ غرض آلودہ کہے۔ اور اُس میں کوشش کرے جس میں اس خاندان کی بدنامی ہو۔ صاحب من ہم ہندوستان کے آدمی یک رُو ہیں۔ خدا نے ہماری سرشت میں دو رُوئی پیدا ہی نہیں کی۔ الحمدللہ کہ ہم نمک کو حلال کر کے کھاتے ہیں۔ اور لوگوں کی طرح سفید رُو اور سیاہ دل نہیں۔ اگرچہ ظاہر میں رنگت کا کالا ہوں۔ باطن سفید رُو ہے۔ جیسے آئینہ کے ظاہر میں اس کی سیاہ رنگی سے وہم پڑتا ہے مگر خوب ملاحظہ فرمائیں۔ پاکیزہ دروں اور صاف دل ہوں۔ کھوٹ کھپٹ کچھ نہیں۔ **شعر**

نیَم مہ کز فروغِ غیر دارد خانہ نورانی	چو خورشیدم کہ نورِ خانہ از شمعِ زباں دارم

ایک اور تحریر میں فرماتے ہیں۔ **قبلۂ من**۔ اگرچہ شہزادۂ کامگار کے اوضاع و عادات کی طرف سے ذرا خاطر جمع ہوئی ہے۔ لیکن عبدالرحیم بیرم کے فن و فریب کو کیا کہیے اور کیا کہئے کہ لکھنے میں بیان عاجز اور کہنے میں زبان قاصر ہے۔ اگر تمام عمر اس کی دونیوں کو لکھتے جایئے۔ پھر دیکھئے تو عشر عشیر بھی نہیں لکھا۔ ایک ذات بے بدل ہے کہ نظیر اور شبیہ نہیں رکھتی۔ مکر و دغا میں یگانہ اور بے بدل زمانہ ہے۔ کیونکہ اسے ہر باطن میں گزر ہے۔ اور ہر طرح کی ظاہر کی خبر ہے۔ ابھی دل میں بات نہیں گزرتی کہ اُسے آگاہی ہو جاتی ہے۔ انسان اپنے کام کا ارادہ نہیں کرتا۔ کہ اُسے معلوم ہو جاتا

ہے۔ سبحان اللہ مجھ سرگردانِ بادیۂ حیرت کو اس تفکّر نے گھیرا ہے۔ کہ کیسی چالاکی ہے کیسی طراری و مکاری ہے۔ کہ خدا تعالے نے اُسے کرامت فرمائی ہے۔ لیکن یہ بات ذرا دل میں کھٹکتی ہے۔ کہ ظاہرا مشیئت حق میں سہو اور خطا ہوئی۔ جب یہ زمانہ کا نادرہ کار اور بوالعجائب روزگار موجود ہے۔ تو عزازیل بیچارے کو کہ اس کے اطفال دبستان میں داخل ہونے کے قابل ہی نہیں۔ لعنت کے لئے کیوں اختیار کیا؟ ع

	در ہر بن موئے او زبانے دگر است	

کوئی نمک کھائے اور اس بد سرشتی اور بد طینتی سے سلسلۂ تیموریہ کی دشمنی دل میں رکھتا ہو۔ تو اُس کا کام کیونکر چلیگا؟ کیونکر انجام بخیر ہوگا؟ کیونکر نیکی کا مُنہ دیکھیگا۔ قبلۂ من۔ تمام دن تمام رات عنبر مقہور کے جاسوس اور مخبر موجود رہتے ہیں اور بیخطر اور بے کھٹکے اُن سے شیر و شکر رہتا ہے۔ شہزادہ والا گوہر کا ملاحظہ اور رعایت ادب کچھ بھی نہیں ہے۔ اتنی بھی پرواہ نہیں کہ شاید کوئی درگاہ عالی میں لکھ بھیجے! اور حضور کو ملال ہو۔ یہ بیحیائی اور بے پروائی ہے۔ دعاگو شرطیہ لکھتا ہے۔ کہ اگر وہ اس مُلک میں نہ ہو تو ایک سال میں دکن کی مہم پاک و صاف کر دیتا ہے۔ لیکن کیا کرے اور کیا کرسکتا ہے۔ اس کا نقش ایسا جم گیا ہے۔ کہ حضور کو بھی اور شہزادۂ عالمیان کو بھی اعتقاد ہو گیا ہے۔ کہ دکن کی مہم اُس بغیر فتح نہ ہوگی۔ اور جب وہ نہ ہوگا کچھ نہ ہوگا۔ لانسلم۔ لانسلم۔ لانسلم۔ کوئی نہ مانے۔ میں نہ مانونگا۔ تم بھی نہ مانو کہ ایسا ہوگا۔ بلکہ قضیہ بالعکس ہے۔ کیونکہ جب وہ اس مُلک میں نہ ہوگا۔ مہم کا کام بن جائیگا۔ اور تھوڑے عرصے میں۔ ذرا سی دیر میں دکن ہاتھ آجائیگا۔ اور دکنی آکر سلام کرینگے۔ مانع الخیر وہی ہے۔ حقاً حقاً ثم حقا بعزۃ اللہ تعالیٰ وکفیٰ باللہ شہیدا۔ کہ جو کچھ مَیں نے کہا ہے اور لکھا ہے یہی ہے۔ اصلاً و قطعاً اس میں شبہ نہیں۔ واللہ۔ باللہ تاللہ الغالب الحی الذی لایموت۔ کہ کئی بار اُس کے آدمیوں کو گرفتار کرکے دعاگو کے پاس لائے۔ اور اُس کے نوشتے کہ بالکل اقبال و دولت بادشاہی کے مخالف ہیں۔ بجنسہٖ شہزادۂ والا گوہر کو دکھائے۔ تمام ارکان دولت دانتوں میں انگلیاں دے کر رہ گئے۔ اور ہاتھ ملتے تھے۔ سب بیچارگی اور ناچاری سے چپ لگائے ہیں۔ اور عجز و انکسار میں اپنا بھلا دیکھتے ہیں۔ اور رضا و خاموشی کو بنا ہے جاتے ہیں۔ اعلیٰ ادنیٰ چھوٹے بڑے سب سمجھے ہوئے ہیں۔ کہ مہم دکن کو وہی اُلجھائے

میں ڈالتا ہے۔ اور اُسی کے کرتوتوں سے مہم بند ہے۔ شعر

ہر کہ زبانش دگر و دل دگر		تیغ بباید زدنش بر جگر	

(ایک اور عرضی میں)، **قبلۂ ابوالفضل**۔ میں تو لکھتے لکھتے تھک گیا حضور کے دلنشیں نہیں ہوتا۔ انتہا یہ ہے۔ کہ حضور اسے معزول نہ فرمائیں۔ اتنا ہی لکھیں۔ کہ فلاں شخص کی بے مصلحت کچھ کام نہ کرو۔ اور ہمارے کہے سے پھرو گے۔ تو آزردگی اور رنج ہوگا۔

شاید اسے پڑھ کر اس کے دل میں اثر ہو۔ بعض باتوں میں ذرا ہمیں بھی شریک کر لیا کرے۔

جہانگیر کو ایک عرضی دکن سے لکھی ہے۔ ذرا دیکھو نوجوان لڑکوں کو شیخ صاحب کن باتوں سے اور کیسے الفاظ و عبارت سے پُھسلاتے ہیں۔ بڑے لمبے آداب القاب کے بعد لکھتے ہیں۔ کہ دنیا شش جہت میں محصور ہے۔ میں بھی شش جہت میں اپنی عرض کو منحصر کرتا ہوں۔ جہت اوّل یہ ہے اور دویم یہ ہے۔ تیسری جہت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ شہزادہ دانیال دن رات شراب میں غرق ہے۔ کوئی تدبیر راہ اصلاح پر نہیں لاسکتی۔ کئی دفعہ حضرت اعلیٰ کی خدمت اقدس میں عرضداشت لکھ چکا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم خود بدولت وسعادت اجازت لے کر ادھر تشریف لے آؤ۔ دانیال کو گجرات بھجوا دو۔ تمہارے آنے سے تمام دکنیوں کو عبرت ہو جائیگی۔ اور عنقریب دکن فتح ہو جائیگا۔ عنبر سیاہ رُو خود آکر حاضر ہو جائیگا۔ چاہئے تھا کہ آپ اس باب میں صاف و صریح لکھ کر مجھے بھیجتے۔ لیکن اصلاً و قطعاً متوجہ نہ ہوئے۔ اور اس امر میں کوشش نہ فرمائی۔ اور کبھی اس دعاگو کو جواب شافی سے سرفراز نہ فرمایا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا باعث کیا ہوگا۔ اور بندہ سے کونسی خطا ہوئی ہوگی۔ کہ جس سے خاطر شریف پر ملال ہوا ہوگا۔ خدا گواہ ہے کہ جو بندہ کی طرف سے دشمنوں نے آپ سے کہا ہے اللہ جھوٹ باللہ جھوٹ۔ ثم باللہ جھوٹ ہے۔ خدا نہ کرے کہ بندہ سے آنحضرت (آپ) کے باب میں حرف ناشائستہ سرزد ہو۔ ساری بات یہ ہے کہ بندہ کی بدنصیبی اس درجہ پر پہنچی ہے کہ باوجود دولت خواہی و خاکساری کے غرض گو رُو سیاہ لوگ آپ سے نامناسب باتیں کہتے ہیں۔ اس میں میری کیا خطا۔ مگر خدا سے امیدوار ہے۔ کہ جو کسی کی بدی کے درپے ہوگا

اچھی طرح سے اس کی جزا پائیگا۔ اللہ کے ہزار ناموں سے ایک نام حق ہے جب وہی ناحق کا سزاوار ہوگا۔ تو حق کون کریگا۔ دوسرے یہ کہ گنجائش کیا ہے؟ جو مَیں حضرتِ اعلیٰ سے تمہاری بُرائی کہوں۔ کیا مجھے اتنا بھی شعور نہیں۔ کہ بادشاہی کے سنبھالنے کی لیاقت کسے ہے؟ خاندان تیموریہ کا ننگ و ناموس کون رکھتا ہے اندھا بھی ہو تو اپنی قباحت سمجھ سکتا ہے اور چشم دل سے دیکھ سکتا ہے۔ چہ جائیکہ صاحب نظر۔ میں کور نہیں۔ کج فہم ہوں تو ہوں۔ مگر اتنا تو شاید سمجھوں کہ تم میں اور اور شہزادوں میں کیا فرق ہے ؎ ع

	زکعبہ تا سر کویش ہزار فرسنگ است	

آزاد خدا جانے شیخ صاحب نے کیا کچھ موتی پر دئے ہونگے۔ مَیں نے مہم دکن کے ضمن میں چند سطریں اکبر نامہ کی ترجمہ کردی ہیں۔ ان سے ان کے اصلی خیالات معلوم ہو چکے مگر باوجود اس کے خیال کرو کہ کس خوبصورتی سے اپنی خیر خواہی کے نقش نوجوان لڑکے کے دل پر بٹھاتے ہیں۔ چوتھی جہت کے ضمن میں لکھتے ہیں۔ کہ بندہ نے کئی دفعہ عبدالرحیم بیرم کی نالائقی کے باب میں حضور اعلیٰ کو لکھا کہ قبلۂ من اس سے آگاہ دل رہیں۔ اور اس کی ظاہری چاپلوسی پر فریفتہ نہ ہوں ؎ ع

	در ہر بن موئے او زبانے دگر است	

عیاری اور مکاری میں بے نظیر آفاق ہے۔ خدا نے ویسا پیدا ہی نہیں کیا۔ وہ خدا کی حدِ آفرینش سے بڑھ کر ہے۔ دو رنگی اور دو زبانی ختم ہے اور نمک حرامی اس پر منحصر ہے۔ خدا گواہ ہے۔ ملائک بھی اس عرضی پر شمن بما فیہ لکھتے ہیں کہ دُود مان تیموریہ کا دشمن ہے اور یہ شیوہ اُس کی میراث ہے۔ آنحضرت پر روشن ہے۔ کہ بیرم نمکحرام نے اس سلسلۂ عالی کے برباد کرنے میں کمی نہیں کی۔ کیا کیا کام کئے۔ کیا کیا چالیں چلا۔ خدا خاندان والا کا مددگار تھا۔ اس کے مکر و حیلے نہ چلے۔ کچھ نہ کر سکا۔ خوار ہوگیا۔ کون برہنہ گنواروں کے ہاتھ پڑا۔ اُنہوں نے اُسے بھی کون برہنہ کر کے نچایا۔ کہ من سگ ملکم۔ من سگ ملکم کہہ کر ناچا۔ آخر حق مرکز پر آٹھیرا۔ اور کیوں نہ ٹھیرے۔ جہاں اکبر جیسا بادشاہ عادل غازی وہاں ہو وہ ذاتی کنگلا ہند کی بادشاہت کیونکر لے سکتا۔ جہاں ایسا شہباز شاخسار ملک پر حق دار قائم ہو۔ ایک بندر چار دانگ ہندوستان کی حکومت کیونکر لے سکتا تھا۔ جہاں تیموری نیستان کا نرہ شیر ڈرو کتا ہو۔ گیدڑ کی کیا طاقت ہے کہ اُس کا جانشین ہو ؎

قصہ کوتاہ سخن مختصر۔ مہم دکن میں اُس سے ایسے معاملے نہیں دیکھے۔ ایسی باتیں نہیں سُنیں۔ کہ کہنے سے یقین بھی آجائے۔ اور لکھنے میں مطلب بھی ادا ہو جائے۔ حضور یقین فرمائیں۔ کہ جب تک وہ اس ملک میں ہے ہرگز فتح نہ ہوگی۔ ہم ناحق ٹھنڈا لوہا پیٹ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ **آزاد** دیکھنا باوجود اس متانت اور ثقاہت کے نوجوانوں کی دلجوئی کرنے کو کیسی باتیں کرتے ہیں۔ خیر دنیا میں مطلب نکالنا چاہو تو سب ہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور درباروں کے معاملے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

اکبر کے بیٹے کو ایک عرضی لکھی ہے۔ اس میں مختلف مطالب لکھتے لکھتے کہتے ہیں۔ شہزادہ والا گوہر کی کیا فریاد کروں اور شکایت کیا لکھوں۔ اگر میں جانتا کہ یہاں ایسی ایسی خرابیاں دامنگیر ہوں گی۔ تو ہرگز ہرگز ادھر کا رُخ نہ کرتا۔ مگر مہندس قضا نے ہی مقدر میں لکھا تو چارہ کیا؟ بندہ میں کیا طاقت ہے۔ کہ مشیت حق کو بدل سکے۔ میں تو زمانہ کی نیرنگیوں اور فلک کی کجرفتاریوں سے حیران تھا۔ مگر جب اس عبدالرحیم کو دیکھا تو سب بھول گیا۔ بھرے زخم ہرے ہو گئے۔ پُرانے ناسور پھر بہ نکلے داغوں سے لہو ٹپک پڑا۔ میں کیا کہوں کہ اس نادر الاعضا بوالعجوبہ روزگار کا شکوہ کروں۔ اس کے ہاتھ سے زمانہ کے دل پر داغ پڑے ہوئے ہیں۔ اور افلاک اس کے ظلم سے سینہ چاک ہیں۔ ع

باہر کہ بنگرم بہ ہمیں داغ مبتلا است

جادوگر کہوں۔ مگر اس کا سرمایہ اس سے بہت ہے۔ سامری ہوتا تو اس کے ہاتھ سے چیخ اُٹھتا۔ اس کا ایک گوسالہ تھا جس سے جادوگری کرتا تھا۔ اس کے ہزار گوسالے ہیں کہ خلق عالم اس کے ہاتھ سے فریاد کر رہی ہے۔ سارے بادشاہی لشکر کو گوسالہ بنا رکھا ہے اور جادوکاریاں کر رہا ہے۔ دکن کے لوگوں کو ایسا پھسلایا ہے۔ کہ پیغمبری کا دعوے کرے تو ابھی بندگی کا اقرار کرتے ہیں۔ اور اسے اپنا آفریدگار مانتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا مکاری ہے اور کیا عیاری ہے۔ کہ خدا نے اِسے نصیب کی ہے۔ شہزادہ عالمیان رات دن اس کے ہاتھ سے نالاں ہیں۔ اور فریاد و فغاں کرتے ہیں۔ مگر اس پر نظر پڑی اور گونگے ہو گئے۔ تن بدن میں ذرا جنبش نہیں ہوتی۔ اپنے تئیں اس کے حوالے کر دیا ہے۔ کئی دفعہ اس کی بے باکیاں اور نادرستیاں دیکھ لی ہیں۔ اور

اور صریح کارہائے ناشائستہ اس سے ہوئے ہیں - چنانچہ اس کے خطوط جو عنبر برگشتہ روزگار کو لکھے تھے - وہ کاغذ ہاتھوں لے کر شہزادے کو دکھائے اور نقل درگاہ والا میں بھیج دی - کچھ نہ ہؤا - اس کا کچھ بھی نہ کر سکے - میں نامراد کس حساب اور کس شمار میں ہوں - اور کس جمع خرچ میں داخل ہوں - کہ اس کے اعمال ناشائستہ کا عوض لوں - بے چارہ دشت غربت میں سرگرداں اپنے حال میں حیران مجھے حضرت ظل اللٰہی سے یہ امید نہ تھی کہ میرے لئے اپنی خدمت سے جدائی تجویز کرینگے اور ایسی عجیب بلا سے ٹکرائینگے حیرت در حیرت ہے - کہ یہ کیا تجویز تھی جو فرمائی - حق علیم ہے - خلق اللہ کو یہ وہم تھا - کہ اگر قطب شمالی حرکت کر کے جنوب میں چلا جائے - اور جنوبی جنبش کر کے شمال میں جا گھسے - تو ہو سکتا ہے - ابوالفضل شاید ہی برکات سعادت قرین سے دُور ہو خیر مجھے کیا طاقت تھی کہ اُن کے فرمانے میں دخل دوں - سرو چشم کہہ کر قبول کیا - اور اُن کے حکم سے مہم دکن پر چلا آیا - مگر کونسی محنتیں تھیں کہ نہ پہنچیں - اور کونسی سختیاں تھیں کہ نہ اُٹھائیں قبلہ من غموں کا لشکر ٹوٹ پڑا ہے - بیکس - نہتا - نہ زرہ نہ چلتا - میدان مصیبت میں کھڑا ہوں - نہ بھاگنے کی طاقت ہے - نہ لڑنے کا حوصلہ - ہاں حضور کی ہمت عالی اگر رکاب امداد میں قدم رکھے اور نیک دلی حقیقی کو کام فرمائے - تو اس کمترین کی مخلصی ہو جائے - آخری عمر حضرت کی قدمبوسی میں گزارے کہ ابوالفضل کی سعادت دوجہاں اس میں مندرج ہے - کوئی نیک ساعت اور مبارک گھڑی دیکھ کر حضور کو سمجھایئے اور للہ مجھے بلوایئے وغیرہ وغیرہ +

دانیال کو ایک طولانی عرضی میں اپنے قاعدے کے بموجب مطالب مختلفہ تحریر کئے ہیں - اس میں لکھتے ہیں عبدالرحیم بدکردار عنبر رُوسیاہ برگشتہ روزگار کے ساتھ یک دل و یک زبان ہو کر فیلسوفی کر رہا ہے - خدائے عزّ و جل حق ہے - ناحق کو اس کی درگاہ میں رواج نہیں ہے - انشاء اللہ تعالےٰ ہمیشہ اس کا کام تنزل میں رہیگا - اور اس خاندان سے شرمندہ ہوگا - آقائے ابوالفضل ! جہاں تک ہو سکے - اسے اپنے راز دل سے آگاہ نہ کیجئے گا +

مریم مکانی کو لکھتے ہیں کہ ۲۵ برس سے یہ کہنہ لنگ مہم اسی طرح چلی جاتی ہے - ختم نہیں ہوئی - اور حضور سمجھتے ہیں کہ دولت تیموری کا سارا رعب و داب اس مہم پر منحصر ہے

خدا نہ کرے کہ یہ مہم بگڑے۔ یہ مہم بگڑی تو بات ہی بگڑ جائیگی۔ حضور سمجھائیں کہ حضرت اعلیٰ اللہ توجہ فرمائیں۔ اور پھر وہی عبد الرحیم بیرم کا رونا روتے ہیں +

اسی تحریر میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ملک دکن عجب مُلک ہے۔ خوشحالی کو خدا نے یہاں پیدا ہی نہیں کیا۔ اکثر جگہ لکھتے ہیں۔ کہ کابل و قندھار و پنجاب اور ملک ہیں۔ وہاں کے اور معاملے تھے۔ یہاں انداز کچھ اور ہے۔ اور جو باتیں وہاں کر جاتے ہیں۔ وہ یہاں پیش ہی نہیں جاتیں +

یہ بات بھی ہر عرض میں لکھتے ہیں۔ کہ حضور اعلیٰ نے کئی بار فدوی کو لکھا ہے کہ ہم نے تمہیں اپنی جگہ بھیجا ہے۔ اور جہاں ہمیں آپ جانا تھا۔ وہاں تمہیں بھیجا۔ تمہیں سفید و سیاہ کا اختیار ہے۔ جسے چاہو نکال دو۔ مختار ہو یہ کیا ہے کہ بار بار عبدالرحیم بیرم کے باب میں لکھتا ہوں اور نہیں سُنتے +

تاریخوں سے بھی معلوم ہؤا۔ اور بزرگوں سے بھی سُنا کہ یہ دونوں بھائی پہلو سبز تھے۔ اہل کمال۔ علما۔ شرفا۔ مشائخ اور اہل طریقت جو آتے تھے۔ ان سے بمروت پیش آتے تھے۔ مہمانی کے حق ادا کرتے تھے۔ دربار شاہی میں لے جاتے تھے۔ اور اپنے پاس سے بھی سلوک کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط کی عبارت کا ترجمہ لکھتا ہوں۔ جو شیخ نے اپنے والد شیخ مبارک کو لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُنہوں نے دلّی کے بعض اہل طریقت کی جاگیر کے لئے سفارش لکھی تھی۔ اس فقرے کے جواب میں کشمیر سے لکھتے ہیں +

اُس حقائق آگاہ سے (آپ سے) مخفی نہ ہوگا۔ کہ حضرت دہلی کے اعزہ کے لئے مکرر عرض اقدس تک پہنچایا۔ کہ ایک جماعت مستحقان با استحقاق اور خیر خواہان بے کینہ و نفاق اس متبرک گوشہ میں رہتے ہیں اور ہمیشہ حضور کی دولت و حشمت و عمر کی دعا کرتے رہتے ہیں۔ حکم ہؤا کہ جو کچھ تو عرض کریگا مقبول درگاہ ہوگا۔ حسب الحکم ۱۰ ہزار بیگھہ زمین افتادہ اور مزروعہ ان کے نام پر بہ تفصیل لکھ کر نظر اقدس سے گزاری مقبول ہوئی ساتھ اس کے حکم ہؤا کہ ہزار بیگہ پر سو روپیہ بیلوں اور تخم ریزی کے لئے عنایت ہوں۔ آپ یہ خوشخبری بھی وہاں کے مخادیم کی خدمت میں پہنچادیں۔ کہ اُن کی خاطر جمع ہو۔ انشاءاللہ فرمان واجب الاذعان روپیہ سمیت پہنچا سمجھیں۔ اور اُن سے فرمائیگا کہ کمترین کی یہ خدمت میں مجرا ہو۔ جس قدر ممکن ہوگا اور وقت گنجائش دیگا اپنی طرف سے بھی خدمت کریگا۔

اعزہ کے باب میں کسی صورت سے اپنے تئیں معاف نہ رکھے گا۔ خدا نہ کرے کہ ابوالفضل مہمات اہل فضل میں غفلت اور کاہلی کرے۔ کیونکہ اسے اپنے حق میں سعادت دارین اور دولت کونین سمجھتا ہے۔ اور اپنا شرف جانتا ہے نیک آدمی وہی ہے جس سے ان لوگوں کی خدمتیں سرانجام پا رہی ہیں۔ نہ سمجھیں کہ ابوالفضل دُنیا کے مَیل میں آلودہ ہو گیا ہے۔ اپنے یار و دیار کی ضرورتوں کو بھول گیا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک جب تک زندہ ہوں ان لوگوں کا خاکروب ہوں۔ اور اس گروہ پُر شکوہ کی خاک راہ۔ ان کی خدمت مجھ پر لازم بلکہ فرض ہے۔ ع در پائے تو ریزم آنچہ در دست من است +

بلکہ جان میں کلام ہے جان کیا چیز ہے جسے کوئی اس گروہ سے عزیز رکھے قصہ مختصر کہ جو خدمت اس معتقد کے لائق ہو ایک اشارہ فرمائیں کہ سرانجام کرونگا اور اسے اپنی جان پر احسان کرکے سمجھونگا +

مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی صدر کے معاملے تمہیں معلوم ہی ہیں۔ مخدوم نے غروب اقبال کے عالم میں جونپور کے بعض بزرگوں کے لئے سفارش لکھی۔ اُنھوں نے اس کے جواب میں خط لکھا۔ آفرین ہے اس حوصلہ کو وہ مخدوم الملک جو کسی وقت میں بھی ان سے نہیں چُوکے اور کتنے کا دانت بھی پایا تو ان غریب مسجد نشینوں کے پاؤں میں چبھو دیا۔ اس کے حق میں کیسی برکت عظمت کے الفاظ خرچ کئے ہیں اور کس طرح اعزاز و احترام سے جواب لکھا ہے۔ مگر اسے کیا کریں کہ وقت بے وقت ہے یہ آسمان پر ہیں وہ زمین پر۔ ان کی تحریر کو دیکھتا ہوں تو حرف حرف پڑا ہنس رہا ہے۔ مخدوم نے پڑھا ہوگا تو آنسو نکل پڑے ہونگے +

اوّل تو القاب و آداب میں دو صفحے سے زیادہ سفیدی سیاہ کی ہے۔ مثلاً صاحب العزۃ والعلا جامع الصدق والصفا صاف اشارہ ہے کہ دل میں کیا ہے اور قلم سے ہمیں کیا لکھ رہے ہو۔ مگر یہ خدا لکھواتا ہے اور آپ کو لکھنا پڑتا ہے حامی الشرع والملۃ والدین ماحی الکفر والبدعۃ والبغی فی العالمین مطلب اس کا یہی ہے۔ کہ ایک وقت تھا کہ کفر کے مٹانے کے ٹھیکہ دار بنے ہوئے تھے۔ اور بدعتی۔ باغی۔ کافر ہم تھے۔ آج خدا کی شان دیکھو کہ تم کہاں ہو اور ہم کہاں ہیں۔ انیس السلاطین جلیس الخواقین اسے پڑھ کر مخدوم نے ضرور ٹھنڈا سانس بھرا ہوگا۔ اور کہا ہوگا۔

کہ ہاں میاں جب کبھی تھے تو سب ہی کچھ تھا۔ اب جو ہو سو تم ہو۔ ایک نشتر اس میں
یہ بھی ہے کہ جناب! صاحب فقر اور صاحب شریعت کو سلاطین اور خوانین سے کیا تعلق
عالی حضرت معالی منقبت قدوسی منزلت خادم الفقرا ناصر الغربا۔
واہ ہم غریبوں فقیروں کے ساتھ کیا کیا سلوک کئے ہیں۔ مخدوم الملک عز شانہ
وعم احسانہ دیکھو خدائی تک تو پہنچا دیا ہے اور بندہ سے آپ کیا چاہتے ہیں
معمولی تمہیدوں اور تعریفوں کے بعد فرماتے ہیں۔ قبلہ ابوالفضل التفات نامہ جو اس مخلص
صمیمی کے لئے نامزد فرمایا ہے۔ اس میں ارشاد ہے کہ جونپور کے رہنے والے اور گوشہ نشینوں
کے حال سے خبردار نہیں۔ اور اس سعادت سے بہرہ نہیں رکھتے۔ سبحان اللہ میں کہ
تمام عمر اس گروہ کی خدمت میں گزاری پھر بھی یہی چاہتا ہوں۔ کہ ہمیشہ ان عزیزوں کی خدمت
میں رہوں۔ اور مقدور کے بموجب جو مجھ سے ہو سکے اُن کے باب میں بھلائی کروں۔
آں حضرت (آپ) میرے حق میں فرماتے ہیں میں کیا علاج کر سکتا ہوں۔ کہ میری قسمت
نحس کی بدمددی سے آپ کے دل میں یقین ہو گیا۔ خدائے مصحف کی قسم ہے۔ جب سے
حضرت ظل الٰہی کی خدمت میں ذرا راہ بندگی بہم پہنچائی ہے اور رُوشناسی حاصل ہوئی
ہے لحظہ بلکہ لمحہ بھی عزیزوں کی یاد سے غافل نہیں بیٹھتا اور ان کے مہموں کے سرانجام میں
کسی طرح بھی اپنے تئیں معاف نہیں رکھتا۔ ۴۰ ہزار بیگہ قابل الزراعت سے اہالی
حضرت دہلی کے لئے خدمت کی ہے۔ ۱۰ ہزار بیگہ موالی سرہند کے لئے۔ ۲۰ ہزار بیگہ
عزیزان ملتان کے لئے۔ کل قریب لاکھ بیگہ عزیزان و مجاوران کے لئے التماس کر کے لی
ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہر شہر کے فقرا آئے اور حالات اپنے ظاہر کئے۔ حضرت اعلیٰ سے
عرض کر کے ہر ایک کے حالات کے موافق مدد معاش اور کچھ کچھ نقد لے کر نذر کیا۔ خدا
علیم ہے کہ اگر ساری خدمتیں بیان کرے تو دفتر ہوتا ہے۔ آپ کے خادموں کے لئے
دردسر سمجھ کر تفصیل نہ لکھی۔ مخدومان جونپور اپنے غرور سے کہ آنحضرت (آپ) پر روشن
ہے مجھ مخلص کے پاس نہ آئیں اور بکمال خود بینی کے سبب مجھ نامراد کی طرف متوجہ نہ ہوں تو
میرا اس میں کیا گناہ ہے۔ پھر بھی جب آپ اس طرح لکھتے ہیں تو اپنی جان پر احسان کر کے
اور اپنی سعادت جان کر وہاں کے عزیزوں کے نام فرمان درست کر کے بھیجتا ہے یقین
تصوّر فرمائیں، اور پہنچا ہوا سمجھیں۔ اتنی تکلیف دیتا ہوں کہ آپ ناموروں کی تفصیل لکھ بھیجیں اور

ہر ایک کی کیفیت بھی ظاہر فرمائیں کہ ہر ایک کی مہمسازی کی جائے ۔ خدائے تعالےٰ اس برگزیدہ انفاس و آفاق کو مسند مدرسی پر باتمکین رکھے (بیٹھے لڑکے پڑھایا کرو مگر واہ حضرت شیخ آپ کا حوصلہ آپ ہی کے واسطے ہے)

شیخ صدر کے نام بھی ایک خط ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں وہ حج کو گئے تھے انہی دنوں میں بعض ضرورتوں کے سبب سے انہیں خط لکھا تھا ۔ اس کے جواب میں آپ نے بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ ایک خط لکھا ۔ اوّل القاب میں ڈیڑھ صفحہ کاغذ پر نمک بیستا ہے کہ غریب بڈھے کے زخموں پر چھڑکیں ۔ پھر فرماتے ہیں امید گاہا ان دنوں میں خبر فرحت اثر سُنی ہے ۔ کہ آنخضرت (آپ) نے طواف حرم باحرمت کے لئے عزم جزم فرمایا ہے ۔ مبارک ہے اور خوب ہے ۔ خدا سب دوستوں کو اس سعادت سے مشرف کرے اور مطلب اصلی اور مقصد حقیقی کو پہنچائے اور آپ کی برکت سے اس آرزومند خالص کو بھی اُس حریم عزّت قرین اور حرم حرمت آئین میں معزز و مشرف کرے +

یہ بات کئی دفعہ حضرت پیر و دستگیر مرشد حقیقت تدبیر ظل الٰہی شاہنشاہی کی خدمت اشرف اقدس ہمایوں میں عرض کی ۔ اور رخصت کے لئے التماس کیا ۔ لیکن قبول نہ ہؤا کیا کروں اُن کی خوشی قضائے الٰہی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے جو کام ان کے بغیر ہوگا کچھ فائدہ نہ ہوگا اور کشایش نہ دیگا ۔ خصوصاً مجھ بے نوا عاجز طبع کو کہ جان سے اس مرشد حقیقی کو دستِ ارادہ دے رکھا ہے اور دل کے ظاہر و باطن کو اُسی دستگیر روشن ضمیر کے سپرد کیا ہے ۔ میرا ارادہ اُن کے ارادے پر موقوف ہے ۔ میرا قصد اُن کے حکم سے وابستہ ہے ۔ کیونکہ دلیری کرسکتا ہوں اور اُن کے فرمائے بغیر کب کوئی کام کرسکتا ہوں کیونکہ ہر صبح و شام اُن کے دیدار شریف کا دیکھنا مجھے حج اکبر بلکہ اُس سے بھی افضل تر ہے ۔ اُن کی گلی کا طواف سعادت جاودانی ہے اور منہ دیکھنا میوۂ زندگانی ۔ غرض مجبور اب کے سال بھی سفر ملتوی رہ گیا ۔ اور دوسرے سال پر جا پڑا ۔ ع

تا در میانہ خواستۂ کردگار چیست ۔ اگر رضا قضائے آسمانی کے موافق پائیگا ۔ تو طواف کعبہ معظم پر متوجہ ہوگا

یارب ایں آرزوے من چہ خوش است | تو بدیں آرزو مرا برساں

اس عزم و نیت میں خدا یار و یاور رہے +

اِس خط کو دیکھ کر شیخ صدر کے دل پہ کیا گزری ہوگی ۔ یہ اُسی شیخ مبارک کا بیٹا ہے ۔

کون شیخ مبارک جس کے فضل و کمال کو برسوں تک شیخ صدر اور مخدوم اپنے خدائی زور و ل سے دباتے رہے۔ اور تین بادشاہوں کے عہد تک اُسے کافر اور بدعتی بنا کر کبھی جلاوطنی کے زیر سزا رکھا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس کے بھائی فیضی کو مبارک باپ سمیت اُس نے دربار سے نکلوا دیا تھا +

خدا کی قدرت دیکھو آج اُس کے بیٹے بادشاہِ وقت کے وزیر ہیں اور ایسے صاحب تدبیر کہ اُنہیں دُودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ اور وہ اجتہاد جس کے زور سے یہ حضرات دین و دنیا کے مالک اور پیغمبر کے نائب بنے بیٹھے تھے۔ اس کا محضر علما و مشائخ کی مہر دستخط سے اس نوجوان بادشاہ کے نام لکھوا دیا جو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا اور ان نوجوانوں کے خیالات وہ ہیں کہ اگر ان دونوں صاحبوں کی حکومت ہو تو قتل سے کم کوئی سزا ہی نہیں۔ آج انہی شیخ صدر کو کیسے کھلے دل سے اور کیا پھیل پھیل کر لکھتے ہیں کہ حضرت ظل الٰہی شاہنشاہی پیر دستگیر مرشد حقیقت تدبیر کی بے اجازت حج کو کیونکر جاؤں۔ اور مجھے تو اس کا دیدار حج اکبر ہے +

حق یہ ہے کہ مخدوم اور صدر کے زور حد سے گزر گئے تھے۔ زمانے کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی زور بہت بڑھ جاتا ہے۔ تو خود اُسے توڑتا ہے اور ایسے سخت صدمے سے توڑتا ہے جس کی چوٹ کو کوئی پہاڑ نہیں سہار سکتا۔ اور ان بزرگوں کے تو کام وہ تھے۔ کہ اگر زمانہ نہ توڑتا تو خود ٹوٹ جاتے۔ خیر اختیار کے وقت خدا ہمیں اعتدال کی عینک عنایت کرے +

معلوم ہوتا ہے کہ ماں نے اسے کوئی خط لکھا ہے اور مطالب متفرقہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ غربا اور اہل حاجت کی خبر گیری ضرور کیا کرو۔ اس کے جواب میں ذرا دیکھو۔ اپنے علمی اور فلسفی خیالات کو کن لاڈ کی باتوں میں ادا کرتے ہیں۔ اوّل تو کہیں بادشاہ کی عنایتوں اور نعمتوں کے شکریئے ہیں کہیں اپنے محاسن اخلاق اور نیک نیتی کے دعوے ہیں۔ اُسی میں یہ کہ بادشاہ کی عنایتوں کو بھی خلق خدا کی ضروریات اور آسائش کے کام میں لاتا ہوں۔ اُسی میں لکھتے لکھتے کہتے ہیں کہ قبلۂ ابوالفضل! اہل شریعت کہتے ہیں کہ جس شخص نے بے نماز کی دستگیری کی۔ اس کے لئے فرشتے دوزخ میں کوٹھڑی بنائینگے اور جس نے اہل عبادت اور نماز گزار کی دستگیری کی۔ اُس کے لئے بہشت میں ایوان

بنائینگے - آمنا - صدقنا - جو اس پر ایمان نہ لائے کافر ہے - لیکن ابوالفضل کی عاجز شریعت کا فتوے یہ ہے کہ خیرات عام چاہئے - نمازیوں کو بھی دے اور بے نمازوں کو بھی - کیونکہ اگر بہشت میں گیا تو ایوان تیار ہے وہاں عیش کریگا - اور اگر دوزخ میں گیا - اور بے نمازوں کو کچھ دیا نہیں تو ظاہر ہے کہ وہاں اس کے لئے گھر نہ ہوگا - اور لوگوں کے گھروں میں گھستا پھریگا - اس لئے ایک پرانا جھونپڑا وہاں بھی ضرور رہے - دُور اندیشی کی بات ہے اللہ تعالیٰ اس راہ میں اپنے محبّوں کو توفیق علی التحقیق عنایت کرے اور پھر ابوالفضل بے نوا کو مطالب اصلی اور مقاصد حقیقی تک پہنچا لے - اپنے احسان سے اور اپنے کمال کرم سے کعبۂ ابوالفضل عزیز بھائی شیخ ابوالمکارم کی شادی کے لئے مجھے لکھتے ہو کہ آنا چاہئے - ع

چوں نیایم بسرو دیدۂ خود مے آیم

کیوں نہ آؤنگا - سر سے آؤنگا - آنکھوں سے آؤنگا - کئی دن سے ایک ایسا موقع ہے کہ حضرت ظل الٰہی (بادشاہ) اس ذرہ حقیر پر اس طرح نور التفات ظاہر فرماتے ہیں - کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ ارشاد فرماتے رہتے ہیں - ایسا کہ کوئی مخلوق - کوئی آفریدہ بیچ میں محرم اسرار نہیں ہے ؏

میانِ عاشق و معشوق رمز یست

آنا دو تین دن پر ملتوی ہے انشاءاللہ بعد رمضان مبارک قدمبوسی کا شرف حاصل کرونگا وغیرہ وغیرہ خدا یار و یاور باد - آزاد - یہ آخری فقرہ اکثر خطوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں - سچ ہے ان بیکس بے وسیلہ بھائیوں کا وسیلہ یار و یاور جو تھا - خدا ہی تھا *

مؤتمن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈرمل

تعجّب ہے کہ اکبر بادشاہ کا وزیر - کل کشور ہند کا دیوان اور کسی مصنّف نے اس کے خاندان یا وطن کا حال نہ لکھا - خلاصۃ التواریخ میں بھی دیکھ لیا - باوجودیکہ ہندو مؤرّخ ہے اور ٹوڈرمل کا بھی بڑا ثناخواں ہے - مگر اُس نے بھی کچھ نہ کھولا - البتہ پنجاب کے پُرانے پُرانے پنڈتوں اور خاندانی بھاٹوں سے دریافت کیا تو اتنا معلوم ہوا کہ ذات کا کھتری اور گوت کا ٹنن تھا - پنجاب کے لوگ اس کی ہموطنی سے فخر کرتے ہیں - بعض کہتے ہیں لاہوری تھا اور بعض کہتے ہیں - کہ چونیاں ضلع لاہور کا تھا - اور وہاں اُس کے بڑے بڑے عالیشان

مکانات موجود ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی نے بھی اس کے وطن کی تحقیقات کی۔ مگر یہ قرار دیا کہ موضع **لاہر پور** علاقہ اودھ کا رہنے والا تھا۔

بیوہ ماں نے اس ہونہار لڑکے کو بڑی تنگدستی اور افلاس کی حالت میں پالا تھا۔ اُس کے صدق دل کی دُعائیں جو ٹھنڈے سانس کے ساتھ رات کو درگاہ الٰہی میں پہنچتی تھیں ایسا کام کر گئیں۔ کہ شاہنشاہ ہندوستان کے دربار میں ۲۲ صوبہ کا دیوان کل اور وزیر باتدبیر ہو گیا۔ اوّل عام منشیوں کی طرح کم علم نوکری پیشہ آدمی تھا۔ اور مظفر خاں کے پاس کام کرتا تھا۔ پھر بادشاہی متصدیوں میں داخل ہو گیا۔ اس کی طبیعت میں غور۔ قواعد کی پابندی اور کام کی صفائی بہت تھی اور ابتدا سے تھی۔ مطالعہ کتاب اور ہر بات کے حاصل کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ علم ولیاقت اور ساتھ اس کے رجوع کار دربار میں بھی ترقی کرنے لگا۔ کام کا قاعدہ ہے کہ جو اُسے سنبھالتا ہے۔ چاروں طرف سے سمٹتا ہے اور اُسی طرف ڈھلکتا ہے۔ چونکہ وہ ہر کام کو سلیقہ اور شوق سے سرانجام کرتا تھا۔ اس لئے بہت سی خدمتیں اور اکثر کارخانے اُس کے قلم سے وابستہ ہو گئے۔ اُس کی معلومات امورات دفتر اور حالاتِ معاملات میں ایسی ہو گئی تھی کہ امرا اور درباری کاروار ہر بات کا پتہ اس سے معلوم کرنے لگے۔ اُس نے کاغذات دفتر اور مسلہائے مقدمات اور کھنڈے ہوئے کاموں کو بھی اصول و قواعد کے سلسلہ میں بندش دی۔ رفتہ رفتہ بے واسطہ بادشاہ کے سامنے حاضر ہو کر کاغذات پیش کرنے لگا۔ اور ہر کام میں اُسی کا نام زبان پر آنے لگا۔ ان سببوں سے سفر میں بھی بادشاہ کو اُس کا ساتھ لینا واجب ہوا۔

ٹوڈرمل دھرم کرم اور پوجا پاٹ کی پابندی سے پورا ہندو تھا۔ مگر وقت کو خوب دیکھتا تھا۔ اور ضروریات و فضولیات میں نظر دقیق سے امتیاز کرتا تھا۔ ایسے موقع پر اُس نے دھوتی پھینک کر برزو پہن لیا۔ اور جامہ اُتار چُغے پر کمر کس لی۔ موزے چڑھا لئے۔ ترکوں میں گھوڑا دوڑاتے پھرنے لگا۔ بادشاہی لشکر کوسوں میں اُترا کرتا تھا ایک آدمی کو دیکھنا چاہتے۔ دن بھر بلکہ کئی دن لگ جاتے تھے۔ اُس نے پیادہ۔ سوار۔ توپخانہ۔ بہیر۔ رسد۔ بازار لشکر کے اُتارنے کے لئے بھی پہلے اصولوں میں اصلاحیں نکالیں۔ اور ہر ایک کو مناسب مقام پر جمایا۔ اکبر بھی آدمیت کا جوہری اور خدمت کا صراف تھا جب اُس کی سپاہیانہ کمربستگی اور پُرکانہ پھرتی دیکھی تو سمجھ گیا۔ کہ متصدی گری کے علاوہ

سپاہگری و سرداری کا جوہر بھی رکھتا ہے +

ٹوڈرمل پابندی آئین تعمیل احکام اور محاسبات عمل درآمد میں کسی کی بال بھر بھی رعایت نہ کرتا تھا۔ اور لوگ اس سبب سے اُسے سخت مزاجی کا الزام لگاتے تھے۔ سنہ ۹۷۲ھ میں اُس نے وصف مذکور کو اس طرح استعمال کیا۔ کہ اس کا نتیجہ سخت مضرت کے رنگ میں نمودار ہؤا۔ جب بادشاہ نے خانزمان کی مہم میں منعم خاں وغیرہ امرا کو کڑہ مانک پور بھیجا۔ تو میر معز الملک کو بہادر خاں وغیرہ کے مقابلہ پر قنوج کی طرف روانہ کیا۔ پھر ٹوڈرمل کو کہا کہ تم بھی جاؤ۔ اور میر کے ساتھ شامل ہو کر سرشور نمک خواروں کو سمجھاؤ۔ سلامت پر آجائیں تو بہتر ہے۔ ورنہ اپنی سزا کو پہنچیں۔ جب یہ وہاں پہنچے۔ تو پیغام سلام شروع ہوئے بہادر خاں بھی لڑنا نہ چاہتا تھا۔ مگر میر کا مزاج آگ تھا۔ راجہ بارود پہنچے۔ خلاصہ یہ کہ لڑ مرے[1]۔ اور مُفت ذلت اُٹھائی۔ مگر راجہ کو آفرین ہے کہ میدان سے نہ ٹلا۔ پیارے راجہ! گھر کے ملازموں سے حساب و کتاب میں اپنے قواعد و ضوابط کو جس طرح چاہو برت لو۔ لیکن سلطنتوں کی مہمات میں بگڑی بات کا بنانا کچھ اور آئین چاہتا ہے وہاں کے اصول قوانین درگزر کے کاغذوں پر چشم پوشی کے حروف میں لکھے جاتے ہیں۔ جن کی تحریر سے آزاد کے دستِ قلم کوتاہی کرتے ہیں +

چتوڑ۔ رنتھنبور۔ سورت کی فتحوں میں راجہ کی عرقریز کوششوں نے مؤرخوں سے اقرار نامے لے لئے کہ قلعہ گیری کی تدبیروں اور اُس کے سامان و لوازمات میں جو راجہ کی عقل رسا کام کرتی ہے۔ وہ اسی کا کام ہے۔ دوسرے کو نصیب نہیں +

سنہ ۹۸۰ھ میں اُسے حکم ہؤا کہ گجرات جاؤ اور وہاں کے آئین مال اور جمع و خرچ دفتر کا بندوبست کر دو۔ گئے اور چند روز میں کاغذات مرتب کر کے لائے۔ یہ خدمت حضور میں مجرا ہوئی +

سنہ ۹۸۱ھ میں جب کہ منعم خاں بہار کی مہم پر سپہ سالاری کر رہے تھے لڑائی نے طول کھینچا۔ یہ بھی معلوم ہؤا۔ کہ امرائے لشکر آرام طلبی یا آپس کی لاگ یا غنیم کی رعایت سے جان توڑ کر خدمت بجا نہیں لاتے۔ راجہ ٹوڈرمل اب ایسے با اعتبار۔ مزاجدان اور محرم راز ہو گئے تھے۔ کہ انہیں چند امرائے نامی کے ساتھ فوجیں دے کر کمک کے واسطے

[1] دیکھو میر معز الملک کا حال +

روانہ کیا۔ تاکہ لشکر کا انتظام کریں۔ اور سُست یا فتنہ گر لوگ اُنہیں جاسوس خدمت سمجھ کر اس طرح کام دیں۔ گویا حاضر حضور ہیں۔ غرض شہباز خاں کمبو وغیرہ امرائے نامی کو ساتھ کیا اور لشکر کے انتظام اور نگرانی کے لئے بھی چند ہدائتیں کیں۔ یہ بڑی پھرتی سے گئے۔ اور خانخاناں کے لشکر میں شامل ہوئے۔ دشمن مقابلہ پر تھا۔ میدان جنگ کی ترتیب ہوئی۔ راجہ نے تمام لشکر کی موجودات لی۔ ذرا دیکھو! لیاقت اور کارگذاری کیا چیز ہے۔ بُڈھے بُڈھے بہادر۔ چغتائی ترک۔ ہمایوں بلکہ بابر کے معرکے دیکھنے والے۔ اکثر دلاور سپہ سالار کہ تلواریں مار کر اس درجہ تک پہنچے۔ وہ اپنے اپنے عہدے لے کر کھڑے ہوئے۔ اور قلم کا مارنے والا متصدی گمنام کھتری اُن کی موجودات لینے لگا۔ ہاں۔ کیوں نہیں؟ جب وہ اس منصب کے لائق تھا تو اپنا مرتبہ کیوں نہ لے اور اکبر جیسا منصف بادشاہ کیوں نہ دے +

جب پٹنہ فتح ہوا تو اس مہم میں بھی اُس کی خدمتوں نے اس قدر مردانہ سفارشیں کیں۔ کہ عَلَم اور نقارہ دلوایا۔ منعم خاں کی رفاقت سے جدا نہ ہونے دیا۔ اور بنگالہ کی مہم کے واسطے جو امرا انتخاب ہوئے۔ اُن میں پھر اُس کا نام لکھا گیا۔ کہ وہ اس مہم کی رُوح رواں ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہر معرکہ پر مستعد اور کمربستہ پہنچا۔ اور پیش قدمی سے پہنچا۔ مگر ٹانڈہ کی مہم میں ایسی ہمّت کی کہ فتح ناموں اور تاریخوں میں منعم خاں کے ساتھ اُس کا نام لکھا گیا +

جنید کرارانی کی بغاوت کو اس نے بڑی بہادری سے دبایا۔ ایک دفعہ غنیم بے غیرتی کی خاک سر پر ڈال کر بھاگا۔ دوبارہ پھر آیا۔ اُس سے سخت دھوکا کھایا۔ بعض موقع پر کوئی سردار منعم خاں سے بگڑ گیا۔ اور کار بادشاہی میں ابتری پڑنے لگی۔ تو ٹوڈرمل نے بڑی دانائی اور ہمّت و استقلال سے اُس کی اصلاح کی۔ اور چُست و درست بندوبست کیا +

عیسیٰ خاں نیازی فوج لے کر آیا۔ اور قیا خاں گنگ کے مورچہ پر سخت آن بنی۔ اُس وقت اور امرا بھی پہنچے۔ مگر آفرین ہے۔ ٹوڈرمل خوب پہنچا اور برمحل پہنچا +

جب کہ داؤد خاں افغان نے گوجر خاں سے موافقت کر کے عیال کو رہتاس میں چھوڑا۔ اور آپ فوج لے کر آیا۔ تو راجہ فوراً مقابلہ کو تیار ہوا۔ امرائے شاہی روز روز کی

فوج کشی اور بدہوائی بنگالہ سے بیزار ہو رہے تھے۔ راجہ نے دیکھا۔ کہ میری بیم و امید کے
منتر اثر نہیں کرتے منعم خاں کو لکھا۔ وہ بھی بذبذب تھے۔ کہ اتنے میں فرمان اکبری نہایت
تاکید کے ساتھ پہنچا۔ اُسے پڑھ کر خان خاناں بھی سوار ہوئے۔ اور دو لشکر جرار لے کر
غنیم کے مقابل ہوئے۔ طرفین کی فوجیں میدان میں آراستہ ہوئیں۔ لشکر بادشاہی
کے قلب میں منعم خاں کے سر پر سپہ سالاری کا نشان لہرا رہا تھا۔ گوجر خاں حریف کا
ہراول اس زور شور سے حملہ کر کے آیا۔ کہ بادشاہی فوج کے ہراول کو قلب میں دھکیلتا
چلا گیا۔ منعم خاں تین کوس تک برابر بھاگا گیا۔ آفرین ہے ٹوڈرمل کو کہ داہنا بازو لشکر کا
تھا۔ وہ نہ فقط جما رہا بلکہ سرداران فوج کے دل بڑھاتا رہا۔ اور کہتا رہا۔ کہ گھبراؤ نہیں۔ اب
دیکھو فتح کی ہوا چلتی ہے۔ حریف نے خان عالم کے ساتھ خانخاناں کے مرنے کی خبر اُڑا
دی۔ یہ فوج کو اپنی جگہ لئے کھڑا تھا۔ رفیقوں نے جب اس سے کہا تو کمال استقلال
کے ساتھ بولا۔ کہ خان خاناں نہ رہا۔ تو کیا ہوا۔ ہم اکبری اقبال کی سپہ سالاری پر لڑتے
ہیں۔ وہ سلامت رہے۔ دیکھو۔ اب انہیں فنا کئے دیتے ہیں۔ تم گھبراؤ نہیں۔ اور جس
وقت موقع پایا داہنے سے یہ اور بائیں سے شاہم خاں جلائر اس زور شور کے ساتھ جا
گرا۔ کہ غنیم کے لشکر کو تہ و بالا کر دیا۔ اتنے میں گوجر خاں کے مرنے کی خبر پہنچی۔ اس
وقت افغان بدحواس ہو کر بھاگے۔ اور لشکر شاہی فتحیاب ہوا۔

۹۸۳ھ میں داؤد کا ایسا تنگ حال ہوا۔ کہ صلح کی التجا کی۔ لشکر بادشاہی لڑائی
کے طول اور ملک کی بدہوائی کے سبب سے خود بہ تنگ ہو رہا تھا۔ داؤد کی طرف سے
بڈھے بڈھے افغان خان خاناں اور امرائے لشکر کے خیموں میں پہنچے۔ اور پیغام سلام
سُنائے۔ خان خاناں کا آئین سپہ داری ہمیشہ صلح پر تھا۔ یہ راضی ہو گیا۔ امرا پہلے
ہی جانوں سے تنگ جینے سے بیزار ہو رہے تھے۔ اُن کی مراد بر آئی۔ سب نے اتفاق
رائے کیا۔ ایک ٹوڈرمل کہ ہمیشہ آرام و آسائش کو آقا کے کام اور نام پر قربان کرتا تھا راضی
نہ ہوا۔ اور کہا۔ کہ دشمن کی جڑ اُکھڑ چکی ہے۔ اور تھوڑی سی ہمت میں سب افغان فنا
ہو جائینگے۔ اس کی التجاؤں اور اپنے آراموں پر نظر نہ کرو۔ دھاوے کئے جاؤ اور پیچھا
نہ چھوڑو۔ خانخاناں اور امرائے لشکر نے اُسے بہت سمجھایا مگر وہ اپنی رائے سے نہ ہٹا۔ اگرچہ صلح ہوئی[1]

[1] دربار صلح کا تماشہ دیکھنے کے قابل ہے (دیکھو حال منعم خاں خانخاناں صفحہ ۔)

اور اُس کا دربار بڑے شکوہ و شان اور بادشاہی سامان کے ساتھ آراستہ ہوا۔ تمام لشکر نے عید منائی۔ مگر وہ بات کا پورا دربار تک بھی نہ آیا۔ خانخاناں نے ہزار جتن کئے۔ کس کی سُنتا تھا۔ صلح نامہ پر مُہر تک نہ کی +

جب اطراف بنگالہ کی طرف سے اطمینان ہوا۔ تو بادشاہ نے اُسے بُلا بھیجا۔ جاں نثار کہ مزاج شناس تھا۔ حاضر ہوا۔ عمدہ نفائس اس ملک کے اور عجائب دیارِ فرنگ کے جو کہ دریائی تجارتوں سے وہاں پہنچتے ہیں حضور میں لاکر پیش کئے۔ وہ جانتا تھا۔ کہ میرے بادشاہ کو ہاتھی بہت پیارے ہیں۔ ۵۴ ہاتھی چُن کر لایا کہ نہایت عمدہ اور تمام بنگالہ میں نامی تھے۔ اس نے حضور میں تمام حقیقت ملک کی اور سرگذشت معرکوں کی بہ تفصیل بیان کی۔ اکبر بہت خوش ہوا۔ اور عالی منصب دیوانی عطا فرمایا۔ اور چند روز میں تمام ملکی اور مالی خدمتیں اُس کی رائے روشن کے حوالہ کرکے وزارت کُل اور وکالت مستقل کی مسند پر جگہ دی۔ اسی سنہ میں منعم خاں مر گئے۔ فساد تو وہاں جاری ہی تھا۔ داؤد پھر باغی ہوگیا۔ اور افغان اپنی اصالت دکھانے لگے۔ تمام بنگالہ میں بغاوت پھیل گئی۔ امرائے اکبری کا یہ عالم تھا کہ لُوٹ کے مال مار کر فارول ہو گئے تھے۔ انسان کا قاعدہ ہے کہ جتنی دولت زیادہ ہوتی ہے۔ اتنی ہی جان عزیز ہوتی جاتی ہے۔ توپ تلوار کے منہ پر جانے کو کسی کا جی نہ چاہتا تھا۔ بادشاہ نے خانجہاں کو ممالک مذکور کا انتظام سپرد کیا۔ اور ٹوڈرمل کو ساتھ کیا۔ جب بہار میں پہنچا۔ چاروں طرف تدبیروں اور تحریروں کے ہراول دوڑائے۔ بخاری اور ماوراءالنہری امرا گھروں کے پھرنے کو تیار تھے۔ اسے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ کیونکہ زبردست اور کاردان افسر کے نیچے کام دینا کچھ آسان نہیں۔ بعضوں نے خرابی آب و ہوا کا عذر کیا۔ بعضوں نے کہا۔ یہ قزلباش ہے ہم اس کے ماتحت نہیں رہ سکتے۔ خاندانی تجربہ کار کو اس علم میں دستگاہ تھی۔ اُس نے خاموشی اختیار کی۔ اور سخاوت اور علو حوصلہ کے ساتھ فراخ دلی دکھاتا رہا۔ اسمٰعیل قلی خاں اس کا بھائی پیشدستی کی تلوار ہاتھ میں اور پیشقدمی کی فوجیں رکاب میں لے کر چاروں طرف ترکتاز کرنے لگا۔ ٹوڈرمل کی لیاقت اور کاردانی دیکھو اور ساتھ ہی یہ دیکھو کہ اپنے آقا کا کیسا صدقدل سے خیرخواہ تھا۔ اُس نے کہیں دوستانہ فہمائش سے۔ کہیں ڈراوے سے۔ کہیں لالچ سے۔ غرض اپنی حکمت عملی سے سب کو پرچا لیا۔ کہ

لشکر بنے کا بنا رہا۔ اور کام جاری ہو گیا۔ وہ دونوں باوفا جُل جُل کر بڑے حوصلے، صاف سینے اور کھُلے دل سے کام کرتے تھے۔ سپاہی کے دل اور سپاہ کی قوت بڑھاتے تھے۔ پھر کسی بدنیت کی یاوہ گوئی کیا چل سکتی تھی۔ لیکن جا بجا لڑائیاں صف آرائی کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اور کامیابی پر ختم ہوتی تھیں۔ راجہ کبھی داہنے پر ہوتا تھا کبھی بائیں پر اور اس دلاوری سے عین موقع پر اور بڑھ کر کام دیتا تھا۔ کہ سارے لشکر کو سنبھال لیتا تھا۔ غرض بنگالہ کا بگڑا ہوا کام پھر بنا لیا +

معرکہ کا میدان اخیر حملہ داؤد کا تھا۔ کہ شیر شاہی اور سلیم شاہی عہد کی کھُرچن اور پُرانے پُرانے پٹھانوں کو سمیٹ کر نکالا۔ اور عین برسات کے موسم میں گھٹا کی طرح پہاڑ سے اُٹھا۔ یہ چڑھائی اس دھوم دھام کی تھی۔ کہ اکبر نے خود آگرہ سے سواری کا سامان کیا۔ یہاں جنگ سلطانی کا کھیت پڑا تھا۔ دونوں لشکر قلعہ باندھ کر سامنے ہوئے۔ خانجہاں قلب میں اور ٹوڈرمل بائیں پر تھا۔ اور بہادر بھی دونوں طرف کے اس ہمت سے لڑے کہ دلوں کے ارمان نکل گئے۔ فتح و شکست خدا کے ہاتھ ہے۔ اکبر اور اکبر کے امرا کی نیت کام کر گئی۔ داؤد گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ وہ حسرتناک حالت بھی دیکھنے کے قابل ہے[1]۔ اُس کے خاتمہ سے لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور قوم افغان کی بنگالہ اور بہار سے جڑ اُکھڑ گئی۔ ٹوڈرمل نے دربار میں حاضر ہو کر ۳۰۴ ہاتھی نذر گزرانے کہ اکبر کے لئے یہی اُس مُلک کا بڑا تحفہ تھا۔ مہم کے فتح نامے خانجہاں اور ٹوڈرمل کے نام سے گلگوں ہوئے۔

اُسی عرصہ میں معلوم ہوا۔ کہ وزیر خاں کی بے تدبیری سے گجرات اور سرحد دکن کا حال تباہ ہے۔ حکم ہوا کہ معتمد الدولہ راجہ ٹوڈرمل جلد پہنچے۔ اس نے اوّل سلطان پور ملک ندربار کے علاقہ میں دورہ کیا۔ اور دفتر کو دیکھا۔ وہاں سے بندر سورت میں آیا۔ اِدھر سے بھڑوچ۔ بڑودہ۔ چانپانیر ہوتا ہوا گجرات سے ہو کر پٹن کے دفتر مالیات کے دیکھنے کو گیا تھا۔ کہ مرزا کامران کی بیٹی جو ابراہیم مرزا کی بی بی تھی اپنے بیٹے کو لے کر آئی۔ اور گجرات کے علاقہ میں فساد برپا کیا۔ اُس کے ساتھ اور باغی اُٹھ کھڑے ہوئے اور مُلک میں غدر ہو گیا۔ وزیر خاں نے سامانِ جنگ اور قلعہ و فصیل کے ٹوٹے پھُوٹے کا بندوبست کیا اور بسم اللہ کے گنبد میں بند ہو کر بیٹھ رہا۔ ساتھ ہی قاصد دوڑائے۔ کہ بھاگا بھاگ ٹوڈرمل کو خبر کریں۔ گوشت تو پھُس ہو گیا۔ دال کو آفرین ہے کہ خوب اُبال دکھایا۔ وہ

[1] دیکھو حال خان جہان

جس ہاتھ میں قلم پکڑے لکھ رہا تھا اُسی میں تلوار پکڑ کر چلا۔ گجرات میں آیا۔ وزیر خاں کو مرد بنا کر شہر سے باہر نکالا۔ مفسد بڑودہ پر قابض تھے۔ باگیں اُٹھائے پہنچے۔ چار کوس بڑودہ رہا تھا۔ جو باغیوں کے قدم اُٹھ گئے اور سب بھاگ نکلے۔ یہ آگے تھے۔ اور وہ پیچھے۔ کنبایت سے جوناگڈھ ہوتے ہوئے دولقہ کے تنگ میدان میں جا کر رُکے۔ اور ناچار ہو کر مقابلہ کیا +

دونوں فوجیں جم گئیں۔ اور وزیر خاں قلب میں قائم ہوئے۔ چاروں پرے چاروں طرف آراستہ۔ جن میں راجہ بائیں پر۔ غنیم نے صلاح کی تھی کہ صفیں باندھتے ہی زور شور سے لڑائی ڈال دو۔ کچھ سامنے ہو اور باقی دفعتہً بھاگ نکلو۔ اکبری بہادر ضرور تعاقب کرینگے۔ راجہ ہی آگے ہوگا۔ موقع پا کر دفعتہً پلٹ پڑو۔ پھر دونوں کو گھیر کر وزیر خاں اور راجہ کو مار لو۔ کہ کام تمام ہے۔ اور حقیقت میں انہیں بڑا خیال راجہ ہی کا تھا۔ غرض جب لڑائی شروع ہوئی۔ تو مرزا مرہل چال سے وزیر خاں پر آئے۔ اور مہر علی کولابی کہ اصل بانی فساد تھا۔ راجہ پر آیا۔ راجہ سدِّ سکندر تھا۔ وہ اس سے ٹکّر کھا کر پیچھے ہٹا۔ بادشاہی لشکر کا داہنا ہاتھ بھاگا۔ اور قلب نے بھی بے ہمتی کی۔ ہاں وزیر خاں بہت سے بہادروں کے ساتھ خوب ڈٹا۔ اور قریب تھا کہ ننگ و ناموس پر جان قربان کر دے۔ کہ راجہ نے دیکھا۔ اور اس سینے کے جوش سے جس میں ہزار دل کا جوش بھرا تھا۔ گھوڑے اُٹھائے۔ غنیم کی فوج کو اُلٹتا پلٹتا پہنچا۔ اور اس زور سے آ کر گرا۔ کہ حریف کے بندوبست کا سب تانا بانا ٹوٹ گیا +

کامران کے بیٹے نے کام کیا تھا! عورتوں کو مردانہ کپڑے پہنا کر گھوڑوں پر چڑھایا تھا۔ خوب تیراندازی اور نیزہ بازی کرتی تھیں۔ غرض بہت سے کُشت و خون کے بعد غنیم بھاگ گئے اور غنیمت بہت سی چھوڑ گئے۔ باغی بھی بہت گرفتار ہو گئے ٹوڈرمل نے لُوٹ کے اسباب اور ہاتھی اور قیدیوں کو جُوں کا تُوں وہی لباس اور وہی تیر و کمان ہاتھ میں دے کر روانۂ دربار کر دیا۔ کہ زنانی مردانگی کا نمونہ بھی حضور دیکھ لیں۔ دھار اس کے رشید بیٹے نے اُنہیں دربار میں لا کر پیش کیا +

سنہ ۹۸۷ھ میں بنگالہ سے پھر زور شور کا غبار اُٹھا۔ اس دفعہ آندھی کا رنگ اور تھا۔ یعنی خود امرائے شاہی میں بگاڑ تھا۔ سپاہ اور سردارانِ سپاہ سپہ سالار سے

باغی ہو گئے تھے۔ اور تعجب یہ کہ سب کے سب ترک اور مغل تھے۔ اکبر نے ٹوڈرمل کو روانہ کیا۔ اور دیکھو! جو اکثر سردار اُس کے ماتحت دیئے وہ بھی راجگان ہندوستان ہی تھے کیونکہ جانتا تھا۔ سب بھائی بند ہیں۔ رل جائینگے۔ لیکن ٹوڈرمل کے لئے یہ نہایت نازک موقع تھا۔ کیونکہ مقابل میں اگرچہ باغی تھے۔ لیکن خاندان چغتائی کے قدیمی نمک خوار تھے۔ اپنی ہی تلواروں سے اپنے ہاتھ پاؤں کٹتے تھے۔ اس پر مشکل یہ کہ وہ مسلمان اور وہ ہندو۔ مگر لیاقت والے نے مہم کو بڑے تحمّل اور سوچ سمجھ کے ساتھ انجام دیا۔ تدبیر اور شمشیر کے عمدہ جوہر دکھائے۔ اور بڑی جانبازی اور جانکاہی سے خدمتیں بجالایا۔ جن کو کھینچ سکا اُن کو حکمت عملی سے کھینچا۔ جو بالکل نمک حرام تھے۔ وہ تلوار یا اپنے اعمال کے حوالہ ہوئے۔ جا بجا بھاگتے پھرتے تھے۔ نمک حلال جاں نثار اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ لیکن کیا اِدھر کیا اُدھر۔ خلق خدا اور بندگان بادشاہی تباہ ہوتے تھے +

اس مہم میں بعض منافق بداندیشوں نے سازش کی تھی۔ کہ لشکر کی موجودات کے وقت راجہ کا کام تمام کردیں۔ بلوہ کا خون ہوگا۔ کون جانیگا؟ اور کون پہچانے گا؟ راجہ بڑے سیانے تھے۔ ایسے ڈھب سے الگ ہو گئے۔ کہ اپنی جان بچ گئی۔ اور بداندیشوں کا پردہ رہ گیا +

اس مہم میں اُس نے منگیر کے گرد فصیل اور دمدمہ وغیرہ بنا کر جنگی اور عالیشان قلعہ کھڑا کر دیا۔ ۹۷۹ھ میں سب جھگڑے چکا کر پھر دربار میں آیا۔ اور اپنے عہدۂ وزارت کی مستقل مسند پر بیٹھا۔ دیوان کُل ہوگیا۔ اور ۲۲ صوبۂ ہندوستان پر اُس کا قلم دَوڑنے لگا +

۹۹۰ھ میں اُس نے بادشاہ کا جشن ضیافت اپنے گھر میں سرانجام دیا۔ اکبر بادشاہ بندہ نواز وفاداروں کا کارساز تھا۔ اس کے گھر گیا۔ ٹوڈرمل کی عزت ایک سے ہزار ہو گئی۔ اور ہزاروں وفاداروں کے حوصلے بڑھ گئے +

۹۹۳ھ میں اسے ۴ ہزاری منصب عطا ہوا +

اسی سنہ میں کوہستانی یوسف زئی و سواد وغیرہ کی مہم ہو گئی۔ بیربر[1] مارے گئے۔ بادشاہ کو نہایت رنج ہوا۔ دوسرے دن انہیں روانہ کیا۔ مان سنگھ جمرود کے

[1] دیکھو بیربر کا حال صفحہ

مقام میں تھے اور تاریکیوں کے ہجوم میں تلوار سے روشنی کر رہے تھے۔ حکم پہنچا کہ راجہ سے جا کر ملو۔ اور اس کی صلاح سے کام کرو۔ راجہ نے کوہ لنگر کے پاس سواد کے پہلو میں چھاؤنی ڈال دی اور فوجوں کو پھیلا دیا۔ راہزنوں کی حقیقت کیا ہے۔ مارے گئے۔ باندھے گئے۔ بھاگ گئے۔ یہ سرکشوں کی گردنیں توڑ کر سربلند اور سرفراز واپس آئے باقی سرحد کا معاملہ کنور مان سنگھ کے ذمہ رہا۔

۹۹۶ھ میں قلیچ خاں نے گجرات سے آکر عجائب و غرائب پیشکش حضور میں گزرانے۔ حکم ہوا۔ کہ ٹوڈرمل کے ساتھ دیوان خانہ میں مہمات ملکی و مالی سرانجام دیا کرو۔ (ملا صاحب لکھتے ہیں)۔ ٹوڈرمل ستّرا بہتّرا بدحواس ہو گیا ہے۔ کوئی حریف رات کو آن لاگا۔ تلوار ماری تھی۔ پوست مال گزر گئی۔ **شیخ ابوالفضل اس ماجرے کی حقیقت خوب لکھتے ہیں**۔ امرائے نیک طینت پر گمان تھا کہ عداوت مذہب سے کسی نے یہ حرکت کی ہوگی۔ تحقیقات سے معلوم ہوا۔ کہ راجہ نے کسی کھتری بچّہ کو بداعمالی کی سزا دی تھی۔ اُس کی آنکھوں پر غصہ نے اندھیری چڑھائی۔ چاندنی رات تھی۔ وہ سیہ دل گھات لگائے بیٹھا تھا۔ جب راجہ آیا۔ موقع پایا کام کر گیا۔ آخر وہ بھی اور اُس کے شریک بھی معلوم ہو گئے۔ ایک ایک نے سزا پائی۔

۹۹۷ھ میں بادشاہ کشمیر کو چلے۔ آئین تھا کہ یورش کے موقع پر دو امیر جلیل القدر دارالسلطنت میں رہا کرتے تھے۔ لاہور کا انتظام راجہ بھگوان داس کے سپرد ہوا۔ اور راجہ ٹوڈرمل کو بھی یہیں چھوڑا۔ اوّل تو سو مرضوں کا ایک مرض اُن کا بڑھاپا۔ اس پر کچھ بیمار بھی ہوئے۔ بادشاہ کو عرضی لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا۔ بیماری نے بڑھاپے سے سازش کر کے زندگی پر حملہ کیا ہے۔ اور غالب آگئی ہے۔ موت کا زمانہ قریب نظر آتا ہے۔ اجازت ہو۔ تو سب سے ہاتھ اُٹھا کر گنگا جی کے کنارے جا بیٹھوں۔ اور خدا کی یاد میں آخری سانس نکال دوں۔

بادشاہ نے اوّل ان کی خوشی کے لئے فرمان اجازت بھیج دیا تھا۔ کہ وہاں افسردہ طبیعت شگفتگی پر آجائیگی۔ مگر دوسرا فرمان پھر پہنچا۔ کہ کوئی خدا پرستی عاجز بندوں کی غمخواری کو نہیں پہنچتی۔ بہت بہتر ہے کہ اس ارادہ سے رُک جاؤ۔ اور اخیر دم تک انہیں کے کام میں رہو۔ اور اسے آخرت کا سفر خرچ سمجھو۔ پہلے فرمان کی اجازت پر

تن بیمار اور جان تندرست کو لے کر ہردوار چلے تھے۔ لاہور کے پاس اپنے ہی بنوائے ہوئے تالاب پر ڈیرا تھا۔ جو دوسرا فرمان پہنچا کہ چلے آؤ۔

(شیخ ابوالفضل اس حال کی تحریر میں کیا خوب سرٹیفکیٹ دیتے ہیں) وہ نافرمانی بادشاہی کو نافرمانی الٰہی سمجھا۔ اس لئے جب فرمان وہاں پہنچا۔ فرمانبرداری کی۔ اور گیارھویں دن یہاں کے پالے ہوئے جسم کو یہیں رخصت کر گیا۔ راستی۔ درستی۔ مردانگی۔ معاملہ شناسی اور ہندوستان کی سربراہی میں یگانۂ روزگار تھا۔ اگر تعصب کی غلامی۔ تقلید کی دوستی۔ دل کی کینہ وری اور بات کی پیچ نہ کرتا۔ تو بزرگانِ معنوی میں سے ہوتا۔ اس موت سے کارسازی بے غرض کو چشم زخم پہنچی۔ اور معاملات کی حق گذاری کے بازار میں وہ گرمی نہ رہی۔ مانا کہ بادیانت آدمی (جو ہم آشیانہ عنقا) ہے ہاتھ آجائے۔ لیکن یہ اعتبار کہاں سے لائے۔

ٹوڈرمل کی عمر کا حال کسی نے نہیں کھولا۔ مُلّا صاحب نے جو حالت بیان کی ہے اس سے یہ معلوم ہو گیا۔ کہ عمر سے بھی برکت پائی تھی۔ حضرت تو سب پر خفا ہی رہتے ہیں۔ ابھی شاہ فتح اللہ اور حکیم ابوالفتح پر غصے ہوئے تھے۔ یہ بچارہ تو ہندو تھا۔ اس پر جتنا جنجھلائیں۔ تھوڑا ہے۔ فرماتے ہیں۔ راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بھگوان داس امیرالامرا کہ لاہور میں رہتے تھے۔ جہنم اور دوزخ کے ٹھکانوں کو بھاگے اور تہ در تہ کے درجوں میں جا کر سانپ بچھوؤں کے واسطے سامانِ حیات ہوئے۔ سَقَرٌ ھُمَا اللّٰہُ ایک مصرع سے دونوں کی تاریخ روشن کی ہے۔ ع

بگفتا ٹوڈر و بھگوان مُردند

اس سے بھی دل ٹھنڈا نہ ہوا۔ پھر فرماتے ہیں ؎

ٹوڈرل آنکہ ظلمش بگرفتہ بود عالم
تاریخ رفتنش را از پیر عقل جُستم

چوں رفت سوئے دوزخ خلقے شدند خرم
خوش گفت پیرِ دانا وے رفت در جہنّم

اکبر کو جتنا اس کی عقل و تدبیر پر اعتبار تھا۔ اُس سے زیادہ دیانت اور امانت نمک حلالی و فاشعاری پر بھروسا تھا۔ جب وہ پٹنہ کی مہم پر جاں نثاری کر رہا تھا۔ تو دفتر کا کام رائے رام داس کے سپرد ہوا۔ کہ وہ بھی کاردانی۔ سلامت نفسی اور نیک نیتی کے ساتھ عمدہ اہلکار تھا۔ اُسے دیوانی کا خلعت بھی عطا ہوا۔ مگر حکم ہوا۔ کہ طلب تنخواہ کے کاغذ

راجہ کے محرر و منشی اپنے ہی پاس رکھیں۔

اس کے سبب سے اُس کے رشتہ داروں کی کارگزاری بھی درجۂ حرارت کو پہنچتی تھی۔ چنانچہ جنگ بہار کی مہم میں نواڑوں اور کشتیوں کا انتظام پرمانند کے سپرد ہوا۔ کہ راجہ کے خویشوں میں سے تھا۔ یہ بات بآواز بلند تعریف کے قابل ہے۔ کہ باوجود ایسی لیاقت۔ جانفشانی اور جاں نثاری کے خود اپنے تئیں بلند کرنا نہ چاہتا تھا۔ دیکھو کئی لڑائیوں میں اُسے خود سپہ سالاری کا موقع پیش آیا۔ مگر وہ کبھی قلب میں کہ سپہ سالار کی جگہ ہے قائم نہ ہوا۔ اُس کے کاروبار سے معلوم ہوتا ہے کہ آقا کے حکم پر محو ہو کر بلکہ اپنے حال اور خیال سے بے خبر ہو کر کام کا سرانجام کرتا تھا۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ کہ ہر مہم میں کیسا بروقت پہنچتا تھا۔ اور ہر معرکہ میں جان توڑ کر فتح کو قوت دیتا تھا۔ بنگالہ کی مہم میں ہمیشہ سردار سے سپاہی تک بے دل ہو کر بھاگنے کو تیار ہوتے تھے۔ وہ کہیں دلداری سے اور کہیں غمخواری سے کہیں بیم و امید سے مقدمۂ مطلب منقوش خاطر کر کے سب کو روکے رکھتا تھا۔

حسین قلی خاں خانجہاں کی سپہ سالاری پر جب تُرک سوار بگڑے۔ تو مہم بھی بگڑ گئی تھی۔ غیر کا بڑھنا اور اپنے پیچھے ہٹنا کسے پسند آتا ہے۔ کیا اُس کا دل نہ چاہتا تھا۔ کہ میں سپہ سالار کہلاؤں۔ لیکن آقا کی خوشی پر نظر رکھی۔ اور ایسا کچھ کیا۔ کہ سب سردار خانجہاں کی اطاعت پر راضی ہو گئے۔

اس کی علمی لیاقت کا اندازہ صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپنے دفتر کی تحریروں کو بخوبی لکھ پڑھ لیتا تھا۔ مگر طبیعت ایسی قواعد بند اور اصول تراش لایا تھا جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مالیات کے کام کو ایسا جانچتا تھا۔ اور اُس کے نتیجوں کو ایسا پہچانتا تھا کہ جو اس کا حق ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے اور دوبارہ لکھتا ہوں کہ اس سے پہلے حساب کا دفتر بالکل برہم تھا۔ جہاں ہندو نوکر تھے وہاں ہندی کاغذوں میں کام چلتا۔ جہاں ولایتی تھے وہ فارسی میں کاغذ رکھتے تھے۔

ٹوڈرمل۔ فیضی۔ میر فتح اللہ شیرازی۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام۔ نظام الدین بخشی وغیرہ نے بیٹھ کر قواعد باندھے اور سب دفتروں میں انہیں کے بموجب کام جاری ہوا۔ خواجہ شاہ منصور اور مظفر خاں نے دفتر کے انتظام میں بڑے بڑے کام کئے۔ مگر اُس نے سب پر پانی پھیر دیا۔ اور شہرت کے میدان میں اُن سے آگے نکل گیا۔ بہت سے نقشے

اور فردوں کے نمونے آئین اکبری میں درج ہیں۔ اُسی کی اصطلاحیں اور الفاظ ہیں۔ کہ آج تک مالگذاری اور حساب کے کاغذات میں چلے آتے ہیں +

سکندر لودی کے زمانہ تک دھرم دان ہندو فارسی یا عربی نہ پڑھتے تھے۔ اس کا نام ملکش بدھیار کھا تھا۔ راجہ نے تجویز کیا تھا کہ کل قلمرو ہندوستان میں یک قلم دفتر فارسی ہو جائیں۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ جو ہندو اہل قلم۔ اہل تجارت اور صاحب زراعت ہوں انہیں ضرور فارسی پڑھنی چاہیئے۔ اس سے ہندوؤں میں اضطراب پیدا ہوا۔ اور چند روز مشکلیں بھی پیش آئیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی اُسی نے خاص و علم میں پھیلایا۔ کہ بادشاہ وقت کی زبان رزق کی کنجی اور دربار بادشاہی کی دلیل ہے۔ ادھر بادشاہ بھی اکبر بادشاہ تھا۔ جس نے محبت کا جال پھینک کر دلوں کو مچھلیوں کی طرح پھانس لیا تھا۔ یہ بات بہت جلد سب کی سمجھ میں آگئی۔ چند سال کے عرصے میں بہت سے ہندو فارسی خواں۔ فارسی داں ہو گئے۔ اور دفتروں میں اہل ولایت کے پہلو دبا کر بیٹھنے لگے۔ اُس کی حکمت عملی کو دیکھو۔ کس خوبی سے قوم کے مالی اور مُلکی منصوبوں کے لئے شاہراہ کھولی ہے۔ بلکہ حق پوچھو تو فارسی عربی الفاظ کو اُسی وقت سے ہندوؤں کی زبانوں میں بلکہ گھروں میں رستہ مل گیا۔ اور یہیں سے اُردو کی بنیاد ریختہ سے استوار ہوئی +

۹۹۰ھ میں سونے سے تانبے تک، کُل سکّوں میں اصلاحیں ہوئیں۔ راجہ کی تجویز اس اصلاح کا جزوِ اعظم ہے +

اُس میں بڑا وصف یہ تھا۔ کہ تجویز و تدبیر میں مصلحت۔ کے کسی پہلو کو جلنے نہ دیتا تھا۔ اوّل اوّل دیوانِ عالی دماغ شاہ منصور تمام دفاتر سلطنت کو اپنے قلم کی نوک سے دبائے ہوئے تھے۔ دیوان مستوفی وزیر۔ جو کچھ سمجھو وہی تھے۔ ساتھ اُس کے کاغذات حساب کے کیڑے تھے۔ اور کفایت شعاری کے تالاب میں بگلا۔ مگر سپاہی اور ملازم کا جونک کی طرح لہو پی جاتے تھے۔ ۹۸۹ھ میں اُنھوں نے نئی کاردانی خرچ کی۔ اور فوج کی تنخواہ کے چند آئین باندھے۔ راجہ نے ایک مفصل عرضداشت لکھی۔ اس میں حساب کتاب دفتر کے قواعد لکھے تھے۔ اور مصلحت وقت کے نشیب و فراز دکھا کر سپاہی کی رعایت کو مقدم رکھا تھا۔ اکبر خود فرقہ سپاہی کے مائی باپ تھے۔ چنانچہ

خواجہ سے یہ کام لے لیا۔ اور اُن کی خدمت شاہ قلی محرم کو اور وزارت وزیر خاں کو مل گئی۔ ایسی ہی خیرخواہیاں تھیں جن سے شاہ کا وہ حال ہوا[1]۔ اور یہی مصلحت کے پہلو تھے جن کی رعایتوں سے ان کے کلام کو سپاہ کے دلوں میں وہ راہ تھی۔ کہ بنگالہ کے معرکوں میں کامیابی حاصل کی +

اُس نے حساب میں ایک رسالہ لکھا ہے۔ اُس کے گُر یاد کر کے بنئے اور مہاجن دکانوں پر اور دیسی محاسب گھر اور دفتر کے کاروبار میں طلسمات کرتے ہیں۔ اور مدرسوں کے ریاضی دان مُنہ دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں +

کشمیر اور لاہور کے کہن سال لوگوں میں کتاب **خازن اسرار** اس کے نام سے مشہور ہے۔ مگر کمیاب ہے۔ مَیں نے بڑی کوشش سے کشمیر میں جا کر پائی۔ لیکن دیباچہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ۱۰۰۸ھ کی تصنیف ہے۔ حالانکہ خود ۹۹۷ھ میں مر گیا۔ شاید اس کی یادداشت کی کتاب پر کسی نے دیباچہ لگا دیا۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ ایک میں دھرم۔ گیان۔ اشنان۔ پوجا پاٹ وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے میں کاروبار دُنیاوی۔ دونوں میں چھوٹے چھوٹے بہت باب ہیں۔ ہر چیز کا تھوڑا تھوڑا بیان ہے۔ مگر سب کچھ ہے۔ چنانچہ دوسرے حصّہ میں علم الاخلاق۔ تدبیرالمنزل کے علاوہ اختیار ساعات۔ موسیقی۔ سرودھ۔ شگون آوازِ طیور۔ پرواز طیور وغیرہ تک بھی لکھے ہیں۔ کتاب مذکور سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے مذہب کا پکّا اور خیالات کا پورا تھا۔ ہمیشہ گیان دھیان میں رہتا تھا۔ اور پوجا پاٹ مذہبی لوازمات حرف بحرف ادا کرتا تھا۔ اور چونکہ اُس زمانہ میں بے قیدی و آزادی کی فصل بہار پر تھی۔ اس لئے ان خصائل کے ساتھ انگشت نما تھا۔ کہاں ہیں وہ لوگ؟ جو کہتے ہیں کہ نوکر وفادار جبھی ہوتا ہے جب اس کے خیالات اور حالات بلکہ مذہب اور اعتقاد بھی آقا کے ساتھ ایک ہو جائیں۔ وہ آئیں۔ اور ٹوڈرمل کے حالات سے سبق پڑھیں۔ کہ سچے مذہب والے وہی لوگ ہیں۔ جو اپنے آقا کی خدمت صدق و یقین سے بجا لائیں۔ بلکہ جتنا صدق و یقین مذہب میں زیادہ ہوگا۔ اتنی ہی وفاداری اور جاں نثاری زیادہ صدق و یقین کے ساتھ ہوگی۔ اچھا اس کی نیّت کا پھل بھی دیکھ لو۔ اکبری دربار میں کون سا امیر ذی رُتبہ تھا۔ جن سے وہ ایک قدم پیچھے یا فیض انعام میں پیچھے رہا +

[1] دیکھو شاہ کا حال

جر دیات مذہبی اور اُس کے رسوم و قیود کی پابندی بعض موقع پر نہیں تنگ کرتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ بادشاہ اجمیر سے پنجاب کو آتے تھے۔ سفر کا عالم۔ ایک دن کوچ کی گھبراہٹ میں ٹھاکروں کا آسن کہیں رہ گیا۔ یا وزیر سلطنت کا تھیلا سمجھ کر کسی نے چرالیا۔ راجہ کا قاعدہ تھا۔ کہ جب تک پُوجا نہ کر لیتے تھے کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اور کھانا بھی نہ کھاتے تھے۔ کئی وقت کا فاقہ ہو گیا۔ اکبری لشکر میں ڈیرے ڈیرے چرچا ہو گیا۔ کہ راجہ کے ٹھاکر چوری گئے۔ وہاں عالم مسخرے۔ فاضل۔ شہدے۔ بیربر جیسے کئی پنڈت اور بدھیاوان موجود تھے۔ خدا جانے کیا کیا لطیفے چھانٹے ہونگے +

بادشاہ نے بُلا کر کہا کہ ٹھاکر چوری گئے۔ اَن داتا تمہارا ایشور ہے وہ تو نہیں چوری گیا؟ اشنان کر کے اُسے یاد کرو۔ اور کھانا کھاؤ۔ خودکشی کسی مذہب میں ثواب نہیں۔ راجہ نے بھی اپنے خیال سے رجوع کی۔ **آزاد**۔ کہنے والے کچھ ہی کہیں۔ لیکن میں اُس کے استقلال پر ہزار تعریفوں کے پھول چڑھاؤں گا۔ بیربر کی طرح دربار کی ہوا میں آکر اپنا دین تو نہیں گنوایا۔ البتہ دین الٰہی اکبرشاہی کے خلیفہ نہ ہوئے۔ خیر وہ خلافت انھی کو مبارک ہو +

شیخ ابوالفضل نے جو فقرے اس کی عادات و اخلاق کے بارے میں لکھے ہیں اُن کے باب میں آزاد کو کچھ لکھنا واجب ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ اگر تعصب[1] کی پرستاری۔ تقلید[2] کی محبت۔ اور کینہ کشی[3] نہ ہوتی۔ اور[4] اپنی بات پر مغرور ہو کر نہ اڑتا۔ تو بزرگان معنوی میں سے ہوتا +

عوام الناس ضرور کہینگے۔ کہ شیخ لامذہب تھے۔ جس کو پابند مذہب اور بزرگوں کی لکیر پر چلتا دیکھتے تھے۔ اُس کی خاک اُڑاتے تھے۔ آزاد کہتا ہے۔ کہ یہ سب درست ہے۔ لیکن ابوالفضل بھی آخر ایک شخص تھے۔ اسی جگہ نہیں۔ کئی جگہ راجہ کے حق میں ایسے ہی فقرے تراشے ہیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور ان قباحتوں کے ضرر لوگوں کو پہنچے ہونگے۔ جب راجہ بنگالہ کی مہم سر کر کے آئے۔ ۵۴ ہاتھی اور نفائس گراں بہا پیشکش گزرانے۔ وہاں بھی لکھتے ہیں۔ بادشاہ نے مقدمات مالی و ملکی اس کے فہم درست پر حوالہ کر کے دیوان کُل ہندوستان کا مقرر فرمایا۔ وہ راستی اور کم طمعی میں

عمدہ خدمتگزار تھا۔ بے لالچ کاروبار کرتا تھا۔ کاش کینہ کش اور انتقامی نہ ہوتا۔ کہ طبیعت کے کھیت میں ذرا ملائمت پھوٹ نکلتی۔ یہ بھی سہی۔ تعصب مذہبی چہرہ پر رنگ نہ پھیرتا۔ تو اتنا قابل ملامت نہ ہوتا۔ باوجود اس کے عام اہل زمانہ کو دیکھ کر کہنا چاہیئے۔ کہ سیر دلی اور بے طمعی کے ساتھ۔ عرق ریز کاردان۔ قدردان خدمتگزار تھا۔ اور کم نظیر نہیں۔ بے نظیر تھا۔ دیکھئے کیا سرٹیفکیٹ دیا ہے۔ اب اس ۵ فقرہ کی عبارت کو پھر پڑھو اور غور سے دیکھو۔

پہلا اور دوسرا فقرہ اس کی قوم کے لئے فخر کی سند ہے۔ تیسرے فقرہ پر بھی خفا نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ آخر انسان تھا۔ اور ایسے عالیشان رتبہ پر کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے معاملات اُس سے ٹکر کھاتے تھے۔ اور بار بار ٹکر کھاتے تھے۔ ایک دفعہ کوئی بے نکلتا ہوگا۔ تو یہ دوسرے موقع پر کسر نکالتا ہوگا۔ اور چونکہ ضابطہ دفتر اور کفایت بادشاہی پر بنیاد عمل تھی۔ اس لئے حضور میں بھی اُسی کی بات سرسبز ہوتی ہوگی میرے دوستو! دُنیا نازک مقام ہے۔ اگر دشمن سے بچاؤ نہ رکھتا تو زندگی کیوں کر ہوتی۔ اور گزارہ کہاں کرتا۔ چوتھے فقرہ پر بھی چڑنا نہ چاہیئے۔ کیونکہ وہ دیوان تھا۔ امرائے عالیشان سے غریب سپاہی تک اور صاحبان ملک سے لے کر ادنٰے معافی دار تک سب کا حسب کتاب اُسے کرنا پڑتا۔ وہ واجب الطلب میں کسی کی رعایت کرنے والا نہ تھا۔ اور باخبر اہلکار تھا۔ دنیا میں ادنٰے سے اعلےٰ تک اپنی کفایت اور اپنا فائدہ چاہتے ہیں۔ اور ایک ایک رقم مندرجہ دفتر پر ضرور گرفت کرتا ہوگا۔ لوگ حجتیں کرتے ہونگے۔ حساب کا معاملہ تھا۔ کسی کی پیش بھی نہ جاتی ہوگی۔ سفارشیں بھی آتی ہونگی۔ وہ سُنتا نہ ہوگا۔ دربار تک بھی نوبتیں پہنچتی ہونگی۔ اور راجہ کاٹ ہی لیتا ہوگا۔ اکبر رحیم و کریم بادشاہ تھا۔ مگر آئین سلطنت اور ضوابط دفتر کو توڑنا بھی نہ چاہتا تھا۔ اِس لئے کہیں کہیں وہ بھی دق ہوتا ہوگا۔ سب ناراض ہوتے ہونگے۔ یہی بنیاد ہے اُن اشعار کی جو مُلّا صاحب نے لکھے اور انہی باتوں سے جل کر موزوں طبعوں نے اس کا سجع کہا تھا ؎

آنکہ شد کار ہند از و مختل	راجہ راجہاست ٹوڈرمل

باوجود ان سب باتوں کے جو کچھ کرتا تھا۔ اپنے آقا کی خیر خواہی سمجھ کر کرتا تھا۔ اور

خزانہ شاہی میں داخل کرتا تھا۔ اگر خود بیچ میں کتر لیتا۔ تو گنہگار اور وہ کترتا تو لوگ کب چھوڑتے۔ اُسی بیچارے کو کتر ڈالتے۔ یہی سبب ہے کہ اُس کی راستی اور درستی کو ہر شخص برابر مانتا ہے +

البتہ ایک بات کا مجھے بھی افسوس ہے۔ بعض مؤرخ لکھتے ہیں۔ کہ شاہ منصور کے قتل کی جو سازشیں ہوئی تھیں۔ اُن میں کرم اللہ (شہباز خاں کمبو کے بھائی) نے بھی کچھ خطوط پیش کئے۔ وہ بھی جعلی تھے۔ اور یہ راجہ کی کارسازی تھی۔ اُس وقت کوئی نہ سمجھا۔ پیچھے راز کھلا۔ خیر راجہ کی اور اُن کی کاغذی بحثیں تھیں۔ دونوں اہلکار تھے خدا جانے طرفین سے کیا کیا وار چلتے ہوں گے۔ اُس وقت اُن کا نہ چلا۔ ان کا چل گیا۔

بٹالوی صاحب خلاصۃ التواریخ سے تعجب ہے۔ کہ ملک پنجاب میں بیٹھ کر کتاب لکھی اور شاہجہان اور عالمگیر کا زمانہ پایا۔ اُنہوں نے بھی ٹوڈرمل کی اصل نسل اور عمر اور سنہ ولادت کی توضیح نہیں لکھی۔ البتہ اُس کے اوصاف میں ایک بڑا ورق تحریر کیا۔ جو تقریباً راستی اور اصلیت کے الفاظ سے مرصّع ہے۔ اس میں کہتے ہیں رازدانِ سلطنت تھا۔ دقائق۔ سیاق اور حقائق حساب میں بے نظیر تھا۔ محاسبوں کے کاروبار میں باریکیاں نکالتا تھا۔ ضوابط و قوانین وزارت۔ آئین سلطنت۔ ملک کی معموری۔ رعیّت کی آبادی۔ دفتر دیوان کے دستور العمل۔ حقوق بادشاہی کے اصول۔ افزونی خزانہ۔ رستوں کی امنیّت۔ مواجب سپاہ۔ شرح دامی پرگنات۔ تنخواہ جاگیر۔ مناصب امرا کے قواعد۔ سب کچھ اس کی یادگار ہیں۔ اور سب جگہ انہیں قواعد اور ضوابط پر عمل درآمد ہے (۱) جمع وہ بدہی پرگنہ وار اُس نے باندھی۔ (۲) طنابی جریب خشکی اور تری میں گھٹ بڑھ جاتی ہے اور ۵۵ گز تھی۔ اُس نے ۶۰ گز کی جریب بانس یا نرسل کی قرار دی اور لوہے کی کڑیاں بیچ میں ڈالیں۔ کہ کبھی فرق نہ پڑے (۳) اُس کی تجویز سے ۹۸۲ھ میں کل ممالک محروسہ بارہ صوبوں میں منقسم ہوئے۔ اور دہ سالہ بندوبست ہو گیا۔ چند گاؤں کا پرگنہ چند پرگنوں کی سرکار۔ چند سرکار کا ایک صوبہ قرار دیا۔ (۴) روپیہ کے چالیس دام[۲] ٹھیرائے۔ پرگنہ کی شرح دامی دفتر میں مندرج ہوئی (۵) کرور دام پر ایک عامل مقرر کر کے کروری نام

[۱] ایک بیگھہ مربع = ۳۶۰۰ گز شاہجہانی۔ [۲] دام میں نے دیکھا ہے۔ وزن میں ایک تولہ۔ مرصع جیسا دلی کا پیسہ۔ ایک طرف اکبر کا نام معمولی طور پر۔ دوسری طرف دام نہایت خوش قلم خط ثلث میں +

رکھا۔ (۶) امرا کے ماتحت نوکر ہوتے تھے۔ اُن کے گھوڑوں کے لئے داغ کا آئین مقرر کیا کہ ایک جگہ کا گھوڑا دو دو تین تین جگہ دکھا دیتے تھے۔ عین وقت پر کمی سے بڑا ہرج پڑتا تھا۔ اس میں کبھی تو سواروں کی دغابازی ہوتی تھی۔ کبھی امرا خود بھی دغا دیتے تھے۔ کہ جب موجودات ہوتی تو فوراً سپاہی نوکر رکھ لئے اور لفافہ چڑھا کر موجودات دلوائی اِدھر سے رخصت ہوئے۔ اُدھر جا کر موقوف۔ (۷) بندہائے بادشاہی کی سات ٹولیاں باندھیں۔ ہفتہ کے سات دن کے بموجب ہر ٹولی میں سے باری باری آدمی لئے جاتے تھے۔ اور چوکی میں حاضر ہوتے تھے۔ (۸) روز کے واسطے ایک ایک آدمی چوکی نویس مقرر ہوا کہ ہر اہل خدمت کی حاضری بھی لے۔ اور جو عرض و معروض حکم احکام ہوں۔ جاری کرے۔ اور جا بجا پہنچائے (۹) ہفتہ کے لئے سات واقعہ نویس مقرر ہوئے۔ کہ تمام دن کا حال ڈیوڑھی پر بیٹھے لکھا کریں (۱۰) امرا و خوانین کے علاوہ چار ہزار یکہ سوار خاص رکاب شاہی کے قرار دیئے۔ انہیں کو احدی کہتے تھے۔ کہ یکہ کا ترجمہ ہے۔ ان کا داروغہ بھی الگ ہوا۔ (۱۱) کئی ہزار غلام۔ کیا لڑائیوں کے گرفتار۔ غلامی سے آزاد ہوئے۔ اور چیلہ اُن کا خطاب ہوا۔ کیونکہ خدا کے بندے آزاد ہیں۔ انہیں غلام یا بندہ کہنا روا نہیں غرض سینکڑوں جزئیات آئین و قواعد کے ایسے باندھے کہ بعض امرا اور وزرا نے کوششیں کیں اور کرتے ہیں۔ آگے نہیں نکل سکتے۔ اس کے بعد منصب وکالت مرزا عبدالرحیم خانخاناں کو مرحمت ہوا۔ اُس نے بھی منصب مذکور اور امورات وزارت کو باحسن وجوہ رونق دی کہ مورد تحسین ہوا۔ (۱۲) ہندوستان میں خرید و فروخت۔ دیہات کی جمع بندی تحصیل مال۔ نوکروں کی تنخواہوں کا حساب کیا را جاؤں کیا بادشاہوں میں تنگوں پر تھا۔ مگر پیسے دیا کرتے تھے۔ چاندی پر ضرب لگتی تھی۔ تو چاندی کے تنگے کہلاتے تھے۔ اور ایلچیوں اور ڈوموں کو انعام میں دیا کرتے تھے۔ عام رواج نہ تھا۔ چاندی کے مول بازار میں بک جاتے تھے۔ ٹوڈرمل نے منصب داروں اور ملازموں کی تنخواہ میں انہی کو جاری کیا۔ اور آئین باندھا۔ کہ تنگہ کی جگہ دیہات سے روپیہ وصول ہوا کرے۔ اس کا ۱۱ ماشہ وزن رکھا روپیہ کے ۴۰ دام قرار دیئے۔ اس کا آئین یہ کہ تانبے پر ٹکسال کا خرچ لگائیں تو روپیہ کے پورے ۴۰ دام پڑتے ہیں۔ وہی نوکروں کی تنخواہ میں ملتے تھے۔ اُسی کے بموجب جمع کل دیہات، قصبات پرگنات کی دفتر میں لکھی جاتی تھی۔ اُس کا نام عمل نقد جمعبندی رکھا۔

محصول کا آئین یہ باندھا کہ غلہ زمین بارانی میں - نصف کاشتکار - نصف بادشاہ کا - بارانی میں ہر قطعہ پر $\frac{1}{3}$ اخراجات اور اُس کی خرید و فروخت کی لاگت لگا کر غلہ میں $\frac{1}{2}$ بادشاہی - نیشکر وغیرہ کہ جنس اعلیٰ کہلاتے ہیں - اور پانی اور نگہبانی اور کٹائی وغیرہ کی محنت غلہ سے زیادہ کھاتی ہے - $\frac{1}{3}$ $\frac{1}{5}$ $\frac{1}{4}$ $\frac{1}{2}$ حسب مراتب حق بادشاہی - باقی حق کاشتکار - اگر محصول لیں - تو ہر جنس میں بیگھہ مربع پر زر نقدی لیں - اس کا دستور العمل بھی جنس وار لکھا ہے ۔

یہ بات بھی قابل تحریر ہے - کہ قواعد مذکورہ کے بہت سے جزئیات - خواجہ شاہ منصور - مظفر خاں اور میر فتح اللہ شیرازی وغیرہ کے نکالے ہوئے تھے اور بیشک اُنھوں نے کاغذات کی چھان بین اور انتظام دفتر میں بڑی عرقریزی کی ہے مگر اتفاق تقدیری ہے - کہ اُن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا - جس عمدہ انتظام کا ذکر آتا ہے وہاں ٹوڈرمل کا نام پکارا جاتا ہے ۔

طالع شہرت رسوائی مجنوں بیش است	ورنہ طشت من و او ہر دو زیک بام افتاد

باوجود ان سب باتوں کے یہ نکتہ اکبر کی کتاب اوصاف میں سنہری حرفوں سے لکھنا چاہیئے - کہ امرا نے راجہ کے اختیارات اور ترقیات متواتر دیکھ کر بعض امورات میں شکایت کی - اور یہ بھی کہا - کہ حضور نے ایک ہندو کو مسلمانوں پر اس قدر اختیار اور اقتدار دے دیا ہے - ایسا مناسب نہیں - سینہ صاف اور بے تکلف بادشاہ نے کہا - ہر کدام شما در سرکار خود ہندوئے دارد - اگر ما ہم ہندوے داشتہ باشیم - چرا از و بد باید بود - تم سب کی سرکاروں میں کوئی نہ کوئی منشی ہندو ہے - ہم نے ایک ہندو رکھا - تو تم کیوں بُرا مانتے ہو ۔

راجہ مان[1] سنگھ

اس عالی خاندان راجہ کی تصویر دربار اکبری کے مرقع میں سونے کے پانی سے کھینچنی چاہیئے - کیونکہ سب سے پہلے اس کے باپ دادا کی مبارک رفاقت اکبر کی

[1] بہاری مل - پورن مل - روپسی - آسکرن - جگ مل پانچ بھائی تھے - جگ مل کا بیٹا مہاں سنگھ تھا ۔

ہمدم اور رفیق حال ہوئی۔ جس سے ہندوستان میں تیموری خاندان کی بنیاد نے قیام پکڑا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے۔ کہ اُنہوں نے اپنی رفاقت اور ہمدردی سے اکبر کو اپنایت اور محبّت کرنی سکھادی۔ اور خلق و عالم کو دکھا دیا۔ کہ راجپوتوں میں جو خیال چلا آتا ہے۔ کہ سر جائے بات نہ جائے۔ اُس کی مُورت دیکھنی چاہو۔ تو انہیں دیکھ لو۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اِن بات کے پُوروں نے اُس ترک بادشاہ کی رفاقت میں اپنی جان کو جان نہ سمجھا۔ اور اپنے اور اُس کے ننگ و ناموس کو ایک کر دیا۔ ان کی ملنساری اور وفاداری نے اکبر کے دل پر نقش کر دیا۔ کہ ملک ہند ایسی اجزائے شرافت سے مرکّب ہے۔ کہ اگر اُن کے ساتھ غیر قوم بھی محبّت اور ہمدردی کرے۔ تو یہ ایسا کرتے ہیں۔ کہ اپنی قوم کی تو کیا حقیقت ہے حقیقی بھائی کو بھول جاتے ہیں۔ یہ کچھواہہ کے خاندان عظیم الشّان میں نامی گرامی اور صدہا سال سے خاندانی راجہ چلے آتے تھے۔ ان کے ساتھ تمام قوم کچھواہہ اکبر کی جاں نثاری پر کمر بستہ ہو گئی۔ اور ان کی بدولت راجپوتوں کے اکثر خاندان آ کر شامل ہو گئے۔ لیکن اکبر کی دلربائی اور دلداری کا جادُو بھی ان پر ایسا کارگر ہوا۔ کہ آج تک سب چغتائی خاندان کی محبّت کا دم بھرتے ہیں +

سنہ ۹۶۳ھ پہلے سال جلوس میں دربار اکبری سے مجنوں خاں قاقشال نارنول پر حاکم ہو کر گیا۔ حاجی خاں کہ شیر شاہ کا غلام تھا۔ وہ مجنوں خاں پر چڑھ آیا۔ راجہ بھاڑامل راجہ آمیر کہ اس وقت کچھواہہ خاندان کا چراغ روشن کرنے والا تھا۔ حاجی خاں کے ساتھ تھا۔ مجنوں خاں کی عقل و ہوش جاتے رہے۔ گھر گئے اور حالت تنگ ہوئی۔ خاندانی راجہ مرد کہن سال۔ مروّت و انسانیّت کے جواہر سے خزانہ دار تھا۔ اور بات کے نشیب و فراز انجام و آغاز کو خوب سمجھتا تھا۔ اُس نے صلح کا بندوبست کر کے مجنوں خاں کو محاصرہ سے نکلوایا۔ اور عزّت و حرمت کے ساتھ دربار شاہی کو روانہ کر دیا۔ یہی راجہ بھاڑامل ہیں۔ جو راجہ بھگوان داس کے باپ اور مان سنگھ کے دادا تھے +

مجنوں خاں جب دربار میں پہنچا۔ تو راجہ کی مروّت۔ محبّت۔ اخلاص عالی ہمّتی اور اس کے عالی خاندان کے حالات اکبر کے سامنے بیان کئے۔ دربار سے ایک امیر فرمان طلب لے کر گیا۔ راجہ سامان معقول کے ساتھ حاضر دربار ہوا۔ یہ وہی مبارک

موقع تھا۔ کہ اکبر ہیموں کی مہم مار کر دلّی آیا تھا۔ چنانچہ راجہ کی بڑی عزّت اور خاطرداری کی جس دن راجہ اور فرزند اور اس کے ہمراہی بھائی بندوں کو خلعت اور انعام و اکرام مل رہے تھے۔ اور وہ رخصت ہوتے تھے۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو کر باہر نکلے تھے۔ اور ان کا تماشہ دیکھتے تھے۔ ہاتھی مست تھا۔ اور جوش مستی میں جھوم جھوم کر کبھی ادھر کبھی اُدھر جاتا تھا۔ لوگ ڈر ڈر کر بھاگتے تھے۔ ایک دفعہ ان راجپوتوں کی طرف بھی جھکا۔ وہ اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ اُسی طرح کھڑے رہے۔ بادشاہ کو اُن کی دلاوری بہت پسند آئی۔ راجہ بھاڑامل کی طرف متوجّہ ہو کر یہ الفاظ کہے۔ تُرا نہال خواہم کرد۔ عنقریب مے بینی کہ اعزاز و افتخارت زیادہ بر زیادہ مے شود۔ اُسی دن سے راجپوتوں کی خصوصاً راجہ بھاڑامل اور اس کے متعلقوں اور متوسلوں کی قدردانی کرنے لگے۔ اور ان کی بہادری اور دلاوری روز بروز دل پر نقش ہوتی گئی۔ اکبر نے مرزا شرف الدین حسین کو میوات کا حاکم کر کے بھیجا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر پھیلنا شروع کیا تھا۔ اور آنبیر کو لینا چاہا۔ راجہ بھاڑامل کا ایک فتنہ پرداز بھائی شرکت ریاست کے باعث مرزا سے آن ملا۔ اور ساتھ ہو کر لشکر لے گیا۔ چونکہ گھر کی پھوٹ تھی اسواسطے مرزا غالب آیا۔ اور راجہ کے چند بھائی بند گروے کر پھرا۔

سنہ ۹۶۸ھ میں بادشاہ زیارت اجمیر کو چلے۔ رستہ میں ایک امیر نے عرض کی۔ کہ راجہ بھاڑامل جو دہلی میں حاضر دربار ہوا تھا۔ اُس پر مرزا نے بڑی زیادتی کی ہے۔ بیچارہ پہاڑوں میں گھُس کر گزارہ کر رہا ہے۔ وہ عالی ہمّت بامروّت خاندانی راجہ ہے۔ اگر حضور کی توجّہ شامل حال ہوگی۔ تو خدمات عظیم بجا لائیگا۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ تم خود جا کر لے آؤ۔ چنانچہ وہ لینے گیا۔ راجہ خود نہ آیا۔ عرضی کے ساتھ نذرانہ بھیجا۔ اور اُس کا بھائی امیر مذکور کے ساتھ آیا۔ اکبر نے کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ خود آئے۔ راجہ بھاڑامل نے بڑے بیٹے بھگوان داس کو اہل وعیال کے پاس چھوڑا۔ اور سانگانیر کے مقام پر خود حاضر ہوا۔ بادشاہ نے بڑی محبّت اور دلداری سے اُس کی تشفّی کی۔ اور دربار کے امرائے خاص میں داخل کیا۔ راجہ کے دل میں بھی ایسا محبّت اور وفا کا جوش پیدا ہوا کہ رفتہ رفتہ اپنے یگانوں میں اور اُس میں کچھ فرق نہ رہا۔ چند روز کے بعد راجہ بھگوانداس اور مان سنگھ بھی آ گئے۔ اکبر نے ان دونوں کو ساتھ لیا۔ اور راجہ بھاڑامل کو رخصت کیا۔

دیکھو مرزا کا حال صفحہ

مگر دل رل گئے تھے۔ چلتے ہوئے کہہ دیا کہ جلد چلے آنا۔ اور سامان کرکے آنا۔ کہ پھر جانے کی تکلیف نہ کرنی پڑے +

مذہب کی دیوار اور قانون قومی کا قلعہ اپنی مضبوطی اور استواری میں سد سکندری سے کم نہیں۔ مگر آئین سلطنت (جسے ہندوستان میں راج نیت کہتے ہیں) کا قانون سب پر غالب ہے۔ جب اس کی مصلحت کا دریا چڑھاؤ پر آتا ہے۔ تو سب کو بہائے جاتا ہے۔ اکبر کو شاہ طہماسپ کا قول یاد تھا (دیکھو صفحہ) اُس نے اس خاندان کی نیک نیت اور اخلاص و محبت دیکھ کر سوچا۔ کہ ان کے ساتھ قرابت ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ اور یہ امر ممکن بھی نظر آیا۔ چنانچہ بڑے موقع کے ساتھ یہ سلسلہ ہلایا۔ اور اس میں کامیاب ہوا۔ یعنی ۹۶۹ھ میں راجہ بہاڑامل کی بیٹی مان سنگھ کی پھوپھی بیگمات اکبری میں داخل ہو کر محل کا سنگار ہو گئی +

باوجودیکہ رانا کے ساتھ ان کا خاندانی تعلق تھا۔ مگر جب ۹۷۴ھ میں چتوڑ پر مہم ہوئی۔ تو راجہ بھگوان داس اکبر کے ساتھ تھے۔ اور ہر مورچے پر سپر کی طرح کبھی آگے تھے کبھی پیچھے۔ (دیکھو تتمہ) +

۹۷۹ھ میں جب اکبر گجرات پر خود فوج لے کر گیا۔ تو راجہ مان سنگھ بھی باپ کی رفاقت میں ہمراہ تھا۔ نوجوانی کا عالم۔ دل میں اُمنگ۔ دلاوری کا جوش۔ راجپوتی خون کتنا ہوگا۔ کہ چنگیزی ترک جن کے دل فتحیابی نے بڑھائے ہیں۔ اس وقت باگ سے باگ ملائے ہیں۔ ان سے قدم آگے بڑھا رہے ہے۔ اور انہیں بھی دکھلا دو۔ کہ راجپوتی تلوار کی کاٹ کیا رنگ دکھاتی ہے۔ کیا راہ میں کیا میدانِ جنگ میں جدھر ذرہ اکبر کا اشارہ پاتا تھا۔ فوج کا دستہ لیتا تھا۔ اور اس طرح جا پڑتا تھا۔ جیسے شیر و پلنگ شکار پر جاتے ہیں +

اس عرصہ میں خانِ اعظم احمد آباد میں گھر گئے۔ اور چغتائی شہزادے افواج دکن کو ساتھ لے کر اُس کے گرد چھا گئے۔ اکبر نے آگرہ سے کوچ کیا۔ اور مہینے کی راہ سات دن میں طے کر کے احمد آباد پر جا پہنچا۔ راجہ بھگوان داس اور کنور مان سنگھ اس مہم میں ساتھ تھے۔ اور بادشاہ کے گرد اس طرح سے جان نثاری کرتے پھرتے تھے۔ جیسے شمع کے گرد پروانے +

چغتائی مؤرخوں نے یہ معاملہ درج تاریخ نہیں کیا۔ مگر ٹاڈ صاحب تاریخ راجستان میں لکھتے ہیں۔ اور حقیقت میں دیکھنے کے قابل ہے +

راجہ مان سنگھ شعلہ پور کی مہم مار کر آتا تھا۔ اودے پور کی سرحد سے گزرا۔ سُنا کہ رانا پرتاپ کوملمیر میں ہے۔ وکیل بھیجا اور لکھا کہ آپ سے ملنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ رانا نے اودے ساگر تک استقبال کر کے جھیل کے کنارے ضیافت کا سامان کیا۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو رانا آپ نہ آیا۔ بیٹے نے آکر کہا "راناجی کے سر میں درد ہے۔ وہ نہ آئینگے۔ آپ کھانے پر بیٹھیں۔ اور اچھی طرح کھائیں"۔ راجہ مان سنگھ نے کہلا بھیجا۔ کہ جو مرض ہے عجب نہیں کہ وہی ہے۔ جو میں سمجھا ہوں۔ مگر یہ تو لا علاج مرض ہے۔ اور جب وہی مہمانوں کے آگے تھال نہ رکھینگے۔ تو کون رکھیگا؟

رانا نے کہلا بھیجا۔ مجھے اس کا بڑا رنج ہے۔ مگر کیا کروں۔ جس شخص نے بہن ترک سے بیاہ دی۔ تو اُس کے ساتھ کھانا بھی کھایا ہی ہوگا۔ راجہ مان سنگھ اپنی حماقت پر پچتایا کہ یہاں کیوں آیا۔ اور وہ صدمہ گزرا کہ دل ہی جانتا تھا۔ چاول کے چند دانے لیکر ان دیوی کو چڑھائے۔ وہی اپنی پگڑی میں رکھ لئے۔ اور چلتے ہوئے کہا۔ تیری عزت بچانے کو ہم نے اپنی عزت کھوئی۔ اور بہنیں بیٹیاں تُرک کو دیں۔ تمہاری یہی مرضی ہے کہ خوف میں رہیں تو ہمیشہ رہو۔ اختیار ہے۔ اس لئے کہ اس ملک میں تمہارا گذر نہ ہوگا +

گھوڑے پر چڑھا اور رانا کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ (اس وقت وہ بھی آن موجود ہوا تھا) راناجی اگر تمہاری شیخی نہ جھاڑ دوں۔ تو میرا نام مان نہیں۔ پرتاپ بولا "ہم سے ہمیشہ ملتے رہنا"۔ کسی بے لحاظ نے برابر سے یہ بھی کہا۔ جی اپنے پُھپا (اکبر) کو بھی ساتھ لانا۔ جس زمین پر یہ ضیافت ہوئی تھی۔ اُسے کھدوایا۔ گنگا جل سے دُھلوا کر پاک کیا۔ سردار نہائے۔ پوشاک بدلی۔ گویا سب اُسکے آنے سے ناپاک ہو گئے تھے۔ اس بات کی ذرہ ذرہ خبر اکبر کو پہنچی۔ بہت غصہ آیا۔ اُسے بڑا خیال یہ تھا۔ کہ ایسا نہ ہو راجپوت کی ذات غیرت کھا کر پھر بگڑ جائے اور جس تعصب کی آگ کو میں نے سو سو پانی سے دھیما کیا ہے۔ وہ پھر سُلگ اُٹھے +

عالی ہمت بادشاہ کے دل میں یہ خیال کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ آخر چند روز بعد رانا پر فوج کشی ہوئی۔ سلیم (جہانگیر) کے نام سپہ سالاری ہوئی۔ مان سنگھ اور

مہابت خاں ساتھ ہوئے۔ کہ شہزادہ ان کی صلاح پر چلے۔ بادشاہی لشکر رانا کے ملک میں داخل ہؤا اور چھوٹے موٹے مقابلوں کو ٹھوکریں مارتا آگے بڑھا۔ رانا ایک ایسے کڈھب مقام میں لشکر لے کر اُترا۔ جسے پہاڑوں کے سلسلوں اور گھاٹیوں کے پیچوں نے خوب مضبوط کیا تھا۔ کوملمیر سے رکنا تھ تک (شمال سے جنوب تک) ۸۰ میل طول۔ میرپور سے ستولا تک (مشرق مغرب میں) اسی قدر عرض۔ اس مسافت میں پہاڑ جنگل گھاٹیوں اور ندیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ دارالسلطنت کو شمال جنوب مغرب جدھر سے جاؤ رستہ ایسا تنگ ہے کہ گویا گھاٹی ہی ہے۔ ہر طرف عمودی پہاڑ چلے جاتے ہیں۔ چوڑان اتنی کہ دو گاڑیاں بھی برابر نہیں چل سکتیں۔ گھاٹی میں سے نکلو تو قدرتی دیواریں کھڑی ہیں۔ (انہیں کول کہتے ہیں) بعض جگہ میدان بھی ایسے ایسے آجاتے ہیں۔ کہ بڑا لشکر چھاؤنی ڈال دے۔ چنانچہ ہلدی گھاٹ کا میدان ایسا ہی ہے وہ پہاڑ کی گردن پر واقع ہے۔ اس لئے بیڈھب مقام ہے۔ پہاڑ کے اوپر اور نیچے راجپوتوں کی فوجیں جمی ہوئی تھیں۔ ٹیلوں کے اُوپر اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھیل جو اصلی کیڑے ان پتھروں کے ہیں۔ تیر کمان لئے تاک میں بیٹھے تھے۔ کہ جب موقع آئے بھاری بھاری پتھر حریف پر لڑکائیں۔

درّہ کے دہانہ پر رانا میواڑ کے سورما سپاہیوں کو لئے ڈٹا تھا۔ غرضکہ یہاں ایک گھمسان کا کشت و خون ہؤا۔ کئی راجہ اور ٹھاکر جانوں سے ہاتھ اُٹھا کر آن گرے اور اپنے بہادر رانا کے قدموں پر خون کے نالے بہائے۔ گرم میدان میں رانا قرمزی جھنڈا لئے تیار تھا۔ کہ کسی طرح راجہ مان سنگھ نظر آئے۔ اور اُس سے دو دو ہاتھ ہوں۔ یہ ارمان تو نہ نکلا۔ لیکن جہاں سلیم (جہانگیر) ہاتھی پر کھڑا لشکر کو لڑا رہا تھا وہاں جا پہنچا۔ اور ایسا بے جگر ہو کر گیا۔ کہ سلیم اس کے برچھے کا شکار ہو جاتا۔ اگر ہودہ کے فولادی تختے اس کی جان کی سپر نہ بن جاتے۔ پرتاپ جس گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کا نام چیتک تھا۔ وفادار گھوڑے نے آقا کی بڑی رفاقت کی۔ اس لڑائی کے مرقعے جو تاریخ میواڑ میں شامل ہیں۔ ان میں گھوڑے کا ایک پاؤں سلیم کے ہاتھی پر رکھا ہؤا تھا۔ اور سوار اپنے حریف پر نیزہ مارتا ہے۔ فیلبان کے پاس بچاؤ کا سامان کچھ نہ تھا۔ وہ مارا گیا۔ مست ہاتھی بے مہاوت رُک نہ سکا۔ اور ایسا بھاگا کہ سلیم کی جان بچ گئی۔ یہاں بڑا بھاری

رن پڑا۔ مغل نمک حلال اپنے شہزادہ کے بچانے میں اور میواڑ کے سورما اپنے سیناپتی کی مدد میں ایسے جان توڑ کر لڑے۔ کہ ہلدی گھاٹ کے پتھر شنگرف ہو گئے پرتاپ نے سات زخم کھائے۔ دشمن اُس پر باز اور جرّوں کی طرح گرتے تھے۔ مگر وہ راج کے چتر کو نہ چھوڑتا تھا۔ تین دفعہ دشمنوں کے انبوہ میں سے نکلا۔ اور قریب تھا۔ کہ دب مرے۔ جھالا کا سردار دوڑا اور اس بلا سے رانا کو نکال کر لے گیا۔ راج کا چتر ایک ہاتھ میں اور جھنڈا دوسرے میں لے کر ایک اچھے مقام کی طرف بھاگا۔ اگرچہ خود مع اپنے جان نثاروں کے مارا گیا۔ مگر رانا نِکل آیا۔ جب سے اُس کی اولاد میواڑ کے بادشاہی نشان اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ اور درباروں میں رانا کی داہنی طرف جگہ پاتی ہے۔ راجہ خطاب ہُوا اور ان کا نقارہ دروازہ قلعہ تک بجتا ہے۔ یہ رُتبہ دوسروں کو حاصل نہیں۔ یہ بہادری ایسے دشمنوں کے ساتھ کیا پیش جاتی جن کے ساتھ بے شمار توپیں اور رہکلے آگ برساتے تھے۔ اور اونٹوں کے رسالے آندھی کی طرح دوڑتے تھے۔ فوج پر شکست پڑی بائیس ہزار راجپوت میں سے فقط آٹھ ہزار جیتے بچے۔ اگرچہ فوج پر شکست پڑی۔ مگر اس وقت بچ کر نِکل جانا ہی بڑی فتح تھی۔ رانا پرتاپ اپنے چیتک گھوڑے پر سوار بھاگا اور دو مغلوں نے اس پر گھوڑے ڈالے۔ وہ اس کے پیچھے گھوڑے لگائے آتے تھے کہ رستہ میں ایک ندی آئی۔ (پہاڑ میں سے نکلی تھی) اگر چیتک ذرا جھجکتا۔ تو پھنس ہی گیا تھا۔ وہ بھی گھائل ہو رہا تھا۔ مگر وہ ہرن کی طرح چاروں پُتلیاں جھاڑ کر پانی پر سے اُڑ گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ ان کے نعل پتھروں سے ٹکرا کر تِتنگے اُڑاتے تھے۔ اس نے سمجھا کہ دشمن آن پہنچے۔ اتنے میں کسی نے اس کی بولی میں پیچھے سے پکارا۔ او نیلے گھوڑے کے سوار۔ پرتاپ نے پھر کر دیکھا۔ تو سکت اس کا بھائی ہے۔ یہ کسی گھر کے معاملہ میں بھائی سے خفا ہو کر نِکل گیا تھا۔ اکبر کی نوکری کر لی تھی۔ اور اس لڑائی میں موجود تھا جب دیکھا کہ میرا بھائی۔ میری قوم کا نام روشن کرنے والا۔ میرے باپ دادا کا نام روشن کرنے والا۔ اس حالت کے ساتھ جان لے کر بھاگا ہے۔ اور دو مغل اس کے پیچھے پڑے ہیں تو سب غصہ جاتا رہا۔ خون نے جوش مارا۔ اور اس کے پیچھے ہو لیا۔ موقع پا کر دونوں مغلوں کو فنا کیا۔ اور بھائی سے جا ملا۔ کس مدت کے بچھڑے بھائی کس طرح ملے۔ گھوڑے سے اُتر کر خوب گلے ملے۔ یہاں چیتک بیٹھ گیا۔ سکت نے اُسے گھوڑا دیا

اس کا نام انگار دتھا۔ جب رانا نے اس کا اسباب اُتار کر دُوسرے گھوڑے پر رکھا تو افسوس کہ چیتک کا دم نکل گیا۔ یہاں اُس کی یادگار میں ایک عمارت بنوائی ہے اُودے پور کی آبادی میں آدھے گھر ہونگے جن کی دیواروں پر یہ تصویریں کھینچی ہیں۔ سکٹ نے رانا بھائی سے چلتے ہوئے ہنس کر کہا۔ بھائی جی جب کوئی جان بچا کر بھاگتا ہے۔ تو دل کا کیا حال ہوتا ہے؟ پھر اُس کی خاطر جمع کی۔ کہ جب موقع پاؤنگا۔ پھر آؤں گا +

سکٹ وہاں سے ایک مغل کے گھوڑے پر چڑھا اور سلیم کے لشکر میں آیا۔ لوگوں سے کہا۔ کہ پرتاپ نے اپنے دونوں پیچھا کرنے والوں کو مارا۔ اُن کی حمایت میں میرا گھوڑا بھی مارا گیا۔ ناچار مَیں اُن میں سے ایک کے گھوڑے پر آیا ہوں۔ لشکر میں کسی کو یقین نہ آیا۔ آخر سلیم نے بُلا کر عہد کیا۔ کہ سچ کہہ دوگے تو مَیں معاف کر دُونگا۔ سیدھے سپاہی نے اصل حال کہہ دیا۔ سلیم اپنے عہد پر قائم رہا۔ مگر کہا کہ اب تم اپنے بھائی کے پاس جا کر نذر دو۔ اور وہیں رہو۔ چنانچہ وہ اپنے مُلک میں چلا گیا +

رانا کیکا مُلک **میواڑ** میں راج کرتا تھا۔ اور ہندوستان کے مشہور راجاؤں میں سے تھا۔ جب اکبر نے **چیتوڑ** مار لیا تو رانا نے کوہستان ہندوارہ میں قلعہ کوکنڈہ تعمیر کیا۔ اس میں بیٹھا۔ ملک **کنبھل میر** پر حکومت کرتا تھا۔ مقام مذکور **اروَلی** پہاڑوں میں جانب شمال **اودے پور** سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ہندوستان کے اکثر راجہ اکبر کی اطاعت یا سلامت روی کے سلسلہ میں آ گئے تھے۔ مگر رانا اپنی اکڑ تکڑ پر قائم تھا۔ چنانچہ ۹۸۳ھ میں اکبر معہ لشکر اجمیر گیا۔ جب درگاہ ایک منزل رہی تو پیادہ ہوا۔ زیارت کر کے نذر نیاز چڑھائی۔ ایک دن درگاہ میں مان سنگھ کو بھی ساتھ لے گیا۔ دیر تک دعائیں اور التجائیں کیں۔ وہیں بیٹھے اور امرا بھی حاضر تھے۔ صلاح مشورے ہو کر فوج کشی قرار پائی۔ مان سنگھ کو خطاب فرزندی کے ساتھ سپہ سالاری عنایت ہوئی۔ پانچ ہزار سوار رقمی کہ کچھ خاصہ کے اور کچھ ماتحت امرا تھے۔ مدد کو دئے۔ کئی امیر جنگی تجربہ کار مع اُن کی فوجہائے جرار کے ساتھ روانہ کئے۔ اور ریاست رانا کی طرف متوجہ کیا۔ دریائے لشکر طوفان کی طرح حدود اودے پور میں داخل ہوا۔ کنور نے مانڈل گڑھ پر ٹھہر کر لشکر کا انتظام کیا۔

اور ہلدیو کی گھاٹی سے نکل کر کوکنڈہ پر جا پہنچا کہ وہیں رانا رہتا تھا +

رانا اپنے دار الخلافہ سے نکلا اور سورما راجپوت جو قومی حمایت کے نام پر پہاڑوں میں بیٹھے تھے۔ تلواریں کھینچ کر ساتھ نکلے۔ مان سنگھ ابھی نوجوان کنور تھا۔ مگر اُس نے اکبر کی رکاب میں رہ کر اس شطرنج کے نقشے بہت کھیلے تھے۔ خود چند امرائے کہنہ عمل کے ساتھ قلب میں قائم ہوا۔ کئی پرے باندھ کر قلعۂ لشکر کو سد سکندری بنایا اور عمدہ عمدہ بہادر چُن کر ہر فوج کے لئے کمک تیار رکھی +

مُلّا صاحب بہ نیت جہاد اس لڑائی میں شامل ہوئے تھے۔ اُنھوں نے لفظوں کے آب و رنگ سے میدانِ جنگ کا ایسا نقشہ اُتارا ہے۔ کہ مؤرخوں کے قلم ٹوٹ گئے۔ آزاد اس موقع پر اس کا فوٹوگراف لے کر دربار اکبری میں سجاتا ہے۔ رانا تقریباً تین ہزار سوار کے ساتھ بادل کی طرح پہاڑ سے اُٹھا۔ دو فوج ہو کر آیا۔ ایک فوج نے ہراول شاہی سے ٹکر کھائی۔ پہاڑی زمین تھی۔ گڑھے۔ جھاڑی۔ پہاڑیوں کے اینچ بینچ بہت تھے۔ ہراول اور کمک ہراول غٹ بٹ ہو گئے۔ بھگوڑی لڑائی لڑنی پڑی بادشاہی لشکر کے راجپوت بائیں طرف سے اس طرح بھاگے جیسے بکریاں۔ ہراول کو لانگھ پھلانگ کر دائیں طرف کی فوج میں گھس آئے۔ ہاں سادات بارہ اور بعض غیرت والے بہادروں نے وہ کام کئے۔ کہ شاید ہی رُستم سے ہوں۔ طرفین سے بہت آدمی کام آئے۔ جس فوج میں رانا تھا۔ اُس نے گھاٹی سے نکلتے ہی قاضی خاں بدخشی کو لیا۔ کہ دہانہ روک کر کھڑے ہوئے تھے۔ اُنہیں اُٹھا کر اُلٹتے پُلٹتے قلب میں پھینک دیا۔ سیکری وال شیخ زادے تو اکٹھے ہی بھاگے۔ شیخ ابراہیم شیخ منصور (شیخ ابراہیم خلف سلیم کے داماد) ان کے سردار تھے۔ بھاگنے میں ایک تیر ان کے چُوتڑوں پر بیٹھا۔ مدت تک دُکھ بھرا۔ قاضی خاں باوجود مُلّائی کے بہادری سے لڑے۔ ہاتھ پر ایک تلوار کھائی۔ کہ انگوٹھا کٹ گیا۔ مگر ٹھہرنے کی جگہ نہ تھی۔ قاضی صاحب جواز فرار کی حدیثیں تلاوت کرتے ہوئے ہٹ کر قلب میں آ گئے۔ اَلفِرَارُ مِمَّالَا یُطَاقُ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِیْنَ +

(آزاد۔ علما کے قربان جایئے۔ زبان سے کہتے ہیں کہ جو جہاد سے بھاگے اسکی توبہ کبھی قبول نہیں ہوتی۔ خود بھاگتے ہیں۔ تو پیغمبروں کو بھی بھگا کر آگے رکھ لیتے ہیں)

لے دیکھو صفحہ

اور جو پہلے حملے میں بھاگے تھے اُنھوں نے تو پانچ چھ کوس تک دم ہی نہ لیا۔ ایک دربار بیچ میں تھا۔ اُس سے بھی پار ہو گئے۔ لڑائی تازہ ہو رہی تھی۔ جو ایک سردار گھوڑا اُڑاتا نقارہ بجاتا آیا۔ کہ بندگان بادشاہی یلغار کر کے آن پہنچے۔ لشکر بادشاہی سے شور قیامت کا غُل تھا۔ اور اس منتر نے بڑا اثر کیا۔ بھاگتے ہوئے تھم گئے۔ بھاگے ہوئے پلٹ پڑے۔ اور غنیم کے پاؤں اُکھڑ گئے +

راجہ رامساہ گوالیاری رانا کے آگے آگے بھاگا آتا تھا۔ اُس نے مان سنگھ کے راجپوتوں کی جان پر عجب کار پردازی کی۔ کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ وہ تھے۔ کہ ہراول کے بائیں سے بھاگ کر آئے تھے۔ مگر ایسے بدحواس آئے کہ آصف خاں کو بھی بھگوڑا کر دیا ہوتا۔ دائیں طرف پر سادات بارہ تھے۔ اُن میں پناہ لی۔ اگر سادات بارہ ثابت قدمی سے نہ اڑتے اور ہراول کی طرح نوک دُم بھاگتے۔ تو رسوائی میں کچھ باقی نہ رہا تھا۔ رانا نے ہاتھیوں کو بادشاہی ہاتھیوں سے آن ٹکرایا۔ ان میں دو مست دیوزاد ٹکرم ٹکرا ہو گئے۔ حسین خاں بادشاہی فیلبان مان سنگھ کے آگے بیٹھا تھا وہ گرا۔ مان سنگھ آپ مہاوت کی جگہ جا بیٹھا۔ اور اس استقلال سے ڈٹا۔ کہ اُس سے زیادہ کیا ہوگا۔ الحمدللہ کہ قلب قائم رہا۔ اِدھر سے جو رامساہ بھاگا تھا۔ اُس نے اپنے اور تین بیٹوں کے خون سے داغ بدنامی کو دھو دیا +

فیلبان نے غنیم کی طرف سے رام پرشاد ہاتھی کو بڑھایا۔ یہ بڑا قوی ہیکل اور جنگی ہاتھی تھا۔ بہت سے جوانوں کو پامال کر کے صفوں کو چاک درچاک کر دیا۔ کمال خاں فوجدار شاہی نے اِدھر سے گجراج ہاتھی کو سامنے کیا۔ دیر تک آپس میں ریلتے دھکیلتے رہے۔ بادشاہی ہاتھی دب نکلا تھا۔ اقبال اکبری نے رام پرشاد کے مہاوت کو قضا کی گولی ماری۔ کہ اس دھکم دھکا میں زمین پر آ پڑا۔ بادشاہی فیلبان واہ رے تیری پھرتی۔ کود کر رانا کے ہاتھی پر جا بیٹھا۔ اور وہ کام کیا۔ کہ کسی سے نہ ہو سکے۔ اتنے میں یکہ سوار جو مان سنگھ کی اردلی میں تھے رانا کی فوج پر ٹوٹ پڑے اور اس گھمسان کا رن پڑا۔ کہ مان سنگھ کی سپہ سالاری اس دن معلوم ہو گئی۔ مُلّا شیریں نے سچ کہا ہے۔ ع

کہ ہندو میزند شمشیر اسلام

رانا کے ساتھ مان سنگھ کا مقابلہ ہوا۔ اور اُوپر تلے کئی وار ہوئے۔ آخر رانا نہ

ٹھیر سکا۔ مان سنگھ کے ہاتھ سے زخم کھایا۔ سب کو وہیں چھوڑا اور بھاگا۔ اس کی فوج میں بھی کھلبلی پڑ گئی۔ اور اُس کے سردار بھاگ بھاگ کر اُس کی طرف ہٹنے لگے۔ آخر سب پہاڑوں میں گھس گئے۔ گرمی کا موسم آگ برسا رہا تھا۔ لُو چل رہی تھی۔ زمین آسمان تنور کی طرح بھڑک رہے تھے۔ بھیجے سر میں پانی ہو گئے۔ صبح سے دوپہر تک لڑتے رہے پان سو آدمی کا کھیت پڑا۔ ۱۲۰ مسلمان باقی ہنود۔ زخمی غازی تین سو سے زیادہ۔ لوگوں کا یہ خیال تھا۔ کہ رانا بھاگنے والا نہیں۔ یہیں کسی پہاڑی کے پیچھے چھپ رہا ہے۔ پھر پلٹیگا اس لئے تعاقب نہ کیا۔ خیموں میں پھر آئے۔ اور زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف ہوئے۔

دوسرے دن وہاں سے کُوچ کیا۔ میدان میں ہوتے ہوئے ہر شخص کی کارگذاری کو دیکھتے ہوئے درہ سے گذر کر کوکنڈہ میں آئے۔ رانا نے چند معتبر جاں نثار محلوں پر تعینات کئے۔ کچھ نہ کچھ مندروں میں سے پانڈے نکلے۔ کل بیس آدمی ہوں گے اپنی جانیں دے کر نام کو سرخرو لے گئے۔ ہندوؤں کی قدیمی رسم تھی۔ جب شہر خالی کرتے تھے۔ ننگ و ناموس کے لئے ضرور جانیں دیتے تھے۔ یہ معلوم ہؤا کہ رانا کے شبخون کا بھی خیال تھا۔ کیونکہ شہر کے گرد پتھر چُن کر ہاتھوں ہاتھ الیسی دیوار اور خندق بنائی تھی جس سے سوار گھوڑا نہ اڑا سکیں۔ مان سنگھ نے سرداروں کو جمع کر کے مقتولوں کی فہرستیں مرتب کیں۔ اور جن کے گھوڑے مارے گئے تھے۔ اُن کی تفصیل طلب ہوئی۔ سید محمود خاں بارہ نے کہا۔ کہ ہمارا تو نہ کوئی آدمی ضائع ہؤا۔ نہ گھوڑا مرا۔ خالی اسم نویسی سے کیا حاصل۔ غلّہ کی فکر کرو۔

یہ کوہستان بہت کم زراعت ہے۔ غلّہ ٹھُر گیا۔ اور رسد پہنچتی نہ تھی۔ لشکر میں کہرام مچا ہؤا تھا۔ پھر کمیٹی ہوئی۔ ایسے موقع پر ایسا ہی ہونا ہے۔ ایک ایک امیر کو ایک سردار فرض کر کے قرار پایا۔ کہ باری باری سے غلّہ کی تلاش میں نکلا کرے پہاڑوں پر چڑھ جاتے تھے۔ جہاں جہاں ذخیرہ یا آبادی کی خبر پاتے وہاں جاتے۔ اناج سمیٹتے تھے۔ اور آدمیوں کو باندھ لاتے تھے۔ جانوروں کے گوشت سے گزارہ کرتے تھے آم الیسی بہتات سے تھے کہ حد بیان سے باہر ہے۔ لشکر کے کنگلوں نے کھانے کی جگہ وُہی کھائے۔ اور بیمار ہو کر تمام لشکر میں کثافت پھیلا دی۔ آم بھی ایک ایک

سوا سوا سیر کا ہوتا تھا۔ گٹھلی چھوٹی۔ مگر مزہ چاہو تو کھٹاس مٹھاس کچھ نہیں +
بادشاہ کے بھی دل کو لگی ہوئی تھی۔ ایک سردار کو ڈاک بٹھا کر بھیجا۔ کہ لڑائی کا حال دیکھ کر آئے۔ یہاں فتح ہو گئی تھی۔ وہ آیا۔ حال احوال معلوم کر کے دوسرے دن رخصت ہوا۔ خدمت میں سب قبول ہوئیں۔ باوجود اس کے چغلخوروں نے کہہ دیا کہ فتح کے بعد کوتاہی ہوئی۔ ورنہ رانا گرفتار ہو جاتا۔ بادشاہ کو بھی خیال ہوا۔ مگر تحقیق کے بعد معلوم ہو گیا۔ کہ شیطانی طوفان ہے +

سنہ ۹۸۹ھ میں اُس نے وہ دلاوری دکھائی۔ کہ ہندی لوہے نے ولایتی کے جوہر مٹا دئے۔ ملک بنگال میں اکبری امرا نے بغاوت کی۔ یہ نمک حرام تمام نئے پرانے ترک اور بعض کابلی افغان تھے۔ انہوں نے سمجھا۔ کہ بادشاہ کی مخالفت کے لئے جب تک کوئی بادشاہی ہڈی ہمارے ہاتھ میں نہ ہوگی۔ ہم باغی ہی کہلائینگے۔ اس لئے مرزا حکیم کو عرضیاں لکھیں۔ اور اُس کے اُمرا کو خطوط اور زبانی پیغام بھیجے۔ خلاصہ یہ کہ آپ بھی ہمایوں بادشاہ کے لخت جگر ہیں۔ اور برابر کا حق رکھتے ہیں۔ اگر ہمت شاہانہ کو حرکت دے کر اُدھر سے آئیں۔ تو غلامان قدیم ادھر سے جان نثاری کے واسطے حاضر ہیں۔ اُس کے پاس بھی ہمایوں کے خدمتگذار بلکہ بابری عہد کی کھرچن باقی تھی۔ اول اس کا ہوا خواہ شادمان کوکہ تھا۔ جس کا باپ سلیمان بیگ اندجانی اور داوالقمان بیگ تھا۔ کہ کسی زمانہ میں بابر بادشاہ کا منظور نظر تھا۔ ان خام طمع لوگوں نے خیال مذکور کو اور بھی چمکا کر نوجوان شہزادہ کے سامنے جلوہ دیا۔ اُس نے موقع کو غنیمت سمجھا۔ اور پنجاب کا رُخ کیا۔ ایک سردار کو فوج دے کر آگے روانہ کیا۔ وہ پشاور سے بڑھ کر دریائے اٹک اُتر آیا۔ یوسف خاں (مرزا عزیز کا بڑا بھائی) وہاں کا جاگیر دار تھا۔ اُس بے توفیق نے بے پروائی کے ساتھ ایک سردار کو روانہ کیا۔ وہ ایسا آیا۔ کہ فوج بھی ساتھ نہ لایا۔ اس حالت میں غنیم کو کیا روک سکے۔ اکبری اقبال کا طلسم دیکھو۔ کہ یہ ایک دن اِدھر سے شکار کو نکلا۔ غنیم اِدھر کے جنگل میدان دیکھتا تھا۔ رستہ میں ٹکر ہوئی۔ اور تلوار چلی۔ غنیم زخمی ہو کر بھاگ نکلا۔ اور پشاور آکر مر گیا۔ اکبر نے یوسف خاں کو بُلا لیا۔ اور مان سنگھ کو سپہ سالار مقرر کر کے روانہ کیا +

دیکھئے خاندانی خدمتگذاروں سے جی بیزار نہ ہو تو کیا ہو۔ اور غیروں سے کام نہ لے

تو کیا کرے۔ جب بادشاہ کے بھائی بندوں میں کوئی بغاوت کرتا تھا۔ تو امیر دونوں طرف دیکھتے رہتے تھے۔ ایک گھر کے آدمی کچھ اِدھر ہوتے تھے۔ کچھ اُدھر پیغام سلام برابر جاری رہتے تھے جس کی فتح ہوئی۔ دوسری طرف والے بھی اُدھر جا ملے شرمندہ صورت بنا کر سلام کیا۔ کہ حضور اسی خاندان کے خانہ زاد ہیں۔ ہمایوں۔ بابر بلکہ تمام نسل تیموری میں جو گھر بگڑا۔ اسی طرح بگڑا۔ اکبر کو شاہ طہماسپ کی نصیحت یاد تھی۔ اُس نے جب سلطنت کو سنبھالا۔ تو راجپوتوں کو زور دیا۔ اور خصوصاً ایسے موقع پر اُن سے اور ایرانیوں سے اور سادات بارہ سے کام لیتا تھا۔ کیونکہ وہ بھی بخاریوں یا افغانوں سے میل کھلنے والے نہ تھے۔ ایرانی جاں نثاری اور وفاداری کے ساتھ لیاقت کے پُتلے تھے۔ اور سادات کی تو ذات مالک شمشیر ہے۔ غرض مان سنگھ نے سیالکوٹ اپنی جاگیر میں آ کر مقام کیا۔ اور فوج کا سامان درست کرنے لگا۔ ایک پھُرتیلا سردار فوج دے کر آگے بھیجا کہ قلعہ اٹک کا بندوبست رکھے۔ راجہ بھگوان داس نے لاہور کو مضبوط کیا۔ اُدھر مرزا حکیم نے جب سُنا۔ کہ سردار مُردہ ہؤا۔ تو شادمان اپنے کوکہ کو عمدہ سپاہ کے ساتھ روانہ کیا۔ اُس کی ماں نے مرزا کو جھولا ہلا ہلا کر پالا تھا۔ وہ مرزا کے ساتھ کھیل کر بڑا ہؤا تھا۔ اور حقیقت میں دلاور جوان تھا۔ افغانستان میں اس کی تلوار نے جوہر دکھائے تھے۔ اور سرداری کا نام روشن کیا تھا۔ آیا اور جھٹ قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ مان سنگھ بھی پنڈی میں پہنچ لئے تھے۔ جو یہ خبر پہنچی راجپوتی خون سینے میں اُبل پڑا۔ اور جب تک اٹک سامنے نظر نہ آیا۔ کہیں نہ اٹکا۔ شادمان خواب غفلت میں تھا۔ نقارہ کی آواز سُن کر جاگا۔ اور محاصرہ اُٹھا کر بڑے حوصلے کے ساتھ سامنے ہؤا۔ کنور مان اور شادمان نے جگرداری اور سرداری کے ارمان نکال ڈالے سورج سنگھ مان سنگھ کے بھائی نے ایسے حملہ ہائے مردانہ کئے کہ اُسی کے ہاتھ شادمان خاں زخم کھا کر خاک ہلاکت پر گرا۔

جب مرزا نے سُنا کہ شادمان دُنیا سے ناشاد گیا۔ تو سخت غمناک ہؤا۔ اور خود لشکر لے کر چلا۔ مگر اکبر کے حکم برابر پہنچ رہے تھے۔ کہ نہ گھبرانا اور خبردار مرزا کو نہ روکنا۔ آنے دینا۔ اور جب تک ہم نہ آئیں حملہ نہ کر بیٹھنا۔

نکتہ۔ اکبر جانتا تھا کہ یہ کوتاہ اندیش لڑکا ان بہادروں کے سامنے تھم نہ سکیگا۔

شکست ضرور کھائیگا۔ اور جب بھاگے تو ایسا نہ ہو۔ کہ دل ٹوٹ جائے اور ترکستان چلا جائے۔ عبداللہ خاں اُسے غنیمت سمجھیگا۔ اور اُدھر سے فوج لے کر آیا۔ تو پھر معاملہ کچھ اور ہو جائیگا۔ غرض یہ ہٹتے گئے اور وہ بڑھتا بڑھتا لاہور تک آیا۔ راوی کے کنارے باغ مہدی قاسم خاں میں آن اُترا۔ راجہ بھگوان داس اور کنور مان سنگھ۔ سیّد حامد بارہ اور چند امرائے دربار شہر کے ساتھ دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ اکبر کے پیام پہنچ رہے تھے۔ کہ خبردار حملہ نہ کرنا۔ مطلب یہ تھا۔ کہ مَیں بھی لشکر لے کر جا پہنچوں۔ امرا چاروں طرف پھیل جائیں۔ اور اُسے گھیر کر پکڑ لیں کہ آئندہ کا قصّہ ہی پاک ہو جائے شیر شہر میں بند تڑپتے تھے اور رہ جاتے تھے۔ کہ حکم کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی شہر اور اطراف کا انتظام استحکام کے ساتھ کر لیا تھا۔ اپنے اپنے مورچوں کو سنبھالے بیٹھے تھے۔ اور مرزا کے حملوں کا جواب دنداں شکن دیتے تھے۔ خبر لگی کہ لاہور کے ملّانے بلانا چاہتے ہیں۔ اور قاضی اور مفتی کاغذ کے چوہے دوڑا رہے ہیں۔ چنانچہ اُن کا بڑی روک تھام سے بندوبست کیا۔ اکبر نے یہ خبر دلّی میں سُنی۔ ہمّت کے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور باگ اُٹھائی +

مرزا حکیم کو خیال تھا۔ کہ بادشاہ بنگالہ کی مہم میں مصروف ہے۔ ملک خالی پڑا ہے باغ مذکور میں ۲۰ دن خوشی کی بہاریں منائیں۔ جب سُنا کہ اُدھر نمک حراموں کے کام بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ اور اکبر سرہند میں آن پہنچا۔ تو محاصرہ چھوڑا۔ اور باغ مہدی قاسم خاں سے ایک کوس اوپر چڑھ کر پار ہوا۔ اور جلال پور علاقہ گجرات سے دریائے چناب اُترا۔ بھیرہ کے قریب جہلم اُترا اور مقام مذکور کو لوٹا۔ وہاں سے بھی بھاگا۔ مقام گھیپ کے پاس دریائے سندھ اُتر کر کابل کو بھاگا۔ گھاٹیوں پر گھبراہٹ میں بہت سے آدمی بہ گئے۔ ساتھ ہی سرہند کے مقام سے اکبر کا حکم پہنچا۔ کہ تعاقب نہ کرنا۔ دربار میں مصاحبوں سے بار بار کہتا تھا۔ بھائی کہاں پیدا ہے۔ گھبرا کر بھاگا ہے۔ اٹک دریا اُترنا ہے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ رستہ میں کوئی صدمہ پہنچے۔

کنور مان سنگھ بموجب حکم کے معمولی راہ سے پشاور پر جا پڑے۔ اکبر نے لشکر شاہانہ ترتیب دے کر شاہزادہ مراد کو روانہ کیا۔ کہ کابل تک پہنچے۔ اور مرزا کا پورا پورا بندوبست کر دے۔ بادشاہی امیر اور کہنہ عمل سپہ دار ساتھ گئے۔

مگر اُن میں وہی چلتی تلوار فوج ہراول کا افسر قرار پایا۔ یہ لشکر چلا اور خود بادشاہ اقبال کا لشکر لے اُن کی پشت و پناہ ہوا۔

ہندوستان **آزاد** کا وطن ہے۔ مگر حق سے نہ گذریگا۔ خاک ہند کو انسان کے بے ہمت۔ بے حوصلہ۔ کام چور۔ مفت خور۔ آرام طلب بنانے میں کیمیائی تاثیر ہے۔ امرائے دربار اگرچہ ایرانی۔ تورانی۔ افغان کی ہڈی تھے۔ مگر جب اکبر اٹک کے پاس پہنچا۔ تو امرا کو مدت تک ہندوستان میں رہنے سے وہ ملک ایک نئی دنیا نظر آنے لگا۔ زمین کی حالت نئی۔ چاروں طرف پہاڑ۔ ہر قدم پر جان کا خطرہ۔ انسان نئے۔ جنگل کے جانور نئے۔ لباس نئے۔ بات نئی۔ آواز نئی۔ آگے منزل سے منزل کٹھن۔ انہوں نے یہ بھی سُنا تھا۔ کہ وہاں خونی برف پڑتی ہے۔ تو انگلیاں بلکہ ہاتھ پاؤں تک جھڑ جاتے ہیں۔ لشکر کے لوگ اکثر ہندی بلکہ ہندو تھے۔ جنہیں اٹک پار ہونا بھی روا نہ تھا۔ اِس کے علاوہ کیا ولایتی کیا ہندی اب تو سب کے گھر یہیں تھے۔ کچھ ہندوستان کے مزے یاد آئے۔ کچھ بال بچے۔ سب چاہتے تھے۔ کہ معاملہ کو زبانی باتوں میں لپیٹ کر صلح کریں اور پھر چلیں۔ اکبر کو عرض و معروض سے راہ پر لانا چاہا۔ اور اس کی رائے یہ تھی۔ کہ مرزا حکیم نے کئی دفعہ تنگ کیا ہے۔ اب کی دفعہ بھی اسی طرح پھر چلے۔ تو کل یہی فساد پھر اُٹھیگا۔ یہ بھی سمجھا ہوگا۔ کہ فوج کے دل پر کسی کا ایسا خطر بیٹھنا اچھا نہیں۔ وہ اِس بات کو ضرور ٹٹولتا ہوگا۔ کہ اس مہم سے اِن کا پہلو بچانا خیالات مذکورہ کے سبب سے ہے۔ یا مرزا حکیم کی محبت نے اُن کے دل گداز کئے ہیں۔ شیخ ابوالفضل کو حکم دیا۔ کہ جلسۂ مشورت بٹھاؤ۔ اور ہر شخص کی تقریر تحریر کر کے عرض کرو۔ شیخ نے ہر ایک کا بیان اور اُس کے دلائل کا خلاصہ لکھ کر عرض کیا۔ لیکن بادشاہ کی رائے پر ان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ مان سنگھ جو شہزادہ کو لئے آگے بڑھا تھا۔ اُسے اور آگے بڑھا دیا۔ اور خود لشکر کو لے کر روانہ ہوئے۔ برسات نے اٹک کا پُل باندھنے نہ دیا۔ خود بادشاہ اور تمام لشکر کشتیوں پر اُتر گئے۔ بھاری سامان اٹک کے کنارے چھوڑے۔ اور آپ جریدہ فوج لے کر چلے۔ ساتھ ہی بھائی کے لئے بھی دلجوئی اور فہمائش کے پیغام چلے جاتے تھے۔ بلکہ دیر بھی اِسی غرض سے تھی۔ کہ ایسا نہ ہو۔ لشکر بادشاہی کے دوڑا دوڑ پہنچنے سے صلح و صلاح کا موقع نہ رہے۔ اور نوجوان بھائی کی جان مُفت ہاتھ سے

جائے - چنانچہ دریائے اٹک اُتر کر ایک فرمان مرزا حکیم کے نام پر بھیجا - خلاصہ مضمون یہ تھا کہ وسعت آباد ہندوستان میں سلاطین صاحب تاج و نگین تھے - سب اولیائے دولت کے قبضہ میں آگیا - اور سرداران روزگار نے سر جھکا دئے - تمہارے خاندان کے امرا اُن بادشاہوں کی جگہ بیٹھے حکومت کر رہے ہیں - جب یہ حال ہے - تو اس دولت سے بھائی بے نصیب کیوں ہو - بزرگان سلف نے چھوٹے بھائی کو بمنزلہ فرزند شمار کیا ہے - مگر حق یہ ہے - کہ بیٹا اور بھی پیدا ہو سکتا ہے - بھائی نہیں ہو سکتا - اب تمہاری عقل و دانش کے لئے یہ لائق ہے کہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر ملاقات سے خوش کرو - اور اس سے زیادہ دیدار سے محروم نہ رکھو +

مرزا کی طرف سے کچھ پیام زبانی اور ندامت نامہ عفو تقصیر کے مضمون سے آیا - وہ بے بنیاد اور بے قاعدہ تھا - مگر اکبر نے یہاں سے ایک امیر کو اُن کے ساتھ کیا - اور پیغام بھیجا کہ عفو تقصیر پر منحصر ہے - اس پر کہ جو کچھ ہؤا اس پر ندامت ظاہر کرو - آئندہ کے لئے عہد کو قسم کی زنجیروں سے مضبوط کرو - اور جس ہمشیرہ کو خواجہ حسن سے منسوب کیا ہے - اسے ادھر روانہ کردو - مرزا نے کہا کہ سب صدق دل سے منظور ہے مگر ہمشیرہ کے بھیجنے پر خواجہ حسن راضی نہیں ہوتا - اور وہ اسے بدخشاں لے گیا - مَیں بہرحال اپنے کئے سے پشیمان ہؤا ؎

کردہ ام توبہ واز کردہ پشیمان شدہ ام کافرم بازنہ گوئی کہ مسلماں شدہ ام

مرزا کے عریضہ اور پیام سے امرا کو عفو تقصیر کے چرچے کا زیادہ موقع ملا - یہ بھی معلوم ہؤا - کہ قلیچ خاں اور یوسف خاں کوکہ وغیرہ امرائے جلیل القدر کے پاس سازش کے خط آئے ہیں - ہر چند اُنہوں نے لانے والوں کو قتل تک سزائیں دیں - لیکن اکبر نے پھر بھی مشورت کا جلسہ کیا - اور ابوالفضل سکرٹری ہوئے - اس کمیٹی کے ۲۰ ممبر تھے - سب کی رائے کا خلاصہ یہی تھا - کہ جب مرزا اپنے اعمال سے ندامت ظاہر کرتا ہے - اور عفو تقصیر بادشاہ کے کرم کا آئین ہے - جرم بخشی کریں - ملک بخشی کریں - اور یہیں سے پھر چلیں - شیخ اگرچہ نوجوان نو دس برس کے نوکر تھے - نہ عمر نے داڑھی کو طولانی - نہ اُس کے طول کو سفید کیا تھا - نہ کئی پشت کی خدمتگذاری تھی - مگر مصلحت وقت اُن کا اصول تھا - اس لئے خوب دل کھول کر تقریر کی - اور کہا کہ

بادشاہی لشکر اس قدر سامان سے اتنی دُور تک پہنچا۔ بادشاہ خود سر لشکر ہو کر اُس میں موجود۔ اور چند منزل پر منزل مقصود۔ خالی باتوں پر۔ بے بنیاد تحریر پر۔ گمنام آدمی کی وکالت پر پھر چلنا۔ کیا مقتضائے عقل ہے اور پیچھے پھر کر تو دیکھو۔ پنجاب کا ملک ہے۔ برسات سر پر ہے۔ دریا چڑھ گئے ہیں۔ اس عالم میں یہ خدائی کا سامان ساتھ۔ جنگی اسباب ہمراہ۔ اُلٹا پھرنا آگے بڑھنے سے زیادہ دشوار ہے نقصان اُٹھا کر پھرنا اور فائدہ کو چھوڑنا کسی طرح مناسب نہیں۔ نتیجہ پاس آگیا ہے۔ اسے حاصل کر لو۔ گوشمالی خاطر خواہ کے بعد بخشائش نمایاں کا بھی مضائقہ نہیں امرائے دولت اِس لچھے دار تقریر سے خفا ہو گئے۔ بہت گفتگو ہوئی۔ آخر شیخ نے کہا۔ بہت خوب ہر شخص اپنی رائے حضور میں عرض کر دے۔ کمترین سے جب تک نہ پوچھینگے۔ نہ بولیگا۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے +

بہر حال جلسہ کی روئداد لکھی گئی۔ دوسرے دن شیخ کو تو بخار ہو گیا۔ کاغذ حضور میں پیش ہوا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ شیخ کہاں ہے۔ اور اُس کی رائے کیا ہے۔ ایک شخص نے چرب زبانی سے کہا بیمار ہے۔ مگر رائے ہمارے ساتھ ہے۔ بادشاہ بہت دق ہوئے۔ کہ ہمارے سامنے تو وہ رائے تھی۔ جلسہ میں اُن کے ساتھ ہو گیا شیخ جو دوسرے دن حضور میں گئے۔ تو دیکھتے ہیں۔ بادشاہ کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ مَیں سمجھ گیا۔ کہ دغا بازوں نے پیچ مارا۔ جان سے بیزار ہو گیا۔ آخر تقریر کو تحریک ہوئی اور بات کی تحقیق ہوئی۔ جب دل کو قرار آیا۔ بادشاہ نے خفا ہو کر کہا کہ کابل کی سردی اور سفر کی تکلیف لوگوں کو ڈراتی ہے۔ آرام کو دیکھتے ہیں مصلحت کو نہیں دیکھتے اچھا امرا یہیں رہیں۔ ہم اہل خدمت کے ساتھ جریدہ یلغار کر کے جائینگے۔ یہ کب مجال تھی۔ کہ اکبر بادشاہ جائے۔ اور کوئی رہ جائے۔ کوچ پر کوچ چلنا شروع کیا۔ کیونکہ اب تک جو آہستہ آہستہ آتے تھے۔ اِس میں بڑا لحاظ یہی تھا۔ کہ پیغام سلام میں مرزا راہ پر آجائے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ مایوس ہو کر گھبرائے۔ اور دفعتًہ ترکستان کو نکل جائے۔ نظام الدین بخشی کو بھیجا کہ یلغار کر کے جلال آباد جا کر لشکر شاہزادہ میں بیٹھ کر امرا سے مشورت کر کے کیفیت حال لکھو۔ وہ گئے اور بہت جلد واپس آئے اور یہ پیغام لائے۔ کہ اگرچہ مرزا زبان سے کہتے ہیں۔ کہ ہم بہت ہیں بہت ہیں۔

مگر حالت یہی کہتی ہے۔ کہ فتح حضرت کے قدموں میں ہے *

غرض پشاور میں بوجھ بھار کے اسباب ڈال دیئے۔ سلیم کو راجہ بھگوان داس کی حفاظت میں لشکر کے ساتھ چھوڑا۔ تجمل شاہانہ سے ہاتھ اُٹھایا۔ اور ہلکے ہو کر یلغار کے گھوڑوں کی باگیں لیں۔ بے ہمت کچھ رہ گئے۔ کچھ رستے سے پھر گئے *

اب مرزا حکیم کی کہانی سنو۔ فتنہ انگیز اُسے یہی کہے جاتے تھے۔ کہ اکبر ادھر نہیں آئیگا۔ اور آئیگا تو اِس قدر پیچھا نہ کریگا۔ جب اُس نے دیکھا۔ کہ بے پُل اٹک سے پار ہوئے اور دریائے لشکر کے چڑھاؤ موج در موج چلے آتے ہیں۔ تو شہر کی کنجیاں بزرگان شہر کو دے دیں۔ عیال و اطفال کو بدخشاں روانہ کر دیا۔ آپ دولت و مال کے صندوق اور اسباب ضروری لے کر باہر نکل گیا۔ ایک ارادہ یہ تھا۔ کہ فقیر ہو کر ترکستان کو چلا جائے۔ مصاحب صلاح دیتے تھے۔ کہ بنگش کے رستے سے جا کر ہندوستان میں فساد برپا کرے۔ یا افغانستان کے پہاڑوں میں سر پھوڑتا پھرے اور جیسا اُدھر کا معمول ہے لُوٹ مار کرتا رہے *

اِس شش و پنج میں تھا۔ جو خبریں پہنچیں۔ کہ بادشاہ کے امرائے لشکر میں کوئی اِدھر آنے کو راضی نہیں۔ فتنہ گروں کو دیا سلائی ہاتھ آئی۔ اُنھوں نے پھر آگ سلگائی۔ صورت حال بیان کی۔ اور کہا کہ لشکر شاہی میں ہر قوم کے لوگ ہیں۔ ایرانی تورانی۔ خراسانی۔ افغانی۔ کوئی آپ پر تلوار نہ کھینچیگا۔ جب مقابلہ ہوگا سب آن ملینگے ہندو اور ہند کی تلوار شمشیر ولایتی کے آگے چل نہیں سکتی۔ اور اُن کے دل یہاں کی سردی اور برف کے نام سے تھراتے ہیں۔ صلاح یہی ہے کہ ہمت مردانہ کر کے ایک معرکہ کریں۔ اگر میدان ہاتھ آگیا۔ تو سبحان اللہ۔ کچھ نہ ہوا تو جو رستے موجود ہیں۔ اُنہیں کوئی بند نہیں کر سکتا *

کچھ اِن لوگوں نے اُکسایا۔ کچھ بابری خون میں دھواں اُٹھا۔ نوجوان لڑکے کی رائے بدل گئی۔ اور کہا کہ بے مرے مارے ملک نہ دُونگا۔ سرداروں کو روانہ کیا کہ حشری لشکر سمیٹتے چلے جاؤ۔ اور جہاں موقع ملے لشکر بادشاہی پر ہاتھ مارتے جاؤ۔ افغانستان کے ملک میں اِس طرح سے جمعیت بہم پہنچانا اور پہاڑوں کے پیچھے سے شکار مارتے جانا کچھ بڑی بات نہیں۔ وہ آگے رہے۔ پیچھے مرزا نے بھی ہمت کے

نشان پر پھریرا چڑھایا۔ بادشاہی لشکر کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اُنہوں نے جہاں پایا پہاڑوں کے پیچھے سے نکل نکل کر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ مگر رہزنوں کی طرح۔ البتہ فریدوں خاں نے مان سنگھ کے لشکر کا پیچھا مارا۔ خزانہ بادشاہی کو لُوٹ لے گیا۔ اور سرداروں کو پکڑ لیا۔ ڈاک چوکی کا افسر دَورہ کے طور پر بادشاہ کے لشکر سے مان سنگھ کے لشکر تک آتا جاتا تھا۔ وہ اُس وقت پہنچا تھا۔ کہ بھیر لُٹ رہی تھی۔ انہی قدموں بھاگا+

وقت وہ ہے۔ کہ کنور نوجوان شہزادہ مُراد کو لئے خورد کابل پر (کابل سے سات کوس ادھر) جا پہنچا۔ اور بادشاہ جلال آباد سے بڑھ کر جانب سرخاب پر (مان سنگھ سے پندرہ کوس ادھر) ہیں۔ اور مرزا کی بدحالی اور اپنے لشکر کی خوش اقبالی کی خبریں برابر چلی آتی ہیں۔ کہ دفعتہً خبر بند ہوئی۔ پھر ڈاک چوکی ہرکارے جو برابر خبریں لا رہے تھے۔ حاجی محمد احدی افسر ڈاک نے آکر عرض کی۔ کہ فوج بادشاہی کو شکست ہوئی۔ اور افغانوں نے رستہ بند کر دیا ہے۔ اکبر کو سخت تردد ہُوا۔ اتنے میں ڈاک چوکی کے افسر نے نہایت اضطرار کے ساتھ آکر خبر دی لیکن فقط اس قدر کہ لڑائی ہوئی۔ اور لشکر بادشاہی نے شکست کھائی۔ فوراً جلسہ مشورت بیٹھا۔ اوّل اس نقطہ پر بحث ہوئی۔ کہ خبر کیوں بند ہے اِس میں تقریروں نے طول کھینچا۔ اکبر نے کہا۔ اگر شکست ہوتی تو اتنا لشکر کثیر تھا۔ اور فقط پندرہ کوس کا فاصلہ اب تک سینکڑوں لُوٹے مارے آجاتے۔ ایک آدمی کا آنا اور پھر خبر کا بند ہو جانا چہ معنی دارد۔ یہ خبر غلط ہے۔ دوسرا نقطہ یہ کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ بعض نے یہ کہا کہ اُلٹے قدموں پھرنا چاہئے۔ جو لشکر شاہی پیچھے آتا ہے اُسے ساتھ لے کر پورے سامان سے آئیں اور قرار واقعی تدارک کریں۔ اس پر اعتراض ہُوا۔ کہ اگر بادشاہ نے ایک قدم پیچھے ہٹایا تو لاہور تک ٹھیرنے کو جگہ نہ ملیگی۔ بالکل ہوا بگڑ جائیگی۔ مرزا کا دل ایک سے ہزار ہو جائیگا۔ اپنے لشکر کے جی چھوٹ جائینگے۔ افغانوں کے کتّے بلّیاں شیر ہو کر تمہارے سپاہیوں کو پھاڑ کھائینگے۔ ملک افغانی ہے۔ دیکھو ہماری طاقت کے تین ٹکڑے ہو گئے۔ ایک فوج اٹک کے کنارے پڑی ہے۔ دوسری پشاور میں۔ تیسری خورد کابل میں پہنچ لی۔ تین جگہ لڑائی آپڑی۔ ایک رائے یہ بھی تھی۔ کہ یہیں توقف کرنا چاہئے۔ اور جو لشکر پیچھے آتا ہے اُس کا انتظار کرنا چاہئے۔ اس صلاح میں یہ قباحت نکلی کہ اس وقت توقف بھی ہٹنے سے کم نہیں۔ اگر

بادشاہ چند سرداروں کے ساتھ بیچ میں گھر گئے تو بھی مشکل ہے۔ ابوالفضل وغیرہ مزاج شناس بول اُٹھے کہ توکل بخدا بڑھے چلو۔ اگرچہ رکاب میں جاں نثار کم ہیں۔ مگر وزن میں زیادہ ہیں۔ کیونکہ جنگ آزمودہ جانباز ہیں۔ اور صدق دل سے وفادار ہیں۔ اگر مرزا حکیم نے لشکر کو روکا بھی ہوگا۔ تو دمامۂ دولت کا آوازہ سُنتے ہی کھنڈ کر ہٹ جائیگا۔ یہی رائے درست ٹھیری۔ اور آگے روانہ ہوئے +

خبر کے بند ہونے کا سبب فقط اتنی بات تھی۔ کہ مرزا کا ماموں فریدوں فساد کا فتیلہ لئے پہاڑ کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ اس نے اپنے بازوؤں میں یہ طاقت نہ دیکھی۔ کہ ان شیروں کے ساتھ سینہ بہ سینہ ہو کر لڑے۔ اس لئے فوج کے پیچھے سے آکر چنداول پر گرا۔ بھیر کی بساط کیا۔ بھاگنے لگے۔ جنگی دلاور پلٹ کر آئے۔ کہ افغان لوٹ کے لئے بھاگنے کو فتح سے سوا کامیابی سمجھتے تھے۔ پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ بادشاہ نے کئی لاکھ کا خزانہ بھیجا تھا۔ جو قلیچ خاں کی تفویض میں تھا۔ اور وہ بھی دنبالہ فوج میں تھا۔ اِس بھاگا بھاگ میں حریفوں کا ہاتھ اس پر پڑ گیا۔ خزانے کے اُونٹ بھی گھسیٹ لے گئے۔ اسی عالم میں افسر ڈاک چوکی جا پہنچا تھا۔ بھیر کو بھاگتا دیکھ کر ہٹا اور بادشاہ کو خبر پہنچائی۔ غرض دلاور بادشاہ امرائے رکابی کے ساتھ باگیں اُٹھائے چلا جاتا تھا۔ ہر قدم پر ہمّت گھوڑے کو قمچی اور حوصلہ ایڑ لگاتا تھا۔ سرخاب اور جگدلک کے بیچ میں تھے۔ جو فتح کی خوشخبری پہنچی۔ وہیں گھوڑے سے اُتر کر زمین پر سر رکھ دیا۔ اور دیر تک شکر الٰہی کے مزے لیتا رہا +

اب میدان جنگ کی کیفیّت سُننے کے قابل ہے۔ اگرچہ خزانہ بادشاہی کے لُوٹنے سے مرزا کو غرور بڑھ گیا تھا۔ لیکن دل گھٹا جاتا تھا۔ دن کی لڑائی سے جی چراتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ شبخون مارے۔ مان سنگھ فوج لئے تیار تھا۔ اور خدا سے چاہتا تھا کہ کسی طرح حریف میدان میں آئے۔ اور وہ کم ہمّت بے دل سپاہ پیادہ جمع کئے جاتا تھا۔ سازش اور آمیزش کی غرض سے امرائے لشکر کے نام خطوں کے جُو ہے دوڑاتا تھا کہ بادشاہ ان سے بدگمان ہو۔ سپہ سالار شاہی شہزادہ مراد کو لئے خورد کابل پر پڑا تھا مرزا سامنے پہاڑ پر تھا۔ ایک شب بہت زیادہ شورش معلوم ہوئی۔ رات کو سامنے نہایت کثرت سے آگیں جلتی نظر آئیں۔ سپاہ ہند دیکھ کر حیران رہ گئی۔ شب برات

کی رات تھی ۔ یا دیوالی کا ہنگامہ ۔ اُنھوں نے اپنے بندوبست ایسے پختہ کئے کہ حریف شبخون مارے تو بچتا کر پیچھے ہٹے ۔ روشنی صبح نے جنگ کے پیغام پہنچائے مرزا ایک گھاٹی سے فوج لے کر نکلا ۔ اور لڑائی کا میدان گرم ہوا ۔ نوجوان سپہ سالار ایک پہاڑی پر کھڑا افسوس کر رہا تھا ۔ کہ ہائے میدان نہیں ۔ ہراول نے بڑھ کر ٹکر ماری ۔ بڑا کشت و خون ہوا ۔ مرزا بھی خوب جان توڑ کر لڑا ۔ وہ بھی سمجھا ہوا تھا ۔ کہ اگر ہندوستانی دال خوروں کے سامنے سے بھاگا ۔ تو کالا منہ لے کر کہاں جاؤنگا ۔ اِدھر مان سنگھ کو بھی راجپوت کے نام کی لاج تھی ۔ خوب بڑھ بڑھ کر تلواریں ماریں ۔ اور ایسے جوش دکھائے ۔ کہ آخر دال نے گوشت کو دبا لیا ۔ اور مرزا میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ۔ اس معرکہ میں ہراول کی ہمت نے ایسا کام کیا ۔ کہ اور لشکر کو حوصلہ نکالنے کا ارمان رہ گیا ✦

دوسرے دن صبح کا وقت تھا ۔ کہ فریدوں خاں مرزا کا ماموں پھر فوج لے کر نمودار ہوا ۔ مان سنگھ ہی کی فوج مہرہ پر تھی ۔ تلواریں میان سے نکلیں تو تیر کمانوں سے چلے ۔ بندوقوں نے آگ اُگلی ۔ اور توپیں دل میں ارمان لئے کھڑی تھیں ۔ کہ پہاڑی سرزمین تھی ۔ غرض جا بجا لڑائی پڑ گئی ۔ کابلی بہادر شیر تھے ۔ مگر یہ بھی مُنہ کا نوالہ تو نہ تھے ۔ کہ نگل جاتے ۔ ریل پیل ہو رہی تھی ۔ کہیں یہ چڑھ جاتے تھے ۔ کہیں وہ بڑھ آتے تھے ۔ مان سنگھ ایک پہاڑی پر کھڑا دیکھ رہا تھا ۔ جدھر بڑھنے کا موقع دیکھتا تھا ۔ اُدھر فوج کو آگے بڑھاتا تھا ۔ جدھر جگہ نہیں پاتا تھا ۔ ہٹاتا تھا مشکل یہ تھی کہ زمین کی ناہمواری انتظام جمنے نہ دیتی تھی ۔ دفعتہً غنیم زور دے کر آیا ۔ ہراول کی فوج سینہ سپر ہو کر سامنے ہوئی ۔ مگر لڑائی دست و گریبان تھی ۔ بعض نے جان دے کر نیک نامی حاصل ۔ بعض نے ہٹنا مصلحت سمجھا ۔ سپہ سالار تاڑ گیا کہ میری سپہ کا رنگ بدلا ۔ تڑپ اُٹھا ۔ بھائی کو پہلو سے جدا کیا ۔ سُورما سردار تلواریں لئے راجپوت آس پاس جمع ہوئے تھے ۔ اُنہیں بھی حکم دیا اور موقع دیکھ دیکھ کر فوج فوج کمک بھیجنی شروع کر دی ۔ گجنالیں بھری تیار تھیں ۔ ہاتھیوں کو ریلا ۔ اور توپوں کو مہتاب دکھائی کہ جنگل گونج اُٹھا ۔ اور پہاڑ دھواں دھار ہو گئے ۔ بادشاہی ہاتھی حلقہ خاصہ کے تھے ۔ شیروں کے شکار پر لگے ہوئے تھے ۔ بادلوں کی طرح پہاڑیوں پر اُڑنے لگے ۔ یہ آفت دیکھ کر افغانوں کے بڑھے ہوئے دل پیچھے ہٹے ۔ تھوڑی دیر میں قدم اُکھڑ گئے ۔ نشانچی نے نشان پھینکا

اور سب میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مرزا نے چاہا تھا۔ کہ اگر فوج نے جان عزیز کی ہے
تو میں اپنی جان کو ننگ و نام پر قربان کردوں۔ مگر چند جاں نثاروں نے آکر گھیر لیا۔
مرزا نے جھنجلا کر اُنہیں ہٹایا۔ اور حملہ پر مستعد ہوا۔ محمد علی اسپ باگ پکڑ کر گھوڑے
سے لپٹ گیا۔ اور کہا کہ پہلے مجھے مار لو۔ پھر اختیار ہے۔ خلاصہ یہ کہ مرزا بھی بھاگ گئے۔
سورما راجپوتوں نے بڑا سا کھا گیا اور دلاوروں نے خوب خوب کارنامے دکھائے۔
بھاگتوں کے پیچھے گھوڑے اُٹھائے۔ تلواریں کھینچ لیں۔ اور دُور تک مارتے اور
للکارتے چلے گئے۔ پھر بھی جو تعاقب کا حق تھا۔ اُس کا ارمان نہ نکلا۔ اور خیال یہ بھی
تھا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ مرزا کسی ٹیلے کے پیچھے سے چکر مار کر فوج کا پیچھا مارے بعض
بہادر گھوڑے مارتے ایسے گئے کہ کئی کوس آگے بڑھ کر ایک ٹیلے پر مرزا کو جا لیا۔ اور
اُس نے جان کو بچا لینا فتح عظیم سمجھا۔ سپہ سالار فتح کے دمامے بجاتا کابل میں داخل
ہوا۔ اکبر بھی پیچھے پیچھے چلے آتے تھے۔ اور اُس دن بت خاک پر ڈیرہ تھا کہ مان سنگھ
سرداروں کو ساتھ لئے پہنچے۔ سرخروئی کے ساتھ فتح کی مبارک باد ادا کی۔ بادشاہ نے
کابل میں پہنچ کر ملک پھر مرزا حکیم کو عنایت کیا۔ اور پشاور اور سرحدی ملک کا انتظام
اور اختیارات کنور مان سنگھ کے سپرد کر آئے۔ (اور کنار اٹک پر قلعہ تعمیر کیا۔)
اس قابلیت کی تعریف نہ زبان سے ہو سکتی ہے نہ قلم سے۔ کہ ایک نوجوان ہندو
راجہ نے افغانوں میں بہت اچھی رسائی پیدا کی۔ اور سرحدی افغانوں کا بھی ایسا
بندوبست کیا۔ کہ سرشوری کی گردنیں ڈھیلی ہو گئیں؀

۹۹۳ھ میں حال و استقبال کی مصلحتوں پر نظر کر کے صلاحیں ہوئیں کہ
خاندان کچھواہہ سے ولیعہد سلطنت کا تعلق زیادہ کیا جائے۔ راجہ مان سنگھ
کی بہن سے شادی ٹھیری۔ اس شادی کی دھوم دھام اور آرائشوں کی تفصیل
کہیں لکھی نہیں۔ اور ہوتی بھی تو کتاب ہی بنتی۔ مُلّا صاحب نے مجمل طور پر لکھا ہے
کہ سلیم کی عمر سولہ برس کی تھی۔ بادشاہ معہ اُمرائے دربار آپ بیاہنے چڑھے مجلس عقد
میں قاضی مفتی اور شرفائے اسلام حاضر ہوئے۔ نکاح پڑھا گیا۔ دو کروڑ تنکے کا
مہر باندھا۔ پھیرے بھی ہوئے۔ ہون وغیرہ ہنود کی رسمیں بھی ہوئیں۔ دُلہن کے
گھر سے دُولہا کے گھر تک پالکی پر برابر اشرفیاں نچھاور کرتے لائے۔ لڑکی کے

باپ (راجہ بھگوان داس) نے کئی طویلے گھوڑے ۔ سو ہاتھی ختنی ۔ حبشی ۔ چرکس ۔ ہندی ۔ صدہا لونڈی غلام دیئے ۔ دُلھن کا گہنا کیا کہنا ۔ باسن تک مرصع اور سونے چاندی کے تھے ۔ لباس ہائے رنگا رنگ کے صدہا صندوق بھرے ہوئے فرش ہائے بوقلموں بے حد و شمار جہیز میں دئے ۔ امرا کو بھی ہر ایک کے مناسب حال خلعت اور گھوڑے عراقی ۔ ترکی ۔ تازی ۔ سنہری ۔ رُپہلی زین اور ساز و یراق سے آراستہ تیار کئے ۔ ابوالفضل لکھتے ہیں :۔

دین و دُنیا را مبارک باد کیں فرخندہ عقد	از برائے انتظام دین و دنیا بستہ اند
در نگارستان دولت نور چشم شاہ را	حجلۂ چوں پردہ ہائے دیدہ رنگیں بستہ اند

برادرِ صورت و معنی شیخ ابوالفضل فیضی نے قطعۂ تاریخ کہا ہے

زہے عقد دُر پاش سلطان سلیم	کہ پرتو دہد سالِ امید را
ز پروردن آفتاب ؛ دوِل	قرانے شدہ ماہ و ناہید را

کابل سے خبریں آرہی تھیں ۔ کہ محمد حکیم مرزا کو بادہ خواری برباد کر رہی ہے ۔ سنہ ۹۹۳ھ میں اُس نے کام تمام کر دیا ۔ اکبر نے کنور مان سنگھ کو زیر دیوار لگا رکھا تھا حکم پہنچا کہ فوراً فوج لے کر کابل میں جا بیٹھو ۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا ۔ کہ فریدوں خاں اس کا ماموں اور اکثر مصاحب و ملازم جو مرزا کے پاس تھے وہی اس کے خیالات کو پریشان کیا کرتے تھے ۔ اب وہ کچھ اس خطر سے کہ خدا جانے دربار میں ہمارے ساتھ کیا سلوک ہو ۔ اور بعض اپنے فساد جنگی کے سبب سے اس بات پر آمادہ ہوئے کہ مرزا کے بال بچوں کو ساتھ لے کر ترکستان میں عبداللہ خاں اُزبک کے پاس چلے جاویں ۔ اکبر نے دو خاندانی خدمت گزاروں کو روانہ کیا ۔ فرمان بھیج کر سب کو دلاسے دئے ۔ اور پیچھے پیچھے آپ پنجاب کو روانہ ہوا ۔ اور مان سنگھ کابل کو جس کے اٹک پار ہوتے ہی غول کے غول افغان سلام کو حاضر ہونے لگے ۔ اُس نے کابل پہنچ کر وہ ملک داری کی لیاقت دکھائی ۔ جو کہ اُسے بزرگوں کی صدہا سالہ فرمانروائی سے میراث میں پہنچی تھی ۔ اُس کی رسائی اور لطف و اخلاق نے اہل کابل کے دلوں کو تسخیر کر لیا ۔ اور دو برس پہلے جو مروتیں کی تھیں اُنھوں نے تائید کی ۔ مرزا نے مرنے سے پہلے اپنی معافی تقصیرات کی عرضی حضور میں بھیجی تھی ۔ اور دونوں

بچوں کو اور بخت النسا بہن کو اور اُس کے بیٹے مرزا والی کو روانگی دربار کے ارادہ سے
جلال آباد بھیج دیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے مرزا کا یتیم افراسیاب گیارہ برس کا اور کیقباد
چار برس کا اور اس کا بھائی مرزا والی بھی خورد سال تھا۔ فریدوں خاں وغیرہ فتنہ انگیز
اپنے خیالات فاسد میں گمراہ ہو رہے تھے۔ مان سنگھ سب کو رسائی سے راہ راست
پر لایا اور حکمت عملی کی قید میں سلسل کر لیا۔ جگت سنگھ فرزند کو وہاں چھوڑا اور آپ
سب کو لے کر روانہ ہوا۔ راولپنڈی کے مقام میں اکبر کے پایہ تخت کو بوسہ دیا اور
سب کی ملازمت کروائی۔ بادشاہ بہت دلداری سے پیش آیا۔ پچپن چھپن ہزار
روپے انعام دیئے۔ وظیفے اور جاگیریں مناسب حال عنایت کر کے محبت کی تخم ریزی
کی۔ دربلول اکبر نے یوسف زئی وغیرہ سرحدی علاقہ کنور کو دے دیا۔ اور کابل میں
راجہ بھگوان داس کو بٹھایا۔ وہاں راجہ کو قدیمی بلکہ خاندانی مرض نے دیوانہ کر دیا۔ کنور نے
فوراً جا کر راجہ کی جگہ لی اور راج کرنے لگا۔ کنور نے اس حکومت میں کام یہ کیا کہ کوہستان
یوسف زئی کے آفریدی وغیرہ خیلہائے افغانی جو فساد کی آگ جلا رہے تھے انھیں
ملک سے نکال دیا۔ اکبر اس عرصہ میں اٹک کے کنارے کنارے پھرتا تھا۔ کبھی
شکار کھیلتا تھا۔ کبھی قلعہ اٹک کے کارخانہ میں توپ ریزی کا تماشہ دیکھتا تھا۔
اور اُس میں عمدہ عمدہ ایجاد کرتا تھا۔ یہ کھیل تماشے بھی مصلحت سے خالی نہ گئے۔
یوسف زئی کے سرداروں کا انتظام جم گیا۔ کابل کا بندوبست ہو گیا۔ کوتہ اندیش
افغان سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ ملک کا مالک آپ موجود ہے۔ سب سے
بڑی بات یہ ہوئی۔ کہ عبداللہ خاں اُذبک جو سمجھ رہا تھا۔ کہ کابل کا شکار اب میں نے
مارا۔ وہ ان کامیابیوں اور سرحدی کارروائیوں سے ڈرا۔ کہ مبادا اپنے ملک موروثی
پر آئے۔ اُس نے تحفہ ہائے شاہانہ کے ساتھ ایلچی بھیج کر عہد نامہ کیا۔

۹۹۵ھ میں مان سنگھ کی بہن کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ خسرو نام رکھا۔ آزاد
زمانہ کی سیہ کاری اور فتنہ سازی کو دیکھ کر عقل حیران ہے۔ اسی شہر لاہور میں وہ بچہ ہوا
تھا۔ یہیں چھٹی کی شادیاں اور مبارک بادیاں ہوئی تھیں۔ وہی بچہ جوان ہو کر باپ
سے باغی ہوا۔ اور اسی لاہور میں گرفتار ہو کر آیا۔ تورۂ چنگیزی کے بموجب تلوار گلے میں
لٹکتی ہے۔ سر جھکائے تھر تھر کانپتا ہے۔ اور دربار میں باپ کے سامنے کھڑا ہے۔ آج

نہ وہ ہے نہ وہ۔ سب افسانہ ہوگیا ؎

کھیل ہے پُتلیوں کا بزمِ جہاں کا عالم	رات بھر کا یہ تماشا ہے سحر کچھ بھی نہیں

جب اکبر کی حسن تدبیر اور عقل خداداد کا ذکر آئے۔ تو مان سنگھ کے حسن لیاقت کو بھی نہ بھولنا چاہئے۔ کہ اُس کی نوجوان عمر اور کابل جیسا ملک۔ جہاں سرشور ملانوں اور وحشی مسلمانوں کی خدائی۔ اور مان سنگھ ان پر فرمانروائی کرے۔ وہ برس دن سے زیادہ رہا۔ اور زور شور سے حکومت کرتا رہا۔ فقط راجپوت سردار اور راجپوت فوج اس کے ماتحت نہ تھی۔ بلکہ ہزاروں ترک افغانی ہندوستانی اس کے ساتھ تھے۔ برفانی پہاڑ پر کیا گرمی کیا جاڑے شیر کی طرح دوڑتا پھرتا تھا۔ اور جہاں خرابی پڑتی اُس کی اصلاح کرتا تھا۔

۹۹۵ھ میں راجہ بھگوان داس کو حرم سرا اور محلوں کا انتظام سپرد ہوا۔ اور یہ خدمت انہیں اکثر سپرد رہتی تھی۔ سفر میں حرم سرا کی سواریوں کا انتظام مریم مکانی کی سواری کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ افغانستان سے شکایتیں پہنچیں۔ کہ راجپوت اہل ملک پر زیادتیاں کرتے ہیں۔ اس لئے کنور مان سنگھ کو بہار کا حاکم کر کے بھیج دیا۔ بنگالہ میں افغانوں کی کُھرچن کمینہ سرشور باقی تھی۔ مغلوں کی بغاوت کے زمانہ میں وہ بھی نکمے نہ بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے قتُو جاٹ کو اپنا سردار بنایا اور ملک اڑلیسہ اور دریائے دامودر کے کنارے تمام شہروں پر قبضہ کر لیا۔ کنور مان سنگھ نے وہاں جا کر بندوبست شروع کئے۔ کئی برس پہلے بعض امرائے نمک حرام نے ملک بنگالہ میں علما و مشائخ کے فتوے ہاتھ میں لے کر بادشاہ پر بے دینی کا اشتہار دیا تھا۔ اور تلواریں کھینچ کر جا بجا البغاوت کے نشان کھڑے کر دئے تھے۔ ان کی گردنیں جنگی خونریزیوں سے توڑی گئی تھیں۔ مگر بعض اُن میں سے اب بھی زمینداروں کے سایہ میں سر چھپائے بیٹھے تھے۔ اور جب موقع پاتے تھے۔ فساد کرتے تھے۔ اُن کے رستے بند کئے۔ راجہ پورن مل کندھور یہ عظیم الشان قلعہ بنا کر سمجھتے تھے کہ ہم لنکا کے کوٹ میں بیٹھے ہیں۔ اُنہیں تلوار کے گھاٹ پر اُتار کر سیدھا کیا۔ لوٹ مار میں خزانے اور مال خانے بہت کچھ ہاتھ آئے۔ اپنے بھائی کے لئے اُس کی بیٹی لی۔ صلح کے وقت تحفہ تحائف ہیں۔ رخصت کے وقت جہیز میں سب کچھ پایا۔

سنگرام کو لوہے کی چوٹ سے دبایا۔ **انند چردہ** پر چڑھ گیا۔ اُس سے اطاعت کے ساتھ تحائف گراں بہا لئے۔ نفائس و عجائب کے ساتھ ۵۴ ہاتھی دربار میں بھیجے۔ ۹۹۷ھ میں اکبر کا دل گلگشت کشمیر کی ہوا میں لہلہایا۔ راجہ بھگوان داس کو لاہور کا انتظام سپرد کر کے روانہ ہوئے۔ یہاں راجہ ٹوڈرمل سرگباش ہوئے۔ راجہ بھگوان داس انہیں اوّل منزل پہنچانے گئے۔ آتے ہی پیٹ میں ایسا درد اُٹھا کہ لٹا دیا۔ کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ پانچویں دن دُنیا سے سفر کیا۔ شیخ ابوالفضل اُن کے باب میں رائے لکھتے ہیں۔ راستی اور وقار سے بہرہ پایا تھا۔ بادشاہ کشمیر سے پھر کر کابل کو چلے تھے۔ رستے میں خبر پہنچی۔ بہت افسوس کیا۔ کنور مان سنگھ کو فرمان راجگی کا خطاب۔ خلعت خاصہ اسپ بازین زرّین اور پنجہزاری منصب سے سربلند کیا +

بہار کے بندوبست سے مان سنگھ کی خاطر جمع ہوئی۔ مگر اکبری سپہ سالار سے کب بیٹھا جاتا تھا۔ ۹۹۷ھ میں اُڑلیسہ کی طرف گھوڑے اُٹھائے۔ ملک مذکور سر بنگالہ کے پار واقع ہے۔ اوّل **پرتاب دیو** وہاں کا راجہ تھا۔ نرسنگھ دیو اُس کے ناخلف بیٹے نے باپ کو زہر سے مارا۔ اور جلد مارا گیا۔ سلیمان کرارانی دانش و دین کا پتلا اُس وقت بنگالہ میں فرمانروائی کرتا تھا +

اُس نے ملک مذکور کو مفت مار لیا۔ چند روز کے بعد زمانہ نے اُسکا ورق بھی اُلٹا۔ اوڑلیسہ قتلو خاں وغیرہ افغانوں کے ہاتھ میں رہا۔ اس وقت مان سنگھ نے نشان فتح پر پھریرا چڑھایا۔ برسات دل بادل کے لشکر میں بجلی کی برق چمکا رہی تھی مینہ برس رہے تھے۔ دریا چڑھے تھے۔ اُدھر سے قتلو آیا۔ اور ۲۵ کوس کے فاصلے پر ڈیرے ڈال کر میدان جنگ مانگا۔ مان سنگھ نے بڑے بیٹے کو مقابلے پر بھیجا۔ وہ باپ کا رشید فرزند تھا۔ مگر ابھی نوجوانی کا مصالحہ تیز تھا۔ ایسا گرم گیا۔ کہ انتظام کا سررشتہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اور فتح نے شکست کی صورت بدلی۔ سپہ سالار نے خود آگے بڑھ کر بگڑے کام کو سنبھالا۔ سرداروں کی دلجوئی کی۔ اور پھر فوج کو سمیٹ کر سامنے کیا۔ غیبی مدد یہ ہوئی۔ کہ قتلو خاں مر گیا۔ افغانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ بہت سردار ٹوٹ کر آن ملے۔ جو باقی رہے۔ وہ اِس اقرار پر صلح کے خواہاں ہوئے۔ کہ اکبری خطبہ

پڑھا جائیگا۔ خراج و تحائف سالانہ پیشکش کیا کرینگے۔ جب حکم ہوگا۔ ادائے خدمت کو حاضر ہونگے۔ سپہ سالار نے بھی صلح ہی میں مصلحت دیکھی۔ ۱۵۰ ہاتھی اور تحائف گرانمایہ لیکر ارسال دربار کئے +

جب تک عیسےٰ (قتلو کا وکیل) زندہ رہا۔ عہد و پیمان کا سلسلہ درست رہا۔ چند سال کے بعد نئے نوجوان افغان کی ہمت نے زور کیا۔ اُنھوں نے اوّل جگن ناتھ کا علاقہ مارا۔ پھر بادشاہی ملک پر ہاتھ ڈالنے لگے۔ مان سنگھ خدا سے چاہتا تھا کہ عہد شکنی کے لئے کوئی بہانہ ہاتھ آئے۔ فوراً فوج جرّار لے کر چلا۔ آپ دریا کے رستے بڑھا سرداروں کو چار کھنڈ کی راہ سے بڑھایا۔ اُنھوں نے دشمن کے علاقہ میں ہو کر فتح و فیروزی کے نشان لہرا دیئے۔ افغان ہر چند صلح کی جھنڈیاں ہلاتے رہے۔ مگر اب یہ کب سُنتا تھا۔ لڑائی کا میدان مانگا۔ ناچار اُنھوں نے بھی ہاتھ پاؤں سنبھالے۔ بڈھے اور جوان بڑے بڑے پٹھان جمع ہوئے۔ ہمسایہ کے راجاؤں نے بھی رفاقت کی۔ اور شاہانہ لڑائی آن پڑی۔ بہادروں نے ہمت کے کارنامے دکھائے۔ بڑے رن پڑے۔ ملک مذکور قدرت کا فیل خانہ ہے۔ ہاتھی میدان جنگ میں بینڈھوں کی طرح لڑتے اور دوڑتے پھرتے تھے۔ اور اکبری بہادر انہیں تیر دوز کر کے خاک تودہ بناتے تھے۔ آخر سورما سپہ سالار نے فتح پائی۔ اور ملک کو بڑھاتے بڑھاتے دریائے شور تک پہنچا دیا۔ شہر شہر میں اکبری خطبہ پڑھا گیا۔ جگن ناتھ جی نے بھی اکبر بادشاہ پر دیا کی۔ کہ اپنا مندر ملک سمیت دے دیا۔ مان سنگھ پھانی وغیرہ (مشرقی حصہ سندر بن) میں پھیلتا جاتا تھا۔ مناسب معلوم ہوا۔ کہ ادھر ایک شہر حاکم نشین آباد کیا جائے۔ جہاں سے ہر طرف مدد پہنچ سکے۔ دریائی حملہ سے محفوظ ہو۔ اور غنیمان بدنیت کی چھاتی پر پتھر رہے۔ صلاحوں اور تلاشوں کے بعد **آک محل** کے مقام پر صلاح ٹھہری۔ مبارک ساعت دیکھ کر بنیاد کا پتھر رکھا اور **اکبر نگر** نام رہا۔ (یہی **راج محل** مشہور ہے) اس گل زمین کو شیر شاہ نے اپنی گلگشت اور تفریح کے لئے نامور کیا تھا۔ اب تک بھی کوئی مسافر ادھر جا نکلتا ہے۔ تو بکاؤلی اور بدر منیر کی خیالی داستانیں مٹی تصویروں کی طرح صفحہ خاک پر نظر آتی ہیں۔ اسی مقام پر قلعہ عظیم الشان تعمیر کر کے **سلیم نگر** نام رکھا۔ قلعہ شیر پور۔ مورچہ اکبر نگر بلند عمارتوں۔ سجے ہوئے

گھروں۔ چلتے بازاروں سے چند روز میں طلسمات کا عالم دکھانے لگا۔ اور مان سنگھ کے دمامۂ دولت کی آواز برہم پتر کے کنارے کنارے تمام مشرقی علاقہ بنگال میں گونجنے لگی۔ راجہ کے کارنامے اور اُس کی ہمتوں کے ہنگامے قلم تحریر کو سر اونچا نہیں کرنے دیتے۔ مگر اکبر کی خوبیاں بھی ایسے عالی درجہ پر ہیں۔ جنہیں لکھے بغیر رہا نہیں جاتا۔ ملک اُڑیسہ میں رام چند ایک فرماں روا تھا۔ وہ مان سنگھ کے دربار میں آپ نہ آیا۔ بیٹے کو بھیج دیا۔ راجہ نے کہا۔ کہ بیٹے کا آنا صحیح نہیں۔ راجہ کو خود آنا چاہیئے۔ راجہ قتلو کی مہم میں اِن کی مدد بھی کر چکا تھا۔ مگر جرأت نہ کرتا تھا۔ کہ ملکی معاملے ہیں۔ خدا جانے۔ وہاں جا کر کیا ہو مان سنگھ نے سب خدمتوں کو بالائے طاق رکھا اور بیٹے کو فوج دے کر بھیج دیا۔ اس نوجوان نے جاتے ہی لُوٹ مار کر اُس کے علاقہ کی خاک اُڑا دی۔ کئی قلعے فتح کئے۔ راجہ قلعہ بند اور محاصرہ کا دائرہ تنگ ہوُا۔ بادشاہ کو خبر پہنچی۔ مان سنگھ کے نام فرمان بھیجا۔ کہ اگر راجہ رام چند اس وقت نہیں آیا۔ تو پھر آجائیگا۔ ایسا ہرگز نہ چاہیئے۔ ملک و دولت کی ترقی ان باتوں سے نہیں ہوتی۔ جلد محاصرہ اُٹھا لو۔ کہ آئین حق شناسی کے خلاف ہے۔ مان سنگھ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اور بیٹے کو واپس بُلا لیا۔ ۱۰۰۱ھ میں بنگالہ اور اوڑیسہ کے ملک کو پاک صاف کر کے حسب الطلب حاضر دربار ہوُا۔ نامی راجہ اور سردار اُس ملک کے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اُن کی بھی ملازمت کروائی اور دولت کے ماتھے پر نور کا تلک لگایا۔ بنگالہ کی صفائی کا تمغا موَرخوں نے اس کے نام پر لکھا ہے +

۱۰۰۲ھ کے جشن سالانہ میں اکبر نے خسرو جہانگیر کے بیٹے کو باوجود خرد سالی کے پنجہزاری منصب پر نامزد کر کے اُڑیسہ اُس کی جاگیر میں دیا۔ اور بعض سرداران راجپوت کے حقوق اس میں شامل کئے۔ راجہ مان سنگھ کو اتالیقی کا اعزاز بخشا۔ اور اُس کی سرکار کا انتظام بھی راجہ ہی کے سپرد کیا۔ راجہ کو ملک بنگالہ دے کر اُدھر روانہ کر دیا۔ اور اُسی ملک پر اُس کی تنخواہ مجرا کر دی۔ نوجوان جگت سنگھ اب ایسا ہو گیا تھا۔ کہ بذاتِ خود بادشاہی خدمتوں کا سرانجام کر سکے +

۱۰۰۳ھ میں کوچ بہار کے راجہ نے سورما سپہ سالار کے دربار میں اکبری اطاعت کا سجدہ ادا کیا۔ ملک مذکور کا طول ۲۰۰ کوس۔ عرض چالیس اور سو کے بیچ میں پھیلتا سمٹتا چلا جاتا ہے۔ چار لاکھ سوار دو لاکھ پیادے۔ سات سو ہاتھی۔ ہزار جنگی کشتیاں

جاں نثاری کو حاضر رہتی تھیں۔ اگرچہ اُس کے بیٹے جگت سنگھ کو ۱۰۰۵ھ میں کوہستان پنجاب کا انتظام سپرد ہوا۔ مگر مان سنگھ پر یہ سال نہایت منحوس تھا +

ہمّت سنگھ اُس کے بیٹے نے امتلا سے اسہال اور اسہال سے بدحال ہو کر انتقال کیا۔ ہچکی لگ گئی تھی۔ اسی میں جان نکل گئی۔ شیخ ابوالفضل کہتے ہیں۔ جوانمرد تھا۔ انتظام اور سربراہی کی لیاقت سرشت میں تھی۔ موقعہ وقت پر چوکتا نہ تھا۔ اُس کے مرنے سے تمام کچھواہہ میں کہرام مچ گیا۔ بادشاہ کی دلداری نے زخموں پر مرہم رکھا۔ سب کی تسلّی ہو گئی +

اسی سنہ میں عیسیٰ خاں افغان نے بغاوت کی۔ مان سنگھ نے دُرجن سنگھ اپنے بیٹے کو فوج دے کر بھیجا۔ سرداروں میں ایک نمک حرام غنیم سے ملا ہُوا تھا۔ اور خبر پہنچا رہا تھا۔ دشمن ایک جگہ پر بے خبر آن پڑا سخت لڑائی ہوئی۔ دُرجن سنگھ مارا گیا۔ اور بہت جانیں ضائع ہوئیں۔ تمام مال خانے لٹ گئے۔ پھر عیسےٰ خاں اپنے کئے پر پچھتایا۔ جو کچھ مال لیا تھا۔ ہزار ندامت اور عذر و معذرت کے ساتھ واپس کیا۔ انتہا ہے کہ بہن بھی دے دی۔ ہائے اور تو سب کچھ آگیا۔ دُرجن سنگھ کہاں سے آئے +

۱۰۰۷ھ میں مان سنگھ کا اقبال پھر نحوست کی سیاہ چادر اوڑھ کر نکلا صورت یہ ہوئی کہ اکبر کو جس طرح سمرقند و بخارا کے لینے کی آرزو تھی۔ اسی طرح رانائے میواڑ سے اطاعت لینے کا ارمان تھا۔ چنانچہ عبداللہ خاں اُزبک والی توران کے مرنے سے بڑے بڑے ارادوں کے منصوبے باندھے اور شطرنج پر مُہرے پھیلائے۔ ارادہ یہ تھا کہ ادھر کے منصوبے جیت کر خاطر جمع سے ملک موروثی پر چلئے۔ شہزادہ دانیال۔ عبدالرحیم خان خاناں۔ شیخ ابوالفضل کو دکن پر بھیجا تھا۔ اور پیچھے پیچھے آپ تھا جہانگیر کو مہم رانا پر روانہ کیا۔ مان سنگھ کو پُرانے پُرانے امیروں کے ساتھ سپہ سالار کر کے ہمراہ کیا۔ اور بنگالہ اُس کی جاگیر جگت سنگھ اُس کے ولیعہد کو عنایت کی۔ نوجوان کنور خوشی خوشی روانہ ہوا۔ آگرہ میں جا کر سامان میں مصروف تھا کہ دفعتہً مر گیا۔ قوم کچھواہہ کے گھر گھر میں ماتم پڑ گیا۔ اکبر کو بھی بہت رنج ہوا۔ مہا سنگھ اُس کے بیٹے کو اُس کی جگہ دی۔ اور روانگی کا فرمان روانہ کیا۔ سرشور افغانوں نے اس موقع کو

[1] جگت سنگھ

غنیمت سمجھا۔ طوفان ہو کر اُٹھے۔ جہاں سنگھ جرأت کر کے آگے بڑھا۔ مگر نوجوانی کی دوڑ تھی ٹھوکر کھائی۔ باغیوں نے مقام بھدراک پر لشکر بادشاہی کو شکست دی۔ اور پانی کی طرح پھیل کر بڑا حصہ بنگالہ کا دبا لیا۔ اُدھر سلیم (جہانگیر) اپنے عیش کا بندہ تھا۔ وہ نہ چاہتا تھا۔ کہ اودے پور کے پہاڑوں میں جائے۔ اور پتھروں سے ٹکراتا پھرے۔ اُس کی مراد بر آئی۔ رانا کی مہم ملتوی کر دی اور بنگالہ کی طرف کوچ کیا۔ باپ اُدھر اسیر کا محاصرہ کئے پڑا ہے۔ اور قلعہ والے جان سے تنگ ہیں۔ خان خاناں احمد نگر فتح کیا چاہتا ہے۔ تمام دکن میں اقبال اکبری نے زلزلہ ڈال دیا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ تحائف و پیشکش کے ساتھ بیٹی کو روانہ کرتا ہے۔ کہ دانیال محلوں میں شادی رچے۔ مورکھ شہزادے نے باپ کی ایک مصلحت کا خیال نہ کیا۔ مان سنگھ کو بنگالہ روانہ کر دیا۔ آپ آگرہ پہنچا۔ قلعہ میں جا کر دادی کو سلام بھی نہ کیا۔ اُس نے چاہا کہ خود جا کر ملے تو اُوپر سے اُدھر کشتی میں بیٹھ الہ آباد کو روانہ ہو گیا۔ اور وہاں جا کر عیش کی بہاریں لوٹنے لگا۔ اکبر کو یہ بات پسند نہ آئی۔ بلکہ خیال ہوا کہ رانا کی طرف سے ہٹنا اور بنگالہ کی طرف جانا مان سنگھ کی ترغیب سے ہوا ہے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شہزادہ کی طرف سے بغاوت کے آثار نظر آئے۔ اور امرائے نمک حلال کی عرضیاں آنی شروع ہوئیں۔ یہ وہم اگر اور امرا کی طرف ہوتا تو کچھ بات نہ تھی۔ کیونکہ جب بادشاہ بڈھا ہوتا ہے تو اہل دربار کی اُمیدیں ہمیشہ ولیعہد کی طرف سجدہ کرتی ہیں۔ لیکن مان سنگھ کا تعلق خاص جو شہزادہ کے ساتھ تھا۔ اُس نے ان وہموں کی بدنما تصویریں دکھائیں۔ اور (جھوٹ یا سچ) راجہ کے نام پر جو حرف آیا۔ اس کا اُسے بہت رنج ہوا +

خیر یہ تو گھر کی باتیں ہیں۔ راجہ بغاوت بنگالہ کی خبر سُنتے ہی شیر کی طرح جھپٹا۔ جب وہاں پہنچا۔ تو پُرنیہ۔ کھگڑوال۔ بکرم پور وغیرہ مقامات مختلفہ میں غنیموں نے خودسری کے نشان کھڑے کر رکھے تھے۔ اُس نے جا بجا فوجیں روانہ کیں۔ اور جہاں ضرورت دیکھی۔ وہاں خود یلغار کر کے پہنچا۔ اکبری اقبال کی برکت اور راجہ مان سنگھ کی ہمت اور نیک نیت نے ایک عرصہ کے بعد بغاوت کی آگ بجھائی۔ اور ڈھاکہ میں آکر خاطر جمع سے حکمرانی کرنے لگا +

بادشاہوں کے دل کا حال تو کسے معلوم ہے۔ ظاہر یہی معلوم ہوا۔ کہ اکبر اُس کی

طرف سے صاف ہو گیا۔ اس بغاوت کے محرکوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باغیان بنگالہ کے ساتھ فرنگ کے سپاہی بھی شامل تھے۔ اور اُن کی رفاقت میں جانیں دیتے تھے۔ غالباً ڈچ یا پرتگال کے لوگ تھے +

۱۰۱۰ھ میں ہندوستان کی صفائی اور توران کے بادشاہوں کی کشاکشی نے اکبر کے شوق کو پھر توران پر متوجہ کیا۔ سپہ سالار خان خاناں وغیرہ سرداروں کو مشورہ کیواسطے بلایا۔ مان سنگھ کو بھی فرمان طلب گیا۔ اور لکھا گیا۔ کہ بعض مہمات ضروری ہیں مشورہ در پیش ہے۔ چونکہ وہ فدوی خاص بندہائے قدیم سے ہے۔ اور آق سقال[1] با اخلاص اِس دولت کا ہے۔ مناسب ہے۔ کہ وہ بھی متوجہ درگاہ ہو۔ اسی سنہ میں اُسے پرگنہ جوند مرحمت ہؤا۔ اور حکم ہؤا کہ قلعہ رہتاس کی مرمت کرے۔ بھاؤ سنگھ اس کے بیٹے کو ہزاری ذات پانسو سوار کا منصب عنایت ہؤا +

۱۰۱۳ھ میں خسرو اُس کے بھانجے کو دہ ہزاری منصب ملا (جہانگیر کا بڑا بیٹا تھا) مان سنگھ اتالیق ہو کر ہفت ہزاری چھ ہزار سوار کے منصب پر سربلند ہوئے۔ اور بھاؤ سنگھ پونا ہزاری منصب اور تین سو سوار پر معزز ہؤا۔ اب تک کوئی امیر پنج ہزاری منصب سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ یہ اعزاز اوّل اس نیک نیت راجہ کی وفاداری اور جاں نثاری نے لیا۔ اور اکبر کی قدردانی نے اُسے دیا +

جب تک اکبر رہا۔ مان سنگھ کا ستارہ سعد اکبر (مشتری یعنی برہسپت) رہا۔ جب وہ مرض الموت کے بستر پر لیٹا۔ اُسی وقت سے اُس کا ستارہ بھی ڈھلنا شروع ہؤا۔ اوّل خسرو کے خیال سے خود اکبر کو واجب تھا کہ اُسے آگرہ سے سرکا دے (دیکھو اکبر کا حال) چنانچہ حکم ہؤا۔ کہ اپنی جاگیر پر جاؤ۔ مطیع الفرمان نے کل آرزوؤں کو اپنے پیارے آقا کی خوشی کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ باوجودیکہ بیس ہزار لشکر جرار اُس کی ذات کا نوکر تھا۔ اور تمام قوم کچھواہہ کا سرگروہ تھا۔ وہ بگڑ بیٹھتا تو تمام قوم تلوار پکڑ کر کھڑی ہو جاتی۔ مگر فوراً بنگالہ کو روانہ ہؤا۔ اور خسرو کو ساتھ لیا۔

[1] آق سقال۔ ترکی میں ریش سفید کو کہتے ہیں اور مراد اس سے مرد بزرگ و محترم ہے۔ اب ترکستان کے عرف عام میں چودھری یا میر محلہ آق سقال کہلاتا ہے۔ چنانچہ گاؤں یا شہر کے محلّہ میں ایک ایک آق سقال ہوتا ہے پیشہ والوں کے ہر فرقہ کا آق سقال بھی الگ ہوتا ہے +

جب نیا بادشاہ تخت پر بیٹھا۔ پرانے امراسب حاضر دربار ہوئے۔ نوجوان بادشاہ مست الست تھا۔ مگر یہ بات اُس کی بھی قابل تعریف ہے۔ کہ پہلی باتوں کو بالکل بھول گیا۔ خود لکھتا ہے کہ اُس نے بعض باتیں ایسی کی تھیں کہ اپنے حق میں اس عنایت کی اُمید نہ رکھتا تھا۔ پھر بھی خلعت چارقب شمشیر مرصّع۔ اسپ خاصہ بازین زرّین دے کر اکرام و اعزاز بڑھایا۔ اور بنگالہ کا صوبہ دوبارہ اپنی طرف سے مرحمت کیا۔ مگر طالع کی گردش کو کون سیدھا کر سکے۔ چند مہینے گذرے تھے کہ خسرو باغی ہو گیا۔ آفرین ہے جہانگیر کے حوصلہ کو کہ مان سنگھ کے کاروبار میں کوئی تغیّر کا اثر ظاہر نہ کیا۔ مان سنگھ کو بھی آفرین کہنی چاہیئے۔ کیونکہ بھانجے کا بھلا تو ضرور چاہتا ہوگا مگر اس موقع پر کوئی ایسی بات بھی نہیں کی جس سے بیوفائی کا الزام لگا سکیں ؂

مست الست بادشاہ جلوس کے ایک برس آٹھ مہینے کے بعد خود لکھتا ہے مگر درد آلود عبارت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دردناک دل سے نکلتی ہے۔ راجہ مان سنگھ نے قلعہ رہتاس سے آکر ملازمت کی کہ ملک پٹنہ میں واقع ہے۔ چھ سات فرمان گئے جب آیا ہے۔ وہ بھی خان اعظم کی طرح منافقوں اور اس سلطنت کے [1] (پرانے پاپیوں میں سے) ہے۔ جو انہوں نے مجھ سے کیا۔ اور مجھ سے اُن کے ساتھ ہوا۔ خدائے راز داں جانتا ہے کہ کوئی کسی سے اس طرح نہیں گذارہ کرسکتا۔ راجہ نے سو ہاتھی نر و مادہ پیش کش گذرانے۔ ایک میں بھی اتنی بات نہ تھی۔ کہ فیلان خاصہ میں داخل ہو سکے۔ یہ میرے باپ کے بنائے ہوئے نوجوانوں میں سے ہے۔ اس کی خطائیں اُس کے منہ پر نہ لایا۔ اور عنایت بادشاہانہ سے سرفراز کیا۔ پونے دو مہینے کے بعد پھر لکھتا ہے۔ ایک گھوڑا میرے سارے گھوڑوں کا سردار تھا۔ عنایت کی نظر سے راجہ مان سنگھ کو مرحمت کیا۔ کئی اور گھوڑوں اور تحائف لائق کے ساتھ **شاہ عباس** نے **منوچہر خاں** کی ایلچی گری میں حضرت عرش آشیانی (اکبر) کو بھیجا تھا۔ **منوچہر شاہ** کا غلام معتبر ہے جب یہ گھوڑا میں نے عنایت کیا۔ تو مان سنگھ مارے خوشی کے اس طرح لوٹا جاتا تھا کہ اگر میں کوئی سلطنت اسے دے دیتا۔ تو معلوم نہیں کہ اتنا خوش ہوتا یہ گھوڑا جب آیا تھا۔ تو تین چار برس کا تھا۔ ہندوستان میں آکر بڑا ہوا۔ اور یہیں ساری

[1] او ہم شل خان اعظم از کہنہ گرگاں ایں دولت است ؂

خوبیاں نکالیں۔ تمام بندہائے درگاہ مغل اور راجپوت نے بالاتفاق عرض کی کہ ایسا گھوڑا کبھی ایران سے ہندوستان میں نہیں آیا۔ جب والد بزرگوار نے خاندیس اور صوبہ دکن بھائی دانیال کو مرحمت کیا۔ اور آگرہ کو پھرنے لگے۔ تو محبت کی نظر سے اسے کہا کہ جو چیز تجھے بہت پسند ہو مجھ سے مانگ۔ اُس نے موقع پاکر یہ گھوڑا مانگا۔ اس سبب سے اسے دیا تھا۔ آزاد۔ بھلا بیس برس کے بڈھے گھوڑے پر خوش کیا ہونا تھا۔ یہ کہو کہ وقت کو دیکھتے تھے۔ آدمی کو پہچانتے تھے۔ اور تھے مسخرے۔ کیا یہ کیا خانخاناں مست کو دیوانہ بناتے تھے۔ بڈھے ہوئے تو ہو جائیں۔ طبیعت کی شوخی تو نہیں جا سکتی۔ اکبر کے عہد میں دانش و داد۔ ہمت و حوصلہ۔ جرأت و جاں نثاری کا زمانہ تھا۔ اسے اُن باتوں سے خوش کرتے تھے۔ اور اُسے دیکھا کہ اس ڈھب کا نہیں اسے اس ڈھب سے تسخیر کر لیا +

خانجہان وغیرہ امرائے بادشاہی دکن میں کارنامے دکھا رہے تھے۔ ہمت اور لیاقت کو میدان میں جولانی کرنے کا ضرور شوق ہؤا ہوگا۔ اور جاں نثاری کی عادت نے اس مصلحت کو جوش دیا ہوگا۔ لیکن خسرو کے سبب سے اس کا معاملہ ذرا نازک تھا۔ اس لئے وطن گیا۔ اپنے پرانے اہلکاروں سے صلاح کرکے جہانگیر سے عرض کی اور لشکر لے کر دکن پہنچا۔ دو برس تک وہاں رہا۔ اور ۱۰۲۳ھ میں وہیں سے ملک بقا کو کوچ کر گیا بیٹوں میں سے ایک بھاؤ سنگھ جیتا تھا۔ جہانگیر نے اس موقع پر خود لکھا ہے۔ والد بزرگوار کے عہدہائے دولت میں سے مَیں نے اکثر بندہائے درگاہ کو درجہ بدرجہ خدمت دکن پر بھیجا تھا۔ وہ بھی ان دنوں میں اس خدمت پر تھا۔ مر گیا۔ تو مرزا بھاؤ سنگھ اُس کا خلف رشید تھا۔ مَیں نے بُلا بھیجا۔ شاہزادگی میں میری خدمت زیادہ سے بھی زیادہ کرتا تھا۔ ہندوؤں کی ریت کے بموجب مہاں سنگھ پسر جگت سنگھ کو ریاست پہنچتی تھی۔ کہ سب بھائیوں میں بڑا تھا۔ اور وہ راجہ کے جیتے جی مر گیا۔ مَیں نے اس بات کی رعایت نہ کی۔ بھاؤ سنگھ کو مرزا راجا کا خطاب دے کر چار ہزاری ذات تین سو سوار کے منصب سے ممتاز کیا۔ آنبیر کا علاقہ مرحمت کیا۔ کہ اُس کے باپ دادا کا وطن ہے۔ اور اس نظر سے کہ مہاں سنگھ بھی راضی رہے۔ اس کی دلداری کے لئے پہلے منصب پر پانصدی بڑھا کر گڈھ کا ملک اُسے انعام دیا +

اُس کے حالات کو پڑھ کر بے خبر لوگ جھٹ بول اُٹھینگے۔ کہ اُس نے جہانگیر کے عہد میں کچھ ترقّی نہ کی۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اُس کا معاملہ پیچیدہ تھا۔ بلکہ اُس کی عقل سلیم اور سلامت روی کی چال ہزار تعریف کے قابل ہے۔ کہ مہمات کے ہنگامے ہو رہے تھے۔ کسی آفت کی جھپٹ میں نہ آگیا۔ اور اپنی باعزّت حالت کا عزّت کے ساتھ خاتمہ کر گیا۔ خانخاناں اور مرزا عزیز کوکہ ابتدا سے میدان ترقّی میں اُس کے ساتھ گھوڑے دوڑاتے تھے۔ اُن کے حالات کو اس سے مقابلہ کرکے دیکھو۔ جہانگیری عہد میں اُنہوں نے کیسے سخت صدمے اُٹھائے۔ اسی کی با اصول رفتار تھی۔ جس نے اُسے امن و عافیت کے رستہ سے منزل آخر تک صحیح سلامت پہنچا دیا۔ جو اعزاز و اکرام کی دستار اکبر نے اپنے ہاتھ سے اُس کے سر پر باندھی تھی۔ اُس کو دونوں ہاتھ سے پکڑے امن و امان سے نکل گیا *

اُس نے مُلک گیری اور ملک داری کے تمام اوصاف سے پورا پورا حصّہ پایا تھا جدھر لشکر لے کر گیا۔ کامیاب ہؤا۔ کابل میں آج تک بچّہ بچّہ اُس کا نام جانتا ہے۔ اور اس کی بابت کہاوتیں زبانوں پر ہیں۔ مشرق میں اکبری حکومت کا نقارہ دریائے شور کے کنلے تک جا بجایا۔ اور بنگالہ میں اپنی نیکی سے ایسے گلزار لگائے ہیں۔ جو آج تک سرسبز ہیں۔ اُس کی عالی ہمتی اور دریادلی کے چشمے زبانوں پر جاری ہیں اور زمانوں تک رہینگے اُس کے بھاٹ کی سرکار میں سو ہاتھی فیلخانے میں جھومتے تھے۔ بیس ہزار لشکر جرّار اُس کی ذات کا نوکر تھا۔ جن میں معتبر سردار ٹھاکر اور امرائے عالیشان کی سواریاں امیرانہ جلوس سے نکلتی تھیں۔ تمام سپاہی بیش قرار تنخواہوں اور سامانوں سے آسودہ تھے ہر فن کے صاحب کمال اُس کے شاہانہ دربار میں حاضر رہتے تھے۔ اور عزّت اور خوشحالی کے عالم میں رہتے تھے *

باوجود اس کے خوش اخلاق۔ ملنسار۔ شگفتہ مزاج تھا۔ اور جلسہ میں تقریر کو انکسار و تواضع سے رنگ دیتا تھا۔ جب وہ مُہم دکن پر گیا۔ تو خانجہان لودھی سپہ سالار تھا۔ پندرہ پنج ہزاری صاحب علم و نقارہ موجود تھے۔ جن میں خانخاناں۔ خود راجہ مان سنگھ آصف خاں۔ شریف خاں امیر الامرا وغیرہ شامل تھے۔ اور چار ہزاری سے پانصدی تک ایک ہزار منصبدار فوجیں لئے کمر بستہ موجود۔ بالا گھاٹ کے مقام پر لشکر شاہی کو سخت

تکلیف پیش آئی - ملک میں قحط پڑ گیا - اور رستوں کی خرابی سے رسد بند ہونے لگی۔ امرا روز جمع ہو کر جلسۂ مشورت جماتے تھے - کوئی نقشہ نہ جمتا تھا - ایک دن مان سنگھ نے سر دیوان اُٹھ کر کہا کہ اگر میں مسلمان ہوتا - تو ایک وقت تم صاحبوں کے ساتھ کھانا کھایا کرتا - اب کے ڈاڑھی سفید ہو گئی ہے - کچھ کہنا مناسب نہیں - ایک پان ہے - آپ صاحب قبول فرمائیں - سب سے پہلے خانخاناں نے دلداری کا ہاتھ سینہ پر رکھا - اور مان کا پان سمجھ کر سب نے قبول کیا - چنانچہ پنج ہزاری سے لے کر صدی کے منصبدار تک حسب حیثیت نقد اور جنس - لوازم ضیافت برابر ہر شخص کی سرکار میں پہنچ جاتا تھا - ہر تھیلے اور خریطہ پر اُس کا نام لکھا ہوتا تھا - تین چار مہینے تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا - ایک دن ناغہ نہیں ہوا - بنجاروں نے رسد کا تانتا لگا دیا - بازار لشکر میں ہر شے کے انبار پڑے تھے - اور جو آنبیر میں نرخ تھا - وہی یہاں نرخ تھا - ایک وقت کا کھانا بھی سب کو ملتا تھا - کنور اس کی رانی بڑی عقلمند اور منتظم بی بی تھی - گھر میں بیٹھی تھی - اور سب کاروبار کے انتظام برابر کرتی تھی - یہاں تک کہ کوچ و مقام کے موقع پر مسلمانوں کو حمام و مسجد کی وضع کے خیمے بھی تیار ملتے تھے *

خوش اخلاق راجہ ہمیشہ شگفتہ مزاج اور خوش رہتا تھا - **لطیفہ** - دربار میں کوئی سید صاحب ایک برہمن سے اُلجھ پڑے - اور آخر میں کہا - کہ جو راجہ صاحب کہہ دیں - وہ صحیح - راجہ نے کہا کہ مجھے علم نہیں - جو ایسے معاملے میں گفتگو کر سکوں - مگر ایک بات دیکھتا ہوں - کہ ہندوؤں میں کیسا ہی گنوان پنڈت یا گیانی دھیانی فقیر - جب مر گیا - تو جل گیا - خاک اُڑ گئی - رات کو وہاں جاؤ تو آسیب کا خطر ہے - اسلام میں جس شہر بلکہ گاؤں میں گذرو - کئی بزرگ پڑے سوتے ہیں - چراغ جلتے ہیں - پھول مہک رہے ہیں - چڑھاوے چڑھتے ہیں - لوگ اُن کی ذات سے فیض پاتے ہیں *

لطیفہ - ایک دن یہ اور خان خاناں شطرنج یا چوپڑ کھیل رہے تھے - شرط یہ ہوئی کہ جو ہارے وہ جیتنے والے کی فرمائش کے بموجب ایک جانور کی بولی بولے - خان خاناں کی بازی دبنی شروع ہوئی - مان سنگھ نے ہنسنا شروع کیا - اور کہا کہ بلّی کی بولی بلواؤنگا - خان خاناں ہمت کئے گئے - آخر چار پانچ چالوں کے بعد مایوس ہو گئے - مگر بڑے چالتے تھے - گھبرا کر اُٹھنا چاہا - اور کہا - اے ہا - از خاطرم رفتہ بود - خوب شد کہ حالا ہم بیاد آمد -

مان سنگھ نے کہا۔ کجا کجا۔ اُنھوں نے کہا۔ جہانبانی چیزے فرمودہ بودند۔ حالا یادم آمدہ بروم کہ زود تر سرانجامش کنم اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ راجہ نے کہا۔ نمے شود۔ خانخاناں نے کہا۔ حالا مے آیم۔ راجہ نے دامن پکڑ لیا۔ اور کہا خوب است۔ صدائے پشک بکنید و بروید۔ اُنھوں نے کہا۔ شما دامنم بگزارید۔ مے آیم۔ مے آیم۔ مے آیم۔ وہ بھی ہنس پڑے یہ بھی ہنس پڑے۔ واہ کیا بات ہے۔ اپنی بات کہی اور حریف کی بات پوری کر دی +

لطیفہ۔ وہ ہمیشہ فقراء اور خاکساروں کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اور اس میں ہندو مسلمان کا امتیاز نہ کرتا تھا۔ بنگالہ کے سفر میں ایک مقام پر **شاہ دولت** کے اوصاف و کمالات سُنے۔ خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ بھی اس کی پاکیزہ اور سنجیدہ گفتگو سے بہت خوش ہوئے۔ اور کہا۔ مان سنگھ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔ اُس نے مسکرا کر کہا خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ خدا کی مہر ہے۔ بندہ کیونکر اُٹھائے۔ کہ گستاخی ہے +

مان سنگھ کے حال میں یہ افسوس حقیقت میں نہیں بھولتا۔ کہ اُس کی سپہسالاری اور ملک گیری کی لیاقت جہانگیر کے عہد میں مرجھا کر رہ گئی۔ شرابی کبابی بادشاہ نے کچھ پرواہ نہ کی۔ بلکہ اس کی طرف سے کھٹکتا رہا۔ قدردان وہی مرنے والا تھا۔ جس نے اُس کے جوہر قابل کو لڑکپن سے پال کر اعلیٰ درجۂ کمال پر پہنچایا تھا۔ وہ جیتا تو خدا جانے اس کی تلوار سے ملک موروثی کے پہاڑوں کو ٹکراتا۔ یا دریائے شور میں فرنگ کے زور کو توڑتا۔ اکبر خان خاناں کو مرزا خان، اور خان اعظم کو مرزا عزیز اور اسے مرزا راجا کہتا تھا۔ گھر کی ریت رسوم اور کل کاروبار میں اُس کے ساتھ بیٹوں کی طرح برتاؤ ہوتا تھا۔ خصوصاً حرم سرا کے کاروبار اور سفر کے موقع پر کل اہتمام راجہ بھگوان داس کے سپرد۔ مریم مکانی تک کی سواری ہوتی۔ تو راجہ موصوف ساتھ ہوتے تھے۔ اس سے زیادہ اور کیا اعتبار ہو سکتا ہے عجب پاک زمانہ تھا۔ اور عجب پاک دل تھے۔ دیکھو نتیجے بھی کیسے پاکیزہ نکلتے تھے +

مان سنگھ کی تاریخ زندگی میں اس بیان پر پھول برسانے چاہئیں۔ کہ اُس نے اور اُس کے کل خاندان نے اپنی ساری باتوں کو اکبر کی خوشی پر قربان کر دیا۔ مگر مذہب کے معاملے میں بات کو ہاتھ سے نہ دیا۔ جن دنوں میں دین الٰہی اکبر شاہی کا زیادہ زور ہوا۔ اور ابوالفضل اُس کے خلیفہ ہوئے۔ بیربل برہمن کہلاتے تھے۔ اُنھوں نے سلسلہ مریدی میں چوتھا نمبر حاصل کیا۔ لیکن مان سنگھ سنجیدگی اور عقل کے نقطہ سے بال بھر نہیں ہٹا چنانچہ ایک شب

بعض مہمات سلطنت کے باب میں جلسۂ مشورت تھا۔ ان کو حاجی پور پٹنہ جاگیر عنایت ہوا۔ بعد اس کے خلوت خاص تھی۔ خان خاناں بھی موجود تھے۔ اکبر مان سنگھ کو ٹٹولنے لگے۔ کہ دیکھوں یہ بھی مریدوں میں آتا ہے یا نہیں۔ تقریر کا سلسلہ اس طرح چھیڑا۔ کہ جب تک دو چار باتیں نہیں ہوتیں۔ تب تک اخلاص کامل نہیں ہوتا۔ سپاہی راجپوت نے صاف اور بے تکلف جواب دیا۔ کہ حضور اگر مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں۔ امتحان کی حاجت نہیں۔ اگر کچھ اور ہے۔ اور حضور کی مراد مذہب سے ہے۔ تو ہندو ہوں۔ فرمائیے مسلمان ہو جاؤں۔ اور رستہ جانتا نہیں۔ کونسا ہے کہ اختیار کروں۔ اکبر بھی ٹال گئے۔ آزاد حق یہی ہے۔ کہ جو شخص مذہب میں پورا ہوگا۔ وہی وفا و اخلاص میں پورا ہوگا۔ اور وفا و اخلاص کا استقلال ہر مذہب کی اصل ہے۔ کونسا مذہب دنیا میں ہے جس نے وفا اور اخلاص کو برا سمجھا ہوگا۔ جو اچھی باتیں ہیں سب مذہبوں میں اچھی ہیں۔ اور اُن کی تاکید ہے اہل مذہب عمل میں قصور کریں۔ تو مذہب کا قصور نہیں۔ بدمذہبوں کا قصور ہے +

یہ چٹکلا لکھنے کے قابل ہے۔ کہ راجہ کی ۱۵ سو رانیاں تھیں۔ اور ہر ایک سے ایک ایک دو دو بچے تھے۔ ہاں! بہادر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ کونپلیں ٹہنی سے نکلتی گئیں اور جلتی گئیں۔ چند جانیں تھیں کہ جوانی کو پہنچیں۔ اور افسوس کہ وہ اس کے سامنے گئیں۔ بھاؤ سنگھ کو جیتا چھوڑ گیا۔ وہ شراب کی بھینٹ ہوئے۔ جب راجہ سرگباش ہوئے تو ساٹھ رانیوں نے ستی ہو کر اُن کے ساتھ رفاقت کا حق ادا کیا +

تحقیق۔ جس قطعہ زمین پر تاج گنج کا روضہ ہے۔ یہ راجہ مان سنگھ کی تھی۔ مَیں نے آگرہ میں جا کر دریافت کیا۔ اب بھی کچھ بیگھے زمین اس قرب و جوار میں راجہ جے پور کے نام لکھی چلی آتی ہے۔ مہاراجہ سوائی فرماں فرمائے جے پور کے اہلکار اسے اعزاز کے ساتھ اپنا حق سمجھتے ہیں +

نکتہ رسی۔ ایک فقیر نے بیگھہ بھر زمین کے لئے دربار اکبری میں سوال کیا۔ وہاں سینکڑوں ہزاروں بیگھہ کی حقیقت نہ تھی۔ عطا ہو گئی۔ سند اس کی سب امرا کے دفتروں میں سے دستخط ہوتی چلی آئی۔ مان سنگھ کے سامنے جب کاغذ آیا تو اس نے زعفران زار کشمیر کو مستثنےٰ کر دیا۔ فقیر نے جب دیکھا تو سند پھینک کر چلا گیا۔ کہ اب

کیا کرنی ہے۔ اگر بیگھہ بھر زمین لینی ہوتی تو جہاں چاہتا بیٹھ جاتا۔ خدائی میدان کھلا پڑا ہے[1]
بعض کی تحقیق سے معلوم ہوا۔ کہ یہ ٹوڈرمل کی جنزرسی تھی +

آزاد۔ میرے دوستو! اس زمانہ کے ہندو اور مسلمانوں کے لئے اگر کوئی عہد ہے جس کی تقلید ملک کی بہتری اور خلق خدا کی آسودگی اور مختلف بلکہ متضاد مذہبوں میں محبت دیگانگت پیدا کرنے کے لئے ضرور ہے تو وہ عہد اکبری ہے۔ اور اس بے نظیر مبارک عہد کے پیشرو اور مرد میدان مسلمانوں میں اکبر ہندوؤں میں راجہ مان سنگھ ہیں۔ کہاں ہیں وہ تنگ دل تیرہ خیال جنہوں نے اس زمانہ میں بڑی حب الوطنی یہ بات قرار دی ہے۔ کہ دونوں مذہبوں کو لڑایا کریں اور بغض وکینہ کی آگ دلوں میں سلگایا کریں۔ اس زمانہ کی انجمنوں اور سبھاؤں اور اُن کی بے اثر تقریروں سے خاک حاصل نہیں ہوتا۔ جو بات دل سے نہیں نکلتی۔ وہ دل میں اثر نہیں کرتی۔ تم دَور اکبری کے ان پاکیزہ نفسوں کے حالات پر غور کرو۔ اور ان کو اپنا پیشرو بناؤ۔ اکبر اور مان سنگھ وہ شخص ہیں۔ کہ اگر اُن کے لبسٹ بنوا کر ہر قومی جلسے کو اُن سے زینت دی جائے۔ تو دونوں فریق میں اتحاد بڑھانے کی اچھی تدبیر ہے۔ بڑے غور کی یہ بات ہے۔ کہ مان سنگھ نے یہ اتحاد اپنے دھرم کو پورے طور پر برقرار رکھ کر قائم کیا۔ یہ ہی خوبی ہے۔ جو راجہ مان سنگھ کی بے انتہا عزت اور عظمت ہمارے دلوں میں بٹھاتی ہے۔ آزاد وہ کیا دینداری ہے جو دوسری قوم کی دل آزاری ہو۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب میں ہزاروں امور ہیں۔ جن کو دونوں فریق نیکی سمجھتے ہیں۔ پس دیندار بننے کے لئے ایسی ہی نیکیوں پر عمل کرنا چاہیئے۔ راجہ مان سنگھ! اخلاقی تاریخ میں تمہارا نام سنہری حروف میں قیامت تک روشن رہیگا۔ اخلاق اور بے تعصبی تمہارے مبارک نام پر ہمیشہ پھول اور موتی برسائے گی۔ تمہارا سر ایسے پھولوں کے ہاروں سے سجا ہے۔ جن کی مہک قیامت تک دماغ عالم کو معطر رکھے گی +

---

[1] نصف فوٹوگراف

مرزا عبدالرّحیم خان خاناں

سنہ ۹۶۴ھ میں بیرم خاں کا بڑھاپا اقبال کی جوانی میں لہلہا رہا تھا۔ ہیموں کی مہم مار لی تھی۔ اکبر شکار کھیلتے لاہور کو چلے آتے تھے۔ جو نغمۂ بلبل کے سُروں میں کسی نے آواز دی۔ کہ بڑھاپے کے باغ میں رنگین پھول مبارک ہو۔ فتح کی خوشی میں یہ خوشخبری نیک شگون معلوم ہوئی۔ اس لئے بادشاہ نے جشن کیا۔ وزیر نے خزانے لُٹائے۔ اور اپنے بیگانوں کو انعام واکرام سے مالا مال کردیا۔ بیرم خاں کو تو عالم جانتا ہے۔ ماں کا خاندان بھی معلوم کر لو۔ کہ جمال خاں میواتی کی بیٹی حسن خاں میواتی کی بھتیجی تھی۔ بڑی[1] بہن بادشاہ کے محل میں تھی۔ چھوٹی وزیر کے حرم سرا میں۔ خالو بادشاہ نے خود عبدالرّحیم نام رکھا مبارک مولود کی ولادت خاص اسی شہر لاہور میں ہوئی ✤

یہ پھول قریب تین سال کے ناز و نعمت کی ہوا میں اقبال کے شبنم سے شاداب تھا دفعتہً خزاں کی نحوست ایسی بگولا بن کر لپٹی۔ کہ اُس کے گلبن کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا اور گھاس پھوس کی طرح مدّت تک رواں دواں کرتی رہی۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ اس کا ٹھکانا بھی کہیں لگیگا یا نہیں۔ ہم کاغذوں کے دیکھنے والے ترس کھاتے ہیں۔ وائے بر حال اُس کے رشتہ داروں اور ہوا خواہ نمک خواروں کے۔ جب اُس کی اور اپنی حالت کو یاد کرتے ہونگے۔ تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتے ہونگے۔ کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ مگر حق یہ ہے کہ ایسے ہی اُونچے سے گرتے ہیں۔ جب اس قدر اُونچے پہنچتے ہیں۔ کہ دیکھنے والے تعجب کر کے کہتے ہیں۔ یہ تارا کہاں سے نکل آیا ✤

خدا تر نوالہ دے۔ خواہ سُوکھا ٹکڑا۔ باپ کا ہاتھ بچّوں کے رزق کا چمچہ بلکہ اُن کی قسمت کا پیمانہ ہوتا ہے۔ جب بیرم خاں کے اقبال نے منہ پھیرا۔ اور اکبر رقیبوں کی باتوں میں آکر دہلی میں آن بیٹھا۔ بیرم خاں آگرہ میں رہ گئے۔ یہیں سے نحوست کا آغاز سمجھنا چاہئے۔ حال یہ تھا۔ کہ رفیق ساتھ چھوڑ چھوڑ کر دہلی چلے جاتے ہیں۔ عرضیاں جاتی ہیں تو

[1] اکبر نامہ میں یہی ہے۔ تعجب ہے مآثر سے کہ کہتا ہے بڑی ہمایوں کے عقد میں تھی ✤

اُلٹے جواب آتے ہیں۔ عرض معروض کے لئے وکیل پہنچتا ہے۔ تو قید۔ دربار کے طور بے
طور۔ خبر آتی ہے تو وحشت ناک۔ بچّہ معصوم ان رازوں کو نہ سمجھتا ہوگا۔ مگر اتنا تو ضرور
دیکھتا ہوگا۔ کہ باپ کی مجلس میں رونق نہیں۔ وہ امرا اور درباریوں کی بھیڑ بھاڑ کیا ہوگئی۔
باپ کس فکر میں ہے کہ میری طرف دیکھتا بھی نہیں +

بیرم خاں بیچارہ کیا کرے۔ کبھی بنگالہ کا ارادہ کرتا ہے کبھی گجرات کا کہ حج کو چلا جائے
ادھر رستہ نہیں پاتا۔ راجپوتانہ کا رُخ کرتا ہے۔ چند روز اِدھر اُدھر پھرتا ہے۔ آخر
پنجاب کو آتا ہے۔ کچا ساتھ اپنے حال کو سنبھالے کہ عیال و اطفال کو۔ آخر حرم سرا اور
جواہر خانہ۔ توشہ خانہ وغیرہ بہت سے لوازمات و اسباب کو بٹھنڈے میں چھوڑا۔
اور آپ پنجاب میں آیا۔ بٹھنڈہ کا حاکم اپنا نمک پروردہ۔ خاک سے اُٹھایا ہوا۔ ہاتھوں
کا پالا ہوا۔ چھوٹے سے بڑا کر کے حکومت تک پہنچایا ہوا۔ اُس نے مال و عیال کو ضبط کر کے
روانۂ دربار کر دیا۔ دہلی میں آکر سب قید۔ اسباب خزانہ میں داخل۔ وہ تین چار برس
کا بچّہ روز کی پریشانی اور بے سروسامانی اور گھر والوں کی سرگردانی۔ روز نئے شہر۔ نئے
جنگل دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا۔ کہ یہ کیا عالم ہے۔ (ہم کہاں ہیں)۔ میری ہوا خوری کی
سواریوں اور سب کی دلداریوں میں کیوں فرق آگیا۔ جو لوگ ہاتھوں کی جگہ آنکھوں پر لیتے
تھے۔ وہ کیا ہو گئے +

اور اُس حالت کی تصویر سے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ کہ باپ دربار سے رخصت
ہو کر حج کو چلا گیا۔ گجرات پٹن پر ڈیرے ہیں۔ ابھی سورج جھلکتا ہے۔ شام قریب ہے
خیال یہ کہ اب خان خاناں آتا ہے۔ خبر آئی۔ کہ وہ تو مارا گیا۔ اُس کے مرتے ہی فوج میں طلاطم
مچ گیا۔ پل کے پل میں گھر بار افغانوں نے لوٹ لیا۔ کوئی گٹھڑی لئے جاتا ہے۔ کوئی
صندوقچہ۔ کسی نے مسند گھسیٹ لی۔ کوئی بچھونا لے چلا۔ اُس بیکس مُردے کے
کپڑے تک اُتار لئے۔ لاش بے جان کو کفن کون دے۔ کہ اپنی ہی جان کا ہوش نہیں
وہ تین برس کی جان کیا کرتا ہوگا۔ سہم کر رہ جاتا ہوگا۔ ماں کی گود میں دبک جاتا ہوگا۔ ڈرتا
ہوگا۔ انا کے پاس چھپ جاتا ہوگا۔ افسوس وہ بے چاریاں کہاں چھپائیں۔ کہ آپ ہی
چھپنے کو جگہ نہیں۔ الٰہی تیری پناہ۔ عجب وقت ہوگا۔ شام غریباں اسی شام کو کہتے
ہیں۔ رات قیامت کی رات گزری ہوگی۔ دن ہوا تو روز محشر۔ محمد امین دیوانہ اور زنبور

وغیرہ لشکروں کے لڑانے والے تھے۔ اس وقت کچھ نہ بن آتی تھی۔ پھر بھی ہزار رحمت ہے کہ لٹے قافلے کو سمیٹا ہے۔ اور احمد آباد کو اُڑے جاتے ہیں۔ موقع پاتے ہیں تو پلٹ کر ایک ہاتھ مار جاتے ہیں +

اس وقت اِن پا شکستہ عورتوں کو جن میں سلیمہ سلطان بیگم اور یہ تین برس کا بچہ بھی شامل ہے سے نکلنا غنیمت ہے۔ لٹیرے اب بھی دست بردار نہیں ہوئے۔ پیچھے پیچھے لُوٹتے مارتے چلے آتے ہیں۔ معصوم بچہ سہما ہوا اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور رہ جاتا ہے۔ کون دلاسہ دے۔ احد دے تو ہوتا کیا ہے۔ الٰہی وہ وقت دشمن ہی کو نصیب کیجو +

ان مصیبت زدوں نے لڑتے مرتے احمد آباد میں جا کر دم لیا۔ کئی دن میں گئے ہوئے حواس ٹھکانے آئے۔ صلاح ہوئی۔ کہ دربار کے سوا پناہ نہیں ہے۔ پھر چلنا چاہیئے چنانچہ چار مہینے کے بعد ضروری سامان بہم پہنچا کر روانہ ہوئے۔ یہاں بھی خبر پہنچ گئی تھی۔ چغتائی دریا دلی اور اکبری عفو و کرم کے دریا میں لہر آئی۔ اُن کے لئے فرمان بھیجا۔ خان خاناں کے مرنے کا رنج و الم اور اُن کی تباہی کا افسوس تھا۔ ساتھ ہی بڑے دلاسے اور دلداری کے ساتھ لکھا تھا۔ کہ عبدالرحیم کو تسلّی دو۔ اور بڑی خبرداری و ہوشیاری سے لے کر دربار میں حاضر ہو۔ یہ اطمینان کا تعویذ اُنہیں جالور میں ملا۔ بڑا سہارا ہو گیا۔ ہمّت بندھ گئی اور حضور میں پہنچے +

اس لٹے قافلے کے واسطے وہ وقت عجب مایوسی اور حیرانی کا عالم ہو گا۔ جب کہ بابا زنبور سب تباہی زدوں کو لے کر آگرہ پہنچے ہونگے۔ عورتوں کو محل میں اُتارا ہو گا۔ اس یتیم بچے کو جس کا باپ ایک دن دربار کا مالک تھا۔ بادشاہ کے سامنے لا کر چھوڑ دیا ہو گا۔ اندر شکستہ پا عورتوں کے دل دھکڑ دھکڑ۔ باہر اُس کے قدیمی نمکخوار دعائیں کرتے ہونگے۔ کہ الٰہی باپ کی خدمتوں کو پیش نظر لائیو۔ آخری وقت کی باتوں کو دل سے بھلائیو۔ اس معصوم کے اور ہمارے حال پر مہربان رہیں۔ الٰہی سارا دربار دشمنوں سے ہی بھرا پڑا ہے اس بن باپ کے بچے کا کوئی نہیں۔ ہماری زندگی اور آئندہ کی بہبودی کا سہارا کون ہے اگر ہے تو اسی بچہ کی جان ہے۔ تو ہی اسے پروان اور تو ہی اس بیل کو منڈھے چڑھائیگا

چغتائی سلسلہ میں ان چند بادشاہوں کا حال خطا بخشی کے معاملے میں قابل تعریف

ہے۔ دشمن بھی سامنے آتا تھا۔ تو آنکھ جھپک جاتی تھی۔ بلکہ اُس کی جگہ خود شرمندہ ہو جاتے تھے۔ خطا کا ذکر نہ تھا۔ بھلا یہ تو بچہ معصوم تھا۔ وہ بھی بیرم کا بیٹا جس وقت سامنے لائے۔ اکبر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گود میں اُٹھا لیا۔ اُس کے نوکروں کے لئے وظیفے اور تنخواہیں بیش قرار مقرر کیں۔ اور کہا کہ اس کے سامنے کوئی خان بابا کا ذکر نہ کیا کرو۔ بچہ ہے دل کڑھے گا۔ باباز نبور نے رو کر کہا کہ حضور یہ بار بار پوچھتے ہیں۔ راتوں کو چونک اُٹھتے ہیں کہ کہاں گئے۔ اب تک کیوں نہیں آئے۔ اکبر نے کہا کہ کہہ دیا کرو۔ کہ حج کو گئے ہیں۔ خانۂ خدا میں پہنچ گئے بچہ ہے۔ باتوں میں بہلا لیا کرو۔ دیکھو اسے ہر طرح خوش رکھو۔ اسے یہ نہ معلوم ہو۔ کہ خان بابا سر پر نہیں۔ باباز نبور! یہ ہمارا بیٹا ہے۔ اسے ہمارے پیش نظر رکھا کرو +

۹۶۹ھ میں یہ واجب الرحم بچہ دربار اکبری میں پہنچا تھا۔ اُس کے باپ کے جانی دشمن اب ارکان دولت تھے۔ وہ یا اُن کے خوشامدی ہر وقت حضور میں حاضر رہتے تھے۔ اکثر ایسے تذکرے کرتے تھے۔ جن سے بیرم خاں کی باتیں اکبر کو یاد آجائیں۔ اور اُس کی طرف سے کھٹک جائے۔ اکثر ان میں سے کھُلم کھُلا سمجھاتے تھے۔ لیکن اکبر کی نیک نیتی اور اس لڑکے کا اقبال تھا۔ کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ غیروں کے دل میں اُن باتوں سے رحم پیدا ہوتا تھا۔ اکبر اسے مرزا خان کہا کرتا تھا۔ کہ ابتدائی ذکر میں اُسے اہل تاریخ اکثر مرزا خان ہی لکھتے ہیں +

ہونہار لڑکا اکبری سایہ میں پرورش پانے لگا۔ اور بڑا ہو کر امینا نکلا۔ کہ مؤرخ اُس کی لیاقت علمی کی گواہی دیتے ہیں۔ بلکہ علمیت سے زیادہ تیزی فکر اور قوتِ حافظہ کی تعریف لکھتے ہیں۔ علوم و فنون کی کیفیت اور اثنائے تحصیل اور حد تحصیل کی شرح کسی نے نہیں کھولی۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس نے ابتدائے عمر کو اور امیرزادوں کی طرح کھیل کود میں برباد نہیں کیا۔ کیونکہ جب وہ بڑا ہوا۔ تو علما کا قدردان تھا۔ اہل تصنیف اور شعرا کو عزیز رکھتا تھا۔ خود بھی شاعر تھا۔ زبان عربی سے واقف تھا۔ اور بے تکلف بولتا تھا۔ زبان ترکی اور فارسی جو اُس کے باپ دادا کی میراث تھی۔ اُسے جانے نہ دیا۔ حاضر جواب۔ لطیفہ گو۔ بذلہ سنج۔ بلبل ہزار داستان تھا۔ سنسکرت میں بھی اچھی لیاقت حاصل کی تھی۔ فن جنگ میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت رکھتا تھا +

اس کے باپ کے چند وفادار جاں نثار ساتھ تھے۔ جو محبت کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ اور اپنی قسمتوں کو اس ہونہار بااقبال کے ہاتھ بیچ بیٹھے تھے۔ اس امید پر کہ اس کے

ہاں مینہ برسیگا۔ تو ہمارے گھر میں بھی پرنالے گرینگے۔ حرم سرا میں کچھ شریف زادیاں اور پرستاریں تھیں۔ جو وفاداری کے ساتھ بیکسی اور بے لبسی کی چادروں میں لپٹی بیٹھی تھیں حسرت وارمان اُمید و ناامیدی اُن کے خیالوں میں ایک طلسمات بناتی تھی۔ ایک بگاڑتی تھی بادشاہی دربار خدائی عجائب خانہ تھا۔ امیر اور سردار کہ وہاں سے جواہر کی پتلیاں بن کر نکلتے تھے۔ اس کے رفیق دیکھتے تھے اور رہ جاتے تھے۔ دل میں کہتے تھے۔ کہ ایک دن اس کا باپ جس کو چاہتا تھا۔ اُسے جواہرات اور موتیوں میں چھپا دیتا تھا۔ کاش بیٹا ویسے انعاموں میں ہی شامل ہو جائے۔ اُس میں سب قدرت ہے۔ وہ چاہے تو پھر وہی تماشہ دکھائے۔ دن۔ رات۔ صبح۔ شام۔ آدھی رات آسمان کی طرف ہاتھ تھے۔ اور خدا کی طرف دھیان تھے دل آمین آمین کہہ رہے تھے ✦

مرزا خان نہایت حسین تھا۔ باہر نکلتا تھا۔ تو رستہ کے لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ناواقف خواہ مخواہ پوچھتے تھے۔ کہ یہ کون خان زادہ ہے۔ مصور اس کی تصویریں اُتارتے تھے۔ امیر اپنے مکانوں اور دیوان خانوں کو سجاتے تھے۔ بادشاہ بھی اپنے دربار اور مجلس کا سنگار سمجھتے تھے۔ بیرم خاں کے خوان کرم کے سینکڑوں نہ تھے۔ ہزاروں کھاتے والے تھے۔ کوئی وقا کا بندہ۔ کوئی زمانے کا مارا۔ کوئی عالم۔ کوئی شاعر۔ کوئی اہل کمال۔ جو اسے دیکھتا اور نام سُنتا۔ آتا اور دعائیں دیتا۔ بیٹھتا اور اُس کا مختصر دیوان خانہ متوسط حالت دیکھ کر باپ کے جاہ و جلال اور نیکیاں یاد کرتا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر لاتا۔ ان لوگوں کی ایک ایک بات اُس کے اور اُس کے رفیقوں کے لئے مرثیوں کا کام کرتی تھی۔ اور خون کو آنسو کر کے بہاتی تھی ✦

جب بادشاہ کے ساتھ دہلی۔ آگرہ۔ لاہور وغیرہ میں اُس کا گذر ہوتا۔ بڈھے بڈھے دستکاروں کے تحفے مصوروں کی تصویریں۔ مالیوں کی ڈالیوں سے اس کے حرم سرا میں دو کیفیتیں پیدا ہوتی تھیں۔ کبھی مایوسی اور تأسف کہ ہائے کیا لیں۔ جبکہ لانے والوں کو اُن کے لائق نہ دے سکیں۔ کبھی اُن کا لانا ایک مبارک شگون کا رنگ دکھاتا تھا۔ خیال آتا تھا کہ اس تحفے کی آب و تاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا بھی رنگ پلٹیگا۔ اور دلوں کی افسردگی پر شادابی شبنم چھڑکے گی ✦

اکبر خوب جانتا تھا کہ ماہم نیل والے اُمرا اور دربار کے کون کون سے سردار ہیں۔ جو

اس سے اور اس کے باپ سے خوانی عناد رکھتے ہیں۔ اس واسطے ماہ بانو بیگم خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی بہن سے مرزا خان کی شادی کر دی۔ تاکہ اُس کی حمایت کے لئے بھی دربار میں تاثیر پھیلے ✦

۹۷۳ھ میں اُس کے میدان خوش نصیبی میں ایک مبارک شگون کا جلوہ نظر آیا۔ **اکبر خان زمان** کی مہم پر تھا۔ اُس نے عفو تقصیر کے لئے التجا کی۔ ادھر پنجاب سے خبر پہنچی تھی۔ کہ محمد حکیم مرزا کابل سے فوج لے کر آیا ہے۔ لاہور تک پہنچ گیا ہے۔ اکبر نے خان زمان کی خطا معاف کر کے ملک اُس کا برقرار رکھا۔ اور آپ پنجاب کے بندوبست کے لئے چلا۔ مرزا خان کو خلعت و منصب عطا کر کے منعم خاں خطاب دیا۔ (حالانکہ منعم خاں زندہ موجود) اور چند امرا صاحب تدبیر کے ساتھ آگرہ کو رخصت کیا کہ دارالسلطنت کے انتظام اور حفاظت میں سرگرم رہیں ✦

آزاد۔ اس میں دو پہلو تھے۔ اوّل یہ کہ سُننے والے صورت نہیں دیکھتے۔ جو کہیں کہ بڈھا منعم خاں نو برس کا کیونکر ہو گیا۔ ہاں رعب قائم ہو گیا۔ کہ کہن سال کاردار گھر پر موجود ہے۔ خان خاناں کا لفظ بھی خوب ہے۔ باپ اور بیٹے میں کچھ دور کا فرق نہیں۔ مصالح سلطنت کے لفظوں کو دیکھو۔ یہی پیچ ہیں۔ جنہیں آج کل کے لوگ ملکی پولیسی کہتے ہیں۔ اگر نیکی کی غرض اور نیک نیتی کی بنیاد پر ہو۔ تو مصلحت ملک اور دروغ مصلحت آمیز ہے۔ ہاں خود غرضی اور آزارِ خلائق نظر ہو۔ تو دغا اور فریب ہے ✦

اس کے ستارہ طلوع یا جوہر مردانگی کی چمک تیرھویں صدی میں ہر خاص و عام کو نظر آئی جبکہ ۹۸۰ھ میں خان اعظم مرزا عزیز کوکہ احمد آباد گجرات میں محصور ہوا۔ اور اکبر دو مہینے کی منزلیں سات دن میں طے کر کے گجرات پر جا کھڑا ہوا۔ بڑے بڑے کہنہ عمل سردار رہ گئے۔ ۱۳ برس کے لڑکے کی کیا بساط ہوتی تھی۔ وہ قدم بقدم بادشاہ کے ہم رکاب تھا۔ اُس کے دل کا جوش اور بہادری کی اُمنگ دیکھ کر اکبر نے اُسے قل (قلب لشکر) میں قائم کیا۔ جو عمدہ سپہ سالاروں کی جگہ ہے ✦

اب وہ اس قابل ہوا۔ کہ ہر وقت دربار میں رہنے لگا۔ اور کاروبار حضور کا سرانجام کرنے لگا۔ اکثر کاموں کے لئے بادشاہ کی زبان پر اُسی کا نام آنے لگا۔ اور اُسی کی جیب بھی ہاتھ ڈالنے کے قابل رہنے لگی۔ **آزاد**۔ نوجوانو ناتجربہ کارو سنتے ہو۔ یہی موقع اُس کے لئے

نازک وقت تھا۔ یاد رہے۔ امیرزادے شریف زادے جو بدراہ ہوتے ہیں۔ اُن کی خرابی کا پہلا مقام یہی ہے۔ ہاں اُس کی خوش اقبالی کہو یا باپ کی نیک نیّتی کہ یہی موقع اُس کے لئے آغاز ترقّی کا نقطہ ہوا۔ مَیں نے بزرگوں سے سُنا۔ اور خود دیکھا۔ کہ باپ کا کیا بیٹے کے آگے آتا ہے۔ اور اُس کی نیّت کا پھل اُسے ضرور ملتا ہے۔ چنانچہ جو روپیہ مرزا خاں کے پاس آتا تھا۔ یہ اُس سے دسترخوان کو وسعت دیتا تھا۔ اپنی شان سواری اور رونق دربار کو بڑھاتا تھا۔ اہل علم و اہل کمال آتے تھے۔ بیرم خانی انعام تو نہ دے سکتا تھا۔ لیکن جو دیتا تھا۔ اس خوبصورتی سے دیتا تھا۔ کہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا دیا دلوں پر بڑی بڑی بخششوں کا اثر پیدا کرتا تھا۔ اس بیان میں اُس کے نمک خواروں اور وفاداروں کی تعریف کو نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ اُس کے سلیقہ اور لیاقت کے امتحان کا وقت یہ تھا۔ جس کے وہ برسوں کے منتظر تھے۔ بیشک وہ امتحان میں پورے اُترے۔ انہیں کی دانش و دانائی تھی۔ کہ ہر کام میں تھوڑی سی چیز میں بڑا پھیلاؤ دکھاتے تھے۔ روپیہ خرچتے تھے۔ اور اشرفیوں کے رنگ نظر آتے تھے۔ اور یہی باتیں اُس زمانہ میں امرا کے واسطے دربار میں ترقّی مناصب کے لئے سفارش کیا کرتی تھیں۔ ایشیائی حکومتوں کا قدیمی آئین تھا۔ کہ جس شخص کا سامان امیرانہ اور دسترخوان وسیع دیکھتے تھے اُسی کو زیادہ تر جلد ترقّی دیتے تھے ؎

۹۸۳ھ میں اکبر نے احمد آباد کی حکومت مرزا کوکہ کو دینی چاہی۔ وہ ضدّی امیرزادہ اڑ گیا۔ اور بگڑ بیٹھا۔ کہ مجھے ہرگز منظور نہیں۔ مقام مذکور سرحد کا موقع تھا۔ اور ہمیشہ بغاوتوں اور فسادوں کی گھڑدوڑ سے پامال رہتا تھا۔ اکبر نے خدمت مذکور اس نوجوان کو عنایت کی۔ اور اُس نے کمال شکریہ کے ساتھ قبول کی۔ اس وقت اُس کی عمر اُنیس بیس برس کی ہوگی۔ بادشاہ نے حسب تفصیل ذیل چار امیر تجربہ کار کہ دولتِ اکبری کے نمک پروردۂ قدیم تھے۔ اُس کے ساتھ کئے اور سمجھا دیا۔ کہ عنفوان شباب ہے۔ اور اوّل خدمت ہے جو کام کرنا وزیر خاں کی صلاح سے کرنا۔ یہ اس خاندان کے بندہ ہائے قدیمی سے ہے میر علاء الدولہ قزوینی کو آمینی۔ پیاگداس کو کہ حساب دانی میں فرد تھا۔ دیوانی سیّد مظفر بارہا کو بخشی گری فوج پر معزز کیا ؎

۹۸۶ھ میں شہباز خاں کو ملمیر علاقہ رانا پر فوج لے کر چڑھا۔ مرزا خاں بموجب اُس کی

درخواست کے مدد کو پہنچے۔ چنانچہ قلعہ مذکور اور قلعہ کوکندہ اور اودے پور افواج شاہی کے قبضہ میں آئے۔ رانا ایسا پہاڑوں میں بھاگ گیا۔ کہ شہباز خاں باز کی طرح اُڑا۔ دو اسپہ سواروں کے لئے جریدہ اُس کے پیچھے پیچھے پھرا۔ مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ البتہ دو اسپہ سالار اُس کا حاضر دربار ہو کر گرفتار ہوُا۔ اور خطا معاف ہوئی +

خانخاناں کبھی اپنے علاقہ میں کبھی دربار میں کبھی متفرق خدمتیں بجالاتا تھا۔ اور جوہر قابلیت دکھاتا تھا۔ ۹۸۸ھ میں اُس کی سیر چشمی اور خدا ترسی اور اعتبار اور علو حوصلہ پر نظر کر کے عرض بیگی کی خدمت سپرد کی۔ کہ حاجتمندوں کی عرض معروض حضور میں اور حضور کے احکام اُنہیں پہنچائے +

اسی سنہ میں صوبہ اجمیر کے علاقے میں فساد ہوُا۔ رستم خاں صوبہ دار اجمیر مارا گیا۔ اُس میں راجگان کچھواہہ کی سرشوری بھی شامل تھی۔ کہ راجہ مان سنگھ کے بھائی بند تھے۔ اکبر کو ہر پہلو کا خیال رہتا تھا۔ چنانچہ رنتھنبور خان خاناں کی جاگیر میں دے کر حکم دیا کہ فتنہ کو فرو کرے۔ اور مفسدوں کو فساد کی سزا دے +

۹۹۰ھ میں جبکہ شاہزادہ سلیم (یعنی جہانگیر) کی عمر بارہ تیرہ برس کی ہوگی۔ اور خان خاناں ۲۸ برس کا ہوگا۔ اُسے شہزادہ کا اتالیق مقرر کیا +

آزاد۔ اکثر ریاستوں میں سُنتا ہوں۔ کہ راجہ خورد سال ہے۔ فلاں شخص کو سرکار نے ٹیوٹر اتالیق مقرر کر کے بھیجا ہے۔ اس مقام پر ضرور چند منٹ ٹھیرنا چاہئے۔ اور اُس زمانہ کے اتالیق اور آج کے ٹیوٹر صاحب کو مقابلہ کر کے دیکھ لینا چاہئے۔ کہ عہد سلف کے سلاطین اتالیق میں کیا کیا صفتیں دیکھ لیتے تھے۔ سرکار جو باتیں آج دیکھتی ہے۔ وہ تو سب ہی دیکھ رہے ہیں۔ وہ لوگ اوّل یہ دیکھتے تھے۔ کہ اتالیق خود رئیس ہو۔ اور خاندان شرافت و ریاست سے ہو۔ رئیس کا لفظ ہی آج تک سب کی زبان پر ہے۔ مگر مَیں دیکھتا ہوں اُس عہد میں تفصیل اُس کی بہت شرح طلب ہے۔ ہمارے شاہان وقت تو اس سے اتنا ہی مطلب رکھتے ہیں۔ کہ ایک شخص نے مہم حبش یا کابل پر جا کر کبھی کسی سڑک یا عمارت کا ٹھیکہ لیکر۔ کبھی نہر کی نوکری کر کے بہت سا روپیہ کما لیا ہو۔ وہ اپنے گھر بیٹھا ہے۔ بگھی پر چڑھ کر ہوَا کھاتا ہے۔ جب شہزادہ عالم ولایت سے آتے ہیں۔ یا کوئی لاٹ صاحب جاتے ہیں۔ یا صاحب کمشنر ایک گنج بناتے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ چندہ دیتا ہے

یہ سرکار میں رئیس ہے۔ اور اسے دربار میں کرسی ملنے کا بھی حکم ہے۔ صاحب ڈپٹی کمشنر نے ایک موری ایسی نکالی۔ کہ جس میں تمام شہر کی کثافت نکل جائے۔ اُس نے اس میں پہلے سے بھی زیادہ چندہ دیا۔ بس یہ بڑا صاحب ہمّت رئیس ہے۔ اسے خان بہادر یا رائے بہادر کا خطاب بھی ملنا چاہئے۔ اور میونسپل ممبر بھی ہو۔ اور آنریری مجسٹریٹ بھی۔ اگر کوئی تحصیلدار یا سرشتہ دار جتاتا ہے۔ کہ خداوند اس میں اہل خاندان اور اہل ریاست کی دلشکنی ہوگی۔ صاحب کہتے ہیں۔ ول یہ ہمّت والا لوگ ہے۔ یہ رئیس ہے۔ اگر وہ رئیس ہونا چاہتے ہیں تو ہمّت دکھائیں۔ ہم اُسے ستارہ ہند بنائینگے۔ تب وہ دیکھینگے نئے رئیس کا یہ عالم ہے کہ جب گھر سے نکلتے ہیں۔ تو چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہ ہمیں کون کون سلام کرتا ہے۔ اور سب کیوں نہیں کرتے۔ خصوصاً جن لوگوں کو خاندانی سمجھتے ہیں۔ انہیں زیادہ تر دبلتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں۔ کہ ہماری ریاست جبھی ثابت ہوگی۔ جب یہ جُھک کر سلام کرینگے۔ اب مجسٹریٹی شہر کا انتظام اُن کے ہاتھ میں ہے۔ سب کو جُھکنا واجب پڑا۔ نہ جُھکیں تو رہیں کہاں۔ مگر ان کی شیخیوں اور نمودوں اور بار بار کے دباؤ دکھانے سے فقط خاندانی ہی تنگ نہیں بلکہ اہل محلّہ تنگ ہیں۔ جنہوں نے اصل خاندانیوں کے بزرگوں کو دیکھا ہے۔ وہ انہیں یاد کر کے روتے ہیں۔ اور جو بھول گئے تھے اُن کے دلوں میں محبّت کے مٹے ہوئے حرف روشن ہو جاتے ہیں۔ اہل نظر نے ایسے رئیسوں کا انگریزی رئیس اور انگریزی اشراف نام رکھا ہے۔

آج کل رئیس کا لفظ کبھی کبھی اپنے جلسوں میں بھی ہمارے کانوں تک پہنچتا ہے۔ یہ کیفیت بھی سُننے کے قابل ہے۔ مثلاً دو بزرگ سفید پوش ایک جلسہ میں آئے۔ **ایک میر صاحب ایک مرزا صاحب** آپئے تشریف رکھئے۔ میر صاحب اہل جلسہ سے کہتے ہیں۔ جناب آپ نے ہمارے مرزا صاحب سے ملاقات کی؟ حضرت مجھے تعارف نہیں جناب آپ دہلی کے رئیس ہیں۔ مرزا صاحب ایک طرف دیکھ کر کہتے ہیں۔ قبلہ ہمارے میر صاحب سے آپ کی ملاقات اب تک نہیں ہوئی؟ جناب بندہ تو محروم ہے۔ آپ لکھنؤ کے رئیس ہیں۔ اب لکھنؤ میں جا کر پوچھئے۔ میر صاحب کہاں رہتے ہیں۔ کچھ ہوں تو پتہ لگے۔ ماں ٹینی باپ کلنگ بچّے دیکھو رنگ برنگ۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ۔ مرزا صاحب کو دہلی میں ڈھونڈ ھیئے تو باپ دینا ماں پدربنا بیٹا مرزا نینا۔ نئی روشنی اصلیت کا

اندھیر جو چلا ہے بن جائیے ◆

اب وہ سُن لو کہ بزرگان سلف رئیس کسے کہتے تھے۔ اور شاہان سلف رئیسوں پر کیوں جان دیتے تھے۔ (۱) میرے دوستو تمہارے بزرگ رئیس اُسے کہتے تھے کہ شریف نجیب الطرفین ہو۔ یہ داغ دامن پر نہ ہو۔ کہ ماں لونڈی تھی یا دادا نے ڈومنی گھر میں ڈالی تھی۔ یادر کھنا ہزار دولتمند صاحب دستگاہ ہو۔ وغیبلہ آدمی کا وقار لوگوں کی نظروں میں نہیں ہوتا۔ ذراسی بات دیکھتے ہیں۔ صاف کہہ بیٹھتے ہیں۔ میاں کیا ہے آخر ڈومنی بچہ ہی ہے نا۔ ایک کہتا ہے۔ میاں نواب زادہ ہے تو کیا ہے۔ لونڈی کی ہی تو رگ ہے اثر آوے ہی آوے ◆

	پرستار زادہ نیاید بکار	اگرچہ بود زادۂ شہریار	

(۲) رئیس کے لئے یہ بھی واجب تھا کہ وہ بھی اور اُس کے بزرگ بھی صاحب دولت ہوں۔ اُن کا ہاتھ سخاوت کا پیمانہ ہو۔ اور لوگوں کا ہاتھ اُن کے دست فیض کے نیچے رہا ہو۔ اگر غریب کا بیٹا تھا۔ اب صاحب دولت ہو گیا۔ تو اُسے کوئی خاطر میں نہ لائیگا۔ وہ کسی موقع پر شادی و مہمانی میں کھلانے کھلانے میں۔ لینے دینے میں۔ بلکہ ایک مکان کے بنانے میں اگر مصلحتاً بھی کفایت شعاری کریگا۔ تو کہنے والے ضرور کہہ دینگے صاحب یہ کیا جانے کبھی باپ دادا نے کیا ہوتا تو جانتا۔ کبھی کچھ دیکھا ہوتا تو جانتا ◆

	ہر کہنہ گدائے کہ تونگر باشد	صد سال از و بوئے گدائی نرود	

(۳) اُس کے لئے یہ بھی واجب تھا کہ آپ سخی ہو۔ کھلانے کھلانے والا ہو فیض رساں اور لوگوں سے نیکی کرنے والا ہو۔ اگر بخیل ہے۔ اور باوجود اختیار کے لوگوں کو اُس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ تو اُسے بھی کوئی خاطر میں نہ لائیگا۔ صاف کہہ دینگے۔ ع

بے فیض اگر حاتم ثانی ہے تو کیا ہے

دولت ہے تو اپنے گھر میں لئے بیٹھا رہے ہمیں کیا سے

سیراب نہ ہو جس سے کوئی تشنہ مقصود		اے ذوق جو وہ آب بقا بھی ہے تو کیا ہے

(۴) اُس کے لئے یہ بھی واجب تھا۔ کہ نیک اطوار خوش اعمال ہو۔ بدچلن آدمی ہزار دولت والا ہو۔ لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہی ہوتا ہے۔ اس کی دولت آنکھوں میں نہیں جچتی۔ اس پر بھروسہ نہیں کرتے ◆

اچھا ان باتوں سے غرض کیا تھی۔ کہ شاہان سلف اور اہل شرف ان اوصاف کو ڈھونڈتے تھے۔ بات یہ ہے کہ جو شخص ان اوصاف کے ساتھ امیر ہوگا۔ اور اُس کے باپ دادا بھی امیر ہونگے اُس کے کلام اور اُس کے کام کو تمام لوگوں کی نگاہوں اور دلوں میں بھی وقعت اور وقار ہوگا۔ سب اُس کا لحاظ کرینگے۔ اور اُس کے کہنے سے عدول کرنے کو ان کے دل گوارا نہ کرینگے ایسے ایک شخص کو اپنا کر لینا گویا ایک انبوہ کثیر پر قبضہ کر لینا ہے۔ وہ جہاں جا کھڑا ہوگا۔ جماعت کثیر آ کھڑی ہوگی۔ وقت پر جو کام سلطنت کے اُس سے نکلینگے۔ کمینے دولتمند سے نہ نکلینگے۔ کمینے کا ساتھ کون دیتا ہے۔ اور جب یہ بات نہیں۔ تو بادشاہ اُسے لیکر کیا کرے

(۵) اُس کے لئے یہ بھی واجب تھا کہ فضیلت علمی کے لحاظ سے عالم فاضل نہ ہو۔ مگر ملک کی زبانہائے علمی سے واقف ہو۔ اگر ایشیائی ملکوں میں ہے۔ تو زبان عربی و فارسی کی معمولی کتابیں پڑھا ہو۔ علوم و فنون مشہورہ کی ہر ایک شاخ سے باخبر ہو۔ خود کمالات کا شائق ہو۔ اور اُن کے ذکر و اذکار سے لطف اُٹھاتا ہو۔ کیونکہ بے علم اور بے لطف آدمی جس کا دل و دماغ اس نور سے روشن نہ ہوگا۔ وہ شاگرد کے دماغ کو کیا روشن کرے گا۔ جس کو ملک کا بادشاہ ہونا ہے۔ اور کشور اور اہل کشور کے دماغوں کو اُس سے روشن کرنا ہے۔ اگر اتالیق کا دل علوم کے تذکروں سے لطف اُٹھاتا ہوگا۔ اور علم کی بات سُن کر دل چٹخارا بھرتا ہوگا۔ تو شاگرد کے دل میں بھی اُس کی تاثیر دوڑا سکیگا۔ اور ہمیشہ اُس کے دلچسپ چرچے رکھیگا۔ خود مزا نہ ہوگا تو روکھی سوکھی خالی عبارتوں کی بک بک سے شاگرد کے دل کو کیا مائل کر یگا۔ اور وہ مائل ہی کب ہوگا۔ علمی مطالب اُس کے سامنے ایسے ڈھب سے پیش کرے۔ کہ جس طرح مزے کی چیز کھا کر یا خوشبو سونگھ کر یا خوش رنگ پھول دیکھ کر مزا آتا ہے۔ اسی طرح علمی مسائل سُن کر مزا آئے۔ اور تم خوب سمجھ لو۔ جب تک علم کا مزا نہیں تب تک کچھ آنا ممکن ہی نہیں جسے یہ نہیں اسے علم کی قدر کیا ہوگی۔ اور اہل علم کی قدر کیا ہوگی۔ اور وہ اپنے ملک میں علم و کمال کب پھیلا سکیگا۔ اہل کمال اُس کے دربار میں کیا جمع ہو سکیں گے۔ اور یہ نہیں تو سلطنت نہیں +

اُس زمانہ میں مذہبی لو علمی زبان عربی تھی۔ نیم علمی زبان یعنی درباری۔ دفتری اور مراسلات کی زبان فارسی تھی۔ ترکی کی بڑی عزت تھی۔ اور نہایت کار آمد تھی۔ جیسے آج انگریزی کیونکہ بادشاہ وقت کی زبان تھی۔ تمام امرا جو ماوراء النہری تھے۔ اُن کی بھی اور اہل فوج کی ترکی زبان تھی

ایرانی بھی ترکی بولتے تھے۔ اور سمجھتے تو سب تھے۔ اکبر خود بہت خوب ترکی بولتا تھا۔ **خان خاناں** اگرچہ یہاں پیدا ہوا۔ اور یہیں پلا تھا۔ مگر ترکمان کی ہڈی تھی۔ اور باپ کے نمک حلال وفاداروں کی گودوں میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے ترکی خوب بولتا تھا +

یہ بھی سُن لو کہ تمہارے بزرگ انسان کو کسی زبان کا زبان داں اُسی وقت سمجھتے تھے کہ جب وہ اہل زبان کے ساتھ تحریر تقریر رہنے سہنے بیٹھنے اُٹھنے میں فقط کارروائی نہ کر سکے۔ بلکہ اُس فصاحت اور مہارت کے ساتھ گذران کرے جس طرح خود صاحب زبان بولتے ہیں۔ یہ نہیں کہ نواب بہادر عربی جانتے ہیں۔ مرزا جکم طیّب؟ الحمد للہ کیف حالکم؟ وانت طیّب؟ چند اُلٹے سیدھے فقرے یاد کر لئے آئیں بائیں شائیں بتایا۔ اور زباں داں ہو گئے۔ صاحب آپ کے زبانیں جانتے ہیں۔ دل ۳۵۔ بات کرو تو ایک فقرہ صحیح نہیں بول سکتے۔ لکھواؤ تو ایک سطر ٹھیک نہیں لکھ سکتے۔ ایک صاحب نے ملتان کی زبان میں گفتگو کی کتاب بنائی۔ دو ہزار روپیہ انعام پائے۔ خود گفتگو سنو۔ تو دم بخود۔ ایک صاحب نے بلوچی زبان کی ایک کتاب بنائی۔ بات کرو تو دیدم ولے نہ گویم۔ اس زمانے کے لوگ اسے زباں دانی نہ سمجھتے تھے +

میرے دوستو اتالیق کی علمیّت کے ساتھ اتنا اور یاد رکھو۔ کہ وہ فقط پڑھا ہی نہ ہو۔ پڑھا بھی ہو اور گُنا بھی ہو۔ تم جانتے ہو! پڑھنا کیا ہے؟ اور گُنا کیا ہے۔ پڑھنا تو یہی ہے۔ کتابوں کے پٹھوں میں جو کاغذ سفید ہیں۔ اور اُن پر جو کچھ سیاہ لکھا ہے وہ پڑھ لیا۔ گُنا میں تمہیں کیا بتاؤں؟ وہ تو ایک ایسی شے ہے۔ کہ اس کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ ع۔ ملّا شدن چہ آسان آدم شدن چہ مشکل

اچھا۔ مَیں بے گُنے لوگوں کے کچھ پتے دیتا ہوں۔ انہیں سمجھ لو۔ گُنے کو تم آپ پہچان لو گے۔ دیکھ لو بے گُنے لوگ یہی ہیں۔ جنہیں تم دیکھتے ہو۔ کہ کتابیں ورق کے ورق پڑھے جاتے ہیں۔ ایک بچارے کو چھینک آئی۔ کہہ دیا کافر۔ کھانا کھا کر ڈکار لی۔ کہہ دیا کافر۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایمان کیا ہوا کچّا سوت ہوا۔ کہ ٹھیس لگی ٹوٹ گیا۔ ایسا اتالیق ہو۔ تو ایک ہفتہ میں سارا ملک صاف ہے۔ اُستاد رہے شاگرد رہے۔ باقی اللہ اللہ +

شاہان گذشتہ اور امرائے سلف علوم کے ذیل میں علم اخلاق۔ تاریخ دانی ہیئت نجوم۔ رمل۔ شاعری۔ انشا پردازی۔ خوشنویسی۔ مصوّری وغیرہ وغیرہ فنون کے اجزا کامل

سمجھ کر بڑی کوشش سے حاصل کرتے تھے۔ اور جو لوگ ان باتوں میں کمال رکھتے تھے۔ اُن کی عزّت و توقیر کرتے تھے۔ خود بھی ان باتوں میں کمال یا اچھی مداخلت پیدا کرتے تھے تاکہ بھلے بُرے کو پرکھ سکیں۔ شہسواری۔ تیراندازی۔ نیزہ بازی۔ شمشیر زنی وغیرہ وغیرہ فنون سپاہ گری میں اعلےٰ درجہ کی مشق پیدا کرتے تھے۔ صید افگنی کو ذریعۂ مشق رکھا تھا۔ مگر یہ ہنر اکبر ہی کے وقت تک کار آمد رہے کیونکہ وہی تھا۔ جو یلغار کر کے فوج لے جاتا تھا اور دفعتہً دشمن کی چھاتی پر جا کھڑا ہوتا تھا میدان جنگ میں خود کھڑے ہو کر فوج کو لڑاتا تھا۔ اور آپ تلوار پکڑ کر حملہ کرتا تھا۔ گھوڑا دریا میں ڈالتا تھا اور اُتر جاتا تھا۔ پھر کوئی بادشاہ اس طرح نہیں لڑا۔ آرام طلب ہو گئے خوشامدی کہتے ہیں۔ حضور آپ کا اقبال مار لیگا۔ حضور بیٹھے خوش ہو رہے ہیں کچھ شک نہیں۔ کہ شکار اور فنون مذکورہ جب تک اُس غرض سے ہیں تب تک ہنر یا کمال جو کہو درست۔ یہ نہ ہو تو وہی عالمگیر کا قول۔ شکار کار بیکارانست+

علم مجلس کہ جزئیات مذکورہ کی معلومات کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اُس کا جزوِ اعظم فصاحت کلام اور حسن تدبیر ہے۔ اور وہ ایک خدادا امر ہے۔ جسے خدا دے۔ ایک عالم فاضل آدمی ایک مطلب کو بیان کرتا ہے۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ کہ کیا کہا۔ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی کسی دربار یا جلسہ میں اس طرح بات کہتا ہے کہ بے علم نوکروں تک کے کان بھی اِدھر ہی لگ جاتے ہیں+

سب سے بڑھ کر یہ کہ وقت اور موقع کلام کو پہچانے۔ آنکھوں کے رستہ دل میں اُتر جائے۔ ہر ایک کی طبیعت کا انداز پائے۔ اس کے بموجب اپنے مطالب کو لباس تقریر پہنائے۔ اور رنگ بیان چڑھائے۔ غلام ہوں اُن صاحب کمال سحر بیانیوں کا کہ ایک بھرے جلسہ میں تقریر کر رہے ہیں۔ مختلف الرائے مختلف خیال مختلف مذہب کے لوگ بیٹھے ہیں۔ مگر اُن کی تقریر کا ایک نقطہ بھی کسی دل پر ناگوار ہو کر نہیں کھٹکتا۔ ایک خوانچے والے کا لڑکا یا ایک جلاہے کا بیٹا مسجد میں رہکر عالم فاضل ہو گیا۔ یا کالج میں پڑھ کر بی اے۔ ایم اے ہو گیا تو ہؤا کرے۔ مقاصد مذکورۂ بالا اور علم مجلس اور آداب محفل کی اُس غریب کو کیا خبر۔ وہ آپ ہی نہیں جانتا۔ شاگرد کو کیا سکھائے۔ دربلدوں سرکاروں کی ڈیوڑھی تک اس کے باپ دادا کو جانا

نصیب نہیں ہوا - وہ بچارا وہاں کی باتیں کیا جانے - اور کہیں لکھا دیکھ کر یا سُن سُنا کر معلوم بھی کر لیا - تو کیا ہوتا ہے - یہ کہاں اور وہ لوگ کہاں! جو اسی دریا کی مچھلی تھے بزرگوں کے ساتھ تیر کر بڑے ہوئے تھے - ان کا دل کھلا ہُوا تھا - اُن کو وقت پر قواعد و آداب کے سوچنے کی ضرورت نہ تھی - اپنے موقع پر خود بخود اعضا میں وہی حرکت پیدا ہو جاتی تھی اب بھی نئے روشن ضمیر نو تعلیم یافتہ کہیں جا پہنچتے ہیں - تو سلام کرنا بھی نہیں آتا - میرے دوستو! اُن کے ہوش بجا نہیں رہتے - چلتے ہیں - قدم ٹھکانے نہیں پڑتا - اور نظر باز بھی وہیں کنارے کھڑے ہیں - بات بات کو پرکھ رہے ہیں کہ یہاں چوکا وہاں بھولا - یہ ٹھوکر کھائی - وہ گر پڑا - پھر صاف کہہ دیتے ہیں کہ مولوی صاحب خواہ بابو صاحب ٹکسال باہر ہیں - خیر اب نہ وہ دربار نہ وہ سرکار - جہاں ٹوٹا پھوٹا کارخانہ ہے - اُس کا رنگ بدلتا جاتا ہے - خوب ہُوا - خدا نے سب کا پردہ رکھ لیا ◆

دیکھنے کے قابل یہ امر ہے - کہ ہونہار نوجوان نے اپنے علوم و فنون - اوصاف کمالات - آداب و اخلاق - عادات و اطوار - متانت و سخاوت سے ایسے ہی عمدہ نقش بادشاہ کے دل پر بٹھائے ہوں گے - کہ بڑے بڑے کہن سال کارگذار امیر موجود تھے - اُن کے ہوتے ولی عہد کی اتالیقی کے لئے اس پر صاد کیا - غرض جب منصب جلیل عطا ہُوا تو اس نے بہ ادائے شکرانہ جشن شاہانہ کا سامان کیا - اور رونق افروزی کے لئے بادشاہ کی خدمت میں التجا کی - بادشاہ تشریف لے گئے - مینہ کو برسنا - دریا کو بہاؤ اور بیرم خاں کے بیٹے کو دریا دلی کون سکھائے - قلعہ سے لے کر اپنے گھر تک سونے چاندی کے پھول لٹائے - گھر قریب رہا - تو موتی برسائے - پا انداز میں مخمل و زربفت بچھائے - گھر میں سوا لاکھ روپیہ کا چبوترہ بنایا - اُس پر بادشاہ کو بٹھا کر نذر دی - وہاں سے اُٹھا کر دوسری بارگاہ میں لے گیا - چبوترہ لٹوا دیا - جواہر اور موتی نثار کئے - امرائے تو ہے پیشکش میں جواہرات ملبوسات اسلحہ کہ خزائن سلطانی میں رکھنے کے قابل تھے - عمدہ ہاتھی اصیل گھوڑے کہ بادشاہی کارخانوں کی زینت تھے پیشکش گذرانے - اور امرائے دربار کو بھی حسب مراتب عجائب غرائب تحفوں سے خوش کیا - اور خوش ہُوا - مگر اصل خوشی کی کیفیت ان بڈھے رفیقوں سے پوچھنی چاہئے - جو آج کی اُمید پر زندگی کا دامن پکڑے چلے آتے تھے - تلخ جائے کی پیالیاں اور پھیکے شربت پیتے تھے - اور دُعائیں کر کے جیتے تھے -

لیکن اُن کہن سال بڑھیوں کی خوشی کسی عبارت میں ادا نہیں ہو سکتی جنہیں نہ دن کو آرام تھا۔ نہ رات کو نیند تھی۔ جب گھر میں اکبری دربار لگا ہو گا۔ تو اُن کا کیا حال ہؤا ہو گا۔ شکر کے سجدے میں پڑی ہوں گی۔ اور خوشی کے آنسو جاری ہوں گے۔ اور حق پوچھو تو اس سے زیادہ خوشی کی جگہ کیا ہو گی۔ سوکھی نہر میں پانی آیا۔ برباد چمن آباد ہؤا۔ ویران کھیت ہرا ہؤا۔ جس گھر میں دھندلے چراغ جلتے تھے۔ سورج نِکل آیا +

مرزا خاں کی جوہر لیاقت کا چشمہ جو مدت سے بند پڑا تھا ۹۹۱ھ میں فوارہ ہو کر اُچھلا۔ صورت حال یہ ہوئی کہ اکبر کا جی یہ چاہتا تھا کہ قلمرو ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک میرا سکہ چلے۔ فتح گجرات کے بعد اعتماد خاں ایک پرانا سردار سلطان محمود گجراتی کا نمک خوار اُس سے الگ ہو کر اکبری امرا میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ بادشاہ کے خیالات کو اُدھر متوجہ کرتا تھا۔ ان دنوں میں موقع دیکھ کر بعض امرا کو اپنے ساتھ ہمداستان کیا۔ اور بہت سی صورتیں بیان کیں جس میں ملک مذکور کی آمدنی بڑھے۔ اخراجات میں کفایت ہو۔ اور سرحد آگے کو سرکے۔ ۹۹۱ھ میں اس نے موقع دیکھ کر پھر عرض معروض کی۔ اور بعض امرا کو اپنے ساتھ ہمداستان کیا۔ اکبر نے اُسے ملک مذکور کا واقف حال دیکھ کر مناسب سمجھا کہ شہاب الدین احمد خاں کو گجرات سے بلالے اور اُسے صوبہ کر کے بھیجے +

وہاں کی حقیقت سُنو کہ معاملہ پیچ در پیچ ہو رہا تھا۔ یاد کرو گجرات پر اکبر کی یلغار ابراہیم حسین مرزا وغیرہ تیموری شاہزادوں کی جڑ اکھیڑ چکی تھی۔ مگر گلے سڑے رگ و ریشے زمین میں باقی تھے۔ بہت سے بلخی۔ بدخشی ہزاروں ماوراء النہری ترک اُن کے نام لیوا جیتے تھے۔ جب اکبری انتظاموں کا استقلال دیکھا تو تلواریں جنگلوں میں چھپا کر بیٹھ گئے تھے۔ جو سردار ادھر سے جاتا۔ ہیر پھیر دے کر اُس کے وابستوں کے ساتھ نوکری کر لیتے تھے۔ مگر فکر کے چوہے دوڑاتے تھے۔ اور دل میں دُعائیں مانگتے تھے + ع

خدا شرّے برانگیزد کہ خیر ما درآں باشد

شہاب الدین احمد خاں جب پہنچا تھا تو اُسے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ یہ مفسد حاکم سابق (وزیر خاں) کے انتظام کو بھی بگاڑا چاہتے تھے۔ اور اب بھی اُسی تاک میں ہیں۔ یہ سردار پرانا سپاہی تھا۔ سرگروہوں کو دریافت کیا۔ اور فوج۔ تھانے۔ تحصیل میں پھر کر ہر ایک کو کام میں لگا دیا۔ غرض اس حکمت عملی سے اُن کے جتھے اور زور کو توڑ لیا تھا۔

جب بادشاہ کو خبر پہنچی تو حکم بھیجا۔ کہ ان لوگوں کو ہرگز جمنے نہ دو۔ اور اپنے معتمد اور وفادار آدمیوں سے کام لو ✦

بڈھے سردار نے اس انتظام کا موقع نہ پایا۔ وقت ٹالتا رہا۔ بلکہ اُن کے منصب اور علاقے بڑھا کر دلاسے سے کام لیتا رہا۔ اعتماد خاں پہنچا تو اکبری ارادوں اور نئے انتظاموں کے سُر اُن کے کان میں پہنچ لئے تھے۔ فتنہ گروں نے ارادہ کیا کہ شہاب الدین احمد خاں کا کام تمام کیجئے۔ اعتماد خاں تازہ وارد ہوگا مظفر گجراتی سلطان محمود کا بیٹا جو گمنامی کے ویرانوں میں بیٹھا ہے اُسے بادشاہ بنائینگے ✦

اُنہیں میں سے ایک مفسد نے آکر ادھر بھی خبر دی۔ شہاب کا رنگ اُڑ گیا۔ مگر حکم بادشاہی سے وہ بھی دل شکستہ ہو رہا تھا۔ اس لئے نہ تحقیقات کی نہ بندوبست کیا۔ ان لوگوں کو کہلا بھیجا۔ کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ ان کی عین مراد تھی۔ جھٹ نکلے اور اپنے پرانے پرگنوں میں پہنچ کر اور مفسدوں کو جمع کرنے لگے۔ ساتھ ہی مظفر کو چٹھیاں دوڑائیں بعض مفسد شہاب میں پانی کی طرح مل گئے۔ اور بڈھے سے قسمیں لیں۔ کہ دربار کو جائے تو ہمیں ساتھ لیتا جائے۔ اندر اندر اَوروں کو بہکاتے تھے۔ اور رفیقوں کو یہاں کی خبریں پہنچاتے تھے۔ سرگروہ ان کا میر عابد تھا ✦

فلک کا قاعدہ ہے۔ کہ زمانہ میں جن لوگوں کو بڑھانا ہے۔ اور جن باتوں کو اُن کے بڑھنے کا سامان کرتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ایسا موقع لاتا ہے۔ کہ اُنہیں گھٹاتا ہے۔ اور جن باتوں کو اس وقت بڑھانے کی سیڑھی بنایا تھا۔ اُنہی باتوں کو نمونۂ بے دانشی کر کے گھٹاتا ہے۔ اور جن لوگوں کو اس وقت وہ پامال کر کے چڑھے بڑھے تھے۔ اُنہی کو یا اُن کے بچّوں کو اُن سے آگے بڑھاتا ہے۔ تمہیں یاد ہے وہ وقت کہ **بیرم خاں** جیسے کوہِ دانش کو ایک بُڑھیا اتا اور اُنہی اتا والوں کے ہاتھ سے کس طرح توڑا۔ وہ سب اسی سال میں فنا ہو گئے۔ یہی ایک رقم باقی رہی تھی۔ کہ **شہاب خاں** سے **شہاب الدین احمد خاں** ہو کر پنجہزاری منصب تک پہنچ گئے۔ اور اکثر مہموں کی سپہ سالاری کر چکے۔ اب تماشے دیکھو۔ اسی **بیرم خاں** کے بیٹے کے سامنے شہاب کو کس طرح پانی پانی کرتا ہے ✦

آزاد تو پرانی لکیروں کا فقیر ہے۔ بڈھوں کی باتیں یاد کرتا ہے۔ اور وجد کرتا ہے کہا کرتے تھے جامیاں جیسا کرے اپنی اولاد کے آگے پائے۔ خیر اب **بیرم خاں** کی

نیک نیتی کہو۔ خواہ **مرزا خاں** کا زور اقبال۔ شہاب کی دانائی اُسے لڑکوں کے سامنے بیوقوف بناتی ہے ✦

اعتماد خاں اور خواجہ نظام الدینؒ جو دربار سے گئے تھے۔ پٹن میں پہنچے۔ شہاب کا وکیل آیا ہوا تھا۔ اُنہوں نے اپنا وکیل ساتھ کیا۔ دربار سے اسپ و خلعت اور فرمان رخصت جو لے کر گئے تھے بھیجا۔ شہاب خاں استقبال کو کئی کوس آگے گئے۔ فرمان کو سر پر رکھا۔ اُٹھے بیٹھے۔ آداب بجالائے۔ پڑھا اور اُسی وقت کُنجیاں سپرد کر دیں۔ اپنے تھانے جو اطراف کے قلعوں پر بٹھائے تھے۔ اُٹھوا منگائے۔ نئے اور پُرانے تقریباً ۸ قلعے تھے۔ کہ اکثر خود تعمیر اور اکثر مرمت کر کے درست کئے تھے۔ فساد تو یہیں سے شروع ہو گیا۔ کہ تھانوں کے اُٹھتے ہی کولی اور گراس اُدھر کی وحشی قومیں اُٹھ کھڑی ہوئیں اور اکثر قلعوں کو ویران کر کے تمام ملک میں لُوٹ مچادی ✦

شہاب **پروان** کے قلعہ سے نکل کر **عثمان پور** (ایک محلہ کنار شہر پر ہے) اُس میں آگئے۔ اعتماد خاں شاہ ابوتراب۔ خواجہ نظام الدین احمد خوشی خوشی قلعہ میں داخل ہوئے۔ میر عابد نمک حرام کہ شہاب کے پاس ملازم تھا۔ پانسو کی جمعیت لے کر الگ جا پڑا۔ اعتماد خاں کو پیام بھیجا کہ ہم بے سامان ہیں۔ شہاب کے ساتھ نہیں جا سکتے جو اُنہوں نے جاگیر[2] دی تھی وہ بحال رکھئے۔ تو خدمت کو حاضر ہیں۔ ورنہ خلق خدا ملک خدا ہم رخصت۔ اعتماد خاں کے کان کھڑے ہوئے۔ مگر نہ سوچا نہ سمجھا۔ کہلا بھیجا۔ کہ بے حکم وہ جاگیریں تنخواہ نہیں ہو سکتیں۔ ہاں مَیں اپنی طرف سے رعایت کرونگا۔ انہیں تو بہانہ چاہیئے تھا۔ صاف اپنے یاروں میں جا ملے۔ ہنگامہ اور بھی گرم ہؤا ✦

اعتماد خاں کو جو فوج دربار سے ملی تھی۔ وہ ابھی نہ آئی تھی۔ سوچا کہ شہاب کو ان فتنہ انگیزوں سے لڑا کر رنگ جمائے۔ شاہ اور خواجہ کے ہاتھ پیغام بھیجا۔ کہ تمہارے نوکروں نے فساد کیا ہے۔ تم ابھی جانے میں توقف کرو۔ اور ان کا بند و بست کرو۔ حضور میں اس کا جواب تمہیں لکھنا ہوگا۔ اُس نے کہا کہ یہ مفسد تو اس دن کی دعائیں کر رہے تھے۔ اور

---

[1] مصنف طبقات اکبری

[2] اس عہد میں علاقے جاگیر کے طور پر مل جایا کرتے تھے۔ کہ سردار اپنے اخراجات اور اپنی فوج کی تنخواہ وہاں سے وصول کر لیا کرتے تھے ✦

میرے قتل کے درپے تھے۔ کام اصلاح سے گذر چکا ہے۔ مجھ سے کیا ہو سکتا ہے تم جانو اور یہ۔ مگر اس طرح ملک داری کے کام نہیں چلتے۔ ان لوگوں کو جاگیر دے کر پرچاؤ۔ اور یہ نہیں تو ابھی مفسدوں کی جمعیت تھوڑی ہے۔ بلوا عام نہیں ہوا۔ ملکی اور جنگلی لوگ ہیں۔ کوئی سردار معتبر بھی ابھی ان میں نہیں پہنچا۔ اپنے اور میرے آدمی بھیجو کہ دفعتہً جا پڑیں۔ اور تتر بتر کر دیں۔ اعتماد خاں نے کہا۔ کہ تم شہر میں آ جاؤ۔ پھر جو صلاح ہو گی سو ہو گا۔ یہ بھی شہاب الدین احمد خاں تھے۔ بچہ نہ تھے۔ ماہم کے دودھ کی دھاریں دیکھی تھیں۔ کہا کہ میں نے خود قرض سے سامان سفر کیا ہے۔ فوج بدحال ہے۔ بدقت شہر سے نکلا ہوں۔ پھر کر آنا وقت پر وقت ہے۔ غرض حیلے حوالے بتا دیئے۔ اعتماد خاں نے کہا۔ کہ تم شہر میں چلے جاؤ۔ خزانہ سے مدد خرچ میں دونگا۔ کئی دن مہم کی اونچ نیچ۔ جواب سوال اور رقم کی مقدار مشخص کرنے میں گذر گئے۔

شہاب تاڑ گئے۔ کہ یہ دکنی سردار پرانا سپاہی ہے۔ باتوں باتوں میں کام نکالنا چاہتا ہے۔ کہ جب تک اس کی فوج آئے۔ مجھے اور میرے آدمیوں کو یہاں روک کر اپنی جمعیت اور حیثیت بنائے رکھے۔ جب وہ آ گئے۔ تو مجھے سربصحرا چھوڑ دیگا۔ اس کی نیت نیک ہوتی تو پہلے ہی دن روپیہ کا سرانجام کرتا۔ اور میرے لشکر کا سامان درست کر کے مہم کو سنبھال لیتا۔ غرض شہاب میدان احمد آباد سے کوچ کر کے کڑی میں جا پڑے کہ بیس کوس ہے۔ مفسد ماتر میں پڑے تھے۔ فوراً کاٹھیواڑہ پر پہنچے۔ سلطان محمود گجراتی کا بیٹا مظفر کاٹھیواڑہ میں آ کر اپنی سسرال میں چھپا بیٹھا تھا۔ اُسے سب روئداد سنا کر باغ سبز دکھایا۔ اُس کے باپ دادا کا ملک تھا۔ اُسے اس سے زیادہ موقع کیا چاہئے تھا۔ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ دیس کے چند مفسد گروہوں کو بھی ساتھ لیا۔ ۱۵ سو کے قریب کاٹھی لٹیرے ساتھ ہو گئے۔ اور اس طرح آئے کہ **دولقہ** میں آ کر دم لیا۔ سوچ میں تھے۔ کہ شہاب جو دربار کو چلا ہے اُس پر شبخون ماریں۔ یا اور کسی آباد شہر کو جا لوٹیں۔ اعتماد خاں بڈھا سپاہی اور اسی ملک کا سردار تھا مگر اُس کی عقل پر پردہ پڑ گیا۔ اُس نے جب سُنا کہ مظفر دولقہ میں آن پہنچا۔ تو ہوش اُڑ گئے۔ بیٹے اور دو تین سرداروں کو احمد آباد میں چھوڑا۔ اور کہا کہ میں خود جا کر شہاب کو لاتا ہوں۔ ہر چند اہل صلاح نے کہا کہ غنیم بارہ کوس پر پڑا ہے۔ اٹھارہ کوس جانا اور

شہر کو اس طرح پر چھوڑ دینا مناسب نہیں۔ بڈھے نے نہ سُنا۔ اور خواجہ نظام الدین کو لے کر روانہ ہوا۔ اُس کے نکلتے ہی بدمعاشوں نے اُدھر خبر پہنچائی۔ غنیم جو کہ خود حیران تھا کہ کدھر جائے۔ جھٹ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور سیدھا احمد آباد پر آیا۔ قدم قدم پر سینکڑوں لٹیرے ساتھ ہوتے گئے۔ سرگنج شہر سے تین کوس ہے۔ جب وہ یہاں پہنچا۔ تو چند مجاوروں نے سلاطین باطن کے درباروں سے اُٹھ کر ایک پھولوں کا چتر سجایا۔ اور لے کر سامنے ہوئے۔ وہ نیک شگون نیک فال کے ساتھ گولی کی چوٹ شہر میں داخل ہوا۔ پہلوان علی سیستانی کوتوال تھا۔ آتے ہی اسے پچھاڑ کر قربانی کیا۔ شہر میں قیامت مچ گئی۔ بادشاہی سرداروں میں کیا دم تھا۔ جان کو لے کر بھاگنا فتح سمجھے۔ شہر لاوارث رہ گیا۔ اہل فساد نے لوٹ مار شروع کر دی۔ گھر اور بازار زر و جواہر اور مال و دولت سے بھرے ہوئے تھے۔ پل کی پل میں لُٹ کر صاف ہو گئے ✦

ادھر اعتماد خاں نے شہاب کے پاس جا کر اس عہد کا رنگ جمایا۔ کہ دو لاکھ روپیہ نقد مجھ سے لو اور جو پرگنے جاگیر میں تھے۔ وہ جاگیر میں رکھو اور احمد آباد کو چلو۔ وہ قسمت کا مارا راضی ہو گیا۔ اور دونوں بڈھے ساتھ ہی روانہ ہوئے ✦

کہ ہر دو را دو مربی خوب مے باید	من و مربی من ہر دو آنچناں معذور

شہاب کو اپنے نوکروں کا حال معلوم تھا۔ رات کو قرآن بیچ میں رکھے۔ قول و قسم۔ بے ایمانوں کو مضبوط کیا۔ اور روانہ ہوئے۔ تھوڑی ہی دُور آگے بڑھے تھے کہ شہر کے بھگوڑے ملے جو خاک وہاں اُڑا کر آئے تھے چہروں پر نمودار تھی۔ سُنتے ہی دونوں بڈھوں کے رنگ ہوا ہو گئے۔ آگے پیچھے کے سردار اکٹھے ہوئے۔ خواجہ نظام الدین نے کہا۔ کہ گھوڑے اُٹھاؤ۔ شہر پر جا پڑو۔ اور دم نہ لو۔ اگر غنیم نکل کر سامنے ہو۔ تو لڑ مرو۔ یا قسمت یا نصیب قلعہ بند ہو کر بیٹھا تو محاصرہ ڈال دو۔ اعتماد خاں کی فوج بھی آتی ہے۔ جیسا ہو گا دیکھا جائیگا۔ مگر شہاب تو گھر کو پھرا تھا۔ دِل اُچاٹ تھا۔ لشکر کے اہل و عیال ساتھ تھے۔ غلطی یہ تھی۔ کہ ادھر مڑا تو بھی ان کے کچّے ساتھ کو کڑی میں نہ چھوڑا۔ غرض مارا مار شہر کے پاس پہنچے۔ اور اہل لشکر عثمان پور آ کر ڈیرے ڈالنے لگے۔ کہ بال بچّوں کو بٹھائیں۔ اُس وقت بھی نظام الدین احمد وغیرہ ہمت والوں نے کہا۔ کہ باگیں اُٹھائے شہر میں دھنس جاؤ۔

لہ شہر میں رہ گر دروازہ سے داخل ہوا تھا۔ جو اُس زمانے میں کسی دروازے کا نام تھا ✦

آسان کام کو دشوار نہ کرو۔ بڈھوں نے نہ مانا +

غنیم کو ان کے آنے کی خبر لگ چکی تھی۔ خاطر جمع سے سامان جنگ کر کے باہر نکلا۔ اور دریا کے کنارے فوج کا قلعہ باندھ کر سد سکندر ہو گیا۔ فوج اہل و عیال اسباب و مال سنبھال رہی تھی کہ لڑائی شروع ہو گئی۔ شہاب آٹھ سو سپاہی کو لے کر ایک بلندی پر جمے۔ اور فوج کو آگے بڑھایا۔ فوج نے حق نمک ادا کیا۔ مگر سرداروں نے نمک حرامی کی۔ جو نمک حلال تھے۔ وہ حلال ہو گئے۔ شہاب کی نوبت آ گئی۔ ہمراہی بھاگے ان کا گھوڑا گولی سے چھدا۔ فقط بھائی بند گرد رہ گئے۔ دشمن کا ہجوم دیکھ کر ایک جاں نثار نے باگ پکڑ کر کھینچی۔ انہوں نے بھی غنیمت سمجھا۔ اور بھاگے۔ اپنے ہی نوکروں میں سے ایک نمک حرام نے پشت پر تلوار ماری۔ الحمدللہ کہ ہاتھ اوچھا پڑا۔ ایسے بھاگے کہ پٹن (نہروالا) پچاس کوس ہے۔ ایک دن میں پہنچ کر وہاں دم لیا +

کاٹھی اور کولی اور جنگلی لٹیرے لوٹ کے واسطے غنیم کے ساتھ ہوئے تھے۔ ٹڈیوں کی طرح امڈ پڑے اور تمام لشکر کو چاٹ کر ایک دم میں صاف کر دیا۔ نقد جنس ہاتھی۔ گھوڑے اتنے لٹے کہ محاسب کے حساب سے باہر ہے۔ سپاہ کے عیال کی خرابی خود خیال کر لو کہ بچاروں پر کیا گذری ہو گی +

ظفریاب مظفر فتح کے گھوڑے پر سوار موچھوں کو تاؤ دیتے شہر کو پھرے شہاب کے نمک حرام سرخرو ہو کر اب ان کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ انہوں نے سامان سلطانی موجود دیکھ کر دربار قائم کر دیا۔ اور سب کو بادشاہی خطاب عنایت کئے۔ جامع مسجد میں خطبہ پڑھا گیا۔ اور پرانے سردار جو نحوست کے گوشوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ انہیں بلا بھیجا۔ سب سنتے ہی دوڑ پڑے۔ غرض جنگلوں کے لٹیرے مفلس محتاج۔ ملک کے پرانے سپاہی بخاری و ماوراءالنہری کہ تیموری شہزادوں کی کھرچن تھے۔ دو ہفتہ کے اندر اندر چودہ ہزار فوج کی جمعیت گرد جمع ہو گئی۔ مگر مظفر کو باوجود اس فتح کے قطب الدین خاں کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ اس لئے کچھ سرداروں کو یہاں چھوڑا۔ اور آپ بڑودہ کی طرف فوج لے کر چلا کہ وہ وہیں تھا۔ ادھر دربار سے اعتماد خاں کی فوج بھی آن پہنچی۔ شہاب وغیرہ پٹن میں پٹے گٹے پڑے تھے۔ اب اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسی کو مضبوط کر کے یہیں بیٹھ گئے +

شہاب اور اعتماد قطب الدین خاں کو برابر لکھ رہے تھے۔ کہ تم اُدھر سے آؤ۔ ہم اِدھر سے چلتے ہیں۔ بغاوت نئی ہے اس کا دبا لینا کچھ بڑی بات نہیں۔ وہ پنجہزاری سردار پرانا سپہ سالار کہ دونوں بڈھے بھی اُسے یگانہ روزگار سمجھتے تھے۔ دُور سے بیٹھا بیٹھا ٹال رہا تھا۔ جب دربار سے فرمان عتاب پہنچا تو قطب جگہ سے ہلا۔ اور اب سپاہ کو تنخواہ دے کر دلداری کرنے لگا۔ جب کہ وقت گذر چکا تھا۔ چھاؤنی سے بڑودہ تک پہنچا تھا۔ کہ مظفر نے آن لیا۔ لڑائی ہوئی۔ نیم جاں کی طرح ہاتھ پاؤں مار کر قلعہ بڑودہ کے کھنڈر میں دبک گیا۔ فوج اور سردار مظفر کے ساتھ ہو گئے۔ اور دولت و اموال کا تو کیا پوچھنا ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو۔ یہ وہی مظفر ہے۔ کہ تیس روپیہ مہینہ پر آگرہ میں پڑا تھا۔ یہاں سے ایک ناک اور دو کان لے کر بھاگا۔ آج تیس ہزار لشکر لئے باپ کے ملک کا مالک ہے۔

اب اِدھر کی سُنو۔ کہ مظفر تو اُدھر آگیا۔ شیر خاں فولادی اس کے سردار نے کہا۔ مجھے بھی تو اپنا لوہا دکھانا چاہئے۔ وہ فوج لے کر پٹن کو چلا۔ کہ امرائے شاہی کو جوہر دکھائے۔ آپ پٹن پر آیا۔ اور کچھ فوج کڑی پر بھیجی۔ خواجہ نے دل کڑا کر کے بادشاہی فوج کو نکالا۔ اور جو فوج کڑی پر چڑھی آتی تھی۔ فوراً اُسے جا مارا۔ اب شیر خاں کے مقابلہ کا موقع آیا۔ بڈھے سرداروں پر ایسی نامردی چھائی تھی کہ گھبرا کر بولے بہتر ہے کہ پٹن سے جالور کو ہٹ چلیں۔ خواجہ نظام الدین باوجودیکہ نوجوان سپاہی تھا۔ اُس نے مردوا بنا کر روکا۔ اور آپ فوج لے کر مقابلہ پر ہوا۔ سامنے ہوتے ہی لڑائی دست و گریبان ہو گئی۔ دو ہی ہزار فوج تھی۔ مگر سب پُرانے پُرانے سپاہی تھے۔ پانچ ہزار کے مقابلہ پر بڑھ کر میانہ پہنچا۔ نوجوان سپاہی زادہ نے بڑا ساکھا کیا۔ کشت و خون عظیم ہوا۔ کھیت کاٹ کر ڈال دیا۔ اور لڑائی ماری۔ شیر نوک دُم گجرات کو بھاگا۔ بادشاہی فوج کو لُوٹ اچھی ہاتھ آئی۔ ذرا آنسو پُچھ گئے۔ گٹھڑیاں باندھ باندھ کر دوڑے کہ پٹن میں رکھ آئیں۔ خواجہ ہر چند کہتا رہا کہ اب موقع ہے اور گجرات خالی ہے۔ باگیں اُٹھائے چلے چلو کسی نے نہ سُنا۔ بچارہ ۱۲ دن وہیں پڑا رہا۔ اتنے میں سُنا کہ مظفر نے بڑودہ مار لیا۔

جہاں کی بھی سنئے۔ کہ قلعہ بڑودہ جو قطب الدین کی عقل سے بھی بودا تھا مظفر نے گھیر لیا۔ اور توپیں مارنی شروع کر دیں۔ آج کی پرانی دیواریں مظفر کے عہد اور قطب کی

ہمت سے سوا بے بنیاد تھیں۔ فرش زمین ہو گئیں۔ مگر قطب کا قلعہ عمر اُس سے بھی گیا گذرا تھا۔ اُس بڈھے بے وقوف نے زین الدین اپنے معتبر کو قول و قرار کے لئے بھیجا۔ باوجودیکہ ایلچی کو کہیں زوال نہیں مظفر نے اُسے دیکھتے ہی ہزار سالہ مُردوں میں ملا دیا۔ قطب کا ستارہ ایسا چکر میں آیا تھا کہ اب بھی نہ سمجھا۔ پیغام سلام میں عہد و پیمان ہوا۔ کہ مَیں مکّہ میں چلا جاؤنگا۔ مجھے عیال و مال سمیت یہاں سے نکل جانے دو۔ اتنا بڑا سردار اس بدحالی اور بے ہمتی سے غنیم کے دربار میں حاضر ہوا۔ بعجز تمام جُھک جُھک کر تسلیمات بجالایا +

قضا شخصیت پنج انگشت دارد دو بر چشمش نہد دیگر دو بر گوش	چو خواہد کز یکے کارے برآرد یکے بر لب نہد گوید کہ خاموش

آخر پنج ہزاری سردار بادشاہی تھا۔ پشتوں کا خدمت گذار تھا۔ شہزادوں کا اتالیق رہ چکا تھا۔ مظفر نے ملاقات کے وقت بڑی تعظیم کی۔ اُٹھا اور استقبال کر کے مسند تکیہ پر جگہ دی۔ باتوں سے آنسو پونچھے۔ مگر ہاتھوں سے خون بہایا۔ کہ دامن خاک کے نیچے اپنے دفائن قارونی کا پیوند ہو گیا۔ ۱۴ لاکھ روپیہ اُس کے ساتھ تھا۔ وہ لے لیا۔ خزانچی اُس کی حکومت گاہ پر گیا۔ دس کروڑ سے زیادہ گڑے ہوئے تھے۔ وہ بھی نکال لائے۔ نقد و جنس۔ مال و دولت کا کیا ٹھکانا ہے۔ اور لطف یہ ہے۔ کہ چار ہزاری و پنج ہزاری بڑے بڑے سپہ سالار اُمرا مثلاً قلیچ خاں اور شریف خاں اپنا بھائی جاگیردار مالوہ۔ خاص نورنگ خاں بیٹا سلطان پور پار میں اور پاس پاس کے اضلاع میں بیٹھے تھے دُور سے تماشا دیکھا کئے +

ہم بحر غم میں بہ گئے اور دوست آشنا	سب دیکھتے رہے لب ساحل کھڑے ہوئے

مظفر کے ساتھ ترک۔ افغان۔ گجراتی ہزاروں کا لشکر ہو گیا۔ اور ایک تھے تو دس بلکہ دس ہزار ہو گئے۔ مگر علاقہ در علاقہ بھونچال پڑ گیا۔ خواجہ نظام الدین یہ سُن کر پٹن کو پھرے دربار میں آگے پیچھے خبر پہنچی۔ اور جو پہنچی ایسی ہی پہنچی۔ سب چُپ۔ بادشاہ کو بڑا رنج۔ دو دفعہ جس ملک کو آپ یلغار کر کے مارا۔ وہ اس رسوائی کے ساتھ ہاتھ سے گیا اکبر بادشاہ تھا۔ اور صاحب اقبال تھا۔ کچھ پروا نہ کی۔ اُمرائے دربار میں سے سادات بارہہ اکثر ایرانی دلاور اور سور ما راجپوت۔ راجہ اور ٹھاکر اس مہم کے لئے

نامزد کر کے لشکر جرار آراستہ کیا۔ اُس پر نوجوان مرزا خاں کو جس کا اقبال بھی جوانی پر تھا سپہ سالار کیا۔ کار آزمودہ کہنہ عمل سردار فوجیں دے کر ساتھ کئے۔ قلیچ خاں کو فرمان ہو گیا کہ مالوہ پہنچو۔ اور وہاں سے امرا کو لے کر مہم میں شامل ہو۔ اضلاع دکن میں جو سردار تھے انہیں بھی زور شور سے احکام پہنچے کہ جلد میدان جنگ پر حاضر ہوں۔ مرزا خان اپنے رفقا کو لے کر مارا مار چلا۔ کوہ و بیابان۔ دریا اور میدان کو لپیٹتا لپیٹتا جالور کے رستے پٹن کو چلا جاتا تھا۔ مگر جو خبر پہنچتی تھی پریشان پہنچتی تھی۔ اس لئے قدم سوچ سمجھ کر اُٹھاتا تھا۔ قطب الدین خاں کی خبر سُنی۔ مگر فوج پر راز نہ کھولا۔ **آزاد۔** خیال تو ضرور آیا ہو گا کہ یہ وہی پٹن ہے۔ جہاں سے باپ نے ملک فنا کی منزل کو ایک قدم میں طے کیا تھا۔ حرم سرا پر کیا گذری ہو گی۔ میرا اُس وقت کیا حال ہو گا۔ اور یہ رستہ احمد آباد تک کس مصیبت سے کٹا ہو گا۔ یہاں سب عید کے چاند کی طرح اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے بعض سردار سروہی تک آگے آئے۔ اور سارے حالات سُنائے۔ بڑی بڑی مبارکبادیں ہوئیں وہ فقط دن بھر ٹھیرا۔ اور برق و باد کی طرح اُڑ کر پٹن پر ڈیرے ڈال دئے۔ امرا اور فوجیں استقبال کر کے لائے۔ مبارک بادیں ہوئیں۔ شادیانے بجے۔ اُن کی اور شہاب الدین احمد خاں کی موروثی محبتیں تھیں۔ مگر اس وقت سب بھول گئے۔ معلوم ہؤا کہ مظفر نے ظفر یاب ہو کر اور ہی دماغ پیدا کئے ہیں۔ پیچھے کا بندوبست محکم کئے بیٹھا ہے۔ اور خیمہ آگے ڈال کر لڑائی کو تیار ہے +

نوجوان سپہ سالار نے سرداروں کو جمع کر کے جلسہ کیا۔ بعض کی صلاح ہوئی۔ کہ اقبال اکبری پر تکیہ کر کے باگیں اُٹھاؤ۔ تلواریں کھینچو اور شہر میں جا پڑو۔ بعض کی رائے ہوئی۔ کہ قلیچ خاں مالوہ سے لشکر لے کر آتا ہے۔ اور حضور سے فرمان بھی آچکا ہے۔ کہ جب تک وہ نہ آئے جنگ نہ کر بیٹھنا۔ اُس کا انتظار واجب ہے۔ یہ گفتگو بھی آئی کہ موقع نازک ہے۔ یہ وقت وہ ہے۔ کہ حضور خود یلغار کر کے آئیں۔ تو سب کی سپاہگری کا پردہ رہتا ہے۔ ورنہ خدا جانے کیا انجام ہو۔ دولت خاں ایک بڈھا سردار تھا۔ اور وہ مرزا خاں کا سپہ سالار کہلاتا تھا۔ اُس نے کہا کہ حضور کا بُلانا بہت نازیبا ہے۔ اور قلیچ خاں کا انتظار تمہارے لئے مصلحت نہیں۔ وہ پرانا سپہ سالار ہے۔ اس کے سامنے فتح ہوئی تو تمہارے رفیق حصہ سے بھی محروم رہ جائینگے۔ اگر چاہتے ہو۔ کہ فتح کا ڈنکہ تمہارے

نام پر بجے تو یا قسمت یا نصیب لڑ مرو۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ بیرم خاں کے بیٹے ہو۔ جب تک آپ تلوار نہ مارو گے خان خاناں نہ ہو گے۔ اکیلے ہی فتح کرنی چاہیئے۔ اور گمنامی کے جینے سے ناموری کا مرنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ پُرانے پُرانے سپہ سالار ساتھ ہیں۔ سپاہ تیار ہے۔ سامان حاضر ہے اور چاہیئے کیا ہے +

مرزا خان بھی ایک چلتے پُرزے دربار اکبری کے تھے۔ ایک جھوٹ مُوٹ کی ہوائی اُڑائی۔ کہ دربار سے فرمان آتا ہے۔ اکبری آئین سے اُس کا استقبال ہوا۔ اور جلسہ عام میں پڑھا گیا مضمون یہ کہ ہم فلاں تاریخ یہاں سے سوار ہوئے۔ خود یلغار کر کے آتے ہیں۔ جب تک نہ پہنچیں لڑائی شروع نہ ہو۔ فرمان پڑھ کر مبارکبادوں کے شادیانے بجائے۔ اور تمام لشکر نے خوشیاں منائیں۔ دو دن تک توقف رہا۔ مگر دونوں طرف بہادر بڑھ بڑھ کر جوہر دکھاتے تھے۔ یہ دروغ مصلحت آمیز اگرچہ زبانی باتیں تھیں۔ مگر کم ہمتوں کی کمر بندھ گئی۔ اور ہمت والوں کے اور عالم ہو گئے۔ اُدھر دشمنوں کے جی چھوٹ گئے +

مرزا خان کے ڈیرے احمد آباد سے تین کوس سرکیچ پر تھے۔ اور مظفر شاہ بھیکن کے مزار پر تھا۔ یعنی دو کوس پر۔ وہ فوج مالوہ کی آمد آمد سُن کر چاہتا تھا۔ کہ پہلے ہی لڑ مرے شبخون مارا مگر ناکام رہا۔ مرزا خان نے پھر جلسہ کیا۔ اور صلاح یہی ٹھیری کہ جس طرح ہو لڑنا چاہیئے۔ چنانچہ رات کو چٹھیاں تقسیم ہو گئیں۔ ہر سردار پچھلے پہرہ سے اپنی اپنی فوج کو لیکر تیار ہو گیا۔ اعتماد خاں کو پٹن کی حفاظت پر چھوڑا تھا۔ عثمان پور کے دہانہ پر میدان جنگ ہوا۔ اُس وقت اُس کی فوج دس ہزار تھی۔ اور مظفر کی چالیس ہزار۔ دونوں لشکر صفیں باندھ کر سامنے ہوئے۔ مرزا خان نے دائیں بائیں۔ پس و پیش سے لشکر کی تقسیم کی۔ وہ بچپن سے اکبر کی رکاب کے ساتھ لگا پھرتا تھا۔ ایسا میدان اس کے لئے کچھ نئی جگہ نہ تھی۔ ہاتھیوں کی صف سامنے باندھی۔ خواجہ نظام الدین کو دو سرداروں کے ساتھ فوج دے کر الگ کیا۔ کہ سرکیچ کو داہنے پر چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤ۔ جب لڑائی ترازو ہو۔ تو غنیم کا پیچھا آن مارو +

غرض کہ لڑائی شروع ہوئی۔ اور مظفر نے پیشدستی کے قدم آگے بڑھائے۔ ادھر سے لڑائی کو ٹالتے تھے۔ حریف سر پر آیا۔ تو قدم بڑھائے۔ فوج ہراول نے باگیں بڑے

حوصلہ سے اُٹھائیں ۔ مگر بیچ میں کپڑے اُتار چڑھاؤ بہت تھے ۔ آگے کی فوج جو ہراول کے پیچھے تھی ۔ ایسی تیزی کے ساتھ پہنچی کہ جو ترتیب باندھی تھی وہ ٹوٹ گئی ۔ اور لشکر میں گھبراہٹ پڑی ۔ ہراول کے سردار تلواریں پکڑ کر خود آگے بڑھ گئے تھے ۔ کئی پُرانے نامور مارے گئے ۔ اور فوج اُلٹ پُلٹ ہو کر جدھر جس کا منہ اُٹھا اُدھر ہی جا پڑا ۔ جابجا میدان جنگ گرم ہوا ۔ نیا سپہ سالار تین سو جوان اُس کے گرد ۔ سو ہاتھی کی صف سامنے لئے کھڑا تھا ۔ اور نیرنگئے تقدیر کا تماشا دیکھ رہا تھا ۔ دل میں کہتا تھا ۔ کہ بیرم خاں کا بیٹا ! جائیگا تو کہاں ۔ مگر دیکھئے خدا اب کیا کرتا ہے ۔ ایسے وقت میں حکم کیا چل سکے ۔ کدھر سے روکے ۔ اور کدھر کو بڑھائے ۔ یا قسمت یا نصیب ۔ مظفر بھی پانچ چھ ہزار کا پرا جمائے سامنے کھڑا تھا ۔ مرزا خان نے دیکھا کہ غنیم کے غلبہ کے آثار ہونے لگے ۔ ایک جان نثار نے دوڑ کر اُس کی باگ پر ہاتھ ڈالا ۔ کہ گھسیٹ کرلے جائے ۔ یہ بے ہمتی کا ارادہ دیکھ کر مرزا سے نہ رہا گیا ۔ بے اختیار ہو کر گھوڑا اُٹھایا ۔ اور فیلبانوں کو بھی للکار کر کرنا میں آواز دی ۔ اُس کا گھوڑا اُٹھانا تھا ۔ کہ اقبال اکبری طلسمات دکھانے لگا ۔ آواز کرنا سے دلوں میں جوش پیدا ہوئے ۔ اور جابجا لشکر غنیم کو دھکیل کر آگے بڑھے ۔ تقدیر کی مدد یہ کہ ادھر سے اُنہوں نے حملہ کیا ۔ اُدھر خواجہ نظام الدین بھی ساتھ ہی مظفر کی پشت پر آن گرے ۔ غل ہوا کہ اکبر یلغار کر کے آیا ۔ کوئی سمجھا کہ قلیج خاں مالوہ کی فوج لے کر آن پہنچا ۔ مظفر ایسا گھبرایا ۔ کہ یکبار حواس جاتے رہے ۔ بھاگا اور ہمراہی اُس کے پیچھے پیچھے بھاگے ۔ غنیم کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں ۔ ہزاروں کا کھیت ہوا ۔ شمار کون کر سکتا تھا ۔ شام قریب تھی ۔ پیچھا کرنا مناسب نہ ہوا ۔ وہ معمور آباد کے رستے دریائے مہندری ریگستانوں میں نکل گیا ۔ اور تیس ہزار فوج کی بھیڑ بھاڑ گھڑیوں میں پریشان ہو گئی ۔ غنیمت بے شمار کہ مفت ماری تھی ۔ جن ہاتھوں کی تھی اُنہیں ہاتھوں دے گیا ۔ مرزا خان نے مفصل عرضی کی ۔ بادشاہ سجدات شکر درگاہ الٰہی میں بجالائے ۔ کہ ایک تو خدا نے ایسے موقع پر فتح دی ۔ دوسرے اپنے پالے ہوئے نوجوان کے ہاتھوں ۔ وہ بھی اپنے خان بابا کا بیٹا ۔

مرزا خان نے منت مانی تھی کہ خدا فتح دیگا تو سارا نقد و جنس ۔ مال متاع خیمہ خرگاہ اُونٹ ۔ گھوڑے ۔ ہاتھی غریب سپاہیوں کو اہل لشکر کو بانٹ دُوں گا ۔ کہ انہی کی بدولت خدا نے یہ دولت دی ہے ۔ چنانچہ اُس نیک نیت نے ایسا ہی کیا ۔

خاتمۂ سخاوت - ایک سپاہی ایسے وقت آیا - کہ کاغذوں پر دستخط کر رہا تھا - اُس وقت کچھ نہ رہا تھا - فقط قلمدان سامنے تھا - وہی اُٹھا کر دے دیا - کہ لے بھائی یہ تیری قسمت - خدا جانے چاندی کا تھا - سونے کا تھا - سادہ تھا یا مرصع - ملا صاحب پھر بھی خفا ہوتے ہیں - اور فرماتے ہیں کہ ایفائے وعدہ کے لئے چند ملازموں کو فرمایا کہ ان کی قیمت لگا دو - روپیہ بانٹ دینگے - مقومین[۱] ناامین حیلہ گراں بے دین تھے - چوتھائی پانچواں بلکہ دسواں بھی مول نہ لگایا - اور کچھ کچھ تو آپ ہی ہضم کر گئے - پھر فرماتے ہیں اُس کے بعض چپڑ قناتیوں نے مثلاً دولت خاں لودھی - ملا محمودی وغیرہ نے اُس سے عرض کی - کہ ہم آپ کے نوکر ہوئے ہیں - کچھ گناہ تو نہیں کیا ہے - کہ بادشاہی نوکروں کے نیچے ایسے دبے رہیں - اور وہ ہم سے اُونچے - تلواروں کے سامنے یہ کچھ ہم سے آگے نہیں نکل جاتے - پھر تسلیم اور آئین و آداب کورنش جو آپ کے سامنے بجا لاتے ہیں وہ کیوں نہ ادا کریں - یہ واہیات اور دلفریب باتیں مرزا خاں کو پسند آئیں (لیکن آخر بیرم خاں کا بیٹا تھا) خلعت گھوڑے سامان انعام بہت کچھ اُن کے دینے کو تیار کیا خود توشہ خانہ میں جا کر بیٹھا اور خواجہ نظام الدین (اب اُن کی دانش و دانائی کی ہوا بندھ گئی تھی) کو بُلا کر مشورۃً یہ راز کہا - ایک زمانہ میں خواجہ کی بہن بیرم خاں کے نکاح میں تھی - اُس نے کہا - کہ مَیں جانتا ہُوں یہ تمہارے نوکروں کی بدنفسی ہے - تمہارا خیال نہیں - مگر یہ کہو کہ حضور سُنینگے تو کیا کہینگے - اور فرض کیا کہ اُنہوں نے کچھ نہ کہا - لیکن شہاب الدین احمد خاں کا پنجہزاری منصب - عمر میں بُڈھا - تم سے بڑا - وہ تمہارے سامنے تسلیم بجا لائے ! اعتماد خاں ایک وہ وقت تھا - کہ اپنی ذات سے بیس ہزار لشکر کا مالک تھا - پُرانا امیر اُس کی طرف سے تمہارے لئے تسلیم - اس میں لطافت کیا تھی؟ پائندہ خاں مغل پُراتم ترک وہ تو تعجب نہیں کہ انکار بھی کر جائے - اور باقی تو خیر کسی حساب میں نہیں - بارے مرزا بھی سمجھ گئے اور اس ارادہ سے باز رہے ؂

دنیا عجب مقام ہے - آخر لڑکا ہی تھا - تقدیر نے حد سے بڑھ کر یاوری کی - لاکھوں آدمیوں کی تعریفیں - چاروں طرف سے واہ وا - اور بات بھی واہ واہی کی تھی - دماغ بلند ہو گیا

تھا تو یہ خاک مگر کان میں کچھ غفلت نے		ایسی پھونکی کہ ہوا میں یہ بشر آ ہی گیا

[۱] قیمت لگانے والے ؂

صبح کو ابھی آفتاب نے نشان نہ کھولا تھا۔ کہ خان خاناں فتح کا نشان اُڑاتا احمد آباد میں داخل ہؤا۔ جہاں تین برس کی عمر میں خانہ برباد۔ تیرہ برس کی عمر میں اکبر کے ساتھ یلغار کرکے آیا تھا۔ شہر میں امن امان کی منادی کر دی۔ رعیت کو تسلی اور دلاسا دیا۔ بازار کھلوائے۔ شہر اور نواح شہر کا بندوبست کیا۔ تیسرے دن قلیچ خاں وغیرہ اُمرائے مالوہ بھی فوجیں لے کر آن پہنچے۔ مل کر صلاحیں ہوئیں۔ اور شہر کا بندوبست کرکے تازہ دم فوجوں کے ساتھ مظفر کے پیچھے روانہ ہوئے۔ ہر چند اُنہوں نے کہا۔ کہ اب سپہ سالار گجرات میں رہے مگر کارطلبی اور خدمت گذاری کا خون جوش پر تھا۔ مرزا خان بھی پیچھے روانہ ہؤا +

مظفر کھمبایت میں پہنچا۔ اور لوگوں کو پرچانا شروع کیا۔ قدیمی صاحبزادہ سمجھ کر لوگ بھی سمٹنے لگے۔ سوداگروں نے بھی روپیہ سے مدد کی۔ دو ہزار کے قریب فوج جمع ہو گئی۔ مرزا خاں بھی برق کی طرح پیچھے پیچھے دس کوس پر تھا۔ جو مظفر کو خبر پہنچی۔ وہ وہاں سے نکل کر بڑودہ میں آگیا۔ مرزا خان نے قلیچ خاں وغیرہ چند سرداروں کو فوج دے کر آگے بڑھایا۔ یہ پُرانے سپاہی تھے۔ راہ کی خرابیاں سامنے دیکھ کر آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ وہاں سے بھی نکلا۔ فوج بادشاہی پیچھے تھی۔ امرا ملک میں بھی جہاں مفسد دیکھتے دائیں بائیں کی خبر لیتے تھے نادوت پر آئے تو مظفر وہاں سے اُٹھ کر پہاڑ میں گھس گیا۔ کہ یہاں جم کر ایک میدان اور بھی قسمت آزمائے۔ اُس وقت اُس کی فوج تیس ہزار اور خانخاناں کی آٹھ نو ہزار تھی +

یہ فتح نامہ بھی رستم اور اسفندیار کے فتح ناموں سے کم نہیں۔ مرزا خاں نے لشکر کی تقسیم کرکے فوج کے پرے جمائے۔ ہراول اور دائیں بائیں کو بڑھایا۔ پہلے ہی خواجہ نظام الدین کو آگے بھیجا۔ کہ پہاڑ کی لڑائی ہے۔ دیکھو رستہ کا کیا حال ہے۔ اور فوج دشمن کا کیا انداز ہے۔ اسی طرح لڑائی ڈالو۔ یہ دامن کوہ میں پہنچے تھے۔ کہ اُس کے پیادوں سے مقابلہ ہو گیا۔ مگر انہوں نے ایسا ریلا کہ سامنے جو بڑا پہاڑ تھا اُس میں گھس گئے۔ یہ بھی دبائے چلے گئے۔ وہاں دیکھا دشمن کا لشکر لمبی قطاریں رستہ روکے کھڑا ہے۔ تیر تفنگ کے پٹے پر تھے۔ مگر فوراً دست و گریبان ہو گئے۔ اور وہ دھوآں دھار معرکہ ہؤا۔ کہ نظر کام نہ کرتی تھی۔ خواجہ نے کرامات یہ کی۔ کہ سواروں کو پیادہ کرکے بڑھایا۔ اور جھٹ پہلو کی پہاڑی پر قبضہ کر لیا۔ ساتھ ہی قلیچ خاں کو آدمی بھیجے۔ وہ بائیں ہاتھ سے چلا آتا تھا۔ کہ غنیم سے ٹکر کھائی۔

مگر غنیم نے زور دے کر اُسے پیچھے ہٹا دیا۔ اور دباتا ہوا چلا۔ اس دھکا پیل میں خواجہ کے سامنے رستہ کھل گیا۔ جس پیادہ فوج کو ابھی پہلو کی پہاڑی پر چڑھایا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر پہاڑ پر چڑھ گئی۔ حریف جو قلیچ خاں پر گئے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر اُدھر پلٹے۔ اور دست بدست لڑائی ہو کر عجیب کشت و خون ہوا۔ قلیچ خاں بستی میں جا پڑے تھے۔ اوٹ کو غنیمت سمجھے اور وقت کا انتظار کرتے تھے +

تیز نظر سپہ سالار عقل کی دوربین لگائے دیکھ رہا تھا۔ اور جہاں موقع دیکھتا تھا۔ ویسی ہی مدد وہاں پہنچاتا تھا۔ فوراً فیلی توپ خانہ پہنچایا۔ کہ جس پہاڑی پر قبضہ کیا ہے۔ اُس پر چڑھ جاؤ۔ ساتھ ہی اور فوج پہنچی۔ اُس نے دشمن کا بایاں پہلو آن مارا۔ کئی جگہ لڑائی پڑ گئی۔ اور وہ گھمسان پڑا کہ پہلی لڑائی کو بھی گرد کر دیا۔ ہتھنالوں کی گولی ایسے موقع سے چلی کہ خاص قلب میں پہنچی۔ جہاں مظفر کھڑا تھا۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا۔ شکست کی بدنامی کو غنیمت سمجھا اور نامظفر ہو کر بھاگ گیا۔ سپاہ کا بہت نقصان ہوا۔ بیشمار مال و اسباب چھوڑا۔ مرزا خان نے امرا کو جن جن اطراف پر مناسب دیکھا۔ روانہ کیا۔ اور آپ احمد آباد میں آکر ملک و رعیت کے انتظام میں مصروف ہوا +

دربار میں جب عرضداشت اس کی پڑھی گئی۔ اکبر بہت خوش ہوا۔ فرمان بھیج کر سب کے دل بڑھائے۔ مرزا خاں کو خطاب خان خانی۔ خلعت با اسپ و کمر خنجر مرصع تمن توغ۔ منصب پنج ہزاری کہ انتہائے معراج امرا کی ہے۔ عنایت ہوا۔ اور اوروں کے منصب بھی دس بیس اور اٹھارہ تیس کی نسبت سے جیسے مناسب دیکھے بڑھائے۔ یہ لطیفہ غیبی ۹۹۱ھ میں واقع ہوا +

بہت سے خطوط اور مراسلات کا ایک پرانا مجموعہ میرے ہاتھ آیا ہے۔ اُسی فتح کے موقع پر خان خاناں نے ایرج اپنے بیٹے کے نام ایک خط[1] لکھا تھا۔ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ بہت سے اصلی حالات معرکہ جنگ کے اس سے کھلتے ہیں۔ رفیقانِ منافق کی وفا یا بیوفائی آئینہ نظر آتی ہے۔ اس کے الفاظ سے ٹپکتا ہے کہ دلِ درد بیکسی سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اور اُمید و یاس جو ساعت بساعت اُس پر نقش بناتے اور مٹاتے ہیں سب نظر آتے ہیں یہ رنگ ایسے ایسے قلم سے پھیرا ہے۔ کہ بادشاہ کے ہاتھ میں بھی جا پڑے۔ تو بہت سے مطالب دل پر نقش کرے۔ اور ضرور بیٹے کو لکھا ہوگا۔ کہ بطور خود حضور میں لئے چلے جانا۔ اس سے یہ

[1] یہ خط تتمے میں دیکھو۔

بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ قادر الکلام کامل انشا پرداز تھا۔ اور اپنے مطلب کو پوری تاثیر کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ اقبال کی کامیابی۔ عہدے کی ترقی۔ غرض اس وقت مرزا خان کی عمر کم و بیش بیس برس کی ہوگی۔ کہ وہ دولت خدا نے دی۔ جو باپ کو بھی آخیر عمر میں جاکر نصیب ہوئی تھی۔

حکومت و فرمانروائی دولت و نعمت سامان امیری کا مزا بھی جوانی ہی میں ہے کہ وہ بھی بڑی دولت ہے۔ اقبال مند لوگ ہیں۔ جنہیں ساری دولتیں خدا ساتھ دے۔ امیری اور امیری کے لوازمات۔ اچھے مکانات جوان ہی کے لئے زیبا ہیں۔ جوانی ہو تو اچھا کھانا بھی مزا دیتا ہے۔ اور انگ لگتا ہے۔ بڈھے بچارہ کے لئے ہو بھی تو مزا نہیں۔ بڈھا اچھا لباس پہنتا ہے۔ ہتھیار سج کر گھوڑے پر چڑھتا ہے۔ کمر جھکی ہے۔ شانے ڈھلکے ہوئے ہیں۔ لوگ دیکھ کر ہنس دیتے ہیں۔ بلکہ اپنے تئیں دیکھ آپ شرم آتی ہے ہائے۔ ع   جوانی کجائی کہ یادت بخیر۔

لطیفہ۔ شیر شاہ کو ترقی کی منزلیں طے کرنے میں اتنا عرصہ کھنچا کہ تاج شاہی سر تک آتے آتے خود بڑھاپا آگیا۔ بادشاہ ہوا تو سر سفید۔ ڈاڑھی بگلا۔ منہ پر جھریاں۔ آنکھیں عینک کی محتاج۔ جب لباس پہنتا۔ اور زیور بادشاہی سجتا۔ تو آئینہ سامنے دھرا ہوتا تھا۔ کہتا تھا۔ عید تو ہوئی۔ مگر شام ہوتے ہوئے۔

لطیفہ۔ دلی کو خدا مغفرت کرے۔ ہر بادشاہ کو یہی شوق رہا ہے۔ کہ اس شہر میں شان شکوہ کا جلوس دکھاؤں شیر شاہ بادشاہ ہوا۔ تو اس نے بھی وہاں آکر جشن کیا۔ شام کے وقت مصاحبوں کے ساتھ جریدہ سوار ہوا۔ اور بازار میں نکلا کہ سب کو دیکھے۔ اور اپنے تئیں دکھائے۔ دو بڑھیاں اشراف زادی فلک کی ماری دن بھر چرخہ کاتا کرتی تھیں۔ شام کو جاکر سوت بیچ لایا کرتی تھیں۔ اس وقت وہ بھی برقعہ اوڑھ کر نکلی تھیں۔ سواری کی آمد آمد سن کر کنارے کھڑی ہوگئیں۔ کہ نئے بادشاہ کو دیکھیں۔ شیر شاہ گھوڑے پر سوار باگ ڈھیلی چھوڑے آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے۔ ایک نے دوسری سے کہا بوا! تم نے دیکھا۔ دوسری بولی۔ ہاں۔ ہاں بوا دیکھا۔ پہلی بولی۔ ہاں بوا دیکھا۔ پہلی بولی کہ دلہن کو دلہا ملا مگر بوڑھا ملا۔ شیر شاہ بھی پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے سن لیا۔ جھٹ سینہ ابھارا اور باگ کھینچ کر گھوڑے کو گدگدایا۔ خدا جانے عربی تھا یا کاٹھیاواڑ۔ اچھلنے کودنے لگا۔ دوسری بڑھیا بولی۔ اے بوا۔ وہ تو بڈھا بھی ہے اور مسخرا بھی ہے۔

اتفاق - اس عالم میں کہ بادشاہ کو بہت خبرہائے پریشان پہنچتی تھیں۔ ہر وقت اسی فکر میں رہتے تھے۔ میر فتح اللہ شیرازی سے سوال کیا۔ کہ لڑائی کا انجام کیا ہوگا۔ انھوں نے اُصطرلاب لگاکر طالع وقت نکالا۔ ستاروں کے مقام اور حرکات آسمانی کو دیکھ کر حکم لگا دیا کہ دو جگہ میدان کارزار ہوگا۔ اور دونوں جگہ فتح حضور کی ہوگی۔ اتفاق ہے کہ ایسا ہی ہوا

کسی مؤرخ نے یہ کیفیت نہیں دکھائی۔ کہ جب مرزا خاں کے کارنامے وہاں کوہ خانخانی کے سامان تیار کر رہے تھے۔ اس وقت دربار اکبری میں کیا عالم ہو رہا تھا۔ البتہ ابوالفضل نے ایک خط مبارک بادیں خان خاناں کو لکھا ہے۔ وہی بُشریٰ والا رقعہ ہے۔ جو آج تک اپنی بلندی مضامین اور دشواری عبارت اور فصاحت و بلاغت کے زور شور سے اہل کمال میں شہرۂ آفاق ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ چند روز جو گجرات سے خبر نہ پہنچی تو دُنیا کے لوگ ہزاروں ہوائیاں اُڑا رہے تھے۔ اُس کے اور اُس کے باپ کے دشمن کمین گاہوں سے نکلے تھے۔ خوش ہوتے تھے اور دوستوں سے چھیڑ چھیڑ کر حال پوچھتے تھے۔ اکبر پر بھی طنز کرتے تھے۔ کہ دکن کا ملک اور ملک بھی بگڑا ہوا۔ ایسے نازک موقع میں کہ دو بڈھے سپہ سالار مات کھا چکے۔ ایک نوجوان ناتجربہ کار کو بھیجنا چہ معنی دارد۔ بھلا یہ سپہ سالار ہے؟ یہ تو مجلس آرائی کا سنگار ہے۔ اُسے معرکۂ جنگ سے کیا تعلق۔ بیرم خانی ہوا خواہ بھی دم بخود تھے۔ اور اکبر بھی چُپ تھا۔ چنانچہ الہ آباد سے قلعہ کی بنیاد رکھ کر جلد پھرا کہ آگرہ سے سوار ہو کر پھر یلغار کرے۔ اور خود جاکر لڑائی کو سنبھالے۔ کوڑا گھاٹم پور میں پہنچا تھا جو فتح کی خبر پائی نہایت خوش ہوا۔ اور شکر کے سجدے بجالایا۔ دو رُخے دوغلوں نے فوراً گفتار کی رفتار بدلی جُھک جُھک کر کہنے لگے۔ حضور ہی کی جوہر شناس آنکھ تھی۔ کہ جوہر قابلیت کو تاڑ لیا۔ پرانے پرانے جاں نثار موجود تھے۔ مگر حضور نے اُسی کو بھیجا۔

غرض اُسی وقت حکم ہو گیا۔ کہ نقار خانہ سے تہنیت کی نوبت بجے۔ خط مذکور سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس زمانہ میں بنجارہ کے چودھریوں اور مہاجنوں کی معرفت بہت جلد خبر پہنچا کرتی تھی۔ پہلے کشنا چودھری نے خبر دی۔ پھر اُمرائے لشکر کے بھی عرائض پہنچے۔ اکبر نے بڑی آفرین کی بڑی تحسین کی اور کہا۔ کہ اس کے باپ کا خان خانی خطاب اسے دو۔ خوشی کی مقدار اس سے سمجھ لو۔ کہ خط مذکور میں شیخ صاحب لکھتے ہیں۔ جس وقت نقار خانہ سے نوبت کا غُل ہوا۔ دوست اور دشمن خوشحالی میں برابر ہو رہے تھے۔ اور بات تو یہ ہے

کہ خطاب و منصب کچھ بھی نہ ملتا۔ تو بھی در حقیقت تم سے وہ بن آئی ہے کہ اہل زمانہ اور دشمنوں کے دل داغ داغ ہو جائیں۔ ایسا عالی خطاب جس کی پنج ہزاری امیر آرزوئیں کرتے تھے۔ پہلے ہی مل جانا خیالِ روزگار میں بھی نہ آتا تھا۔ چہ جائے کہ منصب بھی مل گیا +

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ دو فتحوں کے بعد مرزا خان نے ابو الفضل کو اور ساتھ ہی حکیم ہمام کو خط لکھا تھا۔ اس خط میں غالباً دل کی پریشانی ظاہر کی تھی۔ کہ امرا رفاقت سے جی چُراتے ہیں۔ اور ابوالفضل کو خط کے آخر میں قسمیں دے کر لکھا تھا۔ کہ حضور سے عرض کر دو۔ کہ مجھے بُلا لیں۔ جواب میں شیخ لکھتے ہیں۔ کہ مَیں نے غور کر کے دیکھا۔ کسی طرح مناسب نہ معلوم ہوا۔ پھر دوستوں کی صلاحیں ہوئیں۔ رائے اُسی پر متفق ہوئی۔ کہ مضر نہیں ہے۔ کہہ دو اُمید ہے۔ تو فائدہ ہی کی ہے۔ خیر افراطِ شوق پر ڈھال کر عرض کیا۔ اکبر نے نہایت حیران ہو کر کہا۔ کہ ہیں اس وقت میں آنا کیسا۔ حکیم نے اپنی لسانی اور سخنوری کی معجون تیار کر کے باتیں بنائیں۔ پھر بھی شیخ لکھتا ہے۔ میرے نزدیک جس طرح ان باتوں سے حضور کا تعجب رفع نہیں ہؤا۔ اسی طرح کچھ ضرر بھی نہیں ہؤا +

خان خاناں نے بعد اس کے جو عرضداشت لکھی تو بہت سی معروضات کے ذیل میں ٹوڈرمل کے لئے بھی درخواست کی تھی۔ اور یہ بھی عرض کی تھی۔ کہ حضور خود اس ملک پر سایۂ اقبال ڈالیں۔ اکبر نے بھی ارادہ کیا تھا۔ کہ ماہ آئندہ میں نوروز ہے۔ جشن کر کے روانہ ہوں مگر خزانہ کی روانگی اور اور درخواستوں کے سرانجام کا حکم دے دیا۔ اور تعمیل بھی ہو گئی۔ خود نہیں گئے +

خط مذکور میں ابو الفضل نے لکھا ہے۔ کہ تمہارے خط سے بڑا اضطراب پایا جاتا ہے۔ اور اس مضمون بزرگانہ اور دوستانہ بہت سے فقرے لکھے ہیں۔ شیخ نے ٹوڈرمل کے بُلانے کو بھی اچھا نہیں سمجھا ہے۔ اور یہ بات شیخ کی دُرست تھی۔ لیکن نوجوان سپہ سالار پر جب مہمِ عظیم کا پہاڑ اور ذمہ داری کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ اور ملک کو دیکھا۔ کہ اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگی ہوئی ہے۔ رفیقوں کو دیکھے۔ تو گُرگانِ کُہن ہیں اور بادشاہ نے ماتحت کر دیئے ہیں۔ اور ایسا موقع آن پڑا ہے۔ کہ آنکھ سامنے نہیں کر سکتے۔ وہ ناچار مجلسِ مصلحت میں آتے تھے۔ لیکن گُم سُم بیٹھتے تھے۔ صلاح پُوچھو۔ تو بات بات پر الگ ہوتے تھے۔ کہتے تھے تو یہ کہ ہم تو ماتحت ہیں۔ آپ خدمت فرمائیں۔ بسر و چشم

حاضر ہیں۔ اور اپنے رفقاء کی خلوتوں میں بیٹھ کر خدا جانے کیا کیا کہتے تھے۔ نوجوان کو وہ خبریں پہنچتی تھیں ایسی حالت میں ابوالفضل جیسے مستقل شخص کے سوا کون تھا۔ جو نہ گھبرائے۔ جن لوگوں کو انسان دلی دوست سمجھتا ہے۔ اُن کے سامنے دل کھول کر بخار نکالتا ہے۔ اور صاف صاف جو حال ہوتا ہے۔ کہتا ہے۔ بیشک اُس نوجوان نے دل کی جو حالت تھی لکھ دی ہوگی۔ اور یہی وجہ راجہ ٹوڈرمل کے بُلانے کی ہوگی۔ کیونکہ راجہ خان خاناں کا دوست صادق ہو یا نہ ہو۔ لیکن ایک، کارگذار تجربہ کار اہل کار تھا۔ اور خالص نیت سے سلطنت کا خیر خواہ تھا۔ ایسا نہ تھا۔ کہ کسی کی دشمنی کے لئے بادشاہ کے کام کو خراب کر دے۔ اور بڑی بات یہ تھی۔ کہ اکبر کو اُس پر پورا اعتبار تھا۔

بادشاہ کے خود تشریف لانے کی جو التجا کی تھی۔ بیشک نوجوان کا دل چاہتا ہوگا۔ کہ جس نے مجھے پالا۔ جس نے مجھے تعلیم و تربیت کیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے جاں فشانیاں کھاؤں کہ میں کیا کرتا ہوں۔ اور یہ پُرانے پاپی کیا کرتے ہیں۔ اور شائد یہ بھی ہو۔ کہ یہ میرے رفقاء و ملازم حق نمک پر جانیں قربان کر رہے ہیں۔ اُنہیں حسب دلخواہ انعام و اکرام دلواؤں۔

(اس وقت خان خاناں کا اور شیخ کا معاملہ کیونکر تھا) یہی تصور کر دو۔ کہ ایک دربار کے دو ہم عمر ملازم ہیں۔ خانخاناں گویا ایک نوجوان۔ خوش اخلاق۔ خوش صحبت۔ پہلو سبز، سخن فہم امیر زادہ ہے۔ خواہ دربار ہو۔ خواہ جلسۂ علمی ہو۔ خواہ سواری۔ شکاری۔ ہر ایک جگہ پر خلوت و جلوت میں بلکہ محلوں میں بھی پہنچتا تھا۔ دل لگی کے کھیل تماشے ہوں۔ تو مصاحب موافق ہے ابوالفضل ایک عالم انشا پرداز۔ خوش اخلاق۔ خوش صحبت ہے۔ کہ دربار و خلوت اور بعض صحبتوں میں حاضر رہتا ہے۔ خان خاناں کو اُس، کے کمال اور دانائی اور خوبی تقریر اور تحریر نے اپنا عاشق کر رکھا ہے۔ اور ابوالفضل اُس کے اخلاق اور خوش صحبتی کے سبب سے اور اس محبت سے کہ یہ نوجوان میرے کلام اور کمال کا قدر دان ہے۔ اور اس مصلحت سے کہ بادشاہ کے پاس کا ہر دم حاضر باش ہے۔ اُسے غنیمت سمجھتا ہے۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ جانتا ہے۔ جس امر میں میں ترقی کر سکتا ہوں۔ وہ اس کی ترقی سے بالکل الگ ہے۔ نوجوان امیر زادہ سے کچھ خطر کا اندیشہ نہیں۔ اور یہ بھی تعجب نہیں کہ جب شیخ کے پُرانے پُرانے دشمن دربار پر ابر کی طرح چھائے ہونگے۔ اس وقت یہ نوجوان دربار میں شیخ کی ہوا باندھتا ہوگا۔ اور خلوت میں بادشاہ کے دل پر اُس کی طرف سے نیک خیالوں کے نقش بٹھاتا ہوگا۔

ابوالفضل فیضی۔ خانخاناں۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام۔ میر فتح اللہ شیرازی وغیرہ ضرور مختلف اوقات میں ایک دوسرے کے گھر پر جمع ہوتے ہونگے۔ فیضی اور ابوالفضل کا ایک مذہب تھا۔ اور جو کچھ تھا۔ سو معلوم ہے۔ باقی سب کے دل شیعہ۔ نام کے سنت جماعت مگر در حقیقت ایسے تھے۔ گویا سب مذہب انہیں کے تھے۔ اس لئے آپس میں سب رفیق اور معاون رہتے ہونگے۔ ہاں جو یک پہلو مذہب رکھتے ہوں گے وہ اُن سے ضرور کھٹک رکھتے ہونگے۔ اور یہ بھی ضرور ہے۔ کہ جوانوں کی جوانوں سے ملت ہوتی ہے۔ بُڈھوں کی بُڈھوں سے۔ جوانوں کی شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی کہ جوش اصلی ہے۔ بُڈھے بیچارے کہاں سے لائیں خوش طبعی کرینگے تو بُڈھے بھی ہونگے مسخرے بھی ہونگے +

صحبتِ پیر و جواں راست نیاید ہرگز تیر یک لحظہ بہ پہلوئے کماں ننشیند

استغفر اللہ کدھر تھا اور کدھر آن پڑا۔ مگر باتوں کے مصالحہ بغیر تاریخی حالات کا بھی مزہ نہیں آتا +

۹۹۲ھ میں مظفر نے تیسری دفعہ سر اُٹھایا۔ خان خاناں نے اُمرا کو فوجیں دے کر کئی طرف سے بھیجا۔ اور آپ جاں نثاروں کو لے کر الگ پہنچا مظفر نے اپنی حالت میں مقابلہ کی طاقت نہ پائی۔ سانس لئے بھاگا۔ راجگان ملک اور زمینداران اطراف کے پاس وکیل دوڑاتا تھا۔ اور جا بجا بھاگا پھرتا تھا۔ لُوٹ پر گذارہ کرتا تھا تمام علاقے تباہ کر دیئے۔ بھلا اس طرح کہیں سلطنتیں قائم ہوتی ہیں +

خان خاناں کو ایک موقع پر جام نے خبر دی۔ کہ اس وقت مظفر فلاں مقام پر ہے۔ مستعد سپاہی اور چالاک گھوڑے ہوں۔ تو ابھی گرفتار ہو جاتا ہے۔ خان خاناں خود سوار ہو کر دَوڑا۔ وہ پھر بھی ہاتھ نہ آیا۔ معلوم ہؤا کہ جام دونوں طرف کارسازی کر رہا تھا اِن ترکتازوں میں اتنا فائدہ ہؤا۔ کہ جو لوگ مظفر کی رفاقت کر رہے تھے۔ وہ اپنی خوشامدوں کی سفارش لے کر رجوع ہو گئے۔ امین خاں غوری فرمانروائے جوناگڑھ نے اپنے بیٹے کو تحفے تحائف دے کر خانخاناں کی خدمت میں بھیجا +

مظفر نے دیکھا۔ کہ بہادر سپہ سالار تمام امرا سمیت اِدھر ہے۔ جام کے پاس اسباب ضروری رکھا۔ اور بیٹے کو اس کے دامن میں چھپایا۔ آپ احمد آباد پر گھوڑے اُٹھائے۔ تھانہ نیتی پر خان خاناں کے معتبر وفادار موجود تھے۔ وہاں سخت مقابلہ ہؤا۔ اور

مظفر چھاتی پر دھکا کھا کر اُلٹا پھرا۔ خان خاناں کو جب سازش کا حال معلوم ہؤا۔ تو بڑے خفا ہوئے۔ اور کہا کہ جام کو چھوڑ کر ٹھیکرا کر دُوں گا۔ فوج لے کر پہنچا۔ کہ دفعتہً **نواگراؤں** سے چار کوس پر جا کر جھنڈا گاڑ دیا۔ (یہ جام کا دارالحکومت تھا) جام چکر میں آئے۔ کمال عجز و انکسار کے ساتھ عرضی لکھی۔ **شرزہ** ہاتھی اور عجائب و نفائس گراں بہا ساتھ لے کر بیٹے کو بھیجا۔ صلح جوئی۔ امن و امان۔ تسلی و دلاسا اکبری آئین تھا۔ خان خاناں اکبر کے شاگرد رشید تھے۔ پھر آنا مصلحت سمجھے +

اکبر نے حکیم عین الملک وغیرہ امرائے باتدبیر کو سرحد دکن پر جاگیریں دے کر لگا رکھا تھا۔ اُن کی کارسازیوں میں ایک نتیجہ یہ حاصل ہؤا تھا۔ کہ راجی علی خاں حاکم برہان پور دربار اکبری کی طرف رجوع ہو گیا تھا۔ اور اس نظر سے کہ رشتۂ اتحاد مضبوط ہو۔ خداوند جہاں اس کے بھائی سے ابوالفضل کی بہن کی شادی کر دی تھی۔ راجی علی خاں ایک کہن سال تجربہ کار نام کو برہان پور اور خاندیس کا حاکم تھا۔ مگر تمام خاندیس اور دکن میں اُس کی تاثیر اثر برقی کی طرح دوڑی ہوئی تھی۔ اور امور سلطنت کے ماہر اسے ملک دکن کی کنجی کہا کرتے تھے +

۹۹۳ھ میں خان خاناں احمد آباد میں بیٹھے اکبری سکہ بٹھا رہے تھے۔ کہ حکام دکن اور خاندیس آپس میں بگڑے۔ راجی علی خاں نے ایلچی بھیجا اور عرض کی دوربیں سے دکھایا۔ کہ ملک دکن کا رستہ کھلا ہؤا ہے۔ یہ اُس آرزو پر مرادیں مانے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے اُمرا کو جمع کر کے جلسۂ مشورت قائم کیا۔ خان خاناں کو حکم پہنچا۔ وہ بھی یلغار کر کے احمد آباد سے فتح پور میں پہنچے۔ اور یہی صلاح ٹھیری کہ ملک مذکور کا تسخیر کر لینا ترین مصلحت ہے۔ خان خاناں پھر احمد آباد کو رخصت ہو گئے اور خان اعظم مہم دکن کے سپہ سالار ہو کر روانہ ہوئے +

خان خاناں سے میدان خالی پا کر مظفر نے پھر احمد آباد کا ارادہ کیا۔ جام نے اُس کی عقل گنوائی۔ اور یہ سمجھایا کہ پہلے جوناگڑھ کو لو پھر احمد آباد کو سمجھ لینا۔ وہ اس کے سرور میں مست ہو کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اور پھر سنبھل کر بیٹھا۔ امرائے بادشاہی کو خبر لگی۔ یہ سُنتے ہی دوڑے وہ اُلٹے ہی پاؤں بھاگا۔ اسی عرصہ میں خان خاناں بھی آن پہنچے۔ وہ تو نکل گیا تھا۔ اطراف و نواحی کے علاقے جو بچے ہوئے تھے۔ وہ بندوبست میں آ گئے +

خان اعظم معہ اُمرائے شاہی کے اِدھر گئے۔ اور لڑائیاں جاری ہوئیں۔ احمد آباد گجرات سر راہ تھا۔ اور دکن کی سرحد پر تھا۔ اس مہم میں بھی اکبر نے خان خاناں کو شامل

کیا تھا۔ چنانچہ انشائے ابوالفضل میں جو فرمان خان خاناں کے نام ہے۔ اگرچہ برائے نام بیربر کے مرنے کا حال ہے۔ مگر اُسی ضمن میں لکھا ہے۔ کہ تمہاری عرضداشت پہنچی۔ ملک کے حالات جو لکھے ہیں۔ اُس سے خاطر جمع ہوئی تسخیر دکن کی تجویز میں جو جو باتیں تم نے لکھی ہیں۔ پسندیدہ معلوم ہوئیں۔ تمہاری وفور دانش اور کمال شجاعت سے اُمید ہے۔ کہ عنقریب اسی طرح ظہور میں آئیگا۔ جیساکہ تم نے لکھا ہے۔ اور ملک بہت آسانی سے تسخیر ہو جائیگا۔ مگر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُنھوں نے دل کھول کر خان اعظم کی مدد نہیں کی اور حق پوچھو تو خان اعظم بھی ایسے شخص نہ تھے۔ کہ کوئی سینہ صاف آدمی اُن کی مدد کر سکے + اکبر کی دو آنکھیں نہ تھیں۔ ہزار آنکھیں تھیں۔ جن میں سے ایک کی نظر ملک موروثی پر تھی۔ چند روز کے بعد اُدھر تو حکیم مرزا سوتیلا بھائی جس کے پاس ہمایوں کے وقت سے کابل کی حکومت تھی وہ مر گیا۔ اُدھر سُنا۔ کہ عبداللہ خاں اُزبک حاکم وراء النہر نے دریائے جیحوں اُتر کر بدخشاں پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور مرزا سلیمان کو نکال دیا۔ اس لئے بدخشاں پر لشکر بھیجنے کا ارادہ ہوا +

یہ وہی موقع ہے کہ خان اعظم مہم دکن کو برباد کر کے خود سرگرداں ان کے پاس پہنچے۔ خان خاناں نے لوازم ضیافت سرانجام کر کے رخصت کیا۔ اور خود فوج آراستہ لے کر روانہ ہوا۔ جب بڑودہ سے ہوتے ہوئے بھڑوچ میں پہنچے تو خان اعظم کے خط آئے۔ کہ اب تو برسات آگئی۔ اس سال لڑائی موقوف۔ سال آئندہ میں ہم تم مل کر چلینگے۔ خان خاناں احمد آباد کو پھر آئے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ میر فتح اللہ شیرازی بھی وہاں موجود ہیں۔ اس معاملہ کو پانچ مہینے گذرے تھے کہ:۔

ان کے پرچہ نویس قیامت تھے۔ انھیں بھی خبر پہنچی۔ نوجوان صاحب ہمت کے دل میں اُمنگ آئی ہوگی۔ کہ جن پہاڑوں پر میرے باپ نے شاہ جنت نشان (ہمایوں) کی خدمت جاں نثاریاں کی ہیں رات کو رات۔ دن کو دن نہیں سمجھا۔ وہیں چل کر مَیں بھی تلواریں ماروں۔ دکن سے عرضداشت لکھی۔ کہ حضور نے مہم بدخشاں کا ارادہ مصمم فرمالیا ہے۔ مجھے بھی شوق پابوس بیقرار کرتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ اُن پہاڑوں میں فدوی بھی رکاب پکڑے ساتھ جاتا ہو +

۹۹۵ھ میں یہ اور میر فتح اللہ شیرازی طلب ہوئے۔ اُنھوں نے اُونٹوں اور گھوڑوں کی ڈاک بٹھائی اور یلغار کر کے آئے۔ بادشاہ نے ملک خاندیس کے احوال سُنے۔ فتوحات دکن کے باب میں مشورے ہوئے۔ اور کابل و بدخشاں کی مہم پر گفتگوئیں ہوئیں۔ بدخشاں کی مہم ملتوی ہی

مظفر نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ کبھی کھمبایت۔ کبھی نادوت۔ کبھی سورت۔ کبھی پوربی۔ انھنیر۔ کچھ وغیرہ اضلاع میں سے کہیں نہ کہیں سر نکالتا تھا۔ ایک جگہ شکست کھاتا تھا پھر ادھر اُدھر سے حشری اور جنگلی لٹیرے سمیٹ کر دوسری جگہ آن موجود ہوتا تھا۔ کہیں خان خاناں کہیں اُس کے ماتحت اُمرا اُسے ریلتے دھکیلتے پھرتے تھے۔ اور ملک کے انتظام میں مصروف تھے۔ اُن میں قلیچ خاں پرانا امیر تھا۔ اور نئوں میں خواجہ نظام الدین نے ایسے جوہر جانفشانی کے دکھائے۔ کہ دیکھنے والوں کو بڑی بڑی اُمیدیں ہوئیں۔

سنہ ۹۹۷ھ میں خان اعظم کو احمد آباد گجرات عنایت ہوئی۔ اور خان خاناں معہ اُمرائے فتحیاب بلائے گئے۔ باپ کے مراتب میں سے وکیل مطلق کا منصب برسوں ہوئے تھے کہ گھر سے نکل چکا تھا۔ ٹوڈرمل کے مرنے پر سنہ ۹۹۸ھ میں پھر قبضہ میں آیا۔ احمد آباد گجرات کے عوض جونپور عنایت ہوا۔

خان خاناں مہمات مُلکی کے ساتھ علمی خیال سے خالی نہ رہتا تھا۔ اسی سنہ میں حسب الحکم واقعات بابری کا ترجمہ کر کے پیش کیا۔ پسند اور مقبول ہوا۔

سنہ ۹۹۹ھ / ۱۵۹۱ء میں بادشاہ نے ملتان اور بھکر کو خان خاناں کی جاگیر کیا۔ اور امرائے بادشاہی اور لشکر دے کر کوئی لکھتا ہے قندھار کی مہم پر۔ اور کوئی لکھتا ہے ٹھٹھ کی مہم پر بھیجا۔ اکبر نامہ کی عبارت سے بُو آئی جس سے طبیعت میں تلاش پیدا ہوئی۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ کہیں پتہ نہ لگا۔ آخر میرے بچپن کے دوست مدد کو آئے یعنی ابوالفضل کے رقعے جو اُس نے خانخاناں کے نام لکھے تھے اور میں نے دلبستان طفلی میں بیٹھ کر یاد کئے تھے۔ انہوں نے یہ راز کھولا۔ قندھار کو اُس وقت ایران تو اپنا حق سمجھتا تھا۔ کہ ہمایوں وعدہ کر آئے تھے۔ عبداللہ خاں کہتے تھے کہ قندھار کے ساتھ ایران کو بھی گھول کر پی جائیں۔ اکبر نے اُس وقت دیکھا کہ شہزادگان صفوی جو سلطنت ایران کی طرف سے حاکم ہیں۔ وہ شاہ سے آزردہ ہیں اور آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اور رعایا ادھر رجوع ہے۔ دونو بادشاہ اپنی اپنی مہمات میں مصروف ہیں۔ صلاحیں تو مدت سے ہو رہی تھیں اب تجویز ہوئی۔ کہ بیرم خاں نے مدت تک وہاں حکومت کی ہے۔ خانخاناں ملتان کے رستے فوج لے کر جائیں۔ انہوں نے کچھ تو اس سبب سے کہ وہاں کے معاملات جیسے اب دیکھتے ہو اُس وقت اس سے بھی زیادہ پیچیدہ اور خطرناک تھے۔ دوسرے ہندوستانی لوگ برفانی ملکوں کے سفر سے بہت ڈرتے ہیں۔ اور یہاں کی فوج میں زیادہ تر ہندوستانی ہوتے ہیں۔ تیسرے اس

اس سبب سے کہ وہاں کی مہموں میں روپیہ کا بڑا خرچ ہے اور خان خاناں کے ہاتھ روپیہ کے دشمن تھے

ع	چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں	

غرض کچھ اپنی رائے کچھ رفیقوں کی صلاح سے عرض کی کہ پہلے ٹھٹھ کا ملک میری جاگیر میں شامل کر دیا جائے۔ پھر قندھار پر فوج لے کر جاؤں۔ اُس کی رائے بھی مصلحت سے خالی نہ تھی۔ وہ دُوربین اور باخبر شخص تھا۔ ہزاروں تجربہ کار واقف حال افغان خراسانی ایرانی تورانی اُسکے دسترخوان پر کھانے کھا رہے تھے۔ وہ جانتا تھا۔ کہ گجرات کے جنگل میں جا کر نقارے بجاتے پھرے۔ یہ بات اور ہے۔ قندھار شہد کا چھتّا ہے۔ ایران توران ہر ایک کا اُس پر دانت ہے۔ دو شیروں کے مُنہ سے شکار جھپٹنا اور سامنے بیٹھ کر کھانا کچھ بچّوں کا کھیل نہیں ✦

معلوم ہوتا ہے۔ کہ بادشاہی مرضی یہی تھی۔ کہ سیدھے قندھار پہنچو۔ اُنہوں نے اور اُن کے رفیقوں نے صلاح کو اس طرف پھیرا کہ ٹھٹھ رستہ میں سے صاف کر کے قبضہ کرنا چاہئے۔ ابوالفضل کی بھی یہی رائے تھی۔ کہ ٹھٹھ کا خیال نہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ تمہارے فراق میں مجھے یہ یہ غم ہیں۔ ازانجملہ یہ کہ تسخیر قندھار کو چھوڑ کر ٹھٹھ کا رُخ کیا ✦

ان خطوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۹۹۹ھ کے اخیر میں فوج روانہ ہوئی۔ مگر اندر اندر خدا جانے کب سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کیونکہ ۹۹۸ھ کے خط میں شیخ خان خاناں کو لکھتا ہے ۔ ہزار ہزار شکر کہ فتح دلیر دزی کی ہوائیں چلنے لگیں۔ اُمید ہے کہ عنقریب یہ ولایت فتح ہو جائے۔ دیکھنا عزم قندھار اور فتح ٹھٹھ کو اور زمانہ پر نہ ڈالنا کہ وقت و موقع گذرا جاتا ہے۔ بڑی بات یہی ہے۔ کہ چاہو تو جو لوگ اُردو میں بیکار ہیں اُنہیں مانگ لو اور یہ خدمت لے کر ٹھٹھ کو جاگیر میں قبول کرو۔ مجھے ہزار سالہ تجربہ کار سمجھ کر اگر یہ بات مان لوگے تو ممکن ہے کہ یہ کام ہو جائیگا۔ یہ خط اُسوقت کا ہے جبکہ خان خاناں کو جونپور کا علاقہ ملا ہوا تھا۔ اور قندھار کے لئے اندر اندر گفتگوئیں ہو رہی تھیں۔ اور سلطنت کے معاملے میں خدا جانے علم احکام حساب کتاب کے کیا کیا اُلجھاوے ہونگے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ پیارے میری تلخ گوئیوں میں ہمیشہ خوش رہ کر غم کو ذرا دل میں راہ نہ دو۔ اگر بعض حسب الحکمی فرمانوں میں (کہ وہ بھی ایک ظاہری بات کے سوا اور کچھ نہیں) چند حرف سخت یا غم آور لکھوں تو گلشن خاطر کو عین بہار میں خزاں نہ کرو۔ اور بدگمان نہ ہو۔ پرگنہ کے خالصہ کرنے میں اور معاملہ بقایا میں اور جو کچھ اس کے عوض جونپور سے لیا ہے ان سب باتوں کو طول نہ دینا چاہئے۔ یہ طرز اور لوگوں کی ہے۔ تم اور رستہ کے لوگ ہو سہ

از سیم و زر گوید کسے پیش چناں اسکندر		از جان و دل گوید کسے پیش چناں جانانہ

یعنی تمہارا اور بادشاہ کا اور معاملہ ہے۔ شکر ہے کہ تمہاری عبارتیں مفصل گوش گذار نہیں ہوئیں۔ پھر بھی دقت و کلمہ مناسب میں ادا ہو گئیں۔ درگاہ الٰہی میں گریہ و زاری رات دن خلوت کی حالت میں لازم سمجھو۔ بہت خوشی حرام۔ شکستہ دلوں کے آگے گدائی۔ بے دلوں کی دلداری بہت کرتے رہو۔ وغیرہ وغیرہ دیکھو۔ موقع وقت ہے۔ ایک خان خاناں نے اپنے خط میں شاید لکھا ہے۔ کہ فلاں فلاں کتاب تو جلسہ میں پڑھی جاتی ہے۔ اور کیا کہتے ہو۔ آپ فرماتے ہیں کہ شاہنامہ اور تیمور نامہ وغیرہ کتابیں تو اس لئے لکھی تھیں کہ بنائے گفتار اس انداز پر آئے۔ اصلاح نفس مطلوب ہے تو اس کے لئے اخلاق ناصری۔ جلالی۔ حدیقہ۔ مہلکات و منجیات۔ کیمیائے سعادت وغیرہ وغیرہ ہیں۔

خط مذکور میں لکھتے ہیں۔ شکر خدا کہ برادر گرامی حکیم ہمام کے آدمی کے ہاتھ جو خط بھیجا تھا وہ پہنچا۔ پہلے تو اس کے پہنچنے سے پھر دیکھنے سے پھر سمجھنے سے دل پھول سا کھل گیا۔ خصوصاً اس بات سے کہ ترکمان لوگ قندھار سے استقبال کو آئے ہیں۔ تمہارا مصمم ارادہ جو ایران کی طرف ہے سو طرح خوشی کا سرمایہ ہوا وغیرہ وغیرہ۔ میرے پیارے اس فوج کشی میں جو کہ پیش آئی ہے اعزاز اور نام بلند روپیہ سے خریدا جاتا ہے۔ دس کے پندرہ۔ اور دس کے بیس قرض لو اور خریداری میں بڑی کوشش کرو۔ روپیہ ناموری کا پچھ لگو ہے۔ اور اقبال کی طرح خواہ مخواہ دروازہ کی کنڈی ہو جاتا ہے۔ جیسے کسان کے کھیت میں گھاس اور سبزہ خودرو وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور خط کی تمہید بھی اُٹھائی ہے۔ کہ سفر کا ارادہ۔ بادشاہی رخصت۔ فتح قندھار ٹھٹھہ وغیرہ کی طرح مبارک ہو۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔ جو احکام بادشاہی تھے۔ اُن کا فرمان مرتب کرکے (تمہارے نام) بھیج دیا ہے۔ تم نے لکھا تھا۔ کہ ایران و توران کو حضور سے مراسلات جاری ہوں۔ بے تکلف کہتا ہوں کہ بعینہ وہی مضمون ہیں جو مَیں نے سوچے تھے۔ عبارت اور لفظ ہی کا فرق ہوگا۔

ایک اور خط میں لکھا ہے۔ مَیں نے عہد کر لیا ہے۔ کہ قندھار کی فتح (جو فتح ایران کا دیباچہ ہے) جب تک نہ سُن لونگا۔ نہ حکایت اشتیاق لکھوں گا نہ شکایت فراق۔ اب ساری ہمت اُس کام کی بر آمد میں صرف کرتا ہوں۔ جو بزرگ جہاں (اکبر) خیر اندیش زماں (خود) کی

پیش نہاد خاطر ہے۔ اور سب دوستداروں کی مراد ہے۔ چند حرف لکھتا ہوں اُمید ہے کہ خردہ دُوربین تمہاری سماعت تک پہنچا ئے۔ تم سوداگر زر طلب یا پُرانے سپاہی دِن کاٹنے والے نہیں۔ جو سمجھوں کہ مہم ٹھٹھ کو قندھار پر ترجیح دوگے۔ اور کلام کو طول دوں۔ ڈر تو ہمراہیوں کا ہے۔ کہ کوتہ اندیشی عزت بیچ کر روپیہ کے خریدار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے محبوب مزاج کے دل پر اشتعال کو ادھر ڈال دیں۔ قندھار اور قندھاریوں کا حال معتبر خبروں سے نیا معلوم ہؤا ہوگا لکھوں کیا؟ حاصل مطلب یہ ہے۔ کہ قندھار کو ہر وقت آسان نہیں لے سکتے۔ برخلاف ٹھٹھ کے۔ درمیان کے زمیندار بلوچ افغانوں کو دلاسے کی زبان بخشش کے ہاتھ سے اپنا اکے لشکر فیروزی میں لگا لو۔ اور وقت فرصت کو غنیمت سمجھو۔ توکّل الٰہی کے مضبوط بھروسے پر تکیہ کر کے چُستی و چالاکی سے قندھار کا رُخ کرو۔ کمکی لوگوں کی راہ بہت نہ دیکھو۔ اگرچہ لوگ بہت آن ملینگے۔ مگر رستہ یہ ہے۔ کہ داد و دہش میں کوشش نہ کرو۔ کہ جاہ و عزت اسی میں ہے۔ ہشیاری اور بُردباری کو دائیں بائیں کا مصاحب رکھو۔ مجلس میں چرچا ظفرنامہ۔ شاہنامہ۔ چنگیزنامہ کا چاہئے۔ اخلاقِ ناصری۔ مکتوباتِ شیخ شرف منیری اور حدیقہ کی سہی نہیں وہ ملک خفر کی گفتگو ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر لکھتے ہیں۔ بیشک مرزا جانی حاکم ٹھٹھ نے ہمایوں کے ساتھ عالمِ تباہی میں بڑی بیوفائی کی تھی۔ اور اکبر کے دل میں یہ کھٹک تھی۔ پھر بھی اکبر کی اور ساتھ اُس کے ابوالفضل اور امرائے دربار کی رائے یہی تھی۔ کہ شاہان ایران و توران اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ قندھار کے لئے ایسا موقع پھر نہ ہاتھ آئیگا۔ ٹھٹھ کو جب چاہیں۔ لے سکتے ہیں +

انہوں نے پھر کہا کہ قندھار فقط نام کا میٹھا ہے۔ مُلک بھُوکا ہے۔ حاصل خاک نہیں بلکہ خرچ ہیں۔ کہ جن کا کچھ حساب نہیں۔ اور میرے پاس اس وقت کچھ نہیں۔ میں بھُوکا۔ سپاہ بھُوکی۔ خالی کیسہ لے کر جاؤں گا تو کروں گا کیا؟ جب ملتان سے بھکر اور ٹھٹھ تک تمام مُلک سندھ میں اکبری نقارہ بجیگا۔ سمندر کا کنارہ اکبری تصرف میں ہوگا تو قندھار خود بخود ہاتھ آجائیگا +

بہرحال قندھار کو روانہ ہوئے۔ مگر غزنی اور ہنگش پاس کا رستہ چھوڑ کر ملتان اور بھکر ہو کر چلے۔ مُلتان اُن کی جاگیر تھی۔ کچھ روپیہ کی تحصیل۔ کچھ فوج کی فراہمی۔ کچھ آگے کے بندوبستوں میں اور دیر لگی۔ انجام کو یہی ٹھیری۔ کہ ٹھٹھ کا فیصلہ کر دو۔ مرزا جانی حاکم ٹھٹھ کی اتنی

خطا ضرور تھی۔ کہ ہمایوں سے عالمِ تباہی میں اچھی طرح پیش نہ آیا تھا۔ اور اکبر کے دربار میں بھی تحفے تحائف بھیجتا رہا۔ خود حاضر نہ ہوا۔ اس لئے اُس پر اعتبار نہ تھا۔ چنانچہ نشان لشکر ادھر کی ہوا میں لہرایا **فیضی** نے تاریخ کہی۔ **قصدِ تتہ**۔ ملتان سے نکلتے ہی بلوچوں کے سرداروں نے حاضر ہو کر عہد و پیمان تازہ کئے۔

مرزا جانی کے ایلچی حاضر ہوئے کہ حضور کا لشکر قندھار پر جاتا ہے۔ مناسب ہے کہ میں بھی اس مہم میں ساتھ ہوں۔ مگر ملک میں مفسدوں نے سر اُٹھایا ہے۔ فوج خدمتگزاری کو بھیجتا ہوں۔ اُنہوں نے ایلچی کو الگ اُتارا۔ اور فوج کی رفتار تیز کی۔ خبر لگی۔ کہ قلعہ **سیوان** میں آگ لگ گئی ہے۔ اور مدتوں کا جمع کیا ہوا غلہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا ہے۔ مبارک شگون سمجھ کر اور بھی قدم بڑھائے۔ فوج نے دریا کے رستے قلعہ **سیوان** کے نیچے سے نکل کر **لکی** کو مار لیا۔ کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی۔ اور کنجی سندھ کی ہاتھ آگئی۔ لکی سندھ کے لئے ایسا ہے جیسا کہ بنگالہ کے لئے **گڈھی**۔ اور کشمیر کے لئے **بارہ مولا**۔ سپہ سالار نے قلعہ **سیوان** کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت یہ حاکم نشین قلعہ تھا۔ بنانے والے نے ایک پہاڑی پر بنایا تھا۔ چالیس گز خندق سات گز کی چوڑائی گویا لوہے کی دیوار تھی۔ آٹھ کوس لمبا۔ چھ کوس چوڑا۔ تین شاخیں دریا کی وہاں ملتی ہیں۔ مدعا یا کچھ جزیرہ میں اور کچھ کشتیوں میں رہتی تھی۔ ایک سردار چند کشتیاں لے کر دفعتہً جا پڑا۔ بڑی دولت ہاتھ آئی۔ اور رعیت نے اطاعت کی۔

مرزا جانی سنتے ہی فوج لے کر آیا۔ نصیر پور کے گھاٹ پر ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کی ایک طرف بڑا دریا تھا۔ باقی طرفوں میں نہریں نالے۔ اور اُن کے کیچڑ جھلے قدرتی بچاؤ تھے وہ قلعہ بنا کر بیچ میں اُترا۔ (دریتے کا ملک ہے وہاں قلعہ بنا لینا کچھ مشکل نہیں) اور توپ خانہ اور جنگی کشتیوں سے اُسے استحکام دیا۔ خان خاناں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اکبر نے جیسلمیر اور امرکوٹ کے رستے اور فوج بھیجی تھی۔ وہ بھی آن پہنچی۔ سپہ سالار نے ایک سردار کو اپنی جگہ چھوڑا۔ کہ قلعہ والوں کو روکے رہے۔ اور رسد کے لئے رستہ جاری رہے۔ دشمن نے چھ کوس پر جا کر چھاؤنی کی۔ گرداگرد دیوار تیار کر خاطر جمع سے بیٹھ گیا۔

غنیم کی طرف سے **خسرو چرکس** اُس کا غلام سپہ سالار تھا۔ وہ جنگی کشتیاں تیار کر کے چلا۔ کل کشتیاں ان کی دو سو تھیں۔ اور سو کشتی جنگی۔ خبر اُڑی۔ کہ فرنگیوں نے بندر

ہرمز سے اُس کی مدد کو فوج بھیجی ہے۔ یہ بھی اِدھر سے بڑھے۔ حریف کی کشتیاں چڑھاؤ پر لاتا تھا۔ مگر بہاؤ سے بھی تیز آتا تھا۔ شام قریب تھی۔ لڑائی دوسرے دن پر ملتوی رہی۔ خبر لگی۔ کہ مرزا جانی بھی خشکی سے آتا ہے۔ کئی سردار اُسی وقت فوج لے کر سوار ہوئے۔ اور اندھیری رات میں ہوا کی طرح پانی پر سے گذر کر پار جا پہنچے۔ اور یہاں دریا میں صبح ہوتے ہی توپ چلنی شروع ہوئی۔ مگر عجیب و غریب لڑائی تھی۔ دشمن نے چاہا۔ کہ چڑھ آئے۔ پانی کم تھا۔ اور سامنے سے پانی کا توڑ اس لئے نہ بڑھ سکا۔ جو بہادر رات کو پار اُترے تھے۔ توپ کی آواز سُنتے ہی سیل کی طرح دریا کی طرف دوڑ پڑے۔ کناروں پر آکر چھا گئے۔ اور پانی پر آگ برسانے لگے۔ خان خاناں کے پاس جنگی کشتیاں کل پچیس تھیں۔ اُنہیں کو چھوڑ دیا۔ اِدھر سے بہاؤ پر جاتا تھا۔ وہ موج کی طرح چلیں۔ اور دم میں تیر کے پلّے پر جا پہنچیں۔ آگ کی برسات نے ایک چھینٹا گولیوں کا مارا۔ اور پل کے پل میں برچھی اور جمدھر پر نوبت آگئی۔ بہادروں کا یہ عالم تھا۔ کہ کھولتے پانی کی طرح تیرتی پھرتی تھیں۔ ایک امیر کشتی کو دوڑا کر خسرو خاں پر پہنچا اور زخمی کیا۔ پکڑ ہی لیا تھا۔ مگر ایک توپ پھٹ گئی۔ اور کشتی ڈوب گئی۔ پروانہ حریف کا نامی سردار آگ کی جگہ پانی میں فنا ہوا۔ غنیم کے پاس فوج زیادہ۔ سامان پورا۔ مگر شکست پڑی۔ چار کشتیاں سپاہ اور اور اسباب جنگ سے بھری ہوئی قید ہوئیں۔ انہیں میں **قیطو رحرموز** تھا۔ حاکم حرموز اپنا ایک معتبر ٹھٹھہ میں رکھتا تھا۔ اُدھر کے تاجروں کے سب کاروبار میں امین (ایجنٹ) کہلاتا تھا۔ جانی بیگ اُسے ساتھ لے آیا تھا۔ اور اپنے بہت سے آدمیوں کو فرنگی فوج کی وردی پہنادی تھی +

اگر اس وقت گھوڑا اُٹھائے مرزا جانی پر جا پڑتے۔ تو ابھی مہم تمام تھی۔ مگر بے ہمتوں کی صلاح نے روک لیا۔ کہ دشمن ڈوبتا ڈوبتا سنبھل گیا +

بادشاہی فوج بہت تھی۔ خشکی میں امرا فوجیں لئے پھرتے تھے۔ اور جا بجا معرکے کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر مقام قبضہ میں آئے۔ اور رعایا نے اطاعت کی۔ امرکوٹ کا راجہ اطاعت کرکے مدد کو تیار ہوا۔ اور اُس کے سبب سے اِدھر کا رستہ صاف ہو گیا۔ ایک مقام کی رعایا نے کوؤں میں زہر ڈال دیا۔ ملک ریگستان پانی نایاب جو فوج بادشاہی اس رستہ گئی تھی۔ عجب مصیبت میں گرفتار ہوئی۔ نگاہیں خدا کی طرف تھیں۔ کہ اقبال اکبری نے یاوری کی۔ بے موسم بادل آیا۔ اور مینہ برس گیا۔ تالاب بھر گئے۔ خدا نے اپنے بندوں کی جانیں بچالیں +

اچھلے پڑتے تھے۔ کود کود کر کشتیوں میں جا پڑے۔ کشتیاں اور غراب مرغابیوں کی طرح

مرزا جانی گھبرا گیا۔ مگر فوج کی بہتات اور لڑائی کے سامان پر خاطر جمع تھی۔ جگہ کی مضبوطی دل کو قوی کرتی تھی۔ برسات کا بھی بھروسا تھا۔ وہ سمجھا ہوا تھا۔ کہ نہر بن نالے دریا سے زیادہ چڑھ جائینگے۔ بادشاہی لشکر آپ گھبرا کر اُٹھ جائیگا۔ نہ جائیگا تو گھر جائیگا۔ اِدھر بادشاہی فوج کو غلّہ کی کمی نے بہت تنگ کیا۔ سپہ سالار کبھی چھاؤنی کے مقام بدلتا تھا۔ کبھی لشکر کو اِدھر اُدھر بانٹتا تھا۔ ساتھ ہی دربار کو عرضی کی۔ اکبر کا خیال دریائے مہمات کی مچھلی تھا۔ امرکوٹ کے رستہ اِدھر سے بہت کشتیوں میں غلّہ اور جنگی سامان توپ تفنگ تلوار اور لاکھ روپیہ نقد فوراً روانہ ہوا۔

چوں بیچوں بیچ ولایت کا ہے۔ خان خاناں خود یہاں چھاؤنی ڈال کر بیٹھا۔ امراء کو مختلف مقاموں پر روانہ کیا۔ اور ایک لشکر قلعہ سیوان پر دریا کے رستے بھیجا۔ مرزا جانی کو خیال تھا۔ کہ بادشاہی لشکر دریا کی لڑائی میں کمزور ہے۔ اس پر خود فوج لے کر چلا۔ کہ رستہ میں ہاتھ مارے سپہ سالار بے خبر نہ تھا۔ دولت خاں[1]۔ خواجہ مقیم اور دھارا پسر ٹوڈرمل وغیرہ کو فوجوں کے ساتھ کمک کے لئے بھیجا۔ پہلی فوج گھبرا رہی تھی۔ کہ یہ دو دن میں چالیس کوس رستہ لپیٹ کر جا پہنچے۔ اور یہی معرکہ تھا جس میں خود مرزا جانی سے لشکر بادشاہی کا مقابلہ ہوا۔ امراء نے مشورت کا جلسہ کیا۔ پہلے صلاح ہوئی۔ کہ خان خاناں سے اور فوج منگاؤ۔ مگر دشمن کی فوج کا اندازہ کر کے غلبہ رائے کا اسی پر ہوا۔ کہ لڑ مرنا بہتر ہے۔ یہ دشمن سے چھ کوس پر پڑے تھے۔ چار کوس بڑھ کر استقبال کیا۔ اور بڑے استقلال اور سوچ سمجھ کے ساتھ لڑائی ڈالی۔ فتح کی خوشخبری ہوا پر آئی۔ کہ پہلے اُدھر سے اِدھر کو چل رہی تھی۔ لڑائی شروع ہوتے ہی رُخ بدل گیا۔ امرائے فوج کے چار پرے کر کے قلعہ باندھا۔ اور لڑائی شروع کی۔ غنیم کے ہراول اور دائیں کی فوج بڑے زور شور سے لڑی۔ امرائے شاہی نے جو کہ اُن کے مقابل تھے خوب مقابلہ کیا نامی سرداروں نے زخم اُٹھائے۔ مگر اپنے سامنے کی فوجوں کو اُٹھا کر کہیں کا کہیں پھینک دیا۔ بائیں کی فوج نے بھی اپنے سامنے کی فوج کو لپیٹ کر اُلٹ دیا۔ غنیم کی فوج ہراول میں خسرو چرکس تھا۔ اُس نے ہراول کو دبا کر ایسا ریلا کہ بائیں کو بھی تہ و بالا کر دیا۔ بادشاہی ہراول شمشیر عرب تھا۔ خوب ڈٹا۔ اور زخمی ہو کر گرا۔ رفیق میدان سے نکال لے گئے۔ ہوا بھی مدد کو آئی۔ گرد اور آندھی کا یہ عالم ہوا۔ کہ دشمن کو آنکھ نہ کھولنے دیتی تھی۔ دایاں کہیں جا پڑا۔ بایاں کہیں۔

[1] دولت خاں لودھی سپہ سالار خانخاناں ۱۰۰۸ھ میں احمد نگر کی فتح کے بعد درد قولنج سے مرگیا۔

دولت خاں نے فوج شاہی کے قلب سے نکل کر خوب خوب ہاتھ مارے۔ اُس کا رفیق
بہادر خاں حیران کھڑا تھا۔ اور قدرت الٰہی کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ کہ دونوں فوجوں کے انتظام
درہم برہم ہیں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اسی ریل دھکیل میں دو تین سردار اُس کے پاس پہنچے۔
ساتھ ہی خبر لگی کہ مرزا جانی چار پانچ سو سواروں سے الگ کھڑا ہے۔ اُنھوں نے خدا پر توکّل کر کے
باگیں اُٹھائیں ۔ اکبر کا اقبال دیکھو کہ کُل سو آدمی تھے۔ اُنہی سے اس کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ ایک
میدان بھی نہ لڑا۔ نوک دُم بھاگ گیا۔ اُس وقت دشمن کے ایک ہاتھی نے دوستوں کی خوب مدد
کی مستی میں آکر ہتھیائی کرنے لگا۔ اور اپنی ہی فوج کو برباد کر دیا ✤

دھارا رائے ٹوڈرمل کا بیٹا اس معرکہ میں خوب بڑھ بڑھ کر لڑا۔ وہ ہراول میں تھا۔
افسوس کہ پیشانی پر نیزہ کا زخم کھا کر گھوڑے سے گرا۔ خوشا نصیب کہ سرخرو دنیا سے گیا
پھر بھی کمبخت باپ کے حال پر افسوس کرنا چاہیئے۔ کہ جوان بیٹے کا داغ بڑھاپے میں دیکھا
میدان میں فتح کی روشنی ہو گئی تھی۔ اتنے میں امرا کو خبر لگی۔ کہ دشمن کی فوج بادشاہی لشکر کے
ڈیروں کو لُوٹ رہی ہے۔ یہ پہلے سے گئے تھے۔ کہ لڑائی کے وقت پیچھا مارینگے۔ خود
پیچھے پہنچے۔ سنتے ہی سرداروں نے گھوڑے اُڑائے۔ اور باز کی طرح شکار پر گئے۔
بھگوڑوں نے جان کو غنیمت سمجھا۔ جو مال لیا تھا پھینک کر بھاگ گئے۔ اُن کے تین سو۔
خان خاناں کے سو آدمی ضائع ہوئے۔ مرزا کئی جگہ پلٹ کر ٹھیرا۔ مگر خدائی سے کون لڑے
اس لڑائی کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ چھاؤنی کہیں۔ میدان جنگ کہیں۔ سپہ سالار خود کہیں
سب کو تائید آسمانی کا یقین ہو گیا۔ پانچ ہزار کو بارہ سَو نے بھگا دیا ✤

یہاں تو یہ معرکہ ہوا۔ اُدھر جس قلعہ کو مرزا جانی نے بُرے وقت کی پناہ سمجھا تھا۔
خان خاناں اُس پر جا پہنچا۔ اور حملہ ہائے مردانہ سے مسمار کر دیا۔ مرزا جانی میدانِ جنگ سے
بھاگ کر اُدھر گیا تھا۔ کہ گھر میں بیٹھ کر کچھ تدبیر کرے۔ رستہ میں سُنا۔ کہ قلعہ میدان ہو گیا۔
اور وہاں خانخاناں کی خیمہ گاہ ہے۔ بہت حیران ہوا۔ غور و تامّل کے بعد **ہالہ کنڈی** سے چار
کوس۔ سیوان سے چالیس کوس دریائے سندھ کے کنارہ پر جا کر دم لیا۔ اور ایک قلعہ بنا کر
بیٹھ گیا۔ بڑی گہری خندق گرد کھودی۔ خان خاناں بھی پیچھے پیچھے پہنچا۔ اور محاصرہ کر لیا ✤

لڑائی دن رات جاری تھی۔ توپ و تفنگ جواب سوال کرتے تھے۔ کہ ملک میں وبا
پڑی۔ اور اتفاق یہ کہ جو مرتا تھا سندھی مرتا تھا۔ فقرائے گوشہ نشین نے خواب دیکھے۔ کہ

جب تک اکبری سکّہ و خطبہ جاری نہ ہوگا۔ یہ بلا دفع نہ ہوگی۔ **وبا** ناشکری کی سزا ہے۔ سرکشی سے توبہ کرو۔ تو دفع ہو۔ یہ خواب جلد مشہور ہوئے۔ اور بندگانِ شاہی اور بھی قوی دل ہو کر مستعد ہو گئے۔ ریگستان کا ملک ہے۔ خاک تودے بناتے تھے۔ اور اُن کی اوٹ میں مورچے بڑھاتے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ قلعہ کے پاس جا پہنچے۔ محاصرہ ایسا تنگ ہؤا۔ کہ اہلِ قلعہ تنگ ہو کر زبان بزبان صلح کی کہانیاں سُنانے لگے۔ بادشاہی لشکر بھی خوراک سے تنگ ہو گیا تھا منظور کیا۔ عہد یہ ہؤا کہ **سیوستان** کا علاقہ سیوان سمیت اور بیس جنگی کشتیاں نذر کرے۔ مرزا ایرج یعنی سپہ سالار کے بیٹے کو اپنی بیٹی دے۔ اور برسات بعد حاضر دربار ہو۔ خان خاناں نے جنگی مورچے اُٹھائے۔ اور لڑائی کے میدان میں شادی کے شامیانے تن گئے۔ مرزا نے برسات لبسہ کرنے کو قلعہ خالی کر دیا ✦

لطیفہ۔ خان خاناں کے دربار میں جو شعرا لطائف وظرائف کے چمن کھلایا کرتے تھے۔ اُن میں مُلّا شکیبی شاعر تھے۔ اُنھوں نے اس لڑائی کی سرگذشت مثنوی میں ادا کی۔ اور حقیقت میں طلسم کاری دکھائی۔ خان خاناں ایک شعر پر بہت خوش ہؤا۔ اور اُسی وقت ہزار اشرفی دی ✦

ہمائے کہ برعرش کردے خرام   گرفتی و آزاد کردی زدام

لطف یہ ہے کہ جس وقت اِس نے خان خاناں کے دربار میں سُنائی۔ مرزا جانی بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے بھی ہزار ہی اشرفی دی اور کہا۔ رحمتِ خدا کہ مرا ہما گفتی اگر شغال میگفتی زبانت کہ میگرفت ✦

بادشاہ نے اِس مہم میں لاکھ روپیہ ایک دفعہ پچاس ہزار ایک دفعہ پھر لاکھ روپیہ لاکھ من غلّہ پھر سو بڑی توپیں اور توپچی دریا کے رستہ بھیجے۔ اور امرا بھی اپنی اپنی فوجیں لے کر پہنچے۔ ۱۰۰۱ھ کے جشن نوروزی میں بمقام لاہور خان خاناں اُسے لیکر حاضر ہوئے۔ ملازمت کے لئے دربار خاص ہؤا۔ بادشاہ مسند پر تھے۔ وہ کورنش اور آداب زمین بوس بجالایا۔ تین ہزاری منصب اور ٹھٹھہ کا ملک عنایت ہؤا۔ اور اس قدر عنائتیں فرمائیں کہ اُسے اُمید بھی نہ تھی۔ ہمارے مؤرّخوں کو اس بات کا خیال نہیں ہؤا کہ انسان کے کاروبار سے اُس کے دلی ارادوں کے سُراغ نکالتے۔ میں کئی جگہ لکھ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں۔ اکبر کو دریائی قوت بڑھانے کا بڑا خیال تھا۔ چنانچہ اس موقع پر تمام علاقہ اُس کا اُسی کو دے دیا۔ مگر بندرگاہ خالصہ ہو گئے آزاد کی تائید کلام کے لئے اکبر کا مراسلہ جو کہ عبداللہ ازبک کے نام لکھا ہے دفتر اوّل ابوالفضل

میں موجود ہے ✦

سنہ ۱۰۰۴ھ میں خان خاناں کو پھر دکن کا سفر پیش آیا۔ مگر اس سفر میں اُس نے کچھ کدورت اور نحوست بھی اُٹھائی۔ بنیاد مہم کی یہ ہوئی۔ کہ اکبر کو ملک دکن کا خیال اور خان اعظم کی ناکامی کا حال بھولا نہ تھا۔ جو سفارتیں اُدھر کے حاکموں کے پاس گئی تھیں۔ وہ بھی ناکام رہی تھیں۔ فیضی بھی برہان الملک کے دربار سے کامیاب نہ آیا تھا۔ کہ برہان الملک فرمانروائے احمد نگر مر گیا۔ ملک تو مدت سے تہ و بالا ہو رہا تھا۔ اب معلوم ہوا۔ کہ تیرہ چودہ برس کا لڑکا تخت نشین ہوا ہے۔ اور تختۂ حیات اس کا بھی کنارۂ عدم پر لگا چاہتا ہے ✦

اکبر نے مراد کو (روم کی چوٹ پر) سلطان مراد بنا کر لشکر عظیم کے ساتھ دکن پر روانہ کیا۔ آپ پنجاب میں آکر مقام کیا۔ کہ سرحد شمالی کا انتظام مضبوط رہے۔ مراد نے گجرات میں پہنچکر چھاؤنی ڈالی۔ اور مہم کا سامان کرنے لگا۔ کہ اکبری اقبال نے اپنی عملداری جاری کی۔ امرائے عادل شاہ فوج لے کر آئے۔ کہ ملک کا انتظام کریں۔ ابراہیم لشکر لے کر اس کے مقابلہ کو گیا احمد نگر سے چالیس کوس پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اور ابراہیم نے گلے پر تیر کھا کر میدان میں جان دی۔ سبحان اللہ۔ کل بھائی کو اندھا کر کے ہوش کی آنکھوں میں سُرمہ دیا تھا۔ آج خود دنیا سے آنکھیں بند کر لیں۔ ملک میں طوائف الملوکی ہو کر عجب ہل چل پڑ گئی۔ میاں منجو نے مراد کو عرضی بھیجی۔ کہ یہ ملک لاوارث ہو گیا۔ مملکت برباد ہو رہی ہے۔ حضور تشریف لائیں تو خانہ زاد خدمت کو حاضر ہیں ✦

اکبر کو جب یہ خبر پہنچی تو خان زماں کو روانگی کا حکم بھیجا۔ اور شہزادہ کو لکھا۔ کہ تیار رہو مگر حملہ میں تامل کرو۔ جس وقت خان خاناں پہنچے۔ اس وقت گھوڑے اُٹھاؤ۔ اور احمد نگر میں جا پڑو۔ شہزادہ کو جب اول خطاب و اختیارات ملے تھے۔ تو صورت حال سے لوگ سمجھے تھے۔ کہ تیز ہے۔ اور عالی ہمت ہے۔ خوب بادشاہت کریگا۔ مگر وہ تیزی فقط کوتاہ اندیشی اور خود پسندی اور سفلہ مزاجی نکلی۔ صادق محمد خاں وغیرہ اس کے سرداروں کو مزاج میں بہت دخل تھا۔ وہ سمجھے کہ جب خان خاناں آگیا تو ہم بالائے طاق اور اُس کی روشنی سے شاہزادہ کا چراغ بھی مدھم ہو جائیگا۔ پہلے تو اُنھوں نے بھی پھونکی ہو گی۔ کہ اس کے آنے سے حضور کے اختیارات میں فرق آگیا۔ اور اب جو فتح ہو گی۔ اُس کے نام ہو گی۔ خانخاناں کے جاسوس بھی موکلوں اور جناتوں کی طرح جابجا پھیلے رہتے تھے۔ اور جا بجا کی خبریں پہنچاتے تھے۔ رستہ میں خبر پائی کہ

برہان الملک مرگیا۔ اور عادل شاہ نے احمد نگر پر حملہ کیا۔ ساتھ خبر سُنی۔ کہ امرائے احمد نگر نے شاہزادہ مراد کو عرضی لکھ کر بُلا لیا ہے۔ اور وہ احمد آباد سے روانہ ہوا چاہتا ہے۔ یہ خوشی خوشی چلا۔ مگر تقدیر کو خوشی منظور نہ تھی۔ اوّل تو خانخاناں کا جانا کسی سردار سپاہی کا جانا نہ تھا۔ اسے تیاری سپاہ وغیرہ میں ضرور دیر لگی ہوگی۔ دوسرے مالوہ کے رستہ سفر کیا۔ تیسرے بھیلسہ اُس کی جاگیر رستہ میں آیا۔ وہاں خواہ مخواہ ٹھیرنا پڑا ہوگا۔ راستہ میں راجاؤں اور فرمانرداؤں سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہونگی۔ اور ظاہر ہے کہ اُن کی ملاقاتیں فائدہ سے خالی نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ برہان پور کے پاس پہنچا۔ تو راجی علی خاں حاکم خاندیس سے ملاقات ہوگئی۔ اُنہوں نے اپنی حکمت عملی اور حسن تقریر اور گرمجوشیوں کے جادو سے اُسے رفاقت پر آمادہ کیا۔ لیکن ان جادوؤں کا اثر کچھ نہ کچھ وقت چاہتا ہے۔ اتنے میں شاہزادہ کا فرمان آیا۔ کہ مہم خراب ہوتی ہے۔ جلد حاضر ہو۔ اور ہرکاروں نے خبر پہنچائی۔ کہ شہزادہ نے لشکر کو آگے بڑھایا ہے۔ انہوں نے لکھا۔ کہ راجی علی خاں آنے کو حاضر ہے۔ اور فدوی چلا آیا۔ تو اِس مصلحت میں خلل آجائیگا۔ شہزادہ کے دل میں کدورت تو ہوتی ہی جاتی تھی۔ اب بہت بڑھ گئی۔ خانخاناں کو بھی اس کے دربار کی خبریں برابر پہنچتی تھیں۔ اُس عرضی نے جو وہاں رنگ دیا۔ اُس کا حال سُنکر اپنا لشکر فیل خانہ توپ خانہ وغیرہ وغیرہ اور اکثر امرا کو پیچھے چھوڑا۔ آپ راجی علی خاں کو ساتھ لیکر دوڑے شہزادے نے سُن کر بیس ہزار لشکر رکاب میں لیا۔ اور آگے بڑھ گیا۔ اُنہوں نے مارا مار احمد نگر سے تیس کوس پر جا لیا۔ لگانے والوں نے ایسی نہیں لگائی تھی جو بجھ بھی سکے پہلے دن تو سلام ہی نصیب نہ ہوا۔ خان خاناں حیران کہ ہزار کارسازیوں سے میں ایسے شخص کو ساتھ لایا۔ جس کی رفاقت فتح و اقبال کی فوج ہے۔ یہ حسن خدمت کا انعام ملا۔ دوسرے دن ملازمت ہوئی تو شہزادہ تیوری چڑھائے منہ بنائے۔ یہ بھی خان خاناں تھے۔ رخصت ہو کر اپنے خیموں میں آئے۔ مگر بہت رنج۔ اور فکر یہ کہ عقل و تدبیر کا پُتلا جو میرے ساتھ آیا ہے اس حالت کو دیکھ کر کیا کہتا ہوگا۔ اور جو میں نے سمجھایا تھا۔ اُسے کیا سمجھا ہوگا۔ امراء اور لشکر جو پیچھے تھا۔ وہ آئے مصلحت وقت یہ تھی کہ اُن کے آنے کی شان و شوکت دکھاتے اُنہیں خدمتیں سپرد ہوتیں۔ دل بڑھائے جاتے۔ یہاں دلداری کے بدلے دلشکنی اور دل آزاری

ہر دم آزردگیٔ غیر سبب راچہ علاج	ماگذشتیم ز لطفِ تو غضب راچہ علاج

وہ بھی آخر خان خاناں تھا۔ اُٹھ کر اپنے لشکر میں چلا آیا۔ اُس وقت آنکھیں کھُلیں

امیروں کو دوڑایا۔ نامے لکھے۔ غرض جس طرح ہؤا صفائی ہوگئی۔ مگر اس سے یہ قاعدہ معلوم ہوگیا کہ ایک بالیاقت اور باسامان شخص جو سب کچھ کر سکتا ہے وہ ماتحت ہو کر کچھ نہیں کر سکتا۔ بلکہ کام بھی خراب ہوتا ہے۔ اور وہ خود بھی خراب ہوتا ہے +

جن لوگوں نے خان خاناں کا یہ حال کردیا۔ وہ اور امیروں کو کیا خاطر میں لاتے تھے۔ اوروں کو بھی بے عزت کرواتے تھے۔ اس لئے لشکر میں ناخوشیاں عام ہو رہی تھیں۔ راجی علی خاں کو بھی خان خاناں کا ہمان سمجھ کر دربار میں ایک آدھ چکمہ دے دیا۔ غرض مہم کا رنگ بگڑنا شروع ہؤا اب اُدھر کی سُنو۔ کہ چاند بی بی برہان الملک کی حقیقی بہن حسین نظام شاہ کی بیٹی۔ علی عادل شاہ کی بی بی علاوہ عظمتِ خاندانی اور عفتِ ذاتی کے اپنی عقل و تدبیر اور سخاوت و شجاعت۔ قدر دانی۔ کمال پروری کے جواہرات سے جڑاؤ پتلی تھی۔ اسواسطے نادرۃ الزمانی کہلاتی تھی۔ اور وہی ملک کی وارث رہ گئی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ ملک چلا۔ اور خاندان کا نام مٹتا ہے۔ تو چہرہ کی نقاب سے ہمت کی کمر باندھ کر کھڑی ہوگئی۔ اور امراء کو بُلا کر تسلی اور دلاسے کے ساتھ سمجھایا۔ وہ بھی اکبری لشکر کو دریا کی طرح لہراتا دیکھ کر اپنے اور ملک کے انجام کو سوچے۔ جو عرضیاں شہزادہ کو اور اس کے خان خاناں کو بھیجی تھیں۔ اُن پر بہت پچھتائے۔ سب نے مل کر مشورت کی۔ صلاح ٹھہری۔ کہ چاند بی بی قلعہ احمد نگر میں سلطنت کی وارث بن کر تخت پر بیٹھے۔ ہم حق نمک ادا کریں۔ اور جہاں تک ہو سکے۔ احمد نگر کو بچائیں +

اُس شاہ مزاج بیگم نے جنگ کے سامان رسدوں کے ذخیرے جمع کرنے شروع کئے دربار کے امیروں اور اطراف کے زمینداروں کی دلداری اور دلجوئی میں مصروف ہوئی۔ احمد نگر کو مضبوطی اور مورچہ بندی کرکے سدِ سکندر بنا لیا۔ بہادر شاہ بن ابراہیم شاہ کو برائے نام وارث ملک قرار دے کر تخت پر بٹھایا۔ ایک سردار کو بیجاپور بھیج کر ابراہیم عادل شاہ سے صلح کر لی جمعیت و لشکر کو لے کر اپنی جگہ قائم ہوگئی۔ اور اس استقلال و انتظام سے مقابلہ کیا۔ کہ مردوں کے ہوش اُڑ گئے اور خاص و عام میں چاند بی بی سلطان کا نام ہوگیا +

یہاں یہ بندوبست تھے۔ کہ شاہزادہ مراد امرائے کبار کے ساتھ پہنچا۔ اور فوج جرار کو لئے شمال احمد نگر سے اس طرح گرا جیسے پہاڑ سے سیلِ دریا بار گرے۔ یہ فوج میدان نمازگاہ میں ٹھہری۔ اور ایک دستہ دلاوروں کا چبوترہ کے میدان کی طرف بڑھا۔ چاند بی بی نے قلعہ سے دکھنی بہادروں کو نکالا۔ انہوں نے تیر و تفنگ کے دہان و زبان سے جواب سوال کئے قلعہ کے مورچوں سے

گولے بھی مارے۔ اس لئے فوج شاہی آگے نہ بڑھ سکی۔ شام بھی قریب تھی۔ شاہزادہ اور تمام امیر باغ ہشت بہشت میں کہ برہان نظام شاہ نے سرسبز و سرفراز کیا تھا اُتر پڑے۔ دوسرے دن شہر کی حفاظت اور اہل شہر کی دلداری میں مصروف ہوئے۔ گلی کوچوں میں امان امان کی منادی کردی۔ اور ایسا کچھ کیا کہ گھر گھر میں آمین آمین اور سوداگر۔ مہاجن سب کی خاطر جمع ہوگئی دوسرے دن شاہزادہ۔ مرزا شاہ رُخ۔ خانخاناں۔ شہباز خاں کمبو۔ محمد صادق خاں۔ سید مرتضیٰ سبزواری۔ راجی علی خاں حاکم برہان پور۔ راجہ جگن ناتھ مان سنگھ کا چچا وغیرہ امرا جمع ہوئے۔ کمیٹی کر کے محاصرہ کا انتظام کیا اور مورچے تقسیم ہوگئے۔

قلعہ گیری اور شہرداری کا کام نہایت اسلوب سے چل رہا تھا۔ کہ شہباز خاں کو شجاعت کا جوش آیا۔ شہزادے اور سپہ سالار کو خبر بھی نہ کی۔ جمعیت کثیر لیکر گشت کے بہانہ نکلا اور لشکر کو اشارہ کیا کہ امیر فقیر جو سامنے آئے لُوٹ لو۔ دم کے دم میں کیا گھر کیا بازار تمام احمد نگر اور برہان آباد لُٹ کر ستیاناس ہوگیا۔ اور چونکہ اپنے مذہب میں نہایت تعصب رکھتا تھا۔ ایک مقام بارہ امام کا لنگر کہلاتا تھا۔ اور اس کے آس پاس تمام شیعہ آباد تھے۔ سب کو قتل اور غارت کر کے دشت کربلا کا نقشہ کھینچ دیا۔ شہزادہ اور خانخاناں سُن کر حیران رہ گئے۔ اُسے بُلا کر سخت ملامت کی۔ غارت گروں نے قتل۔ قید۔ قصاص سے سزائیں پائیں۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ غارت زدوں کے پاس کپڑا تک نہ تھا۔ رات کے پردہ میں جلاوطن ہو کر نکل گئے۔

اس موقعہ پر میاں منجھو تو احمد شاہ کو بادشاہ بنائے عادل شاہ کے سر پر بیٹھے تھے (۲) اخلاص حبشی موتی شاہ گمنام کو لئے دولت آباد کے علاقہ میں پڑے تھے (۳) آہنگ خاں حبشی ستر برس کے بڈھے شاہ علی ابن برہان شاہ اول کے سر پر چتر لگائے کھڑے تھے۔ سب سے پہلے اخلاص خاں نے ہمت کی۔ دولت آباد کی طرف سے دس ہزار لشکر جمع کر کے احمد نگر کی طرف چلا۔ جب لشکر اکبر شاہی میں یہ خبر پہنچی تو سپہ سالار نے پانچ چھ ہزار دلاور انتخاب کئے۔ دولت خاں لودھی کو کہ اُن کی سپاہ کا گذر سرہند تھا۔ اس پر سپہ سالار کر کے روانہ کیا۔ نہر گنگ کے کنارہ پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہُوا۔ اور کشت و خون عظیم کے بعد اخلاص خاں بھاگے۔ لشکر بادشاہی نے لوٹ مار سے دل کا ارمان نکالا۔ وہیں پٹن کی طرف گھوڑے اُٹھائے۔ شہر مذکور آبادی سے گلزار ہو رہا تھا۔ مگر اس طرح لٹا کہ کسی کے پاس پانی پینے کو پیالہ تک نہ رہا۔ ان باتوں نے اہل دکن کو ان لوگوں سے بیزار کر دیا۔ اور جو ہوا موافق ہوئی تھی بگڑ گئی۔

میاں منجھو اگرچہ زور زر اور قوتِ لشکر رکھتا تھا۔ مگر اُس کی چالاکی غضب تھی۔ اس لئے چاند سلطان بیگم نے آہنگ خاں حبشی کو لکھا کہ جس قدر ہو سکے دکنی دلاوروں کی سپاہ فراہم کر کے حفاظت قلعہ کے لئے حاضر ہو۔ وہ سات ہزار سوار لے کر احمد نگر کو چلا۔ شاہ علی اور مرتضیٰ اُس کے بیٹے کو ساتھ لیا۔ چھ کوس پر آکر ٹھیرا۔ اور جاسوس کو بھیج کر حال دریافت کیا۔ کہ محاصرہ کا کیا طور ہے اور کس پہلو پر زور زیادہ ہے کس پہلو پر کم۔ اُس نے دیکھ بھال کر خبر پہنچائی۔ کہ قلعہ کی شرقی جانب خالی ہے۔ ابھی تک کسی کو ادھر کا خیال نہیں۔ آہنگ خاں تیار ہوا٭

ادھر قدرت کا تماشا دیکھو کہ اسی دن شاہزادہ نے گشت کر کے یہ مقام دیکھا اور خانخاناں کو حکم دیا تھا۔ کہ ادھر بند وبست تم بذاتِ خود کرو۔ اور وہ بھی اُسی وقت ہشت بہشت سے اُٹھ کر یہاں آن اُترا۔ اور جو مکانات پائے۔ اُن پر قبضہ کر لیا۔ آہنگ خاں نے تین ہزار سوار انتخابی اور ہزار پیادہ توپچی ساتھ لئے اور اندھیری رات میں کالی چادر اوڑھ کر قلعہ کی طرف چلا۔ دونوں حریف ایک دوسرے سے بیخبر۔ خبر ہوئی تو اُسی وقت کہ چھری کٹاری کے سوا بال بھر فرق نہ رہا خانخاناں فوراً دو سو دلیروں کو لیکر عمارت عبادت کے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ اور تیر اندازی و تفنگ بازی شروع کر دی۔ اُن کا میر شمشیر وہی دولت خاں لودھی سُنتے ہی چار سو سواروں کو لے کر دوڑا۔ یہ اس کے ہم ذات اور ہم جان افغان تھے۔ جان توڑ کر اڑ گئے۔ پیر خاں دولت خاں کا بیٹا چھ سو بہادروں کو لے کر کمک کو پہنچا۔ اور اندھیرے ہی میں بزن بزن ہونے لگی۔ آہنگ خاں نے دیکھا کہ اس حالت کے ساتھ لڑنے میں سوا مرنے کے کچھ فائدہ نہیں۔ معلوم ہؤا کہ خان خاناں کی تمام فوج مقابلہ میں مصروف ہے خیمہ و خواب گاہ کی جانب خالی ہے۔ چار سو دکنی دلیر اور شاہ علی کے بیٹے کو لے کر گھوڑے مارے اور بھاگا بھاگ قلعہ میں گھس ہی گیا۔ شاہ علی ستر برس کا بڈھا تھا۔ اُس کی ہمت نہ پڑی۔ دم کو غنیمت سمجھا۔ اور باقی فوج کو لے کر جس رستہ آیا تھا اُسی رستے بھاگا۔ دولت خاں نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ مارا مار نو سو آدمی کاٹ کر اُلٹا پھرا٭

بادشاہی لشکر گرد پڑا تھا مورچے امراء میں تقسیم تھے۔ سب زور مارتے تھے اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ شہزادہ کی سرکار میں فتنہ انگیز کوتہ اندیش جمع ہو گئے تھے۔ میدان میں دھاوا نہ مارتے تھے۔ ہاں دربار میں گھڑے ہو کر ایک دوسرے پر خوب پیچ مارتے تھے۔ شہزادہ کی تدبیر میں اتنا زور نہ تھا۔ کہ اُن کی شرارتوں کو دبا سکے۔ اور آپ وہ کرے جو کہ مناسب ہو۔ یہ بات غنیم سے لیکر اُس کی رعایا تک سب جان گئے تھے٭

بنجارے رستہ میں لُٹتے تھے۔ رسد کی تنگی تھی۔ اندر سے گولے برستے تھے۔ مورچے خراب۔ دمدمہ ویران ہوتے تھے۔ رات کو شبخون مارتے تھے۔ نامی سردار مارے جاتے تھے۔ قلعہ کی اینٹ نہ ہلتی تھی۔ میدان میں بھی معرکے ہوتے تھے۔ کئی دفعہ غنیم نے شکست کھائی۔ پیچھا کرتے تو زیادہ کامیاب ہوتے۔ مگر وہ سب کھڑے تماشہ دیکھا کئے۔ ایک شب خانخاناں کے مورچے پر شبخون آیا۔ فوج ہشیار تھی۔ بڑی سختی سے مقابلہ کیا۔ دلاوروں کی سپاہگری سرخرو ہوئی۔ حریف صبح ہوتے خاک اُڑا کر قلعہ میں بھاگ گئے۔ اگر اور امرا تعاقب کرتے۔ حضور انور تازہ دم لشکر کو لے کر پہنچتے تو ساتھ ہی اندر گھُس جاتے۔ نفاق وحسد کا منہ سیاہ کہ سب مُنہ دیکھا کئے۔ ہزار طرح کی کوشش اور لاکھ جانکاہی سے مورچے بڑھاتے بڑھاتے تین سُرنگیں بُرجوں کے نیچے پہنچیں۔ روپیہ بھی بے حد ہی خرچ ہوا۔ مگر اس شیر بی بی نے اپنی ہمت اور جاسوسوں کی تلاش سے پتے لگا کر دو سرنگوں کے سرے نکال لئے۔ دھاوے سے ایک دن پہلے زمین کھود کر بارود کے تھیلے کھینچ لئے۔ طرّہ اس پر یہ کہ مشکیں اور ٹھلیاں بھر بھر کر اتنا پانی ڈلوایا۔ کہ آگ کی جگہ پانی اُبلنے لگا۔ قلعہ والے تیسری نقب کی فکر میں تھے۔ کہ اُدھر سے شہزادہ اور خان خاناں فوجیں لے کر سوار ہوئے۔ اور بہادر دھاوے کے لئے تیار کھڑے۔ حکم ہوا کہ فتیلوں کو آگ دکھاؤ۔ واہ واہ صادق محمد خاں فساد کی دیا سلائی۔ اور انہی کی سرنگ پانی پانی پائی ✦

	اُن کے فانی کے گھر کا تھا وہ تنور		جس سے طوفان نے کیا تھا ظہور	

دوسری کو آگ دی وہ بھی غش۔ **تیسری** اُڑی کہ یہی سب سے بڑی بھی تھی۔ پچاس گز دیوار گری۔ عجیب قیامت نمودار ہوئی۔ دُنیا دھوآں دھار ہو گئی۔ الٰہی تیری امان۔ پتھر اور آدمی کبوتروں کی طرح ہوا میں اُڑے جاتے تھے۔ اور قلابازیاں کھاتے زمین پر آتے تھے۔ کہیں کے کہیں کوسوں پر جا پڑے۔ امراء میں سے کسی نے دھاوا نہ کیا۔ حیران کھڑے تھے۔ کہ اور سُرنگیں کیوں نہیں اُڑتیں۔ آگے نہ بڑھتے تھے۔ کہ مبادا چتوڑ والی آفت یہاں بھی نازل ہو اور بات وہی تھی۔ کہ اپنی اپنی جگہ جی چُرا گئے۔ ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتا تھا۔ آپس کی پھُوٹ سے بڑا وار خالی کھویا۔ قلعہ والوں کی خاطر جمع تھی۔ کہ امرائے شاہی یک دل نہیں ہیں آہنگ خاں وغیرہ بڑے بڑے نامی گرامی امیروں نے جب یہ حال دیکھا تو سب پیچھے ہٹے۔ اور صلاح ٹھیرائی کہ قلعہ خالی کر کے نکل چلیں۔ مگر آفرین ہے چاند بی بی کی ہمت مردانہ کو۔ اُس شیر دل عورت

نے اتنی ہی فرصت کو غنیمت سمجھا۔ برقع سر پر ڈالا۔ تلوار کمر سے لگائی۔ دوسری تلوار سونت کر ہاتھ میں لے بجلی کی طرح بُرج پر آئی۔ تختے۔ کڑیاں۔ بانس۔ ٹوکرے گارے کے بھرے تیار تھے۔ بڑے بڑے تھیلے اور سارے مصالحہ لئے اتنے وقت کی منتظر بیٹھی تھی۔ گری ہوئی دیوار پر آپ کھڑی ہوئی میٹھی زبان۔ زر کا زور کچھ لالچ کچھ دھمکاوے سے۔ غرض ایسا کچھ کیا کہ عورت اور مرد سب آکر لپٹ گئے۔ پل کی پل میں فصیل کو برابر اُٹھالیا۔ اور اُس پر چھوٹی چھوٹی توپیں چڑھا دیں۔ جب بادشاہی لشکر ریلا دے کر جاتا اُدھر سے گولے اس طرح آتے جیسے اولے برستے ہیں۔ اکبری فوج کی طرح ٹکر کھا کر اُلٹی پھرتی تھی۔ ہزاروں آدمی کام آئے اور کام کچھ نہ ہوا۔ شام کو ناکام ڈیروں کو پھر آئے۔

جب رات نے اپنی سیاہ چادر تانی۔ شاہزادہ مع لشکر اور مصاحبوں سمیت نامراد اپنے ڈیروں پر چلے آئے۔ چاند بی بی چمک کر نکلی۔ بہت سے راج اور معمار جلد کار ہزاروں مزدور اور بیلدار تیار تھے۔ آپ گھوڑے پر سوار تھی مشعلیں روشن تھیں۔ چُونے گچ کے ساتھ چنائی شروع کر دی روپے اور اشرفیاں مٹھیاں بھر کر دیتی جاتی تھی۔ راج مزدوروں کا بھی یہ عالم تھا۔ کہ پتھر اور اینٹ بالائے طاق۔ ملبہ۔ لکڑ بلکہ مردوں کی لاشیں تک جو ہاتھ میں آتا تھا برابر چُنتے جاتے تھے۔ بادشاہی لشکر صبح کو اُٹھا۔ اور مورچوں پر نظر ڈالی۔ دیکھیں تو پچاس گز فصیل جس کا تین گز عرض تھا۔ راتوں رات سدِ سکندر۔ اُس کے علاوہ جو جو تدبیریں اُس ہمت والی بی بی نے کیں۔ اگر تفصیل لکھوں تو دربار اکبری میں چاندنی کھل جائے۔ کہتے ہیں اخیر کو جب غلہ ہو چکا اور رسد بند ہو گئی۔ اور کہیں سے کمک نہ پہنچی تو اُس نے لشکرِ بادشاہی پر چاندی سونے کے گولے ڈھال ڈھال کر مارنے شروع کر دیئے۔

اس عرصے میں خان خاناں کو خبر لگی کہ سہیل خاں حبشی عادل شاہ کا نائب ستر ہزار فوج جرار لے کر آتا ہے۔ ساتھ ہی معلوم ہوا کہ رسد اور بنجارہ کا رستہ بھی بند ہو گیا۔ آس پاس کے میدانوں میں لکڑی بلکہ گھاس کا تنکا نہ رہا۔ گرد کے زمیندار سب پھر گئے۔ لشکر کے جانور بھوکوں مرنے لگے۔ ادھر سے چاند بی بی نے صلح کا پیغام بھیجا۔ کہ برہان الملک کے پوتے کو حضور میں حاضر کرتی ہوں۔ احمد نگر اُس کی جاگیر ہو جائے۔ ملک برار کی کنجیاں۔ عمدہ ہاتھی جواہر گرانبہا۔ نفائس و عجائب شاہانہ پیش کرتی ہوں۔ آپ محاصرہ اُٹھالیں۔ باخبر اہلکاروں نے عرض کی کہ قلعہ میں ذخیرہ نہیں رہا۔ اور غنیم نے ہمت ہار دی ہے۔ کام آسان ہو گیا۔ صلح کی کچھ

حاجت نہیں۔ مگر دوسرے طرح سیاہ کچھ رشوتوں نے پیچ مارا۔ کچھ حماقتوں نے آنکھوں میں خاک ڈالی۔ صلح پر راضی ہو گئے۔ باہر سے یہ خبر لگی تھی۔ کہ بیجاپور سے عادل شاہی لشکر جمعیت کر کے چاند بی بی کی مدد کو آتا ہے۔ چار و ناچار سب الصلح خیر کا عقد پڑھ کر رخصت ہوئے اور محاصرہ اُٹھا لیا۔

شاہزادہ نے جب عادل شاہ کی فوج کی آمد سُنی۔ دفعتہً دفعیہ کو چلا۔ چند منزل پر سُنا کہ خبر ہوائی تھی۔ یہ ادھر سے برابر کو مُڑے۔ مگر بے لیاقت سردار محاصرہ سے ایسے بے طور اُٹھے تھے کہ غنیم پیچھے پیچھے نقارے بجاتا آیا۔ اور جہاں قابو پایا۔ اسباب اور مال لوٹتا آیا۔ لشکر بدحال تھا۔ بے سامانی اور رسد کی کمی حد سے گزر گئی تھی۔ امرا میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ کوئی روک نہ سکا۔ سپہ سالار آزمودہ کار اور منتظم روزگار تھا۔ چاہتا۔ تو سارے کاروبار باتوں باتوں میں درست کر لیتا۔ مگر شیطانوں نے شہزادے کے کان میں یہ پھوکی تھی کہ خان خاناں چاہتا ہے کہ فتح میرے نام ہو۔ غلام حضور کے جاں نثار ہیں کہ حضور کا نام روشن ہو۔ مور کھ شہزادہ سمجھا کہ ان نالائقوں سے کچھ نہ ہو سکیگا۔ خان خاناں خاموش۔ جو حکم ہوتا تھا سو کرتا تھا۔ اور اُن کی عقل و تدبیر کے تماشے دیکھتا تھا۔ کبھی ہنستا تھا۔ کبھی جلتا تھا۔ پھر بھی جہاں تک ممکن تھا مہم کو سنبھالے جاتا تھا کہ آقا کا کام نہ بگڑے۔ ملک دکن کی کنجی (راجی علی خاں) اس کی کمر میں تھی۔ وہ عجب جوڑ توڑ کے مضمون نکالتا تھا۔ خان مذکور کی بیٹی کو شاہزادہ مراد سے منسوب کر کے اکبر کا سمدھی بنا دیا۔ اب وہ خواہ مخواہ لشکر میں شامل تھا۔ کئی ہزار فوج اُس کے ساتھ۔ داماد کو چھوڑ کر خُسر کہاں جا سکتا ہے۔

اسی عرصہ میں برار پر قبضہ ہو گیا۔ بادشاہی لشکر نے وہاں مقام کیا۔ شاہزادہ نے شاہ پور آباد کر کے اپنا پایہ تخت بنایا۔ علاقے امرا کی جاگیر میں تقسیم کئے۔ اونٹ۔ گھوڑے اطراف میں بھیج دیئے مگر مشکل یہ تھی۔ کہ خود پسند اور خود رائے غضب کا تھا۔ باپ کے رکن دولت جاں نثاروں کو ناحق ناراض کرتا تھا۔ چنانچہ شہباز خاں کمبو ایسا تنگ ہوا۔ کہ بے اجازت اُٹھ کر اپنے علاقے کو چلا گیا۔ وہ کہتا تھا۔ کہ صلاح کرنی صلاح وقت نہیں۔ میں دعا کرتا ہوں۔ احمد نگر کی لوٹ میری فوج کو معاف ہو۔ شاہزادہ نے نہ مانا۔

باوجود ان باتوں کے شہزادہ نے اطراف ملک پر قبضہ کے ہاتھ پھیلائے۔ چنانچہ پاتھری وغیرہ علاقے لے لئے۔ سہیل خاں عادل شاہ کی طرف سے امرائے احمد نگر کے جھگڑے چکانے آیا

تھا۔ وہ پھراہؤا جاتا تھا۔ اُس نے جب یہ خبریں سُنیں تو بہت برہم ہؤا۔ اس کے علاوہ چاند سلطان نے بھی عادل شاہ کو جو رشتہ میں چھوٹا دیور ہوتا تھا لکھا اُس پر فرمانروایانِ دکن نے اتفاق کر کے لشکر جمع کئے۔ اور سب متفق کہ کے ہو کر ساٹھ ہزار جمعیت کے ساتھ فوج بادشاہی پر آئے +

خان خاناں کا اقبال مدت سے خواب نازمیں پڑا سوتا تھا۔ اُس نے انگڑائی لیکر کروٹ لی۔ چنانچہ یہ حال دیکھ کر اُس نے شہزادہ اور صادق محمد خاں کو شاہ پور میں چھوڑا۔ اب شاہرخ مرزا اور راجی علی خاں کو لے کر بیس ہزار فوج کے ساتھ بڑھا۔ اس معرکہ کی فتح خان خاناں کا وہ کارنامہ ہے کہ افق مشرق پر شعاع آفتاب سے لکھا جائے۔ **نہر گنگ** کے کنارے **سون پت** کے پاس مقام کیا۔ اور یہاں چند روز ٹھیر کر ملک کا حال معلوم کیا۔ لوگوں سے واقفیت پیدا کی ایک دن فوجیں آراستہ کر کے مقام **اشتی** پر فوجوں کی تقسیم کی۔ دریا میں پانی بہت کم تھا۔ پایاب اُتر گیا **باتھری** سے بارہ کوس ماندیر کے مقام پر میدان جنگ قرار پایا +

۱۷ رجمادی الثانی ۱۰۰۵ھ ۱۵۹۷ء تھی کہ سہیل خاں عادل شاہ کا سپہ سالار تمام فوجوں کو لیکر میدان میں آیا۔ دائیں پر اُمرائے نظام شاہی۔ بائیں پر قطب شاہی۔ آپ بڑے غروروں کی فوج لیکر نشان اُڑاتا آیا۔ اور قلب میں قائم ہؤا۔ لشکر کا شمار ہزاروں سے بڑھا ہؤا تھا۔ وہ ساراٹڈی دل بڑے گھمنڈ اور دھوم دھام سے جرأت کے قدم مارتا آگے بڑھا۔ چغتائی سپہ سالار بھی بڑے آن بان سے آیا۔ چاروں طرف پرے جما کر قلعہ باندھا جن میں راجی علی خاں اور راجہ رامچندر راجپوت دائیں پر تھے۔ خود مرزا شاہ رُخ اور مرزا علی بیگ اکبر شاہی کو لئے قلب میں کھڑا تھا +

پہر دن چڑھا تھا کہ توپ کی آواز میں لڑائی کا پیغام پہنچا۔ سہیل خاں کو اس معرکے میں بڑا گھمنڈ اپنے توپ خانہ پر تھا۔ فی الحقیقت ہندوستان میں اوّل توپ خانہ آیا تو دکن میں آیا۔ وہ ملک کئی بندرگاہوں سے ملا ہؤا تھا۔ جو سامان اس کا وہاں تھا۔ اور کہیں نہیں تھا۔ اُس کا آتش خانہ جیسا عمدہ تھا۔ ویسا ہی بہتات کے ساتھ تھا۔ پہلے ہی ہراول نے ہراول سے ٹکر کھائی۔ راجی علیخاں اور راجہ رام چندر نے توپ خالی کرنے کی فرصت ہی نہ دی۔ اور جا ہی پڑے۔ پھر بھی ہراول کی فوجیں غالب و مغلوب ہو کر کئی دفعہ بڑھیں اور ہٹیں۔ مگر بہادران مذکور نے اُٹھا کر پھینک دیا۔ دکھنی پیچھے ہٹے مگر حکمت عملی کے ساتھ۔ لشکر بادشاہی کو کھینچ کر ایک دشوار گذار مقام میں لے گئے۔ پھر جو پلٹے تو وستِ راست سے آئے۔ اور اِدھر اُدھر نکل کر چاروں طرف پھیل گئے۔ لڑائی کا دریا میدان میں موجیں مار رہا تھا۔ اور فوجیں ٹکرا کر بھنور کی طرح چکر مارتی تھیں۔ سردار حملے کرتے

تھے۔ مگر اُس دریا کا کنارہ نظر نہ آتا تھا۔

دن ڈھل گیا۔ اور لڑائی بدستور جاری۔ دفعتہً ایک لطیفہ غیبی نمودار ہؤا۔ اسے تائید الٰہی کہو یا خان خاناں کی نیک نیتی کا پھل سمجھو۔ تدبیر کو اصلا دخل نہیں۔ علی بیگ رومی توپ خانہ غنیم کا افسر تھا۔ خود بخود اُدھر سے پہلو بچا کر نکلا۔ گھوڑا مار کر خان خاناں کے پاس آ کھڑا ہؤا۔ اور کہا۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔ حریف نے تمام توپ خانہ ٹھیک آپ کے مقابل میں چُن رکھا ہے۔ اور اب مہتاب دکھایا چاہتا ہے۔ جلد دائیں کو ہٹیے۔ خان خاناں کو اُس کے قیافہ سے معلوم ہؤا۔ کہ جھوٹا نہیں۔ مقام اور انداز کا پورا حال پوچھا۔ اور بڑے بندوبست کے ساتھ فوج کو پہلو میں سرکایا۔ ساتھ ہی دو سوار راجی علی خاں کے پاس بھیجے کہ حال یہ ہے۔ تم بھی جگہ بدلو۔ خدا کی قدرت اُس کی سمجھ اُلٹی پڑی۔ فوراً جگہ سے سرکا۔ اور جہاں سے خان خاناں ہٹا تھا۔ وہاں آن کھڑا ہؤا۔ قضا کا گول انداز ساعت کا منتظر تھا۔ اُس کا اُدھر آنا تھا۔ کہ موت نے مہتاب دکھائی۔ عالم اندھیر ہو گیا۔ دیر تک تو کچھ دکھائی ہی نہ دیا۔ حریف نے سپہ سار کو سامنے سمجھ کر آگ دیتے ہی حملہ کر دیا۔ یہاں راجی علی خاں اپنی فوج کو لئے کھڑا تھا عجب گھمسان کا رن پڑا۔ اور افسوس کہ وہ ملک دکن کی کنجی اسی میدان کی خاک میں کھوئی گئی۔ کچھ شک نہیں۔ کہ اُس نے اور راجہ رامچندر نے بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے ڈٹ کر جان دی۔ اور تیس ہزار دلاور اُس کے ساتھ کھیت رہے۔

اب دو گھڑی سے زیادہ دن نہیں رہا سہیل خاں نے دیکھا کہ سامنے میدان صاف ہے خیال یہ کہ خان خاناں کو اُڑا دیا۔ اور فوج کو بھگا دیا۔ وہ حملہ کر کے آگے بڑھا۔ شام قریب تھی۔ جہاں صبح کو بادشاہی لشکر میدان جما کر کھڑا تھا وہاں آن پڑا۔

اِدھر خان خاناں کو خبر نہیں۔ کہ راجی علی خاں کا کیا حال ہے۔ جب اُس نے دیکھا۔ کہ آگ کا بادل سامنے سے ہٹا۔ گھوڑوں کی باگیں لیں۔ اور اپنے سامنے کی فوج پر جا پڑا۔ اس نے اپنے حریف کو تباہ کر دیا سہیل خاں کی فوج نے سجے ہوئے خیمے خالی پائے۔ اُونٹ اور خچر قطار در قطار اور بیل ٹٹو لدے ہوئے تیار سان میں خان خاناں کے خاصہ اور کارخانوں کے صندوق سرخ و سبز باناتیں منڈھے ہوئے تھے۔ فوج دکن کے سپاہی اسی طرح کے رہنے والے تھے جو باندھ سکے وہ باندھا۔ چھاؤنی کو چھوڑا۔ اور ان باربرداریوں کو آگے ڈال خاطر جمع سے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ خود اپنی فوج کے بیوفاؤں نے بھی مروت کے سر میں خاک ڈالی۔ یہ گھر کے بھیدی

تھے۔ خزانوں اور بیش بہا کارخانوں پر گر پڑے۔ اور طمع کے تھیلے خوب دل کھول کر بھرے ۔

اگرچہ سہیل خاں کی فوج قتل ہوئی تھی۔ اور بھاگی بھی تھی۔ مگر اس کا دل شیر تھا کہ سپہ سالار کو اُڑا دیا ہے۔ جب شام ہوئی تو سمجھا کہ اس وقت کھنڈے ہوئے لشکر کو سمیٹنا مشکل ہے پاس ہی ایک گولی ٹپے پر نالہ بہتا تھا۔ وہیں تھم گیا۔ تھوڑی سی فوج تھی۔ اُسے لے کر اُتر پڑا۔ کہ جس طرح ہو۔ رات کاٹ لے۔ خان خاناں نے بھی اپنے سامنے سے دشمن کو بھگا دیا تھا۔ وہ وہاں جا پہنچا۔ جہاں سہیل خاں کا آتش خانہ پڑا تھا۔ اندھیرے میں یہ بھی وہیں ٹھیر گیا۔ اس کی فوج بھی بھاگ گئی تھی۔ اور اکثر سپاہی تو ایسے بھاگے تھے۔ کہ شاہ پور تک دم نہ لیا۔ بہت لٹیرے وہیں جنگل میں دریا کے کنارے غاروں اور کڑاڑوں میں بیٹھ رہے تھے۔ کہ صبح کو حریف کی آنکھ بچا کر نکل جائینگے۔ خان خاناں نے یہاں سے سرکنا مناسب نہ سمجھا۔ توپوں کے تخت اور میگزین کے چھکڑے آگے ڈال کر مورچے بنا لئے اور توکل بخدا وہیں ٹھیر گیا۔ یہی وفا کے بندے جو جان کو بات پر قربان کیا کرتے ہیں اُس کے گرد تھے۔ کوئی سوار نہ تھا۔ کوئی گھوڑے کی باگ پکڑے زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں آسمان کی طرف تھیں۔ کہ دیکھیے صبح، صبح مراد ہوتی ہے یا صبح قتل۔ لطف یہ کہ غنیم پہلو میں کھڑا ہے۔ ایک کی ایک کو خبر نہیں ۔

اب اقبال اکبری کی طلسم کاری دیکھو۔ کہ سہیل خاں کے غلام ہوا خواہ کوئی چراغ کوئی مشعل جلا کر اُس کے سامنے لائے۔ خان خاناں اور اُس کے رفیقوں کو روشنی نظر آئی۔ آدمی بھیجے کہ معلوم کریں۔ حال کیا ہے۔ وہاں دیکھیں تو سہیل خاں چمک رہے ہیں۔ کئی توپیں اور زنبورک دکنی توپ خانہ کے بھرے کھڑے تھے۔ جھٹ انہیں سیدھا کر کے نشانہ باندھا اور داغ دیا گولے بھی ٹھیک موقع پر گرے۔ اور معلوم ہوا۔ کہ حریف کے غول ولولہ پڑا۔ کیونکہ وہ گھبرا کر جگہ سے ہٹے سہیل خاں حیران ہوا۔ کہ یہ غیبی گولے کدھر سے آئے۔ آدمی بھیج کر آس پاس کے رفیقوں کو بُلایا۔ اُدھر خان خاناں نے فتح کے نقارے پر چوٹ دے کر حکم دیا کہ کرنائیں شادیانہ فتح بجاؤ۔ رات کا وقت جنگل میں آواز گونج کر پھیلی۔ بادشاہی سپاہی جو کھنڈے بکھرے تھے۔ اُنہوں نے اپنے لشکر کی کرنا پہچانی۔ اور سب نکل کر فتح کی آواز پر آئے۔ وہ پہنچے تو پھر مبارکباد کی کرنا پھونکی۔ اور جب کوئی سردار فوج لے کر پہنچتا تھا۔ اللہ اللہ کا نعرہ کرنائیں ادا کرتے تھے۔ رات بھر میں ۱۱ دفعہ کرنا بجی۔ سہیل خاں بھی آدمی دوڑا رہا تھا۔ اور اپنی جمعیت کو درست کرتا تھا۔ لیکن اس کی فوج کا یہ عالم تھا کہ جُوں جُوں اکبری کرنا کی آواز سُنتے تھے ہوش اُڑے

جاتے تھے۔ سہیل خاں کے نقیب بھی بولتے اور بولاتے پھرتے تھے۔ مگر سپاہیوں کے دل ہارے جاتے تھے۔ گڑھوں اور گوشوں میں چھپتے تھے۔ کہ جان کس طرح بچائیں؟ صبح ہوتے خانخاناں کے سپاہی دریا پر پانی لینے گئے۔ خبر لائے کہ سہیل خاں بارہ ہزار فوج سے جما کھڑا ہے۔ اس وقت اِدھر چار ہزار سے زیادہ جمعیت نہ تھی۔ مگر اکبری اقبال کے سپہ سالار نے کہا۔ کہ اندھیرے کو غنیمت سمجھو۔ اس کے پردہ میں بات بن جائیگی۔ تھوڑی فوج ہے۔ دن نے پردہ کھول دیا تو مشکل ہو جائیگی۔ دھندلکے کا وقت تھا۔ صبح ہُوا چاہتی تھی۔ اتنے میں سہیل خاں چمکا اور فوج کو ہوائے جنگ میں جنبش دی۔ توپیں سیدھی کیں۔ اور ہاتھیوں کو سامنے کر کے ریلا دیا۔ اِدھر سے اکبری سپہ سالار نے دھاوے کا حکم دیا۔ فوج دن بھر رات بھر کی بھوکی پیاسی۔ سرداروں کی عقل حیران۔ دولت خاں ان کا ہراول تھا۔ گھوڑا مار کر آیا۔ اور کہا کہ اس حالت کے ساتھ فوج کثیر پر جانا جان کا گنوانا ہے۔ مگر میں اس پر بھی حاضر ہوں۔ چھ سو سوار ساتھ ہیں۔ غنیم کی کمر میں گھس جاؤں گا۔ خان خاناں[1] نے کہا۔ دلّی کا نام برباد کرتے ہو۔ اُس نے کہا واہ ہے دِلّی خان خاناں کو بھی تو بہت پیاری تھی۔ کہا کرتا تھا کہ مرونگا تو دلّی ہی میں مرونگا) اگر اس وقت دشمن کو دے مارا۔ تو سو دِلّیاں خود کھڑی کر دینگے۔ مر گئے تو خدا کے حوالے۔ دولت خاں نے چاہا۔ کہ گھوڑے اُٹھائے۔ سید قاسم بارہہ بھی اپنے سید بھائیوں کو لئے کھڑے تھے۔ اُنھوں نے آواز دی۔ بھائی ہم تم تو ہندوستانی ہیں۔ مرنے کے سوا دوسری بات نہیں۔ نواب کا ارادہ تو معلوم کر لو۔ دولت خاں پھر پلٹے اور خان خاناں سے کہا۔ سامنے[2] یہ انبوہ ہے اور فتح آسمانی ہے۔ یہ تو بتا دیجئے۔ کہ اگر شکست ہوئی۔ تو آپ کو کہاں ڈھونڈھیں۔ خان خاناں نے کہا۔ سب لاشوں کے نیچے۔ یہ کہہ کر لودھی پٹھان نے سادات بارہہ کے ساتھ باگیں لیں۔ میدان سے کٹ کر پہلے گھونگٹ کھایا۔ اور چکر دے کر ایک مرتبہ غنیم کی کمرگاہ پر گرا۔ اُن میں ہل چل پڑ گئی۔ اور یہ ٹھیک وہی وقت تھا۔ کہ خانخاناں سامنے سے حملہ کر کے پہنچا تھا۔ اور لڑائی دست و گریبان ہو رہی تھی۔ سہیل خاں کا لشکر بھی آٹھ پہر کا ہارا۔ بھوک پیاس کا مارا تھا۔ ایسا بھاگا جس کی ہرگز امید نہ تھی۔ پھر بھی بڑا کشت و خون ہُوا۔ سہیل خاں کئی زخم کھا کر گرا۔ قدیمی وفادار پروانوں کی طرح آن گرے۔ اُٹھا کر گھوڑے پر بٹھایا اور دونوں بازو پکڑ کر معرکہ سے نکال لے گئے۔ تھوڑی دیر میں میدان صاف ہو گیا۔ خانخانی لشکر

[1] خانخاناں نے کہا۔ نام دہلی برباد میدہی۔ دولت خاں نے کہا۔ اگر حریف برداشتیم صد دہلی ایجاد کنیم۔ واگر مردیم کار با خدا است +

[2] چنیں انبوہے در پیش است و فتح آسمانی۔ اگر شکست رو دہد۔ جائے نشان دہید کہ شمارا دریابیم۔ خان خاناں نے کہا۔ در زیر لاشہا

میں بے لاگ فتح کے نقارے بجنے لگے۔ بہادروں نے میدان جنگ کو دیکھا ستھراؤ پڑا تھا *

صحن فلک زدیدۂ قربانیاں پر است ۔ یا آنکہ در کمان قضا یک خدنگ بود

لوگوں نے مشہور کر دیا۔ کہ راجی علی خاں میدان سے بھاگ کر الگ ہو گیا۔ بعضوں نے ہوائی اُڑائی تھی کہ غنیم سے جا ملا۔ دیکھا تو بڈھا شیر ناموری کے میدان میں سرخرو پڑا سوتا ہے۔ ۳۵ سردار نامدار اور پانچ سو غلام وفادار گرد کٹے پڑے ہیں۔ اُس کی لاش بڑی شان و شوکت سے اُٹھا کر لائے۔ اور بدزبانوں کے منہ کالے ہو گئے۔ خان خاناں کو فتح کی بڑی خوشی ہوئی۔ مگر اس حادثہ نے سب مزا کرکرا کر دیا۔ فتح کے شکرانہ میں نقد و جنس ۷۵ لاکھ روپیہ کا مال ساتھ تھا۔ سب سپاہ کو بانٹ دیا۔ فقط ضروری اسباب کے دو اونٹ رکھ لئے۔ کہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا *

یہ معرکہ خان خاناں کے اقبال کا وہ کارنامہ تھا جس کے دمامہ سے سارا ہندوستان گونج اُٹھا۔ بادشاہ کو عرضی پہنچی۔ وہ بھی عبداللہ ازبک کے مرنے کی خبر سُن کر پنجاب سے پھرے تھے۔ اس خوشخبری سے نہایت خوش ہوئے۔ خلعت گراں بہا اور تحسین و آفرین کا فرمان بھیجا۔ جہاں جہاں دشمن تھے سناٹے میں آ کر دم بخود رہ گئے۔ یہ فتح کے نشان اُڑاتے شادیانے بجاتے شاہ پور میں آئے۔ شہزادہ کو مجرا کیا۔ اور تلوار کھول کر اپنے خیمہ میں بیٹھ گئے۔ صادق محمد وغیرہ شہزادہ کے مصاحب و مختار مخالفت کی دیا سلائی سلگائے جاتے تھے۔ ادھر خان خاناں عرضیاں کر رہا تھا۔ اِدھر شہزادہ۔ شہزادہ نے باپ کو یہاں تک لکھا۔ کہ حضور ابوالفضل اور سید یوسف خاں مشہدی کو بھیج دیں۔ خان خاناں کو بُلا لیں۔ خان خاناں بھی اُسی کے لاڈلے تھے۔ اُنہوں نے لکھا کہ حضور شہزادہ کو بُلا لیں۔ خانہ زاد اکیلا فتح کا ذمہ لیتا ہے۔ یہ بات بادشاہ کو ناگوار گذری۔ شیخ نے اکبر نامہ میں کیا مطلب کا عطر نکالا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ حضور کو معلوم ہُوا کہ شہزادہ اُکھڑے ہوئے دل کا جوڑنا آسان سمجھتا ہے۔ اور جس طرح چاہئے۔ اُس طرح نہیں رہتا اور خان خاناں نے دیکھا کہ میری بات نہیں چلتی۔ اس لئے وہ اپنی جاگیر کو روانہ ہو گیا۔ راجہ سالباہن کو حکم ہُوا۔ کہ تم شاہزادہ کو لے کر آؤ۔ کہ نصائح مناسب سے رہنمائی کر کے پھر بھیجیں اور ولیپیہ خواص کو خان خاناں کے پاس بھیجا۔ کہ جس مقام پر ملو۔ وہیں سے دھتکار کر اُلٹا پھیر دو اور کہو۔ کہ جب تک شہزادہ دربار سے رخصت ہو کر وہاں پہنچے۔ ملک و سپاہ کا انتظام کرو *

اگرچہ شہزادہ شراب خوری اور اُس کی بدحالیوں کے سبب سے آنیکے قابل نہ تھا مگر حضوری دربار کا ارادہ کیا۔ اُسکا مزاج دانوں نے خیرخواہی خرچ کر کے کہا۔ کہ اس وقت ملک سے حضور کا جانا

مناسب نہیں۔ شہزادہ رُک گیا۔ اِدھر خان خاناں نے کہا۔ کہ جب تک شہزادہ وہاں ہے۔ مَیں نہ جاؤنگا۔ بادشاہ کو یہ باتیں لپسند نہ آئیں اور دل کو ناگوار گذریں۔ غرض ۱۰۰۶ھ ۱۵۹۸ء خانخاناں اپنے علاقہ پر گئے۔ وہاں سے دربار میں آئے۔ کئی دن تک عتاب و خطاب میں رہے۔ وہ بھی دولپشت کے مزاج دان تھے۔ اور جادو بیان۔ جب عرض معروض کے موقعے پائے۔ شہزادہ کی بدصحبتی و بادہ خواری و بے خبری اور مصاحبوں کی بد ذاتیوں کے سب حالات سنائے۔ غبار کدورت کو دھویا۔ چندروز میں جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے۔ شیخ[1] اور سید دکن کو بھیجے گئے۔ شہزادہ کی نوبت حد سے گزرچکی تھی۔ شیخ کے پہنچنے تک بھی نہ ٹھہر سکا۔ یہ رستہ ہی میں تھے۔ کہ ملکِ عدم کو روانہ ہو گیا افسوس ہے اُس نوجوانی دیوانی پر کہ بادہ کشی کی ہوا میں اپنی جان برباد کی۔ یعنی مراد تیس برس کی عمر ۱۰۰۷ھ ۱۵۹۹ء میں نامراد ناشاد دنیا سے گیا۔

۱۰۰۶ھ میں شاہ عباس نے یہ حال دیکھ کر بلادِ خراسان پر مہم کی اور فتحیاب ہوا۔ انہی دنوں میں تحائف گرانبہا کے ساتھ ایلچی دربار اکبری میں بھیجا۔

اسی سال خان خاناں نے حیدر قلی نوجوان بیٹے کا داغ اُٹھایا۔ اُسے بہت چاہتا تھا اور پیار سے حیدری کہا کرتا تھا۔ اُسے بھی شراب کے شراروں نے کباب کیا۔ نشہ میں مست پڑا تھا۔ آگ لگ گئی۔ مستی کا مارا اُٹھ بھی نہ سکا اور جل کر مر گیا۔

اسی برس بادشاہ لاہور سے آگرہ جاتے تھے۔ سب اُمرا ساتھ تھے۔ ماہ بانو بیگم خان اعظم کی بہن خان خاناں کی بیگم مدت سے بیمار تھیں۔ انبالہ کے مقام میں ایسی طبیعت بگڑی کہ وہیں چھوڑنا مناسب معلوم ہُوا۔ بادشاہ اُدھر روانہ ہوئے۔ بیگم نے ملکِ عدم کو کوچ کیا۔ اکبر بادشاہ کی کوکی۔ مرزا عزیز کوکہ کی بہن۔ خان خاناں کی بیگم تھیں۔ دو امیر دربار سے آئے۔ اور رسُوم سوگواری کو ادا کیا۔

اکبر بلکہ تمام سلاطین چغتائی ملکِ موروثی کہہ کر سمرقند و بخارا کے نام پر جان دیتے تھے۔ ۱۰۰۵ھ میں عبد اللہ اوزبک کے مرنے سے ترکستان میں ہل چل مچ رہی تھی۔ روز بادشاہ ہوتے تھے روز مارے جاتے تھے۔ دکن میں جو لڑائیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ شیخ اور سید کی تدبیر اور شمشیر انہیں سمیٹ نہ سکتی تھی۔ اکبر نے امرا کو جمع کر کے صلاح کی کہ پہلے دکن کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ یا اُسے ملتوی کر کے ادھر چلنا مناسب ہے۔ اس بات کا بھی رنج تھا۔ کہ وہاں جوان بیٹا جان سے گیا۔ پھر بھی ملک فتح نہ ہُوا۔ صلاح ٹھیری کہ پہلے گھر کی طرف سے خاطر جمع کرنی چاہیئے چنانچہ ۱۰۰۸ھ

[1] شیخ ابو الفضل۔ سید یوسف مشہدی۔

میں شاہزادہ دانیال کو لشکر عظیم اور سامان وافر کے ساتھ پھر روانہ کیا۔ اور خان خاناں کو اُس کے ساتھ کیا۔ مراد کی نامرادی نے نصیحت کردی تھی۔ اب کی روانگی بندوبست سے ہوئی۔ جانا بیگم خان خاناں کی بیٹی کے ساتھ شہزادہ کی شادی کردی۔ روز امرا جمع ہوتے تھے خلوتوں میں گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ سپہ سالار کو سب مافی الضمیر سمجھائے۔ جب روانہ ہُوا۔ تو پہلی منزل میں خود اُس کے خیمہ گاہ میں گئے۔ اُس نے بھی وہ پیشکش پیش کئے۔ کہ عجائب خانوں میں رکھنے کے قابل تھے۔ گھوڑے توبہتیرے تھے۔ مگر ایک گھوڑا تھا۔ کہ ہاتھی سے کشتی لڑتا تھا۔ سامنے سے مقابلہ کرتا تھا۔ پچھلے پاؤں سے ہٹ کر حملہ کرتا تھا۔ اور دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر ہاتھ ہاتھی کی مستک پر رکھ دیتا تھا۔ لوگ تماشے دیکھتے تھے اور حیران ہوتے تھے +

غرض خان خاناں شہزادہ کو لئے ملک دکن میں داخل ہوئے۔ واہ ہم سمجھتے تھے کہ مدت کے بچھڑے دوست پردیس میں مل کر خوش ہونگے۔ مگر تم دیکھو گے کہ نقش اُلٹا پڑا۔ آئینے سیاہ ہوگئے۔ اور محبت کے لہو سفید ہوگئے۔ دونوں شطرنج باز کامل تھے۔ دغاکی چالیں چلتے تھے۔ خانخاناں شہزادہ کی آڑ میں چلتا تھا۔ اس لئے اُس کی بات خوب چلتی تھی۔ ابھی میدان معرکہ تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے جو نشانہ مارا۔ شیخ اکبر نامہ میں لکھتے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ قلم سے درد مجبوری برس رہا ہے "میں نے احمد نگر کے کام کا سب بندوبست کر لیا تھا۔ شہزادہ کا فرمان پہنچا۔ کہ جب تک ہم نہ آئیں۔ قدم آگے نہ بڑھاؤ۔ سو تعمیل اور کیا ہوسکتا ہے" +

خان خاناں کی لیاقت ذاتی میں کسے کلام ہے۔ اُنہوں نے اپنے کام اور نام کے الگ بندوبست باندھے۔ اِدھر تو شیخ کو روک دیا۔ کہ احمد نگر پر حملہ نہ کرنا ہم آتے ہیں۔ اِدھر رستہ میں آسیر پر اٹک رہے کہ صاف کرکے احمد نگر کو لینگے۔ یہ بھی شیخ پر چوٹ تھی۔ کیونکہ آسیر شیخ کا سمدھیانہ تھا۔ شیخ نے بھی فطرت کا منصوبہ مارا۔ اور پرادپر اکبر کو لکھا کہ شاہزادہ لڑکپن کرتا ہے۔ آسیر کا معاملہ صاف ہے۔ جس وقت حضور چاہینگے۔ اور جس طرح چاہینگے اُسی طرح ہوجائیگا۔ احمد نگر کی مہم بگڑی جاتی ہے۔ اکبر بادشاہ تدبیر کا بادشاہ تھا۔ اُس نے شہزادہ کو لکھا کہ جلد احمد نگر کو روانہ ہو۔ کہ موقع وقت ہاتھ سے جاتا ہے اور خود پہنچکر اُس پر محاصرہ ڈال دیا۔ ابوالفضل کو وہاں سے اپنے پاس بلا لیا +

خانخاناں نے احمد نگر پر محاصرہ ڈالا۔ روز مورچے بناتے تھے۔ دمدمے بناتے تھے۔ سرنگیں کھدواتے تھے دکنی بہادر اندر سے قلعداری کرتے تھے۔ اور باہر بھی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے بنجارول پر گرتے بھیر اور لشکر پر چھاپے مارتے تھے۔ چاند بی بی سامان کی فراہمی امرائے لشکر کی دلداری

بُرج و فصیل کی مضبوطی میں بال بھر کمی نہ کرتی تھی۔ پھر بھی کہاں اکبری اقبال اور شاہنشاہی سامان کہاں ایک احمد نگر کا صوبہ اس کے علاقہ میں سرداروں کی بدنیتی اور نفاق بھی قائم تھا۔ بیگم نے یہ حال اپنے وزیر سے کہا۔ کہ قلعہ بچتا نظر نہیں آتا۔ بہتر ہے۔ کہ ننگ و ناموس کو بچائیں اور قلعہ حوالہ کر دیں۔ چیتہ خاں نے اور سرداروں کو بیگم کے اس ارادہ سے آگاہ کیا۔ اور بہکایا کہ بیگم امرائے اکبری سے سازش رکھتی ہے۔ دکنی سُنتے ہی بگڑ کھڑے ہوئے۔ اور اُس پاکدامن بی بی کو شہید کیا۔ امرائے اکبری نے سرنگیں اُڑا کر دھاوا کیا۔ تیس گز دیوار اُڑا دی۔ اور برج بابلی سے قلعہ میں داخل ہوئے۔ چیتہ خاں اور ہزاروں دکنی دلاور موت کا شکار ہوئے۔ چیتہ خاں اور تمام سپاہی قتل کئے گئے جس لڑکے کو نظام الملک بہادر شاہ بنایا تھا۔ وہ گرفتار ہوا خانخاناں اُسے لیکر حاضر ہوئے۔ اور مقام بُرہان پور میں پیش کیا۔ ۴۵ سنہ جلوس میں چار مہینے بیس دن کے محاصرہ میں قلعہ فتح ہوا۔ فتح کے کارنامہ پر سب نے لکھا کہ جو کچھ کیا خان خاناں نے کیا۔ اور بے شک سچ کہا +

بادشاہ نے آسیر فتح کیا۔ اور آگرہ کی طرف مراجعت کی۔ **لطیفہ**۔ ملک شہزادہ کے نام پر نامزد کیا۔ اور دانیال کی مناسبت سے خاندیس کا نام **داندیس** رکھا۔ خان خاناں نے پھر پیچ مارا۔ شیخ کی لیاقت و کاردانی کی بہت تعریفیں لکھوائیں۔ اور انہیں بادشاہ سے مانگ لیا اب صورت حال نہایت نازک۔ شاہزادہ صاحب ملک۔ خان خاناں خسر الدولہ اور سپہ سالار۔ شیخ ان کے ماتحت۔ خان خاناں کو اختیار رہے جہاں چاہیں بھیجیں۔ جب بلا بھیجیں چلے آئیں کسی اور کو بھیج دیں۔ شیخ لشکر میں بیٹھیں۔ مُرطُ مُرطُ مُنہ دیکھا کریں۔ اور جلا کریں۔ مہمات کے معاملات میں مشورے ہوتے تھے تو شیخ کی رائے کبھی پسند آتی تھی کبھی رد ہو جاتی تھی۔ شیخ دِق ہوتے تھے۔ اور جس قلم سے خان خاناں پر دم و ہوش قربان ہوا کرتے تھے۔ اُسی قلم سے اُس کے حق میں بادشاہ کو وہ وہ باتیں لکھتے تھے کہ ہم شیطان کو بھی نہیں لکھ سکتے۔ مگر سبحان اللہ اُس کی شوخی طبع نے اُس میں بھی ایسے ایسے کانٹے چبھوئے ہیں کہ ہزاروں پھول اُس پر قربان ہوں +

زمانہ عجب نیرنگ ساز ہے دیکھو جو دوست عاشقی و معشوقی کے دعوے رکھتے تھے۔ اُنہیں کیسا لڑا دیا۔ اب یہ عالم تھا۔ کہ ایک دوسرے پر دغا کے وار کرتا اور فخر کرتا تھا۔ اُن کو بھی خیال کرنا چاہئے کہ کیسے چلتے تھے۔ ابوالفضل بے شک کوہ دانش معدن رائے تدابیر تھے۔ اور خان خاناں اُن کے آگے طفل مکتب۔ مگر آفت کے ٹکڑے تھے۔ اِن کی نوجوانی کے نکتے اور چھوٹی چھوٹی چالیں

ایسی ہوتی تھیں۔ کہ شیخ کی عقل متین سوچتی رہ جاتی تھی +

تمہارا ذہن ضرور اس بات کا سبب ڈھونڈیگا۔ کہ پہلے وہ گرمجوش محبتیں۔ اور اب یہ عداوتیں یا بایں شوراشوری۔ یا بہ ایں بے نمکی +

وصل کی شب تم نے کیوں مجھ سے لڑائی ڈالدی		جل کے شاید کچھ کسی نے جلنوائی ڈال دی

میرے دوستو بات یہ ہے کہ پہلے دونوں کی ترقی کے رستے دو تھے۔ ایک امارت اور سپہ سالاری کے درجوں پر چڑھنا چاہتا تھا۔ مصاحبت اور حاضر باشی اُس کی ابتدائی سیڑھیاں تھیں دوسرا علم و فضل تصنیف و تالیف نظم و نثر مشورت اور مصاحبت کے مراتب کو عزت اور خدمت سمجھنے والا تھا۔ امارت اور اختیارات کو اُس کے لوازمات سمجھو۔ بہرصورت ایک دوسرے کے کام کے لئے مددگار و معاون تھے۔ کیونکہ ایک کی ترقی دوسرے کے لئے ہارج نہ تھی۔ اب دونوں ایک مطلب کے طلبگار ہو گئے۔ جو دوستی تھی وہ رقابت ہو گئی +

یہ تو تین سو برس کی باتیں ہیں جن کے لئے ہم اندھیرے میں قیاس کے تیر پھینکتے ہیں جگر اُس وقت خون ہوتا ہے جب اپنے زمانہ میں دیکھتا ہوں کہ دو شخص برسوں کے رفیق بچپن کے دوست۔ ایک مدرسہ کے تعلیم یافتہ۔ الگ الگ میدانوں میں چل رہے تھے۔ تو قوتِ بازو۔ دردخواہ۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر راہ ترقی پر لے چلتے تھے۔ اتفاقاً دونوں کے گھوڑے ایک گھڑدوڑ کے میدان میں آن پڑے۔ پہلا فوراً دوسرے کے گرانے کو کمربستہ ہو گیا +

میرے اس کے بگاڑ پر مت جا		اتفاقات ہیں زمانے کے	

اکبر کے لئے یہ مشکل موقع تھا۔ دونوں جاں نثار۔ دونوں آنکھیں۔ اور دونوں کو اپنی اپنی جگہ دعویٰ۔ آفرین ہے اُس بادشاہ کو کہ دونوں کو۔ دونوں ہاتھوں میں کھلاتا رہا اور اپنا کام لیتا رہا۔ ایک کے ہاتھ سے دوسرے کو گرنے نہ دیا +

شیخ نے جو اپنی عرضیوں میں دل کے دھوئیں نکالے ہیں۔ وہ فقرے نہیں ہیں۔ جلے ہوئے کبابوں کو چٹنی میں ڈبو کر بھیج دیا ہے۔ اُن سے اِس تمسخر کا انداز بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کتنا ظرافت کا نون مرچ اور تمسخر کا گرم مصالحہ چھڑکتے تھے۔ جو اکبر کو بھاتا تھا۔ اور اُس کے چٹخاروں میں ان کا کام نکل آتا تھا۔ میں نے شیخ کی بعض عرضیاں اُس کے خاتمہ احوال میں نقل کی ہیں۔ خانخاناں نے بھی خوب خوب گل پھول کترے ہونگے۔ مگر افسوس کہ وہ میرے ہاتھ نہیں آئے +

یہ رگڑے جھگڑے اِسی طرح چلے جاتے تھے۔ ۱۰۰۹ھ میں خان خاناں کی حسن تدبیر نے تلنگانہ

کے ملک میں فتوحات کا نشان جا گاڑا۔ شیخ سنہ ۱۰۱۱ھ میں طلب ہوئے۔ اور افسوس ہے۔ کہ راہ سے منزل لقا کو پہنچے۔ خان خاناں نے کئی برس کے عرصہ میں دکن کو بہت کچھ تسخیر کر لیا جب بندوبست سے فارغ ہوئے تو سنہ ۱۰۱۲ھ میں دربار میں طلب ہوئے۔ اُس پر بُرہان پور احمد نگر برار کا ملک شہزادہ کے نام ہؤا۔ اور اُنہیں اُس کی اتالیقی کا منصب ملا۔

سنہ ۱۰۱۳ھ میں اُن پر بڑی نحوست آئی۔ شہزادہ مدت سے بلائے بادہ خواری میں مبتلا تھا۔ بھائی کے مرنے نے بھی مطلق ہشیار نہ کیا۔ باپ کی طرف سے اُسے بھی۔ خان خاناں کو بھی برابر تاکیدیں پہنچتی تھیں۔ کوئی کارگر نہ ہوتی تھیں۔

ضعف حد سے بڑھ گیا۔ جان پر نوبت آن پہنچی۔ خان خاناں اور خواجہ ابوالحسن کو حکم بھیجا۔ کہ پردہ داری کر کے محافظت کرو۔ اُس جانہار کا یہ حال کہ ذرا طبیعت بحال ہوئی۔ اور پھر پی گیا سخت بندش ہوئی تو شکار کا بہانہ کرتا۔ اور نکل جاتا۔ وہاں بھی شیشہ نہ پہنچ سکتا تھا تو قراول روپے کے لالچ سے کبھی بندوق کی نال میں کبھی ہرن کبھی بکری کی انتڑی میں بھرتے اور پگڑیوں کے پیچ میں لپیٹ کر لے جاتے تھے۔ بندوق کی شراب جس میں باروت کا دھوآں لوہے کا میل بھی کٹ کر مل جاتا زہر کا کام کر گئی۔ اور مختصر یہ کہ تینتیس برس چھ مہینے کی عمر میں خود موت کا شکار ہو گیا۔ اس صدمہ کو قلم کیا لکھ سکیگا۔ خان خاناں کے دل سے پوچھنا چاہئے۔ افسوس جانا بیگم[1] کا ہے۔ وہ پاکدامن بڑی عقلمند صاحب سلیقہ باتدبیر صاحبزادی تھی حیف کہ عین نوجوانی کی بہار میں رنڈاپے کی سفید چادر اُسکے سر پر ڈالی گئی۔ اس عفیفہ نے ایسا رنج کیا۔ کہ کوئی کم کرتا ہے۔

جہانگیری دَور ہؤا تو خان خاناں دکن میں تھے۔ سنہ ۱۰۱۶ھ میں جہانگیر اپنی توزک میں خود لکھتا ہے خانخاناں بڑی آرزو سے لکھ رہا تھا اور قدمبوسی کی تمنّا ظاہر کرتا تھا۔ میں نے اجازت دی۔ بچپن میں میرا اتالیق تھا۔ بُرہان پُور سے آیا۔ جب سامنے حاضر ہؤا تو اس قدر شوق اور خوشحالی اُس پر چھائی ہوئی تھی۔ کہ اُسے خبر نہ تھی۔ کہ سر سے آیا ہے یا پاؤں سے۔ بیقرار ہو کر میرے قدموں میں گر پڑا۔ مَیں نے بھی شفقت اور پیار کے ہاتھ سے اُس کا سر اُٹھا کر مہر و محبّت کے ساتھ سینہ سے لگایا اور چہرہ پر بوسہ دیا۔ اُس نے دو تسبیحیں موتیوں کی۔ چند قطعے لعل و زمرد کے پیشکش کئے۔ تین لاکھ کے تھے۔ اُس کے علاوہ ہر جنس کے متاع بہت سے ملاحظہ میں گذرانے۔ پھر ایک جگہ لکھا ہے۔ شاہ عباس بادشاہ ایران نے جو گھوڑے بھیجے تھے۔ اُن میں سے ایک سمند گھوڑا اُسے

---

[1] دیکھو اس کا حال خان خاناں کی اولاد کے حال میں صفحہ

دیا۔ ایسا خوش ہوا۔ کہ بیان نہیں ہو سکتا حقیقت میں اتنا بلند گھوڑا۔ ان خوبیوں اور خوش اسلوبیوں کے ساتھ آجتک ہندوستان میں نہیں آیا **فتوح** ہاتھی کہ لڑائی میں لاجواب ہے۔ اور بیس ہاتھی اور اُسے عنایت کئے۔ چند روز کے بعد خلعت کمر شمشیر مرصّع فیل خاصہ عطا ہوا۔ اور دکن کو رخصت ہوئے۔ اور اقرار یہ کر گئے کہ دو برس میں سب ملک سرانجام کر دونگا۔ مگر علاوہ فوج سابق کے بارہ ہزار سوار اور دس لاکھ کا خزانہ اور مرحمت ہو (اسی مقام پر خافی خاں لکھتے ہیں) پہلے دیوان تھے۔ اب وزیر الملک خطاب دیا۔ اور پنجہزاری پنج ہزار کا منصب عنایت کر کے مہم پر رخصت کیا۔ امرائے نامی بیس ہزار سوار کے ساتھ رفاقت میں دئے۔ اور انعام و اکرام کی تفصیل کیا لکھی جائے۔

خانخاناں کے اقبال کا ستارہ عمر کے ساتھ عزت سے ڈھلتا جاتا تھا۔ وہ دکن کی مہموں میں مصروف تھا کہ ۱۰۱۷ھ میں جہانگیر نے پرویز شاہزادہ کو دو لاکھ کا خزانہ۔ بہت سے جواہر بیش بہا دس ہاتھی۔ تین سو گھوڑے خاصہ کے عنایت فرمائے۔ سید سیف خاں بارہہ کو اتالیق کر کے لشکر ساتھ کیا۔ اور حکم دیا کہ خانخاناں کی مدد کو جاؤ۔ وہاں پھر مراد کا معاملہ ہوا۔ بڈھے سپہ سالار کی بوڑھی عقل۔ نوجوانوں کے دماغوں میں نئی روشنی طبیعتیں موافق نہ آئیں۔ کام بگڑنے شروع ہوئے عین برسات میں لشکر کشی کر دی۔ برسات بھی اس بہتات کی ہوئی کہ طوفان نوح کا عالم دکھا دیا۔

دریائے اشک اپنا جب سر پر اوج مارے	طوفان نوح بیٹھا گوشہ میں موج مارے۔

تکلیف۔ نقصان۔ خرابیاں۔ ندامتیں۔ سب مینہ کے ساتھ ہی برسیں۔ انجام یہ ہوا کہ جس خانخاناں نے آج تک شکست کا داغ نہ اُٹھایا تھا۔ اُس نے ۶۳ برس کی عمر میں شکست کھائی۔ فوج برباد۔ اپنے نہایت تباہ۔ بڑھاپے کے بوجھ اور ذلت کی بار برداری کو گھسیٹ کر برہانپور میں پہنچایا۔ وہی احمد نگر جسے گولے مار مار کر فتح کیا تھا قبضہ سے نکل گیا۔ تماشہ یہ کہ باپ کو لکھا۔ جو کچھ ہوا۔ خانخاناں کی خودسری اور خود رائی اور نفاق سے ہوا۔ یا ہمیں حضور بُلالیں - یا اُنہیں۔ اور خان جہان نے اقرار لکھ بھیجا۔ کہ فدوی اس مہم میں ذمہ لیتا ہے۔ تیس ہزار مجھے اور ملیں۔ جو ملک بادشاہی غنیم کے تصرّف میں ہے۔ اگر دو برس کے اندر نہ لے لوں تو پھر حضور میں منہ نہ دکھاؤنگا۔ آخر ۱۰۱۸ھ میں خانخاناں بُلائے گئے۔

۱۰۲۰ھ میں سرکار قنوج اور کالپی وغیرہ خانخاناں اور اُس کی اولاد کی جاگیر میں عنایت ہوا۔
۱۰۲۱ھ میں جب معلوم ہوا کہ دکن میں شہزادہ کا لشکر اور امراء سب سرگرداں پھرتے ہیں اور روز روز زوال ہے تو جہانگیر کو پھر پرانا سپہ سالار یاد آیا۔ اور امرائے دربار نے بھی کہا کہ وہاں

کی مہمات کو جو خان خاناں سمجھتا ہے۔ وہ کوئی نہیں سمجھتا۔ اس کو بھیجنا چاہئے۔ پھر دربار میں حاضر ہوئے
شش ہزاری منصب ذات۔ خلعتِ فاخرہ۔ کمر شمشیر مرصع۔ فیل خاصہ۔ اسپ ایرانی عنائیت ہوا۔
شاہ نواز خاں سہ ہزاری ذات و سوار۔ اور خلعت و اسپ وغیرہ۔ **داراب** کو پانسو ذات۔
تین سو سوار اضافہ یعنے کل دو ہزاری ذات ایک ہزار پانسو سوار اور خلعت و منصب وغیرہ
اور اُس کے ہمراہیوں کو بھی خلعت و اسپ مرحمت ہوئے۔ اور خواجہ ابوالحسن کیساتھ رخصت ہوئے
سنہ ۱۰۲۴ھ میں اُس کے بیٹے ایسے ہو گئے۔ کہ باپ کو دربار سے ملک ملتا تھا۔ وہ بیٹھا
بندوبست کرتا تھا بیٹے ملک گیری کرتے تھے۔ چنانچہ شہنواز خاں بالاپور میں تھا کہ کئی سردار
عنبر کی طرف سے اُس کے ساتھ آن ملے۔ اُس نے مبارک باد کے شادیانے بجوائے۔ بڑی مروت
اور حوصلے سے اُن کی دلجوئی اور خاطرداری کی۔ اور ہر ایک کے رُتبہ کے بموجب نقد جنس گھوڑے
ہاتھی دے کر تکلف خرچ کئے۔ لشکر توپ خانہ رکاب میں تیار تھا۔ اُن کی صلاح سے عنبر کی
طرف فوج لیکر چلا عنبر کے سردار سپاہی دیہات میں تحصیل مال کے لئے پھیلے ہوئے تھے وہ سنکر
گاؤں گاؤں سے دوڑے اور ٹڈیوں کی طرح اُمنڈ پڑے۔ ابھی وہاں تک نہ پہنچا تھا۔ کہ کچھ[1]
غنیم کے سردار فوج لیکر آن ہی پہنچے۔ رستہ میں مقابلہ ہوا۔ وہ بھاگے اور شکستہ حال عنبر کے پاس پہنچے۔
عنبر سُن کر جل گیا۔ عادل خانی اور قطب الملکی فوجیں لے کر بڑے زور شور سے آیا۔ یہ بھی
آگے بڑھے۔ جب دونوں لشکر لڑائی کے پلہ پر پہنچے تو بیچ میں نالہ تھا۔ ڈیرے ڈال دئے۔ دوسرے
دن پرے باندھ کر میدان داری ہونے لگی غنیم کی جانب یاقوت خاں حبشی ان جنگلوں کا شبر تھا۔
پیش قدمی کر کے بڑھا۔ اور میدان جنگ ایسی جگہ ڈالا۔ کہ نالہ کا عرض کم تھا۔ لیکن کناروں پر دلدل
دُور دُور تک تھی۔ اسی واسطے تیراندازوں اور بانداروں کو گھاٹوں پر بٹھا کر رستہ روک لیا۔ پہر دن باقی
تھا۔ جو لڑائی شروع ہوئی۔ پہلے توپیں اور بان اس زور شور سے چلے کہ زمین آسمان اندھیر ہو گیا عنبر
کے غلامان اعتباری ہراول میں تھے۔ گھوڑے اُٹھا کر آئے۔ نالہ کے اس کنارے سے اکبری
ترک بھی تیراندازی کر رہے تھے۔ جو ہمت کر کے آگے آتے تھے۔ یہ اُن کے گچھے گھوڑوں کو
چراغ پا کر کے اُلٹا دیتے تھے۔ بہت سے دلدل میں پھنس جاتے تھے۔ یہ حال دیکھا تو ملک
عنبر کی نامور شجاعت نے اُسے کوئلے کی طرح لال کر دیا۔ اور چمک کر لشکر بادشاہی پر آیا داراب
اپنے ہراول کو لے کر ہوا کی طرح پانی پر سے گذر گیا۔ اِدھر اُدھر سے اور فوجیں بڑھیں۔ یہ اس

[1] محل دار خاں۔ یاقوت خاں۔ دانش خاں۔ دلاور خاں وغیرہ امرا سردار لشکر تھے۔

کر ملک دکن سے گیا۔ کہ غنیم کی فوج کو اُلٹتا پلٹتا اُس کے قلب میں جا پڑا۔ جہاں عنبر خود کھڑا تھا۔
لڑائی دست و گریبان آن پڑی۔ اور دیر تک کُشتا کشی کا میدان گرم رہا۔ انجام یہ ہُوا۔ کہ تلوار کی
آنچ سے عنبر ہوکر اُڑ گیا۔ اکبری بہادر تین کوس تک مارا مار چلے گئے۔ جب اندھیرا ہو گیا۔ تو
بھگوڑوں کا پیچھا چھوڑا۔ اور ایسا بھاری رن پڑا کہ دیکھنے والے حیران تھے ✦

۱۰۲۵ھ میں خورم کو شاہجہان کر کے رخصت کیا۔ اور شاہی کا خطاب دیا کسی شاہزادے
کو تیمور کے عہد سے آج تک عطا نہ ہُوا تھا۔ ۱۰۲۶ھ میں خود بھی مالوہ میں جا کر چھاؤنی ڈالی۔
شاہجہان نے برہان پور میں جا کر مقام کیا۔ اور معاملہ فہم و صاحب تدبیر اشخاص کو بھیجکر امرائے
اطراف کو موافق کیا ✦

۱۰۲۶ھ میں جب کہ شاہزادہ شاہجہان کے حسن انتظام سے دکن میں بندوبست قابل
اطمینان ہُوا۔ تو جہانگیر کو ملک موروثی کا پھر خیال آیا۔ شاہ ایران نے قندھار لے لیا تھا چاہا
کہ پہلے اسے لے۔ خاندیس برابر احمد نگر کا علاقہ شاہجہان کو مرحمت ہُوا۔ اس بیٹے کو اطاعت
اور سعادتمندی اور نیک مزاجی کے سبب سے باپ بہت عزیز رکھتا تھا۔ اُس نے راجپوتانہ اور
دکن میں فتوحات نمایاں کیں۔ خصوصاً رانا کی مہم کو اس کامیابی سے سر کیا تھا کہ جہانگیر نہایت
خوش ہُوا تھا۔ وہ اسے اقبال مند اور فتح نصیب بھی جانتا تھا۔ غرضکہ شاہجہان حضور میں طلب
ہوئے۔ دربار میں بیٹھنے کی صلاح قرار پائی۔ صندلی (کرسی) کی جگہ دست راست پر تجویز ہوئی
خود جھروکوں میں بیٹھے اور لشکر کا ملاحظہ فرمایا۔ جب وہ حضور میں داخل ہُوا تو اشتیاق کے مارے
آپ جھروکوں کے رستے اُتر گئے۔ بیٹے کو گلے لگایا۔ جواہر نچھاور ہوتے ہوئے آئے۔ خانخاناں
کے بیٹوں نے دکن میں وہ جانفشانیاں کیں۔ کہ خاندانی سرخروئی شاداب ہو گئی۔ چنانچہ انہی
دنوں میں شاہنواز کی بیٹی (خان خاناں کی پوتی) سے شاہجہان کی شادی کر دی۔ خلعت با چارقب
زربفت۔ و دزدامن من سلک مروارید کمر شمشیر مرصع۔ معہ پردلہ مرصع با کمر خنجر مرصع عنایت فرمایا

۱۰۲۷ھ میں جہانگیر توزک میں لکھتے ہیں۔ اتالیق جاں نثار۔ خان خاناں سپہ سالار نے
امراللہ اپنے بیٹے کے ماتحت ایک فوج جرار گوندوانہ بھیجی تھی۔ کہ کان الماس پر قبضہ کر لے۔ اب
اُس کی عرضی آئی۔ کہ زمیندار مذکور نے کان مذکور نذر حضور کر دی۔ اُس کا الماس اصالت و
نفاست میں بہت عمدہ اور جوہریوں میں معتبر ہوتا ہے۔ اور سب خوش اندام آب دار خوب
ہوتے ہیں ✦

اسی سنہ میں لکھتے ہیں۔کہ اتالیق جاں سپار نے آستان بوسی کا فخر حاصل کیا۔مدت ہائے مدید ہوئیں۔کہ حضور سے دُور تھا۔لشکر منصور خاندیس اور برہان پور سے گذر رہا تھا۔تو اُس نے ملازمت کے لئے التماس کی تھی۔حکم ہؤا کہ سب طرح سے تمہاری خاطر جمع ہو۔تو جریدہ آؤ۔اور چلے جاؤ جس قدر جلد ممکن ہؤا۔حاضر حضور ہو کر قدمبوسی حاصل کی۔انواع نوازش خسروانہ اور اقسام عواطف شاہانہ سے سر عزت بلند ہؤا۔ہزار مُہر ہزار روپیہ نظر کروایا۔کئی دن کے بعد پھر لکھتا ہے کہ میں نے ایک سمند گھوڑے کا سُمیر نام رکھا تھا۔وہ میرے خاصہ کے گھوڑوں میں اوّل درجہ پر تھا۔خان خاناں کو عنایت کیا۔(اہل ہند کی اصطلاح میں سمیر سونے کا پہاڑ ہے) میں نے رنگ اور قدآوری کے سبب سے یہ نام رکھا تھا۔کئی دن کے بعد لکھتے ہیں میں پوستین پہنے تھا۔خان خاناں کو عنایت کیا۔پھر کئی دن بعد لکھتے ہیں۔آج خان خاناں کو خلعت خاصہ کمر شمشیر مرصع فیل خانہ با تلائر طلائی۔معہ مادہ فیل عنایت کر کے پھر صوبہ خاندیس و دکن کی سند مرحمت کی منصب معہ اصل و اضافہ کے ہفت ہزاری ذات و ہفت ہزار سوار مرحمت ہؤا۔ امرا میں یہ رُتبہ اب تک کسی کو نہیں حاصل ہؤا۔لشکر خاں دیوان بیوتات سے اُس کی صحبت موافق نہ آتی تھی۔اُس کی درخواست کے بموجب حامد خاں کو ساتھ کیا۔اُسے بھی ہزاری ذات کا منصب۔چار سو سوار اور فیل و خلعت عنایت ہؤا۔

آزاد۔دُنیا کے لوگ دولتمندی کی آرزو میں مرے جاتے ہیں۔اور نہیں سمجھتے کہ دولت کیا شے ہے؟ سب سے بڑی تندرستی دولت ہے۔اولاد بھی ایک دولت ہے۔علم و کمال بھی ایک دولت ہے۔حکومت اور امارت بھی ایک دولت ہے وغیرہ وغیرہ۔انہی میں زر و مال بھی ایک دولت ہے ان سب کے ساتھ خاطر جمع اور دل کا چین بھی ایک دولت ہے۔اس دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہونگے جنہیں بے درد زمانہ ساری دولتیں دے۔اور پھر ایک وقت پر دغا نہ کر جائے۔ظالم ایک داغ ایسا دیتا ہے کہ ساری نعمتیں خاک ہو جاتی ہیں کمبخت خان خاناں کے ساتھ ایسا ہی کیا۔کہ سنہ ۱۰۲۸ھ میں اس کے جگر پر جوان بیٹے کا داغ دیا۔دیکھنے والوں کے جگر کانپ گئے۔اُس کے دل کو کوئی دیکھے۔کہ کیا حال ہؤا ہوگا۔وہی مرزا ایرج جس کی دلداری نے اکبر سے بہادری کا خطاب لیا۔جس کی جانفشانی نے جہانگیر سے شہنواز خانی کا خطاب پایا۔جسے سب کہتے تھے کہ یہ دوسرا خانخاناں ہے۔اُس نے عین جوانی اور کامرانی میں شراب کے پیچھے اپنی جان کھوئی۔

اسے ذوق اتنا دختر رز کو نہ منہ لگا ۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اور دوسرے برس میں ایک اور داغ۔ وہ اگرچہ بخار سے گیا۔ لیکن ادائے خدمت کے جوش میں بے اعتدالی کرکے خدمت کے حق سے ادا ہؤا (دیکھو اُس کی اولاد کا حال)

دردناک لطیفہ ۔ ایک شاعر کے پاس کوئی شخص آیا۔ اور آبدیدہ ہو کر کہا۔ کہ حضرت بیٹا مر گیا تاریخ کہہ دیجئے۔ روشن دماغ شاعر نے اُسی وقت سوچ کر کہا۔ داغ جگر (۱۲۲۸)۔ دوسرے برس وہی جگر کباب پھر آیا۔ کہ حضرت تاریخ کہہ دیجئے۔ شاعر نے کہا چند روز ہوئے تم تاریخ لکھوا کر لے گئے تھے۔ اُس نے کہا حضرت ایک اور تھا وہ بھی مر گیا۔ شاعر نے کہا۔ اچھا داغ دگر (۱۲۲۹) جہانگیر نے ان دونوں واقعوں کو اپنی توزک میں لکھا ہے۔ حرف حرف سے درد ٹپکتا ہے (دیکھو تتمہ)

خان خاناں کا ستارہ غروب ہوتا ہے

افسوس جس خان خاناں نے بہار کامرانی کا پھول رہ کر عمر گذاری تھی۔ بڑھاپے میں وہ وقت آیا۔ کہ زمانے کے حادثے اُس پر بگولے باندھ باندھ کر حملے کرنے لگے ۱۰۲۸ھ میں ایرج مرا تھا۔ دوسرے برس رحمٰن داد گیا۔ تیسرے برس تو ادبار نے ایک ایسا نحوست کا شبخون مارا۔ کہ اقبال میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اور ایسا بھاگا کہ پھر کر نہ دیکھا۔ میرے دوستو دُنیا بُرا مقام ہے۔ بے مروّت زمانہ یہاں انسان کو کبھی ایسے موقع پر لا ڈالتا ہے کہ دو ہی پہلو نظر آتے ہیں۔ دونوں میں خطر۔ اور انجام کی خدا کو خبر عقل کام نہیں کرتی کہ کیا کرے قسمت کے ہاتھ پانسہ ہوتا ہے جس رُخ چاہے پلٹ دے۔ سیدھا پڑا تو عقلمند ہیں۔ اُلٹا پڑا تو بچہ بچہ احمق بناتا ہے۔ اور جو نقصان۔ ندامت مصیبت اور غم و اندوہ اس پر گذرتا ہے۔ وہ تو دل ہی جانتا ہے۔ پہلے اتنی بات سُن لو کہ جہانگیر کا بیٹا شاہجہان ایسا رشید اور سعادت مند بیٹا تھا کہ تیغ و قلم کی بدولت اپنے جوہرِ قابلیت کی داد لیتا تھا۔ باوجود اس کے خوش اقبال جہانگیر بھی اس کے کارناموں پر باغ باغ ہوتا تھا۔ اور اپنی جانشینی کے لائق سمجھتا تھا۔ شاہجہان خطاب شاہانہ تمغے دیئے تھے۔ عالی منصب اُس کے نوکروں کو عطا کئے تھے۔ اکبر بھی جب تک جیتا رہا ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ اور ایسے الفاظ اُس کے حق میں کہتا تھا۔ جس سے بڑی بڑی امیدیں ہوتی تھیں۔ اپنی ذاتی لیاقت اور افواج کے علاوہ خان خاناں جیسا امیر اُس کا دودیا سُسرا تھا۔ آصف خاں وزیر کُل بھی اُس کا خُسر تھا۔

نور جہاں بیگم کا حال معلوم ہے کہ کل سلطنت کی مالک تھیں۔ فقط خطبہ میں بیگم کا نام نہ تھا۔ سکہ پر ضرب۔ فرمانوں پر مُہر بھی بیگم کی ہوتی تھی۔ وہ بھی بڑی دُور اندیش اور باتدبیر بی بی

تھی۔ جب دیکھا۔ کہ جہانگیر کی مستی اور مدہوشی سے مرض اُس پر ہاتھ ڈالنے لگے ہیں۔ تو ایسی تدبیریں سوچنے لگی۔ جس سے جہانگیر کے بعد بھی حکومت میں فرق نہ آئے۔ اُس کی ایک بیٹی شیر افگن خاں پہلے شوہر سے تھی۔ ۱۰۳۰ھ میں شاہزادے شہریار سے اُس کی شادی کر دی۔ اور اُس کی سلطنت کی بنیادیں ڈالنے لگی۔ بنیاد اُس کی یہی تھی۔ کہ شاہجہان کی جڑ اکھیڑ دے شہریار سب سے چھوٹا بیٹا جہانگیر کا تھا۔ مگر طبیعت عیش پسند تھی۔ اس واسطے خیالات پست رکھتا تھا۔ اور ساس کی بادشاہی نے رہا سہا کھو دیا تھا۔

۱۰۳۱ھ میں شاہجہان دربار میں طلب ہوئے کہ مہم قندھار پر جا کر ملک موروثی کو زیر نگیں کریں۔ وہ خانخاناں اور داراب کو لیکر حاضر ہوئے۔ اور مصلحت مشورت ہو کر مہم مذکور اُن کے نام پر قرار پائی ؎

ما در چہ خیال ایم و فلک در چہ خیال
کاریکہ خدا کند فلک را چہ مجال

آسمان نے اور ہی شطرنج بچھائی۔ بازی یہاں سے شروع ہوئی۔ کہ شاہجہان نے دھولپور کا علاقہ باپ سے مانگ لیا۔ جہانگیر نے عنایت کیا۔ بیگم نے وہی علاقہ شہریار کے لئے مانگا ہوا تھا۔ اور شریف الملک شہریار کی طرف سے اُس پر حاکم تھا۔ شاہجہانی ملازم وہاں قبضہ لینے گئے۔ مختصر یہ ہے کہ طرفین کے امیروں میں تلوار چل گئی۔ اور اس عالم میں شریف الملک کی آنکھ میں تیر لگا۔ کہ کانڑا ہو گیا۔ یہ حال دیکھ کر شہریار کا سارا لشکر بپھر گیا۔ اور ہنگامہ عظیم برپا ہوا۔

شاہجہان نے افضل خاں اپنے دیوان کو بھیجا۔ نہایت عجز و انکسار کے پیام زبانی دئے اور عرضی لکھ کر عفو تقصیر کی التجا کی۔ کہ یہ آگ، بجھ جائے۔ بیگم تو آگ اور کوئلہ ہو رہی تھیں۔ یہاں آتے ہی افضل خاں قید ہو گیا۔ اور بادشاہ کو بہت سا لگا بجھا کر کہا کہ شاہجہان کا دماغ بہت بلند ہو گیا ہے۔ اُسے قرار واقعی نصیحت دینی چاہئے۔ مست الست بادشاہ نے اپنے عالم میں خدا جانے کچھ ہوں ہاں کر دی ہوگی۔ فوراً فوج کو تیاری کا حکم پہنچا اور امراء کو حکم گیا کہ شاہجہان کو گرفتار کر لاؤ۔ ادھر چند روز ہوئے تھے۔ کہ شاہ ایران نے قندھار لے لیا تھا۔ یہ مہم بھی شاہجہان کے نام ہوئی تھی۔ اور کچھ شک نہیں۔ کہ اگر وہ بہادر اور بالیاقت شاہزادہ اپنے لوازم و سامان کے ساتھ جاتا تو قندھار کے علاوہ سمرقند و بخارا تک تلوار کی چمک پہنچاتا۔ وہ مہم بھی بیگم نے شہریار کے نام لے لی۔ بارہ ہزاری آٹھ ہزار سوار کا منصب دلوایا۔ جہانگیر کو بھی لاہور میں لے آئی۔ اور شہریار یہاں لشکر تیار کرنے لگا۔ شاہجہان کے دل پر چوٹیں پڑ رہی ہیں۔ مگر چپ۔ بڑے

بڑے معتبر اور امیر سردار اس تہمت میں قید ہو گئے۔ کہ اُس سے ملے ہوئے ہیں۔ بہت سے جان سے مارے گئے۔ آصف خاں بیگم کا حقیقی بھائی تھا۔ مگر اس لحاظ سے کہ اُس کی بیٹی شاہجہان کی چاہیتی بیگم ہے۔ وہ بھی بے اعتبار ہو گیا۔ غرض یہاں تک آگ لگائی۔ کہ آخر شاہجہان جیسا سعادت مند فرمانبردار با اقبال بیٹا باپ سے باغی ہوا۔ مگر کچھ شک نہیں کہ مجبوراً باغی ہوا۔

بیگم جوڑ توڑ کی بادشاہ تھی۔ اُسے خبر تھی کہ آصف خاں کی مہابت خاں سے لاگ ہے۔ بادشاہ سے کہا کہ جب تک مہابت خاں سپہ سالار نہ ہو گا۔ مہم کا بندوبست نہ ہو گا۔ اِدھر اُس نے کابل سے لکھا۔ اگر شاہجہان سے لڑنا ہے تو پہلے آصف خاں کو نکالئے۔ جب تک وہ دربار میں ہیں قدم کچھ نہ کر سکیگا۔ آصف خاں فوراً بنگالہ بھیجے گئے۔ اور مہابت خاں سپہ سالاری کے نشان سے روانہ ہوئے۔ پیچھے پیچھے جہانگیر بھی لاہور سے آگرہ کی طرف چلے۔ امرا کی آپس میں عداوتیں تھیں۔ اُنہیں اب موقع ہاتھ آیا۔ جس کا جس پر وار چل گیا۔ نکلوایا۔ قید کروایا۔ مروا ڈالا۔ سازش کے جرم کے لئے ثبوت کی کچھ ضرورت ہی نہ تھی۔

دیکھو پرانا بڈھا جس میں دو پُشت کے تجربے بھرے تھے۔ زلالچی نہ تھا۔ جو ذرا سا فائدہ دیکھ کر پھسل پڑے۔ اُس نے ہزاروں نشیب و فراز درباروں کے دیکھے تھے۔ اُس نے عقل کے پہلو لڑانے میں کچھ کمی نہ کی ہو گی۔ اُس نے ضرور خیال کیا ہو گا۔ کہ بادشاہ کی عقل کچھ تو شراب نے کھوئی۔ رہی سہی بیگم کی محبت میں گئی۔ میں قدیمی نمک خوار سلطنت کا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے اُس کے دل نے ضرور کہا ہو گا۔ کہ سلطنت کا مستحق کون؟ شاہجہان۔ متوالا باپ سلطنت کو بیگم کی محبت میں قربان کر کے بیٹے کو برباد کیا چاہتا ہے۔ اور نمک خوار کو اس وقت سلطنت کی حمایت واجب ہے۔ اُس کی رائے نے اس بات کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔ شاہجہان سے اس وقت بگڑنا جہانگیر کی طرفداری نہیں۔ بیگم کی طرفداری ہے۔ اور سلطنت موروثی کی بربادی ہے۔

کیا خان خاناں سے ممکن نہ تھا۔ کہ دونوں سے کنارہ کر جاتا؟ کیونکر ممکن تھا۔ جہانگیر نے شاہجہان کی شادی شاہنواز خاں کی بیٹی سے کی تھی۔ اور آصف خاں نورجہاں کے بھائی کی بیٹی بھی شاہجہان کے عقد میں تھی۔ اس سے اصل مطلب یہی تھا۔ کہ ایسے ایسے ارکان دولت ایسے تعلق اُس کے ساتھ رکھتے ہونگے تو گھر کے جھگڑے اُسے حق سے محروم نہ کرینگے۔ تقدیر کی بات ہے کہ جو دن اُس نے اپنے بعد خیال کیا تھا۔ وہ جیتے جی سامنے آیا۔

جب شاہجہان نے ہمراہی کی فرمائش کی ہو گی۔ تو خان خاناں نے اپنے اور جہانگیری تعلقات

کا ضرور خیال کیا ہوگا۔ وہ بیگم سے بھی رسائی رکھتا تھا۔ اور ہم مذہب تھا۔ وہ سمجھا ہوگا۔ کہ باپ بیٹے کی تو کچھ لڑائی ہی نہیں۔ جو کھٹک ہے سوتیلی ماں کی ہے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ میں صفائی کروا دُونگا۔ اور بیشک وہ کر سکتا تھا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا۔ رنگ بیرنگ دیکھتا گیا۔ اور کسی بات کا موقع نہ پایا۔ بیگم نے کام کو ایسا بگاڑا تھا۔ کہ افسوس اصلاح کی کچھ بھی گنجائش رہی ہو۔ جس کو شاہجہان نے عرضداشت دے کر دربار میں بھیجا تھا وہ قید ہو گیا۔ یہ بھی دیکھ لیا تھا۔ کہ خان اعظم جس کا اکبر بھی لحاظ کرتا تھا اُسے قلعہ گوالیار میں قید رہنا پڑا۔ ایسے نازک پر اسے اپنے لئے کیا بھروسہ تھا۔

خان خاناں کے نمک خوار قدیم اور ملازم با اعتبار محمد معصوم نے جہانگیر کے پاس مخبری کی۔ کہ امرائے دکن سے اُس کی سازش ہے۔ اور ملک عنبر کے خطوط جو اُس کے نام تھے وہ شیخ عبدالسلام لکھنوی کے پاس ہیں۔ جہانگیر نے مہابت خاں کو حکم دیا۔ اُس نے شیخ کو گرفتار کر لیا۔ حال پوچھا تو اُس نے بالکل انکار کر دیا۔ اُس غریب کو اتنا مارا کہ مر گیا۔ مگر حرف مطلب نہ ہارا۔ خدا جانے کچھ تھا ہی نہیں یا رازداری کی۔ دونوں طرح اُسے آفرین۔

بہر صورت وہ اور داراب دکن سے شاہجہان کے ساتھ آئے۔ جہانگیر کو دیکھو۔ کس درد سے لکھتا ہے۔ جب خان خاناں جیسے امیر نے کہ میری اتالیقی کے منصب عالی سے خصوصیت رکھتا تھا۔ ستر برس کی عمر میں بغاوت اور کافر نعمتی سے منہ کالا کیا۔ تو اوروں سے کیا گلہ۔ گو ایسی ہی زشت بغاوت اور کفران نعمت سے اُس کے باپ نے میرے پدر بزرگوار سے بھی یہی شیوہ ناپسندیدہ برتا تھا۔ اُس نے باپ کی پیروی کر کے اس عمر میں اپنے تئیں ازل سے ابد تک مطعون اور مردود کیا۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود	گرچہ با آدمی بزرگ شود

بیگم نے شاہزادہ مراد کو سپاہ جرار دے کر بھائی کے مقابلے پر بھیجا۔ مہابت خاں کو سپہ سالار کیا۔ واہ ری بیگم تیری عقل دور اندیش۔ دونوں بھائیوں میں جو مارا جائے۔ شہریار کے لئے ایک پہلو صاف ہو سکے۔

غرض جب دونوں لشکر جرار قریب پہنچے۔ تو ایک ایک حصّہ دونوں پہاڑوں میں سے الگ ہو کر ٹکرایا۔ بڑا کشت و خون ہوا۔ بڑے بڑے امیر مارے گئے۔ اور بہت سے غیرت والے ننگ و ناموس پر جان دے کر دُنیا سے ناکام گئے۔ مگر شکست شاہجہان کی فوج کو نصیب

ہوئی۔ اور وہ اپنے لشکر کو لے کر کنارے ہٹا۔ کہ دکن کو چلا جائے۔ اس موقعہ پر بدگمانی اور نیک نیتی کا مقابلہ ہے کہ) خان خاناں یا تو اپنی نیک نیتی سے صلح کی تدبیر کرتا تھا۔ یا انتہائے درجہ کی چالاکی تھی۔ کہ جہانگیر سے بھی سرخرو رہنا چاہتا تھا۔ مہابت خاں سپہ سالار سے اُس نے پیغام سلام کئے۔ عجب مشکل مقام ہے۔ ذرا خیال کرو۔ باپ بیٹوں کا بگاڑ۔ وہ بھی سوتیلی ماں کی غرض پرستی اور متوالے باپ کی مدہوشی سے سرداران لشکر آٹھ پہر ایک جگہ رہنے سہنے والے۔ ایک قاب میں کھانے والے۔ ایک جام میں پینے والے۔ ان میں پیغام کیونکر بند ہو سکے مشکل یہ ہوئی کہ اس معاملہ میں چالاک سپہ سالار کے دریائے طبع نے انشا پردازی کی موج ماری۔ اپنے ہاتھ سے خط لکھا۔ اور بادشاہ کی ہواخواہی کے مضمون لکھ کر اس میں یہ شعر بھی لکھا ؎

صد کس بہ نظر نگاہ مے دارندم	ورنہ بپریدمے ز بے آرامی

یہ خط کسی نے پکڑ کر شاہجہان کو دے دیا۔ اُس نے اُنہیں بُلا کر خلوت میں دکھایا۔ جواب کیا تھا؟ چُپ شرمندہ۔ آخر بیٹوں سمیت دولت خانہ کے پاس نظر بند ہوئے۔ اور اتفاق یہ کہ سُوہی منصبداروں کو اُن کی حفاظت سپرد ہوئی۔ آسیر پہنچ کر سید مظفر بارہہ کے سپرد کیا کہ قلعہ میں لے جا کر قید کرو۔ لیکن داراب بے گناہ تھا۔ اس لئے سوچ سمجھ کر دونوں کو رہا کر دیا۔

بادشاہ نے شاہزادہ پرویز کو بھی امرا کے ساتھ فوجیں دے کر بھیجا تھا۔ وہ دریائے نربدا پر جا کر تھم گیا۔ کیونکہ شاہجہان کے سرداروں نے گھاٹوں کا خوب بندوبست کر رکھا تھا۔ یہ بھی ساتھ تھے۔ اور یہ کوئی مجرم قیدی نہ تھے۔ عبدالرحیم خان خاناں تھے۔ دیکھنے کو نظر بند تھے۔ مگر صحبت میں بھی شامل ہوتے تھے۔ ہواخواہی اور خیر اندیشی کی اصلاحیں کرتے تھے جن کا خلاصہ ایسے مطالب تھے۔ جن سے فتنہ و فساد کی راہ بند ہو۔ اور کامیابی کے ساتھ صلح کے رستے نکلیں۔

اُدھر سے جب مہابت خاں اور پرویز دریا کے کنارے پہنچے۔ سامنے شاہجہان کا لشکر نظر آیا۔ دیکھا کہ گھاٹوں کا انتظام بہت چُست ہے۔ اور دریا کا چڑھاؤ اسے زور شور سے مدد دے رہا ہے۔ کشتیاں سب پار کے کنارے پر کھینچ لے گئے۔ اور مورچے توپ و تفنگ سے سد سکندر کر گئے۔ لشکر کے ڈیرے ڈلوا دئے۔ اور بندوبست میں مصروف ہوئے۔ مہابت خاں نے ایک جعلسازی اور دوست نمائی کا خط خان خاناں کے نام لکھا۔ اور اس طرح بھیجا کہ شاہجہان کے ہاتھ میں جا پہنچا۔

خلاصہ خط مہابت خاں ۔ عالم جانتا ہے کہ شہزادہ جہاں و جہانیاں کو اطاعت حضور کے سوا اور کچھ بات منظور نہیں ۔ فتنہ پرداز اور درانداز عنقریب اپنی سزا کو پہنچینگے ۔ میں مجبور ہوں کہ آ نہیں سکتا ۔ مگر ملک کی حالت دیکھ کر افسوس آتا ہے ۔ کہ اُس کی اصلاح اور خلق خدا کے امن و آسائش میں جان سے حاضر ہوں ۔ اور اس بات کو اپنا اور کُل مسلمانوں کا فرض سمجھتا ہوں اگر تم شہزادہ بلند اقبال کو یہ مطالب منقوش خاطر کر کے ایک دو معتبر معاملہ فہم شخصوں کو بھیج دو ۔ تو عین مصلحت ہے ۔ کہ باہم گفتگو کر کے ایسی تدبیر نکالیں جس میں یہ آگ بُجھ جائے اور خونریزی موقوف ہو ۔ باپ بیٹے پھر ایک کے ایک ہو جائیں ۔ شہزادہ کی جاگیر کی کچھ ترقی ہو جائے ۔ اور نور محل شرمندہ ہو کر ہماری تجویز پر راضی ہو جائے وغیرہ وغیرہ ۔ یہ اور ایسی ایسی چند باتیں قول و قسم اور عہد و پیمان کے ساتھ لکھیں ۔ اس پر کلام الٰہی کو درمیان دیا ۔ اور خط کو ملفوف کر کے ادھر کی ہوا میں اس طرح اُڑایا ۔ کہ شاہجہان کے دامن میں جا پڑا ۔ وہ خود امن و امان کا عاشق تھا ۔ مصاحبوں سے صلاح کی ۔ خان خاناں سے بھی گفتگو ہوئی ۔ یہ پہلے ہی ان مضامین کے شاعر تھے ۔ شہزادہ کو اس کام کے لئے ان سے بہتر رسا اور معاملہ فہم کوئی نظر نہ آتا تھا ۔ قرآن سامنے رکھ کر قسمیں لیں ۔ داراب کو ساتھ اور عیال کو اپنے پاس رکھا ۔ اور انہیں روانہ کیا ۔ کہ جا کر دریا کا بہاؤ اور ہوا کا رُخ پھیرو ۔ دریا کے اس پار ہو ۔ اور طرفین کی صلاحیت پر صلح قرار دو ۔

خان خاناں شطرنج زمانہ کے پکے چالباز تھے ۔ مگر خود بڈھے ہو گئے تھے عقل بڑھیا ہو گئی تھی ۔ مہابت خاں جوان اُن کی عقل جوان ۔ جب یہ لشکر بادشاہی میں پہنچے ۔ اُن کے اعزاز و احترام میں بڑے مبالغے ہوئے ۔ خلوت میں ایسی دلسوزی اور دردخواہی کی باتیں کیں ۔ کہ اُنہوں نے خوشی خوشی کامیابی مقاصد کے پیام اور اطمینان کے مراسلے شاہجہان کو لکھنے شروع کئے ۔ اُس کے امرا کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ بھی خوش ہوئے ۔ اور غلطی یہ کی کہ گھاٹوں کے انتظام اور کناروں کے بندوبست ڈھیلے کر دیئے ۔

مہابت خاں عجیب چلتا پُرزہ نکلا ۔ اُس نے چپکے چپکے راتوں رات فوج پار اُتار دی ۔ اب خدا جانے اُس نے دردخواہی اور نیک نیتی کا ہرا باغ دکھا کر اُنہیں غفلت کی دارو بیہوشی پلائی ۔ یا لالچ کا دسترخوان بچھا کر باتیں ایسی چکنی چپڑی کیں ۔ کہ یہ قرآن کو نگل کر اُس سے مل گئے بہرحال شاہجہان کا کام بگڑ گیا ۔ وہ دل شکستہ نہایت ناکامی کے عالم میں پیچھے ہٹا ۔ اور اس اضطراب کے ساتھ دریائے تاپتی سے پار اُترا کہ فوج اور سامان فوج کا بہت نقصان ہوا ۔ اکثر

امیر ساتھ چھوڑ کر چلے گئے +

داراب اور بعض عیال شاہجہان کے پاس تھے۔ یہ لشکر بادشاہی میں اُدھر پڑے تھے اب مہابت خاں سے موافقت کرنے کے سوا چارہ کیا تھا۔ اُس کے ساتھ برہان پور پہنچے مگر سب اِن کی طرف سے ہوشیار ہی رہتے تھے۔ صلاح ہوئی کہ نظر بند رکھو اور ان کا خیمہ پرویز کے ساتھ طناب بہ طناب رہے۔ اس سے مطلب یہ تھا۔ کہ جو کچھ کریں حال معلوم ہوتا رہے۔ مہابت خاں برہان پور میں پہنچ کر نہ ٹھیرا۔ دریائے تاپتی اُتر کر تھوڑی دُور تعاقب کیا۔ اور وہ دکن سے بنگالہ کی طرف روانہ ہوا +

جانا بیگم باپ کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے جو ہمت و حکمت کے سبق ان سے پڑھے تھے حرف بحرف یاد کر رکھے تھے۔ اُس نے کہا کہ میں باپ کو نہ چھوڑوں گی۔ جو اس کا خلل سو میرا حال۔ وہ بھی دانیال شہزادہ کی بیوہ تھی۔ اُس کے بچے ساتھ تھے۔ اُسے کون روک سکے آخر باپ کے پاس خیمہ میں رہی۔ **فہیم** ان کا غلام خاص کہ فی الحقیقت فہیم اور کاردان بے نظیر تھا۔ اسے دلاوری نے دودھ پلایا تھا۔ اور شجاعت کے نمک سے پلا تھا۔ جس طرح اس معرکہ میں مارا گیا۔ اس کا رنج خان خاناں ہی کے دل سے پوچھنا چاہئے۔ شاہجہان کو جب یہ خبریں پہنچیں اُن کے بال بچوں کو قید کر لیا۔ اور حفاظت راجہ بھیم کے سپرد کی (راجہ بھیم رانا کا بیٹا تھا) ادھر خانخاناں کو یہ حال سُنکر بہت رنج ہوا۔ اور راجہ کو پیغام بھیجا کہ میرے عیال کو چھوڑ دو میں لشکر بادشاہی کو اِدھر سے کچھ نہ کچھ حکمت عملی کر کے پھیر دیتا ہوں۔ اگر یہی حال ہے تو سمجھ لو کہ کام مشکل ہوگا میں خود آ کر چھڑا لے جاؤں گا۔ راجہ نے لکھا۔ کہ ابھی تک پانچ چھ ہزار جاں نثار رکاب میں موجود ہیں۔ اگر تم چڑھ کر آئے۔ تو پہلے تمہارے بال بچوں کو قتل کرینگے۔ پھر تم پر آن پڑیں گے۔ یا تم نہیں یا ہم نہیں +

شاہجہان کے لشکر بادشاہی سے معرکے بھی ہوئے۔ اور بڑے بڑے کشت و خون ہوئے۔ افسوس اپنی فوجیں آپس میں کٹ کر کھیت رہیں۔ اور دلاور سردار اور ہمت والے امیر مفت جانوں سے گئے۔ شاہجہان لڑتے بھڑتے کبھی کنارہ اور کبھی پیچھے ہٹتے اوپر اوپر بنگالہ میں جا نکلے۔ یہاں داراب سے قول و قسم لے کر بنگالہ کی حکومت دی۔ اُس کی بی بی بیٹے۔ بیٹی اور ایک شاہ نواز خاں کے بیٹے کو یرغمال میں لے لیا۔ اور آپ بہار کو روانہ ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد داراب کو بُلا بھیجا۔ اُس نے لکھا کہ زمینداروں نے مجھے گھیر رکھا ہے حاضر نہیں ہو سکتا

شاہجہان کی فوج برباد ہو چکی تھی۔ وہ دل شکستہ جس رستے آیا تھا۔ اُسی رستے دکن کو پھرا۔ خیال ہؤا کہ یہ بھی بادشاہ سے مل گیا۔ اُن کے جوان بیٹے اور بھتیجے کو مار ڈالا۔ داراب یہاں بے دست و پا ہو گیا تھا۔ بادشاہی لشکر نے آکر مُلک پر قبضہ کر لیا۔ داراب سلطان پرویز کے لشکر میں حاضر ہؤا۔ جہانگیر کا حکم پہنچا۔ کہ داراب کا سر کاٹ کر بھیج دو۔ افسوس اس سر کو ایک خوان میں کھانے کی طرح کسوا کر بدنصیب باپ کے پاس بھیج دیا۔ اللہ اکبر جس خان خاناں کے سامنے کسی کو مجال نہ ہوتی تھی۔ کہ رحمٰن داد کے مرنے کا نام زبان سے نکالے۔ چُپ بیٹھا تھا۔ اور آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ مہابت خاں کے یزیدیوں نے بموجب اُس کے حکم کے کہا کہ حضور نے یہ تربوز بھیجا ہے۔ خونی جگر باپ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ درست! شہیدی ہے کہنے والوں نے تاریخ کہی

ع شہید پاک شد داراب مسکین

افسوس کے قابل تو یہ بات ہے۔ کہ وہ جانباز دلاور جن کی عمریں اور کئی کئی پشتیں اس سلطنت میں جاں نثاری اور وفاداری کی مشق کر رہی تھیں مفت ضائع ہوئیں۔ اگر شاہجہان کے ساتھ قندھار پر جاتے تو کارنامے دکھاتے۔ اُذبک پر جاتے تو ملک موروثی کو چھڑاتے اور ہندوستان کا نام توران میں روشن کر کے آتے۔ اور حیف کہ اپنے ہاتھ اپنے ہاتھوں سے جدا ہوئے۔ اور اپنے سر اپنے ہاتھوں سے کٹے۔ اپنی چھری سے اپنے پیٹ چاک ہوئے۔ یہ کیونکر؟ بیگم صاحبہ کی خود غرضی اور خود پرستی کی بدولت۔ بیشک کہ بیگم کو بھی ایک لعل بے بہا۔ تاج سلطنت کا کہنا زیبا ہے عقل۔ تدبیر۔ ہمت۔ سخاوت۔ قدردانی فیض رسانی میں ثانی نہ رکھتی تھیں لیکن کیا کیجئے۔ جو بات ہوتی ہے۔ وہی کہی جاتی ہے۔ چند روز کے بعد شاہ اور شاہزادہ دونوں باپ بیٹے جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے۔ امرا بچارے شرمندہ حیران کہ کہاں جائیں۔ اور کیا مُنہ لے کر جائیں۔ مگر اس گھر کے سوا اور گھر کون سا تھا +

سنہ ۱۰۳۶ھ میں خانخاناں حضور میں طلب ہوئے۔ مہابت خاں نے جب رخصت کیا تو جو جو معاملے درمیان آئے تھے ان کا بہت عذر کیا۔ اور سامان سفر اور لوازم ضروری کے سرانجام میں وہ ہمت عالی دکھائی۔ جو خان خاناں کی شان کے لائق تھی۔ مطلب یہ تھا۔ کہ آئندہ کے لئے صفائی ہو جائے۔ اور ان کے دل میں میری طرف سے غبار نہ رہے۔ یہ جب دربار میں آئے تو جہانگیر خود توزک میں لکھ[illegible] ندامت کی پیشانی کو دیر تک زمین پر رکھے رہا۔ سر نہ اُٹھایا۔ میں نے کہا۔ جو کچھ وقوع میں آیا تقدیر کی باتیں ہیں۔ نہ تمہارے اختیار کی باتیں ہیں

نہ ہمارے۔ اِس کے سبب سے ملامت اور خجالت دل پر نہ لاؤ۔ ہم اپنے تئیں تم سے زیادہ شرمندہ پاتے ہیں۔ جو کچھ ظہور میں آیا۔ تقدیر کے اتفاق ہیں۔ ہمارے تمہارے اختیار کی بات نہیں "۔

ارکان دولت کو حکم ہوا کہ انہیں لے جا کر اُتارو۔ کئی دن کے بعد لاکھ روپیہ انعام دیا۔ کہ اسے اپنی درستی احوال میں صرف کرو۔ چند روز کے بعد صوبہ قنوج عطا ہوا۔ اور خان خاناں کا خطاب جو اُس سے چھین کر مہابت خاں کو ملا تھا پھر اُنہیں مل گیا۔ اِنہوں نے شکریہ میں یہ شعر کہہ کر مُہر میں کھدوایا ؎

مرا لطف جہانگیری بتائیدات یزدانی	دوبارہ زندگی داد و دوبارہ خان خانانی

دُوسرے ہی برس میں پانسا پلٹا ؎

زوالِ دُنیا نے صلح کی کس دن	یہ لڑاکا سدا سے لڑتی ہے

بیگم کی مہابت خاں سے بگڑی۔ فرمان گیا کہ حاضر ہو۔ اور اپنی جاگیر اور فوج وغیرہ کا حساب کتاب سمجھا دو۔ بادشاہ لاہور سے گلگشت کشمیر کو چلے جاتے تھے۔ وہ ہندوستان کی طرف سے آیا۔ چھ ہزار تلوار مار راجپوت اس کے ساتھ۔ لاہور ہوتا ہوا حضور میں چلا۔ مگر تیور بگڑے اور غصّہ میں بھرا ہوا۔ خان خاناں یہیں موجود تھے۔ زمانہ کی نبض خوب پہچانتے تھے سمجھ گئے کہ آندھی آئی ہے۔ خوب خاک اُڑیگی۔ ساتھ ہی یہ بھی جانتے تھے کہ چھ ہزار کی حقیقت کیا ہے جس پر یہ جاہل افغان کودتا ہے (یہ جاں نثار اُس کے ذاتی نوکر تھے) یہ ضرور بگڑ بیٹھیگا۔ مگر آخر کو خود بگڑ جائیگا۔ کیونکہ بنیاد نہیں۔ آخر بازی بیگم کے ہاتھ رہیگی۔ خلاصہ یہ کہ اُن کی ملاقات کو نہ گئے بلکہ مزاج پُرسی کو وکیل بھی نہ بھیجا۔ اُس کا بھی سب طرف خیال تھا۔ سمجھ گیا کہ خان خاناں ہیں۔ اور کدورت بھی دکھا دی ہے۔ خدا جانے وہاں کے معرکے کا پہلو کس طرف آن پڑے۔ یہ پیچھے سے آ گرے تو اور مشکل ہو گی۔ چنانچہ جب کنارہ جہلم پر پہنچ کر بادشاہ کو قید کیا۔ اُسی وقت آدمی بھیجے کہ خان خاناں کو حفاظت کے ساتھ دلّی پہنچا دو۔ اطاعت کے سوا چارہ کیا تھا۔ چُپ دِلّی چلے گئے۔ وہاں سے ارادہ کیا کہ اپنی جاگیر کو جائیں۔ وہ پھر بدگمان ہوا۔ اور رستہ سے بلوا لیا۔ کہ لاہور میں بیٹھو۔ وہاں جا کر جو کچھ مہابت خاں نے کیا۔ خواہ نمک حرامی کہو خواہ یہ سمجھو کہ ایک مست مدہوش کے گھر کا انتظام کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال جو حرکت اس نے کی۔ شاید کسی نمکخوار امیر سے ہوئی ہو۔ یہاں تک کہ بادشاہ اور بیگم دونوں کو الگ الگ قید کر لیا۔ بیگم کی دانائی اور حکمت عملی سے آہستہ آہستہ

اُس کا طوفان دھیما ہوا۔ آخر یہ کہ بھاگا۔ خان خاناں کا دل اُس کے زخموں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ بڑی التجا اور تمنا سے عرضی بھیجی۔ کہ اس نمک حرام کے استیصال کی خدمت مجھے مرحمت ہو۔ بیگم نے اُس کی جاگیر خان خاناں کی تنخواہ میں مرحمت کی۔ ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار۔ دو اسپہ سہ اسپہ خلعت اور شمشیر مرصع۔ گھوڑا بازین مرصع فیل خاصہ اور بارہ لاکھ روپیہ نقد اور گھوڑے۔ اونٹ۔ بہت سامان عنایت کیا۔ اجمیر کا صوبہ بھی مرحمت کیا۔ امرا فوجیں دے کر ساتھ کئے۔ بہتر برس کا بڈھا اس پر قیامت کے صدمے گذر چکے تھے۔ طاقت نے بیوفائی کی۔ لاہور ہی میں بیمار ہو گئے۔ دہلی میں پہنچ کر ضعف غالب ہوا۔ اواسط ۱۰۳۶ھ میں دُنیا سے انتقال کیا۔ اور ہمایوں کے مقبرہ کے پاس دفن ہوئے۔ تاریخ ہوئی۔ **خان سپہ سالار کو**۔ تمام اہل تاریخ باپ کی طرح اس کا ذکر بھی خوبیوں سے لکھتے ہیں۔ اور محبوبیاں اس پر طرہ ہیں +

جہانگیر نے اس کے واقعہ کے موقع پر توزک میں نہایت افسوس کے ساتھ خدمتوں کے بعض کارنامے مختصر اشاروں میں بیان کئے ہیں۔ اور شاہنواز کے جوہر شجاعت کو بھی ظاہر کیا ہے۔ اخیر میں لکھتا ہے کہ خان خاناں قابلیت و استعداد میں یکتائے روزگار تھا۔ زبان عربی۔ ترکی۔ فارسی ہندی جانتا تھا۔ اقسام دانش عقلی و نقلی یہاں تک کہ ہندی علوم سے بھی بہرہ وافی رکھتا تھا۔ شجاعت اور شہامت اور سرداری میں نشان بلکہ نشان قدرت الٰہی کا تھا۔ فارسی و ہندی میں خوب شعر کہتا تھا حضرت عرش آشیانی کے حکم سے واقعات بابری کا ترجمہ فارسی میں کیا کبھی کوئی شعر اور کبھی کوئی رباعی اور غزل بھی کہتا تھا۔ اور نمونہ کے طور پر چند است آرزو مند است کے قافیہ کی غزل اور ایک رُباعی بھی لکھی ہے +

نظام الدین بخشی نے طبقات ناصری کے آخر میں امرائے عہد کے حالات مختصر درج کئے ہیں۔ اس کا ترجمہ لکھتا ہوں +

اس وقت خان خاناں کی ۲۷ برس کی عمر ہے۔ آج دس برس ہوئے۔ کہ منصب خانخانی اور سپہ سالاری کو پہنچا ہے۔ عالی خدمتیں اور عظیم فتحیں کی ہیں۔ فہم و دانش اور علم و کمالات اُس بزرگ نہاد کے جتنے لکھیں۔ سَو میں سے ایک اور بہت میں سے تھوڑے ہیں۔ شفقت عالم۔ علما و فضلا کی تربیت۔ فقراء کی محبت۔ اور طبع نظم اس نے میراث پائی ہے۔ فضائل و کمالاتِ انسانی میں آج اس کا نظیر امرائے دربار میں نہیں ہے +

اکثر باتیں تھیں۔ کہ اُن کے خاندان کے لئے خاص تھیں۔ ان میں سے اکثر خود اُنکی طبیعت کے

عمدہ ایجاد تھے۔ اور بعض بادشاہی خصوصیت کی مہر رکھتے تھے۔ دوسرے کو وہ رتبہ حاصل نہ تھا مثلاً سپرہُما کہ اُس کی کلغی بادشاہ اور شہزادوں کے سوا کوئی امیر نہ لگا سکتا تھا۔ ان کو اور اُن کے خاندان کو اجازت تھی +

خان خاناں کا مذہب

صاحب مآثر الامرا لکھتے ہیں۔ کہ وہ اپنا مذہب سنت وجماعت ظاہر کرتے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ شیعہ ہیں۔ تقیہ کرتے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ فیض ان کا شیعہ سُنی سب کو برابر پہنچتا تھا کسی مذہب کے لئے خاص نہ تھا۔ البتہ بیٹے ایسی تعصب کی باتیں کرتے تھے جس سے ثابت ہوتا تھا۔ کہ سنت جماعت مذہب رکھتے ہیں۔ خان خاناں علی العموم احکام شریعت کو مانتے تھے اور جہاں تک ممکن تھا اُن کی پابندی بھی کرتے تھے لیکن دربار کے دَور میں گھر جاتے تو شراب بھی پی لیتے تھے جس مقام پر کہ خان خاناں کو مہم دکن اور قندھار وغیرہ کے لئے خاندیس سے بلایا وہ یلغار ڈاک کی چوکی بٹھاکر کر کے آیا۔ یہاں خلوتوں میں جلسہ ہائے مشورہ ہوئے۔ ایک شب کہ خان خاناں اور مان سنگھ وغیرہ امرائے خاص کو جمع کیا تھا۔ اسکے بیان میں مُلا صاحب کیا مزے سے چٹکی لیتے ہیں۔ "اسی جلسہ میں کہ شب عاشورہ تھی۔ ساقی نے جام بادشاہ کے سامنے کیا۔ اُنہوں نے خانخاناں کو دیا۔ مُلّا صاحب جو چاہیں فرمائیں۔ مگر یہ تو کہیں کہ زمانہ کیا تھا جن صحبتوں میں صدر الشریعت اور مُفتی اسلام۔ کل ممالک محروسہ ہندوستان کا خود مانگ کر جام لے۔ وہاں خان خاناں بادشاہ کا دیا ہوُا جام لیکر نہ پی جائے تو کیا کرے۔ یہ بیچارہ تو ایک ترک بچہ سپاہی زادہ تھا +

گر یار سے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے	زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

اور حق پوچھو تو اکبر بھی زاہدان پارسا سے بے جا بیزار نہ تھا۔ اُنہوں نے اس کے استیصال سلطنت میں کیا کسر رکھی تھی +

اخلاق اور طبعی عادات

آشنائی اور آشنا پرستی میں اعجوبۂ روزگار تھے۔ خوش مزاج۔ خوش اخلاق اور صحبت میں نہایت گرم جوش۔ اپنے دلربا اور دلفریب کلام سے یگانہ و بیگانہ کو غلام بنا لیتے تھے۔ باتوں باتوں میں کانوں کے رستہ سے دل میں اُتر جاتے تھے۔ شیریں کلام، لطیفہ گو۔ بذلہ سنج۔ اور نہایت طرار و فرار تھے دربار اور

عبدالتمہائے بادشاہی کی خبروں کا بڑا خیال تھا۔ مگر حق پوچھو تو علی العموم اخبار واقعات کے عاشق تھے
کئی شخص دارالخلافہ میں نوکر تھے۔ کہ دن رات کے حالات برابر ڈاک چوکی میں بھیجے جاتے تھے عبدالتمہانے
کچہریاں۔ چوکی چبوترہ۔ یہاں تک کہ چوک اور کوچہ و بازار میں بھی جو کچھ سنتے تھے لکھ بھیجتے تھے خانخاناں
رات کو بیٹھ کر سب کو پڑھتے تھے اور جلا دیتے تھے۔

بادشاہی یا اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی طرف رجوع کرنے میں اپنے عالی مرتبہ کا خیال نہ رکھتے
تھے۔ وہ دشمنوں سے بھی بگاڑتے نہ تھے۔ مگر موقع پاتے تو چوکتے بھی نہ تھے۔ ایسا ہاتھ مارتے
تھے کہ قلم ہی کر دیتے تھے۔ ان باتوں کے سبب سے لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک زمانہ ساز آدمی تھے۔
اور یہ مقولہ اُن کا اصول تدبیر تھا۔ کہ دشمن[1] کو دوست بن کر مارنا چاہیئے۔ اور سبب اس کا یہ ہے کہ وہ
ترقی مدارج اور جاہ و دولت کے ہر وقت محتاج تھے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے شجاعت۔ سخاوت
دانش و تدبیر بند و لبست جنگی و مُلکی میں افسر تھے مختلف وقتوں میں تیس برس تک دکن میں بسر
کیئے۔ اور اس طرح کئے کہ سلاطین اور امرائے دکن کو اپنی رسائی کے وسیلے اطاعت و اخلاص کے
پھندوں میں پھانسے رکھا۔ جو شاہزادہ یا امیر دربار شاہی سے جاتا تھا۔ یہی کہتا تھا۔ کہ یہ غنیم سے
ملے ہوئے ہیں۔ دولت چغتائی کے امرائے عظیم الشّان میں سے تھا۔ اس کے نام نامی نے صفحۂ شہرت
پر نقش دوام پایا ہے۔ مطالب مذکورہ کے بعد مآثر الامرا میں ایک شعر بھی لکھا ہے۔ جو کسی حریف یا
حریفوں کے خوشامدی نے کہا تھا ؎

یک وجب قد و صد گرہ در دل		مشتکے استخواں و صد مشکل	

آزاد۔ ہائے ہائے۔ بیرحم دُنیا۔ اور حیف بے درد اہل دُنیا۔ گڑھوں کے بسنے والے۔
موریوں کے سڑنے والے بادشاہی محلّوں کے رہنے والوں پر باتیں بناتے ہیں۔ اُنہیں کیا خبر ہے
کہ اُس شاہ نشان امیر کو کیا کیا نازک موقع اور پیچیدہ معاملے پیش آتے تھے۔ اور وہ سلطنت کی
مہموں کو حکمت کے ہاتھوں سے کس طرح سنبھالتا تھا کمینی نجس اور ناپاک دُنیا۔ اسکی آبادی۔
شور و شر کا میلا ہے۔ تمام بدنیت۔ بداندیش۔ بدکردار۔ ظاہر کچھ۔ باطن کچھ۔ دل میں دغا۔ زبان پر
قسمیں۔ اس پر بے لیاقت آپ کچھ بھی نہیں کرتے۔ بلکہ کچھ کر نہیں سکتے۔ اس پر لیاقت والوں اور
کرنیوالوں کو دیکھ نہیں سکتے۔ ان کی جانفشاں محنتوں کو مٹا کر بھی صبر نہیں کرتے۔ بلکہ اسکی اُجرت
کے خود مستحق بنتے تھے۔ ایسے نااہلوں کے مقابل میں انسان ویسا ہی نہ بن جائے تو کیونکر بسر کر سکے

[1] بادشمن درلباس دوستی دشمنی نمودہ آید۔

حکیم یونان نے کیا خوب کہا ہے۔ (انسان کے نیک رہنے کے لئے ضرور ہے کہ اسکے ہم معاملہ بھی نیک ہوں۔ ورنہ اس کی نیکی نہیں نبھ سکتی) بیشک بالکل درست کہا۔ اگر یہ اپنی ذات سے ٹھیک رہے تو بدنیت شیطان اس کے کپڑے بلکہ کھال تک نوچ کرلے جائیں۔ اس لئے واجب ہے کہ بے ایمانوں کے ساتھ اُن سے زیادہ بے ایمان بنے +

خان خاناں نام کو ہفت ہزاری منصب دار تھا۔ مگر ملکوں میں خود اختیار سلطنت کرتا تھا۔ صدہا ہزاریوں سے اس کے معاملے پڑتے تھے۔ اس طرح کام نہ نکالتا تو ملکداری کیونکر چلتی۔ ایسے سے مس طرح جان نہ بچاتا تو کیونکر بچتا۔ انبوہ در انبوہ منافقوں کو اس پیچ سے نہ مارتا تو خود کیونکر جیتا۔ ضرور مارا جاتا۔ کاغذوں پر بیٹھ کر لکھنا اور بات ہے اور مہموں کا سر کرنا اور سلطنتوں کا عمل درآمد کرنا اور بات ہے۔ وہی تھا کہ سب کچھ کر گیا۔ اور نیکی لے گیا۔ اور نام نیک یادگار چھوڑ گیا۔ اس وقت بہتیرے امیر تھے اور آج تک بہتیرے ہوئے کسی کی تاریخ زندگی میں اس کے کارناموں کا پاسنگ تو دکھا دو +

استعداد علمی اور تصنیفات

استعداد علمی کے باب میں اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ عربی زبان بہت خوب سمجھتا تھا اور بولتا تھا۔ فارسی اور ترکی اس کے گھر کی زبان تھی۔ گو نان و یوہ ہندی ہو گر تھا۔ مگر سارا گھر بار اور نوکر چاکر ترک اور ایرانی تھے۔ خود ہمہ گیر طبیعت رکھتا تھا۔ میں نے اس کی اکثر عرضیاں بادشاہ اور شاہزادوں کے نام اکثر مراسلے احباب و امرا کے نام اکثر خط مرزا ایرج وغیرہ بیٹوں کے نام دیکھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی کا عمدہ انشا پرداز تھا۔ اُس زمانہ کے لوگ اپنے بزرگوں کی ہر بات کی خصوصاً زبان کی بڑی حفاظت کرتے تھے۔ اور بڑی بات یہ تھی کہ بادشاہ وقت ترک تھا۔ جہانگیر اپنے بچپن کے حال میں لکھتا ہے میرے باپ کو بڑا خیال تھا کہ مجھے ترکی زبان آئے۔ اسواسطے پھوپھی کے سپرد کیا تھا۔ کہ اس سے ترکی ہی بولا کرو اور ترکی ہی بلوایا کرو +

مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ خان خاناں عربی۔ فارسی۔ ترکی میں رواں تھا۔ اور اکثر زبانیں جو عالم میں رائج ہیں۔ اُن میں گفتگو کرتا تھا +

(۱) **توزک بابری** ترکی میں تھی۔ اکبر کے حکم سے ترجمہ کر کے ۹۹۷ھ میں نذر گذرانی۔ اور تحسین و آفرین کے بہت پھول سمیٹے۔ اس کی عبارت سلیس اور عام فہم ہے اور بابر کے خیالوں کو نہایت

صفائی سے ادا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اُس عالی دماغ امیر الامرا نے نہ آنکھوں کا تیل نکالا ہوگا نہ چراغ کا دھوآں کھایا ہوگا۔ مفت خور ملّا نے بہت ساتھ رہتے تھے۔ کسی سے کہہ دیا ہوگا۔ ایک دو اُزبک ساتھ کر دیئے ہونگے۔ سب مِل جُل کر لکھتے ہونگے۔ آپ سُنا کرتا ہوگا۔ ہدایتیں کرتا جاتا ہوگا جب اس خوبی اور خوش ادائی کے ساتھ یہ نسخہ تیار ہوا۔ مولوی ملّانوں سے کیا ہوتا تھا ؎

عشق و جنوں کی راہیں اہلِ وفا سے پوچھو	کیا جانیں شیخ صاحب ملّا نے آدمی ہیں!

(۲) اکبر کا عہد گویا نئی روشنی کا زمانہ تھا۔ اُس نے علم سنسکرت بھی حاصل کیا۔ جوتش میں اِسکی مثنوی ہے۔ ایک مصرع فارسی ایک سنسکرت +

(۳) فارسی میں دیوان نہیں ہے متفرق غزلیں اور رباعیاں ہیں۔ مگر جو کچھ ہیں خوب ہیں۔ جو خود خوب ہیں۔ ان کی سب باتیں خوب ہیں +

اولاد

باپ مہمّوں پر رہتا تھا۔ بچّوں نے اکثر اکبر کی حضوری میں پرورش پائی۔ خان خاناں بچّوں کو بہت چاہتا تھا۔ چنانچہ اکبر بھی اکثر فرمانوں میں ایرج۔ داراب کا نام کسی نہ کسی طرح لے دیتا تھا۔ ابوالفضل کو اس سے زیادہ لینے پڑتے تھے۔ کہ ان دنوں بڑی محبّتیں تھیں۔ ۹۹۶ھ میں اکبر نامہ میں لکھتے ہیں۔ خان خاناں کو بیٹے کی بڑی آرزو تھی تیسرا بیٹا ہوا حضور نے فارن نام رکھا۔ شادی کی دھوم دھام میں جشن کیا۔ اور حضور کو بھی بلایا عرضی قبول ہوئی۔ اور اعزاز کے رُتبے بلند ہوئے۔ تحریروں کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی بچّوں سے محبت رکھتا تھا اُتنی ہی تعلیم و تربیت پر توجّہ رکھتا تھا +

مرزا ایرج سب میں بڑا تھا۔ اس کی تربیت و تعلیم کا حال معلوم نہیں۔ ابوالفضل نے عالم اتحاد کی گرمجوشی میں ایک خط خان خاناں کو لکھا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں۔ دربار میں ایرج کا بھیجنا کیا ضرور ہے۔ تمہیں اس میں اصلاح عقیدہ کا خیال ہے۔ یہ اُمید بے حاصل ہے +

آزاد۔ جو لوگ شیخ کو بے دین کہتے ہیں اور اکبر کو بے دین کر دینے کا اسے الزام لگاتے ہیں وہ اِن لفظوں کو دیکھیں۔ کہ اِس کے دل میں دربار کی طرف سے ان معاملات میں کیا خیال تھا۔ جو یہ فقرے قلم سے نکلے ہیں +

سنہ ۴۰ جلوس اکبری میں خان خاناں دکن میں تھا۔ تو ایرج بھی اُس کے ساتھ تھا عنبر حبشی

ل دشت جنوں کی راہیں وحشت زدوں سے پوچھو +

فوج لے کر تلنگانہ کو مارتا ہوا چیرے پر آیا۔ اُمرا نے خان خاناں کو متواتر تحریریں بھیج کر کمک مانگی۔ خان خاناں نے ایرج کو بھیجا۔ وہاں بڑے معرکہ کا میدان ہوا۔ نوجوان دلاور نے اس بہادری سے تلواریں ماریں کہ باپ دادا کا نام روشن ہو گیا۔ پرانے پرانے سپاہی آفرین کرتے تھے۔ ماں شمشیر کی سفارش نے اُسے دربار سے بہادری کا خطاب دلوایا +

۱۰۱۲ھ میں جبکہ عادل شاہ نے شاہزادہ دانیال کے ساتھ اپنی بیٹی کی نسبت منظور کی۔ تو چند امرا کے ساتھ معہ پانچ ہزار سپاہ کے برات لے کر گیا۔ وہاں سے دُلہن کی پالکی کے ساتھ جہیز کے سامان پیشکش لئے شادی کی شہنائیاں بجاتے آئے۔ قریب پہنچے تو خان خاناں چودہ ہزار سوار سے دمامۂ دولت بجاتے گئے۔ اور برات لے کر لشکر میں داخل ہوئے +

جہانگیری عہد میں بھی اُس نے اور داراب اور اور بھائیوں نے ایسے ایسے کارنامے کئے کہ باپ کا دل اور دادا کی روح باغ باغ ہوتے تھے خصوصاً ایرج۔ اس کی شجاعت۔ ہمت۔ عالی دماغی دیکھ کر سب لکھتے ہیں۔ کہ یہ دوسرا خان خاناں کہاں سے آ گیا۔ جہانگیر اپنی توزک میں جا بجا اس کی تعریفیں لکھتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ خوش ہو ہو کر لکھتا ہے۔ اور آئندہ کی جانفشانی کی اُمیدیں رکھتا ہے +

سلاطین ایشیائی کے اصول و فروع کو جب قوانین حال کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ تو اختلاف بہت معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہ نکتہ دکھانے کے قابل ہے۔ کہ وہ لوگ اپنے نوکروں کی خوبی۔ خدمتگذاری اور خوشحالی دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے۔ جیسے کوئی زمیندار اپنے زرخیز کھیت کو ہرا بھرا دیکھ رہا ہے۔ یا باغبان اپنے لگائے ہوئے درخت کے سایہ میں بیٹھا ہے۔ یا کوئی مالک ہے کہ اپنے گھوڑے۔ گایوں۔ بکریوں کی شیرداری اور نسل داری پر خوش اور نازاں ہوتا ہے یہ نعمت اُنہیں خوش نصیب جاں نثاروں کو حاصل تھی۔ جس کی ہم لوگوں کو ہرگز اُمید نہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ وہاں وہ جاں نثار اپنے بادشاہ کے سامنے جانفشانی کر رہے تھے۔ اُسے اُن سے اور اُن کی نسل سے اپنی بلکہ اپنی اولاد کے لئے ہزاروں اُمیدیں تھیں۔ اور ہم؟ ہمارا بادشاہ بھی حاکم جو چند روز کے بعد تبدیل ہو جائیگا یا ولایت چلا جائیگا۔ پھر وہ کون۔ اور ہم کون +

۱۰۲۰ھ میں جہانگیر نے اُسے شاہنواز خاں خطاب دیا۔ ۱۰۲۱ھ میں تین ہزاری ذات تین ہزاری منصب کا خطاب دیا۔ ۱۰۲۲ھ میں عنبر پر ایسی فتح نمایاں حاصل کی کہ خنجر و شمشیر کی زبان سے صدائے آفرین نکلی۔ اور داراب نے جانبازی کے رتبہ کو حسد سے گذار دیا۔ ۱۰۲۶ھ میں بارہ ہزار

سوار جرار خوش اسپہ عنایت ہوئے۔ اور اس نے بالاگھاٹ پر گھوڑے اُٹھائے۔ اسی سنہ میں
ان کی بیٹی کی شاہزادہ شاہجہان سے شادی ہوئی ۔

۱۰۲۷ھ میں اسے پنجہزاری منصب کیساتھ دو ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ عنایت ہوئے ۔

۱۰۲۸ھ میں لکھتا ہے کہ جب وہ اتالیق رخصت ہونے لگا تو میں نے بتاکید تمام کہدیا تھا
کہ سُنا ہے شاہنواز خاں خراب، کا عاشق ہو گیا ہے۔ بہت پیتا ہے۔ اگر سچ ہے۔ تو بڑا افسوس
ہے۔ کہ اس عمر میں جان کھو بیٹھیگا۔ اسے اس کے حال پر نہ چھوڑنا۔ خود اچھی طرح حفاظت نہ
کرسکو تو صاف لکھو۔ ہم حضور میں بلا لینگے۔ اور اس کی اصلاح حال پر توجہ کرینگے۔ وہ جب برہانپور
میں پہنچا تو بیٹے کو بڑا ضعیف و نحیف پایا۔ علاج کیا وہ کئی دن کے بعد بستر ناتوانی پر گر پڑا ۔
طبیبوں نے بہت معالجے اور تدبیریں خرچ کیں۔ کچھ فائدہ نہ ہوا۔ عین جوانی اور دولت و اقبال کے
عالم میں تینتیس برس کی عمر میں ہزار دل حسرت و ارمان لے کر رحمت اور مغفرت الٰہی میں داخل ہوا
یہ ناخوشخبری سن کر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ حق یہ ہے کہ بڑا بہادر خانہ زاد تھا۔ اس سلطنت میں
عمدہ خدمتیں کرتا اور کارنامہائے عظیم اس سے یادگار رہتے۔ یہ راہ تو سب کو درپیش ہے اور
حکم قضا سے چارہ کسے ہے۔ مگر اس طرح جانا تو ناگوار ہی معلوم ہوتا ہے۔ امید ہے۔ کہ خدا
مغفرت کرے۔ راجہ رنگ دیو خدمتگاران نزدیک میں سے ہے۔ اسے میں نے خان خاناں
کے پاس پُرسے کے لئے بھیجا اور بہت نوازش اور دلجوئی کی اُس کا منصب اس کے بھائی
بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ داراب کو پنج ہزاری ذات و سوار کر دیا خلعت۔ ہاتھی۔ گھوڑا شمشیر
مرصع دے کر باپ کے پاس بھیج دیا۔ کہ شاہنواز خاں کی جگہ برار و احمد نگر کا صاحب صوبہ ہے
رحمن داد۔ دوسرے بھائی کو دو ہزار آٹھ سو سوار **منوچہر** شاہنواز کا بیٹا۔ دو ہزاری ہزار سوار۔
طغرل دوسرا بیٹا ہزاری ذات پانسو سوار حقیقت یہ ہے کہ جوانمرگ امیرزادہ کی جانفشانی
اور جاں نثاری نے جہانگیر کے دل پر داغ دیا تھا۔ اپنی توزک میں کئی جگہ اس کی دلاوری کا ذکر کیا ہے۔
اور ہر جگہ لکھتا ہے۔ کہ اگر عمر وفا کرتی تو اس سلطنت میں خوب خدمتیں بجالاتا ۔

داراب ۱۰۲۹ھ میں خان خاناں کی عرضی آئی کہ برگی وغیرہ سرداران دکن نے جنگلی قوموں کو ساتھ
لے کر ہجوم کیا ہے۔ تھانہ دار اُٹھ کر داراب کے پاس چلے آئے ہیں۔ بادشاہ نے دو لاکھ روپیہ بھیجا۔
داراب نے کئی دفعہ امرا کو بھیجا تھا۔ سپاہ کٹوا کر چلے آتے تھے۔ آخر خود گیا۔ مارتا مارتا اُن کے گھروں
تک جا پہنچا۔ اور سب کو قتل و غارت کر کے پریشان کر دیا۔ اس کی دردناک مصیبت باپ کے

حال میں بیان ہو چکی۔ بار بار صبر کے سینہ میں خنجر مارنا کیا ضرور ہے ؛

رحمٰن داد۔ جن پھولوں کو ہم جانتے ہیں معمولی رنگ و بُو رکھتے ہیں۔ یہ پھول رنگارنگ کے اوصاف و کمال سے آراستہ تھا کمبخت باپ اسی کو بہت پیار کرتا تھا۔ اس کی ماں قوم سودھیہ مقام امرکوٹ کی رہنے والی تھی۔ وہ فخر کیا کرتا تھا۔ کہ بادشاہ میرے ننہال میں پیدا ہوئے تھے جب وہ مرا ہے کسی کی جرأت نہ پڑتی تھی کہ خان خاناں سے جاکر کہہ سکے حضرت شاہ عیسٰی سندھی کوئی بزرگ تھے۔ انہیں اہل محل نے کہلا بھیجا کہ آپ جا کر کہئے۔ انہوں نے بھی اتنا کیا کہ لباس ماتمی پہن کر گئے۔ فقط فاتحہ پڑھی کوئی آیت۔ کوئی حدیث۔ چند کلمے صبر کے ثواب میں ادا کئے اور اُٹھ کر چلے آئے۔ جہانگیر تو زک میں لکھتا ہے۔ سنہ ۱۰۲۹ھ میں پھر خان خاناں کو داغ جگر نصیب ہوا کہ رحمٰن داد بیٹا بالا پور میں مر گیا۔ کئی دن بخار آیا تھا۔ نقاہت باقی تھی۔ ایک دن غنیم فوج کا دستہ باندھ کر نمودار ہوئے۔ بڑا بھائی داراب فوج لے کر سوار ہوا۔ اسے جو خبر ہوئی۔ تو شجاعت کے جوش میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور سوار ہو کر گھوڑا دوڑائے بھائی کے پاس پہنچا۔ غنیم کو بھگا دیا۔ فتح کی خوشی میں موج کی طرح لہراتا ہوا پھرا۔ گھر آکر اعتنیا طنہ کی۔ کپڑے اُتار ڈالے۔ ہوا لگ کر بدن اینٹھنے لگا۔ زبان بند ہو گئی۔ دو دن یہ حال رہا تیسرے دن مر گیا۔ خوب بہادر جوان تھا شمشیر زنی اور خدمت کا شوقین تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنا جوہر تلوار میں دکھائے۔ آگ تو سوکھے گیلے کو برابر جلاتی ہے مگر میرے دل کو سخت رنج ہوتا ہے۔ بُڈھے باپ پر کیا گذری ہوگی۔ کہ دل شکستہ ہے۔ ابھی شاہنواز خاں کا زخم بھرا ہی نہیں۔ کہ اور زخم نصیب ہوا۔ خدا ایسا ہی صبر اور حوصلہ دے ؛

امر اللہ ایک بیٹا لونڈی کے پیٹ سے تھا۔ یہ تعلیم اور تربیت سے بے بہرہ رہا۔ یہ بھی جوان ہی گیا اسی کے باب میں جہانگیر نے خوش ہو کر لکھا تھا۔ کہ گونڈانہ علاقہ خاندیس کان الماس پر جاکر قبضہ کیا ؛

حیدر قلی۔ باپ اسے پیار سے **حیدری** کہتا تھا کئی بھائیوں سے پیچھے آیا تھا اور سب سے پہلے گیا ؛

گل کچھ تو اس چمن کی ہوا کھا کے گر پڑے	وہ کیا کرے کہ غنچہ بھی کملا کے گر پڑے

سنہ [illegible]ھ میں اس کا حال لکھ چکا ہوں۔ وہاں سے دیکھ لو۔ خدا یہ داغ دشمن کو بھی نہ دکھائے ؛

دو بیٹیوں کے حال بھی سیاہ نقابیں ڈالے کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ ایک وہی جو **دانیال** سے منسوب تھی جس کا ذکر ہو لیا۔ افسوس جس **جانا بیگم** کے سر سے سہاگ کے عطر ٹپکتے تھے بیرحم زمانہ نے اُس میں بدنصیبی کے ہاتھوں سے رنڈاپے کی خاک ڈالی۔ اس عفیفہ نے ایسا غم کیا کہ کوئی

نہیں کرتا۔ دہکتی آگ سے تن کو داغ داغ کیا۔ بُڑھیا ہو کر مری۔ مگر جب تک جیتی رہی سفید گزی گاڑھا پہنتی رہی۔ رنگین رومالی تک سر پر نہ ڈالی۔ اس کی کارروائی اور سلیقے مردوں کے لئے دستور العمل ہیں +

جہانگیر دکن کے دورہ پر گیا۔ کُل دربار اور لشکر سمیت بادشاہ کی ضیافت کی۔ اتفاق یہ کہ ان دنوں خزاں نے درختوں کے کپڑے اُتار لئے تھے۔ پاک دامن بی بی نے انہیں بھی خلعت اور لباس سے آراستہ کیا۔ دُور دُور سے مصوّر اور نقاش جمع کئے۔ کاغذ اور کپڑے کے پھول پتّے کترواے۔ موم اور لکڑی کے پھل ترشوائے۔ اُن پر ایسا رنگ روغن کیا۔ کہ نقل و اصل میں اصلا فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔ جب بادشاہ آئے تو تمام درخت ہرے اور پھلوں سے دامن بھرے کھڑے تھے۔ حیران ہوئے۔ روش پر چلتے تھے۔ ایک پھل پر ہاتھ ڈالا۔ اُس وقت معلوم ہوا کہ کُل کارخانہ فقط سبز باغ ہے۔ بہت خوش ہوئے +

دوسری بیٹی کا نام معلوم نہیں۔ میر جمال الدین انجو فرہنگ جہانگیری کے مصنف امرائے اکبری میں داخل تھے۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ ایک اُن میں سے **میر امیر الدین** تھے۔ کہ سعادت مندی اُنہیں باپ کی خدمت سے ایک دم جُدا نہ ہونے دیتی تھی۔ دُختر مذکور اُن سے منسوب تھی۔ افسوس اس بیچاری کو بھی عین جوانی میں دُنیا سے ناکامی نصیب ہوئی +

میاں فہیم

یہ وہی میاں فہیم ہے۔ جس کے نام سے ہندوستان کے زن و مرد کی زبان پر کہاوت مشہور ہے۔ کہ کمائیں خان خاناں اور لٹائیں میاں فہیم۔ خان خاناں کی بعض عرضیاں اور خطوط مَیں نے دیکھے۔ وہ بھی میاں فہیم لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میاں ہی کہتے بھی ہونگے۔ میاں ہی مشہور ہو گئے۔ لوگ اُنہیں خانخاناں کا غلام سمجھتے ہیں حقیقت میں غلام نہ تھے۔ ایک راجپوت کے بیٹے تھے۔ خدا ترس بامروّت جوہر شناس خان خاناں نے اپنے بچّوں کی طرح پالا۔ اور بیٹوں کے ساتھ تعلیم و تربیت کیا تھا۔ انہیں ہمت و شجاعت سے دودھ پلوایا تھا۔ اور لیاقت آداب سے سبق پڑھوایا تھا آقا کی بدولت اس کا نام آسمان شہرت پر ایسا چمکا۔ جیسے چاند کے پہلو میں تارا۔ بیٹے کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ فہیم باوجود اوصاف مذکورہ کے نہایت پرہیزگار نیک نیت

نیکو کار تھا۔ مرنے کے دن تک تہجد اور اشراق کی نماز نہیں چھُٹی۔ فقیر دوست تھا۔ اور سپاہ کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتا تھا۔ خان خاناں کی سرکار کے کاروبار اُس کی ذات پر منحصر تھے۔ کھلاتا تھا۔ لٹاتا تھا۔ اپنا دل خوش اور آقا کا نام روشن کرتا تھا۔ وہ مہموں میں تیغ و تیر کی طرح اُس کے دم کے ساتھ ہوتا تھا۔ میں نے خان خاناں کی ایک عرضی اکبر کے نام دیکھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سہیل کی لڑائی میں وہ فوج ہراول میں حملہ آور تھا۔ مگر تند مزاج اور بلند نظر بھی حد سے زیادہ تھا۔ جب جاؤ اسکی ڈیوڑھی پر کوڑا ہی چٹختا سُنائی دیتا تھا۔

نقل ۔ ایک دن داراب اور بکرماجیت شاہجہانی ایک مسند پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کہ فہیم بھی آیا۔ دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ اور داراب سے کہا۔ کاش ایرج کے بدلے تو مر جاتا۔ یہ ڈکوت برہمن اور بیرم خاں کے پوتے کی برابر بیٹھے! (مآثر)

آخر میں خان خاناں کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ اُسے بیجاپور کی فوجداری پر بھیج دیا تھا چند روز بعد حساب کتاب مانگا۔ حافظ نصراللہ خان خاناں کے دیوان با اختیار نہایت معزز شخص تھے۔ حساب لینے لگے۔ کسی قسم کی تکرار ہوئی۔ سر دربار حافظ صاحب کے مُنہ پر طمانچہ مارا۔ اور اُٹھ کر چلا گیا۔ آفرین ہے خان خاناں کے حوصلہ کو آدھی رات کو آپ گئے اور منا کر لائے (مآثر)

جب مہابت خاں نے خانخاناں کو قید کرنا چاہا۔ تو فہیم کی طرف سے خیال تھا کہ من چلا جوان ہے۔ ایسا نہ ہو کہ زیادہ آگ بھڑک اُٹھے۔ چاہا کہ منصب اور انعام و اکرام کے لالچ دے کر پہلے اُسے بلالے۔ فہیم نے نہ مانا۔ اور تیز تیز پیغام سلام بھیجے۔ آخر مہابت خاں نے کہلا بھیجا۔ کہ سپاہگری کا گھمنڈ کب تک۔ پیش جائیگا۔ جان کھو بیٹھو گے۔ فہیم نے کہا کہ خان خاناں کا غلام ہے۔ ایسا سستا بھی نہ ہاتھ آئیگا۔

جب خان خاناں کو مہابت خاں نے بلایا۔ تو فہیم نے اُسی وقت کہہ دیا تھا۔ کہ دغا معلوم ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ذلّت و خواری تک نوبت پہنچے۔ مسلح و مستعد ہو کر حضور کی خدمت میں چلنا چاہئے۔ خان خاناں نے کچھ خیال نہ کیا۔ مہابت خاں نے اُنہیں نظر بند کرتے ہی فہیم کے ڈیرے پر آدمی بھیجے۔ اُس نے اپنے فرزند فیروز خاں سے کہا۔ کہ وقت آن لگا ہے۔ تھوڑی دیر انہیں روکو۔ کہ وضو تازہ کر کے سلامتی ایمان کا دوگانہ ادا کر لوں۔ چنانچہ نماز سے فارغ ہو کر آپ، بیٹا چالیس جاں نثاروں کے ساتھ تلوار پکڑ کر نکلے۔ اور جان کو آبرو پر قربان کر دیا۔ خیال کرو خان خاناں کو اُس کے مرنے کا کیسا رنج ہوا ہوگا۔ اُس کی لاش بھی دلّی میں بھجوائی۔ کہ وہاں کی خاک کو آرام گاہ سمجھتا تھا۔

ہمایوں کے مقبرہ کے پاس مقبرہ بنوایا۔ اب تک نیلا گنبد اُس کے غم میں رنگ سوگواری دکھا رہا ہے (مآثر)

باغ فتح۔ احمد آباد کے پاس جہاں مظفر پر فتح پائی تھی۔ وہاں خان خاناں نے ایک باغ آباد کیا۔ اور اُس کا نام **باغ فتح** رکھا۔ دیکھو ہندوستان میں آکر اتنا رنگ بدلا۔ بیرم خاں کے وقت تک جہاں فتح ہوئی کلہ منار بنتے رہے۔ کہ ایران و تُوران کی رسم تھی۔ ہندوستان کی آب و ہوا نے باغ سرسبز کیا +

دکن کے دَورہ میں جہانگیر کا گذر گجرات میں ہوا۔ باغ مذکور میں بھی گئے۔ لکھتے ہیں جو باغ خان خاناں نے میدان کارزار پر بنایا۔ دریائے سابرمتی کے کنارہ پر ہے۔ عمارت عالی اور بالادری موزوں و مناسب چبوترہ کے ساتھ دریا کے رُخ پر تعمیر کی ہے۔ تمام باغ کے گرد پتھر اور چُونے کی مضبوط دیوار کھینچی ہے۔ ۱۲۰ جریب کا رقبہ ہے۔ خوب سیر گاہ ہے۔ دولاکھ روپے خرچ ہُوئے ہونگے۔ مجھے بہت پسند آیا۔ ایسا باغ تمام گجرات میں نہ ہوگا۔ دکن کے لوگ اسے **فتح باڑی** کہتے ہیں +

امارت اور دریا دلی کے کارنامے

جُود و کرم کے باب میں بے اختیار تھا۔ ہمت اور حوصلہ کے جوش فوارہ کی طرح اُچھلے پڑتے تھے اور عطا و انعام کے لئے بہانہ ڈھونڈتے تھے۔ اس کی امیرانہ طبیعت بلکہ شاہانہ مزاج کی تعریفوں میں شعرا اور مصنّفوں کے لب خشک ہیں۔ علما۔ صلحا۔ فقرا۔ مشائخ وغیرہ وغیرہ سب کو ظاہر اور خفیہ ہزاروں روپے اشرفیاں اور دولت و مال دیتا تھا۔ اور شعرا اور اہل کمال کا تو مائی باپ تھا۔ جو آتا ان کی سرکار میں آکر اس طرح اُترتا۔ جیسے اپنے گھر میں آگیا۔ اور اتنا کچھ پاتا تھا کہ بادشاہ کے دربار میں جانے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ اس کے وقت میں اہل کمال کا وہ مجمع تھا۔ جو سلطان حسین مرزا اور امیر علی شیر کے عہد میں گذرا ہے۔ مگر مَیں کہتا ہوں کہ ان کے دربار میں یہ لہر بہر دریائے سخاوت کہاں۔ کئی شاعروں کو اشرفیوں میں تلوا دیا۔ اس کی سخاوتوں کے کارنامے اکثر لطیفوں اور حکایتوں کے رنگ میں بُو میں محفلوں اور جلسوں پر پھول برستے ہیں۔ مَیں بھی اس کے گلدستوں سے دربار اکبری کو سجاؤنگا۔ شعرا نے جتنے قصیدے اس کی تعریف میں کہے ہیں۔ اکبر ہی کی تعریف میں کہے ہوں تو کہے ہوں ساتھ اس نے بھی اُنہیں لاکھوں انعام دیئے۔

گنوان پنڈت۔ کوئی کبیشور۔ بلکہ بھاٹ ہزاروں اشلوک۔ دوہڑے۔ کبت کہکر لاتے تھے۔ اور ہزاروں لے جاتے تھے۔ انعام میں بھی وہ وہ نزاکت و لطافت کے انداز دکھا گیا۔ کہ آیندہ دینے والوں کے ہاتھ کاٹ ڈالے ہیں۔ ملا عبدالباقی نے کل قصائد صحیح البیاض جمع کر کے ایک ضخیم کتاب بنا دی ہے۔ اس میں ہر شاعر کا حال اُس کے قصیدہ کے ساتھ لکھا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ کس تقریب میں یہ قصیدہ کہا گیا تھا۔ اور انعام کیا پایا تھا۔ اس سے اکثر جزئیات تاریخی حالات کے معلوم ہوتے ہیں۔ **ماثر رحیمی** اُس کا نام ہے ✦

لطیفہ۔ خان خاناں کا دسترخوان نہایت وسیع ہوتا تھا۔ کھانے رنگا رنگ کے تکلفات سے رنگین اور اُس کے فیض سخاوت کی طرح اہل عالم کے لئے عام تھے۔ جب دسترخوان پر بیٹھتا تھا۔ مکانوں میں درجہ بدرجہ صدہا بندگان خدا بیٹھتے تھے۔ اور لذت سے کامیاب ہوتے تھے۔ اکثر کھانوں کی رکابیوں میں کسی میں روپے کسی میں اشرفیاں رکھ دیتے تھے۔ جو جس کے نوالہ میں آئے۔ اس کی قسمت۔ آج تک وہ مثل زبانوں پر ہے۔ خان خاناں جس کے کھانے میں تاتا ✦

لطیفہ۔ ایک دفعہ پیش خدمتوں میں کوئی نیا شخص ملازم ہوا تھا۔ دسترخوان آراستہ ہوا۔ نعمتہائے گوناگوں چُنی گئیں۔ جب خان خاناں آکر بیٹھا۔ سینکڑوں امرا اور صاحب کمال موجود تھے۔ کھانے میں مصروف ہوئے۔ اس وقت وہی پیش خدمت خان خاناں کے سر پر رومال ہلا رہا تھا۔ یکایک رونے لگا۔ سب حیران ہو گئے۔ خان خاناں نے حال پوچھا۔ عرض کی کہ میرے بزرگ صاحب امارت اور صاحب دستگاہ تھے۔ میرے باپ کو بھی مہمان نوازی کا بہت شوق تھا۔ مجھ پر زمانہ نے یہ وقت ڈالا۔ اس وقت آپ کا دسترخوان دیکھ کر وہ عالم یاد آگیا۔ خان خاناں نے بھی افسوس کیا۔ ایک مرغ بریاں سامنے رکھا تھا۔ اس پر نظر جا پڑی۔ پوچھا۔ بتاؤ۔ مرغ میں کیا چیز مزے کی ہوتی ہے۔ اُس نے کہا پوست۔ خان خاناں نے کہا۔ سچ کہتا ہے۔ لطف و لذت سے باخبر ہے۔ مرغ کی کھال اُتار کر پکاؤ۔ تو کیسا ہی تکلف سے پکاؤ۔ وہ لذت اور نمکینی نہیں رہتی بہت خوش ہوا۔ دسترخوان پر بٹھا لیا۔ دل جوئی کی۔ اور مصاحبوں میں داخل کر دیا ✦

دوسرے دن دسترخوان پر بیٹھے۔ تو ایک اور خدمتگار رونے لگا۔ خان خاناں نے اس سے بھی سبب پوچھا۔ اس نے جو سبق کل پڑھا تھا۔ وہی سُنا دیا۔ خان خاناں ہنسا۔ اور ایک ۔ جانور کا نام لیکر پوچھا۔ کہ بتاؤ اس میں کیا چیز مزے کی ہوتی ہے اُس نے کہا پوست۔ سب لعنت ملامت کرنے لگے۔ خان خاناں بہت ہنسا۔ اسے کچھ انعام دے کر کسی اور کارخانے میں بھیج دیا۔ کہ ایسا شخص

حضور یہ خدمت کے قابل نہیں +

ایک دن ملازموں کی چٹھیاں دستخط کر رہے تھے کسی پیادہ کی چٹھی پر ہزار دام کی جگہ ہزار روپے لکھ دیئے۔ دیوان نے عرض کی۔ کہا اب جو قلم سے نکل گیا۔ اس کی قسمت +

ایک دن نظیری نیشاپوری نے کہا۔ کہ نواب میں نے لاکھ روپیہ کا ڈھیر کبھی نہیں دیکھا۔ کہ کتنا ہوتا ہے۔ انہوں نے خزانچی کو حکم دیا۔ اُس نے سامنے انبار لگا دیا۔ نظیری نے کہا شکر خدا آپ کی بدولت آج لاکھ روپے دیکھے۔ خان خاناں نے کہا۔ اللہ جیسے کریم کا اتنی بات پر کیا شکر کرنا روپے اُسی کو دے دیئے۔ اور کہا خیر اب شکر الٰہی کرو تو ایک بات بھی ہے +

جہانگیر بادشاہ ایک دن تیر اندازی کر رہا تھا۔ کسی بھاٹ کی یاوہ گوئی پر خفا ہو کر حکم دیا۔ کہ اسے ہاتھی کے پاؤں تلے پامال کریں۔ خان خاناں پاس کھڑا تھا۔ فرقہ مذکور کی حاضر جوابی اس کی زبان درازی سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے عرض کی حضور ذرہ ناچیز کے لئے ہاتھی کیا کریگا ایک چھپے چڑے کا پانو بھی بہت ہے۔ ہاتھی کا پاؤں خانخاناں کے لئے چاہیئے۔ کہ بڑا آدمی ہے۔ جہانگیر نے ان کی طرف دیکھا۔ کہ اس لفظ نے دل پر کیا اثر کیا۔ پوچھا کیا کہتے ہو۔ اُنہوں نے کہا۔ کچھ نہیں داروغہ سے پوچھا۔ کہ تو بتادے۔ خان خاناں خود بولے۔ کہ حضور کے تصدق سے خدا نے مجھ ناچیز کو ایسا کیا۔ کہ یہ بڑا آدمی سمجھتا ہے۔ میں نے اُس وقت شکر خدا کیا۔ اور کہا کہ جب اِس کی خطا معاف ہو۔ تو پانچ ہزار روپے دے دینا۔ حضور کی جان و مال کو دعا دیگا +

اہل ہند کا خیال ہے۔ کہ سورج ہر شام کو سمیر کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ اور وہ ایک سونے کا پہاڑ ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی فرض کیا ہے۔ کہ چکوا چکوی دن کو ساتھ رہتے ہیں۔ رات کو دریا کے وار پار الگ الگ جا بیٹھتے ہیں۔ اور رات بھر جاگ کر کاٹتے ہیں۔ ایک بھاٹ نے چکوا چکوی کی زبانی کبت کہا جس کا خلاصہ یہ کہ خدا کرے خان خاناں کا سمند فتوحات سمیر پہاڑ تک جا پہنچے۔ وہ بڑا سخی ہے۔ سب بخش دیگا۔ پھر ہمیشہ دن رہیگا۔ اور ہم تم موج کرینگے۔ جب یہ کبت پڑھا گیا تمام اہل دربار نے تعریف کی۔ کہ نیا مضمون ہے۔ خانخاناں نے پوچھا۔ کہ پنڈت جی تمہاری عمر کیا ہے عرض کی ۳۵ برس۔ کل سو برس کی عمر لگائی۔ اور ۱۰ روپیہ روز کے حساب سے ۶۵ برس کا روپیہ جو کچھ ہوا خزانہ سے دلوا دیا +

ایک بھوکا برہمن خان خاناں کے دروازے پر آیا۔ دربان نے روکا۔ اُس نے کہا کہدو آپ کا ہمزلف ملنے آیا ہے۔ اور اس کی بی بی ساتھ ہے۔ خدمتگار نے عرض کی۔ اُسے بُلایا۔ پاس بٹھایا

اور رشتہ کا سلسلہ کھولا۔ اُس نے کہا۔ کہ پیتا اور سپنتا دو بہنیں ہیں۔ پہلی میرے گھر گئی۔ دوسری آپ کے گھر آئی ہے۔ آپ اور مَیں ہم زلف نہیں تو اور کیا ہیں؟ نواب بہت خوش ہوُا۔ خلعت دیا۔ خاصہ کے گھوڑے پر طلائی ساز سجوا کر سوار کیا۔ اور بہت کچھ نقد و جنس دے کر رخصت کیا +

ایک دن دربار میں بیٹھا تھا۔ اہالی و موالی۔ اہل غرض۔ اہل مطلب حاضر تھے۔ ایک غریب شکستہ حال آکر بیٹھا۔ اور جُوں جُوں جگہ پاتا گیا۔ پاس آتا گیا۔ قریب آیا تو ایک توپ کا گولہ بغل سے نکال کر لڑکا یا کہ خانخاناں کے زانو سے آکر لگا۔ نوکر اس کی طرف بڑھے۔ اُس نے روکا اور حکم دیا کہ گولے کے برابر سونا تول دو۔ مصاحبوں نے پوچھا کہ یہ قول شاعر کو کسوٹی پر لگاتا ہے +

آہن کہ بپارس آشنا شد فی الحال بہ صورت طلا شد

ایک دفعہ دربار شاہی سے برہان پور کو رخصت ہوئے۔ پہلی ہی منزل پر ڈیرے تھے قریب شام سراپردہ کے سامنے شامیانہ لگا ہوُا۔ فرش بچھا ہوُا۔ آپ نکل کر کُرسی پر بیٹھے مصاحبوں ملازموں سے دربار آراستہ تھا ایک آزاد سامنے سے گزرا۔ اور پکار کر کہتا چلا +

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہِ ساخت

منعم خاں ان کا خطاب ہو چکا تھا۔ اور پہلے منعم خاں کفایت شعار تھے۔ اُنہوں نے خزانچی کو حکم دیا۔ کہ لاکھ روپے دے دو۔ فقیر دعائیں دیتا چلا گیا۔ دوسری منزل میں اُسی وقت پھر باہر نکل کر بیٹھے۔ فقیر پھر سامنے سے نکلا۔ اور وہی شعر پڑھا۔ اُنہوں نے پھر کہہ دیا۔ کہ لاکھ روپیہ دے دو۔ غرض وہ سات دن برابر اس طرح آتا رہا۔ اور لیتا رہا۔ پھر آپ ہی دل میں سمجھا۔ کہ یہ انعام آج تک کسی نے نہیں پایا۔ امیر ہے۔ خدا جانے کبھی طبیعت حاضر نہ ہو خفا ہو کر کہے کہ سب چھین لو۔ زیادہ طمع اچھی نہیں۔ اسی کو غنیمت سمجھنا چاہئے۔ آٹھویں دن خان خاناں پھر اسی طرح نکل کر بیٹھے معمول سے زیادہ وقت گذرا۔ دربار برخاست نہ کیا۔ شام ہوئی تو کہنے لگے۔ کہ آج وہ ہمارا فقیر نہ آیا۔ خیر برہان پور آگرہ سے ۲۷ منزل ہے۔ ہم نے تو پہلے دن ۲۷ لاکھ روپیہ خزانہ سے منہا کر دیا تھا۔ تنگ حوصلہ تھا۔ خدا جانے دل میں کیا سمجھا +

خان خاناں نہایت حسین تھا۔ اس کی خوبیاں اور محبوبیاں سن کر ایک عورت کو اشتیاق پیدا ہوُا وہ بھی حسین تھی۔ اس نے اپنی تصویر کھچوائی۔ اور ایک بڑھیا کے ہاتھ بھیجی۔ وہ خلوت میں آکر خان خاناں سے ملی۔ اور مطلب کو اس پیرایہ میں ادا کیا۔ کہ ایک بیگم کی یہ تصویر ہے اُنہوں نے پیغام دیا ہے کہ آپ کی تعریفیں سُن سُن کر میراجی بہت خوش ہوتا ہے۔ ارمان یہ ہے کہ تمہیں جیسا ایک فرزند میرے ہاں ہو۔

تم بادشاہ کی آنکھیں ہو۔ زبان ہو۔ دست و بازو ہو۔ نہیں یہ بات کچھ مشکل نہیں۔ خان خاناں نے سوچ کر کہا کہ مائی۔ تم میری طرف سے اُنہیں کہنا۔ کہ یہ بات تو کچھ مشکل نہیں۔ مگر یہ مشکل ہے۔ کہ خدا جانے اولاد ہو یا نہ ہو۔ اور ہو تو کیا خبر ہے۔ بیٹا ہی ہو۔ اور وہ زندہ بھی رہے۔ پھر خدا جانے ایسی صورت ہو یا نہ ہو۔ یہ بھی ہو تو اقبال پر کس کا زور ہے۔ خدا چاہے دے خدا چاہے نہ دے اگر انہیں مجھ جیسے بیٹے کی آرزو ہے۔ تو کہنا تم ماں میں بیٹا۔ خدا کا شکر کرو۔ جس نے بلا پلایا بیٹا تمہیں دیا۔ ماں کو اس قدر روپیہ مہینہ دیتا ہوں۔ وہی تمہیں بھیجا کرونگا۔

ایک شخص خان خاناں کے پاس آیا۔ اور یہ قطعہ لکھ کر دیا:۔

اے خانِ جہاں خاں خاناں	دارم صنمے کہ رشک چین است
گر جاں طلبد مضایقہ نیست	زر مے طلبد سخن درین است

پوچھا وہ کیا مانگتے ہیں۔ کہا لاکھ روپیہ۔ حکم دیا سوا لاکھ دے دو۔

ایک دن خان خاناں کی سواری چلی جاتی تھی۔ ایک شکستہ حال غریب نے ایک شیشی میں بوند پانی ڈال کر دکھایا۔ اور اسے جھکایا۔ جب پانی گرنے کو ہؤا۔ تو شیشی کو سیدھا کر دیا۔ اس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اشراف خاندانی ہے۔ خان خاناں اسے ساتھ لے آئے۔ اور انعام و اکرام دیکر رخصت کیا۔ لوگوں نے پوچھا۔ کہا کہ تم نہیں سمجھے۔ اس کا مطلب یہ تھا۔ کہ ایک بوند آبرو رہی ہے اور اب یہ بھی گرا چاہتی ہے۔

ایک دن سواری میں کسی نے انہیں ایک ڈھیلا مارا۔ سپاہی دوڑ کر پکڑ لائے۔ انہوں نے کہا۔ ہزار روپیہ دیدو۔ سب حیران ہو گئے۔ اور عرض کی کہ جرم لائق قابل دشنام بھی نہ ہو۔ اسے انعام دینا آپ کا ہی کام ہے۔ انہوں نے کہا لوگ پھلے ہوئے درخت پر پتھر مارتے ہیں۔ جو میرا پھل ہے وہ مجھے دینا واجب ہے۔

ایک دن سواری سے اُترتے تھے۔ ایک بڑھیا برابر آئی۔ ایک توا اس کی بغل میں تھا۔ نکال کر ان کے بدن سے ملنے لگی۔ نوکر ہاں ہاں کر کے دوڑے۔ انہوں نے سب کو روکا۔ اور حکم دیا کہ اسی کے برابر اسے سونا تول دو۔ مصاحبوں نے سبب پوچھا۔ کہا یہ دیکھتی تھی کہ بزرگ جو کہا کرتے تھے۔ کہ بادشاہ اور ان کے امیر پارس ہوتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے یا نہیں۔ اور اب بھی ویسے لوگ ہیں یا کوئی نہیں رہا۔

خان خاناں دربار چلے۔ ایک سوار سپاہگری کے ہتھیار لگائے سامنے آیا۔ اور سلام کیا۔ انہوں نے حال پوچھا۔ اس نے کہا۔ کہ نوکری چاہتا ہوں۔ بانکپن یہ کہ پگڑی میں دو میخیں بھی باندھی ہیں۔ پوچھا ان میخوں کا کیا معاملہ ہے۔ اس نے عرض کی کہ ایک میخ تو اسکے واسطے کہ نوکر رکھے اور تنخواہ نہ دے

دوسری اس نوکر کے واسطے کہ تنخواہ لے اور کام چوری کرے۔ خان خاناں نے تنخواہ مقرر کی۔ اور سلتمہ لائے۔ وہ بھی دربار میں آیا۔ اس کے بانکپن کے انداز کو سب دیکھنے لگے۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ انسان کی بہت سے بہت عمر ہو تو کتنی ہو۔ اُس نے کہا کہ عمر طبعی ۱۲۰ برس کی ہوتی ہے۔ اُنہوں نے خزانچی کو حکم دیا۔ کہ سپاہی کی عمر بھر کی تنخواہ بیباق کردو۔ اور اس سے کہا لیجئے۔ حضرت ایک میخ کا بوجھ تو سر سے اُتار دیجئے۔ دُوسری کا آپ کو اختیار ہے۔

دربار جاتے تھے مصوّر نے تصویر لاکر دی۔ کہ ایک صاحب جمال عورت ہے۔ نہا کر اُٹھی ہے۔ کُرسی پر بیٹھا ہے۔ ایک طرف کو جُھکی ہوئی سر کے بال پھٹکار رہی ہے۔ لونڈی پاؤں دُھلاتی ہے۔ اور جھانواں کر رہی ہے۔ خان خاناں اسے دیکھتے ہوئے دربار چلے گئے۔ آکر حکم دیا کہ اس مصوّر کو بلاؤ۔ اور پانچ ہزار روپیہ دو۔ مصوّر نے عرض کی۔ انعام تو فدوی جبھی لے گا کہ جو بات حضور قابل انعام خیال فرمائیں وہ ارشاد فرمائیں۔ سب مصاحب متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔ کہ اس کے لبوں کی مسکراہٹ اور چہرہ کا انداز دیکھا۔ سب نے کہا۔ کہ دیکھا نہایت خوب اور بہت زیبا۔ خان خاناں نے کہا۔ پاؤں کی طرف تو دیکھو۔ وہ گدگدیاں ہو رہی ہیں۔ اس نزاکت و لطافت پر ۵ ہزار روپیہ کیا حقیقت ہے۔ ۵ لاکھ بھی تھوڑا ہے۔ مصوّر نے کہا۔ کہ حضور بس انعام پالیا۔ اور میں آپ کا غلام ہو لیا۔ تمام امیروں کے پاس لیکر پھرا۔ ایک نے یہ نکتہ نہیں پایا۔ ہم لوگ قدر شناس کے غلام ہیں۔

خان خاناں جب مظفر پر ظفریاب ہو کر آئے۔ تو بادشاہ کے لئے بہت سے عجائب و نفائس خاندیس و دکن اور ممالک فرنگ سے لائے۔ ان میں عجیب تحفہ یہ تھا۔ کہ رائے سنگھ جھالا علاقہ گجرات کے راجہ کو حاضر کیا۔ معلوم ہوا۔ کہ یہ نوجوانی کے عالم میں برات لیکر بیاہنے گیا تھا جب وہاں سے خوشی کے نقارے بجاتا راہا۔ تو جیتا راجہ کچھ۔ کہ چچیرے بھائی کے ملک میں سے گزرا۔ محلوں کے پاس برات پہنچی۔ تو پیام آیا۔ کہ نقارے نہ بجاؤ یا دُور دُور نکل جاؤ۔ اور مرد ہو تو تلوار نکالو۔ اور لڑو۔ اگرچہ سامان ساتھ نہ تھا۔ مگر رائے سنگھ دولھا کی رائے لڑائی پر جمی۔ اور جہاں تھا وہیں تلوار کھینچکر کھڑا ہو گیا۔ جیتا جھٹ فوج لیکر آئے۔ بڑا کشت و خون ہوا۔ اور بہ جلد میدان جنگ سے نیستی خانہ میں داخل ہوئے۔ چھوٹا بھائی راؤ صاحب آیا۔ وہ بھی بڑے بھائی کے پاس پہنچا۔ راجپوتوں میں رسم ہے کہ جب جوش میں آتے ہیں۔ تو تلواریں سونت کر کود پڑتے ہیں۔ کہ شاید گھوڑا بے قابو ہو کر لے بھاگے۔ یا گھوڑا ران تلے دیکھ کر اپنی ہی نیت بگڑے۔ اور جان لے کر

نکل جائے۔ اس لڑائی میں طرفین کے بہادر اسی طرح جانوں سے ہاتھ اُٹھاکر میدان میں اُتر پڑے تھے۔ غرض دولہا اور اس کے رفیق فتحیاب ہوکر موچھوں پر تاؤ دیتے۔ اپنے گھوڑوں پر آئے۔ سپاہ مغلوب کے پیادے جو گھوڑے لئے کھڑے تھے۔ انہیں جوش آیا۔ گھوڑوں کو چھوڑ کر تلواریں لیں۔ اور پھر میدان کارزار گرم ہؤا۔ ایسا بھاری رن پڑا۔ کہ دُولہا زخمی ہوکر گر پڑا۔ ایک کو ایک کی خبر نہ تھی۔ کسی نے کسی کو نہ پہچانا۔ کہ کس کی لاش کہاں رہی۔ دُولہا بہت زخمی ہؤا تھا۔ سفس ہی سانس باقی تھا۔ رات کو کوئی جوگی اُدھر آیا۔ اور اُٹھاکر اپنی مڈھ میں لے گیا۔ مرہم پٹی کی۔ خدا نے بچالیا۔ احسان کا بندہ اس کا چیلا ہوگیا۔ انیس برس اس کی خدمت کرتا اور جنگلوں میں پھرتا رہا۔ گھر اور گھرانے میں سب کو یہی خیال کہ میدان میں کام آیا۔ کئی رانیاں ستی ہوگئیں۔ دُلہن رانی دل کے ست اور اس کے خیال میں خدا کو یاد کرتی تھی۔ کیونکہ مرنے کا بھی یقین نہ تھا۔ خان خاناں امیروں سے سوا فقیروں اور غریبوں کے یار تھے۔ ان کی سرکار میں فقیر امیر جوگی سب برابر تھے۔ جوگی جی کے بھی درشن ہوئے۔ اور یہ حال معلوم ہؤا۔ گورو اور چیلے کو دربار میں لے آئے۔ اکبر بھی ایسے معاملات کے مشتاق ہی رہتے تھے۔ اس عجیب واردات کو سُن کر بہت خوش ہوئے اور اتبت چیلا پھر رائے سنگھ راجہ بن کر اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے ملک کو رخصت ہوئے۔ جب وہاں گئے تو سب اقربا ملازم جمع ہوئے۔ اور دیکھ کر پہچانا۔ بڑی خوشیاں ہوئیں۔ سب سے سوا رانی کہ شرم بے زبانی سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ اور اپنے مالک کی یاد میں بیٹھی تھی۔ دیکھو رسم کا ست تو مار چکا تھا۔ محبت کا ست کام کر گیا۔ راجہ نے راج سنبھالا۔ اور خیر خواہان دولت نے شکر الٰہی کے ساتھ خان خاناں کے شکرانے ادا کئے +

موزونیٔ طبع یہ عالی دماغ امیر ایک صندوقچہ کمالات انسانی کا تھا۔ ایسی ہمہ رنگ اور ہمہ گیر روحیں عالم بالا سے بہت کم عالم خاک میں آتی ہیں۔ جو کہ ہر وصف اور ہر خوبی کے لئے جوہر قابل ہوں۔ اگرچہ اس کا دماغ شاعری پر مرنے مٹنے والا نہ تھا۔ مگر پھول اپنا رنگ نہ دکھائے یا خوشبو نہ پھیلائے۔ یہ بھی تو نہیں ہو سکتا۔ اُس کے دل کا کنول کبھی اپنے ذوق و شوق سے۔ کبھی بادشاہ یا دوستوں کی فرمایش کی تقریب سے ہوائے نظم سے کھیلتا تھا۔ اسے شاعرانہ دماغ سوزی کی فرصت نہ ہوگی۔ یا ایسا زیادہ شوق نہ ہوگا کہ اپنی نظم سے بیاض یا دیوان مرتب کرتا۔ ایک غزل اور چند متفرق اشعار اور رباعیاں نظر سے گزریں۔ چنانچہ ہفت اقلیم اور تذکرہ سرخوش اور تزک جہانگیری وغیرہ سے لکھتا ہوں دیکھ لو یہ بھی لطافت و نزاکت سے پھولوں کا طرہ ہو رہا ہے :-

غزل

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند است ‏ جز این قدر کہ دلم سخت آرزومند است

ادائے حق محبت عنایت است زدوست ‏ وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خورسند است

نہ زلف دانم و نے دام این قدر دانم ‏ ز پائے تا بہ سرم ہر چہ ہست در بند است

بدوستے کہ بجز دوستی نمے دانم ‏ خدائے داند و آں کو مرا خداوند است

ازیں خوشم بہ سخنہائے عالیہائے رحیم ‏ کہ اندکے بادا ہائے دوست مانند است

شعر

نیم فضول کہ جویم وصال ہمچو توئی ‏ بس است ہمچو منے را خیال ہمچو توئی

شعر

پارہ پارہ گشت دل اما نمے دارد بہم ‏ زانکہ پیکان تو اش صد بار برہم دوختہ است

شعر

تمام مہر و محبت شدم نمے دانم ‏ کہ دل کدام - محبت کدام و یار کدام

رباعی

خواہم ز درت رسم مروت نگذاشت ‏ واں گرمی اختلاط و صحبت نگذاشت

اینہا ہمہ عذر است چہ پنہاں از تو ‏ قربان سرت رسم محبت نگذاشت

ایضاً

در قصۂ عشق مرد ناگویا بہ ‏ اندیشۂ عشق و خون دل یک جا بہ

تا قدر وصال دوست ظاہر گردد ‏ ہمچوں شب قدر وصل ناپیدا بہ

ایضاً

در راہ وفا نیازمندی چہ خوش است ‏ دل سوختگی و دردمندی چہ خوش است

زلفِ تو کہ دل شکارِ لاغر اوست ‏ از دل صیدے از و کمندے چہ خوش است

ایضاً

اے آتش سینہ شعلہ باری بس کن ‏ اے اشک نیاز دُر شماری بس کن

چوں دادہ و نادادہ نہ امروز است ‏ داری بس کن وگرنہ داری بس کن

ایضاً

جاسوس دلم بسوئے تو بوئے تو بس — دربان مجاز بان ہمیں خوئے تو بس
اُستاد پریشانئ من موئے تو بس — مشاطۂ روئے من ہمیں روئے تو بس

ایضاً

سرمایۂ عمر جاودانی غم تو — بہتر ز ہزار شادمانی غم تو
گفتی کہ چنیں والہ وشیدات کہ کرد — دانی غمِ تو وگرنہ دانی غمِ تو

ایضاً

آنم کہ حیات خود بہ سائل دہمے — گر سر طلبی بہ تیغ قاتل دہمے
از دست دل آنچناں بہ تنگم امروز — گر خاک طلب کند زمن دل دہمے

ایضاً

زنہار رحیم از پئے دل نہ روی — بیہودہ بہ آرزوئے دل در گروی
گفتم سخنے او باز ہم مے گویم — خواہش کاری ہمیشہ خواہش دردی

مسیح الدین حکیم ابوالفتح گیلانی

ماثرالامرا میں لکھا ہے۔ کہ مولانا عبدالرزاق گیلان میں نامور فاضل اور فضائل صورت و معنی سے آراستہ تھے۔ خصوصاً حکمت نظری اور الہیات میں بلند نظر رکھتے تھے۔ مدت تک وہاں صدرالصدور رہے۔ ۹۷۴ھ میں شاہ طہماسپ بادشاہ ایران نے گیلان فتح کیا۔ اور خان احمد فرمانروا وہاں کا اپنی نادانی سے قید ہوا۔ صدرالصدور صدق دل سے اپنے آقا کے ہواخواہ تھے۔ راستی وحق گزاری کے جرم پر قید ہوئے۔ اور شکنجۂ تکلیف میں جان دی۔ علم ان کا درس و تدریس میں اور کمال تصنیف وتالیف میں شہرۂ آفاق تھا۔ جس طرح اولاد روحانی عالم میں نامور ہوئی۔ ویسے ہی بیٹے بھی ہوئے۔ کہ صورت ومعنی میں باپ کے خلف الرشید تھے۔ حکیم ابوالفتح حکیم ہمام۔ حکیم نورالدین کہ شعر بھی کہتے تھے۔ اور قراری تخلص کرتے تھے۔ یہ تینوں بھائی جودت طبع اور تیزی فہم اور علوم رسمی اور کمالات انسانی میں صاحب کمال تھے۔ چوتھے حکیم لطف اللہ کہ کچھ عرصے کے بعد ہندوستان آئے۔ اور صدی منصب دار ہوگئے۔ مگر چند سال کے بعد

مر گئے۔ خاص و عام میں **گیلانی** مشہور ہیں۔ حقیقت میں **لاہجان** علاقہ گیلان کے رہنے والے تھے۔ کتب تاریخ میں ان کی ذات کی توضیح نہیں۔ البتہ **عرفی** نے جو حکیم ابو الفتح اور حکیم ہمام کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں۔ ان میں حکیم ابو الفتح کو میر ابو الفتح لکھا ہے۔

خواجہ حسین ثنائی جب ایران سے ہندوستان آئے۔ اور شعرائے پایہ تخت میں نامور ہوئے تو بیان کرتے تھے۔ کہ میں مشہد میں سلطان ابراہیم مرزا سے ملا کرتا تھا۔ ان تینوں نوجوانوں نے فضل و کمال کا نقارہ بجا رکھا تھا۔ اور مرزا سے بھی ملا کر۔تے تھے۔ ایک دن میں نے مرزا سے پوچھا کہ ملا عبد الرزاق کے بیٹوں کو آپ نے کیسا پایا۔ فرمایا حکیم ابو الفتح شایان وزارت ہے۔ حکیم ہمام مصاحب خوب ہے۔ حکیم نور الدین جوان قابل ہے۔ مگر اس کے قیافہ سے خبط کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ **آزاد**۔ دربار اکبری جوہر انسان کے لئے عجیب کسوٹی تھا۔ جب یہاں آئے تو ہر ایک ان میں سے ویسا ہی نکلا۔ جیسا مرزا نے پرکھا تھا۔

دنیا کے تمام کام نام پر چلتے ہیں۔ اد [illegible] ہمرہ نام ملک ملک میں پہنچ چکا تھا۔ ادھر ان کا اور ان کے باپ کا نام یہاں پہنچا۔ ۹۸۳ھ [illegible]ں تینوں بھائی یہاں آئے۔ اور آتے ہی دربار میں داخل ہو گئے۔ حکیم ابو الفتح کی طبیعت میں شائستگی اور لیاقت کا اور ہی عالم تھا۔ زمانے کے مزاج سے واقف تھے۔ اور اہل زمانہ کی نبض خوب پہچانتے تھے۔ ملا صاحب ان سے ایک برس پہلے آئے ہوئے تھے۔ دیکھنا کیا خفا ہو کر کہتے ہیں۔ بڑے بھائی نے مصاحبت کے زور سے مزاج بادشاہ میں عجیب تصرف کیا۔ اور صریح خوشامدوں سے وادی دین و مذہب میں بھی ہمراہی کر کے آگے آگے چلنے لگا۔ اور اعلیٰ درجۂ تقرب حاصل کر لیا۔ کچھ آگے چل کر کمال دل شکستگی کے ساتھ فرماتے ہیں۔ کہ ناگاہ بیربر حرامزادہ اور شیخ ابو الفضل اور حکیم ابو الفتح نے آگے قدم بڑھا کر دین سے منحرف کر دیا۔ وحی۔ نبوت۔ اعجاز۔ کرامت۔ اور شرائع سے انکار مطلق کر کے کام نکال لے گئے۔ فقیر رفاقت نہ کر سکا۔ ہر ایک کا انجام حال بجائے خود لکھا جائیگا۔ انشاءاللہ۔ بہر حال اتنا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نہایت جلد ترقی کی۔ اور بہت ترقی کی۔

بنگالہ کی مہم جاری تھی۔ ایک تو افغان جا بجا فساد کر رہے تھے۔ طرہ یہ ہوا کہ امرائے ترک میں باہم نفاق ہوا۔ پرانے پرانے امیر اور پشتوں کے خدمتگار نمک حرام ہو کر باغی ہو گئے۔ بادشاہ نے منعم خاں کے مرنے سے چند روز پہلے مظفر خاں سردار کو وہاں بھیجا تھا۔ وہ بڑے زور شور سے فتوحات حاصل کر رہا تھا۔ اور جا بجا افغانوں کو دباتا پھرتا تھا۔ اس کی عقل پر ادبار نے ایسا پردہ ڈالا

کہ دماغ بلند ہوگیا۔ بے سوچے سمجھے ہر ایک پر جبر کرنے لگا۔ اور اس پر سپاہ کو خرچ سے تنگ رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ قدیم الخدمت اور نمک خوار اُسے چھوڑ چھوڑ کر باغیوں میں جانے لگے۔
بادشاہ نے ۹۸۷ھ میں رائے پتر داس کو دیوان مقرر کیا۔ اور حکیم ابو الفتح کو صدارت اور امینی کی خدمت عنایت کی کہ اعلیٰ رتبے کا بااختیار عہدہ تھا۔ ساتھ ان کے بہت سے امرا کو بھیجا۔ کہ جو دلدہی اور دلداری سے آجائیں۔ انہیں سنبھالو۔ جو حقیقتاً سرکش ہیں اُنہیں اعمال کی سزا دو۔

دولت بابری کے قدیم الخدمتوں میں بابا خان اور مجنوں خان قاقشال وغیرہ کا بڑا بہادر خاندان تھا۔ وہ ابتدا سے مہم بنگالہ میں تلواریں مار رہے تھے۔ اور ان کا بڑا جتھا تھا۔ وہ مظفر خاں کے ہاتھ سے بہت تنگ تھے۔ اب تازہ بہانہ یہ ہُوا کہ ان کی فوج میں داغ کا حکم پہنچا یعنی گھوڑے اور سپاہی کی موجودات دو۔ ساتھ ہی ایک مفسد کابل سے بھاگ کر ان کے لشکر میں جا چھپا مظفر خاں کے نام بادشاہی فرمان پہنچا کہ اسے سزائے اعمال کو پہنچائیو۔ اس کی سخت مزاجی کو بہانہ قوی ہاتھ آیا۔ اُسے فوراً گرفتار کرالیا۔ بابا خان نے روکا۔ مظفر خاں نے اُسے بُرا بھلا کہا۔ اور فرمان دکھا کر مفسد کو سر دربار مروا ڈالا۔ اس بات پر تمام قاقشال خیل بگڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تیغ زن اور خونریز لوگ تھے اُسی وقت سر منڈا اپنے مغولی طاقیے پہن سرکشی کا نشان باندھ الگ ہوگئے۔

مظفر خاں نے بہت سی کشتیاں جمع کیں۔ رائے پتر داس اور حکیم ابو الفتح کو کہ ۲۴ جلوس میں دربار سے تازہ زور پہنچے تھے۔ اُن کے مقابلہ پر بھیجا۔ مگر حکیم بزم کے یار تھے نہ رزم کے سپہدار۔ پتر داس بیچارہ ہندی کا بلچنے والا اس سے کیا ہوتا تھا۔ قاقشالوں نے بھُس کی طرح اُڑا دیا قاقشال خیل کا بڑا انبوہ تھا۔ مفسدوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ اور جمع ہو کر لڑتے مارتے مظفر خاں پر چڑھ آئے اسے بد اقبالی نے ایسا دبایا کہ قلعہ ٹانڈہ کے کھنڈر میں محصور ہو کر بیٹھ گیا حکیم اور رائے اور کئی سردار بڑے دانا تھے سمجھ گئے کہ مظفر کو ظفر کی طرف سے جواب ہے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ باغی دیواروں پر چڑھ کر قلعے میں گھس آئے مظفر کو قید کر لیا۔ اور آخر کار مار ڈالا۔ مگر حکیم اور رائے مع اور سرداروں کے بھیس بدل کر غریب رعایا میں مل گئے۔ اس ہل چل میں کسی نے خیال نہ کیا۔ فصیل کود کر باہر آئے رستہ کھُلا تھا۔ گاؤں بہ گاؤں زمینداروں سے راہبر لیتے۔ کہیں پیادہ کہیں سوار خاک پھانکتے ٹٹو ہانکتے حاجی پور کے قلعے میں جا پہنچے۔ مگر پاؤں میں پھپھولے پڑ گئے مخملی مسندیں اور ایرانی قالین سب بھُول گئے۔ وہاں سے پھر ہنستے کھیلتے ہوئے دربار میں آن حاضر ہوئے۔ باتوں کے نسخے اور تدبیروں کی معجونیں ان کے پاس موجود رہتی تھیں۔ جزوی و کلّی حالات چنانچہ صورت حال

کے بموجب عمل میں آئیں۔ اور ان پر اور مرحمت زیادہ ہوئی۔

ملا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ شیخ عبد النبی صدر نے ایمہ مساجد اور بزرگان مشائخ کی عطائے جاگیر میں اس قدر سخاوت کی کہ جو معافیاں کئی کئی سلطنتوں میں ہوئی ہونگی۔ وہ کئی برس میں کر دیں علاوہ اس کے کئی باتوں میں بدنام بھی ہوئے۔ ۹۹۰ھ میں اسی شہر لاہور میں تجویز ہوئی۔ کہ کل ممالک محروسہ کی معافیوں کی تحقیقات ہو کئی کئی صوبوں پر ایک با امانت عالی دماغ شخص مقرر ہوا۔ چنانچہ دہلی۔ مالوہ۔ گجرات کی صدارت ان کے نام ہوئی۔ ۹۹۳ھ میں ہشت صدی کا منصب ملا۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے۔ کہ اگرچہ منصب ہزاری سے کم رہا۔ مگر ہر وقت کی حضوری اور مصاحبت کے سبب سے ان کی وزیر اور وکیل مطلق کی طاقت بڑھتی گئی۔ حکیم نام کے ابو الفتح اور حکیموں کے بادشاہ تھے۔ مگر میدان جنگ میں حصے کرنے آئے تھے۔ سرحدی افغانوں کی مہم میں ترکی فوج کو ساتھ لے کر گئے۔ وہ اور بہت سے نامی شمشیر زن اور سردار کہ بادشاہی روشناس تھے مارے گئے۔ خیر غنیمت ہے کہ یہ تو جیتے پھر آئے۔ بادشاہ نے جس قدر بیربر کے مرنے کا غم کیا۔ تم نے دیکھ لیا۔ جو امرا زندہ پھر کر آئے وہ مدتوں دربار سے محروم رہے۔ چند روز ان کا مجرا بھی بند رہا۔ مگر فیضی۔ ابو الفضل۔ میر فتح اللہ شیرازی خان خاناں جیسے اشخاص موجود تھے۔ چند روز میں پھر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے۔ ۹۹۷ھ میں جبکہ بادشاہ کشمیر سے پھرے اور براہ مظفر آباد پکلی اور دمتور سے گزر کر حسن ابدال میں آن اُترے حکیم رستے میں درد شکم اور اسہال میں گرفتار ہوئے۔ مآثر الامرا میں ہے کہ ان کے حال پر بادشاہ عنایت بے اندازہ و بے نہایت فرماتے تھے۔ منزلوں میں خود دو تین دفعہ عیادت کو گئے۔ اور دلدہی کی۔ کہ صاحب کمال تھے اور یکتائے وقت تھے۔ اور وفادار اور ہواخواہ تھے۔ شیخ ابو الفضل لکھتے ہیں کہ شاہ عارف حسینی کے لئے کچھ روپیہ بھیجا کہ تبت کے محتاجوں کو بھیج دو۔ ایک دن ان کے سبب سے بمقام کیا کہ حکیم کو ضعف بہت ہے۔ سوار ہو کر چلنے کی طاقت نہیں۔ آخر حکمت پناہ مذکور نے کہ نبض شناس روزگار تھا دنیا سے انتقال کیا۔ اکبر کو بڑا رنج ہوا۔ حسن ابدال کا مقام بھی شادابی اور چشمہ ہائے جاری سے کشمیر کی تصویر ہے۔ وہاں خواجہ شمس الدین خافی نے ایک عمارت اور گنبد خوشنما اور چشمہ جاری کے دہانے پر حوض دلنشین بنایا تھا۔ بموجب بادشاہ کے حکم کے وہیں لا کر دفن کیا۔ میر فتح اللہ مرحوم کے زخم پر تازہ زخم لگا۔ حکیم ہمام توران کی سفارت پر گیا ہوا تھا۔ اس کے نام پر فرمان تعزیت بھیجا۔ جو کہ ابو الفضل کے دفتر اول میں موجود ہے۔ اس کا ایک ایک فقرہ ایک ایک مرثیہ و غمنامہ ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے کمالات اور خدمات نے صدق اخلاص کے ساتھ اکبر کے دل میں

کہاں جگہ پیدا کی تھی ۔

اب ملا صاحب کو دیکھو۔ اس غریب کے جنازے پر کیا پھول برساتے ہیں۔ بادشاہ نے اس برس سیر کابل کا ارادہ کرکے پگلی سے اٹک کو باگ موڑی۔ اور اس مروڑ میں منزل دمتور میں حکیم ابو الفتح نے توسن زندگی کی باگ ملکِ آخرت کو پھیر دی۔ تاریخ ہوئی۔ خدالیش سزا داد ۹۹۷ھ ۔

آزاد۔ اس مصیبت کا عالم دیکھنا چاہو۔ تو اکبر نامہ کی مختصر عبارت کا ترجمہ سُن لو حکیم بہت بیمار تھا۔ مقام کر دیا۔ نکتہ دانی کے باغبان۔ دقیقہ شناس۔ نُور بین شبستان ضمائر کے بیدار دل انجمن نہفتہ دانی کے ہوشیار زمانہ کے نبض شناس کا وقت پورا ہو گیا۔ جھمیلوں کے میلے سے الگ ہو گیا۔ اخیر سانس تک ہوش قائم تھے۔ کچھ خطرہ یا پریشانی نہ تھی۔ خاطر قدسی اکبر پر اس حادثہ غم اندوز سے کیا کہوں کہ کیا گذری۔ جب خورد و بزرگ پر سوگواری چھائی۔ تو اس قدر دانِ بزم آگہی کے غم کا کون اندازہ کر سکے ۔ اتنا خلوص اتنی مزاج شناسی۔ خیر اندیشی عام۔ فصاحت زبان حسن جمال قیافہ کی عالی علامتیں۔ ہر باب میں قدرتی شگفتگی۔ ذاتی گرمی و گرمجوشی عقل و دانش کہیں مدتوں ہی میں اکٹھی ہو حکم علا کے بموجب خواجہ شمس الدین اور جماعت امرا کو حسن ابدال میں لے گئے۔ اور خواجہ نے جو گنبد اپنے واسطے بنایا تھا۔ اس میں دفن کر دیا۔ دیکھو کس نے بنایا اور کس طرح سے بنایا ۔

نگارندۂ اقبال نامہ (یعنی ابو الفضل) سمجھ بیٹھا تھا۔ کہ میں بے صبری سے تنگ گلی سے نکل گیا اور فرحت گاہ خورسندی میں آرام گاہ حاصل کر لی۔ اب کوئی رنج مجھ پر اثر نہ کر سکیگا۔ مگر اس غم نے پردہ کھول دیا۔ قریب تھا کہ بیقراری سے تڑپ اُٹھے۔ اُس نے سعادت جاودانی حاصل کی۔ کہ مانگے کی جان اپنے خداوند کے قدموں میں دی۔ خدا سے اُمید ہے کہ سب خدا پرست اس کے سامنے ہی جان دیں

ملک الشعرا شیخ فیضی نے عضد الدولہ اور حکیم کے مرثیے میں قصیدہ رشتہ نظم میں پرویا۔ ساوجی نے تاریخ بھی فوت کی اسی انداز میں کہی (دیکھو شاہ فتح اللہ شیرازی کا حال)

حکیم ہمام سفارت توران سے واپس آئے تھے۔ باریک آپ کی منزل میں آکر سر عجز کو زمین پر رکھ دیا۔ اور فرق خوش نصیبی کو آسمان تک پہنچایا۔ انہیں دیکھ کر بادشاہ کو رنج تازہ ہوا۔ ابو الفضل اکبر نامہ میں لکھتے ہیں کہ فرمایا۔ ترا یک برادر بود از عالم برفت سے

از حساب دو چشم یکتن کم	وز حساب خرد ہزاراں بیش

بادشاہ کی برکت انفاس سے حکیم کا دل بیتاب ٹھکانے ہوا۔ دعا و ثنا بجا لایا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان لوگوں کی خوبیوں نے بادشاہ کے دل میں گھر کر لیا۔ جب پھر حسن ابدال کی منزل میں پہنچے تو مقام

کیا۔ حکیم کو یاد کر کے افسوس کیا۔ اور ان کی قبر پر گئے۔ ہائے اُستاد مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

مرے مزار پہ کس طرح سے نہ برسے نور	کہ جان دی ترے روئے عرق فشاں کیلئے

فاتحہ پڑھ کر دعائے مغفرت کی۔ اور ذکر خیر سے یاد کرتے رہے۔ اور اکثر صحبتوں میں ایسا ذکر ہوا کرتا تھا۔

مآثر الامرا میں عبارت مذکور کے بعد شیخ لکھتا ہے۔ اہل ضرورت کا کام ایسی دلی کوشش سے کرتے تھے کہ گویا اسی واسطے نوکر ہوئے ہیں۔ اور اس خدمت سے کبھی اپنی جان کو معاف نہ کرتے تھے کریم الصفات تھے۔ اور زمانہ کے محسن تھے۔ کمالات میں یگانہ تھے۔ اور شعرائے زمانہ کے ممدوح تھے۔ حکیم صاحب کے علم و فضل اور جواہر کمالات کے باب میں کچھ کہنا فضول ہے۔ ابوالفضل جیسے شخص کو دیکھو کیا کہہ گئے۔ ان کے ایک ایک لفظ میں صفحوں کا عطر کھچا ہوا ہے۔ البتہ چند موقع جو میں نے کتابوں میں دیکھے دکھانے چاہتا ہوں۔ کہ ان کی زیرکی۔ تیزی فہم۔ رمز شناسی مصلحت بینی۔ نکتہ دانی پر اکبر کو کیسا بھروسہ تھا۔ اور کیسا تیز نسخہ خلوص عقیدت کا تھا۔ جس نے چند سالہ حضوری میں پشتوں کے نمکخواروں سے آگے بڑھا دیا۔ ۹۹۰ھ میں ایک بزرگ اہل معرفت کا لباس پہن آگرہ سے جالیسر میں آئے۔ اور معرفت کی دکان کھول دی۔ ہزاروں احمقوں کو گھیر لیا۔ یہاں تک کہ شیخ جمال بختیاری جو بنگالہ میں افغانوں کے پیر تھے وہ بھی پھندے میں پھنس گئے۔ یہ سُنکر بادشاہ کو خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ حکیم صاحب اور میرزا خان (عبدالرحیم خان خاناں) کو بھیجا کہ کھوٹے کھرے کو پرکھو۔ اور ارادہ معلوم کرو۔ کھرے ہوں تو مسند ہدایت ان کا حق ہے ورنہ خلق خدا کو خراب کرینگے دونوں رئیسوں کے مرشد تھے۔ جا کر صحبتیں گرم کیں۔ اور زبان کی نبض سے دل کا احوال معلوم کیا اندر کچھ بھی نہ تھا۔ حکمت عملی سے سارے حلقہ کو حضور میں لے آئے۔ شیخ جمال نے سجدہ عقیدت سے جمال معنی روشن کر لیا۔ فقیر کی جھولی میں سواد غا کے کچھ نہ تھا۔ حکم ہوا کہ خلوت خانۂ ندامت (قید) میں بیٹھے۔

وہ انسانیت کا صراف انہیں خوب تاڑ گیا۔ جب ایسے اشخاص کے حالات کی تحقیق کی ضرورت ہوتی تھی۔ تو ان کی معرفت دریافت کرتا تھا۔ کہ اہل معرفت کے اہل اللہ کے بلکہ اللہ کے پہچاننے والے تھے۔ باتوں باتوں میں بات تو کیا ہے۔ پتال کا پتہ نکال لیتے تھے لیکن ایک معاملہ مُلّا صاحب نے ایسا لکھا ہے۔ جسے پڑھ کر آزاد حیران و سرگردان ہے۔ فرماتے ہیں کہ ۹۹۷ھ میں بادشاہ کشمیر گئے۔ شاہ عارف حسینی سے ملاقات ہوئی۔ وہ مُنہ پر نقاب ڈالے رہتے تھے۔ بادشاہ نے کشمیر میں اسی غرض سے شیخ ابوالفضل اور حکیم کو ان کی خدمت میں بھیجا۔ انہوں نے سلسلہ تقریر میں کہا۔ شاہا کیا مضائقہ ہے

اگر نقاب اُٹھادو۔ ہم بھی تمہارا جمال دیکھ لیں۔ نہ مانا اور کہا۔ ہم فقیر لوگ ہیں۔ جانے دو۔ بہت نہ ستاؤ۔ حکیم کے مزاج میں شوخی اور بیباکی زیادہ تھی۔ ہاتھ بڑھا کر چاہا کہ نقاب کھینچ لے۔ شاہ خفا ہوئے اور کہا معاذ اللہ۔ میں مجذوم یا معیوب نہیں۔ لے دیکھ میرا مُنہ۔ گریبان چاک کر ڈالا۔ اور نقاب زمین پر پھینک دیا۔ حکیم میرا منہ تو تُو نے دیکھا۔ مگر نتیجہ انشاء اللہ العزیز انہیں دو ہفتے میں دیکھیگا۔ ۱۵ دن نہ گزرے تھے کہ اسی راہ میں اسہال سے حکیم کا انتقال ہؤا۔ یاد کرو جس دن حکیم صاحب بیمار ہوئے اسی دن بادشاہ نے کچھ روپیہ شاہ موصوف کو بھیجا۔ اس سے یہی غرض ہوگی۔ کہ ان کا غصہ فرو ہو جائے اور دعائے خیر کریں۔ ابو الفضل اس کوچہ کی خاک تھے۔ اور خاکساروں کی رسم و راہ سے واقف تھے۔ ان کے حالات فقیر کے ساتھ تمام فرامین بادشاہی ہیں۔ اور جو مراسلات و عرائض خود امراو شاہزادوں کو لکھے تھے ان سے بھی کھُلتا ہے۔ جہاں اور باتوں کی تاکید لکھتے ہیں۔ فقرا اور دل شکستوں کی دلجوئی پر بہت زور دیتے ہیں۔ دیکھو! بادشاہ کے حکم سے چلے گئے۔ مگر الگ رہے۔

۹۹۵ھ میں مرزا سلیمان حاکم بدخشان عبداللہ اوزبک کے ہاتھ میں ملک چھوڑ کر دوبارہ ادھر آیا اور اکبر نے اس کی پیشوائی اور مہمانداری ایسی دھوم دھام سے دکھائی گویا ہندوستان نے اپنی ساری شان و شکوہ اُگل دی۔ شہزادہ مراد پانچ چھ برس کا تھا۔ ٹوڈرمل۔ آصف خاں۔ ابوالفضل۔ حکیم ابوالفتح وغیرہ امرائے جلیل القدر اس کے ساتھ کر کے کئی منزل آگے پیشوائی کو بھیجا۔ شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح کو حکم ہؤا۔ کہ وقت ملاقات کے بہت پاس ہوں۔ اور کمینگاہ جواب میں لگے رہیں۔ دونوں کی طرز دانی۔ معاملہ فہمی۔ ادب شناسی نے ایسے ہی دل پر نقش بٹھائے ہونگے جو ایسے نازک وقت پر یہ خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ ابوالفضل اُن سے ایک برس پہلے آئے تھے۔ ملّا صاحب نے طبیبوں کے سلسلہ میں پھر ان کا حال لکھا ہے۔ اور وہاں جو عنایت کی ہے وہ بھی لطف سے خالی نہیں ہے۔ فرماتے ہیں " بادشاہ کی خدمت میں انتہا درجہ کا تقرب حاصل کیا تھا۔ اور ایسا تصرف مزاج میں پیدا کیا تھا کہ تمام اہل دخل رشک کرتے تھے۔ تیزی فہم۔ جودت طبع۔ کمالات انسانی اور نظم و نثر میں ممتاز کامل تھا۔ اسی طرح بیدینی اور اوصاف ذمیمہ میں بھی ضرب المثل تھا۔ جن دنوں حکیم نیا نیا آیا۔ ان دنوں میں نے سُنا ایک دن بیٹھا کہہ رہا تھا۔ خسرو سے اور وہی بارہ شعر ہیں۔ **انوری** کو **انوریک** مداح کہا کرتا تھا۔ **میر بادنجان** اس کا نام رکھا تھا۔ کہ ایران میں ایک مشہور مسخرہ تھا **خاقانی** کو کہا کرتا تھا۔ کہ اگر اس زمانہ میں ہوتا تو خوب ترقی کرتا۔ میرے ہاں آتا میں ایک تھپڑ مارتا۔ طبیعت ذرا کانٹی کو چھوڑتی۔ وہاں سے ذرا شیخ ابوالفضل کے ہاں جاتا۔ وہ مارتا اسی طرح

اصلاح دیتے" جو شخص ملا صاحب کی تاریخ کو پڑھیگا بلکہ دربار اکبری میں بھی کہیں کہیں ان کی باتیں سنیگا سمجھ جائیگا کہ ان کی طبیعت کا یہ حال تھا۔ کہ کسی کو ترقی کرتے نہ دیکھا جاتا تھا۔ جسے عزت کے کپڑے پہنے دیکھتے تھے ضرور نوچتے تھے۔ اور اہل علم کے زیادہ کہ ہم پیشہ ہیں۔ ان میں سے اگر شیعہ ہے تو کیا کہنا شکار ہاتھ آیا۔ اس کی کہیں داد فریاد نہیں۔ چند روز پہلے کوئی شخص شیعہ مذہب کو ظاہر ہی نہ کر سکتا تھا۔ سنہ ۹۸۳-۸۴ھ کے بعد انہی چند اشخاص کے آنے سے اتنا حوصلہ پیدا ہوا۔ کہ شیعہ چپکے چپکے اپنے تئیں شیعہ کہنے لگے۔ اور اُس کا بھی ملا صاحب کو بڑا داغ تھا۔ اور اگر شیعہ نہیں تو خیر۔ ان کی باتیں چنتے رہتے تھے۔ اور گرہ میں باندھتے جاتے تھے۔ جہاں موقع پاتے تھے وہیں ایک سوئی چبھو دیتے تھے۔ حق سے نہ پھرونگا۔ تاریخ نویسی کے اوصاف میں پورے تھے۔ عبارت مذکورہ میں جو حکیم صاحب کے حق میں لکھی ہے۔ ہر چند غصے نے بہت زور کیا۔ مگر اوصاف علمی کے باب میں حق نویسی نے ہرگز نہ مانا جو لکھنا تھا وہی لکھا۔

بے دینی کا جو نشتر مارا۔ کچھ بجا۔ کچھ بے جا۔ تشیّع کے سبب سے بیدین کہا تو اس کی شکایت نہیں۔ ہاں اس جرم پر کہ دربار میں جو ہوا چل رہی تھی اس میں کیوں آ گئے۔ اس کے جواب میں انصاف خاموش نہیں رہ سکتا۔ دیکھو جس بادشاہ کے وہ نوکر تھے جس کا وہ نمک کھاتے تھے۔ اُس کے ہزاروں معاملے تھے۔ کوئی مصلحت ملکی تھی۔ کوئی خوشی دل کی تھی۔ اور یہ لوگ فقط آدمی طبیب نہ تھے۔ عالم نبض شناس اور زمانہ کے طبیب تھے۔ جو ان کی راہ دیکھتے تھے۔ اسی راہ پر چلتے تھے۔ نہ چلتے تو کیا کرتے۔ جہاں جاتے وہاں اُس سے بدتر حال تھا۔ یہاں علم و کمال کی قدر تو تھی مگر اور جگہ یہ بھی نہ تھا یہاں تھے۔ اور اپنے عالی اختیارات کو بندگانِ خدا کی کار پردازی اور کارروائی میں اس طرح خرچ کرتے تھے گویا اس کے نوکر ہیں۔ یا اسی واسطے پیدا ہوئے ہیں۔ مآثر الامرا میں ایک فقرہ ان کے باب میں لکھا ہے۔ گویا انگوٹھی پر نگینہ اور نگینے پر نقش بیٹھا ہے "درہم سازی مردم خود را معاف نہ داشتے"۔ جو کماتے تھے کھاتے تھے کھلاتے تھے۔ لٹاتے تھے۔ نیک نامی کے باغ لگاتے تھے۔ ایسے تھے کہ ان کی بیدینی کے سائے میں سینکڑوں دیندار پرورش پاتے تھے۔ عالم فاضل باکمال عزت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ملا صاحب کے مرید ہوتے ان کی طرح بیٹھ رہتے۔ اور یہ خوش ہوتے جو ان کا حال ہوا وہی ان کا۔ جو انہوں نے قوم کو فائدہ پہنچایا وہی ان سے پہنچتا۔ ان کی تاریخ بداؤنی میں کُل پانچ چھ شخص تھے۔ جن سے آپ خوش رہے۔ ورنہ سب پر لے دے مار دھاڑ ہے۔ بھلا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ کہ تمام دنیا کے لوگ اہل معرفت اور اولیاء اللہ ہو جائیں۔ ایسا ہو تو دنیا کے کام

بند ہو جائیں۔ سبحان اللہ مولانا روم کو دیکھیں کیا فرماتے ہیں ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند	میل آنرا در دلش انداختند

ملا صاحب نے کئی جگہ بڑی بے دماغی سے فرمایا ہے "میں اس واسطے حضوری سے الگ ہو گیا"۔ آزاد کہتا ہے۔ الگ ہوئے تو کیا ہوا۔ کیسی کیسی کتابوں کے ترجمے کئے۔ کیوں کئے۔ کرنے پڑے اور اخیر کو سجدہ بھی کیا۔ فرق اتنا رہا کہ یہ لکھتے گئے اور گالیاں دیتے گئے۔ وہ ہنستے گئے۔ کھیلتے گئے۔ آقا کا کام حسب دلخواہ کیا۔ عقیدہ اپنا دل کے ساتھ ہے۔ مصاحبت میں وزارت اور وکیل مطلق کی طاقت سے قوم کی کارپردازی کرتے تھے۔ جو بات ناگوار ہوتی، اسی طرح تعمیل کرتے۔ گویا ان کا عین مذہب یہی ہے۔ جب گھر میں آتے، سب ہم مشرب مل کر ہنسی میں اڑا دیتے۔ مجھے نہیں ثابت ہوا کہ ان کے عقیدے میں کچھ بھی فرق ہوا۔ بات یہ ہے کہ جب وہ ہندوستان میں آئے تو ایک حمام نظر آیا جس میں مشائخ امیر غریب سب ننگے ہیں۔ انہوں نے بھی کپڑے اُتار کر پھینک دیئے۔

تم جانتے ہو۔ اہل ایران کو جیسے نور کے چہرے خدا نے دیئے ہیں ویسی ہی ڈاڑھیاں بھی دی ہیں۔ ان میں جو رکھنے والے ہیں وہی ان کی قدردانی بھی کرتے ہیں۔ حکیم صاحب کی ڈاڑھی بھی قابل تصویر ہے۔

ملا صاحب فرماتے ہیں۔ ابتدائے ملازمت میں چوبیس پچیس برس کی عمر ہو گی۔ ایک دن میں میر ابوالغیث بخاری کی خدمت میں بیٹھا تھا۔ حکیم نے میری ڈاڑھی مقدار معمولی سے چھوٹی دیکھی۔ کہا تم بھی قصر کرتے ہو (منڈاتے ہو) میں نے کہا حجام کی تقصیر ہے۔ فقیر کی نہیں۔ حکیم نے کہا۔ پھر ایسا نہ کرنا۔ بدنما اور نازیبا ہے۔ چند روز بعد لنڈ منڈ صفاچٹ رندوں لونڈوں سے بھی آگے نکل گیا۔ ایسی بال کی کھال اُتارتا تھا کہ نوجوان مردوں کو دیکھ کر رشک آئے۔ ملا صاحب جو چاہیں فرمائیں۔ انہیں آقا کی تعمیل حکم یا مصلحت ملکی یا خوشی کے لئے کوئی کام کرنا اور بات ہے۔ بیدینی اور بات ہے۔ بے دینی جب ہے کہ اُسے حلال شرعی سمجھ کر اختیار کرے۔ آزاد گنہگار روسیاہ کو ایسے معاملہ میں بولنا خود ناروا ہے۔ مگر بعض موقع ایسا آ جاتا ہے کہ بولے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اس زور شور کی دینداری اکبر بادشاہ کے امام۔ باوجود اس کے ڈاڑھی کا شوق انہی فقروں سے معلوم ہو گیا۔ ستار بجاتے تھے۔ بین بجاتے تھے۔ گلے سے بھی گاتے تھے۔ دو دو طرح شطرنج کھیلتے تھے۔ بس آگے نہیں کہا جاتا۔ اور نہ کہنا مناسب ہے۔ خدا ستار العیوب ہے۔ کیا ضرور ہے کہ ناحق کسی کا

پردہ فاش کروں۔ **اخلاق ذمیمہ** کے ذمیمہ کے لفظ پر اشتیاق منتظر تھا کہ دیکھئے۔ کیا کیا شگوفے کھلائینگے۔ مگر بسند اس کی فقط وہی نکلی کہ انوری کو یہ کہتے تھے اور خاقانی کو وہ کہتے تھے۔ ملّا صاحب نے خود سینکڑوں کی خاک اُڑا دی۔ عالم فاضل پیر فقیر غریب امیر کون ہے جو آپ کے قلم سے سلامت نکل گیا۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے مزاج شگفتہ طبعیتیں شوخ۔ خیالات بڑھے ہوئے تھے۔ خود صاحب کمال تھے۔ دل ایک دریا ہے۔ ہزاروں طرح کی موجیں مارتا ہے کبھی یہ رنگ بھی آگیا۔ وہ خود اس فن کو لے کر بیٹھتے تو انوری و خاقانی سے ایک قدم بھی پیچھے نہ رہتے۔ بے شک میدانوں آگے نکل جاتے۔ ان کی انشا پردازی دیکھنی چاہو تو چار باغ دیکھو۔ خیالات شاعرانہ میں فلسفہ و حکمت کے پھول برس رہے ہیں۔ اور یہ گل افشانی جمع خرچ زبانی نہیں فتاحی دیکھو شیخ سینا کی روح کو آب حیات پلایا۔ قیاسیہ دیکھو۔ حکمت اور شریعت کا یہ عالم ہے کہ شربتِ شیر کی دو نہریں برابر بہی جاتی ہیں۔ ملّا صاحب کی تحریریں پڑھتے پڑھتے میری بھی رائے بدلنے لگی تھی۔ مگر ایک واردات میری نظر سے گزری۔ ان کی محبت قومی اور ہمدردی نے تین سو برس کی راہ سے آواز دی اور میں اپنی جگہ تھم گیا ✦

واردات۔ شہباز خاں کنبوہ مسائل شرعی کے بڑے پابند تھے۔ یہاں تک کہ موقع پر بر سرِ دربار بے لطفی ہو گئی۔ ایک دن شام کے قریب بادشاہ ٹہلتے تھے۔ چند مصاحب امرا ساتھ تھے۔ ان میں خان موصوف بھی تھے۔ عصر کا وقت تنگ ہو گیا۔ خان موصوف الگ ہوئے اور ایک طرف زمین پر اپنی شال بچھا کر نماز پڑھنے لگے۔ ان دنوں بادشاہ دینداروں سے تنگ تھے۔ اتفاق یہ کہ ٹہلتے ہوئے وہ بھی ادھر آ نکلے۔ اور دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ جب شہباز خاں نماز پڑھ کر آئے۔ تو دیکھا کہ حکیم ابو الفتح اور پہلوؤں سے ان کی تعریف کر رہے تھے مطلب اس سے یہی تھا کہ ان کی طرف سے دل میں غبار نہ آئے۔ اگر حکیم صاحب حقیقت میں بیدین یا دشمن اہل دین ہوتے تو شہباز خاں پر چھینٹا مارنے کا پہلو اس سے بہتر کب ہاتھ آتا ✦

تصنیفات۔ میں جو کہ نظر سے گزریں۔ فتاحی شرح قانونچہ تخمیناً ۵۰۰ صفحہ کی کتاب ہے ✦

قیاسیہ۔ برائے نام اخلاق ناصری کی شرح ہے حقیقت میں اُس کے ایک ایک مسئلہ کو کہ براہین فلسفہ پر مبنی ہے۔ دلائل نقلی سے ثابت کیا ہے۔ اور آیتوں اور حدیثوں سے مطابقت دی ہے۔ تخمیناً چودہ سو صفحہ کی کتاب ہوگی ✦

چار باغ۔ اس میں خطوط اور نثریں ہیں۔ اکثر حکیم ہمام اپنے بھائی۔ شیخ فیضی۔ شیخ ابو الفضل۔

خان خاناں ۔ میر شمس الدین خاں خانی وغیرہ امرا اور اہل کمال کو لکھے ہیں ۔ نثروں میں اکثر مسائل حکمت پر خیالات ہیں ۔ یا بعض کتابوں کی سیر کر کے جو رائے قرار پائی ۔ اُسے عمدہ عبارت میں ادا کیا ہے بزرگوں سے سُنا ہے ۔ کہ اور تصنیفیں بھی تھیں ۔ مگر نہیں ملتیں ۔ ان کی شوخ طبعی نے بہت سے مقولے تجربوں کے ساتھ ترکیب دے کر ضرب المثلیں بنا رکھے ہیں ۔ چنانچہ انہیں میں سے ہیں (۱) جس پر اعتبار کرو وہی معتبر (۲) اعتبار کسی کا نہیں ، (۲) ہمت کا دکھانا طمع کا دکھانا ہے (۳) بدمزاج بننا چاہو تو بازاری مرد کو نوکر رکھو ۔ عرفی نے ان کی تعریف میں کئی قصیدے کہے اور بڑی دھوم دھام کے کہے حکیم صاحب نے بھی انہیں اس طرح رکھا کہ جب تک جئے اور کے پاس جانیکی ضرورت نہ ہوئی ۔ اس کے بعد خانخاناں کے پاس گئے ۔ اگلے وقتوں میں عام دستور تھا ۔ کہ اگر اہل علم اور اہل کمال زمانے کی بیوفائی سے بے دست و پا ہو جاتے تھے تو اور صاحب دستگاہ انہیں سنبھال لیتے تھے کہ پردہ فاش نہ ہوتا تھا ۔ افسوس ہے آج کے زمانے کا کہ اپنا ہی سنبھالنا مشکل ہے ۔ کوئی کسی کو کیا سنبھالے ۔ حکیم موصوف کی تعریف میں ملا ظہوری نے دکن سے قصیدے لکھ لکھ کر بھیجے اور وہیں صلے پہنچے +

آزاد ۔ عرفی کیا کہینگے اور ظہوری کیا بھیجینگے ۔ انہیں کی مروتوں کے رس تھے جو ان زبانوں سے ٹپکتے تھے میں نے حکیم صاحب کی تحریر سے آنکھیں روشن کی ہیں ۔ ایک پرانا نسخہ قاموس دیکھا کہ جہانگیر اور شاہجہان وغیرہ بادشاہوں کے کتب خانوں میں کرسی نشین ہوتا آیا ہے کتب خانہائے شاہی کی مہریں اس کے رتبہ عالی کے لئے محضر بناتی تھیں ۔ اس کے ابتدائی صفحوں میں ان کے ہاتھ کی ایک عربی عبارت لکھی ہوئی ہے ۔ جس کا خلاصہ یہ ہے ۔ یہ خزانہ فاخر بلکہ دریائے زاخر مجھے اس شخص نے دیا ۔ جسے خدا نے دونوں جہان کا کمال اور دونوں ملکوں کی ریاستیں دیں یعنی خانخاناں کہ نام کے نقطے بدل کر پڑھو تو فارسی میں جان جاناں ہے ۔ کتبہ ابوالفتح الگیلانی اللاہجانی ان کے بیٹے حکیم فتح اللہ تھے ۔ جہانگیر کے عہد میں کابل کے مقام پر خسرو کی سازش کے الزام میں گرفتار ہوئے ۔ مقدمہ کی تحقیقات شروع ہوئی ۔ اور کئی شخصوں پر الزام ثابت ہوا ۔ انہیں میں یہ بھی تھے ۔ انہیں یہ سزا ملی کہ اُلٹے گدھے پر سوار کرتے تھے ۔ اور منزل بمنزل لئے آتے تھے ۔ آخر اندھا کر دیا +

شاہجہان نامہ میں ایک جگہ نظر سے گزرا کہ حکیم ابوالفتح کا پوتا ضیاء اللہ نہ صدی منصب پر تھا ۔ شاہ فتح اللہ شیرازی اور حکیم ابوالفتح گیلانی کے غم میں شیخ فیضی کا خون جگر ہے ۔ کہ قصیدہ کے رنگ میں کاغذ پر ٹپکا ہے +

حکیم ہمام

حکیم ابوالفتح سے چھوٹے تھے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ علم و فضل اور حسن لیاقت میں ان کے بھائی تھے۔ ساتھ ہی آئے۔ ساتھ ہی ملازمت ہوئی۔ اصلی نام ہمایوں تھا۔ اکبری دربار میں یہ نام لینا ترک ادب تھا۔ اس لئے چند روز ہمایوں قلی رہے۔ پھر اکبر ہی نے ہمام نام رکھا۔ انہیں باعتبار خدمتوں اور منصبوں کے اور فتوحات اور مہمات کے وہ ناموری حاصل نہیں ہوئی۔ جو دربار اکبری کے اور اراکین کو ہوئی۔ مگر جن لوگوں نے قربت حضوری اور وفا اور اعتبار سے دل میں جگہ پیدا کی تھی۔ ان میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ انتظام دفتر اور ضوابط و آئین کے لئے جو جلسہ مشورت ہوتے تھے۔ اُن کے بھی رکن ہوتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کمیٹیوں کی روئدادیں آج نہیں جو معلوم ہو کہ ہر شخص کی قوت ایجاد نے ان معرکوں میں کیا کیا کارنامے دکھائے تھے۔ ان کی تقریریں اور اختلاف رائے اور ایک کی رائے دوسرے کی رائے میں اصلاح اور اس میں لطائف اور ظرائف کی چہلیں قابل دیکھنے کے ہونگی۔ ابوالفتح۔ فیضی۔ میر فتح اللہ شیرازی اور یہ دونوں بھائی۔ راجہ ٹوڈرمل۔ نظام الدین بخشی وغیرہ اشخاص مہمات ملک اور معاملات دربار میں ایک جتھے کے لوگ تھے فیضی کی انشاء میں حکیم ہمام کے نام بہت خط ہیں۔ جن کے دیکھنے سے اُس وقت کے جلسے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں یعلوم ہوتا ہے کہ بڑے زندہ دل اور عجیب شگفتہ مزاج لوگ تھے۔ اگرچہ منصب ششش صدی سے زیادہ نہیں بڑھا۔ مگر اعتبار اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ کہ دسترخوان خاصہ ان کے سپرد تھا +

حق پوچھو تو ایک ہی نقطہ پوری کتاب کا حکم رکھتا ہے۔ کہ ملّا صاحب نے اسکی خاک اُڑادی۔ اور ان کی بُرائی کا نکتہ نہیں چھوڑا۔ سب کچھ کہہ دیا ہے۔ مگر علم و فضل اور لیاقت اور قابلیت پر حرف نہیں لائے۔ صاف سمجھ لو۔ کہ نہ پایا۔ ورنہ وہ کس سے چوکنے والے تھے۔ مخدوم اور صدر کہن سال بڈھے اپنے ہم مذہب تھے۔ ان کی علمیّت کی وہ مٹی خراب کی ہے ان لوگوں کو ایسا ہی پایا تھا جب اتنا کہا ہے۔ اور کچھ شک نہیں یہ لوگ عجوبہ روزگار تھے۔ جس طرح اکبر جیسا بادشاہ باقبال ہونا مشکل ہے اسی طرح ایسے لوگ پیدا ہونے مشکل +

یہ فقط بادشاہ کے نہیں۔ زمانہ کے مزاجدان اور عالم کے نبض شناس لوگ تھے۔ اہل علم اور اہل کمال کی کچھ اس وقت انتہا نہ تھی۔ بے شمار لوگ موجود تھے۔ آخر کچھ بات تھی۔ کہ بادشاہ انہیں کا نام لے کر ہر وقت پکارتا تھا۔ اور جو بات یا جو صلاح پوچھتا تھا۔ اس کا نتیجہ ایسا پاتا تھا کہ مزاج زمانہ اور مصلحت وقت کے موافق ہوتا تھا۔ اور یہ سکّہ نہ فقط شاہ بلکہ شاہزادوں تک کے دلوں پر نقش تھا خصوصاً جبکہ اپنے قومی نمک خواروں سے بیوفائیاں دیکھتے تھے۔ اور بابر اور ہمایوں کے ساتھ ان کے معاملے یاد کرتے تھے۔ تو ان کے استلو وفا کے حرف زیادہ روشن نظر آتے تھے۔ دل کا حال ایک بات میں کھل جاتا ہے۔ تزک میں دیکھو جہانگیر کس محبّت سے لکھتا ہے +

ان کی ملکی خدمتیں سوا اس کے کچھ نہیں۔ کہ جب عبد اللہ خاں ازبک نے مراسلہ اور ممالک ماوراء النہر کے تحائف دربار اکبری میں بھیجے تھے۔ اور میر قریش لے کر حاضر ہوا۔ تو ۹۹۴ھ میں اس نے اُس کا جواب اور تحائف گراں بہا مرتب کئے۔ اور حکیم موصوف کو سفارت کی خدمت میں روانہ کیا۔ نامہ مذکور میں کہ شیخ ابو الفضل کا لکھا ہوا ہے۔ ان کے باب میں یہ الفاظ درج ہیں "افاضت و حکمت پناہ زبدہ مقربان ہوا خواہ۔ عمدہ محرمان کار آگاہ حکیم ہمام کہ مخلص راست گفتار اور مرید درست کردار ہے اور ابتدائے سلطنت سے بساط قرب کا ملازم رہا ہے۔ اس کی دوری اب تک کسی صورت سے تجویز نہیں ہوئی۔ اب بنیاد محبت اور قواعد مودّت کے استحکام کے لئے روانہ کرتے ہیں۔ ہماری ملازمت میں اس کو وہ قرب حاصل ہے۔ کہ مقاصد و مطالب کو بے کسی واسطے کے مقام عرض میں پہنچاتا ہے۔ اگر آپ کی مجلس شریف میں بھی اسی اسلوب کی رعایت ہوگی۔ تو گویا آپس میں بے واسطہ باتیں ہو جائینگی +"

جب تک یہ توران میں تھے۔ بادشاہ اکثر یاد کرتے تھے۔ حکیم ابو الفتح سے کہا کرتے تھے۔ حکیم یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا بھائی ہے۔ اس لئے تمہارا دل اس کے لئے ہم سے زیادہ بے چین ہے حکیم ہمام کہاں پیدا ہوتا ہے۔ دستر خوان پر بھی کہا کرتے تھے۔ جب سے حکیم ہمام گیا۔ کھانے کا مزا جاتا رہا۔ (ماٰثر) یہ اُدھر سے آنے والے تھے۔ کہ ادھر حکیم ابو الفتح مر گئے۔ بڑی دلداری اور غمخواری سے فرمان تسلّی ان کے نام روانہ کیا۔ اس میں میر فتح اللہ شیرازی کے مرنے کا بھی بہت افسوس کیا ہے اس سفارت سے ۹۹۷ھ میں واپس آئے۔ اکبر اس وقت کابل کے دَورے سے ہندوستان کو پھرا چاہتا تھا۔ کہ یہ بھی قریب آن پہنچے۔ اشتیاق نے ایسا بیقرار کیا۔ کہ جو ایلچی وہاں سے ساتھ آیا تھا۔ اُسے بھی اور اپنے ساتھیوں کو بھی رستے میں چھوڑا۔ شوق کے پر لگا کر اُڑے اور دو منزلہ

سہ منزلہ کرتے حضور میں آن پہنچے۔ پیارے آقا کی حضوری اور دوستوں کی ملاقاتیں جو تین برس کے بعد حاصل ہوئی تھی - بڑی خوشی کے ساتھ ہوئیں۔ مگر بھائی کی موت نے سب کو بے مزا کر دیا۔ یہ ملازمت بادشاہ کی اور گفتگوئیں احباب کی کہ ایک ایک اُن میں ملک معنی کا بادشاہ تھا۔ سننے کے قابل ہونگی۔ طالب آملی نے ایک رباعی کہہ کر سنائی سہ

	ہر دو برادرم کہ دمساز آمد او رفتہ بدنبالۂ او عمر رفت	او شد بسفر۔ دیں زسفر باز آمد دیں آمد و عمر رفتہ ام باز آمد	

اکبر نے اسی وقت کہا کہ تیسرے مصرعہ کا دنبالہ بھدا ہے۔ یوں کہو ع

	او رفت و ز رفتنش مرا عمر برفت	

مرتے کے ساتھ کون مر گیا ہے۔ چند روز کے بعد پھر وہی مصاحبت کے جلسے تھے۔ اور یہ تھے۔ ایک دن اُنہوں نے **معجم البلدان** حضور میں پیش کی۔ اور کہا کہ اس میں بہت مفید اور دلچسپ مطالب ہیں۔ اگر فارسی میں ترجمہ ہو جائے تو اس کے فوائد عام ہو جائیں۔ چنانچہ عرض قبول ہوئی ✦

تاریخ الفی کی تاریخ میں بھی انہوں نے حصہ پایا۔ مقام لاہور ۱۰۰۳ھ کے اخیر میں دنیا سے انتقال کیا۔ اور حسن ابدال میں جا کر بھائی کے پاس سو رہے۔ شیخ کہتے ہیں۔ دو مہینے دق کی بیماری سے دق رہ کر قید ہستی سے چھٹ گئے۔ خوش قیافہ۔ بادشاہ گوہر شگفتہ رو۔ فصیح زبان تھے۔ اور بکاول کی خدمت سے سر بلند تھے۔ بادشاہ نے دعائے مغفرت کی اور گوناگوں عنایتوں سے پسماندوں کے دل بڑھائے۔ اب ملا صاحب کو دیکھو۔ ان کی ہمدردی انسانیت کا حق کیونکر ادا کرتے ہیں۔ ان کے مرنے کے باب میں فرماتے ہیں ✦

حکیم حسن۔ شیخ فیضی۔ کمالائے صدر (وہی شاہ فتح اللہ شیرازی والے) حکیم ہمام بترتیب مہینے کے اندر اندر عالم سے نکل گئے۔ اور وہ سارے جمع کئے ہوئے مال ایک دم میں اپنے ٹھکانے پہنچے۔ دریائے قلزم وعمان میں بہے۔ ان کے ہاتھوں میں باد حسرت کے سوا کچھ نہ رہا۔ اور یہ بات تمام اہل قربت زندوں اور مردوں کے لئے عام ہے۔ کہ باوجود خزائن قارونی و شداؔدی کے کفن سے محروم جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ زمرۃ الاطبا میں پھر لکھا ہے۔ حکیم ہمام یہ ابوالفتح کا چھوٹا بھائی تھا۔ مگر اخلاق میں بڑے سے بہتر تھا۔ اگرچہ خیر محض نہ تھا۔ مگر شر محض بھی نہ تھا **آزاد** باوجودیکہ یہ لوگ شگفتہ مزاج تھے۔ مگر کسی کتاب میں ان کے اوضاع و اطوار کے باب میں کوئی اشارہ

خلاف وضع نظر نہیں آیا۔ ملّا صاحب مالک ہیں جو چاہیں فرمائیں۔ حکیم ہمام کے دو بیٹے تھے۔ اوّل **حکیم حاذق**۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے۔ کہ فتح پور سیکری میں پیدا ہوئے۔ جب اُن کے والد کا انتقال ہؤا۔ تو لڑکے تھے۔ چونکہ خاندان علم و حکمت سے تھے۔ بزرگوں کی بزرگی نے تحصیل علم پر مائل کیا۔ چندروز میں متعارف علموں میں دستگاہ پیدا کر کے شعر اور انشا پردازی میں شہرت حاصل کی۔ طب میں اس قدر مہارت نہ تھی۔ مگر اس میں بھی نام پیدا کیا۔ جہانگیر کے زمانہ میں بزرگی و اعتبار سے چہرے کو چمکایا۔ شاہجہان کے عہد میں ہزار پانصدی ششش صد سوار کا منصب پایا ◆

جہانگیر کے عہد میں جب شاہ عباس نے قندھار لے لیا۔ تو امام قلی خاں والئے توران نے سلسلہ دوستی کو جنبش دی۔ شاہ عبدالرحیم خواجہ جوئباری کو برسم سفارت بھیجا۔ اور لکھا کہ آپ ولیعہد دولت کو لشکر مناسب کے ساتھ بھیجئے۔ ادھر سے ہم بھی فوج لے کر پہنچینگے۔ فتح خراسان کے بعد جو ملک آپ کو پسند ہوگا۔ آپ لیجئے گا۔ جو چاہئیگا ہمیں دیجئے گا۔ ایلچی یہاں پہنچا تھا۔ اور گفتگو ہو رہی تھی کہ جہانگیر جہان سے رخصت ہوئے۔ ابتدائے دولت شاہجہانی میں خواجہ موصوف لاہور سے آکر بلائے گئے۔ اور چند ہی روز میں کسی بدترین امراض میں مُبتلا ہو کر دربارِ دُنیا سے رخصت ہوئے۔ ادھر سے مراسلت کا جواب اور ایلچی کا بھیجنا واجب تھا۔ چونکہ اکبر کے عہد میں عبداللہ خاں ازبک کے دربار میں ان کے والد ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کے تحائف مراسلہ محبت کے ساتھ لیکر گئے تھے اور کمال خوبی و خوش اسلوبی سے خدمت بجالائے تھے۔ اس لئے حکیم حاذق کو یہ خدمت سپرد ہوئی۔ وہاں سے آئے تو ۲ سنہ جلوس میں جوہر فصاحت اور مزاجدانی کی قابلیت دیکھ کر عرض مکرر کی۔ خدمت سپرد ہوئی اور درجہ بدرجہ سہ ہزاری منصب پر اعزاز پایا ◆

بدمزاج اور مغرور بہت تھے۔ رعونت اور خود بینی نے دماغ کو عجب بلندی پر پہنچایا۔ جب توران سے پھر کر آئے۔ اور کابل میں آکر ٹھیرے۔ تو میر آلہی ہمدانی کہ خوش فکر سخن پرواز تھے۔ ان کی ملاقات کو گئے صحبت موافق نہ ہوئی۔ انہوں نے یہ رباعی کہہ کر حق صحبت ادا کیا ؎

دائم زادب سنگ و سبو نتواں شد — در دیدۂ اختلاط مو نتواں شد
صحبت بحکیم حاذق از حکمت نیست — بالشکر خبط روبرو نتواں شد

ہر چند فن طب کی تکمیل نہ کی تھی۔ مگر نام کے اعتبار پر اکثر امرا انہیں کا علاج کیا کرتے تھے۔ چند روز شاہجہان کی تاریخ دولت لکھتے رہے۔ جب اور سخن دان ادھر متوجہ ہوئے تو انہوں نے

قلم اُٹھالیا +

شعران کے صاف اور پُر حلاوت ہوتے تھے۔ طرز قدیم پر تازہ ایجادوں کا رنگ دیتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ مگر اپنے تئیں انوری پر فائق سمجھتے تھے۔ دیوان کو بڑے زرق و برق سے آراستہ کیا تھا۔ جب جلسے میں منگاتے تو ملازم کشتی مرصع میں رکھ کر لاتے تھے۔ سب تعظیم کو کھڑے ہو جاتے تھے۔ جو نہ اُٹھتا اس سے ناراض ہوتے تھے۔ کوئی امیر بھی ہوتے تو اس سے بھی ناخوشی ظاہر کرتے تھے سونے کی رحل پر رکھتے تھے۔ اور پڑھ کر سناتے تھے + (مآثر)

پھر ترقی معکوس کی۔ چنانچہ اہل دعا کے لشکر میں ملازم ہو گئے۔ اور ۲۰ ہزار وظیفہ پایا۔ ۱۸ سنہ جلوس میں کوئی ایسا دعا کا تیر لگا کہ ۲۰ کے ۴ ہزار ہو گئے۔ اکبر آباد کے گوشہ عزلت میں گزارہ کرتے تھے۔ مراۃ العالم میں لکھا ہے۔ کہ ۱۰۸۰ھ میں ملک عدم کو نقل مکان کیا +

شعر کا بہت شوق تھا۔ حاذق تخلص کرتے تھے۔ قدما کے قدم بقدم چلتے تھے۔ عمدہ دیوان تیار کیا تھا۔ شاعر شیریں کلام تھے۔ مگر خود پسندی نے بات کو بدمزہ کر دیا تھا +

مرزا سرخوش اپنے تذکرے میں ان کا حال بیان کرتے ہیں جب اشعار پر آتے ہیں تو فرماتے ہیں۔ ایک شعر بہت مشہور ہے۔ وہی سرقہ ہے ؎

دلم بہیچ تسلّی نمے شود حاذق	بہار دیدم و گل دیدم و خزاں دیدم

ساتھ ہی اس کے یہ لکھتے ہیں کہ۔

لطیفہ۔ ملّا شیدا ملاقات کو آئے۔ شعر خوانی ہونے لگی حکیم صاحب نے مطلع فرمایا ؎

بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا	بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا

ملّا پرانے مسخرے تھے مسکرا کر بولے۔ ابھی داڑھی نہ نکلی ہوگی۔ جب یہ شعر کہا ہوگا۔ حکیم صاحب بڑے خفا ہوئے۔ اور ملّا صاحب کو پکڑ کر حوض میں غوطے دلوائے شعر اس طرح پڑھا کرتے تھے کہ معانی کی مورت بن جاتے تھے +

دوم حکیم خوشحال۔ شاہزادہ خورم کے ساتھ پرورش پائی تھی۔ جب وہ شاہجہان ہوئے۔ تو یہ منصب ہزاری کو پہنچے اور فوج دکن کا بخشی کر دیا تھا۔ مہابت خاں جب وہاں کا صوبہ دار ہوا۔ تو ان کے حالات پر عنایت کرتا تھا۔ پھر حال معلوم نہیں مطلب یہ ہے کہ باپ کے رتبے کو ایک نہ پا سکا۔ کاش اولاد کو کمال بھی میراث میں پہنچا کرتا +

حکیم نورالدین قراری

سب سے چھوٹے بھائی شاعر دیوانہ مزاج تھے۔ قراری تخلص کرتے تھے۔ ۹۸۳ھ میں بھائیوں کے ساتھ یہ بھی آئے تھے۔ انہیں دربار اکبری میں نہ فضل و کمال کے اعتبار سے آنے کا حق نہ رتبے کے لحاظ سے۔ اس دربار میں اسی طرح چلے آئے۔ مُلّا صاحب کہتے ہیں کہ شعر خط اور کسب علمی میں انواع فضائل سے آراستہ اور صفت فقر اور انکساری سے متصف تھا۔ صاحب دیوان ہے۔ یہ کہا کرتے تھے کہ حکیم ابوالفتح ہمہ دنیاست و ہمام ہمہ آخرت۔ اسواسطے دونوں سے الگ رہتے تھے۔ (ماثرالامرا)

بادشاہ کا اصل مافی الضمیر یہ تھا۔ کہ ہمارے سب نوکر سب کچھ کر سکیں۔ اس نظر سے اوائل حال میں بھائیوں کے ساتھ بھی خدمت عطا کی۔ یہاں تلوار باندھنی بھی نہ آتی تھی۔ ایک دن آپ چوکی سپرد کرنے وقت ہتھیار باندھ کھڑے ہوئے۔ تلوار بے اسلوب باندھی تھی۔ نوجوانوں میں سے کسی نے ہنس کر ٹوکا۔ آپ نے کہا کہ صاحب ہم مُلّا لوگ ہیں۔ ہمیں سپاہگری سے کیا تعلق ہمیں تو امیر صاحب قِران نے پہچانا تھا (امیر تیمور) اُنہوں نے لڑائی کے موقع پر لشکر جا کر اُتارا۔ ہر ایک سردار اور ہر ایک زمرہ پیادہ اور سوار کے لئے خود مقام تجویز کرتے پھرتے تھے۔ بازار لشکر کو پیچھے جما کر فرمایا کہ بنجارے کے اونٹ اور خچروں کو ان سے بھی پیچھے رکھو۔ اور بیگمات کے خیمے ان کے پیچھے لگاؤ۔ اتنے میں علما بڑے بڑے پگڑ باندھے جبّے اور عبائیں پہنے سامنے سے نمودار ہوئے۔ عرض بیگی نے دور سے دیکھتے ہی کہا کہ حضور ارباب العمایم کے لئے کون سا مکان؟ حضرت نے فرمایا ۔ بیگمات کے پیچھے اور مسکرا کر گھوڑے کو مہمیز کر گئے۔ لوگوں نے یہ لطیفہ اکبر تک بھی پہنچا دیا۔ چونکہ تربیت مدنظر تھی کہا کہ اسے بنگالہ بھیج دو۔ وہاں چند روز رہا مظفر خاں والی بدعملی میں جہاں حکیم ابوالفتح بھاگے۔ بھاگا بھاگ میں خدا جانے کہاں یہ بھی مارے گئے۔ وہ ایک آزاد طرح شہ مزاج شخص معلوم ہوتے ہیں۔ مآثرالامرا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے اکثر مقولے[1] مشہور تھے۔ انہی میں سے ہے (۱) اظہار ہمت خود اظہار طمع است (۲) ملازم بازاری نگہداشتن خود را بہ جوگرفتن است (۳) بر ہر کہ اعتماد کنی معتمد است۔ اس کتاب میں ہے کہ فاضل سخن طراز تھے۔ اور شعر خوب کہتے تھے ۔

---

[1] یہی مقولے صفحہ پر حکیم ابوالفتح کے نام سے لکھے ہیں ان کو میراث میں ملے ہونگے ۱۲۔ محمد باقر

شاہ فتح اللہ شیرازی

تعجب ہے کہ ایسا جلیل القدر فاضل اس کا حال نہ علمائے ایران نے اپنے تذکروں میں لکھا نہ علمائے ہندوستان نے۔ بہت تذکرے دیکھے۔ کہیں نہ پایا۔ ناچار جس طرح کتابوں کے ورق ورق بلکہ سطر سطر دیکھ کر اور امرائے اکبری کے حالات چنے۔ اسی طرح اُن کے حالات بھی پھول پھول بلکہ پتی پتی چن کر ایک گلدستہ سجاتا ہوں۔

سید تھے اور وطن شیراز تھا۔ جب تحصیل سے فارغ ہوئے۔ تو شہرہ کمال کا نور صبح صادق کی طرح عالم میں پھیلا۔ کمال الدین شیروانی اور میر غیاث الدین منصور شیرازی کے شاگرد تھے۔ ملا امین احمد رازی نے ہفت اقلیم میں اتنا زیادہ لکھا ہے۔ ابتدا میں متاعِ دنیا کے خیالات دل پر چھائے تھے ضروریات علمی حاصل کر کے اہل عبادت اور گوشہ نشینوں کی خدمت میں حاضر رہنے لگے۔ اور اکثر **میر شاہ میر مکنہ** کی صحبت کو سعادت سمجھتے تھے۔ اس عرصے میں اہل علم اور صاحبان فضل کی تقریروں پر راغب ہوئے۔ اس لئے درس و تدریس کے حلقے میں داخل ہوئے۔ رفتہ رفتہ خواجہ جمال الدین محمود کے درس میں گئے۔ پہلے ہی دن حاشیہ میر پڑھنے بیٹھے۔ پڑھتے جاتے تھے اور خود بھی تقریر کرتے جاتے تھے۔ اس دن ایسے مطالب دقیق اور معانی لطیف ان سے ادا ہوئے کہ حاضرین حیران رہ گئے۔ اس ملک میں دستور ہے کہ جب شاگرد سبق پڑھ چکتا ہے۔ تو اٹھ کر اپنے اُستاد کی خدمت میں تعظیم و تکریم بجالاتا ہے۔ اُنہوں نے چاہا کہ کھڑے ہو کر لوازم تعظیم ادا کریں۔ خواجہ نے سبقت کر کے خود سینے پر ہاتھ رکھا۔ اور کہا کہ آج تم نے ہمیں مستفیض کیا۔ چنانچہ چند روز میں منتہی ہو کر خود علم کے پیاسوں کو سیراب کرنے لگے۔ پھر دکن میں آ کر والی بیجاپور کے دربار میں منصب وکالت پایا۔ وہ مر گیا تو دربار اکبری میں آئے۔ اور عضد الدولہ خطاب ملا وغیرہ وغیرہ۔

محمد قاسم فرشتہ فرماتے ہیں۔ کہ علی عادل شاہ بیجاپور نے جب ان کے اوصاف سُنے۔ تو ہزار آرزوؤں سے لاکھوں روپے اور خلعت و انعام بھیج کر شیراز سے بلایا۔ بادشاہ مذکور نے امارت کے اعزاز سے رکھا۔ اور خلوت و جلوت میں مصاحبت کے ساتھ رہے۔ ۹۸۸ھ سے ابراہیم عادل شاہ کا دور ہوا۔ اُس نے انہی کی سعی اور تدبیر سے تاج و تخت پایا۔ چنانچہ دربار میں اعزاز و احترام کے ساتھ ارکان دولت میں داخل تھے۔ مگر دل سے خوش نہ تھے۔ اور خوش کیا رہتے۔

وہاں کا حال اگر معلوم نہیں۔ تو سہ نثر ظہوری کو دیکھ لو۔ انتہا ہے۔ کہ حمد ہے تو راگ میں۔ نعت ہے
تو اسی سہاگ میں کتاب ہے۔ تو نورس۔ شہر ہے تو نورسپور۔ باغ ہے تو نورس بہشت۔ خدا
رسول۔ دین ایمان۔ ذہن کی جودت۔ طبعیت کی ایجاد سب اس میں خرچ ہوتے ہیں +

لطیفہ۔ جس طرح ستار۔ تنبورا۔ بین وغیرہ ساز ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک ساز ایجاد کیا تھا۔
اُس کا نام رکھا تھا **موہے خاں**۔ اُس کی بڑی تعظیم تھی۔ درگاہ کی طرح پجتا تھا۔ ہاتھی پر چڑھ
کر عماری میں بیٹھتا تھا۔ ماہی مراتب۔ علم و نقارہ اس کے آگے چلتا تھا۔ غرض کیا دربار کیا محل۔
آٹھ پہر ناچ رنگ گانے بجانے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ ڈوم۔ ڈھارے۔ گایک نایک رسپروائی
اس کی صحبت میں مصاحب تھے۔ شاہ فتح اللہ شیرازی کجا اور یہ باتیں کجا۔ ہندوستان میں اقبال
اکبری کا نشان آفتاب کی طرح چمک رہا تھا۔ علماء کے جلسے اور علوم کے چرچے ہوتے تھے۔
ایرانی اہل کمال آتے تھے اور اعلیٰ رتبے اعزاز کے حاصل کرتے تھے۔ خبریں سُن سُن کر ان کے
دل میں بھی شوق لہریں مارتا تھا۔ مگر آنہ سکتے تھے۔ کیونکہ ایشیائی حکومتوں میں ایسی باتوں کی
روک ٹوک بہت ہوتی تھی۔ اور کبھی کبھی جان سے بھی ضائع کر دیتے تھے۔ اکبر کو جب یہ حال معلوم
ہوا۔ تو اُنہیں فرمان بھیجا۔ ادھر خود ابراہیم عادل شاہ کو لکھا۔ راجہ علی خاں حاکم خاندیس سے بھی تحریک
ہوئی۔ غرض کہ ۹۹۱ھ میں روانہ دربار ہوا۔ اب دیکھئے ملّا صاحب کے غصّے حروف و الفاظ کے
رنگ میں کیونکر پیچ و تاب کھا کر نکلتے ہیں۔ اور غصّہ بجا ہے۔ غیر ملک کا عالم اس طرح بڑھ جائے
اور چڑھ جائے اور ہم وہی ملّا کے ملّا۔ مگر اُن کے واقعہ نگاری کو ہزار آفرین ہے۔ کہ میر موصوف کے
علم و فضل سے انکار نہ کیا۔ البتہ اس پر خاک خوب ڈالی۔ خیر فرماتے ہیں +

ربیع الاوّل ۹۹۰ھ میں سیادت پناہ میر فتح اللہ شیرازی کہ وادی الٰہیات ریاضت۔
طبیعات اور کل اقسام علوم عقلی و نقلی اور طلسمات و نیرنجات و جر اثقال میں اپنا نظیر زمانے میں
نہیں رکھتا۔ فرمان طلب کے بموجب عادل خاں دکنی کے پاس سے فتح پور میں پہنچا۔ خان خاناں
اور حکیم ابو الفتح حسب الحکم استقبال کے لئے گئے۔ اور لاکر ملازمت کروائی۔ **صدارت کے
منصب** پر کہ سیاہ نویسی سے زیادہ بات نہیں ہے۔ (گویا کچھ بڑی بات نہیں) اعزاز پایا
تاکہ غریبوں کی زمینیں کاٹے نہ کہ دیوے۔ اور پرگنہ بساور بے داغ و محلی جاگیر میں ملا۔ سُن چکے
تھے کہ میر غیاث الدین منصور شیرازی کا بے واسطہ شاگرد ہے۔ وہ نماز اور عبادت کے چنداں
مقید نہ تھے۔ اس لئے خیال تھا۔ کہ مذہبی باتوں میں ہمارے ساتھ ہو جائیگا۔ مگر اس نے اپنے

مذہب کے میدان میں استقلال دکھایا۔ باوجود حُب جاہ اور دنیاداری کے تعصب مذہب کے نکتوں سے ایک دقیقہ نہ چھوڑا۔ عین دیوان خانہ خاص میں جہاں کسی کی مجال نہ تھی۔ کہ علانیہ نماز پڑھ سکے وہ بہ فراغ بال وجمعیت خاطر باجماعت مذہب امامیہ کی نماز پڑھتا تھا۔ چنانچہ یہ بات سن کر زمرۂ اصحاب تقلید سے گننے لگے۔ اور اس معاملے سے چشم پوشی کر کے علم و حکمت اور تدبیر اور مصلحت کی رعایت سے پرورش میں ایک دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مظفرخاں کی چھوٹی بیٹی سے اسکی شادی کر کے اپنا ہمزلف بنایا۔ اور منصب وزارت میں راجہ ٹوڈرمل کے ساتھ شریک کیا۔ وہ راجہ کے ساتھ خوب دلیری سے کام کرنے لگا۔ مگر دار و مدار کے ساتھ کرتا تھا۔

آزاد۔ ملا صاحب خفا ہوتے ہیں کہ مظفرخاں ادھر شاہ منصور کی طرح راجہ سے کیوں لڑتے جھگڑتے نہ رہے۔ اور یہ اس مدرسے کے مدرس نہ تھے۔ جہاں اپنی رائے اور تجویز اتنا ہی اختیار دیتی ہے کہ سلامت روی اور صلاحیت کے ورق کو ہوا بھی حرکت نہ دے۔ پھر فرماتے ہیں امرا کے لڑکوں کی تعلیم کی پابندی اختیار کی تھی۔ ان کے گھروں پر روز جاتا تھا۔ سب سے پہلے حکیم ابوالفتح کے غلام کو کبھی شیخ ابوالفضل کے بیٹے کو اور اور امیرزادوں کو سات آٹھ برس کے بلکہ ان سے بھی چھوٹے چھوٹوں کو میاں جی بن کر پڑھاتا تھا۔ اور لفظ اور خط اور دائرہ ابجد بلکہ ابجد بھی سکھاتا تھا

مشت اطفال نو تعلیم را	لوح ادبار در بغل منہید
مرکبے راکہ زادۂ عرب است	داغ یونانش برکفل منہید

لاحول ولاقوۃ ایسے مشتبہ الفاظ کے شعر اس موقع پر افسوس۔ افسوس۔

اور کندھے پر بند دق۔ کیسہ دارو کمر سے باندھ کر قاصدوں کی طرح جنگل میں سواری کے ساتھ دوڑتا تھا۔ غرض جس علم کی شان جا چکی تھی۔ اُسے خاک میں ملادیا۔ اور باوجود ان سب باتوں کے اپنے اعتقاد کے استقلال میں وہ پہلوانی کی کہ کوئی رستم نہ کریگا۔ آنے کی تاریخ ہوئی۔ ع

شاہ فتح اللہ امام اولیاء

ایک شب اس کے سامنے بیربر سے کہہ رہے تھے۔ یہ بات عقل کیونکر مان لے۔ کہ کوئی شخص ایک پلک مارتے۔ باوجود اس گرانی جسم کے بستر سے آسمان پر جائے۔ اور نوے ہزار باتیں گومگو خدا سے کرے۔ اور بستر ابھی گرم ہو کہ پھر آئے۔ اور لوگ اس دعوے کو مان لیں۔ اسی طرح شق قمر وغیرہ ایک پاؤں اٹھا کر سب کو دکھاتے۔ تھے اور کہتے تھے۔ ممکن نہیں کہ جب تک ایک پاؤں کا سہارا نہ رہے ہم کھڑے رہ سکیں۔ یہ کیا بات ہے؟ وہ اور بدبخت گمنام آمنّا و صدقنا کے

دم بھرتے تھے۔ اور تائید کر کے تقویت دیتے تھے۔ مگر شاہ فتح اللہ باوجودیکہ بادشاہ دم بدم اس کی طرف دیکھتے تھے۔ اور مطلب بھی اسی سے تھا۔ کہ نیا آیا ہوا تھا۔ اور اُسے پھانسنا منظور تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ چپ سُنے جاتا تھا۔ ایک حرف نہ بولتا تھا۔ دربار اکبری کے دیکھنے والے ان کے حال سے اُس عقیدت اور خدمت گزاری کا سبق پڑھیں۔ جس سے باوجود نئی ملازمت کے عظمت اور اعتباروں میں کسی پرانے نمک خوار سے پیچھے نہ رہے۔

۹۹۳ھ میں عضد الدولہ میر فتح اللہ امین الملک ہو گئے۔ حکم ہوا کہ راجہ ٹوڈرمل مشرف دیوان کل مہمات مالی و ملکی ان کی صلاح و صواب دید سے فیصل کیا کریں۔ شاہ موصوف کو یہ بھی حکم دیا کہ مظفر خاں کے عہد دیوانی کے بہت سے معاملے ملتوی پڑے ہیں۔ انہیں فیصلہ کر کے آگے کے لئے رستہ صاف کر دو۔ اور جو باتیں قابل اصلاح معلوم ہوں۔ عرض کرو۔ انہوں نے مثلہائے مقدمات کو نظر غور سے دیکھا۔ نہ دفتر و اہل دفتر کی رعایت کی۔ نہ اہل مقدمہ کا لحاظ کیا۔ دونوں سے بے لگاؤ ہو کر امور اصلاح طلب کی ایک فہرست تیار کی۔ اور آسانی کے لئے اپنی رائے بھی لکھی۔ وہ دفتری جھگڑے تحصیل مالی۔ تنخواہ سپاہی اور مقدمات دیوانی کے جنجال ہیں۔ دربار اکبری میں سجانے کے قابل نہیں۔ آزاد انہیں یہاں نہیں لاتا۔ اتنا ضرور ہے کہ نکتہ رسی کی کھال اُتاری ہے۔ اور خیر اندیشی کا تیل نکالا ہے۔ جو کچھ اُنہوں نے لکھا تھا۔ حرف بحرف منظور ہوا۔ اور کاغذ مذکور اکبر نامے میں داخل ہوا۔

اسی سنہ میں تسخیر دکن کا ارادہ ہوا۔ خان اعظم کو کلتاش خاں کو سپہ سالار کیا۔ اور امرائے عظام کو لشکر و افواج کے ساتھ ادھر روانہ کیا۔ شاہ فتح اللہ مدت تک اس ملک میں رہے تھے۔ اور ایک بادشاہ کے مصاحب خاص ہو کر رہے تھے۔ اس لئے صدارت کل ہندوستان کی اُن کے نام ہو گئی۔ پانچ ہزار روپے۔ گھوڑا اور خلعت عطا فرما کر اعزاز بڑھایا۔ اور حکم دیا۔ کہ اس مہم میں جائیں۔ اور امرا میں اس طرح ہوں جیسے نو لکھے ہار میں بیچ کا آویزہ۔ ملا صاحب لکھتے لکھتے خفا ہو کر کہتے ہیں۔ کمالائے شیرازی اس کے نوکر کو اس کی نیابت پر رکھ لیا۔ کہ آئمہ مساجد جو خال خال مقطوع الاراضی رہ گئے ہیں۔ ان کا بھی کام تمام کر دے۔ اب صدارت کمال کو پہنچی۔ رفتہ رفتہ یہ ہو گیا۔ کہ شاہ فتح اللہ اس اختیار اور جاہ و جلال پر پانچ بیگھہ زمین کے دینے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ بڑی بڑی زمینیں ضبط کرنے میں کفایت سرکار سمجھتا تھا۔ وہ زمینیں بھی ویران ہو کر ویسے ہی دام و دد کا مسکن ہو گئیں۔ نہ ان اماموں کی

ہوئیں۔ نہ رعیت کی۔ ان کی مظلمی صدروں کے نامۂ عمل میں رہ گئی۔ اور اُن کا بھی نشان نہ رہا ۔

	از صد دو عظام باقی نیست		در دل خاک جز عظام صدور	

دکن کی داستان طویل ہے۔ مختصر کیفیت یہ ہے۔ کہ راجی علی خاں خاندلیس کا پرانا فرمان روا تھا۔ اور فوج و خزانہ عقل و تدبیر اور بندوبست ملکی سے ایسا چُست و درست تھا کہ تمام دکن اس کی آواز پر کان لگائے رہتا تھا۔ اور وہ سلاطین و امرائیں دکن کی کنجی کہلاتا تھا۔ شاہ فتح اللہ بھی اس ملک میں رہ کر آئے تھے۔ اور علاوہ علم و فضل کے امور ملکی میں قدرتی مہارت رکھتے تھے۔ اور حکام و امرا سے ہر طرح کی رسائی حاصل تھی۔ اکبر نے خان اعظم کو سپہ سالار کیا۔ بہت سے امرا صاحب طبل و علم با فوج و لشکر ساتھ کئے۔ میر موصوف کو ہمراہ کیا۔ کہ ہو سکے تو راجی علی خاں کو لے آئیں۔ یا راہ اطاعت پر لائیں۔ اور اس کے علاوہ اور امرائے سرحدی کو بھی موافقت پر مائل کریں۔ لیکن خان اعظم کی بے تدبیری اور سینہ زوری سے مہم بگڑ گئی۔ (دیکھو ان کا حال) شاہ فتح اللہ کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ بڑی بات یہ ہوئی۔ کہ ناچاری اور ناکامی کے کارواں میں شامل ہو کر خان خاناں کے پاس چلے آئے۔ احمد آباد گجرات میں بیٹھے اور اطراف و جوانب میں کاغذ کے گھوڑے دوڑانے لگے مطلب یہ تھا کہ جو کام خان اعظم کو ساتھ لیکر کرنا تھا۔ وہ ہم خاں خاناں کو لے کر کرینگے۔ اور عجب نہ تھا کہ وہ اس راہ میں منزل کو پہنچتے ✦

۹۹۳ھ میں اکبر نے توران کو ایلچی بھیج کر ادھر سے خاطر جمع کی۔ اور احتیاطاً لاہور میں ٹھیرا ساتھ ہی کشمیر پر مہم شروع ہو گئی۔ اس وقت اہل مشورہ میں یہ نکتہ تنقیح طلب تھا۔ کہ توران پر مہم کی جائے یا نہیں۔ مگر اصل میں معاملہ قندھار کا تھا۔ کہ اس پر فوج کشی کریں یا نہیں۔ اور کریں تو بھکر اور سندھ کو فتح کر کے آگے بڑھنا چاہیے۔ یا اسے کنارے چھوڑیں اور قندھار پر چڑھ جائیں۔ چنانچہ خان خاناں اور شاہ فتح اللہ کو بلا بھیجا۔ کہ اُن کی رائے پر بڑا بھروسہ تھا۔ وہ اونٹ اور گھوڑوں کی ڈاک بٹھا کر دوڑے۔ اور مہینوں کی منزلیں پندرہ دن میں لپیٹ کر لاہور میں آن داخل ہوئے۔ پھر انہیں دربار سے جدا کیا ✦

۹۹۷ھ کے حالات میں ملا صاحب فرماتے ہیں کہ جو راماین کا ترجمہ کر رہا تھا۔ ایک دن (بادشاہ نے) اس کا خیال کر کے حکیم ابو الفتح سے فرمایا۔ کہ یہ شال خاصہ اسے دے دو۔ کہ دو کہ گھوڑا اور خرچ بھی ملیگا۔ شاہ فتح اللہ عضد الدولہ کو حکم ہوا۔ کہ بساور درو لبست تمہاری جاگیر رہی۔ آئمہ مساجد کی جاگیریں بھی تمہیں عنایت ہوئیں۔ اور میرا نام لے کر فرمایا۔ کہ اس بداؤنی

جوان کی مدد معاش ہم نے بساور سے بداؤں کو منتقل کر دی۔ شاہ فتح اللہ نے ہزار روپے کے قریب تھیلی میں پیش کئے۔ (اصل بات یہ تھی کہ) اُس کے شق دار (تحصیل دار) نے بطور تغلب کے بیواؤں اور یتیمان نامراد کے حق میں سے پرگنہ بساور میں ظلم و تعدی سے بچائے تھے۔ تہمت یہ کہ آئمہ حاضر نہیں۔ شاہ نے (مضمون رنگارنگ بدل کر) کہا۔ کہ میرے عاملوں نے آئمہ کے حساب میں یہ روپیہ بطور کفایت نکالا ہے۔ فرمایا۔ بشما بخشیدم۔ غرض شاہ نے مجھے فرمان درست کر کے دے دیا۔ اور تین مہینے نہ گزرے تھے کہ شاہ گزر گئے +

۹۹۷ھ میں بادشاہ کے ہمرکاب کشمیر کو گئے۔ اور جاتے ہی بیمار ہوئے۔ رفتہ رفتہ بیماری نے طول کھینچا۔ ان کی خلوص و وفاداری اور فضائل و کمالات اور اکبر کی محبت و مرحمت کا وزن اکبر نامے کی عبارت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ شیخ لکھتے ہیں۔ کہ بادشاہ خود عیادت کو گئے۔ اور بہت تسلی اور دلداری کی۔ چاہتے تھے کہ ساتھ لے کر چلیں۔ مگر ضعف قوی ہو گیا تھا۔ اس لئے خود کابل کو روانہ ہوئے۔ حکیم علی کی رائے میں خطا معلوم ہوئی۔ اس لئے حکیم حسن کو اُن کے پاس چھوڑ آئے۔ اثنائے راہ میں حکیم مصری کو بھی بھیجا۔ کہ معالجے میں رائے شامل کریں۔ افسوس کہ اُن کے پہنچنے سے پہلے ملک بقا کو روانہ ہو گئے۔ بادشاہ کو بہت رنج ہوا۔ اور زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ کہ میر ہمارے وکیل تھے۔ طبیب تھے۔ منجم تھے۔ جو ہمارے دل کو صدمہ ہوا ہم ہی جانتے ہیں۔ اس درد کا وزن کون کر سکتا ہے اگر اہل فرنگ کے ہاتھ میں میر پڑ جاتے اور وہ قدر ناشناس اس کے عوض میں تمام خزائن بارگاہ سلطنت کے مانگتے تو ہم بڑی آرزو سے سودا کر لیتے۔ کہ بڑا نفع کمایا۔ اور جواہر بے بہا بہت ارزاں خریدا۔ یہ حیران انجمن ہستی (بندہ ابوالفضل) سمجھا ہوا تھا۔ کہ عقل تعلیمی کا کارواں لٹ کر رستہ بالکل بند ہو گیا ہے۔ اس معنوی بزرگ کو دیکھ کر رائے بدلی تھی۔ اس سرمایہ علم پر راستی۔ و درستی۔ معاملہ دانی میں گوہر نایاب تھا۔ حکم ہوا کہ سید علی ہمدانی کی خانقاہ سے اُٹھا کر کوہ سلیمان کے دامن میں سلا دو۔ کہ دل کشا مقام ہے۔ ان دنوں میں بعض اُمرا کو امورات سلطنت کے باب میں جو فرمان جاری ہوئے ہیں۔ ان میں بھی شاہ کے مرنے کا حال بہت افسوس کے ساتھ لکھوایا ہے +

ملا صاحب نے جس طرح ان کے مرنے کا حال لکھا ہے۔ میں اسے پڑھ کر سوچتا رہ گیا

کہ ایسے صاحب کمال کے مرنے کا افسوس کروں۔ یا ملّا صاحب کی بے دردی کا ماتم کروں۔ جس خیال سے انہوں نے اس واقعہ کو لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ان دنوں میں علامۂ عصر شاہ فتح اللہ شیرازی نے کشمیر میں تپ محرق پیدا کی۔ خود طبیب حاذق تھا۔ علاج یہ کیا کہ ہریسہ کھایا ہر چند حکیم علی منع کرتا تھا۔ مانتا نہ تھا۔ آخر اجل کا منتقاضی گریبان پکڑ کر کھینچتا کھینچتا دار البقا کو لے گیا۔ تخت سلیمان میں کہ شہر کشمیر کے پاس ہی ایک پہاڑ ہے۔ سید عبد اللہ خاں چوگان بیگی کی قبر کے پاس دفن ہوا۔ تاریخ ہوئی۔ **فرشتہ بود**۔ خیر گزر گئی۔ کہ گول مول عبارت میں غصہ نکل گیا۔ ملا احمد اور میر شریف املی کو اور جہاں کوئی ان کے پالے پڑ گیا ہے۔ وہ صلواتیں سنائی ہیں۔ کہ خدا کی پناہ۔ فحش کے مشاہدے کی گواہی دے گئے ہیں۔ اُن کی تیز طبیعت کا یہ عالم ہے کہ شیعہ کا نام سنتے ہی غصہ آجاتا ہے۔ شکر یہ بجالاؤ۔ کہ فضائل علمی اور اوصاف و کمالات کو خاک سیاہ نہ کر دیا۔ خیر تھوڑی خاک ڈال دی۔ اس کا تمہیں بھی خیال نہ کرنا چاہیئے۔ جو کچھ عنایت ہوئی۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ میر علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ اس نے ملّا صاحب کے علم دوست دل میں محبت کو گرمایا۔ اور شیعہ بھی تھے۔ مگر جہاں جہاں ان کا ذکر آیا ہے۔ اس سے بے تہذیبی یا کسی غیر مذہب کے باب میں بدکلامی نہیں پائی گئی۔ اپنے مذہب کو علم و فضل کی شاہی لئے آہستگی و شائستگی کے ساتھ نکل گئے۔ اس لئے باانصاف مؤرخ کا قلم بھی بدی کے الفاظ کو لے گیا۔ میرے شیعہ بھائی سلامت روی اور اہلبیت کا رستہ ان لوگوں سے سیکھیں۔ لیکن ملّا صاحب بھی زبردست ملّا ہیں۔ جرم تشیع کی کچھ نہ کچھ سزا ضرور دینی چاہیئے تھی۔ یہی کہہ دیا۔ کہ اتنا بڑا عالم ہو کر بادشاہ کے ساتھ شکار میں دوڑتا پھرتا ہے۔ امرا کے گھر جا کر ان کے لڑکوں کو پڑھاتا ہے۔ شاگردوں کو پڑھاتا ہے۔ تو بُرا بھلا کہتا جاتا ہے کوئی شاگرد صاحب کمال اس کے دامن سے پل کر نہیں نکلا۔ اچھا حضرت یہ بھی غنیمت ہے ۔ ع

	رکھتے فقیر کام نہیں رد و کد سے ہیں		دو گالیاں کہ بوسہ۔ خوشی پر ہے آپ کی	

صرفی ساوجی نے ان کے رنج کو حکیم ابو الفتح کے غم سے ترکیب دے کر عمدہ مادہ تاریخ کا نکالا ہے ۔ ع

	رفتند و مؤخر و مقدم رفتند		امروز دو علامہ ز عالم رفتند
	تاریخ بشد کہ ہر دو باہم رفتند		چوں ہر دو موافقت نمودند بہم

بزرگان باخبر سے معلوم ہوا ہے۔ کہ شاہ مرحوم کاغذات پر جو دستخط کرتے تھے تو فقط فتحی یا فتحی شیرازی لکھا کرتے تھے۔ فتح سے اختصار منظور تھا یا تخلّص ہو گا۔ شاید شعر بھی کہتے ہونگے مگر کوئی شعر آنکھوں یا کانوں سے نہیں گزرا +

ذات کا حال بس اتنا ہی معلوم ہے۔ کہ سیّد تھے۔ ملّا صاحب نے بھی اتنا ہی لکھا۔ کہ "سادات شیراز سے تھے۔" نہ معلوم ہوا کہ کس امام کی اولاد میں سے تھے۔ اور کس خاندان سے منسوب تھے۔ اور عمر کیا پائی۔ پہلے شاہ فتح اللہ مشہور تھے۔ **اکبر میر فتح اللہ کہنے لگا۔** اس لئے تھوڑے مؤرخ میر فتح اللہ لکھتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کا سلسلہ شیخ ابو الفضل اکبر نامہ میں لکھتے ہیں۔ کہ خواجہ جمال الدین محمود۔ مولانا کمال الدین شروانی۔ مولانا احمد کرد سے بہت علم حاصل کیا۔ مگر عقل و فہم کو ان سے بہت اُونچے درجے پر جا رکھا۔ ملّا صاحب نے مولانا غیاث الدین کا شاگرد لکھ کر جو کچھ کہا دیکھ ہی لیا۔ اور پھر زمرۂ علماء میں درج کر کے فرماتے ہیں۔ اعلم علمائے زمان، مدتوں حکام و اکابر فارس کا پیشوا رہا۔ تمام علوم عقلی و نقلی حکمت۔ ہیئت۔ ہندسہ نجوم۔ رمل۔ حساب۔ طلسمات۔ نیرنجات۔ جر اثقال خوب جانتا تھا۔ اس فن میں وہ رتبہ رکھتا تھا۔ کہ اگر بادشاہ متوجہ ہوتے تو رصد باندھ سکتا تھا۔ (خصوصاً کلوں کے کام میں خوب ذہن لگتا تھا) علوم عربیہ اور حدیث و تفسیر میں بھی نسبت سادات تھی۔ اور خوب خوب تصنیفات کی تھیں۔ مگر ملّا مرزا جان[1] شیرازی کے برابر نہیں۔ جو ماوراء النہر میں مدرس یکتا پرہیزگار یگانۂ روزگار ہے۔ میر فتح اللہ اگرچہ مجلسوں میں نہایت خلیق۔ متواضع۔ نیک نفس تھا۔ مگر اس ساعت سے خدا کی پناہ ہے۔ کہ جب پڑھا رہا ہو۔ فحش الفاظ رکیک اور ہجو کے سوا شاگردوں کے لئے کوئی بات زبان پر آتی ہی نہ تھی۔ اسی واسطے لوگ اس کے درس میں کم جاتے تھے۔ اور کوئی شاگرد رشید بھی اُس کے دامن سے نہ اُٹھا۔ چند روز دکن میں رہا۔ عادل خاں وہاں کے حاکم کو میر سے عقیدت تھی۔ ملازمت بادشاہی میں آیا۔ تو عضد الملک خطاب پایا۔ کشمیر میں ۹۹۷ھ میں مر گیا +

[1] ملّا صاحب کی قدر دانی پر قربان جایئے۔ ملّا مرزا جان کو آنکھوں سے دیکھا نہیں۔ کانوں سے بات سُنی تھی۔ نمبر لگا دیا انہیں تو شاہ فتح اللہ بیچارے کا گرانا تھا۔ ورنہ لکھنے کی ضرورت کیا تھی۔ مگر وجہ ترجیح کی بے اختیار قلم سے ٹپک گئی یعنی پرہیزگاری۔ مگر یہ بھی یاد رہے۔ وہ یہاں آئے نہیں۔ آتے تو ان سے کئی حصے زیادہ ان کا خاکہ اُڑاتے۔ میں نے کتابوں میں ان کے حالات بھی پڑھے ہیں۔ خدا آزاد کے قلم سے کسی کا پردہ فاش نہ کرے +

آپ کی فضیلت وقابلیت کا نمبر ملّا صاحب نے یہ لگایا ہے۔ شیخ ابو الفضل نے وہ فقرہ لکھا ہے۔ اور پھر ایک مقام پر اس سے بڑھ کر لکھا۔ اگر علوم عقلی کی پرانی کتابیں نابودی کی رونق پر جائیں۔ تو نئی بنیاد رکھ دیتے۔ اور جو جو کچھ گیا اُس کی پروانہ کرتے۔ جوہر عالی تھا۔ اور عالی ذات تھے یا وہ حکمت رچی بچی ہوئی تھی۔ اور عقل مروجہ نے حق تلاشی کی آنکھ پر پردہ نہ ڈالا تھا۔ محمد شریف معتمد خاں بھی اقبال نامہ میں لکھتے ہیں علمائے متاخرین میں میر فتح اللہ اور ملّا مرزا جان کے برابر کوئی نہیں ہوا۔ مگر میر کی تیزی فہم اور قوت ادراک ملّا پر فائق تھی۔ اگر آج تینوں صاحب موجود ہوتے۔ تو آمنے سامنے بٹھا کر باتیں سنتے اور تماشا دیکھتے ۔

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے

مگر ملّا صاحب کے سامنے کس کا منہ تھا جو بول سکتا۔ سب طرف سے بند ہوتے تو کافر ہی بنا کر اُڑا دیتے۔ یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ ہر فن میں شاہ کی اچھی اچھی تصنیفات تھیں۔ مگر افسوس کہ آج کچھ بھی نہیں ملتا۔ جو ہے وہ سند ہے ۔

ایک رسالہ حالات کشمیر و عجائبات کشمیر میں لکھا تھا۔ وہ حسب الحکم اکبر نامہ میں داخل ہوا ۔

خلاصۃ المنہج ۔ ایک مشہور تفسیر فارسی زبان میں ہے۔ ملّا فتح اللہ کی تفسیر کہلاتی ہے ۔

منہج الصادقین ۔ ایک مفصّل و مبسوط تفسیر کمیاب بلکہ ہند میں نایاب ہے **شیخ ابو الفضل** نے اکبر نامہ میں مجملاً اتنا لکھا ہے۔ کہ علوم و فنون میں مفید تصنیفیں لکھی تھیں اور ایک تفسیر بھی مفصّل لکھی تھی ۔

تاریخ الفی کی تالیف میں بھی شامل کئے گئے۔ اور سال دوم کی تحریر ان کے سپرد ہوئی۔ (دیکھو ملّا صاحب کا حال)

زیچ جدید ۔ تاریخ الٰہی اکبر شاہی کا ایک حصّہ ان کی زیر نگرانی لکھا گیا۔ دیکھو آئین اکبری ۔

علمی یا دفتری اصلاحیں جو ان کی رائے سے روشن ہوئیں ان میں سے :-

(۱) سنہ الٰہی اکبر شاہی کو سال و ماہ اور ایام کی کمی بیشی کا حساب کرکے تاریخ قرار دی یہ تبدیلی ۹۹۲ھ میں واقع ہوئی۔ مگر اُس عہد کی کل تصنیفیں اور بادشاہی تحریریں اسی کی بنیاد پر ہیں۔ اور اسے مبارک سمجھ کر خاندان چغتائی کے تخت نشین اکثر اس کی پابندی کرتے رہے ۔

(۲) اکبر کے زائچہ پر نظر ثانی کی۔ اور یونانی اور ہندی پر اس میں جو اختلاف تھا اس کا سبب

نکال کر دونوں میں مطابقت ثابت کی +

(۳) دفتر مال اور دیوانی میں سب ایجادوں یا اصلاحوں کے پھول لوگوں نے راجہ ٹوڈرمل کی دستار پر سجائے ان میں کچھ پنکھڑیاں ان کا بھی حق ہے۔ ابوالفضل کی عبارت پر خیال کرو جو شخص حکمت یونان کا نظام نیا باندھ سکتا ہو۔ جب دفتر حساب اور معاملات و مقدمات پر متوجہ ہو جائے۔ تو کونسا پیچ ہو گا کہ اس سے رہ جائیگا۔ اور اس میں جو نکتہ وہ عالی طبع نکالیگا کیسا برجستہ ہو گا۔ آئین اکبری کا جزوِ اعظم ہو گا +

(۴) ان کی ایجادوں کا طلسمات دیکھنا چاہو سنہ کے نوروز کا مینا بازار جا کر دیکھو۔ تمام اُمرا نے اپنے اپنے شکوہ و شان کی دکانیں سجائی ہیں۔ میر موصوف سامان مذکور کے ساتھ اپنی طبع رسا کی نمائش گاہ ترتیب دئے بیٹھے ہیں +

(۱) **بادِ آسیا**۔ یعنی ہوا کی چکی چل رہی ہے +

(۲) **آئینۂ حیرت**۔ نزدیک و دُور کے عجائب غرائب تماشے دکھارہا ہے +

(۳) **جرِ اثقال** کے اوزار چرخیاں۔ پیئے برابر چکر لگا رہے ہیں +

(۴) **علمِ نیرنجات** کیمیائی ترکیبوں سے جادو کر رہا ہے +

(۵) **توپ** ہے کہ تخت پر چڑھی ہے۔ جنسی (قلعہ شکن) توپ ہے۔ پہاڑ سامنے آ جائے۔ تو چوڑیوں کی طرح حلقہ حلقہ الگ ہاتھوں ہاتھ اُٹھا کر چڑھ جاؤ +

(۶) **بندوق** ہے کہ ایک فیر میں ۱۲ گولیاں مارتی ہے +

مُلّا صاحب ان پر بہت خفا ہیں۔ کہ بادشاہی مصاحبت اور خوشامدوں میں علم کی شان کو بٹّا لگایا۔ یہ اعتراض بیجا نہیں۔ البتہ مکدر الفاظ اور غلیظ عبارت میں ادا ہوا۔ کیونکہ جس دل سے نکلا تھا۔ وہ بھی مکدر تھا۔ ملّا صاحب تو یہ چاہتے ہیں۔ کہ جو صاحب علم ہو۔ تارک الدنیا جُبّہ پہنے۔ مُصلّا بچھائے۔ تسبیح لئے خانقاہ میں خلوت نشین ہو۔ مریدوں میں نکل کر بیٹھے تو مثنوی شریف کا درس کہے اور زار زار روئے۔ کشف و کرامات کا دعویٰ نہ ہو۔ یہ لوگ وہ کہ یونان حکمت میں جائیں۔ تو اس طور سے سمجھیں اور سمجھائیں منقولات میں دیکھو تو مفسّر محدّث۔ مجتہد یہ سمجھ گئے تھے کہ قوم ڈوبی جاتی ہے۔ بادشاہ بے علم ہے۔ اور بے قوت ہے۔ ہم اس کے دست و بازو بن کر شاملِ حال نہ ہونگے تو ملک کو ڈبو دینگے اور نہ فقط دنیا بلکہ دین بھی ڈوب جائیگا۔ اس لئے اپنے آرام اور ہر طرح کے ذوق و شوق کو اُس کی خدمت اور مصلحت اور

حق نمک پر فدا کر دیا تھا۔ اور بادشاہ بھی اکبر بادشاہ جیسا قدردان اور چاہنے والا ✦

محبت است کہ دل را نمے دہد آرام	وگرنہ کیست کہ آسودگی نمے خواہد

طبعیتیں ایسی شگفتہ لائے تھے۔ کہ جس رنگ میں جا ملیں ویسے ہی ہو جائیں جس خیال میں اپنے آقا کو خوش دیکھتے تھے۔ اسی کے پُتلے بن جاتے تھے میرے دوستو! بھلا مچھلی دریا کے بغیر جی سکتی ہے؟ کبھی نہیں۔ ایسے عالم تصنیف و تالیف اور درس و تدریس بغیر خوش رہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ لیکن کیا کریں کہ مصلحتِ وقت سے مجبور تھے۔ بحر العلوم مولانا عبد العلی سے کسی نے کہا کہ آپ حج کو کیوں نہیں جاتے۔ فرمایا۔ جو فیض ہماری ذات سے یہاں رہنے میں پہنچتے ہیں وہ بند ہو جائینگے۔ اور اُن کا ثواب حج سے زیادہ ہے۔ غرض ۹۹۱ھ میں آئے اور ۹۹۷ھ میں چلے گئے ✦

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے	اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

۷ برس ہندوستان کی سیر کی اور اپنے کمالات کی بہاریں عالم کو دکھا گئے۔ فی الحقیقت مدتِ خدمت بہت کم تھی۔ مگر تاریخی بیان اور خود اکبر کی زبان کے جو الفاظ ہیں۔ ان پر خیال کرو معلوم ہوتا ہے کہ اعتبار اور محبت میں جو مصاحب خاص اور عمروں کے جاں نثار تھے۔ ان میں ان کا نمبر کسی سے نیچے نہ تھا۔ یہ خلاصہ روزگار **ابوالفضل۔ فیضی۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام** تھے۔ اور **بیربر** کا تو کیا کہنا ہے۔ وہ تو بادشاہ کی جان لگی۔ بلکہ زندگی کا کھلونا تھا۔ **ٹوڈرامل** نے کارگزاری و مزاج شناسی سے اعتبار کے ساتھ دل میں گھر کیا تھا۔ **عبدالرحیم خانخاناں** پہلے انہی چاروں میں پانچویں سوار تھے۔ اور **مان سنگھ** چھٹے۔ پھر مہمات ملکی کے ہیر پھیر میں آکر دُور جا پڑے۔ **کوکلتاش خاں** دودھ کے زور سے ہر مقام پر جگہ لیتے تھے۔ اور اکبر بھی چاہتا تھا۔ کہ یہ ویسے ہی ہوں۔ مگر ان کی بے دماغی۔ بلند نظری۔ خود پسندی اور دعوے دار زبان ایسی تھی۔ کہ ان لوگوں میں نہ رہ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ فتوحات کی ہوائیں اُڑا کر کہیں کے کہیں جا پڑے۔ **میر فتح اللہ** نے اپنی لیاقت اور مزاج داتی اور آداب و نیاز اور خالص وفاداری سے اوّل کے چار نمبروں میں جگہ لی۔ یہ اشخاص اکبر کی جزو زندگی ہو گئے تھے۔ اور ان کا یہ حال تھا۔ کہ باوجود فضل و کمال کے اپنی طبیعت کی خواہش اور ہر طرح کے ذوق و شوق کو اُس کی خدمت گزاری اور مصالح ملکی اور دل کی خوشی پر فدا کر بیٹھے تھے ✦

ایک باریک نکتہ اس میں یہ ہے کہ مدت دراز سے چند عالموں نے شریعت کے زور سے

سلطنت کی گردن کو دبا رکھا تھا۔ یہ لوگ گویا گھر کے غنیم تھے۔ اور ان کا توڑنا سب سے مہم عظیم۔ اُن کا زور فوج و لشکر کے بس کا نہ تھا۔ اگر ٹوٹ سکتے تھے تو اپنے وفاداروں کی تدبیر عقلی اور دلائل علمی کی فوج انہیں توڑ سکتی تھی۔ چنانچہ کچھ قدرتی اتفاقات نے کچھ ان لوگوں کی تدبیروں نے توڑ پھوڑ کر ستیاناس کر دیا۔

یہ لوگ اپنی لیاقت اور خدمت کے سوا کسی کو رفیق نہ پاتے تھے۔ اس لئے جان توڑ کر لپٹ جاتے تھے۔ اور سچے اخلاص و نیاز سے خدمت بجالاتے تھے۔ ان کے وطن کی غربت اور قاضیان دربار کے ساتھ جو مذہب کا اختلاف تھا۔ وہ بادشاہ کے سامنے تائید کرتا تھا۔ کہ غنیموں سے مل کے سازش نہ کرینگے۔ اور یہ خاص ان کی ذات سے وابستہ ہیں۔ اور ایرانی اُمرا سے کوئی بیوفائی بھی ظاہر نہ ہوئی تھی۔ بلکہ حق پوچھو تو جو خرابی ہوئی نمک موروثی کے نمک خواروں سے ہوئی۔ بیرم خاں اور خان زمان سے جو کچھ ہوا وہ ظاہر ہے۔ لڑنے والوں نے خواہ مخواہ لڑا دیا۔ اہل ایران نے کوئی مرتبہ جاں نثاری کا نہ چھوڑا تھا۔ اس لئے اکبر ان لوگوں کو عزیز رکھتا تھا۔ اور پورا اعتبار تھا۔ بلکہ اس لطف کی محبت ان کے ساتھ رکھتا تھا۔ کہ الفاظ و عبارت اس کی کیفیت ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ اس پھول کی مہک کا ایک نمونہ دکھاتا ہوں۔ ذرا خیال کرو۔ کہ قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں۔ تو دل میں کیا کچھ ہوگا۔ اور صحبتوں میں کیا باتیں ہوتی ہونگی۔

شیخ فیضی سفارت دکن کی عرائض میں سے ایک عرضی میں ایران کے حالات لکھتے لکھتے کہتے ہیں۔ **ترجمہ**۔ آج کل سر آمد دانشمندان عراق و فارس **میر تقی الدین محمد** ہے مشہور بہ تقیائے لسایہ۔ ولایت میں آج اس کی عقل و دانش کو کوئی نہیں پہنچتا۔ یہ میر فتح اللہ کے شاگردوں میں سے ہے۔ جب میر **فتح اللہ** اور مولانا **مرزا جان** شیراز میں دانشمندی کا نقارہ بجا رہے تھے۔ تو یہ بھی شیراز کے مدرسوں میں سے تھا۔ فدوی مدتوں سے اس کے کمالات کا شہرہ سُن رہا ہے اور میر **فتح اللہ** سے مکرر تعریف سنی ہے۔ جس کا ایسا شاگرد یادگار ہو اس کے کمال کی دلیل اہل عالم کے لئے کافی ہے۔ **مُلّا محمد رضائے شیرازی** یہاں آیا ہے۔ مدرسے کے دماغ سوختوں میں سے ہے۔ فضیلت اور اہلیت کا جوہر ظاہر ہے۔ وہ کہتا تھا میر تقی الدین محمد کو حضور کے آستان بوسی کی آرزو ہے۔ زاد راہ بہم نہ پہنچا۔ اور موقع ہاتھ نہ آیا۔ ورنہ اس قافلے میں آتا۔ عالم پناہا اگر فرمان عالیشان کچھ انعام کے ساتھ بھیجا جائے تو اس کی سرفرازی ہے۔ میر فتح اللہ کی یادگار ہے اور اس کا فرزند معنوی ہے۔ ع

اے گل بتو خورسندم تو بوے کسے داری

سمجھ لو کہ اکبر کے دل میں محبت کا کیا عالم ہوگا۔ جو اس مزاج داں کی تحریر سے یہ رنگ جھلکا ہے۔ طبع فیاضی کی مرثیہ خوانی شاہ فتح اللہ شیرازی کے غم میں ہے۔ ع

وگرنہ ہنگام آں آمد کہ عالم از نظام افتد

فارغی۔ ملا صاحب کہتے ہیں۔ کہ میر فتح اللہ کے بھائی تھے۔ اول بیرم خاں کے عہد میں یہاں آئے۔ خان موصوف نے کہا کہ یہ تخلص شیخ عبدالواحد خوانی کا ہے۔ اور مشہور ہو چکا ہے۔ مجھے اُن سے ارتباط اور نہایت اعتقاد تھا۔ تم فایقی تخلص کر لو۔ چند روز ان کی فرمایش کی تعمیل کی۔ ایران میں جاکر پھر فارغی ہو گئے۔ دوبارہ ہندوستان میں آئے اور مر گئے۔ اُن کے بیٹے میر تقی علم ہیئت اور نجوم میں شاہ فتح اللہ کے مسند نشین تھے۔ میں نے تھوڑا سا رسالہ بست بابی اُن سے پڑھا تھا۔ اعلیٰ درجے کا فہم و ذکا اور ہمت عالی رکھتے تھے۔ اُن کے بھائی میر شریف تھے فضائل و کمالات کے اوصاف سے موصوف تھے۔ میر تقی کہتے تھے۔ کہ ہمارے کل خاندان میں ایک یہ بھائی سنت جماعت ہیں یا شاہ فتح اللہ۔ باقی سب شیعہ خالی ہیں +

آزاد۔ شاہ فتح اللہ کو تم جانتے ہو! ان سے زیادہ کوئی شیعہ کیا ہوگا۔ مگر ہنگامۂ عالم میں سے کیا بچ کر نکل گئے +